کتاب نمبر

16

نقاط

نئے ادب کا ترجمان

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تاچند انتظار قیامت شتاب ہو
وہ چاند سا جو نکلے تو رفع حجاب ہو
یاں جرم گنتے انگلیوں کے خط بھی مٹ گئے
واں کس طرح سے دیکھیں ہمارا حساب ہو
جی چاہتا ہے عیش کریں ایک رات ہم
تو ہووے چاندنی ہو گلابی شراب ہو
آگے زبان یار کے خط کھینچے سب نے میرؔ
پہلی جو بات اس کی کہیں تو کتاب ہو

(میر تقی میر)

آپ ہمارے کتابی سلسلے کا حصہ بن سکتے
ہیں مزید اس طرح کی شان دار،
مفید اور نایاب کتب کے حصول کے لئے
ہمارے وٹس ایپ گروپ کو جوائن کریں

ایڈمن پینل

عبداللہ عتیق : 03478848884
سدرہ طاہر : 03340120123
حسنین سیالوی : 03056406067

نقاط فیصل آباد

نئے ادب کا ترجمان

شمارہ 16
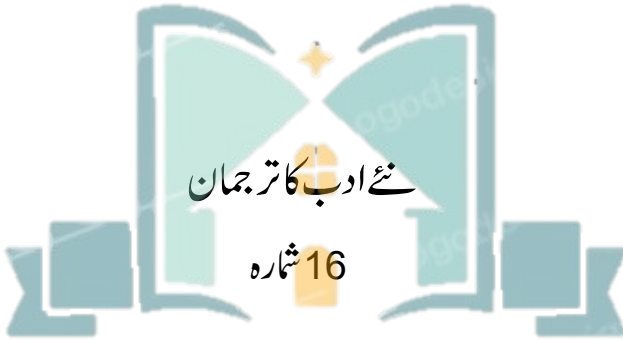
(کتاب نمبر)

اہتمامِ اشاعت:

سٹی بک پوائنٹ، کراچی

Urdu Literary Book Serial

NIQAAT-16
(Book Number)

Faisalabad, Pakistan

December, 2018

ادارت: قاسم یعقوب

خصوصی معاونت: شبیر میواتی

قیمت: 1500 روپے

'نقاط' میں شامل مضامین ادارے کی نظریاتی پالیسی کے مطابق شائع کیے جاتے ہیں، تاہم کسی خاص بحث کے تناظر میں ادارے کی رائے اور مصنف کی رائے میں اختلاف ہوسکتا ہے۔

'نقاط' کی اشاعت کسی کاروباری نقطہ نظر کے تابع نہیں۔ نقاط سے وابستہ تمام افراد کی خدمات اعزازی ہیں۔

E Books
WHATSAPP GROUP

رابطہ:

P-240، رحمٰن سٹریٹ، سعید کالونی، مدینہ ٹاؤن، فیصل آباد

(niqaat@gmail.com)

www.facebook.com/qasim.yaqoob.77

ترسیل و اہتمام اشاعت:

سٹی بک پوائنٹ، کراچی

ترتیب

سنگی کتابیں، کاغذی پیراہن

E Books WHATSAPP GROUP

کتاب دوستی: (فکاهیه اور انشائی تحریریں)

E Books WHATSAPP GROUP

ممنوعہ کتب

کتاب کا سفر (خصوصی مطالعہ)

کتابیں اور کتب خانے

E Books WHATSAPP GROUP

کتابیں جو میرے ساتھ رہتی ہیں

E Books WHATSAPP GROUP

پرانی کتابیں اور بازار

کتاب نظمیں

E Books
WHATSAPP GROUP

کتاب نامہ

کتابوں سے محبت کرنے والے

کتابوں کی دنیا (انتخاب: ادارہ نقاط)

E Books
WHATSAPP GROUP

نئی نسل کیا پڑھتی ہے!

انتخاب وترتیب: عافیہ شاکر

جویریہ ظفر (نمل، اسلام آباد)، یحییٰ سعید (ملتان)، ضیا الثقلین (خانیوال)، مریم سمیع خان (سرگودھا)، ایمن طاہر (سرگودھا)، عائشہ افق (سرگودھا)، سیف اعجاز (گوجرہ)، محمد عثمان (گوجرہ)

کتاب تبصرے

’دوام‘: پہاڑوں کی وادی کوئٹہ سے ایک منفرد ناول	فواد رضا
’’بے پناہ شادمانی کی مملکت‘‘ ایک مطالعہ	رابعہ رحمٰن
’’غلاموں کی غلامی کی فکری اساس‘‘ ایک مطالعہ	شاہد اشرف
’’چینوا اچیبے‘‘ پہ ایک نئی کتاب	عبدالعزیز ملک
انتظار حسن کو ’جستجو کیا ہے؟‘	ڈاکٹر اورنگ زیب نیازی
’’ہائیڈل برگ کی ڈائری‘‘ سے ایک ورق	محمد الیاس کبیر
لیاقت علی کا سچا جھوٹ	ضیغم رضا
ناصر عباس نیر کی کتاب ’اردو ادب کی تشکیلِ جدید‘	محمد الیاس کبیر
انجم سلیمی کی ’’میں‘‘	قاسم یعقوب
انجم سلیمی کی ’’میں‘‘: ذات سے عرفانِ ذات کا سفر	محمد اشرف ثمر
ایڈورڈ سعید کی کتاب شرق شناسی: ایک مطالعہ	تنزیلہ اسلم
نئے لوکیل پہ ایک اہم ناول: ’’نیلی بار‘‘	مدثر علی خان
ٹیری ایگلٹن کی کتاب ’’تھیوری کے بعد‘‘	حمیرا اکرم
کاشف رضا کا ایک منفرد ناول: چار درویش اور ایک کچھوا	نعیم الرحمان

E Books WHATSAPP GROUP

E Books WHATSAPP GROUP

کتابیں اور اکیسواں خواب

(اداریہ)

کتابوں سے دوستی، ان کا ذکر اور ان کا مطالعہ جتنی اہمیت آج رکھتا ہے شاید اس سے پہلے کبھی نہیں تھا۔ کتاب مر رہی ہے۔ کتاب بدل رہی ہے۔ کتاب سے طلسماتی رشتے کمزور پڑ رہے ہیں۔ ایسے میں کتابوں کا ذکر کسی اندھیرے میں ٹمٹماتے دیے کی لَو کو اونچا کرنے کے عمل سے کم نہیں۔ کتابوں کی اہمیت کم نہیں ہوئی، کتابوں سے پیار کرنے والے کم ہو گئے ہیں۔ انسان کا کتاب سے رشتہ کمزور نہیں ہوا، کتاب کو پہچاننے والے خال خال رہ گئے ہیں۔

کتاب نے صدیوں سے تحریر کی اپنی گود میں پرورش کی ہے۔ اگر تاریخ کے صفحات کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ کتاب ہی وہ واحد ذریعہ تھی جس نے انسان کے ثقافتی و تہذیبی اقدار کو بڑھانے اور پھیلانے میں اہم کردار کیا۔ آج کتاب ختم نہیں ہوئی کتاب سے وابستہ وہ کلچر دم توڑ رہا ہے جس نے کتاب میں الفاظ سے زیادہ اُس تہذیب کو پروان چڑھایا تھا جس سے انسانی وقار اور احترام توقیر پاتا رہا۔

آج کے حبس زدہ موسم میں کتابوں کو یاد کرنے کا مطلب ہے اپنی تاریخ میں جھانکنا۔ کتابوں کے ساتھ اپنی رفاقت کو یاد کرنے کا عزم کرنا۔ کتابوں کی معیت میں کچھ دیر رکیے اور اپنے مطالعے کو اپنا زادِ راہ بنائیے۔ اگر نے سماج کی تشکیل میں کہیں سے کوئی امید کی کرن پھوٹنے کا کوئی امکان آج بھی موجود ہے تو وہ کتاب کلچر ہے جہاں سے تہذیب کو نئی اقدار ملیں گی۔

نقاط کا یہ شمارہ بنیادی طور پر میرے محسن اور عزیز دوست انجم سلیمی صاحب کا آئیڈیا تھا۔ انھوں نے اپنے پرچے ''خیال'' کے لیے ایک وقت میں کافی کام بھی کر رکھا تھا مگر ایک ڈیڑھ دہائی میں ان کے منصوبے پہ گرد پڑنے لگی۔ الطاف بابر صاحب کی موجودگی میں انجم سلیمی نے مجھے کئی دفعہ یاد کروایا کہ ''کتاب کلچر'' کو زندہ کرنے کے لیے نقاط کا ''کتاب نمبر'' لایا جائے۔ مجھے آج

خوشی ہے کہ ان کا دیرینہ خواب پورا ہو گیا۔

شبیر میواتی صاحب نے مجھے اس خواب کی تکمیل کے لیے بہت سا سامان مہیا کیا۔ سچ پوچھیے تو میواتی صاحب نے ہی اس تحریک کو عملی شکل دی۔ انھوں نے بہت سی نایاب تحریریں پیش کیں۔ میواتی صاحب کے پاس کتابوں سے پیار کرنے والوں کی تحریروں کا انبار تھا جسے انھوں نے برسوں سے جمع کر رکھا تھا۔ صفدر رشید صاحب نے بھی ''نقاط'' کتاب نمبر کے لیے میواتی صاحب کو مہمیز کرنے میں اپنا کردار ادا کیا۔

ارشد محمود ناشاد صاحب نے اس خصوصی شمارے کے لیے بہت قیمتی مشورے دیے۔ اپنی نایاب کتب فراہم کیں اور سب سے بڑھ کے ایک اہم مضمون خصوصی طور پر تحریر کیا۔ مخطوطہ نویسی (کتاب کی غیر مطبوعہ شکل) کے مختلف مدارج پہ اس سلیقے اور سہل انداز سے روشنی ڈالی ہے کہ کتاب کی تاریخی سوانح سمٹ آئی ہے۔ ادارہ ''نقاط'' ناشاد صاحب کا خصوصی طور پر مشکور ہے۔ ''کتاب نامہ'' ناشاد صاحب کی کتاب سے محبت کی منہ بولتی داستان ہے۔ جسے یہاں مکمل صورت میں شائع کیا جا رہا ہے۔

شاہد اعوان صاحب نے اپنے علمی ادارے کی اہم تحریریں بھجوائیں۔ ان کے تعاون سے یہ شمارہ زیادہ وقیع ہو گیا ہے۔ سچ پوچھیے تو اعوان صاحب اور ہمارا مقصد ایک ہی ہے یعنی علمی سفر۔ اس شمارے میں ان کے شائع کردہ علمی سفرنامے خاصے کی چیز ہیں۔

نئی نسل کیا پڑھتی ہے! اس سلسلے میں اپنے کچھ احباب سے رابطہ کرنے کی کوشش کی گئی مگر اس سلسلے میں کوئی خاطر خواہ تعاون نہیں ملا۔ مگر اس شمارے میں چند طلبہ کے ''خود رو'' اظہار سے ایک اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ہماری نئی نسل کیا پڑھ رہی ہے اور کیا پڑھنا چاہ رہی ہے۔

اس شمارے میں خصوصی گوشے ہوں گے ـــــ کتاب دوستی، ممنوعہ کتب، کتاب کا سفر، کتاب خانے، کتابیں جو میرے ساتھ رہتی ہیں، پرانی کتابیں اور بازار، کتاب نظمیں، کتاب نامہ، کتابوں سے محبت کرنے والے، کتابوں کی دنیا، اور کتاب تبصرے ـــــ جو کتابوں کا ایک جہان لیے آپ کا استقبال کر رہے ہیں۔

ٹالسٹائے کا یہ مشہور قول اکثر گردش کرتا ہوا ملتا ہے:

> ''اگر یہ سچ ہے کہ جتنے سر ہیں اتنے ہی ذہن ہوتے ہیں تو پھر جتنے دل ہیں اتنی ہی قسم کی محبتیں بھی ہیں''

کتابوں میں تو دل اور اذہان دونوں یکجا ہو جاتے ہیں، سو جتنی کتابیں ہیں اتنے دل اور ذہن کے رشتے کھلے ہوئے ہیں۔ نقاط کا کتاب نمبر ایسی کتاب ہے جس میں کتاب کو یاد کیا جا رہا

ہے، کتاب سے وابستہ دل اور ذہن کے رشتوں کو جوڑا جا رہا ہے۔

شاہد اعوان، سید کاشف رضا، فیاض ندیم، یونس خان، عابد میر، عرفان جاوید، فارینہ الماس، محمد علی شہباز، محمود الحسن ،شہزاد وریا، عافیہ شاکر، شاہد اشرف، الیاس کبیر، اورنگ زیب نیازی، ڈاکٹر فرید حسینی اور حنا جمشید کا خصوصی شکریہ جنھوں نے اپنی تحریریں بھی بھجوائیں اور ساتھ دوسری تحاریر کا انتظام بھی اپنے ذمے لیا۔ اپنے سینئرز دوست اور اساتذہ میں ڈاکٹر ناصر عباس نیر، آصف فرخی، ڈاکٹر معین الدین عقیل، سلمیٰ اعوان، ڈاکٹر سعید احمد (فیصل آباد)، ظفر حسین ظفر اور عبد العزیز ساحر صاحب کا بھی شکریہ جنھوں نے مجھے اہم آرٹیکل اور نایاب کتابوں کی فراہمی ممکن بنائی۔ ڈاکٹر سعید احمد (اسلام آباد) اور ڈاکٹر یٰسین آفاقی صاحب نے بھی مختلف مضامین کے انتخاب میں ساتھ دیا۔ ان کا بھی خصوصی شکریہ۔

اس شمارے کا مقصد کتاب سے وابستہ اُس تہذیب کا احیا کرنا ہے جو سائیڈ اور سوشل میڈیا کی وجہ سے رفتہ رفتہ مر رہی ہے۔ تخلیقی ادب اور سماجی علوم صرف ریڈنگ نہیں مانگتے بلکہ مطالعے کی پوری تہذیب مانگتے ہیں جو صرف کتاب سے ممکن ہے۔

آیئے خوبصورت شاعر غلام قاصر کے اس شعر کے ساتھ اس شمارے کا مطالعہ کرتے ہیں:

بارود کے بدلے ہاتھوں میں آ جائے کتاب تو اچھا ہو
اے کاش ہماری آنکھوں کا اکیسواں خواب تو اچھا ہو

قاسم یعقوب
فیصل آباد

کتاب سازی سے کتاب سوزی تک

محمد سلیم الرحمٰن

تحریر سے ہر حکومت خوف زدہ رہتی ہے۔ آمرانہ یا نظریاتی حکومتوں کا بس چلے تو کتابوں، رسالوں اور اخباروں پر پابندی لگا دیں۔ ایسا کرنے سے عالمی سطح پر امیج بگڑنے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ اس لیے یہ حکومتیں صرف وہی تحریریں چھپنے دیتی ہیں جو اپنے حق میں ہوں۔ قصیدے تو اب لکھے نہیں جاتے۔ نثری قصائد ہی سہی۔ ایک بات روزِ اول سے حکمران طبقوں کو سمجھ میں آ گئی تھی۔ اگر عوام پڑھے لکھے ہوں تو ان پر حکومت کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ پاکستان کے دیہی علاقوں میں تعلیم عام کرنے کی جو حوصلہ شکنی کی جاتی ہے وہ بلا وجہ نہیں۔ حکمرانوں کو پتا ہے کہ لوگ پڑھیں گے تو سر پر چڑھیں گے۔

لوسیان ایکس پولستران فرانسیسی مورخ ہے جسے چینی اور عربی امور کی تحقیق میں اختصاص حاصل ہے۔ اس نے ایک دل چسپ کتاب لکھی ہے جس سے پتا چلتا ہے کہ کتاب دشمنی اور کتاب سوزی کی تاریخ خاصی پرانی ہے۔ خوئے بد را بہانہ بسیار کے مصداق ہر دور میں کتابیں جلانے اور برباد کرنے کی توجیہات تلاش کر لی جاتی ہیں۔ پولستران کی کتاب کی مندرجات لرزہ خیز نہیں لیکن افسوس ناک بات یا عبرت آموز ضرور ہیں۔ یہ مانا کہ بہت سی کتابیں اس لائق نہیں ہوتیں کہ انھیں سینت کر رکھا جائے لیکن آگ لگانے والوں یا غارت گروں کو یہ دیکھنے کی فرصت کہاں ہوتی ہے کہ کون سی کتاب کام کی ہے اور کون سی فضول۔ بیشتر آتش زن نیم خواندہ یا ناخواندہ ہوتے ہیں۔ ان کے لیے کتاب سوزی جشنے دارد والا معاملہ ہے۔

یہ بھی نہیں کہ سبھی اہل اقتدار کتاب دشمن ہوں۔ اسی کتاب میں کتنے بادشاہوں، وزرا اور امرا کا ذکر ہے کو علم بردار اور کتاب دوست تھے۔ کتابیں جمع کرنے کے شائق تھے۔ فرق یہ ہے کہ کتابیں جمع کرنے اور گراں بہا کتب خانے ترتیب دینے کے لیے سالہا سال درکار ہوتے ہیں اور انھیں آگ کی بھینٹ چڑھانے کے لیے ایک دن کافی ہے۔

سب سے پرانی کتابیں مصر میں لکھی گئیں۔ اس کا ایک خاص سبب تھا۔ مصر میں ایک

طرح کا نرسل ہوتا ہے۔ اسے Papyrus (بردی) کہتے ہیں۔ اس کے ڈنٹھل کے گودے سے کاغذ بنتا تھا۔ کتابوں کی قدامت کا اندازہ اس بات سے لگایئے کہ 2462 ق م کے لگ بھگ تعمیر شدہ ایک بیوروکریٹ کی قبر پر یہ عبارت کندہ ہے کہ وہ دارالکتب کا محرر تھا۔

قدیم عراق میں کتابیں مٹی کی لوحوں یا تختیوں پر خط میخی میں رقم کی جاتی تھیں۔ یعنی محققین کا خیال ہے کہ آشور کے بادشاہ، آشور بانی پال (ساتویں صدی قبل مسیح) کے کتب خانے میں پانچ لاکھ الواح تھیں۔ مصر اور عراق کے پرانے شہر بار بار بسے اور اجڑے۔ ستم ظریفی یہ کہ جہاں جہاں کتابیں پیپرس پر تھیں وہ آگ لگتے ہی راکھ کا ڈھیر بنیں۔ جن شہروں میں مٹی کی الواح پر مشتمل کتب خانے تھے اور جلائے گئے تو الواح جل کر پختہ تر ہو گئیں۔ قدیم چین میں، کاغذ کی ایجاد سے پہلے، بانس کی کھپچیوں پر لکھنے کا رواج تھا۔ یہاں ذہن میں ایک سوال ابھرتا ہے۔ وادیء سندھ کی تہذیب بھی بہت قدیم ہے۔ اس کا اپنا رسم الخط بھی تھا۔ اگر اس تہذیب کے بنیاد گذاروں نے کتابیں لکھیں تو وہ کہاں گئیں؟ قیاس یہ ہے کہ وہ کتابیں بھوج پتر پر لکھتے ہوں گے اور ہندوستان کی آب وہوا میں بھوج پتر کا سلامت رہنا امرِ محال ہے۔

یونانیوں نے چوتھی صدی ق م میں اسکندریہ میں بہت بڑا کتب خانہ ترتیب دیا تھا۔ اس کا بیشتر حصہ 48 ق م کی رومن خانہ جنگی میں جل کر راکھ ہو گیا۔ اس سے کہیں پہلے سکندر اور اس کے ساتھیوں نے، مدہوشی کے عالم میں، 330 ق م کو ایران کے قدیم دارالسلطنت، پرسی پولس (تخت جمشید) کو جلا ڈالا۔ قدیم ایران کی خدا جانے کیا کیا نادر کتابیں خاک میں مل گئیں۔ رومن افواج نے قرطاجنہ کو فتح کر کے شہر کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ قرطاجنہ کی کتابوں کا اب کہیں سراغ بھی نہیں ملتا۔ دسویں صدی عیسوی میں المنصور نے اندلس میں ہزاروں کتابوں کو یہ کہہ کر جلا ڈالا کہ ان کے مندرجات غیر اسلامی ہیں۔ بغداد کو ہلاکو نے تسخیر کیا تو لاکھوں کتابیں تباہ کر دیں۔ شارل پنجم نے 1535ء میں تیونس پر قبضہ کیا تو وہاں کے کتب خانوں کو آگ لگا دی۔ غرض کہ یورپ ہو یا افریقہ، مشرق وسطیٰ ہو یا چین، کتابوں کی آئے دن شامت آئی رہی۔ ہمارے سامنے ابھی ابھی عراق اور شام میں جو غدر برپا ہے اس کے دوران میں کیا کچھ تباہ نہیں ہوا۔ آتش زنی کی یہ فہرست اتنی طویل ہے کہ بعض دفعہ حیرت ہوتی ہے کہ اتنی بہت سی پرانی کتابیں بچ کیسے گئیں۔

غالباً سب سے اندوہناک سانحہ وہ ہے جس میں ہسپانوی مہم بازوں نے سولھویں صدی میں وسطی امریکہ کی ایزٹک اور مایا تہذیبوں کی تمام کتابیں جلا دیں اور آنِ واحد میں ان مظلوموں کے تاریخی اور تہذیبی ورثے کو بالکل ملیامیٹ کر ڈالا۔ غارت گری کی ان کارروائیوں کے پسِ پردہ وہی ذہنیت کارفرما ہے جو استعماری قوتوں کو خاصہ ہے۔ جن اقوام کو محکوم بنانا مقصود ہوتا ہے ان سے ان کا

ماضی، تاریخ، تہذیب، زبان، سب چھین لیا یا مغشوش کر دیا جاتا ہے۔ اور جب وہ واقعی محروم اور غریب نظر آنے لگتی ہیں تو کہا جاتا ہے کہ یہ اقوام تو تھیں ہی پس ماندہ اور جاہل۔

کتابیں اور کتب خانے ہر مرتبہ دیدہ و دانستہ آگ یا بربادی کی نذر نہیں ہوتے۔ بعض دفعہ آگ اتفاقاً بھی لگ جاتی ہے۔ موجودہ زمانے میں شارٹ سرکٹ سے کتب خانوں میں آگ لگ جانے کی مثالیں موجود ہیں۔ بعض اوقات تباہ کن سیلاب بھی کتابوں پر قیامت ڈھاتے ہیں۔ برصغیر پاک و ہند میں کتب خانوں اور کتابوں کی تباہی کا ایک سبب اور بھی ہے۔ ہم ان کو محفوظ رکھنے کا تردد ہی نہیں کرتے۔ حکومتیں ہوں یا عوام، کتابوں کے بارے میں ان کی روش معاندانہ ہوتی ہے۔ کتابوں کے بڑے بڑے ذخیرے پڑے پڑے تباہ ہو جاتے ہیں۔ کہاں تک ماتم کریں؟

بکس اون فائر از لوسیان ایکس پولستر ان

ناشر: ٹیمز اینڈ ہڈسن

کتابوں کی معیت میں

ڈاکٹر وزیر آغا

جہاز کا خطرے کا سائرن چیخ اٹھا ہے اور سائرن کی آواز کے ساتھ ہی پورے جہاز میں افراتفری مچ گئی ہے۔ جہاز کے کپتان سے میرے دیرینہ مراسم ہیں۔اس لیے اس نے مجھے ایک لائف بوٹ مہیا کر دی ہے تاکہ میں کسی قریبی جزیرے میں پناہ لے سکوں مگر اس نے مجھے اپنے ساتھ جہاز کی لائبریری سے صرف تین کتابیں لے جانے کی اجازت دی ہے۔سوال یہ ہے کہ میں کون سی کتابیں اپنے ساتھ لے جاؤں وار پھر بتاؤں کہ میں نے ایسا کیوں کیا؟ وقت تنگ ہے اور مجھے فوری طور پر کوئی فیصلہ کرنا ہے۔ یہ بات ایسے ہی ہے جیسے کہا جائے کہ میں اپنے بچوں میں سے کسی ایک کو اپنے ساتھ لے جاؤں اور باقی کو جہاز کے ساتھ ہی سمندر میں غرق ہونے کے لیے چھوڑ دوں ایسی صورت میں میرا ردعمل تو یہ ہوگا کہ اپنی بجائے اپنے بچوں کو لائف بوٹ میں سوار کر دوں وار خود ڈوب جاؤں۔ یہی صورت کتابوں کی ہے۔اگر یہ کتابیں انتہائی نادر و نایاب صحیفے ہوتے تو میں انہیں لائف بوٹ میں بھر کر جزیرے کی طرف بہا دیتا اور خود جہاز کے ساتھ ہی سمندر کی تہ میں اتر جاتا۔مگر چونکہ ان کتابوں کی لاکھوں جلدیں پہلے ہی دنیا میں بکھری پڑی ہیں۔اسی لیے ظاہر ہے کہ سوال کتاب کی بقا کا نہیں۔میری اپنی بقا کا ہے۔نجانے مجھے جزیرے میں کتنا عرصہ گزارنا پڑے سنا ہے بعض مسافروں کو سال ہا سال ایک ہی چھوٹے سے جزیرے میں یکہ و تنہا زندگی بسر کرنا پڑی ہے۔ وہاں انہیں جسم و جان کا رشتہ برقرار رکھنے کے لیے غذا تو کافی مقدار میں ملی اور دیکھنے کو مناظر بھی میسر آئے لیکن تنہائی اور بوریت کے احساس نے انہیں کچل کر رکھ دیا۔اس بوریت ہی کا مقابلہ کرنے کے لیے جہاز کے جہاں دیدہ کپتان نے مجھے اپنے ساتھ تین کتابیں لے جانے کا مشورہ دیا ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ کتاب تو دوست کی طرح ہے۔اگر دوست کم آمیز اور اس کی شخصیت اکہری ہے تو میں چند ہی دنوں بلکہ چند ہی ساعتوں میں اس سے اُکتا سکتا ہوں۔اسی طرح میں ہر اس کتاب سے اکتا سکتا ہوں جو مجھے سوچ کی غذا مہیا نہ کر سکے اور جس کے مطالعہ سے مجھے ہر بار نت نئے ابعاد کا احساس نہ ہو۔نہ جانے مجھے اپنے طویل قیام میں ان تینوں کتابوں کو کتنی بار پڑھنا ہوگا اور یہ نہ ہو کہ دوسری ہی بار کے مطالعہ سے میں ان سے اکتا جاؤں اور انہیں پورے زور کے ساتھ سمندر میں پھینک دوں۔ کتابیں کئی قسم کی ہیں۔بعض ایک بار کے مطالعہ کے بعد ہی باسی ہو

جاتی ہیں۔بعض سو بار مطالعہ کرنے کے بعد بھی تازہ محسوس ہوتی ہین۔سائرن دوسری بار چیخا ہے اور جہاز سر بسجود ہونے لگا ہے۔وقت کچھ اور بھی تنگ ہے۔میں نے یکے بعد دیگرے کئی کتابوں کو اٹھایا ہے اور پھر سر کو انکار میں ہلاتے ہوئے انہیں ایک طرف رکھ دیا ہے۔معاً میری نظر لورین ایزلے Loren Eisle کی کتاب The Immense Journey پر پڑی ہے اور میں نے جلدی سے یہ کتاب اٹھالی ہے۔میں دوبارہ کتابوں کو الٹنے پلٹنے لگا ہوں۔ایک چھوٹی سی کتاب شیلف میں سے پھدک کر زمین پر آ گری ہے میں نے کتاب کو اٹھا کر دیکھا ہے۔ یہ نطشے کی Thus Spoke Zarathustra ہے۔میں نے خوش ہوکر یہ کتاب بھی اپنے تھیلے میں ڈال لی ہے۔اب مجھے ایک فقط ایک کتاب اور چاہیے۔شیلف میں سے میر، غالب، میرا جی، فیض اوران کے مقلدین مجھے گھورنے لگے ہیں۔مگر میں ان سے نظریں ملانا نہیں چاہتا۔ییٹس، کیٹس اور ایلیٹ نے میرا راستہ روکنے کی کوشش کی ہے مگر فی الحال مجھے ان کی بھی ضرورت نہیں۔ملارمے، سیفو، ملٹن، میرا بائی اور وارث شاہ۔نہیں مجھے تو ایک ایسی کتاب چاہیے جس میں سمندر کی سی وسعت، جنگل کی سی بوقلمونی اور شہر کی سی ہما ہمی ہو۔ معاً میری نظر وہیٹ میں(Whit Man) کی کتاب Leaves of Grass پر پڑتی ہے اور میں اس کتاب کو بھی اپنے تھیلے میں ڈال لیتا ہوں۔اب جہاز کچھ اور بھی جھک گیا ہے۔میں اپنی لائف بوٹ میں آ جاتا ہوں اور جہاز سے دور ہونے لگتا ہوں۔پھر میں فاصلے سے دیکھتا ہوں کہ عرشۂ جہاز پر جہاز کا کپتان ایک سنگ میل کی طرح ایستادہ ہے اور لمحہ بہ لمحہ جہاز کے ساتھ ہی سمندر میں اترتا جا رہا ہے۔مگر میں اپنے جسم کی لائف بوٹ میں محفوظ تین انوکھی کتابوں کو سینے سے لگائے ایک بالکل نئی Dimension میں آ گیا ہوں۔اور اب اس قابل ہوں کہ جزیرے میں رہوں اور اس بوریت کو اپنے قریب بھی نہ آنے دوں جو جزیرے کے ہر مسافر کا نوشتۂ تقدیر ہے۔

اور اب کہ میں جزیرے میں پہنچ گیا ہوں تو میں آپ کو بتا سکتا ہوں کہ میں نے سینکڑوں کتابوں میں سے ان تین کتابوں کا انتخاب کیوں کیا؟ ان میں سے دو کتابیں تو بالکل مختصر سی ہیں مگر تیسری کتاب قدرے بڑی ہے تاہم اس اعتبار سے یہ تینوں کتابیں بڑی ہیں کہ انہیں صفحوں کے حساب سے نہیں بلکہ فقروں، مصرعوں یا لفظوں کے حساب سے پڑھنا چاہیے۔میں ان کتابوں کے لیے انگریزی محاورہ Packed With Wisdom استعمال کرنا نہیں چاہتا کیوں کہ جزیرے میں رہتے ہوئے آپ Wisdom سے بھی اکتا سکتے ہیں۔ان کتابوں کی خوبی یہ ہے کہ یہ ہر قدم پر آپ کو ٹھہرا لیتی ہیں اور پھر سوچ کو مہمیز لگا کر آپ کو کسی اور ہی دنیا میں لے جاتی ہیں۔

میں نے سب سے پہلے لورین ایزلے کی کتاب The Immense Journey کو اپنے ہاتھ میں لیا ہے اور معاً میں جزیرے کی فضا کو عبور کر کے ماضی اور مستقبل میں

دور دور تک گھومنے لگا ہوں کئی منٹ تو میں اس کتاب کے عنوان ہی کو بار بار پڑھتا چلا گیا ہوں، عظیم سفر The Immense Journey لیکن کیسا سفر؟ یہ کوئی مہماتی کہانی نہیں جو خزانے کی تلاش سے متعلق ہو۔ یہ تو کہانی ہے زندگی کے سفر کی جو قرنوں پہلے شروع ہوا اور قرنوں بعد ختم ہوگا۔ لورین ایزلے ایک سائنس دان ہے۔ لیکن وہ سائنسدان بننے سے پہلے ایک شاعر تھا۔ سائنس دان عملی آدمی ہوتا ہے وہ حقائق کی روشنی میں ہر شے کا تجزیہ کرتا ہے اور پھر کسی اور مسئلہ کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے لیکن جب شاعر پر کوئی بات منکشف ہوتی ہے تو اس کا تخلیل برانگیخت ہو جاتا ہے۔ یہی اس کتاب کا امتیازی وصف ہے کہ اس میں ایک شاعر نے سائنس دان کا روپ دھار کر درشن دیا ہے یا اصل بات یہ ہے کہ ایک سائنس دان نے شاعر کے تخیل کو بروئے کار لانے کی کوشش کی ہے۔ رابندرناتھ ٹیگور نے اپنی بیوی کی موت پر کچھ اس طرح کے تاثر کا اظہار کیا تھا کہ میں نجانے کب سے ایک شاہراہ پر اکیلا چلا جا رہا تھا کہ وہ ایک پگڈنڈی پر سے کود کر شاہراہ پر آ گئی اور میرا ہاتھ تھام کر میرے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔ وہ چلتی گئی، چلتی گئی اور پھر ایک جگہ اس نے آہستہ سے میرا ہاتھ چھوڑ دیا اور شاہراہ سے پھوٹنے والی ایک اور گرد آلود پگڈنڈی پر مڑ گئی۔ مگر میں آگے ہی آگے چلتا رہا: لورین ایزلے نے زندگی کے سفر کو بھی کچھ ایسے ہی دیکھا ہے۔ زندگی سمندر سے برآمد ہوئی اور پھر نباتات، حیوانات اور پرندوں کی صورت میں مصروف سفر ہوئی اور لاکھوں برس تک کروٹ پر کروٹ لیتی چلی گئی مگر پھر آج سے محض چند لاکھ سال پہلے انسان بھی اس کارواں میں شامل ہو گیا۔ زندگی کا سفر جاری ہے کچھ کہا نہیں جاسکتا کہ انسان کب اس کارواں سے کٹ کر دوبارہ اس تاریکی میں چلا جائے جہاں سے وہ برآمد ہوا تھا اور زندگی شادیانے بجاتی ہوئی آگے ہی آگے کو بڑھتی چلی جائے۔ لورین ایزلے لکھتا ہے کہ جب میں صبح کے جھٹپٹے میں بیدار ہوتا ہوں اور نیویارک کی کسی بلند و بالا عمارت پر سے پرندوں کی چہکار کو سنتا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ پرندے ایک دوسرے سے پوچھ رہے ہیں۔ کیا وہ (انسان) ابھی گیا نہیں؟ میں لورین ایزلے کے اس ایک فقرے پر گھنٹوں سر دھن سکتا ہوں۔ انسان کو اس دنیا میں وارد ہوئے ابھی عرصہ ہی کتنا گذرا ہے۔ لہٰذا وہ یہاں کے چرند پرند کے لیے قطعاً اجنبی اور غیر ارضی ہے تاہم اس نے زندگی کے لاتعداد دوسرے نمائندوں کو اپنا مطیع کر لیا ہے اور اب یہ نمائندے اس اجنبی تسلط سے اکتا کر سوچتے ہیں کہ نجانے وہ کب دفع ہو گا؟ میں سوچنے لگا ہوں کہ یہ کرۂ ارض کروڑوں برس تک زندگی کے بغیر ہی خلا میں گھومتا رہا۔ پھر کروڑوں برس ہوئے اس پر زندگی نے اپنا گھونسلا بنایا (سائنس دان اس واقعہ کو اپنی بے رحم حقیقت نگاری کے تحت یوں بیان کرتے ہیں کہ لامحدود کائنات میں آوارہ پھرتے ہوئے اس کنکر پر جسے ہم زمین کہتے ہیں زندگی Funous سا لگ گیا) ابھی صرف چند سال ہوئے کہ انسان پیدا ہوا۔ آنے والے زمانے میں یہ اجنبی شاید سب سے پہلے رخصت ہوگا، پھر چرند پرند جائیں گے، پھر

حشرات الارض، پھر نباتات اور زمین دوبارہ کسی اندھی گونگی اور ٹھنڈی شے کی طرح خلا میں کروڑوں اربوں برس تک گھومتی چلی جائے گی۔ لورین ایزلے پوچھتا ہے: یہ زندگی کہاں سے آئی؟ کیوں کہ جب اس کے عناصر ترکیبی کو الگ الگ کر کے دیکھیں تو بظاہر ان میں کوئی راز نظر نہیں آتا۔ مگر محض ان عناصر کو ایک جگہ ڈھیر کر دینے سے زندگی پیدا بھی تو نہیں ہوتی۔ مختصر ترین مالیکیول میں بھی کم و بیش تین لاکھ Proten Molecules ہیں جو ایک خاص ترتیب سے منسلک اور مربوط ہوں تو زندگی پیدا ہوتی ہے یہ ترتیب کیا ہے؟ اس ترتیب کا محرک اعظم کون ہے؟ کیا سادہ اور اس کا سارا پراسرار نظام اور اس کے جملہ حیرت انگیز مظاہر، جھینگر اور چڑیاں اور آوارہ پھرتے ہوئے انسان بجائے خود کسی انوکھی قوت کے چہرے کے مختلف نقاب نہیں ہیں۔ میں نے ایزلے کی کتاب لحظہ بھر کے لیے بند کر دی ہے اور سوچنے لگا ہوں کہ کیا زندگی محض اس کرۂ ارض تک محدود ہر گز نہیں! کائنات میں لاکھوں کروڑوں کہکشائیں موجود ہیں۔ ہر کہکشاں میں لاکھوں ستارے ہیں اور ہر ستارے کے گرد ایک خاص تعداد میں سیارے ہیں۔ ان سیاروں میں سے کسی بھی سیارے پر زندگی کی نمو ممکن ہے مگر چونکہ زندگی کا امتیازی وصف تنوع اور بوقلمونی ہے اس لیے کہیں یہ تو نہیں کہ کائنات میں زندگی کے لاکھوں کروڑوں روپ تو ہوں لیکن انسانی روپ کہیں اور موجود نہ ہو تو پھر کیا ہم اس بھری کائنات میں اکیلے ہیں؟ معاً مجھے جزیرے میں اپنی تنہائی بے معنی نظر آنے لگی ہے کیوں کہ اب مجھ پر یہ بات منکشف ہوئی ہے کہ انسان تو بھری کائنات میں تنہا ہے۔

میں نے کتاب دوبارہ کھول لی ہے اور اس کی ورق گردانی کرنے لگا ہوں۔ معاً میری نظریں لورین ایزلے کے اس فقرے پر رک جاتی ہیں:

> The Clock in the body. In other words, Has placed a limit upon the pace at which the ape brain grows-A limit which the human ancestors in some manner escaped.

اور یہ فقرہ میرے ذہن میں ایک ہیجان برپا کر دیتا ہے۔ زندگی کے ہر مظہر کے اندر اس کی ایک اپنی گھڑی (کلاک) موجود ہے جو ایک مقررہ رفتار سے ٹک ٹک کرتی چلی جاتی ہے۔ ہر مظہر اپنی کلا کی ٹک ٹک کا اسیر ہے۔ انسان صرف اس لیے انسان ہے کہ ارتقاء کے کسی موڑ پر اس نے Ape کی کلاک کے زندان سے جست بھری اور ایک نئی کلاک کے زندان میں آ گیا۔ اسی لیے Ape Missing Link کی تلاش بے سود ہے۔ انسانی دماغ کی نمو آہستہ آہستہ بتدریج نہیں بلکہ ایک جست کے ذریعہ ہوئی۔ کئی برس ہوئے میں نے ایک کتاب لکھی تھی۔ ''تخلیقی عمل'' اس میں ایک بنیادی نکتہ یہ تھا کہ تخلیق کا عمل ایک پراسراری جست کے تابع ہے اور یہ جست جسم،

معاشرہ، تاریخ، دیومالا، فن، بلکہ ساری کائنات میں دیکھی جاسکتی ہے۔آج جب میں نے ایزلے کی کتاب کو دوبارہ ہاتھ میں لیا تو مجھے اس جست کا ایک سائنسی ثبوت بھی مل گیا۔مگر اس کتاب سے مجھے اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ملا۔ مثلاً یہ خیال کہ حیوان کے اندر کی گھڑی انسان کی گھڑی سے مختلف ہے اور انسان اور حیوان کی گھڑیاں نباتات کی گھڑی سے مختلف ہیں۔ جو گھڑی آہستہ آہستہ چلتی ہے وہ زیادہ دیر تک چلتی ہے اور جو زیادہ تیز چلتی ہے وہ جلد ہی اپنے انجام کو پہنچ کر رک جاتی ہے۔اب کھلا کہ پرانے زمانے میں عمریں کیوں لمبی ہوتی تھیں کہ ان دنوں انسانی معاشرے کے کلاک کی رفتار وہ نہیں تھی جو بیسویں صدی میں ہوگئی ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ میری زمین کی گھڑی بھی تو دوسرے سیاروں کی گھڑیوں سے مختلف ہے اور اسی لیے میری زمین کے وقت کا پیمانہ بھی دوسرے سیاروں کے وقت کے پیمانوں سے مختلف ہے۔ پھر میری کہکشاں کی گھڑی ہے جس کی رفتار دوسری کہکشاؤں سے مختلف ہے۔ میں کسی قسم کی کائنات کا باسی ہوں؟ اوپر دیکھوں تو وقت کی پرتیں تا حد خیال پھیلی ہیں اور یہ وقت سست سے سست تر ہوتا چلا گیا ہے (جیسے ایک ستارے کا عرصہ حیات جو کروڑوں روشنی کے سالوں پر محیط ہے) نیچے دیکھوں تو بھی وقت کی پرتیں تا حد خیال ہیں مگر یہ وقت تیز سے تیز تر ہو رہا ہے (جیسے مثلاً وائرس Virus کی عمر طبعی جو پلک جھپکنے میں ختم ہو جاتی ہے) میں خود وقت کی لاتعداد پرتوں میں سے صرف ایک پرت کا باسی ہوں۔ یہ کیسا زندان ہے؟ وقت کی لاکھوں منزلہ عمارت کی صرف ایک منزل میں رہنا، وہیں پیدا ہونا اور وہیں عمر عزیز ایک خاص رفتار کی گھڑی کے تحت گزار کر چپکے سے رخصت ہو جانا! لورین ایزلے کی کتاب کا یہ کرشمہ ہے کہ اسکے ایک ہی فقرے نے میرے ذہن میں اتنا بڑا ہیجان پیدا کر دیا ہے۔ میں نے اسی لیے یہ کتاب چنی تھی کہ میں اس کی معیت میں ساری عمر گزار سکتا ہوں۔

جزیرے میں یکہ وتنہا زندگی بسر کرنا صدیوں پرانے بن باس کی ہی ایک صورت ہے۔ جب میں نے جہاز کو چھوڑا تو گوتم سدھیارتھ کی طرح گویا کپل دستو کو الوداع کہی اور بن باس اختیار کیا۔ میں اپنے اس گھر میں بہت محفوظ تھا۔اس لیے کہ میری ذات معاشرے سے پوری طرح جڑی ہوئی تھی اور میرے لیے سخت سے سخت سمندری ہچکولوں میں بھی جہاز سے نیچے گرنے کا کوئی خطرہ نہیں تھا لیکن جب میں نے جہاز کو چھوڑا تو گویا اپنے معاشرے اور اس کے پر پیچ دھاگوں سے کٹ کر یکا یک بالکل اکیلا ہو گیا۔ پہلے تو مجھے بڑا خوف محسوس ہوا کیوں کہ میں اب بھری کائنات میں تنہا تھا لیکن پھر آہستہ آہستہ میرے اندر یہ احساس جاگا کہ میں نے اپنے شانوں پر معاشرے کا کتنا بڑا بوجھ اٹھا رکھا تھا۔اور میری شخصیت کس طرح اس بوجھ تلے پس کر رہ گئی تھی شاید اس لیے حساس اذہان خود کو پہچاننے کے لیے ہمیشہ شہر کو چھوڑ کر غاروں، صحراؤں اور پہاڑوں کی طرف بھاگتے رہے ہیں۔ وجہ یہ کہ شہر اور اس کی مخلوق فرد کا گلا گھونٹ دیتی ہے۔ معاشرہ نہیں چاہتا کہ کوئی

ہمیشہ اس کے گلے سے الگ ہو کر بھٹک جائے اسی لیے وہ اخلاقی ضوابط، سماجی قوانین، روایت اور اصول اور قاعدہ اور ڈسپلن کی ڈور سے اسے اس طور جکڑ لیتا ہے کہ وہ پھر کبھی اس جال سے باہر نہیں جا سکتا۔ مگر اس سارے حزم و احتیاط کے باوجود ان لوگوں کو نہیں روک سکا جو اسے خیر باد کہہ کر بار بار جزیروں اور پہاڑوں اور صحراؤں کی طرف جاتے رہے ہیں۔ نطشے انہیں لوگوں میں سے ایک تھا۔ اس کا جزیرہ سطح سمندر سے چھ ہزار فٹ کی بلندی پر واقع تھا جہاں اس نے اہرام مصر ایسی ایک بلند و بالا چٹان کے پاس بیٹھ کر کاغذ کے ایک ٹکڑے پر لکھا ''انسان اور وقت سے چھ ہزار فٹ دور'' اور پھر تنہائی اور آزادی کے اس مقدس لمحے میں اپنی ذات سے پہلی بار متعارف ہوا۔ اس نے ذات کے اس نئے روپ کو زرتشت کا نام دیا اور اس کے ہونٹوں سے ٹپکتے ہوئے ہر لفظ کو اپنی کتاب Thus Spake Zarat Hustra میں محفوظ کرتا چلا گیا۔ آج یہ کتاب میرے ہاتھ میں ہے اور میں جس انبوہ کی کلبلاہٹ سے دور اپنی ہی ذات کی معیت میں بیٹھا اس کا دلجمعی سے مطالعہ کر سکتا ہوں۔

نطشے نے جب یہ کتاب لکھی تو وہ جانتا تھا کہ یہ ایک شاہکار ہے مگر زمانے نے اسے درخور اعتنا نہ سمجھا۔ وجہ یہ کہ اس وقت تک زمانہ گلے کا فلسفہ Philosophy of the Herd کے تابع ہو چکا تھا مگر اس کے بعد بھی مشین اور مشینی نظریات اور انسانی ہمہ اوست کے فلسفے کے رواج نے اس کی پذیرائی کو تا دیر ملتوی کیے رکھا۔ پھر پہلی جنگ عظیم لڑی گئی جس کے بعد سب سے پہلے یورپی ممالک اور ان کے بعد انگریزی دان طبقات آہستہ آہستہ اس کی اہمیت کے معترف ہونے لگے۔ حتیٰ کہ عیسائی پادری اور انگریز محبِّ وطن بھی دبی زبان میں اس کی تعریف کرنے لگے۔ بدقسمتی اس کتاب کی یہ تھی کہ بعض حلقوں نے اسے پہلی اور دوسری جنگ عظیم کا واحد محرک قرار دے ڈالا۔ حالانکہ بقول آسکر لیوی یہ جنگیں نسلی تفاخر کے جذبے کے تابع Kingdom of Heaven کے حصول کی اس کوشش کا اعلامیہ تھیں جو یہودی ذہن کی عطا تھا۔ وہ یہودی ذہن جس کی تفسیر کانٹ، ہیگل اور فشئے کے نظریات میں ملتی ہے نہ کہ نطشے کے افکار میں یہودی ذہن بھیڑ چال کے فلسفے کا قائل ہے اور خود کے اس جوہر سے صرف نظر کرتا ہے جو فرد کو انبوہ سے اوپر اٹھا کر ایک اعلیٰ و ارفع منصب پر فائز کر دیتا ہے۔ کانٹ نے اس خود کا گلا گھونٹنے کی ترغیب دی۔ اس نے جرمن ذہن کو شخصی مسرت کے تصور سے الگ کر کے بادشاہ اور ملک، معاشرے اور ہمسائے کی خاطر متحرک ہونے پر اکسایا۔ فشئے نے جرمن قوم کا یہ مقدس فریضہ قرار دیا کہ وہ انسانیت کو لازمی طور پر روح کی ایک بنیاد مہیا کرے۔ اسی طرح ہیگل نے Moral Idea پر زور دیا اور Divine State کا وہ تصور پیش کیا جسے بسمارک نے حقیقت میں تبدیل کرنے کی کوشش کی یہی وہ لوگ تھے جنہوں نے Kingdom of Heaven کو زمین پر لانے کی دھن میں فرد کی انفرادیت کو اداروں کی اجتماعیت کے تابع کر دیا جب کہ نطشے نے اس استحصال کے خلاف علم بلند کر کے یہ ثابت کر دیا کہ وہ

اجتماعی زنگ آلودگی کا نہیں انفرادی تازگی کا داعی ہے۔

نطشے اکثریت کا نہیں اقلیت کا قائل ہے۔ گلے کا نہیں گلے بان کا والہ وشیدا ہے۔ اور وہ بنی نوع انسان کو نہیں بلکہ مرد مومن کو اپنی منزل قرار دیتا ہے۔ اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ اس کا یہ نظریہ آمریت کی طرف ایک قدم تھا بلکہ اس نے تو فرد کو اجتماع کی اس اکثریت سے بچانے کی کوشش کی جس نے یورپ کو اپنے پنجوں میں دبوچ رکھا تھا۔ ارتقاء غزال کی طرح چوکڑیاں بھرنے کا نام ہے نہ کہ بھیڑ کی طرح نپے تلے قدم اٹھانے کا اور یہ چوکڑی ہمیشہ کوئی ایسا مرد قلندر بھرتا ہے جو بہر اعتبار اپنی نوع سے افضل ہوتا ہے۔ یوں دیکھیے تو نطشے نہ محض Brute Force کا علم بردار ہے اور نہ وہ مردم بیزاری اک مرتکب ہوتا ہے۔ وہ تو پرانے زنگ آلود جہان کو ایک دھماکے کے ساتھ اڑانے اور اس کے بعد Transvaluation of Values کی مدد سے ایک ایسے جہان نو کو وجود میں لانے کا داعی ہے، جس میں خیر و شر کی جملہ سابقہ توضیحات ختم ہو جائیں گی اور ایک نئی اخلاقیات کا سورج طلوع ہوگا۔

نطشے کی یہ کتاب ایک نئی بائیبل ہے جو دنیا کو عطا ہوئی نہ صرف اس کا اسٹائل قدیم عہد نامہ کی یاد دلاتا ہے بلکہ اس کا متن بھی ایک پیغمبر کے سے فرمودات کا اظہار ہے۔ مگر ایک ایسا پیغمبر جو پیغمبروں کی صف سے بالکل الگ تھلگ کھڑا ہے، اخناتن، تاریخ کا پہلا فرد تھا، نطشے دوسرا فرد ہے اور جس طرح اخناتن نے اپنے زمانے سے انحراف کیا بالکل اسی طرح نطشے نے بھی کیا ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ اس کام کے لیے دونوں نے ایک شعری پیرایۂ بیان کو بروئے کار لانے کی کوشش کی۔

ابتداً یہ زمین بالکل بنجر تھی۔ ایک طرف پانی کا بیابان تھا۔ دوسری طرف خشکی کا بیابان؛ پھر پانی کے بیابان میں زندگی کی کلبلاہٹ سی ہوئی اور وہ کروڑوں برس تک اپنے اس Incubator میں پھلتی پھولتی چلی گئی۔ تب ایک روز زندگی نے پانی کے شفاف گھونگٹ کو اپنے چہرے سے ہٹایا تو اسے خشکی کا بیابان دکھائی دیا اور وہ ایک چور کی طرح اس پر دبے پاؤں رینگنے لگی۔ یہ سلسلہ بھی لاکھوں برس جاری رہا۔ پھر یکا یک نجانے کیا ہوا کہ کسی نے صور اسرافیل پھونکا اور بنجر بے رنگ زمین پر گھاس کی سبز چادر بچھ گئی اور انگنت رنگوں کے پھول ساری زمین کو ڈھانپنے لگے۔ پھر گھاس کی اس چادر پر انسان کے جدامجد نے ڈرتے ڈرتے اپنا پہلا قدم رکھا اور اس گھاس ہی کے ایک خوشے سے کچھ بیج نکال کر کھائے یوں اس نے بصارت بھی حاصل کی اور بصیرت بھی۔

کتاب: خوشبو کا ایک لطیف جھونکا

ڈاکٹر وزیر آغا

کتاب، زندگی کا اوّل بھی ہے اور آخر بھی! کتاب ہی وہ صدر دروازہ ہے جس سے گزر کر آپ زندگی کے رموز اور مراحل سے آشنا ہو سکتے ہیں اور یہی قطب نما ہے جو آپ کو صحیح سمت میں چلنے کے قابل بناتا ہے۔ کچھ ایسی ہی باتیں جناب ڈاکٹر وزیر آغا نے گورنمنٹ کالج سرگودھا میں تقریب تقسیم انعامات کے موقع پر خطاب کرتے ہوئے کہیں (مدیر)

برصغیر کی تقسیم کے موقع پر لاہور کے فٹ پاتھوں پر علمی اور ادبی کتابوں کے ڈھیر لگ گئے تھے جو ہندوؤں اور سکھوں کے گھروں سے برآمد ہوئے تھے۔ آج اگر خدانخواستہ ہمارے گھروں کا اثاثہ فٹ پاتھوں پر آ جائے تو اس میں فلموں اور گانوں پر آ جائے تو اس میں فلموں اور گانوں کے کیسٹوں کے ڈھیر تو نظر آئیں گے کتابیں مشکل ہی سے دکھائی دیں گی، حالانکہ کتاب سے زیادہ قیمتی اثاثہ اور کوئی نہیں ہے۔

تعلیمی ادارہ ایک ایسی بستی ہے جس کے دو دروازے ہیں۔ ایک دروازہ بستی میں داخل ہونے کے لیے اور دوسرا باہر نکلنے کے لیے! دونوں دروازوں پر صاحبان بصیرت متعین ہیں جو آنے والوں کو ان کی ذہنی استعداد کی بنا پر اندر آنے کی اجازت دیتے ہیں اور جانے والوں کو ان کی اعلیٰ کارکردگی کی بنا پر رخصت ہونے کا اشارہ کرتے ہیں۔ استعداد اور اعلیٰ کارکردگی کے حصول کے درمیان ایک طویل عرصہ ہے جس میں یہ صاحبان بصیرت، طالبان علم کو کیا سے کیا بنا دیتے ہیں۔ پھر جب وہ علم کی بستی کے بیرونی دروازے سے رخصت ہوتے ہیں تو اس اعتماد کے ساتھ کہ اب وہ کارزار حیات میں اپنا کردار احسن طریق سے انجام دینے پر قادر ہیں۔

عام خیال یہ ہے کہ پر پرواز سے لیس ہونا کامیاب زندگی بسر کرنے کے لیے کافی ہے۔ یہ بات تمام و کمال صحیح نہیں کیوں کہ پر پرواز کا حصول تعلیم کا نقطہ اختتام نہیں بلکہ نقطہ آغاز ہے۔ یہ وہ اسم ہے جسے ''کھل جا س سم سم'' کے طلسماتی جملے میں ڈھل کر زندگی کے طویل و عریض شہر کے دروازے کو کھولنا ہے مگر زندگی کا یہ شریک سطحی نہیں ہے۔ اس کی لاتعداد سطحیں اور بے شمار منازل ہیں۔ ہر منزل بجائے خود ایک جہان نو ہے جس کے اندر تعلیمی ادارے سے حاصل کردہ پر

پرواز کو منقلب کر کے بروئے کار لائے بغیر چارہ نہیں ہے لہذا تعلیمی ادارے کو خیر باد کہنے والوں کو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ ان کی تعلیم مکمل ہوگئی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ انہیں حصول علم کے لیے ایک اہم حربہ یعنی Device مہیا کر دیا گیا ہے۔ اب اس کی مدد سے اعلیٰ اور برتر علم حاصل کرنا ان کی وہبی قوت، لگن اور تجسس پر مبنی ہے۔

تعلیمی ادارے سے فارغ ہونے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ آپ کو ایک سکے میں ڈھال کر اور اس پر قیمت کا ٹھپہ لگا کر آزاد کر دیا گیا ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے معاشرے میں اکثر ایسے ہی ہوتا ہے جس کے نتیجہ میں جب طالبان علم اپنے تعلیمی ادارے سے رخصت ہوتے ہیں تو وہ طالبان علم کے بجائے دشمنان علم بن جاتے ہیں۔ کتاب سے ان کا رشتہ منقطع ہو جاتا ہے۔ وہ زیادہ سے زیادہ اخبار بینی کی عادت میں مبتلا ہوتے ہیں، جو واقعات سے باخبر رہنے کا ایک ذریعہ ہے۔

آج صورت حال یہ ہے کہ ہمارے گھروں میں تفریح کے لوازمات تو بافراط مل جائیں گے لیکن علم حاصل کرنے کے ذرائع مشکل ہی سے نظر آئیں گے۔ برصغیر کی تقسیم کے موقع پر لاہور کے فٹ پاتھوں پر علمی اور ادبی کتابوں کے ڈھیر لگ گئے تھے جو ہندوؤں اور سکھوں کے گھروں سے برآمد ہوئے تھے۔ آج اگر خدانخواستہ ہمارے گھروں کا اثاثہ فٹ پاتھوں پر آ جائے تو اس میں فلموں اور گانوں کے کیسٹوں کے ڈھیر تو نظر آئیں گے کتابیں مشکل ہی سے دکھائی دیں گی، حالانکہ کتاب سے زیادہ قیمتی اثاثہ اور کوئی نہیں ہے۔

زندگی ایک پردہ در پردہ اور نقاب اندر نقاب شے ہے۔ کتاب دوستی آپ کو زندگی کے کسی ایک پردے یا ایک نقاب میں مقید ہو جانے سے منع کرتی ہے بلکہ اس بات پر زور دیتی ہے کہ آپ پردوں اور نقابوں کو الٹتے چلے جائیں۔ عام چلن تو یہ ہے کہ تعلیمی ادارے سے فارغ ہونے کے بعد آپ اپنی تعلیمی استعداد کے مطابق زندگی کے کسی ایک شعبہ مثلاً ملازمت، تجارت، زراعت یا صنعت وغیرہ سے وابستہ ہو جاتے ہیں اور عمر عزیز اس شعبے کے چھپر تلے گزار کر رخصت ہو جاتے ہیں۔ مگر کتاب آپ کے اندر ذوق تجسس اور قوس سیاحت پیدا کرتی ہے۔ آپ کو تحریک دیتی ہے کہ آپ اپنے لیے ایک نیا امریکہ دریافت کریں اور یہ نیا امریکہ کرۂ ارض ہی کا ایک حصہ نہیں انسان کے اعماق میں چھپے ہوئے روح کے براعظم کا ایک حصہ بھی ہے۔ کتاب خوشبو کا وہ لطیف جھونکا ہے جس کی معیت میں آپ ذات سے باہر بھی سفر کرتے ہیں اور ذات کے اندر بھی۔ ذات سے باہر سفر کرتے ہوئے آپ افراد، جماعتوں، قوموں اور نسلوں کے باہمی ربطہ کا مطالعہ کرتے ہیں اور ایک فلاحی معاشرے کے حصول میں اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔ آپ جان لیتے ہیں کہ معاشرہ ایک ایسا کمپیوٹر ہے جس کا ہر پرزہ اس کی بقا کے لیے ضروری ہے۔ جب رشوت، جھوٹ، استحصال،

ناانصافی اور حق تلفی کے وائرس اس کمپیوٹر پر حملہ آور ہوتے ہیں تو ہزاروں برس پر پھیلے ہوئے انسانی اقدامات کا ثمر شیریں یعنی ثقافتی ورثہ معاشرے کے ذہن سے حرف غلط کی طرح مٹ جاتا ہے اور معاشرہ دوبارہ جنگل کے قانون کے تابع ہو جاتا ہے۔ دوسری طرف ذات کے اندر سفر کرتے ہوئے آپ اپنی شخصیت پر سے زنگ اتارتے ہیں۔ ضمیر کی آواز کو استحکام بخشتے ہیں اچھے اور برے کی پہچان کرتے ہیں۔ آپ کے ہاں سوچنے اور غور کرنے کی قوت پیدا ہوتی ہے۔ آپ جاننا چاہتے ہیں کہ یہ زندگی کیا ہے اور کائنات کیا ہے اور انسان کا اس کائنات سے کیا رشتہ ہے، نیز یہ کہ حقیقت Reality اور ظاہرہ (Appearance) کیا فرق ہے؟

کیا یہ جڑواں تخالف (Binary Opposites) کا نمونہ ہیں یا ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں؟ حقیقیت اولیٰ سے آپ کا کیا رشتہ ہے؟ اور حضوری کے لیے آپ کو کیا کرنا ہے۔ عبادت؟ ریاضت؟ غواصی؟ عرفان؟ یہ سب راستے آپ کے سامنے کھلے ہیں۔

سفر زندگی کی خارجی سطح کا ہو یا اس کی داخلی سطح کا، دونوں صورتوں میں کتاب ہی وہ کشتی ہے جس میں بیٹھ کر آپ ساحل مراد تک پہنچ سکتے ہیں۔ ہم جس دین سے وابستہ ہیں اس کی اساس بھی اللہ کی کتاب ہے اور یہ ایک ایسا صحیفہ آسمانی ہے، جس میں پہلی بار لکھے ہوئے لفظ کی اہمیت کا برملا اعلان ہوا ہے۔ نئی انجیل نے متکلم لفظ کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے کہا تھا کہ ''ابتدا میں کلام تھا اور خدا کے ساتھ تھا اور کلام خدا تھا'' مگر قرآن حکیم نے تحریر کا احساس ان الفاظ میں دلایا ہے:

> ''پڑھیے اپنے رب کے نام سے جس نے تخلیق کیا (کائنات کو) انسان کو تخلیق کیا جمے ہوئے خون سے، پڑھیے کہ آپ کا رب صاحب تکریم ہے جس نے قلم کے ذریعے علم عطا کیا، جس نے انسان کو وہ علم دیا جس سے وہ بے بہرہ تھا۔''

اس میں قابل غور بات یہ ہے کہ پڑھنے کے عمل کو بذریعہ ''قلم'' آگے بڑھانے کی تلقین کی گئی ہے۔ لفظ سے قلم تک کا یہ سفر انقلابی نوعیت کا حامل تھا، جس کا مطلب یہ تھا کہ تحریر کی ایک اپنی فعال کائنات ہے یا شاید یہ کہ کائنات بجائے خود ایک تحریر ہے، اسی لیے بار بار اس بات کی تلقین کی گئی کہ کائنات پر غور کرو۔ اسے سمجھنے کی کوشش کرو۔

کائنات کو کتاب کی صورت میں دیکھنا اتنا بڑا انکشاف تھا جو نہ صرف یہ کہ دیگر ادیان نے اسلام سے پہلے پیش نہیں کیا تھا بلکہ جس کی توثیق اب بیسویں صدی کی طبیعات نے بھی کر دی ہے۔

تحریر الفاظ سے بنتی ہے اور الفاظ حروف سے مرتب ہوتے ہیں۔ قابل غور بات یہ ہے کہ اگر بیس الفاظ سے ایک جملہ مرتب ہو تو اس میں الفاظ کی ترتیب کے امکانات لامتناہی ہیں اور

ان کا از خود ایک با معنی جملے میں مرتب ہو جانا قریب قریب ناممکن ہے۔ امکانات کا ذکر آیا ہے تو قدیم زمانے کے اس راجہ کا قصہ یاد کیجیے جس نے اپنے وزیر کی کسی بات سے خوش ہو کر کہا تھا کہ بول کیا مانگتا ہے اور وزیر چونکہ باتدبیر تھا لہذا اس نے ہاتھ جوڑ کر کہا تھا۔ مہاراج! آپ جو یہ شطرنج کھیل رہے ہیں تو بس اتنا کرم کریں کہ اس کے پہلے خانے میں گندم کا ایک دانہ رکھ دیں، دوسرے میں دو اور اسی طرح ہر خانے میں دانوں کی تعداد دگنی کرتے جائیں اور پھر اس حساب سے گندم کی جو مقدار بنے وہ اس حقیر فقیر کو عطا کر دیں۔ راجہ کا ''آئی کیو'' اتنا ہی تھا جتنا کہ راجاؤں کا ہوتا ہے سو اس نے کہا کہ یہ تو بالکل معمولی بات ہے، اس نے فوراً ایک بوری گندم طلب کی اور حساب کتاب شروع ہو گیا لیکن جب کارروائی شطرنج کے آدھے خانوں تک پہنچی تو یکا یک راجہ کو معلوم ہو گیا کہ اس کی پوری سلطنت کی گندم بھی شطرنج کے سارے خانے کو ڈھانپ نہیں سکے گی۔ بالکل یہی حال ایک جملے کا ہے کہ اس میں بھی Variations کا کوئی انت نہیں ہے۔ زندگی کی ابتدا کے بارے میں سر ہائیل کہتا ہے کہ بیس Amino Acids کی ان گنت ترتیبوں میں سے صرف ایک ترتیب ہی سے زندگی وجود میں آ سکتی ہے مگر ان ترتیبوں کو آزمانے کے لیے اربوں سالوں کا عرصہ درکار ہے لہذا حسن اتفاق سے موزوں ترین ترتیب کا وجود میں آ جانا قریب قریب ناممکن ہے۔ یہی حال کائنات کے جملے کا ہے کہ اس کے تمام تر عناصر کا ایک ایسی خاص ترتیب میں بہم ہو جانا جس سے معنی کا انشراح ہو قریب قریب ناممکن ہے۔ اس سب کے باوجود اگر ہم ایک بامعنی کائنات کے باسی ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی بہت بڑے تخلیقی عمل ہی سے کائنات کی یہ کتاب لکھی گئی ہے یہ تخلیقی عمل اس حقیقت عظمیٰ ہی کا ہو سکتا ہے جو اس کائنات کا مرکز اور محور ہے اور جس کے قلم نے معنویت سے لبریز نظر آنے والی اس کائنات کو تحریر کیا ہے۔

یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ ان کے تعلیمی ادارے نے انہیں کتاب پڑھنے کا ہنر سکھایا اور کتاب سے عمر بھر کے لیے رشتہ قائم رکھنے کا درس دیا ہے مگر کتاب کا مطالعہ تو ابھی انہیں کرنا ہے۔ یہ مطالعہ عام کتابوں سے لے کر کتاب حیات اور کتاب کائنات تک پھیلا ہوا ہے۔

سوچنے کی بات ہے کہ کیا وہ اس موقع کو محض چند اوراق کے مطالعہ تک محدود رکھ کر رخصت ہو جائے گا یا روشن الفاظ میں لکھی گئی ان گنت کتابوں کے علاوہ زندگی اور کائنات پر اسرار کتاب کو تمام و کمال پڑھنے کی سعادت بھی حاصل کرے گا؟

کتاب اور ذوقِ مطالعہ

میرزا ادیب

جہاں تک ادب کا تعلق ہے ہمارے دور کی ایک المناک حقیقت یہ بھی ہے کہ جو لوگ ادبی ذوق سے بہرہ مند ہیں اور جنہیں ہم اصطلاحاً اہل قلم اور اہل ذوق سمجھتے ہیں ان میں روز بروز مطالعے کا شوق کم ہوتا جا رہا ہے۔ اور موجود آثار و قرائن بتاتے ہیں کہ یہ صورت حال ابھی جاری رہے گی اور اس میں کوئی نمایاں تغیر رونما نہیں ہوگا۔ اس وقت سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مطالعے کے شوق میں انحطاط کی وجہ کیا ہے اور وہ لوگ جو پہلے کتاب کو اپنا اوڑھنا بچھونا جانتے تھے آج اس سے اس درجہ بے نیاز کیوں ہو گئے ہیں۔ کیا اس کی یہ وجہ ہے کہ بازار سے ایسی کتابیں ہی ناپید ہوتی جا رہی ہیں جو پڑھنے والے طبقے کو دعوت مطالعہ دیتی ہیں یا اس کا سبب یہ ہے کہ کتابیں تو بدستور موجود ہیں اور ان میں کسی حد تک وقتاً فوقتاً اضافہ بھی ہوتا رہتا ہے مگر اس دور کے تعلیم یافتہ لوگ ہی مطالعہ کو کوئی اہمیت نہیں دیتے اور اسے پہلے کی طرح جز و حیات بناتے؟...... اس مسئلے پر غور کیا جائے تو پہلی چیز جو ذہن میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ آج زندگی بے حد پیچیدہ ہو گئی ہے اور زندہ رہنے کے لیے اتنا کچھ کرنا پڑتا ہے کہ مطالعے کے لیے نہ تو فرصت کے لمحے میسر آتے ہیں اور نہ دن بھر کی محنت شاقہ کے بعد آدمی میں اتنی سکت باقی رہتی ہے کہ وہ تھکے ہوئے دماغ کو آرام پہنچانے کی بجائے کسی کتاب کا مطالعہ شروع کر دے۔ مطالعے کے لیے پر سکون ماحول کی بڑی ضرورت ہے اور موجودہ ذہن کش اور بے رنگ و کیف مصروفیات کے ہجوم میں یہ شے عنقا ہو گئی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ دلیل بھی کافی وزن رکھتی ہے کہ آج کل معاشی الجھنیں بہت بڑھ گئی ہیں۔ خاندان کی معاشی حالت معاشی ضروریات سے بہ مشکل ہم آہنگ ہوتی ہے ایسی صورت میں کتابوں کی فراہمی پر روپی صرف کرنا ایک اچھا خاصا مسئلہ بن جاتا ہے اس لیے ہمارے ہاں جو ماہانہ بجٹ بنتا ہے اس میں عموماً کتابوں کی مد شامل نہیں ہو سکتی۔ اور اس طرح کتاب کو ذہنی ضرورت سمجھا ہی نہیں جاتا!

یہ باتیں بالکل صحیح ہیں۔ آج کوئی واقف حال شخص بھی اس امر سے انکار نہیں کر سکتا کہ موجودہ حالات میں معاشی ذمے داریوں نے ایک ایسے بوجھ کی صورت اختیار کر لی ہے جسے اٹھانا اور اٹھائے رکھنا بڑا مشکل کام ہے۔ ہر آدمی بڑی تگ و دو کے بعد کہیں جا کر اس قابل ہوتا ہے کہ

اپنی مادی ضروریات پوری کر سکے۔ اس تگ و دو کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جہاں اس کے پاس کتابوں کے لیے روپے نہیں رہتے وہاں محنت و مشقت کے بعد اس کے اعضا بھی اس درجہ مضمحل ہو جاتے ہیں کہ وہ مطالعے کے لیے وقت نہیں نکال سکتا اور اس چیز کے لیے جس امنگ کی ضرورت ہوتی ہے وہ اس کے دل میں زندہ نہیں رہتی!

مجھے معاشی الجھنوں کا پورا پورا احساس ہے اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ موجودہ دور میں زندگی کی تگ و دو اتنی شدید ہو گئی ہے کہ انسان کے لیے تفریحی نوعیت کے مشاغل کو قربان کرنا ضروری ہو گیا ہے لیکن مجھے یہ بات مان لینے میں تامل ہے کہ آج نہ تو کتابوں کے حصول کی معاشی حالت اجازت دیتی ہے اور نہ پڑھنے والوں کے پاس کتابوں کے مطالعے کے لیے وقت ہے۔ کتابوں کی فراہمی اور مطالعے کے سلسلے میں دقتیں بڑھ گئی ہیں مگر حالات اس حد تک نہیں پہنچے کہ ہم کتاب کو انسان کی ذہنی ضروریات کے دائرے ہی سے نکال دیں اور اس کے لیے وجہ جواز یہ نکالیں کہ کتاب خریدنے کے لیے نہ تو ہمارے پاس پیسہ ہے اور نہ وقت۔ مجھے اس قبیل کی دلیلیں قائل ضرور کرتی ہیں مگر اس قطعیت کے ساتھ نہیں کہ میں اس باب میں مزید فکر و تامل ہی نہ کروں اور تصویر کے دوسرے رخ پر نظر ہی نہ ڈالوں! جب میں ہوٹلوں کی روز افزوں رونق دیکھتا ہوں۔ جب کلبوں کی بڑھتی ہوئی گہما گہمی پر نظر ڈالتا ہوں اور جس وقت میں سینماؤں کے گرد و پیش تماشائیوں کے جوش و خروش سا نظارہ کرتا ہوں تو معاً سوچتا ہوں اخر جب ان تفریحی ذرائع کے لیے ہمارے پاس پیسہ بھی ہے اور وقت بھی تو پھر کتاب کیوں ہماری زندگی سے برابر دور ہوتی چلی جارہی ہے۔ کتاب جو کبھی ہماری ذہنی ضرورت تھی آج کیوں اپنی یہ حیثیت کھو چکی ہے؟

واقعہ یہ ہے کہ آج مطالعے کا شوق محض اس بنیادی وجہ سے کم ہو گیا ہے اور ہوتا چلا جارہا ہے کہ ہم کتاب کو اپنی ذہنی ضرورت نہیں سمجھے۔ اتفاق سے کوئی کتاب ہاتھ آ گئی تو اسے محض وقت گزاری کا ایک ذریعہ سمجھ لیا۔ اس سے زائد کچھ نہیں۔ نتیجۃً کتاب ہمارے ذہن کے لیے وہ سامان نشاط مہیا نہیں کر سکتی جسے نشاط مطالعہ کہا جاتا ہے اور جس سے دماغی افق اس طرح وسیع ہو جاتا ہے جس طرح کثرت نظارہ سے چشم تنگ وا ہو جاتی ہے۔

کہا جاتا ہے اور بجا طور پر کہا جاتا ہے کہ کتاب تنہائی کی بہترین رفیق ثابت ہوتی ہے۔ یہ بھی سمجھا جاتا ہے کہ مطالعے کی وسعت پذیری سے انسان کے دل کی گہرائیوں میں وہ احساس جنم لیتا ہے جو اسے زندگی کے گوناگوں پہلوؤں اور کائنات کی پراسرار رفعتوں اور بلندیوں سے روشناس کراتا ہے اور اس انداز سے بھی سوچا جاتا ہے کہ مطالعے سے انسا کے کھردرے، ناہموار اور تیز احساسات میں اس نوع کی لطافت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ زندگی کے تلخ سے تلخ

تجربات میں بھی دبی چھپی لذت محسوس کرنے لگتا ہے اور یہی دبی چھپی لذت اسے سلیقے کے ساتھ جینے کا قرینہ بتاتی ہے اور زندگی کے ہر پیچیدہ موڑ پر اس کے اندر توازن اور تحمل کا جذبہ ابھارتی ہے یہ نہ ہو تو انسانی شعور گھٹی گھٹی فضا ہی میں دم توڑ کر رہ جائے اور ان بلندیوں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھ سکے جن میں پرواز کرنا ایک انسان کا بنیادی حق ہے۔ مطالعے کی یہ خصوصیات مختصراً اپنی جگہ ایک اٹل حقیقت ہیں مگر میں مطالعے کو ایک اور نقطۂ نظر سے دیکھتا ہوں اور سچی بات یہ ہے کہ میں نے اس موضوع کو جو منتخب کیا ہے تو فقط اسی نقطۂ نظر سے گفتگو کرنے کی خاطر کیا ہے ورنہ مطالعے کی خوبیاں قسم کے مضامین تو پہلے بھی لکھے گئے ہیں اور ظاہر ہے آئندہ بھی لکھے جائیں گے! آج سے بارہ پندرہ برس پیش تر جب لکھنے والے بھی اپنے ہم عصروں کی تخلیقات پڑھتے تھے اور پڑھنے والے تو خیر پڑھتے ہی تھے تو ہوتا یہ تھا کہ ایک طرف تو اہل قلم کے درمیان ایک نوع کا ربط باہمی پیدا ہو جاتا تھا اور دوسری جانب لکھنے والوں اور پڑھنے والوں کے درمیان ایک ایسا تعلق خاطر وجود میں آجاتا تھا جو دونوں کو ذہنی طور پر ایک دوسرے کے قریب کیے رکھتا تھا اور اب جب کہ عصری ادب کے مطالعے کا شوق برابر کم ہوتا جا رہا ہے تو اس سے جو اثرات و نتائج مرتب ہوئے ہیں انھیں کسی صورت میں بھی خوشگوار اور خوش آئند نہیں کہا جا سکتا۔ ہم سب زندگی کے بارے میں سوچتے ہیں زندگی کے بارے میں لکھتے ہیں مگر ہمارا یہ فرض بھی تو ہونا چاہیے کہ خود زندگی پر غور کرنے کے ساتھ ساتھ دوسروں کے اس باب میں فکری نتائج بھی معلوم کر لیا کریں۔ ہم کس طرح سوچتے اور ہمارے ساتھی کس طرح سوچتے ہیں۔ یہ چیز معلوم ہوتی ہے تو لکھنے والوں میں ایک ذہنی رابطہ پیدا ہوگا۔ اس کے علاوہ جہاں یہ معلوم ہوگا کہ ہم کس مقام پر کھڑے ہیں وہاں اپنے ساتھیوں کی ذہنی کاوشیں کبھی کبھی ہمارے لیے فکر انگیز مواد بھی مہیا کریں گی۔ اور یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ چراغ سے چراغ جلتا ہے اور یہ بھی کہ جب ایک چراغ جلتا ہے تو فضا کے روشن اور تاریک...... دونوں حصے ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ہم یوں بھی سوچیں کہ جو حصہ تاریک ہے یا نسبتاً تاریک ہے اسے بھی روشن ہونا چاہیے۔ میرا خیال یہ ہے کہ ایک تخلیقی فن کار کے لیے یہ دوسری چیز زیاں خیال انگیز اور محرک ثابت ہوتی ہے، اہل قلم اور اہل مطالعہ کے درمیان انقطاع رشتہ کا سوال ایک بڑے نقصان دہ نتیجے پر منتج ہوتا ہے۔ کتاب لکھنے والا، کتاب اور کتاب پڑھنے والا۔ یہ تین ایسے خطوط ہیں جن سے ادب کی پوری مثلث شکل پذیر ہوتی ہے۔ ایک مصنف (اور ہر ایک فنکار) اسی وقت مصنف ہوتا ہے جب وہ اپنے تجربات کی ترسیل کے لیے کوئی ذریعۂ اظہار اختیار کرے اور یہ ذریعہ اس وقت تک بیکار و بے معنی ہے جب تک یہ فن کار اور قاری، ناظریاں مع کے درمیان ترسیل و ابلاغ کا فرض انجام نہ دے۔ یہ سب کچھ کہنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ قاری (تصنیف کے معاملے

میں ایک بڑی اہم ہستی ہے، جو مصنف کے قریب رہتی ہے جس سے مصنف مخاطب ہو کر جو کچھ اپنے دل میں ہوتا ہے اس کا اظہار کرتا ہے جو اس کی باتیں غور سے سنتی ہے پسند کرتی ہے تو مقبولیت کے پھول مصنف کے دامن میں بکھیر دیتی ہے، پسند نہیں کرتی تو اپنی ناپسندیدگی کا ذکر بھی کر دیتی ہے۔ مصنف اور قارئین زندگی کے مسئلوں پر ایک ساتھ غور کرتے ہیں۔ قارئین جو کچھ سوچتے ہیں وہ عصری تقاضوں کی صورت میں مصنف تک پہنچ جاتا ہے اور پھر جب مصنف ان تقاضوں کے زیر اثر اپنی آواز بلند کرتا ہے تو قارئین کو یہ آواز کسی دور دراز اجنبی افق سے آتی ہوئی معلوم نہیں ہوتی بلکہ وہ محسوس کرتے ہیں کہ آواز ان کے اپنے دل کی گہرائیوں سے اٹھتی ہے۔ اس لیے وہ بڑی محبت سے اس کی پذیرائی کرتے ہیں (ب) دیکھیے آواز خلا ہی میں گونجے گی تو مصنف کے حصے میں صدائے بازگشت ہی آئے گی۔ جذبات کی وہ متاع گراں بہا لے کر نہیں لوٹے گی جو ہر اس آواز کو ملتی ہے جو دلوں میں سے ہو کر آئی ہے۔ یہ درست اور بالکل درست کہ قارئین اپنے تاثرات کے اظہار کے لیے مصنف تک اپنے خیالات پہنچا سکتی ہے مگر مصنف اور اس کے قاری میں جو رشتہ قائم ہوتا ہے۔ مطالعے ہی کے ذریعے قائم ہوتا ہے اور مصنف کو معلوم ہوتا ہے کہ اس کی ذہنی کاوشوں کی کس قدر پذیرائی ہوتی ہے اور اندا و پذیرائی ہی مصنف کی مقبولیت کا پیمانہ بن جاتا ہے۔

انسانی زندگی میں مطالعے کی اہمیت

سری نیواس لاہوٹی

انسانی ذہن کی نشو و نما اس کی شخصیت، اس کے کردار و عمل کے گوشوں کو منور کرنے اس کی علمی استطاعت کو بڑھانے نیز سماجی و مذہبی، ادبی اور سیاسی معلومات کو حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ مطالعے کی عادت ڈالی جائے کیوں کہ اس عادت کا تابناک پہلو یہ ہے کہ اس سے انسانی شعور میں بالیدگی پیدا ہوتی ہے اور قوموں کی ترقی و تنزلی کے علاوہ ان عوامل سے بھی واقفیت حاصل ہوتی ہے جو قوموں کو بنانے اور بگاڑنے کا سبب بنتے ہیں۔ اس لیے زندگی میں مطالعے کا عمل مسلسل جاری رکھنا چاہیے اور اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ تمام سہولتیں مہیا ہوں جو مطالعے کے ضمن میں آتی ہیں اس اعتبار سے ہندوستان میں کتب خانوں اور دارالمطالعوں کے قیام کی تحریک ابھی تک اپنے ابتدائی دور میں ہے اور بڑی سست رفتاری سے گاؤں اور شہروں میں کتب خانوں اور دارالمطالعوں کا قیام عمل میں آ رہا ہے مگر خوشی کی بات ہے کہ اس تعلق سے عوام کا جذبۂ خیر سگالی ابھر رہا ہے اور یہ ایسا خوش آئند جذبہ ہے جس کا ہر ذی شعور انسان کو خیر مقدم کرنا چاہیے۔

میں یہ بات بتانے سے قاصر ہوں کہ ہندوستان میں سب سے پہلے کب اور کہاں کتب خانے کا قیام عمل میں آیا۔ لیکن نئی کھوج کے مطابق اس بات کو اب تسلیم کیا جا چکا ہے کہ ہمارے ملک میں دو ہزار سال قبل بھی کتب خانے پائے جاتے تھے۔ مصر میں جو تحقیقات ہوئی ہیں اس کی بنا پر آثار قدیمہ کے ماہرین نے اندازہ لگایا ہے کہ وہاں چار ہزار سال قبل بھی کتب خانوں کا وجود تھا۔ یہ صحیح ہے کہ ہمارے ملک میں ابھی تک کتب خانوں کے قیام کی تحریک عہد طفولیت میں ہے اس کی بڑی وجہ تعلیم کی کمی ہے اور جب تک تعلیم کی توسیع عمل میں نہ آئے کتب خانوں کے قیام کی تحریک کو تقویت حاصل نہیں ہو سکتی۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہم اپنی معاشی اور سیاسی جدوجہد کے ساتھ ساتھ تہذیبی زندگی کو بھی سنوارنے کی کوشش کریں اور اس جدوجہد کو کتب خانوں اور دارالمطالعوں کے قیام کی تحریک کا ایک جز بنائیں تو ان کی ترقی میں جو رکاوٹیں حائل ہیں انھیں بھی دور کیا جا سکتا ہے۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ کتب خانے انسانی زندگی کو سنوارنے کے لیے مکتب کا کام

دیتے ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ مدرسے میں استاد کو ایک ڈاکٹر کی طرح سے کونین جیسی کڑوی دوا پلانے کا حق پہنچتا ہے لیکن کتب خانے میں شریک ہونے والا ہر طالب علم خود اپنے لیے نسخہ تجویز کرتا ہے اور ظاہر ہے کہ جب انسان خود کے لیے دوا تجویز کرتا ہے تو اس میں شربت کی بھی آمیزش ضرور کر لیتا ہے تاکہ دوا آسانی کے ساتھ حلق سے اتر سکے۔ مدرسہ یا مکتب ایک خاص اور معینہ مدت تک لوگوں کے لیے مفید ثابت ہوتے ہیں لیکن دارالمطالعے اور کتب خانے ہوش سنبھالنے سے لے کر قبر میں پہنچنے تک لوگوں کے دل و دماغ کو تسکین پہنچاتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ ادارے ایک انسان کا دوسرے انسان سے ربط برقرار رکھنے میں ممد و معاون ثابت ہوتے ہیں اور ان سے مستفید ہونے والا ہر شخص اس بات کو محسوس کرتا ہے کہ اس نے اپنے علم میں اضافہ کیا ہے۔ کتب خانوں کے تعلق سے ہر شخص اگر اس بات کو اپنے ذہن میں رکھے تو میں سمجھتا ہوں کہ وہ مطالعے کی افادیت سے بخوبی واقف ہو سکتا ہے۔

ہندوستان میں قومی آزادی کی جدوجہد کی تاریخ کا بغور مطالعہ کیا جائے تو ایک بات ابھر کر سامنے آئے گی اور وہ یہ کہ ہمیں آزادی کی جدوجہد اور اس کے لیے قربان ہو جانے کا جذبہ کہاں سے ملا تھا؟ ہم میں وہ شکتی اور طاقت کہاں سے آ گئی تھی جس کے سہارے ہم نے ایک بہت بڑے سامراج کا مقابلہ کیا تھا۔ میرے خیال میں ان سوالوں کا جواب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہم نے آزادی کی جدوجہد کا جذبہ ان لوگوں سے بھی حاصل کیا تھا جو ہم سے قبل آزاد ہوئے تھے یا آزادی کی جدوجہد میں مصروف عمل تھے اور بلاشبہ اس جذبے کی بنیاد اخباروں اور کتابوں کے مطالعے کو قرار دیا جا سکتا ہے۔ آزادی کے جذبات کو جگانے اور عوامی طاقت کو ابھارنے کے لیے ہمارے قائدین نے خطابت کو ذریعہ بنایا تھا۔ مگر اس خطابت کے پس منظر پر روشنی ڈالی جائے تو پتا چلے گا کہ ان قومی قائدین نے اپنے جذبہ حب وطن کو بھرپور بنانے کے لیے مارکس، لینن، ابراہم لنکن اور گیری بالڈی وغیرہ کے خیالات سے ضرور اکتساب کیا تھا اور یہ اکتساب صرف کتابوں اور اخبارات ہی کے مطالعہ کا رہین منت ہے۔ اس سے آسانی کے ساتھ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ انسان کی زندگی میں مطالعہ کی کتنی بڑی اہمیت ہے اور اس اہمیت کا اندازہ مجھے ذاتی طور پر اس وقت ہوا جب کہ قومی جدوجہد کے دوران اور اس کے بعد بھی مجھے برسوں جیل کی صعوبتیں برداشت کرنی پڑیں اور جیل کی تنہائی میں دل و دماغ کو تازہ رکھنے اور عزم کامرانی کو تقویت پہنچانے میں کتابوں اور اخبارات کے مطالعے نے بڑی مدد کی۔

اس موقع پر میں اپنی زندگی کا ایک واقعہ تحریر کروں گا جس سے میرے بیان کی صداقت کا پڑھنے والوں کو اندازہ ہو سکے گا۔

مجھے ۱۹۴۹ء کے اوائل میں تقریباً تین سال کے لیے جیل جانا پڑا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ تلنگانہ کے عوام ایک مسلح جدوجہد میں مصروف تھے اور اس جدوجہد کی قیادت کمیونسٹ پارٹی کر رہی تھی میری گرفتاری ایک کمیونسٹ کارکن کے ناطے عمل میں آئی تھی۔ اس لیے کافی ذہنی اور جسمانی اذیتیں پہنچائی گئیں۔ ذہنی اذیتوں میں میرے لیے سب سے بڑی اذیت یہ تھی کہ مجھے تقریباً سات ماہ تک قید تنہائی میں رکھا گیا اور سوائے صفائی کرنے والے اور نگران کار کے علاوہ اس تنگ وتاریک گنجی (کمرے) میں کوئی نہیں آ سکتا تھا۔ اور اس پر یہ ستم بھی ڈھایا گیا کہ پڑھنے کے لیے کوئی چیز بھی نہیں دی جانے لگی۔ حکامان جیل اس امر سے بخوبی واقف تھے کہ مجھے سب سے بڑی اذیت کتابیں اور اخبارات فراہم نہ کر کے پہنچائی جاسکتی ہے اور انھوں نے اس پر عمل کیا۔ ان ساتھ ماہ میں میری حالت اس دیوانے کی سی ہوگئی تھی جسے کسی ذہنی بیماری کے بغیر پاگل خانے میں شریک کر دیا گیا ہو۔ میں ساتھ ماہ تک مسلسل خاموش رہا اور ہر صبح وشام یہ سوچتا تھا کہ شاید میں پڑھنا بھول جاؤں گا۔ میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا اور اسی ذہنی کرب واضطراب کے عالم میں میں نے ایک دن تصفیہ کیا کہ کتابیں اور اخبارات کے حاصل کرنے کے لیے بھوک ہڑتال کرنی چاہیے۔ اپنے اس فیصلے کی اطلاع میں نے سپاہی کے ذریعہ مہتمم جیل کے پاس بھجوادی کہ اگر مجھے چوبیس گھنٹوں کے اندر اخبارات اور کتابیں پڑھنے کو نہیں ملیں گی تو میں بھوک ہڑتال کروں گا اور میری یہ بھوک ہڑتال اس وقت تک جاری رہے گی جب تک مجھے مطالعے کی سہولتیں فراہم نہ کی جائیں۔ پہلے پہل تو میری یہ دھمکی کارگر ثابت نہیں ہوئی اور صبح سے شام تک کسی نے بھی آ کر دریافت نہیں کیا کہ میں بھوک ہڑتال کیوں کر رہا ہوں۔ بات یہ تھی کہ میری اس اطلاع کے بعد جیل والوں نے اپنے جاسوسوں کے ذریعے یہ تحقیقات شروع کی کہ میں اکیلا ہی بھوک ہڑتال کروں گا تو حکامان جیل نے اس کی کوئی پروا نہیں کی مگر میرا ارادہ اپنی جگہ مصمم تھا۔

چوبیس گھنٹے گزرنے کے بعد جب صبح کا کھانا میری گنجی (قید تنہائی کا کمرہ) میں لایا گیا تو میں نے کھانا لینے سے انکار کر دیا۔ لیکن جب جوان کھانا رکھ کر جانے لگا تو میں نے کھانے کے برتن گنجی سے باہر پھینک دیے جس کی وجہ سے جوان کے کپڑے خراب ہو گئے۔ اس نے جیل کے داروغہ سے اس بات کی شکایت کی اور وہ اپنی تحقیقات مکمل کرنے کے لیے گنجی میں آ دھمکا۔ میں نے اس سے بات کرنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ جب تک مہتمم جیل نہیں آئیں کے میں کسی سے بھی بات نہیں کروں گا۔ بات آئی گئی ہوگئی۔ شام کو پھر کھانا لایا گیا۔ اس پر میں نے کہا کہ میں بھوک ہڑتال پر ہوں۔ اس لیے مجھے کھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ خاموشی کے ساتھ کھانا واپس لے کر چلا گیا۔ بھوک ہڑتال کی اس پہلی رات میں نے کسی طرح اپنے ساتھی وی ۔ ڈی۔

ویشپانڈے (سابق اپوزیشن لیڈر حیدرآباد اسمبلی) سے ربط پیدا کرنے میں کامیاب ہو گیا جو میرے ہی قریب کی ایک گنجی میں رکھے گئے تھے۔ انھوں نے بتلایا کہ اس سے قبل وہ بھی بھوک ہڑتال کی دھمکی دے چکے ہیں۔ جس کی بنا پر انھیں اخبار ملنے لگا ہے۔ کامریڈ ویشپانڈے کے اس امید افزا پیام سے ہمت بندھی اور میں بھی سوچنے لگا کہ مجھے بھی اپنے مقصد میں کامیابی حاصل ہو گی۔ اتفاق کی بات ہے کہ میری بھوک ہڑتال کے تیسرے دن ناظم جیل معائنے کے لیے آنے والے تھے اور حکامان جیل چاہتے تھے کہ انھیں میری گنجی میں نہ لایا جائے لیکن مجھے اس کی اطلاع مل گئی تھی اور میں منتظر تھا کہ اگر وہ گنجی کے سامنے سے گزریں گے تو میں نعرہ لگاؤں گا تاکہ میرے پکار ان تک پہنچ سکے۔ ہوا بھی یہی اور مجھے نعرہ لگانا پڑا جس کی بنا پر ناظم جیل نے گنجی میں قدم رنجہ فرمایا میں نے ساری حقیقت ان کے سامنے رکھ دی اور کہا کہ میرے اس معمولی سے مطالبے کو بھی پورا نہیں کیا گیا تو اس کے جو نتائج ہوں گے ان کی ذمہ داری آپ پر ہو گی۔ اسی روز شام سے مجھے اخبار ملنے لگا مگر کتابوں کا مطالبہ پورا نہیں ہوا اور جب اس کے لیے اصرار کیا گیا تو پہلے مجھے جالنہ اور بعد میں بیڑ جیل بھجوا دیا گیا۔

میرے اس نجی واقعہ کو دہرانے کی وجہ یہ ہے کہ جس شام مجھے اخبار ملا میں اتنا خوش ہوا کہ اس خوشی کو میں زندگی کی اہم مسرتوں میں سے ایک سمجھتا ہوں۔ اس کے بعد دو سال کی نظر بندی جس طرح کٹی اس میں مجھے بہت کم احساس ہوا کہ میں جیل میں ہوں۔ اس کی بڑی وجہ میرے مطالعے کا شوق ہے۔ انسان میں جب مطالعے کا ذوق پیدا ہو جاتا ہے تو وہ بہت سی ذہنی الجھنوں میں مبتلا ہونے سے بچ جاتا ہے۔ اس بظاہر طویل اور نجی داستان کے ذکر کا صرف یہ مقصد ہے کہ تنہائی میں بھی کتابیں ایک اچھے ساتھی اور مددگار کا کام دیتی ہیں۔ بشرطیکہ ہم مطالعے کا شوق اور ذوق رکھتے ہوں۔

ہمارے دیش میں ابھی تک کتب خانوں کی تحریک بہت کمزور ہے حالانکہ قوانین مدون ہو چکے ہیں لیکن دوسری چیزوں کی طرح یہ تحریک بھی دفتر شاہی کا شکار بنتی جا رہی ہے۔ اس لیے مطالعے کا ذوق رکھنے والوں کا فرض ہے کہ وہ اس تحریک کو آگے بڑھاءیں تاکہ انسانی شعور میں بالیدگی پیدا ہو اور اس تحریک کو قوت نمو حاصل ہو سکے۔ یہاں یہ سوال بھی میں پڑھنے والوں کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں کہ آج کل ہمارے دیش میں جاسوسی اور جنسی ادب کا بڑا چلن ہو گیا ہے جس کی وجہ سے نئی نسل اس گھٹیا ادب کی جانب مائل نظر آتی ہے۔ اور سماجی زندگی پر اس کے برے اثرات مرتب ہونے لگے ہیں۔ اس لیے مطالعہ کا شوق اور ذوق رکھنے والوں کا فرض ہے کہ وہ ایسے فحش اور جاسوسی ادب کا بھی بائیکاٹ کریں تاکہ وہ نئی نسل کی بہتر خدمت انجام دے سکیں۔

ملک کے عوام میں تعلیم کو عام کرنے کے لیے اب تک جن ذرائع کا استعمال کیا گیا ہے ان میں کتب خانوں کے قیام کی تحریک کو اوّلیت حاصل ہونی چاہیے۔ کیوں کہ درسی تعلیم کے خاطر خواہ نتائج اسی وقت برآمد ہو سکیں گے جبکہ دوسرے ترقی یافتہ ممالک کی طرح سے ہمارے ملک میں بھی کتب خانوں کو Continuation of School کا درجہ دیا جائے۔ اس سلسلے میں ایمرسن کا قول بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ

''بسا اوقات ایک اچھی کتاب کا مطالعہ انسان ان کے مستقبل کو سنوار دیتا ہے۔''

خاص طور پر ہر مذہب کی بنیادی کتابوں ہی کو لیجیے جن کی وجہ سے انسانیت کو سنوارنے میں بڑی مدد ملی ہے۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ ہمارے ملک میں کتب خانوں نے خاطر خواہ ترقی نہیں کی ہے۔ جس کی وجہ سے مطالعے کا ذوق محدود ہو گیا ہے۔ اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ کتب خانوں کے قیام کی تحریک کو وسعت دی جائے۔ جس کی کہ وہ مستحق ہے۔ دوسرے ملکوں کے عوام زیادہ تربیت یافتہ اس لیے ہیں کہ وہاں ہر گاؤں اور قصبے میں کتب خانے اور دارالمطالعے ملیں گے۔ تعلیم بالغاں کے سلسلے میں تو ان کی بہت زیادہ اہمیت ہے۔ وہ حضرات جنھیں ترقی یافتہ ممالک اور خاص طور پر یورپی ممالک کے سفر کا موقع ملا ہے وہ میرے اس بیان کی تصدیق کریں گے کہ ان ممالک میں مطالعے گھر تہذیب کا بہت بڑا مرکز مانے جاتے ہیں اور وہاں پر معاشی، معاشرتی اور سیاسی مسائل پر بڑے بڑے مباحث انھیں مطالعہ گھروں کے زیر اہتمام منعقد ہوا کرتے ہیں............ میں بھی اپنے اس مضمون کو اس امید پر ختم کرتا ہوں کہ ہمارے ملک میں بھی قومی اور تہذیبی جلسے کتب خانوں کے زیر اہتمام منعقد ہوا کریں گے تا کہ عوام کو نئی بیداری کا پیام مل سکے اور وہ علم کے ان مندروں کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ لگا سکیں۔

ابتدائی صدیوں میں کتابوں کی تجارت

ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی

آخر علم وفن کا فروغ کتابوں کے سہولت سے فراہم ہونے پر بھی موقوف ہے اور اس کا بیان ہمیں ان علما وفضلا کے تراجم میں جستہ جستہ ملتا ہے جن میں بعض اوقات بہت ہی دلچسپ واقعات ملتے ہیں کہ مسلمانوں نے کتاب کی کتابت وترتیب وتجلید و کاغذ کے انتخاب وغیرہ میں خاص ذوق سلیم کا ثبوت دیا ہے۔ چنانچہ ذیل میں مختصر طور پر کتابوں کے لین دین کو بیان کیا جاتا ہے جس سے معلوم ہوگا کہ بڑے سے بڑے مصنفین اور مؤلفین اس میں حصہ لیتے تھے۔ علم پروری اور ہنر شناسی کے ضمن میں یہ بحث بھی بہت اہم تھی۔

عام طور پر ہم مسلمان مصنفین کے علمی کارناموں کو نہایت فخر سے پیش کر کے بتاتے ہیں کہ فلاں مصنف کی تصنیفات بیشمار جلدوں میں ہیں۔ اور ان کے نسخے اس زمانے میں امراء اور دیگر شائقین و مصنفین تک بھی پہنچ گئے تھے۔ اس صورت میں یہ باور کرنا پڑتا ہے کہ کاغذ کی فراہمی اور ان کتب کو تیار کر کے دیگر لوگوں کے ہاتھوں تک پہنچانے کے وسائل بھی ضرور مہیا تھے اور لوگ باخبر تھے کہ ان کی کہاں کہاں منڈیاں تھیں ورنہ اس کے بغیر کام نہیں چل سکتا تھا۔ اس مختصر مقالہ میں محض کتابوں کی تجارت کو ابتدا سے لے کر آٹھویں نویں صدی ہجری تک محدود کر کے چند واقعات کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے۔ ویسے ہمیں مربوط اور مبسوط صورت میں کوئی تحریر نہیں ملتی جسے اس نقطۂ نگاہ سے جمع کیا گیا ہو۔

یہ ایک واضح بات ہے کہ عرب میں کاغذ نہیں تھا۔ لوگ کھال یا پتوں وغیرہ پر تحریریں ثبت کر لیتے تھے۔ مگر جب مسلمانوں نے اپنی فتوحات کا دائرہ وسیع کیا اور وسط ایشیا میں سمرقند فتح ہوا۔ تو وہاں کے قیدیوں میں چند چینی بھی تھے۔ جن میں سے بعض کاغذ سازی کے ماہر تھے۔ انہوں نے بغداد میں مسلمانوں کو کاغذ بنانا سکھایا۔ جس سے آہستہ آہستہ کاغذ کی فراہمی شروع ہوئی اور اسی طرح وہ سامان بھی مہیا ہونا شروع ہو گیا جو تحریر وغیرہ کے لیے ضروری تھا۔ اس کے لیے عام طور پر مسلمانوں نے ''وراقت'' کا لفظ استعمال کیا ہے۔ جو آج ہمارے ہاں لفظ ''سٹیشنری'' سے مراد لیا جاتا ہے۔

ندازہ کیجیے کہ کیسے باکمال لوگ دوسری تیسری صدی ہجری میں تصنیف وتالیف اوران کی نشر واشاعت میں مصروف تھے۔ظاہر ہے کہ ایسے مسودات کی تیاری وفراہمی کے لیے کاغذ ودیگر وسائل کی موجودگی ضروری تھی۔ بہرحال ہمیں اس زمانے میں ایک عالم کتب فروش کا پتہ چلتا ہے جس کا نام اور لقب تھا ''الفرج محمد بن اسحاق الندیم''۔

عام طور پر وہ ابن ندیم کے نام سے اور صاحب ''کتاب الفرست'' کی حیثیت سے زیادہ مشہور ہے۔ وہ بغداد کا باشندہ تھا۔حسن اتفاق سے آج اس کی شہرۂ آفاق کتاب مطبوعہ صورت میں میسر ہے۔ یہ کتاب جرمنی کے ایک مقام لیپرک میں ۱۸۷۲ء میں زیرادارت فاضل فلوگل طبع ہوئی تھی۔ جب کہ یہ پیرس کے مخطوطہ تک محدود تھی۔مگر بعد میں مصریوں نے اسے ۱۳۴۸ھ (۱۹۲۹ء) میں بعد کے دریافت شدہ دیگر مخطوطوں کی مدد سے کسی قدر اضافوں کے ساتھ طبع کیا۔ ابن ندیم کو عام طور پر سوانح نگاروں نے وراق یعنی کتب فروش لکھا ہے۔جس کی دکان بغداد کے دارالروم میں بیعۃ کے پیچھے تھی۔ جہاں عام طور پر رومی لوگ رہتے تھے۔ یہ شخص ۲۹۷ ہجری میں پیدا ہوا۔ اور ۳۸۵ھ میں وفات پائی۔بعض لوگوں نے لفظ ''وراق'' سے کاتب کے معنی لیے ہیں۔ بہرحال یہ ایک حقیقت ہے کہ وہ کتابوں کا کاروبار کرتا تھا۔آخر اس نے ۳۷۷ھ میں ان تمام کتابوں کی جو اس کے قبضہ میں تھیں یا اس کے ہاتھوں سے دوسروں تک پہنچ چکی تھیں ایک یادداشت بطور فہرست تیار کی جو آج کتاب الفہرست کہلاتی ہے۔

اس مطبوعہ فہرست پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ آج یورپ کے کتب فروشوں نے جو طریقہ اپنی مطبوعات کی فہرستوں کو مرتب کرنے کا اختیار کر رکھا ہے۔ وہ براہ راست اسی الفہرست ابن ندیم کا چربہ ہے۔ جو ہزار سال سے بھی زیادہ پرانی ہے اور وہ فہرست بغداد کی ایک دکان سے شائع ہوئی تھی جبکہ نہ پریس تھا اور نہ کاغذ کی فراوانی تھی۔ نہ کاتبوں کو سہولتیں میسر تھیں اور نہ سٹیشنری کے سامان کی افراط تھی۔ ابن ندیم نے اس فہرست میں مصنفین کے مختصر حالات مضامین کے تحت عنوان قائم کر کے ان کی کتب کا ذکر کیا ہے۔اس کے علاوہ ان کی خاص خاص خوبیوں کو بھی بیان کر دیا ہے۔اس فہرست میں اس اطلاع کو محض اس وقت تک کی کتب یا محض مسلمان مصنفین عرب تک محدود نہیں رکھا بلکہ چین، ہندوستان، روم اور ایران وغیرہ تک کی متداول کتب اور ان کے مصنفین کا ذکر بھی کر دیا ہے۔ ہم ہندوستان کے متعلق یہ دیکھ کر حیران ہوتے ہیں کہ جہاں مذاہب پر کتابوں کا ذکر آیا ہے وہاں ابن ندیم نے اہل ہند کے ''مواضع العبادات'' کا بھی ذکر کیا ہے۔خاص کر بدھ مت کی کتابوں اور ان کے مصنفین کا ذکر جو آج ہم بدھ مت کی کتابوں سے بھی حاصل نہیں کر سکتے۔

الفہرست ابن ندیم میں وصف نغات الامم من العرب والعجم سے ابتدا کر کے خط اور اس کے اقسام تک گنا کر قرآن کریم تک بحث کر دی ہے۔یعنی قدیم اور معاصر قرآن کریم کے لکھنے والوں پر اور قرآن کریم مطلا و مذہب کرنے والوں پر۔اس کے علاوہ اس زمانے کے مصنفین اور شائقین کتب میں ایک رابطہ تھا اور کتب فروش گاہک اور اس کے رجحان طبیعت کا جو علم ہوتا ہے وہ اس کتاب سے واضح ہے۔ ہم یہ دیکھ کر حیران ہو جاتے ہیں کہ شعبہ قرآن پر کیا کیا تصانیف ہوئیں۔اور پھر یونانی طب اور موسیقی پر کیا کچھ تصنیف ہوا اور کون کون ماہر موسیقی تھے۔ بت پرستوں اور غیر مسلموں کے عقائد کی کتب کیا کیا تھیں۔غرض یہ فہرست بجائے خود ایک انسائیکلو پیڈیا کا حکم رکھتی ہے۔ یورپ میں جو آج انڈکس کا سسٹم ہے وہ بھی ایسی ہی کتب اسلامی سے لیا گیا ہے۔اور کوئی شعبہ نظر نہیں آتا جس پر کوئی کتاب تصنیف نہ ہوئی ہو۔اس مطبوعہ فہرست کے سوا پانچ سو صفحات کی تعداد سے کہیں زیادہ علوم وفنون اور ان کے مصنفین کا ذکر بھی آ گیا ہے۔فہرست بغداد کے اس عہد کی چوتھی صدی کی پیداوار ہے جب کہ عباسیوں کا طوطی بول رہا تھا۔اور جن کی علمی سرگرمیاں اور فیاضیاں آج بھی ضرب المثل ہیں۔

یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ کتابوں کی تجارت نے عہد اسلامی میں ایک خاص اہمیت اور شہرت اختیار کر لی تھی۔اور کتابوں کی دکانیں ہر بڑے شہر میں قائم تھیں۔اور وہیں ان کے لیے کاغذ بنانے کے کارخانے بھی تھے۔ یعقوبی نے اپنی کتاب البلدان میں لکھا ہے کہ تیسری صدی ہجری میں محض بغداد میں تین سو دکانیں کتابوں کی تھیں اور مقریزی نے اپنی کتاب ''الخطط والآ ثار مصر'' میں لکھا ہے کہ مصر کتابوں کی بہت بڑی منڈی تھا اور خطیب بغدادی نے اپنی مشہور تاریخ بغداد میں لکھا ہے کہ چوتھی صدی ہجری میں بغداد میں کتابوں کی تجارت بہت زوروں پر تھی اور تمام دکانیں کتابوں سے بھری ہوئی تھیں۔جن سے ظاہر ہے کہ وہ تمام عنوانات اور مضامین پر مشتمل تھیں۔ بلکہ ان کتب کے گہرے مطالعہ سے یہ بھی واضح ہوگا کہ کتابوں کی دکانیں عام طور پر مساجد کے قرب و جوار میں ہوتی تھیں اور کتب فروش کتابوں کے پشتوں پر ان کے ناموں کی نشاندہی کر دیتے تھے تا کہ تلاش کے وقت سہولت ہو۔

کتابوں کی فروخت عام بازار میں جا کر خریدنے کے علاوہ نجی طور پر بھی ہوتی تھی بلکہ اس کے علاوہ بذریعہ نیلام بھی ہوتی تھی۔ جو آدمی یہ کام کرتا تھا اسے منادی کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا تھا اور اکثر کتابوں کے تاجر بڑے بڑے فضلا وادباء علماء بھی ہوتے تھے۔جیسا کہ ابن ندیم کے سلسلے میں بیان ہو چکا ہے۔یعنی یہ لوگ علم سے معرا نہیں ہوتے تھے۔ کیوں کہ کتابوں کی تجارت عام طور پر بہت اہم عمل اور ذمہ داری کا کام تصور کیا جاتا تھا۔ان میں قابل ذکر ابوالقاسم سہل بن محمد السجستانی

(۲۵۰) یاقوت حموی متوفی (۶۲۶) وغیرہ ہیں جن کی کتابیں آج ہمارے لیے صرف چراغ ہدایت کا کام ہی نہیں دیتی بلکہ آج اسلامی تاریخ اور ادب وثقافت کے بے مثل علمی کارنامے بھی شمار ہوتی ہیں۔

بعض لوگ اپنی کتابوں کی نکاسی کے لیے ایجنٹ بھی مقرر کرتے تھے جن کو عام طور پر ''دلال الکتب'' کہتے تھے۔ وہ کتابوں کو مہیا کرنے کے بعد خود ہی پہنچا بھی آتے تھے۔ جیسا کہ مشہور شاعر خضیری متوفی ۵۸۶ھ کے ذکر میں ملتا ہے۔ جس کا نام اپنے اصلی نام کے علاوہ ''دلال الکتب'' بھی مشہور تھا۔ اسی طرح ایک اور دلال ابو جبہ بن صورۃ متوفی ۶۰۷ھ مصر میں تھا جو کتابیں پھیلا کر اپنے گھر کی چوکھٹ پر بیٹھ جاتا تھا اور فضلاء وعلماء کے ہاں اکثر پیر اور منگل کے روز کتابیں خریدنے آتے تھے۔ جیسا کہ ابن خلکان نے ذکر کیا ہے۔

یہ ایک مزید دلچسپی پیدا کرنے والا امر ہے کہ بعض نابینا عالم لوگ بھی کتابوں کا لین دین کر کے اپنا گزارہ کرتے تھے۔ جیسا کہ مشہور حبلی فاضل احمد بن زین الدین الاصدی نابینا ٹھویں صدی ہجری میں کتابوں کی تجارت کرتا تھا اور وہ ہر کتاب کی قیمت جو اس کے ہاں ہوتی تھی اس سے خوب واقف ہوتا تھا۔ کیوں کہ خود جب کوئی کتاب خریدتا تھا وہ کاغذ کا ایک کنڈل بنا کر ابجد کے حروف کے مطابق نشان کر کے کتاب کے اندر چسپاں کر دیتا تھا۔ پھر اس پر کاغذ کا ایک خول چڑھا دیتا تھا تاکہ وہ نشان ابھرا رہے۔ جس پر اپنا ہاتھ پھیر کر وہ آسانی سے قیمت بتا دیا کرتا تھا۔ ایک اور نابینا فاضل احمد بن سروالسمستری متوفی ۷۵۱ھ جو بڑے پایہ کا محدث تھا اپنے زمانے میں کتابوں کی قیمتیں بتانے اور ان کی جانچ پڑتال میں بہت ماہر تصور کیا جاتا تھا۔ ایک اور شافعی عالم شفیع بن علی الکہانی نابینا مصر کا شاعر اور ادیب ھتا۔ جس کا انتقال ۷۳۰ھ میں ہوا تھا۔ یہ شخص نابینا ہونے کے باوجود کتابوں کی قیمتیں بتانے میں ماہر تصور کیا جاتا تھا۔ کتاب کو ہاتھ میں لے کر اس کی کیفیت بتا دیتا تھا بلکہ اس سے اندازہ کر کے یہ بھی بتا دیتا تھا کہ کس پچھلی تاریخ کو خریدی گئی تھی۔ اسی طرح بعض کتابوں کی تجارت کرنے والوں کی بیویاں بھی ان کی غیر حاضری میں کتابوں کے کاروبار میں حصہ لیتی تھیں۔ کیوں کہ وہ ان کی قیمتوں سے آگاہ ہوتی تھیں۔ چنانچہ اس متذکرہ نابینا شخص شافع شفیع کی بیوی ہر کتاب کی قیمت سے پوری طرح واقفیت رکھتی تھی بلکہ یہ عورت اپنے شوہر کی وفات کے بعد عسرت کے زمانہ میں پرانی کتب کو برابر فروخت کرتی رہی کیوں کہ مرحوم نے اپنے بعد اٹھارہ مختلف مجامع کتب کا ترکہ چھوڑا تھا۔

جوں جوں کاغذ کی فراوانی ہوتی گئی کتابوں کی قیمتوں میں بھی کمی ہوتی گئی۔ ابن درید کی مشہور کتاب حمیرۃ الانساب پانچویں صدی میں ایک مرتبہ ساٹھ دینار یعنی قریب چار سو پچیس

روپیہ میں فروخت ہوئی۔ اسی طرح طبری کی مشہور تاریخ یک صد دینار یعنی سات سو روپیہ میں فروخت ہوئی۔ ایک اموی شاعر جرید کا دیوان دس دینار میں بکا جو آج ۷۵ روپیہ کے برابر ہوں گے۔ ایک سر بند خلیل بن احمد کی مشہور تصنیف کتاب العین جسے ایک کتب فروش خراسان سے بصرہ منڈی میں لایا تھا پچاس دینار یعنی تین سو پچاس روپیہ میں فروخت ہوئی بعض محققین نے اندازہ لگایا ہے کہ بغداد میں خلفائے بنو عباسیہ کے زمانہ میں کتاب کی اوسط قیمت ایک دینار تھا۔ اگرچہ بعض اوقات قیمتی کتب کم داموں پر بھی میسر آجاتی تھیں۔ ابن سینا کے ذکر میں بیان کیا جاتا ہے کہ ارسطو کی الہٰیات کو اس نے چالیس مرتبہ پڑھا اور آخر حفظ کر لیا تاہم وہ اسے پوری طرح سمجھ نہیں سکا۔ ایک شام وہ کتب فروشوں کی منڈی میں گیا جب کہ ایک منادی کرنے والا کتاب کا نیلام بول رہا تھا۔ اس نے ابن سینا سے درخواست کی کہ آپ اسے خرید لیجیے۔ مگر اس نے انکار کر دیا۔ یہ خیال کرتے ہوئے کہ اب یہ بے سود ہے۔ منادی نے پھر ترغیب دی کہ خرید لو یہ بالکل سستی ہے۔ کوئی قیمت ہی نہیں ہے یعنی تین درہم (ہمارے ایک روپیہ ۲ آنے کے برابر) کتاب کا مالک نقدی کی اشد ضرورت میں تھا۔ آخر کار کتاب خرید لی گئی اور خریدار کی خوشی کی انتہا نہ رہی جب اس کے ہمراہ فارابی کی شرح ارسطو کی الہٰیات کری بھی تھی۔ جس نے اس کے تمام شکوک اور مشکلات کا ازالہ کر دیا۔ ابن سینا نے شکرانہ میں غربا کو کھانا کھلایا۔ کہ اسے ایسا بیش بہا خزانہ مل گیا ہے۔

کتابوں کی منافع بخش تجارت کو خلفائے عباسیہ کے زمانہ میں بہت فروغ ہوا۔ اور یہ تجارت محض پیشہ ور تاجروں تک ہی محدود نہ تھی۔ لیکن علماء وفضلاء اکثر اوقات ان کتابوں کی خاطر جو ان کے پاس نہ ہوتی تھیں اپنی موجودہ کتابوں سے تبادلہ بھی کر لیتے تھے۔ اور بعض اوقات اپنے پریشان کن حالات کے تحت ان کو فروخت بھی کر دیتے تھے۔ جس کی بہترین مثال ابو حاتم السجستانی متوفی ۲۵۰ھ کی ہے۔ جس کے ہاں بہت بڑا ذخیرہ کتب کا تھا اور وہ خود بھی تجارت کرتا تھا۔ یہ وہ شخص ہے جس کا ذکر نسائی نے اپنی سنن میں اور البنرازنے اپنی مسند میں کیا ہے۔ اور یعقوب الشیرازی الفیروزآبادی مشہور مصنف قاموس متوفی ۸۱۶ھ جس کے متعلق مشہور ہے کہ اس نے کئی اونٹوں کے بوجھ کی کتابیں جمع کی تھیں اور ہمیشہ ان کو سفر وحضر میں ہمراہ رکھتا تھا۔ وہ عسرت کی حالت میں اپنی کتابیں فروخت کر دیتا تھا۔ یاقوت حموی نے ارشاد میں ابن حمدون ۶۰۸ھ کے متعلق نہایت دردناک واقعہ نقل کیا ہے کہ وہ کتابوں کا بہت بڑا عاشق تھا۔ اس نے ایک تعداد کثیر پچاس سال کے عرصہ میں جمع کی تھی۔ جب اسے سرکاری ملازمت سے علیحدہ کر دیا گیا۔ تو اس کی حالت مزید پریشان ہوگئی۔ یاقوت بیان کرتا ہے کہ اس نے اس کو بغداد کے بازار میں آبدیدہ ہو کر اور دل خراش حالت میں اپنی کتابیں بیچتے دیکھا۔ جیسا کہ کوئی

اپنے محبوب کو اپنے سینے سے جدا کر رہا ہو۔

ابن ندیم نے خود لفظ ''وراق'' استعمال کرتے ہوئے ملوک (بادشاہوں) کُتّاب اور خطبا کے حالات کے تحت بہت سے لوگوں اور ان کی صحبت کا ذکر کیا ہے۔ جن میں سے الفتح بن خاقان کے ذکر کے تحت لکھا ہے کہ وراقین کی دکانوں سے جو کتابیں ملتی تھیں ان میں اس مصنف کی ایک کتاب البستان جو اسی کی طرف منسوب تھی، وہ بھی ملتی تھی۔ بلکہ اسی مقام پر اس نے وراق سے کاتب کا مفہوم لے کر بیان کیا ہے کہ مسندی بن علی، اسحاق موصلی مغنی المامون والرشید کا وراق تھا جو اس کے گیت یا گانے یا غزلیات لکھا کرتا تھا اور منافع خاص پیدا کرنے کی غرض سے اس نے اسحاق موصلی کے نام سے غزلیات کا ایک خاص مجموعہ تیار کر کے گراں رقم پر فروخت کر دیا تھا اور اس طرح بعض تاریخی دستاویزوں اور سکوں کو بھی تیار کر کے فروخت کر دیا کرتے تھے بلکہ بعض اوقات کتابیں خریدنے میں بھی مطلب کی کتابوں کے اوراق کھینچ لیا کرتے تھے۔

بعض اوقات علما بھی اپنی خاص خاص کتب کو عجیب وغریب طریق سے فروخت کر دیا کرتے تھے۔ چنانچہ بغداد کے کتب فروش ابن الخنسر ار و ابوبکر اکنتر ی، قاضی بغداد ابوحسن الخراسانی لصیرافی کے متعلق بیان کرتے ہیں کہ جب کبھی اسے اپنی غربت کی وجہ سے کوئی ضرورت پیش آئی تو وہ اپنی بعض نایاب کتب کو اپنے تلامذہ سے نقل کروا کر بیچ دیتا تھا اور ہر نقل کے اخیر میں یہ لکھ دیتا تھا کہ اس نے خود اس کا مقابلہ اصل سے کرلیا ہے اور اس کی اس کے مطابق تصحیح کر دی گئی ہے۔ اس سے اس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ ایسا کرنے سے زیادہ رقم وصول ہو گی۔ اس مختصر کیفیت فراہمی کتب کے بعد ہمیں یہ بھی مدنظر رکھنا چاہیے ان کو تیار کرنے کے لیے خطاط، نقاش، جلد ساز، صحاف بھی کے اسلامی فنون میں شمار ہوتے تھے جو ان کتب کو تیار کرتے تھے۔ جن کے حالات بہت ہی دلچسپ ہیں۔ سب سے بڑھ کر ان میں قرآن کریم کے لکھنے والوں نے وہ وہ اختراعات وانواع خط ایجاد کی ہیں کہ آج دنیا میں خط کی انواع ثقافت اسلامی میں خاص حیثیت رکھتی ہیں۔ اس موضوع پر ایک الگ مقالہ چاہیے یعنی ہم دیکھتے ہیں خط کوفی، نسخ، رقاع، بدیع، تعلیق، نستعلیق، شکستہ، خاص کر قابل ذکر ہیں۔

بلوچستان میں کتاب کلچر

عابد میر

کہتے ہیں پانی کی قدر پیاسے سے پوچھئے۔ سو اس قاعدے سے کتاب کی قدر کتاب کو ترسے ہوئے بلوچستان سے پوچھئے۔ چٹیل میدانوں اور خشک پہاڑوں والا، چرواہوں اور خانہ بدوشوں کا دیس جہاں تحریری علم کی عمر ابھی ایک صدی کی نہ ہو، جہاں باضابطہ کتابوں کی اشاعت کو ابھی سو سال بھی نہ ہوئے ہوں، وہاں کتاب گویا کسی خزانے سے کم نہیں۔ اور ہم اس خزانے کے کیسے متلاشی رہے ہیں، آیئے پہلے اس بابت دو روایتیں سن لیں۔

گل خان نصیر ہمارے اولین تاریخ دان اور بلوچی کے ملک الشعرا رہے ہیں۔ بلوچ تاریخ پر ان کی کتاب 'تاریخِ بلوچستان' اب تک کا مستند حوالہ ہے۔ کتاب کے دوسرے ایڈیشن کے پیش لفظ میں وہ بتاتے ہیں کہ جن دنوں وہ بلوچستان کے وزیر تعلیم تھے، کوئی صاحب ان سے ملنے آئے۔ تعارف کروایا کہ نوشکی (گل خان نصیر کا آبائی شہر) کے کسی دیہات سے آئے ہیں اور ان کی کتاب 'تاریخِ بلوچستان' پڑھنا چاہتے ہیں۔ گل خان نصیر نے انہیں چائے پلائی اور کتاب کا ایک نسخہ دے کر اپنے کام میں لگ گئے۔ لکھتے ہیں کہ میں گھنٹوں بعد فارغ ہو کر دفتر سے نکلنے لگا تو دیکھا کہ وہ صاحب دفتر کے باہر بنچ پر بیٹھے کتاب پڑھ رہے ہیں۔ مجھے دیکھ کر کھڑے ہو گئے اور کتاب لوٹاتے ہوئے کہا، ''کتاب خریدنے کی سکت نہ تھی، پڑھنے کی چاہ تھی، اس لیے آپ سے مستعار لینے کو آیا، نصف پڑھ لی ہے، بقیہ پڑھنے پھر کبھی آ جاؤں گا۔''

دوسری روایت بھی ہمارے ایک اور نابغہ روزگار عبدالرحمان غوؔر سے متعلق ہے۔ یہ صاحب ۱۹۵۰ء کی دہائی میں اردو شعر و ادب کی تخلیق کے ساتھ ساتھ اس کی اشاعت بھی کر رہے تھے، جب بلوچستان میں کتابیں پڑھنے والے شاید پچاس لوگ بھی شاید میسر نہ تھے۔ کہا جاتا ہے کہ معروف اس قدر تھے کہ کہیں سے گزرتے تو لوگ ایک دوسرے سے کہتے کہ وہ دیکھو غوؔر صاحب جا رہے ہیں۔ روایت ہے کہ ایک بار کتابوں کی ایک دکان میں گھسے۔ ایک کتاب کا معلوم کیا۔ کتاب ملی، کھول کر قیمت دیکھنے کے بعد کتاب بند کر کے دونوں آنکھوں سے لگایا، چوم کر وہیں رکھ دی اور وہاں سے نکل آئے۔

یہ روایات عرض کرنے کا مقصد یہ تھا کہ باوجود ہماری تنگ دستی کے، ہمارے خطے میں کتاب دوستی کی چاہ کا اندازہ لگایا جا سکے۔ بلوچستان میں یوں تو پہلا پریس سن تیس کی دہائی میں عبدالصمد خان اچکزئی نے لگایا جہاں سے وہ اپنا اخبار 'استقلال' چھاپتے رہے۔ البتہ کتابوں کی اشاعت وترسیل کو لگایا جانے والا پہلا پریس بھی اسی دہائی کے اواخر میں پنجاب سے یہاں منتقل ہونے والے ایک فرزندِ بلوچستان زمرد حسین نے لگایا۔ قلات پبلشرز کے نام سے پہلے مستونگ اور پھر کوئٹہ منتقل ہونے والا یہ پریس چالیس سے لے کر ساٹھ کی دہائی تک ہمارے خطے میں مقامی لکھاریوں کی کتابوں کی اشاعت وترسیل کا واحد ذریعہ رہا۔ ساٹھ کی دہائی کے وسط میں عابد بخاری نے گوشہ ادب کے نام سے ایک مطبع لگا لیا، اس روایت کو پھر منصور بخاری آگے لے کر چلے جو آج بھی بلوچستان میں کتاب دوستی کا نمایاں نام ہیں۔

ساٹھ اور ستر کی دہائی میں بلوچی اکیڈمی، براہوی اکیڈمی اور پشتو اکیڈمی وجود میں آئیں، جنہیں بعدازاں سالانہ سرکاری امداد ملنے کے بعد ادبی وسماجی موضوعات پہ اشاعت کا ایک نیا سلسلہ شروع ہوا۔ لیکن اس کے باوجود بیسویں صدی میں شروع ہونے والا کتابوں کی اشاعت، ترویج اور مطالعے کا سفر نہایت سست رو رہا۔ بلوچستان کے ادیب، شاعر اپنی تصانیف کی اشاعت کے لیے طباعتی اداروں کے رہینِ منت رہے (یہ صورت حال آج بھی موجود ہے)، البتہ اکیسویں صدی کے ابتدائی برسوں میں سماجی وسیاسی سطح پر ہونے والی اتھل پتھل نے، نیز آبادی کے بدلتے تناسب نے کتابوں کی اشاعت اور قرأت دونوں سطح پر ایک نئے تناظر کو جنم دیا۔ بطور قاری، لکھاری وناشر اس کا مختصر جائزہ پیش ہے۔

پاکستان میں جہاں پبلشر عام طور یہ رونا روتے نظر آتے ہیں کہ کتاب کا قاری ختم ہو گیا، اب کوئی کتاب نہیں پڑھتا، کتاب کو تو اب کوئی پوچھتا ہی نہیں، (گو کہ بلوچستان میں بھی مارکیٹ پبلشر یہی دہائی دیتا ملے گا) لیکن گزشتہ ایک دہائی کے دوران بلوچستان بھر میں نئے پبلشرز سامنے آئے، درجنوں بک شاپس کا آغاز ہوا۔ خصوصاً ایسے لوگوں نے کتابوں کی اشاعت کا آغاز کیا جنہوں نے اسے منافع بخش کاروبار کی بجائے مشن کے بطور اپنایا۔ کوئٹہ شہر میں گزشتہ دس برس کے دوران ادبی کتابوں کی کم از کم درجن بھر نئی بک شاپس کھلی ہیں۔ ان میں ایک وہ دکان بھی ہے جو آرمڈ شاپ سے بک شاپ میں تبدیل ہوئی۔ کوئٹہ کے بعد مکران کتاب دوستی کا دوسرا بڑا مرکز بنا۔

ہم نے ۲۰۱۱ء میں 'مہر در' کے نام سے ایک اشاعتی سلسلے کا آغاز کیا تو مارکیٹ کا کوئی تجربہ نہ تھا۔ ہم نے کوئٹہ سمیت اندرونِ بلوچستان کتاب میلوں کا سلسلہ شروع کیا۔ یہ ایک بالکل نیا رجحان تھا، جو جلد ہی ایک ٹرینڈ بن گیا۔ تربت، گوادر، نوشکی، خاران، پٹ فیڈر، ٹی پُل، صحبت پور،

جھٹ پٹ، جعفرآباد جہاں لوگ جانے سے کتراتے تھے، وہاں ہم کتابیں لے کر پہنچے اور نصف قیمت پران کی فراہمی کا اعلان کیا۔ یہ وہاں کے عوام کے لیے بھی ایک نئی چیز تھی۔ لوگوں نے جوتوں کی سیل سنی تھی، کھانے پینے کی اشیا پہ سیل سنی تھی، کتابوں کی بھی کوئی سیل ہوتی ہے، یہ ایک انوکھی بات تھی۔ کوئٹہ کے علاوہ بلوچستان کے دیگر شہروں میں اس طرح کے کتاب میلوں کا کوئی رواج نہیں رہا۔

۲۰۱۲ء میں ہم نے جب پہلی بار تربت میں کتاب میلہ لگایا تو صبح گیارہ بجے تک کوئی نہ آیا۔ یہ دیکھ کر ہمارے میزبان، ہمارا دل بہلانے کو کھسیانا ہو کر پوچھنے لگے، ''ویسے آپ لوگوں کو کتنے پرسنٹ امید ہے کہ لوگ آپ کی اس کاوش کی حوصلہ افزائی کریں گے۔'' میں نے یک دم کہا،''زیرو پرسنٹ۔'' میزبان کی حیرت پہ میں نے وضاحت کی کہ یہ ایک نیا مشن ہے، لوگوں کو ابھی تو اسے سمجھنا ہے، ہم نے سمجھانا ہے، فی الوقت تو مقصد ایک پیغام پہنچانا ہے، اپنے لوگوں کو کتاب پڑھنے اور خریدنے کی طرف مائل کرنا ہے۔ یوں اِس سے کچھ انہیں بھی حوصلہ ہوا۔ البتہ بعد میں شام تک لوگوں کی قطاریں لگ گئیں اور ہمیں ایک روزہ میلے کو دوسرے دن بھی جاری رکھنا پڑا، بلکہ اگلے سال تین روزہ رکھنا پڑا، جس میں ایک دن طالبات اور خواتین کے لیے مختص کیا گیا۔ ۲۰۱۴ء میں گوادر میں کتاب میلہ ادبی سرگرمیوں کے ساتھ ہوا۔ اس کے بعد وہاں سی پیک وغیرہ کا غلغلہ اٹھا تو گوادر کو ایک امتیازی حیثیت حاصل ہوگئی۔ وہاں کے میزبانوں نے اس ایونٹ کو اون کر لیا۔ اب یہ ہر سال کی اولین سہہ ماہی میں تسلسل سے چار روزہ تقریبات کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ اُردو کے نامی گرامی ادیب اس میں شرکت کرتے ہیں۔

ان کتاب میلوں اور اشاعت کے آٹھ سالہ تجربے میں ہم نے یہ بھی دیکھا کہ بلوچستان میں کتاب پڑھنے والوں کی اکثریت نوجوانوں پر مشتمل ہے۔ یہ نوجوان بالخصوص سیاسی ادب کی طرف زیادہ مائل ہیں۔ عالمی ادب کے تراجم شوق سے پڑھتے ہیں۔ مجموعی طور پر مزاحمتی اور زندگی آمیز ادب کی طرف اُن کی چاہ زیادہ ہے۔ شاعری بہت ہی کم پڑھی جاتی ہے اور مذہبی ادب کا قاری تو نہ ہونے کے برابر ہے۔ ترقی پسند افکار خواہ ادبی ہوں کہ سیاسی، بلوچستان کے قاری میں آج بھی مقبول ہیں۔ گوکہ اب لوگ جدید رجحانات کا بھی شوق سے مطالعہ کر رہے ہیں، لیکن بلوچستان میں آج بھی سب سے زیادہ پڑھی جانے والی اور بکنے والی کتابیں ترقی پسند افکار و ادب ہی سے ہیں۔ گوکہ اسی عہد میں بلوچستان میں کتابوں کی دکانوں اور طلبا کے ہاسٹل پر چھاپے بھی پڑے اور وہاں سے 'ریاست مخالف' مواد کی دستیابی کے دعوے بھی ہوئے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ تربت میں پڑنے والے ایسے ہی ایک چھاپے کے نتیجے میں جو مواد برآمد کرنے والے اداروں نے پریس کانفرنس کر کے میڈیا کو دکھایا، اس میں نوے فیصد لاہور اور کراچی سے شائع ہونے والی

مارکسی ادب کی وہ کتابیں تھیں جو ملک بھر کے بک اسٹال پہ عام دستیاب ہیں۔ البتہ بلوچی کتابوں پہ سختی زیادہ آئی۔ کچھ پبلشرز لاپتہ ہوئے، کچھ دکان داروں کو ڈرایا دھمکایا گیا، کوئی گرفتار ہوا۔ جس کے نتیجے میں مکران بھر میں بلوچی کتابوں کی مارکیٹ کو سخت نقصان پہنچا۔ اکثر دکان دار اب بھی بلوچی کتابیں رکھنے سے کتراتے ہیں۔ شاعری کی کتابیں البتہ اس 'خطرناک مواد' کی ذیل میں نہیں آتیں۔ باوجود اس کے یہ دلچسپ قصہ بھی سن لیں کہ بلوچی کا آج کا سب سے بڑا شاعر، پسنی کا مبارک قاضی آج بھی وسیع پیمانے پر پڑھا جاتا ہے۔ اس کی کوئی کتاب دو ہزار سے کم تعداد میں نہیں چھپتی۔ اور کوئی ایک کتاب ایسی نہیں جس کے ایک سے زیادہ ایڈیشن شائع نہ ہوئے ہوں۔ یہ وہی مبارک قاضی ہیں جن کا اکلوتا بیٹا ایم بی بی ایس کرنے کے بعد مزاحمتی تحریک میں شامل ہوا، اور نظریاتی اختلاف کے معاملے پر اپنے ہی ساتھیوں کے ہاتھوں جان گنوا بیٹھا۔ (بلوچستان، درد کا دوسرا نام ہے بھائی!)۔

اسی دوران ایک رجحان بلوچستان میں لائبریریوں کا پروان چڑھا۔ واضح رہے کہ بلوچستان میں باضابطہ سرکاری لائبریریوں کا کوئی اہتمام نہیں۔ ماسوائے کوئٹہ کے بلوچستان بھر میں محض ایک درجن پبلک لائبریریاں ہیں، جن کی حالتِ زار ویسے ہی خستہ ہے، جیسے سرکاری اداروں کی ہوتی ہے۔ سرکار پہ تکیہ کرنے کی بجائے عوام نے خود لائبریری کلچر کو فروغ دینا شروع کیا۔ بلوچستان کے نمایاں شہروں کے علاوہ چھوٹے چھوٹے قصبوں اور دیہات میں پڑھے لکھے نوجوانوں نے لائبریریاں قائم کرنا شروع کیں۔ کہیں کسی پرائیویٹ سکول میں، کہیں کسی ادارے کے حال میں تو کہیں کسی نے اپنے گھر کا ایک کمرہ (بیٹھک/ڈرائنگ روم) اس کے لیے مختص کر دیا۔ ان لائبریریوں کے لیے کتابوں کی فراہمی کے لیے انہوں نے نیم سرکاری اور نوآموز پبلشنگ اداروں سے رابطہ کیا، جنہوں نے بطور مشن یہ کام سنبھالا تھا۔ اس سلسلے میں بلوچی اکیڈمی اپنے وسائل سے گزشتہ پانچ برسوں کے دوران بلوچستان بھر میں تین سو سے زائد ایسی لائبریریوں کو کتابیں فراہم کر چکی ہے۔ سنگت اکیڈمی اور مہر در نے بساط بھر یہی کام کیا۔

سال ۲۰۱۵ء میں جب بلوچی کے ملک الشعرا گل خان نصیر کا صد سالہ جشنِ ولادت منایا جا رہا تھا، کوئٹہ سے ادیبوں کا ایک وفد ان کے آبائی شہر نوشکی ایک تقریب میں تشریف لے گیا۔ وہاں اس وفد نے ۱۹۹۸ء سے قائم گل خان نصیر کے نام پر قائم پبلک لائبریری کا دورہ بھی کیا۔ نوجوان پڑھنے والوں کی کثیر تعداد مگر کتابوں کی قلت اور ادارے کی خستہ حالی دیکھ کر انہوں نے طے کیا کہ اگلے دو ماہ میں لائبریری کو ایک ہزار کتابوں کی فراہمی ممکن بنائی جائے گی۔ اس وفد کی سربراہی کرنے والے بلوچستان کے معروف دانش ور ڈاکٹر شاہ محمد مری نے واپسی پر اپنے سوشل میڈیا وسائل کے ذریعے یہ

اعلان کیا اور احباب سے شخصی طور پر معاونت کی درخواست کی۔ بلوچستان سمیت پاکستان بھر سے لوگوں نے ایک سے لے کر سو کتابوں تک کا تحفہ بھجوایا۔ یوں ایک ماہ کے اندر نوشکی لائبریری کو ایک ہزار کتابیں پہنچا دی گئیں۔ عطیہ کی جانے والی مزید ساڑھے تین سو کتابیں شیرانی کے ایک چھوٹے سے قصبے میں قائم سائیں کمال خان شیرانی لائبریری کو عطیہ کر دی گئیں۔

کتاب دوستی کی اس روایت میں بلوچستان کا مارکیٹ پبلشر بھی پیچھے نہیں رہتا۔ بلوچستان کے دو بڑے مارکیٹ پبلشر قلات پبلشرز اور گوشہ ادب (سیلز اینڈ سروسز) بلوچستان میں کتاب دوستی کو رواج دینے کی ایک زبردست روایت رکھتے ہیں۔ قلات پبلشرز کے مالک زمرد حسین، میر غوث بخش بزنجو اور گل خان نصیر کے ساتھی رہے۔ ان کے لائق فرزند نذر حسین زمرد ان کی وراثت کو آج بھی سنبھالے ہوئے ہیں۔ کوئٹہ پریس کلب کے عین مقابل واقع قلات پبلشرز کی چھوٹی سی دکان آج بھی کوئٹہ کے اکثر ادیبوں کا ٹھکانہ ہے۔ ماضی میں اسے لاہور کے پاک ٹی ہاؤس کا سا درجہ حاصل رہا ہے۔ یہاں آپ کتاب خریدیں نہ خریدیں، قہوہ کی ایک پیالی آپ کو ضرور پیش ہوگی۔

اسی طرح گوشہ ادب ایک زمانے میں پاکستان کے نامور ادیبوں کا ٹھکانہ رہا۔ فیضؔ، فرازؔ، جالبؔ کوئٹہ میں ہوں تو لازماً یہاں پائے جاتے۔ اس کے مالک منصور بخاری ادیبوں سے ذاتی قربت بھی رکھتے ہیں۔ ان کے بک لیٹ پہ نوجوان قارئین کو کتاب کی طرف مائل کرنے کے کئی واقعات کے ہم عینی شاہد ہیں۔ یہ شاید واحد کتاب فروش ہیں جو کتاب چوری کے حق میں ہیں۔ وہ کہتے ہیں، نوجوان کتاب چرا کر پڑھے گا ہی ناں، تو اس سے کچھ نہ کچھ تو حاصل ہوگا اسے۔ ایسا بھی ہوا کہ پانچ سو کی کتاب انہوں نے طالب علم کو محض سو روپے میں یہ کہہ کر دے دی کہ 'لے جاؤ بیٹا، تمہارا حق ہے، ہم کہیں اور سے یہ منافع کما لیں گے۔' کتاب چوری کی حوصلہ افزائی کے ضمن میں وہ خود ایک دلچسپ واقعہ بتاتے ہیں کہ ایک بار انہیں ڈاک کے ذریعے ایک بلینک چیک موصول ہوا۔ ساتھ میں ایک مختصر پرچی میں درج تھا کہ 'میں کچھ سال پہلے جب طالب علم تھا تو آپ کی دکان سے کئی کتابیں چوری کر کے پڑھیں، آج سرکاری افسر بن چکا ہوں، یہ بلینک چیک حاضر ہے، جو رقم مناسب سمجھیں، لکھ لیں۔' بخاری صاحب نے یہ چیک سنبھال کر رکھ لیا اور ان کا کاروبار سنبھالنے والے نوجوان فرزند کو سونپ دیا، تاکہ وہ اس روایت کو نہ بھولیں اور اس کے تسلسل کو قائم رکھ پائیں۔

یہ بلوچستان میں کتاب کلچر کے ماضی قریب کا حال تھا۔ اس کی موجودہ صورت حال اور مستقبل کے متعلق آیئے آخر میں پھر دو روایتیں سن لیتے ہیں۔

کوئی آٹھ دس برس پہلے کا واقعہ ہے۔ ایک نوجوان بلوچستان کے عظیم دانش ور عبداللہ جان جمالدینی کے فرزند جیئند خان جمالدینی کی خدمت میں بسلسلہ روزگار حاضر ہوا۔ جیئند خان

بلوچستان یونیورسٹی میں ٹریژرار ہیں۔ انہوں نے اسے مشورہ دیا کہ سرکاری نوکری پہ تکیہ کرنے کی بجائے کوئی اور کام سوچے۔ اس مشورے پہ فوری تدبیر یہ سوجھی کہ بازار سے جا کر ہر ہفتے رعایتی نرخوں پر کتابیں لایا کرے، یہاں جتنے جان پہچان کے پڑھنے لکھنے والے دوست احباب ہیں ان سے گزارش کی جائے گی کہ پوری قیمت پہ کتاب خرید لیں۔ کتابوں کی فراہمی کے لیے منصور بخاری صاحب سے گزارش کی گئی۔ انہوں نے نصف قیمت پر نوجوان کو کتابیں دینے کی حامی بھر لی۔ دو چار برس یہ نوجوان اسی تگ ودو میں رہا۔ لائبریری وغیرہ کے آرڈر بھی ملنے لگے۔ اس نوجوان کا نام عیسیٰ خان رند ہے۔ اب یہ گزشتہ چار برس سے بلوچستان یونیورسٹی میں اپنی بک شاپ چلا رہا ہے، جو کوئٹہ میں شاید سب سے بڑی کاؤنٹر سیل رکھتی ہے۔

دوسرا واقعہ دلچسپ ہے؛ گوادر سے چند کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ساحلی علاقہ ہے پشوکان۔ یہی کوئی دس، پندرہ ہزار آبادی کا قصبہ ہوگا۔ اس کے اردگرد اسی طرح کے چھوٹے موٹے قصبے واقع ہیں۔ یہاں ایک نوجوان خود کتابیں پڑھنے کا شائق ہے۔ اسی شوق میں اُس نے ایک چھوٹی سی بک شاپ بنالی۔ یہ کراچی کے پبلشرز سے کتابیں منگواتا ہے۔ ان کی گٹھڑی بنا کر قصبوں میں نکل جاتا ہے۔ خصوصاً تعلیمی اداروں میں جا کر وہاں کتابوں کی تبلیغ کرتا ہے۔ مہینوں کے ادھار پہ کتابیں دے کر چلا آتا ہے اور پھر ہر ماہ جا کر وصولی کر لیتا ہے۔ ایک زمانے میں دیہات میں اکثر ایک پٹھان کپڑوں کے تھان لیے سائیکل یا موٹر سائیکل پہ آتا تھا اور چھ چھ مہینے کے ادھار پہ کپڑے دے کر جاتا تھا۔ شہروں کی آمدورفت کو ترسے ہوئے دیہاتیوں کے لیے یہ بڑی نعمت تھی۔ (بلوچستان کے کئی علاقوں میں اب بھی یہ رواج موجود ہے)۔ لیکن یہ سننا کیسا دلچسپ ہے کہ کوئی شخص ایسے ہی کتابوں کی گٹھڑیاں اٹھائے قریہ قریہ جاتا ہو اور کئی کئی ماہ کے ادھار پہ کتابیں بیچتا ہو......اور کوئی آخرت سنوارنے والے مذہبی صحیفے بھی نہیں بلکہ جدید ادبی وسماجی موضوعات سے بھری ہوئی کتابیں۔ خصوصاً عالمی ادب کے تراجم اور پروگریسو لٹریچر۔

بلوچی کا نوجوان قاری اور لکھاری، پشوکان کا شبیر شاکر جو فریضہ سرانجام دے رہا ہے، وہ اس بات کا اعلان ہے کہ بلوچستان میں کتاب کلچر کی روایت کتابوں کی دکانوں اور طلبا کے ہاسٹل پر چھاپوں کے باوجود مدہم نہیں پڑی۔ یہ اعلانیہ ہے کہ کہساروں میں خاموشی کی کوئی رسم نہیں، یہاں رات سو بھی جائے تو بہتا ہوا چشمہ گنگناتا رہے گا۔

کہساروں کی عطا رسم نہیں خاموشی
رات سو جائے تو بہتا ہوا چشمہ بولے
(عطا شاد)

بلوچستان میں کتابوں پر چھاپے: 'روشنی سے ڈرتے ہو!'

عابد میر

شیخ ایاز نے کہا تھا حرف اُس خنجر کی مانند ہے، جو جابر کے سینے میں جا اترتا ہے، یہ ہر آمر کی آنکھ میں کھٹکنے والا کانٹا ہے، اسی لیے دنیا کے سبھی جابر و آمر حرف ایجاد کرنے اور تحریر کرنے والوں سے ڈرتے ہیں۔ اس عہدِ بے توقیری میں لیکن جس طرح ہم نے ہر پُر وقار چیز کو بے وقار ہوتے دیکھا، حرف کی حرمت کو لٹتے بھی دیکھا، بکتے بھی دیکھا۔ ایک عرصے سے لگتا یوں ہے کہ 'حرف گیری' اب لکھنے والوں کی قلبی راحت کا سامان ہو تو ہو، باقی سماج میں اس کی اثر پذیری تو گویا اب خواب ہوئی۔ جابروں کے سینے میں خنجر بن کے اترنے اور آمروں کی آنکھ میں کانٹے کی طرح کھٹکنے والے نہ الفاظ رہے، نہ ان کے تحریر کرنے والے۔ الفاظ کی بے حرمتی کا یہ عالم ہوا کہ اب تو خونِ دل سے لکھے گئے حرف بھی کہیں قابلِ مطالعہ نہ رہے۔ بھئی جب لکھنے والے قلم کان میں رکھے سرکار دربار میں قصیدہ خوانی پہ معمور ہوں تو حرف بھلا اثر انگیز ہوں بھی تو کیوں کر۔ ہم نے حرف کی بے توقیری کی تو الفاظ نے احتجاجاً اپنے معنی و مفہوم ہی بدل دیے۔ سبھی متبرک و پاکیزہ الفاظ کے حقیقی معنی، اب چراغِ رخِ زیبا لے کر ڈھونڈیے تو بھی نہ ملیں۔

بھلا ہو لیکن بلوچستان میں امن و امان قائم کرنے کے نام پر معمور امن و امان کو تہہ تیغ کرنے والے ریاستی اداروں کا جنھوں نے تربت کالج میں چھاپہ مار کر 'خطرناک الفاظ' سے بھری کتابیں برآمد کر کے ہمارے متزلزل ایمان کو سہارا بخشا، اور ایک عرصے بعد ہمیں یقین آیا کہ جابروں کے سینے میں خنجر بن کر اترنے اور آمروں کی آنکھ میں کانٹا بن کر کھٹکنے والے الفاظ ابھی زندہ ہیں، ان کی تاثیر ابھی باقی ہے۔ وگرنہ روز ردی کے حساب سے بے فیض تحریریں لکھنے والے ہم ایسے بے ہنر اپنے اس یکتا ہنر سے متعلق سماج کے طنز و تشنیع اور تحقیر آمیز رویے سے کب کے بے زار آئے ہوئے تھے۔ اپنے الفاظ کو مسلسل بے اثر دیکھ کر مخالفین کے، 'لکھنے سے کیا فرق پڑتا ہے؟ بھلا تحریروں سے آج تک کوئی سماج بدلا ہے؟ اتنے لوگ اتنا کچھ لکھ رہے ہیں، آج تک کیا فرق پڑا ہے؟' ...... جیسے اور دیگر الزامات بلاجواز نہ لگتے تھے۔ قلم و حرف آشنائی دینے والے اساتذہ کی

دلیلیں کہ 'پانی بھی پتھر پہ مسلسل برستا رہے تو اس میں دراڑ ڈال دیتا ہے'، اور 'قلم تلوار سے تیز ہے' جیسی روایتی باتیں روکھی پھیکی لگنے لگی تھیں۔ سچ پوچھیے تو عطا شاد ڈگری کالج کے ہاسٹل میں طلبہ کے کمروں میں چھاپے کے دوران 'خطرناک کتابوں' کی برآمدگی نے ہم ایسے 'قلم مزدوروں' کے حوصلے بڑھا دیے ہیں۔ پس ثابت ہوا کہ حرف اثر رکھتے ہیں، الفاظ آج بھی خنجر بن کے کسی جابر کے سینے میں اترنے کی قوت رکھتے ہیں، کتابیں آج بھی 'ملک توڑنے' کی صلاحیت رکھتی ہیں!

اب اس بات کو رہنے دیں کہ جو 'خطرناک مواد' برآمد کیا گیا ہے، اس میں سے نوے فیصد وہ کتابیں ہیں جو پاکستان میں کسی بھی صاحبِ ذوق کے نجی کتب خانے سے لے کر پاکستان کی ہر پبلک و گورنمنٹ لائبریری میں موجود ہیں، ہر بک شاپ پہ سرِعام بک رہی ہیں۔ باقی دس فیصد دراصل وہ 'خطرناک مواد' ہے جس کے پڑھنے سے بچے باغی ہو سکتے ہیں، ملک دشمن بن سکتے ہیں، ملک توڑنے کے اہل ہو سکتے ہیں۔ یہ دنیا کا واحد ایٹمی ملک ہوگا، جس کے 'بانیان' و پاسبان کو یہ خدشہ ہے کہ خطرناک مواد کی حامل چند کتابیں اسے توڑ سکتی ہیں۔

ابھی کچھ برس اُدھر، اپنے ظریفانہ انداز کے لیے مشہور نواب رئیسانی کی حکومت نے اپنے قیام کے ابتدائی ایام میں ہی ڈاکٹر نصیر دشتی کی مرتب کردہ دو انگریزی کتابوں پر یہ کہہ کر پابندی عائد کر دی کہ ان میں ایسا ملک دشمن مواد پایا جاتا ہے جس سے انتشار اور فساد پھیلنے کا خدشہ ہے۔ اس میں دلچسپ امر یہ کہ ان کتابوں میں شامل انگریزی مضامین جن اردو کتابوں سے ترجمہ کیے گئے، وہ مارکیٹ میں موجود رہیں اور بکتی رہیں، انہیں کسی نے نہ پوچھا۔ اس سے کہیں زیادہ سخت مواد کی حامل دیگر کتب چھپتی اور بکتی رہیں، ان پہ سرکار کی 'نظرِ کرم' نہ پڑی۔

ڈاکٹر نصیر دشتی نے اُن دنوں نوجوان صحافی ملک سراج اکبر کو اس بابت دیے گئے انٹرویو میں ایک سوال کے جواب میں مسکراتے ہوئے خوب کہا کہ 'جس ملک کو دو کتابوں سے ٹوٹنے کا خطرہ ہو، اسے دنیا کی کوئی طاقت متحد نہیں رکھ سکتی۔' یہ خوب صورت بات بھی اسی صحافی دوست نے حال ہی میں اپنے تازہ بلاگ میں لکھی کہ نوجوان اکثر مجھ سے پوچھتے ہیں کہ کس قسم کی کتابیں پڑھنی چاہئیں تو میں ان سے کہتا ہوں کہ ایسی کتابیں پڑھنے کی کوشش کرو، جن پہ کسی نہ کسی عہد میں پابندی لگائی گئی ہو، کیوں کہ یقیناً ان میں یا ایسی باتیں لکھی ہیں، جو طاقت ور قوتیں آپ سے چھپانا چاہتی ہیں۔

سو، صاحب سوال تو بنتا ہے کہ آخر ان کتابوں میں ایسی کون سی بات تھی جو انہیں 'خطرناک' بناتی ہے؟ ریاست مخالف مواد کی تعریف کون متعین کرے گا؟ اس سے بھی کہیں زیادہ اہم سوال یہ کہ ریاستیں، ریاست مخالف مواد لکھنے یا پڑھنے والوں کے خاتمے پر تو یقین رکھتی ہیں،

آخر یہ کھوج کیوں نہیں لگاتیں کہ لوگ ریاست مخالف ہوتے کیوں ہیں؟ لکھنے والے، ریاست مخالف مواد کیوں تخلیق کرنے لگتے ہیں، چلیے 'شارٹ کٹ' مارتے ہوئے مان لیا کہ انہیں اس 'مزدوری' کا 'معاوضہ' ملتا ہے، لیکن پڑھنے والے آخر اپنی جیب سے پیسے خرچ کر کے ایسے 'خطرناک' مواد کو کیوں پڑھتے ہیں، جب کہ انہیں معلوم ہو کہ ایسے 'تخریبی' مواد کی برآمدگی ان کی موت کا سامان بھی ہوسکتی ہے؟ بغاوت میں آخر ایسا کیا ہے کہ یہ آدم کو اچھی بھلی جنت سے بے دخلی پہ مجبور کر دیتی ہے؟! اس واقعہ نے پاکستان میں عمومی سطح پر پھیلائی گئی ایک اور غلط فہمی کا پول بھی کھول دیا کہ 'بلوچ پڑھتے نہیں'۔ آئندہ اس الزام کو یوں بدل دیا جائے کہ 'بلوچ وہ نہیں پڑھتے، جو ہم انہیں پڑھانا چاہتے ہیں'۔ جب کہ سادہ سی اتنی بات یہ ہے جناب کہ بلوچ کچھ بھی 'تھوپا' ہوا قبول نہیں کرتا۔ جبراً تو یہ عقیدہ بھی قبول نہیں کرتا، نصاب کیا خاک کرے گا۔ اور اگر دوست بن کر اس کے ساتھ احترام سے پیش آئیں تو یہ آپ کے لیے دن کو رات بھی قبول کر لے، تن کے کپڑوں کے سوا اپنا سب کچھ آپ کو دان کر دے۔

بلوچ نوجوانوں کو اور ان کی ماؤں کو بھی بدھائی ہو کہ مدہوش کر دینے والی جوانی میں ان کے کمروں سے نہ چرس برآمد ہوئی نہ افیون، نہ تاش کے پتے نکلے نہ شراب کی بوتلیں، نہ تصویرِ بُتاں نہ حسینوں کے خطوط...... نکلی بھی تو کتابیں نکلیں۔ کتابیں جو علم کا ماخذ ہیں، جو شعور کی سیڑھی ہیں، جو آگہی کا راستہ ہیں۔ کتابیں، جو آدمی کو انساں بناتی ہیں، جو انسانوں کا معاشرہ بناتی ہیں، جو معاشرے کو انسانوں کے رہنے کے قابل بناتی ہیں۔ کتابیں، جو خیر لاتی ہیں، نیکی سکھاتی ہیں، روشنی پھیلاتی ہیں............ اور روشنی سے، سوائے تاریکی کے بھلا اور کون ڈرتا ہے!!

(مارچ ۲۰۱۴ء میں ڈگری کالج تربت کے ہاسٹل پر اچھاپہ مار کر طلبا کو گرفتار کیا گیا اور وہاں سے برآمد ہونے والی کتابوں کو 'ریاست مخالف مواد' کے بطور پیش کیا گیا۔ یہ مضمون اسی واقعہ پر لکھا گیا)

مکمل کتب خانے میں صرف دو صفحات کم ہیں!

رضا علی عابدی

تصور کیجئے۔ ایک شخص کے ذاتی کتب خانے میں پچیس ہزار نادر کتابیں موجود ہیں لیکن ایک کتاب کے آخری دو یا تین صفحات نہیں ہیں۔ یہ دو یا تین صفحات پانے کے لئے وہ دنیا بھر کے کتب خانوں کو کھنگال رہا ہے مگر ابھی تک ناکامی ہوئی ہے۔ کسی جستجو سے والہانہ لگاو؟ ہو تو ایسا ہو۔ ان صاحب کا نام محمد موسیٰ ہے اور کسی بڑے شہر کے عظیم الشان بنگلے میں نہیں بلکہ صوابی کے قصبہ ٹوپی کے قریب دریائے سندھ کے کنارے ایک چھوٹے سے گاو؟ں زروبی میں رہتے ہیں۔ تیس سال سے اردو کی قدیم اور جدید کتابیں جمع کر رہے ہیں جن کی تعداد پورے یقین سے نہیں، اندازاً بتاتے ہیں: بیس، پچیس ہزار۔ ہماری سائنس اس ای میل کو سلامت رکھے۔ پچھلے دنوں مجھے محمد موسیٰ صاحب کی ای میل ملی جس میں انہوں نے لکھا تھا کہ الطاف حسین حالی کی کتاب تریاق مسموم میرے پاس ہے لیکن اس کے آخری دو یا تین صفحات غائب ہیں۔ اگر آپ لندن کے کتب خانوں میں موجود اس کتاب کے آخری صفحے حاصل کرنے میں میری مدد کر دیں تو ممنون ہوں گا۔

مجھے تریاق مسموم کا سراغ نہ ملا۔ یہ خبر سنانے کے لئے میں نے محمد موسیٰ صاحب کو فون کیا اور پھر جو باتیں چھڑیں تو دیر تک اور دور تک چلیں۔ ان کی عمر اب چون برس کے قریب ہے۔ سنہ اٹھاسی میں ان کے اعلیٰ معیاری کتابیں جمع کرنے کے شوق نے سر ابھارا۔ انہوں نے فٹ پاتھ سے لے کر بڑے کتاب گھروں تک، جہاں سے بھی ملیں یہ کتابیں جمع کرنی شروع کیں۔ اب حال یہ ہے کہ دنیا بھر میں اردو کے ریسرچ اسکالران سے رابطے میں ہیں۔ محمد موسیٰ انہیں مطلوبہ کتابوں کے عکس یا اسکین کر کے پی ڈی ایف فائل بنا کر کمپیوٹر سے بھیجتے رہتے ہیں اور یہ سلسلہ یوں جاری ہے کہ جس وقت میں ان سے بات کر رہا تھا، ہندوستان سے کتابوں کے چار پارسل پہنچنے والے تھے۔ کہنے لگے کہ میں چاہتا ہوں کتاب زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچے۔ میں نے کہا کہ کتابوں کے اس تبادلے پر بھاری رقم اٹھتی ہوگی، بتانے لگے کہ اہل علم باقاعدگی سے ادائیگی کرتے رہتے ہیں۔ میں نے کچھ خاص خاص کتابوں کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے حالنامہ بایزید کا نام لیا جو سات سو صفحوں کی

کتاب ہے اور نایاب ہے۔ اسی طرح ڈپٹی نذیر احمد کی متنازع کتاب 'امہات الامۃ' کا ذکر کیا جو مشتعل مجمع نے ان کی آنکھوں کے سامنے جلا ڈالی اور سنا ہے کہ وہ روتے رہے۔ بتانے لگے کہ بعد میں یہی کتاب عظیم بیگ چغتائی نے شائع کی تو لوگوں نے ان پر حملہ کر دیا۔ میں نے کہا کہ ایسی کیا بات تھی اس کتاب میں؟ محمد موسیٰ صاحب کو کتاب کے کچھ اقتباس یاد تھے جو انہوں نے مجھے سنا دیئے۔ بات صرف اتنی سی تھی کہ ڈپٹی نذیر احمد کے اسلوب میں جو شوخی گھلی ہوتی تھی، اس کو ہر کوئی سراہ نہیں سکتا تھا۔ اسی طرح مولوی چراغ علی کی کتاب 'سلیمانؑ' کی بات چھڑی جس کی خوبی یہ ہے کہ کسی نبی کے بارے میں جذباتی نہیں بلکہ خالص تاریخی اور علمی کتاب ہے مگر اب نایاب ہے۔ محمد موسیٰ صاحب نے بتایا کہ ان کے ذخیرے میں سارے ہی موضوعات شامل ہیں لیکن فکشن کا بڑا کلیکشن ہے مثلاً سدرشن کو اور ان کی کہانیوں کو لوگ جانتے ہی نہیں، محمدی بیگم کو دنیا بھول گئی۔ ڈپٹی نذیر احمد پر سات سو صفحوں کی بے مثال کتاب 'حیات نذیر' اور اسی نوعیت کی بے شمار کتابیں ہیں۔ حیرت انگیز بات یہ کہ محمد موسیٰ کو اکثر کتابوں کے صرف نام ہی نہیں بلکہ دوسری تفاصیل بھی یاد ہیں۔

میں چونکہ برصغیر کے ان گنت کتب خانوں کی سیر کر چکا ہوں، اپنے تجربے کی بنا پر میں نے ان سے پوچھا کہ اس ذخیرے کو دیمک اور کیڑوں سے بچانے کا کچھ انتظام کیا ہے آپ نے۔ مثال کے طور پر انہیں فیومی گیشن چیمبر میں رکھ کر یا ان پر پلاسٹک چڑھا کر لیمی نیشن کر کے محفوظ کرنے کے بارے میں کچھ سوچا؟ اس معاملے وہ دیہاتی نکلے۔ بتانے لگے کہ ہم کتابوں میں تمباکو رکھتے ہیں جس سے یہ ابھی تک تو بالکل محفوظ ہیں۔ (پڑھنے والوں کی دل چسپی کے لئے بتاتا چلوں کہ میری کسی کتاب میں کیڑا لگا ہو تو پندرہ سیکنڈ کے لئے اسے مائیکروویو اوون میں رکھ دیتا ہوں، سارے کیڑے مکوڑے بھن کر راکھ ہو جاتے ہیں۔ ایک ماہر خاتون نے بتایا کہ کتاب کو کچھ دیر کے لئے ڈیپ فریزر میں رکھنے کے بھی بڑے فائدے ہیں)۔

میں نے پوچھا کہ کیا کبھی کوئی محقق ریسرچ کی خاطر یہاں خود آیا؟ انہوں نے بتایا کہ اب جدید طریقے رائج ہو گئے ہیں۔ کسی کو آنے کی ضرورت نہیں۔ میں لوگوں کو ان کا مطلوبہ مواد بھیجتا رہتا ہوں۔ کتاب زیادہ سے زیادہ لوگوں کے ہاتھوں میں پہنچ جائے، اس سے بڑھ کر اور کیا چاہئے۔ اس پر میں نے کہا کہ مجھے مرزا محمد ہادی رسوا کے بارے میں بڑی ہی مفصل کتاب چاہئے ہے۔ فوراً ہی بولے کہ علی گڑھ کی ڈاکٹر میمونہ بیگم انصاری مارہروی کی کتاب 'مرزا محمد ہادی کی سوانح اور ادبی کارنامے' سے بہتر کتاب نہیں۔ دو سو چورانوے صفحات ہیں (انہیں یہ بھی یاد تھا)۔ آپ کو پی ڈی ایف فائل بھیج دوں؟ پھر کچھ سوچ کر بولے کہ نہیں۔ میرے پاس دو تین نسخے ہیں۔ میرے ایک عزیز برطانیہ ایک شادی میں جانے والے ہیں۔ ان کے ہاتھ بھیج دیتا ہوں۔ آپ اطمینان

رکھیے۔

باتوں باتوں میں حیدرآباد دکن کے عبدالصمد کا ذکر آ گیا جو پیشے کے اعتبار سے موٹر میکینک تھے مگر کتابیں جمع کر کے انہوں نے شاندار ریسرچ سینٹر قائم کر دیا اور تحقیق کرنے والوں کا ہاتھ بٹانے لگے۔ان کا نام سن کر محمد موسیٰ صاحب نے سوشل میڈیا کی زبان میں مجھے 'بریکنگ نیوز' دی اور بتایا کہ آج کل 'ریختہ' والے اپنے آلات اور ساز وسامان لے کر عبدالصمد صاحب کے پاس پہنچے ہوئے ہیں اوران کی نایاب کتابوں اور خاص طور پر قدیم اردو رسالوں کو اسکین کر کے ان کو ہمیشہ کے لئے محفوظ کر رہے ہیں۔آخر میں نے دل دکھانے والا وہ سوال کیا جو میں اکثر لوگوں سے کرتا رہا ہوں۔کبھی آپ نے سوچا ہے کہ آپ کے بعد کتابوں کے اس ذخیرے کو کون سنبھالے گا؟ کہنے لگے کہ یہ فکر مجھے بہت ستاتی ہے۔میرا ایک بیٹا ہے جو ابھی چھوٹا ہے۔کئی درس گاہیں اور دوسرے ادارے پیش کش کر چکے ہیں کہ اپنا ذخیرہ ہمیں بطور عطیہ دے دیجئے، ہم اسے محفوظ کر لیں گے۔لیکن ذہن کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہا ہے۔محمد موسیٰ صاحب کی یہ بات سن کر خیال آیا کہ کتابیں جمع کرنے والے جتنے لوگوں سے میں نے یہ سوال کیا، ہر ایک نے یہی جواب دیا۔

میں تو اتنا جانتا ہوں کہ خود میں نے کتابوں کا ذاتی ذخیرہ بہاول پور کی ایک درسگاہ کو پیش کر دیا اور خود جا کر دیکھ لیا کہ میری کتابیں وہاں آرام سے رکھی ہیں چنانچہ میں بھی اب چین سے ہوں۔یہ الگ بات ہے کہ میرے گھر میں ایک نیا ذخیرہ بننا شروع ہو گیا ہے۔

آپ کو کتابوں سے اتنی محبت ہے؟

رضا علی عابدی سے گفتگو

رضا علی عابدی برصغیر پاک و ہند میں اپنی زبان کی شرینی، اندازِ گفتگو اور تحقیق و جستجو کی وجہ سے پہچانے جاتے تھے۔ آسان، سہل، سلجھی، نکھری، شستہ، کانوں کو بھلی اور دل و دماغ میں گھومنے والی اُردو بولتے، یہی لکھتے، یہی اوڑھتے، اِسی کو عام کرنے اور محفوظ رکھنے کا عزم رکھتے ہیں۔ بی بی سی لندن میں گزرے روز و شب نے انھیں ریڈیو سننے والوں کا محبوب بنا ڈالا۔ ۲۷ء سے ۶۹ ءتک وہ ہوا کے دوش پہ لفظ بولتے اور دلوں سے کھیلتے رہے۔

پھر ان کی تخلیقات شیرِ دریا، جرنیلی سڑک، کتب خانہ، ریل کہانی، جان صاحب، جہازی بھائی، جانے پہچانے، ملکہ وکٹوریہ اور منشی عبدالکریم، نغمہ گر، حضرت علیؑ کی تقریریں اور ریڈیو کے دن منظرِ عام پہ آ کر اپنا مقام بنا چکی ہیں۔ لندن میں مقیم ہیں۔ ایکسپو سینٹر کراچی میں تعارف کا مرحلہ طے ہوا تو ہم نے پوچھا ''آج کل کیا مطالعہ ہو رہا ہے؟'' ہم نے گفتگو کا آغاز کیا۔ بولے ''پڑھنے سے زیادہ ان دنوں لکھ رہا ہوں۔ نئی کتاب مکمل کر کے تین کلو کا مسودہ لاہور بھیج دیا ہے۔ جو پڑھا ہے، جی چاہتا ہے اس کا نچوڑ چھوڑ کر جاؤں۔ نئی کتاب ''کتابیں اپنے آباء کی'' کا موضوع بھی کچھ مختلف ہے۔ وہ کتابیں جو علامہ اقبال نے یورپ میں دیکھی تھیں اور ان کا دل سی پارہ ہوا تھا۔ میں نے ان کا احوال لکھا ہے۔ یعنی ۱۸۰۴ء سے جو کتابیں اُردُو میں چھپنا شروع ہوئیں ۱۸۹۹ءتک یعنی سو سال تک جو کتابیں شائع ہوئیں ان کا احوال یکجا کر دیا ہے۔ ''کتابیں اپنے آباء کی'' کا ثانوی نام بھی رکھا ہے۔ ''سو کتابوں کی ایک کتاب''۔ کتابوں کی بات جاری تھی اس لیے پوچھا۔

''اس سے پہلے بھی کتابوں پہ اور سندھ کے کتب خانوں پہ آپ نے کافی تحقیقی کام کیا تھا۔'' انھیں اپنے قیمتی کام کا ذکر اچھا لگا۔

بتانے لگے ''کتب خانہ'' میری پہلی کتاب تھی۔ اصل میں وہ ریڈیو پروگرام تھا جس میں برصغیر میں جہاں جہاں کتابوں کے ذخیرے تھے۔ ان تک پہنچا اور بتایا کہ وہ کس حال میں ہیں۔

شروع میں جو چار پانچ بڑے پروگرام کیے تھے۔ انہی کو میں نے کتاب بھی بنا دیا۔ پروگرام ہوا میں تحلیل ہو گئے مگر کتاب محفوظ ہے۔ گفتگو دلچسپ موڑ پر پہنچ چکی تھی جب میں نے پوچھا ''عابدی صاحب اب اگلا پڑاؤ کس موضوع اور کس منزل پہ ہوگا؟''

بولے ''اس کے بعد بہت دلچسپ چیز ہے۔ لوگ کبھی مختصر سا سفر کرتے ہیں تو سفر نامہ لکھتے ہیں۔ لوگ طویل قیام کرتے ہیں تو قیام نامہ کیوں نہیں لکھتے۔ میں لندن میں چالیس برس سے ہوں تو ظاہر ہے یہ میرے مشاہدے کا حصہ ہے۔ مشاہدہ تو اصل دولت ہے۔ لوگ اس دولت کو تقسیم نہیں کرتے۔ میں اپنا حاصل لوٹانا چاہتا ہوں۔ اپنے سیکھے ہوئے علم اور مشاہدے میں دوسروں کو حصہ دار بنانا چاہتا ہوں۔ میرا مشاہدہ، میرا تجربہ میری ذات تک ہی محدود نہ رہے اور کس نے پورے برصغیر کے یوں زحمت اٹھا کر سفر کیئے ہوں گے۔ میں تو مشاہدے اور تجربے کی تقسیم کے عمل کو پوری نیکی سمجھتا ہوں اور کارِ ثواب سمجھ کر کر رہا ہوں۔''

''اس کارِ ثواب کو تو کافی سال ہو گئے ہیں۔ کچھ یاد ہے کب اس کا آغاز کیا تھا؟'' میں نے نیا سوال سامنے کر دیا۔ بتانے لگے ''۲۰۰۸ء تک تو ریڈیو سے تعلق رہا اور اسی تعلق کی وجہ سے اتنے سفر کیے۔ کچھ سفر اپنے طور پر بھی کیے۔ سب سے زیادہ آنکھیں کھولنے کا وسیلہ سفر ہے، کتاب کا مطالعہ نہیں۔ قرآنی حکم ہے کہ سیرو فی الارض۔ نکل کر دنیا دیکھو۔ سب سے شاندار مشاہدہ تو دوران سفر ہی ہوتا ہے۔

''اتنے سفر، اتنے مشاہدے! زیادہ کس نے متاثر کیا؟''

''جس نے سب سے زیادہ سوچنے پر مجبور کیا۔ آج صبح بھی کسی دوست سے باتیں کرتا آرہا تھا کہ انگریز برصغیر پر جو احسان کر گئے ہیں میں اس لیے نہیں کہہ رہا کہ انگریزوں کا دیا کھا رہا ہوں۔ اس لیے کہہ رہا ہوں کہ ریل، ٹیلی فون، بجلی، تار، ڈاکخانے، نہری نظام، ہوائی اڈے سب وہ کر کے گئے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ انھوں نے چلے جانا ہے۔ وہ تو اتنا کچھ کر گئے ہم سے وہ سنبھالا بھی نہیں گیا۔ ریل ہم سے نہیں چل رہی۔ ریل کے پل مدت پوری کر کے تباہ ہونے والے ہیں۔ نئے ہم نے بنا کر نہ دیئے۔ ہندوستان والوں نے پھر بھی ریلوے کو سینے سے لگا لیا اور ساری معیشت کا پہیہ اس ریل پر چل رہا ہے۔ مجھے اس مشاہدے نے ایک عجیب و غریب احساس عطا کیا کہ ہمارے غیر ملکی آقا کہلانے والے کس قدر کام کر گئے۔ کوئی خود غرضی بھی کہے مگر جو فائدہ ہم اٹھا رہے ہیں اس کا کوئی شمار نہیں۔

''آپ کی کتاب سے اس قدر محبت اور قربت! کیا وجہ رہی ہوگی اس تعلق کے آغاز کی؟''

ایک وجہ تو شاید یہ تھی کہ تب ٹی۔وی نہیں تھا، صرف ریڈیو تھا اور کتاب سب سے بڑا وسیلہ تھا معلومات کا۔ ہر محلّہ میں دو تین لائبریریاں ہوتی تھیں۔ ان میں اُردو کی ہر اچھی کتاب رکھی ہوتی تھی۔ دو آنے روز کرائے پہ ملتی تھی۔ تین دن میں پڑھ کر لوٹانی ہوتی تھی۔ اب تو کتب خانے کا تصور ہی نہیں ہے۔ جو سرکاری تھے وہ بھی قاری کو کتاب کی طرف راغب کرنے کی ذمے داریاں پوری کرنے سے قاصر ہیں۔ کتابوں کا تعارف ہی نہیں کراتے تو پڑھائیں گے کیا؟

اُردو ڈائجسٹ جو پاکستان کا سب سے پرانا ڈائجسٹ ہے، اس میں کتابوں کے خلاصے آتے تھے۔ جو کتاب پڑھ نہیں پاتے تھے وہ تلخیص پڑھ کر کتاب سے آگاہی کر لیتے تھے۔

''آپ کی ریل کہانی، شیر دریا اور جرنیلی سڑک میں اس قدر معلومات ہیں۔ ساری سفر کے دوران تو نہیں ملی ہوں گی؟ تو کیا بہت زیادہ ہوم ورک کر کے نکلتے تھے سفر پر؟''

''جی اختر عباس صاحب! میں بے پناہ ہوم ورک کرنے کا عادی ہوں۔ سفر ختم کرنے کے بعد پھر کرتا ہوں۔ دورانِ سفر منزل بہ منزل، حتیٰ کہ آپ جو تصویر بناتے ہیں تو واپسی پہ کئی شہادتیں آپ کو یاد آتی ہیں۔ آپ ان کی تصدیق کرتے ہیں پھر نیا مشاہدہ جنم لیتا ہے۔

آپ دیکھئے! کوئٹہ جاتے ہوئے جو کچھ پڑھ کر گیا تھا واپسی پہ دوبارہ پڑھا تو منظر نامہ ہی اور تھا۔''

''منظر نامے سے یاد آیا آپ نے پہلے شیرِ دریا کا سفر کیا یا جرنیلی سڑک کا۔ کس کے منظروں نے ادک ادک باتیں کیں؟''

''پہلا سفر تو میں نے جی۔ٹی روڈ کے ساتھ کیا تھا۔ جرنیلی سڑک کے نام سے پروگرام کیا تھا جو بے حد مقبول ہوا پھر خیال پیدا ہوا کہ ایسا ہی ایک سفر اور کیا جائے۔ سڑک کے علاوہ کون سا راستہ اختیار کرنے کا سوال سامنے آیا تو دریائے سندھ کے ساتھ سفر کا خیال آیا کہ کنارے کنارے آباد زندگی کا انداز دیکھا جائے۔ بہت زوردار سفر تھا۔''

دوسرے لکھنے والے اپنی بات لکھتے ہیں۔ میں راستے میں ملنے والوں کی باتیں لکھتا ہوں۔ منظر بیان کرتا ہوں۔ اکثر تو منظر کو دعوت دیتا ہوں کہ خود کو بیان کرے۔ جیسے جرنیلی سڑک پہ چلتے ہوئے بے شمار لوگوں سے باتیں کرتا جا رہا تھا۔ ہر علاقے کا لہجہ بدلتا جا رہا تھا۔ پنجاب کا لہجہ اور سندھ کا لہجہ اور... یو۔پی اور بہار میں کوئی اور۔ اب یہ لہجے کتاب میں تو نہیں مل سکتے۔ اس لیے کئی لوگ اب بھی آڈیو کیسٹ کے طالب ہوتے ہیں۔

''اچھا! عابدی صاحب اتنے طویل اور مشکل سفر میں کتنے لوگ ساتھ ہوتے تھے۔ کیا ٹی۔وی والوں کی طرح پورا کریو اور ٹیم ہوتی تھی؟''

جواب سے پہلے ہنس دیئے۔ ’’لوگ بھی پوچھا کرتے تھے آپ کی ٹیم کے باقی لوگ کہاں ہیں۔ میری ٹیم میں ایک بڑا سا تھیلا ہوتا تھا۔ میں انھیں دکھا دیتا تھا کہ یہی میری ٹیم ہے۔ اس تھیلے میں مختلف کتابیں ہوتی تھیں۔‘‘

’’آپ اکیلے! ان جان، اجاڑ اور بیابان راستوں پر؟‘‘

’’تنہائی کہاں! میرے چاہنے والے ہر جگہ ساتھ مل جاتے ہیں آگے آگے چلتا اور نوجوانوں کا غول پیچھے پیچھے چلتا جاتا۔ وہ کہتے تھے آپ بہت تیز چلتے ہیں۔‘‘

اُردو کانفرنس کا تیسرا سیشن شروع ہونے والا تھا۔ ہم نے اجازت لینے سے پہلے آخری سوال پوچھا:

’’اُردو ڈائجسٹ نظروں سے گزرتا رہا؟ کچھ نیا ہمارے لیے بھی لکھیے۔‘‘

کہنے لگے ’’جب یہ نکلا تھا تب بھی پڑھتا تھا۔ ۶۵ء کی جنگ کے بعد اُردو ڈائجسٹ میں کہانی نویسی کا ایک مقابلہ ہوا۔ جس میں میں نے کہانی بھیجی تھی مگر وہ نامنظور ہو کر واپس آ گئی تھی۔

یوں ایک بھرپور قہقہے کے ساتھ اس عہد کے سب سے نامور اور مقبول براڈ کاسٹر، کتنی ہی باکمال کتابوں کے مصنف، رضا علی عابدی سے ہماری گفتگو اختتام کو پہنچی مگر اُن کی شیریں آواز اور مربوط گفتگو کا احساس کتنی ہی دیر ساتھ رہا۔ اُنہوں نے بجا طور پر ایک بار کہا تھا ’’اُردو زبان مجھ سے نہیں مگر میں اِس زبان سے ہوں۔ اِس نے میرا بھلا چاہا، میں اِس کا بھلا چاہتا ہوں۔ یہ کوئی ادلے بدلے کا بندوبست نہیں، یہ میرے آنگن میں بکھری روشنی اور میرے چمن میں پھیلی ہوئی خوشبو ہے۔ یہ میری سینے میں دھڑکتی زندگی کی علامت، مرے وجود پر برستی ہوئی ٹھنڈک اور مرے ماتھے پر رکھی ماں کی ہتھیلی ہے۔

(بشکریہ: اُردو ڈائجسٹ)

کس کے گھر جائے گا سیلابِ کتب؟

رضا علی عابدی

کتاب اور علم ایک ہی شے کے دو نام ہیں۔ جو علم کا تقاضا ہے، وہی کتاب کا مطالبہ ہے۔ یہ بات ذرا سی وضاحت چاہتی ہے۔ علم حاصل کرنے والے پر لازم ہے کہ جو فیض پائے، دوسروں کو بھی پہنچائے۔ بالکل یہی معاملہ کتاب کا ہے۔ جس کے ہاتھ آئے، پڑھے، شوق سے پڑھے لیکن اگر علم کے متلاشی کسی شخص کو سونپ دے تو گویا علم کو آگے بڑھائے گا۔ اسی کا دوسرا نام نیکی ہے۔

ہمارے علاقے میں اس کا چلن ذرا کم ہے۔ لوگ کتاب کو سینے سے لگا کر رکھ لیتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ پھر عمر بھر اس کے ورق نہ کھولیں۔ وہ گرد کھاتی رہے یا دیمک اس کو چاٹتی رہے، مالک کتاب کی توجہ اس طرف کم ہی جاتی ہے۔

مغرب میں جہاں میں آباد ہوں کتاب کا معاملہ مختلف ہے اور اس کا ذکر بعد میں کروں گا۔ پہلے میں انٹرنیٹ میں نظر آنے والی اس تصویر کی تفصیل بیان کروں جس نے مجھے یہ سب کچھ لکھنے کی توفیق عطا کی۔ تصویر ہمارے برادر ملک ترکی کی ہے جس میں ایک چھوٹی سی دکان نظر آ رہی ہے، اس کے سامنے کھلتا ہوا کوئی دروازہ نہیں بلکہ شیشے کی دیوار ہے اور اندر کتابوں اور کھلونوں کا ڈھیر ہے۔ اوپر کی جانب لیٹر بکس جیسا موکھا کھلا ہوا ہے۔ اور ایک بزرگ اس میں اپنی فاضل کتابیں ڈال رہے ہیں، ایک اور شخص قطار بنائے اپنی باری کا منتظر ہے تاکہ وہ بھی دوسروں کے لیے اپنی کتابیں اور بچوں کے کھلونے وہاں جمع کرا سکے۔

پھر مجھے ایک اور تصویر یاد آئی جو شاید جاپان کی تھی۔ اس میں بس اسٹاپ کے قریب کتابوں کی الماری لگی ہے۔ بس کے انتظار میں بیٹھے لوگ وہیں کتابیں پڑھ رہے ہیں۔ انہیں اختیار ہے کہ جو کتاب وہ چاہیں ساتھ لے جائیں اور جو کتاب فارغ ہو چکی ہو، وہیں اسی الماری میں رکھ جائیں۔ اسی کو صدقۂ جاریہ کہتے ہیں یعنی وہ نیکی جس کا سلسلہ رکتا نہیں اور ثواب مسلسل ملے جاتا ہے۔

ایک بار لندن میں ایک ادبی تنظیم نے یہ سلسلہ شروع کیا کہ اپنی جو کتابیں نکالنا چاہیں،

جلسے میں لیتے آئیں اور وہاں آنے والی جو کتاب چاہیں لے جائیں۔ ایسی ایسی بے مثال کتابیں آئیں کہ قطار میں پیچھے کھڑا میں ہاتھ ہی ملتا رہ گیا۔ پاکستان میں پرانی کتابوں کے بازاروں میں بھی لوگوں سے یہ نیکی سرزد ہوتی ہے کہ وہ بچی کھچی کتابیں بازار میں لے آتے ہیں اور ڈھونڈنے والے ان میں سے نایاب گوہر تلاش کر لیتے ہیں۔

برطانیہ کے اکثر اسپتالوں میں جہاں لوگوں کو دیر تک بیٹھ کر اپنی باری کا انتظار کرنا ہوتا ہے، وہاں کتابیں ضرور آراستہ ہوتی ہیں۔ لوگ آتے ہوئے اپنی فالتو کتابیں لے آتے ہیں اور وہاں چھوڑ جاتے ہیں۔ اس کے صلے میں انہیں اختیار رہوتا ہے کہ جو چاہیں، لے جائیں۔ ہمارے قارئین جانتے ہوں گے کہ مغربی ملکوں میں چیریٹی شاپ کا چلن عام ہے جہاں لوگ اپنی فالتو اشیاء چھوڑ جاتے ہیں جو وہیں سستے داموں فروخت کی جاتی ہیں اور ان کی آمدنی فلاحی کاموں پر صرف ہوتی ہے۔ ان اشیاء میں کتابیں کثرت سے ہوتی ہیں اور کتابوں کے متلاشی اکثر ان کو سونگھتے نظر آتے ہیں۔ میں نے اس طرح ہندوستان کی تاریخ کی کتابوں کا ذخیرہ کیا ہے جس میں نایاب کتابیں شامل ہیں مگر اب میرے سامنے ایک بڑا مسئلہ ہے اور کافی بڑا۔ میں نے اور میری طرح یہاں مغرب میں آباد بہت سے لوگوں نے اپنے ذوق کی تکمیل کے لیے کتابیں جمع تو کر لی ہیں، اب سوال ہے کہ ان وک جھاڑ پونچھ کر رکھنے اور انہیں پیار سے پڑھنے کے لیے میں ہمیشہ تو نہیں رہوں گا پھر ان کا کیا بنے گا۔ یہ خیال مجھے اور مجھ سے زیادہ میری بیگم کو ستاتا ہے۔

حال ہی میں میرا کراچی جانا ہوا اور ایک روز ہمدرد دواخانے کے بانی اور علم کی ترویج کی تحریک کے سرپرست حکیم محمد سعید مرحوم کے قائم کیے ہوئے مدینۃ الحکمۃ جانے کی سعادت حاصل ہوئی۔ انہوں نے وہاں جو عظیم الشان کتب خانہ قائم کیا ہے اس میں یہ دیکھ کے جی سرشار ہو گیا کہ ملک کے بعض اکابرین اور اہل علم حضرات نے اپنے کتابوں کے ذاتی ذخیرے اس کتب خانے کو بطور عطیہ سونپ دیے ہیں جو انہی حضرات کے ناموں کے ساتھ الماریوں میں چنے ہوئے ہیں اور ایک نظر دیکھ کر ہی احساس ہو جاتا ہے کہ ان الماریوں میں کیسے کیسے جواہر پارے آراستہ ہیں۔ ذاتی ذخیروں کو محفوظ کرنے کا یہ اہتمام ملک کی بعض یونیورسٹیوں اور بڑے کتب خانوں میں بھی ہے اور نہایت سکون بخش ہے۔ میں بطور خاص علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا ذکر کرنا چاہوں گا جہاں برصغیر کی بڑی بڑی شخصیتوں کے کتابوں کے ذخیرے محفوظ ہیں۔

برطانیہ کی چیریٹی شاپس کا ذکر ہو رہا تھا۔ وہاں لوگ ہر روز بلا مبالغہ ہزاروں کتابیں دے جاتے ہیں، کچھ وہیں فروخت ہوتی ہیں کچھ کتابیں فروخت کرنے والے دنیا کے مشہور ادارے امیزون Amazon کے توسط سے دستیاب ہوتی ہیں۔ کمپیوٹر میں ان کی فہرستیں دستیاب

ہوتی ہیں اور اکثر ہر کتاب کی قیمت صرف ایک پینس ہوتی ہے۔ منافع ڈاک خرچ میں بیچنے والی معمولی رقم سے ہوتا ہے۔

بدقسمتی سے یہ سہولت اردو کتابوں کے حصے میں نہیں آتی۔ یہ کتابیں چیریٹی شاپس کو دی جائیں تو وہ ان کو دوبارہ کاغذ بنانے والے اداروں کے حوالے کر دیتے ہیں۔ بس اتنا اطمینان ضرور ہے کہ ان کا وہ حشر نہیں ہوتا جو برطانیہ میں ہمارے کتنے ہی جاننے والوں کی کتابوں کا ہوا۔ لوگ چل بسے، ان کے پسماندگان نے ان کی چھوڑی ہوئی کتابیں کوڑے کباڑ کے پلاسٹک کے کالے تھیلوں میں بھر کر رکھ دیں۔ جنہیں ہر ہفتہ ردی اٹھا کر لے جانے والے لے گئے اور پھر خدا جانے ان کا کیا حشر ہوا۔

رشک آتا ہے ترکی کے اس نظام کے اس نظام پر جہاں لوگ اپنی فالتو کتابیں شیشے کے گھر میں جمع کرا رہے ہیں اور دوسرے لوگ ان سے فیض اٹھا رہے ہیں۔ میں نے ایک اور منظر اسپین میں دیکھا ہے جہاں شام کو جب بازار بند ہو جاتے ہیں، شہر کے پارکوں میں کتابوں کی دکانیں کھل جاتی ہیں۔ وہاں دیر تک کتابوں کے شوقینوں کا مجمع لگا رہتا ہے اور یہ خیال آتا ہے کہ علم کے قدر دانوں کی یہ نسل قرطبہ کے زوال کے وقت موجود ہوتی تو اس دور کے عظیم کتب خانوں کے الاؤ جلانے کی اجازت نہ دیتی۔

آخر میں ایک بار پھر برطانیہ کا ذکر جہاں ہے آن وائی Hay on wye نامی ایک قصبے میں صرف ایک کاروبار ہوتا ہے۔ وہاں کچھ اور نہیں، صرف اور صرف پرانی، سیکنڈ ہینڈ کتابیں فروخت ہوتی ہیں اور دنیا بھر کے لوگ اور کہیں جائیں یا نہ جائیں، کتابوں سے بھرے بازار دیکھنے، ہے آن وائی، ضرور جاتے ہیں۔ علم مل جائے اور وہ بھی کوڑیوں کے بھاؤ، کون ہاتھ سے جانے دیتا ہے۔ بس اس کے لیے سینے میں علم کی وہ شمع روشن ہو جس سے محبت کی دعا بچپن سے ہمارے لب پر آتی رہی ہے اور شکر ہے کہ آج تک آتی ہے۔

دوسرا رخ، جنگ ۲۳ / اگست ۲۰۱۳ء، ص ۸

دارالمطالعہ

سلطان احمد

شوق کے مشغلوں میں مطالعہ سب سے گہرا اور دیرپا ہے۔ یہ عمر کی قید سے آزاد، بچپن، جوانی او بڑھاپے تک قائم رہتا ہے۔ اس کو ہواس انسانی کا خلاصہ کہنا چاہئے۔ نفس کے مطالعہ اتنا ہی ضروری ہے جتنا جسم کے لئے ورزش مطالعہ ریاضت بھی ہے اور فرحت بھی۔ یہ اخلاق کا تابندہ ہے اور کردار کا صیقل۔ مطالعہ کی ہمہ گیریوں میں ''دارالمطالعہ'' وہ مرکزیت رکھتا ہے جو ملک میں دارالحکومت کو حاصل ہوتی ہے۔ اس کی قربت سے انسان بنتے اور سنورتے ہیں۔ اگر اس کے مالہ وماعلیہ کو موافق وسازگار بنایا جائے تو بہترین افراد پیدا ہوں، کیوں کہ جامعہ درسیاتی تکمیل کا دروازہ ہے اور دارالمطالعہ تحقیق وتخلیق کا محل۔ وہاں تعداد کا غرہ اور بے با کی ہے، یہاں استعداد کی حجاب و حیرانی، ادھر اسناد میں حروفِ تہجی کی کثرت، ادھر اوراد میں معنی الفاظ کی قلت، وہ فراغت کا دعودار اور یہ کرامت کا طلب گار :

نہیں کتاب سے ممکن تجھے فراغ کہ تو
کتاب خواں ہے مگر صاحبِ کتاب نہیں

عام پڑھے لکھوں کا ذکر ہی کیا۔ ایک ماہرِ فن کو بھی دوسرے فن کی خصوصیات کا بہت کم علم ہوتا ہے اور یہ تو شاذ ونادر ہے کہ ماہرِ تعلیم جلد علوم وفنون کا واقف کار ہو جائے، یہ نہیں کہ دعویٰ سب کا اور حق کسی کا بھی نہیں۔ جب علم لا متناہی ٹھہرا تو منتہی ہونا معلوم، لیکن بقدرِ ضرورت علم ہونا لازمی۔ اس شرط کے باوجود کسی کمی کو گوارا کرنا جہالت اور خسران کو مدعو کرنا ہے، یہ عام حالتوں کا ذکر ہے ورنہ خواص کا علم ذاتی ہو یا لدنی، اس کے فضل وکرم پر منحصر ہے اور بعضوں کو بعض پر فضیلت دی گئی ہے۔ ہماری تعلیم اور تربیت کا تقاضا ہے کہ آئے دن کی ضرورتوں کا اتنا علم اور تجربہ ہونا ہر تعلیم یافتہ کے لئے ضروری ہے جو صورتِ حال کو قابو میں رکھے اور ناگہانی موقعوں پر مداوا کی صورتوں کو بگڑنے نہ دے۔ جس کی بین مثال طبی امور میں پہلی مدد سے ملتی ہے۔ ورنہ ایک معمولی سی حراست میں اگر سیلانِ خون کے نقصانِ کثیر کو نہ روکا جائے تو کسی مسیحائے وقت کی آمد بھی اس نقصان کو پورا نہ کر سکے گی ہمیں اسی تعلیم اور اسی تربیت کی ضرورت ہے مگر آج فارغینِ کتب کا یہ حال ہے کہ وہ اگر

روپے بھیجنے کے فارموں کو بھرنا چاہیں تو ان کے اندراجات میں فاش غلطیاں کریں اور ان کی سمجھ پر ماتم کیجئے کہ روپے اور فارم متعلقہ کارکن کو سپرد کرنے کی جگہ انہیں خطوں کے بکس میں ڈال آئیں۔ شاید یہ مبالغہ ہو لیکن عملی زندگی میں موجودہ درسیات کے جو سانحے سننے میں آتے ہیں وہ اس سے زیادہ محیر العقول اور جگر خراش ہیں۔ مگر اصلاح کی صورت کیا ہے؟ صرف نصاب اور درسیات ہی نہیں امتحانات کی ناہمواریوں کا بھی قصور ہے سند کی وہ چاٹ لگائی ہے کہ توبہ ہی بھلی۔ حصولِ علم کے لئے درسیات کی مدت کافی نہیں، جب کہ علم وآگاہی کا سبق ہر قدم پر ملتا ہے اور اس کا سلسلہ مہد سے لحد تک قائم رہتا ہے تو پھر فارغ ہونے کا تصور کس کام کا؟ ظاہر ہے کہ معلوماتِ عامہ کی آسانی اور باقاعدہ صورت یہی دار المطالعے کی تنظیم ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہمیں ایک قومی ضرورت کے ماتحت اس نظام دار المطالعہ کو زیادہ سے زیادہ وسیع اور قابلِ اعتماد بنانا ہے۔

داار المطالعہ ایک ایسی دانش گاہ ہے جس سے ترقی کے نشانات ملتے ہیں اور تمدن کی راہیں نکلتی ہیں۔ کسی ترقی کا سمجھنا اس پر منحصر ہے کہ اس کا کوئی اندازہ مقرر ہو، محض ذہن کی رسائی سے کام نہیں چلتا۔ اس کے لئے اجتماعی اقدام کرنا پڑتا ہے۔ اس معیار پر آگے بڑھنے کا نام ترقی ہے۔ ورنہ جنگل کے درختوں کی پیدائش اور باغ وچمن کی آرائش میں کوئی فرق نہ ہو۔ وہ قدرت کی بخششوں کا کرشمہ ہے اور یہ اس کے عطیہ عقل وشعور کا نتیجہ۔ وہ حال سجدہ شکر کا مستحق اور یہ کیفیت بار امانت کی متحمل، کہ اس کی قدرت اور دانست کو سمجھنا، انسانیت کا شرف وامتیاز ہے لیکن ہر عمل کے علم مقدم ہے۔ ہمارے ہاتھ پاؤں بھی اس وقت تک نہیں ہلتے جب تک ہمارے خیال اور ارادے کا انہیں علم نہ ہو اور لاعلمی میں کوحرکت سرزد ہو تو صحت کی دلیل نہیں، وقت کی رفتار ہو یا منزل کا نشان، مطالعے کی اسی رسدگاہ میں دیکھتے ہیں۔ یہاں علم وحکمت کے ذخیرے موجود ہیں جو آئے اپنا دامن بھر لے۔ الفاظ قلم بند اور کتابیں محفوظ ہیں، وہ کھلیں اور یہ پڑھی جائیں تو جادو کا کام کریں۔ عہدِ مغلیہ میں کتب خانے کا نظم کن ترقیوں کا حامل تھا اس کا اندازہ ان اقتباسات سے کیا جا سکتا ہے جو اکابرینِ علی گڑھ نے بڑی محنتوں سے جمع کئے ہیں۔ جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ تقسیم عمل کے ماتحت اس اجتماعی ادارے کے مختلف شعبے قائم کئے گئے جو علیحدہ علیحدہ فن اور پیشے کی حیثیت رکھتے تھے۔ جن کے ماہرین اپنے فنون کی حفاظت وترقی پر مامور تھے۔ انہوں نے اپنی ذمہ داریوں کو جس حسن وخوبی سے انجام دیا اور جس درجہ کمال کو پہنچایا وہ اب ایک عظمتِ رفتہ کی داستان ہے۔ مگر کسی فن اور پیشے کی عظمت وشان اور اس کی ترقی وبلندی کے لئے اس قدر کافی ہے کہ اس کو اپنے عہد کی قدر ومنزلت حاصل ہو اور دوسرے آئیں تو انہیں فراموش کر دیں۔ برطانوی عہد اس کے سوا کیا ہے؟ مجرمانہ غفلت یا بزدلانہ حرکت۔ کیسے کیسے فن اور پیشے مٹ گئے اور کتنے ماہرین وفنکار تباہ ہو گئے۔

ان صورتوں کے علاوہ جو سرکاری نظم ونسق سے متعلق تھی یا جن کتب خانوں کا براہِ راست شاہی خاندان سے تعلق تھا، عہدِ مغلیہ کے امراء اور عمائدین بھی علم وادب کے ان سرچشموں کے قائم و جاری رکھنے میں ایک دوسرے کے رقیب بن گئے تھے۔ گویا خاندانوں کی شرافت وتہذیب کا معیار کتب خانوں کی عظمت وقدامت سے وابستہ رہا۔ جو کتب خانہ جتنا بڑا اور پرانا ہوتا اس کا والی و سرپرست اتنا ہی بزرگ ومحترم سمجھا جاتا، حق کہ ذاتی اثر ورسوخ کے معاملے میں کسی نادرونایاب کتاب کا ایک ورق بھی خریطہ تعارف سے کم نہ تھا۔ حرف کی کشش، دلربائی اور حکایاتِ تلفظ کی وہ دلنوازی کہ ایک اجنبی کو قریب سے قریب تر کردے۔ اب کہاں دیکھنے اور سننے میں آتی ہے۔

بعضوں کے نزدیک کتب خانوں کی عظمت، کتابوں کی کثرت پر ہے۔ لیکن ان کا بہت تھوڑا حصہ مصرف میں آتا ہے اور جو حصہ مصرف میں آتا ہے وہی سکہ رواں ہے۔ بقیہ بطور یادگار۔ ضرورت ہے کہ ان کہنہ اور بوسیدہ کتابوں کا ایسا خلاصہ تیار کیا جائے جو دستی و دیدہ زیب ہو۔ انبار چھٹے اور اندوختہ کام آئے۔ ورنہ گلے سڑے اور برباد ہو جائے۔ اس اعتبار سے کتب خانوں کی توسیع، ان کی تعداد کے اضافے سے زیادہ فائدہ اٹھانے والوں کی کثرت پر ہونی چاہئے۔ وہ چھوٹے اور مختصر ہوں لیکن زیادہ سے زیادہ آباد ہوں اور پڑھنے والوں کا حلقہ، کتابوں کے رقبے سے کسی طرح کم نہ ہوں۔ آبادی کی یہ ذمہ داری ناظم ونگراں پر عائد ہوتی ہے۔ اس گھر کی رونق کو میزبانوں سے تعلق ہے۔ جب کہ ایک نعرہ خوش آمدید آنے والوں کی آدھی ضرورت پوری کردے۔ اجنبیت اور تلاش کی حیرانیوں کو دور کردے۔ اور سو فیصدی مطالعے کا رجحان پیدا ہو جائے۔ اس کے برعکس، کسی متعلقہ فن کی ایک بوجھل فہرست تلاش کرنے والے کو ایسا گم کردے کہ مطالعہ کا سارا وقفہ اور جوش طلب کا ولولہ بھی اسی کی نذر ہو۔ طبیعت اتنی پست اور نڈھال ہو جائے کہ پھر آنے کی ہمت نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ذاتی تعارف ہو یا نہ ہو مطالعہ کا تعارف لازمی ہے یہ جاننا بہت ضروری ہے کہ پڑھنے والے کی غرض وغایت کیا ہے؟ ضرورت کسی متن کی ہے یا شرح کی، مقصود کوئی حوالہ ہے یا مباحثہ، محض وقتی جذبہ کی تسکین مدنظر ہے یا علم وفن کی تحصیل، ان کیفیات کے درمیان کتاب کی دستیابی اور مدعا کے حصول تک ایک کارساز رفاقت ضروری ہے۔ کیوں کہ لکڑی اور لوہے کی مشین بھی کتاب ہاتھوں میں تھما سکتی ہے اور کاموں کے بسرعت انجام دینے کی یہ آسان صورت ہے لیکن جہاں کسی مسئلے کی اہمیت اور اس کے کما حقہ انجام دینے کا تعلق ہے، وہاں ناظم کی شخصیت، اس کی پرتپاک ومعنی خیز نقل وحرکت، ضرورتوں کے سمجھنے کی صلاحیت اور وسائل ورسائل کی قدرت، یہ سب ملیں اور کام آئیں تو ظاہر ہے کہ دوطرفہ توجہ پہاڑ بھی توڑ سکتی ہے۔ صاحبِ خانہ کتاب کی ذات اور اس کی یہ خدمت کن گرانباریوں کی متحمل وکفیل ہے اس کا ایک

ہلکا سا اندازہ ڈاکٹر ولیم جیر الڈ کے اس بیان سے ہوسکتا ہے۔

''ایک لائبریرین میں ذہانت، سمجھ بوجھ، عام قابلیت اور اچھا کلچر ہونا ضروری ہے۔ اس کو فرحت بخش اور جاذب شخصیت کا مالک ہونا چاہئے۔ اس کے دل میں لوگوں سے محبت کرنے اور ان کی خدمت بجالانے کے جذبات کا پایا جانا بھی ضروری اوصاف ہیں۔ لائبریرین کے پیشے میں وسیع ذاتی خوبیوں اور دلچسپیوں کی ویسی ہی گنجائش ہے جیسی کسی اور پیشے میں۔ لوگوں کو لائبریری کی کتابیں حوالے کرنے کا علاوہ ایک لائبریرین کے لئے اور بھی توجہ کی ضرورت ہے۔ حالاں کہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ لائبریرین کا کام صرف کتابیں دینا ہے۔ موجودہ حالات میں لائبریرین کے لئے اس امر کے بے انتہا مواقع ہیں کہ لوگوں میں تفریح اور ان کے خیالات میں اپج پیدا کرنے کی سہولتیں پیدا کی جائیں اور حوالہ جات اور تلاش و جستجو کی صورتیں نکالی جائیں۔ لائبریرین کا پیشہ ایسا ہے کہ جس پر دوسرے تمام پیشوں کا انحصار ہے۔ کیونکہ اسے سب قسم کے لوگوں مثلاً استادوں، اخبار نویسوں، ڈاکٹروں، قانون دانوں، دینیات کے ماہروں، انجینئروں، سوداگروں، سپاہیوں، سوشل کارکنوں، کارخانہ داروں، مزدوروں، سرکاری ملازموں، طالب علموں اور گرہستی عورتوں سے واسطہ پڑتا ہے۔''

یہی نہیں کہ اس مختلف النوع زندگی کے افراد ان کے گونا گوں افکار، کتب خانوں میں گزرتے رہتے ہیں بلکہ قابلِ غور معاملہ یہ ہے کہ اس طلسم خانہ قلم بند میں صرف ایک شخص کی ذات سے ساری توجہ اور سب کی تسکین وابستہ ہو جب کہ ہر فرد اپنی اپنی خصوصیات کا حامل اور متلاشی بھی ہو۔ ان حالات میں سبھوں کی نگرانی اور ان کے درمیان ایک رہ نما توازن کا قائم رکھنا کتنا سخت مرحلہ ہے اس کی مثال یوں سمجھیں کہ کسی ملک کا سربراہ یا کسی جماعت کا معلم اپنے حلقے میں کوئی نظم و ضابطہ ان صورتوں میں قائم رکھتا ہے کہ اسے صرف اپنی ذات پر اعتماد نہیں ہوتا، بلکہ دوسرے بھی اس کی برتری و تفوق کا احساس رکھتے ہیں۔ اس خصوصیتوں کے اقرار و استعمال کی نوبت نہ آئے جب بھی کسی حق کا تسلیم کرالینا ہی اس کا مصرف لینا ہے کہ دوسرے اس سے متاثر ہوتے ہیں اور یہ خود مطمئن۔ سماعت و اطاعت میں آسانی ہوتی ہے اور کام آگے بڑھتا ہے۔ لیکن خاموش فضا میں افراد ہی نہیں افکار بھی اجنبی ہوتے ہیں۔ یہاں اخلاقی دباؤ کے سوا تعمیل و پیروی کی کوئی دوسری صورت نہیں۔ ہر شخص ایک مست پندار بنا آتا ہے۔ اور اس سے مخاطب ہوتا ہے۔ جس کی حسیات سے وہ قطعاً نابلد و ناواقف ہو۔ اس مکدر ماحول میں کسی نظم و ضبط کے بحال رکھنے کے علاوہ اس مختلف الطبع جذبات کی تحلیل اور پھر تحقیق و تحصیل کی صورتوں کو بروئے کار رکھنا کتنے تحمل اور تجمل فرست کا رہینِ منت ہوگا؟

ان اہمیتوں کے پیشِ نظر ہمارا فرض ہے کہ ہم دارالمطالعہ کی جدید ترین اصولوں پر تنظیم کریں۔سب سے پہلے ہمیں اس کا فیصلہ کرنا چاہئے کہ وقت کی قلت کو دیکھتے ہوئے، عام مطالعے کے لئے کن کن علوم وفنون کا کتنا کتنا جاننا سب کے لئے ضروری ہے۔مطالعے کو اس معیار پر لانے کے لئے ہمیں علم وفن کے سمندروں کو کھنگالنا پڑے گا تاکہ ان کی ورق پوش موجوں سے کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ مطالعے کی آبیاریاں حاصل کی جائیں۔مثلاً ادب کے فن لیجئے، قومی ادب ہو یا ملکی، اس کی حیثیت عالمی ادب کے مقابلے میں کیا ہے؟ اور ادب کا معیار جس بلندی پر پہنچا ہے اس کا اندازہ ان کی عہد بہ عہد ترقیوں کا ایک ایسا خاکہ، جس سے پورے ادب کا مطالعہ قابو میں آجائے اور یہ معلوم ہو سکے کہ دنیا کا ادب کیا ہے اور اس میں ہماری زبان کے ادب کا کیا مقام ہے؟

اسی طرح تاریخ، فلسفہ، شعروحکمت اور دیگر علوم وفنون کا معاملہ ہے کہ ہر ایک کا الگ الگ شعبہ ومقام ہے۔ان شعبوں کی تقسیم اوران کی ترتیب وتدوین ان صورتوں میں کی جائے کہ کسی علم وفن کی مجموعی ترقی نظرانداز نہ ہو اور اگر کوئی پوچھے کہ ادب کیا ہے؟ تو ملک کا ہر دارالمطالعہ چیخ اٹھے کہ یہ ہے ادب کا خلاصہ اور یہ ہے اس کی رفتار۔تاریخ کے نشانات یہ ہیں اور ترقی وتمدن کی راہیں یہاں تک پہنچتی ہیں۔

کتابوں کی دنیا

محمد اکرم رہبر

کتابیں بھی عجیب نعمت ہیں، جب رنج والم کے بادل ہماری زندگی کو تاریک کر دیتے ہیں تو وہ ایک سچے دوست کی طرح شیریں الفاظ سے ہماری ڈھارس بندھاتی ہیں۔ جب احباب و رشتہ دار ہماری بدبختی کی وجہ سے منہ موڑ لیتے ہیں تو یہ ہمارا ساتھ نہیں چھوڑتیں۔ ہمارا حوصلہ بڑھاتی ہیں۔ ہمت واستقلال سے مشکلات پر غالب آنے کا سبق دیتی ہیں۔ یہ انسان کی ہزاروں سال کی دانائی اور تجربے کا نچوڑ ہیں اور اس کا بیش قیمت ورثہ

دنیا کے کم وبیش ساٹھ ملکوں میں ہر سال پانچ ارب کے قریب کتابیں شائع ہوتی ہیں۔ اس کے باوجود آج تک ''کتاب'' کی تعریف پر کوئی دو ممالک متفق نہیں ہوئے ہر ایک کے نزدیک کتاب کی تعریف جدا جدا ہے۔

انگلینڈ میں ہر وہ مطبوعہ چیز کتاب کہلاتی ہے جس کی قیمت کم از کم ۶ پنس ہو۔ ہنگری میں ہر وہ مطبوعہ چیز کتاب کہلاتی ہے جس کے ۶۴ صفحات ہوں۔ آئس لینڈ میں کتاب کی حد ۱۷، آئر لینڈ اور اٹلی میں ۱۰۰ا صفحات ہے۔ بعض ممالک جن میں پاکستان، ہندوستان، انڈونیشیا اور سوویٹ روس بھی شامل ہیں، کتاب اور پمفلٹ کے درمیان کوئی بڑا فرق روا نہیں رکھتے۔ امریکہ میں سرکاری مطبوعات اور پمفلٹوں کے سوا ہر وہ مطبوعہ چیز کتاب کہلاتی ہے جو نفع یا اقتصادی فائدے کے لئے فروخت کی جائیں۔ یونیسکو کے نزدیک ہر وہ مطبوعہ چیز جس کے ۴۹ یا اس سے زیادہ صفحات ہوں اور وہ جریدہ نہ ہو کتاب کہلانے کی مستحق ہے۔

کتاب کی تعریف میں اختلاف کے باوجود دنیا کے تمام ممالک کے اہل علم اس بات پر متفق ہیں کہ کتابیں ہماری زندگی کا جزو ہیں۔ یہ ہمارے بزرگوں کے تجربے اور دانائی کا نچوڑ ہیں۔ اچھی کتابیں ہمیشہ ہماری زندگی کے دھارے کا رخ موڑ دیتی ہیں۔ یہ مشعل کی طرح ہیں جو ہمیں راستے سے بھٹکنے نہیں دیتیں اچھی کتابیں ہماری زندگی کو روشن اور تابناک بنائے رکھتی ہیں۔

دنیا میں سیکڑوں زبانیں بولی جاتی ہیں۔ ہر زبان کے شاعر وادیب اور مصنف اپنی اپنی زبان میں اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہیں۔ لیکن جب ہم دوسروں کی کتابیں پڑھتے ہیں تو پتہ چلتا

ہے کہ وہ بھی اسی طرح محسوس کرتے ہیں جس طرح ہم۔ سوچنے کا انداز گو مختلف ہوتا ہے لیکن جو چیز وہ پیش کرتے ہیں وہ بالکل وہی معلوم ہوتی ہے جو دوسری زبانوں میں اس زبان کے اہلِ علم نے پیش کی ہیں، جب ہم تمام زبانوں کی بہترین کتابوں کو پڑھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان میں تمام نسوانی جذبات مثلاً محبت، نفرت، غصہ، ہمدردی، حسد وغیرہ ہی پائے جاتے ہیں۔ صدیوں سے شعراء، فلسفی علماء، لاکھوں مرد، عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کی رہنمائی کرتے چلے آرہے ہیں۔ ان کی زندگیوں کو بنانے اور سنوارنے کا کام انہی کے سپرد رہا ہے ہم بھی اپنے محسنوں سے ہمیشہ محبت کرتے رہے ہیں، اس کا اندازہ صدیوں پہلے کہی ہوئی ان نظموں کہانیوں اور اچھی باتوں سے ہو جاتا ہے جو آج بھی ہماری زبان پر ہیں۔

پندرہویں صدی تک کتابیں ہاتھ سے ہی لکھی جاتی تھیں۔ شاہانِ وقت سیکڑوں کاتبوں کو ملازم رکھا کرتے تھے۔ جو دن رات کتابیں نقل کر کے تیار کرتے تھے۔ جہاں سے یہ کتابیں کتب خانوں کو بھیج دی جاتی تھیں۔ اسپین کے مسلمان بادشاہ الحکم کے ذاتی کتب خانے میں چار لاکھ کتابیں تھیں۔ اس سے ہی آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس نے کاتبوں سے کتابیں لکھوانے پر کتنی رقم خرچ کی ہوگی۔ لیکن ہمیں ان غریب طلباء اور عام لوگوں کے ذوق کی داد دینا پڑتی ہے جو دن رات محنت کر کے کتب خانوں سے مستعار لی ہوئی کتابیں نقل کیا کرتے تھے۔

عربی کا ایک تاریخ داں ابنِ جریر نے جو طبری کہلاتا ہے قرآن کریم کی تفسیر لکھی تھی جو ساٹھ ہزار صفحات پر مشتمل تھی، یہ کتاب تیار کر کے وہ اپنے دوستوں کے حلقے میں لایا اور اس سے انہیں متعارف کرایا تو انہوں نے حیرت سے کہا۔ ''اتنی بڑی کتاب''۔ اسے تو پڑھتے پڑھتے ہماری زندگیاں ختم ہو جائیں گی لیکن یہ کتاب ختم نہیں ہوگی۔ اسی مصنف نے دوسری لاتعداد کتابوں کے علاوہ ایک تاریخ بھی لکھی تھی جو ساٹھ ہزار صفحات پر مشتمل تھی۔ دوستوں نے اسے دیکھ کر بھی یہی جواب دیا اور اس نے اس کتاب کو مختصر کر دیا اور آج کل جو کتاب موجود ہے وہ اصل کتاب کا صرف دسواں حصہ ہے۔ اہلِ یورپ اسے مستند مانتے ہیں۔ یہ سوچئے کہ اس نے یہ دونوں کتابیں اور بے شمار دوسری کتابیں کس طرح لکھی ہوں گی۔ امام غزالی کی تصانیف کی تعداد بھی ایک سو کے قریب بتائی جاتی ہے۔ اس سے ہی ہم اپنے اسلاف کی ہمت اور استقلال کا بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔

کتابیں چھاپنے کا فن چینیوں کی ایجاد ہے۔ دنیا کی سب سے پہلی طبع شدہ کتاب جو سنہ ۱۹۰۰ء میں چین کے صوبہ کنسو (KANSU) سے دستیاب ہوئی ہے قریباً گیارہ سو سال پرانی تھی اس پر یہ لکھا ہوا ہے کہ ''وانگ چیہہ (WANG CHI EH) نے یہ کتاب اپنے والدین کے نام کو زندہ رکھنے کے لئے ۱۱ مئی ۸۶۸ء میں طبع کرائی۔ یہ کتاب عوام میں مفت تقسیم کی جائے

گی۔آپ نے دیہات میں کپڑے پر پھول بوٹے چھاپنے والے ضرور دیکھے ہوں گے۔ پہلے پہل کتابیں بھی اسی طرح چھپتی تھیں۔لکڑی کے پھٹوں پر الفاظ کھود لئے جاتے تھے پھران پر سیاہی لگا کر کاغذ پر رکھا دیا جاتا تھا جس سے وہی الفاظ کاغذ پر سیدھے چھپ جاتے تھے۔کسی طاقت مثلاً جاب وغیرہ سے کام لے کر طباعت کا کام بھی سب سے پہلے چینیوں نے ہی ایجاد کیا تھا۔کہا جاتا ہے کہ پی شنگ (PI SHING) نے سنہ ۱۰۱۴ءاور سنہ ۱۰۴۹ء کے درمیان اس طریقے سے چند کتابیں طبع کی تھیں۔

جہاں تک یورپ کا تعلق ہے وہاں یہ فن بڑی دیر بعد رائج ہوالیکن اہلِ یورپ میں چینیوں کو اپنا استاد نہیں مانتے یہاں بھی پہلے پہل لکڑی کے پھٹوں سے ہی کتابیں چھاپی جاتی تھیں، مانچسٹر (انگلینڈ) کے ایک شخص (JOHN RAY LAND) کی ایسی کتاب ایک لائبریری میں موجود ہے جو ۱۴۲۳ء میں لکڑی کے پھٹوں کے ذریعے طبع ہوئی تھی ۔۱۴۴۰ء میں یہ کام ذرا بڑے پیمانے پر شروع ہوا۔۱۴۷۰ءتک لکڑی کے پھٹوں کے ذریعے ہی کتابیں رہیں۔۱۴۷۰ء میں بلاکوں کے ذریعے طباعت کا رواج ہوا۔یادرہے کہ جاپان میں بلاکوں کے ذریعے طباعت کا کام سنہ ۷۷۰ء میں بھی ہوا کرتا تھا۔محرک طباعت کے متعلق یہ متفقہ طور پر تسلیم کیا جا چکا ہے کہ ۱۴۵۴،۵۵ء میں جان گٹن برگ (JOHN GOTTEN BERG) نے میز میں جو جرمنی میں واقع ہے اس طریقے پر اپنی پہلی کتاب چھاپی تھی۔اس سے اگلے برس یعنی ۱۴۵۶ء میں اسی پریس سے بائیبل شائع ہوئی۔اس بائیبل کو میزرین بائیبل کہا جاتا ہے اور اس کی بناء پر ہی گٹن برگ کو اس فن کا موجد مانا جاتا ہے۔۱۴۵۷ء میں اسی مطبع سے ایک کتاب طبع ہوئی جس پر ناشر کا نام مقام اور تاریخ درج تھی۔ یہ کتاب جا بہ جا رنگین تصاویر سے مزین تھی۔اس کی طباعت میں گٹن برگ کے دو ملازموں پیٹر شوفر اور جان فسٹ کا بڑا ہاتھ تھا۔ یہ فن آہستہ آہستہ مقبول ہونے لگا۔گٹن برگ کے ملازم سیکھ کر بھاگ جاتے تھے اور اپنا پریس کھول لیتے تھے۔۱۴۶۴ء میں دو جرمن سوین ہیم (SWAYN HEYM) اور پینارٹ (PENNATTZ) اس فن کو اٹلی لے گئے اور روم کے قریب ایک قصبہ میں چھاپا خانہ کھول لیا۔۱۴۶۹ء میں وینس میں بھی ایک چھاپہ خانہ قائم ہو گیا۔اچھی کتابیں جب نسبتاً سستے داموں بکنے لگیں تو ہر کہ دمہ انہیں خرید کر پڑھنے لگا۔جن سے سارے یورپ میں بیداری کی لہر دوڑ گئی۔ایک وقت ایسا بھی آیا کہ بڑے بڑے زمینداروں اور امراء نے پریس کو سخت نقصان پہنچایا کیوں کہ وہ لوگ جو کل تک ان کے قدموں پر نثار ہو جانے کو ہی اپنا مدعا و ماحصل زندگی سمجھتے تھے اب ان کی چالوں سے واقف ہو رہے تھے۔انگلستان میں یہ فن ولیم کیکسٹن WILLAIM CAXTON) لایا۔ جہاں ۱۳ دسمبر ۱۴۷۶ء کو سب سے پہلی کتاب

شائع ہوئی یہیں سے یہ فن امریکہ، ہندوستان اور دوسرے علاقوں میں پہنچا۔

جب دوسرے کاموں میں طاقت کا استعمال شروع ہوا تو ۱۸۲۲ء میں طباعت میں بھی بھاپ کا استعمال ہونے لگا۔ کام پہلے کی نسبت تیزی سے ہونے لگا تو کتابوں کی قیمت میں خود بخود کمی آ گئی۔ آج کل مطبعوں بجلی کا استعمال ہوتا کام اتنی تیزی سے ہوتا ہے کہ انسان دنگ رہ جاتا ہے۔ آج کل ایک مشین پر فی گھنٹہ ۴۵ ہزار کاپیاں چھپ سکتی ہیں، کاغذ ۴ ۵ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے مشینوں کے اندر جاتا ہے خو بخود چھپ کر باہر آ جاتا ہے مشینوں سے خود بخود کٹائی ہو جاتی ہے حتیٰ کہ تہیں بھی مشینیں لگا دیتی ہیں۔

دورِ جدید کی طباعت کا کمال دیکھنا ہو تو سنئے کہ چائے ایک چمچے میں بارہ کتابوں کو پڑا ہوا دیکھ کر آپ یقیناً حیران ہوں گے۔ یہی دورِ جدید کا کمال طباعت ہے۔ وہ بارہ کتابیں یہ ہیں۔ ۱۔ قرآن مجید، ۲۔ انگریزی کی ڈکشنری جس میں بارہ ہزار الفاظ درج ہیں، ۳۔ گلی لیو نامی کتاب جس کے دوسو آٹھ صفحات ہیں اس کا سائز ڈاک کے چھوٹے ٹکٹ سے بھی نصف ہے، ۴۔ بائیبل، ۵۔ دی مائیٹ، ۶۔ رابرٹ ٹرنر، ۷۔ پیٹنٹ پویٹ، ۸۔ فرانسیسی آئین (چمڑے کی مطلیٰ جلد)، ۹۔ گیتا (سنسکرت)، ۱۰۔ تاشی کلنڈر، ۱۱۔ قوانین موسیٰ اور ۱۲۔ اسکاٹ لینڈ اور آئر لینڈ کے گیت۔ یہاں ایک اور کتاب بھی قابل ذکر ہے جس کا سائز انگوٹھے کے ناخن کے برابر ہے۔ یہ ابراہم لنکن کی گیسٹبرگ کی تقریر پر مشتمل ہے۔

یہاں یہ ذکر کر دینا بھی ضروری ہے کہ ان ایام میں جب کہ طباعت کا فن ابھرا نہیں تھا۔ ۱۴۷۵ء میں ایک کتاب وینس میں شائع ہوئی تھی جس کا سائز سوا دو انچ تھا اور ہر صفحے میں بارہ سطریں تھیں، اس کا نام (Office of the btersed virgin) ہے۔

آیئے اب آپ کو بڑی سے بڑی کتاب کا حال بھی بتائیں۔ برٹش میوزیم (انگلینڈ) میں سب سے بڑی کتاب چارلس دوم کے زمانے کا ایک اٹلس ہے جس کے ورق کی ۵ فٹ ۱۹ انچ لمبے اور ۳ فٹ ۲ انچ چوڑے ہیں۔ اس کتاب کی جلد بندی کے لئے بکریوں کی آٹھ کھالوں کی ضرورت ہے۔ یہاں قرآن کریم کے اس نسخے کا ذکر بھی مناسب ہوگا جس کے ورق ساڑھے سات فٹ لمبے اور ساڑھے چھ فٹ چوڑے تھے۔ یہ قرآن مجید سمرقند کے ایک محل میں موجود تھا اور سنہ ۱۴۰۰ء کے لگ بھگ اس کی کتابت کی گئی تھی۔

دنیا کے تمام ممالک میں ہر سال قریباً ۵ ارب کتابیں چھپتی ہیں۔ بعض اتنی مقبول ہو جاتی ہیں کہ وہ بار بار شائع کی جاتی ہیں۔ چارلس منرو شالڈون کی کتاب ''in his steps'' کی ۱۸۹۷ء سے اب تک اسی لاکھ جلدیں فروخت ہو چکی ہیں۔ بنجمن سپاک کی کتاب ''The

"commensence Gooky and child care" کی پچھلے گیارہ سالوں میں ۷۹ لاکھ جلدیں، ڈیل کارنیگی کی "How win friends and influince people" کی پچھلے بیس برس میں پونے انچاس لاکھ اور میکائے سپلیسن کی کتاب "my gun is quich" کی پچھلے سات برس میں چالیس لاکھ جلدیں فروخت ہو چکی ہیں اس سے ہی آپ ان مصنفوں کی مقبولیت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

اب لائبریریوں کی طرف آیئے برٹش میوزیم میں کتابوں کی صحیح تعداد کا کسی کو علم نہیں ہے اس سے ہی اندازہ کر لیجئے کہ اگر کتابوں کی الماریوں کو ساتھ ساتھ کھڑا کیا جائے تو ساٹھ میل لمبی قطار بن جائے گی۔ سنہ ۱۹۳۱ء میں کتابوں کی ایک مبسوط فہرست تیار ہونا شروع ہوئی تھی لیکن ۲۳ سال کی مسلسل محنت کے بعد ماہرین نے بتایا کہ مکمل فہرست ۲۰۳۶ء میں تیار ہوگی جس کی دوسو جلدیں ہوں گی۔ اس وقت تک برٹش میوزیم کی کتابوں کی الماریوں کی قطار اسی میل لمبی ہو جائے گی۔ ایک سرسری اندازے کے مطابق کتابوں کی تعداد پچاس لاکھ سے زائد ہے۔ روسی کتابوں کے معاملے میں بہت بلند مذاق رکھتے ہیں لینن اسٹیٹ لائبریری میں کتابوں کی تعداد ڈیڑھ کروڑ اور پبلک لائبریری لینن گراؤنڈ میں ایک کروڑ ہے۔ جب کہ امریکی لائبریری آف کانگریس واشنگٹن میں ایک کروڑ اور پبلک آفس لائبریری نیویارک میں ساٹھ لاکھ کتابیں موجود ہیں۔ فرانس میں پیرس کی لائبریری میں ۸۰ لاکھ، جاپان میں ٹوکیو کی لائبریری میں ۳۵ لاکھ کتابیں ہیں۔ بتایا گیا ہے کہ لائبریری آف کانگریس واشنگٹن میں ۳۰ جون سنہ ۱۹۵۴ء کو کتابوں کی تعداد ایک کروڑ ایک لاکھ ۵۵ ہزار تین سو سات اور قلمی نسخوں اور خطوط وغیرہ کی تعداد ایک کروڑ ۴۲ لاکھ ۸۲ ہزار ۵ سو ۱۴ تھی۔ امرتسر میں سکھوں کے گردوارہ میں صرف ایک کتاب پڑی ہے اور وہ ہے گروگرنتھ یعنی سکھوں کی مذہبی کتاب۔

دنیا میں خواندہ لوگوں کی تعداد ایک ارب ۳۵ کروڑ کے قریب ہے۔ ہر سال ڈھائی کروڑ لوگ پڑھنا سیکھتے ہیں۔ دنیا میں کتب فروشوں کی تعداد کتنی ہے؟ یہ اندازہ لگانا بہت مشکل ہے۔ بہرحال آسٹریلیا میں ہر ۲،۷۴۵ آدمیوں کے لئے کتابوں کی ایک دکان، ڈنمارک میں چار ہزار کے لئے ایک دکان، آسٹریا میں ۴۳ سو، اٹلی میں ۴۹ سو، انگلینڈ میں چھ ہزار، روس میں ۸۷ سو، کینیڈا میں ۱۸ ہزار اور امریکہ میں ہر ۱۸ ہزار ۶۱۶ آدمیوں کے لیے کتابوں کی ایک دکان ہے۔ پاکستان اس لحاظ سے بہت پسماندہ ہے، یہاں ہر نوے ہزار نفوس کے لئے صرف ایک کتب فروش ہے۔ پاکستان میں پبلشروں اور کتب فروشوں کی تعداد صرف ۸۵۵ ہے۔ ان میں سے ۲۶۷ پبلشر اور کتب فروش صرف لاہور میں، ۱۰۴ کراچی ہیں۔

آج کل آپ کو شیکسپئر ٹالسٹائی، کالی داس اور دوسرے مشہور مصنفین کی مشہور کتابوں کے تراجم بڑے سستے داموں مل جاتے ہیں۔ کبھی آپ نے یہ بھی سوچا ہے کہ ترجمہ کرنا کس قدر مشکل ہے۔ سب سے پہلی کتاب جس کے ترجمے کے بارے میں ہمیں علم ہے ''پنج تنترا'' ہے یہ کتاب دوسری صدی عیسوی کے درمیان جنوبی ہند کے ایک راجہ کے درباری نے راجہ کی خاطر لکھی تھی۔ چھٹی صدی عیسوی میں یہ ایران پہنچی تو فارسی میں ترجمہ ہوا اور سنہ ۷۵۰ء میں فارسی سے عربی میں، اس کے بعد بارہویں صدی عیسوی میں عربی سے عبرانی، عبرانی سے لاطینی، وہاں سے ہسپانوی پھر جرمنی اور فرانسیسی زبانوں میں اس کا ترجمہ ہوا اور سنہ ۱۶۰۱ء میں تھامسن نارتھ نے اس کا ترجمہ انگریزی میں کیا۔ مسلمانوں کو جہاں دینی علوم سے پیار تھا وہاں سائنس، فلسفہ، ریاضی، کیمیا، طب۔ جغرافیہ اور تاریخ سے بھی گہری محبت تھی۔ عباسی عہدِ حکومت میں ہی یونانی زبان کی مشہور کتابوں کے تراجم شروع ہو گئے تھے۔ مامون الرشید اور ہارون الرشید کے عہد میں کام کی رفتار تیز ہو گئی۔ ان کے دربار سے ہر ملک اور ہر زبان کے بڑے بڑے علماء وفضلاء وابستہ تھے۔ یونانی علوم و فنون، اس کے علاوہ ہندی، عبرانی، فارسی اور دیگر زبانوں کے علوم کے تراجم عربی میں کیے گئے۔ ترجمے کے معاملے میں روسی دوسری زبانوں پر بازی لے گئے ہیں۔ وہاں پچھلے چالیس برس میں دنیا کی ایک سو بائیس زبانوں میں کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔۔ سنہ ۱۹۵۵ میں ۵۹ زبانوں کی کتابیں شائع ہوئی تھیں۔ اس سال ۵۴ ہزار ۳۲۷ کتابیں شائع ہوئیں ہیں۔ صرف ۱۹۵۵ء میں غیر ملکی زبانوں میں ۴۲۸۲ کتابوں کے تراجم ہوئے۔ جن کی ایک ارب جلدیں فروخت ہوئیں۔ جاپان میں ۱۲۰۳، امریکہ میں ۸۱۸، انگلینڈ میں ۶۵۹ کتابوں کے تراجم ہوئے۔ لینن کی کتابوں کے ۱۴ ممالک میں ۳۷۱، بائبل کے ۱۱ ممالک میں ۹۹ تراجم، ٹالسٹائی کے ۱۲ ممالک میں ۲۰۰ تراجم، شیکسپئر کے ۲۲ ممالک میں ۴۷ زبانوں میں تراجم ہوئے اور چرچل کے چھ ممالک میں چھ زبانوں میں تراجم ہوئے۔ جاپان میں ۱۹۵۳ء میں ۲۳۶۰ غیر ملکی کتابوں اور ۱۹۵۵ء میں ۱۲۰۳ غیر ملکی کتابوں کے تراجم ہوئے تھے۔ روزانہ ایک کروڑ ساٹھ لاکھ اخبار شائع ہوتے ہیں جو ضخامت میں دنیا کے تمام اخباروں سے زیادہ ہے۔

سنگی کتابیں، کاغذی پیراہن

(گلدستۂ تحریر، عظیم تعلیم، اعتدال کا اصول)

یونس خان

چینی تاریخ میں ۷۷۱ ق م سے ۴۷۶ ق م تک کا دور ''بہار اور خزاں'' کے نام سے منسوب ہے۔ چینی زبان میں اصطلاحی طور پر ایک سال کی مدت کو ''بہار اور خزاں'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ کنفیوشس ''بہار اور خزاں کے دور'' کے خاتمے سے پچھتر سال قبل، ۵۵۱ ق م میں، شمالی چین کے جزیرہ نما شانڈوگ میں چینی تہذیب کے گہوارہ دریا زرد اور اس کے معاون دریاؤں ہان اور ہوائی کی وادی میں واقع ریاست لُو کے علاقے کوفو (Kufu)، میں پیدا ہوا۔ اس کا خاندانی نام ''کنگ'' یا ''کونگ'' تھا اس کی دانائی کے پیش نظر اسے احترامی طور ''کونگ زی'' یا زیادہ احترام کی خاطر ''کونگ فوزی'' کہا جانے لگا۔ سترہویں صدی میں چین جانے والے یسوعی مبلغین نے اسے لاطینی صورت دیتے ہوئے کنفیوشس بنا دیا۔

کنفیوشس نے ریاست لُو (Lu) کی ۷۲۲ ق م سے اپنی وفات ۴۷۹ ق م تک کے دور کی تاریخ کو سرکاری روزنامچوں کی بنیاد پر ''بہار اور خزاں کی تاریخ'' کے عنوان سے مرتب کیا۔ ''بہار اور خزاں کی تاریخ'' کا شمار کنفیوشس کی مرتب کردہ ''پانچ شہکار چینی کتابوں'' میں ہوتا ہے۔ باقی چار کتابوں میں ''شاعری کی کتاب، تاریخ کی کتاب، مناسک کی کتاب اور تبدیلیوں کی کتاب'' شامل ہیں۔ بالعموم اس میں ایک اور کتاب کا اضافہ بھی کیا جاتا ہے اور وہ ہے ''موسیقی کی کتاب''۔

''بہار اور خزاں'' سے منسوب دور میں جاگیرداری نظام کافی کمزور ہو گیا تھا اور حکمران چاؤ (Zhou) خاندان کے پاس برائے نام اختیارات رہ گئے تھے۔ آہستہ آہستہ جاگیرداروں نے اپنے اپنے راجواڑے اور خود مختار ریاستیں قائم کر لیں اور پھر طاقتور بڑی ریاستوں نے کمزور چھوٹی ریاستوں پر قبضہ کر کے انہیں اپنی اپنی ریاستوں میں ضم کرنا شروع کر دیا۔

پانچویں صدی قبل مسیح کے اختتام تک پہنچتے پہنچتے بہت ساری ریاستیں ختم ہو گئیں یا دوسری ریاستوں میں ضم ہو گئیں اور اسی طرح جنوب میں واقع دو نمایاں ریاستوں چُو (Chu) او

رُ وُو (Wu) نے چاؤ(Zhou) خاندان سے آزادی حاصل کر لی۔ جب کہ ریاست جِی (Jin) میں اختیارات کی کشمکش اس حد تک بڑھی کہ چھ بڑے جاگیردار گھرانوں میں لڑائیاں شروع ہوگئیں۔ یہیں سے ''متحارب ریاستوں کا دور'' شروع ہوا۔ ۴۷۵ ق م میں شروع ہونے والی ان جنگوں کے نتیجے میں ۴۵۷ ق م سے ۴۰۳ ق م کے عرصہ میں ریاست جِی (Jin) تین حصوں: ہان (Han)، ژاو (Zhao) اور وئے (Wei) میں تقسیم ہوگئی۔ جبکہ باقی چار ریاستیں چن (Qin)، چِی (Qi)، چو (Chu) اور یان (Yan) پہلے سے ہی آپس میں متحارب تھیں۔ اب یہ ساتوں طاقتیں آپس میں برسرپیکار تھیں۔

''خزاں اور بہار'' کے ابتدائی دور میں لُو ایک طاقتور ریاست کے طور پر موجود تھی۔ اس کی مخاصمت شمالی ریاست چِی (Qi) سے تھی۔ بار بار کی جنگوں نے ریاست لُو (Lu) کو کافی حد تک کمزور کر دیا تو ایک چھوٹی اور کمزور ریاست ہونے کے ناطے ریاست لُو جنوبی طاقتور ریاست چُو کے زیرِ فرمان آ گئی۔ یہ ریاست کنفیوشس کی پیدائش کے حوالے سے مشہور ہے۔ تاہم چِی اس تمام عرصے میں ایک مضبوط طاقت کے طور پر موجود رہی۔ ۲۴۹ ق م میں ریاست چُو نے ریاست لُو پر قبضہ کرلیا۔ اسی اثنا میں مغرب میں واقع ریاست چِن (Qin) نے بھی طاقت پکڑنا شروع کر دی۔ ریاست چِن نے ۲۳۱ ق م میں ریاست ہان پر قبضہ کرلیا اور اگلے ۹ سالوں میں باقی ۶ ریاستیں بھی چِن کے زیرِ تسلط آ گئیں۔ آخری ریاست چِی تھی جس پر ۲۲۱ ق م میں چِن نے قبضہ کر کے متحدہ چین کی بنیاد رکھی۔ اس کا پہلا بادشاہ شی ہونگ دِی کہلایا۔ شی ہونگ دِی پچھلے پچیس سال سے ریاست چِن کا بادشاہ تھا۔ وہ تیرہ برس کی عمر میں ریاست چِن کا بادشاہ بنا تھا۔

شی ہونگ دِی نے متحدہ چین کا اختیار سنبھالتے ہی اپنے مخالفین کو قتل کرنا شروع کر دیا۔ اسی کے حکم پر ۲۱۳ ق م میں کنفیوشسی مکتب فکر کی نا صرف کتابیں جلائی گئیں بلکہ تین سال بعد ۴۶۰ دانشوروں کو بھی زندہ دفن کر دیا گیا۔ وہ غالباً ان دانشوروں سے ''آبِ حیات'' کے متعلق جاننا چاہ رہا تھا۔ موت کے خوف اور اَمر ہو جانے کی خواہش کے زیرِ اثر اس نے پارے کی گولیاں کھانا شروع کر دیں جس کے باعث وہ اسی سال ۲۱۰ ق م میں صرف ۴۹ سال کی عمر وفات پا گیا اور اگلے چار سال میں چِن پر اس کے خاندان کی حکومت بھی ختم ہوگئی۔ اس سے پہلے کسی ایک خاندان کی حکومت صدیوں تک محیط ہوتی تھی جبکہ چِی ہونگ دی اور اس کا خاندان متحدہ چین پر صرف چودہ سال حکومت کرسکا لیکن وہ چین کو متحد رکھنے میں کامیاب رہا۔

چِی خاندان (۲۲۱ ق م تا ۲۰۶ ق م) کے بعد ہان خاندان (۲۰۷ ق م تا ۲۲۰ء) بر سر اقتدار آ گیا۔ اس خاندان نے کنفیوشس کے نظریات کو نہ صرف سرکاری طور پر اپنا لیا بلکہ تعلیم اور

انصاف کے معاملات میں کنفیوشس کی تعلیمات سے مدد لی بھی جانے لگی جب کہ شاہی ملازمت کے لئے کنفیوشس کی ''پانچ کتابوں'' کا مطالعہ بھی لازمی قرار دے دیا گیا۔ یہ کتابیں تھیں: ''شاعری کی کتاب''، ''تاریخ کی کتاب''، ''مناسک کی کتاب''، ''تبدیلیوں کی کتاب'' اور ''بہار اور خزاں کی تاریخ''۔

وقت کے ساتھ ساتھ ان کتابوں میں دو مزید کتابوں کا بھی اضافہ ہو گیا ان میں ایک کتاب تھی ''والدین کے ساتھ حسن سلوک'' اور دوسری کتاب تھی ''گلدستۂ تحریر''۔ بعد میں سول سروس کے امتحانات کے لئے پرانی پانچ کتابوں کے مقابلے میں ''چار کتابوں'' کو اہمیت دی جانے لگی اور یہ چار کتابیں تھیں: ''عظیم تعلیم''، ''اعتدال کا اصول''، ''گلدستۂ تحریر (Analects)'' اور ''مینگ زی (Mencius)''۔

''گلدستۂ تحریر'' کو ''متحارب ریاستوں کے دور'' کے دوران مرتب کیا گیا۔ ابتدائی ہان دور کے دوران اسے پانچ کتابوں پر شرح کی حثیت سے اہمیت حاصل رہی بعدازاں اسے ''پانچ کتابوں'' سے زیادہ اہم سمجھا جانے لگا۔ ہان خاندان کے بعد آنے والے سانگ خاندان (۹۶۰ء تا ۱۲۷۹ء) نے مضبوط مرکزی حکومت قائم کر لی تھی جس کو چلانے کے لئے ماہر نوکر شاہی درکار تھی جس کے انتخاب کے لئے مہارت اور استحقاق کو مدنظر رکھتے ہوئے باقائدہ ایک امتحانی نظام کو فروغ دیا گیا اور ان چار کتابوں کو باقاعدہ امتحانی سلیبس کا حصہ بنا دیا گیا۔ اس کے بعد آنے والی حکومتیں بھی اس امتحانی نظام سے چھٹکارا حاصل نہ کر سکیں۔ یہ امتحانی نظام ماسوائے ایک چھوٹی سی رکاوٹ کے ۱۹۰۵ء تک مسلسل جاری رہا۔ اس طرح دو ہزار سے زائد سالوں تک یہ کتابیں چینی معاشرت کا حصہ رہیں۔

دوسری طرف کتابیں جلائے جانے کے واقعے کے بعد کنفیوشسی مبلغین اور طالب علموں نے انہیں پتھر کی سلوں پر کندہ کر کے محفوظ بنانا شروع کر دیا۔ سب سے پہلی سرکاری کوشش کے نتیجے میں ۱۷۵ء تا ۱۸۳ء کے دوران کنفیوشس کی ''سات کتابوں'' کو پتھر کی ۴۶ سلوں پر کندہ کر کے شاہی درسگاہ کے باہر استادہ کیا گیا تا کہ کنفیوشس کی کتابوں کو زمانے کی دست و برد سے بچایا جا سکے مزید یہ کہ ان کتابوں کے متن کو بھی کسی بھی قسم کی تبدیلیوں سے محفوظ رکھا جا سکے۔ ان کتابوں کی چند باقیات ہی اب محفوظ ہیں۔ ان کتابوں کو ''زِی پنگ کی پتھر کتابیں'' کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد بھی ان کتابوں کو بچانے کے لئے سنگی کتابوں میں منتقل کیا جاتا رہا۔ ایسی ہی ایک کوشش ۲۴۱ء میں کی گئی۔ تب ان کتابوں میں ''مینگ زی'' بھی شامل کر لی گئی۔ پتھر کی سلوں پر کندہ کی گئی ان کتابوں میں سے ۱۹۰ کتابیں آج بھی بیجنگ کے ''کنفیوشس معبد'' میں محفوظ ہیں۔ جبکہ ''گلدستۂ تحریر'' کا

شمار آج کے یورپ میں سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتابوں میں ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کتابوں کے نئے سے نئے تراجم مارکیٹ میں آ رہے ہیں۔

کنفیوشس کی تحریروں کو ترجمہ کرنا ایک مشکل کام ہے چونکہ مشرقی تصورات، اقدار اور روایات کو سمجھنا مغربی ذہن کے لئے ایک مشکل امر ہے یہی وجہ ہے کہ پہلے سے چھپی ان کتابوں کو آج بھی اَپ ڈیٹ کیا جا رہا ہے۔ فلسفے کی دیگر کتابوں کی طرح ان کتابوں کو بھی مناسب طور پر ترجمہ کرنا ممکن نہیں ہے۔ اس مجموعے میں کنفیوشس کی ''چار کتابوں'' میں سے تین کتابوں ''گلدستہء تحریر''، ''عظیم تعلیم'' اور ''اعتدال کا اصول'' کو اکٹھا کیا گیا ہے۔ یہ ترجمہ بہت جلد مارکیٹ میں دستیاب ہوگا۔

''گلدستہء تحریر'' کا چارلس مُلّر (پیدائش ۱۹۵۳ء) کا ترجمہ کافی معیاری ہے۔ انڈیانہ یونورسٹی کے آر۔ اینو نے بھی اسے کافی محنت سے حال ہی میں ترجمہ کیا ہے۔ ایڈورڈ سلنگر لینڈ کا ترجمہ بھی قابل قدر ہے۔ قدیم ترین ترجمہ جیمز لیگی (۱۸۱۵ء ۔ ۱۸۹۷ء) کا ہے جو ۱۸۶۱ء میں شائع ہوا۔ ارتھر ویلے (۱۸۸۹ء ۱۹۶۶ء) کا ۱۹۳۸ء میں شائع ہونے والا ترجمہ بھی اہمیت کا حامل ہے لیکن ان تمام تراجم میں بہت ساری جگہوں پر اختلاف موجود ہے جو یہ بتاتا ہے کہ کنفیوشس کو سمجھنا ایک مشکل کام ہے۔

ہمہ گیر طور پر یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ کنفیوشس کے حقیقی خیالات اور نظریات کی صحیح عکاسی ''گلدستہء تحریر'' میں ہی کی گئی ہے۔ کنفیوشس کی گفتگو، آرا اور تمثیلات پر ۴۹۹ حکایتوں کو ''گلدستہء تحریر'' میں اکٹھا کیا گیا ہے۔ جنہیں ۲۰ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اس کی تدوین مبینہ طور پر کنفیوشس کے شاگردوں اور ان کے شاگردوں سے منسوب ہے۔ اس کتاب کا مقدمہ محترمہ سیمیں کرن نے لکھا ہے۔

کچھ کتابوں کے بارے میں

ڈاکٹر انوار الحسن

کتابیں انسانی تمدن کا اہم جزو ترکیبی ہیں اور انھیں علوم و معارف نیز تہذیب و ثقافت کا سب سے بڑا ذریعہ کہا جا سکتا ہے۔ کتابیں اچھی بھی ہوتی ہیں اور بری بھی، وقتی بھی ہوتی ہیں اور دیرپا بھی۔ یعنی کبھی تو ایسی کتابیں ملتی ہیں جو بہت زود اثر ہوتے ہوئے بھی ان کے اثرات عارضی ثابت ہوتے ہیں۔ ایسی کتابیں بھی ہوتی ہیں جو اگرچہ زود اثر نہ ہوں لیکن ان کے اثرات پائیدار ہوتے ہیں اور وہ اپنے قاری پر نہ مٹنے والے اثرات چھوڑ جاتی ہیں۔ ان کے نقوش بڑے گہرے اور دیرپا ہوتے ہیں۔ عمر کے کسی حصہ میں بھی ان کے نفوذ و اثرات عارضی نظر آتے ہیں اسی لیے انگریزی زبان کے مشہور ادیب، دانشور اور ماہر تعلیم جان رسکن John Ruskin نے کتابوں کی دو ہی قسمیں قرار دی ہیں یعنی وقتی اور دیرپا۔

کتابوں کی فنا اور بقا اس پر منحصر نہیں ہوتی اور نہ ہو سکتی ہے کہ وہ قاری کو کس درجہ محظوظ کر سکتی ہیں۔ بلکہ اس کا انحصار اس جذبہ پر ہوتا ہے جس کے زیر اثر ان کی تصنیف عمل میں آتی ہے یا اس کے محتویات کس حد تک کارآمد مفید اور فکر انگیز ہیں یا نہیں ہیں۔

آپ کی نظر سے اکثر ایسی کتابیں گزری ہوں گی جو آجھی کہی جا سکتی ہیں کیوں کہ وہ ہر طرح زبان و بیان کی خوبیوں سے آراستہ اور دلچسپ مضامین کی حامل ہیں لیکن اس کے باوجود ایک لمحاتی تاثر ہی پیدا کرنے پر قادر ہوتی ہیں۔ ایسی کتابوں کی اہمیت وقت کے ساتھ ختم ہوتی رہتی ہے۔

چھپی ہوئی اچھی وقتی کتاب کسی شخص کی مفید اور خوشگوار گفتگو کے مانند ہوتی ہے جس سے بالمشافہ گفتگو کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ کبھی کبھی ایسی کتاب بہت مفید بھی ثابت ہوتی ہے کیوں کہ اس سے انسانی ضرورت کے مسائل پر روشنی پڑتی ہے۔ اکثر ایسی کتاب قاری کے لیے بہت خوشگوار بھی ثابت ہوتی ہے جیسے کہ کسی دانا اور عقلمند دوست کی گفتگو ہو سکتی ہے۔ لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ سفرنامے روئیدادیں معاصرانہ مباحث، سیاسی ترقیمے، جذباتی ناولیں اور مخصوص حالات کی نمائندہ تصانیف......ان سب کے پس پشت عصری تقاضے ہوا کرتے ہیں۔ جو شخصی میلانات سے ہم آہنگ

ہو کر عارضی دلکشی کا باعث بنتے ہیں اور اکثر انھیں بہت مقبولیت بخش دیتے ہیں۔ مگر یہ عارضی دلکشی کی حامل تحریریں بہت جلد گمنامی اور عدم توجہی کا شکار بھی ہو جاتی ہیں۔ انھیں ایک بار پڑھ کر برا تو کوئی نہیں کہتا لیکن بار بار پڑھنے کی تمنا بھی کسی دل میں نہیں اٹھتی۔

غور کیجیے کہ ہمارے دوستوں کے خطوط پر لطف وار اہم تو ضرور ہو سکتے ہیں لیکن وہ محفوظ رکھنے کے قابل ہیں یا نہیں ہیں یہ غور کرنے کی بات ہے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ کسی دن کا اخبار اس دن صبح ناشتہ کے وقت ہی موزوں ہوتا ہے اور اگر دوسرے دن کے ناشتہ کے وقت وہی اخبار پڑھا جائے تو اس کی طلسمی کشش ختم ہو چکی ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسی روز کا اخبار بھی دن بھر کے مطالعہ کی چیز نہیں قرار دی جا سکتی ہے۔

ایک لمبا چوڑا مجلد خط جس میں سرایوں، سڑکوں یا موسم کے دلچسپ بیانات ہوں۔ یا جس سے کوئی دلچسپ کہانی معلوم ہوتی ہو، یا کچھ مخصوص واقعات پر روشنی پڑتی ہو، وہ وقتی اعتبار سے خواہ کتنا ہی اہم کیوں نہ ہو اس پر کتاب کی تعریف کا اطلاق اس وقت تک ہرگز نہیں ہو سکتا اور نہ وہ مطالعہ کی چیز ہوتی ہے جب تک اس کے مضامین میں آفاقیت اور ندرت نہیں ہوتی۔ جیسے اردو زبان کے مشہور شاعر مرزا اسد اللہ خاں غالب کے خطوط اگرچہ ایک خاص عہد سے متعلق ہیں لیکن ان کی افادیت مسلّم ہے اور ان کی آفاقیت اس بات کی متقاضی ہے کہ اسے بار بار پڑھا جائے امام ربانی مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ کے مکتوبات اگرچہ ان کے زمانے کے مسائل اور حالات کی نشان دہی کرتے ہیں لیکن ان کی آفاقیت اور ان کے مضامین اور محتویات کی ندرت ہر زمانے میں ان کی افادیت کی ضمانت کرتی ہے۔ اردو کے صاحب طرز ادیب و انشاء پرداز مولانا ابوالکلام آزاد کے وہ خطوط جو احمد نگر جیل کے زمانۂ اسیری میں لکھے گئے اور ہمارے ملک کے برطانوی حکمرانوں کے حکم کے تحت جیل کی چہار دیواری سے باہر نہیں بھیجے جا سکے تھے، ان کے قید سے رہا ہونے کے بعد ۱۹۴۵ء میں ''غبار خاطر'' کے نام سے شائع ہوئے۔ پہلی مرتبہ یہ خطوط منظر عام پر آئے اور مکتوب الیہ نے بھی انھیں شائع شدہ صورت میں پایا۔ ان خطوط کی نہ صرف ادبی اہمیت مسلّم ہے بلکہ ان کے مضامین بھی آفاقیت کے حامل ہیں۔ ۱۹۴۵ء سے اب تک ان کے نہ جانے کتنے ہی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ دنیا کی مختلف زبانوں میں ان کے ترجمے کیے جا چکے ہیں اور آج بھی ان کا سلسلہ جاری ہے۔ لیکن یہ سب مستثنیات کے زمرے میں آتے ہیں اور ان کی افادیت اور ہمہ گیری ان کے بقائے دوام کی ضامن ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ ''کتاب'' کا اطلاق صرف اسی پر ہوتا ہے جو کسی مخصوص نظریہ یا بات کو باقی رکھنے کے لیے لکھی گئی ہو۔ عام طور پر گفتگو اور مکالمہ کی حیثیت والی کتاب صرف اس لیے طبع کی

جاتی ہے کہ اس کا مصنف ہزاروں لوگوں سے بہ یک وقت رابطہ قائم نہیں کرسکتا۔ کہا جاتا ہے کہ ''المکتوب نصف الملاقات'' یعنی خط نصف ملاقات کا درجہ رکھتا ہے۔ اور ملاقات میں گفتگو ہوتی ہے ضروری نہیں کہ وہ گفتگو منظّم، بالترتیب اور باسلیقہ ہو۔ کبھی یہاں کی اور کبھی وہاں کی۔ لیکن جن خطوط کی کتابی صورت میں مرتب کیا جاتا ہے اور جنھیں بقائے دوام کا درجہ دیا جاتا ہے ان میں ایسے مسائل بیان کیے جاتے ہیں جن میں کوئی نہ کوئی نظم وسلیقہ ہوتا ہے، ترتیب ہوتی ہے اور ان کی تشکیل اگر کتابی صورت میں کی جاتی ہے تو بھی وہ پائیدار ثابت ہوتے ہیں۔ ایسی صورت میں شائع کرنے والے خطوط ''کتاب'' کا روپ دھارنے کے بعد اس کے مصنف کی آواز کی توسیع واشاعت کا سبب بن جاتے ہیں۔ یاد رہے کہ کسی دور دراز ملک میں رہنے والے دوست اور ملاقاتی سے یا کسی انجانے عقیدت مند سے بالمشافہ گفتگو ناممکن ہوتی ہے اس لیے اسے بھی خط لکھا جاتا ہے۔ یہ آواز کا ترسیلی عمل ہے۔ لیکن کتاب درحقیقت کسی آواز کی توسیع واشاعت کے نقطۂ نظر سے نہیں لکھی جاتی ہے بلکہ اس بات یا خیال کو محفوظ رکھنے کی غرض سے وجود میں آتی ہے جنھیں اس کا مصنف برقرار رکھنا چاہتا ہے۔ اور کتاب کا مصنف اسی بات یا خیال کو برقرار رکھنا چاہتا ہے اور پائیدار بنانا چاہتا ہے جو اس کے نزدیک مفید، خوش نما اور پائیدار بنانے کے قابل ہو۔ اور جہاں تک اس کے علم میں ہے اس خیال یا بات کو کسی اور مصنف نے اس طرح پیش نہیں کیا ہے جس طرح وہ کہہ رہا ہے۔

کتاب کو بہترین دوست قرار دیا گیا ہے اور کوئی شخص بہترین دوست اسی وقت قرار دیا جاسکتا ہے جب وہ دوستی کے تمام شرائط پر پورا اترے۔ شیخ سعدیؒ نے بہترین دوست کی تعریف یوں کی ہے:

دوست آں باشد کہ گیر دوست دوست
در پریشاں حالی و در ماندگی

یعنی پریشانی اور درماندگی میں کسی کی دست گیری نہ کرنے والا دوست نہیں قرار دیا جاسکتا کیوں کہ دوست تو وہی ہوتا ہے جو مصیبت میں کام آئے۔ مصیبت ذہنی جو جسمانی ہو، اعصابی ہو یا فکر خیال سے متعلق ہو۔ کتاب کو بہترین دوست اسی لیے بتایا گیا ہے کہ وہ قاری کی ہر ممکن مدد کرتی ہے۔ اس کے ذہن کو جلا بخشتی ہے اس کے اعصاب کو تقویت دیتی ہے۔ اس کی عقل و تمیز میں اضافہ کرتی ہے اور فکر انگیز لمحات میں اس کی مدد کرتی ہے۔ کتاب کی شکل میں اس کا مصنف اپنے قاری کی مدد کرتا ہے، تسکین دیتا ہے، رہ نمائی کرتا ہے، دست گیری کرتا ہے اور اپنے نئے انکشافات سے اس کے ذہن کے بند دریچوں کو کھول دیتا ہے۔

اسی لیے مصنف پر ضروری اور لازم ہے کہ اگر ممکن ہو تو وہ اپنے خیالات کو وضاحت اور

خوش اسلوبی سے بیان کرے تاکہ اس کا قاری کسی پیچیدگی کا شکار نہ ہو۔ اگر مصنف سے ممکن ہوتا ہے تو وہ بہ خوشی اسے یہ کہہ کر ہمیشگی بخشنے کے لیے لکھ ڈالتا ہے یا چٹانوں پر تحریر کر دیتا ہے کہ ''یہ میری زندگی کا بہترین سرمایہ ہے اور یہی وہ چیز ہے جو تمھارے یاد رکھنے کے قابل ہے۔''

اسی کو مصنف کی تخلیق کہا جا سکتا ہے اور صرف یہی ''کتاب'' کہلانے کی مستحق ہے۔ اسی کو پائیداری اور بقائے دوام کی ضمانت حاصل ہوتی ہے۔ فردوسی کا شاہنامہ، عمر خیام کی رباعیات، مولانا روم کی مثنوی معنوی، سعدی، حافظ، نظیری، عرفی اور دوسرے بہت سے شعرا کی تخلیقات اسی زمرہ میں آتی ہیں۔ ایسی ہی ایک تخلیق پر سیف الدولہ اور کافور کے درباری شاعر ابو طیب نے دعویٰ نبوت کیا تھا اور ''متنبی'' کے نام سے مشہور ہوا تھا۔

زندگی کے موڑ پر کتاب

ڈاکٹر سلیم اختر

میری زندگی بہت محدود رہی ہے اور پاکستانیوں کی اکثریت کی مانند خاصی سپاٹ اور بے رنگ بھی۔ اور پھر جس پیشہ سے متعلق ہوں اس میں کوئی ایڈونچر اور تھرل بھی تو نہیں۔ سال بہ سال عدم دلچسپی کے شکار نالائق طلباء کو میر، غالب اور اقبال کے فن کی نزاکتوں اور خیالات کی لطافتوں سے روشناس کرانا فطری طور پر تو بڑا مستحسن کام ہے لیکن عملاً سخت بور اور اعصاب شکن۔

خارجی زندگی کے جمود اور کولہو کے بیل جیسی یکسانیت سے مقابلہ کرنے کے لئے میرے پاس صرف ایک ہتھیار ہے اور وہ ہے کتاب۔ اور یہ کچھ آج سے نہیں بلکہ بچپن سے ہے۔ اب تو خیر میں پھر بھی لوگوں سے تھوڑا بہت مل لیتا ہوں اور خوش ہو جاتا ہوں (یا کم ازکم خوشی کا ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہوں) لیکن بچپن میں تو میں بے حد تنہائی پسند اور مردم بیزار تھا۔ میں نے اس میلان پر قابو پانے کی کوشش بھی کی لیکن بالآخر اس میں ناکامی کا اعتراف کر کے خود کو اپنے اعصاب کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا۔ یوں لوگوں سے کٹ کر میں نے کتابوں سے دوستی کی۔ بہت کم لوگوں کو یہ علم ہے میں ٹرینڈ لائبریرین بھی ہوں اور کالج میں آنے سے پہلے اسی پیشہ سے وابستہ تھا۔ لائبریری میں ملازمت کی بڑی وجہ بھی یہی تھی کہ مجھے بآسانی کتابیں ملتی رہیں گی۔

میں نے پنجاب یونیورسٹی او پنجاب پبلک لائبریری میں ملازمت کی تھی) مگر لائبریرین کی تربیت کا ایک نقصان بھی ہوا کہ مجھے کتاب کا احترام کرنا آ گیا شاید اسی لئے نہ میں کتاب پر نشانات لگا سکتا ہوں نہ تصویریں پھاڑ سکتا ہوں اور نہ ہی کسی دوست کی مستعار لی ہوئی کتاب ہضم کر سکتا ہوں۔ میں کتاب کو اس حد تک صاف دیکھنا چاہتا ہوں کہ میں اپنی کتابوں پر اپنا نام تک بھی نہیں لکھا۔

مجھے بچپن میں کھلونوں سے کھیلنا تو یاد نہیں لیکن کتابیں پڑھنا یاد ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ والدین ایسے ملے جنہیں خود مطالعہ کا شوق تھا اس لئے مجھے کبھی بھی چھپ کر مطالعہ کرنے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ مطالعہ کی رفتار اور میری ذہنی استعداد کا یہ عالم تھا کہ میں چوتھی جماعت تک تیرتھ رام فیروز پوری کے جاسوسی تراجم اور ایم اسلم کے لاتعداد ناول پڑھ چکا تھا اور آٹھویں

جماعت تک میں ترقی پسند ادیبوں کو پڑھ رہا تھا (میرے لکھنے کا بھی کچھ ایسا ہی حال رہا۔ پہلی کہانی پانچویں جماعت میں چھپی جب کہ آٹھویں جماعت میں ایک فلمی پرچہ میں پہلے دو افسانے طبع ہوئے)

میں کالج میں فلسفہ، معاشیات اور فارسی کا طالبعلم تھا جب کہ بی اے میں نے فلسفہ اور اردو کے ساتھ کیا۔ اگر چہ آج میرا امیج نفسیات دان کا لیکن کالج میں مجھے نفسیات کے مقابلہ میں فلسفہ سے کہیں زیادہ دلچسپی تھی۔ ایف اے میں منطق اور نفسیات پڑھاتے تھے جب کہ بی اے میں اخلاقیات اور نفسیات کے پرچے ہوتے تھے۔ مجھے منطق میں dalimma ایسے دقیق مسائل زیادہ پسند تھے جب کہ بی اے میں اپنے شوق میں جمالیات وغیرہ خود ہی پڑھ ڈالی۔ (میں نفسیات کی طرف کیسے آیا؟ یہ الگ حصہ ہے جس کا یہ محل نہیں)

جس شخص کا اتنا مطالعہ ہو اور جسے منطق اور فلسفہ سے شغف ہو اس کے لئے کسی ایسی کتاب کی نشاندہی بہت مشکل ہے جس نے اسے بطورِ خاص متاثر کر کے زندگی کے بارے میں اس کی ویژن میں تبدیلی پیدا کر دی ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک وقت ایسا آتا ہے جب بہت زیادہ کتابیں پڑھنے والا سینما سکرین کی مانند ہو جاتا ہے جس پر رنگوں کی پچکاریاں نہیں چلتیں لیکن جو بالآخر سفید ہی رہتا ہے۔

میں بی اے میں تھا اور اخلاقیات کے ضمن میں نصاب کے علاوہ بھی بہت کچھ پڑھ چکا تھا کہ میں نے اناطول فرانس کے ناول ''تائیس'' کا مطالعہ شروع کیا۔ ''تائیس'' میرے لئے محض ایک ناول نہ ثابت ہوا بلکہ یہ ایک تجربے سے گذرنے کے مترادف تھا۔ شرابور کر دینے والا تجربہ۔ اپنے رنگ میں رنگ دینے والا تجربہ۔

''تائیس'' ایک طوائف ہے جسے ایک خدا پرست راہِ راست پر لانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کی نیکی سے متاثر ہو کر تائیس تو تائب ہو جاتی ہے جبکہ اسے نیکی کی راہ دکھانے والا خود صراطِ مستقیم سے بھٹک کر خدا اور مذہب سے منکر ہو جاتا ہے۔ ناول ختم کیا تو میرے ذہن میں زلزلہ آ چکا تھا۔ فلسفہ اخلاق کے ضمن میں اب تک جو پڑھا تھا وہ بے معنی نظر آنے لگا اور اخلاق کے معیار (کم ازکم خرد کی حد تک) بےکار ثابت ہو کر رہ گئے۔ عمر بھر کی ریاضت، تپسیا، عبادت، نیکی جو تناور اشجار کی مانند نظر آتی ہیں درحقیقت اتنی کمزور اور بے جڑ ہیں کہ ''جنس'' کے ایک جھونکے میں زمیں بوس ہو جاتی ہیں۔ زنجیروں جیسے مضبوط اخلاقی معیار عورت کے لمسِ لطیف سے پگھل کر رہ جاتے ہیں۔ جب پرہیزگاری کے پہاڑ مرد پر سے اس کے خوف کی برف پگھلتی ہے تو اندر سے کیسا ابلتا لاوا برآمد ہوتا ہے۔ تب مجھے پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ اخلاق کا کوئی اجتماعی تصور تو ہو سکتا ہے مگر انفرادی نہیں۔

فرد کے لئے اخلاق، مذہب، خدا، ایمان وغیرہ لبادوں کی حیثیت رکھتے ہیں اور کسی کا بھی لبادہ اتنا مضبوط یا دیرپا نہیں کہ ہمیشہ اس کے جسم کی برہنگی چھپا کر جنس کو کیموفلاج کر سکے۔

''تائیس'' نے مجھے لوگوں کی پرکھ کے لئے نیا معیار دیا۔ عام زندگی میں بھی اور اپنے افسانوں کے کرداروں کے لئے بھی۔ اس لئے میں نیک اور پرہیزگار لوگوں سے کبھی بھی متاثر نہیں ہوتا کہ جانتا ہوں انہیں بھی اپنی ''تائیس'' نہیں ملی اسی لئے یہ اپنی برف میں مگن ہیں کہ جب گناہ گار شخص آئینہ کی طرح صاف شفاف دھلا دھلایا نظر آتا ہے۔ آئینہ شبیہ منعکس کرسکتا ہے برف نہیں اس سے بحیثیت نقاد مجھے تخلیق کار کی پرکھ کے لئے بھی ایک معیار ملا۔ تخلیق کار کو Moral یا Immoral ہونے کے برعکس Amoral ہونا چاہئے۔ اس سے ڈپٹی نذیر احمد اور مرزا رسوا کے فن میں بنیادی فرق کو سمجھا جاسکتا ہے۔

''تائیس'' کا موضوع عالمی حیثیت کا حامل ہے چنانچہ اور بھی کئی تخلیق کاروں نے اس پر لکھا۔ انگریزی میں سمرسٹ ماہم کا ''The Rain''، ہندی میں بھگوتی چرن ورما کا ''چتر لیکھا'' اور اردو میں ''منٹو کا افسانہ'' (اور بعد ازاں ڈرامہ) کروٹ ان سب کا موضوع ایک ہی ہے۔ یوں دیکھا جائے تو انسانی شخصیت میں خیر اور شر کی کشمکش کا یہ موضوع چار مختلف زبانوں میں اظہار پاتا ہے اور اس سے فرد کی زندگی میں اس کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے۔

پاکستان میں کتاب بینی میں انحطاط کیوں؟

افضل توصیف

میں تین سال پہلے دہلی میں تھی۔ وہاں کتابوں کی بہت بڑی نمائش لگی ہوئی تھی۔ ہم لوگ بھی دیکھنے گئے۔ بے حساب کتابیں تھیں۔ لوگ خرید رہے تھے۔ وہاں ٹیلی ویژن والے بھی تھے۔ انہوں نے مجھے گھیر لیا۔ پوچھا کیا کتابوں کی طرف سے رجحان کیوں ہٹ رہا ہے اور کتابیں اب کیوں کم فروخت ہو رہی ہیں۔ کم چھپ رہی ہیں میں نے حیرت سے ان سے پوچھا کہ کم چھپ رہی ہیں؟ یہ دیکھیے اتنی کتابیں ہیں۔ نئی دہلی کی نمائش ہے۔ چالیس ریاستوں سے کتابیں آئی ہیں۔ یہاں لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگے ہیں۔ لوگ تھیلے بھر بھر کر کتابیں لے جا رہے ہیں۔ لیکن اس سوال کے پیچھے ایک حقیقت بہر حال تھی۔ اور یہ صورت حال یقیناً موجود ہے۔ وہاں بھی محسوس کیا گیا۔ لیکن اس کی وجہ زیادہ تر جو لوگ بتا رہے تھے وہ انتہائی کھوکھلی تھی۔ مثلاً کہا گیا کہ اس کی وجہ کمپیوٹر آیا ہے۔ وہاں تو یہ شکایت نہیں ہے۔ وہاں یقیناً ہر ایک کے پاس کمپیوٹر ہے لیکن وہاں تو کتابوں کی اشاعت میں کمی نہیں ئی، کتابیں پڑھنے والوں میں کمی نہیں آئی۔ کتاب کی اہمیت کم نہیں ہوتی۔ جاپان میں تو لوگ کتاب اپنے ساتھ رکھتے ہیں۔ جہاں وقت ملا۔ بس سٹاپ پہ، اسٹیشن پہ ٹرین میں وہ اپنے بیگ سے کتاب نکالتے ہیں اور پڑھنے میں لگ جاتے ہیں۔ ہمارے ہاں بھی یہی ہوا کرتا تھا۔ مجھے خود اپنے بارے میں یاد ہے کہ جب ہمیں کوئٹہ وغیرہ جانا ہوتا تھا تو اپنے سامان میں کھانے پینے کی چیزوں کے علاوہ کتابیں ضرور رکھتے تھے بلکہ بہت زیادہ رکھتے تھے کہ چوبیس گھنٹے کا سفر ہے بدل بدل کر کتابیں پڑھنے سے سفر مزے سے کٹ جائے گا۔ پھر ہمارا طالب علمی کا زمانہ تھا۔ ہم لوگ یہاں ہاسٹل میں تھے۔ دل کرتا تھا کہ اچھے اچھے پرنٹس کی قمیضیں خریدیں۔ کریم بخش پہ چلیں پیسے بہت تھوڑے ہوتے تھے لیکن جب لینے نکلتے تھے تو دیکھتے کہ عصمت چغتائی کی کوئی کتاب آئی ہے۔ کرشن چندر کی کوئی نئی کتاب آئی ہے تو سوچتے چھوڑو جی سب کچھ۔ چنانچہ قمیض کی خریداری رہ جاتی اور ہم کتاب لے کر واپس آ جاتے۔ ایک اور بات جو مجھے یاد آ رہی ہے وہ یہ ہے کہ بے شمار کتابیں میرے استادوں نے مجھے پڑھائیں۔ سعید صاحب کا نام تو سرفہرست ہے۔ سارے ہی استاد کتابوں میں دلچسپی پیدا کرتے تھے۔ وہ کتابوں کے نام لیتے۔ اچھی اچھی کتابوں کا تذکرہ کرتے اور پھر ہم سے پوچھتے کہ کیا ہم نے یہ پڑھی ہیں؟ جب ہمارا سر جھک جاتا تو

کہتے اچھا یہ بھی آپ نے نہیں پڑھا۔ اگلے دن ہم کتابوں کی دکانیں چھان مارتے لائبریریوں کے چکر لگاتے کہ وہ کتابیں مل جائیں جن کا ذکر سعید صاحب نے کیا تھا۔ اگلی دفعہ وہ پھر ذکر کریں گے اور پوچھیں گے کہ کیا ہم نے یہ کتاب پڑھی یا نہیں تو شرمندگی ہوگی۔ تو یوں بہت ساری کتابیں استادوں نے ہم سٹوڈنٹس کو نہ صرف پڑھائیں بلکہ مطالعہ کی لت لگا دی۔ اس کے بعد کی جنریشن یعنی اساتذہ کی جنریشن میں وہ بات نہیں رہی ہوگی۔ یہ بظاہر چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں لیکن ان کے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ اگر کتاب لکھنے میں کتاب چھپنے میں اور کتاب پڑھنے میں زوال ہے تو پاکستان میں اور کسی چیز میں زوال نہیں۔ کیا تعلیم میں زوال نہیں۔ کیا تعلیم کا وہ معیار رہ گیا ہے۔ جو کبھی تھا۔ آپ کورسز کی کتابیں دیکھ لیں۔ پہلے ان میں اچھے اچھے آتھرز شامل ہوتے تھے چنانچہ کورس کی کتابوں میں انہیں پڑھ کر طالب علم ان آتھرز کو مزید پڑھنا چاہتا تھا۔ اب سفارشی قسم کے لوگوں کی چیزیں کورس میں شامل ہوتی ہیں۔ بلکہ رائلٹی کا چکر ہوتا ہے۔ کورسز کے معیار بری طرح سے گرے ہیں۔ لاہور جو کتابوں کا گڑھ تھا جہاں کتابیں لکھنے والے اور پڑھنے والے موجود تھے۔ یہاں پر دیکھیے اب ان پڑھتا کتنی ہوگئی ہے۔ کتاب کلچر ختم ہوگیا ہے۔ کلچر کا بہت بڑا حصہ کتاب ہے۔ کتاب کا لکھا جانا، چھپنا، فروخت ہونا اور پڑھا جانا۔ کتاب کلچر بناتا ہے وہ لوگ جو کتاب لکھتے ہیں۔ وہ لوگ جو کتاب چھاپتے اور بیچتے ہیں اور وہ لوگ جو کتاب خریدتے اور پڑھتے ہیں۔ آپس میں جڑے ہوتے ہیں۔ اب ان تینوں کو علم ہے کہ یہ ایک کلچرل بحران ہے۔ سارے ہی کلچر اور ساری ہی تہذیب میں بری طرح بحران آیا ہوا ہے۔ گراوٹ آئی ہے۔ پھر ہماری ایک بات ہے جو تحمل سے سن لینی چاہیے کہہ دینی چاہیے اس میں کوئی پردہ یا چھپانے کی ضرورت نہیں۔ وہ یہ ہے کہ ہم لوگ سوچتے نہیں۔ پڑھتے نہیں ہم لوگ سے مراد ہم سبھی لوگ ہیں اپنے آپ کو بھی اس میں لیتی ہوں۔ حالانکہ میں بہت پڑھتی ہوں۔ ہم لوگ سوچتے سمجھتے نہیں۔ جب کوئی مسئلہ آتا ہے تو سوچتے سمجھتے نہیں۔ مثلاً ٹیلی ویژن پہ کسی نے کوئی بات کہہ دی اور ہم نے یقین کرلیا۔ مثلاً کسی نے کہا کہ یہ ساری مصیبت کمپیوٹر کی پیدا کردہ ہے۔ ہم اسی کو دہراتے چلے جارہے ہیں۔ دیکھیے بات یہ ہے کہ ہمارے لاکھوں بچے کمپیوٹر کے سامنے بیٹھتے ہیں۔ اگرچہ پانچ فی صد لوگوں سے زیادہ کے پاس کمپیوٹر نہیں ہے لیکن جو لوگ کمپیوٹر کے آگے بیٹھتے ہیں وہ اس کے ذریعے پڑھتے کب ہیں۔ ہاں بس چیٹنگ ویٹنگ کر لی۔ سنجیدگی سے بیٹھ کر کمپیوٹر پر نہ تو کوئی لٹریچر پڑھتا ہے اور نہ ہی کسی اور موضوع یا کتاب تک پہنچتا ہے، میں تو کمپیوٹر پہ نہیں پڑھتی۔ مجھے تو کتاب ہی اچھی لگتی ہے۔ کتنے لوگ ہیں جو کمپیوٹر کو مطالعہ کا ذریعہ بناتے ہیں۔ بس ایک ڈھکوسلہ ہے کہ کمپیوٹر نے انحطاط پیدا کردیا ہے۔ ہم سوچنا اور سمجھنا ہی نہیں چاہتے۔ یہ دراصل ایک بحران ہے۔ کتاب تو کلچر کا ایک حصہ

ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ سب کتابیں اچھی نہیں ہوتیں۔ زیادہ پبلشرز نے کمتر کتابیں چھاپنا شروع کر دی ہیں۔ایسی کتابیں شائع ہورہی ہیں جس سے نئی جنریشن کا ذوق خراب ہورہا ہے۔ چنانچہ نئی نسل کے لوگ سنجیدہ کتابوں کی طرف نہیں آتے۔اچھی کتابیں چھاپنے والوں کی شکایات کی بھی ایک لمبی فہرست ہے۔ان کی شکایت ہے کہ کتاب بکتی نہیں۔ کتاب اس لیے زیادہ لوگ نہیں خریدتے کہ وہ مہنگی ہے۔لیکن یہ بات بھی نہیں ہے کچھ اور بات ہے میں اپنے سرکل میں اپنی دوستوں میں خواتین میں کہا کرتی ہوں کہ ہماری خواتین مہنگے مہنگے ڈریسز تو خرید لیتی ہیں۔ جیولری خرید لیتی ہیں۔ فنکشنوں پر بڑا بڑا خرچ کرتی ہیں لیکن جب کتاب کا معاملہ آتا ہے۔تو خریدنے کی زحمت نہیں کرتیں، مثلاً میری کوئی کتاب آئے تو کہتی ہیں ارے تم نے ہمیں اپنی نئی کتاب ہی نہیں دی۔ وہ پانچ دس ہزار روپیہ خرچ کر کے آ رہی ہوتی ہیں۔لیکن دواڑھائی سو کی کتاب نہیں خریدتیں۔ان کی خواہش ہوتی ہے کہ کتاب ہمیں مفت مل جائے۔ ہزاروں روپے کا لباس پہنا ہوگا۔ پندرہ سو کی تو جوتی پہنی ہوگی لیکن کتاب کے معاملے میں کنجوسی پر اتر آئیں گی۔ مجھ سے گلہ کرتی ہیں کہ میں نے انہیں اپنی کتاب نہیں دی۔ میں یہاں کمزور پڑ جاتی ہوں۔انہیں کہہ نہیں سکتی کہ یار یہ سوٹ ذرا کم قیمت خرید لینا تھا۔اوراس سے ہونے والی بچت سے کتاب خرید لیتیں۔ میری کتاب خری لیتی تو مجھے ہی فائدہ ہوتا۔لیکن ان کا استدلال یہ ہوتا ہے کہ .... لے تیری کتاب.......... تیری کتاب کسراں خرید لیے۔توں دے ناں فیر پڑھاں گے۔تو یہ رویہ ہے تعلیم یافتہ طبقہ کا کوئی کتاب دے دے تو ٹھیک ہے ورنہ خرید کر نہیں پڑھنی۔اور پھر کتابیں خریدنا انہیں گھر کی لائبریری میں جمع کرنا پنجاب میں تو بالکل ختم ہو گیا ہے۔سندھ میں ابھی یہ صورت نہیں۔ وہاں کتاب لکھنے، چھپنے خریدنے اور پڑھنے کی حالت اتنی خراب نہیں ہوئی۔ جتنی پنجاب میں ہوئی ہے۔ یہ معاملات کیا ہیں؟ اس صورت حال کا مقابلہ کیسے کرنا ہے۔ہم سب کو سوچنا ہوگا۔ یہ کہہ کر نہیں ٹالا جا سکتا کہ بے شمار غریبی ہے۔ساری دنیا میں غریبی ہے۔ ہماری غریبی اور نوعیت کی ہے۔ہمیں اس معاملے میں سوچنا چاہیے۔علم کا معیار گرا ہے۔تناسب کم ہوا ہے لائبریریوں بہت کم رہ گئی ہیں۔آپ ذرا پبلک لائبریریوں کا حال جا کر دیکھیں۔ ہمارے وقت میں تو سکول میں بھی لائبریری ہوتی تھی۔انگریز نے سکولوں میں بھی لائبریری پہ توجہ دے رکھی تھی۔اب اتنے بڑے شہر میں جو ماضی کے مقابلے میں سو گنا بڑھ گیا ہے۔لیکن لائبریریوں کی تعداد میں اضافے کی بجائے کمی آئی ہے۔ جو ہیں وہ بھی ٹوٹی پھوٹی ہوئی ہیں۔ وہاں نئی کتابیں نہیں ملتی۔ کتابوں کی خریداری میں ایک نیا سلسلہ چل پڑا ہے۔ خریداری لائبریری کے کلرکوں کے ذریعے ہوتی ہے۔ وہ کمیشن کے چکر میں اور ذاتی مفاد میں گھٹیا کتابیں خرید لیتے ہیں۔لوگوں کی ان میں دلچسپی نہیں ہوتی۔ چنانچہ اب سوچنا ہے کہ کتاب کلچر کو

زوال کیوں آیا ہے؟ کتاب کے لیے ذوق شوق کیوں ختم ہو گیا ہے۔ بالخصوص پنجاب میں ایسا کیوں ہے؟ میں بلوچستان کو جانتی ہوں۔ وہاں لوگوں میں نئی کتاب کا شوق ہے۔ سندھ میں بھی کتاب چھپتی اور جلد فروخت ہو جاتی ہے۔ مثلاً میری کتاب جو پنجاب میں نہیں بکتی وہ سندھ میں زیادہ بکتی ہے۔ سندھ کے لوگوں میں زیادہ شوق ہے۔ ان لوگوں کے لیے کتابوں کا کوئی اہتمام نہیں جو سچ مچ کتاب نہیں خرید سکتے۔ لیکن پڑھنا چاہتے ہیں۔ کچھ حلقوں میں میری ایک کتاب گئی تو انہوں نے کہا کہ کوئی سو لوگوں نے یہ پڑھی ہے۔ کچھ لڑکیوں نے کتاب سامنے رکھ کر پنسل سے پوری کتاب نقل کر لی۔

آج یہ سب کچھ خیال و خواب لگتا ہے۔ حالانکہ ہمیں پہنچنا تو اس منزل پہ چاہیے تھا جو ترقی یافتہ ممالک میں پبلشرز کی ہے۔ وہاں لاکھوں کی تعداد میں کتاب چھپتی ہے اور جس رائٹر کی ایک کتاب مقبول ہو جائے اس کی سات پشتیں سنور جاتی ہیں۔ لیکن ہوا یوں کہ ہمارے ہاں جو ایک ہزار کی تعداد تھی وہ سقوط مشرقی پاکستان کے ساتھ کم ہو کر سات سو رہ گئی اور اس کے بعد آہستہ آہستہ کم ہو کر پانچ سو رہ گئی۔ اب حالت یہ ہے کہ کتاب دو سو چھپتی ہے یا تین سو چھپتی ہے۔ چنانچہ اس کی لاگت پر کاپی بڑھنا لازمی ہے۔ دوسری بات کتاب کی فروخت کی ہے اب یہ معاملہ خریدنے والے سے تعلق رکھتا ہے کہ آپ کی جیب میں پیسے کتنے ہیں آپ یقین جانیے کہ لوگ کتابیں خریدنا چاہتے ہیں۔ دلچسپی بھی رکھتے ہیں۔ کتاب سے محبت بھی کرتے ہیں۔ ہمارے پاس ایسے بچے بھی آتے ہیں جو ہاسٹل میں رہتے ہیں انہیں ماہانہ اخراجات کے لیے گھر سے دو اڑھائی ہزار روپیہ ملتا ہیا اس میں سے وہ ایک ہزار روپیہ بچا کر کتابیں خریدنے چلے آتے ہیں۔ ان کے پاس بھی چوائس یہ ہوتا ہے کہ وہ پینوراما سنٹر سے جینز خرید لیں یا پھر کتاب لیکن ہوتا یہ ہے کہ جب وہ ایک ہزار روپیہ جیب میں ڈال کر آتے ہیں۔ تو پہلی صف میں انہیں فراز کی کتاب نظر آتی ہے۔ وہ لے لیتے ہیں پھر انہیں پروین شاکر کی کتاب نظر آتی ہے وہ اسے بھی لے لیتے ہیں۔ اور پھر تارڑ کی کتاب نظر آتی ہے اور یہیں ان کے پیسے ختم ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ وہ بکنرز کی طرف آ ہی نہیں سکتے۔ ان کی پر چیز کپیسٹی ہی اتنی ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کتاب کی قیمت زیادہ ہے لیکن اس ک وجہ یہ ہے کہ تعداد کی وجہ سے کاسٹ پر کاپی بہت زیادہ ہے۔ اور پھر باقی چیزوں کی شرح بھی اسی حساب سے بڑھی ہے سونا اسی حساب سے بڑھا ہے۔ آٹا اسی حساب سے بڑھا ہے۔ کاغذ بھی اس حساب سے بڑھا ہے چنانچہ کتاب کی قیمت بھی بڑھی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ہم اس صورت حال کو کس طرح بہتر کر سکتے ہیں۔ سب سٹڈی دے سکتے ہیں کیسے بہتر کر سکتے ہیں لوگوں کی عادات مطالعہ کو کیسے بہتر بنا سکتے ہیں تاکہ کتاب کی اشاعت میں اضافہ ہو سکے۔

(لاہور میں ۱۱ مئی ۲۰۰۲ء کو منعقدہ ایک تقریب میں کی گئی تقریر)

قرنِ اول کی کتابیں

مولانا عبداللہ عمادی

عام طور پر لوگوں کا خیال ہے کہ دوسری صدی ہجری سے قبل مسلمانوں نے تصنیف و تالیف کا آغاز نہیں کیا تھا اور اسلامی تعلیمات کا وہ ایمان افروز مجموعہ جسے حدیث اور اخلاقیات کہتے ہیں تقریباً ایک صدی تک غیر مرتب رہا۔ ان کے خیال میں تصنیف کی ابتداء ابن جریج (وفات ۱۵۰ھ) سے ہوئی اور پھر امام مالکؒ (وفات ۱۷۹ھ) نے ''موطا'' لکھ کر متعاقبین کے لئے تصنیف وتالیف کا راستہ کشادہ کر دیا۔ پس کتاب ابنِ جریج اور موطا دوسری صدی کی ہجری کی تالیفات ہیں

اس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کا ایک صدی تک غیر منظبط رہنا ایک نکتہ سنج کی نگاہ میں ضرور کھٹکتا ہے اور اسی بنا پر یورپی اقوام نے اسلام پر صدہا اعتراضات کئے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک فاش تاریخی غلطی ہے اور افسوس کی بات ہے کہ امام ذہبی اور حافظ ابنِ حجر جیسے نامور اور باکمال محدثین بھی اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔

اگرچہ مسلمان ہمیشہ مذہبی تعلیمات کے لئے قرآن حکیم ہی کو حرفِ اول و آخر سمجھتے رہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ قانون تمدن کی پہلی دفعہ (تصنیف وتالیف) سے بے خبر رہے۔ بلاشبہ عرب میں کتابت کا رواج نہ تھا۔ نزولِ قرآن سے قبل بمشکل بارہ یا تیرہ اشخاص کو لکھنا آتا تھا اور اگر کوئی لکھائی کے ساتھ تیراندازی و پیراکی بھی جانتا تھا تو وہ صاحبِ کمال سمجھا جاتا۔ تمام ملک عرب اسی جہالت میں مبتلا تھا لیکن آفتابِ اسلام کے طلوع ہوتے ہی ان عربوں نے ''طلع الصباح وطفی المصباح'' کے فقرہ کو سچ کر دکھایا۔ مسلمانوں نے تمدن کی مختلف شاخوں میں ترقی کی۔ حدیث کی کتابیں اسی زمانہ میں تالیف ہوئیں لیکن تالیف کے لئے جس تہذیب وترتیب کی ضرورت پڑتی ہے اس کے آثار دوسری صدی ہجری میں قائم ہوئے۔ مولفین ان ہی مکمل ومرتب تالیفات کو دوسری صدی ہجری کی یادگار بتاتے ہیں۔ ورنہ یہ ایک حقیقت ہے کہ حضرت علیؓ کی کتاب القضایا اور حضرت ابنِ عباسؓ کی حدیث کی کتاب تیسویں ہجری ۳۰ھ تک تالیف ہو چکی تھیں۔

مگر یہ کتابیں مختصر وناکافی تھیں یہی وجہ ہے کہ ابنِ شہاب زہری نے جب ایک مبسوط کتاب لکھی تو یہ بات مشہور ہوئی کہ حدیث کے سب سے پہلے مولف و مدون ابنِ شہاب زہری ہیں جن کو حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اس کام پر مامور کیا تھا۔ اسی طرح ابوبکر خرمی نے بھی حضرت

عمر بن عبدالعزیزؒ کی ترغیب پا کر حدیث کی کتابیں تالیف کی تھیں۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی وفات ۱۰۱ھ میں ہوئی، لہٰذا اس کام کے آغاز کو پہلی صدی ہجری سے ہی نسبت ہوتی ہے۔ مسلمان عموماً اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ حدیث کی کتابیں دوسری صدی میں ابتداً سعید بن ابی عروبہ، ربیع بن صبیح، ابنِ جریج، اور مالک بن انس نے تالیف کیں۔ ان میں کی آخری تالیف (موطا) موجود ہے جسے اسلامی تمدن کی پہلی کتاب کہتے ہیں

تاریخ شاہد ہے کہ ہجرت کے پچیس تیس سال بعد مسلمانوں نے کتابت کی طرف توجہ کی اور مختلف عنوانات پر کتابیں لکھنا شروع کیں۔ زائدہ بن قوامہ نے جو حسن بن عطیہ کے ساتھ جنگ روم میں شہید ہوئے فنِ حدیث، تفسیر، تجوید اور اخلاقیات پر کئی کتابیں لکھی تھیں۔ ابن الندیم نے ان کی کتاب السنن، کتاب القرات، کتاب التفسیر، کتاب الزہد اور کتاب المناقب کا تذکرہ کیا ہے۔

امیرِ معاویہؓ کے حکم سے عبید بن شریہ جرہمی نے اقوام عالم کی ایک تاریخ مرتب کی، عوانہ نے سوانح حیات پر ایک کتاب لکھی اور امیرِ معاویہؓ کی سوانح بھی لکھی۔ کتاب الفہرست کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ دونوں ایک ہی کتاب ہیں۔

فن تفسیر کی ابتداء بھی اسی عہد میں ہوئی۔ حضرت علیؓ اکثر اوقات قرآن مجید کے مطالب بیان کرتے۔ حضرت ابوحمزہ شمالی سنا کرتے۔ انہیں اسی طرح تفسیرِ قرآن لکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ چنانچہ ان کی تیار کردہ تفسیر کئی جلدوں پر مشتمل تھی ایک جلد میں بسا اوقات سات سو یا اس سے زیادہ اوراق ہوتے۔

ان کتابوں میں عنوان ہمیشہ مختلف النوع ہوتے۔ مثلاً مسلہ خلافے کے متعلق ابنِ ہیثم کی ''کتاب الامامہ'' اور ''کتاب الاستحقاق''، علمِ تاریخ میں اشنانی کی کتاب ''فضائل علی و مقتل حسن بن علی'' اور علم کلام میں ''سلیم بن قیس ہلالی'' نامی کتابوں میں یہ جدت بہ وضاحت نظر آتی ہے۔

اق قرنِ اول (ساتویں صدی عیسوی) میں نہ صرف حدیث، تفسیر، کلام اور سیرت میں تصنیف کا آغاز ہوا بلکہ حسبِ ضرورت اکثر علوم وفنون مثلاً علمِ طب و کیمیا کی طرف بھی توجہ کی گئی اور ان پر متعدد کتابیں لکھی گئیں۔

غیر زبانوں کے عربی ترجمہ اسی عہد کی پیداوار ہیں۔ مثلاً خالد بن یزید کے لئے کئی کتابیں یونانی سے عربی میں ترجمہ ہوئیں۔ لیکن واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ خالد کے دادا حضرت امیرِ معاویہؓ اس سلسلہ میں اولیت کے مستحق ہیں جن کے حکم پر ملکِ شام کے ایک عیسائی طبیب ''ابنِ اثال'' نے طبی کتابیں یونانی سے عربی میں ترجمہ کیں۔ خالد بن یزید نے چند یونانیوں کو جو مصر

میں پناہ گزیں تھے ملکِ شام طلب کیا اور ان سے فنِ کیمیا وطب کی یونانی اور قبطی کتابوں کا عربی ترجمہ کرایا۔ علامہ ابنِ ندیم نے کتاب الفہرست میں پہلی صدی ہجری کی کیمیائی تصانیف اور تراجم کی ایک طویل فہرست پیش کی ہیں، مثلاً کتاب الحرارت، کتاب الوصیت وغیرہ۔

عموماً خالد بن یزید کا ''خزانۃ الکتب'' پہلا اسلامی کتاب خانہ سمجھا جاتا ہے اور ہم بھی اس کتاب خانہ کی وسعت، حسنِ انتظام، کتابوں کی فراوانی اور خوبی وکمال کو دیکھ کر اس رائے کو تسلیم کرتے ہیں لیکن فی نفسہ اس سے قبل بھی کتاب خانے کا وجود ثابت ہوتا ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ ابن ابی بعرہ کا کتابخانہ ہر لحاظ سے قابلِ قدر تھا جو ۶۲ھ کے بعد قائم ہوا تھا۔ محمد بن اسحاق صاحبِ مغازی متوفی ۱۵۰ھ نے بچشمِ خود اس کتابخانے کو دیکھا اور ان کا بیان ہے کہ ابنِ ابی بعرہ کو ان کے ایک دوست نے جو کوفہ کے سربرآوردہ تھے مرتے وقت یہ کتابخانہ حبہ کیا تھا۔ واللہ اعلم

معاشرے میں ''مطالعے کا قحط''

شاہنواز فاروقی

قحط پڑتا ہے تو لاکھوں لوگ بھوک سے مر جاتے ہیں اور قحط کی خبر ہر اعتبار سے عالمگیر ہو جاتی ہے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ قحط ایک انتہائی غیر معمولی صورت حال ہے اور بھوک سے لاکھوں افراد کا ہلاک ہو جانا دل دہلانے والا واقعہ ہے۔ لیکن پوری دنیا بالخصوص پاکستان میں مطالعے کا قحط پڑ گیا ہے اور اس سے ہر سال لاکھوں افراد روحانی، ذہنی، نفسیاتی اور جذباتی موت کا شکار ہو رہے ہیں لیکن یہ صورت حال ابھی تک اخبارات میں ایک کالم کی خبر بھی تخلیق نہیں کر سکی ہے۔ اس کی وجہ ہے۔ لوگ جسمانی غذا، اس کی قلت اور اس قلت کے مضمرات کو سمجھتے ہیں، مگر وہ اس حقیقت کا ادراک کرنے میں ناکام ہیں کہ انسان کو جس طرح جسمانی غذا کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح روحانی، ذہنی، نفسیاتی اور جذباتی غذا بھی درکار ہوتی ہے اور مطالعہ اس غذا کی فراہمی کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔ معاشرے میں جن لوگوں کو حقیقت احوال کا تھوڑا بہت اندازہ ہے انھوں نے مطالعے سے گریز اور اس کو نظر انداز کرنے کے سلسلے میں طرح طرح کے عذر تراش لیے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک عذر یہ ہے کہ کتابیں، رسالے اور اخبارات مہنگے ہو گئے ہیں۔ اور یہ بات ایک حد تک درست ہے۔

لیکن اس حوالے سے جب ہم اپنے معاشرتی منظرنامے پر نظر ڈالتے ہیں تو یہ ہولناک حقیقت سامنے آتی ہے کہ ہم دو کروڑ کا گھر خریدتے ہیں، اس میں 20 لاکھ کی دو، دو، تین، تین گاڑیاں رکھتے ہیں۔ اس گھر میں زندگی کی مہنگی سے مہنگی آسائش موجود ہوتی ہے مگر چھوٹا سا کتب خانہ نہیں ہوتا۔ حالانکہ ایک وقت وہ تھا جب متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والے گھروں میں بھی سو، ڈیڑھ سو کتابیں ضرور ہوتی تھیں، مگر اب ہماری جھونپڑیوں میں کیا ''محلوں'' میں بھی کتب خانہ نہیں ہوتا۔ ہم پانچ ہزار کا جوتا خریدتے ہیں اور اسے سستا سمجھتے ہیں، لیکن 200 روپے کی کتاب کو ہم مہنگا کہتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ اب اکثر کتابوں کا ایڈیشن ایک ہزار کتابوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ ان میں سے دو، تین سو کتابیں مصنف خود دوستوں میں مفت تقسیم کر دیتا ہے، باقی کتابیں تین چار سال تک کتب فروشوں کے یہاں پڑی رہتی ہیں۔ چنانچہ اب دیکھنے میں آ رہا ہے کہ بہت سی کتب پانچ

سو کی تعداد میں شائع ہوتی ہیں اور عام طور پر ان کی اشاعت خود مصنف کے سرمائے سے ہوتی ہے۔ پاکستان کی آبادی 17 کروڑ ہے اور ملک میں شائع ہونے والے تمام اخبارات ورسائل کی مجموعی اشاعت بیس پچیس لاکھ سے زائد نہیں۔ اخبار کا مطالعہ، مطالعے کی سیڑھی کا پہلا پائیدان ہے، لیکن اس پائیدان کی حالت بھی خستہ ہے۔ اخبارات کے قارئین کا کافی بڑا حصہ ''مانگ کر'' اخبار پڑھتا ہے۔ جو لوگ خرید کر اخبار پڑھتے ہیں ان کی اکثریت پورا اخبار نہیں پڑھتی۔ اکثر قارئین اپنی دلچسپی کی خبریں پڑھتے ہیں۔ کم لوگ اخبار کی تمام خبریں ملاحظہ کرتے ہیں۔ اس سے بھی کم لوگ وہ ہیں جو اخبار کے کالم یا اداریہ پڑھتے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ اخبار کے اکثر قارئین کا مطالعہ، مطالعہ کم اور اخبار کے ساتھ تانک جھانک یا ''Flirt'' زیادہ ہوتا ہے۔ اس صورت حال نے معاشرے میں ''مطالعے کا قحط'' پیدا کر دیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس قحط سے نجات کیسے حاصل کی جاسکتی ہے؟

یہ زیادہ پرانی بات نہیں کہ برصغیر کی معاشرت میں علم وادب کا چرچا تھا۔ آج ہمارا کوئی ادبی رسالہ پانچ سو یا ہزار سے زیادہ شائع نہیں ہوتا لیکن ساٹھ، ستر سال پہلے اردو کے بعض ادبی جرائد کی ماہانہ اشاعت 75 ہزار سے زیادہ تھی۔ اس وقت بعض شاعر، ادیب اتنے مقبول تھے کہ ان کو فلمی اصطلاح میں ''سپر اسٹار'' کہا جاسکتا ہے۔ اس زمانے میں پانچ دس ہزار افراد کے مشاعرے چھوٹے یا اوسط درجے کے کہلاتے تھے۔ تجزیہ کیا جائے تو اس فضا کا سب سے بڑا سہارا ہماری زبانی روایت Oral Tradition تھا۔ اس زمانے میں کوئی گھر ایسا نہ تھا جہاں کہانیاں سنانے والا، لہک لہک کر نظمیں پڑھنے والا اور پہیلیاں بوجھنے والا نہ ہو۔ اس زمانے کی کہانیاں متنوع ہوتی تھیں، ان میں مذہبی اور تاریخی قصے تھے۔ بادشاہوں، جنوں اور پریوں کی کہانیاں تھیں۔ ان میں انسان کی روح، قلب، ذہن اور تخیل کے لیے بہت کچھ تھا۔ ان قصوں اور کہانیوں سے بچوں میں مذہبیات اور ادب کا ذوق وشوق پیدا ہو جاتا تھا اور بچے اس ''سمعی علم'' کے ساتھ آسانی سے کتاب کی محبت میں گرفتار ہونے کے قابل ہو جاتے تھے۔ اس وقت مشاعرے کا ادارہ اتنا مستحکم اور طاقت ور تھا کہ جو ایک بار مشاعرے میں چلا جاتا تھا اسی کا ہو کر رہ جاتا تھا۔ اس وقت مشاعرے میں اتنی جان تھی کہ اگر کوئی شخص صرف مشاعرے کی روایت سے وابستہ ہو جاتا تھا اور لکھی ہوئی شاعری نہیں بھی پڑھتا تھا تو بھی اس کا شاعرانہ ذوق نکھر جاتا تھا۔ یہ ذوق اکثر لوگوں کو شاعری ہی نہیں ادب کی دیگر اصناف کی طرف لے جاتا تھا۔ پہیلیاں بظاہر معمولی چیز نظر آتی ہیں مگر ان میں ایک شعریت بھی تھی اور یہ صلاحیت بھی کہ وہ پہیلیاں پوچھنے اور بوجھنے والوں کو اشارے، کنائے اور رمز کی زبان بھی سکھا دیتی تھیں۔ اس گفتگو کا مطلب یہ ہے کہ اگر ہمیں معاشرے میں مطالعے کا ذوق وشوق پیدا کرنا ہے تو اپنی کہانیاں کہنے، نظمیں سنانے اور پہیلیاں بوجھنے کی زبانی

روایت Oral Tradition کو پھر سے زندہ کرنا ہوگا۔ یعنی ہمارے والدین کو اپنے بچوں، دادا دادی اور نانا نانی کو اپنے پوتوں پوتیوں اور نواسے نواسیوں اور بڑے بہن بھائیوں کو اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کے لیے ایک بار پھر کچھ نہ کچھ وقت نکالنا ہوگا۔ اس سے صرف مطالعے کا رجحان ہی پیدا نہیں ہوگا بلکہ خاندانی مراسم بھی بہتر ہوں گے اور ان میں محبت و تعلق کے خیالات و جذبات کی ''نئی سرمایہ کاری'' بھی ہوگی۔ غور کیا جائے تو ہماری زبانی روایت یا Oral Tradition میں دو بڑی خوبیاں تھیں۔ وہ برجستہ بھی تھا اور مرتب یا Institutionalized بھی۔

مطالعے کے رجحان کو مزید مرتب اور منظّم کرنے کے لیے ناگزیر ہے کہ ہم مطالعے کو اپنے پورے تعلیمی نظام کا جز لاینفک بنا دیں۔ اس کی روایتی صورت تو یہ ہے کہ ہمارے معمول کے تدریسی نظام میں لائبریری کے لیے کچھ وقت مقرر ہوتا ہے، اس وقت کو بڑھانے کی ضرورت ہے اور ہفتے میں کم از کم تین پیریڈ لائبریری کے لیے مختص ہونے چاہییں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ہر اسکول، ہر کالج اور ہر یونیورسٹی میں ایک اچھا کتب خانہ موجود ہو۔ تاہم مطالعے کو تعلیمی نظام کا ناگزیر حصہ بنانے کے لیے ضروری ہے کہ پانچویں جماعت سے کتاب بینی ایک لازمی مضمون کے طور پر متعارف کرائی جائے۔ اس مضمون میں بچوں کو کسی بھی موضوع بالخصوص ادبی نوعیت کی تین کتابیں پڑھنا اور پھر ان پر ایک تبصراتی اور تجزیاتی مضمون لکھنا ضروری ہو۔ بڑی جماعتوں بالخصوص یونیورسٹی کی سطح پر کتابوں کی تعداد مزید بڑھا دی جائے اور طالب علموں کے لیے ضروری ہو کہ وہ کتابوں پر لکھے ہوئے اپنے مضمون کو پوری جماعت کے سامنے سنائیں اور اس پر کوئی اعتراض ہو تو اس کا تسلی بخش جواب دیں۔ اس طرح مطالعہ نہ صرف یہ کہ ابتدا ہی سے بچوں کی ''عادت'' بن جائے گا بلکہ ان کے فہم کی سطح بھی بلند ہوگی اور ان کی اظہار کی تمام صلاحیتیں بھی فروغ پائیں گی۔

ہر سطح کے تعلیمی نظام میں تقریر اور تحریر کے مقابلوں کو اس طرح ادارتی یا Institutionalize صورت دینے کی ضرورت ہے کہ ان مقابلوں کی پوری عمارت مطالعے پر کھڑی ہو بدقسمتی سے ہمارے تقریری مقابلوں میں ساری توجہ زورِ بیان پر دی جاتی ہے۔ حالانکہ خطابت میں اصل چیز صداقت اور مواد ہے۔ جس تقریر میں صداقت نہیں اور جس تقریر میں مواد کی سطح بلند نہیں وہ بے کار بلکہ چیخ و پکار ہے۔ ہمارے تقریری اور تحریری مقابلوں کا ایک بڑا نقص یہ ہے کہ ان کے لیے بہت چھوٹے انعامات اور اعزازات رکھے جاتے ہیں حالانکہ ان کے لیے انعام اور اعزاز اتنا بڑا ہونا چاہیے کہ شرکاء مقابلہ جیتنے کے لیے اپنے پورے وجود کی قوت صرف کر دیں۔ ایسے مقابلے اگر ضلعی، صوبائی اور قومی سطح پر منعقد ہونے لگیں تو ان کے معیار اور ساکھ دونوں میں اضافہ ہوگا اور مطالعہ طالب علموں کے لیے محض مشغلہ یا Part Time نہیں رہے گا، ایک ''اہم

ضرورت‘‘ بن جائے گا۔

ہماری قومی زندگی کا المیہ یہ ہے کہ اس میں طاقت، دولت، شہرت اور ان کی اقدار کا غلبہ ہو گیا ہے۔ اس پر طرہ یہ ہے کہ یہ چیزیں چند شعبوں مثلاً سیاست، کھیل، اداکاری اور گلوکاری سے وابستہ ہو کر رہ گئی ہیں۔ چنانچہ نئی نسل کے ہیروز یا تو کھلاڑی ہیں یا اداکار، گلوکار یا سیاست دان۔ اس منظرنامے میں نہ کہیں علم موجود ہے نہ صاحب علم۔ چنانچہ ہماری نئی نسلوں کے لیے علم اور تخلیقی سرگرمیوں میں کوئی کشش نہیں۔ اس صورت حال کی تبدیلی کے لیے ہیروز کی تبدیلی اور ہیروز کی فہرست میں ترجیحات کے اعتبار سے ردوبدل ناگزیر ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ اقتدار اہل علم کے ہاتھ میں ہوتا کہ علم اور طاقت کی یکجائی اجتماعی زندگی کا مرکزی حوالہ بن جائے۔ اس سلسلے میں ذرائع ابلاغ کا کردار اس لیے بنیادی ہے کہ مثالیوں یا Ideals کی تشکیل کے حوالے سے ان کی بڑی اہمیت ہو گئی ہے۔ اخبارات کو طے کرنا ہو گا کہ اگر وہ کھلاڑیوں، اداکاروں اور گلوکاروں کے لیے ہفتے میں ایک صفحہ مختص کرتے ہیں تو انہیں اہل علم کے لیے ہفتے میں کم از کم تین صفحے وقف کرنے ہوں گے، یا اگر ریڈیو اور ٹیلی ویژن ہفتے میں کھلاڑیوں اور اداکاروں کو ایک گھنٹہ دیتے ہیں تو انہیں اہل علم کے لیے تین گھنٹے صرف کرنے ہوں گے۔ ہیروز کی اس پیشکش میں پورے معاشرے کے لیے ایک پیغام ہو گا اور اس کے نتیجے میں ہم پورے معاشرے کو علم اور مطالعہ سے منسلک کر سکیں گے۔

پوری انسانی تاریخ میں کتب خانوں نے مطالعے کے رجحان کو پیدا کرنے، اسے فروغ دینے اور برقرار رکھنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ دنیا کے بڑے شہر دیگر چیزوں کے ساتھ ساتھ بڑے کتب خانوں سے بھی پہچانے جاتے تھے۔ لیکن اب ہمارے ملک کی صورت حال یہ ہے کہ کراچی تقریباً پونے دو کروڑ کی آبادی کا شہر ہے اور اس میں کوئی ایسی لائبریری نہیں جہاں سے کتابیں جاری کرا کے مطالعے کے لیے گھر لائی جا سکیں۔ مثالی بات تو یہ ہے کہ کونسلر کے حلقے کی سطح پر چھوٹی چھوٹی لابریریوں کے قیام کے ذریعے پورے ملک کو کتب خانوں سے آراستہ کر دیا جائے۔ لیکن یہ ممکن نہ ہو تو بڑے شہرون میں دس لاکھ افراد کے لیے کم از کم ایک کتب خانہ ضرور ہونا چاہیے۔

اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ کتابوں کی بڑھتی ہوئی قیمتیں مطالعے کے رجحان کی حوصلہ شکنی کر رہی ہیں۔ کتابوں کی قیمتیں کم کرنے کی تین صورتیں ہیں: ایک یہ کہ ہم اپنے ملک میں ہی کاغذ پیدا کرنے لگیں، دوسرے یہ کہ اشاعتی اداروں کو اس بات کا پابند کیا جائے کہ وہ ہر قابل ذکر کتاب کے مجلد یا Hard Bound اور غیر مجلد Paper Back ایڈیشن شائع کریں تاکہ کم

آمدنی والے افراد بھی غیر مجلد کتاب خرید کر اپنے شوق مطالعہ کی تسکین کر سکیں۔ کتابوں کی قیمتوں کو کم کرنے کی ایک صورت یہ ہے کہ زیادہ تعداد میں شائع ہونے والی کتابوں کی شرح منافع کی حد مقرر کر دی جائے۔

مطالعے کے فروغ کی ایک صورت یہ ہے کہ کتاب کو معاشرے کا سب سے بڑا اور قیمتی تحفہ بنا دیا جائے، یہاں تک کہ معاشرے میں کتاب کا تحفہ دینا اور لینا فخر اور مسرت کی بات بن جائے۔ لیکن ان تمام کاموں سے پہلے معاشرے کو یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ مطالعے کے فوائد بے شمار ہیں۔ انسان کے مشاہدات و تجربات اور خیالات بہت ہونے کے باوجود کم ہی ہوتے ہیں، لیکن مطالعہ مشاہدات، تجربات اور خیالات کا سمندر ہے اور یہ شخص کتاب پڑھتا ہے، یہ سمندر اس کی ذاتی متاع بن جاتا ہے۔ مطالعے کی اہمیت یہ ہے کہ صرف ایک کتاب کا اچھی طرح مطالعہ انسان کو کچھ سے کچھ بنا دیتا ہے۔ انسان جب کتاب پڑھنا شروع کرتا ہے تو وہ کسی اور طرح کا آدمی ہوتا ہے اور جب وہ کتاب ختم کرتا ہے تو کسی اور طرح کا شخص بن چکا ہوتا ہے۔ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اگر ایک کتاب انسان کو اتنا بدل سکتی ہے تو سو کتابیں انسان کو کس طرح تبدیل کر سکتی ہیں۔

مطالعے کا ایک فائدہ یہ ہے کہ یہ انسان کو مرتب اور منظّم انداز میں سوچنا اور اظہار کرنا سکھاتا ہے اور انسان کی کند ذہنی اور گونگا پن دور ہو جاتا ہے۔ مطالعہ کند ذہن شخص کو اوسط درجے کی ذہنی صلاحیت عطا کر دیتا ہے، اوسط ذہنی صلاحیت کے حامل شخص کو ذہین بنا دیتا ہے اور ذہین شخص کو مطالعہ عبقری یا Genius بنا دیتا ہے۔ مطالعہ خود آگہی اور ماحول شناسی کا ذریعہ ہے اور ان دونوں چیزوں کے بغیر انسان اپنی زندگی کی معنویت کا تعین نہیں کر سکتا۔ اس تناظر میں دیکھا جائے تو ایک اچھی اور بڑی کتاب سے زیادہ سستی چیز کوئی ہو ہی نہیں سکتی۔ اچھی اور بڑی کتاب دو سو روپے کی کیا دو ہزار، دو لاکھ یا دو کروڑ روپے کی ہو تو بھی سستی ہے کیوں کہ وہ مٹی کو سونا، حیوان کو انسان اور قبیح کو جمیل بنا سکتی ہے۔

فکشن کی کتابیں کیوں پڑھی جائیں؟

عرفان جاوید

ایک لغت میں 'فکشن' کا ترجمہ 'جعل سازی' مرقوم ہے۔ گویا اس تناظر میں فکشن نگار 'جعل ساز' ٹھیرا۔

شمس الرحمان فاروقی اپنے مضمون ''فکشن کی سچائیاں'' میں رقم طراز ہیں 'فکشن کی پہلی تعریف یہ ہوئی کہ وہ جھوٹ ہوتا ہے' یا سراسر جھوٹ نہیں تو جھوٹ پر مبنی ضرور ہوتا ہے۔' بعدازاں وہ نکتہ آفریں ہیں کہ مبنی بر حقیقت ہونا کیا معانی رکھتا ہے۔ اگر فاروقی صاحب کے استدلال پر بات بڑھائی جائے تو بہ آسانی کہا جاسکتا ہے کہ دو افراد کے درمیان ہونے والا مکالمہ بھی دو مختلف زاویوں سے دیکھا جائے تو اس میں دروغ، مبالغہ، ابہام یا تفہیم کا فرق موجود ہوتا ہے۔

فکشن پر چند نکتہ چیں معترض ہوتے ہیں کہ جب یہ معلوم ہے کہ یہ کسی کے دماغ کی اختراع و ایجاد ہے تو اس مصنوعی دنیا میں داخل ہو کر اپنا قیمتی وقت اور توانائی کیوں کر ضائع کیے جائیں۔ اس استدلال کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ ایسے معترضین کو ایجادات کے استعمال سے بھی اِس بنا پر احتراز کرنا چاہیے کہ ان کے موجد نفوسِ دیگر ہیں۔

چناں چہ اس دل چسپ اور دعوتِ فکر دیتے موضوع پر چند معروضات پیشِ خدمت ہیں۔ ان معروضات میں اس موضوع کی خالص علمی تفہیم، وابستہ اجزا، مطالعۂ فکشن کے فوائد، سائنسی تجربات، فکشن کے نفسیاتی، معاشرتی اور ماوی اثرات، ادب، معاشرہ اور فکشن، معاصر فکشن پر سرسری نظر اور دیگر توجہ طلب امور وغیرہ شامل ہیں۔

فکشن کی علمی تشریح سے پہلے دو چشم کشا امور کا تذکرہ بے جا نہ ہوگا۔

مرد شعوری یا لاشعوری طور پر فکشن یا کہانی کو عورت کے پڑھنے کی شے سمجھتا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ بچپن اور لڑکپن میں اُس نے کہانیاں گھر کی عورتوں کی زبانی سنی ہوتی ہیں سو وہ اس امر کو لاشعوری طور پر عورت سے منسوب کر لیتا ہے۔ بہ نظرِ غائر دیکھا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ہمارے ہاں فکشن کے مطالعے میں عورت مرد پر برتری رکھتی ہے۔ خواتین کے وسیع حلقۂ اشاعت والے ڈائجسٹ، ناول نگاروں کے قابلِ رشک تعداد میں شائع ہونے والے ناول، بلکے

پھلکے سامانِ شوق والے ہفتہ وار رسالے اس خیال کو تقویت دیتے ہیں۔

فکشن کے قاری کو دیگر کے علاوہ فلم بین پر بھی امتیاز حاصل ہوتا ہے۔ قاری بہ ذاتِ خود تخلیق کار و موجد ہوتا ہے۔ اسے خیال، کردار، مناظر، داخلی احساسات وغیرہ کاغذ کے صفحات پر الفاظ کی صورت میں میسر آتے ہیں۔ وہ اس سے اپنے ذہن میں موجود میسر اجزا سے ایک پورا جہان خود تخلیق کرتا ہے۔ ہر قاری کا جہان دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔ وہ اپنے جہان کا خالق ہوتا ہے۔ گویا وہ مطالعے کے توسط سے فن کار اور تخلیق کار ٹھیرتا ہے۔ اس کے برعکس فلم بین کو پکا پکایا پکوان پیش کیا جاتا ہے، نرم غذا دی جاتی ہے۔ چناں چہ ایک فلم، ڈراما، تمثیل وغیرہ میں اُسے وہ آزادئ اختراع میسر نہیں آتی۔ اُسے پیش کیے گئے کو قبول کرنا ہوتا ہے۔

یہ معاملہ فکشن کے مصنف پر منحصر ہے کہ وہ قاری کو ایک جہانِ رنگ و بو کی ایجاد میں کس درجہ مواقع بہم فراہم کرتا ہے اور بہ قول نذیر احمد دہلوی 'قیدی' بنا کر رکھتا ہے۔

''ایک قصہ خواں سرِ بازار دل سے بنا بنا کر جھوٹی کہانیاں کھڑا کہہ رہا تھا اور صدہا آدمی اُسے گھیرے کھڑے تھے۔ اتنے میں ایک ریچھ والا ریچھ لیے اُدھر سے نکلا۔ سب لوگ لگے ریچھ کو دیکھنے۔

ریچھ نے کہا ''تم سب لوگ کیا تعجب کے ساتھ مجھے دیکھتے ہو کہ میں خون خوار اور زبردست جان وَر ایک آدمی کی قید میں ہوں۔ ناک چھدی ہے۔ جدھر چاہتا ہے لیے پھرتا ہے۔ اس طرح مجھے تم پر تعجب ہوتا ہے کہ تم سب عقل مند ہو کر اس قصّہ خواں کی قید میں ہو۔ وہ جس بات کی طرف چاہتا ہے تمھیں متوجہ کرتا ہے۔ میری ناک چھدی اور تمھارے کان۔''

فکشن کے لغوی معنی بناوٹ، ساخت، بندش، ایجاد اور اختراع کے ہیں۔ عمومی طور پر اس کی اقسام میں داستان، ناول، افسانہ اور ڈراما شامل ہیں۔

پروفیسر انور جمال نے اپنی عمدہ تصنیف 'ادبی اصطلاحات' میں داستان اور فکشن کو ہم معنی لیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

''اسے اُردو نثر کی اوّلین صنف قرار دیا گیا ہے۔ یہ جھوٹی کہانی یا من گھڑت قصہ ہوتا ہے۔ داستان وہ طویل کہانی ہے جو حقیقی زندگی کے بجائے محیّر العقول واقعات سے تعلق رکھتی ہے۔ ایسی کہانی میں مافوق الفطرت واقعات کا ایک سلسلہ ہوتا ہے۔ داستان میں چوں کہ حواس کے اعتبار میں آنے والے واقعات نہیں ہوتے اس لیے دل چسپی اور تجسّس داستان کے اہم اجزا ہیں۔ دنیا کے قریباً ہر اَدب کے شروعات میں داستان موجود ہے، اس کی وجہ انسان کے شعور کی اوّلین حیرت پسند سطح ہے۔ علم و عرفان کے فروغ اور سائنسی مکاشفات کے باعث ادب داستان کی حیران کن اور

سحر زدہ فضا سے باہر نکلا۔ اُردو اَدب میں داستان، ناول، ناولٹ، افسانہ اور طویل مختصر افسانے کی مورثِ اعلیٰ ہے۔''

ناول داستان کی جدید اور ترقی یافتہ شکل ہے۔ اس کے لفظی معنی انوکھا، نیا اور نمایاں ہیں۔ عموماً یہ نثری شکل میں ہوتا ہے۔ ناول مغرب سے اُردو میں درآمد ہوا۔ ابتدائی اردو ناول طلسماتی، رومانی اور تاریخی نوعیت کے ہوتے تھے جن کی بعدازاں حقیقت بیانی نے جگہ لی۔ بیس ویں صدی کو اردو افسانے کی صدی کہا جاتا ہے جب کہ اکیس ویں صدی میں اردو ناول بہت تیزی سے آگے بڑھا ہے۔ گو اس میں کسی بڑی آمد کا ہنوز انتظار ہے۔

افسانہ ایک ایسی نثری صنف کو کہتے ہیں جس میں قصہ، کہانی یا واقعہ بیان کیا گیا ہو۔ عمومی طور پر اس میں ایک واقعے یا پہلو کو بیان کیا جاتا ہے۔ وحدتِ تاثر اس کا بنیادی جوہر ہوتا ہے۔ افسانے کے معاملے میں ایک تصحیح ضروری ہے۔ افسانوں کے مجموعے کو غلط العام میں افسانوی مجموعہ کہا جانے لگا ہے جس کی وضاحت لغاتِ روزمرہ میں شمس الرحمان فاروقی صاحب نے کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔

''افسانوی'' کے معنی ہیں ''افسانے کی طرح کا تجسّس انگیز، رومانی اور دل چسپ۔'' مثلاً کسی کی شخصیت کو ''افسانوی'' کہا جاتا ہے، یعنی ایسا آدمی جس کی طرح کا شخص [یقین نہ آنے والے] افسانوں میں ملتا ہو، یعنی جس میں کچھ پُراسراریت ہو اور کشش ہو۔ پھر ''افسانوی'' کے معنی ہیں، ''غیر حقیقی۔'' اس لفظ کے تیسرے معنی ہیں ''بہت مشہور، جسے انگریزی میں Legendary کہا جائے۔'' لیکن آج کل کچھ لوگ ''افسانوں کا مجموعہ'' کے معنی میں ''افسانوی مجموعہ'' لکھنے اور بولنے لگے ہیں لیکن مندرجہ بالا معنی کی روشنی میں صاف ظاہر ہے کہ افسانوں کے مجموعے کو ''افسانوی'' کہنا مضحکہ خیز ہے۔ ''افسانوی مجموعہ'' کی جگہ سیدھا سیدھا ''افسانوں کا مجموعہ'' کہنا چاہیے۔''

فکشن کی صنف ڈراما یونانی الاصل ہے۔ اس کے معنی حرکت کے ہیں۔ گویا یہ زندگی کی متحرک تصویر ہے۔ عمومی طور پر ڈراما ایک خاص ترتیب اور توازن کے ساتھ تمامِ اجزائے داستان کو صوت و آہنگ کے ساتھ پیش کرنے کا نام ہے جب کہ زندگی منتشر اور بعض صورتوں میں بے سروپا حادثات وواقعات کا مجموعہ ٹھیرتی ہے۔

رو میں ہے رخشِ عُمر، کہاں دیکھیے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں
غالب

عمومی طور پر علمائے ادب بہ شمول حسن عسکری، شمس الرحمان فاروقی اور دیگر نے تاریخی فکشن کو فکشن کی عمومی بحث سے خارج رکھا ہے۔ ان کا استدلال ہے کہ تاریخی فکشن کا بنیادی مغز حقیقی واقعات اور کرداروں سے اخذ شدہ ہوتا ہے جس میں زیبِ داستان کے لیے ترامیم کردی جاتی ہیں۔ چناں چہ اس کی بنیادیں حقائق کی زمین میں گڑی ہوتی ہیں۔ سوا سے فکشن کی مکمل تعریف سے مطابقت نہ رکھنے کے باعث ایک استثنا حاصل ہوتا ہے۔

انسان جبلی طور پر مبالغہ پسند ہے۔ ازمنۂ قدیم سے فطرت کے مدوجزر سے جنم لیتے معمولی حادثے کو دیوتاؤں کی ناراضی اور ابرق سے پھوٹتے شعلے کو قدرت کے غضب پر محمول کرتا آیا ہے۔ دیو مالا، ایک انسان سے وابستہ جناتی خصوصیات اور واقعات کی ترتیب میں غیر مرئی قوت کی مداخلت کے خیال کا موجد بھی انسانی دماغ ہے اور اس کا پرستار بھی۔ گویا انسانی دماغ اپنا ہی پرستار ہے۔ شاید خود پسندی اور نرگسیت انسانی دماغ اور سرشت کے تاروپود میں یوں جذب ہے جیسے روح بدن میں۔

مبالغے کے ساتھ ساتھ دروغ بھی انسانی فطرت کو پسند و مرغوب ہے۔ اس کی سب سے اہم مثال فکشن میں موجود مصنف کے تخلیق کردہ ترتیب و اتفاقات ہیں جو حقیقی زندگی میں شاذ و نادر ہی موجود ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ فلم کی عوامی مقبولیت انسان کی دروغ پسندی پر دلالت کرتی ہے۔ فلم میں المیہ و حزنیہ مناظر کے ساتھ موجود موسیقی اور پس منظر میں روشنی اور تاریکی کی کمی و بیشی یقیناً ڈرامائی کیفیات پیدا کر کے انسانی ذہن کو لطف و تحیر فراہم کرتی ہیں۔ گو اِن کا حقیقی زندگی سے تعلق نہیں ہوتا۔ موت کے یا حادثے کے پس منظر میں بجلی کی کڑک، جرائم کے مناظر کے ساتھ نیم تاریکی یا دیگر لوازمات کا عمومی زندگی سے کیا تعلق؟ ایک سڑک پار کرتے راہ گیر کی موت یا بجلی کے تار کو چھو کر جل مرنے والے کوے کی موت کے ماحول میں فرق فقط ناظر کے احساس کا ہے۔ اس میں مبالغہ اور دروغ قصے کو رنگینی اور داستان کو مواد عطا کرتے ہیں۔

دو افراد کے درمیان ہونے والا مکالمہ ان دونوں کے جداگانہ نکتۂ نظر کے مطابق مختلف ہوگا۔ بہرحال اگر معروف معنی میں فکشن اور حقیقت میں تفریق کرلی جائے تو یہ بات طے شدہ ہے کہ کوئی حقیقت مکمل سچ نہیں ہوتی اور کوئی فکشن مکمل جھوٹ نہیں ہوتا۔ فکشن میں پیش آنے والے واقعات یا ادا کیے جانے والے بہت سے مکالمات بہرحال کہیں نہ کہیں کبھی نہ کبھی یا تو پیش آرہے ہوتے ہیں یا آچکے ہوتے ہیں۔ اس جہانِ ممکنات سے مشاہدے، تجربے یا تخیل کو بروئے کار لا کر کشید کیا جانے والا عطر تخلیق کار کے پانچ حواس کی دنیا ہی کا عرق ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ الہام یا وہب بھی بے بہرہ پر نہیں اُترتا، مشاق و تیار کے گمان پر ہی القا کے پرندے بسیرا کرتے ہیں۔

فاروقی صاحب صائب طور پر فکشن کی سچائی کو بیان کرنے کی خوبی پر قلم طراز ہوتے ہیں ''فکشن کو شاعری سے برتر ثابت کرنے کا ایک ذریعہ یہ تھا کہ اگر چہ شاعری پورا سچ نہیں پیش کر سکتی لیکن فکشن یہ کام کر سکتا ہے۔ بہت سے نقادوں کا خیال تھا کہ 'حقیقت' اور 'واقعیت' یا 'حقیقت نگاری' ایک ہی شے ہیں اور واقعیت کی ضد عینیت (Idealism) ہے۔'' مزید برآں وہ کسی واقعے کے فکشن میں ڈھل جانے کی توضیح کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

''ایک مدت ہوئی جب میں نے فکشن کے 'افسانہ پن' کی تعریف یہ کی تھی کہ کوئی واقعہ اس وقت فکشن یا افسانہ بن جاتا ہے جب وہ انسانی سطح پر ہماری دل چسپی کو برانگیخت کرتا ہے۔ مثلاً یہ بیانیہ متن ملاحظہ ہو۔

ایک درخت سے ایک پتا ٹوٹ کر گرا اور نیچے بہتے ہوئے چشمے میں ڈوب گیا۔

یہاں دو واقعات بیان ہوئے ہیں لیکن کوئی واقعہ ایسا نہیں جو ہماری انسانی حیثیت میں ہمارے لیے دل چسپ ہو یا ان میں کوئی ایسی بات بہ ظاہر نہیں ہے جو ہمارے انسانی سروکاروں کے لیے معنی خیز ہو۔ لیکن اگر ہم یہ فرض کریں کہ 'درخت' سے مراد 'شجر حیات' ہے اور درخت کے نیچے جو ندی بہہ رہی ہے وہ موت ہے جو ہر چیز کو بہا لے جاتی ہے اور پتے کا ٹوٹ کر گرنا اور پانی میں غرق ہو جانا کسی زندگی کے ختم ہو جانے کے معنی رکھتا ہے تو ہماری انسانی ہوش مندی ایک حد تک بیدار ہوتی ہے لیکن اس حد تک نہیں کہ ہمیں ذاتی طور پر درخت یا گرتے ہوئے پتے سے کوئی ہم دردی یا ان کے بارے میں کچھ تردّد ہو جائے یا ہم یہ سوچ کر افسوس میں مبتلا ہوں کہ ہمارے ساتھ بھی ایسا ہو سکتا ہے۔''

علاوہ ازیں وہ مذکورہ مضمون میں فکشن کے انسانی سروکار سے معاملے پر زور دیتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''اس مسئلے پر دوبارہ غور کریں کہ کوئی متن افسانہ یا فکشن کب بنتا ہے۔ میرا خیال ہے یہ بات ایک حد تک صاف ہو چکی ہوگی کہ فکشن انسانی صنف سخن ہے، انسان اس میں مرکزی حیثیت رکھتا ہے اور انسان ہمیشہ 'انجام' یا آج کی زبان میں closure چاہتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ جو بھی واقعہ ہو وہ اپنے فطری انجام تک پہنچے اور اگر حقیقی معنی میں فطری انجام ممکن نہ ہو تو پھر ایسا انجام ہو جو فطری محسوس ہو کہ اب اس کے بعد کچھ بتانے کی ضرورت نہیں۔ پریم چند اور ای این واٹ اور لوکاچ کے خیالات جو میں نے اوپر نقل کیے ان کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ فکشن نگار اور قاری دونوں کو فکشن کے 'پیغام' اور 'مقصد' سے سروکار زیادہ ہو جاتا ہے، خود فکشن یا کہانی سے کم۔ میرا کہنا ہے کہ فکشن واقعات کی ترتیب کا نام ہے اور ترتیب اس طرح ہو جس میں انسانی سروکار نمایاں

ہوں۔فکشن ہمیں سوچنے کی ترغیب دیتا ہے۔ یہ ہماری طرف سے فیصلے نہیں کرتا بلکہ ہماری ہمت افزائی کرتا ہے یا یوں کہیں کہ ہم سے تقاضا کرتا ہے کہ ہم اپنے فیصلے خود کریں۔''

فاروقی صاحب 'فطری انجام' یا 'ایسا انجام جو فطری محسوس ہو کہ اب اس کے بعد کچھ بتانے کی ضرورت نہیں' کا تذکرہ کرتے ہیں تو سوال اُٹھتا ہے کہ ان کے اخذ شدہ نتائج کیا واقعی تسلی بخش ہیں۔فطری انجام سے کیا مراد ہے؟ کیا اس سے مراد ایک ایسا انجام ہے جو حقیقی زندگی میں وقوع پذیر ہو چکا ہو یا ہونے کا امکان رکھتا ہو۔یا ایسا انجام ہے جو قابلِ یقین ہو۔چوں کہ زندگی بعض اوقات نا قابلِ یقین اوامر اور واقعات کو اپنے اندر سموئے ہوتی ہے اس لیے فطری انجام سے یہ مراد لی جاسکتی ہے کہ ایسا انجام جو اکثریت کے لیے قابلِ فہم اور قابلِ یقین ہو۔اب سوال اُٹھتا ہے کہ کیا یہ لازم ہے کہ فطری انجام کے بعد کچھ بتانے کی ضرورت نہیں؟ تو یہ ایک پیچیدہ معاملے کی سادہ توضیح ہے۔کسی بھی واقعے یا داستان کے بعد مزید کچھ بتانے کی ضرورت بہر حال رہتی ہے۔یہی وجہ مغربی ادب کے بہ ظاہر کامل ادبی ناولوں کے sequel یا بقیہ حصّے سامنے لانے کا موجب بنتی ہے۔ایک شاہ کار ایسا نامکمل بھی ہوسکتا ہے جس میں مصنف مزید کچھ کہنے کی گنجایش پاتا ہے پر وہ اسے ہر قاری کے ادراک، تخیّل اور فکر پر چھوڑ دیتا ہے کہ وہ بات اپنی انفرادی ذہنی بساط کے مطابق خود بڑھائے۔ یوں فاروقی صاحب جیسے ثقہ دانش ور کی بات سے عجز واحترام سے جزوی اختلاف یا انحراف کیا جاسکتا ہے۔

اُردو میں فکشن کی تاریخ کا جائزہ لیں تو یہ امر عیاں ہوتا ہے کہ اردو کلاسیکی ادب میں ایک درسی نوعیت کا خشک نصابی رنگ اُتر آیا تھا۔ جب سر سیّد کی ترغیب پر ڈپٹی نذیر احمد اور دیگر اساتذہ نے فکشن تخلیق کیا تو وہ معاشرتی سدھار کے جذبے سے اس درجے معمور ہو گئے کہ پیغام کو کہانی میں قوام کی مانند لپیٹنے کی بجائے کہانی کو پیغام میں لپیٹ ڈالا۔نتیجتاً وقت گزرنے کے ساتھ اور بدلتے حالات میں ایسی تحریریں کار آمد نہ رہیں اور قارئین کی ان میں دل چسپی گھٹتی گئی۔

انیس ویں صدی کے اواخر اور بیس ویں صدی کے اوائل میں روسی اور یورپی ادب میں یقیناً اصلاحی نوعیت کی تحریریں سامنے آرہی تھیں، سوشلزم و کمیونزم کے فلسفے سے متاثر ادب سمیت، پر وہ کہانی کے اندر یوں گندھی ہوئی تھیں کہ آج بھی قاری سے واسطہ رکھتی ہیں۔

گویا کہانی کا دل چسپ ہونا، بین السطور میں پیغام کو دھیمے سروں میں رکھنا اور پیغام کا بنیادی انسانی معاملات وفطرت سے علاقہ رکھنا ضروری ہے۔

اس مضمون کا موضوع ''فکشن کیوں پڑھا جائے؟'' ایک دقیع مقالے کا متقاضی ہے۔ البتہ چند متنوع، دل چسپ اور فکر انگیز پہلوؤں کی نشان دہی کچھ حد تک تسلی بخش و تشفی آمیز ہوسکتی

ہے۔

فکشن جادو اور اُمید پیدا کرتا ہے۔ یہ وہ کام ہے جو درگاہوں، نجومیوں اور فقیروں کے ہاں ازل سے جاری ہے۔ البتہ فکشن یہی کام تخلیقی طور پر اور خاص سلیقے سے کرتا ہے۔ ''ایک ناول نگار، بھلے حقیقت نگار ہو یا طلسماتی طرزِ تحریر کا مالک، اپنی تخلیق کردہ دنیا میں اپنی خواہش کے مطابق معانی پیدا کر لیتا ہے۔ اس دنیا میں اچھا انسان فتح یاب ہوتا ہے، بیمار بچہ تن درست ہو جاتا ہے اور بے سہارا و غریب یتیم بچے کو غیر متوقع دولت حاصل ہو جاتی ہے۔''

بین الاقوامی شہرت یافتہ فرانسیسی ادیب مارسل پراؤسٹ کا ناول سوانز وے اپنے ایک کردار کی زبانی فکشن کے حوالے سے کہلواتا ہے '' فکشن کا ایک اہم اور عظیم کام اس شفافیت، وضاحت اور اطمینان بخش انداز میں بیان کرنا ہے جو ایک خبر یا صحافتی مضمون میں بیان کرنا قریباً ناممکن ہے۔''

فکشن اس امر کو ممکن بناتا ہے کہ قاری ایک کردار کے دماغ میں جھانک سکے اور ایک خاص سطح پر کردار سے تعلق قائم کر سکے، اس کی سوچوں کو نہ صرف سمجھ سکے بلکہ جذبات کو بھی محسوس کر سکے۔ بانو قدسیہ نے اس حوالے سے ایک نکتہ خیز بات کہی تھی کہ جب کسی مجرم کے خلاف نفرت کا جذبہ پیدا کرو تو اس کی ماں بن کر بھی سوچو۔ یعنی بہت سے مجرم ہم دردی کے مستحق اور سمجھے جانے کے متمنی ہوتے ہیں۔ وہ حالات کے قیدی یا سرشت کے غلام ہوتے ہیں۔ تو معاملے کو دیگر پہلوؤں سے بھی دیکھا جانا چاہیے۔

موسیقی، فلم، رقص کے علاوہ عبادت، مراقبہ اور گیان، دھیان انسان کو اس کی موجودہ مادی دنیا سے کسی دوسرے جہان میں منتقل کر دیتے ہیں۔ ایک اچھا ناول (یا کچھ حد تک افسانہ بھی) انسان کو نہ صرف اس کی موجودہ دنیا سے دوسرے عالمِ رنگ، بو و ذائقہ میں لے جاتا ہے بلکہ بسا اوقات اس کی اپنی زندگی کی بہت سی بھولی بسری باتیں یاد کروا دیتا ہے۔ دل گرفتہ و رنجیدہ قاری کو شفیق الرحمان، ابنِ انشا، مشتاق یوسفی یا پی جی وُوڈ ہاؤس کا مطالعہ شگفتہ اور تر و تازہ کر دینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

نان فکشن میں مزاح قدرتی طور پر کہیں اِکّا دُکّا مقامات پر آ جاتا ہے جب کہ فکشن اسی غرض سے تحریر کیا گیا ہو تو اس میں دانستہ جواز تراش کر مزاح کی گُل کاری کی گئی ہوتی ہے تا کہ قاری کی ظرافتِ طبع کا انتظام کیا جائے۔ یہ معاملہ دیگر مزاج کی تخلیق کاری پر بھی منطبق ہوتا ہے۔

فکشن اپنے قارئین کو مصنف کے تصور کے نزدیک مقام پر منتقل کر دیتا ہے۔ عمدہ فن پارے کا قاری اعلیٰ بنگلے میں قیمتی آرام کرسی پر نیم دراز ہو، حجام کی دکان پر لکڑی کے بینچ پر اپنی باری کا

منتظر ہو یا ٹرین میں کھڑکی کے ساتھ والی نشست پر بیٹھا ہو، مصنف کے دربار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے۔

بعض ناقدین اسے حقیقت سے فرار بھی کہتے ہیں۔ اگر یہ سچ ہے تو امتحانی کمرے میں کھڑکی سے باہر دیکھتا طالبِ علم، ٹی وی پر ڈراما دیکھتا ناظر اور اسٹیڈیم میں میچ دیکھتا شایق، سبھی اپنی ذاتی حقیقی زندگی سے فرار میں پناہ تلاش کرتے ہیں۔ درحقیقت یہ فرار نہیں بلکہ زندگی کا زیادہ وسیع مشاہدہ اور احساس ہے۔ یہ کنویں کی منڈیر پر بیٹھ کر سمندر کا نظارہ ہے۔ ویسے بھی تجسّس انسانی گھٹی میں شامل ہے۔ دوسرے انسانوں کی زندگیوں میں جھانکنا، نباتات و جمادات کی عادات و حرکیات کا مشاہدہ، کائنات کی گتھیوں کو سلجھانا اور دروں بینی آدمی کے خمیر میں ہے۔

انسان موجِ حیات پہ سفر کرتا تنکا ہے۔ جزا و سزا، مقدر و اختیار پر مباحث عام ہیں۔ یہ حقیقت بہر حال طے ہے کہ ایک انسان کا اختیار محدود ہے۔ اسّی برس کی عمر میں اُس کا قومی ٹیم کا کھلاڑی ہونا، سترہ برس کی عمر میں ملک کا صدر بننا (آئینی حد بندی) اور نیم خواندگی کے ساتھ ڈاکٹریٹ کے طلبا کو لیکچر دینا مشکل امور ہیں۔ البتہ ایک ناول، قاری کو ان سبھی رنگوں، جذبوں اور ذائقوں سے روشناس کروا دیتا ہے جو عملی زندگی میں اس کے لیے ممکن نہیں ہوتا۔ فکشن انسان کو ایک زندگی میں کئی زندگیاں گزارنے کا موقع فراہم کرتا ہے۔

ترقی یافتہ تہذیبوں میں بچوں کو فکشن یعنی ناولوں، ڈراموں اور افسانوں کا مطالعہ اس لیے کروایا جاتا ہے کہ اس سے بچے کا ذہن وسیع ہوتا ہے۔ امکانات کی دنیا کھلتی ہے اور انسان وہ تجربہ بھی کر گزرنے کا سوچتا ہے جو بہ ظاہر بند دماغ کو ناممکن یا بودا معلوم ہوتا ہے۔

ہر لفظ لذت کا ایک نوالہ ہوتا ہے۔ خوب صورتی سے کی گئی قرأت انسان کو لطف و سکون دیتی ہے۔ اسی طرح ہر لفظ کا ایک ذائقہ ہوتا ہے۔ خوب صورت آواز، زبان اور تلفظ کے ساتھ ادا کیا گیا زبانِ یار، اُردو کا ہر لفظ کانوں میں رَس گھولتا اور آنکھوں کے سامنے رقص کرتا نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تمام عظیم تہذیبیں سنسکرت، رومن، یونانی، عربی اور فارسی کے الفاظ کی صحت پر خاص توجہ دیتی تھیں۔ اس کا فنّی اظہار آج بھی خطاطی کی شکل میں موجود ہے۔

ایک زوال آمادہ تہذیب میں جہلا کا استدلال ہوتا ہے کہ گفت گو کا مقصد ترسیل مُدعا یعنی بات پہنچانا ہے۔ ناراضی کا اظہار تہذیب سے ہوسکتا ہے اور گالی سے بھی۔ تہذیب سے بات انسانی فعل ہے۔ بھونک تو کُتّے انسان سے بہتر لیتے ہیں۔ اپنے شہروں اور گھروں کو سجانا نفاست کی علامت ہے، نیند تو ریچھ بھی اپنی کچھاروں میں پوری کر لیتے ہیں۔ جمالیات انسان کو وحشی جان وَروں سے ممتاز کرتی ہے۔ پھر یہ جمالیات زبان میں کیوں نہ چمکے؟

حقائق و معلومات کو خشک سبق میں پیش کیا جائے، بور کر دینے والے لیکچر یا سُلا دینے والے مضمون میں، انسانی توجہ حاصل نہیں کر پاتے۔ البتہ انھیں کہانی میں موتیوں کی طرح پرُو کر پیش کیا جائے تو انسانی حافظے میں با آسانی محفوظ ہو جاتے ہیں۔ ''سوفی کی دنیا''، ''فاؤنٹین ہیڈ''، ''سدھارتھا'' اور بے شمار بین الاقوامی ادبی شاہ کار مختلف نوعیت کی معلومات کو اپنے دامن میں لیے جگ مگ کر رہے ہیں۔ گلستانِ اردو میں ''آگ کا دریا''، ''جنت کی تلاش''، ''راکھ''، ''کئی چاند تھے سرِ آسماں''، ''بے وطن'' اور دیگر چنیدہ فکشن پارے، گُل پارے ایسی معلومات سے رَس بھرے ہیں۔ البتہ اُردو کے دیگر ناولوں میں معلومات کم کم ہیں، سوالات پیدا کرنے کی صلاحیت زیادہ ہے۔

حقائق سے ہٹ کر ادب انسان کو نئے الفاظ سے روشناس کروا کر تہذیب او پر والے زینے پر لے جاتا ہے۔ نئے الفاظ فقط فہم کی توسیع نہیں کرتے بلکہ نئے دَر وا کرتے ہیں۔ مثلاً انگریزی کے لفظ Coyness کا مفہوم جھجک، سادگی، حجاب، دیر آشنا کے زیادہ قریب ہے۔ البتہ لفظ 'حیا' کے ساتھ ہی ایک مشرقی ہندی اسلامی شرم ذہن میں آ جاتی ہے۔ بیش تر لغات میں ان دونوں الفاظ یعنی Coyness اور حیا کو ہم معنی لیا گیا ہے جب کہ حیا کا رنگ کچھ اور ہے۔ اسی طرح اردو کے لفظ 'روشنی' کے مترادفات میں نور، دمک، چمک وغیرہ شامل ہیں۔ ان الفاظ کے رنگ مختلف ہیں جو مطالعے اور معاشرتی بول چال ہی سے واضح ہو پاتے ہیں۔ ہر نیا لفظ دماغ میں ایک نئے رنگ کا بلب روشن کرتا ہے۔ فکشن اس امر میں معاون ہے۔

ایک اچھے فن پارے کی ایک نشانی یہ بھی ہے کہ وہ اپنے پڑھنے والے میں یہ احساس پیدا کرتا ہے کہ وہ خود بھی ایسا ہی سوچتا ہے۔ یعنی مصنف نے اس کے ان کھوجے یا ان کہے جذبات کو زبان دے دی ہے۔ علمائے ادب کا خیال ہے کہ موثر، رواں اور عمدہ تحریر اپنے قاری میں احساس پیدا کرتی ہے کہ وہ بھی ویسا لکھ سکتا ہے پر جب لکھنے بیٹھے تو لکھ نہ سکے۔ شاعرِ بے مثل و بے بدل، خدائے ادب نے کیا خوب اس فلسفے کو ایک شعر کے کوزے میں بند کیا ہے۔

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

غالبؔ

جہاں ادیب کے لیے ادب پارہ کتھارسس یا اخراجِ تناؤ کا باعث بنتا ہے، وہیں پر یہ قاری کے دبے، گھٹے، اَن جانے اور اَن کہے جذبات کے اخراج کا بھی ذریعہ بنتا ہے۔ گویا قاری

بہ ذریعہ مصنف ایک فن پارے کے مطالعے سے کتھارسس پا کر آسودگی، اطمینان اور تکمیل کے جذبات سے روشناس ہوتا ہے۔

فکشن کا قاری کسی دوسرے کردار یا شخص کے جذبات، خیالات، فطرت اور مزاج کو، انگریزی محاورے کے مطابق، اس کے جوتوں میں کھڑے ہوکر دیگر کی بہ نسبت زیادہ بہتر طور پر سمجھ سکتا ہے۔ اس سے وسعتِ نظر کے علاوہ وسعتِ قلب بھی پیدا ہوتی ہے۔ وہ معاشرے جہاں مطالعے کا رجحان عام ہے اپنے مزاج میں تحمل، برداشت اور وسیع النظری کے عناصر بڑھ کر رکھتے ہیں۔ انسان اپنے پیدایشی جغرافیے، معاشرے اور مذہب سے ہٹ کر بھی سوچ سکتا ہے اور تعصّبات سے کافی حد تک آزاد ہو جاتا ہے۔

پاکستان کو اس کے سفیروں کی کوششوں سے کم سمجھا گیا ہے بپسی سدھوا کے ناولوں، دانیال معین الدین کی کہانیوں اور ندیم اسلم خان کی تحریروں سے زیادہ سمجھا گیا ہے۔ افغان معاشرے کو مغربی برادری کے لوگ خالد حسینی کے ناولوں سے زیادہ سمجھے ہیں۔ کھلاڑی اور ادیب جدید معاشروں کے نئے اور موثر سفیر ہیں۔

فکشن محروم افراد اور معاشروں کے مسائل اور وسائل کی عدم دست یابی کو اُجاگر کر کے قارئین کے اُس طبقے اور معاشرے جس میں یہ سب میسر ہے میں ان وسائل اور امکانات کی اہمیت بڑھاتا ہے۔ کرسٹائن سُو نے ایک ریسرچ کے نتیجے میں ثابت کیا ہے کہ ایسے قارئین جو اُن معاشروں کے بارے میں پڑھتے ہیں جہاں اُن جیسے عام آدمی کی رائے کو کوئی اہمیت حاصل نہیں اور اُس عام آدمی کو ووٹ کا حق حاصل کرنے کے لیے خاصی جدوجہد کرنی پڑتی ہے، اُن قارئین میں ووٹ کے ذریعے اپنی رائے ظاہر کرنے کا جذبہ کہیں زیادہ بڑھ جاتا ہے۔ وہ اگلے انتخابات میں ضرور ووٹ ڈالتے ہیں۔ محققین نے ایسے لوگوں کے لیے جو مطالعہ کرتے ہیں اور اپنے آپ کو کسی کردار سے وابستہ ہوتا محسوس کرتے ہیں experience-taking (تجربہ کاری و تجربہ شناسی) کی اصطلاح وضع کی ہے۔ جب ایک شخص فلم دیکھتا ہے تو وہ ایک کردار کو بہ طور تماشائی دیکھتا ہے۔ فکشن کے مطالعے میں اس کے برعکس ایک قاری اپنے آپ کو متعلقہ کردار کی جگہ محسوس کرتا ہے۔

امریکا کی ایک تحقیق ہے۔ سینٹ لوئی میں واقع واشنگٹن یونی ورسٹی میں فکشن کا مطالعہ کرنے والے قارئین کے دماغوں کا (Scan) سکین کیا گیا۔ اس سائنسی دماغی پڑتال نے واضح طور پر ثابت کیا کہ متعلقہ قارئین کے دماغوں میں مطالعے کے دَور میں ایسی واضح تبدیلیاں واقع ہوئیں جو تبھی واقع ہو سکتی تھیں جب وہ حقیقی طور پر ان تجربات سے گزرتے۔ یعنی مطالعہ انسان کو

تجربے کے بہت قریب لے جاتا ہے۔

یونی ورسٹی آف ٹورانٹو، کینیڈا میں ایک جامع تحقیق ہوئی۔اس تحقیق میں سائنسی تجربات شامل تھے۔تجربے کے مطابق دیکھا گیا کہ لیبارٹری میں مخصوص ماحول اور عناصر کے تحت آرٹ (بہ شمول مطالعۂ فکشن) کے شخصیت کے خصائص پر کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں۔اس تجربے میں سوال نامے تیار کیے گئے، جذبات کے جوار بھاٹے کو جانچنے کا پیمانہ طے کیا گیا اور دیگر لوازم کا انتظام کیا گیا۔مطلوبہ قارئین کے ایک حصے کو چیخوف کا افسانہ The Lady with the dog 'کُتّے والی خاتون' پڑھنے کو دیا گیا۔قارئین کے دوسرے حصے کو اسی کہانی کا دستاویزی (قانونی شقوں، معاشرتی پیمانوں وغیرہ پر مبنی درسی نوعیت کا مواد) روپ پڑھنے کو دیا گیا۔

اِس دل چسپ تجربے میں 166 افراد کو شامل کیا گیا۔112 خواتین اور 54 مردوں پر مشتمل گروہ کی اوسط عمر بیس برس تھی۔یہ عمر اثرات کو جلد قبول کرنے والی ہوتی ہے۔تمام شرکا انگریزی زبان میں رواں تھے۔تمام اراکین کو کینیڈا اور امریکا کے مستند و تسلیم شدہ نفسیاتی معیارات کے مطابق جانچا گیا۔اراکین کو بے ترتیب انداز میں دو برابر گروہوں میں تقسیم کر دیا گیا۔

اس کے بعد انھیں کمپیوٹر پر دو علیحدہ نوعیت کے مذکورہ متن پڑھنے کو دیئے گئے۔المختصر یہ کہ تفصیلی توجہ اور ارتکاز والے مطالعے کے بعد شرکائے تجربہ نے کمپیوٹر پر ہوشیاری اور خاص مقاصد سے تیار شدہ سوالات کے جوابات دیئے۔

پہلا متن چیخوف کی مذکورہ کہانی کا تھا۔یہ کہانی 6367 الفاظ پر مشتمل ہے۔اس کہانی کا ادبی و مطالعاتی معیار، روانی اور قدر جانچنے کے لیے وضع شدہ کلیہ استعمال میں لایا گیا۔ایک جملے کی اوسط لمبائی (کُل الفاظ تقسیم کُل جملے) معلوم کی گئی اسی طرح ہر لفظ میں اوسط تعداد میں syllables (رکن کلمہ، تلفظ کی وہ اکائی جو کسی لفظ کا حصہ ہونے کی بجائے از خود ایک لفظ ہو)(کُل تعداد میں syllables تقسیم کل الفاظ) معلوم کیے گئے۔اس کا Flesch-kincaid Grade level Score معلوم کیا گیا جو 6.7 تھا۔

اس کہانی کا شمار چیخوف کی پانچ بہترین کہانیوں میں کیا جاتا ہے اور چیخوف کا شمار صفِ اول کے ادیبوں میں ہوتا ہے۔ایک اور امر کو یقینی بنایا گیا کہ شرکا میں سے کسی نے یہ کہانی پہلے سے پڑھی ہوئی نہ ہو۔یوں اس کا فوری اثر معلوم کرنا ممکن تھا۔

دوسرا متن دستاویزی نوعیت کا تھا۔درحقیقت اس تجربے سے یہ معلوم کرنا مقصود تھا کہ کہانی کے پیغام کے اس کے متن اور فنی محاسن کو تبدیل کر دینے سے کیا مختلف اثرات مرتب ہوتے ہیں۔یہ افسانہ دو شادی شدہ لوگوں (خاتون اور مرد) کے درمیان رومانی تعلق کے گرد بُنا گیا ہے

۔اسے دستاویزی رنگ دینے کے لیے طلاق سے متعلقہ عدالتی دستاویز گھڑی گئی۔اس میں کہانی کے مرکزی کردار کی زبانی تمام حالات و واقعات بیان کیے جاتے ہیں۔البتہ اس کی زبان فکشن کے بجائے مقدمے کی ہے۔دوسرے متن کے الفاظ کی تعداد بھی اصل کہانی کے قریب تر یعنی 6358 رکھی گئی اور گریڈ 6.7 رکھا گیا۔

یوں شرکا کے فہم ،نفسیاتی اثرات، جذباتی اثرات ،خصلتی عناصر اور دیگر عوامل کو ملحوظ خاطر رکھا گیا۔

یہ ایک طویل اور تھکا دینے والا تجربہ تھا۔

ایک دل چسپ عنصر یہ بھی تھا کہ اصل کہانی انیسویں صدی کے اواخر کے روس کے پس منظر میں لکھی گئی تھی جس کا شرکا کے پس منظر اور جدید طرزِ حیات سے تعلق نہ تھا۔ دوسری جانب عدالتی دستاویز شرکا کے پسِ منظر سے زیادہ قریب تھی۔

اس تجربے کے نتائج دل چسپ رہے۔اصل کہانی کے کرداروں کے مزاج اور خصلتوں کو شرکا نے اپنے آپ کے زیادہ نزدیک پایا۔ اصل کہانی زیادہ پُر اثر ثابت ہوئی جب کہ عدالتی دستاویزی کہانی بھی کم دل چسپ نہ رکھی گئی تھی۔ایک کہانی میں مصنف اور قاری ہم قدم چلتے نظر آتے ہیں جب کہ دیگر نوعیت کی دستاویزی تخلیقات کے اثرات میکانکی ہوتے ہیں۔اس تجربے اور دیگر کئی تجربات میں یہ یکساں نوعیت کا نتیجہ سامنے آیا کہ قارئین پر فکشن بہ موازنہ نان فکشن، فکشن کے زیادہ مثبت اثرات ہوتے ہیں۔ یہ اثرات قابلِ پیمایش اور واضح ہوتے ہیں۔ یوں اگر تسلسل سے فکشن کا مطالعہ جاری رکھا جائے تو شخصیت پر دیرپا مثبت اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

محققین نے واضح کیا ہے کہ لازم نہیں فکشن اپنے تمام قارئین پر مثبت اثرات مرتب کرے۔اس میں بہت پیچیدہ عوامل شامل ہو جاتے ہیں۔البتہ بیش تر قارئین کی شخصیات، خصائل اور نکتہ ہائے نظر پر مثبت اور تعمیری اثرات مرتب ہونے کے ٹھوس امکانات ضرور موجود ہوتے ہیں۔

ادراکی سائنس کے حوالے سے یہ امر ثابت شدہ ہے کہ ادب و فن سامع ، ناظر اور قاری کی شخصیت پر اس طرح اثر پذیر ہوتے ہیں کہ وہ اس کے مزاج اور خصائل میں شعوری یا غیر شعوری طور پر تبدیلی لے کر آتے ہیں۔ جب فکشن کا قاری اس کے ایک کردار میں اپنی ذات سے مماثلت پاتا ہے تو وہ کردار کے اندر رونما ہونے والی تبدیلیوں کو اپنے اوپر منطبق کر کے تغیّر کے عمل سے گزرتا ہے۔کوئکن ،میئال اور سیکورا (Kuiken, Miall, & Sikora) کی 2004 کی اہم تحقیق کے مطابق فکشن کا مطالعہ قاری کو درجہ بہ درجہ خود شناسی اور ماخوذ کرنے کے تجربے سے بہرہ ور کرتا ہے۔یوں قاری کی شخصیت ترمیم اور تبدیلی سے گزرتی ہے۔

اس نوع کی تحقیقات میں The Big Five Inventory (فہرستِ خمسہ / پنجِ اکبر) از (John et al. 1991) مرتب کی گئی۔ اس فہرست میں شخصیت کے پانچ پہلوؤں پر بالعموم ادب اور بالخصوص فکشن کے اثرات کا جائزہ لیا گیا۔ یہ چوالیس انواع و اقسام کے حصوں پر مشتمل فہرست ہے۔ شخصیت کے پانچ اور اہم منتخب کردہ پہلو ہیں: بروں بینی (کارل یونگ نامی معروف نفسیات دان کا تجویز کردہ شخصی پہلو جو کئی تحقیقات میں مستعمل ہے)؛ احتیاط؛ بااصولی اور باضمیری؛ موافقت و خوش مزاجی؛ جذباتی یا اعصابی استحکام؛ اور وسعت مزاج، صاف گوئی، شفاف ضمیری۔

جذبات کو ماپنے والے پیمانوں سے ہٹ کر ان کی دس اقسام کو زیرِ غور لایا جاتا ہے۔ یہ دس اقسام ہیں: غم گینی، اندیشگی، مسرت، بوریت، طیش، خوف، قناعت، جوش و ہیجان، بے چینی اور مرعوبیت۔

درست نتائج حاصل کرنے کے لیے متن میں یکساں دل چسپی برقرار رکھی جاتی ہے۔ اس طرح یہ یقینی بنایا جاتا ہے کہ متعلقہ افراد کے مزاج و جذبات میں رونما ہونے والی تبدیلیاں متن میں بڑھی یا گھٹی ہوئی دل چسپی کی وجہ سے نہ ہوں بلکہ سائنسی تجربے میں کارفرما عناصر آزاد ہوں۔

سائنسی طور پر یہ بات ثابت شدہ ہے کہ ایک قاری کی یادداشت میں کمی اور دماغی زوال ایک غیر قاری کی نسبت بڑھاپے میں 32 فی صد کم ہوتا ہے۔

فکشن کا مطالعہ قاری کے دماغ پر حقیقت کے مماثل ایسی تصویر چلاتا ہے جیسے کمپیوٹر سیمولیشن ایک کمپیوٹر پر چلتی ہے۔

تین متواتر تجربات نے ثابت کیا کہ جب طلبا نے ناول ہیری پوٹر کے تعصب کے خلاف، مساوات کو مثبت انداز میں پیش کرنے والے اور فرد کی آزادی سے متعلق اقتباسات پڑھے تو اُن کی آرا میں واضح مثبت تبدیلیاں نظر آئیں۔

Emory University کی 2013 کی تحقیق میں فکشن پڑھنے والوں اور دیگر کے دماغوں کا معائنہ اور موازنہ کیا گیا تو یہ امر سامنے آیا کہ ایک مخصوص ناول کے مطالعے کے بعد قارئین کے دماغوں میں left temporal cortex میں بڑھی ہوئی سرگرمی جانچی گئی۔ دماغ کا یہ مخصوص حصہ تفہیمِ لسان اور ذخیرۂ الفاظ سے متعلق ہے۔ متنوع الفاظ کی تفہیم متنوع جذبات، حالات اور معاملات کو سمجھنے میں کارآمد ہوتی ہے۔

موضوع میں ثقالت اور گرانی سے صرف نظر کرتے ہوئے ایک دل چسپ اور ہلکا پھلکا پہلو توجہ طلب ہے۔

فکشن بہت سی سیاسی اور سماجی تبدیلیوں کا محرک بنا ہے۔ بھلے وہ جارج آرویل کا 1984 نامی ناول ہو یا ٹونی موریسن کی سیاہ فام استحصال کے حوالے سے تحریریں ہوں۔ قیامِ پاکستان کے بعد نسیم حجازی کے ایمان افروز اور مجاہدانہ خُو بیدار کرتے تاریخی ناول ہوں (ان کے مثبت و منفی اثرات سے ہٹ کر ان کی اثر پذیری طے شدہ امر ہے)، بانو قدسیہ کا ناول راجا گدھ (حرام وحلال کے غیر ثابت شدہ وغیر سائنسی فلسفے سے ماوراہوکر) عمیرہ احمد کے وسیع حلقۂ قارئین والے نیم اسلامی، نیم اصلاحی ناول یا دیگر کئی تحریریں ہوں ان کے پاکستانی معاشرے پر کم وبیش منفی ومثبت اثرات مرتب ہوئے ہیں۔

حیران کن طور پر مغرب میں بہت سے ناول اور افسانے سائنسی ایجادات کا باعث بنے ہیں۔ ان ناولوں سے نئے خیالات نے جنم لیا جن سے نئے امکانات کی کونپلوں نے سر اٹھایا اور چند شوریدہ سروں نے خیال کو ٹھوس شکل دینے کی ٹھانی اور کام یاب ٹھیرے۔ داستانِ انسانی درحقیقت شوریدہ سروں ہی کی تو داستان ہے!

خیال کہاں سے آتا ہے؟ یہ سوال ازل سے انسان کو متجسّس کرتا آیا ہے۔ یہ ضرورت کے بطن سے جنم لیتا ہے۔

خوب محاورہ ہے 'ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔' البتہ بعض اوقات ایک خیال پیدا ہوتا ہے، اس سے ایک ایجاد جنم لیتی ہے اور اس ایجاد سے اس کی ضرورت بھی جنم لے لیتی ہے۔ انسان کا بہ خوبی رابطہ ٹیلی فون پر ہو جاتا تھا، پھر موبائل فون وجود میں آیا اور اس کی ضرورت بھی وجود میں آ گئی۔ دیگر بے شمار مثالیں ہیں۔

مارٹن کُوپر جس نے 1970 کی دہائی میں پہلا موبائل فون ایجاد کیا، اس کا سہرا ایک ناول پر بننے والی ٹی وی سیریل اسٹار ٹریک کے سَر دیتا ہے۔ اس امریکی سیریز نے ایک پوری نسل کو (بہ شمول پاکستانی نسل) متاثر کیا تھا۔ اس میں کئی نئے معروف ہونے والے آلات میں ایک آلہ "Communicator" کمیونی کیٹر تھا۔ یہ بے تار کا فون تھا اور جدید موبائل فون کا جدِ امجد بھی۔

فرانسیسی مفکر اور ناول نگار جولز ورن کو 'بابائے سائنس فکشن' بھی کہا جاتا ہے۔ اس کے معروف ناولوں میں 'زمین کے درمیان تک کا سفر'، 'دنیا کے گرد اسی روز میں' اور 'سمندر کے نیچے ہزار لیگز (فاصلہ پیما)' وغیرہ شامل ہیں۔

جولز ورن نے زیرِآب چلنے والے ایک ایسے بحری جہاز کا تصور دیا جو بجلی سے چلتا تھا۔ اس زیرِآب جہاز کا نام ''نوٹیلس'' رکھا گیا تھا۔ اس تصور نے سائمن لیک نامی لڑکے کو اس

درجے متاثر کیا کہ وہ ایسی ایجاد کرنے پر تل گیا اور بالآخر دنیا کی پہلی سب میرین بنانے میں کام یاب ہو گیا۔ سائمن نے اس کا نام آرگونائٹ رکھا۔

جولزورن نے 1865 میں ایک ناول میں انسان کے چاند پر اُترنے کی تفصیلات کی حیران کن طور پر درست تصویر کشی کر دی تھی۔ حقیقی طور پر انسان اس ناول کے تحریر کیے جانے کے 104 برس بعد چاند پر اپنے قدم رکھنے میں کام یاب ہوا تھا۔ چاند پر کششِ ثقل بہ نسبت زمین کے بہت کم ہوتی ہے جس کی وجہ سے انسان چاند پر زمین کی طرح قدم جما نہیں پاتا۔ جولزورن 1865 میں دیگر تفصیلات کے علاوہ تحریر کرتا ہے۔ ''اُن تینوں کو محسوس ہوا کہ اُن کے بدن وزن سے محروم ہو گئے ہیں۔ اگر وہ اپنے بازو بڑھا دیتے تو بھی گرنے کا خدشہ موجود نہ تھا۔ اُن کے سَر اُن کے کندھوں پر ہلتے تھے، اُن کے قدم جمتے نہ تھے اور وہ خمار آلودگی کے شکار بندوں کی مانند استحکام سے محروم تھے۔''

1898 کا واقعہ ہے۔ ابھی ٹیلی فون بھی عام نہ ہوئے تھے۔ معروف مفکر و ادیب مارک ٹوئن نے اپنی کہانی '1904 کے لندن ٹائمز سے' میں ایک ایجاد کا خاکہ پیش کیا جسے 'ٹیلی کیٹروسکوپ' کا نام دیا۔ وہ ایجاد ٹیلی فون سسٹم کے ذریعے ایک ورلڈ وائڈ نیٹ ورک (www) قائم کرتی ہے جس کے ذریعے معلومات کا تبادلہ ہوتا ہے۔ یوں مارک ٹوئن نے انٹرنیٹ کا ابتدائی تصور پیش کیا۔

مغربی سائنس فکشن میں ایسی ہزارہا ایجادات کا تذکرہ وضاحت کے ساتھ ملتا ہے جو بعدازاں معرضِ وجود میں آئیں۔ گویا ذہن نارسا کو اسی توسط سے رسائی میسر آئی۔ ان میں خود کار چہرہ شناسی (Automated Face Recognition) جسے آج کے ٹچ اسکرین فون تک میں عام کر دیا گیا ہے، ناول 'ڈارون کی اولاد' از گریگ بیر میں موجود ہے۔ اسی طرح دیگر ایجادات میں شامل ہیں، ٹچ ٹیبلیٹ، ڈرون، ای۔ پیپر اور دیگر بے شمار آلات و اشیا۔

یہ فکشن کا فقط ایک پہلو ہے۔

ایک دل چسپ پہلو اور بھی ہے۔

امریکی ادیبہ آیا ڈی لیون نے معاشرتی تبدیلی لانے کے لیے شہوت انگیز جنسی ادب کا سہارا لیا۔ جنسی ہیجان اُس کے مشاہدے کے علاوہ تجربے کا بھی حصہ بنا تھا۔ کہانی کچھ یوں ہے کہ اُس کے آبائی گھر میں ایک خاتون کی تصویر آویزاں تھی۔ اُس خاتون نے چیتا پرنٹ کی بکنی پہن رکھی تھی اور ہاتھوں میں ایک اژدھا تھام رکھا تھا۔ وہ خاتون آیا ڈی لیون کی ماں تھی جو لاس اینجلس کے لارگو کلب میں پُر ہیجان رقاصہ تھی۔ 1970 کی دہائی میں وہ برکلے آ گئی جہاں انسانی حقوق کی

وکیل بن گئی اور شہری اسکول بورڈ کی صدارت سنبھال لی۔ بعدازاں اُس کی بیٹی، یعنی ڈی لیون نے کئی ادب پارے رومان اور جنس کے گلابی محلول میں ڈبو کر لکھے۔ اُسے معلوم تھا کہ عموماً رومانی کہانیوں کا مرکزی کردار کوئی مرد نہیں ہوتا بلکہ عورت ہوتی ہے، سو ایک عورت ہونے کے ناتے اُس نے زیادہ بہتر طور پر ایسی کہانیاں لکھیں۔ اُس کی ایک کہانی 'Uptown Thief' ترغیب آمیز فسانہ ہے، جس میں نیویارک شہر کی اونچے درجے کی طوائفیں، اشرافیہ سے اینٹھی دولت کم زور طبقے کی تشدد زدہ طوائفوں اور بے گھر عورتوں کی فلاح پر خرچ کرتی ہیں۔ اس کہانی کی ہیروئن، ماریسول رائی ویریا، جو ایک جسم فروش خاتون ہے اور اس آمدنی سے اپنے اور اپنی چھوٹی بہن کے اخراجات پورے کرتی ہے، کو ایک اوباش اور گم راہ عورت کے بجائے مضبوط عورت کے کردار میں دکھایا گیا ہے۔ ڈی لیون کہتی ہے ''میری نظر میں اصل مسئلہ جسم فروشی نہیں بلکہ وسائل پر مردانہ اجارہ داری ہے۔''

وہ مزید کہتی ہے ''میں مساوی تقسیمِ وسائل پر یقین رکھتی ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ بیش تر قارئین میری تحریریں جنسی تلذذ اور چمکتے دمکتے قیمتی جوتوں، اعلیٰ کپڑوں اور بیش قیمت فرنیچر کے بارے میں جاننے کے لیے پڑھیں گے۔ میں درحقیقت اس کی آڑ میں اُن قارئین تک پہنچنا چاہتی ہوں جو اِس سب دکھاوے کے اندر چھپے میرے پیغام کو سمجھیں۔''

ٹی وی اور انٹرنیٹ نے سنجیدہ ادب کے مزاج کو خاصا متاثر کیا ہے۔ سنجیدہ اور سستے ادب میں تفریق کی لکیر دھندلا رہی ہے۔ ماضی میں بہت سے رستے عمومی نوعیت کے تفریحی ادب سے گزر کر سنجیدہ ادب کی جانب جاتے تھے۔ یعنی بچپن میں ماورائی کہانیاں، جوانی میں رومانی، جاسوسی اور مہماتی سمیت سنجیدہ ادب اور بڑھاپے میں عموماً مذہبی نوعیت کا ادب۔ اب سب گڈمڈ ہو رہا ہے۔

یہاں سوال اُٹھتا ہے کہ کیا جنسی نوعیت کے فکشن سے فقط تلذذ حاصل کرنے والا قاری سنجیدہ موضوعات سے متاثر ہونے کی کماحقہ صلاحیت اور اہلیت رکھتا ہے یا یہ کہ چوں کہ ہر قاری کے اندر جنسی موضوعات کی جانب رغبت فطری طور پر موجود ہوتی ہے سو اُس کے مزاج پر حکم لگانا غیر منطقی ہے۔ عمومی طور پر جنسی فکشن کا ہدف مرد قاری رہا ہے اور اس میں ملفوف سنجیدہ پیغام کی موجودگی کم کم رہی ہے۔ ماضی قریب میں ایسا جنسی نوعیت کا فکشن بھی وجود میں آیا ہے جس کا ہدف خاتون قاری ہے۔ EL James کے ناول Fifty Shades of Grey نے متوسط طبقے کی درمیانی عمر کی شادی شدہ لاکھوں خواتین کو متوجہ کیا ہے۔ اس کا مرکزی کردار مرد اپنی غیر معمولی جنسی استعداد اور قوتِ متخیلہ سے خواتین قارئین کی تشنہ خواہشات کی ذہنی آبیاری کرتا ہے۔ مصنفہ اس میں کوئی

سنجیدہ نوعیت کا پیغام دینے میں ناکام رہی ہے۔

متوسط طبقے اور معاشی طبقے کے ذکر سے بات ایک بحث طلب نکتے کی جانب چلی جاتی ہے۔ کرسٹینا اوسٹر ہیلڈ (Christina Oesterheld) اردو ادب کی ایک مستند، ثقہ جرمن اسکالر ہیں۔ وہ ادیب اور معاشرتی تبدیلی کے حوالے سے خیال پرداز ہیں کہ آج کے جدید معاشرے میں ایک فکشن نگار کا کردار اُس کے معاشرتی مقام پر بھی منحصر ہوتا ہے۔ متوسط طبقے کا فکشن نگار عموماً تبدیلی، جدیدیت، جمہوریت، معاشرتی عدل اور قانون کی حکم رانی کا خواہش مند ہوتا ہے پر اِن سب کے لیے وہ باوسیلہ اور بااثر طبقات کی جانب بھی دیکھتا ہے۔ علاوہ ازیں اُس کے اثر انداز ہونے اور حلقۂ قارئین کی وسعت پر ادب سے ہٹ کر دیگر عوامل بھی کارفرما ہوتے ہیں۔ ان عناصر میں مارکیٹنگ، ذاتی تعلقات، میڈیا پر تشہیر اور اُس دَور کا عام چلن وغیرہ شامل ہیں۔ ایک نمونہ جنوبی ایشیائی انگریزی زبان میں لکھنے والے مصنّفین کی موجودہ بین الاقوامی شہرت ہے۔

بدقسمتی سے اس کے برعکس اُردو ناول پاکستانی میڈیا کی اس کے پاسنگ توجہ بھی حاصل کرنے میں ناکام رہے ہیں۔

جاری موضوع کا ایک شاخسانہ، زبان کا فکشن میں کردار ہے۔ جو دانش ور فرماتے ہیں کہ ادیب جلاوطن ہوتا ہے، اُس کا کوئی وطن نہیں ہوتا اُن کے پیش نظر یہ بات رہنی چاہیے کہ بے شک بڑا ادیب بے وطن ہوسکتا ہے پر زبان کا اپنا وطن یا اوطان ہوتے ہیں۔ کسی زبان کے فن پارے کو آسمانِ ادب کا درخشندہ ستارہ بننے کے لیے ترجمے کی زمینوں پر قدم قدم چلنا ہوتا ہے۔

فکشن کے اثرات پر بحث کو واپس لاتے ہوئے ایک تذکرہ صائب ہے۔ بین الاقوامی سطح کے نمایندہ ادب کو شائع کرنے والا رسالہ 'نیو یارکر' لکھتا ہے۔

''یہ ثابت شدہ حقیقت ہے کہ فکشن کا مطالعہ ہمارے دماغ کو مسرت آمیز، وجدانی کیفیت میں لے آتا ہے۔ یہ مراقبے سے مماثل تجربہ ہوتا ہے۔ مطالعہ صحت پر مراقبے جیسے اثرات مرتب کرتا ہے جن میں گہرا آرام اور اندرونی سکون شامل ہیں۔ باقاعدگی سے مطالعہ کرنے والے بہتر نیند لیتے ہیں، کم مضطرب ہوتے ہیں، تناؤ ان پر کم اثر انداز ہوتا ہے، عزتِ نفس میں اضافہ ہوتا ہے اور قاری میں ڈپریشن بہ نسبت غیر قاری کم ہوتا ہے۔''

بفر جیسے کام یاب امریکی کاروبار کے مالک جوئل کا کہنا ہے کہ دن کی آخری سرگرمی ایسی ہونی چاہیے جو آپ کو دن بھر کے معمولات سے منقطع کر کے سکون کی نیند کی جانب لے جائے۔ اس معاملے میں مطالعۂ فکشن ایک بہترین سرگرمی ہے۔

”رات کو سونے سے پہلے نان فکشن کا مطالعہ انسان کو اپنے مستقبل کے بارے میں فکر مند کرتا ہے اور آیندہ کے لائحہ عمل پر سوچنے پر اُکساتا ہے۔ اس کے برعکس فکشن کا مطالعہ انسان کو تصورات میں لے جا کر عین اُس لمحے میں جینے کی ترغیب دیتا ہے۔“

برصغیر میں ثقافتی تنوع دنیا کے بیش تر علاقوں سے زیادہ ہے۔ مختلف مذاہب، فرقے، زبانیں، گروہ اور چہروں کے نقوش اسے رنگین ٹکڑیوں میں بٹا قابلِ توجہ خطہ بناتے ہیں۔ جدید عالمی چلن میں تنوع کو پسند کیا جاتا ہے۔ یہ چلن برصغیر میں اب تک زیادہ عام نہ ہو پایا ہے اور ہنوز تعصّبات برقرار ہیں۔ علاقائی فکشن کی قومی سطح پر پذیرائی ملکی ہم آہنگی کو فروغ دے سکتی ہے۔ لوگ ایک دوسرے کو جان کر اور سمجھ کر زیادہ برداشت پیدا کر سکتے ہیں۔

فکشن پر تحقیق کے دوران چند دل چسپ امور سامنے آئے۔ یقیناً ان پر ایک سے زیادہ آرا صحت مند اور مدلل مباحثے کو جنم دے سکتی ہیں۔

مختصر فکشن یعنی سو لفظوں، پچاس لفظوں، دس لفظوں یا چند لفظوں کی کہانیاں عام چلن ہو چکی ہیں۔ چند قیمتی دوست اس ہیئت (genre) میں کام یابی سے آگے بڑھے ہیں۔ کہانی کے کثیر الاشاعت اخبارات کے ادارتی صفحات پر آنے کا ایک نمایاں فائدہ یہ ہوا ہے کہ اخبار کے لاکھوں قارئین پُرفکر فکشن کی جانب متوجہ ہوئے ہیں۔ یوں قاری سے محرومی پر نوحہ کناں ادبا کا ایک طبقہ شاد ہوا۔

البتہ پرُخرسٹ کی تحقیق بتاتی ہے کہ وہ قاری جو پیچیدہ نوعیت کی فکشن کا مطالعہ کرتے ہیں، معاملات کو زیادہ گہرائی میں جا کر سمجھنے کی صلاحیت کے حامل ہوتے ہیں۔ پرُخرسٹ کا کہنا ہے کہ مختصر تحریروں کا مطالعہ، جیسا اخبارات، رسائل وغیرہ کا مطالعہ کرنے والے قارئین میں سنجیدہ، علمی اور فکری نوعیت کی تحریروں کے قارئین کی بہ نسبت کم تر تفہیم اور شعور پیدا کرتا ہے۔ مختصر تحریریں وقتی لطف و فکر کا سامان تو مہیا کرتی ہیں پر دیرپا اثرات جو شخصیت میں تبدیلی لے کر آئیں کم کم پیدا کرتی ہیں۔

ادب بالعموم اور فکشن بالخصوص قاری کو روایت کے ساتھ منسلک رکھتا ہے۔ یوں قاری کے تحت الشعور اور یادداشت میں روایت ایک اہم عنصر کے طور پر موجود رہ کر اُس کی سوچ اور فیصلہ سازی پر اثر انداز ہوتی ہے۔ روایت کی موجودگی ایک صحت مند شخصیت کی تعمیر میں مدد دینے کے علاوہ ذہنی زرخیزی کا باعث بنتی ہے۔ روایت کی روشنی میں معروضی حالات کا تجزیہ اور مستقبل کے متعلق تفکر زیادہ بارآور اور زمین سے وابستہ ہو کر پُرمعنی ہو جاتا ہے۔

طویل اور نسبتاً پیچیدہ فکشن کا مطالعہ اس امر میں زیادہ معاون ہوتا ہے۔

ٹم اوبرآئن ویت نام کی خوف ناک جنگ لڑنے والا سپاہی جو بعدازاں کام یاب ادیب بنا کہتا ہے ''فکشن اُس سچ تک لے کر جاتا ہے جب سچ، اصل سچائی کو پوری طرح بیان نہیں کر پاتا۔''

نوبل انعام یافتہ ادیبہ نادائن گورڈیمر کہتی ہیں ''حقائق ہمیشہ اس سے کم بیان کرتے ہیں جو وقوع پذیر ہوتا ہے۔'' یعنی ایک واقعہ کا سادہ بیان اُس کی حقیقت کا پوری طرح احاطہ نہیں کر پاتا۔ اُس کے تمام پہلوؤں کو بیان کرنے کے لیے فکشن کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ البرٹ کیمیو اسی خیال کو لے کر بیان کرتا ہے ''فکشن ایک ایسا جھوٹ ہے جس کے ذریعے ہم سچ کو بیان کرتے ہیں۔''

اچھی اور کام یاب فکشن کے بارے میں معروف ادیب ڈیوڈ فوسٹر ویلس کی رائے ہے ' اچھے فکشن کا کام مضطرب کو سکون دینا اور پرُسکون کو مضطرب کرنا ہے۔''

جنوبی امریکا اور دنیا کے دیگر بہت سے خطوں میں Digital Detox week (عددی صنعتیات سے دوری کا ہفتہ) منایا جاتا ہے۔ اس میں ایک ہفتے کے لیے ٹی وی، کمپیوٹر اور دیگر برقی تفریحات کو بند کر دیا جاتا ہے۔ پورا خاندان اکٹھا ہوتا ہے، کتابیں پڑھی جاتی ہیں، تفریح کے لیے جایا جاتا ہے اور اکٹھے وقت گزارا جاتا ہے۔ یہ عمل متعلقہ معاشروں میں نمایاں مثبت تبدیلی لے کر آ رہا ہے۔

اس حوالے سے والدین خاصا مثبت کردار ادا کر رہے ہیں۔ وہ اپنے چھوٹے بچوں کو بٹھا کر ایک منتخب کتاب پڑھ کر سناتے ہیں۔ یوں بچوں کی سوچ میں وسعت آتی ہے اور خاندان کے افراد کے درمیان تعلق بھی مضبوط ہوتا ہے۔ اس معاملے میں ایک پیش رفت اور بھی ہو رہی ہے۔ خاندان کے افراد ایک کتاب منتخب کرتے ہیں، ہفتہ بھر اُس کا مطالعہ کرتے ہیں، بعدازاں اس پر تبادلۂ خیال کرتے ہیں۔ یوں اُنھیں ایک دوسرے کے زاویۂ سوچ سے بھی آگاہی ہوتی ہے اور آپس میں صحت مندانہ مکالمے کی روایت بھی فروغ پاتی ہے۔

برصغیر میں ایسے صحت مندانہ مشاغل کو نسبتاً کم فروغ حاصل ہوا ہے۔ ایک طبقہ آج بھی مطالعے کو وقت کے زیاں پر محمول کرتا ہے۔ معاشرے میں وسعتِ مطالعہ نہ ہونے کی وجہ سے کوئی تحریر وسیع تر معاشرتی اثر پذیری کی صلاحیت کھو بیٹھتی ہے۔ عموماً خوف زدہ، سہما ہوا اور معاشی استحصال کا شکار معاشرہ توہم پرستی کی جانب جلد مائل ہو کر اس سے وابستہ ادب کو زیادہ پسند کرتا ہے۔ ایسا ادب جس میں اَن دیکھے مستقبل میں تدریجی ارتقائی معاشرتی عمل کے بغیر ہی اُمید کے بلب ٹمٹماتے ہوں اور ماورا کی جانب سے امداد کے سامان کی باتیں ہوں۔ ایسا ادب عمل اور خود

اعتمادی سے محروم معاشروں کی دل پسند خوراک ہے۔

قیامِ پاکستان کے بعد معرضِ وجود میں آنے والے فکشن نے خال خال ہی معاشرتی تبدیلی میں ٹھوس کردار ادا کیا ہے۔ گو تقسیم سے پہلے کا فکشن موثر طور پر معاشرے پر اثر انداز ہوا۔ یہ تبدیلی بھی اپنے جلو میں کئی سوالات لے کر آتی ہے کہ آزادی کے بعد یہ بے اعتنائی کیوں کر یا فکری افلاس کیسا؟

قبل از تقسیم و آزادی، ڈپٹی نذیر احمد نے معاشرتی اصلاح کے لیے ٹھوس نوعیت کے کام یاب اور مقبول ناول مراۃ العروس (1869)، توبتہ النصوح (1877) اور بنات النعش (1873) لکھے۔ وہ علی گڑھ تحریک سے متاثر تھے۔ فکشن نگاروں میں نذیر احمد اور شعرا میں حالی کی مخاطب گھریلو خواتین تھیں۔ وہ جانتے تھے کہ معاشرے میں تبدیلی خاندان اور خاندان میں تبدیلی تعلیم یافتہ عورت لا سکتی ہے۔ یوں اگر عورت کے دل و دماغ کو متاثر کر لیا جائے تو آہستہ آہستہ معاشرے میں تبدیلی آ جائے گی۔

اُس دور کے ذرا بعد ڈپٹی نذیر احمد کے نیم طنزیہ انداز سے ہٹ کر راشد الخیری فکشن اور دیگر اصنافِ اظہار میں زیادہ سنجیدہ طور پر سامنے آئے۔

نذیر احمد کے بعد رتن ناتھ سرشار بھی زبانی داستان کو ناول کا روپ دیتے نظر آتے ہیں، عبدالحلیم شرر تاریخی ناولوں کے ساتھ سامنے آتے ہیں، مرزا ہادی رسوا معاشرتی اصلاح ناول کے ساتھ نمایاں ہوتے ہیں۔

ترقی پسند تحریک کا اُردو ادب میں نمایاں کردار رہا ہے۔ اس حوالے سے فکشن کو زیادہ استعمال میں لایا گیا۔ فکشن میں بھی حقیقت نگاری ترجیح اُولیٰ رہی۔ افسانہ اور ناول نگار پریم چند اس تحریک کے ابتدائی مصنّفین میں سے تھے۔ وہ 1914 میں اردو سے ہندی زبان کی جانب منتقل ہو گئے تھے۔ 1932 میں 'انگارے' نامی کتاب جس کے مصنّفین میں احمد علی، رشید جہاں، محمود الظفر اور سجاد ظہیر شامل تھے، نے اُردو ادب میں اپنے جدت آمیز موضوعات جن میں طبقاتی استحصال، حقوق نسواں، جنسیت اور مذہبی استحصال شامل تھے کی بنا پر خاصی توجہ حاصل کی۔ ترقی پسند تحریک کے عوامی سطح پر گہرے اور دیرپا اثرات مرتب نہ ہو سکے۔

ایک زاویۂ سوچ یہ بھی ہے کہ تقسیمِ ہند نے اُردو کو خاصا نقصان پہنچایا۔ ہند کا مسلمان گہرے جذباتی سانحے اور اقلیت میں رہ جانے کے احساسِ محرومی کے باعث دب کر رہ گیا۔ اُردو سمٹ کر پاکستان تک محدود ہو گئی۔ اِسے مسلمانوں کی زبان سمجھا جانے لگا۔

البتہ تقسیمِ ہند نے موجود اُردو فکشن کو ایک پہلو سے مثبت طور پر خاصا متاثر کیا۔ فسادات

وحادثات کی طُو مارنے اس پودے کی جڑوں کو سیراب کیا۔ یوں اُردو افسانہ اور ناول حقیقت نگاری کے ایک بار آور دور میں داخل ہوئے۔ یہ امر توجہ طلب ہے کہ فسادات اور تقسیم جس نے اردو فکشن کو جذباتی اور تخلیقی طاقت بخشی تھی، کیوں کر وہی زبان اس درجہ بے حس ہوگئی کہ 1971 میں تقسیمِ پاکستان کے سانحے پر پہلے کی طرح فعال نہ ہو پائی۔

مغرب سے علامتی افسانہ درآمد کیا گیا۔ وہاں شرحِ خواندگی توانا تھی۔ اس کے علاوہ صنعتی انقلاب، دو عظیم جنگوں اور جدید ایجادات کے باہمی انسانی تعلقات پر اثر اندازی کے باعث ایسے حالات پیدا ہوگئے تھے کہ وہاں کی زمین علامت کو شناخت کرنے، سمجھنے اور سراہنے کے لیے زرخیز ہو چکی تھی۔ اس کے برعکس پاکستان میں شرح خواندگی کم تھی اور معاشرتی حالات مغرب سے مماثل ارتقا سے نہ گزرے تھے۔ چناں چہ مغرب سے درآمد کیا گیا پودا اس دیس کی زمین میں جڑ نہ پکڑ سکا۔ نتیجتاً مقامی فکشن اور قاری کے بیچ فاصلہ درآیا۔ ایسے میں چند ہوشیار لوگوں نے علامتی فکشن کی آڑ میں اپنی کہانی کہنے کی عدم صلاحیت کو چھپالیا اور سارا ملبہ قاری پر ڈال دیا۔

علامتی اور تجریدی فکشن فرد کے اندرونی اور بیرونی عناصر کو ٹٹولتا تھا، سامنے لے کر آتا تھا پر کیا اِس طرح اُس پر اثر انداز ہوتا تھا کہ اولاً قاری کی شخصیت اور ثانیاً معاشرے میں تبدیلی رونما ہو؟ اس کا سادہ سا جواب نفی میں ہوگا۔ اس جواب کے رَد میں یقیناً بہت سے دلائل دیے جاسکتے ہیں۔ پر یہ ایک حقیقت ہے کہ علامتی اور تجریدی ادب کے معاشرے پر واضح طور پر قابلِ پیمایش اثرات مرتب نہ ہوئے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے 1984 میں 'کہانی کی واپسی' کا اعلان کیا تھا۔ یہ اعلان خوش کن تھا پر تکنیکی لحاظ سے اِس بنا پر کم زور تھا کہ کچھ حد تک کہانی تو بہر حال ممتاز علامتی اور تجریدی فکشن میں بھی موجود تھی، نحیف، خفتہ اور در پردہ سہی!

پاکستان میں اُردو، سندھی، پنجابی، پشتو، بلوچی یہاں تک کہ ہندی فکشن پڑھا جانا چاہیے۔ اگر ہم ہند میں اُردو کے مذہب سے بالاتر ہو کر وسیع تر پھیلاؤ کے حامی ہیں تو ہندی کو کیوں کر مذہب کے خانوں میں بانٹتے ہیں؟ زبان کو مذہب کی قید سے آزاد کر دینا ہی اسے باثروت اور پُراثر بناتا ہے۔ فارسی میں کیا کیا غیر مسلم دیو ہیں اور عربی میں کیا کیا مسیحی سحر کار اور کافر بُت کار!

یقیناً فکشن شخصیت پر اثر انداز ہو کر معاشرے پر اثرات مرتب کرتا ہے۔ اس کے لیے فکشن کا بامعنی اور پراثر ہونا لازم ہے۔ پاکستان میں ادب کے معروضی حالات میں اوّلین قدم ایسا فکشن سامنے لانا ہے جو 'نیا ادب' اور 'مختلف ذائقہ' جیسی مہمل لیکن پُرفریب تراکیب کی اوٹ میں عام آدمی کے فہم سے ماورا تخلیقات پیش نہ کرے۔ عموماً عظیم ادب عوام و خواص دونوں میں مقبول

ہوتا ہے۔ ماضی کے شیکسپیئر اور ٹالسٹائی سے لے کر حال کی ایلس منرو تک، سب اس زمرے میں آتے ہیں۔ کافکا سے لے کر بورخیس (جن پر علامت و تجرید کے پرتو ہیں) عمومی طور پر اوسط تفہیم رکھنے والے ذہن کے لیے بھی قابلِ فہم ہیں۔ اُردو میں بیدی سے لے کر احمد ندیم قاسمی تک، سب نے ایسا فکشن تخلیق کیا جو عام آدمی کے دائرہ تفہیم میں بہ خوبی آتا تھا اور وہ ایسی تحریروں سے وابستگی محسوس کرتا تھا۔ حاضر کے فکشن کا حقیقت نگاری پر مبنی، دل چسپ اور توجہ طلب، عام قاری کی زندگی سے علاقہ اور جدید مسائل و معاملات سے منسلک ہونا اہم ہے۔ ماضی کے اہم مدیران محمد طفیل، وزیر آغا اور احمد ندیم قاسمی اور حاضر کے نمایاں مدیران محمد سلیم الرحمان، اجمل کمال، آصف فرخی اور علی محمد فرشی قابلِ فہم اور کہانی سے رس بھرے فکشن کے نباض اور قائل رہے ہیں۔ ان قابلِ قدر مدیران کی سند یقیناً قابلِ احترام ہے۔

فکشن کے مطالعے کی ہمہ گیر اہمیت کو سمجھتے ہوئے چند امور کو ملحوظِ نظر رکھنا مستحسن معاملہ ہوگا۔ منڈی اور معیشت کے دو اہم عوامل طلب اور رسد کی طرح فکشن میں بھی یہ دو عناصر دیگر کے علاوہ کارفرما ہیں۔ طلب میں اضافے کے لیے پنیری پر کام کرنا ضروری ہے۔ یعنی اطفال سے متعلق ایسا ادب تخلیق کرنا اور اُسے ان کی تعلیمی و تدریسی نظام کا درجہ بہ درجہ حصہ بنا دینا جو ان کے نہ صرف شوق کو مہمیز دے بلکہ جدید نظامِ زندگی سے بھی متعلق ہو۔ اگر فوری طور پر ایسا کرنا ممکن نہ ہو تو جدید بین الاقوامی فکشن کے اردو تراجم اس ضرورت کو کچھ حد تک پورا کر سکتے ہیں۔ بچوں کے ادب کو مزید توجہ کی ضرورت ہے۔ کلاسیکی کہانیاں ایک نوآموز کو روایت سے تو ضرور جوڑتی ہیں پر جدید طرزِ حیات سے ہم آہنگ نہ ہونے کے باعث بچے میں احساسِ اجنبیت پیدا کرتی ہیں اور مطالعے کو ایک پُرشوق سرگرمی کے بجائے زحمت بنا دیتی ہیں۔ کلاسیکی ادب کو بہ تدریج مطالعے میں شامل کیا جا سکتا ہے۔

ترقی یافتہ دنیا میں لازمی نصاب کے ہم راہ کہانیاں اور ناول طلبا کو مطالعے اور بعد ازاں مباحثے کے لیے دیے جاتے ہیں۔ یوں ان میں مطالعے کا شوق اور تجزیے کا ذوق جنم لیتا ہے۔ اگر یہی معاملہ ہمارے ہاں ترویج پا جائے تو چند برسوں میں قارئین کی ایک جماعت اُبھر کر سامنے آ جائے گی۔ ایسے میں اس امر کو ملحوظِ خاطر رکھنا اہم ہے کہ اصلاحی نوعیت کے ادب کے علاوہ تفریحی مزاج کا ادب بھی دسترخوان پر چُنا جائے۔ یوں جدید ادب کی بڑھتی ہوئی طلب رسد کو بھی جنم دے گی۔ رسد کے لیے وسیع پیمانے پر ادب کی تخلیق اس شعبے میں معاشی سرگرمی کے پہیے کی رفتار کو تیز کرنے کا باعث بنے گی جو ادیب کے لیے معاشی خود کفالت لا سکتی ہے۔ بہ ظاہر سادہ امر اپنے جلو میں لاتعداد پیچیدگیاں لا سکتا ہے۔ مسائل آئیں گے تو ان کے حل جنم لیں گے۔ حل خلا میں

وجود نہیں پاتے۔ درحقیقت اعلیٰ فکشن کی تخلیق معاشرتی سطح پر ایسی تہذیبی بہتری لاسکتی ہے اور پاکستانی معاشرے کو عالمی برادری کا معزز رُکن بناسکتی ہے جو قابلِ تعریف اور باعثِ اطمینان ہو۔

دریں اثنا موجودہ ادیبوں کی معاشی بہبود کی صورت پیدا کرنے اور انھیں تن دہی سے عمدہ ادب تخلیق کرنے پر آمادہ رکھنے کے لیے ایک ایسا غیر متنازعہ بورڈ تشکیل دیا جاسکتا ہے جو حقیقی ادیبوں اور ان کے معیاری ادب پاروں کا انتخاب کرکے ان کی معاشی سرپرستی کرے، اُن اخبارات اور چینل کو جو اردو ادب سے متعلقہ خبروں کو جگہ اور اہمیت دیں، مراعات دی جائیں، اُردو کی ادبی کتابوں کی موجودہ دکانوں اور پبلی شروں کو محصولات میں آسانی اور نئے آنے والے دکان داروں اور پبلی شروں کو محصولات میں خاطر خواہ چھوٹ دی جائے۔ متوازی طور پر پبلی شروں کی حقیقی طور پر پڑتال (آڈٹ) ہوتا کہ ان سے ادبا کی جائز آمدنی واگزار ہو۔ ناشرین کے وطیرے جس کے تحت مقبول کتب پر بھی اُن کے ایڈیشنوں کی تعداد (مع پہلے ایڈیشن کے سنِ اشاعت) کے عدم تذکرے کی غیر صحت مندانہ روایت کا محاسبہ ہوسکے۔

ایک ایسا ادارہ بھی وجود میں آسکتا ہے جو نہ صرف ادیبوں کی سرپرستی کرے بلکہ ان کا تحفظ بھی کرے۔

فکشن کے اہم نظر انداز کیے جانے والے جزو ڈرامے کے حوالے سے پاکستان اور اردو کی صورتِ حال مایوس کن ہے۔ نئے آنے والوں کے پاس اس میدان میں رونمائی کے لیے بہترین موقعہ ہے۔ عام پاکستانی کی فی الحال شاید تماشٔ گہہِ سیاست میں برپا ہونے والے شب و روز کے ڈراموں سے تشفّی و تسلی ہوجاتی ہو۔ کلامِ غالبؔ میں تحریف سے ؎ ہوتا ہے شب و روز 'ڈراما' مرے آگے۔

بیسویں صدی کی ۱۰۰ بہترین انگریزی کتابیں

تعارف و ترجمہ: یونس خان

بیسویں صدی کے اختتام پر، ماڈرن لائبریری نے بیسویں صدی کی ۱۰۰ بہترین کتابوں کی فہرست شائع کی۔ ماڈرن لائبریری، دنیا کے سب سے بڑے اشاعتی ادارے، رینڈم ہاؤس کا ایک ذیلی ادارہ ہے۔ ماڈرن لائبریری کی بنیاد آج سے سوسال پیشتر ۱۹۱۷ء میں رکھی گئی جبکہ رینڈم ہاؤس کا آغاز ماڈرن لائبریری کے ذیلی ادارے کے طور پر ۱۹۲۷ء میں ہوا ،اور وقت کے ساتھ ساتھ رینڈم ہاؤس ترقی کرتے کرتے اس گروپ کا بنیادی ادارہ بن گیا۔

ماڈرن لائبریری اپنا تعارف ''دنیا کی بہترین کتابوں کی ماڈرن لائبریری'' کے طور پر کرواتی ہے۔ اس دعوے کو سچا ثابت کرنے کے لئے انہوں نے بیسویں صدی کے اختتام پر'' بیسویں صدی کی سو بہترین کتابیں: ناول اور نان فکشن'' کی علیحدہ علیحدہ دو فہرستیں شائع کرنے کا پروگرام بنایا۔

رینڈم ہاؤس کی دس رکنی مجلس عاملہ یہ چاہتی تھی کہ عوامی سطح پر ایک بحث ہوتا کہ پتا چلایا جا سکے کہ اختتام پزیر صدی میں کون سا عظیم تخلیقی کام ہوا ہے۔ اس مقصد کے لئے ایک ویب پول (web poll) کا انتظام کیا گیا۔ دوسری طرف امریکہ کے دس نامور دانشوروں کے ایک بورڈ کو ناول اور نان فکشن کی علیحدہ علیحدہ فہرستیں مرتب کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی۔ اس فہرست میں یاد داشتوں سے لے کر درسی کتب تک اور مناقشوں اور مناظروں سے لے کر مضامین تک ہر چیز کا احاطہ کیا گیا ہے۔ یہ ایک جامع فہرست ہے۔ بیسویں صدی کی ۱۰۰ بہترین انگریزی کتابوں (نان فکشن) کی ادارتی فہرست آپ کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے:

ان فہرستوں میں، راقم سے یہاں تک ممکن ہو سکا، ٹائیٹل ترجمہ کرتے وقت معنوی اور صوری حسن کو برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے۔ ان دقیق موضوعات کو ترجمہ کرنا ایک مشکل کام تھا تاہم اگر ان بے شمار موضوعات کے ترجمہ میں کہیں کوئی کمی رہ گئی ہو تو اسے سراسر میری نااہلی پر مامور کیا جائے۔

ا

بیسویں صدی کے ۱۰۰ بہترین انگریزی ناول

بورڈز لسٹ

۱۔ یولیسز، جیمز جائس (۱۹۲۰ء)

1.Ulysses, by James Joyce

۲۔ عظیم گیٹز بی، ایف۔سکاٹ فٹزجیرالڈ (۱۹۲۵ء)

2.The Great Gatsby, by F.Scot Fitzgerald

۳۔ آرٹسٹ کا جوان آدمی ایسا ایک پورٹریٹ، جیمز جائس (۱۹۲۵ء)

3.A Portrait of the Artist As a Young Man, by James Joyce

۴۔ لولیتا، ولادیمیر نابوکوف (۱۹۵۵ء)

4.Lolita , by Valadimir Nabokov

۵۔ نئی بہادر دنیا، آلڈواَس ہکسلے (۱۹۲۳ء)

5.Brave New World, by Aldous Huxley

۶۔ نِدا اور جوش، ولیم فاولکنر (۱۹۲۹ء)

6.The Sound And The Fury, by William Faulkner

۷۔ کیچ۔۲۲، جوزف ہیلّر (۱۹۶۱ء)

7.Catch-22 , by Joseph Heller

۸۔ سیاہی سانجھ سمے کی، اَرتھر کوئسٹلر (۱۹۴۰ء)

8.Darkness At Noon , by Arther Koestler

۹۔ بیٹے اور محبوب، ڈی۔ایچ لارنس (۱۹۱۳ء)

9.Sons And Lovers, by D.H. Lawrence

۱۰۔ قہر کے انگور، جان سٹین بیک (۱۹۴۰ء)

10.The Grapes Of Wrath , by John Steinbeck

۱۱۔جوالا مُکھی کے نیچے،میلکوم لَوری(۱۹۴۷ء)

11.Under The Volcano, by Malcolm Lowry

۱۲۔کھانا،سیموئل بٹلر(۱۹۰۳ء)

12.The Way Of All Flesh, by Samuel Butler

۱۳۔۱۹۸۴ء،جارج اَورَویل(۱۹۴۹ء)

13. 1984, by George Orwell

۱۴۔مَیں،کلاڈِیسؔ ،رابرٹ گریوز(۱۹۳۴ء)

14. I, Claudius, by Robert Graves

۱۵۔ٹو دالائٹ ہاؤس،وَرجینیاوُ ولف(۱۹۲۷ء)

15.To The Light House, by Virginia Woolf

۱۶۔ایک امریکی المیہ،تھیوڈُورڈ رَیزَر(۱۹۲۵ء)

16.An American Tragedy, by theodore Dreiser

۱۷۔دل ہی تو اکیلا صیاد ہے،گارسن مَیک کلّرز(۱۹۴۰ء)

17.The Heart Is The Lonely Hunter, by Carson McCullers

۱۸۔مزبح۔۵،کرٹ وُونگٹ(۱۹۶۹ء)

18.Slaughterhouse-5, by Kurt Vonnegut

۱۹۔مخفی انسان،رالف ایلیسَن(۱۹۵۲ء)

19.Invisible Man, by Ralph Ellison

۲۰۔وطنی بیٹا، رچرڈ رائٹ(۱۹۴۰ء)

20.Native Son, by Richard Wright

۲۱۔بارش کا بادشاہ ہینڈرسن،سال بیلّو(۱۹۵۹ء)

21.Henderson The Rain King, by Saul Bellow

۲۲۔سمارا میں تعیناتی،جان اَوہیرا(۱۹۳۴ء)

22.Appointment In Samara, by John o`Hara

۲۳۔یو۔ایس۔اے(سہ ناول)،جون ڈوس پاسُز (۱۹۳۸ء)

23.USA (Trilogy), by John dos

۲۴۔وائنز برگ، اوہائیو، شیر ووڈ اینڈرسن (۱۹۱۹ء)

24.Winesburg, Ohio , by Sherwood Anderson

۲۵۔انڈیا کا ایک سفر، ای۔ایم فارسٹر (۱۹۲۴ء)

25.A Passage To India, by E.M forster

۲۶۔فاختہ کے پنکھ، ہنری جیمز (۱۹۰۲ء)

26.Thw Wings Of The Dove, by Henry James

۲۷۔سفارتِ خاص، ہنری جیمز (۱۹۰۳ء)

27.The Ambassadors, by Henry James

۲۸۔رات محافظ ہے، ایف سکاٹ فٹز جیرالڈ (۱۹۳۴ء)

28.Tender Is The Night, by F.Scott Fitzgerald

۲۹۔سٹڈز لونیگان سہ ناولہ، جیمز ٹی۔فاریل

29.The Studs Lonigan Trilogy, by James T.Farrell

۳۰۔اچھا سپاہی، فورڈ میڈوکس فورڈ (۱۹۱۵ء)

30.The Good Soldier, by Ford Madox Ford

۳۱۔اَینیمل فارم، جارج اِورویل (۱۹۴۵ء)

31.Animal Farm , by George Orwell

۳۲۔سنہری ساغر، ہنری جیمز (۱۹۰۴ء)

32.The Golden Bowl, by Henry Jame

۳۳۔سسٹر کیری، تھیوڈور ڈریزر (۱۹۰۰ء)

33.Sister Carrie, by Theodore Dreiser

۳۴۔مشت بھر خاک، اَیولن وَاوگ (۱۹۳۴ء)

34.A Handful of Dust, Evelyn waugh

۳۵۔جیسے میں لیٹا مر رہا ہوں، ویلیم فاوکنر (۱۹۳۰ء)

35.As I lay Dying, by william faulkner

۳۶۔بادشاہ کے تمام حواری، روبرٹ پین وارن (۱۹۴۶ء)

36.All The King's Men , by Robert Penn Warren

۳۷۔سان لوئس رے کا پُل ،تھورنٹن وِلڈر(۱۹۲۷ء)

37.The Bridge Of San Luis Rey, by Thornton wilder

۳۸۔ہاورڈز کی طرف،ای۔ایم فارسٹر(۱۹۱۰ء)

38.Howards End , by E.M Forster

۳۹۔چلو کہسار پر جا کر بتانا، جیمز بیلڈ وِن(۱۹۵۳ء)

39.Go Tell It On The mountain, by James Baldwin

۴۰۔مَن کا مغز،گراہم گرین(۱۹۴۸ء)

40.The Heart Of The Matter, by Graham Green

۴۱۔شیطان،ولیم گولڈِ نگ(۱۹۵۴ء)

41.Lord Of The Flies, by William Golding

۴۲۔نجات،جیمز ڈِکّی(۱۹۷۰ء)

42.Deliverance, by James Dickey

۴۳۔زمانے کی موسیقی پر رقص،انتھونی پاوَل(۱۹۷۵۔۱۹۵۱ء)

43.A Dance To The Music of Time, by Anthony Powell

۴۴۔نقطہ۔جوابی نقطہ،آلڈوس ہکسلے(۱۹۲۸ء)

44.Point Counter Point, by Aldous Huxley

۴۵۔ سحر بھی ہوگی،اَرنسٹ ہَیمنگ وَے(۱۹۲۶ء)

45.The Sun Also Rises, Ernest Hemingway

۴۶۔جاسوس،جوزف کونَرڈ(۱۹۴۰ء)

46.The Secret Agent, by Joseph Conrad

۴۷۔نوسٹرومو،جوزف کونَرڈ(۱۹۴۰ء)

47.Nostromo, by Joseph Conrad

۴۸۔دھنک،ڈی۔ایچ لارنس(۱۹۲۱ء)

48.The Rainbow, by D.H.Lawrence

۴۹۔محبت میں مبتلا عورتیں،ڈی۔ایچ لارنس(۱۹۲۱ء)

49.Women In Love, by D.H.Lawrence

۵۰۔خطِ سرطان،ہنری مِلّر(۱۹۳۴ء)

50.Tropic Of Cancer, by Henry Miller

۵۱۔ظاہراور بے جان، نارمن مے لر، (۱۹۴۸)

51.The Naked And The Dead, by Norman Mailer

۵۲۔پورٹنوے کی فریاد، فلپ روتھ (۱۹۶۹ء)

52.Portnoy's Complaint, by Philip Roth

۵۳۔دھیمی آگ، ولادیمیر نابوکوف (۱۹۶۲ء)

53.Pale Fire, Valadimir Nabokov

۵۴۔اگست میں اُجالا، ولیم فاؤلکنز (۱۹۳۲ء)

54.Light In August, by william Faulkner

۵۵۔شاہراہ پر، جیک کیروایک (۱۹۵۷ء)

55.On The Road, by Jack Kerouac

۵۶۔مالٹاکے باشندے کا باز، ڈیشیل ہیمٹ (۱۹۳۰ء)

56.The Maltese Falcon, by Dashiell Hammett

۵۷۔پریڈ کی طرف، فورڈ میڈوکس فورڈ ،

57.Parade's End, by Ford Madox Ford

۵۸۔سادگی کا زمانہ، ایڈِتھ وہارٹن (۱۹۲۰ء)

58.The Age Of Innocence, by Edith Wharton

۵۹۔زلیخاڈوبسن، میکس بیربھوم (۱۹۱۱ء)

59.Zuleika Dobson, by Max Beerbohm

۶۰۔فِلم بین، وَالکر پرسی (۱۹۶۱ء)

60.The Moviegoer, by Walker Percy

۶۱۔پادری کے لئے موت کا بلاوا، ویلا کیتھر (۱۹۲۷)

61.Death Comes For The Archbishop, by Willa Cather

۶۲۔یہاں سے ابدیت کی طرف، جیمز جونز (۱۹۵۱ء)

62.From Here To Eternity, by James Jones

۶۳۔وَیپ شاٹ کی سرگزشت، جان چیوِر (۱۹۵۷ء)

63.The Wapshot Chronicles, by John Cheever

۶۴ رائی میں پھندا، جے۔ڈی سالنگر (۱۹۵۱ء)

64.The Catcher In The Rye, by J.D.Salinger

۶۵۔ چابی والا انسان، انھونی برجیس (۱۹۶۲ء)

65.A Clockwork Orange, by W.Somerset Maugham

۶۶۔ انسانی غلامی کے متعلق، ڈبلیو سومرسیٹ موگھم (۱۹۱۵ء)

66.Of Human Bondage, by Joseph Conrad

۶۷۔ قلب جہالت، جوزف کونرڈ (۱۹۰۲ء)

67.Heart of Darkness, by Joseph Conrad

۶۸۔ مین سٹریٹ، سن کلیئر لیوز، (۱۹۵۲)

68.Main Street, by Sinclair Lewis

۶۹۔ کاشانہ نشاط، ایڈتھ وہارٹن (۱۹۰۵ء)

69.The House Of Mirth, by Edith Wharton

۷۰۔ الیگزنڈریہ کی ٹولی، لارنس ڈورَیل (۱۹۵۷ء)

70.The Alexandria Quartet, by Lawrence Durell

۷۱۔ جمیکا میں آندھی، رچرڈ ھوجیس

71.A High Wind In Jamaica, by Richard Hughes

۷۲۔ مسٹر بسواس کے لئے ایک گھر، وی۔ایس نیپال (۱۹۶۱ء)

72.A House For Mr.Biswas, by V.S Naipaul

۷۳۔ شجر کا دن، ناتھنیل ویسٹ (۱۹۳۹ء)

73.The Day Of The Locust, by Nathanael West

۷۴۔ وداعِ جنگ، ارنسٹ ہیمنگ وَے (۱۹۲۹ء)

74.A Farewell to Arms, by ernest Hemingway

۷۵۔ وسعت، اَوِلن وَاوگ (۱۹۳۸ء)

75.Scoop, by Evelyn Waugh

۷۶۔ مس جَین بروڈآئی کا شباب، مورِیل سپارک (۱۹۶۱ء)

76.The Prime of Miss Jean Brodie, by Mureil Spark

۷۷۔ فنیگر کے نقشِ قدم پر، جیمز جائس (۱۹۳۹ء)

77.Finnegans Wake, by James Joyce

۷۸۔ کِم، رُڈیارڈ کپلنگ (۱۹۰۱ء)

78.Kim, by Rudyard Kipling

۷۹۔ نظارے کا موقع، ای۔ایم فارسٹر (۱۹۰۸ء)

79.A Room With A View, by E.M Forster

۸۰۔ برائیڈز ہیڈ پھر ملنے گئی، اَیولن وَا گ (۱۹۴۵ء)

80.Brideshead Revisited, by Evelyn Waugh

۸۱۔ آ گائی مارچ کی مہم، سال بیلو، (۱۹۵۳ء)

81.The Adventures Of Augie March, by Saul Bellow

۸۲۔ ستانے کا گوشہ، والس سٹیگنر (۱۹۷۱ء)

82.Angle Of Repose, by Wallace Stegner

۸۳۔ ندی میں خم، وی۔ایس نیپال (۱۹۷۹ء)

83.A Bend In The River, by V.S Naibaul

۸۴۔ قلب کی موت، ایلزبتھ بووَین (۱۹۳۸ء)

84.The Death Of The Heart, by Elizabeth Bowen

۸۵۔ لارڈ جم، جوزف کونرَڈ (۱۹۰۰ء)

85.Lord Jim, by Joseph Conrad

۸۶۔ امریکی راگ، ای۔ایل ڈاکٹورو (۱۹۷۵ء)

86.Ragtime, by E.L Doctorow

۸۷۔ پرانی بیویوں کا قصہ، ارنلڈ بینّٹ، (۱۹۰۸ء)

87.The Old Wive's Tale, by Arnold Bennett

۸۸۔ بیابان کا بلاوا، جیک لنڈن (۱۹۰۳ء)

88.The Call Of The Wild, by Jack London

۸۹۔ محبت کرنے والا، ہنری گرین،

89.Loving, by Henry Green

۹۰۔ آدھی رات کے بچے، سلمان رُشدی (۱۹۱۸۱ء)

90.Midnight's Children, by Salman Rushdie

۹۱۔ٹو بیکو روڈ،اَرس کائن کالڈوَیل(۱۹۳۲ء)

91.Tobacco Road, by Erskine Caldwell

۹۲۔آہنی پھول،ویلیم کینڈی(۱۹۸۳ء)

92.Ironweed, by William Kennedy

۹۳۔دی میگس،جون فاوَلز(۱۹۶۶ء)

93.The Magus, by John Fowles

۹۴۔کائی کا وسیع سمندر،جَین رھیز،(۱۹۶۶ء)

94.Wide Sargasso Sea, by Jean Rhys

۹۵۔جال کے نیچے،ائرَ زمَر دوخ،(۱۹۵۴ء)

95. Under The Net, by Iris Murdoch

۹۶۔سَوفی کے پسند،ویلیم سٹائرون،(۱۹۷۹ء)

96.Sophie's Choice,by William Styron

۹۷۔پناہ گاہ آسمان،پاوَل باوَلز(۱۹۴۹ء)

97.The sheltering Sky, by Paul Bowles

۹۸۔ہرکارہ ہمیشہ دو دفعہ گھنٹی بجاتا ہے،جیمز ایم۔کَین،(۱۹۳۴ء)

98.The Postman Always Rings Twice, by James M.Cain

۹۹۔ تیز آدمی،جے۔پی ڈنلیوی

99.The Ginger Man, by J.P Donleavy

۱۰۰۔شاندار ایمبر سنز، بوتھ ٹارکنگٹن (۱۹۱۸ء)

100.The Magnificent amersons, by Booth Tarkington

۲

بیسویں صدی کی ۱۰۰ بہترین انگریزی کتابیں (نان فکشن)

بورڈز لسٹ

۱۔ ہنری آدم کی تعلیم، ہنری آدمز

1.The Education Of Henry Adams, by Henry Adams

۲۔ مذہبی ازمائشوں کی رنگارنگی، ویلیم جیمز

2.The Varieties Of Religious Experience, by William James

۳۔ غلامی سے پہلے بُوکر۔ ٹی واشنگٹن

3.Up From Slavery, by Booker T. Washington

۴۔ کسی کی اپنی کٹیا، ورجینیا وولف

4.A Room Of One's Own, by Virginia Woolf

۵۔ ساکت چشمہ، رَیچل کارسَن

5.Silent Spring, by Rachel Carson

۶۔ منتخب مضامین: ۱۹۳۲-۱۹۱۷ء، ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ

6.Selected Essays, 1917-1932, by T.S.Eliot

۷۔ نقش ونگار کو دو چند کرنا، جیمز۔ ڈی واسٹن

7.The Double Helix, by James D. Watson

۸۔ حافظہ اور گفتگو، ولا یمیر نابوکوف

8.Speak, Memory, by Vladimir Nabokov

۹۔ امریکن طرزِ سخن، ایچ۔ ایل مینکّین

9.The American Language, by H. L. Mencken

۱۰۔ روزگار، سوداور دولت کا مروّج نظریہ، جان مینارڈ کینز

10.The General Theory Of Employment, Interest, and Money, by John Maynard Keynes

۱۱۔ایک کوٹھری کی زندگیاں، لیوس تھامس

11.The Lives Of A Cell, by Lewis Thomas

۱۲۔امریکی تاریخ کی سرحد، فریڈرک جانسن ٹرنر

12.The Frontier In American History, by Frederick Jackson Turner

۱۳۔سیاہ طفل، رچرڈ رائٹ

13.Black Boy, by Richard Wright

۱۴۔ناول کی ہیت، ای۔ ایم۔ فارسٹر

14.Aspects Of The Novel, by E.M. Forster

۱۵۔خانہ جنگی، شیلبی فُوٹ

15.The Civil War, by Shelby Foote

۱۶۔عالی شان بندوقیں، باربرا ٹکمین

16.The Guns Of August, by Barbara Tuchman

۱۷۔بنی نوعِ انسان کا حقیقی مطالعہ، اَزیحہ برَلن

17. The Proper Study Of Mankind, by Isaiah Berlin

۱۸۔انسان کی فطرت اور مقدر، رین ہولڈ نیبُھر

18.The Nature And Destiny Of Man, by Reinhold Niebuhr

۱۹۔ایک وطنی بیٹے کی یادداشتیں، جیمز بیلڈ وِن

19.Notes Of A Native Son, by James Baldwin

۲۰۔ایلسی۔ٹوکیاز کی خودنوشت، گرٹروڈ سٹائن

20.The Autobiography Of Alice B. Tokias, by Gertrude Stein

۲۱۔طرزادا کے عناصر، ولیم سٹرنک اور اِی۔ بی وائٹ

21.The Elements Of Style, by William Strunk and E.B. White

۲۲۔امریکہ کی دہری مشکل، گنّر میرڈَل

22.An American Dilemma, by Gunnar Myrdal

۲۳۔ریاضی کے بنیادی اصول، ایلفرڈ نارتھ وہائٹ ہیڈ اور برٹرینڈ رَسّل

23.Principia Mathematica, by Alfred North Whitehead and Bertrand Russell

۲۴۔انسان کا غلط اقدام، سٹیفن جے۔ گوولڈ

24.The Mismeasure Of Man, by Stephen Jay Gould

۲۵۔آئینہ اور چراغ، مییَر ہاورڈ اَیبرامز

25.The Mirror And The Lamp, by Meyer Howard Abrams

۲۶۔حل پزیری کا ہُنر، پیٹر۔ بی۔ میڈاوَر

26.The Art Of The Soluble, by Peter B.Medawar

۲۷۔چونٹیاں، ہرٹ ہوایل ڈوبلّر اور ایڈورڈ۔او۔ولسن

27.The Ants, by Bert Hoelldobler and Edward O. Wilson

۲۸۔انصاف کا اصول، جان راوَلز

28.A Theory Of Justice, by John Rawls

۲۹۔فن اور فریبِ نظر ،ارنسٹ۔ایچ گومبرِچ

29.Art And Illusion, by Ernest H. Gombrich

۳۰۔انگلش ورکنگ کلاس بنانے کی ترکیب، ای۔پی۔تھامپسن

30.The Making Of The English Working Class, by E.P. Thompson

۳۱۔سیاہ برادری کی ارواح، ڈبلیو۔ای۔بی۔ڈوبوئز

31.The Sould of Black Folk, by W.E.B. Du Bois

۳۲۔اخلاقیات کے بنیادی اصول، جی۔ای۔مُور

32.Principia Ethica, by G.E. Moore

۳۳۔فلسفہ اور تہذیب، جون ڈیوی

33.Philosophy And Civilization, by John Dewey

۳۴۔قالب اور بالیدگی کے متعلق،ڈی آرسی تھامپسن

34.On Growth And Form, by d'Arcy Thompson

۳۵۔تصورات اور آراء،البرٹ آئن سٹائن

35.Ideas and Opinions, by Albert Einstein

۳۶۔جیکسن کا عہد (ارتھر شلیے زِنگر)،جونیئر

36.The Age Of Jackson , Arthur Schlesinger by Jr.

۳۷۔جوہری بم بنانے کی ترکیب،رچرڈ رَہوڈَز

37.The Making Of The Atomic Bomb, by Richard Rhodes

۳۸۔سیاہ میمنا اور خاکستری عقاب،رَابیکا وَیسٹ

38.Black Lamb And Grey Falcon, by Rebecca West

۳۹۔سوانح عمریاں ،ڈبلیو۔بی۔ییٹس

39.Autobiographies, by W.B. Yeats

۴۰۔سائنس اور تمدن چین میں،جوزف نِیڈہم

40.Science And Civilization in China, by Joseph Needham

۴۱۔اُن تمام کو خدا حافظ،رابرٹ گریوز

41.Goodbye To All That ,by Robert Graves

۴۲۔قشتالیہ کو خراجِ عقیدت،جارج اَوروَیل

42.Homage To Catalonia, by George Orwell

۴۳۔مارک ٹوئینؔ کی خودنوشت،مارک ٹوئین

43.The Autobiography Of Mr Twain, by Mark Twain

۴۴۔بحرانوں کے بچے،روبرٹ کولز

44.Children Of Crisis, by Robert Coles

۴۵۔تاریخ کا ایک مطالعہ،آرنلڈ جے۔ٹائن بی

45.A Study Of History, by Arnold J. Toynbee

۴۶۔متمول معاشرہ، جان کینتھ گلبریتھ

46.The Affluent Society, by John Kenneth Galbraith

۴۷۔تخلیق کے دوران موجود، ڈی ان اتچسن

47.Present At The Creation, by Dean Acheson

۴۸۔عظیم پُل، ڈیوڈ میک کلو

48.The Great Bridge, by David McCullough

۴۹۔حُبِ وطن کا گِلہ، ایڈمنڈ ولسن

49.Patriotic Gore, by Edmund Wilson

۵۰۔سیموئل جانسن، والٹر جیکسن بیَٹ

50.Samuel Johnson, by Walter Jackson Bate

۵۱۔میلکم اَیکس کی خودنوشت، آلیکس ہَیلی اور میلکم ایکس

51.The Autobiography Of Malcom X,by Alex Haley and Malcolm X

۵۲۔درست مسالہ، ٹوم وُولف

52.The Right Stuff, by Tom Wolfe

۵۳۔وِکٹورین عہد کے ممتاز لوگ، لےٹن سٹرپچی

53.Eminent Victornians, by lytton Strachey

۵۴۔ورکنگ، سٹڈز ٹرکیل

54.Working, by Studs Terkel

۵۵۔آشکار اندھیرا، ویلیم سٹائرون

55.Darkness Visible, by William Styron

۵۶۔لبرل تخّیل، لائی اونَیل ٹرِلنگ

56.The liberal Imagination, by Lionel Trilling

۵۷۔جنگِ عظیم دوئم، ونسٹن چَرچِل

57.The Second World War, by Winston Churchill

۵۸۔افریقہ سے باہر، اَیزک ڈِینے زَین

58.Out Of Africa, by Isak Dinesen

۵۹۔جیفرسَن اوراسکا عہد،ڈومیس مےلون

59.Jefferson And His Time, by Dumas Malone

۶۰۔ امریکی غلّے میں،ولیم کارلوس ولیم

60.In The American Grain, by William Carlos Williams

۶۱۔آرام دہ صحرا،مارک ریزنر

61.Cadillac Desert, by Marc Reisner

۶۲۔مورگن کا گھر،رَون چرنَو

62.The House Of Morgan, by Ron Chernow

۶۳۔شریں سائنس،اے۔جے۔لائی بلنگ

63.The Sweet Science, by A. J. Liebling

۶۴۔کھلا معاشرہ اوراس کے دشمن،کارل پوپر

64.The Open Society And Its Enemies by Karl Popper

۶۵۔حافظے کا ہنر،فرنسِ اے۔ییٹس

65.The Art Of Memory, by Frances A.Yeats

۶۶۔کیپٹل ازم کی نمود اور مذہب،آر۔ایچ۔ٹانے

66.Religion And The Rise of Capitalism by R.H. Tawney

۶۷۔عادات کا دیباچہ،والٹر لپمین

67.A Preface To Morals, by Walter Lippmann

۶۸۔سَماوی سکون کا باب،جوناتھن۔ڈی سپینس

68.The Gate of Heavenly Peace, by Jonathan D. Spence

۶۹۔سائنسی انقلابات کی ترکیب،تھامس۔ایس کوہن

69.The Structure of Scientific Revloutions, by Thomas S. Kuhn

۷۰۔جِم کرَوکا انوکھا ذریعہ معاش،سی۔وَین وَوڈوَرڈ

70.The Strange Career Of Jim Crow, by C. Vann Woodward

۷۱۔مغرب کا عروج، ولیم ۔ایچ مِک نیل

71.The Rise Of The West, by William H, McNeill

۷۲۔انجیل خواں عارفین، ایلین پاجیلز

72.The Gnostic Gospels, by Elaine Pagels

۷۳۔جیمز جائس، رچرڈ ایلمین

73.James Joyce, by Richard Ellmann

۷۴۔فلورنس نائیٹنگیل، سیسل ووڈھیم ۔سمتھ

74.Florence Nightingale, by Cecil Woodham-Smith

۷۵۔شدید جنگ اور جدید حافظہ، پال فسّیل

75.The Great War And Modern Memory, by Paul Fussell

۷۶۔تاریخ کا اھم شہر، لیوِ زمَم فورڈ

76.The City In History, by Lewis Mumford

۷۷۔آزادی کی طلب کی جنگ، جیمز ایم ۔میک فرسَن

77.Batttle Cry Of Freedom, by James M. McPherson

۷۸۔ہم انتظار کیوں نہیں کرتے مصنف مارٹن لوتھر کنگ ، جونئیر

78.Why We Cant't Wait, by Martin Luther King by Jr.

۷۹۔تھیوڈور روز ویلٹ کا عروج، ایڈمنڈ موریس

79.The Rise Of Theodore Roosevelt, by Edmund Morris

۸۰۔بصری آرٹ کے علم کی تعلیمات، اِروِن پینوفیسکی

80.Studies In Iconology, by Erwin Panofsky

۸۱۔جنگ کا چہرہ، جون کی گان

81.The Face Of Battle, by John Keegan

۸۲۔لبرل انگلینڈ کی انوکھی موت، جارج ڈینگر فیلڈ

82.The Strange Death Of Liberal England by George Dangerfield

۸۳۔ ورمیر، لارنس گووِنگ

83.Vermeer, by Lawrence Gowing

۸۴۔ایک چمکتا ہوا روشن جھوٹ، نیل شی ہَن

84.A Bright Shining Lie, by Neil Sheehan

۸۵۔شب کے سنگ مغرب، بیَرل مارک ہم

85.West With The Night, by Beryl Markham

۸۶۔اِس لڑکے کی زندگی، ٹوبیاز وولف

86.This Boy's Life, by Tobias Wolff

۸۷۔ایک ریاضی دان کی معذرت، جی۔ایچ ہارڈی

87.A Mathematician's Apology, by G.H.Hardy

۸۸۔تسکین کے چھ اجزا، رچرڈ۔ پی فِین مَین

88.Six Easy Pieces, by Richard P. Feynman

۸۹۔ٹِنکر کریک (کھاڑی) کا زائر، اینی ڈِیلارڈ

89.Pilgrim at Tinker Creek, by Annie Dillard

۹۰۔سنہری شاخ، جیمز جارج فَریزِر

90.The Golden Bough, by James George Frazer

۹۱۔سایہ اور عمل، رالف ایلی سَن

91.Shadow And Act,by Ralph Ellison

۹۲۔پاور بروکر، روبرٹ۔اے کیرو

92.The Power Broker, by Robert A.Caro

۹۳۔امریکن سیاسی روایت، رچرڈ ہوفز ٹیڈٹر

93.The American Political Tradition, by Richard Hofstadter

۹۴۔امریکن تاریخ کے چہرے، ولیم ایپل مین ولیمز

94.The Contours Of American History, by William Appleman Williams

۹۵۔امریکن زندگی کا وعدہ، ہربرٹ کَرولی

95.The Promise Of American Life, by Herbert Croley

۹۶۔ٹھنڈے خون میں،ٹرومان کیپوٹ

96.In Cold Blood, by Truman Capote

۹۷۔صحافی اورقاتل،جینٹ میلکم

97.The Journalist And The Murderer, by Janet Malcolm

۹۸۔موقع کومطیع کرنا،آئن ہیکنگ

98.The Taming Of Chance, by Ian Hacking

۹۹۔عمل کرنے کےاحکامات ،اَنی لیموٹ

99.Operating Instructions, by Anne Lamoot

۱۰۰۔میلبورن ،لارڈ ڈیوڈ سیسل

100.Melbourne, by Lord David Cecil

آپ ہمارے کتابی سلسلے کا حصہ بن سکتے
ہیں مزید اس طرح کی شان دار،
مفید اور نایاب کتب کے حصول کے لئے
ہمارے وٹس ایپ گروپ کو جوائن کریں

ایڈمن پینل

عبداللہ عتیق : 03478848884

سدرہ طاہر : 03340120123

حسنین سیالوی : 03056406067

کچھ تازہ کتابیں

سیمیں کرن

ایک ایسا وقت جب یہ شور وغوغا بلند ہوا کہ ادب پھل پھول نہیں رہا، اُردو ادب اپنی موت مر رہا ہے۔ کتاب کلچر کو نیٹ کی دُنیا نے بُری طرح نگل لیا ہے۔ دنیا جو ایک بالکل نئی کروٹ لے چکی اِن گزشتہ دو دو ہائیوں میں، نئے انداز اور رویے ہمارے دروازوں پر دستک دے رہے ہیں بلکہ دستک دے کر ہماری زندگی کا حصہ بن چکے ہیں۔ وہاں اِن سوالوں کو اور آج کے ادب کو دیکھنے اور اُس پہ بات کرنے کی پہلے سے زیادہ ضرورت ہے۔ اس بات پر غور کرنے کی اور اِن مفروضوں کو غلط ثابت کرنے کی کہ کیا واقعی اُردو زبان زوال پذیر ہے۔

کیا اُردو ادب تخلیق نہیں ہو رہا، اَیسا ادب جو بین الاقوامی ادب کا مقابلہ کر سکے۔ کیا کتاب کلچر ہمارے بیچ سے غائب ہو چکا ہے کیا کتاب کی جگہ واقعی نیٹ اور سوشل میڈیا لے چکا ہے؟ اِن سوالوں کا جواب ڈھونڈنا ناگزیر اِس لیے بھی ہو جاتا ہے کہ نئی صدی کے دوسری دہائی اختتام پذیر ہے اور یہ گزشتہ بیس تیس برس ایک مکمل بدلے اور نئے سماج کے دعویدار ہیں جہاں سیاست ہماری جذباتی دنیا میں بری طرح مدخیل ہو چکی عام شخص کا سیاسی شعور مذید بالغ ہو چکا ہے اور جہاں بہت سے نئے مسائل سے موضوعات بن کر انسانی نوع کے سامنے ایک بُرے سوال کی صورت کھڑے ہیں۔

اُردو زبان کا شمار برصغیر کی اہم زبانوں کی ایک خاص لڑی میں ہوتا ہے، ایک ایسی زبان جس کر پڑھنے اور بولنے والے دُنیا کے ہر خطے میں موجود ہیں۔ جو سرزمین پاکستان کی قومی زبان ہے جبکہ یہ ہندوستان میں جنم لینے والی ایک بڑی آبادی میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ ہندوستان سے اُردو ادب میں مسلسل حصہ بھی ڈالا جا رہا ہے۔ لیکن اِس کے باوجود اُردو ادب زوال پذیر ہے کا سلوگن کیوں گردشِ عام ہے؟ اِن حالات میں اس سوال کے معنی خیزی نہ صرف ادب کے لکھاری کے لیے بڑھ جاتی ہے بلکہ قاری بھی اس سوال کو پوچھنے میں حق بجانب ہے۔ پاکستان اور ہندوستان کے ہر دو کا سماج ایک گھٹن، انتشار اور شدت پسندانہ رویوں کا ثمر کاٹ رہا ہے۔ پاکستان میں غیر مستحکم جمہوری اقدار، اسٹیبلشمنٹ کی مداخلت جو کہ کبھی مختلف اداروں کے مارشل لاء

جیسی صورتحال اِختیار کر لیتی ہے اور ہندوستان میں شدت پسند متشدد ہندو سیاست جو اُردو کو لگا تار ایک اقلیت کی زبان بنا رہی ہے، اُردو کو بنگالی میں دھکیلا جا رہا ہے۔ یہ وہ مسائل، چیلنجز اور سوال ہیں جو اُردو ادیب کو درپیش ہیں اور جن کو جواب ڈھونڈنے میں ہی شاید اس کا حل بھی پنہاں ہے۔

یہ ایک ایسا عہد ہے جہاں پاکستان سقوطِ ڈھاکہ جیسے سانحہ کے بعد مارشل لاء کے جبر اور پھر اپنی سرحدوں سے داخل ہو کر شہر میں مدخیل جنگ سے نبرد آزما رہا ہے، سانحہ آرمی پبلک سکول پشاور ابھی اِتنا تازہ ہے کہ زخموں سے لہو رِستا ہے۔

یہ ہے ہمارے آج کا منظر نامہ جو ادب اور ادیب کے لیے چیلنج کی مانند کھڑا ہے اور سوال پوچھتا ہے کہ کیا آج کا ادیب اِس سے عہدہ برآ ہونے کے لیے تیار ہے؟ اگر ہمارے پاس اِس سوال کا کوئی واضع جواب ہے تو یقیناً ہم باقی سوالوں اور مسائل کی جانب مثبت پیش رفت کے قابل ہوں گے۔ یہ سوال اپنی جگہ ہیں مگر کتاب اور ادبی جرائد کا تسلسل، اُس کی اشاعت، اُس کا تذکرہ ناگزیر ہی نہیں ہے بلکہ خوش آئند بھی ہے اور اِس دعوے کی نفی بھی کہ ادب زوال پذیر ہے اور ناپید ہو رہا ہے۔ ۲۰۱۸ء جو کہ آپ ہمیشہ کے لیے مہمان ہوا چاہتا ہے اِس کے حوالے سے گر کتب و جرائد کا جائزہ لیا جائے تو ہمارے پاس کہنے کو بہت کچھ ہے اور صورتحال یقیناً خوش آئند اور اُمید افزا ہے۔ قرۃ العین حیدر کہتی ہیں ''پتھر وقت کی منجمد صورت ہیں۔'' اور گر یہی بات کسی اچھی کتاب کے بارے میں کہی جائے تو کچھ ایسا غلط نہیں۔ اِس سال ایسی بہت سے کتابیں آئیں۔ ایسا بہت کام ہوا جو نہ صرف قابلِ ذکر ہے بلکہ اُردو ادب میں ایک گراں قدر اضافہ سمجھا جائے گا۔

سب سے پہلا تذکرہ محترم مستنصر حسین تارڑ کے ناول ''منطق الطیر، جدید'' کا ہے۔ تارڑ صاحب کے ناول کے کچھ اِختصاصات ہیں جن میں پرندے سرفہرست ہیں۔ فریدالدین عطار کے یہ پرندے مستنصر حسین تارڑ کی باطنی دنیا میں ہی نہیں پھڑ پھڑاتے بلکہ یہ پرندے ان کی ادبی کائنات میں بھی پرواز کرتے ملتے ہیں۔ یہ پرندے ''خس و خاشاک زمانے میں'' بھی منسوب ٹھہرتے ہیں۔ یہ تارڑ کے ساتھ ساتھ محوِ پرواز رہتے ہیں۔ ایسا ناول لکھنے کی ہمت مستنصر حسین تارڑ جیسا کہنا مشق ادیب ہی کر سکتا تھا۔ جس کے ساتھ مطالعہ کی کثرت ہم رکاب ہے وہ چاہے سفر کی صورت ہو یا کتاب کی۔ تارڑ ہر صورت مطالعہ کے خوگر ہیں اور یہی اُس کی تحریر کو ایک لازوال چاشنی عطا کرتی ہے۔ اُنہوں نے ان گزشتہ دو دہائیوں میں اُردو ادب کو بلا مبالغہ ایسے بڑے ناولز سے نوازا جس کو ہم عالمی ادب کے سامنے فخر سے رکھ سکتے ہیں۔ اِس میں بہاؤ، راکھ، اے غزال شب اور خس و خاشاک زمانے اور قربت مرگ میں محبت جیسے بڑے ناول شامل ہیں۔

خالد فتح محمد بھی اُن ناموں میں شامل ہیں جنھوں نے اُردو ادب میں معتبر اضافہ کیا

ہے۔ اُن کا اسلوب سادہ و دلنشین ہے بغیر کسی اُلجھاوے کے وہ اپنی بات وسوچ قاری تک پہنچا دیتے ہیں۔ ''شہرمدفون'' اور ''خلیج'' کے بعداُن کا تازہ ناول ''سانپ سے زیادہ سراب'' سامنے آیا ہے۔محمد الیاس بھی اُن معتبر ناموں میں شامل ہیں جنھوں نے گزشتہ دو دہائیوں میں اُردو ادب میں گراں قدر اضافہ کیا ہے۔متعدد افسانوی مجموعے اور ناول اُن کے کریڈٹ پہ ہیں۔ کہر، برف، بارش، پروا اور دھوپ جیسے بڑے ناول وہ اردو اَدب کو دے چکے ہیں اور امسال اُن کا ناول '' عقوبت''،نفس اُمید ہے کہ اشاعت ہوکر سامنے آجائے گا۔جس میں اُن کے دو ناولٹ شامل ہیں۔

اختر رضا سلیمی بھی ایک اہم ناول نگار کی صورت اُبھر کر سامنے آئے ہیں۔گزشتہ برس اُن کے پہلے ناول ''جاگے ہیں خواب میں'' کا تیسرا ایڈیشن شائع ہوا جبکہ دوسرا ناول ''جندر'' بھی سامنے آیا۔اس سال اِن کے دو ناولوں کا خوب تذکرہ رہا۔ ہزارہ کے پس منظر میں لکھے گئے یہ دونوں ناولز یقیناً ایک گراں قدر اضافہ ہیں۔

سید کاشف رضا کا ناول ''چار درویش اور کچھوا'' اِس برس کا ایک اہم اور عمدہ ناول ہے۔ ناول کا بیانیہ آغاز میں دیے ژاں بوردیاغ کے اِس بیان کی بہترین مثال ہے کہ آج کا فن حقیقت میں مکمل طور پر گھس گھسا چکا ہے اور دوسرے باب کے آغاز میں ژاں بوردیاغ کا کہنا ہے کہ اول تو یوں کہ فن بنیادی حقیقت کا عکس ہے اور ناول پڑھتے ہوئے یہ گمان ہوتا ہے کہ اِس کا بیانیہ حقیقت میں گھس گھسا چکا ہے یا کسی حقیقت کا عکس ہے۔ پاکستان کا سیاست کا ایک باب بے نظیر کی شہادت اور طالبان کی کاشت کاری ایسے موضوعات کی عکس بنیادی مصنف کچھ ایسے کی ہے کہ گویا کوئی قلم سامنے چل رہی ہے جس میں مصنف خود کسی کچھوے کے خول میں جا چھپا ہے۔

سید کاشف رضا ایک عمدہ ناول نگار کی صوت میں سامنے آتے ہیں۔ آمنہ مفتی کا ناول ''پانی مر رہا ہے'' بھی قابلِ تذکرہ ہے۔گو زیر مطالعہ نہیں رہا۔ وہ ایک عمدہ لکھاری اور ڈرامہ رائٹر ہے۔ فارس مغل بھی ایک تیز رفتار لکھاری ہیں اور یکے بعد دیگرے اُن کے دو ناول سامنے آئے ہیں۔ ''ہم جان'' اُن کا پہلا ناول تھا اور اِس برس اُن کا ناول ''سوسال وفا'' سامنے آیا ہے۔ ''سوسال وفا'' بلوچستان جو ایک سلگتا ہوا حساس صوبہ ہے اور ایک ایسا مسئلہ جس پر بات کی بہت ضرورت ہے، اسی حساسیت کے پس منظر میں لکھا گیا ہے۔ یہ ایک سیاسی اور رومانوی ناول ہے۔ ایک حساس اور سنجیدہ موضوع کو ایک محبت کی کہانی کی صورت میں پیش کیا ہے اور وہ اپنی سوچ کے ابلاغ میں کامیاب رہا ہے۔فارس کے ہاں رومان کی چاشنی اِس قدر زیادہ ہے کہ وہ بیک وقت اُس کی تحریر کی خوبی بھی بنتی ہے اور خامی بھی ٹھہرتی ہے۔اُس کے پاس وہ تمام لوازم ہیں جو ایک شہ پارہ تخلیق کر سکتے ہیں۔ کردار نگاری، وسیع مطالعہ، عمدہ کردار نگاری و منظر نگاری دل پر براہِ راست

دستک دیتے جملے، کہانی کوسلیقے سے بیان کرنے ک سبھاؤ مگر یہ اُس کی کرداروں اور کہانی کا ٹریٹمنٹ ہے کہ ناول محض ایک رومانوی اور سماجی ناول بن جاتا ہے۔ یہی طریق اُس کے گزشتہ ناول ہیجان میں بھی نظر آتا ہے۔ یہ وقت فارس مغل جیسے اچھے لکھاری کے لیے سنبھل کر لکھنے کا ہے کہ اُردو ادب کو اُس سے بہت سی اُمیدیں وابستہ ہیں۔

محترم مشرف عالم ذوقی افسانے اور ناول کی دنیا کا وہ اہم نام ہے جو اب اساتذہ میں شمار ہوتے ہیں۔ گزشتہ دو دہائیوں میں وہ سلگتے مسائل اور عالمی و سماجی بدلاؤ کو اپنے ناولز کا موضوع بناتے رہے ہیں۔ اِس برس اُن کی ایک ہی تسلسل میں پانچ طویل کہانیاں، ہندوستان کے سیاسی پس منظر اور گھٹن کی بہترین عکاس رہیں جب کہ یہ کہانیاں اب ایک افسانوی مجموعے کی صورت کتابی شکل اختیار کر چکی ہیں۔ معروف فکشن نگار محمد عاصم بٹ کا ناول ''بھید'' بھی شائع ہوا ہے۔ یہ اپنے تئیں ایک منفرد تجربہ ہے جسے مستنصر تارڑ نے ''بھول بھلیاں یعنی Labyrinth قرار دیا ہے۔ اپنے تجربے کی بنیاد پہ اس ناول کو اختصاص حاصل ہے۔

ڈاکٹر ناصر عباس منیر جو ایک معتبر ادبی نقاد ہیں، کا افسانوی مجموعہ ''راکھ سے لکھی گئی کتاب'' قابلِ ذکر اضافہ ہے۔ اس کے علاوہ ان کی دو اہم کتابیں ''نظم کیسے پڑھیں'' اور ''لسانیات اور تنقید'' بھی شائع ہوئیں۔ ناصر عباس نیر نے اُردو تنقید میں اعتبار حاصل کر لیا۔ خصوصاً نوآبادیاتی مطالعات میں انھیں بنیاد گزار کی حیثیت حاصل ہے۔ امین ھایانی کا یہ دوسرا افسانوی مجموعہ ''بے چین شہر کی پُرسکون لڑکی'' ہے جو سامنے آیا ہے۔ محترم حمید شاہد کے رائے فلیپ پر شامل ہے۔ امین ھایانی کے افسانوں کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ ایک دردمند اور حساس لکھاری ہیں اور اصطلاح معاشرہ کے جذبے سے مغلوب ہیں اور یہی اُن کے قلم کی تحریک ہے۔ اِس مجموعے کا ایک قابلِ ذکر افسانہ ''نفرت سے محبت تک ۲۰۲۵'' ہے۔ ہندوستان و پاکستان کی سیاست، مسئلہ کشمیر اور مابین جنگوں کے پس منظر میں یہ امین ھایانی کا ایک عمدہ افسانہ ہے۔

سید ماجد شاہ کے افسانوی مجموعے ''ق'' کے بعد ''ر'' ان کا دوسرا مجموعہ ہے۔ جو اُن کے مختصر افسانوں وافسانچوں پہ مشتمل ہے۔ سبین علی نوجون لکھاریوں میں ایک عمدہ اضافہ اور اہم نام ہیں مختلف اور اہم موضوعات پر قلم اٹھاتی ہیں۔ صاحبِ مطالعہ اور عمدہ تنقیدی فکر رکھتی ہیں۔ اُن کا افسانوی مجموعہ ''گل مصلوب'' حال ہی میں منظر عام پر آیا اُمید کی جانی چاہیے کہ یہ ایک اہم اضافہ ثابت ہوگا۔ جواد حسنین بشر جواد جو ابن مسافر کے قلمی نام سے لکھتے ہیں کے یکے بعد دیگرے دو افسانوی مجموعے آئے ہیں۔ پہلا مجموعہ ''سفر نا تمام'' تھا اور اِس برس دوسرا مجموعہ ''ہاتھ ملاتا دریا اور مقدس بیٹی'' منظر عام پر آیا۔ جواد ایک جرات آمیز افسانہ نگار ہیں اور نئے موضوعات پہ لکھنے کے

خوگر روایتی موضوعات کے علاوہ جدید موضوعات و مسائل پر بھی ان کی گہری نظر ہے۔ اُمید ہے کہ وہ آنے والے وقتوں میں اہم افسانہ نگار ثابت ہوگا۔ نسترن فتیحی نے ایکوفیمنزم کے حوالے سے اچھا کام پیش کیا ہے۔ اُردو افسانے کو ماحولیاتی تانیثیت کے حوالے سے پہلے نہیں پڑھا گیا تھا۔

اگر اِس برس ادبی جرائد کی جانب نگاہ ڈالی جائے اور ایسے دور میں کہ یہ سودا محض دیوانگی کا ہے، اُردو جرائد جن کو نہ اِشتہارات تک رسائی ہے۔ نہ سرکاری سر پرستی حاصل اور نہ ہی مارکیٹ تک یہ پہنچ پاتے ہیں اِن تمام تر مسائل کے باوجود ادبی جرائد علم وادب کی شمع روشن رکھے ہوئے ہیں۔ ادبی جرائد کی بات آئے توصفِ اول میں بہت سے جرائد آن بان سے کھڑے ہیں۔ لوح، مکالمہ، اجرا، سویرا، چہارسو، نقاط اور تسطیر یہ رسالے اپنے عمدہ معیار کو برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ ''لوح'' نے بہت جلد خود کو صفِ اول میں شامل کیا ہے۔ لوح کا افسانہ نمبر اس دہائی کا ہی نہیں آنے والی دہائیوں کا بھی ایک قابل فخر کارنامہ ہے۔ جس کا ذکر آنے والے وقتوں میں ہوتا رہے گا اور ہر شمارے میں ایک خصوصی گوشے کا اِہتمام ہر شمارے کو خاص نمبر بناتا ہے۔ اِتنا ضخیم اور معیاری رسالہ نکالنا یقیناً محترم ممتاز شیخ صاحب کا قابلِ فخر کارنامہ ہے۔

مکالمہ مبین مرزا کی ادارت میں نکلنے والا ایک معتبر جریدہ ہے جو اَب ماہانہ تسلسل کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔ سویرا ایک تہذیبی روایت و تسلسل کا نام ہے اور محترم سلیم الرحمٰن کا نام ادبی دنیا میں کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ اس کا ہر شمارہ اپنی جگہ خاص ہے۔ اِس برس اجرا کا یوسفی نمبر ایک خاصے کی چیز ہے۔ احسن سلیم مرحوم کے بعد اقبال خورشید اور اُن کی ٹیم نے اجرا کو اسی معیار و روایت پہ جاری رکھا ہے جس پہ وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔

اکادمی ادبیات کے دو شمارے اِس برس آئے اور حالیہ شمارا عبداللہ حسین نمبر تھا۔ ستمبر میں ماہانہ ندائے گل لاہور کا سپیشل سالنامہ جس کا خوب تذکرہ ہوا۔ ادبی دنیا میں نو واردوں کا ایسے اہم جرائد و پراجیکٹ پہ کام بہت خوش آئند ہے کہ یہیں سے تازہ لہو کی آبیاری ہوگی۔ سہ ماہی چہارسو ایک اورادبی روایت کا نام ہے گلزار جاوید کی اِدارت میں تسلسل اور باقاعدگی سے نکلنے والا ،اِی جریدہ انڈیا پاکستان دونوں جگہ مقبول ہے اور ہر دفعہ گوشۂ اِختصاص اِس کا کارنامہ ہے۔ چہار سُو کو پیپر پر بھی محدود تعداد میں شائع کیا جا رہا ہے۔ قاسم یعقوب فیصل آباد سے تعلق رکھتے ہیں۔ کا بسلسلہ ملازمت اسلام آباد میں رہ کر نقاط جیسے عمدہ جریدے کو جاری رکھنا ایک مشکل کام ہے لیکن وہ اسے بخوبی نبھا رہے ہیں۔ نقاط نے بہت جلد اپنے آپ کو معیاری جرائد کی فہرست میں شامل کیا ہے۔ سہ ماہی شعر وسخن خیبر پختون خواہ کی ایک توانا آواز ہے اور باقاعدہ سنجیدگی سے اشاعت پذیر ہونے والے پرچوں میں شامل ہے۔ اِس کا اِس برس نکلنے والا ہزارہ نمبر ایک اہمیت طلب کام تھا

جسے جان عالم نے بخوبی سرانجام دیا۔ ''انہماک'' کتابی سلسلہ کا ذکر کرنا ناگزیر ہے۔ اِس کا خصوصی نمبر جو سامنے آیا اِس میں پانچ مصنّفین پر خصوصی گوشے شامل تھے۔ جن میں محمود ظفر اقبال ہاشمی اور جمیل احمد عدیل کے گوشے قابلِ ذکر ہیں۔ اہم مضامین و مائیکرو فکشن پر خصوصی توجہ لیے یہ شمارہ بھی خاصے کی چیز تھا۔ سیپ کا ایک شمارہ بھی اِس برس سامنے آیا سیپ ایک عہد کا نام ادب دوست ارشد نعیم کی اِدارت میں اپنا کھویا ہوا وقار پھر بحال کر رہا ہے وہ اِسے تسلسل کے ساتھ لا رہے ہیں اور عمدہ ماہنامہ نکال رہے ہیں۔ سہ ماہی الزبیر کے دو جرائد یکے بعد دیگرے سامنے آئے یہ ایک مخصوص مزاج کا پرچہ ہے۔ ادبِ لطیف بھی ناصر زیدی کی اِدارت میں تسلسل سے آ رہا ہے۔ تخلیق، الحمرا، بیاض بھی لاہور سے نکلنے والے اہم جرائد ہیں اور باقاعدگی سے شائع ہو رہے ہیں۔ امجد طفیل کی ادارت مین نلنے والا پرچہ ''استعارہ'' نے ادبی حلقوں میں خوب پہچان بنائی ہے۔ لاہور سے شائع ہونے والا اہم ادبی جریدہ ہے۔ دنیا زاد، مکالمہ اور روشنائی بھی کراچی سے شائع ہوئے۔ فیصل آباد سے اہم ادبی جریدہ ''نقاط'' کا کوئی شمارہ اس سال سامنے نہیں آیا۔ سہ ماہی مطلع، طلوع ادب، آزاد کشمیر کا سلوگن لیے طلوع ہوتا ہے جریدہ نہ صرف کشمیری ادب کی نمائندگی کرتا ہے بلکہ اپنی تحاریر کے اِنتخاب میں قومی دھارے میں شامل ہوتا نظر آتا ہے۔ کراچی سے باقاعدگی سے نکلنے والا سہ ماہی ''غنیمت'' جو اکرم کنجاہی کی اِدارت میں نکل رہا ہے بھی قابلِ ذکر ہے۔ ''صبح بہاراں'' بھی ایک نیا جریدہ ہے جو باقاعدگی سے منظرِ عام پر آ رہا ہے۔ اِس طرح سرحد پار دیکھیں تو بہت سے عمدہ پرچے جو ادب کی شمع تھامے ہوئے ہیں۔ اِن میں ماہنامہ شاعر بمبئی جس کی اشاعت کو ۸۰ برس گزر گئے ایک عمدہ روایت کا نام ہے۔ امروز، تفہیم، اِشعار، دربھنگہ ٹائمز اور ترایق بھی عمدہ پرچے ہیں اور حکومتی پالیسیوں کے تمام حوصلہ شکن اِقدامات کے باوجود سرحد پار سے اُردو رسائل، جرائد اور اِخبارات کا اِجراء یقیناً خوش آئند ہے۔ بھیرہ سے عرصے سے شائع ہونے والا ''فن زادہ'' بھی اہم پرچا ہے جو معیار اور تسلسل کی وجہ سے اپنی جگہ بنا رہا ہے۔

اِسی طرح شعری دنیا پہ نظر ڈالیں تو بے شمار شعری مجموعے منظرِ عام پہ آئے۔ ایک ایسا وقت جب معتبر و سینئر شعرا جو اَب استاد کا درجہ حاصل کر چکے ہیں جیسے امجد اسلام امجد جن کی کتاب امجد فہمی حال ہی میں منظرِ عام پر آئی۔ ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کا نیا شعری مجموعہ انتشار آیا، نصیر احمد ناصر کے کلیات کے علاوہ ''ملبے میں ملی چیزیں'' کا نیا ایڈیشن سامنے آیا۔ اس کے علاوہ نئی نسل و نئے شعرا بڑی تعداد میں سامنے آ رہے ہیں۔ ڈاکٹر جواز جعفری کی نظموں کا مجموعہ ''متبادل دنیا کا خواب'' قابلِ ذکر ہیں۔ ارشد معراج کی نظموں کا مجموعہ ''دوستوں کے درمیاں'' قابلِ ذکر ہے۔ یہ اپنی نوعیت کا منفرد تجربہ ہے۔ دوستوں کے نام ہٹا کے بھی پڑھا جائے تو مکمل نظمیں موجود ہیں۔ کوہاٹ

سے خوبصورت شاعر عارف بخاری کی غزلوں کا مجموعہ ''سرمئی'' بھی اسی سال شائع ہوا۔ حفیظ تبسم کا نظموں کا مجموعہ ''دشمنوں کے لیے نظمیں'' اِک نئے ذائقے کا آہنگ ہے۔ ظہور چوہان جن کے تین مجموعے اِس سے پہلے آ چکے، اُن کا شعری مجموعہ ''رودنی دونوں طرف'' اِس برس منظرعام پر آیا۔ شوزیب کاشر، اک جواں سالہ خوبصورت لب و لہجے کے نوجوان شاعر ہیں اور شعری دنیا میں عمدہ اضافہ ہیں۔ اُن کا شعری مجموعہ ''خمیازہ'' اِس برس منظر عام پر آیا ہے۔

ثمینہ تبسم ایک منجھی ہوئی شاعرہ ہیں چار کتب پہلے منظر عام پر آ چکیں جن میں پرچم تلے (نثر) شہید بھائی کی یادداشتیں ہیں، تین نظموں کے مجموعے مٹی کی عورت، عینی شاہد، نیا چاند۔۔۔ اِس برس اُن کی کتاب ''سربلندی تیری عنایت ہے (خواتین محمد کے نظمیہ حالاتِ زندگی) اشاعت پذیر ہوئی ہے۔ ناز بٹ کی نظموں وغزلوں کا پہلا مجموعہ ''وارفتگی'' منظر عام پر آیا ہے اور ادبی حلقوں میں اِسے کافی سراہا گیا ہے۔ شعروادب کی تخلیقی کتب کے علاوہ کچھ اور اہم قابلِ ذکر کتابیں ہیں جن کا ذکر ہونا چاہیے۔ محترم جبار مرزا ایک کہنہ مشق صحافی ہیں اِک محترم و معتبر نام ہیں۔ اُن کی کتاب ''نشانِ اِمتیاز''، محسنِ پاکستان ڈاکٹر عبدالقدیر سے متعلق ۳۴ برس کی یادداشتوں پر مشتمل ہے۔ جمیل احمد عدیل کے فن پر ''صاحبِ اسلوب'' کے نام سے اُن کے ادبی محاسن کا احاطہ کیا گیا ہے۔ یاسر جواد جو کہ ایک معروف مترجم و محقق ہیں اِس برس اُن کی سرائیکی ویب کی تاریخ، نوبیل اِنعام یافتہ ادیبوں کے خطبات، پنجاب میں دیسی تعلیم (سرلائنز)، ضرب الامثال اور محاورے (فرہنگِ آصفیہ سے ماخوذ) لاہور گزیٹیر (۱۸۹۴ء) منظر عام پر آئیں۔ ''فکشن، کلامیہ اور ثقافتی مکانیت'' فرخ ندیم کی کاوش ہے جو نئے تنقیدی فریم میں ادب کو دیکھنے کی کاوش ہے۔

یہاں تک سوشل میڈیا کا تعلق ہے تو جہاں تک اسے کتاب کلچر کو نگلنے کا ملزم ٹھہرایا جا رہا ہے وہیں اسی سوشل میڈیا کے مختلف فورمز اردو ادب کے فروغ کے لئے اپنا سودمند حصہ ڈال رہے ہیں۔ یہ اردو ادب کی نئی بستیاں ہیں جہاں نیا لکھاری بھی پیدا ہو رہا ہے اور قاری بھی۔ لیکن یہ لکھاری کنفیوز ہے کہ نہیں جانتا کہ اسے کیا لکھنا ہے، کہاں لکھنا ہے اور کہاں چھپنا ہے مگر اس کے سامنے امکانات کی وسیع تر دنیا ہے۔

اِس منظرنامے پہ نگاہ دوڑائیں تو ایک اور دروزہ کھلتا ہے۔ اِک اور منظر نگاہوں کے سامنے ہے وہ یہ کہ تمام تر مسائل اور لاحق حالات کے باوجود ادب تخلیق ہو رہا ہے کتاب سامنے آ رہی ہے۔ ہاں اِک گھٹن زدہ اور انتشار کے شکار معاشرے کے ادیب کو دھند کے اِس بار نئے افق تلاش کرنا ہیں کیا وہ ایسا کر پائے گا یہ سوال باقی رہے گا؟

کتاب کی قدر شناسی زندہ قوموں کی علامت ہے

میرزا ادیب

اب تو وقت کے چہرے پر گرد و غبار کی ایک بڑی تہ جم چکی ہے۔ ہاں جب کبھی ماضی کی کھڑکی سے تیز ہوا کا کوئی جھونکا آتا ہے تو کچھ دیر کے لیے گرد و غبار ہٹ جاتا ہے اور یادوں کے وہ خدوخال روشن ہو جاتے ہیں جنھیں بھلا کر بھی بھلایا نہیں جا سکتا۔ ان یادوں میں ایک یہ بھی ہے۔ میں ساتویں جماعت کا طالب علم تھا۔ ایک دن ہمارے فارسی کے استاد نے سعدی کی کسی حکایت کا مطلب سمجھاتے ہوئے جب یہ شعر پڑھا

پئے علم چوں شمع باید گداخت
کہ بے علم نتواں خدا را شناخت

تو انھوں نے ایک دو منٹ کے لیے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور جس وقت انھیں دوبارہ کھولا تو ان کی پلکوں پر وہ چیز چمک رہی تھی جسے اصغر گونڈوی نے ''ستارۂ سحری'' کہا ہے۔ میں کلاس میں ''پڑھاکو'' مشہور تھا۔ مجھ سے مخاطب ہو کر بولے۔ ''بیٹا! کتاب کی سچی قدر کیا کرو۔'' اس نصیحت کا مجھ پر ایسا اثر ہوا کہ میں نے کتاب کی سچی قدر کرنے کی بجائے خود کتابیں لکھنا شروع کر دیں اور دوسروں سے یہ توقع رکھی کہ وہ ان کی قدر کریں گے۔ مسلمان نے کتاب کی ہمیشہ سچی قدر کی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نے گرہ میں یہ حکم پیغمبر ﷺ باندھ لیا تھا۔

کہ حکمت کو اک گم شدہ لال سمجھو
جہاں پاؤ اپنا اسے مال سمجھو

مسلمان نے حکمت کو واقعی اپنا مال سمجھا تھا مگر اس کے لیے لوٹ کھسوٹ نہیں کی تھی۔ دنیاوی مال و منال کے لیے تو جنگیں لڑی جاتی ہیں حملے کیے جاتے ہیں دوسروں کو مارا اور گرایا جاتا ہے لیکن حکمت کے لیے تو دل کی لگن روح کا خلوص اور جذبہ ایثار و قربانی چاہیے۔ یہاں تو ایک ذرہ حکمت کے سامنے تاج و تخت کی بھی کوئی قیمت نہیں ہے اور مسلمان جب تک حکمت کا والہ و شیدا رہا ہے حصول حکومت کے لیے اس نے کسی بھی قربانی سے دریغ نہیں کی۔ اس حقیقت کی تائید اسلامی تاریخ ہی نہیں دنیا کی ہر تاریخ کرتی ہے۔ میں نے ابھی ابھی جس شاعر کا ایک شعر پڑھا ہے اس

نے مسلمانوں کے زمانہ عروج کی روداد سناتے ہوئے یہ بھی کہا ہے

یہ تھا علم پرواں توجہ کا عالم
کہ ہو جیسے مجروح جو پائے مرہم
کسی طرح پیاس ان کی ہوتی نہ تھی کم
بجھاتا تھا آگ ان کی باراں نہ شبنم
حریم خلافت میں اونٹوں پہ لاد کر
چلے آتے تھے مصرو یونان کے دفتر

مصرو یونان کے دفتر اونٹوں پہ لاد کر ہسپانیہ میں چلے آتے تھے۔ آٹھ سو سال تک اونٹ آتے رہے، ہسپانیہ کے بڑے بڑے شہروں میں عظیم الشان کتب خانے قائم ہو گئے۔ ان کتب خانوں میں مسلسل اضافہ ہوتا رہتا تھا۔ ان کے دروازے رات دن کھلے رہتے تھے معمولی طالب علم ان کتب خانوں میں جاتے تھے اور چند سال بعد ان کتب خانوں کے درودیوار کو انتہائی احترام و عقیدت کے ساتھ الوداع کہتے تھے تو جہاں سے بھی گزرتے تھے بڑے بڑے حکمران اپنی آنکھیں ان کے لیے فرش راہ کر دیتے تھے۔

مگر وقت کے سمندر میں مدو جزر تو آتے ہی رہتے ہیں مد کے بعد جب جزر آیا تو وہ ساحل تہی دست ہو گیا جہاں صدیوں شوق زاراں کی لہریں علم کے تابناک موتی بکھیرا کرتی تھیں۔ لہریں اب بھی حرکت کرتی تھیں۔ لیکن اب انھوں نے یہ موتی ساحل سے سمیٹ سمیٹ کر ان علاقوں میں پہنچانا شروع کر دیا تھا جہاں اس سے پہلے جہالت کی تاریکیاں محیط تھیں۔ میں یہ سطریں لکھ رہا ہوں اور مجھے اسلامی تاریخ کا ایک واقعہ یاد آ گیا ہے۔ میں نے علم کی گہرفشانیوں کے جس زمانے کا ذکر کیا ہے اس وقت کتاب کو ایک متاع بے بہا سمجھا جاتا تھا۔ کاتب جب کوئی نادر روزگار کتاب نقل کر کے بازار میں لے آتے تھے تو اپنی توقع سے زیادہ قیمت پاتے تھے کوئی کاتب ایک ایسی ہی کتاب لکھ کر اس جگہ پہنچ گیا جہاں کتابوں کے پیاسے نئی نئی کتابوں کی تلاش میں جایا کرتے تھے۔ اس وقت وہاں ایک پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس کوئی درویش بھی کھڑا تھا۔ وہ اس کتاب کو ہر قیمت پر حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اپنی ساری زندگی میں اس نے پیٹ کاٹ کر جو کچھ جمع کیا تھا وہ ایک رومال میں باندھ کر لے آیا تھا۔ اسے توقع تھی کہ وہ اپنے مطلوبہ کتاب خرید لے گا۔ دنیا کے بازار میں یہ خرید و فروخت بھی ایک عجیب شے ہے جس کے پاس جو کچھ ہوتا ہے، پلے میں باندھ کر لے آتا ہے۔ آپ مصر کی اس بوڑھی عورت کو کیا کہیں گے جو یوسفؑ کو خریدنے کے لیے ہاتھ میں ایک اٹی لے آئی تھی۔ کتنی مضحکہ خیز تھی اس کی حرکت۔ مگر ذرا سوچیے یہی اٹی تو اس کی ساری زندگی

کا اثاثہ تھی۔ گویا وہ اپنی ساری زندگی کا اثاثہ لے کر ماہ کنعان کی روشنی سے اپنے دل کی تاریکی دور کرنا چاہتی تھی اور وہ درویش بھی اپنا سارا جمع جھتا لے آیا تھا۔ کتاب نیلام ہونے لگی۔ درویش کے سامنے ایک دولت مند شخص بھی بولی دے رہا تھا۔ درویش ؟؟ تک اس کا مقابلہ کر سکتا تھا۔ مرزا غالب نے شاید ایسے ہی موقع پر کہا ہے۔

ہم سے چھوٹا قمار خانہ عشق

واں جو جاویں گرہ میں مال کہاں

درویش کی گرہ کا مال شکست کھا گیا۔ بوڑھے بے سہارا ہاتھ لرز کر رہ گئے۔ سونے کے ہاتھ سونے سے بہت زیادہ قیمتی کتاب لے گئے۔ درویش کو شکست آرزو کا بہت غم تھا وہ اپنے حجرے میں بیٹھا اپنی تہ دستی پر خاموش ماتم کر رہا تھا۔ آدھی رات بیت چکی تھی۔ اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی درویش نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ سامنے وہی دولت مند کھڑا تھا اور اس کے ہاتھ میں وہی کتاب نظر آ رہی تھی جسے وہ خرید کر لے گیا تھا۔ اس سے پہلے کہ درویش اس سے کچھ کہے...... وہ بولا ''اس کتاب کے صحیح حق دار تم ہو۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ میں نے یہ کتاب اپنے ہاں لے جا کر تم پر زیادتی کی ہے...... تمھارا شوق میری ساری دولت سے زیادہ قیمتی ہے۔ اسے میری طرف سے قبول کرو۔''

آپ اسے جذبہ ایثار کی مثال سے تعبیر کر سکتے ہیں اور یقیناً ایسا سمجھنا غلط نہیں ہے مگر سمجھتا ہوں کہ اسے کتاب کی صحیح قدر شناسی کہیں تو زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے اور یہ اس اعتبار سے کہ یہاں کتاب کی قدر و قیمت کو دولت کے پیمانے سے نہیں، ذوق وشوق کے معیار پر جانچا گیا ہے۔

کتاب کی قدر شناسی زندہ قوم کی علامت ہے۔ تیزی سے آگے بڑھتے ہوئے لوگ اس کی روشنی اپنے دلوں کے اندر پاتے ہیں اور جب آگے بڑھتے ہوئے قدم رک جائیں تو اس کی حیثیت چراغ راہ سے زیادہ نہیں ہوتی۔ قوموں کے عروج وزوال کا کتاب سے بڑا گہرا تعلق ہے۔ جب کوئی قوم کتاب کو اٹھا کر اپنے سینے سے لگا لیتی ہے تو اسے پر پرواز مل جاتے ہیں اور وہ اپنی پرواز میں ستاروں سے بھی آگے نکل جاتی ہے اور جب اس کے ہاتھ کتاب اٹھانے کے تحمل نہیں رہتے تو وہ زمین کی پستیوں میں بھٹکنے لگتی ہے کیوں کہ پرواز تو کتاب نے ہی اسے دیے تھے۔

کتاب کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ خالق نے اپنی مخلوق کو جو سب سے بڑی نعمت دی ہے وہ کتاب ہی کی صورت میں دی ہے، کتاب ہی سے مخلوق نے اپنے خالق کو پہچانا ہے اور اپنے آپ کو پہچانا ہے۔ خالق اور مخلوق کے درمیان رابطہ کتب ہی نے قائم کیا ہے۔

کتب ہی نے بتایا ہے کہ کروگار حقیقی اپنی مخلوق سے کیا چاہتا ہے اور کتاب ہی نے انسان کو سکھایا ہے کہ وہ خدا کے احکام پر کس طرح عمل پیرا ہو سکتا ہے۔

انقلاب فرانس کے زندہ جاوید انگریز مصنف کارلائل نیجا کہا ہے:

''اس دنیا میں جتنی پر عظمت چزیں بنائی گئی ہیں یا بنائی جا سکتی ہیں ان میں سب سے زیادہ عجیب وغریب، پر عظمت اور حیرت انگیز شے کتاب ہے۔''

انسان کتاب لکھتا ہے اور کتاب انسان کا مقدر تحریر کرتی ہے۔ زندہ قوم کی لائبریری زندہ اور متحرک ہوتی ہے جس سے ہر لمحہ زندگی کی برکتوں کی شعاعیں پھوٹتی رہتی ہیں اور جب قوم مردہ ہو جاتی ہے تو یہ لائبریری بھی مردہ خانے میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

کتاب ہر اس شخص اور ہر اس قوم کے لیے ہے جو اس کی طرف محبت کا ہاتھ بڑھاتی ہے۔ جب یورپ گھٹا ٹوپ اندھیروں میں ڈوبا ہوا تھا تو مشرق کی فضاؤں میں علم وحکمت کی تجلیاں ہر جہت بکھرتی چلی گئی تھیں اور جب تجلیوں کے اس کارواں نے مشرق کی فضاؤں سے نکل کر مغرب کا رخ کیا تو ہمارا شاعر دردوغم کے عالم میں پکارا اٹھا۔

مگر وہ علم کے موتی کتابیں اپنے آباء کی
جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سی پارہ

کیا یہ ممکن ہے کہ اس کتاب میلہ میں ہمارا دل سی پارہ اس بات کا عہد کر لے کہ یہ اپنے آبائی ورثے کو ایک بار پھر اپنا مال سمجھے گا اور کتاب کو وہی کچھ سمجھے گا جو اسے سمجھنا چاہیے۔

کتب کی تعریف متعین کرنا ایک کٹھن مرحلہ ہے!

سید قاسم محمود

یونیسکو کے زیرِ اہتمام دنیا بھر میں جو عالمی سال کتاب منایا گیا ہے اس کا ہمیں اور کوئی فائدہ پہنچا ہو یا نہ پہنچا ہو، یہ فائدہ ضرور ہوا کہ اردو میں پہلی مرتبہ اس پر غور ہو رہا ہے کہ خود کتاب کیا ہے۔ کتاب کی تعریف میں اس سے پہلے بہت کچھ لکھا گیا ہے اور اردو کے تقریباً ہر ادیب اور مصنف نے کتاب کی تعریف و توصیف میں ضرور کچھ نہ کچھ لکھا ہے۔ لیکن یہ تمام تحریریں مل کر بھی کتاب کی تعریف متعین نہ کر سکیں کیوں کہ ان کا مقصد کتاب کی تعریف کرنا تھا۔ کتاب کی تعریف مقرر کرنا نہیں۔

یہ لفظ تعریف منطق کی اصطلاح کے طور پر استعمال ہو رہا ہے۔ منطق میں تعریف ایک قطعی اور صاف صاف بیان یا خفیہ ہے جس کے دو اجزائے ترکیبی ہوتے ہیں۔ ایک تو وہ چیز یا موضوع جس کی تعریف کرنا مقصود ہے اور دوسرے اس چیز یا موضوع کی خصوصیات۔ ایسی خصوصیات جن کی بنا پر وہ چیز دوسری چیزوں سے منفرد اور جداگانہ ہے یعنی وہی ذات اور صفات کا معاملہ ہے۔ یہاں سٹوارٹ مل کے لفظوں میں تعریف کا مطلب ہے جو کھینچنا کسی چیز کی وضاحت و صراحت میں ایسا قطعی جملہ کہ وہ چیز جن جن امور و صفات میں دوسری چیزوں سے الگ ہے وہ صاف صاف نظر آنے لگیں جیسے کھیتوں کی حد بندی ہے کہ یہاں سے وہاں تک کا مالک (ا) ہے اور یہاں سے وہاں تک کا مالک (ب) ہے۔

علوم و فنون میں آج سے نہیں ارسطو کے زمانے سے اشیاء موضوعات اور اصطلاحات کی تعریف مقرر کرنے کا دستور چلا آتا ہے۔ تعریف بندی کے فوائد کیا ہیں یہ آج کے موضوع سے خارج ہے۔ البتہ کسی تعریف کے اچھا اور عالمگیر ہونے کی جو بنیادی شرائط ہیں اور جن پر تقریباً تمام مغربی اور مشرقی فلسفیوں کا اتفاق ہے ان کا اشارہ بے محل نہ ہوگا۔ کسی بھی چیز کی تعریف اچھی اور عالمگیر کہلائے گی بشرطیکہ

(ا) تعریف بالکل متوازن ہو نہ اتنی تنگ ہو کہ اجزاء تو فرداً فرداً بیان ہو جائیں اور کل دکھائی دے اور اجزاء محو ہو جائیں۔

(۲) تعریف مقرر کرنے والے خیالات پیچیدہ نہ ہوں بلکہ جس چیز کی تعریف مقرر کی گئی ہو اس سے بھی زیادہ صاف اور واضح ہوں۔

(۳) تعریف مقرر کرنے والے الفاظ کم سے کم ہوں۔ استعارے اور تشبیہہ سے پرہیز لازم ہے، کیوں کہ وہ ابہام کی طرف لے جا سکتے ہیں۔

کسی چیز یا اصطلاح کی تعرف کرنا ایک قدرتی، علمی ضرورت ہے اور جوں جوں علم بڑھتا رہتا ہے تعریف حسب اقتضا بدلتی رہتی ہے۔ معاشیات کی تعریف پسوں کچھ اور تھی، کل کچھ اور، آج کچھ اور گویا اصل مقصد تعریف مقرر کرنا نہیں۔ علم کی ترویج ہے یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ تعریف مقرر کرنے کا عمل محض ایک ذہنی ورزش یا خوش حال دماغوں کا تفریحی مشغلہ ہے تعریف مقرر کرنے سے اصطلاحیں ایک دوسرے کے قریب آ کر آپس میں باتیں کرتی ہیں۔ ایک دوسرے کی مدد سے اپنے اپنے گنجلک اور مبہم مفاہیم سے دامن چھڑاتی ہیں واضح اور صاف بن کر مجموعی علم کی تفہیم و ترویج میں مددگار بنتی ہیں۔

اگر ہمارے ہاں کتاب سازی کے علم کو ترقی کرنا ہے تو اب وقت آ گیا ہے کہ اس کی اصطلاحیں مدون ہوں اور ہر ایک کی الگ الگ تعریف متعین ہو، لیکن ہمارے ہاں علم کی ترقی کے لیے ماحول ساز گار نظر نہیں آتا کیوں کہ جب یہ سوال کیا جاتا ہے کہ کتاب کیا ہے تو سننے والا استہزائیہ انداز میں ہنس کر کہتا ہے۔ کیا عجیب سوال ہے۔ کیا ہم پانچویں جماعت کے طالب علم ہیں کہ بتاتے پھریں کہ کتاب کیا ہے۔'' ہم سب جانتے ہیں کہ کتاب کیا ہے عام طور پر اس عنوان کے تحت جو مقالے اور مضامین نظر آئیں گے وہ کتاب کی تعریف و توصیف میں اپنے آپنے ذاتی جذبات و تاثرات کا اظہار ہوتا ہے جب کہ کسی چیز کی معینہ تعریف کا غیر شخصی و غیر جذباتی ہونا ضروری ہے۔ مثلاً کہا جائے کہ کتاب ازل ہے، کتاب ابد ہے، کتاب اوّل ہے کتاب آخر ہے۔ دل کا نور ہے۔ دماغ کی ٹھنڈک ہے تہذیب کا خزانہ ہے۔ ثقافت کا منبع ہے، تاریخ کا سرچشمہ ہے۔ جغرافیے کا مخزن ہے، ماضی کی میراث ہے۔ مستقبل کی امین ہے۔ کتاب ہمارا بہترین رفیق ہے اور تھوڑا سا مزید جذباتی ہوں گے تو تعریفی جملوں کی ساخت اس طرح کی ہو جائے گی۔ مسلمان اہل کتاب ہیں، مسلمانوں نے کتاب سازی میں کارہائے نمایاں سرانجام دیے ہیں، مسلمانوں نہ ہوتے تو کتاب نہ ہوتی۔ کتاب تو بس مسلمانوں پر ہی نازل ہوئی ہے۔ وغیرہ وغیرہ

اگلے پچھلے یہ تمام لمبے لمبے مقالات مل کر بھی کتب کی جامع و مانع تعریف مقرر نہ کر سکیں گے کیوں کہ ان میں لکھنے والوں نے کتاب کے بارے میں اپنے اپنے ذاتی و جذباتی خیالات اور تاثرات کا اظہار کیا ہے، تمام صفات کا مجموعہ ذات نہیں کہلا سکتا۔ صفات کی ترکیب باہمی کا نام اللہ

نہیں ہے اللہ کی ذات ان صفات کے ماورا کچھ اور ہے کتاب کے جو فوائد اور صفات بیان کیے جاتے ہیں وہ سب مل کر بھی کتاب کو کتب نہیں بناتے کتاب ان صفات سے ماورا کچھ اور ہے۔ وہ کیا ہے؟ یہ ایک بڑا پیچیدہ سوال ہے۔ جس کا جواب اتنا نازک اور باریک ہے جسے میں محسوس تو کر سکتا ہوں مگر بیان نہیں کر سکتا۔ کتاب کا کچھ حصہ عالم الغیب سے تعلق رکھتا ہے۔

اپنی ناکامی کا اتنا واضح اعتراف کرنے کے بعد مجھے اصولاً سٹیج سے اتر جانا چاہیے لیکن مزید پانچ ساڑھے پانچ منٹ اور بولتے رہنے کا جواز یہ ہے کہ ''زندگی'' کی طرح آج تک کتاب کی تعریف بھی مقرر نہ ہو سکی۔ اردو تو کیا دوسری ترقی یافتہ زبانوں میں بھی بڑے بڑے علما و فضلا اس کی جامع اور عالمگیر تعریف متعین کرنے سے اب تک قاصر رہے دنیا کے تمام ملکوں اور تمام زبانوں کے بڑے بڑے ماہرین کا اجماع جسے عرف عام میں یونیسکو کہتے ہی؛ وہ کتاب کی صرف ایک نمایاں خصوصیت یعنی ضخامت ہی کو مد نظر رکھ کر کتاب کی تعریف متعین کر سکا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ یونیسکو جمہوریت پر یقین رکھتا ہے اس لیے وہ گنتی کرتا ہے، تولتا نہیں چنانچہ یونیسکو نے اپنے عمل مقاصد کی حد تک یہ تعریف متعین کر دی ''انچاس یا انچاس سے زیادہ اوراق کا سلا ہوا مجموعہ!

اس تعریف میں کتاب کی صرف جسم کو دیکھا گیا ہے اور روح کو شاید اس مذاکرے کے لیے چھوڑ دیا گیا ہے اور میرا قیاس یہ ہے کہ اس مذاکرے میں روح یا متن یا مافیہ پر اس قدر توجہ دی جائے گی کہ جسم کو نظر انداز کر دیا جائے گا جب کہ اچھی تعریف کی پہلی شرط یہ ٹھہری ہے کہ وہ بالکل متوازن ہو اور ایک جزو کو دوسرے جزو پر یا کل پر قربان نہ ہونے دیا جائے۔

کتاب کی متوازن تعریف کا تعین ایک اچھا خاصا امتحان ہے اور ہمارے اساتذہ نے ہمیں یہ سکھایا ہے کہ امتحان دیتے وقت پہلے آسان سوال حل کرو اور پھر مشکل کیوں کہ وقت تھوڑا اور مقرر ہوتا ہے یا یوں سمجھ لیجیے کہ چھوٹا راستہ دشوار گزار اور کانٹوں بھرا ہو تو دوسری طرف سے لمبا چکر کاٹ کر منزل تک پہنچا جا سکتا ہے کتاب کی تعریف تک ہم سیدھا نہیں پہنچ سکتے تو آیئے دوسری طرف سے چلتے ہیں مثلاً یہ طے شدا بات ہے کہ کتاب اینٹ نہیں ہے کتاب مالٹا نہیں ہے کتاب ہاتھی نہیں ہے منفیات کی اس راہ پر چلتے چلتے بالآخر کیمرے کی آنکھ کتاب مرتکز ہو جاتی ہے اب کتاب آپ کے سامنے ہے اسے اٹھا لیجیے آپ کے ہاتھ میں جو کچھ آیا ہے اور جس کا وزن محسوس کر رہے ہیں وہ تراشیدہ اور مضبوط کاغذ ہیں۔ کاغذ کتاب نہیں ہے۔ کتاب کہیں اور ہے اور یہی انہی اوراق میں چھپی بیٹھی ہے پ کا دھیان خیالات یا جذبات کی طرف جائے گا جو ان اوراق میں مذکور ہوتے ہیں یہ خیالات یا جذبات بذاتہٖ کتاب نہیں کہلا سکتے ہیں جب تک آپ لکھے ہوئے یا چھپے ہوئے الفاظ کو بھی ملحوظ نہ رکھیں۔ اینٹ، مالٹے، ہاتھی اور دوسری چیزوں کی طرح آپ کتاب کو بھی

استعمال میں لاتے ہیں دوسری چیزوں کی طرح کتاب کی بھی خرید وفروخت ہوتی ہے۔ رسد اور طلب کے مسائل یہاں بھی پیدا ہوتے ہیں اس کے باوجود کتاب کسی ایسی پراسرار صفت سے متصف ہے کہ اس کے ساتھ وہ سلوک روا نہیں رکھا جاتا جو دوسری چیزوں کے ساتھ روا رکھا جاتا ہے، بے شک کتاب دوسری چیزوں کی طرح استعمال میں آنے سے معدوم و نابود ہو جاتی ہے لیکن نیست و نابود نہیں ہوتی اگر اوراق نذر آتش یا دریا برد ہو جائیں تو اس کے اندر کے خیالات پھر بھی کسی نہ کسی طرح سینہ بہ سینہ ہی سہی باقی رہ جاتے ہیں۔ پس کتاب کی تعریف کے بارے میں ہم ایک نتیجہ تو یہ نکال سکتے ہیں کہ کتاب مادی چیز میں لپٹی ہوئی، بندھی ہوئی اور سلی ہوئی ہونے کے باوجود ایک زندہ شے ہے اس میں روح ہے اور جن چیزوں میں زندگی اور روح ہے بالکل انہی کی طرح مرتی نہیں، قائم و دائم رہتی ہے۔ اس کا کچھ نصب العین ہوتا ہے کچھ مقاصد ہوتے ہیں بے مقصد اپوچ، بدنیت، اخلاق سوز مسودہ شائع ہو کر بھی کتاب کے زمرے میں شامل نہیں ہو سکتا۔

مادی، جسمانی سطح پر کتاب بعض فنی طریقوں اور تکنیکوں کی پیداوار ہوتی ہے جس طرح دوسری مصنوعات لیکن دوسری مصنوعات اور کتاب میں ایک بنیادی فرق ہے وہ مقاصد وہ ٹیکنیکس اور وہ استعمالات جو مل جل کر کتاب کی تعریف مقرر کرنے میں مدد دیتے ہیں رفتار زمانہ کے ساتھ ساتھ اپنے اپنے دائروں میں بدلتے رہتے ہیں۔ حتیٰ کہ بسا اوقات اپنا مفہوم بھی بدل لیتے ہیں اور یوں الگ الگ بدلے ہوئے مفاہیم ایک دوسرے سے مربوط ہو کر خود کتاب کا مفہوم بدل دیتے ہیں اور فرد و جماعت کی زندگی میں کتاب کی عملی افادیت پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

تاریخ کے مختلف ادوار میں کتاب اپنے طریق استعمال کے مطابق اپنے مقصد اور اثر پذیری میں بھی تبدیلی پیدا کرتی رہی، کبھی پیپرس، تو کبھی شہتوت کی لکڑی، کبھی مٹی کی تختیاں تو کبھی چرمی کاغذ کبھی مخطوطہ تو کبھی مطبوعہ نسخہ، کبھی لیتو، کبھی آفسٹ، ضرورت ایجاد کی ماں ہے علم کی پے در پے ترقی کتاب کی پیدائش کے طریقے متعین کرتی رہی۔ استعمال بدلتے رہے اغراض و مقاصد بدلتے رہے اور یوں کتاب کی تعریف تبدیل ہوتی رہی اور پھر رفتہ رفتہ یوں ہوا کہ جس طرح تحریر نے لفظ کو اس قابل بنایا کہ وہ انسان کی تسخیر کرے کتاب نے لفظ کو یہ سبق سکھایا کہ وہ مکان پر بھی تسلط کر لے پرانے زمانے کا شاعر جو اپنے سامنے بیٹھے ہوئے سامعین کے حلقے سے باہر نہیں جا سکتا تھا اب کتاب کی معرفت پوری انسانیت کو مخاطب کر سکتا ہے پرانے زمانے میں صرف وہی چیز کتاب کہلاتی تھی جس پر شاہان وقت، رؤسا اور شرفاء تفریح طبع کے لیے طلاکاری کرتے تھے یا کراتے تھے لیکن اب طباعت کے فنی طریق و تکنیک کے باعث کتاب کے مفہوم و منشا میں تبدیلی پیدا کرتی رہی اور استعمال و افادیت کے دائرے کو وسیع سے وسیع تر کرتی رہی۔

گویا کتاب کی تعریف کا دوسرا جزو اعظم اس کا مادی یا جسمانی یا ظاہری ہوتا ہے اور یہ عجیب اتفاق کی بات ہے کہ کتاب کے مترادف جتنے بھی الفاظ دوسری زبانوں میں ملتے ہیں ان کا لغوی مفہوم کسی نہ کسی مادے سے وابستہ ہے یونانی لفظ Biblos کا مطلب ہے، سرکنڈے کا اندرونی چھلکا، لاطینی Liber کا مطلب ہے درختوں کی بیرونی چھال کے اندر کی ریشہ دار تہہ، انگریزی لفظ Book اور جرمن لفظ Puck فرانسیسی لفظ Bois سے ماخوذ ہیں جس کے لغوی معنی درخت جھال، ریشہ روسی لفظ Kniga چینی لفظ King سے مشتق ہے جس کا لغوی مفہوم ہے ریشم۔

مختلف زبانوں میں لفظ ''کتاب'' کا کسی ایسے مادے سے منسوب ہونا جس پر وہ ابتدا میں لکھی جاتی تھیں اس امر کا شاہد ہے کہ کتاب کی تعریف مقرر کرتے وقت اس کی مادی ہیئت کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ ریشہ ہو یا ریشم، درخت کی چھال ہو یا پکائی ہوئی مٹی پیپرس ہو یا پیپر کتاب کی خواہ کوئی تعریف بھی مقرر کی جائے اس کے مادی وسیلے کی شمولیت ضروری ہے جس کے ذریعے کتاب خود کو ظاہر کرتی ہے چنانچہ آکسفورڈ ڈکشنری اپنی تعریف کی اساس اسی پہلو کو قرار دیتی ہے۔

''کتاب کیا ہے؟ حرکت پذیر لکھا ہوا یا چھپا ہوا نسخہ جو پشتے پر سے بندھے ہوئے یا سلے ہوئے چند اوراق پر مشتمل ہوتا ہے۔''

میری رائے میں یہ تعریف یک طرفہ ہے کیوں کہ جسم یا ظاہر پر زور دیتی ہے اور روح یا متن یا باطن کو نظر انداز کرتی ہے۔

عربی و فارسی اور اردو لغتوں نے تو کمال کر رکھا ہے کہ لفظ کتاب کو اس قابل ہی نہیں سمجھا کہ لغوی مفہوم بیان کیا جاتا۔ انسائیکلوپیڈیا کی طرح محض مترادفات کی صورت میں تشریح مزید کر دی ہے جامع اللغات سے لے کر نسیم اللغات تک سب ہی کتاب کا مفہوم یہ بتاتے ہیں۔ نوشتہ نامہ، پوتھی، پستک، رجسٹر، بیاض، بہی، گرنتھ، رسالہ، فیروز للغات نے کتاب کا مفہوم یہ بھی بتایا ہے کہ لونڈی یا غلام کو روپیہ لے کر آزاد کر دینا۔ میں اپنے مقصد کی حد تک اس مفہوم کو کتاب کی تعریف میں شامل کر لیتا اگر لونڈی یا غلام کو بلا معاوضہ آزاد کر دینا مقصود ہوتا۔ ہاں ایک فارسی لغت نے کتاب کے مفہوم کو لکھا ہے اندازہ، مفروضہ، قیاس۔ ان الفاظ سے ذہن معاً تعینات اور اصولوں کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ معانی، خیالات، افکار، جذبات، معلومات، تاریخ وسوانح ناول افسانے شاعری انسان کی تمنائیں اور آرزوئیں عزائم اور مقاصد، دریافت اور تجسس، مہم جوئی اور جدوجہد زندگی اور کائنات یعنی کتاب کی روح یا متن۔

کتاب کی کوئی تعریف مکمل اور جامع و مانع نہیں کہلا سکتی جب تک اس کے ظاہری

ہیئت، ضخامت اور قد و قامت کے ساتھ اس کی روح یا متن کو شامل نہ کیا جائے۔ تعداد اور کمیت کے پہلو بہ پہلو معیار اور کیفیت کا ہونا ضروری ہے۔ کتاب کے مقاصد، نصب العین، مفہوم و منشا، لفظ نظر طرز پیدائش اور طریق استعمال ان تمام صفات و خصوصیات کو ملحوظ رکھتے ہوئے میرے نزدیک کتاب کی یہ تعریف مقرر ہو جانی چاہیے۔

''اونچاس یا اونچاس سے زیادہ اوراق پر مشتمل لکھا ہوا یا چھپا ہوا بندھا ہوا یا سلا ہوا ایسا زندہ نسخہ جس میں کوئی شبہ نہ ہو اور جوان لوگوں کی راہنمائی کرتا ہو جو رہنمائی حاصل کرنا چاہیں اور جو غیب کی چیزوں پر ایمان رکھتے ہوں اور تمام اگلی پچھلی کتابوں پر بھی یقین رکھتے ہوں۔''

یہ تعریف ہر لحاظ سے متوازن ہے اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ اسے میں نے مقرر کیا ہے کہ اسے خالق اعظم نے مقرر کیا ہے میں نے انسان کے جدید تقاضوں کے مطابق اور یونیسکو کی شرائط پوری کرنے کے لیے ضخامت پر قید لگا دی ہے یہ تعریف نہ تو اتنی محدود ہے کہ صرف پاکستان میں آباد مسلمانوں کے لیے وقف ہو کر رہ جائے اور نہ اتنی وسیع ہے کہ اینٹ، مالٹا، ہاتھی سبھی اس میں شامل ہو جائیں۔

یہ تعریف اپنے خیالات کے اعتبار سے بھی سلجھی ہوئی ہے کوئی ایچ پیچ نہیں ہے جس چیز کی تعریف مقرر کی جارہی ہے اس سے بھی زیادہ صاف اور واضح ہے۔

یہ تعریف مقرر کرتے وقت استعاروں اور تشبیہوں سے پرہیز کیا گیا ہے، الفاظ کم سے کم استعمال کیے گئے ہیں۔ فقط دو لفظ کرانے سے تعریف کے مجروح ہو جانے کا احتمال ہے۔

کتابیں باتیں کرتی ہیں

فاروق قیصر

ہمارے ہاں فلم اور ٹیلی ویژن نے دیکھتے ہی دیکھتے ہماری تاریخ، ادب اور ثقافت کو یوں تبدیل کر دیا ہے جیسے سیاستدان راتوں رات اپنی وفاداریاں تبدیل کر دیتے ہیں۔ ہماری نئی نسل کو مسلمان بزرگوں کے بارے میں اتنا نہیں پتہ جتنا وہ مائیکل جیکسن، میڈونا، ایشوریا رائے یا شاہ رخ اور امیتابھ کے بارے میں جانتے ہیں۔ ایک طالب علم کسی سے کہہ رہا تھا کہ اگر دلیپ کمار یا مدھوبالا نہ ہوتی تو مغل شہنشاہ اکبر کو کون جانتا؟ استاد نے شاگرد سے پوچھا کہ نصیرالدین کہاں کا بادشاہ تھا؟ تو شاگرد نے فوراً جواب دیا، ہندوستانی آرٹ موویز کا۔ اسی طرح امتحان میں ایک سوال پوچھا گیا کہ بابر نے کس سے شکست کھائی تھی؟ تو جواب ملا، ''ریما سے''۔ مغل بادشاہ جہانگیر کے بارے میں پوچھا گیا کہ وہ کس وجہ سے مشہور ہوا تو جواب ملا، اسکوائش کے کھیل سے۔ پوچھا جہانگیر کی بیگم کا نام کیا تھا تو جواب ملا۔ ملکۂ ترنم نور جہاں۔ لاہور کا مطالعاتی دورہ کرتے ہوئے استاد نے بتایا کہ یہ ہے وہ قلعہ جسے شاہجہان نے تعمیر کرایا۔ جانتے ہو شاہجہان کون تھا؟ جواب ملا کوئی ٹھیکیدار ہی ہوگا۔ استاد نے بتایا، یہ جی ٹی روڈ کہلاتی ہے۔ اس سڑک کو شیر شاہ سوری نے تعمیر کیا۔ ایک طالب علم بولا، اس میں کون سی ایسی خاص بات ہے؟ شیر شاہ نے تو اسے ایک بار بنایا ہوگا، ہماری حکومتیں تو اسے آج تک بناتی چلی آ رہی ہیں۔

وقت کے ساتھ ساتھ ہمارے اداروں اور شخصیات کے ناموں کے معنی بھی تبدیل ہوتے جا رہے ہیں۔ مثلاً اب اگر کسی کو جھوٹا کہنا ہو تو اسے نیوز کاسٹر کہا جاتا ہے۔ ایم این اے کا مطلب اب ممبر نیشنل اسمبلی نہیں بلکہ منسٹری ناٹ اویل ایبل بنتا ہے۔ کسی سے پوچھا کہ شریف کسے کہتے ہیں؟ تو جواب ملا۔ شریف وہ ہوتا ہے جسے جلاوطن کیا جاتا ہے۔ پوچھا کہ پاورفل کسے کہتے ہیں تو جواب ملا۔ ایک ایسا پاورفل انسان جو بغیر میٹر لگوائے پاور استعمال کرتا ہو اور جس کا بل ''پوورفل'' (Poorful) عوام ادا کرتے ہوں۔ پوچھا، امریکہ کس نے دریافت کیا؟ جواب ملا، غیر قانونی تارکین وطن نے پوچھا گھوڑا کیا کھاتا ہے؟ جواب ملا گھوڑا اگر غریب کا ہے تو مار کھاتا ہے اور اگر امیر کا ہے تو مربے اور جیلی کھاتا ہے۔ پوچھا دیر آید درست آید کا کیا مطلب ہے؟ تو جواب آیا۔ ''پاکستان ریلوے''۔ پوچھا ''زندہ لاکھ کا مرا سوا لاکھ کا محاورہ سن کر آپ کے دل میں کس جاندار کا

خیال آتا ہے؟ جواب ملا، لوک ورثہ کے ایگزیکٹو ڈائریکٹر عکسی مفتی کا۔ سوال پوچھا کہ ہمارے ہاں ''ریشم'' کی پیداوار کیسے بڑھائی جاسکتی ہے؟ تو جواب ملا، فلمی صنعت کو فروغ دے کر۔ پوچھا شبنم کا سوچ کر آپ کے دل میں کس کا خیال آتا ہے تو جواب ملا، روبن گوش کا۔ پوچھا فیض احمد فیض کی وجہ شہرت کیا ہے؟ تو جواب ملا نور جہاں، جس نے فیض کا گانا ''مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ'' گایا۔ پوچھا جدید ادب کسے کہتے ہیں؟ تو جواب ملا، ایسا ادب جو کسی بڑے کا نہ کیا جائے۔ پوچھا پاکستان کے دارالحکومت کا نام؟ جواب ملا واشنگٹن ڈی سی۔ پوچھا پاکستانی فلموں کا مشہور ایکٹر کون ہے؟ جواب ملا پاکستانی وزیراعظم۔

تو جناب ہمارے الفاظ کے معنی اب وہ نہیں رہے جو کتابوں میں ہوا کرتے تھے۔ اب مطلب وہ ہوتا ہے جو سامنے نظر آتا ہے۔ میڈیا نے اور خاص طور پر ٹی وی چینلز نے ہمارے اندر کا روایتی ''ادب'' ختم کر کے رکھ دیا ہے۔ کسی زمانے میں اخبار کا کالم لکھنے والے کی علمی قابلیت دیکھی جاتی تھی، اب کالم کوئی بھی لکھ سکتا ہے۔ دبئی میں ایک ان پڑھ ٹیکسی ڈرائیور سے ہم نے کہا کہ آپ کی بیوی کو تو آپ کا خط پڑھنے میں مشکل پیش آتی ہوگی۔ جواب ملا نہیں۔ ہم نے پوچھا کیا آپ کی بیوی پڑھی لکھی ہے؟ جواب ملا، نہیں۔ اسے خط پڑھوانے کے لیے کسی پڑھے لکھے کے پاس نہیں جانا پڑتا اس لیے کہ میں اب اسے خط بھجوانے وِیڈیو فلم میں پیغام ریکارڈ کر کے بھجوا دیتا ہوں۔ وہ پیغام بھی سن لیتی ہے اور میری شکل بھی دیکھ لیتی ہے۔ ہمیں خیال آیا کہ اب تو کسی کو کاپی کرنا کوئی مشکل نہیں رہا مگر ایک بات سامنے آگئی کہ وِیڈیو ٹیپ سے کاپی کرنے والے اوریجنل کام کبھی نہیں کر سکتے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اب فیض، فراز، منیر، قاسمی، ناصر، اشفاق، دلدار، امجد، طفیل، نور جہاں، مہدی، فیردہ اور زبیدہ جیسے اوریجنل لوگ پیدا نہیں ہوں گے۔ ہمارے ہاں کتاب کی مرتی ہوئی حالت کا احساس ہمارے سمیت کوئٹہ کے ہاشم ندیم کو بھی ہے جو ایک اعلیٰ عہدے پر فائز ہونے کے باوجود اپنے اندر ایک نرم و لطیف دل رکھتے ہیں۔

ہاشم ندیم کی تحریر میں ایک گداز لطافت کے ساتھ روح کو غمگین کر دینے والی ایک روانی ہے جو پڑھنے والے کو اپنی گرفت میں رکھتی ہے۔ وہ بھی میری طرح اپنے بچپن کو آتشدان پہ رکھ کر اس کے گرد یادوں کی شمع روشن رکھتے ہیں۔ ان کی تحریر میں مستنصر حسین تارڑ کی مہم جوئی، اشفاق احمد کی اداسی اور شفیق الرحمٰن جیسا میٹھا میٹھا درد چھپا ہے۔ وہ پاکستان کے مصنوعی طبقے میں رہتے ہوئے بھی اس طبقے سے خائف دکھائی دیتے ہیں۔ وہ آسمان پہ رہتے ہوئے بھی زمین کا دکھ جانتے ہیں۔ شاید اسی وجہ سے ان کی تحریر میں آسمانی اسرار کے ساتھ ساتھ زمینی حقائق ایک ساتھ نظر آتے ہیں۔ ان کی ایک کتاب بچپن کا دسمبر، پڑھ کر آپ کو اپنے اندر کی معصومیت اور شرارت مسکراتی دکھائی دے

گئی۔ ہاشم ندیم کی تحریر میں اک کسک ہے۔ جو دو نمبر معاشرے کی چبھن سے آپ کو بے چین رکھے کی۔ ہاشم ندیم میں لکھنے اور کتب بینی کا شوق شاید اس لیے باقی ہے کہ ان کے ارد گرد کوئی ٹی وی چینل کوئی انٹرنیٹ نہیں ہے۔ وہ ایک ایسے گم شدہ علاقے میں رہتے ہیں جہاں میں نے زندگی کے دس برس گزارے۔ شاید وہاں کی تنہائی نے مجھے اکیلا بنا دیا اور اس اکیلے پن نے مجھے خود سے باتیں کرنا سکھلا دیا جسے لوگ میری تحریر سمجھتے ہیں۔ جب میں اکیلا ہوتا ہوں تو ٹی وی آن کرتا ہوں اور ٹی وی کے مصنوعی پن سے گھبرا کر اسے بند کر کے کتاب اٹھا لیتا ہوں۔ کتاب پڑھتا ہوں تو اس کے رائٹر کا خیال آ جاتا ہے۔ جو خود کو منفرد اور عظیم ثابت کرنے کی تگ و دو میں دکھائی دیتا ہے۔

کتاب کی طرح ہاشم ندیم بھی اس معاشرے میں اکیلے رہ گئے ہیں۔ وہ کتابیں لکھ کر ان سے اکیلے میں باتیں کرتے ہیں اور ان سے اپنا جی بہلاتے ہیں۔ میری اس نظم کی طرح کہ

کتابیں باتیں کرتی ہیں ہمارا جی لبھانے کی
کبھی اگلے زمانے کی، کبھی پچھلے زمانے کی
کتابیں سچی ساتھی ہیں نہ ان سے ناتا تم توڑو
کہیں یہ کھو ہی نہ جاءیں انہیں تنہا نہ تم چھوڑو
کتابوں کے کئی حصے، ہیں ان میں ماضی کے قصے
حقائق کے روایت کے، ہنر مندی ، ثقافت کے
ہیں س روشن مثالیں یہ ہمیں انسان بنانے کی
کتابیں باتیں کرتی ہیں ہمیں سب کچھ بتانے کی

کتاب کیا ہے؟ اور کیا ہونی چاہیے؟

پروفیسر محمد عثمان

کتاب مرکز والوں کو نہ جانے بیٹھے بٹھائے یہ کیا شرارت سوجھی ہے کہ ان صاحبوں کے ارباب کتب کے نام ایک پرچہ امتحان جاری کر دیا ہے اور پوچھا ہے کہ اے صاحب کتاب ہونے کے دعویدارو یہ تو بتاؤ کتاب ہوتی کیا ہے کتاب کسے کہتے ہیں؟ کتاب کو ہونا کیسا چاہیے اور سچی بات تو یہ ہے کہ یہ شرارت کم از کم میرے لیے خاصی بڑی آزمائش ثابت ہوئی۔ کتاب کیا ہے بھلا یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے یہ تو بڑا پریشان کن سوال ہے اور شاید اس کی قدر ذاتی نوعیت کا کہ اسے خلاف تہذیب شمار ہونا چاہیے۔ بالکل اسی طرح جس طرح مہذب لوگوں میں کسی شخص سے اس کی تنخواہ کے بارے میں پوچھنا خلاف تہذیب سمجھا گیا ہے لیکن صاحب آج کل تو تہذیب کی قدریں بڑی تیزی سے بدل رہی ہیں جو باتیں پہلے دائرہ تہذیب سے باہر شمار ہوتی تھیں وہ آج کل عین تہذیب و شائستگی ہیں کراچی کے ایک مقبول ہفت روزہ میں ایک کالم باقاعدگی سے چھپتا ہے جس میں خواتین ''آپ بیتی'' بیان کرتی ہیں اور بقول مدیر ہفت روزہ اس میں ان حقائق زندگی کو قارئین کے سامنے لانے کی کوشش کی جاتی ہے جن کو قبل ازیں پردہ راز میں رکھا گیا۔ اس کالم میں بعض خواتین نے بے لاگ طریق سے اس جنس ستم کی کہانی بیان کی ہے جو ان پر کسی محترم استاد یا منہ بولے بھائی جان نے روا رکھا۔ یہ صورت اگے کہاں ممکن تھی اس طرح ہمارے ایک دانشور دوست کی بیوی نے ازدواجی زندگی کے اسرار و رموز اور کیف و کم پر ایک پوری کتاب لکھ دی ہے اور ان حکایت لذیذ کو رقم کیا ہے جو اس سے قبل کم از کم ہمارے یہاں بیان قلم پر کبھی نہ آئیں تھیں اس پس منظر میں دیکھیے تو کتاب مرکز والے فرشتے نظر آئیں گے انہوں نے اگر کسی ذات میں جھانکنا بھی چاہا ہے تو کتاب جیسے معصوم وسیلے سے اگرچہ شعر کی طرح کتب کا انتخاب بڑوں بڑوں کو رسوا کر سکتا ہے۔

کتاب کیا ہے، نسل انسانی کا حافظہ ہے کہ اس کے ذریعے سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ آج سے ہزاروں یا سینکڑوں سال پہلے کسی شخص یا قوم نے کس طرح سوچا اور کیا محسوس کیا تھا کتاب نہ ہو تو ہم اپنے ماضی سے لمحہ بھر میں کٹ کر رہ جائیں اور انسانی فکر کے تمام سرمائے اور ورثے سے

محروم ہو کر وہاں پہنچ جائیں جہاں انسان پتھر یا دھات کے زمانے میں تھا اس لحاظ سے دیکھیے تو کتاب نقطہ انسانی حافظہ ہی نہیں انسانی تہذیب بھی ہے انسانوں نے اپنے رہن سہن وضع قطع، تراش خراش اور رسم ورواج میں جو بھی ترقی کی ہے اس کے ابلاغ وارتقاء کا ذریعہ بھی دراصل کتاب ہی ہے اگر انسانوں کے درمیان سے کتاب ہٹالی جائے تو تہذیب کا بہتا دریا رک جائے کتاب انسان کے دل کی آواز اور دھڑکن بھی ہے صدیوں سے نسل انسانی جس سوز وگداز میں مبتلا رہی اور جن دردمندیوں سے گزری ہے اس کی داستان الم کتاب ہی کے صفحات میں محفوظ ہے کتاب انسانی ارادوں کی عظمت کی شاہد ہے اور اس کے تخیل کی بلند پروازوں کی مظہر ہے کتاب ہماری بہترین رفیق اور قابل اعتماد دوست بھی ہے اور ہماری مونس وغمخوار بھی۔ دوسروں کے غم جان کر ہم اپنے غموں پر قابو پانا سیکھتے ہیں کتاب شراب بھی ہے جو محبوب کی نگاہوں کی طرح بن جائے ایک عالم سے دوسرے عالم تک لے جاسکتی ہے اور حساب بھی ہے جو ہمارے معیاروں کو اپنے معیاروں پر جانچتی پرکھتی اور خود ہمیں اپنا محاسبہ بنانے کے قابل بناتی ہے کتاب ولولہ انگیزی کا بہترین سرچشمہ ہے انسان ہمیشہ خود بڑے انسانوں سے سبق اور ولولہ حیات حاصل کیا ہے لیکن بڑوں کی زندگی اکثر وبیشتر ہم تک کتاب کے ذریعے ہی پہنچتی ہے قائداعظم محمد علی جناح کمال اتاترک سے کبھی نہ ملے تھے لیکن انہوں نے اتاترک پر ایک کتاب ''گرے وولف'' پڑھی تھی بعد میں قائد بھی ایک قوم کے قائد اور بابا بنے۔ جس طرح کمال ترکوں کا اتا اور باپ بنا تھا کتاب کی ایک انوکھی خصوصیت یہ ہے کہ ایک طرف آپ کو آپ کے گردوپیش سے بے نیاز کرتی ہے اور دوسری طرف یہی آپ کو آپ کے ماحول سے مربوط اور پیوستہ بھی رکھتی ہے گویا کتاب ایک عارضی بے خودی کی قیمت پر مستقل ہوش کا ذریعہ ہے۔

آپ چاہیں تو کتاب کی مدح وتعریف میں دیر تک گفتگو کر سکتے ہوں مگر طول کلام کا خوف دامن گیر ہے لہذا میں اپنی اس بات کو اس نکتے پر ختم کرتا ہوں۔ انسان کی آرزوئے اظہار نے حرف لفظ کی تخلیق کی اور لفظ کتاب کی دلکش صورت میں ڈھالا اور بالآخر یہ لفظ اور یہ کتاب انسان اور انسان کے درمیان سب سے پیارا سب سے مستحکم اور سب سے مفید رشتہ بن گیا۔ لیکن کتاب کی شاید سب سے بڑی عظمت یہ ہے کہ جب خدا نے اپنے بندوں سے اور خالق نے اپنی مخلوق سے مزید رشتہ جوڑنا چاہا تو اس رشتے کی صورت بھی الکتاب ہی ٹھہرا۔

لیکن میں سوچتا ہوں کہ جب اس گفتگو کا موضوع چنا گیا تھا تو ممکن ہے اس کا انتخاب کرنے والوں کے ذہن میں یہ بات ہو کر اس پر گفتگو کرنے والے پاکستان کی موجودہ فضا میں کتاب کیا ہے؟ پر اظہار رائے کریں گے لہذا میں اس خدشے کی بنا پر چند الفاظ مزید آپ کے گوش

گزار کرنا چاہوں گا کتاب ازلی وابدی حقیقت بھی ہے اور ایک وقتی لمحاتی حقیقت بھی۔ یوں تو آپ پاکستان کی موجودہ صورت حال میں رہ کر اگر شیکسپیئر یا گوئٹے کی شاعری یا افلاطون کے فلسفے پر کتب لکھیں تو وہ بھی کتاب ہی کہلائے گی اور شاید اس کا خیر مقدم بھی کیا جائے گا لیکن بڑی کتاب وہ ہوتی ہے جس میں ابدی حقیقتوں کے ساتھ ساتھ اس دور کی حقیقتیں پوری طرح گرفت میں آ جائیں جس میں وہ کتاب لکھی گئی ہو۔ آج اگر سعدی، حافظ، رومی، غزالی، غالب اور اقبال ہمارے یہاں اور ہر کہیں زندہ ہیں تو اس لیے کہ یہ لوگ آفاقی ہونے کے باوجود اپنے اپنے دور کے بہترین نمائندہ تھے وہ اپنے عہد کی تخلیق بھی تھے اور اس کے خالق بھی۔ اس کا دل بھی اور اس کی زبان بھی۔ اس کی آہ بھی اور اس کی واہ بھی۔

آج پاکستان بھی ایک اہم دور میں مبتلا ہے ایک نازک دور سے گزر رہا ہے اس کے دشمن زیادہ اور دوست کم ہیں اس کے مسائل زیادہ ہیں اور وسائل کم ہیں۔ دوستوں کو سیدھی راہ نہیں ملتی۔ وسائل کو صحیح چینل دستیاب نہیں۔ تحریک پاکستان کے مقاصد اعلیٰ ترین انسانی مقاصد تھے اور پاکستان کا قیام برحق اور منطقی تھا مگر ان مقاصد کو زبان نہ ملی اور اس قیام کو استقلال نصیب نہ ہوا لہذا آج کے دور کی بڑی کتاب'' مطلوبہ کتاب وہ ہوگی جس میں پاکتان کے مسائل کا حل ہوگا جس میں اقبال کی بصیرت اور اقبال کی دانش کا عکس ہوگا جس میں زندہ رہنے اور مضبوط ہونے کے آداب سکھائے جائیں گے جس سے دوست اور دشمن کی پہچان ہو سکے گی جو ہمیں ہماری منزل سے آشنا کرے گی اور اس کا راستہ دکھائے گی جو سچے اسلام، سچی جمہوریت اور سچے معاشی انصاف کی علمبردار ہوگی، جو دجل اور فریب کا پردہ چاک کر سکے، جو مفاد پرستی پر کاری ضرب ہو جو مظلوم کی حمایت میں ظالم کو للکارے، جو غریبوں کو اٹھائے اور کاخ امرا کے در و دیوار ہلا دے جو ہمارے درمیان علامہ اقبال اور ظفر علی خان کی یاد تازہ کرے جوان کو آگے بڑھائے۔ الغرض ہمیں وہ کتاب چاہیے جو پاکستان کو پاکستان بننے میں مدد دے۔

ادب کی کتابیں: اب زوال کیوں؟

احمد صغیر صدیقی

یہ بات بالکل درست ہے کہ ۱۹۶۰ء تک میں وہ صورت حال نہ تھی جو اس وقت ہے۔ مجھے یاد ہے کہ میں اس زمانے میں نوجوان تھا اور جس جگہ میں رہتا تھا۔ وہاں ایک کھوکھا نما دکان سڑک کے کنارے تھی، جس میں کتابیں اور رسائل رکھے ہوئے تھے جنہیں پڑھنے پر آنہ دو آنہ روزانہ دیا جاتا تھا۔ یہ کھوکھا نما لائبریری پانچ بجے شام کو کھلتی تھی اور آٹھ بجے بند کر دی جاتی تھی۔ میں وہاں سے اکثر کتابیں پڑھنے کے لیے کرائے پر لیتا تھا۔ میں نے دیکھا تھا کہ لائبریری والے کا کاروبار خاصا اچھا چلتا تھا۔ محلے کی بہت سی عورتیں، اے آر خاتون، رضیہ بٹ وغیرہ کی کتابوں کے ساتھ عصمت چغتائی، کرشن چندر اور اسی طرح کی ادبی شخصیات کی کتابیں منگوا کر پڑھتی تھیں۔

میرے جیسے نوجوان بھی کتابیں لے جاتے تھے۔ گویا پڑھنے کا رجحان موجود تھا اور رہی ابن صفی کی بات تو اس وقت ان کا سکہ چلتا تھا۔

۱۹۶۰ء کے بعد بھی اگر کتابوں کے پڑھنے کے رجحان میں کچھ کمی آ گئی تھی تو ڈائجسٹوں نے یہ خسارہ پورا کر دیا تھا۔ اسی زمانے میں عالمی ڈائجسٹ، اردو ڈائجسٹ اور سیارہ ڈائجسٹ نے عوام میں جگہ بنائی تھی اور پھر بہت سے دوسرے ڈائجسٹوں کا اجرا ہوا تھا۔ سب رنگ ان میں سب سے آگے تھا۔ جس کی اشاعت نے اردو ڈائجسٹ کی نوے ہزار کی اشاعت کو پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ ظاہر ہے یہ رسائل پڑھے جا رہے تھے اور خریدے جا رہے تھے۔

کتابیں پڑھنے کے رجحان میں کمی، میرا خیال ہے ۱۹۸۰ء کے بعد سے ہوئی۔ اس دور میں ٹی وی اور وی سی آر وغیرہ نے عام قاری کو ادھر راغب کر دیا تھا اور بعد کی جو دہائیاں ہیں ان میں تیزی سے ہم دیکھتے ہیں کہ کتابیں عدم پذیرائی کا شکار ہوئی تھیں۔ وہ ڈائجسٹ جو ۵۰ ہزار سے زائد چھپ رہے ہیں۔

اس وقت کتابوں کا حال یہ ہے کہ لکھنے والے انہیں خود چھاپتے ہیں اور ان کی اشاعت تین سو کی تعداد میں بھی نہیں ہوتی۔ کتابیں جو خالصتاً ادبی نوعیت کی ہوتی ہیں یا تو بک شاپس والے رکھتے ہی نہیں یا رکھتے بھی ہیں تو ان کی فروخت سو پچاس سے اوپر نہیں ہوتی۔ قارئین کا حال یہ ہے

کہ ادب لکھنے والے خود ہی اسے پڑھتے بھی ہیں وہ بھی اس وقت جب کوئی کتاب انہیں تحفتاً مل جاتی ہے اور بہت سے تو انہیں بھی نہیں پڑھتے۔

میں نہیں سمجھتا کہ کتابوں کی بھاری قیمتیں اس رجحان کا موجب ہیں۔ اپنے نوجوانی کے دنوں میں میرا ایک دستور تھا کہ میں دس بیس روپے ماہانہ صرف کتابوں کی خریداری پر خرچ کرتا تھا۔ بے شک اس وقت کتابوں کی اتنی قیمتیں نہیں ہوتی تھیں مگر اس وقت ہم لوگوں کی ماہوار تنخواہ بھی دو سو تین سو روپے سے زیادہ نہیں ہوتی تھی۔ ڈپٹی کمشنر کو بھی پانچ سو ملتے تھے۔ کلرکوں کو ڈیڑھ سو روپے اور چپڑاسیوں کو چالیس پچاس روپے۔ اب اگر ایک چھوٹے ورکر کو بھی چار یا پانچ ہزار ملتے ہیں۔ اس میں سے وہ پچاس روپے تو کتابوں پر خرچ کر سکتا ہے بشرط یہ کہ اس کے اندر کتاب پڑھنے کی لگ ہو۔ یہ لگن اب نہیں رہی ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر یہ لگن کس طرح فنا کے گھاٹ اتری؟ وہ کون سے عوامل ہیں جنہوں نے آج کی عوام کو کتابوں کی سمت سے بے رغبتی پر مائل کر دیا ہے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ الیکٹرونک میڈیا اس کا ذمہ دار ہے۔ دنیا کے ترقی یافتہ ممالک میں دیکھیے وہاں کتاب کلچر موجود ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ عام آدمی اب پڑھنے پر محض اس لیے مائل نہیں ہو رہا ہے کہ ہمارا تعلیمی ڈھانچہ کچھ اس طرح کا ہے جس نے ادب کو ایک غیر ضروری چیز بنانے پر کمر باندھ رکھی ہے۔ جو نوجوان سکول سے نکل کر زندگی میں قدم رکھتا ہے وہ آئی ٹی کمپیوٹر وار کمرشلزم کے زیر اثر ہوا ہے۔ لہذا ہم دیکھتے ہیں کہ آج جتنا بھی ادب پڑھا جا رہا ہے، اسے وہ نسل پڑھ رہی ہے جن کی عمریں پچاس سے اوپر کی ہیں۔ حتیٰ کہ پاپولر ڈائجسٹ بھی اسی عمر کے لوگوں کی وجہ سے زندہ ہیں۔ دوسری اہم وجہ یہ ہے کہ ہماری بڑی کمپنیاں جو لاکھوں روپے کی اشتہار بازی کرتی ہیں، اس کا ایک فیصد حصہ بھی ادب کی ترویج کے لیے مختص نہیں کرتیں۔

ادب کو دوبارہ اسی طرح مقبول بنانے کے لیے جس طرح وہ ۱۹۶۰ء کے زمانے میں تھا، ہمیں سکول و کالج اور یونیورسٹی لیول پر صاحبان اور اساتذہ حضرات اپنے طور پر ضرور کر سکتے ہیں۔ اگر وہ اپنے طالب علموں میں ادب کی محبت پیدا کر سکیں اور انہیں اچھی کتابیں پڑھوانے کا کوئی طریقہ اختیار کر سکیں تو میں سمجھتا ہوں کہ مستقبل میں اس بات کی امید کی جا سکتی ہے کہ ہمارا ادب جو تیزی سے عوامی نظروں سے گرتا جا رہا ہے، شاید ایک بار پھر وہ مقام حاصل کر لے جو اسے آج سے چالیس پچاس سال قبل حاصل تھا۔

اس جگہ میں یہ بات بھی بتانا چاہوں گا کہ ادب بر اوقت پڑنے کے باوجود بھی مکمل طور سے نہ کبھی غائب ہوا ہے نہ ہوگا۔ آج کے اس بدترین دور میں بھی جب اخبارات تک ادب کے

صفحات بند کرنے میں لگے ہوئے ہیں اور الیکٹرانک میڈیا ادب کے پروگرام دکھانے میں ہمیشہ متذبذب نظر آتا ہے۔ ادب زندہ ہے، کسی اور روپ میں ہی سہی۔ ڈراموں کی شکل میں سہی وہ موجود ہے اور یہ بھی جان لیں کہ ہر زمانے میں ادب کبھی بہت بڑی تعداد کو اپنے اردگرد جمع کرنے میں کامیاب نہیں ہوا ہے مگر ایک چھوٹی اقلیت ہر دور میں اس کے پاس موجود رہی ہے۔ سو اس کی عوامی عدم پذیرائی اتنی خوفناک نہیں کہی جاسکتی۔ آج بھی درجنوں کی تعداد میں ادبی پرچے نکل رہے ہیں حالانکہ بڑی بڑی کمپنیاں انہیں کبھی بھی اشتہار وغیرہ نہیں دیتیں پھر بھی حالانکہ یہ ان پر فرض بنتا ہے۔

مندرجہ بالا باتوں کے پیش نظر ہمیں ادب کی سمت سے خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ البتہ اگر اس کا دائرہ وسیع ہو جائے، قارئین کا حلقہ بڑھ جائے تو یہ ضرور ہے کہ ہمارے اندر پیدا ہونے والی مشینی سوچ بدل سکتی ہے۔ آدمی جو روز بہ روز بے حس، مادہ پرست اور روبوٹ جیسا ہوتا جارہا ہے دوبارہ لسانیت میں آسکتا ہے اور یہ مقصد بذاتِ خود اس قدر اہم اور بڑا ہے کہ اس کے لیے ہر کوشش مستحسن ہی کہی جائے گی۔

ادب میں اچھی کتابیں پڑھنے کو کیوں نہیں مل رہیں!

فارینہ الماس

انسان کے احساسات وجذبات جب لفظوں کے دلکش پیرائے میں ڈھل کر تحریر کی شکل اختیار کر لیں تو خیالات کے اس خاص اور انوکھے اظہار کو "ادب" کا نام دیا جاتا ہے۔ یوں تو خیالات کا ہر تحریری اظہار ادب کہلانے کا مستحق نہیں ٹھہرایا جا سکتا اسے تخلیقیت کے حسن میں شامل گھلاوٹ، شائستگی و بے ساختگی کے تمام تر لوازمات کے علاوہ اپنی خاص صنف کے ترکیبی عناصر کو بھی پورا کرنا ہوتا ہے۔ کسی بھی ترکیب یا زبان میں ادب کی کوئی ایک جامع اور مکمل تعریف پیش کرنا قدرے دشوار امر ہے بلکہ یہ کہنا درست ہے کہ کہ ادب کی کوئی ایک تعریف ہو ہی نہیں سکتی۔ جیسے ڈاکٹر جمیل جالبی کا کہنا ہے کہ ادب کے بارے یہ سوال کرنا کہ ادب کیا ہے بلکل ایسے ہی ہے جیسے آپ سے کوئی سوال کرے کہ "زندگی کیا ہے؟" تو آپ کے پاس کیا جواب ہوگا۔ آپ جو جواب دیں گے اس میں صرف وہ زاویہ ہوگا جس سے خود آپ نے زندگی کو دیکھا ہے۔ ضروری نہیں کہ دوسرا بھی اس سے اتفاق کرے۔ یہ سوال بھی کہ ادب کیا ہے اسی نوعیت کا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ادب بھی زندگی کے اظہار ہی کا نام ہے۔

Hasnain Sialvi

ادبی تحریر ہم ایک ایسی تحریر کو کہہ سکتے ہیں جو ہمارے شعور کو متاثر کرتی ہے۔ جس میں لافانیت کا ایک ایسا عنصر نمایاں ہوتا ہے کہ صدیاں بیت جائیں تو بھی ہمیں وہ تحریر ویسا ہی لطف دیتی رہے جیسا کہ اپنے لکھے جانے کی تاریخ میں پڑھنے والوں کو دیا کرتی ہوگی۔ اس کی اہمیت اور آفاقیت پر سمے کا کوئی بندھن کارگر نہیں۔ وہ زمان ومکان سے عاری اور اپنے مفہوم میں عالمگیر کردار کی حامل ہوتی ہے۔ اس میں اطلاع تمدن کے ساتھ ساتھ اصلاح تمدن کے بھی سبھی امکانات موجود ہوتے ہیں۔ اس کا تحرک ہی معاشرے کے لئے باعث تحریک ہے۔ ادب، افراد معاشرہ کے شعور وادراک کا وہ پیمانہ بھی ہے جسے پا لینے کے بعد فرد اپنی گمشدہ یا خوابیدہ صلاحیتوں کو مسخر کر سکنے کے امکانات کو جا لیتا ہے۔ اس کے گہرے مطالعے سے تزکیہ نفس ومحاسبہ ذات دونوں ہی ممکن ہیں اور زندگی کو پر پیچ اور کٹھن راستوں پر ثابت قدم رہنے کی حوصلگی کے ساتھ ساتھ نئے سہل راستوں کی بازیافت کی نوید بھی ملتی ہے۔ آج کے جدید مادی ومیکانکی دور میں ادب کی اہمیت پہلے سے بھی

زیادہ بڑھ چکی ہے آج جب انسان زندگی کی بے معنویت سے گھبرا کر، اس کی حقیقی معنویت کی تلاش میں نکلتا ہے تو ادب میں ہی اسے پناہ ملتی ہے۔ ادب ایک گہرے بھید کی جستجو کا بھی باعث بنتا ہے۔ انسانی ذہن بیک وقت سوال کرنا اور اس کے جواب کو کریدنے کا ہنر جان پاتا ہے۔ اس سے فکرو خیال کی رعنائی و توانائی کشید کئے جانے کا بندوبست ہو جاتا ہے۔

روایتی قسم کے نظریات اور سطحی قسم کی سوچ کو نئے خیالات اور نظریات کا تازہ لہو مل جائے تو انسان کے لئے گھٹن زدہ سماج میں سانس لینے اور کھل کر جینے کی امید پیدا ہو جاتی ہے یعنی کہ یہ فکری انقلابات کا پیش خیمہ بھی بن سکتا ہے اور ان انقلابات کے بعد نئی سوچ اور نئے خیال کے پیمانے بھی فراہم کرتا ہے۔ اور اگر یہ سبھی خواص ادب میں نہ پائے جائیں تو وہ ادب نہیں غیر تخلیقی فنون کے وہ مصنوعی ڈھکوسلے ہیں جنہیں اپنا کر ہم خود کو مہذب معاشروں کی صف میں کھڑا کرنے کی بے کار جستجو میں رہتے ہیں۔

مغربی ادب کی تاریخ مختلف تحاریک پر مبنی رہی۔ قدیم مغربی ادب یوٹو پیائی ادب کی خاصیت کا حامل رہا۔ افلاطون کی ریپبلک جو کہ کوئی ناول، شاعری، کہانی یا ادب کی کوئی بھی صنف نہ تھی لیکن اس کے مکالمات نے لافانی شہرت پائی، سن 1600 میں ٹامس مور کی یوٹو پیا نے خیالاتی دنیا کے تصور کو ایک انقلابی حیثیت عطا کی۔ فینٹسی کے جہان میں انسان پر نئے احساسات و تجربات منکشف ہوئے۔ 1880ئسے 1920ئتک کے دور میں نیوٹرل ازم کی ایک تحریک خاص طور پر امریکہ سے اٹھی۔ جس کو ماننے والوں کا نظریہ یہ تھا کہ انسان اپنے رویے کائنات اور فطرت کے اصولوں کے مطابق اپناتا ہے۔ ان رویوں کو اپنانے میں ان کی جبلت، فطرت اور وراثت کا عمل دخل ہوتا ہے۔ یعنی انسان اپنے رویوں کو اپنانے میں آزاد نہیں وہ اپنے ماحول کے بھی رحم و کرم پر ہے۔ گردوپیش کے ماحول کی ترغیب انسان کو خاص ردعمل پر اکساتی ہے۔ لہذا اس دور میں لکھا جانے والا ادب انسانی مطالعے پر مبنی رہا۔ اس دور کے لکھاری کائنات میں فطرت کے چھپے سچ کی دریافت میں مگن پائے گئے۔ اٹھارہویں صدی روشن خیالی کی صدی ثابت ہوئی۔ کانٹ، روسو، والٹیئر کی تحریروں میں سوچ کی نئی راہیں تلاش کی جانے لگیں۔ نئی سائنسی دریافتوں نے ادب کو بھی مشاہدے کی نئی راہیں فراہم کیں۔ عجائبات زمانہ اور ایڈونچر نے انسانی مشاہدے کو متاثر کیا۔ اور پہلا سائنس فکشن ناول 1818 frankenstein میں تخلیق کیا گیا۔ انیسویں صدی رومانویت کی صدی ثابت ہوئی۔ جب فاؤسٹ، ولیم بلیک، لارڈ بائرن، شیلے، جان کیٹس کا ادبی فن دنیا کے سامنے آیا۔ اس دور میں شارٹ سٹوری کا رواج عام ہوا۔ شاعری کے عنوانات میں فطرت اور حسن کو دانشورانہ خوبصورتی اور دلکشی سے مزین کیا گیا۔ فطرت کے حسن میں انگنت تخیلاتی

علامات کو مسخر کیا گیا۔ روح کے ساتھ ساتھ موت کے تصور کو بھی رومانیت دی گئی۔ جہاں بہار، پرندوں کو موسیقیت بھری آوازوں اور دلکش مناظر فطرت کی بھرپور عکاسی ہوئی وہیں تنہائی، خزاں اور موت سے بھی محبت نبھاتے ہوئے ان تصورات کو آرٹ اور فن میں لافانی حسن دیا گیا۔

دو عالمی جنگوں نے مغرب کے فلسفے، ادب اور سماج پر بھی گہرے اثرات مرتب کئے۔ درد، کرب اور فرسٹریشن کی داستانیں رقم ہوئی۔ طاقت کے اظہار کے نتیجے میں دنیا میں دکھائی دینے والی خون سے لتھڑی انسانیت کی تصویر کو بڑے دکھ، وحشت اور حزن کے بیانیے میں ڈھالا گیا۔ وسائل کی کم پڑتی طاقت کو متوازن کرنے کے لئے بڑی طاقتوں نے چھوٹے اور کم زور ملکوں کو نو آبادیات کے شکنجے میں جکڑ رکھا تھا۔ جہاں آقا؟ں کی بے رحمی و محکوموں کی بے بسی کو فن اور ادب میں بیان کیا گیا۔ جیسے کافکا کی تحریریں بیسویں صدی میں ابھرتی انسانی چیخوں اور قتل و غارت گری کے ابھرتے قصوں کی عکاس بننے لگیں۔

بیسویں صدی میں تعلیم کی شرح بڑھی تو آگاہی کے بھی نئے در وا ہونے لگے۔ انسان کا متجسس سے عقیدہ اٹھنے لگا وہ خیالاتی دنیا اور یوٹوپیا سے کہیں زیادہ اب زندگی کی حقیقتوں کے ادراک سے متاثر ہونے لگا۔ مسائل زمانہ بڑھنے لگے۔ معاش سے وابستہ نظریات نے دنیا کو دو الگ الگ نظریات سے جوڑا تو کئی طرح کے تمدنی و سماجی انتشار کو بھی برداشت کرنا پڑا۔ ان بدلتے سماجی حالات نے نئی فکر اور انداز اظہار کو متعارف کروایا۔ پاپولر لٹریچر کا تصور ابھرا۔ متنوع موضوعات ادبی اظہار میں نمایاں ہوئے۔

مغرب میں تحریر ہونے والا آج کا ادب بھی انسان دوستی کا اظہار ہے۔ کئی طرح سے انسان کو فانیت کے کرب سے نکال کر لافانی روحوں کا کردار نبھانے پر اکساتا ہے۔ اس کی عالمگیریت کی گواہی یہ ہے کہ دنیا کی کسی بھی زبان یا ثقافت و اقداری نظام میں اسے خوش دلی سے قبول کیا جاتا ہے۔ اس میں ماضی کے رونے دھونے کے قصے بھلا کر جدید دور کے مسائل پر سوچنے سمجھنے اور انہیں نپٹانے کا شعور دیا گیا ہے۔ سائنس، فلسفے اور معاشرت پر کھل کر بات کی گئی ہے۔ یہ صاف دکھائی دیتا ہے کہ مغرب کے پاس سوچنے کو بہت کچھ ہے۔ شاید ایسا بھی ہے کہ جب انسان معاش کے آزار سے آزاد ہو تو دماغ اور سوچ کی کارکردگی بڑھنے لگتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مغرب کے پاس کرنے اور سوچنے کو بہت کچھ ہے۔ اپنے اس سوچنے کے عمل میں وہ نئے اور خوشگوار تجربات اور ادراک سے بھی گزرتا ہے۔ سچ کی دریافت کے راستے میں وہ منکشف ہونے والے نئے ادراک کے لئے کلی طور پر تیار بھی رہتا ہے اور بے تاب بھی۔ مغرب کا لکھاری مایوس ہے اور نہ ہی

مایوسی تقسیم کرتا ہے۔اس نے تہہ دل سے سائنس اور انسان کے تصور فانیت کوتسلیم بھی کیا ہے کیونکہ وہ نہیں چاہتا کہ فرسودگی کے بھنور میں لپٹ کے رہ جائے اور ادراک وفہم کے سفر میں رک جائے۔یہی وجہ ہے کہ وہ اقداراور رویوں کی تشکیل وترویج سے بہت آگے نکل چکا ہے۔

بلاشبہ اردو ادب نے بھی ہر دور میں مغرب میں چلنے والی تحریکوں ،تمدنی ارتقاء،قدیم روایات کی جگہ نئی روایات کی ترویج ،معاشی وسماجی انقلابات اور عالمی جنگوں اور بدلتے سیاسی منظر ناموں سے ہمیشہ اثر لیا۔ادبی روایات یہاں بھی بنتی اور بگڑتی رہیں۔آقا؟ں کی لگائی گئی تعزیروں کے باوجود یہاں نوآبادیاتی نظام کے جبر،ظلم اور بربریت کا واویلہ ادب کے ذریعے اٹھتا رہا۔اس دور کے لکھاری اس حقیقت سے بخوبی آشنا تھے کہ برصغیر کے لوگ غلامی کے دکھ سے کہیں زیادہ معاشرتی وتمدنی زوال کے مصائب میں مبتلا ہیں۔ان کے گلے میں غلامی سے بھی بہت پہلے جہالت وگمراہی کا طوق لٹک رہا تھا۔بادشاہوں کی شاہانہ اور عوام کی مفلسانہ زندگی کا تضاد معاشرے کو پستی وذلت میں دھکیل چکا تھا۔علم وہنر کا کمال،اور تمدنی ترقی کا خیال سماج سے روٹھ چکا تھا۔سو اس معاشرے کو اصلاح حال کی اشد ضرورت تھی۔حالی،شبلی،سرسید اور محمد حسین آزاد جیسے مصلحین معاشرہ،ادب میں استدلال وعقلیت کی طرح ڈال چکے تھے۔ڈپٹی نذیر احمد کے توبتہ النصوح،فسانہٴمبتلا ،مرا؟العروس اور ابن الوقت جیسے شاہکار تخلیق ہونے لگے تھے۔گوکہ انہوں نے اپنے ناول انگریزی ادب سے ہی متاثر ہوکر لکھے لیکن یہ بہت کمال کا کام تھا جو ادب کے تمام تر خواص خصوصاً اس کی لافانی حیثیت کا مقام سمیٹے ہوئے ہے۔مغرب میں جنم لینے والی رومانویت،حقیقت پسندی،فاشزم اور ترقی پسندی کی تحریکوں نے ہندوستانی ادب کو بھی بیحد متاثر کیا۔اب ادب کی تمام تر اصناف میں نئے پہلو ابھر کر سامنے آنے لگے۔ 1917ئکے روسی اشتراکی انقلاب نے عروج پایا تو برصغیر کے اہل قلم نے اسلامی فلسفے اور مذہبی ددینی فکر کا پرچار شروع کر دیا۔ظفر علی خان اور اقبال نے اس خاص تحریک کا بھرپور ساتھ دیا۔شاعری میں رومانویت کی تحریک کے اثرات کو قبول کیا جانے لگا اور کائنات وحیات کی باریکیوں کے ساتھ ساتھ،فطرت کے حسین امتزاج سے لے کر محبت کی رعنائیوں پر بھی بات کی گئی۔گویا وقت اور حالات نے جہاں جہاں نئی فکر اور نئے شعور کو کریدا اردو ادب نے اسے بھرپور طریقے سے قبول کیا۔ اگر کہیں کوئی شہر اجڑا تو اس کے پس منظر میں بکھری پژمردگی وافسردگی کا حال بھی بیان میں آیا۔جب جہاں اصلاح کی ضرورت محسوس ہوئی ادیب اصلاح کار بھی بنے اور جب انقلاب کا بگل بجایا جانا ضروری ہوا انقلاب کے نغمے اور نثری پیرائے بھی عام کئے گئے۔غلامی کے باوجود نا تو ادب کا تحرک اور نا ہی ادب کا پھیلا؟ کہیں پر بھی کسی مقام پر تھمتا محسوس ہوتا ہے۔ادب کے موضوعات وانداز

بیاں کہیں موسیقیت، کہیں سوز، کہیں تصوف تو کہیں کلاسیکی کا انداز بن کر سامنے آتے رہے۔اس ادب میں جدیدیت کے رجحان کو بھی بالائے طاق نہ رکھا گیا۔غلامی کے باوجود جرائت گفتار کے مظاہر جا بجا پائے گئے۔منٹو، پریم چند، اپندر ناتھ اشک اور ان جیسے کئی تخلیق کار اپنے اپنے انداز بیاں سے اور پوری دیانتداری سے سماج کی عکاسی اور مکمل حقیقت نگاری کا برقت و برمحل اظہار بلا جھجھک کرتے رہے

بعد از تقسیم لکھے گئے ادب پر بہت حد تک تقسیم کی کرب ناک کہانیوں اور سرحد پر برپا قیامتوں کی منظرکشی غالب رہی۔اس تقسیم میں ہونے والا جانی و مالی نقصان قوم کی نفسیات اور تشخص وتمدن پر بری طرح اثر انداز ہوا۔ادیب اور شعرا بھی ان زخموں کو سینے پر اٹھائے ہوئے اپنے رنج وملال کے زہر کو ادبی حقیقت نگاری میں بجھانے لگے۔ابھی ٹھیک سے یہ زخم بھرے بھی نہ تھے کہ کچھ ہی عرصہ بعد اس قوم کے سینے میں مشرقی پاکستان کا زخم جڑ دیا گیا۔اس شکست وریخت اور بے بسی کا نوحہ بھی ادبی نگارشات میں جگہ پانے لگا اور قوم کو اپنی حقیقت حال کا عکاس محسوس ہوا۔پھر مارشل لائی حکومتی ادوار نے ان زخموں کو کبھی مندمل ہونے ہی نہ دیا۔شکستگیِ اذہان اور ارواح ایک نئے طور سے سامنے آئی اور ادب کا حصہ بنی۔سچ کی آواز کو نوآبادیاتی دور سے بھی کہیں زیادہ سختی سے پابند سلاسل کیا جاتا رہا۔لیکن ادب ایک طاقتور آواز بن کر اپنے مقام کو بلند کرتا رہا۔یہ بھی سچ ہے کہ اس دوران مزاحمت سے کہیں زیادہ طاقتور مفاہمت کرنے والوں ادیب رہے لیکن انہوں نے تصادم سے زیادہ قوم کے مزاج واطوار میں سدھار پیدا کرنے کے لئے اصلاحی انداز اپنایا۔60یا70اور80 کی دہائی تک ادب کا سفر بڑی سرعت سے جاری وساری رہا۔اس دوران کمال کا ادب سامنے آیا۔لیکن اس خاص تحریک کے ادیب وقت کے ساتھ ساتھ اجل کے ہاتھوں کم یاب ہوتے گئے۔

آج پاکستان مین لکھا جانے والا اردو ادب گو کہ پرتاثیر ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ بہت محنت سے بھی لکھا جا رہا ہے۔خصوصاً افسانے اور ناول کی اصناف پر بھرپور توجہ دی جا رہی ہے۔ایسے بہت سے ناول نگاروں اور افسانہ نگاروں کے نام گنوائے جا سکتے ہیں جو معیاری کام کر رہے ہیں اور تنقید پر بہت ہی سنجیدہ کام ہو رہا ہے۔لیکن بہت سا ادب ایسا بھی تخلیق ہو رہا ہے جس میں تخلیق کا عنصر خاصہ محدود ہے۔خصوصاً شاعری کے میدان میں بہت سے نووارد شعرا شاعری کی ساکھ اور ادبی حیثیت کو نقصان پہنچانے کا باعث بن رہے ہیں۔شاعری کے عنوانات نا تو اپنی نوعیت میں انقلابی ہیں اور نہ ہی اصلاحی وتحریکی۔زیادہ تر کام محبت اور عشق کی ناکامی کے تذکروں کی صورت سامنے آ رہا ہے۔لیکن ان تذکروں میں بھی نہ تو خیال کی کوئی ندرت وا چھوتا پن دکھائی

دیتا ہے اور نہ ہی فکر کا کوئی سلیقہ و سلجھا؟ سامنے آ رہا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے یا تو تخلیق کاروں کی تخلیقی استعداد کم ہونے لگی ہے یا وقت کے تقاضوں سے ادیب کچھ چشم پوشی اختیار کرنے لگے ہیں۔

سماج کی صورتحال میں تا حال بدلا؟ کی کوئی سبیل دکھائی نہیں دیتی۔ معاشرتی اقدار ہنوز، فرسودگی کی دیمک میں لپٹی دکھائی پڑتی ہیں۔ دہشت و وحشت کی دل گیر کہانیوں نے قوم کو اعصابی و جذباتی طور پر توڑ کر رکھ دیا ہے۔ ہمارے لئے آج بھی تشخص کا بحران ایک گھمبیر بحران ہے۔ ہم ایک ایسے بدبودار سماج میں ڈھل رہے ہیں جس سے اٹھتا جبر، استحصال، منافقت، اخلاقی گراوٹ کا تعفن ہمیں اب سانس بھی لینے نہیں دیتا۔ باہمی نفرتوں، قدورتوں، تفرقوں کا زہر ہمارے حلق میں اتر کر پورے جسم میں سرایت کرتا جا رہا ہے۔ یہاں بے گناہوں کو فتوؤں کی صلیب پر جھلا دیا جاتا ہے اور ہمیں کچھ فرق نہیں پڑتا۔ کیا ہمارے تہذیبی و تمدنی زوال نے تخلیق کاروں کے آہنگ و فکر کو اثر انداز نہیں کیا ہوگا؟ ضرور کیا ہوگا بلکہ ان کی روحیں تو سب سے زیادہ گھائل ہوتی ہیں کیونکہ وہ معاشرے کا حساس طبقہ ہیں لیکن ان تمام تر مسائل زمانہ کے باوجود ادیب اور تخلیق کار قوم کے کردار و تشخص کی تشکیل و نو کا بیڑا اٹھاتے کیوں دکھائی نہیں دیتے، کیوں وہ ظلم و جبر کے خلاف واویلہ نہیں اٹھاتے؟ یا تو ادیب بھی مصلحت کوش ہونے لگے ہیں یا پھر ان کی مایوسی، بے یقینی، بے سکونی و بے سمتی انہیں تفکر و تدبیر سے روک دیتی ہے۔ آج وقت کے جدید تقاضوں کو سمجھنے اور ان کو اظہار میں لانے کی صلاحیت کا بھی فقدان دکھائی دیتا ہے۔ ادیب نئے دور کے سائنسی و تمدنی تقاضوں کو سمجھنے اور بیان کرنے کی صلاحیت سے قاصر ہیں یا کم تر ہیں۔ اس لئے وہ المیے، تشدد، جبر، ظلم اور ناانصافی کو قبول تو کر رہے ہیں لیکن انہیں پچھاڑنے کی تدبیر نہیں۔ وہ روتے، چیختے، کلبلاتے، بلکتے، گھٹتے، مرتے کرداروں کے عکاس بن کر پڑھنے والوں کو فرسٹریشن اور تناؤ میں مبتلا تو کر رہے ہیں لیکن ان کے پاس غم، دکھ، کرب، تکلیف، محرومی سے نکلنے کا کوئی انوکھا و اچھوتا نسخہ نہیں۔ سوچ دقیانوس، بدعتی اختراع سے الجھ کر اپنی بلند خیالی سے کوسوں دور رہ جاتی ہے۔

آندرے مالرو نے کہا تھا" اگر ہمیں فکر کا ایک گہرا، بامعنی، مثبت اور انسانی زاویہ اختیار کرنا ہے تو لامحالہ ہمیں دونوں باتوں پر انحصار کرنا ہوگا۔ ایک تو یہ کہ زندگی بلآخر ہمارے اندر ایک طرح کا المیاتی احساس پیدا کرتی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم اپنی تمام تر فکری اور مادی کامرانیوں کے باوجود یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ ہم کہاں جا رہے ہیں اور دوسرا یہ کہ ہمیں بحرحال انسان دوستی کے تصور کا سہارا لینا ہوگا کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ ہم نے اپنا سفر کہاں سے شروع کیا تھا۔ اور بلآخر کہاں پہنچنا چاہتے ہیں۔ انسان دوستی تخلیقی تجربے کی بنیاد ہے" آج کا ادب بہت حد تک المیاتی احساس سے تو لبریز ہو چکا ہے لیکن انسان دوستی کے پہلو سے سراسر غافل نظر آتا ہے۔ اس لئے انسان کی

روح کو متاثر کرنے سے عاری ہوتا چلا جا رہا ہے۔آج ادب کی ادبی قدریں گھٹتی نظر آ رہی ہیں۔اسی لئے روح میں سرایت کرنے کی طاقت کھونے لگا ہے۔ادب میں اصلاحی پہلو بھی کم سے کم تر ہوتا جا رہا ہے۔دیکھا جائے تو یہ صرف حالات کے بیانیے تک ہی محدود ہو رہا ہے۔مغرب میں لکھی گئیں کتابیں اپنے لسانی فرق کے باوجود ہمیں فکری و روحانی طور پر اثر انداز کر رہی ہیں۔یہی وجہ ہے کہ جدید دور کا نوجوان اس کے دور میں لکھی جانے والی اردو زبان کی کتابوں میں سے کسی ایک بھی ایسی کتاب کا حوالہ نہیں دے پاتا جس نے اسے خیالاتی و جذباتی طور پر جھنجھوڑا ہو۔لیکن اس کے پاس پائلو کوئیلو یا گیبریل گارشیا مارکیز جیسے لکھاریوں کی کئی کتابوں کے حوالے موجود ہوں گے۔جوان کی سوچ و فکر کے نئے سائنسی و تمدنی زاویوں کے تحرک کا باعث بنیں۔جوان کے لئے دلچسپی و دل جوئی کا سبب اور حیرت انگیز خیال کی دریافت کی وجہ بنیں۔جن کے اثرات شاید ہی وہ مدتوں تک اپنے ذہن و فکر سے زائل کر سکیں۔

یوں لگتا ہے جیسے معاشرتی و سماجی زوال کی طرح ہم تخلیقی زوال کے بھی دور سے گزر رہے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ بدلتی دنیا کے بدلتے معیار کے مظاہر ہمیں ادب میں کم کم دکھائی دے رہے ہیں۔تخلیقیت سوچ کے نئے بھید کو دریافت کرنے کا نام ہے اور ایک ادیب کی ذمے داری، خیال و فکر کی نئی توجیہات و تشریحات پیش کرنا ہے اسی طرح ادب کے بھی تمام تر اسلوب اور اصناف کو زرخیز دماغی اور موضوعات کا اچھوتا و جدت آمیز انتخاب درکار ہوتا ہے۔روایتی طریقوں اور انداز اظہار سے نکل کر جدت کو اپنانا آج کے ادب کی سب بڑی ضرورت ہے۔تا کہ نا صرف نوجوان نسل کا رشتہ زبان سے جڑ سکے بلکہ آج کا اردو ادب بھی اس پائے کا ہونے لگے کہ عالمی زبانوں میں اس کے ترجمے دستیاب ہوں۔

کتاب شناسی: تاریخ کے آئینے میں

جیسیکا بریٹلی   ترجمہ: توحید احمد

کتاب کی تاریخ پر تحریریں دنیا بھر میں دستیاب ہیں۔ پچھلی چند دہائیوں سے ادبی گفتگو پر حاوی تاریخیت کے سنگم پر واقع متون کی مادیت کا مطالعہ ادبیات کے ہر شعبہ میں پھل پھول رہا ہے۔ جوں جوں یونیورسٹیوں میں تاریخ کتاب کے مراکز قائم ہو رہے ہیں اور وہاں جاری تدریسی پروگراموں سے کتاب کی تاریخ کی ببلیوگرافی میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے، اشاعتی ادارے اس موضوع پر نت نئی کتب شائع کر رہے ہیں اور اسکالرز کتاب شناسی اور اس سے ملحقہ مضامین میں بڑھ چڑھ کر دلچسپی لے رہے ہیں۔

تحقیق کے اس میدان میں حال ہی میں رمز بندی کی گئی ہے جو نہ صرف متعدد اداروں میں ہوئی بلکہ اصطلاحی سطح پر بھی دیکھنے میں آ رہی ہے۔ رمز بندی کی اصطلاح ''کوڈ'' سے نکلی ہے جو خود ''کوڈیکس'' (یعنی کتاب کی شکل میں قدیم مخطوطہ) سے مشتق ہے۔ کتاب شناسی کے اسکالر کوڈیکس میں سموئی ہوئی رمزوں کو افشا کرنا چاہتے ہیں یعنی عمومی طور پر فکر کے سسٹم کی تخلیق اور اظہار کے وہ مادی ڈھانچے جن کے ذریعے خیال کا اظہار کیا جاتا ہے۔

ان کا اصل موضوع کوئی بدن سے عاری نظم نہیں ہے جو اپنے مادی سہاروں سے آزاد ہو کر فضا میں تیر رہی ہو، نہ ہی استفسار اور طباعت کی تعداد کے کیل اور پیچ ہیں بلکہ متون کے مختلف پہلو ہیں۔ اسکالروں کیلئے کتاب شناسی کا مضمون ایک ایسا میدانِ علم ہے جو منہاجیات اور نظریوں کو دلچسپ طور پر یکجا کرتا ہے۔ وہ اولین مفروضہ جو کتاب کے تاریخ دان اپنے پیشِ نظر رکھتے ہیں (materiality) مادیت یعنی تحریروں کی کتابی شکل میں اہمیت سے متعلق ہے۔ ادب کی کوئی لطیف تاریخ یا افکار کی کوئی غیر مرئی تاریخ کی بجائے ان تاریخ دانوں کا مطمعِ نظر اشیا کی آثاریاتی تاریخ ہے۔ گو تجزیاتی کتابیات کے عالموں نے عرصہ دراز سے ان شواہد پر نگاہ رکھی ہے جن پر جدید کتاب شناسی کی بنیاد اٹھائی گئی ہے، لیکن اب ایسے سوالات اٹھائے جا رہے ہیں جو ان شواہد کے مختلف استعمال کے متقاضی ہیں۔

کتابیات میں ضمنی دلچسپی کے عوامل جنہیں ادبی تجزیہ میں پہلے نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ متن کی صفحہ سازی، مطبوعہ عبارت کا طرز (typography)، حاشیہ نویسی، کاغذ کی تیاری اور اقسام اور آبی مارکہ جات (watermarks) اب متون کے مطلب سے غیر متعلق نہیں رہے۔ اسی طرح اشاعتی اداروں کے دستاویزی محافظہ خانے (Archives) کتب فروشوں کے کاروباری معاہدے یا کتابی حاشیوں کے تجزیئے اور قارئین کے مشاہدات، تاریخ دانوں کے ساتھ ساتھ اب ادبی نقادوں کی دلچسپی کے سامان میں شامل ہو گئے ہیں۔ اور جیسا کہ متعدد اسکالروں کا کہنا ہے کہ کتاب کے وجود میں آنے کے عوامل دانش کی تخلیق اور انکشاف ہیں کیونکہ وہ کوئی وقتی خصوصیات ہونے کی بجائے ادبی متن کی شناخت کے ٹھوس ترین اور ابدی عوامل ہوتے ہیں۔ تاریخِ کتاب کتابیاتی معلومات کی باریک بین، نہایت محتاط تنقیح، مجرد قیاس آرائی اور متن کی فطری خصوصیات کی تحقیق کی بابت ایسا مجموعہ ہے جو مطالعہ کیلئے ایک قوی چوکھٹا فراہم کرتا ہے۔ علم کے اس نئے میدان میں قرون وسطیٰ کے مطالعات کا کیا مقام ہے؟ ایک لحاظ سے قرونِ وسطیٰ کے ماہرین ہمیشہ کتاب کے مورّخ ہی رہے ہیں۔ کیونکہ شروع ہی سے اس میدان کا مرکزی محور تاریخی متن کی مادیت یعنی وجود میں آنا رہا ہے۔ اس کا اولین اور مشکل ہدف مخطوطات کے متون کی وضاحت اور طباعت تھا کیونکہ اس دور کے فکر و عمل کے شواہد انہی مخطوطات میں تو پوشیدہ ہیں۔ قرونِ وسطیٰ کے متون کی تدوین سے کتاب کی تاریخ کے علم کی تشکیل اور جنم ہوا جیسا کہ 1864ء میں Early English Text Society کے قیام سے ظاہر ہوتا ہے۔ اب بھی جیوفری چاسر کے قارئین کو یہ مسئلہ درپیش ہے کہ Canterbury Tales کے متعدد مسودات اِن کہانیوں کی اصل ترتیب کے بارے میں کوئی حتمی رائے قائم نہیں کرتے۔ علمِ اللسان (Philology)، متنی تنقید (Textual Criticism)، قدیم کتبوں و دستاویز کا مطالعہ (Palaeography)، علمِ رموز بندی (Codicology) اور کتاب کی آثاریات (Archaeology)، وہ چند علوم ہیں جو قرونِ وسطیٰ کے مخطوطات کے مطالعہ میں مستعمل ہیں۔ ان کے تنوع سے ایسی تحقیق کی طویل تاریخ اور ترجیحات میں تغیر کا پتہ ملتا ہے۔

کتاب کے آثاریات کا علم اور کتاب شناسی کی تاریخ تقریباً برابر ہے۔ تاہم قرونِ وسطیٰ کے مطالعہ اور اس کے بعد کے ادوار کے مطالعات میں کافی زمانی فرق ہے۔ اپنے ذی اثر اور بار بار شائع ہونے والے مقالہ بعنوان: ''What is the History of Books?'' میں رابرٹ ڈارنٹن نے اس سوال کا جواب کتاب کی تاریخ کی اس تعریف میں دیا کہ وہ ''طباعت کے ذریعہ ابلاغ کی سماجی اور ثقافتی تاریخ'' ہے۔

اس کے مقابلہ میں دوسرے مطالعات بھی سامنے آتے ہیں جو تاریخِ کتاب کے فرانسیسی اور امریکی دبستانوں کے آپس میں رشتے کا گہرا موازنہ کرتے ہیں اور تاریخ دانوں، ماہرین کتابیات، مدیروں اور ادبی نقادوں کے بدلتے ہوئے کردار کا مطالعہ کرتے ہیں۔ لیکن ان سب نے پرنٹنگ کے دور سے قبل کی کوڈیکس کی کہانی کو اکثر نظرانداز کیا ہے۔ اس میدان میں سامنے آنے والی چند ٹیکسٹ بکس An Introduction to Book History میں اس علم کی وسیع ترین تعریف برتتے ہوئے اس میں ''طباعت کا ہر قسم کا عمل'' شامل کرلیا ہے۔ امریکی ماڈرن لینگوئج ایسوسی ایشن کے مجلّہ PMLA نے اپنی ایک خصوصی اشاعت بعنوان'' The History of the Book and the Idea of Literature''میں کتاب شناسی کو صرف طباعتی مواد تک محدود رکھا ہے۔ گو اس مجلّہ کا ایک مدیر ماہر مطالعات قرونِ وسطیٰ بھی ہے۔

اگر اس دور کا کوئی شخص یا کالج میں پہلے سال کا نووارد طالب علم کسی ٹیکسٹ بکس کی دوکان میں داخل ہو تو شاید یہ سمجھے کہ یوہانس گیوٹن برگ کے چھاپہ خانہ کی ایجاد سے قبل انسان کچھ بھی نہیں پڑھتا تھا۔ فی الحقیقت لسانیاتی اور مذہبی تفرقات سے بڑھ کر گیوٹن برگ کی ایجاد ہمارے لیے قرون وسطیٰ اور جدید دور کے درمیان نظر آنے والے بُعد کی تشریح کرتی ہے۔

دراصل تحریر اور طباعت میں حقیقی تفریق اس علمی صف بندی کی اصل وجہ ہے۔ تاریخِ کتاب کی ابتدائی تحریک اٹھارویں صدی میں طباع شدہ متون کے قارئین کی ایک بڑی تعداد اکٹھا کرنے کی قوت سے پیدا ہوئی۔ اوائلی جدید دور میں ٹیکنالوجی میں ہونے والی ترقی نے کتاب شناسی کے مضمون کیلئے ایک زرخیز فوکس کا کردار ادا کیا کیونکہ چھاپہ خانے کی ایجاد نے تحریروں کے ٹھوس وجود کو اجاگر کیا۔ ہاتھوں سے لکھے کوڈیکس کے نقوش ان مطالعات میں نظر نہیں آتے جو پرنٹنگ کی وجہ بنے۔ تحقیق کے باوجود تاریخ کتاب میں قلمی کتاب کا کوئی ذکر نہیں تھا۔

فی الحقیقت قلمی کتاب، تاریخ کتاب شناسی کا ناگزیر حصہ ہے۔ ایسے مبصرین بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ گیوٹن برگ نے طباعتی انقلاب ہی برپا نہیں کیا تھا بلکہ اس نے معلوم کوڈیکس کی تخلیق کیلئے دوسری ٹیکنالوجی متعارف کروائی۔ آج بھی ہم مخطوطے سے کچھ کام لیتے ہیں اور ہمیں ایک تیسری ٹیکنالوجی کو بھی خاطر میں لانا ہوگا یعنی اکیسویں صدی کا ہر جاء موجود ڈیجیٹل ماحول۔ ہمارے متنی آفاق کے تغیرات ہمیں علم کے مختلف پہلوؤں کی اثر اندازی پر غور کرنے کا جواز فراہم کر رہے ہیں۔ اس ماحول میں ہمیں کتاب کی تاریخ کی تعریفِ نو کرنا ہوگی کہ یہ مضمون مطبوعہ کوڈیکس کی تاریخ سے بڑھ کر ہے۔ الیکٹرانک مواد اور طبع شدہ مواد میں تھوڑی بہت مماثلت ہے۔ مثلاً الیکٹرونک متون طبع شدہ متون کی وسیع تر اشاعت کی صلاحیت میں اضافہ کرتے ہیں لیکن اس کے

استحکام اور ٹھہراو؟ میں کمی کر ڈالتے ہیں۔ تاہم ایسی تعریف سے انفارمیشن ٹیکنالوجی کے اطلاق پر پڑنے والے اثر کا پتہ ملتا ہے۔

ٹھوس متن کی ایسی کشادہ تاریخ وضع کرنا قرون وسطیٰ کے مطالعات کیلئے نہایت مفید ثابت ہوسکتا ہے کیونکہ اگر مخطوطات سے قرونِ وسطیٰ کی ادبی تنقید معین ہوتی ہے تو وہ اس تنقید کے مستقبل کی نشاندہی کرنے کا دعویٰ بھی کر سکتے ہیں۔ گزشتہ چند دہائیوں میں ہر جانب یہ طے کرلیا گیا ہے کہ قرونِ وسطیٰ کے مدّون ایڈیشن جدید قاری کی مکمل تاریخی سمجھ کی پیچیدگی کو محدود کر ڈالتے ہیں۔ اس کے برعکس مخطوطہ شناسی کا حال میں ترک ہونے والا دلکش مطالعہ قرونِ وسطیٰ میں ادب کی اولین افزائش کے مانوس حالات کو اس ادب کی سمجھ کا اہم رکن گردانتا ہے۔ قرونِ وسطیٰ کے مخطوطات کے مطالعات کی احیاءِ نو کی ایک وجہ کتاب کی وہ تاریخیں ہیں جو دنیا کے دوسرے خطوں میں لکھی جا رہی ہیں۔

پرنٹنگ کی ایجاد کے بعد کے دور میں مطبوعہ مصنوعات کو نئے زاویوں سے دیکھنے سے ہمارے جیسے قلمی متون کے محققوں کیلئے نئی راہیں کھلی ہیں اور نئے مفید سوالات نے جنم لیا ہے۔ مثلاً وسط انگریزی زبان کے متون کے اولین ایڈیشن بنیادی طور پر زبان مرکوز تھے۔ جیسا کہ ان کی طویل لسانیاتی تمہیدوں سے پتہ چلتا ہے کہ Early English Text Society کے قیام کا ایک جزوی مقصد آکسفورڈ انگلش ڈکشنری کیلئے لسانیاتی کوائف فراہم کرنا تھا۔ اب ہم قرونِ وسطیٰ کے کسی متن کی تمام مادی تاریخ پر توجہ دیتے ہیں جس کو New Philology بھی کہا جاتا ہے جو قرونِ وسطیٰ کے مطالعات کی ایک ایسی شاخ ہے جس کی اہمیت میں بتدریج اضافہ ہو رہا ہے۔

قلمی کتاب کی تاریخ مطبوعہ کتابوں کے مورخوں کو بھی کچھ سکھا سکتی ہے کیونکہ مخطوطات کا ذکر نہ کرنے سے خواندہ متنیت Literate Textuality کی اہم گفتگو میں خلل پڑتا ہے۔ قرونِ وسطیٰ کے دوران قائم کردہ پڑھنے لکھنے کی ٹیکنالوجی سولہویں صدی میں معدوم نہیں ہوگئی تھی۔ چھاپہ خانوں کے قیام نے پرنٹنگ کو فوری طور پر عام نہیں کر دیا تھا جیسا کہ اوائلی جدید دور میں ادبی یا دیگر تحریریں اور ان کی نشر و اشاعت قلمی شکل ہی میں ہوتی تھی۔ لائبریری کی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ قرونِ وسطیٰ کی کتب نے اوائلی جدید عہد کے قارئین اور مصنفین کو آگے بڑھنے میں مدد دی۔

آکسفورڈ یونیورسٹی کی بودلائن لائبریری کی الماریوں میں سترھویں صدی کے وسط تک مخطوطات اور مطبوعہ کتابیں ایک ساتھ رکھی جاتی تھیں۔ ٹائپ رائٹر کی ایجاد کے انقلاب کے بعد بھی مخطوطات اور مطبوعہ مواد، کبھی ایک ہی فن پارے میں اکٹھے، گردش میں رہے۔ کم از کم قرونِ وسطیٰ

کے ماہرین میں یہ گرما گرم بحث جاری رہی ہے کہ قرونِ وسطیٰ اور نشاۃ ثانیہ کے درمیان ادواری حد کیا تھی۔ ان میں سے چند اسکالر ایسے بھی ہیں جو خط سے ٹائپ کی جانب ترقی کو ان دو ادوار کے مابین حد ہونے یا نہ ہونے کے بارے غور کر رہے ہیں۔

ادبی تاریخ کے بدلتے ہوئے ماڈلوں کے بارے میں تفتیش کیلئے علوم مخطوطات یوں مددگار ثابت ہو سکتے ہیں کہ وہ اس ادواری حد کے دونوں جانب قلمی ثقافت کے تواتر کے نقوش مرتب کر سکتے ہیں کہ قلمی کتابیں اور خطی متون کی اشاعت کس طرح ہوتی، قلمی نسخوں کو قارئین کیسے دیکھتے تھے اور تصنیف کے عمل میں اشتراک کا کیا کردار ہوتا تھا۔ قرونِ وسطیٰ کی قلمی ثقافت کے مطالعہ کے بعد کے ادوار کی اسکالرشپ بشمول مطبوعہ کتاب کے مطالعات مرتب ہونے والے ممکنہ تغیرات کے بارے میں نظریہ سازی میں مزید کام کیا جا سکتا ہے۔ الیسٹر منیس کی اثر انگیز کتاب Medival Theory of Authorship جس کی اہمیت قرونِ وسطیٰ کے مطالعات میں عرصہ دراز سے مسلم ہے اس مضمون کے علاوہ ان سب کو بھی پڑھنا چاہیے جو اوائلی قلمی ثقافت کے ادب کی نظریہ سازی پر پڑنے والے اثرات کی تحقیق میں دلچسپی رکھتے ہیں۔

حال میں ہونے والے قرون وسطیٰ کے مخطوطات کے مطالعات کا خود کو ''new philology'' یا ''new codicology'' کہنے سے قدیم اور جدید کے جانے پہچانے تعامل کی نشاندہی ہوتی ہے: جدیدیت کی جانب گاہے بگاہے آنے والے اشارے اس میدانِ علم کے اپنے بنیادی مقصد کی طرف لوٹنے کے مستقل مطالبے کا جواز ہیں۔ اسی طرح دوسرے میدانِ علم کے لوگوں سے گفت وشنید احیاءِ شوق کا کام دیتی ہے لیکن میرے لیے قرونِ وسطیٰ کے مخطوطات کے مطالعات ''کتاب'' کی نوعیت کے کسی بھی جائزے کیلئے بنیادی حیثیت کے حامل ہیں، جیسا کہ بیسویں صدی میں متنیت کے بارے میں قرون وسطیٰ کی قلبی حیثیت ہے۔

اسی طرح کا دعویٰ کتاب کی تاریخ کے بارے میں بھی کیا جا سکتا ہے، یہاں یہ کہنا مقصود نہیں کہ کتاب کے اولین مورخوں نے قرونِ وسطیٰ سے تحریک وہبی حاصل کی تھی (بلکہ معاملہ اس کے برعکس تھا) بلکہ مقصد یہ ہے کہ قلمی ثقافت کے اٹھائے گئے سوال: مصنف کیا ہوتا ہے؟ کیا اس کلاس میں کوئی متن ہے؟ مادی متن کی مابعد از ساخت شکنی کی تھیوریوں کی جڑ ہیں۔ قرونِ وسطیٰ کے ماہرین کو ہمیشہ سے علم تھا کہ تحریر کی مادی حقیقتیں اس کے معنی تخلیق کرتی ہیں۔ اگر ایک تحریر کے کئی مختلف متون موجود ہیں جن میں سے کسی مصنف کا اجازت نامہ شامل نہ ہو تو پھر یہ عیاں ہے کہ ہر مخطوطہ کی شکل قارئین کے لیے معنی کا تعین کرتی ہے۔

قرونِ وسطیٰ کے ماہرین کھل کر ضمنی طور سے کئی دہائیوں سے یہ دعویٰ کر رہے ہیں کہ ان

کا کام دوسرے مضامین کے ماہرین کیلئے سود مند ہونا چاہیے۔ میں بلند بانگی کی معذرت کے ساتھ اس آواز میں اپنی آواز ملاو?ں گی۔ گو یہ میدانِ علم شاید صرف مخصوص منہاجیات فراہم کرتا ہے۔ قرونِ وسطیٰ کے مخطوطہ کا مطالعہ کتاب کی ایسی تھیوری بھی فراہم کرتا ہے جو طباعت کے عہد میں بھی دیر تک صائب رہی ہے۔ مخطوطات کے مطالعہ اور کتاب کی تاریخ دونوں پر یہ الزام ہے کہ ان کی تیاری میں تسلی بخش حد تک تھیوری سازی نہیں کی گئی۔

ماضی کی ادبی ثقافتوں کی نسبت قرونِ وسطیٰ کے متون کی مادی اشکال ہمارے لیے زیادہ وضاحت کرسکتی ہیں: مخطوطات ادب کی جانب ہمارے نظریوں کے بارے میں بھی معلومات فراہم کر سکتے ہیں۔ علمی ثقافت کی تغیر پذیریت ان ماہرین کی توجہ کی طالب ہے جو قرونِ وسطیٰ کے متون کا مطالعہ کرتے ہیں۔ اثرات کی بجائے ہمیں فی الحقیقت اس دور کے مخطوطات کو دیکھنا چاہیے نہ کہ انہیں ایک ذریعہ تعلیم سمجھنا چاہیے۔ ہم ان کی موضوعاتی حیثیت کو کبھی نظر انداز نہیں کر سکتے۔

کتاب کی جدید تاریخ پر تنقید کرنے والے بھی ہیں۔ جان سدر لینڈ نے مکینزی کی طباعت کی تاریخ کی ذیلی حقیقتوں کی مشکل تحقیق کی بابت سوال اٹھایا کہ کہیں یہ کاوش بے سود تو نہیں رہی۔ ابھی کچھ عرصہ قبل ڈیوڈ سکاٹ کستان (جو خود اس میدانِ علم میں کارفرما ہیں) نے مخطوطات کے مطالعہ اور ان کے باہمی رشتوں کے مطالعہ Codicology کے جمع کردہ رائی کے پہاڑوں کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے اس مضمون کو طنزیہ انداز میں ''The New Boredom'' قرار دیا۔ اسی طرح سیٹھ لیریر نے کتاب کی تاریخ میں نیم خوابی طاری ہونے کے خدشہ کا اظہار کیا ہے۔ آکسفورڈ انگلش ڈکشنری میں کوڈیکس (قدیم مخطوطہ کی کتاب کی شکل میں پیشکش) کے لفظ کو ''codger'' (ایک بوڑھا شخص) کے فوراً پہلے رکھے جانا عجیب طور پر معنی خیز ہوسکتا ہے۔ لیکن سکاٹ کستان کا ''مادیت'' کی تھیوری کے بعد ادبی مطالعات کو مطمعِ نظر بتانا دراصل یہ تجویز کرنے کے مترادف ہے کہ پرانے آفاق سے نئے افق کیسے استنباط کئے جا سکتے ہیں۔

میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ تاریخِ کتاب کے بارے میں مجرد اور نظریاتی سوچ کیلئے ماقبل از جدید ہیئتوں کا باریک بینی سے جائزہ لینا مفید ہوسکتا ہے۔ قرونِ وسطیٰ کی کتاب مصنفیت کی نوعیت، قارئین کو دستیاب تشریحی امکانات اور متون کے رتبہ کی بابت وسیع تر نظریاتی سوال اٹھانے کی جاہ بھی ہو سکتے ہیں جن میں مابعد از جدیدیت کے سوال بھی شامل کئے جا سکتے ہیں۔ مخطوطات کے بارے عمومی رائے زنی کرنے کے مسائل تاریخی بازیابی کی سخت گیر منہاج کی متقاضی ہے جو بادی النظر میں اس میدانِ علم کے وسیع تر سوال اٹھانے کی قابلیت میں رکاوٹ دکھائی دیتی ہے۔ لیکن مخطوطہ کے ٹھوس حقائق کی موجودگی میں عمومی تصفیے کرنے کی مشکل کا یہ تقاضا بھی ہے کہ ایسے

نظریاتی موقف وضع کئے جائیں جو اس مشکل کا جواز بتا سکیں۔

مادی متن کی جدید تھیوریوں کے بارے میں سوال اٹھانے، تمثیل پیش کرنے اور انکشاف کرنے کی قرونِ وسطیٰ کے مخطوطات کی قابلیت اسی بنا پر ہے کہ وہ ان سب سے زمانی طور پر بعید ہیں۔ علمی ثقافت کی طباعت کی ثقافت سے علیحدگی اور اس کی مخصوص طبعی اشکال وہ چیزیں ہیں جو ان کی نظریاتی اساس کو فوکس میں لاتی ہیں۔ ٹھوس کے مجرد کی نشاندہی کا امکان وسیع تر تاریخِ کتاب کے مضمون میں دلچسپی کی بنیاد ہے۔ اور منفرد کی نظریاتی قوت کا واضح ترین اظہار مخطوطاتی مطالعہ کی منہاجیات سے ہوتا ہے۔ قرونِ وسطیٰ کی کتاب کی تاریخ ہمیں سارے ادب کی تاریخیت کی یاد دلاتی ہے اور کہ ہر ادب پارہ چاہے وہ کل ہی کیوں نہ لکھا گیا ہو، اپنے مادیت کے ماضی سے معنی تشکیل کرتا ہے۔

کتابوں کے بارے میں ایک کتاب

ڈاکٹر محمد علی صدیقی

ترجمہ و تلخیص: رضی الدین رضی

اٹلی کے معروف فلسفی اطالوی جمہوریت کے معمار بینڈیٹو کروس (Bendetto Croce) نے کتابوں کے انسانی زندگی پر مرتب ہونے والے اثرات کے بارے میں ایک خوبصورت جملہ تحریر کیا ہے۔اس کے بقول:

''کتابیں انسان کا ذہن تبدیل کرتی ہیں اور میں خود صرف ان کتابوں کے اثرات کا مجموعہ ہوں، جو میں نے اب تک پڑھی ہیں۔''

بہت سے دوسرے مصنفین نے بھی کتابوں اور انسانی کردار پر ان کے اثرات کے بارے میں بہت کچھ کہا ہے۔ایک فرانسیسی مفکر نے تو کتابوں کے حوالے سے بہت دلچسپ باتیں کہی ہیں۔

''آپ مجھے یہ بتا دیں کہ کون کس قسم کی کتابیں پڑھتا ہے اور میں آپ کو بتا دوں گا کہ وہ کس قسم کا انسان ہے۔''

اس میں کوئی شک نہیں کہ کتابیں ہمیں اچھی سوچیں دیتی ہیں۔لیکن یہ سوال بے سود ہے کہ یہ اچھی سوچیں ہمارے روزمرہ معمولات پر اثر انداز کیوں نہیں ہوتیں۔سیدھی سی بات ہے کہ ہمارا شمار دنیا کی ناخواندہ ترین اقوام میں ہوتا ہے۔ بلکہ ہم تو پرائمری تعلیم کے بنیادی ہدف سے بھی بہت پیچھے ہیں۔ایک مرتبہ پھر میں کروس کا ذکر کرتا ہوں جس نے اپنی خودنوشت میں ایک اور خوبصورت بات کہی ہے۔اس خودنوشت کا راقم الحروف نے ۱۹۷۹ء میں ترجمہ کیا تھا اور اس کتاب کو پاکستان رائٹر گلڈ نے ترجمہ نگاری کے حوالے سے سال کی بہترین کتب قرار دیا تھا۔کروس نے ایک طویل عرصہ تک اپنی ذاتی زندگی کے تجربات کو قلمبند کرنے سے گریز کیا۔اس کا کہنا تھا کہ اسے یہ مسئلہ درپیش ہے کہ خودنوشت کیسے تحریر کی جائے۔ بالآخر اس نے ایک طریقہ تلاش کر ہی لیا۔اس

نے ان کتابوں کی فہرست تیار کی جن کا اس نے مطالعہ کیا تھا اور پھر ان کتابوں سے اس نے جو اثرات قبول کیے انہیں بھی قلمبند کر دیا۔ یہی اس کی خودنوشت تھی اور وہ اپنے بارے میں اتنا ہی بتانا چاہتا تھا۔ خودنوشت تحریر کرنے کا یہ کتنا خوبصورت اور منفرد انداز تھا۔

اگرچہ بعض ایسی کتابیں میری نظر سے گزر چکی ہیں جن کے مطالعے سے محسوس ہوتا ہے کہ مصنف نے دوسری کتابوں کے اثرات قبول کیے ہیں لیکن میں ایک ایسی کتاب کی تلاش میں تھا جو کروس کے سٹائل میں لکھی گئی ہو اور جس میں کتابوں کی مدد سے خودنوشت تحریر کی گئی ہو۔ بالآخر مجھے عبدالمجید قریشی کی کتاب ''کتابیں ہیں چمن اپنا'' پڑھنے کو ملی۔ اگرچہ اس کتاب میں یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ مصنف نے کروس کی طرح خودنوشت تحریر کی ہو یعنی کتابوں کی فہرست دے کر اپنی شخصیت پر ان کتابوں کے اثرات کا حوالہ دیا ہو۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ کتابوں کی ترویج کے حوالے سے ایک اچھی کتاب ہے۔

میرے خیال میں اس کتاب میں شامل مضامین عبدالمجید قریشی نے مختلف جرائد کے لیے تحریر کیے تھے۔ عبدالمجید قریشی نے کتاب کا آغاز کتابوں کی اہمیت کے بارے میں ایک باب سے کیا ہے۔ اس باب میں انہوں نے بہت سی سرکاری اور نجی لائبریریوں اور کتابوں سے محبت کرنے والی شخصیات کا ذکر کیا ہے۔ جن میں مولانا حبیب الرحمٰن خان شیروانی، مولانا حسرت موہانی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا غلام رسول مہر، مولانا حکیم محمد عبداللہ، مولانا شبلی نعمانی، سید علی بلگرامی، امدادالملک بلگرامی، مولانا چراغ علی، محسن الملک، میر ناصر علی مہدی افادی، ڈپٹی نذیر احمد دہلوی، مرزا فرحت اللہ بیگ، داغ دہلوی اور بہت سی دوسری شخصیات شامل ہیں۔ انہوں نے مسعود احمد برکاتی کے سفرنامے ''دو مسافر دو ملک'' کا بھی حوالہ دیا ہے جس میں مسعود برکاتی نے ''کتابوں کے بارے میں ایک کتاب'' کا ذکر کیا ہے۔ اسی عنوان اور لائبریریوں کے بارے میں بعض کتابوں نے عبدالمجید قریشی کو کتابوں کے بارے میں ایک کتاب لکھنے کی تحریک دی اور اب ہمارے سامنے ایک ایسی کتاب ہے جس میں دلچسپی کی بہت سی چیزیں ہیں اور جسے اردو میں اپنی نوعیت کی پہلی کتاب کہا جا سکتا ہے۔

زیرِ نظر کتاب میں بہت سی اہم کتابوں کا تذکرہ ہے۔ مثال کے طور پر اس کتاب نے مجھے صدق جائسی کی کتاب: ''دربارِ دُربار'' کے بارے میں متجسس کیا ہے جس میں شہزادہ معظم جاہ کے دربار کا احوال بیان کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اس کتاب میں فانی بدایونی کی زندگی کے ایسے گوشے بھی بےنقاب ہوئے ہیں جو کسی اور کتاب میں درج نہیں۔ حیدرآباد کے شہزادے کے دربار کی منظر کشی کے دوران اس درجہ حقیقت نگاری کا مظاہرہ کیا گیا ہے کہ بعض واقعات کا مطالعہ کرتے

ہوئے قاری پلک جھپکنا بھی بھول جاتا ہے۔ یہ اس دور کا احوال ہے جب یہ خیال کیا جارہا تھا کہ جاگیرداری نظام ختم ہو رہا ہے۔

آزادی کے بعد آج ہم جس معاشرے میں سانس لے رہے ہیں شاید یہ جاگیرداری نظام کا آخری دور ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہاں ایسے جاگیردار بھی موجود ہیں جو ۵۰،۵۰ ہزار ایکڑ اراضی کے مالک ہیں وہ اپنے ووٹوں کے بل بوتے پر اسمبلیوں میں موجود ہیں۔ بیوروکریسی اور صنعتی شعبے میں بھی ان کا عمل دخل ہے۔ یہ جاگیردار ملکی ترقی کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرتے ہیں اور بعض علماء کو خرید کر ذاتی جاگیروں کے حق میں فتویٰ بھی لیتے ہیں۔

فاضل مصنف نے اس کتاب کے ذریعے ہماری معلومات میں اضافہ کیا ہے۔ کتاب کے بارہ (۱۲) ابواب ہیں اور تحریک پاکستان کے حوالے سے تحریر کیا جانے والا باب خاص طور پر بہت دلچسپ ہے۔ اگرچہ اس باب میں زیادہ تفصیل بیان نہیں کی گئی اور اس حوالے سے اردو اور انگریزی کی بہت سی اہم کتابوں کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ لیکن پھر بھی یہ ایک اچھی کاوش ہے۔ اچھا کام وہی ہوتا ہے جس سے مزید بہتر کام کی تحریک ملے۔ کتاب کا ایک باب علم گڑھ کے بارے میں ہے۔ اس کتاب میں ان کتابوں کا بھی ذکر ہے جنہیں برصغیر کے رہنماؤں خاص طور پر مسلمان رہنماؤں نے اسیری کے دوران تحریر کیا۔ اس میں بہادر شاہ ظفر سے لے کر اس دور کی تمام اہم شخصیات حوالہ موجود ہے۔ اس ایک کتاب کے مطالعہ کے بعد قاری اور بہت سی کتابوں سے متعارف ہو جاتا ہے اور یہی اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ میری خواہش ہے کہ اس قسم کی کتابیں شائع ہوتی رہنی چاہییں کیوں کہ اب ہمیں ایسی کتابوں کی ضرورت ہے جن سے کتب بینی کو فروغ حاصل ہو۔

کتاب چوری کا مسئلہ

منور راجپوت

نہ جانے سعود عثمانی نے کیا دیکھ کر کہا تھا:

کاغذ کی یہ مہک، یہ نشہ روٹھنے کو ہے
یہ آخری صدی ہے، کتابوں سے عشق کی

مگر آپ کو بتاتے چلیں کہ گزشتہ ماہ کراچی میں ہونے والے کتاب میلے میں پانچ لاکھ افراد نے شرکت کی اور خریداروں میں بڑی تعداد نوجوانوں اور بچّوں کی تھی، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تمام تر خامیوں کے باوجود، موجودہ نسل کا کتاب سے رشتہ برقرار ہے، تو نئی نسل بھی ہاتھوں میں کتاب لیے آگے بڑھ رہی ہے۔ تاہم اس کتاب دوستی کو ایک نئے مسئلے کا سامنا ہے اور ہمارا موضوع وہی ہے۔

''انجمن ناشران وتاجرانِ دینی کتب، پنجاب'' اِن دنوں پی ڈی ایف (Portable Document Format) کتابوں کے خلاف مہم چلا رہی ہے، جس کی دیگر پبلشرز تنظیمیں بھی حمایت کررہی ہیں۔ اس ضمن میں تنظیم کے صدر، ناصر مقبول کا کہنا ہے کہ ''بعض اداروں اور افراد کی جانب سے نئی اور پرانی کُتب پی ڈی ایف کی صورت میں فیس بُک پیجز اور ویب سائٹس پر اَپ لوڈ کی جا رہی ہیں، جنھیں وہاں سے مفت ڈاؤن لوڈ کر کے پڑھا جا سکتا ہے۔ یہ صورتِ حال پبلشرز، خاص طور پر تحقیق وترجمہ کرنے والوں کے لیے نقصان کا باعث ہے، کیوں کہ جب مفت کتاب مل رہی ہو، تو خرید کر کون پڑھے گا؟'' بلاشبہ یہ ایک فکر انگیز معاملہ ہے اور چوں کہ اس کا تعلق علم سے ہے، تو اس کی سنگینی اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ سو، ہم نے پبلشرز، اُن کے نمایندوں، پی ڈی ایف کتابوں کے کام سے منسلک افراد اور دیگر شائقینِ مطالعہ سے گفتگو کی، تاکہ اس معاملے کے اہم پہلو قارئین کے سامنے آسکیں۔ اس صورتِ حال میں پبلشرز مایوس ہو کر نئی کتابیں چھاپنا بند کر دیں گے، جو مُلک وقوم کے لیے کوئی اچھا اقدام نہیں ہوگا۔

اشاعتی ادارے ''بُک کارنر'' کے سی ای او، گگن شاہد کا اس حوالے سے کہنا تھا کہ

"پی ڈی ایف کُتب کی اِس قدر فراوانی سے صرف پبلشرز ہی نہیں، مصنّفین کو بھی نقصان پہنچتا ہے کہ اُن کا رائلٹی سسٹم متاثر ہو رہا ہے، کیوں کہ پی ڈی ایف مواد موبائل فون، ٹیبلٹ اور کمپیوٹر پر با آسانی پڑھا جا سکتا ہے۔ کتاب بہت محنت سے شایع کی جاتی ہے، مصنّف خود کو کھپا دیتا ہے، تو پبلشر بھی بھاری سرمایہ کاری کرتا ہے، مگر وہ کتاب پی ڈی ایف کی شکل میں آجائے، تو ساری محنت اور سرمایہ کاری رائیگاں چلی جائے گی، کسی کی محنت کو یوں استعمال کرنا جرم ہے۔ ہمارے ہاں کاپی رائٹ کے نام سے ایک قانون موجود ہے، مگر اُس پر عمل درآمد کم ہی ہوتے دیکھا گیا ہے، جب کہ یورپ میں اس حوالے سے کافی سختی کی جاتی ہے۔ وہاں کُتب پر پبلشر نوٹ میں لکھا ہوتا ہے کہ "اِس کتاب کو الیکٹرانک، میکینیکل، فوٹو اسٹیٹ یا کسی اور صورت میں شایع نہیں کیا جا سکتا"، یعنی اُسے کتاب کے علاوہ کسی اور میڈیم میں استعمال نہیں کیا جا سکتا۔"

پاکستان پبلشرز اینڈ بُک سیلرز ایسوسی ایشن کے چیئرمین، عزیز خالد کا اس ضمن میں کہنا ہے کہ "کتابوں کی پی ڈی ایف کاپیوں کا سلسلہ اب بہت زیادہ بڑھ گیا ہے اور اس کے انڈسٹری پر انتہائی منفی اثرات مرتّب ہو رہے ہیں۔ کہنے کو قوانین تو موجود ہیں، مگر یہاں تو لوگ کتابوں تک کے جعلی ایڈیشن چھاپ دیتے ہیں اور کچھ نہیں ہوتا۔ بعض اداروں نے انفرادی طور پر اس کے خلاف بھاگ دوڑ کی تھی، جیسے آکسفورڈ یونی ورسٹی پریس یا پیراماؤنٹ، مگر لوگ دو نمبری سے پھر بھی باز نہیں آتے۔"

"ایمل پبلی کیشنز، اسلام آباد" کے ڈائریکٹر شاہد اعوان نے کہا کہ "ہمارے ہاں ایک تو پہلے ہی کتابیں ہزار، پانچ سو کی تعداد میں چھپتی ہیں اور اگر اُنھیں بھی پی ڈی ایف کی صُورت میں عام کر دیا جائے، تو پھر کتابیں کون اور کیوں خریدے گا۔ گو، ہمارا قانون پبلشرز کو سپورٹ کرتا ہے، مگر دیگر قوانین کی طرح اس پر عمل درآمد نہیں کیا جاتا، اس لیے بعض افراد اس کا ناجائز طور پر فائدہ اُٹھا رہے ہیں۔ دیکھیے، اگر کوئی پبلشر ایک ہزار کتابیں چھاپتا ہے، تو اُس کی خواہش ہوتی ہے کہ اُس کا خرچہ نکل آئے۔ نیز، اُسے اور مصنّف کو چار پیسے بھی بچ جائیں۔ اب اگر کوئی اُس کتاب کو پی ڈی ایف میں ڈھال دے، تو کاروباری مفادات تو متاثر ہوں گے۔ اس صورتِ حال میں پبلشرز مایوس ہو کر نئی کتابیں چھاپنا بند کر دیں گے، جو مُلک و قوم کے لیے کوئی اچھا اقدام نہیں ہوگا۔ ترقّی یافتہ ممالک میں اب بھی، جہاں تقریباً ہر شخص کی انٹرنیٹ تک رسائی ہے، کتابیں چَھپ رہی ہیں اور بڑی تعداد میں چَھپ رہی ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہاں پرنٹ اور ای بُک کے حوالے سے

قوانین کی پاس داری کی جاتی ہے۔''

فضلی پبلشرز کراچی کے ساجد فضلی اس ضمن میں کہتے ہیں ''پہلی بات تو یہ ہے کہ ای بُک یا پی ڈی ایف کا پی پڑھنا کوئی آسان کام نہیں اور بہت کم افراد کو یہ سہولت حاصل ہے کہ وہ کتاب کا پرنٹ لے کر اُس کی جِلد وغیرہ بنوا سکیں۔ دراصل، پی ڈی ایف ایڈیشنز کا مسئلہ زیادہ تر مذہبی کتب کے ساتھ ہو رہا ہے اور اُن کی دھڑا دھڑ پی ڈی ایف کاپیاں بن رہی ہیں، شاید لوگ ایسا ثواب سمجھ کر کرتے ہوں، لیکن اس سے پبلشرز کو بہرحال نقصان ہوتا ہے۔''

بچّوں کے معروف ادیب، ابنِ آس محمّد بھی اس صُورتِ حال پر دِل گرفتہ ہیں۔ اُن کے مطابق

''یہ سب کچھ علم وادب کی خدمت کے نام پر ہو رہا ہے، مگر دراصل اس کے پیچھے بھی مالی مفادات ہی کارفرما ہیں۔ بعض شاطر افراد مختلف کُتب کی پی ڈی ایف فائلز اس لیے اپنی ویب سائٹس یا فیس بُک پیجز پر اَپ لوڈ کرتے ہیں تاکہ اس کے ذریعے اُنھیں زیادہ سے زیادہ کلکس یا وزیٹرز ملیں، جو ای۔بزنس کی ایک شکل ہے۔'' اُن کا مزید کہنا تھا کہ ''اگر بالفرض یہ سب کچھ اچھے جذبات کے تحت ہو رہا ہو، تب بھی کسی کی محنت کو یوں چُرانا درست نہیں۔ جب آپ کسی ادیب کی کتاب فیس بُک یا ویب سائٹ پر ڈال دیں گے، تو لوگ کتاب نہیں خریدیں گے، جس کا زیادہ نقصان مصنّف ہی کو ہوتا ہے کہ اُس کا حق مارا جاتا ہے۔ اس صُورت میں کتاب کم بِکنے کی وجہ سے پبلشر اُسے رائلٹی دینے پر تیار نہیں ہوتا۔''

مفت کے مقابلے میں کتاب کتنی ہی قیمت میں کیوں نہ ملے، مہنگی ہی لگے گی۔ مسئلہ یہ ہے کہ مہنگی اور سستی کی تعریف کون کرے گا؟

مسعود احمد ایک ایسے فیس بُک پیج اور ویب سائٹ کے ایڈمن ہیں، جس پر مختلف کُتب پی ڈی ایف کی شکل میں اَپ لوڈ کی جاتی ہیں۔ ہمارے سوال پر اُن کا کہنا تھا کہ ''دیکھیں جی! ہم ایسی کُتب ہی عوام کے لیے پیش کرتے ہیں، جو برسوں قبل شایع ہوئیں اور اب نایاب ہیں۔ پھر یہ کہ اُن پر حقوقِ ملکیت کا قانون بھی لاگو نہیں ہوتا کہ اُن کی اشاعت کو دہائیاں گزر چُکی ہیں اور مصنّفین کے ورثا کا بھی کچھ اَتا پتا نہیں۔'' ''آپ یہ کام کیوں کر رہے ہیں؟'' اس سوال پر اُن کا کہنا تھا کہ ''ہمارا مقصد پُرانی کُتب کو محفوظ کرنا ہے تاکہ محقّقین اُن سے استفادہ کر سکیں۔ ہم یہ سہولت مفت فراہم کر رہے ہیں، جب کہ کئی پبلشر پُرانی کتابوں کا عکس لے کر یا نئی کمپوزنگ کروا کر دوبارہ شایع کروا رہے ہیں، مگر اُن کی قیمت بہت زیادہ ہوتی ہے، تو کئی بار جدید اشاعت کے چکر میں

کتاب میں بہت سی تبدیلیاں بھی کر دی جاتی ہیں، جو خیانت کے ساتھ، محقّقین کے لیے بھی مشکلات کا سبب بنتی ہیں۔'' عبدالمالک بھی یہی کچھ کرتے ہیں، مگراُن کی ویب سائٹ اور فیس بُک پیج پر بہت سی ایسی کُتب بھی دیکھی جاسکتی ہیں، جو اشاعت کے چند ماہ بعد ہی اُن کی ویب سائٹ کی زینت بنیں۔ ہم نے پوچھا ''کیا یہ اخلاقی اور قانونی طور پر درست ہے؟'' تاہم اُنھوں نے اس سوال کا براہِ راست جواب دینے کی بجائے کتابوں کی قیمتوں کو اس کا ذمّے دار ٹھہرایا۔

اس پورے معاملے میں کتابوں کی قیمتوں کا ایشو نہایت اہم ہے کہ ہم نے جس سے بھی بات کی، اُس نے بڑھتی ہوئی قیمتوں کا ضرور ذکر کیا اور اسے پی ڈی ایف کاپیوں کے فروغ کا بڑا سبب قرار دیا۔ محمد عُمر فاروق مطالعے کے رسیا ہیں اور ہر ماہ اپنی آمدنی کا ایک حصّہ کتابوں کی خریداری پر صَرف کرتے ہیں، مگر اب وہ بھی انٹرنیٹ ہی پر مطالعے کو ترجیح دے رہے ہیں۔ اس حوالے سے اُن کا کہنا ہے کہ ''کتابوں کی قیمتوں کو تو پر لگ گئے ہیں، ایسے میں کون دو، دو ہزار روپے کی کتابیں خریدے؟ جب کہ ویب سائٹس پر سب کچھ مفت مل جاتا ہے۔ یہ بات درست ہے کہ ای بُک پڑھنے میں مشکل ہوتی ہے، لیکن کتب کی قیمتوں پر بھی کچھ کنٹرول ہونا چاہیے۔ تاہم مَیں سمجھتا ہوں کہ چھوٹی کُتب و رسائل کو تو پی ڈی ایف کی صورت دینے میں حرج نہیں، مگر بڑی کتابوں کے ساتھ یہ سلوک نہیں کیا جانا چاہیے، خاص طور پر تحقیقی کتب کے ساتھ تو بالکل بھی نہیں۔''

اس حوالے سے شاہد اعوان کا کہنا تھا کہ ''مفت کے مقابلے میں کتاب کتنی ہی قیمت میں کیوں نہ ملے، مہنگی ہی لگے گی۔ مسئلہ یہ ہے کہ مہنگی اور سستی کی تعریف کون کرے گا؟ آپ کہہ رہے ہیں کہ کتاب مہنگی ہے، ہم کہتے ہیں، سستی ہے۔ ہم اپنی ضرورت کی چیزیں خریدتے ہوئے گھڑی بھر نہیں سوچتے، چاہے کتنی ہی مہنگی کیوں نہ ہوں، آخر کتاب ہی کے بارے میں یہ بات کیوں کی جاتی ہے کہ مہنگی ہے!! پھر یہ کتاب مہنگی ہونے کا واویلا دراصل کتاب پر لکھی قیمت کی بنیاد پر کیا جاتا ہے، حالاں کہ بیش تر کُتب چالیس سے پچاس فی صد رعایت پر بھی مل جاتی ہیں۔''

عزیز خالد اس معاملے کو ایک اور رُخ سے دیکھتے ہیں۔ اُن کا کہنا تھا کہ

> ''واقعی کتابوں کی قیمتیں بڑھ رہی ہیں، مگر اس کے ذمّے دار پبلشرز نہیں، بلکہ پیپر مینوفیکچررز ہیں۔ پاکستان میں پانچ، چھے پیپر مینوفیکچررز ہیں اور وہی کاغذ کی قیمت کا تعیّن کرتے ہیں۔ نہ صرف ادبی بلکہ تعلیمی کتابوں کی قیمتیں بھی بڑھ رہی ہیں، اس سال اپریل میں دیکھ لیجیے گا کہ درسی کُتب کی قیمتیں کہاں جاتی ہیں، کیوں کہ ان پیپر مینوفیکچررز نے کاغذ کے نرخوں میں مَن مانا اضافہ کردیا ہے۔ پھر یہ کہ پبلشرز امپورٹڈ کاغذ بھی استعمال نہیں کرسکتے کہ اس پر بھی ڈیوٹی بڑھا دی گئی ہے اور مقامی

کاغذ غیر معیاری ہے، یہی وجہ ہے کہ اب ہماری کتابیں خُوب صورت نہیں رہیں۔
ہم یہ نہیں کہتے کہ حکومت کاغذ سے ڈیوٹی یک سَر ختم کر دے، لیکن اس میں کمی تو کی
جا سکتی ہے، پھر کوئی ایسا نظام بھی وضع کیا جانا چاہیے کہ ٹیکس پیڈ پبلشرز کو بھی کاغذ
درآمد کرنے کی اجازت مل جائے، اس سے کتابوں کی قیمتوں میں کمی ہوگی اور پی
ڈی ایف سمیت کتاب دشمن اقدامات کی بھی حوصلہ شکنی ہوگی۔''

پی ڈی ایف کُتب کی اِس قدر فراوانی سے صرف پبلشرز ہی نہیں، مصنّفین کو بھی نقصان پہنچتا ہے۔ اس ضمن میں ایک رائے یہ بھی سامنے آئی کہ ترقّی یافتہ ممالک میں پبلشرز اپنی کتاب کی ای-کاپی بھی جاری کرتے ہیں، جو کہ مختلف سائٹس پر قیمتاً پڑھی جا سکتی ہیں اور اسے کاپی، پیسٹ کیا یا کسی کو بھیجا نہیں جا سکتا، جیسا کہ ریہام خان نے کیا تھا، تو پاکستانی پبلشرز کو بھی پی ڈی ایف بُکس سے خوف زَدہ ہونے کی بجائے خود یہ سلسلہ شروع کر دینا چاہیے۔ نیز، آن لائن ایڈیشن کی قیمت اتنی کم ہو کہ مفت پڑھنے کی حوصلہ شکنی ہو سکے۔

انجمن ترقّیٔ اُردو، پاکستان کی معتمد، ڈاکٹر فاطمہ حسن بھی اس تجویز کی حامی ہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ ''علم کی اشاعت میں ای-بُکس کا کردار نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی بہ دولت ہی ہم دیگر مُمالک کے ادب سے روشناس ہو رہے ہیں کہ دُور دُور سے کتابیں منگوا کر پڑھنا ہر ایک کے بس میں نہیں۔ البتہ، یہ ضرور ہے کہ ای-بُکس کا کام قانون کے دائرے ہی میں رہ کر کیا جانا چاہیے اور ناشر و مصنّف کے حقوق کا تحفّظ بھی لازم ہے۔ یہ سُن کر افسوس ہوتا ہے کہ کئی لوگ ان باتوں کا خیال نہیں رکھ رہے اور یہ کوئی اچھی بات نہیں۔''

اس تجویز پر ساجد فضلی نے کہا ''سرِ دست تو یہ ممکن نہیں کہ ہم دیگر ممالک کی طرح ای بُک ایڈیشن بھی جاری کر سکیں، جسے قیمتاً پڑھا جا سکتا ہو، کیوں کی کئی تیکنیکی مسائل موجود ہیں، البتہ مَیں سمجھتا ہوں کہ پبلشرز کو اپنی نئی آنے والی کتاب کی خود پی ڈی ایف بنا کر قارئین کے لیے شیئر کر دینی چاہیے، جس میں کتاب کا ٹائٹل، ابتدائی صفحات، اہلِ علم کی آرا اور کچھ اقتباسات شامل ہوں، گویا بیس پچیس صفحات پر مشتمل ایک تعارف جاری کر دیا جائے۔''

ایمل پبلشرز، اسلام آباد کے شاہد اعوان نے کہا کہ

''پہلی بات تو یہ ہے کہ ہمیں ای-بُکس اور پی ڈی ایف کاپی میں فرق سامنے رکھنا
چاہیے۔ پی ڈی ایف کاپی، کتاب کے اسکین شدہ صفحات کا نام ہے، جب کہ ای-
بُکس کے لیے پورا طریقۂ کار وضع کرنا پڑتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ اُردو کتابوں کا
الیکٹرانک ورژن پڑھنے والوں کی تعداد ابھی خاصی کم ہے، پھر اُردو سافٹ وئیر بھی

اتنی سپورٹ نہیں کرتے کہ ترقّی یافتہ ممالک کے معیار کی ای-بُکس تیار کی جا سکیں۔ نیز، ای-بُکس سے پبلشر کو آمدنی ہوتی ہے اور پی ڈی ایف کاپی اُن کی محنت پر ڈاکا ہے۔''

گگن شاہد کا کہنا تھا کہ

''ترقّی یافتہ دنیا میں ای-بُک سسٹم موجود ہے، خواہ وہ اینڈرائیڈ ایپلی کیشن کی شکل میں ہو یا kindle کی طرح کچھ اور۔ پبلشر کسی ادارے کو باقاعدہ لائسنس دیتے ہیں کہ وہ اس کتاب کو انٹرنیٹ پر جاری کر سکتے ہیں اور اس کے بدلے میں اُسے کمیشن ملتا ہے۔ تاہم، ہمارے ہاں اسے متعارف کروانے میں ابھی وقت لگے گا کہ ہم اس کے لیے درکار ٹیکنالوجی میں کافی پیچھے ہیں اور ابھی ہمارے ہاں ای-بُکس کی اتنی طلب بھی نہیں ہے۔''

اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ پی ڈی ایف بُکس کی یلغار کی وجہ سے پبلشرز اور مصنّفین کے حقوق بُری طرح پامال ہو رہے ہیں، اس لیے یہ ضروری ہے کہ پاکستان میں بھی ترقّی یافتہ ممالک کی طرح انٹیلکچوئل پراپرٹی رائٹس کا اطلاق اُس کی اصل رُوح کے مطابق ہونا چاہیے۔ تاہم، اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ ہمارے ہاں بھی آن لائن مطالعے کا رجحان مسلسل فروغ پا رہا ہے، سو، اگر پبلشرز نے خود آگے بڑھ کر اسے کوئی قانونی شکل نہ دی، تو اس خلا کو پی ڈی ایف بُکس کی شکل میں پُر کرنے کی کوششوں کو روکا جانا ممکن نہیں ہوگا۔

کتابوں کی چوری، کارِ ثواب ہے

شین شوکت

کتابوں کی چوری کارِ ثواب ہے۔ بڑا عجیب سا لگا یہ جملہ جب ہم نے اسے پہلی بار سنا۔ شاید اس لئے کہ ہم کتابوں کے چور نہیں تھے، البتہ سینہ زور ضرور تھے۔ جس کا مظاہرہ ہم نے پشاور صدر کی ارباب روڈ کے پرلے چوک میں قائم اپنے وقت برٹش کونسل کی نہایت نستعلیق لائبریری میں کیا تھا۔ یوں ہوا کہ میں برٹش کونسل لائبریری سے اپنے نام جاری کی گئی دو کتابیں واپس کرنے کی غرض سے پہنچا۔ جانے کس ٹینشن کا شکار تھے اس لائبریری کے ہیڈ لائبریرین جو مجھ سے کتابیں واپس لینے کی بجائے مجھ شامت کے مارے پر غصہ جھاڑنے لگے۔ ''اب لائے ہو تم یہ کتابیں اتنے دن گزارنے کے بعد''۔ ''جی۔ دیر سویر تو ہوتی رہتی ہے'' میں نے جان کی امان پا کر عرض کی۔ لیکن میرے دھیمے لہجے سے ان کے غضب ناک لہجے پر کوئی اثر نہ ہوا، وہ برابر غصہ کئے جا رہے تھے جس کے جواب میں مجھے بھی ان ہی کے سے انداز میں کہنا پڑا کہ ''دیکھئے صاحب۔ اگر میں یہ کتابیں واپس کرنے نہ آتا تو آپ میرا کیا بگاڑ لیتے''۔ جس کے جواب میں حضرت بے دل مزید بھڑ کر کہنے لگے کہ ''ہم قانونی کارروائی کرتے''۔ اچھا۔ تو کر لیجئے اپنی قانونی کارروائی۔ اتنا کہہ کر میں نے کتابیں اٹھائیں۔ ان کو بغل میں دبایا اور پھر دوسرے ہی لمحے ارباب روڈ پشاور صدر کی سڑک ناپنے لگا۔ اس دوران میں نے دو تین بار مڑ کر دیکھا۔ برٹش کونسل کا خوش پوش ہیڈ لائبریرین اپنے انگریزی سوٹ کے حصار میں بے بس ولاچار کھڑا مجھے یوں گھور رہا تھا جیسے اس کو غصہ نامی بادہ تلخ کو گھونٹ نہ کر سکنے کا انجام مل گیا ہو۔ شاید دل ہی دل میں مجھے بد دعائیں دے رہا تھا وہ۔ شاید کہہ رہا تھا کہ ''جا تو میری طرح سدا ٹینشن کا شکار رہے۔ جا تجھے اللہ لائبریرین بنائے''۔

اس بات کا اندازہ مجھے اس وقت ہوا جب میں پشاور یونیورسٹی سے لائبریری اینڈ انفارمیشن سائنس میں پوسٹ گریجویٹ ڈپلومہ کرنے کے فوراً بعد میونسپل پبلک لائبریری کا ہیڈ انچارج مقرر ہو گیا۔ برٹش کونسل کی وہ کتابیں جو میں نے چوری ہی نہیں سینہ زوری کر کے اڑائی تھیں سالہا سال تک نہ صرف میرے قبضے میں رہیں بلکہ پانی میں مل کے پانی، انجام یہ کہ فانی کے مصداق نشتر میونسپل پبلک لائبریری پشاور کے ذخیرہ کتب میں غلطاں ہو کر رہ گئیں۔ میں اس لائبریری سے جون 2010 میں اپنی عزت و آبرو کی گٹھڑی سنبھال کر ریٹائر ہوا۔ لیکن اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ میں کتابوں کی چوری، یا ان کو چرانے کی غرض سے کی جانے والی سینہ زوری یا کتاب چوروں کی ہیرا

پھیری سے بچ سکا۔ کتابیں چرا کر ثواب کمانے کا نظریہ رکھنے والوں نے مجھ پر بھی پھن پھلائے رکھے اور میں مقدور بھر کوشش کرتا رہا بلدیہ پشاور کے زیر انتظام قائم اس کتب خانہ کو کسی قسم کے نقصان پہنچنے کے اندیشے سے محفوظ رکھنے کی، اور اللہ کے کرم سے میں اس مقصد میں بہت حد تک کامیاب بھی رہا۔ مگر اہالیان پشاور کے اس قیمتی اثاثے کو ایک عمارت سے نکال دوسری اور دوسری کے بعد تیسری عمارت میں منتقل کرنے کے عمل کو نہ روک سکا کہ ایسا کرنا میرے اختیار ہی میں نہ تھا۔ ہم سوچنے لگتے ہیں کہ انتقال در انتقال کے اس عمل میں جانے کس کس نے کتنا کتنا ثواب کمایا ہوگا کتابوں کی چوری کا۔ میں نے آج کے کالم کا آغاز کتابوں کی چوری کار ثواب ہے کے جملہ معترضہ کے حامل فتوے سے کیا۔ Borrow, Buy or Steel, but you must have books. یعنی مستعار لو، خرید و یا چراو، لیکن تمہارے پاس کتاب کا ہونا ضروری ہے جیسے مغرب میں گردش کرتے جملے اس بات کا بین ثبوت ہیں کہ کتابوں سے ٹوٹ کر پیار کرنا اور ان کے ساتھ 'جنگ اور محبت میں سب کچھ جائز ہے' جیسے رویئوں کو اپنانا دانش مندان شرق و غرب کا مرغوب مشغلہ رہا ہے۔

کتاب انسان کی بہترین دوست ہوتی ہے۔ کسی کو کتاب دینے والا بے وقوف ہوتا اور کتاب لیکر واپس کرنے والا اس سے بڑا بیوقوف، گویا برٹش کونسل کے ہیڈ لائبریرین کی بد دعا سے نشتر میونسپل پبلک لائبریری کے ہیڈ بے وقوف کی جاب پر فائز آپ کے اس کالم نویس نے سال 1979ء کے دوران اس کتب خانہ کا چارج سنبھالا تو کتب خانہ میں موجود کتابوں کو ان کی دستیاب فہرست کی گنتی کے مساوی نہ پا کر اس کی تحریری شکایت افسر مجاز کو کی جو اس لائبریری کے ریکارڈ پر موجود ہونی چاہئے۔ چارج سنبھالتے وقت اس کے نوٹس میں یہ بات بھی آئی کہ گورمکھی اور ہندی رسم الخط میں لکھی ہوئی کتابیں بلدیہ پشاور کے محافظ خانہ یا ریکارڈ روم میں نا قابل پرسان حالت میں پڑی ہیں۔ جب ریکارڈ کیپر سے ستلیوں میں بندھی ان کتابوں کے انبار کے بارے میں سوال کیا تو وہ مجھے اتنا کہہ کر چپ ہوگئے کہ ''لے جاو؟، ان کتابوں کو اور رکھ دو اپنی لائبریری میں۔ مجھے یاد پڑتا ہے، پشاور کی ایک ممتاز سماجی اور سیاسی شخصیت اقبال اخونزادہ عرف لالے بالے نے مجھے بتایا تھا کہ کچہری گیٹ پشاور شہر میں پرانی میونسپل کمیٹی کی عمارت کی باقیات میں ایک سٹو پا تھا جس میں لائبریری کی بہت ساری کتابوں کو ڈمپ کرکے دیمک، کاکروچ، جھینگر، سفید مچھلی اور اس قبیل کے بہت سارے کتابی کیڑوں کی دعوت کا اہتمام کر دیا تھا۔ اللہ جانے کہاں گئیں وہ کرم زدہ کتابیں۔ کاش کوئی چرا لے جاتا ان کتابوں کو بھی اور کما لیتا ڈھیروں ثواب اور ہم کہتے رہتے کہ

نہ لٹتا دن تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا
رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو

کتاب خریدنا اور اس کی حفاظت کرنا

اے حمید

جس طرح کتاب خریدنا، اسے سنبھال کر رکھنا ایک فن ہے۔ اسی طرح کتاب پڑھنا بھی ایک فن ہے۔ کہتے ہیں کتاب ایک بہترین بیوی ہے کیوں کہ آپ جب چاہیں وہ خاموش ہو جاتی ہے، بلکہ اسے خاموش کر دیا جاتا ہے۔ آپ بولتی بیوی کا منہ بند نہیں کر سکتے۔ مگر کتاب کا جب اور جہاں چاہیں منہ بند کر سکتے ہیں۔

ہاں ایک قباحت ضرور ہے وہ یہ کہ آپ بیوی کی حفاظت کر سکتے ہیں، خبر گیری کر سکتے ہیں مگر کتاب کی خبر گیری نہیں کر سکتے۔ یہ اس آدمی کے ساتھ بھاگ جاتی ہے جس کو یہ بالکل پسند نہیں کرتی اور اس آدمی کے ساتھ بھی بھاگ جاتی ہے جو اسے پسند کرتا ہے۔

کتاب کو آپ سات تالوں میں بند کر کے رکھیں یہ ایک نہ ایک دن ضرور آپ کو دغا دے جائے گی۔ آپ بڑے شوق سے دیوان غالب کا نادر نسخہ خرید کر لاتے ہیں اس کی جلد پر پھولدار کاغذ چڑھا کر اسے سجا بنا کر اپنے شیلف میں رکھتے ہیں کہ اچانک ایک بدنصیب صبح کو آپ کے کوئی لحاظ ملاحظے والے، رشتہ دار آ جاتے ہیں، یہ وہ رشتہ دار صاحب ہیں جنھوں نے پشاور سے آپ کے لیے مفت چپلی بھیجی تھی۔ آپ ان سے انکار نہیں کر سکتے۔

وہ شیلف میں دیوان غالب لگا ہوا دیکھ کر چھکتے ہیں اور کہتے ہیں: ''بھئی واہ! یہ دیوان غالب ہے۔''

وہ ہاتھ دیوانِ غالب کی طرف بڑھاتے ہیں مگر یہ ہاتھ آپ کو اپنے دل کی طرف بڑھتا محسوس ہوتا ہے۔ وہ شیلف میں دیوان غالب اور آپ کے سینے میں سے آپ کا دل نکال کر ہاتھ میں لے لیتے ہیں اور انگلی پر لب لگا لگا کر اس کی یوں ورق گردانی شروع کرتے ہیں جس طرح پنساری اپنا بہی کھاتہ کھول کر اس کی ورق گردانی کرتا ہے۔ آپ کو دیوان غالب کے ہر صفحے پر اس کی ہر غزل پر ہر شعر کی چیخیں سنائی دیتی ہیں۔ مگر آپ کچھ نہیں کر سکتے کیوں کہ آ کو اس قاتل رشتہ دار نے پشاور سے مفت چپل لا کر دی تھی وہ خوش ہو کر ایک شعر پڑھتا ہے۔ سبحان اللہ! غالب کہتا ہے۔

نکتہ چیں ہے غمِ دل کو سنائے، نہ بنے

اور وہ یہ کہہ کر دیوان غالب اپنی جیب میں رکھ لیتا ہے کہ باقی وہ گھر جا کر آرام سے لیٹ کر پڑھیں گے۔ بعض لوگ لیٹ کر پڑھتے ہیں، بعض کھڑے ہو کر، بعض بیٹھ کر اور بعض چل پھر کر کتابیں پڑھتے ہیں۔ کچھ اصحاب ایسے بھی ہیں جو کھانا کھاتے ہوئے کتاب پڑھنے کے شوقین ہوتے ہیں، ہم ایسے ایک صاحب کو جانتے ہیں۔

ایک دفعہ وہ بازار سے ایم اسلم کا ایک ناول خرید کر لائے اور کھانا لگا کر کتاب پڑھنی شروع کر دی۔ جب آدھی کتاب کتاب پڑھ چکے تو ان پر انکشاف ہوا کہ وہ روٹی کے ساتھ آدھی کتاب کھا چکے ہیں اور سالن ویسے کا ویسا ہی پڑا ہے۔

ہمارے ایک دوست ہیں میں ان کا نام نہیں لوں گا کیوں کہ نام میں کیا رکھا ہے۔ انہیں عادت ہے کہ وہ کتاب لے کر بیٹھ جاتے ہیں۔ پڑھتے جاتے ہیں اور کسی صفحے پر اگر انہیں کو بات پسند نہیں آتی تو وہ صفحہ پھاڑ کر پھینک دیتے ہیں۔ چنانچہ ان کی لائبیریری میں جتنی بھی کتابیں ہیں وہ پوری نہیں ہیں۔ صرف ان کی پسند کے صفحے ہیں باقی کتاب خالی ہے۔

ایک صاحب کتابیں اٹھا کر لے جانیوالے دوستوں وار رشتہ داروں سے تنگ آ گئے تو انہوں نے اپنے کمرے میں لکھ کر لگا دیا۔

''برائے مہربانی یہیں بیٹھ کر کتاب پڑھیں۔ ساتھ لے جانے کی زحمت نہ کریں۔''

اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آج ان کا کمرہ ایک لائبریری میں بدل گیا ہے۔ رشتہ دار اور دوست وہاں اپنے رشتے داروں وار دوستوں کے ساتھ آتے ہیں اور اپنی پسند کی کتاب نکلواتے ہیں اور گھنٹوں مطالعے میں مصروف رہتے ہیں۔ حال ہی میں انہوں نے تنگ آ کر بورڈ بدل دیا ہے اور اب وہ لوگوں کو کتابیں دے کر کہتے ہیں: ''برائے مہربانی اپنے گھر جا کر پڑھیں۔''

آپ سے اگر کوئی دوست کتاب مانگے تو آپ انکار کر سکتے ہیں لیکن رشتہ دار کے آگے انکار نہیں کر سکتے۔ خاص طور پر اگر رشتہ نازک ہے تو آپ بالکل ہی مجبور ہو کر رہ جائیں گے۔ مثال کے طور پر اگر آپ کی ہمشیرہ کے خاوند صاحب آپ کے شیلف میں سے کوئی کتاب اٹھا کر بغل میں داب لیتے ہیں اور کہتے ہیں

''یہ کتاب تو میں کئی برسوں سے تلاش کر رہا تھا۔ الحمد للہ کہ یہاں مل گئی اب تو میں اسے زندگی بھر اپنے ساتھ رکھوں گا۔''

اب آپ ان صاحب سے کتاب نہیں چھین سکتے۔ ایک بار ہمارے ایک دوست نے اپنے بہنوئی کو صاف صاف کہہ دیا کہ صاحب یہ کتاب میں آپ کو نہیں دے سکتا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دو روز بعد ان صاحب کی ہمشیرہ صاحبہ گھر میں آ کر بیٹھ گئی۔ بہنوئی صاحب نے ان سے کسی

بہانے زبردست لڑائی کر دی اور انہیں گھر بھیج دیا۔ اب وہ صاحب خود اپنی ہمشیرہ اور کتاب کو لے کر بہنوئی کے گھر گئے اور اپنی کتاب کی خانہ بربادی اور بہن کی خانہ آبادی کی۔ ایک بار آپ کتاب خرید کر گھر لے آئے ہیں تو وہ دوسرے کے گھر جانے سے بچ نہیں سکتی۔ کتاب اگر خود نہیں جائے گی تو اسے اغوا کر لیا جائے گا۔ بعض لوگ کتابوں کو اس طرح اغوا کر لیتے ہیں کہ ایک چھوٹی سی بے معنی کتاب کو دے کر آپ کی کوئی قیمتی اور ضخیم کتب لے کر رفو چکر ہو جائیں گے۔ مثلاً آپ کو رضیہ کا دسترخوان نامی کتاب دے کر کہیں گے:

''صاحب میں تو اس ہاتھ لے اس ہاتھ دے کا قائل ہوں۔ آپ یہ کتاب پڑھیں اور میں کارل مارکس کی 'داس کیپٹل' کا مطالعہ کرتا ہوں''

اور وہ آپ کے آگے رضیہ کا پھیکا دسترخوان بچھا کر آپ کی شیلف سے داس کیپٹیل کی ضخیم کتاب نکال کر لے جائیں گے۔ داس کیپٹل سے یاد آیا۔ ہمارے ایک ملنے والے بزرگ ہمارے گھر آئے۔ شیلف میں داس کیپٹل کو دیکھ کر بولے:

''یہ کسی ہندو کی سوانح عمری معلوم ہوتی ہے۔ اصل میں یہ کیپٹل داس ہے بہت خوب، میاں صاحبزادے یہ ہندوستانی کتابیں ذرا کم ہی پڑھا کرو۔''

کتاب کو آپ زنجیر دیں تب بھی یہ زنجیر ہوئے آتش دیدہ بن کر ٹوٹ جائے گی اور کتاب شیلف سے اغوا کر لی جائے گی۔

کتابوں کو محفوظ کرنے کے دو طریقے ہم نے بسیار تحقیق کے بعد معلوم کیے ہیں۔ ہم آپ کے فائدے کے لیے لکھے دیتے ہیں۔ آپ اگر چاہیں تو ان پر عمل کر کے ان سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ پہلی ترتیب یہ ہے کہ آپ کتاب خرید کر اسے اپنے گھر رکھنے کی بجائے اپنے دوست یا رشتہ دار کے گھر جا کر رکھ دیں اور وہیں جا کر پڑھا کریں۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ کتابوں کو الماری کے اوپر خفیہ جگہ پر ایک لوہے کا ہتھوڑا چھپا کر رکھا جائے۔ خبر نہیں کوئی صاحب کتاب نکالن کے لیے الماری کھولیں و پر سے دھائیں کر کے ہتھوڑا ان کے سر پر پڑے اور وہ دھڑام سے فرش پر گر پڑیں۔ ہم اس دوسرے طریقے پر عمل کرنے کی پرزور سفارش کریں گے۔ مگر اس میں ایک قباحت ہے کہ یہ ہتھوڑا آپ کے سر پر بھی پڑ سکتا ہے۔ ثابت ہوا کہ پہلے والی ترتیب ٹھیک رہے گی۔ کتاب خریدی وار دوسرے کے گھر میں جا کر رکھ دی۔ یعنی مال لے کر خود چور کے گھر چلے جائیں بجائے اس کے کہ وہ آپ کا مال چوری کر کے لے جائے یا پھر اپنی الماری کی ہر کتاب کے پہلے صفحے پر جلی حروف میں لکھوا رکھیں۔ کمینے! کتاب بند کر کے یہیں رہنے دے!

کتاب کے ساتھ محبوبہ کی طرح عمر بھر کا پیمان وفا باندھا جاتا ہے!

ڈاکٹر سلیم اختر

کتاب کیا ہے؟

اس سوال کا جواب تو ہر شخص دے سکتا ہے لیکن خواب جوانی کی مانند کتاب کی تعبیریں بہت سی ہو سکتی ہیں۔ اس لیے کہ ہر شخص کے لیے کتاب محض اوراق والفاظ کا مجموعہ نہیں بلکہ چند تقاضوں ......زیادہ بہتر تو یہ ہے کہ...... چند نفسی ضروریات کی تسکین کا انداز ہے، واضح رہے کہ میں تخلیقی کتابوں کی بات کر رہا ہوں ورنہ تو ہر موضوع اور مسئلہ پر کتابیں لکھی جاتی ہیں۔

مزاح کے لحاظ سے میں کتاب کو عورت سمجھتا ہوں، اس لیے نہیں کہ یہ دونوں مذکر نہیں ہیں بلکہ اس لیے کہ دونوں پر کبھی مکمل طور پر غلبہ نہیں پایا جا سکتا۔ غلبہ جسمانی نہیں کہ وہ آسان ہے اور کتاب اور عورت دونوں کو پیسے دے کر خریدا جا سکتا ہے۔ دونوں کو چرایا جا سکتا ہے۔ دونوں کا غلط استعمال کیا جا سکتا ہے، بیکار ہونے پر دونوں سے چھٹکارا حاصل کرنا بھی مشکل نہیں ہوتا اور اس کے ساتھ ساتھ دونوں کو حوزِ جاں بنانے والوں کی بھی کمی نہ ہوگی۔ چنانچہ کچھ نے گھروں میں کتب خانے قائم کیے تو بعض نے حرم؛

کتاب کو عورت سے اس بنا پر مشابہ قرار دیا گیا کہ دونوں گریز پا کیفیات واحساسات کا باعث بنتی ہیں خوبصورت عورت کی مانند کتاب سے اوّلین تعارف بھی عجب جذباتی ارتعاش پیدا کرتا ہے، پھر جیسے جیسے ملاقاتوں میں اضافہ ہوتا جائے اور قربت بڑھتی جائے ویسے ویسے ہی جہت در جہت رموز آشکار ہوتے جاتے ہیں۔ مکمل خود سپردگی کے باوجود بھی عورت اپنی شخصیت کے نہاں خانوں تک مرد کی مکمل رسائی نہیں ہونے دیتی۔ اسی طرح پڑھ اور سمجھ لینے کے باوجود بھی معنی کی تہ داری کے باعث قاری ان تمام کیفیات کے مکمل انجذاب میں کامیاب نہیں ہو پاتا۔ چینی مصنف نے محسوس کیا اور پھر الفاظ سے جن کے ابلاغ کی سعی کی:

کتاب اور عورت دونوں کو ایک انجان جزیرے سے تشبیہہ دی جا سکتی ہے ایسا جزیرہ

جس کا وجود نقشہ اور اٹلس سے بے نیاز ہے۔ دونوں کا لطف ان کے کھوج یعنی Exploration میں مضمر ہے۔ ہر نیا قدم ایک نیا استعجاب سامنے لاتا ہے، ہر نیا راستہ ایک نیا منظر پیش کرتا ہے اور ہر نیا موڑ ایک نئی دنیا دکھاتا ہے اسی لیے کتاب خریدنا ایک تجربہ سے گزرنا ہے۔ آپ اخبار خریدتے ہیں لیکن اس میں عادت کو زیادہ دخل ہے کہ اخبار کی خرید روزمرہ کے معمولات میں سے ہے اور اخبار خریدنے والا اس کی اچھی یا بری خبروں کے بارے میں خود کو یوں ذمہ دار محسوس نہیں کرتا کہ آج کی ہر دم متغیر زندگی میں چیز کی عمر چوبیس گھنٹے بھی نہیں بنتی۔ شام تک اخبار بے کار ہے اور مہینے بعد ردی میں بیچ کر ان سے ہر طرح کا تعلق منقطع کر لیا جاتا ہے لیکن کتاب کا معاملہ اس کے برعکس ہے جس طرح محبوبہ سے پیمان وفا باندھتے ہیں اور بیوی کو جیون ساتھی سمجھا جاتا ہے اسی طرح کتاب کی خرید بھی عمر بھر کے لیے ہوتی ہے یہی نہیں اس کے خراب ہونے یا توقعات پر پورے نہ اترنے کی ذمہ داری بھی خود پر عائد ہوتی ہے اس لیے میں نے عرض کیا تھا کہ کتاب کی خرید ایک طرح کا تجربہ ہے اور اسی نکتہ کو مزید پھیلانے پر یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ تجربہ کار وہ شخص نہ ہوگا جس نے واقعی دھوپ میں بال سفید کیے اور جو گرد و پیش کی زندگی سے بے خبر سلسلۂ روز و شب میں اپنی عمر میں اضافہ کرتا چلا گیا بلکہ تجربہ کار وہ ہوگا جس نے کتابوں سے تجربات حاصل کیے۔ جس نے کتاب کے اوراق کی گنتی نہ کی بلکہ انھیں اپنے لیے پیرہن جانا اور الفاظ کو تخیل اور تصور کی کلید سمجھا۔

لیکن یہ سب باتیں تو ہم لوگوں کی ہیں جو کتاب کا رسیا کہلانے میں فخر محسوس کرتے ہیں لیکن ان حضرات کی کمی نہیں جو کتاب میں وقت، پیسے، اور ذہن کا ضیاع دیکھتے ہیں یہ وہ لوگ ہیں جن کا انداز زیست کاروباری ہے اور جو کتاب سے دو جمع دو برابر چار کے طور پر افادہ حاصل کرنے کے خواہاں ہوتے ہیں۔ اس بحث کو مزید پھیلانے سے پیشتر افادہ کی اصطلاح کا تعین لازم ہے۔ عام طور پر اشیا کے استعمال سے حاصل ہونے والی تسکین کو افادہ قرار دیا جاتا ہے۔ یہ امر اس لحاظ سے قابل غور ہے کہ افادہ کا یہ تصور خود اشیا کی اپنی ساخت اور اجزائے ترکیبی میں ہی مضمر ہوتا ہے۔ گلاس سے پینے کا کام ہی لیا جا سکتا ہے کھانے کا نہیں...... بعض اوقات منفی میں افادہ پوشیدہ ہوتا ہے۔ جیسے حصول افادہ کے بعد جب شے بیکار ہو جاتی ہے تو اسے پھینک دینے میں ایک طرح کا افادہ ہے ورنہ تمام گھر کباڑ خانہ بن جائے گا۔ اسی طرح نوع کی اور مثالیں بھی، درد لا علاج ہو تو دانت نکلوا دیا جاتا ہے۔ بیوی بدکار ہو تو طلاق دے دی جاتی ہے اور ناخلف بیٹا بڑھاپے کی لاٹھی کی بجائے خدا کی لاٹھی ثابت ہو تو اسے عاق کر دیا جاتا ہے۔ یہی نہیں معاشیات سے (Dimenishingutility) کی صورت میں افادہ کا ایک اور پہلو بھی سامنے آتا ہے۔ ٹکٹ وغیرہ جمع کرنے کی استثنائی مثالوں سے قطع نظر وقت کے ساتھ ساتھ شے سے افادہ میں کمی ہوتی

جاتی ہے۔ مثلاً پہلی مرتبہ افادہ اگر تسکین کی سو اکائیاں رکھتا ہے تو بعد میں مزید استعمالات سے تسکین کی اکائیاں ۸، ۶، ۴، ۵ کی صورت میں کم ہوتی جائیں گی۔ اس کی عام مثال بھوکے کی ہے جس کے لیے بعد کی چپاتیوں میں کسی صورت سے بھی پہلی چپاتی ایسا افادہ نہ ہوگا۔ غیر ادبی افادہ کی ان چند متنوع مثالوں سے کم از کم یہ تو واضح ہو جاتا ہے کہ کتاب سے وابستہ افادہ کی معاشیات کے قواعد کی رو سے نہ تو ناپ تول ہو سکتی ہے اور نہ ریاضی کے اصولوں سے قدر تعین کے لیے کوئی اکائی مقرر کی جا سکتی ہے اور نہ ہی الجبرا کی مانند ''x'' فرض کیا جا سکتا ہے حتیٰ کہ گھٹیا طریقہ سے کام لیتے ہوئے کتاب کی قیمت اور صفحات کی تعداد سے حاصل ہونے والے افادہ کا کوئی تناسب بھی نہیں مقرر کیا جا سکتا۔ کیا غالب اور اقبال کے کلام کو ان کی مطبوعہ قیمتوں میں تولا جا سکتا ہے؛

ایک ہی کتاب اور اس میں پیش کردہ ادب، اپنی اساسی خصوصیات تبدیل کیے بغیر بیک وقت مختلف النوع افراد کے لیے باعث افادہ ثابت ہو سکتا ہے۔

لیکن کتاب سے افادہ کی توقع ہی کیوں ہو؟ کیا کتاب کا افادہ اس کے کتاب ہونے میں مضمر نہیں؟ خارجی ذرائع سے کتاب کا افادہ ثابت کرنے میں اس کے وجود کو ''اضافی'' بنا دینے کا خطرہ ہے بلکہ کتاب مطلق ہے بالکل عورت کی طرح۔ کیا آپ حضرات نے کسی حسینہ سے تعارف پر اس سے حاصل ہونے والے افادہ کا تو ائل کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ، آنکھوں کی چمک، آواز کی کھنک...... یہ سب اپنے وجود سے اپنے حسن کا احساس کرتے ہیں اس لیے حسینہ کو حسین ثابت نہیں کیا جاتا تو پھر کتاب کے بارے میں اس کے برعکس رویہ کیوں؟

مانگے کی کتابیں

کنہیالال کپور

انجیل مقدس میں آیا ہے کہ کتابوں کی انتہا ہے نہ ان کا شمار! یہی وجہ ہے کہ ان اشخاص کو بھی جن کے پاس کتابوں کے ذخائر ہیں کچھ نہ کچھ کتابیں مانگ کر پڑھنی پڑتی ہیں۔ایک اور طریقہ انہیں چرا کر پڑھنے کا بھی ہے، لیکن چوری کوئی خاص اچھی عادت نہیں، نیز پکڑے جانے کا بھی احتمال رہتا ہے، اس لیے شرفا کتابیں مانگنے کو کتابیں چرانے پر ترجیح دیتے ہیں۔

مانگنا بذات خود ایک ناخوشگوار فعل ہے۔ میں دعا مانگنے کے متعلق عرض نہیں کر رہا۔ کپڑے، کتابیں اور ووٹ مانگنے کا ذکر کر رہا ہوں۔ ہندی کے ایک شاعر نے کہا ہے، ''مانگنا ایک قسم کی اخلاقی موت ہے، لیکن سائل کو انکار کرنا مانگنے سے بھی بدتر ہے۔'' کتابیں مانگنے والے اس نکتے سے بخوبی واقف ہیں۔کاش وہ حضرات بھی اس سے اتنے باخبر ہوتے جن سے کتابیں مانگی جاتی ہیں۔

ہمارے ایک دوست ہیں جن سے جب ہم کوئی کتاب مانگتے ہیں ان کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگتی ہیں۔انکار بھی نہیں کرتے۔لیکن کتاب مستعار دینے پر آمادہ بھی نظر نہیں آتے، حتیٰ کہ ان کے دلائل سن کر ہم یہ شعر پڑھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں:

''نہیں'' ہی کیوں نہیں کہتے زباں سے
''نہیں'' کا کام کیوں لیتے ہو ''ہاں'' سے

بڑی رضامندی کے ساتھ وہ کتاب ہمارے حوالے کرتے ہیں۔اسے لے کر ہم ابھی مشکل سے گھر پہنچتے ہیں کہ ان کا خادم یہ دریافت کرنے کے لیے حاضر ہوتا ہے کہ اگر ہم نے کتاب پڑھ لی ہو تو اسے واپس کر دیں۔ بسا اوقات ہم اسے پڑھے بغیر واپس بھجوا دیتے ہیں۔ ہمارے اس دوست کا عقیدہ ہے کہ اپنی گھڑی، اپنا قلم اور اپنی کتاب کسی شخص کو مستعار نہیں دینی چاہیے، کیوں کہ اوّل تو اسے واپس نہیں کیا جائے گا اور اگر کیا جائے گا تو اس کا حلیہ بگاڑ کر۔ یہ جب کسی کمزوری کے لمحے میں کتاب مستعار دیتے ہیں تو ہدایت اور نصیحت کے ملے جلے انداز میں فرماتے ہیں! ''دیکھیے صاحب، یہ بڑی نایاب کتاب ہے، مرحوم دادا جان کو ایک انگریز نے تحفے کے طور پر پیش کی تھی۔

خدا بخشے دادا جان فرمایا کرتے تھے کہ کتاب موتیوں میں تولنے کے قابل ہے۔اسے ذرا سنبھال کر رکھیے گا۔اور ہاں پڑھتے وقت کسی صفحے پر روشنائی سے نشان یا دھبہ مت لگائیے گا۔بچوں سے اسے خاص طور پر بچا کر رکھیے گا۔کہیں کوئی تصویر یا صفحہ اڑا نہ لے جائیں۔دیکھیے اس کتاب کی صرف دو جلدیں دستیاب ہیں۔ایک تو برٹش میوزیم لندن میں ہے اور دوسری خاکسار کے پاس۔''

لطف یہ کہ وہ ہر ایک کتاب کے بارے میں یہی کچھ کہتے ہیں؛ حالانکہ جن کتابوں کو نایاب قرار دیتے ہیں، بڑی آسانی سے کسی کتب فروش سے مل سکتی ہیں۔تاوقتیکہ انہیں کتاب واپس نہ مل جائے، انہیں چین نہیں آتا۔جب کبھی ملاقات ہوتی ہے، احتیاطاً پوچھ لیتے ہیں؟ کتاب محفوظ ہے نا؟

ایک اور صاحب ہیں جنہیں ایک خاص تاریخ تک جس کا فیصلہ شروع میں کرلیا جاتا ہے، کتاب واپس نہ کی جائے تو طوفان کھڑا کر دیتے ہیں۔ بھاگم بھاگ ہمارے ہاں آتے ہیں اور چھوٹتے ہی کہتے ہیں!'' دیکھو بھئی۔ آج پندرہ تاریخ ہے اور تم نے ہماری کتاب واپس نہیں کی۔''
کبھی کبھار ایسا ہوتا کہ ہم بالکل بھول جاتے ہیں کہ ان کی کتاب پڑھ کر کہاں رکھ دی تھی۔اس وقت ان کا غیظ وغضب دیکھنے کی چیز ہوتا ہے اتنے کوسنے دیتے ہیں کہ ہم کان کو ہاتھ لگاتے ہیں کہ آئندہ بڑی سے بڑی حماقت کرلیں گے لیکن ان سے کتاب نہیں مانگیں گے۔
وہ شکایت آمیز لہجے میں کہے چلے جاتے ہیں!''ہمیں پہلے ہی معلوم تھا کہ آپ یہ کتاب ضرور گم کر دیں گے۔دراصل آپ ایسے غیر ذمہ دار اور لاپروا شخص کو کتاب مستعار دینا اس سے ہمیشہ کے لیے ہاتھ دھونے کے مترادف ہے۔آپ نے ضرور وہ کتاب ردی میں بیچ دی ہوگی۔آپ پر تو مال مفت اور دل بے رحم والی مثل صادق آتی ہے۔جب آپ مانگی ہوئی چیز کو سنبھال کر نہیں رکھ سکتے تو آپ کو اسے مانگنے کا کیا حق پہنچتا ہے۔

ادھر ہم جھلا کر کہتے ہیں: آپ خواہ مخواہ پریشان ہو رہے ہیں۔یہیں کہیں مل جائے گی۔

بس اب مل چکی صاحب۔اگر اسے ملنا ہوتا تو گم ہی کیوں ہوتی۔ہمیں تو آپ کی بجائے اپنے پر غصہ آرہا ہے۔ہم نے وہ کتاب آپ کو دی ہی کیوں تھی۔

اتنے میں ہمیں ان کی کتاب مل جاتی ہے اسے دیکھ کر ان کی جان میں جان آتی ہے۔
وہ ایک بار تسلی کرنے کے بعد کہ یہ وہی کتاب ہے، وہ فرماتے ہیں! قسم ہے خداوند کریم کی اگر آئندہ آپ کو کبھی کتاب مستعار دی۔اور ہم دل ہی دل میں عہد کرتے ہیں:''لعنت ہے ہم پر اگر ہم نے آئندہ آپ سے کوئی کتاب مانگی۔''

ہمارے ایک اور دوست کسی گمنام کالج میں گمنام پروفیسر ہیں۔ یہ پچھلے بارہ برس سے کسی گمنام موضوع پر ریسرچ کر رہے ہیں چونکہ ہر دوسرے سال ریسرچ کا موضوع بدل دیتے ہیں۔اس لیے ان کا تھیسس کبھی مکمل نہیں ہو پاتا۔ان کے پاس لاتعداد چھٹی پرانی کتابیں ہیں جنہیں یہ ہر وقت سینے سے لگائے رکھتے ہیں یہ پہلے خود کسی کتاب کی حد سے زیادہ تعریف کرتے ہیں۔ پھر یہ کتاتے ہیں انہیں یہ کتاب کس پنساری سے کون سا سفوف خریدتے وقت دستیاب ہوئی تھی۔ پھر اسے پڑھنے کی سفارش کرتے ہیں لیکن جب ہم پڑھنے کا اشتیاق ظاہر کرتے ہیں۔تو لیت ولعل کرنے لگتے ہیں۔آخر یہ طے پاتا ہے کہ ہم یہ کتاب صرف ایک دن کے لیے لے جا سکتے ہیں۔ لیکن ہمیں اسے محفوظ رکھنے کی ہر ممکن احتیاط کرنا ہوگی۔

ایک دفعہ شامت اعمال سے ان کی ایک بوسیدہ اور کرم خوردہ کتاب ہم سے ضائع ہو گئی۔ دراصل ہمارے نوکر نے اسے نہایت فضول تصنیف سمجھتے ہوئے چولھے میں جھونک دیا۔بس پھر تو غضب ہو گیا بہت سیخ پا ہوئے۔ دھاڑیں مار کر رونے لگے۔ آٹھ آٹھ آنسو روتے تھے اور کہتے تھے: آپ نے مجھے کہیں کا نہ رکھا۔ میں برباد ہو گیا۔اس کتاب کی مدد سے مجھے ”موہنجوداڑو کی تہذیب پر تھیسس لکھنا تھا۔اب میں عمر بھر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل نہیں کر سکتا۔“

ہم نے گڑگڑا کر معافی مانگی اور بہت دیر تک کتاب کے یوں ضائع ہو جانے پر اظہار تاسف کرتے رہے، لیکن ان کی تسلی کسی طرح نہ ہوئی۔ اب ان کا یہ معمول ہو گیا کہ جہاں بھی ہوتے جس حال میں بھی ہوتے اس بات کا چرچا ضرور کرتے کہ ان کے ڈاکٹر نہ بننے کی تمام تر ذمہ داری ہم پر عائد ہوتی ہے حالانکہ ہم بخوبی جانتے تھے کہ ہمارے علاوہ اس المیہ میں ان کی نااہلیت کا بھی کافی ہاتھ ہے لیکن مصلحتاً چپ رہتے۔ ایک دن جب ان کے ایک دوست کو پی ایچ ڈی کی ڈگری مل گئی تو وہ از سرنو ہمارے پاس شکایت کرنے آئے کہ اگر ہم سے ان کی وہ کتاب ضائع نہ ہوگئی ہوتی تو آج وہ بھی پی ایچ ڈی کہلاتے۔

ان کا شکوہ سن کر ہم اتنے خفیف ہوئے کہ ہم نے تہہ کر لیا چاہے ہمیں چار کھونٹ گھومنا پڑے، زمین و آسمان کے قلابے ملانے پڑیں، ہم ان کی کتاب ڈھونڈ نکالیں گے، بڑی بڑی لائبریریوں سے دریافت کیا۔ پرانے کتب فروشوں کو لکھا لیکن کہیں سے کتاب دستیاب نہ ہوئی۔ ایک دن جب ہم مایوس ہو کر گھر لوٹ رہے تھے تو پان کھانے کے لیے ماتا دین پنواڑی کی دکان پر رکے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ ماتا دین اسی کتاب کے اوراق میں گاہکوں کو پان باندھ باندھ کر دے رہا ہے۔ پوچھنے پر پتہ چلا کہ اس کے پاس اس کتاب کی پچاس جلدیں ہیں جو اس نے ایک کباڑی سے آٹھ آنے فی سیر کے حساب سے خریدی ہیں۔ ہم نے فوراً ایک نسخہ موازی تین آنے میں ماتا

دین سے خریدا اور کتاب پروفیسر صاحب کے حوالے کی۔ حالانکہ انہیں کتاب ملے چار سال سے زیادہ کا عرصہ ہو چکا ہے۔ لیکن ابھی تک وہ پی ایچ ڈی نہیں ہو سکے۔

کتابیں مانگنے کے سلسلے میں ہمارا تجربہ یہ ہے کہ کبھی اس شخص سے کتاب نہیں مانگنی چاہیے جو پرلے درجے کا سنکی ہو اور جس کو ہر وقت کتاب گم ہو جانے کا خدشہ رہتا ہے۔ پرانی اور بوسیدہ کتاب نہیں مانگنی چاہیے کیوں کہ اسے آپ کی بیوی یا نوکر ردی کی ٹوکری میں پھینک دے گا وہ کتاب نہیں مانگنی چاہیے جس کا دنیا میں صرف ایک ہی نسخہ ہو، کیوں کہ اگر وہ گم ہو گئی تو کتاب کا مالک آپ کو حشر تک معاف نہیں کرے گا۔ اور سب سے ضروری بات یہ کہ کتاب کبھی مانگنی ہی نہیں چاہیے خرید کر پڑھنی چاہیے کہ اس طرح آپ کے علاوہ مصنفوں اور ناشروں کا بھی بھلا ہو گا۔

میں نے پڑھا ہے!

عظیم بیگ چغتائی

وہ حضرات آئے اور مجھ سے کوئی پانچ چھ قدم پر ایک صوفے پر تکیہ لگا کر میری طرف پشت کر کے بیٹھ گئے اور ایک ٹانگ پر دوسری ٹانگ اطمینان سے رکھ کر پڑھنے میں مشغول ہو گئے۔ نہایت ہی خلیق اور ملنسار آدمی معلوم ہوتے تھے۔ کوئی بیس منٹ تک تو کتاب پڑھتے رہے، پھر کھنکار کر میری طرف دیکھا، نظر چار ہوتے ہی عجیب حیرت و استعجاب سے بولے:
کمال کر دیا ہے

میں نے ان کی بات سے کوئی دلچسپی نہ لی اور کچھ نہ بولا، تو بولے: ''تاج محل...... عجیب وغریب عمارت ہے! استاد عیسی نے بنایا ہے۔ واللہ اب تک میں یہ جانتا تھا کہ نقشہ اس کا ایک اٹلی میں رہنے والے نے بنایا ہے۔
جی ہاں۔ میں نے کہا اور گفتگو کو ختم کرنے کی نیت سے فوراً ہی اپنی کتاب پر پھر نظر جمالی کیوں کہ میں کتاب کے قصے کی جس نوبت پر پہنچا تھا، وہ ضرورت سے زیادہ دلچسپ تھی اور کسی کا مخل ہونا مجھے ذرہ بھر گوارا نہ تھا۔

مگر وہ کیوں چپ ہوتے، بولے۔ مصنف نے مستند حوالہ جات سے ثابت کر دیا۔

جی ہاں۔ ''جواب پر مجبور ہو کر میں نے کہا۔ ''میں نے پڑھا ہے۔''

''یہ اوّل نمبر کے بدمعاش ہیں۔'' وہ بولے۔ ''اوّل نمبر کے بدمعاش! یہ یورپین مصنف...... گھونسا تان کر انھوں نے کہا۔

میں چپ ہو کر اپنی کتاب میں پھر مشغول ہو گیا۔ شکر ہے کہ وہ بھی مشغول ہو گئے، مگر پانچ منٹ بعد ہی وہ اچک کر بولے! ''یہ دیکھیے خود دوسرے منصف مزاج مورخوں کے اقوال سے مصنف ثابت کرتا اور............''

جی ہاں۔ ''میں نے کہا۔ ''میں نے پڑھا ہے...... پوری کتاب میں نے پڑھی ہے'' وہ پھر پڑھنے میں مشغول ہو گئے اور میں بھی مشغول ہو گیا لیکن دس منٹ بعد ہی پھر وہ پڑھتے پڑھتے

اچھل پڑے۔ ''کیا کہنا ہے مصنف کی قابلیت کا، چودہ مستند حوالے، ذرا غور تو فرمائیں......''

''میں نے پڑھا ہے۔'' میں نے تنگ آ کر کہا۔

''مگر یہ سب......''

''میں نے پڑھا ہے، میں نے کل کتاب پڑھی ہے۔'' یہ کہہ کر میں اندازِ بے نیازی کے ساتھ پھر مشغول ہو گیا، مگر مشکل سے دس منٹ گزرے ہوں گے کہ انہوں نے اپنی رانیں پیٹ ڈالیں اور بیتاب ہو کر پھر مجھ سے کہا۔ ''یعنی یہ دیکھیے کہ......''

میں نے کچھ جل کر بات کاٹتے ہوئے جواب دیا۔ ''میں نے پڑھا ہے۔''

''آپ یہ دیکھیے کہ یہ حضرت......''

''میں نے پڑھا ہے۔'' ذرا زور دے کر میں نے کہا۔ ''میں نے کل کتاب دو مرتبہ پڑھی ہے اور......''

تو پھر'' وہ بیچ میں بات کاٹ کر بولے۔ ''تو پھر آپ نے خود دیکھ لیا ہو گا کہ مصنف نے غضب ہی کر دیا ہے۔ کہاں کہاں سے مواد جمع......''

''ارے صاحب! میں نے پڑھا ہے۔'' اب رو کر میں نے کہا۔ ''میں نے سب پڑھا ہے۔'' اس پر وہ حضرت یہ سن کر کچھ گنگنا کر پڑھنے لگے اور انگلی نچا کر لطف اندوز ہونے لگے۔

میں اب دق ہو گیا تھا کہ الٰہی اب کیا کروں۔ کہاں بھاگ جاؤں، میری کتاب اس وقت میرے لیے اس قدر دلچسپی کا سامان پیدا کر رہی تھی کہ بیان سے باہر اور ان کا موذی پن میرے لیے جہنم تھا۔ جوں توں کر کے میں نے اپنے رنج اور غصے کو فرو کیا اور پراگندہ دماغ کو پھر کتاب کی طرف متوجہ کیا۔ اب میں کتاب کے انتہائی دلچسپ حصے پر پہنچ گیا تھا اور خوش قسمتی سے یہ حضرت بھی منہمک تھے، مگر بدقسمتی .... ہاں میری بدقسمتی کہ یہ حضرت پھر ایک دفعہ پھاند پڑے۔ ''خوب! یہ بھی آپ نے دیکھا ہے!'' گویا مجھے مخاطب کر کے پھر بولے۔ ''اجی حضرت! یہ بھی آپ نے دیکھا ہے کہ مصنف نے خود............''

''میں نے، دے......کھا، ہے اور......'' مگر انہوں نے میری بات کاٹ دی اور کہا؛ مصنف نے خود اپنی طرف سے کوئی......''

میں نے پڑھا ہے'' اب پھر رو کر میں نے عجیب لہجے میں کہا۔ ''میں نے سب پڑھا......''

مگر وہ تو گویا میری کوئی سنتے ہی نہ تھے چپ نہ ہوئے بلکہ بولے: ''کوئی بھی بات نہیں چھوڑی......''

اب گویا میں اور وہ دونوں ساتھ ساتھ بول رہے تھے میں اپنے نا تمام جملے کی فکر میں او وہ اپنے نا تمام جملے کی تکمیل کی فکر میں۔ چنانچہ میں نے کہا: ''میں نے پڑھا ہے، سب پڑھا ہے۔'' میں رو رو کر گویا کہہ رہا تھا، مگر وہ اب خون کرنے پر آمادہ تھے۔ اپنی دھن میں بولے: ''ذرہ بھر مصنف نے کسی طرف سے......''

میں نے پڑھا ہے۔'' اب بڑی لجاجت سے میں نے سمجھا کر ان سے کہا۔ ''حضرت! میں نے سب پڑھا ہے۔'' شکر ہے کہ اب وہ پھر اپنی کتاب کی طرف متوجہ ہو گئے، مگر میرا مشغول ہونا دشوار تھا۔ دبلا پتلا آدمی مارے غصے کے خون کھول رہا تھا۔ مشکل سے غصہ رفع کرنے کو تھا کہ وہ اب کی مرتبہ مجھے قتل کرنے ہی کی نیت کر بیٹھے!!

وہ کسی نے سچ کہا ہے، تنگ آمد بہ جنگ آمد، ان حضرت کی ضد، بدتمیزی اور جارحانہ کارروائی نے میرے لیے موت اور زیست کا سوال پیش کر دیا۔ غصہ، انتہائی جلال، کمزور آدمی، پاگل ہو گیا، دیوانہ ہو گیا وحشی ہو گیا، نہایت شرم کے ساتھ مجھ کو قبول ہے کہ ''اسفل السافلین کی تفسیر بن کر غضب میں عقل و ہوش سب کھو بیٹھا۔ اب صرف ایک ہی علاج تھا میں کر گزرا......ان کا جملہ تھا......تمام دنیا کے مورخین اس بات پر متفق......''

ان کے آخری لفظ متفق کے آخری ٹکڑے فق کے ساتھ میں نے مجبوراً گویا حفاظت خود اختیاری میں اپنی کرسی کا بڑا اگدا گھسیٹ کر پوری قوت سے ان کے سر پر گھما کر مارا اور کرسی پھاند کر بدحواسی میں سر پر پیر رکھ کر بھاگا۔

چشم زدن میں لائبریری کے احاطے کی دیوار پھاند کر کھیتوں کھیت ڈاک گاڑی کی رفتار سے اڑا جا رہا تھا۔ نہ دیکھوں خندق نہ کھائی۔ سامنے ایک باڑھ آئی...... کترا کر نکل جاؤں۔ مگر حضرت وقت کہاں، لہٰذا اس ارہر کے جھنکڑوں کی باڑھ پر سے اڑنے کی کوشش جو کی تو الجھ کر گرا۔ بوکھلا کر اٹھا، مڑ کر لائبریری کے برآمدے کی طرف نظر کی تو کیا دیکھتا ہوں کہ حضرت کھڑے دیکھ رہے ہیں، بے اختیاری کے عالم میں ان کے ہاتھ میں کتاب دیکھتے ہی زور سے پکار کر میں نے وہیں سے ہاتھ اٹھا کر کہا: ''میں نے پڑھا ہے۔''

بیچاری کتابیں

(روئے سخن کسی کی طرف ہو تو روسیاہ)

اسعد گیلانی

ایک آدمی جسے اچھی اچھی کتابیں پڑھنے ، جمع کرنے ، سنبھالنے اور محفوظ رکھنے کا شوق ہوا سے بالعموم ایسے احباب سے واسطہ پڑتا ہے جو کتابوں کو ان کے مالک کی حفاظت سے نکال لے جانے میں یدِ طولیٰ رکھتے ہیں ۔ یہ مصیبت کسی ایک آدمی کی مصیبت نہیں اور نہ یہ مصیبت لانے والا کوئی ایک آدمی ہوتا ہے بلکہ یہ کتابیں لے جانے ، اڑا لینے ، ضبط کر لینے ، گم کر دینے اور پھاڑ کر واپس کرنے والوں کا ایک اچھا خاصا گروہ ہے جو ہماری سوسائٹی میں پڑھے لکھے معززین کی شکل میں پایا جاتا ہے ۔ ان کی پہچان مشکل ہے ۔ صرف تجربہ بتاتا ہے کہ کون کس طبقہ سے تعلق رکھتا ہے ۔ مجھے اس طبقہ کے ہر فرد سے گلہ ہے جیسے ہر اس آدمی کو گلہ ہوتا ہے جو کتابیں جمع کرنے کا ذوق رکھتا ہو ۔

اس لئے میرا روئے سخن کسی شخص کی طرف بھی نہیں ہے ، جن صاحب کو شبہ ہو کہ میری کوئی بات ان کی ذاتِ گرامی پر کسی پہلو سے چپکتی ہے وہ اسے میری گستاخی نہ قرار دیں بلکہ میری ان باتوں کو نظر انداز کر کے اپنے وطیرے پر قائم رہیں ۔ البتہ یہ تو ہرگز نہ کریں کہ اپنے آپ کو خواہ مخواہ مخاطب قرار دے کر مجھ سے ناراض ہو بیٹھیں ۔ مجھ میں یہ کمزوری بہر حال موجود ہے کہ میں کتابوں کے ساتھ احباب کو بھی ضائع کرنے کی ہمت نہیں رکھتا اور یہ میری کمزوری ہر اس شخص میں ہوتی ہے جو میری پوزیشن میں ہو ۔

کتابیں لے جانے والوں میں رنگ برنگ کے حضرات ہوتے ہیں اگرچہ کتابوں کو اغوا کر لے جانے کی صفت سب میں مشترک ہے لیکن اس اشتراکِ طبعی کے باوجود ان کی بے شمار اقسام ہیں ۔ ان میں سے چند ایک سے میں آپ کا تعارف کرائے دیتا ہوں تاکہ سند رہے اور جب آپ کوئی نئی کتاب لائیں اور اسے ضائع کرنا بھی مقصود نہ ہو تو ایسی ضرورت کے موقع پر یہ معلومات آپ کے کام آئیں ۔

تعارف سے پہلے ایک بنیادی بات جو کتابیں مانگ لے جانے والوں کے دل و

دماغ میں ثبت ہو چکی ہے اس کا اظہار ضروری سمجھتا ہوں تاکہ آپ اخلاقی پابندیوں اور دیانت کے تقاضوں کے مستند بھروسے پر اپنی ساری لائبریری نہ لٹا بیٹھیں۔ بنیادی بات جو آج کل کی تعلیم یافتہ سوسائٹی کے اندر ایک ثابت شدہ، قبول کردہ اور معروف حقیقت بن چکی ہے، وہ یہ ہے کہ کتاب کی امانت کوئی امانت نہیں ہے جسے واپس کیا جائے۔ کتاب کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کے لین دین میں امانت کے اس معیار کو سامنے رکھا جائے جس کا روزمرہ کے دیگر مسائل میں لحاظ رکھا جاتا ہے۔ ایک نہایت دین دار آدمی جو کسی سے ایک آنہ لے کر بھی نہیں بھولتا اور ایک عرصہ کے بعد بھی نہایت ذمہ داری سے بھول جانے کی انتہائی معذرت اور خدا ترسی کے شدید احساس کے ساتھ اسے واپس کرنا ضروری سمجھتا ہے وہ آپ سے بیس روپے کی کتاب لے کر بھی بلاڈکار ہضم کر جانا عین روزمرہ کی بات سمجھتا ہے جس میں اسے دیانت و امانت کے اصولوں کی پامالی کا دور دور تک احساس نہیں ہوتا بلکہ اسے یہ بھی احساس نہیں ہوتا کہ اس معاملہ میں دیانت و امانت کا بھی کوئی سوال کھڑا ہوتا ہے۔

اس تلخ صورتِ حال سے مجھ جیسے لوگوں کو ایک مدت سے واسطہ پڑ رہا ہے۔ جو کتاب پڑھتے بھی ہیں اور پڑھاتے بھی ہیں اور اتفاق سے دینی و اخلاقی کتب دوسروں کو پڑھانا کارِ ثواب سمجھتے ہیں۔ پس اگر کسی کو ہماری اس کمزوری کا پتہ چل جائے تو پھر سمجھ لیجئے کہ کتاب احسان کا چھدّا رکھ کر پڑھنے کے لئے لی جاتی ہے اور پھر کبھی واپس نہیں کی جاتی۔ میرے پاس کئی لمبی لمبی فہرستیں ایسی ہیں جن کے اوپر مغویہ کتب کی ایک طویل قطار درج ہے۔ ان میں اکیس روپے کی ٹائن بی کی تاریخ تہذیبِ انسانی حصہ اول سے لے کر چھ آنے کے پمفلٹ ''سلامتی کا راستہ'' تک شامل ہیں۔ یہ سب کتابیں جب میرے ہاتھ سے گئیں تو پھر کبھی واپس نہ آئیں، جو حضرات ان کتابوں کو لے کر جاتے ہیں وہ رنگ برنگ کے حضرات ہیں۔ دوست احباب، کالجوں کے طلباء اسلام کے متعلق مفصل معلومات اور علمیت کا اظہار کرنے کے لئے دوسروں سے کتب لے کر اپنے پاس ڈھیر کرنے کے شائق ہوں وغیرہ۔

ایک صاحب آئیں گے۔ کیوں جناب۔ ایک صاحب معاشیات پر بحث کرتے ہیں۔ سود کی حرمت کے قائل نہیں ہیں۔ کہتے ہیں آج کل سود اور بنک کاری کے بغیر کام نہیں چل سکتا۔ کوئی کتاب ان کے لئے تجویز کیجئے۔

میرا خیال ہے ان کو ''جدید معاشی نظریات اور اسلام'' اور ''اسلام اور سود'' پڑھائیے۔

بہت بہتر۔ اگر آپ کے پاس یہ کتب ہوں تو دے دیجئے۔ میں پھر کبھی لاہور گیا تو خرید لاؤں گا۔''

مجھے بھی شوق ہے کہ جن لوگوں کے نظریات اسلامی تعلیم کے بارے میں الجھے ہوئے

ہوں ان کی الجھنیں دور ہو جائیں۔ میں فوراً اٹھ کر اپنی لائبریری سے ''جدید معاشی نظریات'' جو پچھلے ہفتہ میں منگائی ہے اور ''اسلام اور سود'' دونوں کتابیں ان کے حوالے کر دوں گا۔

چند دنوں تک کتب ذہن میں رہیں گی۔ پھر کسی کاغذ کے پرزے یا ڈائری پر کہیں نوٹ کر لی جائیں گی۔ چند ہفتوں کے بعد تذکرۃً شرماتے، لجاتے ان سے کسی ملاقات پر گول مول طریقہ سے کتابوں کا پوچھوں گا تو جواب ملے گا۔

''جی کیا کہیں۔ وہ صاحب پلٹ کر میری دکان پر آئے ہی نہیں۔ شاید شہر سے باہر کہیں چلے گئے ہیں۔''

چلئے قصہ ختم ہوا اور دونوں کتابیں ہمیشہ کے لئے داغِ مفارقت دے گئیں۔ چاہے وہ اپنے تبلیغی مشن پر موجود رہیں یا کسی ردی کی دکان پر بک جائیں۔

ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی صاحبزادے کالج کی کسی مجلس مباحثہ کے لئے کسی موضوع پر نکات چاہتے ہیں۔ ان کو موضوع کی نسبت کتاب تجویز کر دی۔ وہ دوسرے دن کی شام کو کتاب کی واپسی کا وعدہ کر کے لے گئے اور پھر وہ کتاب کبھی واپس نہ آئی۔ اگرچہ صاحبزادے پھر بھی بار بار آتے رہے کہ دوسری کتب پر ہاتھ صاف کریں۔

بعض ایسے دوست بھی ہوتے ہیں جو بے تکلف احباب کہلاتے ہیں۔ آئے، الماری کا پٹ کھولا، جلدوں پر سرسری نظر ڈالی، جس کتاب کی جلد موٹی اور خوبصورت معلوم ہوئی اسے پوری بے دردی سے گھسیٹا، بغل میں دابا۔ ''بھئی ذرا دیکھنے کو لئے جا رہا ہوں۔'' اور بے تکلفی سے لے گئے اور بے تکلفی سے ہی واپس نہ کی۔ کبھی تقاضا کیا تو ابھی فارغ نہ ہونے کا بہانہ کیا۔ مزید تقاضا کیا تو بات ہنسی مذاق میں ٹال دی۔ مزید کچھ کہا تو طنز و تعریض کے چند تیر برسا دیئے۔ اس پر بھی کتاب پر اپنا حق ظاہر کیا تو معمولی سی خفگی کا اظہار کر دیا اور جھٹ تعلقات کی ترازو کھڑی کر کے ایک طرف کتاب کو رکھ دیا اور دوسری طرف خود کھڑے ہو گئے ہیں۔ ایک بامروت آدمی کس طرح کتاب کا وزن قرار دے سکتا ہے جو کتاب اس آزمائش پر چڑھ گئی اور اس ترازو میں تل گئی وہ پھر کبھی نہیں لوٹتی وہ گویا تعلق کے مقابلہ میں ہدیۃً ازخود قبول کر لی جاتی ہے۔

بعض حضرات ہیں جو اسی نیک نیتی سے آپ کی کتاب کو آگے چلا دیتے ہیں، جس نیت سے آپ نے ان کو دی تھی۔ آپ نے پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ وہ انہوں نے ایک ملحد کو دے رکھی ہے اور فخر سے گویا آپ کا فریضہ ادا کر کے آپ پر احسان کر رہے ہیں۔ پھر کبھی پوچھا تو معلوم ہوا کہ ان صاحب نے اپنی ایک عزیزہ کو دی ہے، جن کا فلسفہ پڑھنے کے سبب خدا سے یقین اٹھتا چلا جا رہا ہے اور انہوں نے آگے اپنی ایک سہیلی کو دے دی ہے جو ہیڈ مسٹرس ہیں اور خیال ہے کہ اگر ہیڈ

مسٹرس متاثر ہوگئیں تو وہ ایسی دینی کتب اپنے اسکول کی لائبریری میں منگا کر رکھیں گی جس سے آئندہ نسل کی اصلاح کا کام ہوگا۔ آپ کی دی ہوئی کتاب چونکہ آئندہ نسل کی اصلاح کی راہ ہموار کر رہی ہے اس لئے اس کا اس سے بہتر مصرف کیا ہوسکتا ہے۔ اور نہ اس کو ایسے اہم کام سے ہٹا کر واپس لائبریری میں رکھنا کوئی مفید کام ہے اس لئے اس کتاب پر بھی صبر کیجئے اور خوش ہو جائیے کہ وہ اپنا کام کہیں نہ کہیں ضرور کر رہی ہے۔

بعض حضرات ایسے بھی ہیں جو کتاب لے جائیں گے، مگر پڑھیں گے کبھی نہیں۔ صرف کتابیں لے جانا، ہاتھ میں لے کر چلنا، دوسروں کو دکھانا، یہی ان کا خاص کام ہوتا ہے، ایسے لوگ عموماً بے پڑھے ہی کتابیں واپس کر دیتے ہیں، اس قسم میں کچھ حضرات ایسے بھی ہوتے ہیں، جن کو لائبریری بنانے کا شوق ہوتا ہے، لیکن خریدنے کی بجائے دوسروں سے کتب لے جا لے کر وہ اپنی لائبریری بناتے ہیں۔ جن میں سے بیشتر بے پڑھے محفوظ رکھتے ہیں۔ ان کی لائبریری کھولئے تو اس میں سے بہت کچھ لوٹ کا مال نکلے گا۔ شاید آپ کی مدت سے کھوئی ہوئی بعض کتب بھی مل جائیں۔

خراب قسموں میں ایک سب سے عجیب قسم وہ ہے جو کتاب کے ساتھ کشتی لڑتے ہیں، واپس کریں گے تو اتنی گندی ہوگی جیسے اتنے دن پڑھنے کے بعد چولھے میں ہی رکھتے ہیں۔ اوراق کے سرے مڑے ہوئے ہونگے، گرد پوش پھٹ گیا ہوگا تو پھینک دیا ہوگا اور واپس کرتے ہوئے سادگی سے کہہ دیں گے، ''اوپر کا کاغذ گندا ہوگیا تھا اس لئے اتار کر پھینک دیا ہے۔'' کبھی کتاب واپس کریں گے تو اس پر سالن کے داغ دھبے ہوں گے، چائے کی پیالی کے پیندے کا گول نشان ہوگا، تیل والی انگلیوں کی نشان ہوں گے اور کوئی ایک آدھ ورق پھٹا ہوا بھی ہوگا۔

ایسے بھی ہوتے ہیں جو کتاب واپس کرتے ہیں تو کتاب کی شناخت مشکل ہوتی ہے، نہ اس کا ابتدائی حصہ ہوتا ہے، اور نہ آخری ورق باقی ہوتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی سپاہی معرکے سے اس حالت میں واپس آیا ہے کہ اس کا عضو عضو زخمی ہے، ان حضرات میں سے چند ایک ایسے ملے جنہوں نے کتاب واپس کرتے ہوئے کتاب کی خوب تعریف کی تو مجھے شبہ ہوا کہ انہیں کتاب اتنی پسند آ گئی ہے کہ وہ اسے پڑھنے کی بجائے غالباً کھاتے رہے ہیں۔ چنانچہ میں نے ان کو ایسی کتب واپس کر دیں تا کہ وہ ان کو اچھی طرح ہضم کر سکیں۔ ایک صاحب جب ایک بار میرا ذاتی مطالعہ کا قرآن مجید جس پر میں نے جا بجا حاشئے لکھے ہوئے تھے ایک دن کے وعدے پر لے جا کر چھ ماہ بعد بسیار تقاضوں پر واپس کرنے آئے تو میں پہچان تک نہ سکا، پھر ان کے بتانے اور بار بار الٹ پھیر کے بعد میں نے بعض نشانات سے شناخت کیا تو میں یہ کہے بغیر نہ رہ سکا کہ بھائی

صاحب یہ بتائیے کہ آپ اسے الماری میں رکھتے ہیں یا باورچی خانے میں، تو انہوں نے میری طرف حیرت سے دیکھا اور میری بات نہ سمجھ سکے۔

ایک مطالعہ کی کتاب کی زیادہ سے زیادہ عمر بیس پچیس ''مطالعہ'' ہوتی ہے، جب اتنے ہاتھوں سے وہ کتاب گذر جائے تو پھر گویا وہ ختم ہو جاتی ہے، لیکن یہ عمر بھی اس صورت میں ہوتی ہے جب اسے احتیاط سے پڑھا جا رہا ہو، لیکن یوں مانگے پر دی گئی کتب کی عمر گھٹ کر چند مطالعے رہ جاتی ہے اور جو کتاب ایک بار ''مطالعے'' پر چڑھ جائے پھر وہ بہت جلد دم توڑ دیتی ہے، جس طرح محاذِ جنگ پر گئے سپاہی کی زندگی کی گارنٹی ختم ہو جاتی ہے ایسی کتب بار بار خرید کر لائبریری میں رکھنی پڑتی ہیں۔

بعض کو دوسروں کی کتابوں کے حاشیوں پر اپنے نوٹ لکھنے کی دلچسپ عادت ہوتی ہے، وہ جو پسند آتا ہے اسے نشان زد کر دیتے ہیں، حاشیے پر اس کی تعریف یا مصنف کی تعریف میں مزید جملے لکھتے ہیں اور وہ عجیب و غریب جملے ہوتے ہیں۔ ''بھئی واہ کمال کر دیا۔'' کیا دندان شکن جواب ہے، اسے کہتے ہیں استدلال، بے شک، دریں چہ شک، اب کہو کیا کہتے ہو، یہ کتاب لاجواب ہے۔''

بعض حضرات کتاب پر اپنا نام لکھ دیتے ہیں، اپنی یادداشت کے لئے دوسرے احباب کے پتے نوٹ کر لیتے ہیں، اپنے بچوں کے نام لکھ دیتے ہیں، طبی نسخے لکھ لیتے ہیں، اپنے خطوط ان میں رکھ دیتے ہیں، بعض کتب پر ان کے بچوں نے خوش خطی کے عجیب و غریب نمونے جلی قلم سے دکھائے ہوتے ہیں۔

بعض لوگ کتب لیتے ہوئے خود کتاب پڑھنے کی نیت سے نہیں لیتے بلکہ محض کتاب لے جانے کی نیت سے لے لیتے ہیں، ان کا ارادہ پڑھنے کا ہوتا ہی نہیں۔

میری لائبریری کے خانوں میں کتنے ہی مقامات خالی پڑے ہیں۔ کتب کے دائیں بائیں جگہیں خالی ہیں جو کسی نئی ترتیب یا کسی نئی کتاب کے آجانے کے بعد پُر ہو جائیں گی۔ یہ خالی جگہیں ان کتب کی ہیں جو میرے مطالعہ پسند احباب لے گئے۔ ان میں سے بعض کے نام مجھے یاد ہیں بعض ذہن سے نکل چکی ہیں۔ بعض ڈائری میں کہیں نہ کہیں محض درج ہیں اور وہ بھی اس لئے درج ہیں کہ جب سال بھر بعد میں کتب کا جائزہ لوں تو وہ گم شدہ کتب کی فہرست میں شامل ہو جائیں۔ اس وقت میرے پاس ''رحمۃ للعالمین'' کی پہلی اور تیسری جلد موجود ہیں۔ ان کے درمیان خالی جگہ سے دوسری جلد غائب ہے۔ یہ جو صاحب لے گئے ہیں ان کا اتا پتا بھی بھول چکا ہوں۔'' الجہاد فی الاسلام'' غائب ہے۔ چھ ماہ پہلے ایک صاحب کسی کو دکھانے کے لئے تین دن کے وعدے

پر لے گئے تھے۔سید سلیمان ندوی مرحوم کی ’’سیرت النبی‘‘ کا چھٹا حصہ جو اخلاق پر مبنی ہے، غائب ہے، باقی ۵ جلدیں اس کا خلائے مفارقت پہلو میں لئے پڑی ہیں۔’’معارف الحدیث‘‘ کی پہلی جلد نہیں ہے، ایک دوست رمضان شریف میں مطالعہ کے لئے لے گئے تھے، اب بقرعید بھی گذر گئی ہے۔’’ترجمان السنہ‘‘ کی تیسری جلد غائب ہے جو صاحب لے گئے تھے، ان کا تبادلہ ضلع سے باہر ہو گیا ہے۔’’تفہیم القرآن‘‘ کی پہلی جلد ایک طالب علم سورہ مائدہ کی تیاری کے سلسلہ میں لے گئے تھے۔طالب علم صاحب نے امتحان پاس کر لیا لیکن میری کتاب غالباً انہوں نے اپنے انعام کے طور پر رکھ لی ہے۔علامہ محمد اسد کی شاہراہِ مکہ (Road to macca) لے کر کوئی صاحب ایسے گئے کہ شاید کتاب کے دیئے ہوئے نقشے کے مطابق مکہ شریف کا مبارک سفر پیدل ہی اختیار کر لیا ہے۔ایک صاحب میری ایک ضخیم طبی کتاب لے گئے کئی ماہ ہو گئے ہیں، اب میں منتظر ہوں کہ سن لوں کہ انہوں نے کسی شہر میں اسی کے بل پر کوئی مطب قائم کر لیا ہے۔ایک صاحب ’’نقوش‘‘ کا طنز و مزاح نمبر لے گئے تھے، مدت ہو گئی واپس نہیں ہوا۔سنتا ہوں کہ اس کے لطائف اب وہ اپنی مجالس میں بیان کرتے ہیں، جب تک سارے نمبر کے لطائف مجالس میں بیان نہ ہو چکیں اس کی واپسی کی امید عبث ہے۔

لیکن بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو کتاب لے جاتے ہیں، تو جاتے ہی اس پر دوسرا کاغذ چڑھا لیتے ہیں۔اسے کوئی داغ دھبا نہیں لگنے دیتے، بہت جلد واپس کر دتے ہیں، کتاب کو بھی امانت سمجھتے ہیں۔کتاب اگر خستہ حالت میں ہو تو جلد کرا کر واپس کرتے ہیں۔گم ہو جائے تو نئی کتاب بازار سے خرید کر لاتے ہیں۔توجہ سے پڑھتے اور اس پر گفتگو کرتے ہیں۔شکوک وشبہات رفع کرتے ہیں۔بعض اوقات کتاب دینے والے کی معلومات کو بھی تازہ کرتے ہیں۔بس ایسے ہی لوگ ہیں جن کو کتاب دینے کو جی چاہتا ہے اور جب وہ کتاب واپس لاتے ہیں تو دل چاہتا ہے کہ ان کو دوسری کتاب دی جائے۔یہی لوگ ہیں جو آگے چل کر ایک مقصدی کام میں ممد و معاون ثابت ہوتے ہیں۔لیکن ایسے لوگ خال خال ہوتے ہیں اور بہت سی کتابوں کی قربانی کے بعد ہی میسر آتے ہیں۔

کتاب سے شکوہ

محمد منور

اے کتاب تم مجھے بہت عزیز ہو، تم ماضی کی داستان سناتی ہو، حال کی ترجمانی کرتی ہو، تم مستقبل کی پیامبر ہو، تم اولادِ آدم کے احساسات کا محافظ خانہ اور امیدوں کا اندوختہ ہو، تم کامرانیوں کا گنجینہ اور عبرتوں کا مرقع ہو۔ تم بسیط فطرت کا آئینہ ہو کہ جو صاحبِ نظر اس میں جھانکے وہ ''کبھی جھومے کبھی لرز جائے''۔

تم حافظ شیراز کے معشوق کی طرح ''بہ شیوہ ہر کس برابر'' ہو۔ تمھارا شاعروں سے دوستانہ انشاء پردازوں سے رابطہ، فلسفیوں سے میل جول، سائنس دانوں سے خلوص، مہندسوں سے ملاپ، رندوں سے اختلاط زاہدوں سے نامہ و پیام اور مفتیوں سے تبادلہ سلام ہے۔ حق یہ ہے کہ تم عظیم الشان و دلربا ہو اور تم ان لمحات کی مونس و غمگسار ہو ''جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا''۔

میں نے تمھاری شان میں جو کچھ کہا ہے وہ اوپری دل سے نہیں کہا، محسوس کر کے عرض کیا ہے۔ تمھارے بارے میں میرا عمومی احساس فی الواقع یہی ہے، لیکن دیکھو ایک روز تم نے مجھے مولانا حالی کا یہ شعر پڑھایا تھا اور پھر مجھ سے داد بھی طلب کی تھی۔

باتوں سے شکایت کی، بو آتی ہے الفت کی
گر دل میں جگہ ہوتی، لب پر بھی گلہ ہوتا

چنانچہ اثباتِ عشق کی خاطر اپنی چند شکایات تمہاری خدمت میں پیش کرنے لگا ہوں۔ برا نہ مانو شکوہ محبت کی نشانی ہے نا؟ جہاں کسی کو کسی سے سروکار نہ ہو وہاں شکوہ کیسا؟ محبت کرنے والے کم بخت ویسے بھی کچھ زیادہ ہی حساس واقع ہوئے ہیں اور یہ حساسیت انہیں ہر لحظہ ''غیر محفوظ'' (Insecure) ہونے کا شعور دلاتی ہے اس لئے محبت کرنے والوں کا اجتماعی مزاج یہی ہے کہ جس سے بھی محبت کریں گے اس سے شکایت ضرور کریں گے۔ وہ میرا ایک دوست تھا ابو طالب کلیم، اسے وفات پائے کوئی زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔ آخر تین سو سال کس گنتی اور شمار میں ہیں۔ تمہیں یاد ہوگا اس سے میرا تعارف تمہیں نے کرایا تھا اور یہ کہہ کر کہ ''یہ عزیز ابو طالب کلیم نامی ملک الشعراء ہیں اور ان شہنشاہ کے ہیں جن کو صاحبقران ثانی شاہجہاں کے طور پر یاد کیا جاتا ہے۔'' میں آج تمہیں اسی کلیم کا ایک شعر سناتا ہوں۔

نیست بگیتی دو چیز ، جستم و کم یافتم
عاشق بے شکوہ را، آتش بے دود را

یعنی ''کلیم کو دو چیزیں تلاش بسیار کے باوصف نہ ملیں یا نہ ہونے کے برابر ملیں ایک عاشق بےشکوہ اور دوسری آتش بے دود'' اس مضمون کے دوسرے حصے کو بجلی کے اور سوئی گیس کے چولہوں نے بڑی حد تک خراب کر دیا ہے مگر پہلا حصہ جو ہم عاشقوں سے تعلق رکھتا ہے ہماری ہی طرح پائدار ہے۔ ہاں تو میں اگر شکایت نامہ پیش کرنے لگا ہوں تو اس سے یہ نہ جان لینا کہ میری محبت میں کوئی کمی واقع ہوگئی ہے بلکہ جب شکوہ سرہو رہا ہو اس وقت احساس محبت اپنی انتہائی شدت پر ہوتا ہے، میرا مطلب سمجھ گئی ہو نا محترمہ؟ لو اب ''خوگر حمد سے تھوڑا سا گلا بھی سن لو'' مگر دل کو ذرا مضبوط کر کے سننا۔

سب سے پہلے تو مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ تمھارا کنبہ سود در سود کے حساب سے بھی زیادہ حیران کن بلکہ پریشان کن صورت میں پھیل رہا ہے۔ تم اپنے اعزہ کو خاندانی منصوبہ بندی کے فائدوں سے آگاہ کرو اور بڑی سختی سے اس منصوبے پر عمل کراؤ۔ تمہارے کنبے کا یہ بے پناہ پھیلاؤ بنی نوع انسان کے لئے عذاب بنا رہا ہے۔ عذاب اس طرح کہ تحصیل علم کی راہیں کٹھن ہوتی جا رہی ہیں، دیکھو میں پہلے تمہیں باغ اور جنگل کی مثال دے کر کچھ سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں اگرچہ تم کند ذہن نہیں ہو تاہم میں جو معلم ٹھہرا لہٰذا عادت سے مجبور ہوں۔

تمہیں معلوم ہے کہ پودے جب کسی ترتیب اور مقدار کے پابند ہوں تو خوش منظر باغ کہلاتے ہیں، لوگ آتے ہیں حسین منظر کی داد دیتے ہیں، رگ و بو سے لطف اٹھاتے ہیں، سیر کرتے ہیں، کبھی یہاں بیٹھ رہے، کبھی وہاں بیٹھ رہے، کہیں دوڑنے لگے، کہیں لیٹ رہے۔ گویا باغ کی روح افزا فضا سے جسم و جان کو تقویت کی خوراک کھلا پلا کر چلے جاتے ہیں۔ مگر جب پودوں کی افراط ہو اور وہ گھنے ہوں تو وہ باغ کی بجائے جنگل کہلاتے ہیں، بعض اتنے دشوار گذار ہوتے ہیں کہ ان میں داخل ہو کر مختلف پودوں کو دیکھنا، ان کا رنگ و بو سے لطف اندوز ہونا، سیر کرنا، لیٹنا، بیٹھنا بھاگنا وغیرہ ناممکن ہوتا ہے۔ نہ مشاہدہ، نہ تفریح، نہ تقویت جان، نہ طاقت روح، نگاہ اشتیاق کناروں پر رکھی رہ جاتی ہے اگر داخل ہونے کی کوشش کرے تو پہلے ہی قدم پر نہ الجھی تو دوسرے پر الجھی، سلجھنے کی کوشش میں مزید الجھی اور پھر اٹک کر رہ گئی۔

اے کتاب تمہارا کنبہ علم کو گھنے جنگل کی طرح دشوار گذار بنا رہا ہے، علم کی کسی ایک شاخ تک رسائی حاصل کرنا چاہیں تو ہزاروں بے خار اور خار دار شاخیں سرِ راہ نظر آتی ہیں۔ کام کی بات تو تمہارے کنبے کے چند ہی افراد کے یہاں ہوتی ہے، باقی ایک دوسرے سے سن کر ایک دوسرے کو

سنانے چل کھڑے ہوتے ہیں۔ اور اپنی جگہ ''حوالدار'' یا یوں کہئے کہ حوالوں کے تحویل دار بن بیٹھتے ہیں۔ نتیجتاً اب یہ حالت ہوگئی ہے کہ اگر خود مرزا غالب یا حضرت علامہ اقبال ایم اے اردو یا فارسی میں غالبیات یا اقبالیات کا پرچہ رکھ بیٹھیں تو انشاءاللہ فیل ہو کر ہی رہیں گے، فیل ہونے کا باعث یہ ہوگا کہ بہت سے ''فلاں وہانویوں'' نے جو بے شمار کتابیں لکھ کر غالبیات و اقبالیات کے جنگل بنا دئے ہیں ان میں خود غالب و اقبال بھی گھس نہیں سکتے۔ اور پھر چونکہ وہ ان ''فلاں وہانویوں'' کی کتابوں کا حوالہ نہ دے سکیں گے جو تاجران علم کے کاروبار کی ساکھ ہیں تو لابد ہے کہ فیل ہوں گے۔ مجھے میرے ایک دوست نے جو شیکسپئر سے پرخلوص روابط کے مدعی ہیں ایک روز بڑے رازدارانہ لہجے میں بتایا کہ خود شیکسپئر ایم اے انگریزی کے اس پرچے میں جو اس کے متعلق ہے بارہا فیل ہو چکا ہے اور اب اس نے ایم اے انگریزی کا امتحان پاس کرنے کا ارادہ ہی ترک کر دیا ہے۔

اے کتاب تمہارے کنبے کے اس بے پناہ پھیلاؤ اور دشوار گذاری ہی نے بڑی حد تک علم کو کبوتر خانوں میں تقسیم کر دینے کی راہ ہموار کی ہے۔ پھر ان کبوتر خانوں کا ہر خانہ کئی بیضہ خانوں میں منقسم ہے، ان تنگ تر خانوں کے مکین اخصائی یا سپیشلسٹ کہلاتے ہیں، یہ اختصاص، علم کے تقریباً ہر شعبے میں رواج پا رہا ہے اور اس طرح کہ ہر شعبہ تقسیمات کی شعبدہ گری دکھائی دینے لگا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا ہے کہ ایک شعبہ علم کی ناک کے دائیں نتھنے کا اخصائی نیویارک میں ہے تو بائیں نتھنے کا ماسکو میں۔ دائیں ٹخنے کی ایک شریان کا ماہر لندن میں ہے تو دوسری شریان کا ماہر ٹوکیو میں۔

کیا دن تھے ارسطو کے اس کے زمانے میں پائی جانے والی مشہور کتابوں میں سے اکثر خود اس کی اپنی تصنیف تھیں، ارسطو کے بعد بھی صدیوں تک ایسے لوگ پیدا ہوتے رہے، جو علم کے جامع قرار پاتے تھے۔ وہ بیک وقت بہت کچھ ہوتے تھے۔ منجم بھی، طبیب بھی، فلاسفر بھی، سائنس دان بھی، فقیہہ بھی اور شاعر بھی، علوم کی روز افزوں قدرتی پیچیدگیاں بجا لیکن اگر تمہارا کنبہ کثرتِ آبادی کے ذوق کو جنوں نہ بنا لیتا تو کم از کم سپیشلسٹوں کے مابین اس قدر وسیع فاصلے نہ حائل ہوتے اور جیسا کہ بعض موقعوں پر نظر آتا ہے اختصاص وجود علم کے اترے ہوئے ناخنوں، پھٹی ہوئی جرابوں اور سگریٹ کی خالی ڈبیوں کی طرح عبث ہو کر نہ جاتا۔

اس شکایت سے دوسری شکایت بالکل اسی طرح خود بخود پیدا ہوتی ہے جس طرح کسی شخص کی انگلی ہلانے سے اس انگلی کی انگوٹھی بغیر کسی جرم وخطا کے بے آرام ہو، یہ کتابیں جو محض دیکھا دیکھی، گھونگھٹ اتارے، دکانوں، گھروں اور لائبریریوں پر حملہ آور ہیں اکثر اوقات ایک دوسری کی ہم ادا و ہم فہم ہوتی ہے۔ عموماً کوئی نئی ادا نہیں دکھاتیں، کوئی بات نہیں بتاتیں۔ مگر ان کے نیاز

مند تفاخر میں مبتلا ہو جاتے ہیں ایک کہتا ہے میں فلاں موضوع پر سند ہوں مجھ سے ذرا سنبھل کر بات کرنا ورنہ کتابوں کے نام ان کے مصنفوں کے ناموں سمیت دے ماروں گا، کوئی ضرب پہنچے تو میں ذمہ دار نہ ہوں گا، دوسرا کہتا ہے میں سند ہوں، مجھ سے گفتگو کرتے وقت ذرا احتیاط ملحوظ رکھنا نہیں تو دھرتی ہلے گی جب پسر سعد آئے گا۔

اگر کوئی ان بزرگوں اور عزیزوں سے پوچھے کہ حضرت آپ کے اسناد کی بنیاد کیا ہے تو عموماً جواب ملتا ہے۔ ''میں نے اس موضوع پر ایک سو گیارہ کتابیں پڑھی ہیں فہرست ملاحظہ ہو۔'' اور ''ملاحظہ ہو'' اسی دھونس کی ادا سے کہا جاتا ہے جس دھونس کی ادا کے ساتھ کوئی مغرور اور بر خود غلط شاعر پھسپھسی غزل پیش کر کے داد وصول کرنے کا ارادہ فرمائے۔

اب تمہیں انصاف کرو، کیا ممکن نہیں کہ ایک شخص نے تو اس موضوع پر کام کی ایک کتاب پڑھ کر بات پالی ہو اور دوسرے نے پانچ سو کتابیں دیکھ کر بھی کچھ نہ سمجھا ہو؟ میں نے ممکن بات کہی ہے نا؟ تم خود جانتی ہو کہ تمہارے نیاز مندوں کی عمارت وجود کی بالائی منزل ہوادار ہوتی ہے۔ اب کوئی ایسا شخص جو پانچ سو کتابوں کے مافیہ طوطے کی طرح رٹ بھی لے تو کیا؟ اسے کتابوں کی ایک فہرست یا تشریح کہہ لیجئے یا زیادہ سے زیادہ پانچ سو کتابوں کی ایک الماری قرار دے دیجئے، مگر الماری چوکیداری تو کرتی ہے، عالم نہیں ہوتی، تمہیں ایک روز بتایا تھا کہ کسی نے امام رازی سے کہا ''فلاں شخص نے صحیح بخاری مع اسناد حفظ کر لی ہے تو امام رازی نے فرمایا تھا'' چلو اچھا ہوا شہر میں بخاری شریف کا ایک اور نسخہ بڑھ گیا'' یاد رہے کہ یہ کتاب بخاری شریف تھی کوئی معمولی شے نہ تھی۔ تم جواب میں کہو گی کہ کثرتِ مطالعہ کی دھونس جمانے والوں کے قصور کی ذمہ دار میں کیوں؟۔ دیکھو بلا واسطہ نہ سہی بالواسطہ ہی سہی قصور تمہارا ہی ٹھہرتا ہے۔ میرے بزرگ دوست مرزا غالب نے خلقِ خدا کے خون کا سبب اگر یار کی مست خرامی کو قرار دیا تھا تو اس مست خرامی کی اعانت کا بار ضرور موج مئے پر ڈال دیا تھا۔

ثابت ہوا ہے گردن مینا پہ خونِ خلق
کانپے ہے موج مے تری رفتار دیکھ کر

تو ان بے دانش مغروران علم کی رگ گردن کو تناؤ کی جو تکلیف پہنچتی ہے اس کی ایک نہ ایک واسطے سے ذمہ داری تمہیں پر عائد ہوگی۔

ایک شکایت اور بھی ہے، وہ یہ کہ جب تمہیں کسی دور میں اعتبار و وقار حاصل ہو جاتا ہے تو پھر تم آئندہ ادوار کے بدلے ہوئے حالات سے آگاہ ہونے کے باوصف بعض اوقات اپنے وقار کی مدافعت پر خواہ مخواہ اڑ جاتی ہو۔ چونکہ تمہاری آراء کا سکہ چل چکا ہوتا ہے لہٰذا تمہاری آرا سے

اختلاف کرنے والوں کو اول تو خود ہی اظہار رائے کی ہمت نہیں ہوتی اور اگر کسی قدر ہمت ہوتی ہے تو تمہارے نیاز مند دیوانہ وار اس نئے "بندہ گستاخ کا منہ بند" کرنے بلکہ منہ توڑنے کے درپے ہو جاتے ہیں۔ زمانہ سیلِ رواں ہے، روز نئے حقائق سامنے لاتا ہے مگر تم ہو کہ افکار و آراء کا عجائب گھر بن کر سنگین مجسموں اور بعض اوقات حنوط شدہ پیکروں کے بل بوتے پت زندہ افکار و آراء کا مقابلہ کرنے لگتی ہو۔ تم جو کچھ بھی ہو بہر حال زندگی کے کسی پہلو کے کسی کروڑویں اربویں حصے کی نامکمل سی تصویر ہو یا تفسیر ہو۔ زندگی آگے نکل جاتی ہے، تم پیچھے رہ جاتی ہو یہ بالکل ناگزیر امر ہے مگر تم چاہتی ہو کہ جہاں تک بس چلے زندگی کو متحجر کر کے اپنے مسکنوں میں ڈال لے۔ تمہارے مسکن جنہیں عرفِ عام میں لائبریریاں کہا جاتا ہے ایک حد تک بوسیدہ افکار کے ممی خانے ہوتے ہیں ہاں مگر میں نے کہا ہے "ایک حد تک۔"

ایک تماشا اور بھی رونما ہوتا ہے وہ یہ کہ تمہارے اوراق کی آغوش راحت میں آرام فرمانے والے نظریئے باہم ٹکرانے لگتے ہیں، گھمسان کا رن پڑتا ہے، مگر کشتوں کے پشتے نہیں لگتے، جہاں قطرہ قطرہ خون گرتا ہے وہیں سے نئے نظریات پھوٹ نکلتے ہیں۔ یعنی نظریات کا تصادم ہی نظریات کو جنم دیتا ہے مطلب واضح ہے کہ ایسے نظریات براہِ راست زندگی کی پیداوار نہیں ہوتے۔ وہ منطق، جرح اور تنقید و تنقیح کی پیداوار ہوتے ہیں، اس طرح وہ نظریے ٹھوس حقائق سے رفتہ رفتہ دور چلے جاتے ہیں ایک کتاب سے نکلتے ہیں اور دوسری میں گھس جاتے ہیں، لازماً زبان بھی وہ نہیں رہتی جو عام فہم ہو، اس لئے کہ نظریوں کے تصادم میں اصطلاحیں زیادہ کام دیتی ہیں اور عام زبان بیچاری کام آجاتی ہے، پھر دشتِ زندگی کے ان آہوان رمیدہ کی چوکڑیوں پر مرنے والوں کا جو حشر ہوتا ہے وہ ظاہر ہے ایسے دیوانے بیچارے معلق ہو کر رہ جاتے ہیں، اصطلاحوں میں محصور، زندگی سے انہیں کوئی فراری قرار دیتا ہے، کوئی کاروان زیست کے بے مایہ غبار کا پسماندہ کہتا ہے اور کوئی "انٹلکچول" کے نام گرامی سے یاد کرتا ہے۔ تمہیں بتاؤ کیا ایسے قابلِ رحم لوگ تمہارے ہی ستم رسیدہ نہیں۔

علم کا معنی ہے جاننا، آگاہ ہونا، اس کا مطلب عقل مند ہونا ہرگز نہیں، یعنی تمہاری بدولت بنیادی طور پر نیاز مندوں کی معلومات میں اضافہ ہوتا ہے نہ کہ عقل میں۔ عقل کی پرورش اس کی جبلی صلاحیت کے تناسب سے ہوتی ہے لیکن دیکھا یہ ہے کہ جن لوگوں کو تمہارا راز ہر چڑھ جاتا ہے وہ فقط عالم کہلانے پر اکتفا نہیں کرتے، وہ عاقل کہلانے کے جنون میں مبتلا ہو جاتے ہیں، ویسے ان لوگوں کا عمومی اندازِ گفتگو یہ ہوتا ہے کہ چھوٹتے ہی اپنے مخاطبین کو "حوالہ باری" کا ہدف بنا لیتے ہیں فلاں نے اس ضمن میں یہ فرمایا ہے، فلاں نے یہ ارشاد کیا ہے، فلاں کا یہ فیصلہ ہے، فلاں کی یہ رائے

ہے گویا اقوال کے کنکر اور موتی اکٹھے پھینکتے چلے جاتے ہیں۔ وہ شمع ادراک ان کے پاس نہیں ہوتی جس کی روشنی میں تجزیہ وتمیز کر سکیں، پھر تم ہی خود بتاؤ کہ اگر کوئی شخص تنگ آجائے اور ''حوالہ باری'' کرنے والوں سے پوچھ بیٹھے کہ عزیزو، بزرگو میں آپ سے بات کرتا ہوں، آپ جواب کسی آنجہانی سے لاتے ہیں، اگر میں یہ پوچھوں کہ فلاں مسئلے کے بارے میں ارسطو کی کیا رائے ہے تو ضرور بتاؤ کہ ارسطو کی رائے یہ ہے، مگر جب رائے آپ کی پوچھی جائے اور آپ جواباً کسی اور بزرگ کا قول میرے سر پر دے ماریں تو یہ کہاں کی شرافت ہوگی؟ کیا آپ دوسروں کا آموختہ دوہرانے والے میاں مٹھو ہی رہیں گے، خود کچھ نہ سوچیں گے؟ خدا کے لئے یہ بتائیں کہ اس مسئلے پر آپ نے بھی کچھ سوچا؟ پھر آپ کی اپنی رائے کیا ہے؟

بات وہی ہے کہ علم ایک الگ آفت کا نام ہے اور عقل ایک الگ بلا کا نام ہے۔ لیکن اے کتاب! نام لے کر دونوں چیزوں کو باہم گڈمڈ کر دیا جاتا ہے ہم آئے دن سنتے ہیں کہ دیکھو صاحب! فلاں شخص اتنا پڑھا لکھا ہے مگر اس نے یہ کیا ہی احمقانہ حرکت فرمائی ہے، یا یہ فلاں شخص کے پاس اتنی علمی سندیں ہیں مگر اس کا طور طریقہ اور کردار ایسا اور ایسا ہے۔ حق یہ ہے کہ تم میں سے کسی کے ضمیر یا ضمیر کو بدلنے کی صلاحیت بہت ہی کم پائی جاتی ہے۔ اے کتاب تم روشن چراغ ہی سہی مگر ان کے لئے جن کی آنکھیں بابصر ہوں۔ لہٰذا تمہاری بدولت علمی سند پانے والے اور اس بنا پر عقل کی ڈینگیں مارنے والے دیوانوں کا علاج یہ ہے کہ ان کے لئے کتابوں کی جگہ برت کر ان کی قبر تعمیر کی جائے اور انہیں اس قبر میں ان کی سندوں کے کفن میں لپیٹ کر دفن کر دیا جائے۔

ہے نا ظلم کی انتہا؟ ہم سے کہا جاتا ہے کہ فلاں نے تاریخ کی اتنی مستند کتابیں پڑھ رکھی ہیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ وہ بڑا نیک اور ہمدرد ہمسایہ ہے۔ ہم کہتے ہیں، یہ کیا تک ہے؟ پھر ہم کو بتایا جاتا ہے کہ فلاں نے ادب پر اتنے درجن کتابوں کی شرح لکھی ہے لہٰذا واضح ہو گیا کہ وہ شریف آدمی ہے، ہم عرض کرتے ہیں کہ یہ کیا گھپلا ہے؟ بھلا اس کا اس سے کیا تعلق ہے؟ پھر ہم سے کہا جاتا ہے کہ فلاں نے علومِ عسکری کی اتنے درجن چوٹی کی کتابیں ملاحظہ کی ہیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ وہ بڑوں کا ادب کرتا ہے، ہم پوچھتے ہیں بھئی اس کا اس سے کیا ربط؟ پھر ہم سے کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص کے پاس انجینئری کی اتنی اور اتنی اور اس اور اس درجے کی کتابیں ہیں جن کو سمجھے بغیر انجینئری کی سند حاصل نہیں کی جا سکتی لہٰذا ثابت ہوا کہ وہ محبِ وطن ہے؟ ہم کہتے ہیں اس کا اس سے کیا واسطہ؟ وعلیٰ ہذا القیاس۔ دیکھا اے کتاب تمہارے نام سے کیا کیا کھیل کھیلے جا رہے ہیں؟

اے کتاب! ان باتوں کے علاوہ ایک بڑا نازک معاملہ تمہارے گوش گذار کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ آیا کبھی فرصت کے لمحات میں تم نے سوچنے کی زحمت گوارا کی تم جن اشخاص کے فکر و

ذہن کی نمائندگی کر رہی ہو وہ واقعی اپنے دور کے سب سے اعلیٰ مفکر اور عالم تھے یا ہیں؟ تم سینکڑوں برس سے جن افکار کا ڈھنڈورا پیٹ رہی ہو کیا پتہ وہ اپنے دور کے معمولی اہلِ علم میں شامل کیے جاتے ہوں۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ وہ لوگ جنہوں نے کتابیں نہیں لکھیں وہ علمی دنیا کے مشاہیر سے بدرجہا بہتر علمی، فکری اور تخلیقی صلاحیتوں کے مالک ہوں؟ اس لئے مجھے تم سے یہ بھی شکایت ہے کہ تم حتمی طور پر عظیم ترین عالم، مفکر اور محقق افراد کی نمائندہ نہیں ہوتیں۔ کبھی سوچا تو ہوتا کہ اے کاش کہ وہ اور وہ لوگ جو کچھ لکھتے، بارہا یوں ہوتا ہے کہ جو عالم ہیں وہ لکھتے نہیں اور جو لکھتے ہیں وہ عالم نہیں۔ مگر تمہیں کیا، تمہیں تو اپنی انفرادی اور اجتماعی خودی کی نگہبانی کرنی ہے۔ ہم جئیں، ہم مریں تمہاری بلا سے۔ بقول حالی:

دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام
کشتی کسی کی پار ہو یا درمیاں رہے

میں دیکھ رہا ہوں کہ تم برا مان گئی ہو، تم میں اب مزید کچھ سننے کی تاب نہیں، تم بھرپور جواب شکوہ ارشاد کرنے پر تلی بیٹھی ہو۔ میں جواب شکوہ ضرور سنوں گا، مگر کسی آئندہ ملاقات پر۔

کتا بوخولیا

ارشد میر

آ ج کل کے مادی دور میں ہر چیز روپےاور کرنسی کے پیمانہ سے ناپی جاتی ہے۔حتی کہ اگر کسی شخص کی ناسازی طبع کا سن کر اس کا کوئی یار غار یا قرابت دار اس کی مزاج پرسی کے لیے بھی جائے تو وہ اسے دیکھتے ہی یا بیٹھتے ہیں برجستہ یہی کہتا ہے کہ اب تو خدا کے فضل و کرم سے روپے میں پچاس پیسیوں کا افاقہ ہے یا بس دوٹکوں کی کسر رہ گئی ہے۔اور اگر ڈاکٹروں کے مسلسل نئے مشوروں، رنگ برگی گولیوں مختلف سائز کے ٹیکوں اور بوقلموں ناشنیدہ اور ناگفتہ بہ بیماریوں کی تشخیص کی بنا پر کہیں زیادہ ہی مایوس ہو گیا ہو۔تو پھر بستر مرگ پر کراہتا ہوا بھی یہی رٹ لگاتا ہے کہ زندگی ہے بس شرمندگی ہے بس گنتی کے سانسے پورے کر رہا ہوں اصل میں سودا ہی بک چکا ہے میاں نظیر سچ کہہ گئے ہیں۔

''سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارہ''

چنانچہ اسی مال و زر کے سوداگر بلکہ سوداگری کا یہ ادنیٰ سا کرشمہ ہے کہ زندگی سے مایوس شخص کو دنیا کے فانی ہونے کے متعلق خیال آتا ہے۔تو اس قسم کا شعر یاد آتا ہے۔

از خرابات عدم تا سر بازار وجود
بتلاش کفنے آمدہ عریانے چند

(یعنی ملک عدم کے ویرانے سے چند عریاں لوگ اپنے کفن کی تلاش میں دنیا کے بازار میں آ گئے ہیں۔)

مختصر یہ کہ آپ کو اب گرد و نواح میں مختلف اقسام مالیخولیا کے شکار انسانوں کا ایک انبوہ کثیر نظر آتا ہے جو دونوں ہاتھوں سے مال اکٹھا کر کے اپنے اپنے نفسیاتی خولیاؤں میں بند ہیں۔ انہیں صرف اپنی ذات سے تعلق ہے۔اور وہ ملک و قوم بلکہ ہمسایوں کے بارے میں سوچنا گوارا نہیں کرتے۔اس ننانوے کے پھیرے انہیں اخلاقی اقدار سے بالکل بے نیاز کر دیا ہے ابتدا میں یہ لوگ اقلیت میں تھے لیکن آہستہ آہستہ ان کی طلسم ہوشربا بیماری، ایک روز افزوں اکثریت کو آکاس بیل کی طرح اپنی لپیٹ میں لے رہی ہے۔

ظاہر ہے جب صورت حال اس قدر مخدوش ہو جائے۔تو کتابوں کے بارے میں سوچنا بھی تضیع اوقات کے سوا کچھ نہیں اور پھر کتابوں میں لکھنا چھپوانا اور پڑھنا اگرہفت خواں طے کرنے کے مترادف ہے لیکن ان مراحل کے طے کرنے کرانے میں تو پھر ایک دوگونہ لذت ہے۔ لیکن صاحب یہ جو کتابیں اکٹھی کرے کا مرض کچھ لوگوں کو لاحق ہے۔اور پھر اکٹھی کرنا ہی مقصود نہیں ہوتا بلکہ ان کی حفاظت اور نگہداشت بھی اپنی جان سے زیادہ کرنی ہوتی ہے۔ان کے متعلق آج تک کسی نے سنجیدگی سے غور ہی نہیں کیا۔غالباً اس لیے کہ اس دور استحصال میں ہر شخص دوسرے کے کاندھے پر بندوق رکھ کر چلانے کا دلدادہ ہے۔ چنانچہ اسی ترکیب استعمال فارمولا اور طریق واردات پر کتابی دنیا میں عمل ہو رہا ہے کہ جہاں مصنفوں اور ناشروں کی ساز باز سے کتاب بن سنور کر گویا مرحلہ بلوغ تک پہنچا کر عام قارئین یا لائبریریوں کے حوالے ''سپردم بتو مایۂ خویش را'' کے انداز میں کر دی جاتی ہے جہاں وہ ان کی جوانی سے لے کر بشرط زندگانی طبعی عمر فانی تک اپنی جان پر کھیل کر نگرانی بھی کرتے ہیں۔اور یوں مصنف اور ناشر حضرات طویلے کی بلا بندر کے سر ڈال کر بی جمالو کی طرح خود بری الذمہ ہو جاتے ہیں اور پھر جب کتاب اپنے اصلی مگر بے نوا پرستاروں کے ہتھے چڑھ جاتی ہے تو پھر وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر اس میں گم صم ہو جاتے ہیں۔یہی وہ لوگ ہیں جن کو دل جلے اور شفا سے مایوس مریض کتابوخولیا کہہ کر الگ ہو جاتے ہیں یہ مرض عام طور پر مزمن اور دائمی ہو جاتا ہے لیکن یہ یاد رہے کہ یہ اس مرض کا نام ابھی دریافت ہوا ہے۔لیکن یہ مرض کوئی نیا نہیں ہے بلکہ اپنے جلو میں صدیوں پرانی تاریخی روایات لیے ہوئے ہے۔ایک خرابی اور ہے اور وہ یہ کہ ایک لحاظ سے یہ مرض متعدی ہے۔ جسے عامیانہ استعارے میں کتابی چھوت چھات کا مرض بھی کہا جا سکتا ہے۔کہ اس کے جراثیم بھی بڑ کے درخت کی طرح وسیع پیمانے پر پھیلنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ابتدامی ں تو یہ مرض درباروں اور روسا کے کتب خانوں تک ہی محدود تھا۔لیکن آہستہ آہستہ کتابیں عام اور سستی دستیاب ہونے لگیں تو پھر سفید پوش بھی اس موذی مرض کا شکار ہو گئے۔

ایک زمانہ میں تو علم کا بول بالا تھا اور اسے اوّلیت کا شرف حاصل تھا۔لیکن پھر حساب ور شماریات کے چکر میں اسے ثانوی حیثیت اختیار کرنی پڑی یہ علیحدہ بات ہے۔کہ حساب دوستاں در دل اور کتاب دوستاں در گل یعنی در دلال محفوظ ہوتے ہیں۔اس کتابی دلدل کا نام الماری ہے اور الماری کا نام چلا ہے۔تو آپ جانتے ہیں۔کہ آج کل تو نئی الماری بنانا بھی زمانہ قدیم کے ایک مکان بنانے کے برابر ہے۔کتاب اچھی خاصی مہنگی ہو کر بھی سینے پر سل رکھ کر خریدی جا سکتی ہے۔ لیکن نئی الماری بنوانے کے لیے تو چیتے کا جگر، شیر کا دل اور بانڈز میں نکلی ہوئی یا جوئے میں جیتی ہوئی رقم کی ضرورت ہے پھر معاملہ یہیں ختم نہیں ہوتا۔ بلکہ ایک طرف الماریوں کی تالہ بندی کا

اہتمام ہورہا ہے۔تو دوسری طرف جلد ساز ڈھونڈے جارہے ہین۔کبھی الماریوں کے خانوں میں اخبارات کتابوں کی حفاظت کے لیے بچھائے جارہے ہیں۔تو کہیں ان پر دیدہ زیب گرد پوش جڑھانے کا خبط سوار ہے۔اور یوں یہ سارے مرحلے طے کر کے کتاب کی نشست و برخاست کا انصرام ہوتا ہے۔ان مراحل کو بھی اگر بخیر وخوبی سرانجام دے دیا جائے۔تو پھر ان کتب کو بحفاظت تمام رکھنے کے لیے ایک مخصوص کمرہ درکار ہوتا ہے۔لیکن جوں جوں ان کی تعداد بڑھتی جاتی ہے بلکہ ہرنئی آنے والی کتاب لائبریری کی زینت بن کر عمر بھر کے لیے زیب زندان کتابستان بن جاتی ہے تو پھر معاملہ گھر کے ایک کمرے سے بڑھتا بڑھتا اس حد تک پہنچ جاتا ہے کہ گھر کا کوئی کمرہ بھی ان کی دخیل کاری سے نہیں بچتا۔حتی کہ ایک مقام پر پہنچ کر دیواروں میں لگی ہوئی الماریوں سے لے کر صندوقوں اور میزوں تک بلکہ چارپائی کے چاروں طرف کتابوں کا حصار کھینچنا پڑتا ہے کئی دفعہ تو تکیہ بھی انہی کا بنا کر اسی تکیے پر تمام زندگی بسر ہو جاتی ہے بلکہ کلمۃ الایمان بھی یہ ہوتا ہے۔

مریں گے ہم کتابوں پر
ورق ہوں گے کفن اپنا

بات کہاں کہاں پہنچ گئی۔ذکر خیر تو کتابوخولیا کا ہو رہا تھا۔اس سلسلہ میں مصنف کی خواہش ہوتی ہے۔کہ کتاب کا تمام سٹاک پورے داموں پر فروخت ہو جائے جبکہ ناشر زیادہ سے زیادہ کمیشن لینے کا خواہاں ہوتا ہے۔اور وہ مصنف کو شہرت اور عظمت کے نت نئے چکمے دے کر اسے کتابوخولیا کے رنگین جال میں پھنسانے کے لیے کتاب کی چھپائی کی رقم بھی اکثر اس سے بٹور لیتا ہے جبکہ آج کا خرانٹ قاری کتاب ہی مفت حاصل کرنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارتا ہے۔مصنف غریب لاکھ چاہے اس کے پاس بمشکل ایک آدھ کاپی ہی ریکارڈ میں رکھنے کے لیے بچی کھچی رہ جاتی ہے۔وگرنہ مفت کتاب حاصل کرنے والوں کا اس وقت تک تانتا بندھا رہتا ہے جب تک انہیں یقین نہ ہو جائے۔کہ مصنف اپنے پورے کتابی اثاثہ سے ہاتھ دھو بیٹھا ہے۔یوں یہ لوگ مانگے تانگے کی کتابوں پر ''رئیس الکتب'' بن جاتے ہیں۔ہمچوں قسم کے ایک شخص کے بارے میں مشہور ہے۔کہ اس نے ایک اچھی خاصی لائبریری پر آہستہ آہستہ ہاتھ کی صفائی دکھانی شروع کی۔جب لائبریری کا وافر حصہ خالی ہو گیا۔تو پھر لائبریرین نے تنگ اور لاچار ہو کر لائبریری کا بورڈ اس شخص کے مکان پر جا کر آویزاں کر دیا اور بورڈ پر ان حروف کا اضافہ کر دیا کہ اب لائبریری منتقل ہو کر یہاں آ گئی ہے۔

کتابوخولیا کے شکار یعنی کتابوں کے پرستار و جان نثار اعزازی طور پر یا چوری یا خیرات کے ذریعہ ہی کتابیں حاصل نہیں کرتے بلکہ اہل عیال کا پیٹ کاٹ کر خود فاقوں سے دوچار ہو کر

میلوں کی مسافت طے کر کے ان میں اضافہ کرتے رہتے ہیں۔ ان کا موٹو کتابوں کے متعلق انگریزی کا ایک مقولہ ہے جس کا مفہوم ہے ''مانگ لو، مستعار لے لو، ورنہ چرا لو'' ان عاشقان کتب کا حد سے زیادہ انہماک بالآخر ان کا گھیلو سکون تباہ کر دیتا ہے جس کی وجہ سے ان کے گھر میں دیوان پریشانی کی گردان رہتی ہے لکہ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ اگر چہ بقول غالب

دھول دھپہ اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں

لیکن پھر بھی معاملہ دھینگا مشتی تک پہنچ ہی جاتا ہے۔ ان کتابوں کے ہجوم کو ہوم گورنمنٹ یعنی رفیقاء حیات سوکنوں میں شمار کرتی ہے۔ بچے خیال کرتے ہیں کہ اصل اولاد یہی کتب ہین۔ کہ جن کے جھرمٹ میں ابا حضور کی طبیعت ہشاش بشاش رہتی ہے اور انہیں ٹرخانے یا جھڑکیاں دینے کے لیے بطور تختہ مشق رکھا ہوا ہے۔ اسی طرح والدین شکوہ سنج ہوتے ہیں کہ انہیں ہماری کیا پروا کہ ان کا عشق صادق تو صرف کتابوں ہی سے ہے۔ ہاں کتابوں سے کبھی فرصت ملی تو ایک اچٹتی سی نظر ادھر بھی ہو جائے پھر یہی نہیں۔ دوست احباب یہی ان کے کتابوں سے والہانہ عشق کے متعلق بے خبری کی وجہ سے سمجھتے ہیں کہ ان سے مسلسل بے رخی اور بے اعتنائی خواہ مخواہ برتی جا رہی ہے۔ جس کی وجہ سے وہ علیحدہ و بیزار نظر آتے ہیں۔

بچوں کی نگہداشت اور پرورش بھی اپنی جگہ خاصہ ٹیڑھا اور مشکل کام ہے۔ ان سے انسان اپنے آخری ایام عمر کے لیے کچھ امیدیں وابستہ کر لیتا ہے اور پھر کبھی کبھار فی الواقع یہ بڑھاپے کا سہارا بھی بنتے ہیں (شاید اسی کا نام ہے خوش فہمی شیفتہ) لیکن اگر ان کی تعداد کسی کنبہ میں عاشقی قید شریعت میں آ کر جلوہ کثرت اولاد دکھا دے تو پھر خواہ اہل خانہ اس ہنگامہ پر گھر کی رونق موقوف سمجھ لیں۔ قومی سطح پر اسے پسندیدہ نظروں سے نہیں دیکھا جاتا۔ بلکہ قومی سے لے کر بین الاقوامی سطح تک زیادہ بچوں کی پیدائش کے خلاف وسیع پیمانہ پر منظّم پروپیگنڈہ کیا جا رہا ہے۔ یہی نہیں اس مقصد اور غرض کے لیے تو محکمہ فیملی پلاننگ وجود میں آ چکا ہے کہ جو بچوں کی پیدائش کی روک تھام کے لیے غیر ملکی خیرات کا خزانہ دونوں ہاتھوں سے لٹا رہا ہے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ اس سفید ہاتھی کی بدولت بتدریج شرح پیدائش میں حیرت انگیز اضافہ ہو رہا ہے گویا۔

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

یہی نہیں عالمی سطح پر بچوں کی صحیح پرورش کے لیے دن ہفتے اور سال تک بڑے تزک و احتشام سے منائے جاتے ہیں۔ اور وقتاً فوقتاً ان کے ایک گھرانے کے لیے کم سے کم تعداد کی حد بندی بھی کرتے رہتے ہیں۔ لیکن ان کے برعکس کتاب پروری اور کتابو خولیا تو بڑا مہنگا سودا اور ذہنی فتور کا باعث مشغلہ ہو کر رہ گیا ہے۔ لیکن جو لوگ کتاب کے اصل پجاری ہیں۔ وہ حریض دولت

مندوں کی طرح انہیں لاتعداد دیکھ کر اور ان کے روز افزوں اضافہ سے بھی مطمئن نہیں ہوتے۔ بلکہ ان کی زندگی کی واحد کمزوری یہ قرار پاتی ہے۔ کہ ان میں مرتے دم تک بے پایاں اضافہ ہوتا رہے۔ جس طرح مشہور ہے۔ کہ سیٹھ لوگ روز الماریوں کے پٹ وا کر کے روپوں کی گڈیاں دیکھ کر شاداں وفرحاں ہوتے اور صحت برقرار رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بعینہٖ یہ کتابی قارون کتابوں کی الماریاں کھول کر مسرت وانبساط کے جذبات سے ہمکنار ہوتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں۔ جو عشق مجازی اور عشق حقیقی دونوں سے بے نیاز ہو کر صرف عشق کتابی ہی کے ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اور فقط کتابوں کی مخصوص اور ان کے نزدیک بھینی بھینی خوشبو ہی سے اپنا مشام جاں معطر رکھتے ہیں۔ کتابوں کے اس بے پناہ عشق بلکہ خبط کی وجہ سے وہ صرف نیند کی مقررہ ساعتوں کے علاوہ کتاب کا مطالعہ باورچی خانہ اور غسل خانہ میں بھی کرنے سے نہیں چوکتے۔ بلکہ اسے کار خیر کے زمرے میں شمار کرتے ہیں بلکہ انہیں تو نیند بھی کتاب کے توسط ہی سے آتی ہے ورنہ تیز سے تیز تر خواب آور گولیاں بھی ان کا بال تک بیکا نہیں کرسکتیں۔ ان میں سے کچھ لوگ تو شادی بیاہ بلکہ مرگ کے موقع پر بھی کتاب پڑھنے سے باز نہیں رہتے۔ جس طرح مٹی کے ساتھ آدمی بالآخر مٹی ہو جاتا ہے اسی طرح کتابی کیڑوں کے ساتھ ساتھ کئی کتاب کے دلدادہ بھی کتابی کیڑا ابن کرمن وتو کی تفاوت کی منزل سے نکل جاتے ہیں۔ بلکہ ان کی دانست میں بقول اقبال اس طرح

دانہ خاک میں مل کر گل وگلزار ہوتا ہے

اسی مخصوص طبقہ یعنی کتابوں کے عاشق کے بارے میں ایک شاعر نے تنگ آ کر یہاں تک کہہ دیا تھا کہ

کیڑے کی طرح لگ گیا ظالم کتاب کو

اگرچہ لوگ کچھ عرصہ تک کتابیں پڑھنے سے باز رہیں۔ تو پھر وہ فرصت کے ایام کتابوں کی الماریوں میں الٹ پلٹ کرنے آڑا تر چھا جمانے، موضوع وار لگانے اور مصنفوں کے حساب سے سجانے میں صرف کر دیتے ہیں۔ یا پھر ان کی ساون بھادوں میں صحن یا کوٹھے پر لے جا کر اتھل پتھل کی جاتی ہے۔۔ اور کبھی سن سٹروک (Sun Stroke) کی پروا کیے بغیر انہیں جیٹھ ہاڑ کی کڑاکے دار دھوپ میں رکھا جاتا ہے۔ ایسا کرنے سے بعض اوقات ان گنت کتابوں کی دھول پھانک کر ضیق النفس یا دق کا شکار ہو جاتے ہیں بلکہ تاریخ پرورش کتب میں اکا دکا مثالیں ان شہدائے کتب کی بھی ملتی ہیں جو دنیا و مافیہا سے بے خبر ارد گرد کتابوں کا ڈھیر سجا کر مطالعہ میں مستغرق تھے کہ کتابوں کی ایک لمبی چوڑی دیوار ان پر بجلی بن کر گری اور وہ وہیں جاں بحق ہو گئے۔ اس نوع کے لوگ چونکہ بالآخر وسوسوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اس لیے ہمہ وقت کتابی دنیا میں گذارتے

ہیں۔ اگر شومئی قسمت سے انہیں کوئی کتاب نہ ملے تو پھران کا دن کا آرام اور رات کی نیندیں حرام ہو جاتی ہیں۔ اس حالت میں کسی اور کام کے کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ جب تک متعلقہ کتب نہ مل جائے۔ اسے الماریوں یا گردونواع میں بکھرے ہوئے ڈھیروں سے ڈھونڈ نہ لیں انہیں کسی کل چین نہیں آتا۔ جب یہ کتاب خاصی تگ ودو کے بعد مل جاتی ہے۔ تو باچھیں کھل جاتی ہیں۔ اور یوں محسوس کرتے ہیں جیسے خزانہ غیبی مل گیا ہے۔ اور پھر کتاب کیا ملتی ہے۔ اسی وقت گھوڑے بیچ کر خواب خرگوش کے مزے بھی لینے لگتے ہیں۔

اس سلسلے میں تصویر کا دوسرا رخ بھی قابل توجہ ہے کہ بعض اوقات کچھ لوگ کا سرے سے کتاب سے کوئی تعلق واسطہ ہی نہیں ہوتا لیکن انہوں نے محض علمی دکھاوے کے لیے یہ سارا ڈرامہ رچایا ہوتا ہے۔ وہ نئ سے نئ اور قیمتی سے قیمتی کتب خرید کر یا اغوا کروا کر اپنی لائبریری کی زینت بناتے ہیں۔ یا پھر جعلی عکس ڈالنے اور علمی وادبی رعب جمانے کے لیے ڈرائینگ روم میں سجاتے ہیں۔ لیکن یہ عقل کے بدھو بھول جاتے ہیں کہ عقابی نظروں والے پھر بھی بھانپ جاتے ہیں کہ یہ کس فضا میں ہیں اور ان کا مبلغ علم کیا ہے۔ چونکہ اس قبیل کے بزعم خود باذوق حضرات کا قلبی تعلق اور رجحان کتاب کی طرف نہیں ہوتا۔ اس لیے ان کے ملازم جس طرح چاہیں کتابیں لگاتے پھریں ان کی بلا سے کیوں کہ انہیں تو صرف کتابوں کی تعداد اور کمرے کی ظاہری سج دھج سے لگاؤ ہوتا ہے تا کہ ہر آمدہ ملاقاتی یا قرابت دار پہلی نظر میں ان کی بے شمار کتابیں دیکھ کر متاثر ہو۔ اور انہیں اگر عالم فاضل نہیں تو کم از کم صاحب ذوق ہی سمجھ لے۔

ان کے علاوہ ایک اور قماش کے لوگ ہیں جنہیں ورثہ میں کتابوں کا نادر ذخیرہ مل جاتا ہے۔ اب وہ مجبوراً اس کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ بادی النظر میں بزرگوں کی علمی فضیلت کے گن بھی گاتے ہیں۔ اپنے کتب خانے کا پرچار بھی کرتے ہیں۔ لیکن فی الواقع کتابوں کے ڈھیروں سے تنگ آئے ہوتے ہیں اس لیے تنہائی میں اپنے آباء کو کوستے ہیں۔ کہ خود بھی عمر عزیز لایعنی مشغلہ یعنی کتابیں اکٹھی کرنے میں صرف کر دی اور جاتی دفعہ یہ مصیبت لواحقین کے کھاتے میں ڈال گئے۔ اب یہ کتابیں بھی ان کے لیے سانپ کے منہ میں چھپکلی کی طرح ہوتی ہیں کہ نہ انہیں رکھنے کے موڈ میں ہوتے ہیں اور نہ ہی ان سے کنارہ کشی کرتے ہیں۔ البتہ اگر قسمت یاور ہو تو پھر کبھی کبھار ان کا ذخیرہ کتب کسی آسمانی آفت، زمینی یلغار، ذاتی غفلت، یا ازماست کہ برماست یعنی کتابی کیڑوں کے ہاتھوں برباد ہو جائے تو پھر دل کی اتھاہ گہرائیوں سے شکر خداوندی بجا لاتے ہیں۔ ویسے کتابی کیڑوں کی بھرمار اور آسمان سے باتیں کرتی قیمتوں کی وجہ سے اب کسی طور کتب پروری عام آدمی کے بس کا روگ نہیں بلکہ یہ ہابی یعنی پسند خاطر مشغلہ تو اب رؤسا اور جاگیرداروں

کے لیے ہی مخصوص ہونا چاہیے کہ جن کے ان کی خرید اور حفاظت کے لیے بندوبست استمراری ہوسکتا ہے۔ لیکن اس کا ایک تدارک ہو کہ یہ طبقہ اکثر کتاب کی بجائے، کباب، شراب اور رباب کا قدردان رہا ہے۔

تاریخ پاک و ہند اس امر کی شاہد ہے کہ یہاں ایک زمانے میں مرنے والوں کے ساتھ ان کے لواحقین زیورات، پارچہ جات اور قیمتی چیزیں دفن کر دیا کرتے تھے۔ لیکن آہستہ آہستہ یہ رواج ختم ہوگیا۔ ان دنوں جبکہ لوگوں کا کتابوں سے کوئی رابطہ قائم نہیں رہا۔ اس صورت حال میں پرورش کتب کے شائقین کو اگر قبروں میں چند کتب ہی میسر آجائیں یا پھر ان کی قبروں کی چاردیواری ہی ان سے استوار ہو جائے۔ تو یہ بھی بہت بڑی بات ہوگی اور کم از کم کتاب کے پجاریوں کو یہ تسلی تو ہوگی کہ وہ سکندر اعظم کی طرح دنیا سے دونوں ہاتھ خالی لے کر نہیں جا رہے۔ بلکہ اپنے ساتھ دولت علم کا اچھا خاصا ذخیرہ لے کر جا رہے ہیں۔

سرسید نے تو زبانی کلامی یہاں تک کہہ دیا تھا کہ باری تعالیٰ روز قیامت مجھ سے پوچھیں گے کہ دنیا سے کیا لے کر آئے ہو تو میں بلا جھجک کہوں گا۔ ''مسدس حالیؔ'' وقتی طور پر اس اعلان سے واہ واہ اور مرحبا صد مرحبا کی صدائیں خوب بلند ہوئیں لیکن سچ پوچھیے تو مجھے سرسید کی اس بے ذوقی پر بہت رونا آیا۔ ان سے تو وہ صاحب ذوق نکلا۔ جس نے کہا تھا

چوں روز محشر ہر کسے در دست گیرد نامۂ
من نیز حاضری شوم تصویر جاناں در بغل

(یعنی جب محشر کے دن ہر شخص کے ہاتھ میں اپنا نامۂ اعمال ہوگا میں بھی وہاں محبوب کی تصویر بغل میں دبا کر پہنچ جاؤں گا۔)

سرسید مرحوم نے کتابوں میں سے چھانٹی بھی تو ''مسدس حالی''، انہیں یہ خبر بھی نہ تھی کہ ابھی ''حیات جاوید'' بھی معرض وجود میں آئے گی۔ یوں بھی دیکھا جائے۔ تو سرسید کے اس مذکورہ تاریخ اعلان سے بھی عملاً کوئی فائدہ نہ ہوا۔ سرسید دنیا سے رخت سفر باندھنے سے قبل مسدس حالی کا ایک خوبصورت نسخہ ہی محفوظ کر کے بستر مرگ پر رکھ لیتے یا کم از کم وصیت ہی کر جاتے کہ ان کی قبر میں مسدس حالی کا ایک قیمتی اور نادر قلمی نسخہ مولانا حالی کے دستخطوں سے ضرور دفن کیا جائے۔ اس سے ایک تو سرسید فی الواقع اللہ میاں کے حضور سرخرو ہو جاتے (اگر یہ نسخہ قیامت تک کتابی کیڑوں سے محفوظ رہ جاتا) دوسرے اس شاندار روایت کے بل بوتے پر کتاب پروری کے دلدادگان کو اپنے ہمراہ بعد مرگ کتابیں لے جانے کی خاصی سہولت رہتی۔ ویسے تو اب بھی اس کار خیر کا آغاز اہل خانہ سے کروایا جا سکتا ہے۔ لیکن صاحبو! اس مادی دور میں گھر والوں کو یہ کہاں منظور ہوگا کیوں کہ ایسا

کرنے سے کافی وزن کی کتابیں قبر کی چار دیواری میں پہنچانا ہوں گی۔ اور یوں معتد بہ ردی کم فروخت ہونے سے بچ جائیں دوسری اشیا رکھنے کے کام لائی جاتی ہیں۔ یا پھر چند ورثا اپنے بزرگوں کے برعکس جو تمام عمر کتابیں پڑھنے میں سر کھپاتے رہے۔ اپنی صحت کا ستیاناس کرتے رہے کہ مرنے کے بعد موٹی موٹی کتابوں سے ڈنٹر پیلنے کا کام لے کر اپنی جان بناتے ہیں کچھ ان پڑھ سلیقہ شعار خواتین ان کتابوں کو تندور میں ڈال کر روٹیاں پکانے کے کام بھی لاتی ہیں۔

المختصر کتابیں زندگی میں کتاب پروری کے عاشقوں کو روحانی تقویت دیتی ہیں اور اگر وہ کیڑوں کی دست برد سے بچ جائیں تو پھر مرنے کے بعد اہل خانہ کے اقتصادی مسائل کے حل کرنے میں مدد و معاون ثابت ہوتی ہیں۔ اس ساری صورت حال کو دیکھتے ہی ہم اس کے سوا اور کیا کہہ سکتے ہیں۔

''ہر کس بہ خیال خویش خبطے دارد''

کیا آپ اتنے نکمے ہیں کہ آج تک کوئی کتاب نہیں چرائی!

شیما صدیقی

مشتاق یوسفی کے بقول جس نے آپ کو کتاب دی، اس کی بے وقوفی اور جس نے کتاب واپس کر دی وہ اس سے بھی بڑا بے وقوف۔ جہاں کسی صاحبِ علم کو دیکھیے، ایک ہی رونا روتا ہے کہ صاحب معاشرے کے زوال کی وجہ یہی ہے کہ لوگوں نے کتاب سے ناتا توڑ لیا ہے، لائبریریاں سنسان پڑی ہیں اور کتابیں اپنے پڑھنے والوں کا نشاں ڈھونڈتی ہیں۔۔۔لیکن نہیں، یہ تو سراسر الزام ہے۔ اگر یقین نہیں آتا تو دو چار اعلیٰ درجے کی کتابیں خرید لیجیے اور چند ہی روز میں وہ چوری (وہ بھی دھڑلے سے) نہ ہو جائیں تو کہیے گا۔

ایسے میں کفِ افسوس ملنے کے بجائے چور صاحب کی سینہ زوری کو داد دیجیے اور دو نفل شکرانے کے بھی ادا کر لیجیے کہ اللہ نے آپ کو کسی باذوق چور کے ذہن کی آب یاری کرنے کے قابل بنایا۔ دراصل اس میں قصور چور صاحب کا بھی نہیں کہ کتب بینی ایک چسکا ہے، جسے لگ جائے تو پھر وہ کہیں کا نہیں رہتا، ایسے چرسیوں کے لیے اچھی کتاب کسی محبوبہ سے کم نہیں کہ جہاں نظر پڑی، بس اسے ٹکٹکی باندھ کر دیکھا کیے۔۔شاعر صاحب تو پہلے ہی فرما گئے۔

سُرورِ علم ہے کیفِ شراب سے بہتر
کوئی رفیق نہیں کتاب سے بہتر ؟

ہم آج آپ کے سامنے کچھ اپنی چوری (سینہ زوری نہیں) کا ذکر لیے بیٹھے ہیں۔ ہماری چوری ہے 'کتاب کی چوری'۔ یہ کوئی ایسی گناہ نہیں جس میں صاحبِ علم ہاتھ دھونا نہ چاہے بلکہ فروغ علم میں یہ ننھی سی چوری اکثر اکسیر کا کام کرتی ہے۔

کیا؟ آپ نے آج تک کوئی کتاب نہیں چرائی؟ یہ تو کچھ ایسا ہی ہے کہ ابھی تک آپ کے دودھ کے دانت ہی نہ نکلے ہوں یا چلیں، نکل گئے تھے تو ابھی گرے ہی نہیں۔ اب آدمی کو اتنا بھی سست نہیں ہونا چاہیے کہ ایک کتاب بھی نہ چرا سکے۔ ویسے ہم نے باقاعدہ چوری نہیں کی، محض پڑھنے کے لیے لی تھی اور نیت یہی تھی کہ پہلی فرصت میں پڑھتے ہی واپس ایسے ہی رکھ دیں گے۔

صاحبِ کتاب کو کیوں کر اندازہ ہو سکے گا کہ ہم نے بھی کچھ اپنے علم کی آب یاری کر لی، ہاں فرشتوں کے لکھے پر تو پکڑے ہی جائیں گے۔

لیکن جناب صرف ہمارا ہی قصور نہیں، اب خاندان میں سے کسی کی کتاب ہمارے پاس آ گئی تو یہ بھی طے شدہ ہے کہ ہماری بھی بہت سوں کے پاس ہوں گی۔ پچھلے دنوں کی بات ہے کہ جب رضا علی عابدی کی 'اخبار کی راتیں' کی ضرورت پڑی اور جب ڈھنڈیا پڑی تو کتاب غائب اور مزید غم کی بات یہ ہے کہ وہ تمام کتابیں جو ہم نے اپنی جیبِ خاص سے خریدی تھیں، اب ان سات آٹھ کتابوں میں سے صرف ایک دو کتابیں ہی ہماری لائبریری کا حصہ ہیں، باقی کیا ہوئیں اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔

آپ بھی کتاب سے محبت کرنا چاہتے ہیں تو سب سے پہلے اپنے کسی دوست سے کتاب مانگ لیں، نہیں دیتا تو آپ کو پتا ہی ہے کہ کیا کرنا ہے!

ہم علم بانٹنے پر پختہ یقین رکھتے ہیں اور لوگوں کو بھی اُکساتے رہتے ہیں کہ وہ کتاب پڑھیں۔ ہماری بھی غلطی کہ ہم کو پہلے تو اتنی فرصت ہی نہیں مل پاتی کہ کتاب دیتے ہوئے کہیں لکھ رکھیں۔ ہر بار سوچتے ہی رہ جاتے ہیں، دوسرا لوگوں کو بھی چاہیے کہ اپنا نام لکھ رکھیں تو ہم کو بھی ان کی کتاب واپس کرنے میں آسانی ہو جائے۔

آج ہم آپ کے بتاتے بلکہ اُکساتے ہیں کہ آپ بھی ہماری 'چوری' سے فیض یاب ہوں۔ اس کے لیے آپ کو کوئی خاص صلاحیت کی ضرورت نہیں، بس کچھ چیزیں بے خودی میں سرزد ہو ہی جاتی ہیں، اس کام میں زیادہ محنت بھی نہیں کرنا پڑتی اور کتاب آپ کی ہو جاتی ہے۔ عقل سلیم، شوق طلب اور شعوری کوشش آپ کو چشم زدن میں 'کتب چوروں' کی صف میں لا کھڑا کرتی ہے۔ آپ بھی کتاب سے محبت کرنا چاہتے ہیں تو سب سے پہلے اپنے کسی دوست ہی سے مدد لیں اور اس سے کتاب مانگ لیں۔ نہیں دیتا تو آپ کو پتا ہی ہے کہ کیا کرنا ہے، بس بے خودی کا شکار ہوں اور بھول جائیں۔ دوست پوچھے تو بتا ضرور دیں کہ بھائی پڑھنے کے لیے لی ہے، دے دیں گے۔ ہم جھوٹ بولنے کی ترغیب بالکل نہیں دیں گے، ویسے بھی نیت تو واپس کرنے کی ہی ہونی چاہیے۔

''جس نے آپ کو کتاب دی، اس کی بے وقوفی اور جس نے کتاب واپس کر دی وہ اس سے بھی بڑا بے وقوف''، مشتاق یوسفی

صاحبو! اعمال کا دارو مدار نیتوں پر ہوتا ہے۔ کہہ دیجیے گا بس ذرا کتاب پر دل آ گیا تھا۔ کیا کریں، اماں باوا کی تربیت جو ہمیں کہیں اور دل لگانے ہی نہیں دیتی۔ اور ہم بھی ٹھہرے مسکین، تو

بس کتاب ہی پر اکتفا کیا اور اس ننھی سی رنگین چیز پر دل ہار بیٹھے۔ بقول شاعر دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت! کیا کریں ایک کے بعد ایک غالب یاد آ رہے ہیں۔ وہ شعر تو سنا ہی ہوگا کہ عشق ہے وہ آتش غالب، جو بجھائے نہ بجھے جو لگائے نہ لگے! تو آپ بھی اپنی علم کی پیاس کو کتاب دوستی سے اور بڑھا وا دے ڈالیں۔

ویسے اپنے مشتاق احمد یوسفی نے تو فرما ہی دیا ہے کہ 'جس نے آپ کو کتاب دی، اس کی بے وقوفی اور جس نے کتاب واپس کر دی وہ اس سے بھی بڑا بے وقوف' تو حضرات، جہاں کتب بینی آپ کی فہم و فراست کا بین ثبوت ہے، وہاں آپ کی علم دوستی کا بھی مظہر ہے۔

کتب سے رشتہ جوڑے رکھیے اور خوش رہیے۔ کبھی آپ کو اندازہ ہو کہ سامنے والا آپ کی کتاب کو جس پر آپ کا نام بھی تحریر ہے، ہاتھ سے چھوڑتا ہی نہیں اور کتاب سے محبت اس کی آنکھوں سے ٹپکی پڑ رہی ہے تو دل نرم کیجیے اور اپنی آنکھیں بند کر لیجیے۔ دوست کو چھوٹی سی چوری کرنے دیں، سمجھیں یہ بھی ایک طرح کا صدقہ اور نیکی ہے۔ دل پر بوجھ نہ لیں۔ کتاب کا کیا ہے، آپ کی چیز ہے، اس پر آپ کا نام حق کی طرح ثبت ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ احسان کا بدلہ احسان ہی ہوتا ہے۔ آپ پر کسی نے احسان کیا، آپ کسی پر کر رہے ہیں، بس دنیا کا یہی چلن ہے، زندگی ایسے ہی چلتی رہتی ہے۔ چلتے چلتے آخر میں فیض سے معذرت کے ساتھ اپنا شکوہ پیش کیے دیتے ہیں:

مجھ کو شکوہ ہے میرے بھائی کہ تم جاتے جاتے
لے گئے ساتھ میری عمرِ گزشتہ کی کتاب

فیض نے یہ شعر اپنے بھائی کی موت پر کہا تھا، لیکن ہم اس شعر کا سہارا لیتے ہوئے اپنا شکوہ عزیزوں اور دوستوں تک پہنچانا چاہتے ہیں۔ یہ شکوہ ان تمام خواتین و حضرات سے بھی ہے، جو کچھ ایسی کتابیں بھی ہماری نہیں رہنے دیتے جو ہم نے بڑے شوق اور دل سے لی تھیں کہ بس ذرا تھوڑی فرصت ملے تو مزے سے پڑھیں گے، لیکن جب مزہ لینے کا وقت آتا ہے تو دل کو ٹھیس لگتی ہے کہ وہ کتاب اب ہماری نہیں رہی۔ تو میرے عزیز بہنو اور بھائیو! جن جن کے پاس ہماری کتابیں ہیں، ہو سکے تو ہمیں پڑھنے کے لیے ہی دے دیں، بڑی مہربانی ہوگی!

مشہورِ زمانہ ممنوعہ کتب

ڈاکٹر ارشد معراج

یوں تو ہر عہد میں کوئی نہ کوئی کتاب عتاب سہتی رہی ہے ان میں بعض کتابیں ایسی بھی تھیں جو بنی نوع انسان کی تقدیر بدلنے کے کام آئیں۔ لیکن اپنے اپنے دور میں وہ ممنوع قرار دی گئیں۔ کتابوں پر پابندی لگانے کی روایت اسی قدر پرانی ہے جس قدر فن تحریر۔ کسی بھی نوعیت کی کتاب پر پابندی آزادیٔ اظہار پر پابندی ہے۔

چوتھی صدی عیسوی میں جب مشہور رومن شہنشاہ کان لسٹنسٹائن نے عیسائی مذہب قبول کر لیا تو اس نے سب سے پہلے ان تحریروں اور شاعری پر پابندی لگا دی جو بادشاہ کے قبول عیسائیت سے قبل اہل روم اور یونان میں مقبول عام تھیں اور جن سے ردعیسائیت کی بو آتی تھی۔

عوامی جمہوریہ چین میں جب لوگوں کو مذہبی کتب سے دور رکھا گیا تو انھوں نے مذہبی کتب کو زبانی یاد کرنا شروع کر دیا اور بعض اوقات تو ان مذہبی کتابوں میں استعمال ہونے والے ناموں سے ہی اپنے بچوں اور نواسوں کو پکارنے لگے۔

کیتھولک چرچ نے ایسے کئی عوامی اجتماعات منعقد کروائے جن میں سرعام ناپسندیدہ کتب جلائی جاتی تھیں۔ وہ اسے ایمان کو بچانے کا عمل قرار دیتے تھے۔ بعض اوقات معاملہ کتاب کو جلانے تک محدود نہیں رکھا جاتا تھا بلکہ کتاب کے ساتھ ساتھ مصنف کو بھی جلانا عین ثواب سمجھا جاتا تھا۔

روم کا مشہور چوراہا Field of Flowers مصنفین کو زندہ جلانے کی یادگار سے ہی عبارت ہے۔ جرڈانو برونو Giordano Bruno کو اسی چوراہے میں جلایا گیا تھا۔ گزشتہ ۱۷۰۰ سال میں کتب کو جلانے کے حوالے سے سب سے منظم اور ذمہ دار ادارہ کیتھولک چرچ ہی رہا ہے۔

پنڈت جواہر لال نہرو قدیم چینی تہذیب کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''۲۴۶ قبل مسیح میں چوتھا چی ین بادشاہ ہوا۔ وہ نہایت ہی عجیب وغریب آدمی تھا۔ اس کا اصلی نام ونگ چنگ تھا لیکن اس نے شیہ ہوانگ ٹی کا لقب اختیار کیا اور اسی نام سے وہ مشہور ہے۔ اس کے معنی ہیں ''پہلا شہنشاہ'' اس کی نظر میں اپنی اور اپنے زمانے کی بہت

وقعت تھی اور ماضی کا بالکل قائل نہ تھا بلکہ چاہتا تھا کہ لوگ ماضی کو بھول جائیں اور سمجھیں کہ تاریخ اسی سے یعنی ''پہلے شہنشاہ'' سے شروع ہوتی ہے۔ اس کے نزدیک اس کی کوئی اہمیت نہ تھی کہ تقریباً دو ہزار سال تک چین میں متواتر بادشاہ ہوتے رہے تھے۔ وہ چاہتا تھا کہ اس سرزمین سے ان کی یاد بھی محو ہو جائے اور نہ صرف پچھلے شہنشاہوں کو بلکہ تمام دوسرے مشہور لوگوں کو بھی بھلا دیا جائے۔ لہذا اس نے حکم جاری کیا کہ ایسی تمام کتابیں جن میں پچھلے زمانے کا کوئی تذکرہ ہو خصوصاً تاریخ کی اور کنفیوشس کے زمانے کی علم و ادب کی سب کتابیں جلا دی جائیں حتی کہ ان کا ایک نسخہ بھی کہیں دستیاب نہ ہو سکے۔ صرف طب اور اسی قسم کے بعض دوسرے علوم کی کتابوں کو مستثنیٰ قرار دیا گیا تھا۔ اپنے فرمان میں اسے نے لکھا تھا کہ: ''جو لوگ موجودہ زمانہ کی اہمیت کو کم کرنے کے لیے ماضی کی اہمیت کو بڑھائیں گے انہیں ان کے اہل خانہ سمیت قتل کر دیا جائے گا۔'' یہی نہیں کہ اس نے صرف یہ حکم جاری کر دیا تھا بلکہ اس پر عمل بھی کیا اور سینکڑوں عالم فاضل جنہوں نے اپنی محبوب کتابوں کو چھپانے کی کوشش کی زندہ دفن کر دیئے گئے۔''[۱۱]

اس میں کوئی شک نہیں کہ شی ہوانگ ٹی نے پرانی کتابوں کو جلوا کر اور ان پڑھنے والوں کو زندہ دفن کرا کے بڑی بربریت کا ثبوت دیا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کا سب کیا کرایا اسی کے ساتھ ختم ہو گیا۔ اس کا زوال اور خاتمہ سب پچاس سال کے اندر اندر ہو گیا۔ خاندان نیست و نابود ہو گیا اور تمام ممنوعہ کتابیں خصوصاً کنفیوشس کے زمانے کی علمی و ادبی تصانیف زمین کھود کھود کر نکال لی گئیں اور انہیں پھر عزت کا درجہ حاصل ہوا۔

ڈاکٹر کوثر محمود نے اپنے مضمون ''بائبل کے ترجمے کی کہانی'' میں بائبل کے تراجم کے حوالے سے لگائی جانے والی مختلف پابندیوں اور قید و بند کی صعوبتوں کے علاوہ قتل کیے جانے کے واقعات کو یوں قلم بند کیا ہے:

سن ۶۷ء میں سینٹ پال کو روم میں قتل کر دیا گیا اس نے عبرانی میں کچھ خطوط لکھے۔۔۔ چونکہ چرچ کی طرف سے بائبل کو صرف لاطینی زبان میں لکھے جانے کی پابندی تھی لہذا پوپ وائی کلف کے انگریزی میں ترجمہ کرنے سے اس قدر مشتعل تھا کہ اس نے انگریزی زبان کے اس محسن کو اس کے مرنے کے ۴۴ سال بعد یوں رسوا کیا کہ اس نے حکم دیا کہ جون وائی کلف کی ہڈیوں کو قبر سے نکالا جائے اور انہیں چورا چورا کر کے دریا میں بہا دیا جائے اور پوپ کے احکامات کے حرف بحرف تعمیل ہوئی لیکن اس ظالمانہ رویے کے باوجود معاملات چرچ کے ہاتھوں سے نکلتے گئے اور عام لوگ انگریزی ترجمے کی بدولت

آسمانی صحائف کو اپنی زبان میں پڑھ کر سمجھنے لگے لیکن چرچ کا معاندانہ رویہ برقرار رہا۔۔۔۱۴۱۵ء میں چرچ کے ظلم کا اگلا شکار جون ہس (Jhon Hus) تھا۔ یہ بھی وائی کلف کا شاگرد تھا چرچ نے فتویٰ دیا تھا کہ جس شخص کے پاس لاطینی زبان کے علاوہ کسی اور زبان میں بائبل کا نسخہ ہوگا وہ واجب القتل ہوگا جون ہس کو بھی اس جرم میں زندہ جلوا دیا گیا اور مقام عبرت ہے کہ ایندھن کے طور پر جون وائی کلف کے انگریزی ترجمے کو استعمال کیا گیا یعنی اپنی ہی مقدس کتاب کو ایک ایسے شخص کے جلانے کے لیے نذر آتش کیا گیا جس کا جرم صرف یہ تھا کہ اس کے پاس بائبل کا ترجمہ پایا گیا۔ بہرحال جب جون ہس کو جلایا جا رہا تھا تو اس کے آخری الفاظ یہ تھے ''سو سال بعد خدا ایک ایسے شخص کو پیدا کرے گا جو اصلاحات کا پیامبر ہوگا اور اس کے پیغام کو دبایا نہیں جا سکے گا''۔۔۔مارٹن لوتھر پہلا شخص تھا کہ جس نے علی الاعلان بائبل کا جرمن زبان میں ترجمہ کیا اور عام آدمی کی رسائی مقدس تحریروں تک ہوگئی۔۔۔اسی سال فوکس (Foxe) کی کتاب 'کتاب شہداء' (Foxe Book of Martyrs) شائع ہوئی اس کتاب میں فوکس کا بیان ہے کہ چرچ نے سات لوگوں کو اس جرم میں زندہ جلوا دیا کہ وہ اپنے بچوں کو لاطینی کی بجائے انگریزی میں انجیل کی تعلیم دیتے تھے۔ ۲۶-۱۵۲۵ء میں ایک اور عالم فاضل ولیم ٹن ڈال (William Tyndale) جسے انگریزی زبان کا معمار کہا جا سکتا ہے۔ اس نے بائبل کا پہلا مستند اور مکمل ترجمہ شائع کیا اور انگریزی زبان کو بائبل کی شکل میں ایک معیار اور سند فراہم کی کیونکہ وہ آٹھ زبانوں کا ماہر تھا اور اس نے کمال عرق ریزی سے بائبل کا انگریزی ترجمہ کیا۔ لیکن بدقسمتی سے بشپ نے ٹنڈال کو زندہ جلوانے کی بجائے اس ترجمے کی کاپیاں ضبط کرنے کا حکم دیا لیکن کچھ کاپیاں بادشاہ کی خواب گاہ میں چھپا دی گئیں اور بشپ اور بادشاہ ہنری ہشتم نے اس ترجمے کی تقسیم پر پابندی عائد کر دی اور چرچ نے اعلان کیا کہ اس ترجمے میں ہزاروں غلطیاں ہیں جب کہ اس میں ترجمے کی کوئی غلطی نہ تھی لیکن اس ترجمے کو کثیر تعداد میں نذر آتش کیا گیا۔۔۔ بالآخر ٹن ڈال کو (غالباً جرمنی) فرار ہونا پڑا لیکن اس کے ترجمے کو روئی کی گانٹھوں اور آٹے کے تھیلوں میں چھپا کر انگلستان لایا جانے لگا لیکن ۱۵۳۶ء میں ولیم ٹنڈال کو گرفتار کر لیا گیا اور ۵۰۰ دنوں کے بعد اس کو بھی زندہ جلوا دیا گیا۔۔۔ ۱۵۵۵ء میں ملکہ میری نے انگریزی بائبل کے پبلشرز راجرز (Rogers) اور تھامس کران مر کو زندہ جلوا دیا۔[۲]

یورپ کے تاریک دور میں یونان اور روم کی تمام کتابوں کو شیطانی علوم قرار دے کر تہہ

خانوں میں بند کر دیا گیا۔ مسلمان خلیفہ مامون الرشید نے روم کے کتب خانے جو بند کر دیے گئے تھے ان کی کتابیں اونٹوں پر مال و دولت بھیج کر اس کے عوض خرید لیں۔ روم کے لوگ اس امر پر حیران تھے کہ اس مسلمان خلیفہ کے پاس دولت کی فراوانی ہے جو شیطانی علوم کو خرید رہا ہے۔ حالانکہ وہ اس مصیبت سے نجات حاصل کرنا چاہتے تھے۔ مامون الرشید نے بہت بڑے پیمانے پر دارالتراجم قائم کروائے اور سارے علوم وفنون کو ترجمہ کیا گیا۔ یہی ترجمہ بعد میں یورپ کی نشاۃ الثانیہ کی تحریک میں کام آیا۔

بغداد کے کتب خانے ایک عہد میں دنیا بھر میں علم کی روشنی پھیلانے میں مصروف تھے جب یورپ غفلت کی گہری نیند سو رہا تھا۔ اس عہد میں بغداد علمی سرزمین کے حوالے سے شہرت رکھتا تھا۔ لیکن بد قسمتی سے ہلاکو خان کے حملوں نے کتاب کے ان خزانوں کو جہالت اور گمراہی کی وجہ سے نذر آتش کر دیا جس کے باعث امت مسلمہ کو نقصان سہنا پڑا اور پوری دنیا میں علم کی روایت ختم ہو گئی۔

کوپرنیکس کی کتاب 'حرکت اجرام سماوی' ۱۵۴۳ء میں مکمل ہوئی۔ انہوں نے جس شاہکار پر اتنی مدت تک محنت کی تھی ممکن تھا وہ کبھی معرض اشاعت میں نہ آتا اور دنیا اس سے محروم رہتی لیکن ایک نوجوان جرمن فاضل جارج جوریٹیکس کی کوشش سے کتاب منظر عام پر آئی۔ ریٹیکس نے کوپرنیکس اور ان کے تجربات کا ذکر سن لیا تھا اور وہ طویل ملاقات کے لیے فاضل ہئیت دان کے پاس پہنچ گیا۔ بوڑھے ہئیت دان کے انکشافات کا علم حاصل کیا تو بے حد متاثر ہوا۔ چنانچہ ۱۵۴۰ء میں اس نے بمقام ڈانزگ کوپرنیکس کی تصنیف کا ''ایک ابتدائی مرقع'' چھاپ دیا یہ دنیا میں تہلکہ انگیز نظریات کا پہلا بیان تھا۔

کوپرنیکس کے نظریات کو قبول کر لینے کی رفتار نہایت سست تھی سائنس دان بھی اور عوام بھی دونوں متأمل سے رہے۔ چند افراد کے سوا عام معاصر رائے ان کے سخت خلاف تھی۔ مارٹن لوتھر نے کوپرنیکس پر سخت نکتہ چینی کی۔ جان کیلون نے بھی ان کی مذمت میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ ۱۶۱۵ء میں یہ کتاب اس فہرست میں شامل کر دی گئی جس میں مندرج کتابوں کی اشاعت ممنوع تھی۔ دو سو سال سے بھی زیادہ عرصے تک یہ اسی فہرست میں شامل رہی۔

گلیلیو ابتدائی دور میں کوپرنیکس کے نظریئے کے حامی تھے جس میں سورج کو کائنات کا مرکز ثابت کیا گیا تھا۔ گلیلیو نے کوپرنیکس کی حمایت میں جو روش اختیار کی اس سے ارباب کلیسا بے پرواہ رہنے کی بجائے سخت سرگرم عمل ہو گئے۔ دوربین کی ایجاد نے گلیلیو کے لیے پہلی بار موقع بہم پہنچایا کہ ہئیت میں بڑی بڑی دریافتیں کر سکیں۔ گلیلیو نے دوربین کے ذریعے جو دریافتیں کی وہ تفصیل سے ایک کتاب میں چھاپ دی گئیں جس کا نام 'پیغامبر انجم' رکھا یہ کتاب ۱۶۱۰ء میں شائع ہوئی۔

مقصد یہ تھا کہ تمام فلسفیوں اور ریاضی دانوں کو بعض مشاہدات سے آگاہ کر دیا جائے اس کی بناء پر گلیلیو کو پہلی مرتبہ مذہبی گروہ سے تصادم کی نوبت آئی۔ مذہبی گروہ کو یہ خطرہ لاحق ہوا کہ جو نظریہ کوپرنیکس نے پیدا کر دیا تھا یعنی یہ کہ کائنات کا مرکز سورج ہے۔ مذہبی گروہ نے فیصلہ کر لیا کہ کلیسا کی سند کے خلاف کسی کو چوں وچرا کی اجازت نہیں۔

پیر بال کی 'فرہنگ تاریخ وانتقاد' ۱۶۰۷ء میں شائع ہوئی اس تصنیف میں عقلیت اور رواداری کی روح فرمائی تھی اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ فرانس میں اسے شائع کرنا ممنوع قرار پایا۔ لوئی چہارہم جیسے بادشاہوں کو بال کی کتاب پر یہ اعتراض تو تھا ہی کہ اس میں آرتھوڈکسی کا فقدان ہے، لیکن بال نے ان کے متعلق طنزیہ باتیں بھی کیں۔ جن سے ان کے عیوب ونقائص آشکارا ہوتے تھے۔ اس سے رنج اور بھی بڑھا۔ اس ممانعت سے چنداں فائدہ نہ ہوا کیونکہ جلد ہی کتاب کے مکمل نسخے نیز اس کے خلاف فرانسیسی زبان میں بھی شائع ہو گے اور اس کے ترجمے جرمنی، انگلستان اور سوئٹزرلینڈ میں بھی پہنچ گئے۔ پھر اس کی بہت بڑی تعداد سرحد پار کر کے پیرس کے تاجران کتب کے ہاں بکنے لگی۔

۱۶۱۶ء میں تعذیب مذہب کے مقدس ادارے کی طرف سے گلیلیو کی مذمت کی گئی اور حکم جاری ہوا کہ وہ اس ادارے کے رئیس اعلیٰ کارڈنیل بیلر مائن کے روبرو پیش ہو۔ وہاں پہنچتے ہی فرمان صادر ہوا کہ زمین، سورج اور ستاروں کے متعلق ملحدانہ خیالات سے دستبردار ہو جائے۔ 'پیغامبر انجم' نیز دوسری کتابوں کو جن میں حرکت زمین کا دعویٰ کیا گیا ہے ممنوع الاشاعت کتابوں کی فہرست میں شامل کر دیا گیا۔ پندرہ دن تک گلیلیو مقابلتہً خاموش رہے۔ اسی اثناء میں نیا پوپ منتخب ہوا یعنی اربن ہفتم جیسے زیادہ آزاد خیال سمجھا جاتا تھا امید پیدا ہوگئی کہ سائنٹیفک انکشافات کے متعلق اس کی روش زیادہ ہمدردانہ اور متوازن ہوگی۔ گلیلیو نے پھر ایک عہد آفرین کتاب پیش کر دی جس پر وہ سال ہا سال سے محنت کرتے رہے تھے۔ اس کا نام 'دنیا کے دو بڑے نظاموں کے باب میں مکالمات' رکھا۔ پاپائی احتساب سے بچنے کے لیے گلیلیو نے اس کے آغاز میں ایک پارسایانہ تمہید لکھی جس میں کوپرنیکس کے نظریئے کی مذمت اس بناء پر کی گئی کہ وہ مقدس صحیفوں کے خلاف ہے۔ ظاہر ہے یہ ایک نمائشی پردہ تھا۔ کیونکہ کتاب میں واضح طور پر ہر سوال اور اعتراض کے سلسلہ میں کوپرنیکی نظام کی حمایت کی گئی تھی۔

'مکالمات' کے شائع ہوتے ہی گلیلیو کے دشمنوں نے پوپ کو یقین دلایا کہ یہ خلاف دین و مذہب ہے۔ چند ماہ بعد گلیلیو کو دوبارہ پیشی بھگتنی پڑی اور انہیں روم بلایا گیا۔ اس وقت ان کی عمر ستر سال تھی اور صحت اچھی نہ تھی لیکن وہ 'ادارہ تعذیب مذہبی' کی پیشی پر مجبور ہوئے۔ انہیں صاف صاف بتایا گیا کہ اگر ان سائنٹیفک عقائد سے دست بردار نہ ہوئے تو تعذیب کے مستوجب ٹھہرو

گے۔ گلیلیو نے سر تسلیم خم کر دیا۔ اپنی غلطی کا اقرار کرتے ہوئے کہا ''میں اعلان کرتا ہوں اور حلف اٹھاتا ہوں کہ زمین سورج کے گرد نہیں گھومتی'' اس کہانی میں ایک الحاقی فقرہ لگا دیا گیا کہ گلیلیو عدالت سے باہر نکلے تو اس حدیث زیرلب کے طور پر کہا ''یہ بہرحال گھومتی ہے۔''

'مکالمات' کو ممنوع الاشاعت کتابوں کی فہرست میں شامل کر لیا گیا اور ۱۸۳۵ء تک ممانعت کی پابندی نہ اٹھی۔ گلیلیو کو سزائے قید کا حکم ہوا لیکن یہ حکم جاری نہ ہو سکا کیونکہ وہ اپنے گھر فلارنس چلے گئے اور رسمی اعتبار سے نظر بند ہوئے۔ سائنٹیفک چھان بین کا سلسلہ مزید آٹھ سال تک جاری رکھا موت سے کچھ مدت پیشتر ان کی سب سے بڑی تصنیف "Discources on two sciences" ۱۶۳۸ء میں خفیہ طور پر ملک سے باہر بھیج دی گئی اور ہالینڈ سے شائع ہوئی۔

ٹیوڈر اور سٹوارٹ بادشاہوں کے زمانے میں انگلستان کے جس ادارے سے حد درج نفرت کی جارہی تھی وہ سٹار چیمبر کی عدالت کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ اس عدالت کا اولین وظیفہ یہ تھا کہ کتابوں کو سنسر کرے۔ چھاپہ خانہ کے ایجاد ہونے کے بعد یہ مذہبی اور ملکی پالیسی کا ایک نہایت اہم کام بن گیا تھا۔ جب رومن کیتھولکوں نے جوابی اصلاح کا سلسلہ شروع کیا تو سنسر پر زیادہ سختی سے عمل ہونے لگا۔ ۱۶۴۲ء میں خانہ جنگی شروع ہونے سے بیشتر بہت سے ایسے معاملات سامنے آئے تھے جن میں سنسر کے خلاف عوام کے غصے کی آگ بری طرح بھڑک اٹھی تھی۔ جن لوگوں کو مجرم قرار دیا گیا تھا، انہیں طویل مدت کے لیے قید کر دیا گیا۔ علاوہ بریں بھاری جرمانے کیے گئے اور ایسی ہی دوسری بے رحمی و بے دردی کی سزائیں دی گئیں۔ جب شاہ چارلس اور مشہور طویل المیعاد پارلیمنٹ میں کشمکش شروع ہوئی تو پارلیمنٹ نے قانون کے ذریعے سے سٹار چیمبر کی عدالت منسوخ کر دی۔ اس زمانے میں پارلیمنٹ میں ایسے ارکان کا غلبہ تھا جو پریسی ٹیری تھے وہ باغیانہ، ہتک آمیز اور بدنام کن مطبوعات کے طوفان سے چوکس ہو گئے تھے۔ جو سنسر اٹھائے جانے کے بعد منظر عام پر آنے لگی تھیں۔ ۱۴ جون ۱۶۴۳ء کو پارلیمنٹ نے سنسر کا ایک نیا قانون منظور کیا جو پرانے سٹار چیمبر کے قاعدوں پر مبنی تھا۔ اس میں امتیازی پہلو یہ تھا کہ سنسر مقرر کرنے کا کام پارلیمنٹ انجام دے گی۔ چنانچہ بے لگام طباعت ممنوع قرار دی گئی۔ ملک کے پرنٹروں اور پبلشروں کی منظّم کمپنی اور پارلیمنٹ کے کارکنوں کو اختیار دے دیا گیا کہ وہ تلاش کریں اور جہاں جہاں کوئی مطبع اجازت کے بغیر قائم شدہ ملے اسے تباہ کر دیں۔ بے اذن چھاپی ہوئی کتابیں ضبط کر لی جائیں۔ نیز ایسے تمام پرنٹر اور مصنف مستوجب گرفتاری سمجھے جائیں۔

ملٹن کی سخت مذمت کی گئی کیونکہ انہوں نے دو رسالے چھاپے تھے جن میں طلاق کی حمایت کی گئی تھی۔ وہ سنسر کے مقابلے کے لیے کھڑے ہوئے اور ایک رسالہ Areopagitica کے نام

سے شائع کیا جو دانستہ رجسٹر نہیں کرایا گیا تھا اور نہ اس کے لیے اجازت لی گئی تھی۔ یہ ملٹن کی نثری تصانیف میں سے سب سے زیادہ مشہور ہے۔ ایروپاگٹیکا Areopagitica قدیم ایتھنز کی عدالت عالیہ تھی جس کے روبرو بڑے بڑے خطیب مقدمات کی وکالت کرتے۔ ملٹن کی یہ کتاب بھی ایک خطبہ ہی تھی اگرچہ وہ کسی مجمع عام میں سنایا نہ گیا بلکہ چھپ کر پڑھنے کے لیے تقسیم کیا گیا۔ اس رسالے میں کتابوں کی انتہائی اہمیت کے متعلق بڑے فصیح و بلیغ اعلانات تھے اور ہر پابندی سے آزاد مطابع کی حمایت میں اہم دلائل دیے گئے تھے۔ مثلاً:

> کتابیں مطلقاً مردہ چیزیں نہیں۔ ان میں قوت اور زندگی ہے تاکہ وہ روح کی طرح سرگرم عمل ہیں اور روح ہی کی وہ پیداوار ہیں۔ انہیں مار دینا بھی قریباً ایسا ہی ہے جیسا انسان کو مار دینا جو شخص کسی اچھی کتاب کو تباہ کرتا ہے وہ عقل و دانش کو قتل کرتا ہے جو خدا کا مثالی پیکر ہے۔۔۔ اچھی کتاب روح کامل کی زندگی کا قیمتی خون ہے جسے خوشبوئیں لگا کر عمدہ زندگی کے بعد زندہ رہنے کے لیے محفوظ کر دیا گیا ہے۔[۳]

سنسر کی سرگزشت پر تبصرہ کرتے ہوئے ملٹن نے کہا کہ یونان کے کلاسیکی دور میں صرف وہ کتابیں ممنوع قرار دی گئیں تھیں جن میں کفریہ کلمے تھے جو دہریت کی اشاعت کرتی تھیں یا ہتک آمیز نوعیت کی تھیں جو کتابیں بداخلاق یا بے لگام تھیں ان کے بارے میں خاصی نرمی برتی گئی۔ رومی حکومت بھی قبول وصیت سے پیشتر تمام تحریرات میں رواداری سے کام لیتی تھی۔ صرف وہ کتابیں مستثنیٰ تھیں جن میں کسی مقدس شے کی بے حرمتی کی جاتی تھی یا کسی کو خواہ مخواہ بدنام کیا جاتا تھا۔ پھر ملٹن نے ابتدائی دور کے پوپوں کے ماتحت سنسر کی سرگزشت بیان کی جس سے آخر ممنوع الاشاعت کتابوں کی ایک فہرست تیار کی گئی۔ اس فہرست کے لیے انہوں نے پوپوں کو ملزم قرار دیا، کیونکہ آخری فیصلہ یہ کیا گیا تھا، کوئی کتاب، کوئی رسالہ اور کوئی اخبار اس وقت تک چھپ نہیں سکتا جب تک وہ دو تین دنیادار پادریوں کے ہاتھوں سے گزر کر تصدیق و اجازت کی سند حاصل نہ کرے۔ ملٹن کے مطابق:

> بری کتابیں بھی ممنوع نہ ہونی چاہیں کیونکہ سچائی جھوٹ کے بغیر معلوم نہیں ہوسکتی نہ اچھائی کا علم برائی کے بغیر ہوسکتا ہے، برائی بھول جائے گی کوئی بھی کتاب دبانی نہ چاہیے۔ بری کتابیں بھی تجربے کی عمومیت کا ایک جز ہیں۔[۴]

وینس دیدرو نے 'دائرہ المعارف' کی ابتداء ۱۷۴۵ء میں کی۔ اس کی پہلی جلد ۱۷۵۱ء میں منظر عام پر آئی دوسری جلد اگلے سال شائع ہوئی پھر یسوعیوں اور مطلق العنانی کے حامیوں نے اس پر سخت نکتہ چینی شروع کر دی چنانچہ شاہی مجلس کی طرف سے اس کی طباعت و فروخت اس بناء پر

ممنوع قرار پائی کہ اس میں شاہی اقتدار کو تباہ کرنے اور آزادی کی روح، نیز بغاوت کو بروئے کار لانے کا رجحان موجود تھا۔ اگرچہ زبان مبہم اور ذومعنی رکھی گئی تاہم اس سے غلطی، خرابی، لامذہبی اور بدعہدی کی بنیاد پڑنے کا اندیشہ تھا لیکن یہ حکم صرف ابتدائی دو جلدوں سے متعلق تھا۔ مزید جلدوں کی اشاعت بالتعین ممنوع قرار نہیں دی گئی تھی۔ چنانچہ ہر سال ایک جلد کی اشاعت کا سلسلہ جاری رہا۔ البتہ ۱۷۵۹ء میں دوسری مرتبہ حد درجہ نازک صورت پیدا ہوگئی، کیونکہ اس سال تشدد کی نئی لہر اٹھی تھی۔ بنابریں حکم دے دیا گیا کہ اس کتاب کی اشاعت روک دی جائے۔ دیدرو نے جتنے شرکاء کو قلمی اعانت پر آمادہ کیا تھا، وہ مسلسل ذلتوں سے تنگ آ کر الگ ہوگے۔ صاف نظر آرہا تھا کہ یہ کام برباد ہو جائے گا۔ اس مشکل سے بچ نکلنے کی تدبیر دیدرو اور ان کے ناشر نے یہ سوچی کہ کتاب کی باقی جلدیں خفیہ طور پر شائع کی جائیں اور مقالہ نگاروں کے نام بھی حذف کر دیئے جائیں۔ سرورق پر جھوٹ موٹ لکھ دیا جائے کہ کتاب نیوشاتل (سوئٹزرلینڈ) میں چھپی تھی۔ ۱۷۷۲ء میں کتاب مکمل ہوگئی۔ سترہ جلدیں اصل متن اور سات جلدیں تصاویر کی تھیں۔ پورا مجموعہ چھپ گیا اور دیدرو کو ایک اور حادثے سے سابقہ پڑا جس کتاب پر انہوں نے اکیس سال صرف کیے اس کے ناشر نے حکومت کی طرف سے نامنظوری کے خطرے کی بنا پر یہ فیصلہ کر لیا کہ پوری کتاب کا لفظ لفظ غور سے دیکھے اور جو باتیں حکومت کی ناراضی کا باعث تھیں انہیں نکال دے۔ دیدرو آخری پروف پڑھ کر ناشر کے حوالے کر دیتے تو وہ اس میں سے جا بجا مختلف فقرے کاٹ دیتا، اگرچہ ان کی روح باقی رہی لیکن اس طرح کتاب کی حقیقی حیثیت پر سخت ضرب لگی۔

تاریخ علوم کا ایک عجیب پہلو یہ ہے کہ انسان نے زمین اور اس کے مادی خصائص کا مطالعہ نسبتاً بہت بعد میں شروع کیا۔ زمین کی اصل اور نوعیت کے متعلق نظریات کی کمی نہ تھی۔ اٹھارہویں صدی میں ایک عام نظریہ یہ تھا کہ ابتدا میں زمین یخ کا ایک ٹھوس تودہ تھی پھر ایک دم دار تارا زمین سے ٹکرایا اور اس کی حرارت پیدا ہوئی۔ ایک اور تصور یہ تھا کہ زمین ابتداء میں صرف پانی تھی اس کی سطح پر بخارات اٹھتے رہتے تھے۔ آگے چل کر انہیں عناصر نے پانی کے اوپر ایک قشر کی شکل اختیار کر لی۔ محض مذہبی عالم ہی نہیں، بلکہ اکثر ماہرین ارضیات بھی انتہائی کوشش کرتے رہے کہ نظریہ ارضیات کو قدیم مذہب کی لفظی تعبیر کے مطابق بنالیں۔ مذہبی علماء کہتے تھے کہ زمین ۴۰۰۴ ق م میں پیدا ہوئی اور اس کی موجودہ وضع و ہیئت شدید حوادث کے سلسلے کا نتیجہ ہے۔ غالباً ایک سمندر بلند ترین پہاڑوں پر چھایا ہوا تھا۔ تباہی خیز طوفان اٹھے زلزلے آئے۔ آتش فشاں پہاڑ پھٹے طبعی مظاہر کے تصورات پر اس عقیدے کا بے حد اثر پڑا کہ ماضی بعید میں تباہی خیز ارض وقائع غلط کار انسانیت کی سزا کی حیثیت رکھتے تھے۔

سکاٹ لینڈ کے جیمز ہٹن نے 'نظریہ ارض' پیش کیا۔ یہ کتاب دو جلدوں میں چھپی اس کی وجہ سے سائنس میں نئے حدود کی چھان بین کے لیے روشنی مہیا ہوئی۔ ایسا انتہا پسندانہ نظریہ مصنف کے اکثر معاصر قبول نہیں کر سکتے تھے چنانچہ ہٹن پر کفر کا الزام لگایا گیا۔ کیونکہ انہوں نے ایسے افکار پیش کیے جو صحیفوں کے بالکل برعکس تھے اور دشمن مذہب قرار دے کر ان کی مذمت کی گئی۔

گوئٹے کے مشہور رومانوی ناول The suffering of young weather پر اس لیے حکمرانوں نے پابندی لگائی کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ اس ناول کی وجہ سے نوجوان جرمنوں میں خودکشی کے رجحانات پروان چڑھ رہے تھے۔

اسی طرح دوسو سال قبل کی امریکی شاعرہ سلویا پلاتھ کے مختصر ناول پر بھی اس لیے پابندی لگا دی گئی کیونکہ اس بارے میں گمان تھا کہ یہ ناول لڑکیوں میں خودکشی کے رجحان کو بڑھا رہا ہے۔ آج اگر سلویا پلاتھ کے ناول کو پڑھیں تو حیرت ہوتی ہے کہ اس میں تو کوئی ایسی بات ہے ہی نہیں۔ البتہ یہ ناول انسان میں پنہاں عمیق جذبات کی ترجمانی ضرور کر رہا ہے۔

'سلطنت روما کا زوال اور خاتمہ' ۱۷۸۳ء میں تخریب کی راغب کتاب قرار دے کر پاپائے روم کی طرف سے ممنوعہ مطبوعات میں شامل کر دی گئی اس کا مصنف ایڈورڈ گبن تھا۔

جیمز جوائس کا ناول 'یولیسز' Ulysses کو بلاشرکت غیر بیسویں صدی کے چند بہترین ناولوں میں شمار کیا جاتا ہے تاہم امریکہ میں اسے فحاشی کے الزام میں سخت مزاحمت کا سامنا رہا۔ ۱۹۱۸ء اور پھر ۱۹۳۰ء میں امریکی پوسٹل اتھارٹی نے اس کی اشاعت کو ممنوع قرار دیتے ہوئے مارکیٹ سے اس کی کاپیوں کو ضبط کر لیا۔ ۱۹۳۳ء میں کہیں جا کر سخت جدوجہد کے بعد جیمز جوائس کے معترضین جیولسنر پر پابندی ختم کرانے میں کامیاب ہوئے۔

انقلاب روس سے قبل لینن کی اکثر تصانیف روسی حکومت کی جانب سے ممنوع قرار دی گئیں۔ ۱۹۲۷ء میں ممالک متحدہ امریکہ اور ہنگری میں لینن کی تصانیف فحش اور تخریب کار قرار دے کر ممنوع قرار دے دیں گئیں۔ کینیڈا میں بھی ان تحریروں کو تخریب کار قرار دیا۔ ۱۹۳۳ء میں جرمنی کی نازی حکومت نے اور دیگر فاشی قوتوں نے لینن کی کتابوں کو تخریب کار قرار دے کر ممنوع قرار دے دیا۔

۱۹۳۰ء میں امریکی کسٹمز نے فرانسیسی ادیب والٹیر کی کتاب Candide (کاندید) کی کاپیاں ضبط کر لیں جو ہارورڈ یونیورسٹی کے لیے منگوائی گئی تھیں۔ بعد ازاں یونیورسٹی کے اساتذہ نے کتاب کے بارے میں متعلقہ حکام کے شبہات کو دور کیا اور یوں اسے ان کے چنگل سے

چھڑانے میں کامیاب ہوئے۔ بعدازاں ۱۹۴۴ء میں امریکی پوسٹ آفس میں کاندید کی کاپیوں کی ترسیل کے حوالے سے اعتراض کیا اور ضبطی کا مطالبہ کیا۔

'بہادر نئی دنیا' آلڈس ہکسلے کی مشہور سائنسی افسانوں پر مبنی کتاب کو جمہوریہ آئرلینڈ نے مخرب الاخلاق قرار دے کر ۱۹۳۲ء میں ممنوع قرار دے دیا۔

'اوڈیسی' ہومر کی تصنیف کردہ مشہور معروف منظوم تاریخ کو ۱۹۳۳ء میں روم کیلی گولا نے بے تکی شاعری کا عنوان دے کر ممنوعہ قرار دے دیا۔ ' کاسانوا کی یادداشتیں' ۱۸۳۴ء میں حکومت آئرلینڈ نے ۱۹۳۵ء میں اطالوی حکومت نے مخرب الاخلاق گردان کر ممنوعہ قرار دے دی۔ 'لے مزرا ایبل' جو کہ 'وکٹر ہیوگو' کی تصنیف ہے فرانسیسی حکام نے ایسے ۱۹۳۴ء میں مخرب الاخلاق قرار دے دی۔ 'لیوٹالسٹائی' کی تصانیف روسی شہنشاہت نے ۱۸۸۰ء میں اور ہنگری نے ۱۹۲۶ء میں مخرب الاخلاق اور تخریب افزا ہونے کے الزام میں ممنوع قرار دے دیں۔ چارلس ڈارون کے نظریہ آفرینش پر اس کی کتاب ۱۹۳۵ء میں یوگوسلاویہ ۱۹۳۶ء میں یونان اور ڈیٹ کن میں مخرب الاخلاق فحش اور ملحدانہ ہونے کے الزام کی بناء پر ممنوعہ قرار دے دی گئی۔

'ہتھیاروں کو خیر باد' ارنسٹ ہیمنگوے کی مشہور تصنیف ہے۔ 'ہتھیاروں کو خیر باد' کو حکومت نے ممنوع قرار دے دیا کیونکہ یہ پہلی جنگ عظیم کی ایک بے لاگ سرگزشت تھی اور ۱۹۳۴ء میں نازیوں نے جو بے شمار کتب نذر آتش کیں ان میں یہ شامل تھی۔

جون کلے لینڈز John Cleland کی کتاب (فنی ہل) Fanny Hill جسے ایک خوش باش لذت پسند عورت کی یادداشتوں کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ ۱۷۴۹ء میں اپنی اشاعت کے فوراً بعد ہی متنازعہ ہوگئی۔ ناول میں ایک طوائف کے جنسی معاملات کو بیان کیا گیا ہے۔ جب کہ اس کی اور خاص بات ہم عصر ادب پر اس کا طنزیہ تبصرہ بھی ہے ڈینیل ڈیفو Daniel Defoe کی Moll Flanders پر فحاشی کے الزام میں مقدمہ چلایا گیا تاہم ۱۹۶۶ء میں امریکی سپریم کورٹ نے اس پر لگائے گئے الزامات کو غلط قرار دے دیا۔

امریکہ میں Comstock Law (۱۸۷۳ء) کے تحت مختلف ادوار میں کئی کتابوں کی اشاعت و فروخت وغیرہ پر پابندی عائد کی گئی۔ ان کتابوں میں Aristophanes کی Lysistratra، Chaucer کی Canterbury tales. Boccaccio کی Decamceron اور الف لیلیٰ خاص طور پر قابل ذکر ہیں یہ قانون فحش نگاری کی بیخ کنی کے لیے تیار کیا گیا تھا۔ یہ قانون اگرچہ اب کالعدم قرار دے دیا گیا ہے لیکن جب تک یہ باقی رہا اس نے لکھنے والوں کے لیے مشکلات پیدا کیں۔

Aristophenes کی Lysis trata ۱۹۶۷ء میں یونان میں عسکری حکومت کی طرف سے ممنوع قرار دے دی گئی۔ معروف امریکی شاعر Walt whiteman کی کتاب Leaves of grass کو بھی ۱۸۸۱ء میں بوسٹن کی ریاست میں ضبط کرلیا گیا۔ کیونکہ ڈسٹرکٹ اٹارنی کا خیال تھا کہ اس کی بعض نظموں میں غیر محتاط اور فحش زبان استعمال کی گئی ہے۔

روسو کی خودنوشت Confession 'اعترافات' کی فروخت واشاعت پر بھی ۱۹۲۹ء میں امریکی کسٹم کی طرف سے ممانعت عائد کی گئی وجہ یہ بتائی گئی کہ یہ کتاب عوامی اخلاقیات پر منفی اثرات مرتب کرنے کا باعث بن سکتی ہے۔ روسو کی فلسفیانہ تحریروں کو روس میں ۱۹۳۵ء میں ممنوع قرار دیا گیا۔ جب کہ اٹھارویں صدی عیسوی میں ان میں سے کچھ کتابوں کو کیتھولک چرچ کے ممنوع کتب سے متعلق اعشاریے میں بھی شامل کیا گیا۔ اس اعشاریے کی حیثیت ایک قانون سمجھا جاتا تھا۔ ۱۹۶۶ء میں اس اعشاریہ کو منسوخ کر دیا گیا۔

تھامس پینےThomos Panie کے خلاف ۱۷۹۲ء میں انگلستان میں مقدمہ چلایا گیا کہ ان کی کتاب The Rights of Man پر یہ الزام لگایا گیا کہ اس میں فرانسیسی انقلاب کی حمایت کی گئی ہے ان کی ایک کتاب The age of Reasons کی اشاعت پر بھی ان کے ناشر کو عدالتی کارروائی کا سامنا کرنا پڑا۔

۱۹۱۸ء میں امریکی شعبہ جنگ نے ایک نوٹس کے ذریعے امریکن لائبریری ایسوسی ایشن سے کہا کہ وہ انتشار پیدا کرنے والی کتابوں کو لائبریری سے باہر نکال دیں۔ جیسے Ambrose Bierce کی کتاب ?Can't such things be کو کیمپوں میں موجود کتب خانوں سے واپس لے لیا گیا مسلک پر پابندی لگائی ان کی کتابوں کو ضبط کرلیا گیا اور ان کے ماننے والوں پر تشدد کیا گیا۔

Blaise Pascal کی کتاب The Provincial letters کے خلاف زبردست تحریک چلی اور ۱۶۶۰ء میں فرانس کے بادشاہ لوئی چہاردھم کے حکم پر نذرآتش کر دی گئی۔ فرانس میں Tasso کی کتاب Jerusalem Delivereed کو بھی سولہویں صدی میں ممنوع قرار دے دیا گیا کیونکہ اس میں ایسے خیالات کا اظہار کیا گیا تھا جو بادشاہ کی مطلق العنانیت پر ضرب لگاتے ہیں۔

Jack London کی تحریروں کو ۱۹۲۰ء اور ۱۹۳۰ء کی دہائیوں کے درمیان مختلف یورپین آمریت پسند حکومتوں نے ممنوع قرار دے دیا۔ ۱۹۲۹ء میں اٹلی کی حکومت نے Jack

London کی کتاب Call of the wild کی ممانعت کا حکم دیا اور اسی سال یوگوسلاویہ میں اس کی تمام تحریروں کو ضبط کر لیا گیا۔ نازیوں کی حکومت نے بھی اس کی اشتراکیت پسند خیالات پر مشتمل کتابوں جیسے The iron heel کی کاپیاں سرعام جلائی گئیں۔ لائبریریوں پر امتناع کا یہ قانون آج بھی کسی نہ کسی صورت میں موجود ہے۔

جنگ عظیم اول کے دوران امریکی حکومت نے ان لوگوں کو جیل کی کوٹھڑی میں بند کر دیا جو "This one" جیسے حکومت مخالف خیالات پر مبنی پمفلٹ تقسیم کر رہے تھے۔ ان پمفلٹوں کے ناشر Schenck کو گرفتار کر کے سزا دی گئی ان کے خلاف مقدمہ سپریم کورٹ میں ۱۹۱۹ء میں لڑا گیا۔ ۱۹۲۶ء سے ۱۹۵۶ء کے دوران روس میں قرآن کریم اور بائبل کی درآمد ممنوع رہی اور کتب خانوں میں انہیں رکھنا غیر قانونی رہا۔ تاریخ کے مختلف ادوار میں بائبل کو ممنوع قرار دیا گیا جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ بائبل کو جلایا بھی گیا۔

جنوبی افریقہ کی متعصب حکومت نے ۱۹۲۵ء میں کلاسیک کا درجہ رکھنے والی کئی کتابوں کو ممنوع قرار دیا۔ جیسے Marry Shelly کی کتاب Fram Kenstien کو غیر شائستہ اور فحش قرار دے کر ضبط کر لیا گیا۔ اسی طرح Anna Sewell کی Black Beauty کو بھی ممنوع قرار دیا گیا۔

۱۹۵۴ء میں امریکہ میں پوسٹ آفس میں ''لینن'' کی کتاب 'ریاست اور انقلاب' کی براؤن یونیورسٹی کی ترسیل روک دی گئی اور الزام لگایا کہ اس کتاب میں گمراہ کن مواد موجود ہے۔ ڈی ایچ لارنس کا ناول 'لیڈیز چیٹر لی لورز' کو ۱۹۶۰ء کی دہائی میں امریکہ اور برطانیہ میں اسے فحاشی کے الزام میں متعدد مقدمات کا سامنا کرنا پڑا۔

کینیڈا میں ۱۹۸۰ء کی دہائی میں Ernest Zundel کو Did Six Million Realy Die نامی کتاب شائع کرنے پر دوبار مقدمات کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ کتاب پہلی دفعہ ۱۹۷۴ء میں چھپی تھی اس میں ایٹم بم کی تباہ کاریوں سے انکار کیا گیا تھا۔ اس کتاب پر گمراہ کن معلومات پھیلانے کے الزام میں مقدمہ چلایا گیا۔ ۱۹۹۲ء میں سپریم کورٹ نے False News Laws کو غیر آئینی قرار دیا لیکن اس سے بھی Zundel کی جان نہیں چھوٹی اب اسے اسی کتاب کے حوالے سے کینیڈا کے ''ہیومن رائٹس'' ایکٹ کے تحت چلائے جانے والے مقدمے کا سامنا ہے۔

'اسپائی کیچر' پیٹر رائٹ کی مشہور تصنیف ہے جس پر حکومت برطانیہ نے یہ الزام لگایا کہ سرکاری رازوں کا افشاء اور معاشرے کی خلاف ورزی ہے۔ ۱۹۸۷ء میں ممنوع قرار دے دی گئی۔

ایرانی صدر احمدی نژاد نے یہودیوں کے قتل عام کے واقعات سے انکار کیا ہے ان کے اس بیان کی بنیاد The Hoax of the twentith century یعنی '۲۰ ویں صدی کا فریب' ہے یہ کتاب برطانوی دانشور آرتھر آربٹز نے ۱۹۷۵ء میں لکھی تھی۔ یہ کتاب بہت سے ممالک میں ممنوع ہے۔ ان ممالک میں برطانیہ اور امریکہ بھی شامل ہیں۔ تاہم جرمنی، کینیڈا اور ایران میں یہ کتاب بآسانی دستیاب ہے۔

یکم جولائی ۱۹۹۶ء میں سنگاپور میں عدالت نے ایک عورت کو اس لیے سزا دی کیونکہ اس کے پاس بائبل کا 'یاہوا' (Jehovah;s) کا ترجمہ تھا۔ ۲۰۰۰ء میں امریکی حکومت کی ایک رپورٹ میں بتایا گیا کہ برما میں بائبل کے کسی بھی مقامی زبان میں ترجمے کو ممنوع قرار دیا گیا۔ برما کی حکومت نے ان ویب سائٹ پر بھی پابندی لگا دی جہاں یہ تراجم موجود تھے اسی طرح سعودی عرب کی حکومت نے بائبل کی تقسیم وغیرہ کو ممنوع قرار دیا کہ سعودی عرب کے ایئرپورٹ پر اترنے والے مسافر اپنی غیر منظور شدہ مذہبی کتب حکام کو جمع کرانے کے پابند ہیں۔ اسی طرح چین کی حکومت نے ۱۹۹۹ء میں "Falun Gong" کو ممنوع کتاب قرار دیا۔

۲۰۰۳ء میں کیوبا میں پچھتر افراد کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے پھینک دیا گیا ان پر یہ الزام تھا کہ وہ امریکی ہلاشیری پر خودمختار لائبریری کی تحریک میں اہم کردار ادا کر رہے تھے اس تحریک کے تحت شہریوں کو ایسی کتابیں فراہم کی جاتی تھیں جو حکومتی لائبریریوں میں ممنوع ہوتی جس قسم کا مواد ملزمان لوگوں میں تقسیم کرتے رہے ان میں ''انسانی حقوق کا عالمی میثاق نامہ' اور 'امریکی آئین' وغیرہ شامل تھے۔ ان میں سے بہت سے افراد آج بھی عقوبت خانوں میں بند ہیں۔

فاطمہ مرنثی کی کتاب 'پردہ اور مردوں کی اشرافیہ' بہت سے مسلم ممالک میں ممنوع ہے۔ فاطمہ کا تعلق مراکش سے ہے۔ ۲۰۰۳ء میں اسلامیہ جمہوریہ ایران میں فاطمہ کی اس کتاب کے پبلشر، مترجم سب کو گرفتار کر کے ۶، ۶ سال کی قید کی سزا سنائی گئی۔

اس کے علاوہ مختلف کتابوں پر مختلف وجوہات کی بناء پر پابندیاں عائد کی جاتی رہی ہیں جن کی فہرست درج ذیل ہے:

S.No.	Name of book	Author	Date of issue
1.	Mediline	Anonymous	July 1920
2.	Mademoiselle de Maupin	Theophile Gautier	July 12,1922

3. Satyricon Petronius Sept 27,1922

4. Women in love D.H. Larwrenc Sept 30, 1922

5. Casanova's Homecoming Arthur Sctinitzler Sept 30. 1922.

6. Young Girls Diary Anonymous Sept 30, 1922.

7. Jurgen James branch cabell oct. 1, 1922.

8. Replenishing Jessica Maxwell, Bodenheim June, 1925.

9. The well of lonelines redclyffe Hall Mar. 4, 1930.

10. The sex side of life mary ware Dennett Mar. 4, 1930.

11. Married Love Marie c. stopes April 6, 1931.

12. Eastern Shame girl Anonymous May 7, 1931.

13. Celestine octave mirbeau May 7, 1931.

14. Hsimen ching Anonymous Nov 9, 1931.

15. Flesh Clemend Wood Dec 18, 1931.

16. Let's go Naked Louis charles Royer Dec 8, 1932.

17. God's Little Acre Erskine Caldwell May 23,

1933.

18. November Gustave Flaubert May 8, 1935.

19. If it Die Andlr'e Gide Jan 24, 1936.

20. A world I Never Made. James T. Farrell Feb 11, 1937.

امیر طہری لکھتے ہیں:

> کتابوں کو جلا دینے سے کہیں زیادہ مہلک بات یہ ہے کہ کتابوں کو پڑھا نہ جائے۔۔۔ کتابوں کو جلا دینے سے نہ تو نظریات ختم ہوتے ہیں اور نہ ہی مصنفین کو مستوجب سزا قرار دنے سے حکمران اپنے مطلوبہ مقاصد حاصل کر پائے۔ تاہم ایسا استبداد بذات خود ، پابندی لگنے والی تحریروں و کتابوں کی تشہیر کا باعث بن گیا۔ کتابیں بغداد میں جلیں یا ایران میں، ان کا آتش کدہ روم ہو یا امریکہ، انہیں جلائے جانے والے ایشیائی ہوں یا یورپی اس عمل کا ردعمل بھی ساتھ ساتھ جاری رہتا ہے۔[5]

اس مضمون میں بین الاقوامی سطح پر ممنوعہ کتب کی مختصر سی فہرست پیش کی گئی ہے اس کے علاوہ بھی بے شمار ایسی کتب ہیں جن پر مختلف ادوار میں مختلف وجوہات کی بنا پر پابندیاں عائد کی جاتی رہی ہیں لیکن ان کے بارے میں خاطر خواہ معلومات حاصل نہ ہونے سبب شامل نہیں کی جا سکیں۔

حواشی و حوالہ جات

۱۔ جواہر لال نہرو، پنڈت، تاریخ عالم اسلام پر ایک نظر، تخلیقات، لاہور، ۱۹۹۲ء، ص ۱۱۴۔۱۱۳

۲۔ کوثر محمود، ڈاکٹر، بائبل کے ترجمے کی کہانی۔ غیر مطبوعہ، ذاتی مخزونہ، ۱۹۹۹ء

۳۔ رابرٹ بی، ڈاؤنز، دنیا کی عظیم کتابیں، مترجم غلام رسول مہر، دوست ایسوسی ایٹ لاہور، ۲۰۰۳ء، ص ۱۶۷

۴۔ ایضاً ص ۱۶۹

۶۔ امیر طہری، ممنوعہ کتب، مشمولہ ماہنامہ عوامی جمہوری فورم، لاہور، جون ۲۰۰۶ء

فحاشی کے الزام میں ضبط شدہ کتاب

''آفت کا ٹکڑا''

کے خالق سے ایک ملاقات

انٹرویو: ستار سید

پیشہ وکالت، جس کی ذمہ داریوں کو نبھانے، موکلوں کے حقوق کی نگہداشت اور تحفظ کے لیے وہ وکیلوں کو کوٹ پہنے، آنکھوں پر نظر کی عینک لگائے، سائیکل پر سوار، ایک عدالت سے دوسری عدالت کا رخ کرتے نظر آتے ہیں، موسم کیسا بھی ہو، وہ ہوتے ہیں اور ان کی سائیکل۔ یوں فاصلے اڑتے چلے جاتے ہیں۔ شام کو مغرب کی نماز کے بعد ان کے دفتر میں مؤکلوں کا ہجوم ہوتا ہے، وہ سب سے مسکرا کر میٹھے لہجے میں بات کرتے ہیں۔ ہر بات پہ ''جی'' کہتے ہیں۔ اور ''جی'' کا استعمال اس کثرت سے کرتے ہیں کہ جیسے یہ ''جی'' ان کا تکیہ کلام بن گیا ہو۔ ویسے یہ ''جی'' ان کے منہ سے سجتا بھی ہے۔ نظر کی عینک کے شیشوں کے پیچھے مسکراتی ہوئی آنکھوں میں ایک عجیب سا استہزاء بھی ہوتا ہے۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ دکھائی دیتی ہے تو اس میں بھی ''خندۂ بے جا'' کی ایک رمق ضرور ہوتی ہے۔

دفتر کے ساتھ ہی ان کا گھر ہے۔ دفتر کی پیشانی پر ''Cemented'' الفاظ میں لکھا ہوا ہے:

حاجی خان محمد فضل الرحمٰن خاں............ایڈووکیٹ

یہ خان صاحب! ضبط شدہ ناول ''آفت کا ٹکڑا'' کے خالق ہیں۔

لاہور شہر میں کئی سال پہلے کچھ سیماب صفت نوجوانوں نے ایک ادبی تنظیم قائم کی تھی۔ یہ نوجوان دوسروں پر تنقید کے زیادہ عادی تھے اور بوڑھے اور شہرت یافتہ لکھنے والوں سے بے حد نالاں تھے۔ اس تنظیم کے کچھ اجلاس بی این آر سنٹر میں ہوئے، کچھ وائی ایم سی اے میں اور پھر یہ تنظیم بھی اللہ کو پیاری ہوگئی۔ اسی تنظیم کے ایک تنقیدی اجلاس میں ہم نے ایک ادھیڑ عمر بزرگ کو اپنے سامنے ایک سچ مچ کا رجسٹر رکھے افسانہ پڑھتے ہوئے دیکھا اور سنا............ہمیں بتایا گیا کہ

''یہ خان محمد فضل الرحمٰن خان ہیں.........'' خان صاحب کو دیکھ کر ہمیں ایک لمحہ کے لیے یقین نہ آیا کہ یہی وہ صاحب ہیں جن کے افسانے ''نصرت'' میں شائع ہوتے ہیں اور لوگ ان افسانوں کی ''گرمی'' پر بے کار کی بحث کرتے ہیں۔

خان صاحب کے ساتھ اس کے بعد ہمارا ملنا جلنا قائم رہا۔ مگر اس طرح کہ سال میں ایک بار...... دوبارہ۔ پھر ان کا ناول ''آفت کا ٹکڑا'' شائع ہوا، ضبط ہوا۔ پھر ان کے افسانے بھی کم ہی پڑھنے کو ملے۔ دراصل اردو رسالوں کے بیشتر ایڈیٹر ان کے افسانوں کی اشاعت کے متحمل نہ ہوتے۔ اس لیے خان صاحب سے ان کے افسانوں کے حوالے سے ملاقات اور بھی کم ہونے لگی۔

ایک بار ان سے ملاقات ہوئی تو پتہ چلا کہ وہ کئی ناول لکھ کر ایک طرف رکھ چکے ہیں۔ افسانے بھی کئی لکھے پڑے ہیں اگر شائع نہیں ہوتے تو ان میں ان کا کیا قصور؟

خان صاحب کو مطالعہ سے کہیں زیادہ لکھنے سے دل چسپی ہے۔ لکھنا ایک طرح سے ان کی حیاتیاتی ضرورت بن گیا ہے۔ ان کی تحریریں بہت کم شائع ہوتی ہیں مگر اس سے وہ بد دل نہیں ہوئے۔ وہ لکھتے جا رہے ہیں اور شاید کوئی ایسا موقع بھی آ جائے کہ وہ جتنا لکھیں گے وہ ساتھ ساتھ شائع ہوتا جائے گا۔ اور انہیں یہ احساس ہوگا کہ انہوں نے بہت کم لکھا ہے۔ کم چیزیں شائع ہونے کے باوجود ان کی انفرادیت اپنا لوہا منوا چکی ہے۔ وہ جس ماحول، دنیا اور زبان کو اپنی تحریروں کے عناصر بناتے ہیں۔ وہ منفرد ہیں۔ ایک بار ان کی ایک کہانی ادب لطیف میں شائع ہوئی۔ اس کے ساتھ ایک نقشہ بھی تھا۔ ہم نے باتوں باتوں میں ولیم فاکنر کا ذکر دیا کہ وہ بھی اپنے ناولوں کے ساتھ نقشہ دیا کرتا تھا۔ خان صاحب نے صاف انکار کر دیا کہ انہوں نے فاکنر کو نہیں پڑھا۔ یہ ان کی اپنی جدت ہے۔

''آفت کا ٹکڑا'' کے یہ مصنف ادھیڑ عمر کو پہنچ چکے ہیں۔ ہاتھ، پاؤں اور قد سب لمبے ہیں رنگ بیحد گورا ہے۔ اس میں جب جوانی کی سرخی ہوگی تو خود قیامت ہوں گے۔ اب بھی ان کے اندر زندگی کا طوفان ہے مگر وہ اتنے وضعدار، بردبار اور متحمل مزاج ہیں کہ یہ طوفان بظاہر نظر نہیں آتا۔ آفت کا ٹکڑا کے متعلق جب ہم ان سے بات چیت کرنے کے لیے ان کے دفتر گئے تو ٹی وی کی آوازیں آ رہی تھیں جو گھر کے دوسرے حصہ میں دیکھا جا رہا تھا۔ ہم نے خان صاحب سے پوچھا ٹی وی نہیں دیکھتے آپ؟

''جی نہیں، میں نہیں دیکھتا، بیوی دیکھتی ہیں''

ہم نے ان سے پوچھا کہ انہوں نے ''آفت کا ٹکڑا'' کب لکھا؟ اور اس ناول کے موضوع کی تحریک اور انسپریشن انہیں کیسے ہوئی؟

خان صاحب بتانے لگے ’’ضلع سہارن پور میں ایک گاؤں ہے، خوش حال پور۔ بڑا خوبصورت گاؤں تھا۔ میں اس گاؤں کا واحد مالک تھا۔ اس گاؤں کے قریب شوامک کی پہاڑیوں کے علاقے میں انگریز، اینگلو انڈین وغیرہ بڑی کثرت سے رہتے تھے اور ان کی جائیدادیں بھی تھیں۔ اسی لیے انگریزوں کے رہن سہن، ان کی معاشرت، ان کے جنسی اعمال سے میں شروع ہی سے واقف ہوں۔ وہاں سکاٹ لینڈ کے لوگ بھی ایک مدت سے رہتے تھے۔ جس کا نام ’’پاؤل خاندان‘‘ تھا۔ اس خاندان کی ایک لڑکی مرزا پور نامی گاؤں کی واحد مالک تھی۔ ایک میجر ڈاکٹر تھا۔ جو میرے اچھے ملنے والوں میں سے تھے۔ اس میجر ڈاکٹر کو ’’پاؤل خاندان‘‘ کی لڑکی سے عشق تھا۔ یہ عناصر واقعات اور ماحول ایسی چیزیں تھیں جن سے میں بے حد قریب تھا اور متاثر بھی۔ اس خاص دنیا اور ماحول میں میری عمر کا ایک بڑا حصہ گزرا۔ میں نے وکالت کا امتحان پاس کر کے وہیں وکالت بھی شروع کر دی تب ان لوگوں سے اور زیادہ قربت ہو گئی اور میں ان کے جھگڑوں اور تنازعوں کے ذریعہ سے ہی ان کی زندگی کے اطوار کو سمجھنے لگا۔

قیام پاکستان سے پہلے میں نے اس ناول کا خاکہ تیار کیا۔ یہ خاکہ پندرہ بیس صفحوں پر مشتمل تھا لیکن اسے میں نے قیام پاکستان کے بعد لکھنا شروع کیا۔ پاکستان آ کر مجھے اپنے گاؤں کی یادیں تڑپاتی رہتی تھیں۔ میں نے یہ ناول لکھنا شروع کیا۔ ’’آفت کا ٹکڑا‘‘ کو میں نے تین حصوں میں لکھنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ ایک حصہ شائع ہوا اور ضبط بھی کر لیا گیا۔

’’کیا آپ اس کے دوسرے دونوں حصے بھی لکھ چکے ہیں؟

’’جی وہ بالکل مکمل ہیں۔‘‘

’’یہ ناول کب مکمل ہوا تھا؟‘‘

’’۱۹۶۵ء میں‘‘ خان صاحب بتانے لگے کہ ۱۹۶۲ء میں اسے شائع کیا گیا۔ ناشر مکتبہ جدید لاہور تھا۔ محمد حنیف رامے صاحب نے ہی اس کا سرورق بنایا اور انہی نے اس کا فلیپ بھی لکھا تھا۔‘‘

’’یہ ناول کیوں ضبط کیا گیا؟‘‘

خان صاحب مسکرانے لگے، پھر بولے‘‘

’’جی، میں نے تو یہ سنا تھا کہ ایک صاحب جو عیسائی تھے، انہوں نے نواب امیر محمد خاں ، گورنر پنجاب سے شکایت کی کہ اس ناول میں عیسائیت کے خلاف لکھا گیا ہے۔ انہوں نے یہ ناول منگوا کر پڑھا اور اس کو فحش قرار دیتے ہوئے اپنے حکم خاص سے ضبط کرنے کا حکم صادر کر دیا۔‘‘

’’کیا آپ کے خیال میں اس ناول کو فحش کہا جا سکتا ہے؟...... یہ سوال آپ سے ایک قانون دان کی

حیثیت سے کیا جارہا ہے۔''

''جی'' میرا خیال ہے کہ یہ ناول فحش نہیں ہے''

''آفت کا ٹکڑا'' میں دو کردار ہیں، رومنے گارٹ اور روز بے، رومنے گارٹ نیکی اور خیر کا نمائندہ ہے۔ روز بے بدی اور شر کا پیکر ہے۔ سپین کے ایک عظیم انسان المنصور سے میں بے حد متاثر ہوا ہوں۔ المنصور سے میں بے حد متاثر ہوا ہوں۔ المنصور، بادشاہ بھی تھا، صاحب ظرف بھی۔ رومنے کے کردار کی تشکیل میں المنصور کی شخصیت کے عناصر بھی شامل ہیں۔ اس کے برعکس روز بے شیطان ہے۔ میں نے اس ناول کو ''سورۃ التین'' کی ایک آیت کی روشنی میں دیکھا اور لکھا ہے۔ یہ آیت ہے:

''ہم نے انسان کو بہترین پیدا کیا ہے اور اگر وہ گر جائے تو اسفل السافلین میں سے ہے۔ رومنے گارٹ، بہترین میں سے ہے، اور روز بے اسفل لسافلین میں سے۔ فحاشی اور عریانی کے سلسلے میں یہ دیکھنا ضروری ہوتا ہے کہ مصنف کی ہمدردیاں کس کے ساتھ ہیں وہ کن اقدار کو Glorify کرتا ہے۔ آپ ''آفت کا ٹکڑا'' میں دیکھیں اور محسوس کریں گے کہ میری تمام ہمدردیاں رومنے گارٹ کے ساتھ ہیں۔ روز بے صرف شیطنیت ہے۔''

خان صاحب ایک لمحے کے لیے خاموش ہوئے اور پھر سنجیدگی سے کہنے لگے:

''مجھے اسلام سے بے حد محبت ہے۔ اسلام کے لیے میں بڑے سے بڑا ایثار کر سکتا ہوں۔ اس ناول ''آفت کا ٹکڑا'' میں میں نے اسلام کی تبلیغ کی ہے۔ رومنے گارٹ کا عیسائیت سے بدظن ہونا، ایک طویل ذہنی اور روحانی سفر کی ابتدا ہے۔ اس ناول کے دوسرے حصوں میں جو شائع نہیں ہوئے میں نے رومنے گارٹ کو حلقۂ بگوش اسلام ہوتے ہوئے دکھایا ہے۔''

''اور روز بے کا کیا انجام ہوا؟

''جو ایسے کردار کا ہونا چاہیے تھا''۔ خان صاحب نے جواب دیا۔ وہی روز بے ہر لڑکی ہر عورت کا منظور نظر ہے جس کے لیے لڑکیاں مرتی تھیں، وہ سب اس سے نفرت کرنے لگیں اور چوں کہ وہ جنس کی منفی قوت تھا اس لیے میں نے اس کا انجام یہ دکھایا تھا کہ اس کا آلۂ تناسل کٹ گیا ہے وہ اپنی اس قوت سے ہی محروم ہو گیا ہے جس کی وجہ سے وہ شیطانیت اور بدی کا پیکر بن گیا تھا۔ مجھے افسوس ہے تو اس بات کا کہ میرے ناول کے صرف ایک حصے کو ہی پیش نظر رکھ کر اس کو ضبط کر لیا گیا۔ کاش! اس کے دوسرے حصوں کو بھی سامنے رکھا جاتا تو پھر کوئی فیصلہ کیا جاتا۔

''اس میں حکومت کا کیا قصور ہو سکتا ہے۔ کیوں کہ ''آفت کا ٹکڑا'' تو ایک مکمل کتاب کی صورت میں شائع ہوا اور اس میں کہیں بھی یہ اشارہ نہ کیا گیا تھا کہ یہ اصل کتاب کا صرف ایک حصہ ہے۔

خان صاحب ہماری بات سن کر مسکرائے ''آفت کا ٹکڑا'' کے سلسلہ میں باتوں کے درمیان خان صاحب نے کہا:

اس ناول میں میں ایک خوبی یہ سمجھتا ہوں کہ اس میں پہاڑوں کے حسن کو پیش کیا گیا ہے۔ شاید اردو میں اس سے پہلے کبھی پہاڑوں کو اس طرح بیان نہ کیا گیا ہو۔ اس طرح جو چیز پڑھنے والوں نے نظر انداز کر دی، وہ تھی مصنف کا تاریخی شعور۔ رومنے گارٹ کا کردار تاریخ کے تسلسل کی نشاندہی کرتا ہے۔ اس کردار کو جس طرح سے میں نے لکھا ہے میں سمجھتا ہوں کہ اسے پوری طرح نہیں سمجھا گیا۔ وہ سیزر کی طرح ہے جب وہ چلتا ہے تو اس کا باوقار انداز دیکھ کر عام لوگ بھی کہہ اٹھتے ہیں کہ ہم نے فیلڈ مارشل کو دیکھا ہے۔ وہ اتنا بے نیاز ہے کہ اس کا گھر جل رہا ہے مگر وہ آرام کرسی پر بیٹھا، لاتعلق اور خاموش تماشائی کی طرح سے اسے دیکھ رہا ہے۔ لوگوں نے رومنے گارٹ کو نظر انداز کر کے روزبے پر زیادہ توجہ دی۔

''کیا ایسا تو نہیں کہ آفت کا ٹکڑا میں زیادہ تر روزبے ہی چھایا رہا ہو؟''

''ایک طرح سے یہ اعتراض درست ہے کہ روزبے کا ذکر زیادہ ہے مگر جس انداز میں رومنے گارٹ کو پیش کیا گیا ہے وہ زیادہ مؤثر ہے۔''

''خان صاحب! آپ نے آفت کا ٹکڑا میں لڑکیوں کے سراپے باہمی گفتگو اور حسن کو جس طرح سے بیان کیا ہے۔ کیا اس اسلوب میں عریانی یا فحاشی کے عناصر تو شامل نہیں ہو گئے۔''

''جی نہیں! میں نے دانستہ طور پر ایسی کوئی کوشش نہیں کی۔ میں جس ماحول کو آفت کا ٹکڑا میں پیش کر رہا تھا، جس سوسائٹی کا نقشہ کھینچ رہا تھا اس کے افراد کو بہت اچھی طرح جانتا تھا۔ اینگلو انڈین اور انگریزوں کی جنسی زندگی میرے مشاہدے میں رہی ہے، میں نے کوئی ایسی چیز شامل نہیں کی جو غیر حقیقی ہو، کرداروں کی نفسیات اور ان کے نفسانی اور جنسی رویے میں کہیں بھی مبالغہ نہیں کیا۔ نہ ہی چسکا پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔''

''آپ نے بعض لڑکیوں کو بے حد خوبصورت بتایا ہے مثلاً بیری بال .... جو ابھی جوانی کی سیڑھیاں چڑھ رہی ہے مگر ابھی سے اس کے حسن کی دھوم ہے۔ پادری کی بیٹی .... کیا آپ نے اپنی زندگی میں ایسی خوبصورت لڑکیاں دیکھی ہیں؟''

''جی! میں نے اپنی زندگی میں تین ایسی عورتیں یا لڑکیاں دیکھی ہیں جن کے حسن کو میں کبھی بھول نہیں سکتا۔ ایک دختر کوہستان تھی۔ کو میں نے آفت کا ٹکڑا کا گمبری کا روپ دے دیا۔ ایک انگریز لڑکی جو اغلباً سکاٹ تھی۔ اور تیسری حسین عورت میں نے ان دنوں میں دیکھی جب میں حج کے لیے گیا ہوا تھا۔ یہ عورتیں ان کا حسن مجھے ہمیشہ یاد رہے گا۔'' ....

’’خان صاحب! آپ کے خیال میں فحش ادب کی تعریف کیا ہے؟‘‘

’’میں ایک قانونی، اخلاقی اور ادبی لحاظ سے فحاشی کو ادب کا نام دے ہی نہیں سکتا جو چیز فحش ہے وہ اور سب کچھ ہو سکتی ہے ادب نہیں۔ ادب میں جمالیاتی عنصر نمایاں ہوتا ہے۔ اسے آپ جمالیاتی حظ بھی کہہ سکتے ہیں۔ فحاشی میں یہ عنصر سرے سے ہی موجود نہیں ہوتا۔ ایسی تحریریں جنہیں پڑھ کر جنسی ہیجان پیدا ہو، جسمانی ملاپ کی ترغیب یا تحریک ملتی ہو۔ انسان کو مجامعت کی خواہش پیدا ہوتی ہو، میں اسے فحش کا نام دوں گا۔‘‘

’’کیا آپ کا ناول ’’آفت کا ٹکڑا‘‘ فحش نہیں تھا۔‘‘

’’جی نہیں! اگرچہ وہ ناول ضبط ہے لیکن میں اسے فحش نہیں کہوں گا۔ ویسے بھی میں اس ناول پر پابندی لگانے کے خلاف رٹ کرنے والا ہوں۔ اس لیے مجھے قانونی طور پر بھی یہ استحقاق حاصل ہے کہ میں ’’آفت کا ٹکڑا‘‘ کی صفائی پیش کر سکوں۔‘‘

’’آفت کا ٹکڑا‘‘ کے بارے میں لوگوں کا کیا ردِ عمل تھا؟‘‘

’’جہاں تک مجھے معلوم ہو سکا ہے، مذہبی حلقوں نے مجھ پر لعنتیں بھیجیں، میرے بعض ایڈووکیٹ دوستوں اور ہائی کورٹ کے فاضل ججوں نے بھی اس کا مطالعہ کیا تھا بعض کی نظر میں اعلیٰ ادب پارہ تھا اور بعض کو اس کے کچھ حصوں پر اعتراض تھا۔‘‘

’’خان صاحب، آپ نے جن مصنفین کو پڑھا ہے ان کے بارے میں کچھ بتایئے۔‘‘

’’میں نے ادب کا مطالعہ بہت کم کیا ہے۔ اردو ادب کو تو یوں سمجھیے کہ سرے سے مطالعہ ہی نہیں کیا۔ ہارڈی کو البتہ پڑھا ہے۔ رینالڈز میرا پسندیدہ مصنف تھا۔ میں تخلات میں بسنے والا آدمی ہوں۔ رینالڈز کا ایک ناول کیشیا کے بارے میں تھا۔ میں اس سے اتنا متاثر ہوا کہ دن رات کیشیا کے خواب دیکھنے لگا۔ پاسپورٹ بھی بنوالیا۔ پھر جانے کیا بات ہوگئی کہ جاتے جاتے رہ گیا۔ میں خیالوں اور خوابوں کو حقیقت سمجھنے لگتا ہوں۔‘‘

’’اپنے بچپن اور ذہنی ترغیب کے بارے میں کچھ بتایئے۔‘‘

’’میں سخت مذہبی آدمی ہوں، نماز سے کبھی غفلت نہیں برتی۔ حج کی سعادت بھی حاصل کر چکا ہوں۔ میں ولانا عبدالرحیم صاحب کا مرید ہوں۔ بچپن میں مجھے ان کی سرپرستی میں دے دیا گیا تھا۔ ایک مدت تک میں ان ہی کی اترن پہنتا رہا ہوں۔ میری پیدائش ۱۹۱۲ء کی ہے۔ پہلی جنگ عظیم کے وقت میں سات آٹھ سال کا تھا۔ لیکن اسلام اور جہاد کا جذبہ میرے دل میں اسی عمر میں اتنا تھا کہ چھری تیار رکھتا تھا اور جہاد پر جانے کے لیے تیار رہتا تھا۔‘‘

’’کیا آپ نے کبھی کوئی ایسی کتاب پڑھی جس پر فحاشی کے الزام میں مقدمہ چلایا

گیا۔"

"جی نہیں! لیڈی چیٹر یز لور Lady Chterlay's Lover پڑھنے کے لیے خریدی تھی کہ ایک دوست مانگ کر لے گئے اس لیے اب تک اسے بھی نہیں پڑھ سکا۔"

"کیا آپ نے عزیز احمد کو پڑھا ہے............

خاص طور پر ان کا ناول "گریز"

"جی نہیں!

"کیا آپ کو اپنے ہی تخلیق کردہ کردار کبھی خواب میں نظر آئے؟"

"جی ہاں! رومنے گارٹ تو کئی بار خواب میں دیکھا ہے۔" یہ کہہ کر خان صاحب بڑی معصومیت سے مسکرا کر بولے:

"میری بیوی کہتی ہیں کہ میں ہی رومنے گارٹ ہوں!!"

"آفت کا ٹکڑا" کی ضبطی کے خلاف مصنف کی اپیل کا فیصلہ

یہ اپیل مندرجہ ذیل حالات میں دائر کی گئی:

فضل الرحمٰن اپیل کنندہ نے ایک کتاب "آفت کا ٹکڑا" کے نام سے لکھی۔ حکومت نے اس کے بعض حصوں پر یہ اعتراض کیا کہ ان سے ویسٹ پاکستان پریس اینڈ پبلی کیشنز آرڈیننس کی شقوں ایف اور جے کی دفعہ ۲۴ کی ذیلی دفعہ (۱) کی خلاف ورزی ہوتی ہے اس ضمن میں یہاں اس مر کا حوالہ دینا بے موقعہ نہ ہوگا کہ حکومت کے نقطۂ نظر سے کتاب مذکورہ میں ایسا مواد تھا جو ناشائستہ، فحش، مخرب اخلاق وغیرہ وغیرہ تھا۔

۲۔ چنانچہ حکام متعلقہ نے کتاب کے پرنٹر وار پبلشر کے نام فرد جرم جاری کی۔ وہ حاضر ہوئے۔ الزام کو صحیح تسلیم کیا اور رحم کی درخواست کی چوں کہ پرنٹر اور پبلشر نے آغاز ہی میں صاف صاف تسلیم کر لیا اس لیے کوئی تعزیری کارروائی نہیں کی گئی، سوائے اس کے کہ کتاب بحق سرکار ضبط کر لی گئی۔ ان دونوں (پرنٹر اور پبلشر) میں سے کسی نے بھی اپیل دائر نہ کی اس لیے معاملے کو ختم سمجھا گیا لیکن فضل الرحمٰن خان مصنف حالاں کہ وہ پہلے ایڈیشن کا کاپی رائٹ پبلشر کو دے چکا ہے شکایت لے کر حاضر ہوا اس لیے یہ اپیل سامنے آئی۔

۳۔ مصنف کی جانب سے یہ سوال اٹھایا گیا ہے کہ چوں کہ شروع میں اسے "شوکاز نوٹس"

جاری نہیں کیا گیا تھا اس لیے وہ حکم جس کے مطابق کتاب کو ضبط کیا گیا، از روئے قانون درست نہیں ہے اس لیے بے اثر ہے۔ بادی النظر میں یہ سوال بے وزن نہیں ہے لیکن ہم اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کر سکتے جو اس عالم گیر محاورے میں پوشیدہ ہے کہ ''ہر چیز جو چمکتی ہے، سونا نہیں''

بد قسمتی ہے فائل میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہو کہ اپیل کنندہ کا ضبط شدہ کتاب سے کیا مفاد دانستہ ہے کیوں کہ وہ کاپی رائٹ پبلشر کے نام فروخت کر چکا ہے۔ اس سلسلہ میں رشید احمد کا حلف نامہ خاص طور پر قابل ذکر ہے یعنی اپیل کنندہ کا اپنا گواہ بھی بالکل اسی امر کی توثیق کرتا ہے:

اب چوں کہ اپیل کنندہ پہلے ایڈیشن کا کاپی رائٹ فروخت کر چکا ہے اس لیے اسے از روئے قانون ''پارٹی'' نہیں قرار دیا جا سکتا۔ اسے ضبط شدہ ایڈیشن سے کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ ضبط شدہ کتاب سے مالی یا کسی اور قسم کا کوئی مفاد وابستہ نہیں رہا اس لیے اپیل کنندہ کو آرڈیننس کی دفعہ ۴۸ (۱) کی حدود اور منشاء کے مطابق اپیل کرنے کا بھی کوئی حق نہیں پہنچتا۔ اپیل کنندہ نے بطور استناد پی ایل ڈی ۱۹۶۷ء لاہور کی دفعہ ۴۲ پر بھروسہ کیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جس قانون کے تحت یہ حکم نافذ کیا گیا ہے اگر وہ خاموش بھی ہو تب بھی قدرتی طور پر انصاف کے قواعد کا اطلاق تو ہونا ہی چاہیے اور ہو گا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چوں کہ اپیل کنندہ کا ضبط شدہ کتاب سے کوئی مفاد وابستہ نہیں ہے اس لیے پی ایل ڈی ۱۹۶۷ء (لاہور کی دفعہ ۴۲ کی عبارت کا اطلاق اس کیس پر نہیں ہوتا۔ نتیجتہً فریق مخالف یعنی حکومت کا کیس جوں کا توں رہتا ہے یعنی مذکورہ کتاب میں ان حالات کا واضح و قطعی ثبوت موجود ہے۔ جن کے تحت اسے حکومت نے ممنوع قرار دیا ہے۔ اگر اس کے برعکس ہوتا تب بھی ہمارے نزدیک یہ اپیل اس وجہ سے قابل قبول نہیں ہے کہ اپیل کنندہ کی پوزیشن آرڈیننس کی دفعہ ۴۸ کے تحت صحیح ثابت نہیں ہوتی۔

جب حقیقی و قانونی پوزیشن یہ ہو تو اپیل کے فوائد خود بخود ساقط ہو جاتے ہیں۔ اور ہم بے جھجک بذریعہ حکم ہذا اپیل خارج کرتے ہیں لیکن اس کیس کے خصوصی حالات کے تحت ہم مسغیث کے اخراجات کا بار اپیل کنندہ پر ڈالنے کا جواز نہیں سمجھتے۔ اس لیے فریقین اپنے اپنے اخراجات خود برداشت کریں گے۔

مورخہ: ۲۹۔ جون ۱۹۷۰ء

دستخط: چیئرمین ٹریبونل

’’آفت کا ٹکڑا‘‘

یہ ناول ایک لذیذ المیہ ہے

محمد حنیف رامے

’’آفت کا ٹکڑا‘‘ ایک نئی کتاب ہے۔تصنیف و تالیف اس کے مصنف کا پیشہ نہیں اس کے پاس کہانی ہے، الفاظ ہیں، تجربہ ہے۔ بصیرت ہے لیکن بندھا ٹکا طرز نگارش نہیں۔ وہ اردو کے مروجہ سانچوں سے واقف ہی نہیں کہ ان سے متاثر ہونے کا سوال پیدا ہوتا۔ اپنے کردار کے پھولنے پھلنے کے لیے وہ لب ولہجہ اور اظہار کے نئے قالب جنم دینے پر مجبور ہے اور یہی مجبوری اسے اردو کا ایک نیا تازہ ادیب بنا کر ہمارے سامنے لاتی ہے۔ جوں جوں ہم اس کی تحریر میں اترتے چلے جاتے ہیں۔ یہ احساس قوی سے قوی تر ہوتا جاتا ہے کہ یہ نطق، یہ آہنگ، یہ سارا منظر حقیقی ہوتے ہوئے بھی اجنبی ہے۔

خان محمد فضل الرحمٰن خاں کی یہ اجنبیت اردو اور اردو ادب کی جھلسی ہوئی بے رنگ و برس زمین پر ٹھنڈے میٹھے پانی کی پھوار کی تمثیل ہے۔ اپنی جگہ یہ ناول ایک لذیز المیہ ہے۔ جس کے کردار اپنی وحشی خواہشوں کی چھوٹی بڑی زنجیروں میں اس طرح جکڑے ہوئے ہیں کہ اس کیفیت کو دوزخ ہی کا نام دیا جا سکتا ہے۔ دوزخ کا یہ نیا رخ معنویت سے اور اس رخ کی یہ نرالی عکاسی حسن سے مالا مال ہے۔ یہ ناول عظیم ہے یا نہیں؟ یہ دعوے ضرور کیا جا سکتا ہے کہ اس سے کھرے ادب کے سوتے پھوٹتے ہیں۔

’’آفت کا ٹکڑا‘‘

ایک ادبی رپورتاژ کی حیثیت رکھتا ہے

اعجاز حسین بٹالوی

اس ناول کے دو مرکزی کردار ہیں۔ رومنے گارٹ اور روزے بے۔ رومنے کارٹ اپنے آئیڈیل کی خاطر دنیا کی تمام راحتیں تج دیتا ہے۔ اس مطمعٔ نظر کے لیے دکھ اٹھاتا ہے، غم سہتا ہے اور دینوی لذت سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے اس کا کردار وہ آئینہ ہے جو اپنی شکستگی سے آئینہ ساز کو عزیز تر ہو جاتا ہے۔ ناول میں اس کردار کی شکست و ریخت کچھ اس طرح ہوتی ہے کہ جب اس کی دینوی وجاہت اور سماجی سطوت جل کر راکھ ہو جاتی ہے تو اسی راکھ سے ایک نئی شخصیت جنم لیتی ہے۔

> ’’جب بلدیہ کے فائر انجن گھنٹے ٹھنکاتے ہوئے موقع پر پہنچ گئے اور خلقت ڈھوک آئی تو وہ گھر سے منہ موڑے پھاٹک کے آگے جھولنے والی آرام کرسی سنبھالے سگریٹ پیتا ہوا سڑک کو اس طرح دیکھ رہا تھا جس طرح یہ آگ اس نے حکماً لگوائی تھی اور وہ منتظر تھا کہ کب سب کچھ جل کر قصہ پاک ہو اور اسے فراغت ملے۔ گویا پھانسی گھر کا ڈاکٹر چاہ رہا تھا کہ مجرم جان بحق ہو تو وہ کاغذات موت کی تکمیل کرے اور جائے۔ یا کوئی چتا ٹھنڈی ہونے کی راہ دیکھ رہا تھا کہ بھوبل سے پھول چنے اور رخصت ہو۔‘‘

دینوی وجاہت کے اس انجام کے بعد رومنے گارٹ کا کردار ایک ایسی معراج کی طرف چلنے لگتا ہے جو روز بے کو نصیب نہیں۔ روز بے اس انداز نظر کا متضاد نمونہ ہے۔ روز بے انسانی کردار میں کھلنڈرے پن اور اخلاقی غیر ذمہ داری کی ایک مہیب علامت ہے۔ وہ ایک عمر رسیدہ بچہ ہے جو حوّا کی بیٹیوں سے کھلونوں کی طرح کھیل رہا ہے۔ محبوباؤں کو جل دے کر بھاگ جاتا ہے، گاؤں کی الھڑ لڑکیوں کو شادی کے روز راہ راست سے بھٹکانے کی کوشش کرتا ہے۔ باپ کی مصیبتوں میں اس کا ہاتھ نہیں بٹا۔ ساری کائنات میں سب سے زیادہ اہمیت اپنے آپ کو دیتا ہے، خود پرست ہے اور کوئی اخلاقی پابندی اپنے اوپر عائد نہیں کرتا۔

روز بے کے کردار کا دوسرا اہم پہلو یہ ہے کہ قدرت نے اسے حسن جسمانی سے جی بھر

کرنوازا ہے۔اس کا جمال صنف مخالف کے لیے مقناطیس کا اثر رکھتا ہے اور ایک نظر غور سے دیکھیے
لو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے حسن و جمال کی ہی فراوانی روزبے کی اخلاقی بے راہ روی کا باعث بنی
ہے۔یوں بظاہر جسمانی حسن کی فراوانی اور اخلاق کی شکستگی میں کوئی علت و معلول کا رشتہ نظر نہیں آتا
لیکن روزبے کے کردار کے مطالعے میں بین السطور کہیں کہیں یہ بات ضرور جھلکتی ہے کہ وہ ساری
کائنات کو ایک عظیم آئینہ خانے کے طور پر استعمال کر رہا ہے۔وہ اپنے حسن کی رعنائیوں میں اس
قدر کھویا ہوا ہے کہ خود پرستی کی اس قید نے اس پر اخلاقی سفر کے تمام راستے بند کر دیے ہیں۔

اس دنیا میں روشنی طبع ہی نہیں، جسمانی حسن بھی بلا بن سکتا ہے۔محبت دوسروں تک
پہنچنے کا عمل ہے اور اگر انسان کی شخصیت خود دیوار بن کر اس میں حائل ہو جائے تو یہ عمل ممکن نہیں
رہتا۔اسی لیے صوفی اپنی ذات کو ذات باری میں گم کر کے وجدان کی طرف جاتا ہے اور عاشق اپنے
آپ کو کھو کر عشق کی منزل تک پہنچتا ہے۔روزبے سے یہ عمل ممکن نہیں، اسی لیے اس کی زندگی جسم
کے پیچ و خم سے آگے نہیں بڑھتی اور ہمیں اس کے کردار میں کوئی ارتقاء نظر میں آتا۔

روزبے کے کردار کی تشریح اس لیے بھی لازم ہے کہ اس ناول کا محور اسی کردار کی جنسی
زندگی ہے۔روزبے کی جنسی زندگی ایک ''تکرار تمنا'' ہے۔ایک ایسا مجبوری کا عمل ہے جسے نفسیات
والے Repetition Compulsion کا نام دیتے ہیں۔جنس محض ایک جسمانی عمل کا نام
نہیں بلکہ اپنے وسیع معنوں میں وہ قوت ہے جو تمام تر انسانی زندگی میں جلوہ گر ہوتی ہے اور بالخصوص
اس کا مظاہرہ مرد و زن کے تعلقات میں ہوتا ہے۔اس قدیم ترین انسانی رشتے میں بھی جنس محض
اتصال جسمانی کا نام نہیں لیکن روزبے کے نزدیک جنس اس کے ماورا کچھ بھی نہیں اور اسی لیے اس
ناول میں روزبے ایک ایسا کنایہ ہے جس کے معانی یہ ہیں کہ جنسی زندگی محبت اور باہمی احترام
سے محروم ہو کر ایک بدصورت چیز رہ جاتی ہے۔جسم طلب محض کے لیے ایک آلہ بن جاتا ہے اور
خواہش کے سامنے ایک سدھائے ہوئے جانور کی طرح میکانکی عمل کرتا ہے۔روزبے کا ہر جنسی عمل
اس کی ''نرگسیئت'' کی تسکین ہے۔اسی لیے وہ شریک عمل کے جذبات کی پرواہ نہیں کرتا اور ہر عمل کو
ایک نئی تسخیر سمجھ کر اپنی انا کی تسکین کرتا ہے۔یہ جنس کی ایک مہیب تصویر ہے۔

اس ناول کی خوبی یہ ہے کہ جنسی زندگی کی یہ تصویر ایک دلچسپ پیرائے میں بنتی اور
ابھرتی ہے۔نثر کا انداز عام ناولوں کا سا نہیں۔اس سے فائدہ یہ ہوا ہے کہ مصنف جس طریقے کی
تصویر کشی کرنا چاہتا ہے اس کی مغائرت اور اس کا اکھڑا پن بآسانی پڑھنے والے تک پہنچ جاتا ہے۔
لیکن جب مصنف دیہاتی زندگی کا خاکہ پیش کرنا چاہتا ہے تو وہ یہ انداز یکسر موقوف کر دیتا ہے۔مثلاً

''پہاڑن کا ورزشی جسم ایسا گتھا ہوا تھا جیسے کوئی پلنگ پر اعلیٰ درجے کا بان خوب دل

کھول کر خرچ کرے اور ایسا ٹھوک ٹھاک کر بنے کہ اگر اس پر پانی انڈیل دیں تو
ایک بوند تک نیچے نہ گر سکے۔‘‘

یہ محض ایک نادر اور طرفہ کار تشبیہہ نہیں بلکہ ایک ایسے کردار کا تعارف ہے جو میرے نزدیک اس ناول کا نہ بھولنے والا کردار ہے۔

گمبری ایک دیہاتی لڑکی ہے جو روزبے کے عشق میں گرفتار بھی ہوتی ہے مگر اس کے حربے سے محفوظ بھی رہتی ہے۔ اس کی بارات گھر آئی ہوئی ہے اس کا شوہر راستے میں پڑا سو رہا ہے اور وہ اس سخت طوفانی رات کو روزبے سے ملنے باغ کے کوٹھے میں جاتی ہے اور صبح کو اس دلدل اور کیچڑ سے یوں برآمد ہوتی ہے جیسے کنول کا پاکیزہ پھول کھلتا ہے۔

شاید مصنف گمبری کے کردار کے ذریعے پڑھنے والے تک یہ بات پہنچانا چاہتا ہے کہ چٹانوں کے درمیان، کوہساروں کے قدرتی حسن میں پلی ہوئی گمبری کے کردار میں بھی چٹانوں کی سی مضبوطی ہے اور وہ شہر کی طرح دار لڑکیوں کی طرح نہیں ہے جو روزبے کے دریائے حسن میں خس و خاشاک کی طرح بہہ جاتی ہیں۔

یہ ناول آزادئ وطن سے پہلے کے ایک مخصوص طبقے کی تصویر ہے یہ طبقہ اب قریب قریب مٹ چکا ہے اور دوبارہ کبھی واپس نہیں آئے گا۔ اس اعتبار سے یہ ناول ایک ادبی رپورتاژ کی حیثیت رکھتا ہے۔

مخطوطہ اور مخطوطہ نویسی کا فن: آغاز وارتقا

ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد

خالقِ ارض وسما نے انسان کو خلق کیا تو اس کے خمیر میں ایسے اوصاف وکمالات گوندھ دیے، جن کے باعث وہ باشرف ہوا اور ولقد کرمنا بنی آدم کے اعزاز کا سزاوار ٹھہرا۔ اُسے فرشتوں، جنوں اور دوسری تمام مخلوقات پر برتری اور فضیلت دے کر نیابتِ الٰہی کا منصب سونپا گیا۔ کرۂ ارض کو اُس کے لیے میدانِ عمل ٹھہرایا گیا اور یہاں پر اُس کے ہبوط کے ساتھ ہی اس کا امتحان آغاز ہوا۔ اوّل اوّل وہ اپنے خمیر میں گندھے اوصاف وکمالات سے بے گانہ اور نا آشنا تھا مگر اُس کی فطرت میں رکھی بے قراری اور ذوقِ جستجو نے ضرورت اور مشکل کے وقت اپنے اندر کی تسخیر کے دوران اُن اوصاف وکمالات کا کھوج لگا لیا اور اُن کو کام میں لا کر عرصۂ امتحان کی مشکلات پر قابو پانے لگا۔ انسان نے جنگلوں اور غاروں سے اپنا سفر آغاز کیا۔ اس وقت وہ تہذیب وتمدن سے نا واقف تھا اور اس کا طرزِ زیست جنگل کے دوسرے جانوروں کے مماثل تھا۔ رفتہ رفتہ اس کے اندر کی بے قراری اور ذوقِ جستجو نے اس کی صلاحیتوں کو مہمیز کیا اور وہ وحشت وبربریت کے حصار اور درندگی وخوں خواری کی فضا سے نکلا اور حریمِ آدمیت میں داخل ہو گیا۔ اس نے عزمِ صمیم، جہدِ مسلسل اور ذوقِ جستجو سے اپنے لیے متمدن اور مہذب معاشروں کی داغ بیل ڈالی اور کائنات کی تسخیر کا سفر شروع کیا۔ اس کے ارتقا کی کہانی دل چسپ بھی ہے اور حیرت آگیں بھی۔ انسان نے جب زمین پر اپنا سفر آغاز کیا اُس وقت اس کے معروض میں پھیلے ہوئے مظاہر واشیا بے نام، آوازیں بے معنی اور افعال واعمال حسنِ ترتیب سے بے گانہ تھے۔ انسان نے مشکل کی ان گھڑیوں اور خطرات کی اس فضا میں اپنے غور وفکر کے تیشے سے ان گونگے منظروں کو گویا کر دیا اور بے نام اشیا کو ناموں اور اعمال وافعال کو حسنِ معنیٰ کا اعتبار بخشا۔ وحشیانہ زندگی کے زمانے ہی میں اُس کے دل میں اپنے خیال اور احساس کو دوسروں تک منتقل کرنے کی آرزو بیدار ہوئی۔ جسمانی اعضا کی حرکات اور اشاروں کا محدود نظام اس کے احساس کی ترسیل کے لیے ناکافی تھا اس لیے اس نے تلاش وجستجو کا سفر جاری رکھا اور مسلسل غور وفکر کرتا رہا۔ مٹی کے پیکر میں موجود زندگی اپنے شوقِ نمو اور ذوقِ تسخیر کے باعث آشکارا ہونے لگی:

آشکارا ہے یہ اپنی قوتِ تسخیر سے

گرچہ اِک مٹی کے پیکر میں نہاں ہے زندگی

انسان نے اپنے جنگلوں اور غاروں کے قیام کے زمانے میں اپنے اردگرد پھیلی ہوئی دُنیا کے گہرے مشاہدے کو اپنے احساس کی ترسیل کے لیے کام میں لایا۔ اُس نے غاروں کی اندرونی دیواروں اور بڑی بڑی چٹانوں پر تصویریں بنانے کا سلسلہ آغاز کیا۔ ابتدا میں یہ ٹیڑھی میڑھی اور بدشکل تصویریں مبہم اور غیر واضح تھیں مگر رفتہ رفتہ ان میں معنی پیدا ہونے لگے اور یہی بدنما اور بدوضع تصویریں انسان کے جذب واحساس کی ترجمانی کا فریضہ انجام دینے لگیں۔ علمائے آثاریات اور ماہرینِ خط شناسی (Paleographers) نے انھی ٹیڑھی میڑھی اور بدوضع تصویریں کو فنِ تحریر کا نقطۂ آغاز قرار دے کر انسان کی اس کوشش کو غیر معمولی کارنامہ تسلیم کیا ہے۔ چٹانوں پر بنی یہ تصویریں اوّل اوّل پڑھنے کے بجائے دیکھی جاتی تھیں۔ چاند، سورج، درخت یا شیر کی تصویر کو دیکھ کر انھی چیزوں کا تصور پیدا ہوتا تھا۔ گویا یہ تصویریں حقیقی تعبیرات (Primary signs) سے بغل گیر تھیں۔ معنوی ارتقا کے ساتھ یہی تصویریں مجازی تعبیرات(Associative Signs) کی حامل ٹھہریں اور سورج سے مراد دن اور چاند سے مرادرات یا سونا لیا جانے لگا۔ چٹانوں پر تصویر سازی کا یہ سلسلہ کسی خاص علاقے تک محدود نہیں تھا؛ دُنیا بھر کے مختلف مقامات پر ایسی چٹانیں پائی جاتی ہیں جن پر اُس دور کے انسانوں کی ہُنر کاری کے نقوش ملتے ہیں۔ مصر، چین، ایران، ہندوستان، جنوبی امریکہ، بابل، آشور، نینوا اور دوسرے علاقوں میں موجود چٹانوں اور غار کی دیواروں پر بنی یا کُھدی یہ تصویریں اور پتھروں پر بنائے گئے نقش ونگار، خط نویسی کی ابتدائی صورتیں قرار دی جاسکتی ہیں۔ وہ اگرچہ اس طرح حسنِ معنی سے آراستہ نہیں تاہم حسنِ معنی کا سفر انھی سے آغاز ہوتا ہے۔

انسانی شعور کی پختگی کے ساتھ ساتھ چٹانوں پر بنی یہ تصویریں جب معنوی ارتقا سے گزریں تو یہ تصویریں رفتہ رفتہ تصویری اشارات میں ڈھلنے لگیں۔ تصویروں کی طرح یہ تصویری اشارے بھی مکمل طور پر غیر مبہم اور واضح نہ تھے مگر ان کے بنانے میں تصویروں سے کم محنت اور وقت صرف ہوتا تھا۔ تصویری اشارات کا اگلا پڑاؤ تصویری رسم الخط (Pictorial writing) تھا ۔ تصویری رسم الخط میں تصویر اور اشارے سے بھی کم محنت صرف کرنا پڑتی تھی۔ یہ خط آڑی ترچھی لکیروں کا مجموعہ تھا۔ یہ آڑی ترچھی لکیریں دراصل تصویری اشارات کی مختصر شکلیں تھیں جو انسان کی کئی برسوں کی محنت کے نتیجے میں ظہور میں آئیں۔

خط کا آغاز وارتقا:

انسان نے چٹانوں پر تصویر سازی کا آغاز شاید تفریح یا وقت گزاری کے لیے کیا مگر رفتہ رفتہ یہ اُس کی ضرورت بننے لگا اور ان کی بدوضع تصویروں میں معنویت جاگنے لگی۔ یہ تصویریں

جب تصویری اشارات کی منزل تک پہنچیں تو تب یہ دیکھنے کے دائرے سے نکل کر پڑھنے کے دائرے میں داخل ہوگئیں اور یہیں سے خط نویسی کا آغاز ہوا۔ خط نویسی کے ماہرین نے بعد میں اس خط کو ہیروغلفی خط (Heiroglyphic) کا نام دیا۔ ابتدا میں ہیروغلفی خط کی تین صورتیں تھیں: ہیروغلفی خط کی بالکل ابتدائی صورت تصویر نویسی (Pictography) کہلائی۔ اس میں تصویر سے اصل شے مراد لی جاتی۔ دوسری صورت کو خیال نویسی (Ideography) کا نام دیا گیا؛ اس میں تصویر استعارے یا علامت کے طور پر کام کرتی ہے۔ ہیروغلفی خط کی تیسری شکل، صورت نویسی (Hierography) کہلاتی ہے۔ تصویری خط کی یہ سب سے کامل یا ترقی یافتہ صورت ہے۔ اس عہد میں انسان نے آواز کو مختلف نشانوں یا علامتوں کی صورت میں لکھنے کا چلن سیکھا۔ اس منزل پر ہونے والے صوت اور صورت کے ملاپ نے حرف کو وجود بخشا۔ علمائے خط نویسی نے ہیروغلفی کی کئی قسموں کا ذکر کیا ہے اور مصر، عراق اور چین کو اس کے خاص مراکز قرار دیا ہے۔ مصر میں یہ خط دائیں سے بائیں یا اوپر سے نیچے لکھا جاتا تھا۔ چین میں بھی اس کا انداز عمودی رہا؛ باقی علاقوں میں عرضی (چوڑائی میں) صورت کو رواج ملا۔ ہیروغلفی خط کی مختلف قسموں سے مزید خطوط نے جنم لیا جن میں ہیراطیقی (Heisatic) اور دیموطیقی خط (Demotic) خاص طور شہرت رکھتے ہیں۔ ہیراطیقی خط ہیروغلفی خط سے زیادہ مشابہ نہ تھا اور عام طور پر مذہبی تحریروں کے لیے مستعمل تھا۔ اسی لیے اس کا نام ہیراطیقی رکھا گیا۔ ہیراطیقی کا مطلب مذہب اور پیشوایانِ دین ہے۔ عوام الناس کو یہ خط استعمال کرنے کی اجازت نہ تھی۔ اس لیے عوام الناس نے اپنے استعمال کے لیے جو خط وضع کیا وہ دیموطیقی کہلایا۔ دیموطیقی کا معنی عام لوگ یا عوام الناس ہے۔ ہیروغلفی، ہیراطیقی اور دیموطیقی خطوط کا چلن مصر میں ۶۰۰ ق م تک رہا۔ لندن کے عجائب گھر میں موجود حجر الرشید (Rossetta Stone) پر ان تینوں خطوط کے نمونے رقم کیے گئے ہیں۔ یہ پتھر ۱۷۹۹ء میں نپولین بونا پارٹ کی فوج کو ملا، جو مصر کی مہم سر کرنے میں مصروف تھی۔ وہاں سے یہ پتھر فرانس پہنچا اور پھر انگلستان۔ ہیروغلفی خط کے فروغ کے زمانے میں کئی اور تصویری خط بھی وجود میں آئے۔ ان میں میخی، فنیقی، قبطی، آرامی، پہلوی، یونانی، عبرانی، حمیری وغیرہ خاص طور پر معروف ہیں۔ یہ خط مختلف علاقوں میں مروج و مستعمل رہے اور انسانوں کے مسلسل غور و فکر نے ان میں بہتری اور نکھار پیدا کر کے انھیں باقاعدہ حروف کے سانچوں میں ڈھالا اور ان کے استعمال کے قواعد مرتب کیے۔ فنیقیوں نے اسی زمانے میں خط کو صورِ ذاتی سے صورِ مقطعی میں تبدیل کر کے باقاعدہ حروفِ تہجی کی بنیاد رکھی۔

اہلِ عرب میں طلوعِ اسلام سے قبل مختلف خط جیسے: مسند حمیری، سطرنجیلی (سُریانی)،

نبطی وغیرہ موجود ومروج تھے۔ یہ خط کن قدیم خطوں کی ترقی یافتہ شکلیں تھیں،اس پر علمائے خط نویسی اور مؤرخین میں اختلاف پایا جاتا ہے۔عرب میں قبلِ اسلام مروج خطوط کے بارے میں مولانا شبیر احمد خاں غوری رقم طراز ہیں:

''خطِ سُریانی اور خطِ نبطی کے امتزاج سے عربی خطوط مستخرج ہوئے؛ عرب کے مشرق میں جہاں خطِ سُریانی کا رواج تھا، اس خط سے وہ عربی خط پیدا ہوا جو بعد میں خطِ کوفی کہلایا۔مغربی عرب میں جہاں قدیم زمانے میں خطِ نبطی مستعمل تھا،مؤخرالذکر سے خطِ کوفی سے مراجعت کے بعد وہ خط پیدا ہوا جو بعد میں خطِ نسخ کہلایا۔'' (۱)

گویا سُریانی اور نبطی خطوط عرب میں پہلے سے مستعمل ومروج تھے اور انھی سے بعد میں کوفی اور خطِ نسخ نے جنم لیا۔عرب میں خطوط کے رواج وارتقا کے حوالے سے ڈاکٹر اعجاز راہی کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

''عرب کی ادبی تاریخ سے شہادت طلب کریں تو یہ جان کر اس یقین کو تقویت پہنچتی ہے کہ عرب اقوام اور خصوصاً انباز، حیرہ اور غسّان کی ریاستوں اور شہروں میں ادب کا بڑا چرچا تھا اور فنِ خطاطی پوری طرح پھیل چکی [چکا] تھا اور ان کا خط نبطیوں کے خط سے مماثلت رکھتا تھا اور یہ ان ہی لوگوں سے حاصل کیا گیا تھا جو رومیوں کے ہاتھوں تباہی کے بعد سینا پطرہ، بصرہ اور ہجرہ سے آ کر یہاں آباد ہو گئے تھے۔گو بنیادی طور پر یہ خط خطِ نبطی ہی تھا مگر مقامی رنگ کی آمیزش سے یہ انبار میں خطِ انبار، حیرہ میں خطِ حیرہ اور حمیرہ میں خطِ حمیرہ کہلایا اور اسلام کی آمد اور کوفہ کی آبادی کے بعد خطِ کوفی کے نام سے مستعمل ہوا۔ایک خیال یہ بھی ظاہر کیا جاتا ہے کہ خطِ مسند حمیری دراصل خطِ نبطی اور خط سطرنجیلی کی آمیزش سے ایجاد ہوا اور یہی آگے چل کر خطِ کوفی کہلایا۔لیکن اس کو یمن والوں نے اہلِ حیرہ کی وساطت سے ہی حاصل کیا تھا اور بعد ازاں یہاں مقامی رنگ کی آمیزش کے بعد ایک مکمل خط کی صورت میں سامنے آیا مگر عربی خط کے جو قدیم نمونے دستیاب ہوئے ہیں، اس سے ایک طرف تو یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ عربی رسم الخط دوسری صدی عیسوی میں رواج پا چکا تھا اور نبطیوں کی طرح ہی یہ رسم الخط غیر منقوط، غیر اعرابی اور غیر اوقافی تھا۔بہر طور نبطیوں کے خط کو عربوں نے مقامی رنگ میں رنگنے کے بعد رواج دیا۔'' (۲)

چوتھی صدی میں حیرہ میں کامل رواج پانے والے خطِ کوفی کو بہت فروغ نصیب ہوا۔ اس خط کو اوّل اوّل بشیر بن عبدالملک حیرہ سے سیکھ کر مکہ آیا اور یہاں قریش کے حرب ابنِ امیہ کو سکھایا جو رشتے میں اس کے سُسر تھے۔چوں کہ یہ خط کوفہ سے آیا تھا، اس لیے اس کا نام کوفی پڑ گیا

جو رفتہ رفتہ پورے عرب میں پھیل گیا۔ رسولِ کائنات حضرت محمد ﷺ کے زمانۂ مبارکہ میں حجاز اور دیگر عرب میں اسی خط کی حکمرانی تھی اور ہر طرح کی تحریر و کتابت کے لیے یہی خط مقبول و مروج تھا۔ صدرِ اسلام میں یہی خط وحیِ الٰہی کی کتابت کے لیے استعمال ہوا، فرامینِ نبوی ﷺ اور اس دور کی دوسری تحریریں بھی اسی خط میں ملتی ہیں۔ اسلام کے صدرِ اوّل میں ہی اس خط نے بہت زیادہ ترقی کی اور اس میں کاتبوں نے نزاکتیں پیدا کر کے اس کے حسن و جمال میں اضافہ کیا۔ اسلام نے علوم و فنون کی ترقی میں بہت فعال کردار ادا کیا۔ فنِ خطاطی کی تعمیر تشکیل، فروغ اور نئے خطوط کے اجرا میں اسلام کی خدمات اظہر من الشّمس ہیں اور پوری دُنیا نے اس کا اعتراف کیا ہے۔

مخطوطہ نویسی کی ارتقائی منزلیں:

مخطوطہ عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں: تحریر کیا ہوا، لکھا ہوا۔ اس کا مادہ ’’خ ط‘‘ ہے۔ خط کا معنی و مفہوم تحریر، لکھاوٹ یا کتابت ہے۔ اصطلاحی مفہوم میں ہاتھ سے لکھی ہوئی تحریر مخطوطہ کہلاتی ہے۔ اس کا انگریزی مترادف (Manuscript) ہے جس سے اس کے اصطلاحی مفہوم کا اظہار وضاحت کے ساتھ ہوتا ہے۔ یہ لفظ دو لاطینی الفاظ Manu اور Scriptus کا مجموعہ ہے۔ ان الفاظ کے معنی بالترتیب ہاتھ اور تحریر یا لکھت کے ہیں مراد ہاتھ سے لکھی ہوئی تحریر۔ ابتدا میں لکھنے کے لیے پتھر کی سلیں، مٹی کی تختیاں، ہڈیاں اور دوسری مادی اشیا مستعمل و مروج رہیں اور ان پر ہاتھ سے لکھنے کا رواج رہا؛ اس لیے مخطوطہ کے وسیع اصطلاحی مفہوم میں اس طرح کی تمام تحریریں شامل ہیں، البتہ کاغذ کی ایجاد کے بعد دیگر مادی اشیا پر لکھی ہوئی تحریروں پر مخطوطہ کی مخصوص معنویت کا اطلاق نہیں ہوتا۔ زمانۂ قدیم میں جب کاغذ وجود میں نہیں آیا تھا یا نہایت کم یاب تھا، اس دور میں کھال، چمڑا، پتے، تختے، ہڈیاں وغیرہ بہ طور کاغذ یا مسطر مستعمل تھے۔ بعد کے زمانوں میں اس طرح کی مادی اشیا پر لکھنے کا رواج ملتا ہے جیسے عمارتوں کے سنگِ بنیاد یا سالِ تکمیل کی تاریخیں جو بالعموم سنگِ مرمر، پیتل یا دوسری ٹھوس چیزوں پر تحریر ہوتی ہیں یا الواحِ قبور جو عام طور پر سنگِ مرمر پر تیار کی جاتی ہیں یا تشہیر کی غرض سے کپڑے، پلاسٹک یا دیگر مادی اشیا پر لکھی ہوئی تحریریں۔ یہ سب مخطوطہ کی مخصوص معنویت کی حامل نہیں۔ مخطوطہ کا اطلاق اب ہاتھ کی لکھی ہوئی کتابوں یا تحریروں پر ہوتا ہے۔ یہ کتابیں مختصر ہوں یا طویل، طبع زاد ہوں یا دوسری زبانوں سے ترجمہ شدہ، دیدہ زیب ہوں یا بدخط، باقاعدہ خطاط یا کاتب کی لکھی ہوں یا عام افراد کی، اصل ہوں یا ان کی نقول سب مخطوطات میں شامل ہیں۔ بیسویں صدی میں طباعت و اشاعت کے رواجِ عام نے اگرچہ مخطوطات نویسی کی بساط لپیٹ دی تاہم پریس کی ایجاد کے بعد بھی یہاں وہاں مخطوطہ نویسی ہوتی رہی اور دُنیا کے عجائب گھروں اور کتب خانوں میں ایسے سیکڑوں مخطوطات محفوظ ہیں۔

خطی یا قلمی کتابوں کے لیے مخطوطہ کی اصطلاح پچھلی ایک دو صدیوں سے مستعمل ہے، صدرِ اسلام میں ہاتھ کی لکھی ہوئی کتاب ''مسودہ'' کہلاتی تھی۔ مسوّدہ کا لفظ اسود کے مادے سے تعلق رکھتا ہے جس کا مطلب ہے سیاہ۔ چوں کہ بالعموم کتابیں سیاہی یا سیاہ روشنائی سے لکھنے کا چلن عام تھا، اس لیے کتاب کو مسودہ اور کاتب کو مسوّد کہا جانے لگا۔ ہاتھ سے لکھی ہوئی کتابوں کے لیے مخطوطہ کے علاوہ دیگر اصلاحات کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر انجم رحمانی لکھتے ہیں:

''عالمِ اسلام میں قلمی کتابوں کے لیے مخطوطہ کی اصطلاح بالکل جدید ہے۔ مخطوطہ کے لکھنے والے کو خطاط اور اس کی تحریر کو خطاطی کہتے ہیں۔ مخطوطہ کی اصطلاح اس وقت دُنیائے عرب، افریقیائی ممالک، ترکی، جنوبی ایشیا میں مروج ہے۔ ایران، افغانستان اور وسطی ایشیائی ممالک میں اس کے بجائے نسخۂ خطی کی اصطلاح رائج ہے۔ ایران میں اس سے پہلے دست نویس کی اصطلاح رائج تھی۔ جنوبی ایشیا میں اس کے لیے قلمی یا خطی کتاب، قلمی نسخہ وغیرہ خصوصی الفاظ بھی مستعمل رہے ہیں۔ دراصل ان ساری اصطلاحوں کا اطلاق طباعت کے آغاز کے بعد مطبوعہ کے مقابلے میں ہاتھ سے لکھی ہوئی کتابوں پر ہوتا ہے۔ کتاب کی اصطلاح رائج رہی۔ اس کے لکھنے والے کو کاتب اور اس کے شجرِ عمل کو کتابت کے نام سے موسوم کیا گیا۔''(۳)

عالمِ اسلام نے مخطوطہ نویسی اور خطاطی کے فنون کو نہایت اہمیت دی اور شاہی سرپرستی میں ان فنون کو نت نئے اسالیب میں نکھرنے کا موقع ملا۔ مختلف تزئینی خطوط اور مخطوطات کی زیب وزینت کے لیے نئے نئے انداز وضع کیے گئے اور مختلف اشیا کے استعمال سے اس کی آرائش کا اہتمام کیا گیا۔ جلد بندی کا فن بھی مخطوطہ نویسی کے ساتھ ساتھ پروان چڑھا۔ جلد ساز کو وراق کہا جاتا تھا۔ ایک زمانے میں مخطوطہ نویسی کا پورا شعبہ وراق کے ہی سپرد رہا۔ دستی کاغذ بنانے، مختلف رنگوں اور الوان کی روشنائیاں بنانے، کتابت کرنے، تذہیب کاری اور جلد سازی کا کام وراق ہی انجام دیتا تھا۔

سامانِ مخطوطہ نویسی:

مخطوطات نویسی کی تاریخ صدیوں پر پھیلی ہوئی ہے۔ ابتدا میں اسے بھی مختلف علوم وفنون کی طرح مشکل حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ ابتدا میں پتھر بہ طور مسطر استعمال ہوتا تھا، پتھروں پر مختلف آلات اور اوزاروں کی مدد سے اشکال بنانا اور علامات کندہ کرنا بے حد مشکل کام تھا۔ پتھر پر تیشے یا سخت دھات سے نقوش تحریر کرنے کا عمل ''نقر'' کہلاتا ہے۔ ظاہر ہی یہ عمل فرہاد کے پہاڑ کھودنے کی طرح مشکل تھا۔ اس مشکل کے باوجود دُنیا کے مختلف علاقوں سے ایسے سیکڑوں نمونے

دست یاب ہوئے ہیں جنھیں مخطوطہ نویسی کے اولین نقوش قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہ نمونے محض اس دور کی تاریخ نہیں بتاتے بلکہ اس دور کے انسانوں کی محنت، لگن اور ذوقِ جستجو کی داستان بھی سُناتے ہیں۔ پتھر کی تراشی ہوئی لوحیں بھی استعمال کی گئیں۔ اس طرح کے مخطوطات کو ''لخفہ'' کہا جاتا ہے۔ پتھر پر کھدائی یا کندہ کاری مشکل تھی اور پھر اسے ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانا بھی ممکن نہ تھا اس لیے ذہنِ انسانی نے نئے مسطر کی تلاش میں مٹی کی لوحیں بنائیں۔ ابتدا میں یہ کچی ہوتی تھیں اور ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرتے وقت ٹوٹ جاتی تھیں۔ بعد میں مٹی کی ان لوحوں پر لکھ کر انھیں پختہ کرنے کا رواج عام ہوا۔۔ اس طرح کی پکی لوحوں پر لکھے نسخے بھی دُنیا کے عجائب گھروں میں موجود انسان کے عزم و ہمت کی کہانی سُناتے ہیں۔ پہلی صدی کی کچھ لوحیں متھرا کے عجائب گھر میں موجود ہیں۔ شیخ ممتاز حسین جونپوری عراق کے عجائب گھر میں رکھی ایسی سیکڑوں مٹی کی تختیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''عراق کے عجائب خانے کے کئی سو کتبے ایسے ہیں جن میں عراق اور بابل قدیم کے مکانوں کے بیع نامے، اراضی کو لگان پر دینے کی اسناد، بردہ فروشی کے متعلق تحریریں، شادی کے معاہدے، تنسیخ معاہدے کی دستاویزیں اور معاملات دیوانی کے قضیے مٹی کی پُختہ تختیوں پر منقوش ہیں۔'' (۴)

تلاش و جستجو کا سفر رُکا نہیں بلکہ خوب سے خوب تر کے لیے سرگرمِ عمل رہا۔ مٹی کی لوحوں کے بعد لکڑی کے تختے لکھنے کے لیے کام میں لائے جاتے رہے۔ لکڑی کے تختوں پر تحریریں کندہ بھی کی جاتی رہیں اور انھیں ابھروں انداز میں بھی رقم کیا گیا۔ لکڑی پر لکھے ہوئے مخطوطات کو ''قتب'' کہا جاتا ہے۔۔ بدھ راہبوں نے مذہبی عبارتوں کے لیے بالعموم لکڑی کے تختے استعمال کیے۔ عربوں میں اونٹ اور بکرے کی چوڑی ہڈیاں بھی کتابت کے لیے استعمال کی جاتی رہیں۔ اونٹ کی سینے کی چوڑی ہڈی خاص طور پر کثرت سے مستعمل رہی۔ قرآنِ کریم کی آخری وحی کے دو نسخے اونٹ کی ہڈی پر تحریر کیے گئے جو استنبول کے توپ قاضی عجائب گھر میں موجود ہیں۔ ہڈی پر لکھے ہوئے مخطوطات ''کتف'' کے نام سے موسوم ہیں۔ ہڈی کے بعد چمڑا سامانِ کتابت میں شامل ہوا۔ اونٹ اور ہرن کے چمڑے اور ان کی اندرونی جھلیاں صاف کر کے کتابت کے لیے استعمال ہوئیں۔ یہ مضبوطی اور پائیداری میں اپنی مثال آپ ہیں۔ پورے عالم میں چمڑا اور جھلیاں مخطوطہ نویسی کے لیے مستعمل رہیں۔ حیدر آباد کے سالار جنگ میوزیم میں قرآنِ حکیم کے تین جز موجود ہیں۔ یہ جھلی پر لکھے ہوئے ہیں اور نویں صدی عیسوی کے مکتوبہ ہیں۔ ہندوستان میں شیر اور چیتے کی کھالیں بھی تحریر و کتابت کے لیے مستعمل رہیں۔

درختوں کی چھال بھی سامانِ کتابت میں بہ طور مسطر شامل رہی۔ ہندوستان میں قدیم زمانے سے درخت کی چھال کو اس مقصد کے لیے استعمال کیا جاتا رہا۔ بھوج درخت کی چھال سب سے زیادہ کام میں لائی گئی۔ اس چھال کو سینگ سے رگڑ کر ملائم اور نرم کیا جاتا تھا اور پھر اسے تیل کی پالش کر کے چمک دار بنایا جاتا تھا۔ اس چھال کو برابر سائز میں کاٹ کر کاغذ بنا لیے جاتے تھے اور پھر دو برابر ناپ کی تختیوں میں ان کاغذوں کو لپیٹ کر کتاب کی صورت دی جاتی تھی۔ اس کتاب کے لیے ''پنتھی'' کا لفظ مروج تھا۔ البیرونی نے اپنی کتاب میں بھی ہندوستان کے اس اسلوبِ کتابت کا ذکر کیا ہے۔ بھوج کی چھال پر لکھے گئے مخطوطات اُڑیسہ، کشمیر، لداخ، آسام اور شمالی ہند میں عام ہیں۔ اگر یا ساچی درخت کی چھال بھی کتابت کے لیے استعمال کی جاتی رہی۔ پندرہ سولہ سال کے اگر کے درخت جن کا تنا تیس سے پینتیس انچ اور اونچائی چالیس فٹ ہوتی، سے چار انچ سے پچیس انچ تک کی چوڑی پٹیاں اُتار کر دھوپ میں خشک کی جاتیں؛ پھر سخت چیز سے رگڑ کر اُن کی بیرونی جھلی الگ کر لی جاتی۔ اس کے بعد ان پٹیوں کو اوس میں بھیگنے کے لیے رکھ دیا جاتا پھر مہارت سے ان کا اوپری حصہ جسے ''نکاری'' کہا جاتا ہے، الگ کر لیا جاتا اور سنکھیا (Arsenic) سے زرد رنگ دے کر خشک کر لیا جاتا ہے۔ خشک پٹی کو ضرورت کے مطابق مختلف ناپ کے ٹکڑوں میں کاٹ لیا جاتا اور انھیں مزید رگڑ کر ملائم کر لیا جاتا۔ بھوج اور اگر کے علاوہ نیم، شہتوت اور دوسرے درختوں کی چھالیں بھی استعمال کی جاتی رہیں۔ اہلِ عرب کھجور کے درخت کی جڑ کے قریب ریشہ دار حصے کو گوند سے جوڑ کر ورق بنا لیتے تھے۔ اس طرح کے اوراق کے لیے ''عسیب'' کی اصطلاح استعمال کی جاتی تھی۔

درختوں کے پتے بھی تحریر و کتابت کے لیے دُنیا میں عام طور پر استعمال ہوتے رہے۔ ہندوستان میں بھوج پتر اور تاڑ پتر پر تحریر کا رواج مسیحی دور سے پہلے کا ہے۔ گوتم بدھ کی وفات کے تر تھینکا پہلے پہل تاڑ کے پتوں پر ہی لکھے گئے۔ ارتھ شاستر میں کوٹلیہ نے بھوج کی چھال اور کھجور کی پتیوں پر کتابت کا ذکر کیا ہے۔ ابوالفضل نے مغلیہ دور میں تاڑ پتوں پر تحریر و کتابت کا تذکرہ کیا ہے۔ تاڑ پتوں پر دو طرح سے کتابت کی جاتی۔ ایک عام طرح روشنائی سے اور دوسری پتوں پر فولادی قلم سے نقوش بنا کر اُن میں روشنائی یا رنگ بھرا جاتا۔ تاڑ پتوں پر مصوری کے کئی نمونے بھی عجائب گھروں کی زینت ہیں۔ اڑیسہ اور تامل ناڈ میں اب بھی یہ پتے تحریر کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔

مصر میں ایک درخت پیپرس (Papyrus) کے ریشوں سے ایک خاص لگدی تیار کر کے اس سے کاغذ بنایا گیا۔ یہ چمکیلا اور ملائم تھا، اس لیے اس پر روشنائی سے لکھنا آسان تھا۔ پیپرس

کی لگدی سے بنے ان اوراق کو حصیری اوراق بھی کہا جاتا ہے۔کاغذ کا انگریزی نام Paper بھی اس سے ہی وجود میں آیا۔ان حصیری اوراق پر لکھے کئی مخطوطات مصر کے علاوہ بھی دوسرے ملکوں کے عجائب گھروں میں پائے جاتے ہیں۔اس لیے پیپرس سے تیار کردہ کاغذ دُور ونزدیک میں مروج ومستعمل رہا۔

کپڑا بھی لکھنے کے لیے استعمال ہوتا رہا۔کپڑے کے مخطوطات کو پٹہ، پاٹکا یا کدیتم کے نام سے پکارا جاتا رہا ہے۔کپڑے کو تحریر کے قابل بنانے اور اس کے مساموں کو بند کرنے کے لیے گیہوں یا چاول کے گودے کا لیپ کیا جاتا تھا۔ہندوستان کے مختلف علاقوں میں املی کے بیج کا لیپ کیا جاتا۔ کپڑے کو سامانِ تحریر کے طور پر استعمال کرنے کا قدیم ترین حوالہ سمرتی میں ملتا ہے۔اورینٹل مانوسکرپ لائبریری، آندھرا پردیش میں تفسیرِ حسینی کا کپڑے پر مکتوبہ ایک نسخہ موجود ہے۔کاغذ کی ایجاد کے بعد کپڑے پر نسخہ لکھنے کا رواج ختم ہو گیا۔

کاغذ سازی چین سے آغاز ہوئی۔ چین میں ۱۰۵ء میں کاغذ بنانے کا سلسلہ آغاز ہوا۔اس سے قبل بھی دُنیا کے مختلف علاقوں میں کاغذ یا کاغذ نما شے بنانے کا رواج تھا۔خاص طور پر ہندوستان میں روئی سے کاغذ بنانے کا ذکر نیرکوس سے کیا ہے جس نے ۳۲۷ ق م میں ہندوستان کی سیاحت کی۔روئی سے بنے کاغذ کی عمر تھوڑی ہوتی اس لیے اسے سامانِ تحریر میں کم کم شامل کیا گیا۔چین میں کاغذ کی ایجاد سے دوسری دُنیا بہت دیر بے خبر رہی، بالآخر عربوں نے اہلِ چین سے کاغذ سازی کا فن سیکھ لیا۔پروفیسر عبدالجبار شاکر اس حوالے سے رقم طراز ہیں:

> ’’کاغذ کی ایجاد اصلاً چین کا کارنامہ ہے۔جنھوں نے اس صنعت کو قائم کیا۔سات سو سال تک یہ ایجاد ان کے ہاں ایک سربستہ راز رہی لیکن عربوں نے کسی نہ کسی طرح یہ فن اہلِ چین سے سیکھ لیا اور آٹھویں صدی عیسوی میں سمرقند میں کاغذ کا پہلا بڑا کارخانہ قائم ہو گیا۔جلد ہی یہ فن عالمِ اسلام کے تمام شہروں تک پھیل گیا۔عربوں کی مدد سے یہ کارخانے پہلے اسپین اور پھر اطالیہ میں قائم ہوئے اور یوں کاغذ سازی کی صنعت مسلمانوں کے توسط سے پورے یورپ میں پھیل گئی۔‘‘(۵)

۱۴۰۷ء سے بنگال میں وسیع پیمانے پر کاغذ بنانے کا سلسلہ آغاز ہوا۔سلاطینِ کشمیر نے بھی کاغذ سازی کے لیے پندرھویں صدی میں ایک ادارہ قائم کیا۔کشمیر میں چاول اور گیہوں کی لگدی کو پتلے تختوں پر پھیلا کر خشک کیا جاتا اور پھر چکنے پتھروں سے ان پر رگڑائی کر کے ان کو ملائم اور چمک دار بنایا جاتا۔کشمیر کے زیرِ اثر ہندوستان میں کئی مقامات پر کاغذ بنایا جانے لگا۔سیال کوٹ، اورنگ آباد اور احمد آباد میں کاغذ کے کارخانے وجود میں آئے۔ان کارخانوں میں بوسیدہ کپڑوں

اور پٹ سن کے ریشوں کو کوٹ کران میں چاول کی پیچ شامل کر کے کاغذ تیار کیا جاتا۔ڈاکٹر وحید قریشی کاغذ سازی کی تاریخ پر یوں روشنی ڈالتے ہیں:

''کاغذ سازی میں ریشم کے علاوہ چاول اور بعض دوسری اشیا کی آمیزش سے مختلف علاقوں کے کاغذ اپنے رنگ، جسامت اور سطح کے اعتبار سے مختلف ہوتے چلے گئے۔ایران میں اگر سمرقندی کاغذ کی شہرت تھی تو برصغیر پاک وہند میں کشمیری اور سیال کوٹی کاغذ نے شہرت پائی۔۔۔سمرقندی کاغذ دیرپائی، مضبوطی اور نمی کو روکنے میں اس لیے کارآمد تھے کہ اس میں نمک کے اجزا بہت کم تھے تو کشمیری کاغذ بھی دیرپائی میں اپنی مثال آپ تھے۔''(۶)

دستی کاغذ میں چوں کہ کسی قسم کا کیمیائی مواد شامل نہیں ہوتا تھا اس لیے ان کے جوڑ مستحکم ہوتے اور ان کی عمر زیادہ ہوتی۔مشینوں سے کاغذ بنانے کا سلسلہ انیسویں صدی میں عام ہوا۔ مشینوں کے کاغذ میں بانس اور دوسری درختوں کی لکڑی بھی شامل ہوگئی اور مختلف کیمیکلز کے استعمال سے رنگ رنگ اور قسم قسم کے کاغذ تیار ہونے لگے۔تاہم دُنیا میں پائے جانے والے بیشتر مخطوطات میں استعمال کیا گیا کاغذ ہاتھ سے بنا ہوا ہے۔

سامانِ مخطوطہ نویسی میں کاغذ کے بعد سیاہی یا روشنائی اہمیت کی حامل ہے۔ابتدا میں مختلف قدرتی چیزوں کو پیس کر سیاہی تیار کی جاتی تھی۔رفتہ رفتہ اس میں مختلف تجربات کے ذریعے اعلیٰ قسم کی روشنائیاں تیار کی جانے لگیں۔کشان عہد سے کوئلے کی سیاہی کا چلن ہوا۔دھل جانے والی سیاہی بادام کے چھلکوں کو جلا کر تیار کی جاتی تھی، سرمے، کتھے اور گوند کے ملانے سے بھی کچی یا دھل جانے والی سیاہی بنتی تھی۔اس کے برعکس مستقل روشنائی تل کے تیل کا کاجل بنا کر اس میں گوند اور پانی ملا کر ہاون دستے میں بہت دیر کوٹا جاتا تھا۔بعد میں اس لوازمے کو خشک کر کے ٹکیاں بنا لی جاتیں اور ضرورت کے وقت انھیں پانی میں بھگو کر استعمال کیا جاتا۔سیاہی کی تیاری میں مختلف درختوں کی چھال اور گُڑ بھی استعمال کیا جاتا رہا۔سرخ یا شنگرفی روشنائی کے لیے شنگرف میں گوند اور پانی ملایا جاتا تھا، اس طرح سنہری اور روپہلی روشنائیوں کے لیے سونے اور چاندی کے ورق کوٹ کر گوند میں گوندھے جاتے تھے۔اسی طرح نیل کے گوند میں ملانے سے نیلی روشنائی بنائی جاتی تھی۔

روشنائی رکھنے کے لیے مختلف زمانوں میں دوات استعمال کی جاتی رہی۔دوات اوّل اوّل مٹی سے بنائی جاتی تھی۔بعد ازاں مختلف دھاتوں سے بھی دواتیں بنائی گئیں۔دوات میں صوف، روئی یا کُوٹا ہوا کپڑا ڈال کر سیاہی یا روشنائی کو زیادہ دیر تک خشک ہونے سے محفوظ رکھا جاتا تھا۔عربی میں دوات کے لیے ''نون''، صوف کے لیے ''ملیق'' اور روشنائی کے لیے ''مداد'' کے لفظ

مستعمل رہے۔ دنیا کے مختلف عجائب گھروں میں پیتل، کانسی، لکڑی اور مٹی کی دواتوں کے خوب صورت اور منقش نمونے موجود ہیں جن سے مختلف ادوار اور مختلف علاقوں کے لوگوں کا ذوقِ جمال سامنے آتا ہے۔

قلم سامانِ کتابت میں ایک اہم چیز ہے۔ قلم سازی میں بھی انسان کے صدیوں کے تجربات گندھے ہوئے ہیں۔ انسان نے آغازِ تحریر و کتابت میں فولاد کا نوک دار قلم استعمال کیا، درختوں کی چھال اور پتوں پر لکھنے میں یہ قلم پورے عالم میں مستعمل رہا۔ اس قلم کو ''شکالا'' کہا جاتا تھا۔ ہڈی کے دوطرفہ نوکیلے قلم بھی تحریر کے لیے استعمال کیے جاتے رہے۔ مختلف علاقوں سے ماہرینِ آثارِ قدیمہ کو اس نوع کے قلم دست یاب ہوئے ہیں، جو دُنیا کے مختلف عجائب گھروں میں موجود ہیں۔ شکالا یا ہڈی کے بنے ہوئے قلم روشنائی کے بغیر استعمال ہوتے تھے۔ یہ چھال یا مٹی کی تختیوں میں متن گودنے یا کھودنے کے لیے استعمال ہوتے تھے۔ روشنائی کے قلم لکڑی، بانس یا مختلف دھاتوں سے تیار کیے جاتے تھے۔ ہنس، گدھ، عقاب یا دوسرے پرندوں کے پر بھی بہ طور قلم استعمال میں رہے۔ ترقی کی منزلیں طے کرتے کرتے مختلف دھاتوں کی نب سے لکڑی کے قلم بننے لگے۔

مخطوطات کی آرائش اور تذہیب کاری:

مخطوطہ نویسی کا فن جب اپنے زمانۂ عروج میں داخل ہوا تو تزئین و آرائش کے کئی اسالیب اُس سے بغل گیر ہو گئے۔ اس عمل سے مخطوطات کی قدر و قیمت کا ایک نیا در وا ہوا۔ وراقوں، کاتبوں اور خطاطوں نے مخطوطات پر بیل بوٹے اور نقش و نگار بنا کر ان کی جاذبیت اور دل پذیری میں اضافہ کیا۔ مخطوطات کی لوحیں مختلف رنگوں کی روشنائیوں اور رنگا رنگ بیل بوٹوں سے آراستہ ہو کر دامنِ دل کو اپنی طرف کھینچنے لگیں۔ یہ بیل بوٹے اور نقش و نگار تاریخ کے مختلف زمانوں میں مخطوطات کی تزئین و آرائش کا حصّہ بنے۔ اہلِ عرب میں مخطوطات حسنِ سادہ کے مظہر تھے اور ان میں تزئین و آرائش کا اہتمام نہیں ملتا۔ البتہ ایران میں مسلمانوں کی آمد کے بعد خطی نسخوں میں ایرانی ذوقِ آرائش اپنی نمود کرنے لگا اور مختلف رنگوں اور نقش و نگار سے مخطوطات کو سجایا سنوارا جانے لگا۔ ایران میں نیل، شنگرف اور سونے کے پانی سے نسخوں کی تذہیب کاری کا کام آغاز ہوا اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کے حسن و جمال میں اضافہ ہوتا گیا۔ منقش لوحیں اور تزئینی حاشیے بھی ایرانی ذوقِ جمال کے مظہر ہیں۔ متن کے گرد آرائشی حاشیوں کا چلن صفوی عہد میں ہوا۔ اعجاز راہی اس ضمن میں لکھتے ہیں:

''صفوی عہد میں صفحات پر حاشیے کا رواج بھی عروج پر نظر آتا ہے۔ ان حاشیوں میں

سنہری روشنائی سے بیل بوٹے اور کہیں کہیں حرفوں سے اشکال، پتے اور بیلیں بنا کر صفحات کے حسن کو دوبالا کرنے کا رجحان بھی غالب رہا۔‘‘(۷)

مخطوطات کی تزئین و آرائش کے لیے آرائشی اور زیبائشی خط بھی وجود میں آئے۔ ماہر خطاطوں نے کئی دیدہ زیب خط وضع کیے۔ ان آرائشی خطوط میں خطِ گلزار، خطِ پیچاں، خطِ ناخن، خطِ انیقہ، خطِ ریحاں، خطِ سُنبل، خطِ ماہی، خطِ غبار اور زلفِ عروس شامل ہیں۔ ایرانی ذوق وشوق نے دُنیا کو مصور نسخوں سے متعارف کرایا۔ سلاطین اور بادشاہوں نے نامی گرامی خطاطوں اور مصوروں سے گراں قیمت اور بیش بہا مصور نسخے تیار کرائے۔ دُنیا بھر کے نوادر خانوں اور کتاب گھروں میں مصور نسخے موجود ہیں۔ ہندوستان میں اکبرِ اعظم کے زمانے میں کثرت سے مصور نسخے تیار ہوئے۔

کاغذ کو بھی مختلف رنگوں میں رنگ کر نسخوں کو دیدہ زیب بنایا جاتا رہا ہے۔ نیل میں رنگے کاغذ پر پیلی روشنائی سے کتابت کی جاتی تھی۔ اسی طرح سونے کا پانی چڑھا کر کاغذ کو سنہری کر لیا جاتا، اس کو اصطلاح میں ’’لپہ‘‘ کہتے تھے۔ طلا اور زعفران کی بندکیوں سے صفحے کو آراستہ کیا جاتا تھا، ایسے صفحات ’’زرافشاں‘‘ کے نام سے موسوم تھے۔ برگِ مخطوطہ پر آبِ زر سے کنگھے بنائے جاتے جنھیں اصطلاح میں ’’موشِ دنداں‘‘ کہا جاتا تھا۔

مخطوطات کی تذہیب کاری مختلف ادوار کے ذوقِ جمال کی مظہر ہے۔ اس میں مختلف علاقوں کی تہذیب کی جلوہ گری مخطوطات کے حسن و جمال میں اضافے کا موجب قرار پائی۔ یہی وجہ ہے کہ مخطوطی شناسی میں تذہیب کاری کے مختلف اسالیب اور تزئین کے مختلف فنون سے آشنائی کو لازمی اور ضروری خیال کیا جاتا ہے۔

اہم اصطلاحاتِ مخطوطہ:

دوسرے علوم وفنون کی طرح مخطوطہ نویسی کی بھی اپنی مخصوص اصطلاحات ہیں۔ ان میں سے اہم تر اصطلاحات کا اجمالی تعارف ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

برگ: فنِ مخطوطہ نویسی میں برگ، ورق کے معنوں میں مستعمل ہے۔ انگریزی میں اسے Folio کہا جاتا ہے۔ برگ دو صفحات پر مشتمل ہوتا ہے۔ برگ کے سامنے والا صفحہ ’’الف‘‘ اور اس کی پشت ’’ب‘‘ کہلاتی ہے۔ قلمی نسخے کا حوالہ دیتے ہوئے برگ کا نمبر اور الف یا ب سے اس کے صفحہ نمبر کا تعین ہوتا ہے۔

چہرہ یا وجہ: مخطوطے کے برگِ اوّل کا سامنے والا یا پہلا صفحہ وجہ یا چہرہ کہلاتا ہے۔ اسے انگریزی میں Recto کہتے ہیں۔

ظہرہ: مخطوطے کے برگِ اوّل کا صفحۂ ثانی یا صفحہ ب ظہرہ کہلاتا ہے۔اسے انگریزی میں Verso کہتے ہیں۔

لوح: مخطوطے کے برگِ اوّل کے چہرے پر آرائشی محراب جو بالعموم صفحے کے نصفِ بالا پر بنی ہوتی ہے، لوح کہلاتی ہے۔لوح کی تیاری میں مختلف رنگوں کی روشنائیاں، نیل اور آبِ زر استعمال ہوتا ہے۔

حوض: برگِ مخطوطہ میں جو حصہ متن کی کتابت میں صرف ہوتا ہے، اسے اصطلاح میں حوض کہا جاتا ہے۔

حاشیہ: حوض کے باہر چاروں طرف کی خالی جگہ حاشیہ کہلاتی ہے۔بعض مخطوطات میں متن کی وضاحت، اصلاح یا اضافہ شدہ الفاظ ان خالی جگہوں پر لکھنے کا چلن رہا ہے، اس لیے ان وضاحتی یا اضافی الفاظ یا جملوں کو بھی حاشیہ کہا جانے لگا۔

ناقص الاوّل: ایسا خطی نسخہ جس کے شروع کے برگ ضائع ہو جائیں، اسے ''ناقص الاوّل'' کہا جاتا ہے۔

ناقص الآخر: جس مخطوطے کے آخر سے اوراق ضائع ہو گئے ہوں، اسے ''ناقص الآخر'' کا نام دیا جاتا ہے۔اسی طرح جن نسخوں کے درمیان سے صفحات پھٹ جائیں یا ضائع ہو جائیں، انھیں ''ناقص الاوسط'' کہا جاتا جاتا ہے۔

نجیب الطرفین: ایسا خطی نسخہ جو اول و آخر مکمل ہو اور اس کے اوراق ضائع نہ ہوئے ہوں، اصطلاحِ مخطوطہ نویسی میں ''نجیب الطرفین'' کہلاتا ہے۔دونوں اطراف سے نامکمل مخطوطہ ''ناقص الطرفین'' کہلاتا ہے۔

بیاض: مخطوطے کے خالی صفحات یا جگہوں کو جو حوض کے اندر ہوں، بیاض کہلاتی ہے۔اس کی جمع بیاضات مستعمل ہے۔

بے داغ: ایسے مخطوطات جن پر برگ نمبر یا صفحہ نمبر درج نہ ہو، بے داغ کہلاتے ہیں۔

ترک: مخطوطے کے برگ کے صفحۂ ثانی پر بالائی حاشیے کی دائیں طرف صفحۂ الف کی آخری سطر کے ایک دو لفظ، اصطلاح میں ترک کہلاتے ہیں۔ترک کے لغوی معنی چھوڑنا کے ہیں، گویا وہ عبارت یا الفاظ جو پچھلے صفحے پر ناسخ یا کاتب چھوڑ آتا ہے، ترک کے نام سے موسوم کیے جاتے ہیں۔

رکاب: برگِ مخطوطہ کے پہلے صفحے کے زیریں حاشیے کی انتہائی دائیں طرف تحریر شدہ اگلے صفحے (صفحۂ ثانی) کے چند الفاظ، رکاب کہلاتے ہیں۔عہدِ قدیم میں مخطوطات پر بالعموم صفحات نمبر درج نہیں ہوتے تھے اور کاغذوں کو ترتیب دینے میں ترک اور رکاب سے کام لیا جاتا تھا۔

خوانا، ناخوانا: بعض نسخے عمدہ اور دیدہ زیب لکھے ہوتے ہیں، ان کو پڑھنا مشکل نہیں ہوتا مگر اس کے برعکس بعض نسخے یا نقلیں رواروی، تیزی یا عجلت میں گھسیٹی ہوتی ہیں۔ ایسے نسخوں کا پڑھنا مشکل ہوتا ہے۔ جو نسخے آسانی سے پڑھے جا سکیں انھیں خوانا اور جن کا پڑھنا دشوار ہو انھیں ناخوانا کہا جاتا ہے۔ خوش خط اور دیدہ زیب نسخوں میں بھی بعض الفاظ پڑھنے میں دقت ہوتی ہے، اگر ان میں سے کوئی لفظ نہ پڑھا جا سکے تو اسے بھی ناخوانا کا نام دیا جاتا ہے۔

اتفاقیے: ہر عہد میں لفظوں کا املا، رموزِ اوقاف اور لفظوں کی تقسیم کا نظام دوسرے عہد سے مختلف یا الگ ہوتا ہے۔ اتفاقیے سے مراد کسی عہد کے مخطوطات کا مخصوص املائی نظام اور رموزِ اوقاف کا استعمال ہے۔ اگر ترقیمہ موجود نہ ہو یا مخطوطے کا سالِ تصنیف معلوم نہ ہو تو انھی اتفاقیوں سے اس کا عہد متعین کرنے میں مدد ملتی ہے۔

مختارات: ہر تخلیق کار بعض لفظوں کو روشِ عام سے ہٹ کر استعمال کرتا ہے، اسی طرح ہر کاتب یا ناسخ بعض حروف کی بناوٹ یا لکھاوٹ مخصوص انداز میں کرتا ہے۔ تخلیق کار اور کاتب کے ان امتیازی اسالیب کو اصطلاح میں مختارات کا نام دیا جاتا ہے۔

ترمیم: مخطوطہ میں ناقل یا کاتب کے سہو سے ہونے والی متنی تبدیلیاں ترمیم کہلاتی ہیں۔

تعبیر: مبہم الفاظ یا متن کی وضاحت کے لیے عبارت میں اضافہ کرنا تعبیر کہلاتا ہے۔ تعبیرات مصنف کے قلم سے بھی ہو سکتی ہیں اور کاتب یا قاری کے قلم سے بھی۔ عام طور پر یہ تعبیرات متن سے الگ شناخت کی جا سکتی ہیں۔

تنسیخ: ادارتاً یا جان بوجھ کر مخطوطات میں الفاظ یا عبارتوں کو منسوخ کرنا، کاٹ دینا یا چھپا دینا تنسیخ کہلاتا ہے۔ یہ عمل بھی مصنف، کاتب یا قاری اپنے اپنے مقاصد کے لیے انجام دیتے ہیں۔

تصحیح: صاحبِ متن یا مصنف اپنی مرضی سے اپنے متن کو تبدیل کرے یا سابق معلومات کو بدلے تو اس عمل کو تصحیح کہا جاتا ہے۔

تصحیف: صاحبِ متن یا مصنف کے علاوہ کسی دوسرے شخص کاتب، ناقل یا قاری کی طرف سے کی گئی متنی تبدیلی تصحیف کہلاتی ہے۔

انتحال: انتحال کا مطلب ہے غلط نسبت۔ جب کوئی سارق کسی متن کو اپنے یا کسی دوسرے کے نام پر پیش کرے تو اصطلاحِ مخطوطہ میں اسے انتحال کہا جاتا ہے۔

تصحیحِ قیاسی: مخطوطے کی تدوین کے دوران عبارتِ مہمل، ناخوانا، خلافِ قواعد یا مشکوک عبارت یا لفظ کی جگہ پر مناسب اور معقول عبارت یا لفظ کو شامل کرنا تصحیحِ قیاسی کہلاتا ہے۔ تصحیحِ قیاسی کو متن سے الگ رکھا جاتا ہے یا پاورق میں اس کی نشان دہی کی جاتی ہے۔

نسخۂ وحید: ایسا مخطوطہ جس کی دوسری نقل پوری دُنیا میں موجود نہ ہو، منحصر بہ فرد یا نسخۂ وحید کہلاتا ہے۔ ضروری نہیں کہ نسخۂ وحید مصنف کا مکتوبہ ہو۔

عرض دید: شاہی کتب خانوں کے نسخوں کے شروع یا آخر میں ''عرض دیدہ شد'' کے اندراجات کو عرض دید کہا جاتا ہے۔ بعض محققین کا خیال ہے کہ یہ عبارت نسخے کے مطالعے کے بعد بادشاہ اپنے قلم سے تحریر کرتا ہے، جس کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ یہ نسخہ بادشاہ کے زیرِ مطالعہ رہا۔ ڈاکٹر حنیف نقوی کے خیال کے مطابق یہ اصطلاح کتب خانے کے جائزے یا کتب شماری کے عمل سے تعلق رکھتی ہے۔(۸)

ترقیمہ: ترقیمہ کے لغوی معنی رقم کیا ہوا، یا لکھا ہوا کے ہیں۔ اصطلاحی مفہوم میں اس سے مراد وہ تحریر ہے جو نسخے کے اختتام پر کاتب تحریر کرتا ہے۔ اس تحریر میں کاتب مخطوطے کے مصنف، کتاب کے نام، تاریخِ کتابت، مقامِ کتابت اور خود اپنے بارے میں معلومات فراہم کرتا ہے۔ بعض کاتب تفصیلی ترقیمے رقم کرتے ہیں جس میں اس طرح کی تفصیلات بھی مل جاتی ہیں کہ نسخہ کس کے لیے اور کس کے ایما پر تیار کیا گیا اور اس نسخے کی کتابت میں کتنا وقت صرف ہوا۔ بعض ترقیمے مختصر بھی ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر حنیف نقوی نے اپنے مضمون ''ترقیمہ'' میں متعدد ترقیمے نقل کیے ہیں۔ اسی مضمون میں شامل ''طبقات الشعرا'' کا ترقیمہ ذیل میں نقل کیا جاتا ہے:

> ''تمام شد بعون الملک الوہاب نسخۂ طبقات الشعرا بہ موجب فرمائش خان مہربان دوست محمد خاں خلف الصدق خاں صاحب نصرت خاں حاکم بہ خطِ بندہ احقر العباد فیض علی بہ تاریخِ نہم شہر رجب روزِ پنج شنبہ، وقتِ سہ پہر ۱۲۰۱ ہجری۔''(۹)

حوالہ جات

(۱) ''علمِ خط شناسی''، مشمولہ: فنِ خطاطی و مخطوطہ شناسی (مرتب: ڈاکٹر فضل الحق)؛ دہلی، شعبۂ اُردو، دہلی یونیورسٹی؛ مئی ۱۹۸۲ء؛ ص ۴۷۔

(۲) تاریخِ خطاطی؛ اسلام آباد؛ ادارۂ ثقافتِ پاکستان؛ مئی ۱۹۸۶ء؛ ص ۵۵، ۵۶۔

(۳) ''مخطوطات: اہمیت، حصول، تحفظ''، مشمولہ: فکر و نظر (مخطوطات: خصوصی اشاعت)؛ اسلام آباد؛ ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی؛ اکتوبر ۱۹۹۷ء تا مارچ ۱۹۹۸ء؛ ص ۳۳۔

(۴) خط و خطاطی: کراچی؛ اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ؛ دوم، ۲۰۰۰ء؛ ص ۲۲۔

(۵) ''پاکستان میں ذخائرِ مخطوطات۔۔ایک جائزہ''، مشمولہ: فکر و نظر (مخطوطات: خصوصی اشاعت)؛ ص ۱۲۵۔

(٦) ”دیباچہ“ مشمولہ تاریخِ خطاطی و خطاطین (پروفیسر محمد سلیم)؛ کراچی؛ پروفیسر محمد سلیم اکیڈمی؛۲۰۰۱ء؛ص۲۱۔

(۷) تاریخِ خطاطی: ص۱۲۵۔

(۸) تحقیق و تدوین۔۔مسائل و مباحث: ملتان؛ بیکن بکس؛۲۰۱۲ء؛ص۲۵۴۔

(۹) ایضاً: ص۲۳۱۔

کتابوں کی جلد سازی کا فن

رفعت گل

تحریر انسان کی بنیادی ضرورت ہے اور تحریر کو محفوظ کرنا اس کی فطری خواہش کا بنیادی وظیفہ۔ انسان نے جب لکھنا سیکھا تو اپنے لکھنے کو محفوظ کرنے کا سلیقہ بھی حاصل کر لیا تھا۔ اس حوالے سے کہا جا سکتا ہے کہ تحریر کو محفوظ کرنے کا فن اتنا ہی قدیم ہے، جتنا خود تحریر کی تاریخ......ازمنہ قدیم میں کتاب سازی کا شعور تو تادیر دکھائی نہیں دیتا، مگر لکھے ہوئے کو محفوظ کرنے کی کوششیں بہت پہلے ہی آغاز پا گئی تھیں۔ اس کی بہترین مثال ابتدائی تہذیبی ادوار سے ہی مل جاتی ہیں۔ سومیریوں نے اپنا تصویری یا اشاری رسم الخط ایجاد کیا، تو اوّل اوّل انھیں کچی مٹی پر تحریر کیا گیا لیکن جلد ہی مٹی کی ان ہزاروں تختیوں کو محفوظ کرنے کا فن بھی سیکھ لیا۔ مٹی کی ان تختیوں پر تحریر کی جاتی اور پھر انھیں بھٹی میں پکا کر نہ صرف تختی کو مضبوط کر لیا جاتا، بلکہ تحریر بھی محفوظ ہو جاتی۔ گویا عمل تکلیف وہ حد تک طویل رہا ہو گا، مگر جہاں تحریر کا فن تاریخ انسانی کی ترقی کا ایک اہم واقعہ تھا وہیں تحریر شدہ مٹی کی تختیوں کو محفوظ کرنے کے فن کی ایجاد بھی انسانی ذہن کا ایک عظیم کارنامہ ہی قرار دی جاسکتی ہے کہ اس سے کتاب سازی کا آغاز ہوتا نظر آتا ہے۔ سومیری طویل مضامین کے لیے کئی کئی تختیاں استعمال کرتے تھے۔ (اعجاز راہی: تاریخ خطاطی، ادارہ ثقافتِ پاکستان، ۱۹۸۶، ص۴۳) جنھیں کسی نہ کسی طریقے سے ایک دوسرے کے ساتھ مربوط کر دیا جاتا ہو گا، بعد کی کتاب سازی کو خصوصاً لکڑی کی جلدوں کے دور کو سامنے رکھتے ہوئے، یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ تختیوں میں سوراخ کر کے پرونے کے انداز میں تحریر کو مربوط کیا جاتا ہو گا۔

قدیم مصری تہذیب میں درخت کی چھال کے باریک ریشوں، جانوروں کی چوڑی ہڈیوں اور کھال پر تحریر کا آغاز ہوا، ہڈیوں کی تختیوں کے برعکس کھال کی جھلیوں اور چھال کے باریک ریشوں کے ۲۰، ۲۰ فٹ طویل ٹکڑے، استعمال کیے جاتے تھے، جنھیں گول کر کے طومار کی شکل دے دی جاتی۔ کاغذ نما اس مواد کو محفوظ کرنے کا ایک اور طریقہ بھی رائج تھا کہ وہ اسے تہہ کر کے رکھ لیا کرتے، جس سے تحریر متاثر ہوا کرتی اور پڑھنے میں دشواری کا سبب بنتی تھی۔

Islamic Book Binding by Duercan Holdam Penshurt

Press, London, 1983, P-9

تحریر کو محفوظ کرنے کا یہی طریقہ چینیوں کے ہاں بھی رائج تھا مگر مصریوں کی نسبت زیادہ غیر مروف اور غیر مرتب تھا، بہرحال انسانی ذہن کی یہ کوششیں کتاب سازی کی طرف تیزی سے بڑھتی رہیں اور آگے بڑھ کر جب مصریوں نے ہی پیپرس نامی درخت کی چھال سے ''کاغذنما'' کی دریافت کی تو مرتب ٹکڑوں کی شکل میں کتاب سازی کا شعور بھی بیدا ہوا۔ ہڈیوں اور کھالوں سے مختلف مصنوعات کے ساتھ ورق سازی کا طریقہ تو پہلے سے رائج تھا، چنانچہ تحریر کو کتابی شکل دینے کے لیے چھوٹے یا بڑیوں اور بعض صورتوں میں (لیکن بہت بعد میں آ کر) لکڑی کی جلدوں کا ڈھیلا ڈھالا طریقہ بھی رائج ہوگیا، جسے فیتے کے ساتھ باندھ کر جلد کا کام لیا جاتا۔

اسلامی فن تجلید بھی انہی انسانی ایجادات اور تجربات کی توسیع ہے، کہ اسلام کا سورج جس خطۂ ارضی پر طلوع ہوا، بے شمار تہذیبوں اور اقوام کے نقش پا کی امین ہے، مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ فن خطاطی کی طرف فن تجلید نے بھی مصحف کے تقدس کی چھاؤں میں ہی ارتقا کی ان گنت منازل طے کیں، کہ کوئی بھی دوسری قوم اس کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کرسکتی۔

اسلام کے ابتدائی ایام میں عربی رسم الخط کی کرختگی کے باوجود قرآنی خطاطی رواج پا چکی تھی۔ اس کا ایک واضح ثبوت تو ایک حدیث خود ہے، جس میں رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

''زید کو بلاؤ اور کہو کہ وہ اپنی تختی اور دوات لے آئے۔''

پھر ورقہ بن نوفل کے مطابق اسلام کے ابتدائی دور میں ریشمی کپڑے پر رنگ کر کے کتابت کی جاتی تھی، مزید یہ کہ درج ذیل اشیا کا ذکر بھی موجود ہے جن پر کتابت کی جاتی تھی۔[۱]

۱۔ چمڑے کا ورق بنا کر

۲۔ بکرے یا اونٹ کے شانے کی چوڑی ہڈی کی تختی بنا کر جسے کتف کہا جاتا تھا۔

۳۔ پتھر کی چھوٹی چھوٹی پتلی تختیاں، جنھیں لخفہ کہا جاتا تھا۔

۴۔ لکڑی کی تختیاں جنھیں قتب کہا گیا۔

۵۔ کھجور کے درخت کی جڑ کے قریب ریشہ دار سے حصے کو گوند سے جوڑ کر ورق بنا لیتے جسے حسیب کہتے تھے۔

۶۔ ہرن کی کھال کو صاف کر کے جھلی نکال لی جاتی، جسے کتابت کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔

عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور ادوار خلافت راشدہ کے بعد جب اسلامی سلطنت کی

سرحدیں مشرق ومغرب میں دور دور تک پھیل گئیں، تو قرآن اور ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کو عام مسلمانوں تک پہنچانے کے کام کو منضبط کرنے کا آغاز ہوا۔ دور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں قرآنی صفحات کو محفوظ کرنے کا ایک روایتی طریقہ رواج پا چکا تھا۔ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ جب کتابت کر لیتے تو اسے لکڑی کی بنی ہوئی دو تختیوں میں رکھ لیتے تھے اور یہی طریقہ کار رفتہ رفتہ کتاب سازی میں پیش رفت کر کے جلد سازی کا رخ اختیار کر گیا۔ بعد ازاں ان دونوں تختیوں کو ڈوری سے باندھ کر جلد کا کام لیا جاتا۔ اس کے علاوہ قدیم مصری باشندوں کے فن تجلید کو بھی رواج ملا۔ مصر کے قدیم باشندے قبطی پیپرس پر چمڑے کا غلاف چڑھا کر اسے مضبوط بنا لیتے اور اسے مضبوط بنا لیتے اور اسے ایک طرف سے باندھ کر جلد کا کام لیتے تھے۔

دور امیہ میں جب قرآن کی خطاطی کا وسیع پیمانے پر کام شروع ہوا اور خطاطین عصر نے اسے مذہبی جوش و جذبے اور تقدس سے لکھنا شروع کیا، تو جہاں خط عربی میں (جو کوفہ کے آباد ہونے کے بعد خط کوفی قدیم کہلایا) نئے نئے زاویے، تہذیب اور شائستگی ابھرنے لگی، تو قرآن کو زیادہ خوبصورت انداز میں پیش کرنے کے لیے جلد کی طرف بھی توجہ دی جانے لگی۔ تحریر اور تجلید کے لیے چمڑے کا استعمال عربی روایت کا ہمیشہ سے حصہ رہا تھا، جب لکھنے کے لیے کاغذ دستیاب ہونے لگا، تو چمڑے کو صرف جلد کے لیے استعمال کیا جانے لگا اور دوسری صدی کے اختتام تک کتاب سازی تزئین و آرائش کی نئی نئی راہیں تلاش کرنے لگی چنانچہ مسلمان فنکاروں نے اپنے ذوق جمال اور نرم ولطیف جذبوں کا اظہار اور اپنے فن اور ہنر کاری کو قرآن کی بہتر سے بہتر تزئین وسنوار کر پیش کرنے کی طرف مائل کر لیا۔ فن تجلید رفتہ رفتہ منہاج رفعت کی ایسی منزلوں تک جا پہنچا جہاں یقینی طور پر اسے مسلمانوں کے تمام فنون میں امتیازی مقام حاصل ہو گیا۔

کسی بھی فن میں تخلیق کار یا فن کار کی اپنی شخصیت اور شخصیت کا اسلوب اجاگر ہوتا ہے، مگر من حیث المجموع پورے عصر کا ایک اسلوب بھی بنتا ہے اور زمانی و مکانی اثرات الگ الگ اسالیب کی ترتیب میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اس حوالے سے اسلامی فن تجلید میں بھی بہت سے اسالیب دکھائی دیتے ہیں۔ ہر اسلوب ایک الگ تکنیک، طریقۂ کار ہنر کاری اور الگ فکری دروبست کا اظہار کرتا ہے۔ جلد کی آرائش اور تزئین کے الگ الگ رویوں پر دال ہے۔ اس حوالے سے پورے عالم اسلام کے مختلف علمی مراکز کی چھاپ واضح طور پر دیکھی جا سکتی ہے، بات کو زیادہ الجھاؤ اور پھیلاؤ سے بچانے کے لیے ہم اپنی بحث کو چار واضح رجحانات تک محدود رکھیں گے۔

۱۔ عربی فن تجلید

جس میں مصر، اندلس، الجزائر، مراکش، شمالی افریقہ بھی شامل ہیں۔

۲۔ فارسی فن تجلید
۳۔ ترکی فن تجلید
۴۔ برصغیر ہندو پاک میں فن تجلید

عربی فن تجلید ایک عمومی جائزہ

اسلامی فن تجلید کے مختلف اسالیب پر بات کرنے سے قبل یہ مناسب ہوگا، کہ اسلامی فن تجلید کا ایک عمومی جائزہ لے لیا جائے تا کہ فن اور طریقہ کار (Methodology) پر بحث کرتے ہوئے علاقائی فن تجلید کی ایک عمومی تصویر سامنے رہے۔

مصر قدیم تہذیبوں میں ایک نہایت ترقی یافتہ اور فنون پروری کا سب سے بڑا مرکز رہا ہے۔ وادی نیل کی اس تہذیب نے جہاں زندگی کے بہت سے شعبوں میں دوسری قریبی تہذیبوں کی نسبت پیش قدمی کی، وہیں فن تحریر اور کتاب سازی میں بھی اس کی پیش رفت رہی۔ قدیم مصری باشندوں نے سب سے قبل جانوروں کی کھالوں کے اندرونی حصے کو صاف کر کے تحریر کے لیے مواد حاصل کیا اور پھر پیپرس کے درخت سے کاغذ بنانے کا شرف بھی اسی قوم کو حاصل ہوا لیکن پیپرس کی ایجاد کے باوجود چمڑے سے کتاب سازی کے عمل میں کمی نہیں آئی اور رنگین چمڑے سے کتاب کی تزئین کا کام لیا جانے لگا۔ اسلام سے قبل قبطی فن تجلید، جو بعد میں اسلامی نظریہ حیات سے متاثر ہوا اور اس پر اسلامی رنگ غالب آیا، قدیم تجلیدی روایت کا حامل ہے، قبطی جلدوں میں زیبائش کا عمل دیر سے جاری تھا، اسلام سے کچھ قبل جو چند جلدیں قبطی مجلدوں کی ملی ہیں ان سے اس دور کی صنعت تجلید کا پتہ چلانے میں مدد ملی ہے۔ یہ جلدیں لندن لائبریری میں محفوظ ہیں اور مناجاتی متون رکھتی ہیں۔

ان جلدوں سے پتہ چلتا ہے کہ قبطی جلد سازی میں دو تین نمایاں خصوصیات یکسانیت کی حامل ہیں۔ ایک...... وہ بیچ سے تراشیدہ ہوتیں۔ دوم...... ان پر فریٹ کاری اور برجستہ کاری (جو نبت کاری سے مشابہ فن ہے) کی جاتی تھی۔ سوم...... جلدوں پر مختلف اشکال کندہ ہیں اور جو چیز ان میں یکساں نظر آتی ہے، وہ قطری کراس کا نشان ہے۔ اس کی شاید کوئی مذہبی توجیہہ کی جاسکتی ہو۔ اس کے ساتھ ہی چھوٹے چھوٹے اوزاروں سے جلدوں کو ستاروں اور دائروں سے آراستہ کیا جاتا، جانوروں اور پرندوں کی تصاویر بہت کم دیکھنے میں آتیں، ایک جلد پر باز ماہی خورے (فیلکن)، سینگوں والے مینڈھے اور فاختہ کی تصاویر ہیں۔ لندن لائبریری کے ایک قبطی جلد پر آٹھ رخے ستارے کندہ ہیں اور جلد کے بیچوں بیچ سونے سے کراس کا نشان جڑا گیا ہے۔ جلد کے

اطراف میں ایک باز اور فاختہ کی اشکال ہیں، جب کہ ایک طرف سینگوں والے مینڈھے کی تصویر بنی ہے۔ اس جلد کو تین خوبصورت ڈوریوں میں لپیٹ کر ڈوریوں کے سرے پیتل کے ایک چمٹے کے ساتھ باندھے گئے ہیں یہ دونوں جلدیں اب تک محفوظ ہیں، یہ ۱۸۹۶ء میں دریافت کی گئیں، جو بکرے کی کھال اور پتھر کے بکس نما ٹکڑے میں پڑی تھیں۔

اس کے باوصف کہ مصر میں جلد سازی بہت پرانی ہے، لیکن مصحف کی جلد سازی میں مسلمان ماہرین سے کما حقہ کسب فیض نہ کر سکے قبطی دور کی بعض جلدوں سے پتہ چلتا ہے کہ ان میں اوزاروں کا استعمال نہیں ہوا۔ جب کہ مسلمانوں نے آغاز ہی میں صنعت تجلید میں اپنے ذوق آگہی اور مذہبی جذبوں کی آبیاری کے لیے جدید ذریعے استعمال کیے۔ مثلاً بعض قبطی جلدیں پیپرس پر غلاف چڑھا کر بنائی گئیں۔ جب کہ مصر میں بھی مسلمان فن کاروں نے پیپرس اور اس وقت کے دوسرے سامان کتب کے علاوہ لکڑی کی پتلی پتلی کڑیوں سے بھی جلد سازی کی۔ لکڑی کی ان تختیوں کو رنگ کر ان میں نقش و نگار اور خطاطی کندہ کی جاتی اور فلز کاری کے ذریعے حروف کو ابھار کر مختلف چیزوں سے جڑاؤ کر کے جلدوں کو خوبصورت بنایا جاتا۔ چوبی تختوں پر چمڑہ چڑھا کر بھی جلدیں بنائی جاتیں۔ اس کے علاوہ چمڑے پر خوبصورت خطاطی اور نقش و نگار کی ہوئی ابتدائے اسلام کی جلدیں آج بھی یورپ کے بعض عجائب گھروں اور کتب خانوں میں موجود ہیں، ہمبرگ اور میٹرو پولٹین میں پیپرس پر غلاف چڑھی خوبصورت آرائشی و زیبائشی جلدیں مسلمان فنکاروں کے ابتدائی کام کی گواہ ہیں۔

ابتدائی ادوار کی جلدوں کو دیکھنے کے بعد یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ مسلمان فن کاروں نے قدیم قبطی روایت اور تجربات سے فائدہ تو اٹھایا، مگر جلد ہی اپنا طریقہ کار تکنیک، رنگ اور آہنگ پیدا کر لیا اور ایک ایسی جاندار روایت اور نئی کلاسیک کو جنم دیا جس کی مثال تاریخ میں کم کم نظر آتی ہے، مثلاً قبطی، رومی اور یونانی جلدوں پر بھاری اور پراسرار فقی و عمودی صفحیوں (Panels) کی شکل اختیار کر لیتے۔ بعض صفحیے اس طرح بنائے جاتے جو ایک یا ایک سے زیادہ مستطیل بنا دیتے، جن میں خطاطی کے علاوہ خوبصورت بیل بوٹے بنائے جاتے اور اس میں فن کار اپنے تخلیقی جوہر دکھاتے، یہاں یہ امر بھی قابل غور رہے کہ ابتدائے اسلام میں فن خطاطی کم مدور اور افقی تھی جب کہ عمودی رجحان نمایاں تھا اور جب مرصع خط کوفی کی طرح پڑی تو حروف اور زیادہ عمودی میلان لے کر آئے جنھیں بعد ازاں تناسب و ترتیب دے کر عموداً و افقاً برابر کیا گیا، اس کے لیے بھی مستطیل کا تناسب زیادہ موزوں تھا۔

اب آئیے، وسطی اور جنوبی عرب کی طرف:...... اہل حبشہ کا دعویٰ کہ فن تحریر ان سے

عربوں تک پہنچی! کسی طرح بھی درست نہیں ہے۔ حبشہ کے شمال مشرق میں بحر احمر کے دوسرے کنارے پر یمن ایک ایسا ملک ہے جہاں ابتدائے اسلام میں ہی تجلید کی مثالیں ملتی ہیں۔ یہاں دباغت خانوں، فن دباغت اور سامان دباغت گری کی مضبوط روایت کا پتہ چلتا ہے۔ ایرانی اثرات نے اسے مہمیز لگائی اور ۹۹۰ء کے قریب صرف صنعا میں جو یمن کا دارالحکومت تھا، ۴۰ سے زائد دباغت خانے تھے۔ یمن کا ایک اور شہر زبد احمری، چرم کے سبب شہرت رکھتا تھا۔ طائف فن تجلید میں نفاست کے لیے مشہور تھا۔

دور مملوک میں مصر کتاب سازی کے سامان کی پیداوار کے لیے سب سے بڑی منڈی تھا۔ یہاں بے شمار دباغت خانے تھے، جو جلد سازی کے سامان کے لیے اعلیٰ معیاری چرم مہیا کرتے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ فن تجلید میں کام آنے والا دوسرا سامان بھی تیار کیا جاتا تھا۔

چھٹی اور ساتویں صدی عیسویں کی عربی شاعری میں خطاطی و فن تجلید کا اکثر ذکر ہوا ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے، کہ عرب میں کتاب سازی کا شعور ایک مضبوط روایت کی صورت میں موجود تھا۔ اسلام کے بعد عباسیوں کے دور تک پہنچتے پہنچتے بے شمار صاحب کمال ماہرین تجلید پیدا ہو چکے تھے جنھوں نے اس فن کو اپنے ذوق اور مذہبی جذبے کی آمیزش سے رفعت و اعجاز کی ایسی بلندیاں عطا کیں جس کی مثال تاریخ سے نہیں دی جا سکتی۔

یہاں اس بات کا اظہار بھی ضروری ہے کہ اسلام کی آمد سے وہ تمام فنون لطیفہ جو وحدانیت کی نفی پر استوار تھے یا جسے ممنوع قرار دیا گیا، مسلمانوں نے ان سے کنارہ کیا، تو اپنے تمام فنی جذبوں کو قرآن کے تقدس کے ساتھ وابستہ کر کے اپنی تمام تر صلاحیتوں کو کتاب سازی کی طرف مائل کر لیا۔ مصوری کی جگہ خطاطی نے لی اور اس میں ایسا کمال پیدا کیا، کہ خطاطی مصورانہ حیثیت اختیار کرتی چلی گئی، چنانچہ قرآن کی خطاطی اور جلد سازی جہاں روزگار کا ایک سبب تھی وہیں جمالیاتی ذوق اور فنی جذبوں کی تسکین کا سامان بھی تھی، بعض نابغہ روزگار ماہرین تجلید ایسے بھی تھے جن کا اپنے ادوار میں طوطی بولتا تھا اور ان کی بنی ہوئی لاکھوں کتابیں عرب کے مختلف کتب خانوں اور ذاتی انتخابوں میں ان کے فن کی داد چاہتی تھیں، عام طور پر اعلیٰ درجے کی جلد کا معاوضہ سونے کا ایک دینار ہوا کرتا تھا۔ مگر یمن میں ایک ایسا شخص بھی تھا جس کی شہرت جغرافیہ دان کے حوالے سے تھی۔ اس کا نام المقدس تھا جو ایک جلد کے دو دینار لیا کرتا تھا۔ اس دور میں دو دینار کا مطلب بڑا واضح ہے۔ ایسے نہ جانے کتنے استادان فن گردش ایام می ں اپنا وجود کھو بیٹھے ہیں۔ المقدس کی بنی ہوئی ۲۵۰ جلدیں صرف قرطبہ کے کتب خانے میں تھیں، جو اس طرح ضائع ہوئیں کہ اب اس کا نام و نشان بھی موجود نہیں۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ مسلمانوں نے چار پانچ صدیوں میں علم و فن کی

لاکھوں کتابیں جمع کیں، بڑے بڑے کتب خانے بنائے جن میں نادرونایاب کتب موجود تھیں مگر دیکھتے ہی دیکھتے مسلمانوں کا نہایت قیمتی سرمایہ نیست ونابود ہوگیا۔ مصر میں ۱۰۶۸ء میں غلاموں کی بغاوت کے دوران بنو فاطمی کا کتب خانہ جس میں ہزاروں کتابیں تھیں تباہ ہوگئیں، عیسائیوں کے حملوں کے دوران صرف طرابلس کے کتب خانوں سے تین لاکھ کتابیں نذر آتش کر دی گئیں۔ ۱۲۵۷ء میں الموت کے ایک بڑے کتب خانے کو جلا دیا گیا۔ ۱۲۵۸ء میں منگولوں کے بغداد پر قبضے کے بعد ہزاروں کتب خانے اور لاکھوں کتابیں نذر آتش ہوئی۔ مدینہ کے ایک کتب خانے میں جہاں نایاب اور قیمتی کتابوں کا ذخیرہ تھا ایک شخص کی ذراسی غلطی سے، جس نے موم بتی پھینک دی تھی، ہزاروں کتابیں جل کر خاک ہوگئیں۔ اکثر خلفائے (بعد از خلفائے راشدین) سلاطین اور فرمانرواؤں کے ذاتی کتب خانے تھے جو اکثر و بیشتر ریشہ دوانیوں اور قتل مقاتلوں کے سبب تباہ ہو گئے اور آج اسلام کے زریں دور کے ذخیرے سے چند نمونے باقی ہیں جن کا بیشتر حصہ غیر مما لک میں پڑا ہوا ہے، ہماری کتاب دوستی کا ثبوت اور ہمارے زوال کی داستان سنا رہا ہے۔

فن تجلید، تکنیک، طریق کار، اوزار اور مواد

اسلامی فن تجلید ۱۲ سو سالوں رپ محیط تاریخ کی حامل ہے گو اس فن پر بالکل کام نہیں ہوا اور جو کچھ کام کیا گیا وہ بھی یورپ اور امریکہ کے کتب خانوں میں موجود جلدوں کی بنیاد پر۔ پھر مستشرق کتنا ہی غیر جانبدار، وسیع النظر اور ماہر السان ہو، اس کا نکتہ نظر کاروباری یا شہرت کے حصول کا ہوتا ہے چنانچہ اپنے فن کی کھوج کی جانکاری مستشرق کے کام کی نسبت رنگ اور حقیقی لگاؤ اور تلاش کی نیابت کرتی ہے مگر اب تک خود مسلمان محققین نے اسلامی فنون کی طرف اس قدر توجہ نہیں دی، جس کا یہ فنون تقاضا کرتے ہیں، پھر فن تجلید تو ایک ایسا فن ہے جو بہت زیادہ (بلکہ اردو میں) کلیتہً نظر انداز ہوا ہے۔ جس کی وجہ سے فن تجلید کے بہت سے گوشے ہنوز تاریخ کی گرہ میں چھپے ہوئے ہیں۔ البتہ چند ایک کتابیں ایسی ہیں جن میں فن تجلید پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان میں:

عمدة الکتاب دعوة دوی الالباب از امحزبن بادیس

نفیس الفنون از ممحد بن محمود العمالی(۱۳۳۵ء)

صناعة تسفیر الکتب و جلی الذھب از ابو العباس احمد بن محمد السفیانی، مراکش(۱۶۱۹ء)

عدة الکتب از عبدالله بن حسن

نفیس الفنون کتاب سازی کی تکنیک اور طریقہ کار سے بحث کرتی ہے۔ عدة الکتاب فن تجلید میں استعمال ہونے والے اوزاروں پر تفصیلی معلومات مہیا کرتی ہے جبکہ باقی دونوں کتابیں

فن کتاب سازی اور فن تجلید کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرتی ہیں۔ ابن بادیس کی کتاب کے بارھویں باب میں چمڑے کے فن تجلید، اوزاروں، آلات اور مواد پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس نے سب سے پہلے درج ذیل اوزار گنوائے۔

سل	Slab	لوح
سان	Wret Stone	حجر شحز
چاقو	Knife	
سوا	Awl	مخرز/مثقبۃ
قینچی	Scissor	مقص
ہتھوڑی	Hammer	مطرقۃ حبثیۃ/لراس
سوئی	Needle	ابرہ
کٹر/قاطع	Cutter	قاطع/مقطع
شکنجہ/دباودار/کبس	Press	کبس
دباؤ پیچ	Screw Press	لولب الکبس
مسطر/پیمانہ	Ruler	مسطرۃ
پرکار	Compasses	فرجار

ابن بادیس اس باب میں مختلف اوزاروں کے سائز، استعمال اور فرق کو ظاہر کرتا ہے، جیسے وہ کہتا ہے کہ سوئیاں دو قسم کی ہونی چاہییں۔

ایک......جس سے صفحات کی سلائی ہو، یہ باریک اور

دوسری......جس سے جلد کی سلائی ہو سکے، وہ موٹی اور کم طویل ہو اسی طرح وہ دباؤ دار۔ (کبس Press) کے بارے میں کہتا ہے کہ ایک وہ طریقہ کار جو مصر، عراق کے کچھ حصوں اور ایران کے شہر خراسان میں استعمال کیا جاتا ہے، جس سے جلد سوکھنے کے بعد سیدھی اور مضبوط ہو جاتی ہے جبکہ دوسرا طریقہ پیچ دار شکنجے کا ہے۔ جو عراق کے اکثر علاقوں میں نہ صرف جلد ساز بلکہ بڑھئی بھی لکڑی کو جوڑنے کے لیے استعمال کرتے ہیں بادیس آگے چل کر ان دونوں کے استعمال کے طریقے بتاتا ہے۔

السفیانی جلد کے لیے چمڑے کو تیار کرنے کی تکنیک بیان کرتا ہے وہ بتاتا ہے سب سے پہلے ایک تر یشدہ چمڑے کا مطلوبہ سائز کا ٹکڑا لیا جاتا ہے، اور اس کے دونوں طرف طاقتور قسم کی سریش بھرپور انداز میں لگا دی جائے۔ پھر اس پر دور تا تراشیدہ چمڑے کے ٹکڑے چسپاں کر دیے

جائیں اوراس کے اندرونی حصے میں سریش لگائی جائے۔اسے خشک ہونے تک یوں پڑا رہنے دیا جانا چاہیے۔ پھراس پر کاغذ کا وہ ٹکڑا جس پر روشنائی سے ڈیزائن بنایا گیا ہے چسپاں کردیا جائے پھر ایک کاغذ لیجیے، یہ کاغذ پتلا ہونا چاہیے اسے آپ تھوک یا لیس دار مائع سے گیلا کرلیں اور اتنا انتظار کیجیے کہ یہ جذب ہوکر قدرخشک ہو جائے۔ڈیزائن پر دباؤ ڈالیے یہ ڈیزائن کچھ بھی ہوسکتا ہے جو آپ جلد پر بنانا چاہتے ہیں۔ دباؤ اپنے انگوٹھے سے دیجے۔ پھر روشنائی یا پنسل سے اس ڈیزائن کی بیرونی لکیروں کو واضح کیجیے اور پھر سریش لگے چمڑے پر اس کا تاثر ابھار لیجیے۔السفیانی بڑی تفصیل سے اس طریقہ کار پر روشنی ڈالتا ہے۔

اسلامی فن تجلید میں نقش ونگار اور آرائش وزیبائش کے لیے متنوع قسم کے اوزار استعمال ہوتے رہے ہیں۔عرب ماہرین تجلید عموماً پیمانے اور پرکار کے استعمال سے ڈیزائن کرتے اور بعد ازاں اسے مطلوبہ ڈیزائن اور آرائشی انداز دینے کے لیے طلا کاری، زردوزی یا برش سے رنگوں کو ابھار دیتے۔عرب فنکار یہ کام آگ کے استعمال کے بغیر کرتے تھے چنانچہ وہ قدرے نم آلود اور تر چمڑا استعمال کرتے۔لیکن اوزاروں کو گرم کر کے نالی دار بنالیا جاتا اور اس کے سوکھنے سے قبل ہی اس میں بھرائی کر لی جاتی۔ پرکار اور پیمانے کا استعمال زیادہ تر خاکہ بندی کے کام آتا جبکہ ڈیزائن کے بنانے میں بہت سے آلات اور اوزار استعمال کیے جاتے۔

اس بات پر اکثر یورپی مستشرقین متفق ہیں کہ جلد کے ساتھ بنی (Flap) کا اضافہ مسلمان جلدسازوں کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ جو نہ صرف کتاب کے حسن میں اضافے کا سبب بنا بلکہ کتاب کی حفاظت اور اوراق کو بکھرنے سے روکنے کا ایک شاندار ذریعہ بھی ہے، اس بات کوئی مغربی محققین نے تسلیم کیا ہے، کہ جلدسازی میں آرائشی طریقہ کار کے ساتھ بنی سازی کا طریقہ کار بھی مغرب نے اسلامی فن تجلید سے مستعار لیا ہے، یہ بنی عموماً جلد کی چوڑائی کے ایک دہائی کے برابر ہوتی ہے۔

یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ اسلامی جلدوں پر عموماً بکریوں کی کھال استعمال کی جاتی تھی کیوں کہ موسم کے اعتبار سے یہ جانور تقریباً پورے عالم اسلام میں آسانی سے دستیاب تھا، دوسرا جانور بھیڑ ہے جس کی کھال عالم اسلام میں آسانی سے دستیاب ہو جاتی تھیں۔اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ یہ حلال جانور ہیں اور پورے عالم اسلام میں نہ صرف اسے سال بھر کھایا جاتا ہے جس سے کھالیں حاصل ہوتی ہیں جبکہ سال میں ایک قربانی کے موقع پر بیک وقت بڑی تعداد میں کھالیں دستیاب ہو جاتی تھیں۔ یہاں یہ امر دلچسپی سے خالی نہیں کہ جہاں چمڑے کو مختلف رنگوں میں رنگنے کے لیے مسلمانوں نے اس دور میں شاندار قسم کے دباغت خانے قائم کر رکھے تھے، وہیں

چمڑے کو سفید رنگ میں بدلنے کے لیے پھٹکڑی کا استعمال ہوتا تھا۔

یہ کارنامہ بھی مسلمانوں نے ہی سرانجام دیا کہ پھٹکڑی جو پہلی معدنی دولت تھی، جس سے چمڑا رنگنے کا سب سے پہلے کام لیا جبکہ بابلی تہذیب میں بھی پھٹکڑی دریافت تھی، پھٹکڑی سے جلدوں کو سفید کرنے کا بڑا آسان طریقہ تھا پھٹکڑی اور پوٹاس کے محلول میں بال سمیت کھال کو ڈال کر ۱۰ سے ۲۰ سینٹی گریڈ تک گرم کرنے سے کھال سفید ہو جاتی ہے۔ یہ کھال نہایت نرم اور ملائم ہو جاتی۔

اسلامی فن تجلید فن کتاب سازی میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ کتاب انسان کی دوست اور روح کی آسودگی کی غذا ہے۔ انسان نے ہمیشہ خوبصورتی کو پسند کیا۔ چنانچہ کتاب کی آرائش کا فن انسانی فطرت اور مسلمانوں کے ذوق جمال کی دلیل ہے جس کے لیے مسلمان جلد سازوں نے نئی نئی راہیں نکالیں اور آج دنیا کے بے شمار کتب خانوں میں پڑی ہزاروں کتابیں معلوم اور نامعلوم فنکاروں کی مہارت، ہنرکاری اور جمالیاتی ذوق کے لیے تحسین طلب کر رہی ہیں۔

مغلوں سے دور جدید تک

مغلوں نے کتاب دوستی اور علم پروری اپنے آباء سے ورثے میں پائی تھی۔ اس خاندان کے بادشاہ، ملکائیں، شہزادے اور شہزادیاں اپنے ہاتھ سے لکھنا باعث توقیر جانتے تھے۔ ہمایوں سے لے کر عالمگیر اورنگ زیب تک شاید ہی کوئی مغل سربراہ یا شہزادہ ایسا ہو جسے لکھنے سے شغف نہ ہو، شہزادہ داراشکوہ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی وصلیاں خط نستعلیق کے شاہکار کے طور پر آج بھی قدر و منزلت کی حامل ہیں۔

مغلوں کے ابتدائی ادوار ہی میں فن پروری نظر آتی ہے۔ ہمایوں اپنے ساتھ جن صاحب ورک لوگوں کو لایا، خطاطی کے حوالے سے ان کا ذکر ہو چکا ہے۔ اکبر کے دور میں وسیع پیمانے پر عربی اور ہندی سے فارسی میں کتب تراجم ہوئیں اور انھیں مصور کرنے کا اوّلین مربوط کام بھی دور اکبری میں ہی نظر آتا ہے۔ اس کی بہترین مثال عربی اور ہندی کی وہ مشہور کتب تھیں، جنھیں نہ صرف اسی دور میں ترجمہ کیا گیا بلکہ فارسی میں لکھتے ہوئے مصور بھی کیا گیا۔ داستان امیر حمزہ ان کتب میں بے نظیر ہے جو مصور کی گئیں۔ اکبر نے کتاب کی جمع آوری کے دو کتب خانے قائم کیے۔ ایک دیوان کے اندر اور ایک دیوان کے باہر۔ ان کتب خانوں کے مہتمم عہد ہمایوں کے وہ نابغہ روزگار خطاط، عبدالصمد شریں قلم اور میر سید علی تبریزی تھے۔ جنھیں ہمایوں ایران سے اپنے ساتھ لایا تھا۔

ان کتب کی تیاری کا آخری مرحلہ جلد سازی تھا۔ اندرونی صفحات کو مصور کرنے کے

ساتھ ساتھ دوست داران فن سرورق کو بھی مصور کرنے میں کمال فن کا مظاہرہ کرتے تھے۔ مغلوں کے ہاں اپنے آباء کی روایت کے برعکس انسانی اشکال سے سرورق مزین کرنے کی روایت نے جنم لیا۔ اندرونی مصوری کے علاوہ بعض سرورق ایسے بھی ہیں جن میں شہنشاہ کے دربار، شکار کے مناظر اور مناظرے کی تصاویر دکھائی دیتی ہیں۔ لندن کے البرٹ وکٹوریہ میوزیم میں بعض جلدیں موجود ہیں۔ جن میں گہرے اور شوخ رنگوں میں جلدوں کو سنوارا گیا ہے۔

شاہجہان کے دور میں نادر و نایاب ۲۴ ہزار سے زائد جلد والی کتابیں جمع کی گئیں اور ان میں سے بعض جلدیں ایسی تھیں۔ جن کا شمار عالم اسلام کے بلند پایہ فن تجلید میں ہوتا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق ان جلدوں پر اس وقت کے مطابق ۶۵ لاکھ روپے خرچ تے تھے۔ اور کئی جلدیں ۲،۲ سالوں میں تیار کی گئیں تھیں۔

عبدالرحیم خانخانی کا نام مغل تاریخ میں بڑا اہم ہے۔ انھیں دوسرے اہم کاموں کے علاوہ کتاب دوستی کے حوالے سے بھی جانا جاتا ہے۔ ان کے ذاتی کتب خانے میں ہزاروں کتابیں تھیں۔ انھیں خوبصورت کتابیں جمع کرنے کا شوق تھا، جس کے سبب ان کے کتب خانے میں اپنے عصر کے بہترین فنکاروں کی تیار جلدوں والی کتابوں سے خان خانی کے فن تجلید سے لگاؤ اور وابستگی کا پتہ چلتا ہے۔ ان کے کتب خانے میں ہندوستان میں تیار بعض ایسی جلدوں کا بھی پتہ چلتا ہے جو عربی اور ایرانی جلدوں کے اثرات کے تحت مدالی اور گل کاری سے آراستہ ہیں۔ اس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ مغل آرٹ کے ساتھ ساتھ عربی اور فارسی اسالیب بھی رائج تھے۔

اسی دور میں بعض جلدوں پر خالص ہندوستانی تہذیبی غلبے کا اندازہ بھی ہوتا ہے اور کہیں کہیں لوک رس کی آمیزش سے ہندی ایرانی فن نئے انداز سے ظاہر ہوتا دکھائی دیتا ہے۔

اورنگ زیب عالمگیر کے دور میں قرآن کے حوالے سے ایک بار پھر فنکاروں اور مجلدوں کا ایک ایسا دور نظر آتا ہے، جس کی مثال ابتدائی عباسی عہد میں دکھائی دیتی ہے چونکہ اورنگ زیب بھی قرآنی خطاطی کرتا اور اس کے شہزادے شہزادیاں بھی فن خطاطی کی ماہر تھیں چنانچہ فن خطاطی کے ساتھ ساتھ فن تجلید کو بھی نشاۃ ثانیہ نصیب ہوئی۔ اس دور میں بعض نہایت اعلیٰ پیمانے کی جلد سازی دکھائی دیتی ہے ایک روایت کے مطابق ایران کے شاہی کتب خانے میں اورنگ زیب کے ہاتھ کے لکھے ہوئے ایک قرآن کی جلد پر پانچ لاکھ روپے خرچ آتے تھے یہ قرآن شاہ ایران کو افغانستان کے حکمران نے پیش کیا تھا، اس جلد پر اسلامی طرز کے معروف انداز کو اپنایا گیا اور دور عباسی کے عروج اور ایرانی فن تجلید کے معروف اسلوب کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں۔ اس کی جلد باریک چرم کی تہیں جوڑ کر بنائی گئی۔ جس پر سونے سے منبت کاری اور علاقی ٹھپہ کاری کا کام نمایاں

ہے اورنگ زیب عالمگیر کے بعد اس فن کی سر پرستی تو ہوئی مگر مغلوں کے زوال کا آغاز بھی یہیں سے شروع ہو گیا چنانچہ جو شخص مغلوں کے بعد کتاب دوستی کے حوالے سے سامنے آتا ہے، وہ سلطان ٹیپو ہے۔ اسے خوبصورت کتابوں کا جنون تھا۔ اس کے کتب خانے میں لاکھوں کتابیں تھیں۔ اس نے فن خطاطی اور فن تجلید کے شعبے قائم کیے تھے چنانچہ جلد سازی کے بعد نادر نمونے اب بھی ان کی کتاب دوستی کا ثبوت مہیا کرتے ہیں۔ ان کے پاس اورنگ زیب کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک قرآن حکیم تھا جس پر ایک شاندار جلد بندی بھی ہوئی تھیں مگر سلطان کو یہ پسند نہ آئی اور اس نے اپنے عصر کے بہترین جلد سازوں سے اسے دوبارہ جلد کرایا، جس پر اس وقت کے حساب سے ۹۰ ہزار روپے خرچ آئے۔ انگریزوں کے اقتدار پر آنے کے بعد مسلمانوں کا یہ فن گمنامی میں جا پڑا اور تجارتی انداز فکر فن تجلید پر حاوی ہو گیا صرف ایک دور آغاز میں دکھائی دیتا ہے وہ رامپور میں نواب آصف الدولہ کے کتب خانے کا ہے جہاں ۳ لاکھ سے زائد کتب جمع تھیں اور جن میں ایک شعبہ صرف بہترین جلدوں کے لیے قائم تھا۔

۱۹ ویں صدی کے اواخر میں پانچویں نظام پر عثمان علی کے دور میں کتاب سازی کی صنعت کو ایک بار پھر فروغ ہوا۔ انھوں نے جدید علوم کو اردو میں منتقل کرنے کے ساتھ ساتھ قدیم فنون کی سر پرستی بھی کی، ان ہی میں فن تجلید بھی شامل تھا۔ ۲۰ ویں صدی کے شہرہ آفاق جلد ساز محبوب قریشی نے ان ہی کی زیر کفالت اسلامی فن تجلید کے احیا کی کوششیں شروع کیں، جہاں انھوں نے جدید طرز تجلید کو اپنایا، وہیں قدیم فن تجلید کے حسن کمال میں یکتا تھے۔

محبوب قریشی کی ولادت ۱۹ ویں صدی کے آٹھویں عشرے میں نظام کے کبوتر خانے کے خاندانی کبوتر بازوں کے ہاں ہوئی لیکن ان کا طبعی میلان مذہب کی طرف آمادہ تھا، انھوں نے اپنا آبائی پیشہ ترک کر دیا اور اوّلین طور پر وہ ایک مسجد میں امام ہوئے پر جلد سازی کی طرف ایسے راغب ہوئے کہ اسلامی فن کی یادیں تازہ کر دیں۔

پہلے پہل محبوب قریشی نے اسلام کے اولین دور کے انداز تجلید کو اپنایا لیکن ان کی طبیعت کی جولانی اور جدت طبع نے انھیں نئے نئے جزیرے آباد کرنے پر آمادہ کیا۔ انھوں نے کراچی میں سو سال سے زائد عمر میں وفات پائی، جہاں انھوں نے محبوبیہ فن تجلید کے نام سے ایک جدید کارخانہ بھی قائم کیا۔ جہاں اب محبوب قریشی کے صاحب زادے اس فن کو زندہ رکھنے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔

محبوب قریشی نے مشرق و مغرب پر دو طرزوں سے اکتساب کیا اور ۱۸ قسم کی جلدوں کے بانی کے طور پر ان کا نام تاریخ کا حصہ بن گیا ہے۔ ان کی جلد سازی پر ایک نظر ڈالنے سے قبل

ان کی جلدوں کا ایک اجمالی جائزہ لیا جائے تا کہ ان کے فن کو سمجھنے میں آسانی ہو۔

۱۔ **قرآنی معطر جلد**

محبوب قریشی کے مطابق انھوں نے ہاتھی دانت لکڑی وار سیپیوں سے بھی جلدیں بنائیں، مگر اب ہارڈ بورڈ اور گتے سے قرآنی جلدوں پر انھوں نے جو انداز پیش کیے۔ اس کی مثال کم کو ملتی ہے۔ قرآنی معطر جلد میں ایسی خوشبویات شامل کی جاتی تھیں جو جلد کا حصہ بن جاتی تھیں اور جب تک جلد باقی رہے گی قرآن کھولتے ہی ایک خوشبو پڑھنے والے کو معطر رکھتی رہے گی۔ ان قرآنی جلدوں پر ٹھپہ کاری، داغ کاری، زردوزی اور منبت کاری کے بہترین نمونے بھی نظر آتے ہیں۔

۲۔ **عالمگیری جلد**

یہ جلد چرمی مطلّا ہوتی تھیں، جن پر جلد ساز کو بڑی محنت کرنی پڑتی تھی، چرم کے باریک ریشوں کو چرمی سریش سے چسپاں کر کے بنائی جاتیں اور پھر ان پر طلا کاری ہوتی، جس کے لیے قدیم طرز کے ٹھپہ اور جدید طریقہ کار دونوں استعمال ہوئے۔

۳۔ **سلطانی جلد**

یہ جلدیں فارمیکا سے تیار کی جاتیں، ان پر جدید ٹیکنالوجی کا اطلاق کیا جا سکتا ہے فارمیکا پر نقوش قلمی ہوتے تھے۔

۴۔ **نظامی جلد**

یہ جلدیں اسفنج سے تیار کی جاتیں اور ان پر قلمی نقوش کے علاوہ اس کا مواد زیادہ تر نرم چرم یا گتے پر مشتمل ہوتا۔

۵۔ **بہادر خانی جلد**

یہ جلد مصور ہوتی تھیں اس میں گتا، چرم، مقوہ بھی استعمال کیا جاتا۔

۶۔ **شاہجہانی جلد**

یہ جلدیں جواہرات سے مزین کی جاتیں، گو اب وہ دور تو باقی نہیں رہ گیا تھا جب اصل زر و جواہرات استعمال ہوتے تھے مگر محبوب قریشی نے حتی المقدور اس فن کو زندہ رکھنے کی کوشش کی اور جلدوں کو جدید و قدیم طریقہ کار کے ساتھ ٹانکنے اور جڑنے کے کام کو زندہ کیا۔

۷۔ **حیدر آبادی جلد**

یہ جلد اپنی نوعیت کے اعتبار سے خوب تھی اس کو ٹکڑوں میں تیار کیا جاتا جس کے سبب کتاب کو دوہرا کر کے بھی پڑھا جا سکتا تھا اور کتنی ہی اونچائی سے کیوں نہ گرائی جائے اس کی جلد کو

کوئی گزند نہیں پہنچتا۔

۸۔ عثمانی جلد

یہ جلد بغیر مقوے کی تیار کی جاتی مگر پائیداری اور حسن میں اس کا یہ عالم تھا کہ کتاب ختم ہو جاتی مگر جلد یونہی تازہ رہتی تھی۔

۹۔ رامپوری جلد

ہندوستان میں محبوب قریشی نے پہلی بار جلد کو مخمل سے آراستہ کرنے کا فن ایجاد کیا۔ یہ مخمل ایک خاص قسم کی سریش سے جو انھوں نے خود ایجاد کی تھی، جوڑی جاتی اور اس طرح پیوست ہو جاتی کہ اسے مقوے سے الگ نہیں کیا جا سکتا تھا۔

۱۰۔ مصری جلد

محبوب قریشی نے مصری جلد کی یاد تازہ کرنے کے لیے ہارڈ بورڈ سے جلدوں کی ایک ایسی قسم بھی ایجاد کی جن پر قدیم انداز کی پھلکاری اور نقش نگاری ہوتی۔

اس کے علاوہ ۸ دوسری جلدیں بھی محبوب قریشی نے ایجاد کیں۔ جن میں حکمتی جلدیں بھی شامل ہیں، جو مختلف ادویہ کی آمیزش سے تیار کی جاتیں اور یہ ہمیشہ کیڑوں سے پاک رہتیں۔

محبوب قریشی کے فن کی داد جہاں میر عثمان نظار حیدر آباد نے دی۔ وہیں شبیر احمد عثمانی، مولانا سلمان ندوی، جمال میاں فرنگی محل، عبدالرحمٰن چغتائی، نیاز فتح پوری، مہاراجہ سرکش پرشاد، مولانا مودودی اور ۱۰۰ کے قریب دوسری نہایت مشہور شخصیات شامل ہیں۔ محبوب قریشی کو اس فن پر ۴۰ سے زائد اور دوسرے تمغے ملے اور ۱۰۰ سے زائد سرٹیفکیٹ امتیازی عطا ہوئے۔ جبکہ ان کے فن کو سراہنے والوں کی تعداد ہزاروں میں ہے۔

محبوب قریشی نے کتاب سازی میں جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے جدید طرز تجلید کو اپنایا، وہیں قدیم اسلامی فن تجلید سے بھی کماحقہٗ استفادہ کیا۔ انھوں نے اپنے آغاز میں جلد سازی کا سارا کام اپنے ہاتھوں سے کیا۔ جلد کی تیاری کے بعد انھیں نقشی اور آرائشی بنانے کے لیے لکڑی کے پھٹوں سے لے کر پیتل کی ڈائیوں تک کو استعمال کیا۔ محبوب قریشی کے عجائب خانے میں ایسے ہزاروں ٹھپے ڈائیاں اور نقشی اوزار موجود ہیں جو اسلام کے اوّلین دور تجلید کو یاد دلاتے ہیں۔

محبوب قریشی نے جلد کو محفوظ کرنے کے لیے بیسیوں ایسی ادویات تیار کیں، جو جلد سازی کے دوران استعمال کر کے نہ صرف جلد کو کیڑا، پھپھوندی اور نمی لگنے سے محفوظ کر لیتی ہے بلکہ اگر بعد میں استعمال میں لائی جائیں تو کتابوں کو تحفظ مل جاتا ہے۔

محبوب قریشی نے ۸۲ء میں وفات پائی اور اب ان کے نوادرات اور فن کو ان کا ایک بیٹا

عبدالغفور قریشی کراچی میں زندہ رکھنے کی کوشش میں مصروف ہے۔فن تجلید جس نے مصحف کے مقدس کام سے آغاز پایا، عباسیوں ایرانیوں، ممالیک، عثمانیوں، تاتاریوں، مغلوں کے عہد میں اوج ثریا پایا، آج جدید ٹیکنالوجی کے دور میں داخل ہوگیا ہے۔لیکن آج بھی عظمت گم گشتہ کے یہ اوراق مسلمانوں کی رفعت و اعجاز کے گواہ بنے، دنیا کے کتب خانوں اور عجائب گھروں میں محفوظ پڑے، مسلمانوں کے فن کی داد طلب کررہے ہیں۔

جدید فن تجلید، طریق کار اور مواد

آج جدید جلد سازی میں بہت سا کام ٹیکنالوجی نے سنبھال لیا ہے۔کاغذ کی ترشائی سے لے کر جلد باندھنے، سینے اور تدثیری (Finishing) تک کے تمام مرحلے اب مشین طے کر لیتی ہے۔مگر آج بھی ترقی یافتہ ممالک سے لے کر غریب اور غیر ترقی یافتہ ممالک تک تیار ہونے والی کتب کی جلدوں میں ہنرکاری کی مہارت اور دستکاری کارفرما نظر آتی ہے۔ پاکستان ان ممالک میں سے ایک ہے جہاں جدید ٹیکنالوجی اب آنکھ کھول رہی ہے اور فن تجلید دستی ہنرکاری بدستور مرہون منت ہے۔ چند اداروں میں جلد بندی کے لیے جدید مشینوں کی آمد کے باوجود ۹۸ فی صد کتاب سازی دستی ہنرکاری میں ہورہی ہے۔

یہ کتاب جسے ہم خوبصورت جلد یا پیپر بیک میں دیکھتے ہیں، کن مرحلوں سے گزر کر ہم تک پہنچتی ہے، یہ ایک لمبی کہانی ہے۔آج ہم پیپر بیک (غیر مجلد) کتابیں بھی بڑے پیمانے پر دیکھ رہے ہیں۔مگر ایک دور تھا، جب جلد کے بغیر اس کا تصور نہیں تھا، غیر مجلد کتاب کا دور انیسویں صدی میں آغاز پایا گیا تھا۔مگر بقول منڈیل:

> ''دوسری جنگ عظیم کے بعد کتاب کی دنیا میں دو انقلاب رونما ہوئے (جن میں سے ایک) پیپر بیک کتابوں کی اشاعت کا تھا.................گو یہ رجحان نیا نہ تھا مگر وسیع پیمانے پر اشاعت اور تقسیم ایک انقلاب تھا۔''
>
> (منڈیل ای ایچ، ''ارل سٹینلے گارڈنز اے چیک لسٹ''، کنٹ اسٹیٹ ایجنسی یونیورسٹی پریس، امریکہ، ۱۹۶۸، ص ۱)

پیپر بیک پر کتابوں کی اشاعت کے باوجود جلد کی ضرورت اور اہمیت کم نہیں ہوئی بلکہ تحقیق، ادب، سائنس، میڈیکل، ٹیکنالوجی اور دوسرے جدید و قدیم فنون میں اب تک پیپر بیک داخل ہی نہیں ہوسکی اور جہاں آئی وہاں اس کا وجود قابل ذکر نہیں۔

میں ابھی کہہ چکا ہوں کہ پاکستان سمیت دنیا کے بیشتر ممالک میں فن تجلید اب تک ہنرکاروں کی دستکاری سے پروان چڑھ رہا ہے۔آیئے کتاب سازی پر ایک نظر ڈالتے ہی، مگر بات

کا آغاز ان اوزاروں سے کرتے ہیں، جو اس فن میں استعمال ہو رہے ہیں۔ اس کا یہ فائدہ بھی ہوگا کہ اسلامی فن تجلید میں استعمال ہونے والے اوزاروں سے آج کے اوزار و آلات کے تقابلی جائزے میں آسانی پیدا ہو سکے گی۔

سامان تجلید

(الف) اوزار

۱۔ تہہ دار۔ فولڈر

ہڈی کا بنا ہوا تقریباً چھ انچ لمبا تہہ دار جو کاغذ کو تہہ کرتے ہوئے اس کی کریز بٹھاتا ہے۔ تہہ دار پلاسٹک کا بھی استعمال ہو سکتا ہے۔ مگر کچھ دیر استعمال کے بعد ہی وہ سیاہ نشان چھوڑنا شروع کر دیتا ہے۔ اس لیے ہڈی کا بنا ہوا تہہ دار استعمال کیا جاتا ہے۔

۲۔ چاقو

عام استعمال میں آنے والا تیز دھار چاقو، جو گتے کو بھی آسانی کے ساتھ کاٹ سکتا ہے۔

۳۔ برش

ہمارے ہاں عام طور پر لکڑی کے ساتھ کپڑا باندھ کر سریش لگائی جاتی ہے۔ یہ بات تجربے میں آتی ہے کہ اس سے سریش یکساطور نہیں لگ پاتی۔ چنانچہ سریش لگانے کے لیے کم از کم دو برش ایک سوا انچ اور ایک پونے انچ کے برش استعمال کیے جاتے ہیں۔ اس سے کام کی رفتار تیز اور سریش یکساں چسپاں ہوتی ہے۔

۴۔ قینچی

کم از کم ۳ قینچیاں ہوتی ہیں۔ ایک گتے کی کٹائی اور دوسری موٹے یا زیادہ کاغذوں کے لیے، اور تیسری نرم اور نفیس کام کے لیے۔

۵۔ آری

آریاں دو قسم کی ہونی چاہیے، ایک بڑی آری جس سے بڑھئی کام کرتا ہے دوسری بلیڈ آری تاکہ گتے کی گولائی میں کاٹنے کے لیے بلیڈ آری کام دے اور سخت کام کے لیے بڑی۔

۶۔ ہتھوڑی

گول منہ والی چھوٹی ہتھوڑی اس کام کے لیے بہت بہتر ہوتی ہے۔

۷۔ گنیا

۹ انچ والا گنیا (جسے عام زبان میں گنڑ یاں کہا جاتا ہے اور جسے عام طور پر بڑھئی کونے

سیدھے کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں) گتے کو چاروں طرف سے سیدھا کاٹنے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔

۸۔ قاسم (ڈیوائڈر)

جیومیٹری میں استعمال ہونے والا قاسم (ڈیوائڈر) مفید کام دے سکتا ہے۔

۹۔ سوئیاں

دو تین سائز کی ایسی سوئیاں جس میں سینے کے لیے موٹا دھاگہ آسانی سے ڈالا جا سکے۔

۱۰۔ سوا

نفیس قسم کا سوا جس سے دھاگہ گزارنے کے لیے سوراخ کیا جاتا ہے۔

۱۱۔ چھیلائی چھری

کاغذ تراشنے کے لیے کئی قسم کے تراش استعمال ہوتے ہیں لیکن زیادہ بہتر گول منہ والا تیز دھار کاغذ تراش مفید رہتا ہے۔

۱۲۔ مغزی تراش

کاغذ کو کاٹنے کے لیے نوک دار چھری ہی استعمال ہوتی ہے، جو نازک کام کی کٹائی اور کٹائی کے وقت کٹتے ہوئے کاغذ کو بریدہ ہونے سے بچاتا ہے۔

۱۳۔ رمبی

یہ عام قسم کا ایک چھ سات انچ لمبا تراش اوزار ہی ہوتا ہے۔ مگر اس کا پھل اطراف کی بجائے نیچے قدرے خمیدہ گول ہوتا ہے۔ جو دستی کے دباؤ سے کاغذ یا گتا کاٹنے کے کام آتا ہے۔

۱۴۔ گتہ کٹر

تقریباً ۱۰ تا ۱۵ انچ لمبے بلیڈ (پھل) والا گتہ تراش بنا بنایا بازار سے مل جاتا ہے۔ پھل کے ساتھ دستی لگی ہوتی ہے۔ جسے لوہے یا لکڑی کے بنے ہوئے تختے کے ایک ضلعے کے کنارے پر جوڑا گیا ہوتا ہے اور اسکے ساتھ لوہے کے ایک پٹی لگی ہوتی ہے۔ حسب منشا الگ کیے جانے والے کاغذ کے حصے کو لوہے کی پٹی کے نیچے سے گزار کر باہر نکالا جاتا ہے اور دستی پر دباؤ ڈال کر فالتو گتہ قطع کر دیا جاتا ہے۔

۱۵۔ دستی یا برقی کٹنگ پریس

جلد کے بعد کتابوں میں یکساں تناسب کے لیے یہ نہایت ضروری عمل ہے۔ پہلے پہل دستی کٹنگ مشین استعمال ہوتی تھی، مگر اب بہت بڑی اور درمیانے سائز کی کٹنگ مشین دستیاب ہے۔

۱۶۔ **بڑی داب پریس**

کتابوں کو جلد کرنے کے بعد ان کو مضبوط بنانا اور سیدھا رکھنے کے کام آتی ہے اس میں بڑی تعداد میں کتابیں رکھی جاسکتی ہیں۔ اسے عام زبان میں داب پریس کہا جاتا ہے۔

۱۷۔ **کمانی دار داب پریس**

کتابوں کو جلد کرنے کے بعد داب دینے والی کمانی دار مشین عام استعمال میں آتی ہے۔ بڑی داب پریس کے مقابلے میں اس میں کم کتابیں آتی ہیں۔ اسے بھی عام طور پر داب پریس ہی کہا جاتا ہے۔

۱۸۔ **شکنجہ......پشتہ**

فن جلد سازی میں یہ بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ پہلے یہ لکڑی کا بنایا جاتا تھا، مگر اب لکڑی کے ساتھ لوہے کے شکنجے (جسے عام زبان میں داب پریس کہا جاتا ہے) بھی استعمال میں لائے جاتے ہیں۔ اس کے دو بنیادی کام ہیں۔

ایک............داب کے ذریعے جلد کا پشتہ تیار کرنا۔ اگر کتاب کے پشتے کو باہر کی طرف ابھارنا مقصود ہو، تو شکنجے میں باندھنے سے اس میں ابھار پیدا ہو جاتا ہے۔

دوسرا............اس میں کتاب کی تذ ئیر (Finishing) کے لیے بلیڈ نصب ہوتا ہے جو کتابوں کی یکساں کٹائی اور چھیلائی کا کام کرتا ہے۔

۱۹۔ **آہنی ضارب / آہنی ٹھوک**

پشتے کی تہہ بٹھانے کے لیے عموماً ۸×۱۴ انچ کے لوہے کا موصل استعمال ہوتا ہے۔

۲۰۔ **سلائی فریم / تانی سلائی**

سلائی فریم عام طور پر استعمال نہیں کیا جاتا اور کاریگر کتاب میں پکڑ کر ہی سلائی کرتے ہیں، مگر بعض بڑے پیمانے پر جلد سازی کرنے والوں کے ہاں سلائی جوکھٹا / سلائی فریم استعمال میں لایا جاتا ہے۔ جلد میں مناسب جگہوں پر سوراخ کرنے کے بعد کتاب کو سلائی فریم میں رکھنے کے بعد سلائی آسان ہو جاتی ہے۔

۲۱۔ **پتھری**

سامن پتھری فن جلد سازی کا ایک لازمی جز ہے۔

۲۲۔ **اڈا چھیلائی / رگڑائی**

پتھر کی سل

۲۳۔ **چولہا / سٹوو**

سریش پکانے اور دستی نقاشی کے ٹھپوں کو گرم کرنے کے لیے

۲۴۔ **سریش کی دیگچی**

سریش کے لیے دیگچی یا ایسا برتن جسے پانی میں لٹکایا جا سکے۔

۲۵۔ گو جلدوں پر نقش نگاری کا رواج کم تر رہ گیا ہے مگر اب بھی ہاتھ سے داغ کاری کا کام ہوتا ہے۔ جس کی جدید شکل جلدوں پر ناموں یا نشانوں کے لیے پٹھوں نے لے لی ہے۔ مختلف جلد ساز اپنے مخصوص نشانوں کے لیے داغ کار ٹھپے ہوتے ہیں۔ لیکن ان کے علاوہ درج ذیل داغ کار ٹھپے بھی استعمال میں آتے ہیں۔

الف) ہندسی

ب) لکیر دار

ج) جلد ساز کا نشانی ٹھپہ

د) بیلوں یا پنکھوں کے ٹھپے

ھ) دائرے، مستطیل اور مربع ٹھپے

و) کہکشائی ٹھپے

ز) نقطہ، اعرابی ٹھپے

ح) محرابی و مسجدی ٹھپے

ط) دیگر حسب خواہش بنائے جانے والے ٹھپے

(ب) کاغذ اور سائز

اوزاروں کی شناخت کے بعد اگلا مرحلہ جلدوں کی شناخت کا ہے۔ جلدوں کی مختلف اقسام ہیں لیکن جلدوں سے قبل کتاب کا سائز وار کاغذ کے استعمال کے بارے میں ایک سرسری جائزہ۔ اس وقت کتابیں عموماً درج ذیل کاغذوں پر تیار کی جاتی ہیں۔

آرٹ پیپر

نہایت قیمتی ہے اس پر عموماً اعلیٰ پائے کی کتابیں شائع ہوتی ہیں۔ جن میں فنون لطیفہ خاص ذکر رکھتا ہے۔

آفسٹ پیپر

اس میں عموماً دو اقسام آتی ہیں۔ یعنی ۸۲ گرام اور ۶۲ گرام، جنھیں عام زبان میں ۹۰ اور ۷۰ گرام کہا جاتا ہے۔[۱]

چارسدہ پیپر وائٹ پیپر اور دوسرے درآمدی کاغذ، کتابیں اور رسائل عموماً ان پر شائع

ہوتے ہیں۔

نیوز پرنٹ

یہ کاغذ اب صرف اخبار اور جرائد کے لیے مخصوص ہو گیا ہے۔ مگر دستیابی کی صورت میں سستی کتابیں اسی کاغذ پر شائع ہوتی ہیں۔

کتابی سائز

کاغذ کا عام سائز	نصف	چوتھائی	آٹھواں	سولھواں
۳۰×۳۰	۱۰×۳۰	۱۰×۱۵	۷_۱/۲×۱۰	۵×۷_۱/۲
۳۳×۳۶	۱۸×۲۳	۱۱_۱/۲×۱۸	۹×۱۱_۱/۲	۵_۳/۴×۹

پہلے کتابوں کا عام سائز ۱۶/۲۰×۳۰ اور ۴/۲۰×۳۰،
۱۶/۲۳×۳۶ اور ۴/۲۳×۳۶

پہلے کتابوں اور چھوٹی تقطیع کے دو سائز متحمل تھے۔ مگر اب کتابیں عموماً ۱۶/۲۳×۳۶ اور ۱۶/۲۰×۳۰ پر دوسری بڑی تقطیع کتابیں۔ آٹھویں حصے پر آتی ہیں۔

پاکستان کی تشکیل سے پہلے اور قدرے بعد تک ۲۳×۳۶ اور ۲۰×۳۰ کے سولہویں حصے پر زیادہ کتابیں شائع ہوتی تھیں۔ مگر اب زیادہ کتابیں (عمومی رجحان کے طور) ۲۳×۳۶ کے سولہویں پر شائع ہوتی ہین۔

(ج) گتہ یا دفتی

گتے کی کئی اقسام ہیں لیکن یہ عموماً ۲۳×۳۶ کے سائز میں آتا ہے اور اس کا وزن درج ذیل ہوتا ہے۔

الف) ۱۶اونس

ب) ۱پاؤنڈ

ج) ۲پاؤنڈ

د) ۲_۱/۲پاؤنڈ

☆ ۱۶اونس کا گتہ عموماً کم ضخامت اور نرم جلدوں میں استعمال ہوتا ہے۔

☆ ایک پاؤنڈ کا گتہ سو صفحات تک کی کتاب کے لیے بہتر ہوتا ہے کیوں کہ زیادہ دبیز نہ ہونے کے سبب زیادہ بوجھ نہیں سہار سکتا۔ کاغذ بائنڈنگ اس لیے بہتر ہوئی ہے۔

☆ دو پاؤنڈ کا گتہ ۳۰۰ صفحات تک کی کتاب کے لیے مناسب ہوتا ہے اور کلاتھ بائنڈنگ

کا بوجھ برداشت کرسکتا ہے۔

☆ اڑھائی پاؤنڈ کا گتہ ۳۰۰ صفحات سے زائد کے لیے آئیڈیل ہے۔ اس پر چرمی، ریگزینی اور کلاتھ پر ہر قسم کی فل یا دولخت بائینڈنگ کی جاسکتی ہے۔
سائنسی، میڈیکل، فنون لطیفہ کی ضخیم اور بڑی تقطیع کی کتابوں کے لیے یہ نہایت مناسب رہتا ہے۔

☆ ہارڈ بورڈ بائینڈنگ نہایت مضبوط اور طاقتور ہوتی ہے اسے ہر قسم کی وزنی کتب کی جلدوں کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے۔

☆ ہارڈ بورڈ کی کم پھلائی کی پلیٹ پر چڑھاؤ، نسبت اور داغ کاری کا کام زیادہ بتر ہوسکتا ہے۔

جلدوں کی اقسام

۱۔ مکمل چرمی

اس جلد کو عام طور پر مکمل لیدر بائینڈنگ بھی کہا جاتا ہے پہلے ادوار میں اس میں کئی قسم کے چرم استعمال ہوتے تھے نرم و ملائم، قدر سخت اور زیادہ سخت۔ یہ کتاب کی ضخامت اور کاغذ کے مطابق استعمال ہوتا ہے۔ ان میں بکری بچھڑے، گائے، اونٹ اور دوسرے جانداروں کی کھالوں سے تیار ہونے والا لیدر بائینڈ شامل تھا۔ یورپ میں آج بھی مراکشی، نائجیرین، الجزائری، مصری لیدر بائنڈ مشہور ہیں جبکہ ہمارے ہاں صرف مراکشی لیدر کا نام معروف ہے۔ نرم و لطیف جلدوں کے لیے بچھڑے کی کھال کو نم دے کر استعمال کیا جاتا تھا۔ یہ جلد مکمل طور پر لیدر بائنڈ ہوتی ہے۔

۲۔ مکمل ریگزین

ریگزین بائنڈنگ میں اعلیٰ اور ادنیٰ کئی اقسام شامل ہیں اور کئی اقسام کی ریگزین مختلف اور متنوع رنگوں میں استعمال ہوئے ہیں۔ یہ جلدیں مکمل ریگزین کی ہوتی ہیں۔

۳۔ مکمل

اسے عام طور پر کپڑا جلد یا کلاتھ بائنڈنگ کہا جاتا ہے اس میں بھی کئی اقسام آتی ہیں اعلیٰ کلاتھ بائنڈ، درمیانہ کلاتھ بائنڈ اور ادنیٰ کلاتھ بائنڈ۔ یہ جلدیں مکمل طور پر کپڑے سے تیار ہوتی ہیں۔

۴۔ مکمل کاغذی

جلد کی چوتھی قسم مکمل کاغذی پیپر بائنڈنگ ہے۔ مختلف رنگوں اور معیاروں میں یہ کاغذ

مکمل جلد کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

۵۔ دولخت (الف)

جلد کی پانچویں قسم دولخت یا دوطرزی ہے۔اس میں جلد کے کونوں وار پشتے پر لیدر، کپڑا یا اعلیٰ کاغذ لگایا جاتا ہے اور درمیان میں ابری یا ریمی نیشن پیپر۔

عام طور پر یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ لائبریری کے لیے تیار کی جانے والی ضخامتی کتابوں کے پشتے اور کونے لیدر بائنڈ اور درمیان میں ریگزین یا بائنڈنگ پیپر لگا دیا جاتا ہے جبکہ ذرا ہلکی ضخامت کی کتابوں کی جلدوں کے کونے اور پشتے ریگزین اور درمیان میں ہلکا کپڑا یا کاغذ لگایا جاتا ہے جبکہ بعض کونے اور پشتے کپڑے سے تیار کیے جاتے ہیں اور درمیان میں ابری یا ریمی ٹیشن لگایا جاتا ہے۔

۶۔ دولخت (ب)

جلدوں کی چھٹی قسم ان جلدوں پر مشتمل ہے، جن کے پشتے چرمی، ریگزین یا کتانی ہوتے ہیں۔اور باقی سارے حصے پر دوسری قسم کا سامان تجلید استعمال ہوتا ہے، مثلاً پشتہ اگر چرمی ہے تو باقی جلد ریگزین یا بائنڈنگ کلاتھ کی ہوسکتی ہے۔اس طرح ریگزین یا کپڑے کے پشتے پر کاغذ (پیپر بائنڈنگ) کی جاسکتی ہے۔ان دونوں کتانی (پیپر کلاتھ) کے پشتے پر پیپر بائنڈنگ کا رواج عام ہوگیا ہے۔

۷۔ دولخت (ج)

ایسی کتابیں جو خاص مضامین سے تعلق رکھتی ہیں، انھیں بطور خاص چرمی پشتے اور باقی ریگزین یا بائنڈنگ کلاتھ سے تیار کیا جاتا ہے۔مکمل لیدر کے بعد یہ اعلیٰ جلدوں میں شمار ہوتی ہے۔

۸۔ گرد پوش

ان کتابوں میں جن پر گرد پوش لگایا جاتا ہے، ان میں بھی اوپر درج اقسام میں سے کوئی بھی جلد استعمال کی جاسکتی ہے۔مگر بعض جلدوں میں چرمی، کتانی یا ریگزین پشتے کی صورت میں گرد پوش کی تصویر کا چھاپ کا غذ بھی لگایا جاتا ہے۔یعنی جو ڈیزائن گرد پوش پر ہو، وہی ڈیزائن قدرے سستے کاغذ پر چھاپ کر مکمل یا پشتے کو چھوڑ کر کتاب کے پہلے حصے پر لگایا جاتا ہے۔گرد پوش کیلیے عموماً مرا کو آرٹ پیپر (دانے دار زمین)

آرٹ پیپر (عام ملائم) ابری، طبع شدہ اور آفسٹ پیپر بھی استعمال ہوتا ہے۔

۹۔ پیپر بیک

غیر مجلد طریقہ کار بھی پرانا نہیں۔ یہ انیسویں صدی کے اواخر میں متعارف ہوا اور

بیسویں صدی کی چوتھی دہائی کے بعد اسے غیر معمولی فروغ حاصل ہوا۔آج تمام ایسی کتابیں جو سستی شائع ہوتی ہیں۔ پیپر بیک کے ساتھ ہوتی ہیں۔اس کی سلائی کا طریقہ کار ضخامت کے مطابق اوپر درج طریقوں میں سے ہی کسی ایک کا انتخاب کیا جاتا ہے۔مگر عموماً سستی ہونے کے سبب ٹچ سلائی ٹیس سلائی کے ذریعے اس کی سلائی کی جاتی ہے اور اوپر سادہ یا مصور ایوری کارڈ جو مختلف قسموں میں دستیاب ہے، چھاپ کر لگادیا جاتا یہ۔

۱۰۔ کریز

پیپر بیک جلد چونکہ زیادہ دبیز نہیں ہوتی اور کھولنے سے پھٹنے یا اکھڑ جانے کا اندیشہ ہوتا ہے اس پر پشتے کے قریب چوتھائی انچ کے فاصلے پر اس کے داب پریس کے ذریعے کریز ڈال دی جاتی ہے۔جس سے کتاب کھولنے سے جلد پھٹنے یا اکھڑنے سے محفوظ ہوجاتی ہے۔

(ہ) سلائی کی اقسام

۱۔ ٹچ سلائی

دوقسم کی ہوتی ہے

ا۔ عام طور پر سوا مار سلائی کہلاتی ہے۔تمام اوراق کو یک جا کر کے تین چار سوراخ کرنے کے بعد دھاگے سے سی دیا جاتا ہے۔ یہ نہایت ناقص سلائی ہوتی ہے۔کہیں سے بھی دھاگے کے ٹوٹتے ہی تمام جلد کھل جاتی ہے۔

۲۔ باریک تار سے مشین کے ذریعے تمام اوراق کو سٹیپل کر دیا جاتا ہے۔ یہ سلائی عام دھاگے کی نسبت (یعنی اوپر درجہ کی نسبت) قدرے مضبوط ہوتی ہے مگر لوہے کے تار کے سبب اوراق بار بار کھلتے تو کاغذ پھٹنا شروع ہو جاتا ہے۔یا سٹیپل کی گئی پن کھل جاتی ہے اور اوراق کھل جاتے ہیں یہاں اس کا ذکر بھی ضروری ہے کہ ٹچ سلائی میں کتاب آسانی سے پوری نہیں کھلتی۔

۲۔ جزبند سلائی

سلائی میں طریقہ کار نہایت مضبوط سمجھا جاتا ہے۔اس میں ہر جز کی الگ الگ سلائی ہوتی ہے۔جس سائز کی کتاب ہوگی اس حساب سے جز تیار ہوتی ہے۔اگر کتاب سولہویں سائز پر ہے۔تو جز کے اوراق سولہ ہوں گے۔اگر سائز آٹھواں ہے تو جز آٹھ صفحات پر مشتمل ہوگی۔بعض پریس سولہویں سائز کو آٹھویں سائز کی پلیٹ پر چھاپتے ہیں۔ اس طرح سولہویں سائز یعنی ۱۶/۳۰×۲۰ یا ۱۶/۳۶×۲۳ سائز کی کتاب کی ایک جز بھی ۸ صفحات پر مشتمل ہوگی۔جز بندی میں کتاب پوری طرح کھل جاتی ہے مگر اس میں ایک نہایت باریکی بھی ہے وہ یہ کہ دھاگے کے انتخاب میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے کمزور دھاگے کے ٹوٹنے سے جز کھل جاتی ہے اور زیادہ سخت

دھاگے کے استعمال سے جز کے پشتے سے کاغذ پھٹنا شروع ہو جاتا ہے چنانچہ جز بند سلائی میں دھاگے کے استعمال میں نہایت احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔

۳۔ لپٹیا یا کھپائی سلائی

جس کتاب میں سلائی کی گنجائش نہ ہو ان میں کھپائی کی جاتی ہے اور اس طرح سلائی کی جاتی ہے کہ پشتے پر جال بن جاتا ہے۔ یہ سلائی مضبوط ہو سکتی ہے مگر جز بندی کی نسبت کمزور کہلاتی ہے۔

۴۔ مچھلی کانٹا

اصل میں سلائی کا یہ طریقہ بھی لپیٹا قسم کا ہے لیکن یہ پشتے پر جال بننے کی بجائے کم تر سلائی کے باعث کراس سلائی بن جاتی ہے۔ دائیں بائیں ٹانکے لگنے سے کراس بن جاتا ہے۔

۵۔ وائر سلائی

اس کا ذکر ٹچ سلائی میں آیا ہے یہ سٹیپل کی نسبت قدرے مختلف ہوتی ہے کہ اسے تار سے سیا جاتا ہے۔

۶۔ ٹیس سلائی

اس کا ذکر بھی اوپر آیا ہے اس میں واٹ کین سے سوراخ کر کے تمام اوراق میں سے یکساں دھاگہ گزار دیا جاتا ہے یہ زیادہ پائیدار سلائی نہیں ہوتی۔

(و) عملی جلد بندی

اوزاروں کی شناخت اور سامان تجلید کے انتخاب کے بعد عملی مرحلہ شروع ہوتا ہے۔ جلد بندی کے اس سارے عمل کو ہم اپنی سہولت کے لیے ۱۰ حصوں میں تقسیم کر لیتے ہیں اور ہر مرحلے پر مختصر نظر ڈالتے ہیں۔

۱۔ کاغذ کی تہہ کاری

جلد بندی کا پہلا مرحلہ کاغذ کی تہہ کاری (Folding) سے شروع ہوتا ہے۔ یہ تہہ کاری کتاب کے مطلوبہ سائز اور طباعت کے مطابق ہو گی۔ مثلاً کتاب کا سائز ۳۶×۲۳ کے سولہواں حصہ ۳۶/۱۶×۲۳ ہے۔ تو چھپائی ۳۶/۱۶×۲۳ کی تقطیع پر بھی ہو سکتی ہے اور اس کے نصف سائز ۲۳/۸×۱۸ پر بھی اگر چھپائی ۳۶/۱۶×۲۳ پر لوٹ پوٹ ص ا ہوتی ہے۔ تو سب سے پہلے اس شیٹ کو درمیان سے کاٹ کر دو حصوں جزوں میں کرنا ہو گا اس کے بعد طے شدہ ضابطے کے مطابق کاغذ کو تہہ (فولڈ) کر کے سل اٹھائی جاتی ہے۔

۲۔ سلائی

جلد بندی کے سلسلے کی دوسری کڑی سلائی ہوتی ہے یہ پہلے سے طے ہوتا ہے کہ سلائی کیسی ہوگی۔ اگر سادہ سلائی یعنی ٹیس، مچھلی کانٹا، لپیٹا یا ٹچ سلائی، تو جلد ساز واٹ کین سے سوراخ کر کے دھاگے سے سی دے گا۔ کتاب کی ضخامت اور جسامت کے مطابق جلد ساز طے کرتا ہے کہ اسے کتنے ٹانکوں کی روک سہار سکتی ہے۔ اگر جز بند سلائی مقصود ہو تو ۳ سے ۶ تک ٹانکے لگائے جاتے ہیں چنانچہ اس کے مطابق پشتے کو دبا دے کر ہموار کر لینے کے بعد آری سے تراش کر سوئی سے سی لیا جاتا ہے۔ سلائی کے لیے گزشتہ صفحات کے باب (ہ) میں دی گئی سلائی کے کسی بھی طریقے کو اختیار کیا جا سکتا ہے۔ اس سلسلہ میں کتاب میں ضخامت، اہمیت اور جلد کرنے والے کی مالی استعداد کو سامنے رکھنا ہوتا ہے۔

۳۔ استر پیوستگی

جلد سازی کے عمل میں کتاب کی سلائی کے بعد استر پیوستگی کا مرحلہ آتا ہے جلد ساز کتاب کے سائز کے مطابق کتاب کے دونوں طرف سفید، نقشی ابری یا کسی بھی کسی قسم کا کاغذ جوڑ دیتا ہے۔

۴۔ پشتہ روک پٹی

چوتھے مرحلے میں کتاب کے پشتے پر دو انچ کی ململ کے کپڑے کی روک لگائی جاتی ہے یہ روک بسا اوقات سلائی کے ساتھ بھی لگا دی جاتی ہے۔

۵۔ کٹائی

اب کتاب کا ایک حصہ مکمل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اس مرحلے پر کتاب کو طے شدہ سائز کے مطابق تیار کرنے کے لیے اس کی تین اطراف سے کٹائی ہوتی ہے۔ جلد ساز سب سے پہلے سامنے والے حصے کو کٹائی کر کے تمام کتانوں کو یکساں کر دیتا ہے اور اس کے بعد اوپر اور نیچے کی کٹائی کرتا ہے۔ اس طرح کتاب اب حتمی جلد بندی کی طرف بڑھتی ہے۔

۶۔ گتہ لگانا

کتاب کے سائز کے برابر مگر پشتے کی طرف سے ایک چوتھائی انچ یا قدرے زیادہ اوپر اٹھا کر گتے کو پشتہ روک پٹی کے ساتھ سریش سے پیوست کر دیتا ہے۔

۷۔ پشتہ اور کونے

گتے کو کتاب کے ساتھ چسپاں کرنے کے بعد اب پشتہ سازی کا مرحلہ آتا ہے۔ اگر کتاب کو دولخت جلد کرنی ہے۔ تو پشتہ چرمی، ریگزینی کتانی ہوگا اور کونے تیار کرنے ہیں تو کونوں پر بھی پشتے کا مواد سریش سے پیوست کر دیا جائے گا۔ اگر جلد مکمل چرمی ریگزینی، کتانی پیپر بائنڈ ہے تو

الگ سے لپیٹنے کی ضرورت نہیں رہتی۔

۸۔ چسپاندگی

پشتہ تیار ہونے کے بعد اب اگلا اور سب سے اہم مرحلہ جلد پر چرم ریگزینی، کپڑا یا کاغذ لگانے کا ہے، جیسا کہ اوپر کیا جا چکا ہے کہ اگر پشتہ اور کونے ایک رنگ میں ہیں تو درمیان کسی قسم کا مواد بھی لگایا جاسکتا ہے جلد ساز ظاہر جلد سے زائد ٹکڑا کاٹتا ہے اور اسے پشتے کے ساتھ ایک طرف جوڑ کر باقی تینوں اطراف سے اسے گتے کے اندر تک لے جا کر سریش سے جوڑ دیتا ہے۔ اگر جلد مکمل چرمی، ریگزینی، کتانی یا بائنڈنگ پیپر کی ہے تو اسے پوری طرح سریش سے گیلا کر کے جلد کے دونوں حصوں کے ساتھ پیوست کر کے گتہ کے اندرونی حصے تک لے جا کر اندر چسپاں کر دیا جاتا ہے۔ گتے کے اندر جانے والے بیرونی چرم یا ریگزین یا کتان تقریباً نصف انچ یا اس سے زائد ہوسکتا ہے۔

۹۔ استر پیوستگی

جلد جوڑنے کے بعد آخری مرحلہ اندر موجود استر گتے کو اندرونی حصے پر سریش سے جوڑ دیا جاتا ہے اور پھر اسے شکنجے (کمانی دار یا دوسرے داب پریس) میں رکھ کر اس پر اس طرح دباؤ ڈالا جاتا ہے کہ جلد پوری طرح جوڑ کر مضبوط ہو۔ اگر کتاب داب میں ہی سوکھے تو اس سے جلد کی پایہ داری اور مضبوطی اور مستحکم ہو جاتی ہے۔

۱۰۔ گرد پوش

اب جلد تیار ہو چکی ہے۔ اگر گرد پوش لگانا ہے تو گرد پوش کو جلد کے برابر کاٹ کر اور اندر کے حصے میں حسب ضرورت (دو سے تین انچ تک) بڑھا کر گرد پوش لگا دیا جاتا ہے۔

۱۱۔ ٹھپہ کاری

پہلے ادوار میں جلد تیار ہونے کے بعد گرم ٹھپوں سے نقش و نگار بنائے جاتے تھے آج کل جلدی مواد پیوست کرنے سے قبل بھی یہ کام ہوسکتا ہے مگر نفاست کے لیے جلد کی تیاری کے بعد گرم ٹھپوں سے مطلوبہ نقش و نگار یا تحریر ابھار کر اس میں حسب خواہش سنہرہ بھر دیا جاتا

(یہ آرٹیکل رفعت گل کی کتاب ''اسلامی فنِ تجلید: تاریخ، طریقہ کار، فرہنگ'' کے مختلف حصوں کو ملا کے پیش کیا گیا ہے۔ یہ کتاب اُردو میں اپنی نوعیت کی چند ایک کتابوں میں شمار کی جاتی ہے جو مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد سے ڈاکٹر جمیل جالبی کی سرپرستی میں مارچ ۱۹۸۹ میں شائع ہوئی تھی۔ ''ادارہ نقاط'')

میرا کتب خانہ

ڈاکٹر وزیر آغا

میرا کتب خانہ دراصل میری زندگی کی داستان ہے لیکن میں اسے اپنے احباب کی ایک محفل بھی کہہ دوں تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ محفل کا لفظ میں نے اس لیے استعمال کیا کہ پچھلے بیس پچیس برس میں جب کبھی کسی نئے مصنف کی کتاب میرے کتب خانے میں داخل ہوئی تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے دوستوں کی محفل میں ایک نئے دوست کا اضافہ ہوا اور یہ دوست بھی عجیب تھا۔ عام زندگی کے دوست تو جذبات کا ایک پٹارہ ہیں اور ان سے نباہ کرنا کانٹوں کی سیج پر قدم رکھنے کے مترادف ہے۔ ادھر آپ نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کوئی بات کہی، محض تفنن طبع کی خاطر کوئی جملہ اختراع کیا اور ادھر دوست کی خوبصورت پیشانی پر سلوٹیں نمودار ہوگئیں اور برسوں کی محنت سے تعمیر کیے گئے دوستی کے ایوان میں دراڑیں نمودار ہونے لگیں۔ میرے کتب خانے کا دوست جذبات کے اس جوار بھاٹا سے قطعاً محفوظ ہے۔ پھر وہ اپنے خاص موڈ کے رحم و کرم پر بھی تو نہیں۔ عام زندگی کے دوست صرف اس وقت آپ سے کھل کر باتیں کریں گے۔ جب ان کی ذات کی شخصی، قومی اور بین الاقوامی نوک پلک درست ہوگی۔ یعنی جب ان کا ہاضمہ ٹھیک، جیب پر اور موڈ درست ہوگا۔ لیکن میرے کتب خانے کا دوست ہر لحظہ مجھ سے باتیں کرنے بلکہ کھل کر باتیں کرنے پر مستعد نظر آتا ہے۔ اور یہ دوست بھی کس مرتبے، کس مقام کا مالک ہے، یکا یک کس لمحہ خود فراموش میں آپ کی نظریں دیوار کی طرف اٹھ جاتی ہین۔ اور وہاں شیکسپیئر، غالب، کالیداس، ہومر یا ڈانٹے کی نظروں سے دوچار ہوجاتی ہیں۔ آپ کا تجسس فریق ثانی کی نظروں میں ایک پر لطف سی مسکراہٹ پیدا کر دیتا ہے۔ آپ ذرا سا کسمسا کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ الماری میں سے اپنے دوست کو انگلی سے لگائے واپس کرسی پر آ بیٹھتے ہیں اور یکا یک بغیر کسی ہچکچاہٹ یا تکلف کے آپ کا یہ دوست آپ سے باتیں کرنے لگتا ہے۔ ان باتوں میں کوئی ڈھکا چھپا انداز اخفائے راز کی کوئی کوشش یا ریا کاری کا کوئی عمل موجود نہیں ہوتا۔ وہ ایک نہایت بیباک اور پر خلوص انسان ہے اور آپ سے بھی اسی بیباکی اور خلوص کا طالب ہے۔ وہ آپ کے سامنے آتے ہی پ کے ارشاد کی تعمیل میں ایک سلسلہ گفتگو شروع کر دیتا ہے اور یہ گفتگو بھی کیا ہے؟ انسانی فکر کا نچوڑ، انسانی

احساسات کی لطیف ترین اور ارفع ترین صورت! ایک ایسا قیمتی سرمایہ کہ اگر یہ ہم سے چھن جائے تو زندگی بے کار، بے معنی اور تہی دامن ہو کر رہ جائے لیکن لطف یہ ہے کہ آپ کا یہ عظیم دوست محض آپ کے موڈ کے تابع ہے۔ آپ اس سے باتیں کرنے کو کہیں تو وہ گھنٹوں بے تکان آپ سے باتیں کرتا جائے اور آپ جب اکتا کر اس سے چپ ہونے کو کہیں تو بغیر کسی ملال کے چپ ہو جائے اور آگے کے بہتر موڈ کا انتظار کرے۔ بھلا یہ بات کتب خانے سے باہر ممکن ہے؟

لیکن یہ چھوٹا سا کمرہ جس میں وقتاً فوقتاً باہر سے کتابیں ٹپکتی رہیں اور جسے میں نے میرا کتب خانہ کہا ہے درحقیقت میرے احساسات کی ایک داستان بھی ہے۔ اس میں ہر کتاب کبھی ایک مژدہ جانفزا اور کبھی ایک حادثہ جانکاہ بن کر نازل ہوئی لیکن لطف یہ ہے کہ دونوں صورتوں میں نتیجہ مسرت کی صورت ہی میں ظاہر ہوا۔ مجھے مژدہ جانفزا تو اس کتاب نے دیا جس میں میں نے اپنے ہی افکار اور نظریات کا پرتو دیکھا۔ اس سے اپنی ذات پر بڑا اعتماد حاصل ہوا اور زندہ رہنے کو جی چاہنے لگا۔ حادثۂ جانکاہ میں اس کتاب کو کہوں گا۔ جس نے میرے پہلے احساسات کو پاش پاش کر دیا اور مجھے ایک بلند تر سطح پر اپنی فکری اور احساسی دنیا کو از سرِ نو مرتب کرنے کی تحریک دی اور حقیقت یہ ہے کہ ایسی کتاب ہی نے نظر کو وہ کشادگی عطا کی جو ہزاروں کوس چلنے سے بھی حاصل نہیں ہوتی۔

میرے کتب خانے میں اوّل اوّل دیوان غالب، شیکسپیئر کے ڈرامے، انگریزی کے نیچر پرست شعرا کے مجموعے، اقبال کی کتبیں، دیوان حافظ، آزاد کی آب حیات، موپساں کے افسانے، چارلس ڈکنز، سمرسٹ ماہم، ہمینگوے، لارنس، جیمز جوائس، ورجینیا وولف ولز پرل ایس بک اپٹن سنکلیر وغیرہ کے ناول، نیز روسی اور فرانسیسی افسانہ نگاروں اور ناول نگاروں کی کتب داخل ہوئیں اور میرے احساسی نظام کی اوّلین سطح کو مرتب کرتی چلی گئیں۔ اسی دوران میں مذہبی صحیفوں .... اور یونانی مفکروں کی کتب سے آشنا ہوا۔ گویا ذہن کی بکھری ہوئی کڑیاں بھی مرتب ہونے لگیں۔ اور اس کے بعد یکا یک میری لائبریری میں ایک ایسی کتاب داخل ہوئی جسے میں ایک حادثۂ جانکاہ کا نام دوں گا۔ اور جس نے میرے نظام فکر کی نہج ہی کو بدل دیا۔ یہ کتاب سوامی رام تیرتھ کی ان تقریروں پر مشتمل تھی جو اس نے اس صدی کے آغاز میں امریکہ کے مختلف شہروں میں کیں اور جنہیں In Wood of God Realization کے نام سے مرتب کر دیا گیا میں نے جب سوامی رام تیرتھ کی یہ تقاریر پڑھیں جن میں اپنشد کے فلسفے کو بڑی صفائی اور جذبے کے ساتھ بیان کیا گیا ہے تو میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں اور مجھے محسوس ہوا گویا میری شخصیت میں ایک نئی سطح کا اضافہ ہو گیا ہے۔ میں نے مذہبی قیود، فرقہ پرستی بلکہ قوم اور وطن پرستی کے مدارج سے اوپر اٹھ کر کائنات کو ایک اکائی کے روپ میں دیکھنے اور انسان کو اس کائنات کا

مرکزی نقطہ قرار دینے کا نظریہ سوامی رام تیرتھ کے اس اپدیش ہی سے حاصل کیا۔ کچھ عرصہ کے لیے تو میں اس طلسم میں پتھر کی طرح بے حس و حرکت پڑا رہا اور جب اس سے باہر آ کر روحانیت کے بجائے فن اور اس کے مقتضیات میں گرفتار ہوا تو بھی ویدانت کی کشادہ دامانی نے ہمیشہ مجھے راہ دکھائی اور زندگی کی الجھی ہوئی راہوں میں گم ہو جانے سے باز رکھا۔

سوامی رام تیرتھ نے مجھے مسرت کی تلاش پر مائل کیا۔ اس مسرت کا کچھ پرتو مجھے خود فراموشی کے عالم اور ذات کو کائنات پر منطبق کرنے کے عمل میں ملا۔ لیکن جب میں آسمان سے زمین پر اترا تو بھی تلاش کے اس جذبے نے برابر میرا ساتھ دیا۔ میں مسرت کے صرف ماورائی مدارج سے ہی نہیں، اس کے ارضی مظاہر سے بھی آشنا ہونے کا متمنی تھا۔ انہی دنوں میرے کتب خانے میں لن یوٹانگ کی اسمپارٹنس آف لونگ داخل ہوئی اور مجھے ایک انوکھے کیف سے سرشار کر گئی۔ زندگی کے چھوٹے چھوٹے واقعات، حادثات، مظاہر اور پہلوؤں سے کس طرح لطف اندوز ہونا چاہیے۔ یوں کہ ارضی لذتیں بھی مسلط نہ ہوں اور ماورائی کیفیات پر غالب نہ آ جائیں۔ میں نے اس کتاب ہی سے سیکھا۔ عجیب فلسفہ تھا۔ بالکل صراط مستقیم پر چلنے کی کیفیت؛ لیکن اس سے میں نے اصل بات یہ سیکھی کہ زندگی۔ یہ ارضی زندگی ایک نہایت نادر اور نایاب تجربہ ہے اور اس سے منہ موڑنا کفران نعمت کے مترادف ہے۔ چنانچہ میں نے بڑی باقاعدگی سے مسرت کے موضوع پر مطالعہ کا آغاز کر دیا اور پھر میرے کتب خانے میں اس موضوع پر کتابوں کی ایک پوری قطار نمودار ہو گئی۔ اس میں برٹنڈ رسل اور انڈریو مارے کی مسرت کے موضوع پر کتب بھی تھیں اور ارسطو سے لے کر کروچے تک تمام اہم فلاسفروں کی وہ کتب بھی جن میں مسرت کے موضوع پر کچھ نہ کچھ لکھا گیا ہے۔ اس موضوع سے سب سے بڑا فائدہ مجھے یہ پہنچا کہ میں ایک طالب علم کی طرح فلسفے کی طرف راغب ہوا اور میں نے وہ تمام کتب بھی پڑھ ڈالیں جو ایک پر لطف، اعلیٰ و ارفع زندگی کا گر سکھاتی تھیں۔ لیکن جب میں ازدواجی زندگی میں مسرت کے حصول کے مطالعہ کی طرف راغب ہوا تو یکا یک قطعاً غیر ارادی طور پر نفسیات کے طویل و عریض جنگل میں داخل ہو گیا اور میرے فکر و احساس میں ایک بار پھر ایک نئی سطح کا اضافہ ہو گیا۔

نفسیات کا مطالعہ فرائڈ کے نظریات سے ہوا اور میں نے اپنے کتب خانے میں فرائڈ کی بیشتر کتب اکٹھی کر لیں ان میں وٹ پر اس کی مشہور کتاب بھی تھی۔ ٹوٹم اور ٹیبو بھی۔ خوابوں کے بارے میں اس کی کتاب بھی۔ بی یونڈ دی پلیزر پرنسپل بھی اور موسیٰؑ کے مرکزی کردار کو اجاگر کرنے کے سلسلے میں اس کی آخری کتاب بھی فرائڈ کے بعد میں نے آڈلر۔ ژنگ اور اوٹو رین کے نظریات کا مطالعہ کیا لیکن ژنگ کی کتاب نے مجھے باہر کی طرف دیکھنے کی بجائے پلٹ کر اپنی ذات کی

گہرائیوں، نسل کے ثقافتی سرمائے اور دیومالا کے نفسیاتی مطالعہ پر اکسایا۔ یہیں سے میرا وہ مطالعہ شروع ہوا جو مجھے آج بھی بے حد عزیز ہے۔ یعنی تاریخ تہذیب؛ لیکن اس کا ذکر میں بعد میں کروں گا۔ ژنگ کی کتابوں بالخصوص سمبلز آف ٹرانفارمیشن اور ریلیجن اینڈ سائیکالوجی نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ دوسرے نفسیاتی مفکرین کی بہ نسبت ژنگ مشرق سے قریب بھی ہے اس لیے قدرتی طور پر مجھے ژنگ کے نظریات میں سکھ کا احساس ہوا۔ ژنگ دیومالا کی علامتوں اور Arche Types کا بہت ذکر کرتا ہے۔ ضروری تھا کہ میں دیومالا کا بھی کچھ مطالعہ کرتا تا کہ ژنگ کے نظریات کو گرفت میں لینا آسان ہوتا۔ یوں میرے کتب خانے میں فریزر کی گولڈن باؤ داخل ہوئی اور میں نے کئی راتیں اس کے مطالعے میں صرف کر دیں۔ اس کتب نے ذہن کو جلا بخشی اور میں نے اپنے سفر پر از سرنو روانہ ہونے کے قابل ہو گیا۔

ان ہی دنوں میرے سر میں یہ سودا سمایا کہ میں طنز و مزاح پر ایک مبسوط مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی سند کے لیے پیش کروں۔ یوں مجھے ہنسی اور اس کے اماثل پر متعدد کتابیں پڑھنے کا موقع ملا۔ اور میرے کتب خانے میں ایک تازہ موضوع کے سلسلے میں بہت سی کتابیں اکٹھی ہو گئیں۔ کانٹ شوپنہار، گریگ، ایسٹ مین، آرتھر کوئسلر اور برگساں اسی چور دروازے سے میرے یہاں داخل ہوئے۔ ان میں سے برگساں کی کتاب Creative Enolution نے بڑا لطف دیا۔ دوسری کتاب آرتھر کوئسلر کی Insight and Outlook تھی مجھے آج بھی اس کتاب سے بڑا پیار ہے۔ اس میں آرتھر کوئسلر نے مزاحیہ تخلیق اور المیہ کے مابین جو لطیف سا ربط قائم کیا ہے، اس نے مجھے متاثر کیا اور مجھے تخلیق کے لوازم اور مقتضیات کو سمجھنے میں مدد دی۔

اسی دوران میں قطعاً غیر شعوری طور پر میں ایک وسیع تر موضوع کی طرح راغب ہو رہا تھا۔ اس موضوع سے میری دلچسپی کا آغاز تو ان ایام ہی میں ہو گیا تھا جب میں نے پنڈت نہرو کی سوانح عمری اور ڈسکوری آف انڈیا کا مطالعہ کیا تھا اور مجھے برصغیر کے ماضی سے گہرا لگاؤ پیدا ہو گیا تھا۔ پھر تمدن ہند اور سر مارٹیمر ویلیر کی کتابوں میں بھی خاصی زمین ہموار کر دی تھی۔ اب مجھے یکا یک اس بات کا احساس ہوا کہ اس برصغیر کی تہذیب افریشیا کی تہذیب سے الگ نہیں اور اس لیے اس کا مطالعہ افریشیا کے وسیع تر کینوس میں رکھ کر کرنا چاہیے چنانچہ میں ایران، عراق، مصر اور اس کے ساتھ یونان اور روم کی تہذیبوں کی طرف مائل ہوا اور میرے کتب خانے میں ایک سہانے موضوع پر متعدد کتابیں داخل ہوتی چلی گئیں۔ میں نے اس سلسلے میں براؤن اور نکلسن سے لے کر لیونارڈ کوٹرل اور مسلمان صوفیا کی کتب سے لے کر ہیگل ٹائن بی، شپنگلر اور سوروکن تک تقریباً تمام اہم مفکرین سے استفادہ کرنے کی کوشش کی۔ ان میں سے ہیگل کی ''دی فلاسفی آف ہسٹری''

شپنگلر کی ''ڈیکلائن آف دی ویسٹ'' اور ٹائن بی کی انٹروڈکشن ٹو دی سٹڈی آف ہسٹری'' نے میرے ذہن کے بہت سے گوشوں کو منور کر دیا۔ بالخصوص شپنگلر کی کتب تو میرے لیے ایک حادثہ جانکاہ ثابت ہوئی۔ اوراس نے مجھے ایک نئی ذہنی سطح سے آشنا کیا۔ اب میرے لیے یہ ممکن ہو گیا کہ میں افریشیا کی ارضی تہذیب کے مزاج سے واقف ہو کر اس کا موازنہ...... آریاؤں کی غیر ارضی تہذیب کے ساتھ کر سکتا۔ اس موازنہ نے گویا انکشاف اور عرفان کے بہت سے دروازے وا کر دیے اور مجھے محسوس ہونے لگا جیسے میں ایک لامحدود کائنات میں یکہ و تنہا نہیں بلکہ احساسی طور پر اپنے ماضی سے پوری طرح وابستہ ہوں۔ اس بات سے ایک میٹھی سی راحت کا احساس ہوا۔

لیکن انسان کے اندر جو مضطرب اور بے قرار ہستی چھپی بیٹھی ہے اسے اطمینان کہاں؟ گویا جب انسان کسی مقرر کردہ منزل کے قریب پہنچ جاتا ہے تو ایک فطری عمل کے تحت کسی دوسری منزل کے نقوش اجاگر ہو جاتے ہیں۔ میں نے تاریخ تہذیب کا مطالعہ تو کر لیا تھا لیکن ذہن بار بار یہ سوال کرتا کہ ایک خاص صورت حال میں انسان کیوں ایک خاص ردعمل کا مظاہرہ کرتا ہے؟ اس کے ذہن کی تشکیل میں ماحول کے اثرات کس قدر ہیں اور جبلت کے کس قدر؟ یعنی کیا انسان خارجی حالات کے سانچوں میں ڈھلتا ہے یا ان سانچوں کو وہ اپنے نسل کے گودام سے حاصل کرتا ہے۔ ایسے متعدد سوالات ذہن میں ایک کہرام سا برپا کرنے لگے اور میں نے خود کو غیر شعوری طور پر علم الانسان کا مطالعہ کرنے کی طرف راغب پایا۔ شپنگلر اور ژنگ نے اس سلسلے میں خاصی زمین ہموار کر دی تھی اب میں میتھو، ٹائیلر اور ہنگٹن کی کتب کا مطالعہ کیا اور روشنی حاصل کی بالخصوص ہنگٹن کی کتات ''مین سپرنگ آف سولیزیشن'' تو حادثۂ جانکاہ نسل کی ایک کتاب ثابت ہوئی اور میں نے اس کی روشنی میں اپنے برصغیر کے تہذیبی پیکر کا پوری طرح مطالعہ کیا اور اس قومت سے آشنا ہوا جو اس دھرتی ک ہوا، پانی، نمک سے مرتب ہوئی ہے اور جس نے ہر بیرونی قوت زود یا بدیر خود میں ضم کر لیا ہے۔ اسی سلسلے میں مجھے ایس جی بیرل کی تصنیف Man's Emerging Mind اور لورین ایزلے کی کتاب The Immense Journey کو دیکھنے کا بھی اتفاق ہوا اور میں کرۂ ارض پر زندگی بالخصوص انسانی زندگی کے سفر کی ساری داستان پڑھ ڈالی، مؤخر الذکر کتاب تو میرے لیے ایک حادثۂ جانکاہ ثابت ہوئی اور میں اپنے سابقہ نقطۂ نظر کو مسمار کر کے ایک نئے اور کشادہ تر زاویۂ نگاہ کی تعمیر میں کامیاب ہو سکا۔

اسی دوران میں مجھے تخلیقی عمل کے موضوع نے اپنے گرفت میں لے لیا اور میں اس بات پر غور کرنے لگا کہ کیا ارتقا ایک میکانکی انداز میں نپے تلے قدم اٹھانے کا نام ہے یا تخلیقی جست کی مدد سے آگے بڑھنے کے عمل سے مترادف ہے؟ یوں مجھے اس بات کی ضرورت پڑی کہ میں

حیاتیات، عمرانیات، دیومالا، تاریخ اور ادب کا تخلیقی عمل کی روشنی میں مطالعہ کروں۔ تجسس اور تگ و دو کے اسی عالم میں میں نے کیسیرر کی لینگوئج اینڈ متھ اور متھ آف دی سٹیٹ کا بھی مطالعہ کیا اور سوسن لینگر کی فلاسفی ان اے نیو کی اور کولن ولسن کی بیونڈ دی آؤٹ سائڈر بھی پڑھ ڈالی۔ ان تینوں مصنفین کی کتابوں نے مجھے احساس اور عرفان کے ایک نئے ہی عالم میں پہنچا دیا۔

مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ میں اس تمام عرصے میں ادب اور اس کی تحریکات سے نا آشنا رہا۔ حقیقت یہ ہے کہ ادب تو میرا محبوب ترین موضوع تھا اور رمیں اسے پوری طرح سمجھنے اور اس سے محظوظ ہونے کے لیے اس کے گرد چکر لگاتا اور ان علوم سے آشنا ہونے کی کوشش کرتا رہا۔ جو اس سے کسی نہ کسی حد تک متعلق تھے چنانچہ میں نے تاریخِ تہذیب اور علم الانسان کے علاوہ فلسفے بالخصوص 'موجودیت' کا مطالعہ بھی اسی سلسلے میں کیا اور فلکیات، موسیقی اور رقص کا بھی۔ اس کے علاوہ نطشے اور ہائڈگر سے لے کر ہربرٹ ریڈ، کنتھ برک، کروچے، ایلیٹ، سیوج، رچرڈسن، سارتر اور آرتھر کوئسلر کو خاص طور پر اس لیے پڑھا کہ میں ادب اور اس کے مقتضیات کو سمجھنے کا متمنی تھا چنانچہ ان مصنفین کی بہت سی کتب بھی میرے کتب خانے میں داخل ہوتی چلی گئیں۔

مطالعہ کی کہانی بہت طویل ہے اور اس کے ذکر سے میں قاری کی اکتاہٹ کو تحریک دینے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔ کتاب تو ایک بحرِ ذخار ہے۔ آپ عمر بھر اس کا مطالعہ کیجیے۔ مگر آخر میں آپ کو محسوس ہوگا جیسے آپ نے ابھی اس سمندر کے ساحل پر ہی چہل قدمی کی ہے یہی حال میرا ہے۔ میں نے بہت سی کتابیں پڑھ ڈالی ہیں لیکن محسوس یہی ہوتا ہے جیسے ابھی کچھ نہیں پڑھا۔

شام دوستاں آباد / ڈاکٹر وزیر آغا / مکتبہ عالیہ، لاہور۔ ۱۹۹۴ء

لاہور کے کتب خانے

ڈاکٹر انیس ناگی

کتب خانے ایک تمدن کی زینت ہوتے ہیں۔ جب تمدن زوال پذیر ہوتا ہے تو کتب خانے اجڑنے لگتے ہیں اور کتابوں کے قاری بتدریج معدوم ہو جاتے ہیں۔ جو معاشرہ کتابوں سے بے اعتنائی برتتا ہے کتابیں بھی اس سے منہ موڑ لیتی ہیں۔ عجب اتفاق ہے کہ لاہور جو ادیبوں کا مرکز رہا ہے اور جہاں سے بہت سی ادبی تحریکوں نے جنم لیا ہے، جہاں ملک کی تعلیمی اور فنی یونیورسٹیاں ہیں وہاں کتب خانوں کی تعداد اور حالت تشویشناک ہے۔

پرانے زمانے میں عمومی کتب خانوں کا رواج عام نہیں تھا۔ صاحب ثروت اور صاحب لوگ من پسند مسودہ کو کاتبوں سے خود لکھوا کر اپنے ذاتی کتب خانوں میں محفوظ کر لیتے تھے۔ انیسویں صدی میں چھاپے خانے کے تعارف کے بعد کتابوں کی ترسیل کا عمل زیادہ وسیع ہوا۔ نشر و اشاعت کی اس سہولت کے باوجود لاہور میں عمومی کتب خانوں کے قیام کا کسی کو خیال نہ آیا۔ جس طرح انگریزوں نے اردو زبان کی ترویج کے لیے مختلف اقدام کیے اسی طرح انہوں نے عمومی کتب خانوں کے تصور کو بھی پیش کیا۔ چنانچہ لاہور میں پہلا کتب خانہ پنجاب پبلک لائبریری کے نام سے ۱۸۸۴ء میں معرض وجود میں آیا۔ شروع شروع میں اس لائبریری کو عجائب گھر کی پشت پر واقع بارہ دری وزیر خاں میں قائم کیا گیا اور پھر ۱۸۸۶ء میں اسے اس کی موجودہ عمارت میں منتقل کیا گیا۔ اس کتب خانے کے لیے کچھ کتابیں تو انگریز انتظامیہ نے خریدیں اور مزید کتابیں لاہور کے اہل علم حضرات نے انتظامیہ کے ایماء پر کتب خانے کو تحفہ کے طور پر دیں۔ عطیہ دینے والوں میں لکھنؤ کے مشہور ناشر نولکشور کا نام سرفہرست ہے۔

قیام پاکستان کے کافی عرصہ بعد تک بارہ دری وزیر خاں کی عمارت اس کتب خانے کے زیر استعمال رہی ہے۔ اس کی کہنہ عمارت میں اخباروں اور رسالوں کا ریفرنس سیکشن قائم تھا۔ گزشتہ دہائی میں اس بارہ دری کی عمارت کو خستہ قرار دے کر کتب خانے کے ریفرنس سیکشن کو وہاں سے منتقل کر دیا گیا۔ یہ عمارت محکمہ آثار قدیمہ کو واپس دے دی گئی ہے۔ اس کتب خانے کی توسیع بھی کی گئی ہے اور دارالقرآن کے ایک نئے سیکشن کا اضافہ کیا گیا ہے۔ کسی زمانے میں اس کتب خانے میں تین لاکھ سے

زیادہ کتب تھیں جن میں بیشتر سرقہ ہو چکی ہیں۔ کتب خانے میں موجود کتب غفلت کا شکار ہیں اور بہت سی گرد اور کتابی کیڑوں کی نظر ہو چکی ہیں۔ اکثر کٹی پھٹی ہیں۔ نئی کتابوں کا اس کتب خانے میں بہت کم اضافہ ہوتا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق اس تاریخی کتب خانے کے اردو سیکشن میں روزانہ کل ۶۰ کے قریب لوگ مطالعہ کرنے آتے ہیں جن میں سے اکثر اخبار پڑھ کر چلے جاتے ہیں۔

پنجاب پبلک لائبریری کو حکومت پنجاب نے قائم کیا تھا۔ لیکن اس صدی کے آغاز میں لاہور کے ایک شہری اور آنریری مجسٹریٹ سردار دیال سنگھ مجیٹھیا نے اپنی گرہ سے نسبت روڈ پر عمومی فائدہ کے لیے دیال سنگھ لائبریری کے نام سے ایک کتب خانہ قائم کیا جو آج بھی اپنی تمام تر خستگی کے باوجود قارئین کے زیر استعمال ہے یہ کتب خانہ ۱۹۰۸ء میں قائم ہوا تھا۔ شروع میں یہ ایک ریڈنگ روم پر مشتمل تھا لیکن بعد میں یہاں ایک پروقار عمارت تعمیر کی گئی اس کتب خانے میں کتابوں کا بیش بہا ذخیرہ تھا جو بتدریج معدوم ہوتا گیا۔ اس کتب خانے کو محکمہ متروکہ وقف املاک نے اپنی تحویل میں لیا ہوا ہے اور اس کے ذخیرہ کتب میں بہت کم اضافہ ہوا ہے بلکہ نادر کتب بھی روز بروز ناپید ہوتی جارہی ہیں۔ اس کتب خانے کی توسیع یا اس کو جدید کتب خانوں کی طرح آراستہ کرنے کے لیے اہل لاہور نے کبھی توجہ نہیں دی اور نہ ہی اس کے ذخیرہ کتب میں کسی نے اضافہ کی کوشش کی ہے۔ یہ کتب خانہ عوام الناس کے لیے ایک انفرادی کوشش کا نتیجہ ہے۔

لاہور کا تیسرا اور سب سے بڑا کتب خانہ قائداعظم لائبریری ہے جسے لارنس گارڈن (باغ جناح) کے منٹگمری ہال میں ۱۹۸۰ء کے لگ بھگ قائم کیا گیا ہے۔ یہ ریفرنس کتب خانہ ایک ایسی عمارت میں قائم کیا گیا ہے جو وہ انگریز حکمران سر ہنری لارنس اور رابرٹ منٹگمری کی یاد میں انگریزوں اور مقامی امرا نے تعمیر کرایا تھا۔ اس کا دوسرا حصہ منٹگمری ہال ۱۸۶۶ء میں بنایا گیا تھا اور ان دونوں حصوں کو ایک طویل کوریڈور سے متصل کیا گیا تھا۔ قائداعظم لائبریری اس وقت ملک کا سب سے جدید کتب خانہ ہے جس میں مختلف زبانوں کے ادب کے علاوہ فنی کتب اور رسائل کی فراوانی ہے۔ یہ واحد کتب خانہ ہے جس میں مائیکروفلمنگ اور اس طرح کی دوسری سہولتیں دستیاب ہیں۔ مختلف زبانیں سیکھنے کے لیے سمعی بصری ذرائع بھی موجود ہیں۔ یہ کتب خانہ نہایت سلیقے سے مزین کیا گیا ہے۔

ان تین کتب خانوں کے علاوہ لاہور میں اور کوئی قابل ذکر کتب خانہ نہیں ہے۔ کہیں کہیں میونسپل سطح پر چھوٹے چھوٹے کتب خانے قائم ہیں۔ اسی طرح سکولوں اور کالجوں میں بھی چھوٹے چھوٹے کتب خانے موجود ہیں۔ لاہور شہر جیسے بڑے شہر میں کوئی ایسا بڑا کتب خانہ نہیں ہے جو جدید کتابوں کو خرید کر محفوظ کرے۔ باوجود شرح خواندگی بڑھنے کے اہل لاہور کی کتابوں میں دلچسپی کم ہو چکی ہے۔

رضا لائبریری، رام پور

سعود الحسن خان روہیلہ

تاریخ رام پور رضا لائبریری:

روہیلوں کا جو گروہ سرداروں کی شکل میں سامنے آتا ہے، وہ تعلیم یافتہ تھا۔ یقیناً اس کے علاوہ عام سپاہیوں میں بھی تعلیم یافتہ لوگ تھے مگر اس گروہ کے پاس ذخیرۂ کتب بھی تھا۔ اس گروہ کے سرکردہ افراد علی محمد خان، شادی خان، بخشی سردار خان، حافظ رحمت خان، شیخ کبیر خان، گلی محمد خان، سعادت خان، محمد یار خان وغیرہ تھے۔ ان لوگوں کا ذخیرۂ کتب آج رضا لائبریری کی شکل میں رام پور میں محفوظ ہے۔

روہیلہ سرداروں میں سے ہر ایک کا الگ الگ کتب خانہ تھا۔ جس میں مذہبیات، ادب وفلسفہ، تاریخ وریاضی اور دیگر علوم سے متعلق کتابیں ہوا کرتی تھیں۔ علی محمد خان وغیرہ کی کتب کا ذخیرہ آنولہ میں محفوظ تھا۔ حافظ رحمت خان کا بریلی میں تھا۔ اسی طرح ہر سردار کا کتب خانہ اپنی اپنی رہائش گاہوں پر تھا۔ علی محمد خان کے ذخیرہ میں سند شاہی، نسخہ کلام پاک، شاہی مہر، تبرکات اور خلعت وغیرہ بھی شامل تھے۔ علی محمد خان کی مہر پر تحریر ہے۔

''علی محمد خان فدوی بادشاہ غازی محمد شاہ ۱۱۵۰ھ'' بمطابق سن 1737ء''

رضا لائبریری میں آج بھی بہت سی کتب پر روہیلہ سرداروں کی مہریں ہیں اور ان کے نوٹس درج ہیں۔ بعض رپ نواب کلب علی نے تحریر کیا ہے کہ یہ کتابیں ہمارے موروثی کتب خانہ کی ہیں۔ روہیلہ کتب خانے میں حافظ رحمت خان نے بیش بہا پشتو اور فارسی کتب کا اضافہ کیا تھا۔ ۱۷۷۴ء میں شجاع الدولہ اس کی کتب اپنے ساتھ لے گیا جو چالیس صندوقوں میں بند تھیں۔ ۱۸۵۷ء کے سقوط لکھنؤ کے بعد نوابین اودھ کے کتب خانہ کی کچھ کتابیں بھی رضا لائبریری میں آ گئیں جن میں کچھ کتابیں حافظ رحمت خان کی مہروں والی بھی تھیں۔

لال ڈانگ میں پناہ کے وقت فیض اللہ اور مستقیم خان وغیرہ کی کئی کتب ان کے پاس ہی تھیں۔ جب وہ لوگ رام پور آئے تو یہ ذخیرۂ کتب بھی ساتھ آ گیا۔ یہ کتاب خانہ فیض اللہ کی کوٹھی کے ایک کمرے میں تھا۔ اس میں فقہ، فلسفہ اور طب وغیرہ پر کتب موجود تھیں۔ اس میں فیض اللہ کے

اپنے دور کی بھی بعض کتب شامل ہوگئیں جیسے حکیم بایزید کی فصول فیض اللہ خانی اور مولوی محمد یوسف کی فتاویٰ فیض اللہ خانی بھی شامل ہیں۔

نواب محمد علی اور نواب غلام محمد کا عہد تو جنگ و جدل کی نذر ہو گیا۔ ان کے بعد ۹ نومبر ۱۷۹۴ء سے احمد علی خان کے نواب اور نصر اللہ خان کے نائب نواب بننے سے رضا لائبریری کی باضابطہ تاریخ شروع ہوگئی۔ نواب احمد علی نے اس کی نگرانی کے لیے ایک مشہور افغانستانی ماہر آغا یوسف علی محوی کو ناظم مقرر کیا۔ اس دور کی اکثر شعراء نے اپنے دیوان لائبریری میں داخل کیے۔ احمد علی خان کے دور میں اخوندزادہ احمد خان غفلت نے رامائن کا اردو میں ترجمہ کرایا۔ اس کے دو نسخے ''قصہ رام و سیتا'' کے نام سے لائبریری میں محفوظ ہیں۔ نواب احمد علی کے دور میں اس کتب خانے میں بہت سی کتب کا اضافہ ہوا۔ نواب محمد سعید خان ۱۸۴۰ء میں مسند نشین ہوا۔ اس نے انگریزی انداز میں کتب خانے کی تنظیم کی نیا فرنیچر ڈالوایا اور کتابوں کے لیے الگ کمرہ بنوایا گیا۔ ایک مہر تیار کر کے ہر کتاب پر لگائی جانے لگی:

ہست این مہر بر کتب خانہ	والی رام پور فرزانہ
۱۲۶۸ھ	۱۸۵۷ء

نواب محمد سعید کے دور میں یہ کتب خانہ کافی مشہور ہو گیا۔ برطانوی حکومت اکثر یہاں سے کتب منگوا لیتی تھی۔ اگست ۱۸۴۸ء میں آگرہ بورڈ کا صدر مسٹر ریلےسن رام پور سے تاریخ و تذکرہ کی بہت سی کتابیں لے گیا جو واپس نہ آئیں۔ محمد سعید کے دور میں لائبریری میں بہت سی کتب کا اضافہ ہوا۔ نواب نے مرزا محمد حسن اور غلام رسول کاشمیری کو بھی بلوایا جنھوں نے بہت سی کتب پر طلائی کام کیا۔ نواب محمد سعید کے دور میں ۶۱۱۹ روپیہ مطبوعہ و قلمی کتابوں کے خریدنے پر صرف ہوا۔

نواب یوسف علی ناظم کو کتب خانے سے بڑی دلچسپی تھی۔ اس دور میں مبلغ ۱۲۲۵۸ روپے کی مطبوعہ اور قلمی کتابیں خریدی گئیں۔ ۱۸۵۷ء سے متعلق لٹریچر روزنامچے، مشاہیر کے خطوط اور پولیٹیکل ریکارڈ آفس کا ریکارڈ بہت اہم ہے۔ اس دور میں امیر اللغات تیار ہونا شروع ہوئی۔ نواب موصوف نے حروف تہجی کے حساب سے کتب خانے کی ایک فہرست بھی تیار کروائی۔ ان کے دور کتب خانے کے نگران میاں رحیم بخش مجددی تھے، جنھوں نے کتب کے لیے بہت کام کیا۔ اس دور میں اکثر لوگ کتب پیش کر کے ملازمت حاصل کر لیا کرتے تھے۔

کلب علی کے نواب بننے کے ساتھ ہی کتب خانے میں بیش بہا دولت کا اضافہ ہو گیا۔ نواب نے اپنے کارندے جگہ جگہ چھوڑ دیے جو قیمتی کتب اور نوادرات اکٹھے کر کے لاتے تھے۔

نواب نے غیر مما لک کے دورے کے دوران بہت سی کتب خریدیں، فہرست سازی کی ترتیب کے لیے منشی امیر احمد مینائی اور مولوی مہدی علی خان کو ملازم رکھا۔ بہت سے علما کے ذاتی ذخیرے خرید کر سرکاری کتب خانے میں داخل کر لیے۔ مہدی علی خان نے غیر معمولی صلاحیت اور محنت کا ثبوت دیا جس سے ان کی بہت شہرت ہوئی۔ کلب علی نے تصنیف و تالیف کے کام کو بھی آگے بڑھایا، اردو لغت پر کام کرایا، کئی کتب کے ترجمے کرائے، فہرست کتب میں زرِ خرید اور ذریعہ حصول کے اندراج کا بھی حکم دیا۔ (۲) ۱۸۸۶ء میں یہ کتب خانہ محل سے نکال کر علیحدہ عمارت میں منتقل کر دیا۔ یوں لائبریری کی مستقل حیثیت بن گئی۔ مطبع نظامی کانپور اور مطبع نول کشور لکھنؤ سے ہر کتاب لائبریری میں آتی تھی۔ نواب کے دور میں ۴۳۶۰۸ روپے کی کتب خرید کر داخل لائبریری کی گئیں۔ نواب کے دور میں پہلے کتاب خانہ ''توشہ خانہ'' سے نکال کر ''چھلی بھون'' کے قریب محل میں منتقل کیا گیا تھا۔ ۱۸۸۶ء میں اسے قدیم لال پردہ کے نزدیک ایک دومنزلہ عمارت میں منتقل کر دیا گیا۔ اس پر یہ تاریخ نام کنندہ ہے (۳)

کتب خانہ علوم دینیہ

۱۳۰۳ھ

نواب کلب علی کے دور میں کئی اور لوگوں نے بھی اپنے کتب خانے بنانے شروع کر دیے جن میں سے بعض کو کلب علی نے ان کی اولادوں سے خرید لیا۔ ان میں سب سے اچھا کتب خانہ مفتی سعد اللہ شاہ کا تھا۔ ان کے علاوہ میرٹھ کے حکیم غلام محی الدین طبیب، دہلی کے مفتی صدر الدین آزردہ، حکیم احسن اللہ خان اور لکھنؤ کے حکیم علی حسن کے ذخیروں کی کتب بھی خریدی گئیں۔

نواب مشتاق علی بر بنائے معذوری کامل اختیارات کے استعمال سے محروم تھے لہذا جنرل اعظم الدین خان کو ریاست کا چیف منسٹر مقرر کیا گیا۔ جنرل نے کتب خانے پر خصوصی توجہ دی اور اس کی تعمیر نو شروع کر دی۔ اسی دور میں چالیس ہزار روپے کی لاگت سے کتب خانے کے لیے ایک اور نئی عمارت کا کام شروع ہوا۔ جنرل نے جدید فہرست تیار کرائی اور اسکالروں کے لیے مہمان خانہ بنوایا۔ جنرل نے لائبریری میں سب سے پہلے معائنہ بک کا رجسٹر قائم کیا۔ اس میں سب سے پہلا اندراج ایک عراقی اسکالر شیخ محمود بن شیخ محمد نصیر الدین جیلانی کا ہے۔ اسی دور میں ۸۸۵ے روپے کی کتب خریدی گئیں۔ (۴)

نواب حامد علی کے دور میں ریاست کے چیف منسٹر گو اعظم الدین خان ہی رہے۔ حکیم اجمل خان کو کتب خانے کا افسر اعلیٰ مقرر کیا گیا۔ حکیم اجمل خان نے طب کے شعبہ کی نادر کتب اس کتب خانے میں داخل کیں۔ بیرونی مما لک سے تازہ کتب منگوائی گئیں، شعبہ عربی کی فہرست کا

ایک حصہ مکمل ہوکر شائع ہوا۔ جنرل صاحب نے کتب خانہ نئی عمارت میں منتقل کرایا۔

حکیم اجمل خان کے دہلی چلے جانے کے بعد احمد علی خان نے شوق کو ۱۳۱۵ھ بمطابق 1897ء سے کتب خانے کا ناظم مقرر کر دیا گیا۔ حافظ احمد علی شوق نے فارسی کتب کی فہرست تیار کرائی۔ ستمبر ۱۹۱۵ء میں اس کتب خانے میں عربی و فراسی کی قلمی کتب کی تعداد ۸۵۸۷ تھی اور مطبوعہ کتب کی ۱۳۵۰۳ تھی۔

حکیم اجمل خان کے بعد نجم الغنی رام پوری کو ناظم کتب خانہ مقرر کیا گیا۔ نجم الغنی نے اس کتب خانے سے بہت فائدہ اٹھایا اور اپنی تصانیف میں اکثر مواد اس لائبریری کا استعمال کیا۔ نجم الغنی اپنے انتقال کے بعد ہی اس کتب خانہ سے الگ ہوئے۔ نواب حامد علی کے دور میں چار لاکھ ستاسی ہزار تین سو اٹھانوے روپے کی کتب خریدی گئیں۔

نواب رضا علی کی مسند نشینی (۱۹۳۰ء) اور نجم الغنی کی وفات (۱۹۳۲ء) کے بعد امتیاز علی خان عرشی کا ناظم کتب خانہ کے طور پر تقرر رہا۔ امتیاز علی خان نے اس کتب خانے کو فائدہ پہنچایا بھی اور اس سے فائدہ اٹھایا بھی۔ ان کا تقرر ۱۹۳۲ء میں ہوا۔ عرشی صاحب نے اس کتب خانے میں قلمی اور مطبوعہ کتب کے بیش بہا خزانے کا اضافہ کیا۔ تمام ذخیرے کی باقاعدہ اور محققانہ فہرستیں تیار کی گئیں۔ کتب خانے کا نظم و نسق جدید اصولوں پر اور ''مخطوطات کی جدید سائنس'' کی روشنی میں کیا گیا۔ نیشنل لائبریری کلکتہ کے لائبریرین مسٹر چیمپئن کو بلایا گیا جس نے اکتوبر ۱۹۳۲ء سے ۱۹۳۵ء تک اس کا رخ، طریق کار اور نظم و نسق متعین کیا۔ فہرست سازی کے سلسلے میں معین الدین ندوی اور مسعود عالم ندوی بھی یہاں ملازم رہے۔ عرشی صاحب نے بھی عملاً اس سارے کام میں حصہ لیا۔ کتاب خانے میں مرجعتی پوسٹ کارڈ کے ذریعہ کتاب کی تلاش کا انتظام کیا گیا۔ عرشی صاحب نے شعبہ اشاعت بھی قائم کیا جس سے کئی کتب شائع کی جا چکی ہیں۔ ان کے دور میں مطبوعات اور مخطوطات کے الگ الگ حصے مقرر کیے گئے تاکہ مطبوعہ اور مخطوطہ کتب ایک دوسرے کو نقصان نہ پہنچا سکیں۔ کتب کے لیے لوہے کی الماریوں کا انتظام کیا گیا تاکہ دیمک کا مکمل خاتمہ ہو سکے۔ (۵)

۱۹۴۷ء میں ہندوستان آزاد ہو گیا اور ۱۹۴۹ء میں ریاست رام پور صوبہ یو پی میں ضم ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی نواب نے یہ لائبریری وقف کر دی۔ کتب خانے کا نام ''رام پور رضا لائبریری'' کر دیا گیا۔ اس سے پہلے یہ اسٹیٹ لائبریری رام پور کہلاتی تھی۔ لائبریری کو 'رضا لائبریری ٹرسٹ'' کے زیر انتظام دے دیا گیا۔ حکومت یو پی اس کا تمام خرچہ اٹھانے کا ذمہ لیا۔ ۲۔ جون ۱۹۵۲ء کو رضا علی خان (سابق نواب) نے جواب انتظامیہ کمیٹی کے چیئرمین تھے، اس کتب خانہ کو حامد منزل میں منتقل کر دیا جو ۱۹۰۲ء میں نواب حامد علی نے اپنے لیے بنوائی تھی۔ آج کل

یہ کتب خانہ اسی جگہ موجود ہے۔

مارچ ۱۹۶۶ء میں نواب رضا علی فوت ہو گئے اور اس کے لڑکے مرتضیٰ علی خان کو لائبریری کا چیئرمین بنا دیا گیا۔اس کی کوششوں سے یکم جولائی ۱۹۷۵ء کو لائبریری مرکزی حکومت کی تحویل میں آ گئی۔اوراس کے لیے رنگ محل کے علاوہ قلعہ کی کچھ زمین الاٹ کر دی گئی۔(۶)

کتب خانے سے وابستہ خوش نویس:

کتب خانہ رام پور سے ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک بہت سے نامور خوش نویس وابستہ رہے۔ان میں پہلا نام میر احمد الحسینی ہے۔غدر کے بعد احمد حسن کو رام پور بلایا گیا۔ان کی وصلیاں اور دیگر نمونے آج بھی رضا لائبریری میں محفوظ ہیں۔دوسرے مولوی حکیم مرتضیٰ ولد قاری علی حسین رضوی ہیں جو محلّہ کٹرہ جلال الدین میں رہتے تھے۔ان کا رسالہ فارسی بھی لائبریری میں محفوظ ہے۔محمد علی خان نبیرہ نواب محمد سعید خان نسخ کے خوش نویس تھے۔غلام محی الدین از اولا د نصرت خان رام پوری، امانت خان رام پوری اور مولوی حبیب اللہ احمد ولد حافظ محمد شاہ خان رام پوری بھی اسی فن سے وابستہ تھے۔ان سب کی خدمات رضا لائبریری کی تاریخ میں یاد رکھی جائیں گی۔(۷)

کتب خانے سے وابستہ خطاط:

رضا لائبریری رام پور میں بلحاظ زبان مخطوطات کی تقسیم یوں ہے:(۹)

زبان	تعداد
۱۔عربی	۳۴۷
۲۔فارسی	۵۲۳
۳۔اردو	۱۷۰۰
۴۔پشتو	۵۵
۵۔تامل و تلگو	۱۵۰
۶۔ترکی	۴۶
۷۔سنسکرت	۳
۸۔دیوناگری	۷
۹۔بھاشا	۱۹
۱۰۔پنجابی	۱

رضا لائبریری کے عربی و فارسی مخطوطے:

رضا لائبریری میں بہت نادر نسخے موجود ہیں۔ان میں ایک نسخہ عبدالستار بن قاسم لاہوری کی ترجمہ شدہ کتاب ''سمرۃ الفلاسفہ'' کا ہے۔یہ عہد اکبری کا فرنگی زبان کا مترجم تھا۔اس

نے اکبر کے دربار میں موجود پادری جردنموشیر سے فرنگی زبان سیکھی۔ اس دور میں فرانسیسی، انگلستانی اور پرتگیزی سب ہی آتے جاتے تھے۔ پتہ نہیں کہ فرنگی سے کیا زبان مراد ہے اور کس زبان سے اسے ترجمہ کیا گیا ہے۔ (۱۰)

دیوان حافظ کے عہد اکبری کے نسخے کے علاوہ اس کی ایک شرح یہاں پر موجود ہے۔ لائبریری میں ایک نسخہ کلام پاک کا موجود ہے جس کی کتابت حضرت علی رضی اللہ عنہ یا حضرت جعفر رضی اللہ عنہ سے منسوب کی جاتی ہے۔ یہ نسخہ کوفی خط میں کھال پر تحریر ہے اور پہلی صدی ہجری کا ہے۔ روس کے مصحف عثمانی کے بعد یہ نادر ترین سرمایہ ہے۔ اس کے علاوہ ابن مقالہ کا چوتھی صدی ہجری کا تحریر کردہ نسخہ کلام پاک بھی یہاں محفوظ ہے۔ (۱۱)

بابر کا دیوان بھی اسی لائبریری میں موجود ہے۔ جس میں دیوان کے آخر میں بابر نے اپنے ہاتھ سے ایک رباعی تحریر کی ہے۔ دنیا بھر میں یہ بابر کی واحد تحریر ہے جس کی تصدیق شاہجہان نے اپنے قلم سے کی ہے۔ (۱۲)

خواجہ عبداللہ انصاری کے رسالے کے ایک نسخہ پر بیک وقت عبدالرحیم خان خانان، جہانگیر اور شاہجہان کی دستی تحریریں ہیں اور عالمگیر کی مہر ثبت ہے۔ نفخات الانس کے ایک نسخے پر داراشکوہ کی تحریر ہے۔ رسالہ خواجہ عبداللہ پر جہاں آرا کی تحریر بھی ہے۔ (۱۳)

لائبریری کے نوادر میں ایک عربی تفسیر بھی ہے جسے امام ثوری نے تحریر کیا تھا۔ ان کا انتقال ۱۶۱ھ بمطابق مئی ۷۷۸ء ہوا تھا۔ (۱۴)

ریاست لوہارو سے آنے والے نایاب ذخیرے میں غالب کی تحریریں اور یادداشتیں ہیں۔ (۱۵)

ہندی کتب:

ہندی قلمی کتب میں سے ملک منجن کی ''مدمالتی'' کا مکمل نسخہ صرف اسی لائبریری میں ہے۔ ملک محمد جائسی کی ''پدماوت'' بھی یہاں ہے جس میں ہر لفظ کا درست تلفظ بنایا گیا اور ہم معنی ہندی لفظ کے فارسی معنی دیے گئے ہیں۔ غلام علی بلگرامی کی انگ درپن بھی یہیں ہے۔ شاہ محمد کاظم کی نغمات الاسرار اور شاہ عالم ثانی کی نادرات شاہی بھی یہیں ہے۔ (۱۶)

اردو کتب:

اس لائبریری میں اردو کے سترہ سو مخطوطات ہیں جن میں سوز، قائم، میر، سودا، مصحفی، انشاء، جرأت، مومن، غالب، تسکین اور تسلیم کے علاوہ دیگر بہت سے شعراء کے دواوین موجود ہیں، اس کے علاوہ لکھنؤ کے مشہور داستان گویوں کی داستانیں موجود ہیں۔ (۱۷)

اس لائبریری میں روہیلوں کی بعض کتب کے مخطوطے بھی موجود ہیں۔اس کے علاوہ حلب، مدینہ، مکہ، ایران کے شاہ طہماسپ صفوی اور شاہ عباس صفوی، بابر، اکبر، جہانگیر، احمد شاہ ابدالی، نادر شاہ، عالمگیر ثانی، سلطان مظفر گجراتی، عادل شاہ سجاپوری، سعد اللہ وزیر شاہجہان، عبدالرحیم خان خانان، آصف الدولہ، امجد علی شاہ، واجد علی شاہ اور نواب احمد خان بنگش کے کتب خانوں کی کتابیں بھی موجود ہیں۔(۱۸)

نوادرات کتب خانہ:

رضا لائبریری رام پور میں صرف مسودات اور مخطوطے ہی نہیں بلکہ دیگر نوادرات بھی موجود ہیں جو اس کی شان کو بڑھاتے ہیں۔

لائبریری میں شہنشاہ جہانگیر کی ایک یادگار تصویر ہے جس میں جہانگیر تخت پر بیٹھا ہوا ہے اور اس کے اردوگرد شہزادیاں ہیں جن میں نور افزا بیگم عرف صدر النسا شراب پیش کر رہی ہے۔ عشرت آراء بیگم کے ہاتھ میں صراحی ہے، زینت النساء کی مٹھی میں رومال دبا ہوا ہے۔ ایک اور شہزادی جس کا نام نہ پڑھا گیا۔ اس کے ہاتھ میں صراحی اور ساغر ہے۔ محفل آراء بیگم، نور النساء، خانم گل، دائی عصمت، حیات النساء خانم، زن خان خانان، حمیدہ بیگم اور رمکو بائی زن سندر خان قوال وغیرہ بھی دکھائے گئے ہیں۔ یہ تصویر راجپوت آرٹ کا نمونہ ہے۔

تزک جہانگیری میں جہانگیر نے سانپ اور مکڑے کی لڑائی کا ذکر تحریر کیا ہے۔ رضا لائبریری میں ایک تصویر ایسی ہے کہ جو سانپ اور مکڑے کی لڑائی کو دکھاتی ہے۔ خیال ہے کہ اس تصویر میں جو لوگ دکھائے گئے ہیں، وہ جہانگیر اور اس کے مصاحب ہیں۔

ایک اور تصویر میں راجپوت مصور نے جہانگیر کو عالم شباب سے دکھایا ہے۔

ایک دوسری تصویر گوبردھن کی بنائی ہوئی ہے جس میں جہانگیر کے علاوہ اعتماد الدولہ، آصف خان، خواجہ ابوالحسن، نرسنگ دیو اور دیگر امرائے دربار کو بھی دکھایا گیا ہے۔

بابر کی ایک تصویر بہت نایاب ہے۔ اس میں بابر کے خطوط منگولین ظاہر کیے گئے ہیں۔ اس طرح یہ تصویر حقیقت سے بہت قریب ہے۔ اس میں بابر کو منگولی ظاہر کیا گیا ہے۔ ہمایوں کی جو تصویر یہاں موجود ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ منگولین خون میں افغانی اثرات ہیں اور اس کا لباس بھی کچھ پھولا ہوا۔ دیوان حافظ، جسے اکبر نے نقل کرایا، اس کے نسخے میں اکبر کی شکار کو جاتے ہوئے تصویر بنائی گئی ہے۔ اس کے علاوہ اکبر کو ایک تصویر میں تخت پر بیٹھا دکھایا گیا ہے جس میں ابوالفضل، فیضی اور ابوالفتح کو بھی دکھایا گیا ہے۔

ان تصاویر کے علاوہ عہد مغلیہ سے قبل سلاطین دہلی کی تصاویر کی تین جلدیں بھی موجود

ہیں۔اپنی قدامت اور قیمت کے لحاظ سے بہت ہی قیمتی البم ہے،اس میں ہر تصویر کے ساتھ نام، عرف،قوم، ابنیت ، ولادت،سن جلوس،ایام سلطنت، وفات،محل جلوس، دارالحکومت اور مدفن بھی درج ہے۔(۱۹)

مولانا روم کا تصویر کا تذکرہ بھی ضروری ہے۔اس میں ان کا ایک شاگرد انہیں کتاب نسا رہا ہے۔یہ تصویر نیلے رنگ کی ہے۔

رضا لائبریری میں بالمیک رامائن کا ایک فارسی نسخہ رکھا ہوا ہے۔یہ نسخہ سمیر چند نے تیار کیا۔اس نے ۲۵۹ رنگین تصویریں ہیں۔یہ نسخہ فرخ سیر مغل بادشاہ کے دور میں تیار ہوا۔اس میں ۲۵۹ تصاویر کے مقابلے میں ۶۷۵ صفحات ہیں۔(۲۰) ڈاکٹر برنیئر کی نایاب تصویر بھی یہاں موجود ہے۔(۲۱) رضا لائبریری میں قلمی تصاویر کی تعداد ایک ہزار کے قریب ہے۔(۲۲)

فہرست ناظمانِ لائبریری:

۱۔ آغا محمد یوسف محوی افغانستان صاحب

۲۔ میاں رحیم شاہ مجدد صاحب

۳۔ بخشی عبدالرحیم خان صاحب

۴۔ منشی بانکے لال بہاری پھاٹک صاحب

۵۔ کوپر صاحب

۶۔ دیوان راج بہادر صاحب

۷۔ حافظ احمد علی خان شوق صاحب

۸۔ حکیم اجمل خان صاحب

۹۔ نجم الغنی خان رام پوری صاحب

۱۰۔ امتیاز علی خان عرشی صاحب

۱۱۔ ہیم راج سود صاحب

۱۲۔ اکبر علی خان عرشی زادہ صاحب[۲۳)

اس وقت رام پور رضا لائبریری کے افسر بکار خاص ڈاکٹر وقار الحسن صدیقی صاحب ہیں۔

رضا لائبریری کے دیگر افسران:

امیر احمد مینائی صاحب۔عبداللہ امرتسری صاحب،مولوی حفیظ اللہ صحاب،محمد طیب مکی صاحب،عبیداللہ بسمل صاحب،مولانا ظہور الحسن صاحب،مولوی فصیح الزمان صاحب،مولوی فضل

حق صاحب، مولوی مجاہد الحسن صاحب، مولوی محمد علی عرشی صاحب، حکیم محمد نبی صاحب، عظمت علی صاحب، مولوی عبدالواحد خان صاحب، شجاعت علی خان صاحب، سید محمد اسرائیل صاحب، مولوی عبدالحئی صاحب، مسٹر چپ مین صاحب، محمود حسین قیصر صاحب، عابد رضا بیدار صاحب، عتیق جیلانی سالک صاحب، سید بختیار الحق صاحب، معین الدین ندوی صاحب، اکرام علی خان صاحب، عبدالحکیم خان اور حکیم محمد حسین خان شفا صاحب کے نام قابل ذکر ہیں۔(۲۴)

رام پور کی علمی وادبی وراثت اور رضا لائبریری کے بارے میں
نامور ادیبوں وعلماء کے تاثرات

مولانا عبدالماجد دریابادی ۱۸۔دسمبر ۱۹۴۱ء کو تحریر کرتے ہیں:

''سچ کہا جس نے رام پور کو پہلی بار دارالسرور لکھا۔ سرور حسی کے نشان شہر کے چپہ چپہ پر سرور معنوی کا مرکز کتب خانہ مدتوں کوئی یہاں رہے، اور دل نہ اکتائے طبیعت اس سدا بہار گلشن سے روز ایک نیا لطف اٹھائے، کتب خانے ہندوستان میں اور بھی اچھے اچھے ہیں، لیکن یہ اپنے رنگ میں نرالا، اکثر سے افضل واعلیٰ............ع

''بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری''

آج پہلی بار نہیں، ۱۹۱۹ء سے لے کر اب تک متعدد بار اس سے استفادہ کیا اور ہر بار یہاں سے کچھ حاصل کر کے ہی گیا۔ مولانا رومی کے ملفوظات فیہ مافیہ کا قلمی نسخہ سب سے اوّل اس کتب خانے میں نظر سے گزرا، اور اسی کی نقل لے کر ہندوستان اور استنبول کے بعض نسخوں سے مقابلہ کر کے اس بے علم نے شائع کیا۔ پہلے بھی یہاں کے کارکن مولوی حافظ احمد علی خان مرحوم اور مہدی علی خان مرحوم وغیرہ بڑے مخلص اور مستعد کارگذار تھے اور اب تو انتظام فرشیوں کے ہاتھ سے نکل کر ایک ''عرشی'' کے ہاتھ میں آ گیا ہے۔ اب پوچھنا ہی کیا ہے۔''

''بہت بہتر ہوا اور کتب خانہ کی حیثیت افادی بہت زائد بڑھ جائے اگر یہاں کے نوادر وقتاً فوقتاً ایڈٹ ہو کر شائع بھی ہوتے رہیں۔ نوادر سے مراد صرف مخطوطات ہی نہیں عربی فارسی اور اردو کی پچاسوں قابل قدر کتابیں مطبوعہ ہونے کے باوجود بھی اب نوادر کے حکم میں داخل ہیں۔ ان کی ترتیب تہذیب تحشیہ طبع واشاعت کا بہترین انتظام رام پور ہی جیسی علم دوست ریاست اور علم وادب کی قدردان سرکار کر سکتی ہے۔ اس وقت اس عاجز کے فہم ناقص میں سہیل اندلسی متوفی ۵۸۱ھ کی ''التعریف والاعلام فی ماابنھم فی القران من الاسماء والاعلام'' تو ضرور اس قابل ہے کہ اس کے علاوہ اور بھی بہت سی کتابوں کا انتخاب ناظم صاحب ملک کے دوسرے اہل قلم و اہل ذوق سے مشورے سے کر سکتے ہیں۔ نفع جاری کی یہ بہترین شکل ہو سکتی۔ نفع عام بھی اور نفع تام

بھی ملک اور بیرون ملک کے ممتاز اور علمی وسائل بھی اگر کتب خانے کے کسی حصے میں میز پر لگے ہوئے ملیں تو محل نہ ہوں گے۔'' (۲۵)

۲۲/جنوری ۱۹۱۴ء کو مولانا حبیب الرحمٰن شیروانی (نواب صدر یار جنگ) نے تحریر فرمایا:

''حافظ احمد علی خان شوقؔ کی مہربانی سے میں نے یہ نادر کتب خانہ (جس کے دیکھنے کا عرصہ سے مشتاق تھا) دیکھا فرصت قلیل، ذخیرہ نایاب وکثیر کچھ نہ دیکھ سکا

داماںِ نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار
گلچیں جمال تو زداماںِ گلہ داذ''

تاہم جو کچھ دیکھ سکا اس کے ذوق سے روح وجدِ نشاط میں ہے میں تقریباً ۲۵ برس سے کتابوں کے جمع کرنے میں مصروف ہوں، اس لیے اس درد سے واقف ہوں، جو کتابوں کی ترتیب ونگہداشت سے تعلق رکھتا ہے۔ اس تجربے کی رو سے کہہ سکتا ہوں کہ حافظ صاحب ممدوح بے حد توجہ ومحبت سے اور شوق دلی سے خدمت کتاب خانہ فرما رہے ہیں۔ اگر میں سرکاری عالی حضور والی ریاست رام پور کا سپاس ادا نہ کروں تو موجب ناسپاسی ہوگا۔ اس لیے کہ حضور ممدوح کہ مراحم خسروانہ سے اس بے نظیر خزینۃ الکتب کے دیکھنے کا موقع ملا؛؛ (۲۶)

خواجہ حسن نظامی نے اپنے تاثرات کے اظہار اس طرح فرمایا:

''آج ۲۹۔ جولائی ۱۹۳۰ء دوپہر کے وقت کتب خانۂ ریاست رام پور کو سالہا سال کے اشتیاق کے بعد دیکھا۔ جس طرح برق فلک کو دیکھ کر رہ جاتے ہیں، اسی طرح تھوڑی فرصت میں مجھے اس تجلی خانۂ علوم کو دیکھنے کا موقع ملا کہ ہر چیز کو سرسری نظر سے دیکھ سکا۔''

شجاعت علی خان صاحب نائب مہتمم کتب خانہ بہت خلیق اور اپنے خاندان کے لحاظ سے ایک مجسم اور بولتی ہوئی کتاب ہیں، انہوں نے کتابوں کو دکھانے میں پوری مسافرنوازی ظاہر کی ہے۔

میرا خیال ہے کہ یہ کتاب خانۂ ہندوستان میں نہیں بلکہ موجودہ ایشیاء میں ایک نایاب اور بے مثل کتب خانہ ہے اور یقین ہے کہ موجودہ فرمانروائے رام پور ہز ہائنس نواب رضا علی خان بہادر اپنی علم دوستی سے اس کو یورپ کے نادر کتب خانوں کے مقابلے کا بنا دیں گے۔'' (۲۷)

''میں اس کتب خانہ سے بارہا متمتع ہوا ہوں۔ ہندوستان کے کتب خانوں میں اس سے بہتر کیا، اس کے برابر بھی کوئی کتب خانۂ نہیں۔ میں نے روم کے کتب خانے بھی دیکھے ہیں، لیکن کسی کتب خانے کو مجموعی حیثیت سے میں نے اس سے افضل تر نہیں دیکھا۔

اہلکاران کتب خانہ کی محنت اور وسعت اطلاع کی داد دینی چاہیے۔خصوصاً مہدی علی خان تو خود ایک زندہ کتب خانہ ہیں۔''(۲۸)

حوالہ جات

۱۔ رضاء لائبریری جنرل i ۱۹۸۹ء، ص ۲۵۲۔۲۵۱

۲۔ ایضاً، ص ۲۵۵۔۲۵۲

۳۔ رضا لائبریری کی علمی وراثت، ص ۱۸

۴۔ ایضاً، ص ۵۶۔۵۵

۵۔ ایضاً، ص، ۵۸۔۵۶، رضاء لائبریری جنرل i ۱۹۸۹ء، ۲۵۹۔۲۵۶

۶۔ رضا لائبریری کی علمی وراثت، ص ۵۸،، رضاء لائبریری جنرل y i ۱۹۸۹ء، ص ۲۶۰

۷۔ رضا لائبریری کی علمی وراثت، ص ۱۱۰۔۱۰۷

۸۔ رضا لائبریری کی علمی وراثت، ص ۱۱۶۔۱۱۱

۹۔ رضاء لائبریری جنرل i ۱۹۸۹ء، ص ۲۵۸

۱۰۔ رضا لائبریری کی علمی وراثت، ص ۷۲،۷۱

۱۱۔ ایضاً، ص ۵۹

۱۲۔ ایضاً، ص ۵۹

۱۳۔ ایضاً، ص ۵۹

۱۴۔ ایضاً، ص ۵۹

۱۵۔ ایضاً، ص ۵۹

۱۶۔ ایضاً، ص ۱۲

۱۷۔ ایضاً، ص ۵۹۔۶۰

۱۸۔ ایضاً، ص ۵۸

۱۹۔ ایضاً، ص ۹۰۔۸۷

۲۰۔ ایضاً، ص ۱۰۵۔۱۰۱

۲۱۔ ایضاً، ص ۵۸

۲۲۔ ایضاً، ص ۵۹

۲۳۔ ایضاً، ص ۵۸ تا ۵۳، رضا لائبریری جرنل i، ص ۲۵۱ تا ۲۶۰

۲۴۔ رضا لائبریری جرنل i، ص ۲۶۱

۲۵۔ ایضاً، ص ۵۴

۲۶۔ ایضاً، ص ۱۳۲

۲۷۔ ایضاً، ص ۲۰۷

۲۸۔ ایضاً، ص ۲۴۸

(یہ آرٹیکل سعود الحسن خان روہیلہ کی کتاب ''رام پور تاریخ و ادب'' سے لیا گیا ہے جو ابلاغ پبلشرز لاہور سے ۲۰۰۳ میں شائع ہوئی۔ ''ادارہ نقاط'')

خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری: پس منظر و پیش منظر

حبیب الرحمٰن چغتائی

گنگا کے جنوب میں اشوک راج پتھ پر ایک عالیشان اور پر شکوہ عمارت ایستادہ ہے جس کا چاروانگ عالم میں اتنا چرچا ہے کہ ہر سمت سے تشنگان علم اور جویائے فن اس کا رخ کرتے ہیں اور سیراب ہوکر جاتے ہیں۔ یہ بہار خاص کر عظیم آباد کا نشان امتیاز اور ہندوستان کے لیے وجہ افتخار ہے۔ یہ علمی سر چشمہ عرف عام میں خدابخش لائبریری کے نام سے موسوم ہے۔

خدابخش لائبریری مولوی محمد بخش کے ذاتی ذخیرے سے وجود میں آئی تھی۔ ان کا تعلق صوبہ بہار کے ضلع چھپرہ کے موضع اوکھی کے ایک علمی خانوادے سے تھا۔ انہیں کتابوں سے عشق تھا۔ وہ عربی، فارسی کے نادر مخطوطات اور اہم مطبوعات جمع کرتے رہے۔ مخصوص لوگوں نے محدود پیمانے پر ان سے استفادہ بھی کیا۔ ان کی خواہش تھی کہ اہل عظیم آباد کے لیے ایک لائبریری قائم کی جائے تاکہ عام فائدے کی صورت پیدا ہو۔ ابھی وہ اپنی خواہش کو عملی شکل بھی نہ دے پائے تھے کہ ۱۸۷۶ء میں بستر مرگ پر جا پہنچے۔ مرتے دم انہوں نے اپنے بیٹے خدابخش سے کہا کہ جب بھی ممکن ہو پٹنہ کے عوام کے لیے ایک کتاب خانہ قائم کروا اور اپنی زندگی کی کل متاع جو چودہ سو عربی اور فارسی مخطوطات و مطبوعات پر مشتمل تھی ان کے حوالے کی۔ لائق بیٹے نے باپ کے اس خواب کو اپنا مقصد حیات بنالیا۔

خدابخش خاں (جن کا حقیقی نام بوعلی خاں تھا) ۲؍اگست ۱۸۴۲ء میں موضع اوکھی ضلع چھپرہ میں پیدا ہوئے۔ ابھی وہ دو سال کے تھے کہ ان کے والد بانکی پور میں سکونت پذیر ہوئے۔ ان کی ابتدائی تعلیم حسب دستور گھر پر ہی ہوئی۔ وہ اپنے باپ کے سایۂ عاطفت میں جوان ہوئے۔ اس طرح پدری اقدار عالیہ ان میں منتقل ہوئیں۔ ابھی وہ پٹنہ ہی میں زیر تعلیم تھے کہ غدر کے ہنگاموں کی وجہ سے ان کا اسکول بند ہوگیا اور انہیں کلکتہ کا رخ کرنا پڑا۔ ۱۸۱ء میں وہاں سے ہائی اسکول پاس کیا۔ پٹنہ واپسی پر قانون کی تعلیم حاصل کرنا شروع کی۔ والد کی علالت کی وجہ سے تعلیم کے ساتھ ساتھ ضلع جج کے یہاں پیشکار کی حیثیت سے ملازمت کرنا پڑی۔ رفتہ رفتہ ان کی صلاحیتیں ظاہر ہونے لگیں۔ مختلف تعلیمی اور فلاحی اداروں سے وابستہ ہوئے۔ قانون کی ڈگری لی اور ۱۸۸۰ء

میں پٹنہ میں سرکاری وکیل مقرر ہوئے۔ ان کی خدمات کے پیش نظر ایک سال بعد ہی ۱۸۸۱ء میں انہیں خان بہادر کے لقب سے نوازا گیا۔ تین سال کے لیے ۱۸۹۵ء سے ۱۸۹۸ء تک نظام ہائی کورٹ حیدرآباد میں انہوں نے بحیثیت چیف جسٹس خدمات انجام دیں۔ ۱۹۰۳ء میں انہیں CIE کے اعزاز سے بھی سرفراز کیا گیا۔

مولوی محمد بخش کی بیاض سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا تعلق پانچویں پشت میں جا کر قاضی ہبت اللہ سے مل جاتا ہے۔ مگر کون قاضی ہبت اللہ اس کی وضاحت نہیں کی گئی ہے۔ مشہور مورخ سر جادو ناتھ سرکار کا کہنا ہے کہ یہ قاضی ہبت اللہ وہی تھے جنہوں نے فتاویٰ عالمگیری کی تدوین میں ہاتھ بٹایا تھا۔ مگر خدا بخش کے بیٹے صلاح الدین خدا بخش لکھتے ہیں کہ اس کی کوئی سند نہیں ملتی۔ خدا بخش بھی اس روایت کو لائق اعتنا نہیں سمجھتے تھے۔ وہ خاندانی وقار و مرتبے سے زیادہ شخصی اوصاف میں یقین رکھتے تھے۔ جو لوگ اسلاف کے معرکوں میں سرمست و سرشار رہتے ہیں وہ خود زندگی میں مشکل ہی سے کوئی کارنامہ انجام دے پاتے ہیں۔ بہر حال یہ ایک حقیقت ہے کہ ان کا تعلق ذی عزت اور تعلیمی خانوادے سے تھا۔ مولوی محمد بخش خود ایک عالم تھے۔ پیشہ ان کا وکالت تھا جس میں ان کو اچھی شہرت حاصل تھی۔

والد کی طرح خدا بخش خاں کا پیشہ بھی وکالت تھا جس میں انہوں نے خوب نام کمایا اور دولت بھی خوب کمائی۔ حالات سازگار تھے اور والد کی وصیت بھی یاد تھی۔ وہ اس کو پورا کرنے میں ہمہ تن مصروف ہو گئے۔ کتابیں جمع کرنے کا شوق تھا وہ اس کے لیے کچھ بھی کر سکتے تھے۔ انہوں نے محمد تقی نام کے ایک عرب کتاب جو کی خدمات حاصل کیں جو اٹھارہ سال تک پچاس روپے ماہوار پر ان کے لیے کام کرتا رہا۔ اس نے بلاد اسلامیہ عرب، شام، دمشق، مصر اور ایران سے مخطوطات جمع کر ان کے سامنے ڈھیر کر دیے۔ خود ملک کے طول و عرض سے کتابیں ان کے پاس کھینچ کھینچ کر آنے لگیں۔ وہ ایک ایسے خریدار کی حیثیت سے ابھرے کہ جو کتاب کے منہ بولے داموں کے علاوہ کتب فروش کو آمد و رفت کا کرایہ بھی دیتا تھا۔ ۱۸۵۷ء کے غدر بلکہ پہلی جنگ آزادی میں جب شاہان دہلی اور نوابان اودھ کے کتاب خانے تباہ و برباد ہونے لگے تو نواب رامپور نے تیزی سے کتابیں جمع کرنا شروع کر دیں۔ انہوں نے انگریزوں کا ساتھ دیا تھا اس لیے فاتح سپاہیوں سے فی مخطوطہ ایک روپے کے حساب سے خریدنے لگے۔ اس کے باوجود بہت سے مخطوطات بیرون ملک چلے گئے۔ خدا بخش نے کتب اندوزی بہت بعد میں شروع کی تھی اور مقابلہ تھا نواب رامپور سے جہاں دولت و ثروت ہمرکاب تھی۔ خدا بخش کو بہت جدو جہد کرنا پڑی۔ اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا۔ انجام کار کامیابی انہیں کو نصیب ہوئی۔ مخطوطہ فروش سب سے پہلے انہیں کی

خدمت میں حاضر ہوتے۔ اگر وہ مخطوطات نہیں خریدتے تو بھی آمدورفت کا کرایہ ادا کرتے تھے۔ کتابیں جمع کرنے کے ساتھ ان کو رکھنے کے لیے ایک دو منزلہ عمارت کی داغ بیل بھی ڈال دی۔ یہ عمارت جس کی تعمیل خدا بخش نے بے دریغ روپیہ صرف کیا ۱۸۸۸ء میں ۸۰ ہزار روپے کی لاگت سے تیار ہوگئی۔ ساری کتابیں قرینے سے الماریوں میں سجا دی گئیں۔ جب ان کے پاس عربی، فارسی اور اردو کے چار ہزار مخطوطات اور تقریباً ڈھائی ہزار انگریزی عربی، فارسی اور اردو کی اہم مطبوعات جمع ہوگئیں تو ۱۸۹۱ء میں اس کے دروازے عوام کے لیے کھول دیے گئے۔ اس کا افتتاح لیفٹیننٹ گورنر چارلس ایلیٹ نے کیا۔ اسے باقاعدہ عوام کے لیے وقف کر دیا اور حکومت بنگالہ کو اس کا متولی بنایا۔ اس کا نام وقف نامے کے مطابق اورینٹل پبلک لائبریری رکھا اور حکومت بنگالہ سے پچاس روپے ماہوار ہمیشہ کے لیے بغرض مصارف مقرر ہوئے۔ یہ کتاب خانہ جس کی ابتداء مولوی محمد بخش کے نجی ذخیرے سے ہوئی جس کے باقاعدہ قیام، توسیع و ترقی کے لیے خدا بخش نے اپنا مال وزر حتیٰ کہ اپنی زندگی بھی وقف کر دی عوام کو یہ بات پسند نہ آئی کہ اس کا نام صرف اورینٹل پبلک لائبریری رہے۔ انہوں نے اس عظیم شخص کی بے لوثی، فیاضی اور خدمت خلق کے اعتراف میں ان کے نام کو بطور سابقہ شامل کر دیا۔ اس طرح اس کا نام خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری قرار پایا۔ مگر یہ ادارہ زبان زد ہوا خدا بخش لائبریری کے نام سے۔ اکثر حوالوں میں صرف خدا بخش ہی لکھا گیا اور لفظ لائبریری بھی محذوف کر دیا گیا۔ خدا بخش کی شخصیت اس طرح لائبریری میں مدغم ہوئی کہ وہ خود لائبریری کی علامت بن کر رہ گئی۔ ابتداً یہ لائبریری گرچہ پٹنہ کے عوام کے لیے قائم کی گئی مگر علم کا یہ سرچشمہ جب جاری ہوا تو ساری سرحدیں معدوم ہوگئیں۔ ہر کوئی بقدر ہمت اوست عالمگیر سطح پر سیراب ہوتا رہا۔

خدا بخش نے خلوص نیت سے اس لائبریری کی بنیاد رکھی تھی۔ ان کا یہ جذبہ اخلاص و فلاح ہی تھا جو لائبریری کے تحفظ کا ضامن ہوا۔ ایک مرتبہ کسی جلد ساز نے نقب لگا کر چند قیمتی مخطوطات چوری کر لیے اور انہیں لاہور میں ایک کتب فروش کو فروخت کر دیا۔ خدا بخش مخطوطات کی دنیا میں بہت مشہور ہو چکے تھے اس نے وہ مخطوطات ان کی خدمت میں پیش کر دیے۔ انہوں نے اپنے ہی مخطوطات کو دوبارہ خرید لیا البتہ چور کو سزائے واجبی دی گئی۔

جب وہ حیدرآباد میں چیف جسٹس تھے تو ایک دن ہائی کورٹ سے واپسی پر ان کی نگاہ ایک دوکان پر پڑی جہاں کچھ پرانی کتابیں ڈھیر تھیں۔ انہیں اس ڈھیر میں کچھ کام کی چیزیں نظر آئیں اس لیے قیمت معلوم کی۔ دوکاندار نے کہا کہ اگر کوئی خریدتا تو وہ اس ردی کے تین روپے مانگتا مگر جب حضور لینا چاہتے ہیں تو یقیناً کوئی خاص بات ہے لہذا اس کی قیمت بیس روپے ہوگی۔

انہوں نے قیمت ادا کر دی۔ بعد میں نظام حیدر آباد نے انہیں کتابوں کے لیے چار سو روپے کی پیشکش کی مگر لاحاصل وہ تو فروخت ہو چکی تھیں۔

جب قسمت مہربان ہوتی ہے تو ناقابل یقین باتیں بھی ظہور پذیر ہو جاتی ہیں۔ پٹنہ کے صوبائی جج جے بی ایلیٹ (جو مخطوطات کے جامع اور بوڈلین لائبریری کے معطی تھے) نے خدا بخش سے قصائد کمال الدین اصفہانی کا نسخہ مستعار لیا۔ نیت میں فتور آ گیا اور واپس کرنے سے انکار کر دیا۔ قیمتاً ایک بڑی رقم کی پیشکش کی۔ انہیں بہت ناگوار ہوا۔ کیا کرتے صبر کر کے بیٹھ گئے۔ پٹنہ سے سبکدوش ہونے پر جب ایلیٹ نے رخت سفر باندھا تو ایک صندوق میں اہم اور پسندیدہ مخطوطات رکھے اور لندن بھیجنے کا حکم صادر فرمایا۔ دوسرے صندوق میں بیکار قسم کی کتابیں بھر دیں اور نیلام کرنے کے لیے یہیں چھوڑ دیا۔ لندن جا کر یہ عقدہ کھلا کہ اہم مخطوطات کا صندوق پٹنہ میں ہی رہ گیا اور مسترد کتابیں وہاں پہنچ گئیں۔ بس سر پیٹ کر رہ گئے۔ خوبی قسمت کہ خدا بخش کو قصائد کمال الدین اصفہانی کے علاوہ دیگر مخطوطات بھی مل گئے۔ ان میں مجالس خسمہ کا وہ نسخہ بھی شامل تھا جس پر شاہجہان کے دستخط ہیں۔

خدا بخش لائبریری کا پہلا دور اس کے بانی کی زندگی کے ساتھ ختم ہو گیا۔ خدا بخش کا انتقال ۳/ اگست ۱۹۰۸ء میں ہوا۔ وصیت کے مطابق ان کی تدفین لائبریری کے احاطے میں ہی ہوئی۔ انہوں نے بہت کمایا مگر سب لائبریری پر صرف کر دیا۔ بالکل تہی دست ہو گئے۔ جب بیمار ہوئے تو علاج کے لیے قرض لینا پڑا۔ حکومت کی امداد سے یہ آٹھ ہزار روپے کا قرض ادا ہوا۔ وہ لائبریری کے پہلے سیکریٹری مقرر ہوئے جنہیں ماہانہ دو سو روپے ادا کیے جاتے تھے۔ جب صحت جواب دینے لگی تو لائبریری سے سبکدوش ہو گئے اور اپنی توجہ پڑھنے اور لکھنے پر مرکوز کر دی۔ انہوں نے چند مضامین اور کتابچوں کے علاوہ عربی فارسی مخطوطات کی ایک توضیحی فہرست بھی تیار کی تھیں۔

یہ اس لائبریری کی خوش نصیبی ہے کہ قیام کے دس بارہ سال بعد ہی قلمی کتابوں کی فہرست سازی شروع ہو گئی۔ لارڈ کرزن جو اس وقت ہندوستان کے وائسرائے تھے ۱۹۰۳ء میں پٹنہ تشریف لائے۔ لائبریری کے کلکشن کو دیکھ کر بہت متاثر ہوئے۔ خواہش ہوئی کہ اس خزانے کی اطلاع یورپ میں بھی پہنچنا چاہیے۔ چنانچہ عربی کے ایک عالم اور مشہور مستشرق سر ایڈورڈ ڈینسن روس کو جو کلکتہ میں مقیم تھے حکم دیا کہ وہ اپنی نگرانی میں مخطوطات کی توضیحی فہرستیں تیار کرائیں۔ ۱۹۰۸ء میں توضیحی فہرست کی پہلی جلد شائع ہوئی۔ مخطوطات کے لیے Descriptive Catalougu کی جو اہمیت ہوتی ہے وہ کسی سے مخفی نہیں۔ توضیحی فہرست کی یہ اشاعت اس اعتبار سے لائبریری کی تاریخ میں ایک سنگ میل کا درجہ رکھتی ہے اور اس کا سہرا لارڈ کرزن کے سر ہے۔

لہذا ۱۹۰۵ء میں جب ایک ریڈنگ ہال تعمیر ہوا تو اسے لارڈ کرزن کے نام سے منسوب کر دیا۔

لائبریری کے آغاز سے ہی یعنی جب محمد بخش نے اس کی بنیاد اپنے نجی ذخیرے سے رکھی مشاہیر کے آنے کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ جو بھی یہاں آیا وہ خدا بخش خاں کے کارنامے سے متاثر ہو گیا۔ لارڈ لٹن، لارڈ منٹو، علامہ شبلی نعمانی، سر ظفر اللہ، لارڈ ریڈنگ، جون سمن، لارڈ ڈارون، جی سی بوس، گاندھی جی، نواب حبیب الرحمٰن خان شیروانی، راجہ محمود آباد، سی وی رمن اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن وغیرہ نے نابغہ روزگار بانی کتاب خانہ خدا بخش خاں کو ہدیۂ تبریک پیش کیا اور نادر و نایاب ذخیرے کی ستائش کی۔

پنڈت جواہر لال نہرو جمہوریہ ہند کے پہلے وزیر اعظم ۱۹۵۳ء میں لائبریری آئے۔ انہوں نے اپنے تاثرات کا اظہار یوں کیا ''فن کے ان حسین شہ پاروں کو دیکھ عجیب سرخوشی کا احساس ہوا۔ انہوں نے ہندوستان کی تاریخ کے ایک دور کو جاوداں کر دیا۔ ان پر خصوصی توجہ دینا چاہیے۔ میں تو یہ چاہوں گا کہ انہیں جدید تکنیک کے ذریعے دوسروں تک پہنچانا چاہیے تاکہ وہ بھی انہیں دیکھیں اور ہماری خوشی میں شریک ہو سکیں۔'' لائبریری نے عکسی نقل فراہم کرنے کی ضرورت کو محسوس کیا اور ۱۹۵۴ء میں ایک چھوٹا سا مائیکروفلمنگ سیکشن قائم کیا۔ یہ ان لوگوں کو یہاں کے مخطوطات کی مائیکروفلم فراہم کرتا ہے جو اپنے تحقیقی کام کے لیے لائبریری نہیں آ سکتے ہیں۔

لائبریری کی تاریخ نے ۱۶؍اکتوبر ۱۹۶۲ء کو ایک نیا موڑ لیا جب گیارہ رکنی اعلیٰ اختیاری بورڈ نے انتظامی کمیٹی کی جگہ لی۔ اس بورڈ کا چیئرمین بہار کا گورنر ہوا۔ مرکزی حکومت نے جدید خطوط پر اس کے انتظام، تنظیم نو اور توسیع کے مصارف کی کفالت کی آمادگی اس شرط پر ظاہر کی کہ ریاستی حکومت بھی پچاس ہزار روپے سالانہ اس مد میں فراہم کرے۔ یوں لائبریری کے لیے ترقی کی ایک راہ کھل گئی۔

اس مشرقی کتاب خانے کی قسمت اس وقت جاگی جب دسمبر ۱۹۶۹ء کو حکومت ہند نے پارلیمانی ایکٹ کے ذریعے اسے قومی اہمیت کے ادارے کا مرتبہ عطا کیا اور اس کے مصارف کی تمام تر ذمے داری قبول کی۔ اب یہ لائبریری Ministry of Culture, Youth Affairs and Sports کے تحت ایک خود مختار ادارے کی حیثیت سے کام کرتی ہے۔ احسان ناشناسی ہوگی اگر ہم اپنے مربی ڈاکٹر ذاکر حسین کی خدمات کا اعتراف نہ کریں جن کی کوشش کے نتیجے میں اس لائبریری کو قومی ادارہ تسلیم کیا گیا۔ لائبریری بورڈ بارہ ارکان پر مشتمل ہے۔ اب اس کا بجٹ تقریباً ڈیڑھ کروڑ روپیہ سالانہ ہے۔ حکومت بہار بھی پچاس ہزار روپے سالانا بطور امداد دیتی ہے۔

اس کی پیشانی پرایک اورستارہ ۱۹۹۸ء میں چمکا جب کمپیوٹرسنٹر کا قیام عمل میں آیا۔ای میل اورانٹرنیٹ کی سہولتیں فراہم ہوئیں۔اردو، فارسی وارعربی کے کتاب خانوں میں یہ سرفہرست آ تاہیجہاں جدید آلات کی تنصیب ہوچکی ہے۔ایک لائق اور تجربہ کارانچارج کا تقرر ہو چکا ہے جو لائبریری کی جدید کاری میں مصروف ہے۔گزشتہ تین سالہ تاریخ کی حسن کارکردگی، قارئین کومزید سہولتیں، رو پروگرافی کی بہتر خدمات اور کرزن ریڈنگ روم میں اضافہ وقات کی شاہد ہے۔

لائبریری ذخائر وخدمات

اذن برا کے ایک مستشرق وی سی اسکاٹ اوکونر کا قول ہے کہ ''پٹنہ اورینٹل پبلک لائبریری دنیا میں مسلم ادب پر بہترین ذخائر میں سے ایک ہے۔'' خدا بخش نے سالہا سال کی جدوجہد کے بعد بھاری قیمتیں ادا کر کے نادرونایاب مخطوطات ومطبوعات جمع کیں جن کی شہرت ساری سرحدیں پار کرگئی۔ برٹش میوزیم نے ایک مرتبہ خدابخش کوان کے کلیکشن کے عوض ایک غیر معمولی رقم کی پیشکش کی۔خدابخش نے اوکونر کو یہ واقعہ بیان کرتے ہوئے کہا'' میں ایک غریب آدمی ہوں اورانھوں نے جس رقم کی پیشکش کی وہ تو صرف شہزادوں کی قسمت ہوتی ہے۔کیا میں اس سے کبھی پیسہ کی خاطر جدا ہوسکا ہوں! ارے بھئی میرے باپ اور میں نے تو اس کے لیے اپنی زندگی وقف کردی۔نہیں یہ بکاؤنہیں ہے۔ یہ کلکشن پٹنہ کے لیے ہے اور یہ تحفہ پٹنہ کے عوام کے قدموں پر نچھاور ہوگا۔''

اسلامی علوم، طب یونانی، تذکرے،تصوف، تقابل ادیان،عہد وسطیٰ کی تاریخ،جنوبی مشرقی ایشیائی تاریخ،مغربی ایشیائی تاریخ،قرون وسطیٰ کے سائنسی علوم،تحریک آزادی اورقومی یکجہتی کا ادب، اردو، فارسی اورعربی ادبیات وہ موضوعات ہیں جواس کے دائرہ اختصاص میں آتے ہیں۔

اس کا خطی ذخیرہ اکیس ہزار سے اوپر ہے جبکہ مطبوعات تقریباً دو لاکھ ہیں۔مزید برآں مجلد رسائل تقریباً ساڑھے سینتیس ہزار ہیں۔شہنشاہ اکبر،تغلق،شاہجہان اورشاہ عالم کے دور کے آٹھ سو سکے بھی یہاں موجود ہیں۔ان کے علاوہ مائیکروفلمز، مائیکروفش، ویڈیواورآڈیوکیسٹس خاصی تعداد میں ہیں۔ یہاں کئی نادراصطرلاب بھی محفوظ ہیں۔۱۹۶۵ء میں مخطوطات ۷۸۴۸اور مطبوعہ کتابیں ۱۱۴۱۱تھیں جبکہ مارچ ۱۹۹۹ءتک قلمی ذخیرے کی تعداد ۲۱۱۰۱اورمطبوعات ۱۹۵۵۳۸ تھیں۔۳۴سال کے عرصے میں کتابوں کی تعداد میں ایک غیرمعمولی اضافہ ہوا ہے۔

لائبریری کا قلمی ذخیرہ ہی اس کا امتیاز ہے۔بعض مخطوطات تو یہاں ایسے نادرونایاب ہیں کہ دنیا میں کہیں اورنہیں ملتے۔شاہوں اورنوابوں کے اہم مخطوطات اس لائبریری میں موجود

ہیں۔عہد وسطیٰ کے بعض وہ مخطوطات جن پر بادشاہوں کے دستخط اور مہریں ثبت ہیں یہاں کی زینت ہیں۔اکبری دور کے دل کش فن پارے اور خطاطی کے حسین نمونے، ایرانی، کشمیری اور راجستھانی دبستان فن کی تصویریں دیکھ کر بے ساختہ واہ نکلتی ہے۔کہاں تک ان کا ذکر ہو۔دفتر کے دفتر سیاہ ہو جائیں گے مگر ان کا قصہ تمام نہ ہوگا۔چند نوادر کا مختصر تعارف پیش کیا جاتا ہے۔

۱۔ یہاں قرآن شریف کے بعض بہت ہی نایاب نسخے ہیں۔خلافت عباسیہ کا ایک بے حد مشہور خطاط یاقوت مستعصمی کے ہاتھ کا لکھا ہوا نہایت ہی خوبصورت قرآن شریف کا نسخہ جس پر اس کے دستخط ہیں وار ۶۶۸ھ درج ہے۔یہ خطاطی کا بہترین نمونہ ہے۔

۲۔ قرآن شریف کا بہت بڑی تقطیع پر لکھا ہوا نہایت ہی مرصع اور مطلا نسخہ۔شروع کے دو صفحات بے حد مزین ہیں۔بین السطور فارسی میں ترجمہ خط نستعلیق میں ہے۔

۳۔ قرآن شریف کا ایک اور قدیم نسخہ جو خط کوفی میں ہے۔جگہ جگہ سے حروف اڑ گئے ہیں۔اس میں اعراف نہیں ہیں۔اس کے علاوہ خط کوفی میں سورۂ ابراہیم کی صرف تین آیتیں ہرن کی کھال پر لکھی ہوئی ہیں اور فریم کی ہوئی ہیں۔قرائن سے معلوم ہوتا ہے یہ دونوں صحابہ کے زمانہ کے لکھے ہوئے ہیں۔

۴۔ ایک قدیم ترین نسخہ ''الرسالۃ القشیر یہ'' ہے جس کی کتابت مصنف کی زندگی میں ہوئی۔اس پر ۴۳۸ھ درج ہے۔فارسی میں بہت نایاب نسخے یہیں محفوظ ہیں۔

۵۔ ''تاریخ خاندان تیموریہ'' نستعلیق میں لکھا ہوا دنیا کا واحد نسخہ ہے۔یہ تیمور سے اکبر کے بائیسویں سال جلوس تک کی تاریخ ہے۔اکبر کے دربار کے مشہور مصوروں کی بنائی ہوئی ایک سو بتیس تصویریں اس میں شامل ہیں۔مصوری کا ایک بے مثال نمونہ۔ہر تصویر کے نیچے تصویر بنانے والے اور رنگ بھرنے والے کا نام درج ہے۔

۶۔ ''بادشاہ نامہ'' دو جلدوں میں ہے۔یہ شاہجہان کی مکمل تاریخ ہے۔چوبیس انتہائی خوبصورت تصویروں پر مشتمل ہے۔مصوری کا انمول نمونہ ہے۔اس میں چند عمارتیں بھی شامل ہیں۔آخری تصویر میں شاہجہان کا جنازہ تاج محل جاتا دکھایا گیا ہے۔جارج پنجم اور ان کی ملکہ ۱۹۱۱ء میں جب دہلی دربار میں آئے تو ان کے ملاحظہ کے لیے پیش کیا گیا اور ان دونوں نے اس پر دستخط کیے۔

۷۔ ''شہنشاہ نامہ'' فاتح قسطنطنیہ سلطان محمد ثانی کی تاریخ ہے۔شاہجہان کے زمانے میں یہ نسخہ ہندوستان پہنچا۔اس پر مغل بادشاہوں اور شہزادوں کے اتنے دستخط ہیں کہ یہ صفحہ بھر گیا ہے۔اس پر شاہجہان کی بیٹی جہاں آراء بیگم کے بھی دستخط ہیں جو کسی اور نسخے پر نہیں ملتے۔

۸۔ محمود غزنوی کی مدح میں فردوسی کے شاہنامہ کا بہت ہی خوبصورت مصور قلمی نسخہ۔کابل وکشمیر کے گورنر علی مراد خاں نے شاہجہان کے حضور اسے بطور تحفہ پیش کیا تھا۔

۹۔ جامی کی مشہور کتب ''یوسف وزلیخا'' جسے عبدالرحیم خاں خاناں نے بیس ہزار روپے خرچ کر کے جہانگیر کے لیے تیار کرائی تھی۔

۱۰۔ جامی کی کتاب ''سلسلۃ الذہب'' خود مصنف کے ہاتھ کی لکھی ہوئی موجود ہے۔اس میں ان کے بیٹے کی ولادت کی تاریخ درج ہے۔

۱۱۔ ''دیوان حافظ'' جو خاندان مغلیہ میں فال نکالنے کے لیے استعمال ہوتا تھا۔اس پر ہمایوں اور جہانگیر کی تحریر اور دستخط ہیں۔

۱۲۔ ''سفینۃ الاولیا'' داراشکوہ کی اپنی تصنیف ان کے اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے۔

۱۳۔ جہانگیر کا ''جہانگیر نامہ'' نایاب کتاب ہے جسے انہوں نے اپنے دربار کے سب سے بڑے کاتب سے لکھوایا اور گولکنڈہ کے بادشاہ قطب شاہ کو تحفتاً دیا تھا۔اورنگ زیب کے زمانے میں جب گولکنڈہ فتح ہوا تو ان کے بیٹے سلطان محمد کے قبضے میں یہ کتاب آئی۔اس کے پہلے صفحے پر سلطان محمد کے دستخط ہیں۔

۱۴۔ الزہراوی کی ''کتاب التصریف'' ۱۱۹۰ء میں لکھی گئی۔یہ عمل جراحت پر مصور نسخہ ہے۔ اس میں جراحت کے جو آلات دکھائے گئے ہیں وہ آج بھی استعمال کیے جاتے ہیں۔

۱۵۔ مصحفی کے آٹھوں دواوین کا واحد نسخہ صرف خدا بخش لائبریری میں دستیاب ہے۔

شری مد بھگوت گیتا، پران اور مہا بھارت کے فارسی تراجم محفوظ ہیں۔پالی اور سنسکرت میں کئی سوتاڑ پتر موجود ہیں۔ان کے علاوہ کثیر تعداد میں مشاہیر کے خطوط بھی محفوظ ہیں۔مثلاً علامہ اقبال، ڈاکٹر راجندر پرساد، مولانا ابوالکلام آزاد، اکبرالہ آبادی، محمد علی جوہر، ڈاکٹر ذاکر حسین اور جوش ملیح آبادی کے خطوط اردو زبان میں دستیاب ہیں۔

مطبوعہ ذخیرہ بھی کچھ کم اہم نہیں ہے۔انیسویں صدی کے ربع ثالث کے بعض اردو کے پرچے اور اخبار موجود ہیں۔اردو، انگریزی، عربی اور فارسی میں تذکرے سینکڑوں کی تعداد میں محفوظ ہیں۔قرآنیات، حدیث وفقہ پر بڑی تعداد میں کتابیں لائبریری کی زینت میں اضافہ کر رہی ہیں۔

خدا بخش ایک سچے اور پکے مسلمان تھے اور ان کے تعلقات اہل ہنود سے بے حد خوشگوار تھے۔وہ کہا کرتے تھے کہ ان کے جسم میں ایک پنڈتانی کا خون دوڑ رہا ہے۔واقعہ یوں ہے کہ ان کے والد محمد بخش کی رضائی ماں ایک برہمن خاتون تھیں ان کے احترام میں انہوں نے اور خدا بخش نے کبھی گائے کے گوشت کو ہاتھ نہیں لگایا۔یہی سبب ہے کہ ذخائر میں ہندوستانی مذاہب اور

قومی ہم آہنگی پر معتد بہ ادب دستیاب ہے۔

بعض انگریزی زبان میں بھی نادر کتابیں موجود ہیں۔۱۸۱۴ء کی لارڈ بائرن کی Ode to Nepolean محفوظ ہے جس میں شاعر کے اپنے خط میں دو بند شامل ہیں۔ Memories of Napolean Buoneparte ملتا ہے جس پر نپولین کے دستخط اور ان کے سیکریٹری کی مہر ثبت ہے۔ یہ نسخہ کبھی نپولین ثالث کی شاہی لائبریری کی ملک تھا۔

خدا بخش کی زندگی میں ہی بعض رؤسا نے اپنے ذاتی ذخیروں کو حفاظت کی غرض سے اورینٹل پبلک لائبریری کو ہدیہ کر دیا تھا۔ عطایا کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کے توسط سے لائبریری کو دسنہ کلکشن حاصل ہوا۔ اس میں مطبوعات کے علاوہ مخطوطات بھی شامل ہیں۔ اس کے علاوہ بھی بہت سے کلکشن ملے ہیں جن کا ذکر ممکن نہیں۔ ان میں سے چند یہ ہیں: ادارۂ تحقیقات اردو (قاضی عبدالودود) سر فخر الدین کلکشن، اختر اورینوی کلکشن، پروفیسر کلیم الدین احمد کلکشن، یونس سلمی کلکشن، سہسرام کلکشن اور ڈاکٹر اخلاق الرحمٰن قدوائی کلکشن وغیرہ۔

جس رفتار سے کتابوں اور مخطوطات میں اضافہ ہوا اس مناسبت سے ملازمین کی تعداد نہیں بڑھی۔ اس وقت لائبریری میں ساٹھ آسامیاں ہیں جن کو مختلف خدمات انجام دینا پڑتی ہیں۔

ایک اچھی لائبریری کی پہچان اس کے ذخائر اور خدمات سے ہوتی ہے۔ دانشور اور قارئین ہمیشہ اس لائبریری کے مشتملات کی تعریف کرتے رہے ہیں اور اس کی بھرپور خدمات کے بھی معترف رہے ہیں۔ ریپروگرافی کی خدمات کو بہتر بنایا گیا ہے۔ محققین اکثر مخطوطات کی زیروکس کاپی کا مطالبہ کرتے رہے ہین۔ ماضی میں ان کا یہ مطالبہ پورا بھی کیا گیا ہے۔ لیکن اب زیروکس کاپی کے لیے معذرت کر لی جاتی ہے۔ دراصل مخطوطات کی زیروکسنگ سے بہت نقصان پہنچتا ہے۔ کاغذ، رنگ و روشنائی بری طرح متاثر ہوتی ہے۔ لیکن تحقیق کرنے والوں کی اس جائز ضرورت کو پورا کرنا بھی لازم تھا۔ لہٰذا لائبریری نے ڈیڑھ سال قبل منولٹا مائیکروفلم ریڈر پرنٹر خرید لیا۔ اب مخطوطے کی مائیکروفلم تیار کر کے اس کا پرنٹ آؤٹ ضرورت مند کو فراہم کر دیا جاتا ہے۔ مطبوعہ مواد کی زیروکس کاپی ماسوا تصاویر اور سلائیڈز حسب دستور مہیا کی جاتی ہے۔ حوالہ جاتی خدمات فیکس، فون اور ای میل کے ذریعے دی جاتی ہیں اور جو لوگ لائبریری آتے ہیں ان کی ہر ممکن مدد کی جاتی ہے۔

کرزن ریڈنگ روم صبح آٹھ بجے سے رات آٹھ بجے تک کھلا رہتا ہے۔ اس میں انگریزی، اردو اور ہندی کے اخبارات اور رسائل بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ پہلے یہ ریڈنگ روم صرف ساڑھے چھ گھنٹے کے لیے کھلتا تھا۔ لائبریری نے بارہ گھنٹے کی سروس اس لیے شروع کی کہ تنگی

دامانی کی شکایت کسی حد تک دور کی جا سکے۔ پٹنہ کے اکثر کتاب خانے کسمپرسی کی حالت میں ہیں۔ سارا دباؤ خدابخش لائبریری پر ہے۔ یہ ریڈنگ روم صرف پبلک کے لیے مخصوص ہے۔ اوسطاً ایک مہینے میں نو دس ہزار قارئین آتے ہیں۔

متنوع سرگرمیاں

خدابخش لائبریری محض ایک لائبریری ہی نہیں بلکہ رنگا رنگ سرگرمیوں کا ایک مرکز بھی ہے۔ یہ دانشوروں اور محققین کی ضرورتوں کو پورا کرتی، تحقیقی کاموں کو فروغ دیتی، فرقہ ورانہ ہم آہنگی کو مہمیز کرتی، عوام کی خدمت کرتی اور علمی وثقافتی پروگراموں کا اہتمام کرتی ہے۔

اہم موضوعات پر ہند اور بیرون ہند کے معروف دانشوروں کی توسیعی خطبات کا انعقاد کر چکی ہے۔ متعدد قومی اور بین الاقوامی مذاکروں کا اہتمام کیا ہے۔ مختلف موضوعات کے حوالے سے سارک ممالک کے سیمینار منعقد کیے ہیں اور ملکوں میں ان موضوعات پر دستیاب مخطوطات کے یونین کیٹلاگ بھی مرتب کرا کے شائع کیے ہیں۔ مذاکروں، تقریروں، مباحثوں، تقریری مقابلوں اور ریفریشر کورسوں کا سلسلہ جاری وساری ہے۔

حفظان صحت اور صفائی سے متعلق خاص کر عوام الناس کی معلومات کے لیے پروگرام کرتی رہتی ہے۔ قومی یکجہتی کے فروغ کے لیے خصوصی اہتمام اس کے پروگراموں میں شامل ہے۔ کل ہند اور ہندو پاک مشاعروں، شعری نشستوں، قوالی اور مشاہیر کے انٹرویوز منعقد کرتی ہے۔ غرضیکہ ثقافت ہو یا ادب، تاریخ ہو یا مذہب، ملکی ترقی ہو یا مسلم مسائل، سیکولرزم ہو یا مخلوط تہذیب، یہ سب موضوعات اس کے دائرۂ عمل میں آتے ہیں اور ان پر عوام وخواص کے لیے پروگرام منعقد کرتی ہے۔

نشرواشاعت

لائبریری کا ایک شعبۂ نشر واشاعت کے لیے مختص ہے۔ لائبریری کی مطبوعات نے علمی وتحقیقی حلقے میں ایک مقام حاصل کر لیا ہے۔ اب تک اردو، ہندی، انگریزی، فارسی اور عربی میں تقریباً چار سو عنوانات شائع کر چکی ہے جو اہل علم کی داد وتحسین حاصل کر چکے ہیں۔ لائبریری کے مخطوطات کو مرتب کرا کے شائع کرنا یا ان کے فیکسی میل ایڈیشن چھاپنا، مذاکروں کے مقالات کو مع کرنا اس کے اشاعتی پالیسی میں شامل ہیں۔

تحقیقی کاموں میں رسالوں کے اشاریوں کی اہمیت مسلم ہے۔ لائبریری اشاریہ سازی پر خصوصی توجہ دیتی ہے۔ اردو کے کئی مؤقر رسالوں کے اشاریے مرتب کرا کے شائع کر چکی ہے۔ کئی اشاریے زیر ترتیب ہیں۔ ان کاموں کے لیے سات جونیئر ریسرچ فیلو مصروف رہتے ہین۔ تین سینئر ریسرچ فیلو مخطوطات کی تحقیق وتدوین اور ان کی توضیحی فہرستوں کی ترتیب کے لیے مقرر ہیں۔

ایک ذولسانی سہ ماہی جریدہ ''خدابخش لائبریری جرنل'' کے نام سے ۱۹۷۷ء سے نکل رہا ہے۔اس میں تحقیقی مقالات اردو/انگریزی میں شامل کیے جاتے ہیں۔کبھی کبھی عربی اور فارسی میں بھی مضامین شائع ہوتے ہیں۔اہمیت اور مناسبت کے لحاظ سے قدیم رسالوں سے اہم مضامین بھی نقل کیے جاتے ہیں۔مشرقی و اسلامی علوم کے علاوہ ادبی تحقیق میں یہ جرنل معاون ہوتا ہے۔

خدابخش ایوارڈ

بانی کتب خانہ کی یاد میں ۱۹۹۲ء سے سالانہ اعزاز دینا شروع کیا ہے۔توصیفی سند اور شال کے علاوہ ایک لاکھ روپے کا انعام صدر جمہوریہ کے ذریعے ان حضرات کو دیا جاتا ہے جنہوں نے لائبریری کے اختصاصی موضوعات پر کوئی وقیع کام کیا ہو۔آنجہانی ڈاکٹر بشمبھر ناتھ پانڈے، ڈاکٹر انور جمال قدوائی مرحوم اور محترمہ سبھدرا جوشی کو قومی یکجہتی اور مخلوط تہذیب زندگی بھر کے کارناموں پر نوازا گیا۔کئی انعامات واجب ہو چکے ہیں جو دیے جانا ہیں۔

مشرقی علم کتاب خانہ اور مخطوطہ شناسی

لائبریری نے کئی سال پہلے مشرقی علم کتاب خانہ اور مخطوطا شناسی پر ایک سالہ تربیتی کورس شروع کیا تھا۔تین چار سال یہ جاری رہا لیکن بعد میں بند ہو گیا۔اس کورس کی اہمیت سے انکار نہیں۔لیکن اس کو فعال بنانے کی ضرورت ہے۔جب تک کس تعلیمی ادارے یا ایجنسی کی سرپرستی حاصل نہیں ہوگی یہ مفید ثابت نہیں ہوسکتا۔بہرحال لائبریری کے منصوبوں میں یہ شامل ہے۔

لائبریری کی، عمارت اور آلات

خدابخش خاں نے زرخطیر سے دو منزلہ عمارت بڑے اہتمام سے تعمیر کرائی تھی۔اسی عمارت میں لائبریری کا افتتاح ہوا تھا۔اس کی بالائی منزل تحقیق کرنے والوں کے لیے مخصوص تھی۔کتابیں صرف نیچے کی منزل میں تھیں۔۱۹۳۴ء میں پٹنہ میں شدید زلزلہ آیا۔بالائی منزل تہس نہس ہو گئی۔زیریں منزل متاثر نہیں ہوئی۔کتابیں محفوظ رہیں۔حکومت بہار نے بالائی منزل بالکل منہدم کرا کے چھتیں ٹھیک کرائیں۔چھ ماہ تک مرمت کا کام چلتا رہا۔اس دوران ساری کتابیں ایک ملحقہ عمارت ینگ مین انسٹی ٹیوٹ میں منتقل کر دی گئیں۔مرمت کے بعد یہ کتاب زمانہ اپنی اصلی عمارت میں واپس آ گیا۔

حکومت بہار نے ۱۹۳۸ء میں ایک بہت ہی خوبصورت عمارت تعمیر کروائی جس میں سنگ سرخ کا کثرت سے استعمال کا ی۔یہی وہ عمارت ہے جہاں آج کل لائبریری ہے۔جب یہ جگہ ناکافی ہو گئی تو ۱۹۶۹ء میں حکومت ہند نے اس پر دوسری منزل تعمیر کرائی۔یہ دونوں منزلیں بھی

بڑھتی ہوئی لائبریری کے لیے مختصر پڑ گئیں تو لائبریری کی پشت پر ایک سہ منزلہ عمارت ۱۹۸۳ء میں بنوائی گئی۔ جس رفتار سے لائبریری میں توسیع ہوئی یہ عمارت بھی اس کا ساتھ نہ دے سکی۔ آج لائبریری کے لیے سب سے بڑا مسئلہ جگہ کی شدید قلت ہے شش منزلہ عمارت کا پانچ کروڑ روپے کا ایک منصوبہ بورڈ سے پاس کرا کے محکمہ ثقافت کو بھیجا گیا ہے۔ امید ہے یہ منظور ہو جائے گا۔ جب مجوزہ عمارت تعمیر ہو جائے گی تو ہمارے کئی نئے منصوبے نافذ ہو سکیں گے۔

سردست لائبریری کی حس کاری پر توجہ دی جا رہی ہے۔ دھول پور کے بادامی پتھروں کے ٹائلز سے اس کو ایک نیا چہرہ دیا گیا ہے۔ خوبصورتی کے لیے دروں اور دریچوں کی سنگی محرابوں کو قرمزی رنگ سے سنوارا ہے۔ اندر سے بھی اسے ٹھیک کرایا ہے۔ رنگ و روغن سے اس کی شکل نکل آئی ہے۔ اس کے کشادہ سیڑھیاں سفید سنگ مرمر سے بنوائی گئی ہیں۔ اس کی پیشانی پر سفید سنگ مرمر کے سل پر سبز گرینائٹ سے نام چسپاں کرایا گیا ہے۔ اب یہ ایسی جاذب نظر ہو گئی ہے کہ راہگیر دیکھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

مخطوطات کے اسٹیکس اور ریڈنگ ہال وغیرہ کو ائر کنڈیشن کرایا جا رہا ہے۔ پانی کی قلت کو دور کرنے کے لیے ٹیوب ویل تیار ہو گیا ہے۔ ہمہ وقت روشنی کے لیے ایک بڑا جنریٹر دو تین سال پہلے نصب ہو چکا ہے۔

جھاڑ جھنکاڑ کو صاف کر کے لان کو خوبصورت بنایا ہے۔ گلابوں کے تختوں، موسمی پھولوں کی کیاریوں، چھوٹی چھوٹی دورنٹا کی جھاڑیوں، گھاس اور درختوں کی تراش نے اس کا حسن دوبالا کر دیا ہے۔ لان کو دیکھ کر طراوت اور فرحت کا احساس ہوتا ہے۔

صاف پانی کے لیے جگہ جگہ ایکوا کارڈ نصب کرائے ہیں۔ گندگی سے بچنے کے لیے پیک دان رکھوائے ہیں۔ عمدہ فرنیچر فراہم کیا گیا ہے۔ لیکچر ہال میں نیا کارپٹ بچھوایا ہے۔ گودریج کی کرسیاں لگوائی ہیں۔ ماحول کو ہر اعتبار سے خوشگوار اور خوبصورت بنانے میں ہر ممکن کوشش کی گئی ہے۔

مخطوطات کے لیے کنزرویشن لیب کا ہونا بہت ضروری ہے۔ یہاں جو لیب ہے اسے جدید طرز پر بنانا ضروری ہے۔ لیمی نیشن کے امپریگنیٹر (Impregnator) درآمد کرنے کا منصوبہ ہے۔ نئی طرز کا فیومیگیشن چیمبر بھی خریدنا ہے۔ دو ٹیلی فون لائنوں کا اضافہ ہوا ہے۔ فوری سروس کے لیے نیا نیلی کوم سسٹم لگوایا ہے۔ اب ہر سیکشن میں فون ہے۔

خدا بخش کی خواہش تھی کہ اگر ان کے پاس ایک پرنٹنگ پریس ہوتا تو نادر مخطوطات کی نقلیں ضرورت مندوں کو فراہم کر دیا کرتے۔ ان کی اس خواہش کو پورا کرنے کے لیے عمل تو بہت پہلے شروع کر دیا گیا تھا۔ لیکن ایک سال پہلے ایک بڑا پرنٹنگ پریس بھی خرید لیا ہے اور ایک فورمین

کی خدمات حاصل کرلی ہیں۔ زیادہ تر طباعت کا کام اب یہیں ہو رہا ہے۔ نادر مخطوطات شائع کیے جارہے ہیں۔

جدید کاری

لائبریری کی جدید کاری اگر زیر بحث ہو تو یہ کیوں کر ممکن ہے کہ ڈاکٹر اخلاق الرحمٰن قدوائی کا ذکر نہ ہو۔ میرے تقرر کے وقت انہوں نے اپنی دیرینہ خواہش کا اظہار کیا کہ لائبریری میں کمپیوٹر کاری شروع کی جائے۔ دو سال ہم نے بڑی تگ و دو کی۔ نیشنل انفارمیٹکس سنٹر دہلی اور پٹنہ برانچ کے مشوروں سے لائبریری کی کمپیوٹر کاری کے لیے ایک جامع منصوبہ بنایا گیا۔ لائبریری بورڈ سے منظور کرا کے محکمہ ثقافت کی رضا مندی اور رقم کی فراہمی کے لیے پیش کر دیا۔ منظوری ملتے ہی خریداری کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس ساری مہم میں قدوائی صاحب نے ہر ہر قدم پر ہماری رہنمائی اور مدد کی۔ کسی صورت سے لائبریری کی نئی عمارت میں ایک جگہ خالی کی اور وہاں کمپیوٹر سینٹر تعمیر کرایا۔ پینٹیم II کے تیرہ عدد، کلر ڈیسک جیٹ پرنٹرز، اسکینر اور ڈیجیٹل کیمرہ خریدا گیا۔ LAN سسٹم کی تنصیبات مکمل کیں۔ ای میل اور انٹرنیٹ کنٹی نیوٹی حاصل کی۔ ۳۱ رمئی ۱۹۹۹ء کو اس کا افتتاح بھی ڈاکٹر قدوائی ہی سے کرایا۔ حال ہی میں ایک کمپیوٹر کنسلٹینٹ کا تقرر بھی ہو گیا ہے۔

تین مرحلوں میں لائبریری کی کمپیوٹر کاری ہونا ہے۔ پہلے مرحلے میں مخطوطات کی ۳۶ توضیحی فہرستوں کی سی ڈی تیار کرانا ہیں۔ یہ ہمہ وقت انٹرنیٹ پر دستیاب ہوں گی تاکہ یہاں کے خطی ذخیرے کے بارے میں دنیا بھر میں معلومات حاصل کی جاسکیں۔ دوسرا مرحلہ ہوگا مخطوطات کی سی ڈی بنوانا۔ یہ صرف مطالبے پر انٹرنیٹ پر فراہم کی جاسکیں گی۔ تیسرا مرحلہ ہوگا لائبریری کی دیگر مندرجات کا آن لائن کیٹلاگ مرتب کروانا۔ بعد میں لائبریری کے دوسرے شعبوں میں بھی کمپیوٹر داخل کیا جائے گا۔ ہر چند کہ ۱۹۸۰ء کی دہائی میں لائبریری میں چار کمپیوٹر، لیزر پرنٹر اردو ہندی اور انگریزی کے سافٹ ویئرز کے ساتھ خریدے گئے تھے۔ مگر ان کا استعمال ڈی ٹی پی تک محدود تھا۔ یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے بلکہ کوشش یہ ہے کہ زیادہ تر کمپوزنگ کمپیوٹر سے ہی کی جائے۔ اس میں جو آسانیاں ہیں وہ کتابت میں نہیں۔ بہر حال فن کتابت کی حفاظت بھی کرنا ہے۔ اردو کے لیے ان پیج سافٹ ویئر بھی خرید لیا گیا ہے۔ لائبریری کی ہمہ جہت ترقی کے لیے کوشش جاری ہے۔ خدا بخش کے اس انمول عطیے اور قومی ورثے کی حفاظت، ترویج و توسیع اور اس سے عالمی استفادہ ہمارا نصب العین ہے۔

(ڈائریکٹر، خدا بخش لائبریری، پٹنہ

میرا کتب خانہ

پروفیسر وقار عظیم

شریک گفتگو: سید معین الرحمٰن ۔ ڈاکٹر عبید اللہ خاں

''میرا کتب خانہ'' کے موضوع پر یہ گفتگو وقار عظیم صاحب کے انتقال سے کوئی ڈھائی ماہ پہلے ۴؍ستمبر ۱۹۷۶ء کو ریڈیو پاکستان، لاہور سے نشر ہوئی اس گفتگو کا ٹیپ میرے ذخیرۂ نوادر میں محفوظ ہے (سید معین الرحمٰن)

جب کوئی شخص ''میرا کتب خانہ'' کہہ کر اس کا تعارف کروانے کی کوشش کرے تو اس روایت کے مطابق جو برعظیم پاک و ہند میں عام ہے۔ ہم یہ توقع کرتے ہیں کہ بہت سی عام کتابوں کے ساتھ کچھ نوادر کا اور خصوصیت سے قلمی نوادر کا ذکر آئے گا اور ان نوادر کے ذکر میں بزرگوں کی بتائی ہوئی بعض ایسی باتیں بھی شامل ہوں گی جو نسلاً بعد نسلاً منتقل ہوتی ہوئی ہماری نسل تک پہنچی ہیں اور ان باتوں نے مخطوطے کو بعض ایسی خصوصیتیں دی ہیں جو اس مخطوطے کا مخصوص امتیاز ہیں لیکن عاجزی اور معذرت کے ساتھ اپنے کتب خانے کے تعارف کا یہ کام، میں اس اعلان سے شروع کر رہا ہوں کہ میرے کتب خانے میں کوئی مخطوطہ اور کوئی قلمی نسخہ نہیں ہے۔ اگر کبھی تھا تو وہ لکڑی کے ان مضبوط، مقفل صندوقوں کے ساتھ جل کر راکھ ہو گیا، جنہیں میں حفاظت کے خیال سے دہلی میں ایک دوست کے سپرد کر کے پاکستان آیا تھا۔

سرکاری ملازم کی حیثیت سے مجھے اپنا سامان لانے کی جو سہولت ملی تھی، اس کی بدولت لکڑی کی گھڑونچی، نہانے اور کپڑے دھونے کے پٹڑے، توا پھکنی اور جھاج چھلنی تک چھوٹی بڑی بہت سی چیزیں بحفاظت پاکستان پہنچ گئیں۔ انہیں ہم اب تک برت رہے ہیں۔ کتابوں کے چار صندوقوں والے قیمتی ذخیرے میں سے، بس میں نے جزدان میں لپٹے ہوئے قرآن شریف کے علاوہ تین کتابیں ساتھ رکھ لی تھیں: بال جبریل اور ضرب کلیم کے پہلے ایڈیشن اور نظامی کا نسخۂ کلام غالب۔

۱۲؍اگست ۱۹۴۷ء سے دوسری فروری ۱۹۵۰ء تک کراچی میں رہ کر جب میں تیسری

فروری کو لاہور پہنچا ہوں تو بال جبریل، ضرب کلیم اور دیوان غالب کے علاوہ مشکل سے چار چھ کتابیں اور ہوں گی جو میرے ساتھ تھیں۔ تیسری فروری (۱۹۵۰ء) سے اورینٹل کالج، لاہور میں پڑھانا شروع کیا تو قدم قدم پر کتابوں کی ضرورت پیش آئی اور یونیورسٹی کے کتب خانے اس ضرورت کو رفع کرتے رہے۔ کبھی کبھار اشد ضرورت کے تحت کتابوں کی خریداری کے اس عمل میں جبر وقہر کا دخل ہوتا تھا، اس لیے ملازمت کے ابتدائی چند برسوں میں ان چند کتابوں کے علاوہ جو درسی ضرورت کے لیے اشد ضروری تھیں، محض شوق کی تسکین کے لیے کوئی کتاب نہیں خریدی گئی اب کہ اس بات کو بیس اکیس سال ہوگئے ہیں یا پچیس چھبیس سال، حال یہ ہے کہ میرے گھر کے ہر کمرے میں، برآمدے میں، گیلری میں کتابیں ہی کتابیں ہیں اور وہ کمرہ جو میری خواب گاہ بھی ہے اور لکھنے پڑھنے کا کمرہ بھی، اچھی خاصی کباڑی کی دکان بن گیا ہے۔ اس کمرے کی یہ حالت یا گت اس لیے بنی کہ جن کتابوں کی ضرورت بار بار پڑتی ہے یا جنھیں کبھی کبھار بے ضرورت بھی پڑھنے کو جی چاہتا ہے ایک ایک کر کے اس کمرے میں سمٹ آئی ہیں۔ زیادہ تر ان پانچ الماریوں میں ہیں جو کمرے کے شمال، جنوب اور مشرق میں رکھی ہیں۔ باقی ڈھیریوں کی شکل میں دس بارہ، پندرہ، بیس کتابوں کی اور کبھی کبھی اس سے بھی زیادہ اونچی دس ڈھیریاں...... جو کتابیں کام اور ضرورت کی نوعیت کے لحاظ سے میرے پلنگ پر اس کے بائیں طرف بچھے ہوئے قالین پر آتی جاتی رہتی ہیں وہ ان کے علاوہ...... یہ سارا نقشہ بتانا اور پیش کرنا میں نے اس لیے ضروری سمجھا کہ میں اپنی لائبریری کے متعلق یہ بات کہہ سکوں کہ میری لائبریری کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ محض ایک کاربرآری کام چلاؤ لائبریری ہے۔

ایک استاد کے لیے جس نے اکیس بائیس تک ایم اے کے طالب علموں کو ایک افسانوی ادب کا پرچہ پڑھایا اور دوسرے اقبال اور اقبالیات کا اور ایک پیشہ ور ادیب کے لیے جسے تحریر اور تقریر کے ذریعے جماعت میں، جلسوں میں، ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر، رسالوں کے مضامین اور کتابوں میں مختلف موضوعات پر اظہار خیال کرنا پڑتا ہے اس طرح کی کاربرآری کام چلاؤ لائبریری کی ضرورت تھی۔ اپنی ضروریات کی تکمیل اور اپنے ذوق کی تسکین کے لیے میں نے اس لائبریری میں تنکا تنکا کر کے جو کچھ جمع یا فراہم کیا ہے، اسے کئی حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

میرے نزدیک ہر ایسے اردو داں یا اردو خواں کی لائبریری میں جو لفظوں کی صحت اور لفظ اور معنی کے رشتے کی ابدیت کا قائل ہے چند لغات کا ہونا ضروری ہے میں اپنے روزانہ کے کاموں میں برابر جن لغات سے مدد لیتا ہوں، ان میں پلاٹس، فیلن، اسٹائن گاس نور اللغات اور کن سائز آکسفورڈ کا نام سب سے پہلے لوں گا۔ یہ پانچوں کتابیں میں نے لاہور آنے کے بعد کے ابتدائی

چند برسوں میں خریدیں، لیکن رفتہ رفتہ لغات کا ذخیرہ بڑھتا رہا اور اب میرے اس کار برآر کتب خانے میں فارسی اور اردو کے جو لغات موجود ہیں ان کے نام یہ ہیں۔

مدار الافاضل، موید الفضلا، منتخب النفائس، غیاث اللغات، منتخب اللغات، چراغ ہدایت، لغات القرآن، شائق اللغات، قائد اللغات، المرجع المنجد، اس کے علاوہ ہندی، انگریزی کی دو ڈکشنریاں اور بیڈ کی A Dictionary of Hindi Language اردو پشتو لغت، اردو سندھی لغت، سندھی اردو لغت، قاموس المشاہیر Beele کی بیاگرافی کل ڈکشنری اور اصطلاحات کی ڈکشنریوں میں پاکستانی یونیورسٹیوں سے شائع ہونے والی علوم و فنون کی اصطلاحات کے لغات اور اصطلاحات پیشہ وران کے کل حصے۔

لغات کے سلسلے کے علاوہ میں اپنی کتابوں کو جن مختلف شقوں میں تقسیر کر سکتا ہوں۔ ان میں غالبیات اور اقبالیات کا ذخیرہ، ادب کی تاریخ اور تنقید سے تعلق رکھنے والی کتابیں، منظومات، درسیات اور افسانوی ادب کی کتابیں شامل ہیں۔

تاریخ کی بعض بنیادی کتابیں مثلاً آب حیات، گل رعنا، شعرا الہند، عسکری کی تاریخ ادب اردو...... کاشف الحقائق، داستان تاریخ کے علاوہ نئے اور پرانے لکھنے والوں کے تنقیدی مضامین کے بہت سے مجموعے جن میں پاکستان کے ادیبوں کے علاوہ بھارت کے اکثر لکھنے والوں کی ایسی کتابیں شامل ہیں جو اب نہ بازار میں ملتی ہیں اور نہ اکا دکا اچھے کتب خانوں کے سوا کسی کتب خانے میں موجود ہیں۔

غالبیات کے ذخیرے کے متعلق کسی طرح کا دعویٰ کرنا ممکن نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ میرے ذخیرے میں کلام غالب کے تقریبا سارے نسخے موجود ہیں اور ان سے تعلق رکھنے والی اکثر تنقیدی کتابیں بھی، لیکن یہ سب چیزیں ایسی ہیں جو بہت سے کتب خانوں میں یکجا مل جائیں گی۔ البتہ اس کے مقابلے میں اقبالیات پر اپنے کتب خانے کو میں نسبتاً زیادہ کارآمد سمجھتا ہوں کہ اقبال کا جو کلام نظم و نثر، باقیات کی صورت میں مرتب ہوتا رہتا ہے اور ان کی زندگی اور کلام پر جو کچھ شائع ہوتا رہتا ہے اور ان کی زندگی اور کلام پر جو کچھ شائع ہوتا رہتا ہے میری کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ میرے ذخیرے میں موجود ہو۔

کتابوں کا ایک سلسلہ اور ہے جن کا تعلق تاریخ اور سیرت سے ہے، خصوصیت کے ساتھ تاریخ اسلام سے۔ میں نے کوشش کی ہے کہ اس سلسلے میں کم از کم چند کتابیں ضرور میرے پاس موجود ہوں جن سے اسلام اور اسلامی زندگی سے تعلق رکھنے والی معلومات فراہم ہوسکیں چنانچہ معین الدین ندوی، اسلم جیراج پوری اور اکبر شاہ خان نجیب آبادی کی تاریخ اسلام کے علاوہ

دارالمصنفین کی کتابوں کا پورا سیٹ میرے ذخیرے میں موجود ہے۔

ان سلسلوں کے علاوہ دو اور سلسلے جن کا ذکر خاص طور پر کروں گا۔ منظومات اور افسانوی ادب کے ہیں۔ نظم کے ذخیرے میں اساتذہ کے کلیات کے علاوہ دور جدید کے شاعروں کے مجموعے اور شاعری کے مختلف طرح کے انتخابات میں نے خاص طور سے جمع کیے ہیں۔ ان میں نعتوں کے متعدد مجموعے، قومی نظموں کے کم و بیش سب مجموعے، غزلوں، نظموں اور مرثیوں کے انتخاب شامل ہیں اور ان میں سے کئی ایسے ہیں جو ہندوستان میں مرتب ہوئے اور اب یہاں آسانی سے نہیں ملتے۔

آخری سلسلہ افسانوی ادب کا ہے جس میں ڈرامے، ناول، افسانے، داستانیں اور نوٹنکیاں شامل ہیں۔ ان میں سے بعض چیزیں تو ایسی ہیں جو دوسرے کتب خانوں میں بھی مل جائیں گی گو کس کتب خانے میں یکجا نہ سہی۔ لیکن بعض ایسی ہیں جو میرے علم میں اب پبلک لائبریریوں میں تو موجود نہیں ہیں، البتہ ذاتی کتب خانوں میں ہوں گی اور وہ بھی شاید سب کی سب کسی ایک ہی کتاب خانے میں نہ ملیں۔ اس ضمن میں یہاں صرف چند ناولوں کا نام لوں گا۔ یہ ناول زیادہ تر انیسویں صدی کے آخر میں چھپے اور مقبول ہوئے مثلاً خواب کلکتہ (چار حصے) حرم سرا (دو حصے)، فسانہ خورشیدی، رزم بزم۔

فسانۂ راحت، سگھڑ سہیلی اور اقبال دلہن'' نئے دور کے ناولوں میں حیات اللہ انصاری کا لہو کا پھول (چار حصے) ممکن ہے کہ پاکستان میں میرے علاوہ کسی اور کے پاس بھی ہو۔

میں نے رسالوں کے خاص نمبر اور درسی کتابوں کے تعلیمی سلسلے بھی محفوظ رکھے ہیں۔ لیکن ان کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں۔ انگریزی اور فارسی کی بعض کتابیں بھی ہیں جو خاص طور سے کسی نہ کسی ضرورت کے تحت خرید کر محفوظ کی گئیں اور میرے کتاب خانے کا کام چلاؤ یا کاربرآر کتب خانہ بنانے میں ان کا بھی ایک حصہ ہے۔ی

ڈاکٹر عبیداللہ خاں: آپ نے ابھی دوران گفتگو میں گاربرآر کا لفظ استعمال کیا ہے حالانکہ جہاں تک مجھے آپ کے کتب خانے کو دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ اس میں بہت سی نایاب کتابیں دیکھیں میں نے، اور بعض رسالوں کے نمبر، مثال کے طور پر پریم چند نمبر زمانہ کا یہاں اب کسی لائبریری میں موجود نہیں ہے صرف آپ کے ہاں مجھے پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ اس طرح پھر ''حیات النذیر'' بھی آپ کے ہاں پڑھنے کا موقع ملا۔ تو یہ ''کاربرآر'' کا لفظ یہ کیوں آپ نے استعمال کیا؟

سید وقار عظیم: کاربرآر کی ترکیب جیسا عبیداللہ صاحب میں نے کہا، اپنے کام کو اور ضرورت کو پورا کرنے کے لیے...... میں اس سے پہلے بھی اختصار سے کہہ چکا ہوں کہ ایم اے میں

مجھے ''افسانوی ادب'' اور ''اقبالیات'' کے پرچے پڑھانا ہوتے تھے تو ان میں جتنے مصنفین تھے، ان کے سلسلے میں جتنا بھی ذخیرہ جمع ہو سکے، میری یہ کوشش ہوتی تھی کہ میرے کتب خانے میں ہو، پھر اس طرح میری ضرورت کو رفع کرنے کے لیے جو چیزیں جمع کی گئیں، میرے لیے وہ ذخیرہ ظاہر ہے محض کار برآ رہے، ان میں سے یہ صحیح ہے کہ بعض ایسی چیزیں ہوں گی جو عام طور پر نہیں ملتیں۔

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن: ایک بات یہاں میرے ذہن میں آتی ہے کہ آپ نے گفتگو کے بالکل آغاز میں معذرت کے انداز میں فرمایا کہ آپ کا کتب خانہ قلمی نسخہ، خطی نسخوں سے خالی ہے مجھے بیشتر آپ کے کتاب خانے سے استفادے کا موقع میسر رہا ہے۔ تحقیقی مقالے جو ایم اے یا پی ایچ ڈی کی سطح پر آپ کی نگرانی میں مکمل ہوئے یا باہر کی یونیورسٹیوں سے آپ کے پاس رائے کے لیے آئے ان کے بہت سے نسخے آپ کی لائبریری میں موجود ہیں اور یہ ایسی مثال ہے کہ اتنے شاید کہیں بھی یک جا نہ ہوں گے۔ بعض دوسری یونیورسٹیوں کے مقالوں میں سے مثلاً کراچی یونیورسٹی کا ایک اچھا مقالہ ممنون...... حیات اور شاعری'' کراچی یونیورسٹی ہی کا ایک اور مقالہ جو سیر شیخ القادر کی حیات اور ادبی خدمات کا احاطہ کرتا ہے، یا سندھ یونیورسٹی سے ڈاکٹر سخی احمد ہاشمی کا بہت جامع مقالہ ''شبلی کا ذہنی ارتقا'' ...... خود پنجاب یونیورسٹی میں آپ کی نگرانی میں پی ایچ ڈی کا جو کام ہوا۔ وہ سب مقالے۔ ان میں سے کچھ چھپ گئے ہیں لیکن اردو داستانوں پر ڈاکٹر سہیل بخاری کا مقالہ قلمی شکل میں ہے۔ پریم چند کی حیات اور وفات پر ڈاکٹر عبید اللہ کا بہت قیمتی مقالہ جو ابھی تک نہیں چھپا، مومن پر ڈاکٹر ناظر حسن زیدی کا بڑا اچھا مقالہ، یہ کہیں نہیں چھپے اور غیر مطبوعہ شکل میں شاید یہ آپ کے کتب خانے کی خصوصیت ہے کہ اس میں موجود ہیں، یہ اور کہیں نہیں۔ پی ایچ ڈی کے تحقیقی کام سے قطع نظر ایم اے کی سطح پر جو مقالے لکھے گئے، اسی طرح کے بہت سے مقالے ہیں جن کی قلمی جلدیں آپ کے کتب خانے میں ہیں، اس ذخیرے کے بارے میں آپ کچھ کہنا چاہیں گے؟

سید وقار عظیم: (ہنستے ہوئے) معین صاحب! یہ آپ نے خوب کہا کہ وہ اس اعتبار سے تو واقعی قلمی ہیں کہ وہ چھپے نہیں ہیں، لیکن قلمی نسخے کی جو تعریف عام طور پر کی جاتی ہے، کلفاً آپ ان مقالوں کو اس میں شامل کر لیں بے شک، یا ممکن ہے کہ مثلاً سو برس کے بعد جب کوئی اس کتب خانے کو دیکھے تو پھر انہیں قلمی کہنے لگے...... تو ابھی ان کے لکھنے والے بھی بفضل تعالیٰ موجود ہیں، ان کی نقلیں ان کے پاس بھی اور پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں بھی ہیں، تو میں نے اس لیے ان کا ذکر نہیں کیا اور انہیں بھی میں اس لحاظ سے، اس کار برآر لائبریری کا حصہ سمجھتا ہوں ایک تو یہ کہ میرے اپنے کام آتی ہیں یہ چیزیں۔ پڑھی ہوئی چیزیں آدمی کو ہر وقت یاد نہیں رہتیں۔ انسان کا

حافظہ بڑی محدود چیز ہے، تو جن چیزوں کو تازہ کرتا ہوتا ہے، ان سے مدد ملتی ہے۔ ایک لحاظ سے اور بھی کاربرآر کہ طلباء میں سے اور بعض عزیز دوستوں میں سے کسی خاص موضوع پر جب وہ کام کرنا چاہتے ہیں تو اکثر یہ ہوا ہے کہ بعض کتابیں رسالے جو انہیں کہیں اور نہ ملے وہ انہیں میرے ہاں مل گئے۔ لیکن میں اس بات پر فخر اس لیے نہیں کرتا کہ یہ تھوڑی سی چیزیں ہیں جو لوگوں کے کام آتی ہیں، اور زیادہ چیزیں ایسی ہیں جو عام کتب خانوں میں موجود ہیں۔ یہ ٹھیک ہے، آپ انہیں مخطوطات میں شامل کرنا چاہتے ہیں تو کر لیجیے!

ڈاکٹر معین الرحمٰن: جی، بالکل، انہیں مخطوطات کے تحت آنا چاہیے۔

ڈاکٹر عبید اللہ خاں: میرا خیال ہے کہ اس سلسلے میں، جب پاکستان بنا ہے، پاکستان بننے کے بعد یہاں میں نے تو ۱۹۴۷ء میں؟؟؟؟ پر بکتے ہوئے بہت سے رسائل اور بہت سی سیریز جو پہلے چھپی تھیں یا مضامین شر ربہت سے اس طرح کی کتابیں بھی آپ کے یہاں، یا رسائل بھی میں نے بہت سے دیکھے ہیں۔ وہ بھی اب تو نایاب ہیں۔ کیوں کہ اب نہیں ملتے وہ کسی لائبریری میں بھی...... پھر آپ نے تمام کتب خانے کا ذکر کیا۔ فلاں فلاں موضوعات پر کتابیں ہیں اور فلاں فلاں کتابیں ہیں اور اس سلسلے میں انگریزی کتابوں کا ذکر بھی کیا، تو وہ انگریزی کی کتابیں صرف افسانوی ادب سے متعلق ہیں یا اور دوسری؛

سید وقار عظیم: وہ عبید اللہ خاں صاحب یہ ہے کہ ادب کے طالب علم کو، خواہ وہ اردو ادب کا طالب علم ہو، فارسی کا یا عربی کا یا انگریزی کا تنقید کی بعض بنیادی کتابیں ہیں انگریزی کی جنہیں پڑھے بغیر اس کا کام نہیں چلتا اور ذہن میں کشادگی نہیں پیدا نہیں ہوتی تنقید کا ایک خاص اسلوب جو ہم نے اپنایا ہے، مغرب سے ملا تو میں نے عام طور سے جو انگریزی ادب کا تعارف کرانے کے لیے بعض کتابیں لکھی گئیں، مثلاً ہڈسن کی کتاب Introduction to the Study of English Literature سمجھتا ہوں کہ ہر ادب کے طالب علم کو ضرور پڑھنی چاہیے وہ میں نے خرید کے رکھی اپنے پاس، اسکاٹ جیمز کی Making of Literature ہے، پھر اس طرح ناول کے فن پر بعض بنیادی کتابیں ہیں ایڈون میور فاسٹر وغیرہ کی، اور ہنری جیمز کی تو یہ کتابیں بجائے اس کے کہ میں لائبریری سے لا کر پڑھتا، کام چلاتا، میں نے انہیں خرید کے جمع کیا، دقت ہوئی لیکن خریدا، اس طرح بعض دفعہ کوئی ایسی چیز مل جاتی ہے جو آگے چل کر نایاب ہو جاتی ہے، مثلاً برٹش کونسل نے کتابوں کا ایک سلسلہ شائع کیا تھا، کوئی بیس برس ہوئے۔ وہ میں نے دیکھا، اشتیاق سے اور بڑی دقت سے میں نے یہ سلسلہ جمع کیا اور وہ سارے رسالے خریدے کوئی سینتیس بہت ہی اچھے رسالے تحقیقی اور تعارفی اس میں شیلی پر، ہارڈی پر، برنارڈ شا پر، سرسٹ لم پر، فاسٹر پر،

ٹی ایس ایلیٹ پر، جی ایچ لارنس پر، جین آسٹن پر اور ہنری جیمز پر، جارج ایلیٹ پر، پھر بائرن، کیٹس اور ورڈز ورتھ پر............ یہ چیزیں میں نے جمع کیں اور ایک صاحب جو ایم اے کا امتحان دے رہے تھے وہ اتفاق سے میرے ہاں آئے اور ان کتابوں کو دیکھ کر اچھل پڑے کہ میں اس سیریز کو ڈھونڈ رہا تھا اور یہ کہیں سے ملتا نہیں تھا......اور حقیقت میں وہی کہ میں اپنی ایک خاص ضرورت کو رفع کرنے کے لیے یا کسی حد تک ایک شوق کے تحت کتابیں فراہم کرتا رہا ہوں، اس طرح انگریزی کی کچھ کتابیں میں نے جمع کیں، زیادہ تر وہ تنقیدی ہیں۔

ڈاکٹر معین الرحمٰن: ایک اور بات، وہی مخطوطے اور قلمی کتابوں کے حوالے سے میرے ذہن میں آتی ہے کسی کتاب کی اہمیت کی ایک سطح تو اس کی قدامت ہے، یعنی کوئی کتاب اگر پرانی ہو اور اس لیے عام طور پر ملتی نہ ہو، وہ اہم ہے، کتاب یا کتاب خانے کی ایک اہمیت اسی طرح بھی تو بنتی ہے کہ تازہ اور نئی سے نئی کتاب جو کہیں اور عام طور سے نہ پہنچی ہو۔اور نہ ملتی ہو وہ میسر آ جائے۔اس عقب میں کس کتاب کی فوری اور تازہ طباعت کی اپنی الگ الگ اہمیت بنتی ہے۔بعض آپ کے خاص موضوعات ہیں۔جیسے غالب اور اقبال۔آپ نے کہا کہ آپ کے ذخیرے کی کوئی خصوصیت نہیں حالانکہ میں نے دیکھا کہ غالب پر بعض بہت اہم اور نادر کتابیں آپ کے ہاں موجود ہیں ''غالب نامہ'' (اکرام) کا پہلا ایڈیشن یا ''انتخاب غالب (عرشی) یہ چیزیں اب کہاں ملتی ہیں۔عام طور سے پھر غالب یا اقبال پر پاکستان یا ہندوستان کہ بعض تازہ ترین کتابیں آپ کے ہاں مل جاتی ہیں۔تو تازہ کتاب کے آنے کی کیا صورت رہتی ہے آپ کے ہاں!

سید وقار عظیم: معین صاحب! جیسا کہ آپ نے ہندوستان کا ابھی نام لیا، پہلے وہاں کی کتاب آنے میں سہولتیں تھیں اور ممکن ہے وہ سہولت ہو جائے آئندہ بھی۔بعض کتب فروش خاص طور سے منگایا کرتے تھے۔وہ کتابیں، اگر ہمیں اطلاع ہوتی تھی تو ہم لوگ وہاں جاتے تھے، میں تھا، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر عبادت بریلوی، اور جو کتاب اپنے شوق یا موضوع کی یا تحقیق کی بھی کہ خیال ہوتا تھا کہ آئندہ شاید یہ نہ ملے وہ خریدی جاتی تھی، تو وہ کتابیں تو اس طرح جمع ہوئیں اور وہ زیادہ تر خرید کے جمع کی گئیں۔کبھی کبھی ایسا ہوا کہ ہندوستان سے کسی دوست نے آتے جاتے کے ہاتھ کوئی اپنی اچھی کتاب بھیج دی یا بعض دفعہ پارسل بھی آ جایا کرتے تھے، تو ہندوستان کی کتابیں زیادہ تر خرید اور کچھ گویا تحفتاً، دوستوں کی عنایت اور مروت سے، اور وہ واقعی ایسی ہیں کہ میں سمجھتا ہوں کہ بعض لائبریریوں میں بھی نہیں اور میرے ذاتی کتب خانے میں وہ محفوظ ہیں......
پھر بہت سے ادارے ہیں پاکستان کے، تعلیمی اور علمی اور ادبی، ان میں بہت سوں کا میں رکن ہوں، آٹھ دس ادارے ایسے ہیں کہ وہاں جو کتاب بھی چھپتی ہے، میرے پاس آ جاتی ہے۔

ڈاکٹر معین الرحمٰن: یہ ایک ذریعہ ہے......

سید وقار عظیم: جی ہاں! ذریعہ ہے کتاب جمع ہو جانے کا۔ بعض دوست ہیں کہ وہ جب کچھ لکھتے ہیں تو محبت سے مجھے دیتے ہیں اور نئے لکھنے والوں کی اکثر کتابیں اسی طرح جمع ہوئیں ...... پھر اس طرح جب ملتی رہتی ہیں کتابیں تو کبھی کبھی اشتیاق، انتظار پر غالب آ جاتا ہے...... مثلاً فیض صاحب کا نیا شعری مجموعہ اور ان کے خطوں کا مجموعہ آیا تو مجھ سے انتظار نہیں کیا گیا کہ وہ بھیجیں، میں جا کے بازار سے خرید کے لایا ناصر کاظمی کا دیوان خریدا، پھر وہ ن م راشد کی کتابیں بڑے اچھے ایڈیشن یہاں سے چھپے، پیسے بہت خرچ ہوئے لیکن جی چاہا کہ انہیں رکھوں...... تو اسی طرح کچھ خرید کر، کچھ تحفے میں یہ چیزیں جمع ہوئیں اور میں اب بھی یہ سمجھتا ہوں کہ یہ کار برآر لائبریری کا حصہ ہیں...... تو آپ نے میری خاطر جو زحمت فرمائی بہت بہت شکریہ آپ کا......''

''سید وقار عظیم نے اپنی زندگی میں افسانے بھی لکھے اور شعر بھی۔ انہوں نے سو سے زیادہ کتابیں شائع کیں۔ ہندوستان میں ''آج کل'' اور پاکستان میں ''ماہ نو'' اور ''نقوش'' کی ایڈیٹری بھی کی، وہ ریڈیو اور ٹی وی کی بھی ہر دل عزیز شخصیت تھے۔ غرض ان کی ذات کئی پہلوؤں کی حامل تھی۔ لیکن ان کا اصلی کارنامہ جس کے لیے وہ تاریخ ادب اردو میں یاد کیے جائیں گے۔ ان کی تنقید ہے۔ خاص طور پر افسانے اور غزل کے میدان میں۔ افسانے میں تو ان کا نام اتنا نمایاں ہے کہ شاید ہی کوئی نقاد ان کی ہمسری کا دعویٰ کر سکے۔ اگرچہ اور بہت اصحاب نے بھی افسانے کی تاریخ و تنقید پر لکھا ہے۔ مثلاً احتشام حسین اور احسن فاروقی ہیں۔ لیکن بحثیت مجموعی ان کا پلہ سب پر بھاری ہے۔

وقار عظیم تنقید میں ایک طرح سے حالی اور ترقی پسند نقادوں کے درمیان برزخ کا کام دیتے ہیں۔ ان کا انداز بے شک کلاسیکی تھا اور وہ حالی سے متاثر بھی تھے۔ لیکن ان میں حالی کی مقصدیت اور اصلاح کی خواہش کا کہیں نشان نہیں ملتا۔ اسی طرح وہ ترقی پسند تحریک سے بھی متاثر ہوئے بلکہ کچھ زمانہ ان کے ہمراہ بھی چلے۔ لیکن وہ کبھی ان کی تخریبی تنقید اور انقلابی روش سے اتفاق نہ کر سکے۔ انہوں نے دونوں کی افراط و تفریط سے دامن بچایا اور اپنی انفرادیت کا سکہ منوایا۔''

مسلمانوں کا ذوق کتب اور ان کے کتب خانے

عبدالجبار شاکر

کتاب وسنت کے مطالعے سے ایک بات تو واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام نے علم کے حصول اور عمل خیر کے اکتساب پر جس قدر توجہ دلائی ہے، اسے ہم اسلامی تہذیب وثقافت کا سب سے روشن باب اور درخشندہ کارنامہ کہہ سکتے ہیں۔ اسے محض حسن اتفاق قرار نہیں دینا چاہیے کہ آسمانی وحی کے آخری سلسلے قرآن مجید کا آغاز جس سورۃ اور جن پانچ آیات سے ہوتا ہے، ان میں علم اور قلم کے تذکرے کو کس عزت اور شان کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

اقرا باسم ربک الذی خلق O خلق الانسان من علق O اقرا وربک الاکرم O الذی علم بالقلم O علم الانسان مالم یعلم (سورۃ العلق:۱۔۵)

پڑھو (اے نبی ﷺ) اپنے رب کے نام کے ساتھ، جس نے پیدا کیا، جمے ہوئے خون کے لوتھڑے سے انسان کی تخلیق کی۔ پڑھو اور تمہارا رب بڑا کریم ہے، جس نے قلم کے ذریعہ سے علم سکھایا، انسان کو وہ علم دیا جسے وہ نہ جانتا تھا۔''

یرفع اللہ الذین امنوا منکم والذین اوتوا العلم درجت (سورۃ مجادلہ:۱۱)

''اللہ ایمان والوں اور علم والوں کے درجے بڑے بلند کرتا ہے۔''

ھل یستوی الذین یعلمون ولذین لایعلمون (سورۃ زمر:۹)

''کیا علم والے اور بے علم برابر ہوتے ہیں؟''

وما یستوی الاعمی والبصیر (سورۃ المومن:۵۸)

''اور یہ نہیں ہوسکتا کہ اندھا اور بینا یکساں ہو جائے۔

اس نوعیت کی سینکڑوں آیات قرآن مجید میں موجود ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام میں علم اور کتاب کا مقام کیا ہے۔ اس ذیل میں معروف سکالر اور شاعر عبدالعزیز خالد نے ''کتاب العلم'' کے نام سے آٹھ سو صفحات کی کتاب لکھی ہے جس کے اڑتیس ابواب میں ہزاروں علمی اقوال ملتے ہیں جو اسلامی تہذیب وثقافت کے اس پہلو پر وسعت علمی اور جامعیت کا اظہار

کرتے ہیں۔

قرآن مجید کی تنزیل کے ساتھ ہی علوم قرآن کے درواہوتے چلے گئے۔اس ضمن میں علوم القرآن پر جوگراں قدر کتب لکھی گئی ہیں،ان کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس علم وحی نے علوم القرآن کے کتنے باب کھول دیے اوراس پر مستزاد فنون کا سلسلہ الگ سے موجود ہے۔اس ''الکتاب'' سے دنیا میں کتنے کتاب خانے تیار ہوگئے۔مصاحف قرآنی کے حسن و جمال سے تو غیر مسلم تہذیبیں بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں۔کتابت وخوش نویسی کے بیسیوں اسالیب جوکوفی،ثلث، ریحان،محقق،نسخ،تعلیق اور بہار کی بہاریں دکھارہے ہین۔ان کے نمونوں کی قدرافزائی سے کتب خانے ''عجائب گھر اور آثار علمی کی مراکز بھرے دکھائی دیتے ہیں۔پھرقرآن مجید کے حوالے سے نقاشی اورتزہیب اورتجلید کے عمل نے مسلمانوں کی کتاب دوستی پر ابدی مہریں ثبت کریں۔

قرآن مجید نے جن دوسرے علوم کی ضرورت کو پیدا کیا ان میں علوم الحدیث کو ایک تاریخی حیثیت حاصل ہے۔تاریخ انسانی میں کوئی علم اس پائے اور درجے کو حاصل نہیں کرسکتا جو مقام علوم الحدیث کو حاصل ہے۔اصول تاریخ میں جو نزاکتیں درجۂ کمال پر قبول کی جاتی ہے،وہ اصول حدیث میں ابتدائی درجے میں بھی بصد احتیاط روا رکھی جاتی ہیں۔مسلمانوں کے کتب خانوں میں الکتاب کے بعد علوم حدیث کے متون کی فراوانی دکھائی دیتی ہے۔اس ضمن میں مخطوطات اورمطبوعات کی فہارس سے ان کے تنوع کا ایک اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

مسلمانوں کے ہاں ان کے کتب خانوں کا آغاز الکتاب کے مصاحف اور مخطوطات سے ہوا۔پھر متون حدیث نے اپنے مقام کے لحاظ سے جگہ حاصل کی اور پہلی صدی ہجری کے آخر تک اس علم کے حلقے کتب خانوں کے مزین ہوتے چلے گئے،ان کا نقطہ عروج عہد عباسی کے آغاز میں ہوا جو ۷۴۹ء سے ۱۳۵۸ء تک چھ صدیوں پر محیط ہے۔جس کا ایک مربوط تذکرہ ڈاکٹر محمد عبدالحلیم چشتی نے اپنے پی ایچ ڈی کے تحقیق مقالے ''اسلامی کتب خانے'' میں کیا ہے۔۱۰۳۷ء صفحات کے اس تذکرے میں جن سیکڑوں کتب خانوں کی تفصیل پیش کی گئی ہے اگرچہ مرورایام کے باعث وہ آج موجود نہیں ہیں مگر ان کی تفصیلات سے مسلم اور غیر مسلم محققین اور مورخین کی کتابیں بھری پڑی ہیں۔اس عہد میں جن موضوعات پر کتابیں لکھی اور سنبھالی گئی ہیں ان کی تفصیل کے لیے بھی ایک دفتر درکار ہے۔اس ضمن میں فہرست ابن الندیم اور حاجی عبداللہ کے فلسفہ کی کشف الظنون کے علاوہ عمر رضا کحالہ کی معجم المؤلفین سے اندازہ ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے کس طرح علوم و فنون کے انبار لگائے اور دریا بہائے ہیں۔پھر اسلامی علوم کے علاوہ ان ہزاروں مخطوطات پر نگاہ ڈالیے جو دوسرے طبی،سائنسی،معاشرتی،تاریخی،سماجی،معاشرتی اور علمی موضوعات پر لکھے گئے

ہیں۔ان مخطوطات سے یورپ نے اپنے استعماری اور استبداری دور میں لوٹ مار سے اپنے کتب خانوں کو بھر رکھا ہے اور ان کی فہارس کو دیکھ کر شاعر بے اختیار فریاد کناں ہے۔

مگر وہ علم کے موتی کتابیں اپنے آباء کی
جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سی پارہ

غنی روز سیاہ پیر کنعاں راہنما ساکن
کہ نور دیدہ اش روشن کند چشم زلیخارا

تاریخ علم پر نگاہ رکھنے والے اس حقیقت سے باخبر ہیں کہ اسلام سے قبل کتب خانوں کی روایت بہت محدود بلکہ معدوم سی دکھائی دیتی ہے۔سلطنت اشوریا کے فرماں روا اشور بانی بال کا کتب خانہ نینوا (بابل) میں تھا۔اس کی کتابیں مٹی کی تختیوں کی صورت میں تھیں۔ایران میں چندی شاپور کے کتب خانے میں علم نجوم اور طب کے ایک ذخیرے کا ذکر ملتا ہے۔مصر میں بطلیموسی خاندان کے بادشاہ نے سکندریہ میں ایک عظیم کتب خانہ بنوایا۔''تمدن عرب'' کے مصنف گستاؤلی بان نے عیسائی کتب خانوں کا تذکرہ کیا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ عہد اسلامی سے قبل تاریخ عالم میں کتب خانوں کی روایت مستحکم دکھائی نہیں دیتی......

عہد اسلامی میں امویوں، عباسیوں، عثمانیوں اور مغلوں نے کتاب شناسی کی روایت کو قائم رکھتے ہوئے عظیم الشان کتب خانے بنوائے۔عظیم مکاتب اور مدارس کے ساتھ ان کے اصل وجہ شہرت ان کے کتب خانے ہوتے تھے۔امرأ اور علماء کے ذاتی کتب خانوں کے سلسلے میں کیمبرج یونیورسٹی میں ڈاکٹر احمد شبلی کے تحقیقی مقالے سے مدد لی جاسکتی ہے۔جن کے مقالے کا اردو ترجمہ ''تاریخ تعلیم وتربیت اسلامیہ'' کے عنوان سے ادارہ ثقافت اسلامیہ نے لاہور سے شائع کیا ہے۔ برصغیر پاک وہند بھی مسلمانوں کی علمی روایات اور کتب خانوں کا امین ہے۔

قیام پاکستان کے بعد یہاں بھی سرکاری کتب خانوں میں وسعت واستحکام پیدا ہوا۔ پنجاب پبلک لائبریری لاہور ۱۸۸۴ء میں قائم ہوئی۔پنجاب یونیورسٹی کا کتب خانہ بھی ۱۸۸۲ء میں جاری ہوا۔گورنمنٹ کالج لاہور کے کتب خانے نے اپنا سفر ۱۸۶۴ء میں شروع کیا۔دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری ۱۹۲۸ء میں قائم ہوئی۔ملتان میں باغ لانگے خاں میں پبلک کتب خانے کی ابتدا ۱۸۵۳ء میں ہوئی۔سکھر اور خیر پور میں بھی اس زمانے میں کتب خانے قائم ہوئے۔ایک جدید کتب خانہ ۱۹۸۱ء میں قائد اعظم لائبریری کے نام سے شروع کیا گیا جس کا افتتاح مرحوم صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق کی سربراہی میں تیرہ سال تک اس کی خدمت کا موقع ملا اور ہنوز اسی

خدمت پر مامور ہے کہ خطۂ پنجاب میں پبلک کتب خانوں کے قیام واستحکام کے لیے خدمات سرانجام دی جائیں۔

جامعات، کالجوں اور پبلک کتب خانوں کے علاوہ دینی مدارس کے کتب خانے بہت وقیع ہیں۔مگر حقیقتاً کتب خانوں کی عظمت وشوکت کا ایک پہلو ذاتی ذخائر کے ساتھ وابستہ ہے۔ قیام پاکستان کے بعد کراچی میں جناب خالد اسحاق نے ایک عظیم کتب خانہ بنایا جس میں کتب کی تعداد ڈیڑھ لاکھ سے تجاوز کر چکی ہے۔نوابان تالپور اور راشدی خاندان کے سندھ میں عظیم ذخیرے مجود ہیں۔ پروفیسر سید محمد سلیم نے منصورہ (ہالہ) میں ایک اچھے کتب خانے کی بنا ڈالی۔خیر پور کا کتب خانہ قابل ذکر ہے۔صادق آباد میں میرزاہد حسین، ملتان میں شاہ گردیز، سردار پور جھنڈیر میں میاں مسعود احمد، بہاولنگر میں میاں فضل احمد لالیکا، کراچی میں جناب مشفق خواجہ اور حکیم محمد سعید کا مدینۃ الحکمت، قلندر آباد (ایبٹ آباد) میں پروفیسر ڈاکٹر صابر کلوروی واہ کینٹ (راولپنڈی) میں ڈاکٹر سفیر اختر، گجرات میں پروفیسر احمد حسین قریشی قلعداری، گوجراں والا میں ضیاءاللہ کھوکھر، قصور میں ڈاکٹر احمد شبیر، محمد پور (رحیم یار خان) میں سید انیس شاہ جیلانی اور حضرو میں خواجہ محمد خاں اسد کے ذاتی کتب خانے قابل ذکر ہیں..........مگر قطب البلاد لاہور میں ذاتی کتب خانوں کا تذکرہ ایک الگ تفصیل کا طالب ہیں۔اس شہر میں کم وبیش تین سو کے قریب چھوٹے بڑے ذاتی کتب خانے موجود ہیں۔مگران میں ڈاکٹر وحید قریشی کے ہاں پچیس ہزار سے زائد کتب ورسائل موجود ہیں۔ پروفیسر افضل قرشی، پروفیسر محمد اقبال مجددی، ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، پروفیسر ظفر حجازی، شبیر احمد خان میواتی، خلیل الرحمٰن داؤدی، عارف چغتائی، ڈاکٹر صدیق جاوید، سید ابوالاعلیٰ مودودی، میاں ممتاز محمد خاں دولتانہ، عالمگیر شجاع، عین الحق فرید کوٹی، ڈاکٹر انجم رحمانی، محمد عالم مختار حق، ڈاکٹر تحسین فراقی، عاصم الحداد اور مرزا محمد منور کے کتب خانے لائق ذکر ہیں۔اس سلسلے میں لاہور کے دو ذاتی کتب خانوں کا بطور خاص ذکر کرنا چاہوں گا جن میں ایک راقم الحروف کا کتب خانہ بیت الحکمت ہے جس میں پچاس ہزار مطبوعات اور تیرہ ہزار رسائل کے علاوہ ساڑھے پانچ ہزار مخطوطات بھی موجود ہیں۔مخطوطات کے لحاظ سے اغلباً یہ دور حاضر کا سب سے بڑا ذاتی ذخیرہ ہے۔اقبالیات میں دنیا کی پینتیس زبانوں میں چار ہزار کے قریب کتب ورسائل موجود ہیں۔ سیرت النبی ﷺ پر تین ہزار کے قریب دنیا کی تیرہ زبانوں میں کتابیں ہیں۔تحریک پاکستان کے موضوع پر ایک ہزار، غالبیات میں چار سو، تصوف کے موضوع پر پانچ سو دنیا کی اسلامی تحریکوں کی تین سو سے زائد کتب، حدیث میں چھ سو اور قرآنیات کے موضوع پر پانچ سو کتابیں موجود ہیں۔

لاہور کے جس اہم ترین کتب خانے کا آخر میں ذکر جمیل کرنا چاہتا ہوں، وہ معروف

عالم دین اور محقق مولانا عطا اللہ حنیف بھوجیانی رحمۃ اللہ علیہ (م۔۱۲ اکتوبر ۱۹۸۷ء) سے متعلق ہے۔ اس وقت مولانا موصوف کی علمی، تحقیقی اور صحافتی خدمات کا تفصیلی تذکرہ مطلوب نہیں۔ وہ نسائی شریف جیسی حدیث کی کتاب کے عربی زبان میں محشی اور شارح ہیں۔ ان کے کتب خانے کا ایک معتد بہ حصہ تقسیم ہند کے موقع پر ضائع ہو گیا تو اس درویش طبع اور فقیر منش گڈری پوش نے اپنے ذوق کی شمع پھر سے روشن کی۔ میں نے ایسے کم وسائل شخص کو اس ذوق وشوق سے کتب جمع کرتے نہیں دیکھا۔ انہوں نے اپنی زندگی کی ہر ضرورت کو ثانوی سے بھی آگے بڑھ کر جگہ دے رکھی تھی۔ مگر کتاب کے لیے ان کا ایثار ایک مثالی اور تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ صرف کتابیں جمع نہیں کرتے تھے بلکہ ان کے مطالعے سے ایک تحقیقی راہ روشن کرتے تھے۔ ان کے وسعت مطالعہ اور قوت استحضار کی مثالیں ان کے احباب اور شاگردوں میں زبان زد عام ہیں۔ اپنے ذاتی کتب خانے کی تشکیل کے ساتھ انہوں نے المکتبہ السّلفیہ کے نام سے ایک طباعتی اور اشاعتی ادارہ بھی ۱۹۵۳ء میں قائم کیا جس کی مطبوعات کے تحقیقی اور طباعتی معیار کو آج بھی ایک قدر ومنزلت کی نگاہ حاصل ہے۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے ''الاعتصام''، ''الرحیق'' کے عنوان سے دینی صحافت کا آغاز کیا۔ الرحیق تو بوجوہ اپنی آزادی کے رمق برقرار نہ رکھ سکا مگر الاعتصام ہنوز علم وتحقیق اور دعوت وتذکرے کے موتی بکھیر رہا ہے۔ محترم بھوجیانی رحمۃ اللہ علیہ جہاں علم وتحقیق کے اکابر میں سے تھے وہاں سادگی اور عاجزی میں اس دور کی فقید المثال شخصیت تھے۔ ان کے ایثار اور علم دوستی کا یہ عالم ہے کہ اپنا تمام تر کتب خانہ مرکز الدعوۃ السّلفیہ کے لیے وقف کر دیا۔ اب لاہور کے اس فقیہ المثال ذاتی ذخیرے میں پینتیس ہزار سے زائد کتب ورسائل موجود ہیں جن میں عربی کتابیں بالخصوص تفسیر وحدیث کا ذخیرہ لائق اعتبار ہے۔ لاہور میں شیش محل روڈ کے اواخر میں بائیں جانب ایک چار منزلہ عمارت میں یہ کتب خانہ عرب وعجم اور بلاد عالم کے محققین اور شائقین کے لیے علم وتحقیق کے نوادر پیش کر رہا ہے مگر ابھی اس کی مستقل سرپرستی کی ضرورت ہے۔ اس دنیا میں اللہ تعالیٰ نے بہت سے لوگوں کو ان کی ضرورت سے بہت زائد دے رکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل وانعام کا شکر اس طور پر بھی ادا کیا جا سکتا ہے کہ ایسے علمی اور تحقیقی اداروں کی مستقل سرپرستی کی جائے۔

(مولانا عطا اللہ حنیف لائبریری، لاہور میں کی گئی تقریر)

لیاقت میموریل لائبریری

الیاس جاوید چوھدری

کسی بھی قوم کی علمی وتحقیقی زندگی میں کتب خانوں کا ہمیشہ ایک اہم کردار رہا ہے کیونکہ تحقیق تعلیمی اداروں کے اندر ہو یا باہر کتب خانوں کی مرہون منت ہے۔ کتب خانے سابقہ تجربات نظریات ومشاہدات بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ علم کی حفاظت اس کی ترتیب اور ترسیل کا فریضہ بھی ادا کرتے ہیں کیونکہ کتب ہی علم کے حصول کا بنیادی ذریعہ ہیں لیکن اگر ہم غور کریں تو عام مسلمان ممالک کی طرح پاکستان میں مطالعاتی ذوق کی کمی پائی جاتی ہے ایک تو یہاں ناخواندگی کافی ہے لیکن پڑھے لکھے لوگوں میں بھی مطالعہ کا کچھ زیادہ شوق نہیں ہے۔ پاکستان میں کراچی پورے ملک سے زیادہ پڑھے لکھے لوگوں کا شہر ہے لیکن یہاں بھی مطالعاتی ذوق کی فراوانی نہیں ہے سچ بات تو یہ ہے کہ یہاں کتب خانوں کی تعداد آبادی کے لحاظ سے بہت کم ہے سرکاری ونجی کتب خانوں کے علاوہ چند کتب خانے بلدیہ عظمیٰ کراچی کے زیرِ اہتمام ہیں لیکن ان سب میں نمایاں مقام لیاقت میموریل لائبریری کو حاصل ہے۔ فی الوقت قارئین کو اسی کا تعارف کرانا اوراس کی خدمات سے آگاہ کرنا مقصود ہے۔

یہ لائبریری اس وقت حکومتِ سندھ کے محکمہ ثقافت کے زیرِ انتظام ہے۔ شہیدِ ملت لیاقت علی خان (مرحوم) کی یاد میں قائم ہونے والی لائبریری کو جنوری ۱۹۵۴ء میں نیشنل لائبریری میں ضم کر دیا گیا لیکن جب دارالحکومت اسلام آباد منتقل ہو گیا تو نیشنل لائبریری بھی ۱۹۶۹ء میں اسلام آباد منتقل کر دی گئی اور لیاقت میموریل لائبریری کراچی میں وفاقی وزارتِ تعلیم کے محکمہ کتب خانہ کے تحت خدمات انجام دیتی رہی ہے بعدازاں ۲۸ فروری ۱۹۸۶ء کو اسے حکومتِ سندھ کے محکمہ ثقافت کے زیرِ انتظام دے دیا گیا یہ لائبریری فرسٹ فلور پر ہے جبکہ گراؤنڈ فلور ابھی تک حکومتِ پاکستان کے محکمہ کتب خانہ کے زیرِ استعمال ہے۔ یہ لائبریری نیشنل سٹیڈیم روڈ پر ٹی وی اسٹیشن سے متصل بنگلوں اور کوٹھیوں کے درمیان وسیع وعریض رقبہ پر تعمیر عالی شان عمارت میں قائم ہے۔ اس کی بیرونی دیوار میں تین دروازے کھلتے ہیں۔ پچھلی جانب داہنی جانب اور عمارت کے مرکزی دروازہ کے سامنے۔

سامنے والے بیرونی دروازہ سے داخل ہوں تو مرکزی دروازے کی دہلیز پر خوبصورت رن برنگے پھول آپ کا استقبال کرتے ہیں دروازہ کھول کر اندر داخل ہوں تو یہ ایک برآمدہ نما وسیع ہال ہے اس میں مختلف جگہوں پر بیٹھنے کے لئے نشستیں ہیں مگر یہاں اکثر لوگ ستاتے ہوئے نظر آتے ہیں، اس ہال میں کھڑے ہو کر دائیں جانب بڑھئے تو اسٹینڈز پر مختلف زبانوں کے ۲۲ اخبارات موجود ہیں جن میں دو غیر ملکی اخبارات بھی ہیں۔ ہر اخبار کے لئے جگہ مخصوص کر دی گئی ہے مگر قارئین نے ان کا تلنجن بنا رکھا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ایک دروازہ ایک بڑے ہال میں کھلتا ہے۔ اس میں داخل ہونے سے پہلے دروازہ کے قریب بنے کیبن میں موجود عملہ کے پاس اپنا بیگ، پرس اور کتابیں وغیرہ جمع کرانا پڑتی ہیں۔

ہال میں داخل ہوں تو ایک استقبالیہ ہے۔ لائبریری کی رکنیت کے لئے نام کا اندراج یہیں کرانا ہوتا ہے۔ مئی ۱۹۸۶ء سے فری ممبر شپ شروع کی گئی اور اب اپریل تک ۱۵۰۱۷ افراد لائبریری کے ممبر بن چکے ہیں۔ اس ہال میں دائیں جانب سیلفز پر مختلف زبانوں کے رسائل و جرائد کے تازہ شمارے موجود ہیں، ذرا بائیں جانب پرانے اخبارات اور رسائل و جرائد بڑی خوبصورتی شیلفز پر سجے نظر آتے ہیں درمیان میں نشستوں پر موجود لوگ حالاتِ حاضرہ سے آگاہی کی سعی میں تازہ شماروں کی ورق گردانی میں مصروف نظر آتے ہیں اور کچھ لوگ ماضی کے جھروکوں میں جھانکنے کی کوشش میں پرانے اخبارات کھنگالتے دکھائی دیتے ہیں یہاں فراہم کردہ ہفت روزہ جات کی تعداد کل تیرہ ہے جن میں آٹھ انگریزی اور پانچ اردو میں ہیں۔ ماہنامہ جات انیس انگریزی میں ۳۸ اردو اور تین سندھی میں ہیں یہ سب قیمتاً خریدے جاتے ہیں ان کے علاوہ بہت سے رسائل و جرائد ایسے بھی ہیں جو مختلف اداروں کی طرف سے مفت بھیج دئے جاتے ہیں ان سے تقریباً ستر افراد روزانہ استفادہ کرتے ہیں۔

اس ہال کی پچھلی جانب مختلف شعبہ جات کے دفاتر ہیں جن میں لائبریرین اور ڈپٹی ڈائریکٹر پرنسپل لائبریرین کے دفاتر بھی ہیں جن کا دروازہ ایک برآمدہ میں کھلتا ہے۔

اسی برآمدہ نما ہال میں کھڑے ہو کر دیکھیں تو بالکل سامنے ایک بڑی ائر کنڈیشنڈ مطالعہ گاہ ہے اس میں داخل ہوں تو استقبالیہ پر موجود روزنامچہ میں نام، رکنیت نمبر لکھنے کے علاوہ دستخط بھی کرنا ہوتے ہیں۔ اس میں ۱۳۰ افراد کے مطالعہ کے لئے نشستیں رکھی گئی ہیں اسی مطالعہ گاہ سے دو زینے اوپر کی ایک چھوٹی مطالعہ گاہ کی طرف رہنمائی کی گئی ہے۔ یہ ۳۰ نشستوں پر مشتمل ہے جہاں تنہائی میں پڑھنے کا بہترین موقع میسر آتا ہے خواتین کے لئے ایک طرف کچھ نشستیں مخصوص ہیں آجکل تو کراچی میں امتحانوں کا موسم ہے اس لئے اپنی تمام تر وسعتوں کے باوجود یہ مطالعہ گاہ کچھ

تنگی داماں کا ثبوت پیش کر رہی ہے۔ یہاں مطالعہ کے لئے آنے والے افراد کی روزانہ حاضری تقریباً پانچ سو رہتی ہے اسی مطالعہ گاہ سے متصل بڑا کتب خانہ ہے جس کا دروازہ اسی مطالعہ گاہ کے اندر کھلتا ہے دروازہ پر استقبالیہ ہے جہاں موجود عملہ کتب کے حصول میں آپ کی مدد کرتا ہے۔ کتب خانہ میں ایک لاکھ کے لگ بھگ کتب موجود ہیں جنہیں کتب خانہ میں قطار اندر قطار پڑے شیلفز پر اس طرح سجایا گیا ہے کہ اسے نخلستانِ کتب کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ یہ کتابیں مختلف زبانوں اور مختلف موضوعات پر لکھی گئی ہیں سب سے زیادہ اسلام پر کتب ہیں جن کی تعداد تقریباً تیرہ ہزار ہے اور سب سے کم لینگویج پر ہیں ان کتب سے ماہانہ تقریباً چار ہزار افراد مستفید ہوتے ہیں۔

اس مطالعہ گاہ سے باہر پہلے والی جگہ پر آئیں تو بائیں جانب آڈیٹوریم ہے یہ آڈیٹوریم ۲۸۰ نشستوں پر مشتمل ہے اس میں لیکچرز، تقاریر اور مختلف مواقع پر تقاریب کا اہتمام کیا جاتا ہے اس آڈیٹوریم کی پچھلی جانب وضوخانہ اور پبلک کے لئے ٹائیلٹ ہے۔ آڈیٹوریم کے ساتھ بچوں کی لائبریری ہے۔ یہ لائبریری بھی ائیر کنڈیشنڈ ہے اور دیوار تا دیوار قالین بچھا ہے اس لائبریری میں پانچ ہزار پانچ سو کتب موجود ہیں۔ سب سے زیادہ اسلام اور پاکستان پر لکھی گئی ہیں اس لائبریری میں پچاس نشستیں ہیں اور تقریباً ساٹھ بچے روزانہ مطالعہ کے لئے آتے ہیں۔

عمارت کی پچھلی جانب ایک وسیع کار پارکنگ ہے جس کے لئے بیرونی دیوار کا داہنی جانب کا دروازہ استعمال ہوتا ہے کار پارکنگ کے ساتھ کنٹین بھی ہے جو کہ عام دنوں کی طرح رمضان المبارک میں بھی ''مائل بہ کرم'' رہتی ہے۔ سائل آتے ہیں دستک دیتے ہیں اور اپنے ''تن'' کی مرادیں پاتے ہیں۔

اس لائبریری میں کئی کتابیں اپنی جگہ انتہائی نادر شمار ہوتی ہیں اور کہیں اور بمشکل دستیاب ہیں مثلاً نسخہ مثنوی مولانا روم جو ۱۰۲۳ھ میں تحریر کیا گیا تھا فورٹ ولیم کالج کی طرف سے شائع کردہ کلیاتِ میر جسے ۱۸۱۱ء میں شائع کیا گیا صادق حسین چشتی کا فیروز نامہ ترک جو مدراس میں چھپا، تفسیر سورہ فاتحہ، سوالحی الالہام (یہ منظوم ہے اور بغیر کسی نقطہ کے لکھی گئی) گلدستہ نازنیناں جسے مولانا عبدالکریم پانی پتی نے تحریر کیا، ان کے علاوہ کامریڈ، ٹائمنز آف انڈیا، ٹائمنز آف کراچی، سول اینڈ ملٹری گزٹ کے پرانے فائل وغیرہ۔

لائبریری میں کتب کی خریداری کے لئے سالانہ تخمینہ پانچ لاکھ روپے کا ہے اور تخمینہ اخراجات برائے مرمت ۱۰۰،۰۰۰ روپے ۸۶،۸۷ء کے سال میں عملہ کی تنخواہوں کے لئے ۵۲۲۴۴ روپے مختص کئے گئے۔ اس سال کتب کی خریداری کے لئے دس لاکھ روپے کی خصوصی امداد بھی حکومت کی طرف سے دی گئی ہے۔

لائبریری میں مختلف خدمات کی انجام دہی میں مصروف عملہ ۵۶ افراد پر مشتمل ہے بشمول ۵ افسران کے اس عملہ میں ۱۵ افراد پیشہ وارانہ اور ۱۴ افراد غیر پیشہ وارانہ خدمات پر مومور ہیں۔ لائبریری کے ڈپٹی ڈائریکٹر پرنسپل لائبریرین جناب آئی اے ایس بخاری سے ان کے دفتر میں ایک مختصر نشست ہوئی۔ انہوں کہا کہ کتب خانوں کی اہمیت کے پیشِ نظر حکومت کو اس طرف زیادہ سے زیادہ توجہ دینا چاہئے مزید یہ کہ پنجاب میں تو حکومت کروڑوں روپے اس سلسلہ میں خرچ کر رہی ہے مگر یہاں ابھی لاکھوں تک ہی بات ہے۔

اسی دوران لائبریرین محترمہ ناہید جہاں صاحبہ سے بھی ملاقات ہوئی ممبران کی مشکلات اوران کے لئے سہولیات کے ذکر پر انہوں نے کہا کہ ہم ممبران کے لئے ہم ممکن سہولیات بہم پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ممبران کے لئے ٹھنڈے پانی کے کولر کا اہتمام کیا گیا ہے، وضو خانہ ہے جائے نماز اور ٹائیلٹ وغیرہ، اس کے علاوہ مطالعہ گاہ میں قالین بچھانے کی تجویز منظور ہو چکی ہے، فوٹو کاپیئر بھی فراہم کیا جارہا ہے اس کی عدم موجودگی میں ممبران کو مطلوبہ مواد کی فوٹو کاپی بھی عملہ کے افراد کے ذریعہ مہیا کی جاتی ہے لیکن ان تمام چیزوں کے باوجود ممبران ہمارے ساتھ کچھ زیادہ تعاون نہیں کرتے اکثر لوگ کتابوں سے مطلوبہ مواد کے صفحات پھاڑ لیتے ہیں یا اخبارات سے کٹنگ کر لیتے ہیں جو کہ بعد میں مطالعہ کرنے والوں کے لئے ناکارہ ہو جاتے ہیں انہوں نے افسوس کے ساتھ کہا کہ کچھ عرصہ قبل ایک معتبر جریدہ کے ایڈیٹر (نام نہیں بتایا) نے ایک پرانے اخبار سے مطلوبہ کٹنگ کر لی جنہیں پکڑ لیا گیا بعد ازاں انہوں نے معافی بھی مانگ لی بہرحال ان کی رکنیت منسوخ کر دی گئی ہے۔

کتب مستعار نہ دینے کی پالیسی کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ کئی لوگ کتابیں لے جاتے ہیں اور پھر واپس نہیں کرتے یا کتابوں کی واپسی کے لئے کافی بھاگ دوڑ کرنا پڑتی ہے او رپھر ہمیں کتابوں سے روزانہ مستفید ہونیوالے افراد کا شمار بھی کرنا ہوتا ہے اس لئے فی الوقت ایسی کوئی تجویز زیرِ غور نہیں ہے۔

بچوں کی لائبریری کی انچارج مس فیروزہ صاحبہ سے بھی ملاقات ہوئی انہوں نے بچوں کے لئے لائبریری کی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ہمارے پاس کچھ بچے ایسے ہیں جو پڑھ نہیں سکتے ہم نے ان کے لئے تصویری کتب رکھی ہوئی ہیں تاکہ ان کے ذریعہ ان کے ذہن میں کائنات میں پائی جانے والی چیزوں کا تصور اجاگر ہو سکے۔ گزشتہ دنوں ۲۵ مئی کو بچوں کے لئے کتابوں کی ایک نمائش کا اہتمام کیا گیا تھا جس میں ۱۵۰ کتب رکھی گئی تھیں۔ اب ہم ان کے لئے مختلف کھلونوں اور خالصتاً تعلیمی اور ثقافتی معلومات پر مبنی ویڈیو فلم کے دکھائے جانے کا بھی لائبریری

میں مستقل اہتمام کر رہے ہیں تا کہ جدید میڈیا کی مدد سے بچوں کی ذہنی نشو ونما کی جائے۔

بہر حال یہ لائبریری کراچی کے شہریوں کے لئے جو خدمات انجام دے رہی ہے ان سے پورا پورا استفادہ کرنا چاہئے، سچ بات تو یہ ہے کہ کسی بھی کتب خانہ کے قیام پر کثیر رقم خرچ ہوتی ہے، بہت سے افراد کی خدمات صرف ہوتی ہیں ان سے مستفید نہ ہونا قومی استحصال کے مترادف ہے۔عوام کو بالعموم اور اساتذہ وطلباء کو بالخصوص لائبریری کو اپنی زندگی کا لازمی جزو بنالینا چاہئے اور کتب سے مستفید ہونا چاہئے کیونکہ کتب ہی کا علم کا بنیادی ذریعہ ہیں اور علم کے بارے میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ ''علم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے جبکہ حدیث قدسی ہے کہ ''علم حاصل کرو اگر کسی قوم کے امیر ہوئے تو اور اونچے ہو جاؤ گے اگر عام آدمی ہوئے تو زندہ رہ سکو گے۔

سکندریہ کی لائبریری

ملک اشفاق

اب مصر کے نئے حکمران خاندان ٹالمی نے اقتدار سنبھالا اور سکندریہ کو دانش وروں کا شہر بنا دیا۔ اس خاندان کے حکمرانوں نے علم وفن سے بہت زیادہ محبت کی تھی اور مصر کے قدیم علمی خزانوں کو دوبارہ دریافت کر کے دنیا کے لیے مفید بنا دیا تھا۔ اگرچہ فرعونوں نے بھی سقارا میں عظیم اہرام تعمیر کر کے دنیا کو حیرت زدہ کر دیا تھا۔ اب سکندریہ کے لائٹ ہاؤس نے دنیا کو حیرت میں ڈال دیا تھا اور اس کے علم وکمال نے دنیا کو اپنی جانب کھینچ لیا تھا۔

۲۸۸ قبل مسیح میں ٹالمی اوّل (Soter) نے ڈیمی ٹریس (Demetrius) کی زیر نگرانی میوسس مندر اکیڈمی جو کہ ایک تحقیقی مرکز تھا اور لائبریری تعمیر کروائے۔ اس دور کے مفکر، سائنس دان، ریاضی دان، شاعر اور فلسفیوں کو سکندریہ میں بے شمار سہولتیں فراہم کیں تاکہ وہ تحقیق کا کام کریں۔ اس وقت یونانی زبان میں ہی تمام علوم پڑھے اور پڑھائے جاتے تھے۔ سکندریہ کی مشہور عالم لائبریری ''ٹالمی اوّل (۳۸۵، ۳۰۵ ق م) نے شروع کی اور ''ٹالمی دوم (۲۴۶۔۲۸۵ ق م) کے دور حکومت میں مکمل ہوئی۔

لاکھوں کتابیں

ٹالمی دوم نے اپنے ماتحت ریاستوں کے حکمرانوں اور مختلف علوم کے علما کو دعوت دی کہ اس عظیم لائبریری کے لیے کتابیں جمع کریں اور علما کتابیں تحریر کریں۔ دو تاریخ دان، ''اوکس (OKES)'' اور گیلن (GAHLIN)ّ لکھتے ہیں کہ سکندریہ کی لائبریری کی عظیم الشان عمارت میں بہت سے کمرے تھے۔ ان میں دو لاکھ ستر ہزار ''پیپرس'' کے سکرول کی صورت میں کتابیں رکھی تھی۔

ان میں سے زیادہ تر کتابیں خریدی گئیں تھی اور لاکھوں کتابیں مختلف علوم کے علما سے تحریر کروائی گئی تھیں۔ کتابیں شیلفوں میں ایک خاص ترتیب سے رکھی گئی تھیں اور کسی کتاب کو تلاش کرنا بالکل مشکل نہ تھا۔ ہر کتاب کی ایک نقل بھی تیار کی جاتی تھی۔ آج لائبریری سائنس میں جو کچھ بھی پڑھایا جاتا ہے یہ سب کچھ سکندریہ کی لائبریری کی ترتیب سے ہی لیا گیا ہے۔

کچھ تاریخ دانوں کا کہنا ہے کہ سکندریہ کی لائبریری میں کئی لاکھ کتابیں تھیں۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ لائبریری میں ۵ لاکھ کتابیں تھیں۔

یہ بھی کہا جاتا ہیکہ مارک انتھونی (Mark Antory) نے ''فرعونہ قلوپطرہ'' کو ۲ لاکھ کتابیں اس لائبریری سے دی تھیں لیکن اس کا کوئی ٹھوس ثبوت نہیں ہے۔

مین گا سارین مزید لکھتا ہے۔

سکندریہ کی عظیم الشان لائبریری میں کتابیں رکھنے کے خول سونے کے بنے ہوئے تھے۔ان خولوں میں زیادہ قیمتی اور مفید کتابیں بند کر کے رکھی جاتی تھیں۔

لائبریری کے لیے کتابوں کا حصول

سکندریہ کی قدیم تحریروں سے ہمیں معلوم ہوا کہ سکندریہ کی لائبریری کے لیے کتابیں کیسے حاصل کی جاتی تھیں۔ دوسری صدی عیسوی کا ایک دانش ور جو کہ سکندریہ کا باشندہ تھا لکھتا ہے کہ سکندریہ کی لائبریری موسس کے مندر کے ایک بڑے ہال میں قائم کی گئی تھی۔اس ہال میں مختلف موضوعات پر دو لاکھ کتابیں سکرولوں کی شکل میں موجود تھیں۔ یہ لائبریری قدیم دور کی سب سے بڑی لائبریری تھی۔

ٹالمی بادشاہوں نے اس لائبریری کے لیے کتابیں ایتھنز، رہوڈس، سائرین، روم، بابل اور دنیا بھر سے منگوائی تھیں۔ایتھنز، رہوڈس اور روم میں باقاعدہ کتابوں کی تجارت ہوئی تھی۔

اس لائبریری کے لیے بے شمار کتابیں زبردستی بھی حاصل کی گئی تھیں۔ٹالمی سوم جو کہ فلاڈیموس کا بیٹا تھا اس کا دور حکومت ۲۲۱۔۲۴۶ قبل مسیح میں تھا۔اس نے بندرگاہ پر سپاہی تعینات کر رکھے تھے اور ان کو حکم دیا تھا کہ بندرگاہ آنے والے ہر جہاز کی تلاشی لی جائے اور جو بھی کتب ملے اس کو قبضہ میں لے لیا جائے اور پھر اس کتاب کی نقل تیار کروائی جائے۔ کتاب کے مالک کو اصل کتاب واپس نہ کی جاتی تھی بلکہ اس کی نقل دے دی جاتی تھی۔ اصل کتاب سکندریہ کی لائبریری میں محفوظ کر لی جاتی تھی۔

سکندریہ کی لائبریری میں یونانی شاعرہ ''سوفوکلیز (Sophocles) ''، ''ایسی کلیس (Aesclylus)''، اور یوری پیڈز (Euripeds) کی لکھی ہوئی اصل کتابیں بھی رکھی ہوئی تھیں۔ یہ قیمتی مخطوطے یونان کی حکومت نے محفوظ کیے ہوئے تھے لیکن سکندریہ کی لائبریری کے لیے ان کتابوں کو انتہائی مہنگے داموں ایتھنز سے خریدا گیا تھا۔ جب کہ ہر نسخے کے لیے ۱۵ ٹیلنٹ ضمانت کے طور پر ادا کیے گئے تھے۔تب ان مخطوطوں کی نقلیں اصل کے مطابق تیار کی گئی تھیں۔ جب ان اصل کتابوں کو ایتھنز واپس کیا گیا تو ضمانت کی رقم واپس کر دی گئی۔

سونے کے عوض تول کر خریدی گئی کتابیں

سٹرابولکھتا ہے کہ قدیم ''ڈورک'' زبان اور قدیم یونانی زبان میں لکھی گئی کتابیں جو کہ نام ورشاعروں اور فلسفیوں کی تھیں۔ رہوڈس کے بازار سے سونے کے ساتھ تول کر خریدی گئی تھیں اور ان کتابوں کے عوض کئی من سونا دیا گیا تھا۔ لائبریری میں زیادہ تر کتابیں یونانی تھیں۔ ٹالمی خاندان نے مختلف ممالک سے بھی کتابیں اکٹھی کی تھیں اور ان کے ترجمے یونانی زبان میں کروائے تھے۔

ایک مصری کاہن ''مانتینو'' (Manetno) نے بہت سی مصری کتابوں کے یونانی زبان میں ترجمے کیے تھے اور بہت سی کتابوں کی یونانی زبان میں تشریحات لکھی تھیں۔ مانتینو نے مصر کی تاریخ بھی یونانی زبان میں لکھی اور کئی تاریخی سائنسی ریکارڈ بھی یونانی زبان میں لکھے تھے۔ ہرمی پس (Hermippus) ایک دانش ور تھا جس نے سکندریہ میں تعلیم حاصل کی تھی اس نے قدیم ایرانی مذہب ''زرتشت'' پر ایک کتاب لکھی تھی۔ یہ کتاب بھی سکندریہ کی لائبریری میں موجود تھی۔ ٹالمی دوم ''فلاڈی پس (Philadelphus)'' نے یہ کتاب ہندوستان کے بدھ حکمران ''اشوکا'' کے سفیر سے کسی کتاب کے تبادلے میں حاصل کی تھی۔ اس لائبریری میں بدھ مت کی کتابیں بھی موجود تھیں۔

سکندریہ میں یہودی بڑی تعداد میں موجود تھے اس لیے ان کے لیے عبرانی زبان میں لکھی ہوئی مذہبی کتابیں یونانی زبان میں ترجمہ کروائی گئی تھیں تا کہ وہ ان سے مستفید ہو سکیں۔ لائبریری میں ان کتابوں کی بڑی تعداد موجود تھی۔ یوری گیٹس Euergetes کے دور میں اسی طرز کی ایک لائبریری بنائی گئی تھی۔ یہ لائبریری دیوتا ''سیراپس'' کے مندر میں بنائی گئی تھی۔ دیوتا سیراپس کے مندر کو سیراپیئم کہا جاتا تھا۔ یہ لائبریری بھی دوسری لائبریری سے منسلک تھی۔ بیٹی Daughter دوسری لائبریری کو پہلی لائبریری کی بیٹی کہا جاتا تھا۔

بارھویں صدی عیسوی کا ایک تاریخ دان ''جان زیزس Jhon Tzetzes لکھتا ہے۔ پہلی لائبریری میں ملی جلی کتابیں تھیں اور نوے ہزار (۹۰۰۰۰) مخصوص کتابیں تھیں جب کہ بیٹی لائبریری میں ۴ لاکھ کتابیں تھیں۔ ملی جلی یا Mixed کتاب اس کو کہا جاتا تھا جس میں ایک سے زیادہ موضوعات پر لکھا گیا ہو اور مخصوص کتاب اس کو کہتے تھے جو صرف ایک ہی موضوع پر ہو۔

اندازہ کیا گیا ہے کہ ان دونوں لائبریریوں میں پانچ لاکھ کتابیں ضرور موجود تھیں۔ سکندریہ کا جو بھی حکمران آتا وہ لائبریری میں کتابوں میں پہلے حکمران سے بڑھ کر اضافہ کرتا تھا۔

انڈیا آفس لائبریری، لندن

سلیم الدین قریشی

۱۸ویں صدی کے اواخر میں مغلیہ سلطنت کے زوال کے ساتھ ساتھ ایسٹ انڈیا کمپنی کا اثر ورسوخ بتدریج بڑھتا چلا جارہا تھا انگریزی فوج کو مالِ غنیمت کے ساتھ بے شمار نوادرات اور مخطوطات بھی مل رہے تھے جنہیں فوجی افسر واپسی پر اپنے ساتھ انگلستان لے آتے۔
معاشی بدحالی نے ہندوستان کے بیشمار نامور خاندانوں کو اپنا موروثی اثاثہ فروخت کرنے پر مجبور کر دیا تھا جسے انگریز خرید کر اپنے وطن لے آتے آسکے علاوہ ایسٹ انڈیا کمپنی اور متعدد انگریزوں کے پاس ایسے نوادرات اور مخطوطات کی ایک بڑی تعداد جمع ہوگئی تھی جو ہندوستان کے راجاؤں، نوابوں ،امراء اور مصنفین نے انہیں تحفتاً دیئے تھے۔

ان حالات کو مدِنظر رکھتے ہوئے جب ۱۷۸۴ء میں بنگال کی ایشیاٹک سوسائٹی کی بنیاد ڈالی گئی تو اس کا مقصد مشرقی علوم کی تعلیم کے فروغ کے علاوہ ان تمام مخطوطات کی دیکھ بھال بھی تھا جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے پاس جمع ہوگئے تھے۔

اسی زمانہ میں انگلستان میں بھی اسی قسم کے ایک اور ادارے کی ضرورت محسوس کی جارہی تھی، جہاں ایسٹ انڈیا کمپنی اور انگریز افسران کے ہندوستان سے لائے ہوئے نوادرات اور مخطوطات کو محفوظ کیا جا سکے۔ اس ضرورت کا احساس سب سے پہلے ۱۷۹۸ء میں کمپنی کے ایک ڈائریکٹر کو ہوا۔ جس نے لندن میں اس قسم کے ایک ادارے کے قیام کی تجویز پیش کی۔

اس تجویز میں اس نے اس بات کا اندیشہ بھی ظاہر کیا کہ ایران اور ہندوستان میں بدلتے ہوئے حالات کی وجہ سے مسلمانوں کے نوادرات اور قیمتی اثاثوں کے ضائع ہونے کا ڈر ہے ،بہتر ہوگا کہ ان تمام نوادرات کو انگلستان منتقل کر کے اس ادارے میں محفوظ کر دیا جائے۔

اس دوران مشہور تاریخ دان ادرم نے جو ایک عرصہ تک ہندوستان میں رہ چکا تھا اسی قسم کی ایک اور تجویز پیش کی جس میں کہا گیا تھا کہ ہندوستان سے نادر اور قیمتی مخطوطات سے بھرا ہوا ایک جہاز انگلستان لایا جائے تا کہ یہاں کے باشندوں کو ہندوستان اور ہندوستانی علوم کے متعلق واقفیت بہم پہنچانے کی سہولت حاصل ہو سکے۔

چارلس ولکنز کو جو کمپنی کی ملازمت میں ۱۶ سال تک ہندوستان میں رہ چکا تھا جب ان تجاویز کا علم ہوا تو اس نے اس ادارے کے مہتمم کی آسامی کے لئے اپنی خدمات پیش کر دیں۔ چارلس ولکنز نے ہندوستان میں اپنے قیام کے دوران سنسکرت، بنگالی اور فارسی زبانوں میں مہارت حاصل کرنے کے علاوہ ان زبانوں میں کتابوں کی چھپائی کے فن کو بھی فروغ دیا تھا۔ اپنی درخواست کے ساتھ ولکنز نے مجوزہ کتب خانے کا ایک خاکہ بھی پیش کیا اور تجویز پیش کی کہ کتب خانے سے ملحقہ ایک ایسا عجائب گھر بھی قائم کیا جائے جس میں ہندوستان سے لائی گئی مصنوعات، نباتات، معدنیات اور حیوانات کے نمونے اکٹھے کئے جاسکیں۔

اس تجویز میں ولکنز نے ایک ایسا چھاپہ خانہ قائم کرنے کی سفارش بھی کی تھی جو مشرقی زبانوں میں کتابوں کی چھپائی اور اشاعت کا کام کر سکے۔ تقریباً دو سال کی تاخیر اور سوچ بچار کے بعد فروری ۱۸۰۱ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائرکٹروں نے ان تجاویز پر عمل کرنے کا فیصلہ کیا اور چارلس ولکنز کو کتب خانے کا جس کا نام اس وقت اورینٹل ریپازٹری رکھا گیا تھا، مہتمم مقرر کیا، یہی ادارہ ۱۸۵۷ء کے بعد انڈیا آفس لائبریری کے نام سے موسوم ہوا۔ کتب خانے کو سب سے پہلا قابلِ ذکر عطیہ جو ملاوہ اورم کا ذاتی کتب خانہ تھا جسے اس نے اپنی وصیت میں اس کتب خانے کے لئے وقف کر دیا تھا۔

۱۷۹۹ء میں جب سرنگاپٹم پر انگریزوں کا قبضہ ہوا تو ٹیپو سلطان کا ذاتی کتب خانہ بھی انگریزوں کے ہاتھ آیا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے یہ کتب خانے جس میں اس وقت دو ہزار سے زائد قیمتی اور نادر مخطوطات تھے فورٹ ولیم کالج کلکتہ منتقل کر دیا اس کتب خانے کے کچھ نادر اور نقش و نگار سے مزین نسخے چن کر علیحدہ کر لئے گئے جن میں سے کچھ تو انگلستان کے شاہی خاندان کی نذر کر دیئے گئے اور بقیہ کو انڈیا آفس لائبریری اور آکسفورڈ کیمبرج اور ڈبلن کی یونیورسٹیوں کے کتب خانوں کو دے دیا گیا۔

۱۸۰۶ء میں جب فورٹ ولیم کالج کا کتب خانہ بند ہوا تو اس کتب خانے کے تمام مخطوطات جن میں ٹیپو سلطان کے کتب خانے کے مخطوطات بھی شامل تھے۔ بنگال کی ایشیاٹک سوسائٹی کے حوالے کر دئے گئے ان میں سے جو نسخے فاضل بچے تھے انہیں انڈیا آفس لائبریری منتقل کر دیا گیا اس طرح ٹیپو سلطان کے کتب خانے کے تقریباً چار سو مخطوطات انڈیا آفس لائبریری میں منتقل ہو گئے۔

۱۸۰۶ء میں اس لائبریری کو فارسی عربی اور سنسکرت کے مخطوطات کا ایک اور اہم ذخیرہ ملا جسے بڑودہ کے مہاراجہ نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو عطیہ کے طور پر دیا تھا۔ ۱۹ ویں صدی کے اوائل میں

شاہ عالم کے کتب خانے کا انتشار بھی شروع ہو چکا تھا اس کتب خانے کے مخطوطات کی نیلامی کے دو اشتہار اب انڈیا آفس لائبریری میں موجود ہیں ان میں سے ایک اشتہار کی عبارت کا ترجمہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔ ''پیٹر برا کے ولیم پٹیل کے ذاتی کتب خانے کی فہرست جس میں عربی، فارسی، ہندی ہندوستانی، بنگالی، تامل، مالاباری، تلگو اور آرمینی زبانوں کے مخطوطات کا ایک بیش بہا خزانہ شامل ہے۔ یہ مخطوطات بہت ہی اچھی حالت میں ہیں اور اس سے قبل مغل بادشاہ شاہ عالم مرحوم کے کتب خانے میں شامل رہ چکے ہیں یہ تمام ذخیرہ ۱۳ دسمبر ۱۸۰۹ء کو دن کے بارہ بجے کلکتہ میں ٹی اینڈ سدھی فرم نیلام کرے گی یہ نیلامی آٹھ دن تک متواتر جاری رہے گی۔''

چنانچہ اس نیلامی میں فروخت کئے گئے مخطوطات کا کچھ حصہ تو ایسٹ انڈیا کمپنی نے خرید لیا اور کچھ جو انگریز افسر ذاتی طور پر خرید کر انگلستان لے گئے تھے مختلف ذرائع سے انڈیا آفس لائبریری اور ملک کے دوسرے کتب خانوں میں پہنچ گیا۔

۱۸۴۰ء اور ۱۸۵۷ء کے درمیان ایسٹ انڈیا کمپنی نے برِصغیر کے دو بڑے اہم اور مشہور کتب خانوں کو اپنی تحویل میں لے کر انڈیا آفس لائبریری میں منتقل کر دیا۔ ان میں پہلا بیجاپور کا عادل شاہی کتب خانہ تھا جو ۱۸۴۹ء میں ستارا کے آخری راجہ کی وفات کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کے قبضہ میں آیا۔ اس کتب خانہ کی بنیاد غالباً ۱۴۷۵ء میں بہمنی دور میں پڑی تھی بعد میں عادل شاہی خاندان نے اسے آثار محل میں منتقل کر دیا ابراہیم عادل شاہ اور علی عادل شاہ ثانی کے دور میں اس کتب خانے نے بیحد ترقی کی حتیٰ کہ اس دور میں یہ کتب خانہ دہلی کے شاہی کتب خانے سے کسی طرح کم تصور نہیں کیا جاتا تھا اورنگ زیب عالم گیر کے دکن فتح کرنے کے بعد بھی اس کتب خانے میں اضافہ کا سلسلہ برابر جاری رہا۔

بیجاپور پر مرہٹوں کے قبضہ کے بعد اس کتب خانے کو کافی نقصان پہنچا اور بے شمار مخطوطات ضائع ہو گئے۔ ۱۸۴۹ء میں اس کتب خانے میں صرف ۴۵۱ نسخے باقی بچ سکے جنہیں ایسٹ انڈیا کمپنی نے ۱۸۵۳ء میں انڈیا آفس لائبریری منتقل کر دیا ان میں ۴۳۴ عربی اور ۱۷ فارسی کے نسخے شامل ہیں بیشتر نسخوں پر عادل شاہی حکمرانوں کے علاوہ شاہ جہاں اورنگ زیب اور ان کے امراء کی مہریں اور دستخط موجود ہیں اس کے بعد جو سب سے بڑا اور اہم کتب خانہ انڈیا آفس لائبریری میں شامل کیا گیا وہ دہلی کا شاہی کتب خانہ تھا۔

سترہویں صدی کے ایک سیاح منڈیسلو کے بیان کے مطابق ۱۶۳۸ء جب اس نے کتب خانے کا معائنہ کیا تو اس وقت اس میں ۲۴ ہزار سے زائد مرصع اور منقش نسخے تھے۔ جن کی قیمت کا اندازہ اس نے ۶۴۶۳۷۳۱ روپے سے زائد لگایا تھا۔

اس کتب خانے کا کچھ حصہ تو شاہ عالم کے دور میں جس کا اوپر ذکر کیا جا چکا ہے فروخت کر دیا گیا۔ بقیہ مخطوطات ۱۸۵۷ء میں دہلی کی فتح کے بعد انگریزی فوج کے قبضہ میں آ گئے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے حکام کو جب ان مخطوطات کی اطلاع ملی تو انہوں نے اپنے مالِ غنیمت کے محکمے کو احکام جاری کئے کہ وہ ان تمام مخطوطات کو نیلامی کے ذریعہ فروخت کر دے۔

چنانچہ مخطوطات کی نیلامی کا یہ سلسلہ اگست ۱۸۵۸ء تک جاری رہا۔ بعد میں گورنر جنرل کے پرائیویٹ سیکرٹری ایڈسن سٹون نے مالِ غنیمت کے محکمہ کو نیلامی کا یہ سلسلہ ملتوی کرنے کا حکم دیا تا کہ ان مخطوطات میں سے نایاب اور قیمتی نسخوں کو حکومتِ برطانیہ کے لئے چن لیا گیا اس کے بعد ایک گودام میں رکھ دیا گیا جہاں بارش کی وجہ سے تقریباً ایک سو مخطوطات تو بالکل تباہ ہو گئے اور تقریباً ڈھائی سو دوسرے مخطوطات کو کافی نقصان پہنچا ۱۸۶۷ء کے اوائل میں ان مخطوطات کو ۱۴ بکسوں میں بھر کر کلکتہ منتقل کر دیا گیا تا کہ ان کو وہاں نیلام کر دیا جائے۔ فروری اور مارچ ۱۸۶۷ء کے گزٹ آف انڈیا میں ان مخطوطات کی نیلامی کے اشتہارات ملتے ہیں مثلاً ۱۳ مارچ ۱۸۶۷ء کو جو نیلامی کی گئی اس میں ۱۲۰ مخطوطات ۳، ۱۴، ۱۰۶۷ روپے کے عوض فروخت کئے گئے۔

اس نیلامی کے بعد تقریباً چار ہزار جلدیں باقی بچی تھیں جنہیں ۱۸۷۶ء میں انڈیا آفس لائبریری میں منتقل کر دیا گیا۔ اس طرح اس وقت انڈیا آفس لائبریری میں جو دہلی کلکشن موجود ہے اس میں تقریباً تین ہزار جلدیں عربی زبان میں، ایک ہزار سے زائد فارسی میں اور تقریباً ڈیڑھ سو اردو کے نسخے شامل ہیں۔ ان دو کتب خانوں کے علاوہ ۱۸۴۹ء میں جب لاہور پر انگریزوں کا تسلط ہوا تو شاہی قلعہ لاہور کے کچھ نوادرات جن میں حضرت علیؓ، حضرت امام حسینؓ اور حضرت امام حسنؓ سے منسوب قرآن کریم کی آیات کے نسخے شامل ہیں انڈیا آفس لائبریری میں منتقل کر دیئے گئے۔

اس طرح جب ۱۸۵۶ء میں اودھ کے کتب خانوں کا انتشار شروع ہوا تو ان کتب خانوں کے متعدد نسخے انگلستان کے کتب خانوں کی زینت بنے۔

ان کتب خانوں کے علاوہ لائبریری کو متعدد ایسے ذخیرے بھی ملے جنہیں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازمین ہندوستان سے جمع کر کے واپسی پر اپنے ساتھ انگلستان لے آئے تھے۔ ان میں سب سے پہلا وارن ہیسٹنگز کا ذخیرہ کتب تھا جسے لائبریری نے ۱۸۰۶ء میں ۸۵۹ پونڈ کے عوض خریدا تھا۔ مسٹر جانسن ۱۷۷۵ء سے ۱۷۹۰ء تک بنگال سول سروس میں ملازم تھے اور کچھ عرصہ تک دکن اور لکھنو میں ریذیڈنٹ بھی رہ چکے تھے شاہ عالم نے انہیں مفخر الملک ممتاز الدولہ بہادر حسام جنگ کے خطابات سے نوازا تھا۔ انہیں مرصع اور منقش نسخے اور تصویریں جمع کرنے کا شوق تھا۔ انڈیا آفس لائبریری نے ان سے جو ذخیرہ خریدا اس میں ۱۳ سو سے زائد نقاشی کے عمدہ نمونے شامل تھے جن

میں داراشکوہ کا ذاتی البم جو انہوں نے اپنی شریکِ حیات نادرہ بیگم کے لئے تیار کرایا قابلِ ذکر ہے۔

اس ذخیرے میں تقریباً پانچ سو کتابیں اور سات سو سے زائد قلمی نسخے بھی شامل تھے ان میں کلیات امیر خسرو کا ایک قدیم نسخہ جو ۸۱۶ھ میں نقل کیا گیا تھا خمسئہ جمالیہ کا ایک نسخہ جو بغداد میں ۸۶۹ء میں نقل کیا گیا تھا اور کلیات سودا کا نسخہ جو مصنف نے مسٹر جانسن کو عطیہ کے طور پر دیا تھا قابلِ ذکر ہیں۔ اسی طرح ۱۸۱۷ء میں لائبریری نے جان لیڈن کا ذخیرہ مخطوطات پانچ سو پونڈ کے عوض خریدا اس میں ۲۰۳۷ بھوج پتروں کے علاوہ ۱۵۲ عربی، فارسی اور اردو کے نسخے بھی شامل تھے۔

۱۸۷۶ء میں لندن کی رائل ایشیاٹک سوسائٹی نے ولیم جونز اور رالیش برنر کے ۲۸۹ فارسی، عربی اور اردو کے مخطوطات کو انڈیا آفس لائبریری کی تحویل میں دے دیا۔

مخطوطات کی فہرستیں

اردو مخطوطات کی پہلی فہرست بلوم ہارٹ نے ۱۹۲۶ء میں شائع کی تھی اس کا ایک ضمیمہ راقم اور مسنز سمنز ولیمز نے مل کر مرتب کیا تھا جو ۱۹۸۰ء میں شائع ہوا۔

ان دو فہرستوں کے علاوہ انڈیا آفس لائبریری میں اردو کے جو مخطوطات تھے ان کی فہرست مکمل کی جارہی ہے اور اس سال کے آخر تک شائع ہو جائے گی۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر ضیاء الدین شکیب برطانیہ میں اردو مخطوطات کی ایک جامع فہرست تیار کررہے ہیں جو لندن کا ایک ادارہ اردو مرکز غالباً اگلے سال تک شائع کرے گا۔

فارسی مخطوطات

کی سب سے پہلی فہرست ایتھے نے ۱۹۰۳ء میں آکسفورڈ سے شائع کی تھی بعد میں حاصل کئے گئے کچھ مخطوطات کی تفصیل اربری نے رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے جرنل کے جولائی اور اکتوبر کے شماروں میں شائع کی تھی۔ رائل ایشیاٹک سوسائٹی نے جو مخطوطات انڈیا آفس لائبریری کو دیئے تھے ان کی تفصیل Ross And Browne کی فہرست میں موجود ہے۔ اس کے علاوہ SA Storey نے اپنی کتاب Peasian Literature میں بھی انڈیا آفس لائبریری کے متعدد فارسی نسخوں کا تذکرہ کیا ہے۔ بقیہ مخطوطات کی ہینڈ لسٹ اس لائبریری میں موجود ہے اور ان کی فہرست بندی پر کام جاری ہے۔

عربی مخطوطات کی پہلی جلد لوتھ Loth نے ۱۸۷۷ء میں شائع کی تھی۔ دوسری جلد کا پہلا حصہ سٹوری نے ۱۹۰۳ء میں، دوسرا حصہ آربری نے ۱۹۳۶ء میں تیسرا اور چوتھا حصہ لیوی نے ۱۹۳۶ء اور ۱۹۴۰ء میں شائع کیا۔ رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے کلکشن کی تفصیل راس اور براؤن کی

فہرست میں موجود ہے۔ بقیہ مخطوطات کی فہرست ابھی مکمل نہیں ہوئی۔ پنجابی اور سندھی مخطوطات کی فہرست سی شیکل نے میں تیار کر کے شائع کی تھی۔

پشتو مخطوطات کی تفاصیل بلوم ہارٹ اور MACKENZIE (میکنزی) کی تیار کردہ Catalogue of the Pashto Manuscripts in the the libraries of the British isles میں موجود ہے جو لندن سے ۱۹۶۵ء میں شائع ہوئی تھی۔

مشرقی زبانوں کے مخطوطات کے علاوہ لائبریری میں یورپین مسودات کا ایک علیحدہ شعبہ بھی ہے جس کی دیکھ بھال کی ذمہ داری انڈیا آفس ریکارڈ زز کے پاس ہے اس شعبہ میں ۱۱۵۰ جلدیں اور بکسے موجود ہیں جن میں ہندوستان سے وابستہ انگریزی حکام کے ذاتی کاغذات کے علاوہ سرکاری اور نیم سرکاری خط و کتابت کی نقلیں ذاتی نقلیں بھی شامل ہیں۔ جن لوگوں کے ذاتی کاغذات اب شعبہ میں موجود ہیں ان میں سے ہندوستان کے وائسرائے، گورنر جنرل، سیکرٹری آف سٹیٹ بورڈ آف کنٹرول کے پریذیڈنٹ صوبوں کے گورنر، فوج کے کمانڈر اور انڈین سول سروس کے اعلیٰ افسران شامل ہیں۔ ان کاغذات میں قائداعظم، لیاقت علی خان، سر سید احمد خان، علامہ اقبال، سر فضل حسین اور دوسرے رہنماؤں اور سیاسی لیڈروں کے وہ خطوط بھی شامل ہیں جو انہوں نے انگریز افسران کو لکھے تھے۔

ان تمام کا ذخیرے کا انڈکس کارڈز پر اور ٹائپ شدہ فہرستوں کی شکل میں لائبریری میں موجود ہے۔

مطبوعات

مخطوطات کے ساتھ ساتھ ہندوستان میں شائع ہونے والی اور ہندوستان کے متعلق یورپ میں شائع ہونے والی کتابوں کو جمع کرنے کا سلسلہ بھی جاری رہا۔

انیسویں صدی کے اوائل میں جو کتابیں ہندوستان میں شائع ہوئی تھیں ان کا ایک بڑا حصہ فورٹ ولیم کالج اور برصغیر کے دوسرے کتب خانوں سے حاصل ہوا۔ بقیہ مطبوعات براہِ راست خریداری اور عطیات کے ذریعہ حاصل کی گئیں۔

۱۸۶۷ء میں انڈین رجسٹریشن آف بکس ایکٹ کے تحت انڈیا آفس لائبریری کو یہ اختیار دیا گیا کہ وہ ہندوستان میں شائع ہونے والی کسی بھی کتاب کی ایک جلد قانونی طور پر مفت حاصل کر سکتی ہے بعد میں اس قانون کے تحت برٹش میوزیم کو بھی یہ سہولت مل گئی جس کی وجہ سے ۱۸۶۷ء اور ۱۹۴۷ء کے درمیان ہندوستان میں جتنی بھی کتابیں شائع ہوئی تھیں ان کا ایک بڑا حصہ ان دونوں اداروں میں محفوظ ہو گیا۔ البتہ جنگِ عظیم کے دوران، برطانوی جہازوں کی جنگ میں مصروفیت کی وجہ سے ہندوستان سے کتابوں کی ترسیل کا کام منقطع ہو گیا جس کی وجہ سے اس دوران

شائع ہونے والی کتابوں کی بہت کم تعداد اس لائبریری میں موجود ہے۔

ہندو پاک کی آزادی کے بعد جب لائبریری کا انتظام برطانیہ کے فارن اینڈ کامن ویلتھ آفس کے تحت آیا تو ہندوستان اور پاکستان میں برطانوی سفارت خانوں کو یہ ذمہ داری سونپ دی گئی کہ وہ ان ممالک میں شائع ہونے والی اہم کتابوں کو لائبریری کے لئے خرید کر لندن روانہ کرتے رہیں لیکن شروع شروع میں ہندوستان کی زبانوں کی کتابوں کو جمع کرنے پر زیادہ توجہ نہ دی جا سکی اس کی سب سے بڑی وجہ لائبریری میں ایسے عملے کی کمی تھی جو ان زبانوں کو بخوبی جانتا ہو۔ ۱۹۶۰ء اور ۱۹۷۵ء کے درمیان جب اس کمی کا تدارک کیا گیا تو لائبریری میں ہندوستانی زبانوں کی کتابوں کی باقاعدہ خریداری کا سلسلہ شروع ہوا۔

۱۹۸۲ء تک انڈیا آفس لائبریری اور برٹش لائبریری (برٹش میوزیم لائبریری) کے اورینٹل مینس کرپٹس اینڈ پرنٹڈ بکس کے شعبے علیحدہ علیحدہ اپنے طور پر ہندو پاکستان میں شائع ہونے والی کتابوں کا اضافہ کرتے رہے۔ ۱۹۸۲ء میں جب انڈیا آفس لائبریری کا انتظام فارن اینڈ کامن ویلتھ آفس کی بجائے برٹش لائبریری کے سپرد کیا گیا اور ان دونوں اداروں کو ملا کر ایک ہی محکمہ قائم کر دیا تو انڈیا آفس لائبریری کو یہ اختیار دیا گیا کہ آئندہ وہ صرف پاکستانی مطبوعات حاصل کرے جبکہ اورینٹل مینس کرپٹس اینڈ پرنٹڈ بکس کا شعبہ ہندوستان میں ہونے شائع ہونے والی اردو اور چند دوسری زبانوں کی کتابیں جمع کرے۔ اس سمجھوتے کے تحت ہندوستان اور پاکستان میں شائع ہونے والی کتابوں کے علاوہ ان تمام مطبوعات کی ذمہ داری بھی جو دوسرے ممالک میں ہندوستان کے متعلق یورپین زبانوں میں شائع ہوئی ہیں، بدستور انڈیا آفس لائبریری کے پاس رہنے دی گئی۔

اس وقت لائبریری میں مختلف زبانوں کی جو کتابیں محفوظ ہیں ان کی تعداد مندرجہ ذیل ہے۔

عربی ۷۰۰۰، فارسی ۶۵۰۰، اردو ۳۵۰۰۰، پنجابی ۶۰۰۰، سندھی ۵۰۰۰، بلوچی ۳۰۰، براہوی ۵۰، پشتو ۲۴۰۰، انگریزی اور دیگر یورپین زبانوں میں ۱۲۰،۰۰۰، ہندی ۲۸۰۰۰، تامل ۳۰۰۰۰، بنگالی ۳۰،۰۰۰

ان کے علاوہ تحریکِ خلافت اور تحریکِ آزادی کے متعلق کتابوں، رسالوں اور اشتہاروں کا ایک علیحدہ ذخیرہ بھی موجود ہے جو اردو، فارسی، ہندی اور دوسری زبانوں میں ہندوستان کے علاوہ برطانیہ، جرمنی، فرانس، کینیڈا، امریکہ، ترکی، جاپان اور دوسرے ممالک میں شائع ہوئیں اور جنہیں حکومتِ برطانیہ نے ضبط کر لیا تھا۔

سرکاری مطبوعات (گورنمنٹ پبلیکیشنز)

کتب خانوں میں سرکاری مطبوعات کا ایک علیحدہ شعبہ ہے جس کی دیکھ بھال انڈیا آفس ریکارڈز کے سپرد ہے ان کی مجموعی تعداد اسی ہزار کے قریب ہے اوران میں حکومت ہند کی سرکاری مطبوعات کے علاوہ برطانیہ کی وہ تمام سرکاری مطبوعات بھی شامل ہیں جن کا تعلق ہندوستان سے تھا ان میں برٹش ایکٹس پارلیمنٹری پیپرز ہاؤس آف کومنز کی ڈبیٹس ،لندن گزٹ لیجسٹو کونسل اور اسمبلی کی پروسیڈنگز، ایڈمنسٹریٹو رپورٹز گورنمنٹ گزٹ، سول لٹر سٹیٹس سرپلز، سروے آف انڈیا، جیالوجیکل سروے آف انڈیا، آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا، مختلف محکموں کی سالانہ رپرٹیں حکومتِ ہند کے ریکارڈز کے خلاصے ہندوستان میں شائع ہونے والے اردو اور دوسرے زبانوں کے اخبارات ورسائل میں شائع ہونے والی اہم خبروں اور مضامین کے اقتباسات اور خلاصے تعلیم اور زراعت، ریلوے، حفظانِ صحت پبلک سروس کسٹم اوار اکسائز ریونیو، ملٹری اور سیاسی مہارات، ملک میں جرائم، قحط وباؤں اوراس قسم کے دوسرے موضوعات پرسرکاری محکموں کی تیار کردہ رپورٹیں اور اعداد وشمار شامل ہیں ان تمام ذخیرے کی فہرستیں مکمل ہو چکی ہیں اور یہ فہرستیں ٹائپ شدہ صورت میں لائبریری میں موجود ہیں۔

مطبوعات کی فہرستیں

انڈیا آفس لائبریری کی تمام فہرستیں خواہ وہ یورپین زبانوں کی کتابوں کی ہوں یا ایشیائی زبانوں کی رومن رسم الخط میں ہیں۔

انگریزی مطبوعات

انگریزی مطبوعات کی سب سے پہلی فہرست جس میں دوسری یورپی زبانوں کی کتابیں بھی موجود ہیں ۱۸۴۵ء میں Catalouge of the library og the East India compny کے عنوان سے شائع ہوئی تھی اس کے بعد ۱۸۵۱ء میں اس کا ضمیمہ شائع ہوا۔ ۱۸۸۸ء میں ایک اور فہرست Catalouge of the India office کے نام سے شائع ہوئی۔ ۱۸۹۵ء اور ۱۹۰۹ء میں اس فہرست کے دو ضمیمے شائع ہوئے۔ ۱۹۱۱ء اور ۱۹۳۶ء کے درمیان لائبریری نے جو کتابیں حاصل کی تھیں ان کی فہرستیں Accession لسٹس کے طور پر ۱۸ حصوں میں شائع ہوئیں۔

۱۹۳۶ء اور ۱۹۳۸ء کے درمیان حاصل کی جانے والی کتابوں کا اندراج کارڈز پر ہے ۔۱۹۸۳ء کے بعد آنے والی کتابوں کا اندراج کمپیوٹر پر کیا جارہا ہے۔

اردو مطبوعات

اردو مطبوعات کی پہلی فہرست بلوم ہارٹ نے ۱۹۰۰ء میں شائع کی تھی اس کا ایک ضمیمہ راقم نے مرتب کر کے ۱۹۸۲ء میں شائع کیا تھا بقیہ کتابوں کا اندراج کارڈز اور کمپیوٹر پر ہے اس کے علاوہ ان کتابوں کی فہرست جو تحریکِ آزادی اور دوسرے موضوعات پر شائع ہوئی تھیں اور جنہیں حکومتِ ہند نے ضبط کر لیا تھا راقم نے ۱۹۷۶ء میں شائع کیا تھا اب ایک یونین کیٹلاگ جس میں انڈیا آفس لائبریری اور اورینٹل مینس کرپٹس اینڈ پرینٹڈ بکس ڈپارٹمنٹ میں موجود ہر زبان کی ضبط شدہ کتابیں شامل ہیں میری لائڈ اور گراہم شاہ نے مل کر تیار کی ہے جو عنقریب شائع ہونے والی ہے۔

فارسی مطبوعات کی فہرست آر بری نے تیار کر کے ۱۹۳۷ء میں شائع کی تھی بعد میں آنے والی کتابوں کا اندراج کارڈ اور ۱۹۸۲ء کے بعد کمپیوٹر پر ہے۔

عربی مطبوعات کی ابھی تک کوئی فہرست شائع نہیں ہوئی اس زبان کی تمام کتابوں کا اندراج کارڈ اور ۱۹۸۲ء کے بعد کمپیوٹر پر ہے۔

سندھی پشتو اور پنجابی مطبوعات کی ایک فہرست بلوم ہارٹ نے ۱۹۰۲ء میں شائع کی تھی اس کے بعد موصول کی گئی پنجابی کتب کی فہرست گاور نے مرتب کی تھی جو لائبریری نے ۱۹۷۵ء میں شائع کی پشتو اور سندھی کی بقیہ کتابوں کا اندراج کارڈز اور کمپیوٹر پر ہے، بلوچی، براہوی، سرائیکی، کشمیری اور دیگر علاقائی زبانوں کی کتابوں کی ابھی تک کوئی فہرست شائع نہیں ہوئی ان سب زبانوں کی کتابوں کا اندراج کارڈز پر ہے۔

اخبارات و رسائل

مطبوعہ کتابوں کے ساتھ ساتھ اخبارات و رسائل جمع کرنے کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ ۱۸۶۷ء کے قانون کے تحت بیشتر اخبارات اور رسائل کی جلدیں لائبریری میں وصول ہوتی رہیں البتہ اس دور میں ہندوستانی زبانوں کے اخبارات جو جمع ہو جاتے انہیں جگہ کی کمی اور دیکھ بھال کے مسائل کی وجہ سے کچھ عرصہ کے بعد تلف کر دیا جاتا اس کی ایک اور بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ حکومتِ ہند دیسی اخبارات میں شائع ہونے والی تمام اہم خبروں اور مضامین کے خلاصے اور اقتباسات انگریزی میں ترجمہ کر کے انڈیا آفس کو بھیج دیتی یہ سلسلہ ۱۸۶۸ء سے ۱۹۴۲ء تک جاری رہا۔ جس کی وجہ سے اصل اخبارات کو محفوظ کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی گئی۔

اس کے برعکس اس دور میں ہندوستان سے شائع ہونے والے انگریزی اخبارات کو جمع کرنے کی طرف خاصی توجہ دی گئی تھی جس کی وجہ سے اٹھارویں اور انیسویں صدی کے بیشتر اخبارات کے فائل کسی وجہ نامکمل رہ گئے تھے انہیں اب مائکروفلم خرید کر مکمل کیا جا رہا ہے۔ اس شعبہ

میں انگریزی کے جو اخبارات موجود ہیں ان میں انڈیا گزٹ بنگال کرانیکل، مدراس کوریر، مدراس میل، پائنیر، سٹیٹسمین، ٹائمز آف انڈیا، بمبئے ٹیلی گراف اینڈ کوریر، سپیکٹیٹر، انڈین مرر، فرینڈز آف انڈیا، علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، کامریڈ، ڈان، سول اینڈ ملٹری گزٹ اور دہلی گزٹ قابلِ ذکر ہیں۔ان کے علاوہ اردو اخبارات میں نور مغربی (دہلی)، ہندوستان غدر (سان فرانسسکو)، اخوت (استنبول) جیسے چند دوسرے نادر اخبارات کے شمارے بھی لائبریری میں موجود ہیں۔

اخبارات و رسائل جمع کرنے کا یہ سلسلہ ۱۹۴۷ء کے بعد بھی بدستور جاری ہے۔ ہندو پاکستان سے اب جو اخبارات حاصل کئے جا رہے ہیں ان میں ڈان، پاکستان ٹائمز، ہندوستان ٹائمز اور چند دوسرے اخبارات شامل ہیں۔

رسائل و جرائد

کتب خانہ میں ہندو پاکستان میں شائع ہونے والے رسائل کے علاوہ یورپ اور دوسرے ممالک میں برصغیر کے متعلق شائع ہونے والے رسائل و جرائد کا ذخیرہ بھی موجود، محفوظ ہے۔ ۱۹۴۷ء سے قبل حکومتِ ہند جو سرکاری رسالے شائع کئے تھے ان کے تقریباً مکمل فائل سرکاری مطبوعات کے شعبے میں ہیں اور بقیہ رسائل اور جرائد کے شعبہ میں چند سال پہلے تک ہندوستانی زبانوں کے رسالوں کا ایک علیحدہ شعبہ قائم تھا لیکن ان کی فہرستیں مکمل ہو جانے کے بعد اب اس کو مغربی زبانوں کے رسالوں کے شعبہ میں ضم کر دیا گیا۔کتب خانہ میں اردو، فارسی کے کئی نامور رسالوں مثلاً اخبار مفیدِ عام (آگرہ) بنارس گزٹ، حقیقی عرفان (لاہور) جبل المتین (کلکتہ) گنجینہ علوم (مراد آباد) وغیرہ کے شمارے موجود ہیں اس وقت ہندو پاکستان سے اردو کے جو رسالے حاصل کئے جا رہے ہیں ان میں قومی زبان اردو، کتاب، افکار اور ریسرچ سوسائٹی آف پاکستان کا جرنل شامل ہیں۔

فہرستیں

ایشیائی زبانوں کے اخبارات اور رسائل کی ایک جامع فہرست جس میں انڈیا آفس لائبریری کے علاوہ برطانیہ کے دوسرے کتب خانوں میں موجود اخبارات اور رسائل کا اندراج شامل ہے راقم اور G SHAW نے مل کر مرتب کی تھی، جسے ہارد لیٹر پریس نے The Bibliography of South Asian periodicals کے عنوان سے ۱۹۸۲ء میں برائٹن اور نیویارک سے بیک وقت شائع کیا تھا۔انگریزی اخبارات کی فہرست ڈورتھی واکر نے مرتب کی تھی جو Catalouge of the news paper collection in the India office library کے عنوان سے ۱۹۷۷ء میں شائع ہوئی۔انگریزی اور دوسری یورپین

زبانوں کے رسالوں کا اندراج کارڈز اور کمپیوٹر پر ہے۔

پرنٹس اینڈ ڈرائنگ

انڈیا آفس لائبریری میں مخطوطات اور مطبوعات کے علاوہ ہندوستانی مصوری، فوٹو گرافی اور ڈرائنگز کا ایک بہت بڑا ذخیرہ بھی موجود ہے اس شعبہ میں جو نوادرات ہیں ان میں دارالشکوہ کا ذاتی البم، مغل اور ہندوستان کے دوسرے بادشاہوں، راجاؤں، نوابوں اور ان کے خاندانوں کی تصاویر، ہندوستان میں پائے جانے والے نباتات، پھولوں، پھلوں اور جانوروں کی تصاویر، ہندو پاکستان کے تحریکِ آزادی کے رہنماؤں کی تصاویر برصغیر کے مزہور مقامات اور عمارات کی تصاویر، خاکے اور نقشے شامل ہیں اس ذخیرے کے ایک بڑے حصے کی فہرستیں ڈاکٹر ایم آر چر نے مکمل کر کے شائع کی تھیں۔ اس سلسلے کی کچھ جلدیں Tobby Falk Paulin Rohatch اور پروفیسر رابنسن نے تیار کی تھیں جو بھی اب شائع ہو چکی ہیں۔ بقیہ ذخیرے کا انڈکس کارڈ کیٹیلاگ کی صورت میں موجود ہے۔

نقشہ جات

سرکاری مطبوعات کے شعبہ کی طرح نقشہ جات کا شعبہ بھی ریکارڈ سے منسلک ہے۔ اس شعبہ میں ۳۰ ہزار سے زائد قلمی اور مطبوعہ نقشہ جات کے علاوہ اٹلسوں اور سرکاری غیر سرکاری رپورٹوں کا مجموعہ بھی شامل ہے اس مجموعہ میں ۱۶۰۰ سے ۱۹۴۷ء تک کے وہ تمام نقشے موجود ہیں جو ایسٹ انڈیا کمپنی، حکومتِ ہند، انڈیا آفس اور ہندوستان کے علاوہ دوسرے ممالک کی حکومتوں اور تجارتی فرموں نے تیار کئے تھے۔ اس ذخیرے کے کچھ حصے کی ایک فہرست ۱۸۷۸ء میں شائع ہوئی تھی بقیہ کا اندراج ٹائپ شدہ فہرستوں میں ہے۔

تاریخ کے مخفی کتب خانے

فیانا میکڈونلڈ   ترجمہ: فیاض ندیم

(دمشق میں زیر زمین ریڈنگ روم سے متعلق خبر پھیلنے کے بعد فیانا میکڈونلڈ نے ایسی جگہیں دریافت کیں، جہاں صدیوں سے تحریر کو چھپایا گیا تھا۔ فیانا میکڈونلڈ کا یہ مضمون BBC Culture کے ویب سائٹ پر 19 اگست 2016 کو شائع ہوا۔)

دمشق کے مضافات میں گلیوں کے نیچے، تختوں پر وہ کتابیں موجود تھیں جنہیں عمارتوں پر بمباری کے دوران محفوظ کیا گیا تھا۔ گذشتہ چار برسوں میں درریّا کے محاصرے کے دوران رضا کاروں نے گولہ باری سے تباہ شدہ گھروں میں سے چودہ ہزار کتابیں اکٹھی کیں۔ انہیں اس خوف سے ایک خفیہ جگہ پر رکھا گیا ہے کہ انہیں حکومت اور صدر اسد نواز قوتیں نشانہ بنا سکتی ہیں۔ قارئین کو اس جگہ تک پہنچنے کے لیے بارود اور گولہ باری سے بچتے بچاتے آنا پڑتا ہے۔ اسے شام کی خفیہ لائبریری کہا جاتا ہے اور بہت سے اہل ذوق اس کتب خانے کو ایک اہم وسیلہ تصور کرتے ہیں۔ ''ایسے محسوس ہوتا ہے ایک طرح سے جیسے لائبریری نے مجھے زندگی لوٹا دی ہے۔'' ایک باقاعدگی سے آنے والے صارف عبدالباسط الاحمر نے بی بی سی کو بتایا، ''میں کہوں گا کہ جیسے ایک جسم کو خوراک کی ضرورت ہوتی ہے، بالکل اسی طرح روح کو کتاب کی ضرورت ہوتی ہے۔

کتابوں کو مختلف ادوار تاریخ میں مذہبی اور سیاسی دباؤ کی وجوہات سے چھپایا جاتا رہا ہے۔۔۔کبھی انہیں مخفی ذخیروں کی صورت میں رکھا جاتا، تو کبھی ذاتی مجموعوں کی شکل میں۔۔۔ان میں سے ایک کو اب ''غار کے اندر کا کتب خانہ'' کہا جاتا ہے۔

غار کے اندر کا کتب خانہ

چین میں صحرائے گوبی کے کنارے پر درگاہوں کے نیٹ ورک کے ایک حصّے کو ''ہزار بدھا غار'' کہا جاتا ہے۔ اسے تقریباً ایک ہزار سال تک لوگوں کی دسترس سے دور رکھا گیا۔ 1900 میں ایک تاؤ راہب، وانگ یوانلو، جو غاروں کا ایک غیر سرکاری رکھوالا تھا، اس نے ایک خفیہ دروازہ دریافت کیا۔ یہ خفیہ دروازہ ایک ایسے کمرے میں کھلتا تھا جس میں چوتھی صدی سے لے کر گیارہویں صدی تک کے مسودات بھرے ہوئے تھے۔

وانگ کے رابطہ کرنے پر صوبائی حکومت نے کوئی دلچسپی نہیں دکھائی۔ لیکن اس غار کی خبر پھیل گئی اور ایک ہنگری نژاد کھوجی اوریل سٹیل نے وانگ کو دس ہزار مسودے بیچنے پر آمادہ کرلیا۔ پھر فرانس، روس اور جاپان کے مندوبین آئے اور زیادہ تر قدیم مسودے غار سے چلے گئے۔ معروف جریدے نیویارکر کے مطابق، 1910 تک جب چینی حکومت نے بقیہ مسودوں کو بیجنگ منتقل کرنے کا حکم دیا، اس وقت تک اصل ذخیرے کا محض پانچواں حصہ باقی بچا تھا۔

اس کے باوجود اصل مسودے اب بھی دیکھے جاسکتے ہیں: ذخیرے کو ڈیجیٹل شکل دینے کی ابتدا1994 میں ہوئی۔ دنیا بھر کے شراکت داروں کے ساتھ، برٹش لائبریری کی سرکردگی میں، دی انٹرنیشنل ڈن ہانگ پراجیکٹ کا مقصد یہی ہے۔ جیسا کہ دی نیو یارکر نے لکھا، ''آرام دہ کرسیوں پر بیٹھ کر محفوظات کو کھنگالنے والے اب دنیا کے قدیم ترین سٹار چارٹ دیکھ سکتے ہیں۔ ایک تاجر کی بابیلون سے چائنہ جاتے ہوئے عبرانی میں لکھی ہوئی دعا کو پڑھ سکتے ہیں، ایک مسیحی صوفی کی بدھستوا کے روپ میں بنائی ہوئی پینٹنگ دیکھ سکتے ہیں، ایک غلام لڑکی کی فروخت کا معاہدہ پڑھ سکتے ہیں، جسے ریشم کے ایک تاجر کی قرض کی ادائیگی کے لئے بیچا گیا تھا، یا ترک زبان کے حروف میں لکھی گئی علمِ غیب کی کتاب کو پڑھ سکتے ہیں۔

غار کو کیوں بند کیا گیا تھا؟ کوئی نہیں جانتا۔ سٹین کے مطابق یہ اُن کتابوں کو محفوظ کرنے کا طریقہ ہوسکتا ہے، جو استعمال میں نہیں ہوتی تھیں۔ لیکن اہم ہونے کی وجہ سے انہیں پھینکا بھی نہیں جاسکتا تھا، یعنی یہ ایک قسم کا متبرک فضلہ تھا۔ پال پیلیوٹ جو چینی علوم کا ماہر فرانسیسی ہے، اس کا قیاس ہے کہ ایسا 1035 میں ہوا جب ژی ژیا سلطنت نے ڈنیانگ پر حملہ کیا۔ چینی عالم رونگ ژن جیانگ کی رائے ہے کہ غار کو اسلامی حملہ آور خاراخانوف کے خوف سے بند کیا گیا تھا، جس کا حملہ کبھی ہوا ہی نہیں۔

اس کو چھپانے کی کوئی بھی وجہ ہو، غار کے مواد نے، ایک صدی سے، جب سے یہ دریافت ہوا ہے، تاریخ کو بدل کے رکھ دیا ہے۔ ڈائمنڈ سوترا جو ڈن ہاؤنگ کی ایک دستاویز ہے، بدھ مت کا انتہائی متبرک کام ہے۔ برٹش لائبریری کے مطابق غار میں موجود نقل کی عمر AD868 ہے۔ یہ دنیا کی ایسی پہلی مکمل دستاویز ہے جسے اپنی تاریخ کے ساتھ چھاپا گیا ہے۔ یہ اس بات کی یاد دہانی کرواتی ہے کہ کاغذ اور طباعت کی ابتدا یورپ میں نہیں ہوئی۔ نیو یارک جریدے کے مطابق، ''طباعت کی ابتدا دعا کی شکل میں ہوئی۔ دعائیہ پہیے کو گھمانے کے مترادف، یا یروشلم میں مغربی دیوار پر نوٹ کی طرح، لیکن صنعتی پیمانے پر''

ایک رخ اور ایک عبادت

مذہبی متون کا ایک اور خفیہ خزانہ جس کی معلومات دستیاب ہیں، 1612 میں دریافت ہوا۔ اگرچہ یہ ابھی بھی سازشی نظریات کے موضوع کے طور پر زیرِ بحث رہتا ہے۔ ویٹیکن کے محفوظات (archives) ہزار سال سے بھی پہلے کے پوپ کی خط وکتابت کو ظاہر کرتے ہیں۔ مزید یہ کہ ڈان براؤن کے ناول ''اینجلز اینڈ ڈیمن'' میں ایلومی ناٹی کے ساتھ لڑنے والے ہارورڑ ماہرِ علامیات کے طور پر ظاہر ہوئے۔ ذخیرے کے افواہوں کا حصہ بننے والے مواد میں غیر ارضی کھوپڑیاں، حضرتِ عیسیٰ کے قتل سے متعلق تحریریں، ٹائم مشین جو کرونو وائر کہلاتی ہے، جسے بینیڈکٹ راہب نے اس لئے بنایا تھا تا کہ وہ پچھلے وقتوں میں جا سکے، اور حضرت عیسیٰ کی مصلوبیت کی فلم شامل ہیں۔ اس ساری داستان کو عیاں کرنے کی غرض سے اس ذخیرے تک رسائی حاصل کر کے کھولا گیا ہے اور ران محفوظات میں سے حاصل ہونے والی دستاویزات کی ایک نمائش روم میں کیپیٹو لائن میوزیم میں لگائی گئی۔ پوپ لیو XIII نے پہلے پہل دیکھے بھالے کچھ سکالرز کو 1881 میں جائزے کی اجازت دی۔ اور اب بہت سارے محققین انہیں دیکھ سکتے ہیں، اگرچہ ان دستاویزات کی دیکھ پرکھ اور ٹٹول ابھی بھی ممنوع ہے۔ سیکرٹ، لاطینی زبان کے لفظ سیکریٹم سے آیا ہے، جس کے قریب قریب معانی نجی ملکیت کے ہیں۔ ابھی بھی محفوظات کے بہت سے حصوں تک پہنچ ممنوع ہے۔

سکالرز کو 1939 سے پوپ کے کاغذات کو دیکھنے کی اجازت نہیں ہے۔ جب جنگ کے دنوں میں متنازع پونٹف پائیس پوپ بنا، اور محفوظات کا ایک حصہ جو افضلین کے ذاتی معاملات سے متعلق تھا، 1922 سے اس تک رسائی ممنوع ہے۔

یہ محفوظات کنکریٹ کے بنکر میں واقع سینٹ پیٹر باسیلکا کے پچھلے حصے میں، جہاں سوئس محافظوں اور افسران جو کہ ویٹیکن کی اپنی پولیس فورس میں سے ہیں، کی حفاظت میں ہیں۔ یہ یہاں پر موجود لفظوں کی طاقت کو مزید تقویت بخشتے ہیں۔

ویٹیکن کی موزارٹ، ایراسمس، شارلمین، والیٹر اور اڈولف ہٹلر جیسی شخصیات کے درمیان خط وکتابت کے ساتھ ساتھ یہاں پر بادشاہ ہنری ہشتم کی آرگوان کی کیتھرین سے نکاح کی منسوخی کی درخواست بھی ہے جسے پوپ کلیمنٹ ہفتم نے ماننے سے انکار کر دیا تھا، تو ہنری نے طلاق دے دی، جو روم کی چرچ آف انگلینڈ سے علیحدگی کا باعث بنی۔

محفوظات میں پوپ لیو دہم 1521 کا وہ حکم نامہ بھی شامل ہے جس میں مارٹن لوتھر کو دین نکالا دیا گیا تھا، گلیلیو کے خلاف بدعت کے مقدمے کا ہاتھ سے لکھی ہوئی جرح کی کارروائی بھی شامل ہے، اور مائیکل اینجلو کا وہ شکایتی خط بھی شامل ہے جس میں لکھا گیا ہے کہ اسے سیسٹائن چیپل

کے کام کا معاوضہ ادا نہیں کیا گیا۔

دیوار کی ایک اور اینٹ

پرانے قاہرہ میں ایک ذخیرہ جو مصلح محافظوں کی حفاظت میں تو نہیں تھا، لیکن اسے صدیوں سے نظر انداز کیا گیا تھا، مصر میں اس وقت تک گم گشتہ رہا جب تک کہ ایک رومن یہودی نے اس کی اہمیت نہیں جان لی۔ جیکب سافر نے اس گنجینہ کا ذکر اپنی تصنیف میں 1874 میں کیا۔ لیکن پھر بھی 1896 تک اسے کوئی نہ جانتا تھا، جب سکاٹ لینڈ کی جڑواں بہنوں ایگنس لیوس اور مارگریٹ گبسن نے اس کے کچھ مسودے اپنے کیمبرج یونیورسٹی کے فیلو سولومون شیسٹر کو دکھائے تو اس خزانے کو شہرت ملی۔

بن عزرا کنیسہ کی دیوار میں چھپے 280,000 عبرانی نسخوں کے ٹکڑے تھے: جنہیں کائرو گنیزاح کہا گیا ہے۔ یہودی قانون کے مطابق کوئی بھی تحریر جس میں خدا کا نام درج ہو پھینکی نہیں جا سکتی۔ ایسی تحریروں میں سے جو نیچے گر جاتی ہیں انہیں کنیسیہ کی دیوار کے ایک حصے میں یا قبرستان میں اس وقت تک ذخیرہ کر لیا جاتا تھا، جب تک کہ انہیں باقاعدہ دفن نہیں کروا دیا جاتا تھا۔ اس مخزن کو گنیزاح کہا جاتا ہے، جس کا عبرانی سے مطلب ''چھپا دیا گیا'' ہے۔ جنہیں بعد میں محفوظات (archives) کہا جاتا ہے۔

فیوسٹیٹ میں 1000 سال تک یہودی کمیونٹی اپنی تحریروں کو مقدس ذخیروں میں جمع کرتی رہی۔ اور کائرو گنیزاح کو بن چھوئے رکھا گیا۔ نیو یارکر جریدے کے مطابق: ''قرونِ وسطیٰ کے یہودیوں نے شاید ہی خدا کا ذکر کئے بغیر کچھ لکھا ہو۔ چاہے ذاتی خطوط ہوں یا، خریداری کی فہرستیں'' اور نتیجے میں ''ہمارے پاس ایک منجمد پوسٹ بکس ہے، جس کے اندر دو لاکھ پچاس ہزار ٹکڑے ہیں جو مصر میں نویں سے لے کر انیسویں صدی تک کی زندگی کے بے مثال ذخیرے پر مشتمل ہے۔ اس طرح کا وسیع اور اتنا مکمل کوئی اور ریکارڈ موجود نہیں ہے۔''

بَین آؤتھویٹ، جو کیمبرج میں گنیزاح ریسرچ کے سربراہ ہیں، نے نیو یارکر کو بتایا کہ سکالرز کے لئے کائرو گنیزاح کا ذخیرہ کتنا اہم ہے، ''اس میں کوئی مبالغہ آرائی نہ ہوگی اگر کہا جائے کہ جو کچھ ہم یہودیت، مشرقِ وسطیٰ اور بحیرہ روم کے بارے قرونِ وسطیٰ میں جانتے تھے، دوبارہ لکھا ملا ہے۔''

ٹکڑوں سے پتہ چلتا ہے کہ یہودی تاجر عیسائیوں اور مسلمانوں سے تعاون کرتے تھے اور یہ کہ یہودیوں کے ساتھ اس سے کہیں زیادہ رواداری کا سلوک ہوتا تھا، جیسا کہ ہم اس سے پہلے تصور کرتے تھے، اور یہود دشمنی ہماری سوچ سے کہیں کم تھی۔ اس ذخیرے کی اہمیت کا اعتراف بڑھتا

جا رہا ہے۔ 2013 میں آکسفورڈ اور کیمبرج یونیورسٹی کی لائبریریوں نے اس ذخیرے کو محفوظ رکھنے کے لیے چندہ جمع کیا۔۔۔انہوں نے پہلی دفعہ اس طرح مل کر کام کیا ہے۔

اسی دوران ڈیوڈ ابولافیا جو، ''دی گریٹ سی: بحیرۂ روم کی انسانی تاریخ کے مصنف ہیں نے کہا، '' کائرو گنیزا ح کی دستاویزات ایک سرچ لائٹ کی مانند ہیں، جو بحیرۂ روم کی تاریخ کے تاریک کونوں کو منور کرتی ہے۔ اور نا صرف قرونِ وسطیٰ کے مصر، بلکہ دور دراز کے علاقوں کے یہودیوں کی معاشرتی، معاشی اور مذہبی زندگی پر بھرپور روشنی ڈالتی ہیں۔ یورپی اور اسلامی دنیا میں اس کے پلّے کا کوئی اور ذریعہ دسویں سے بارہویں صدیوں کی تاریخ سے متعلق نہیں ہے۔

بین السطور

1913 میں قرونِ وسطیٰ کی کتابوں کے ایک ولندیزی تاریخ دان اریک کواکّل نے ''ایک قابلِ ذکر دریافت'' کا ذکر کیا ہے۔ جو لیڈن یونیورسٹی کی ایک کلاس جسے وہ پڑھاتا تھا، اس کے طلباء نے کی تھی۔ اس نے ایک بلاگ مضمون جس کا عنوان ''قرونِ وسطیٰ کے چھپے ہوئے محفوظات کا ظاہر ہونا'' میں ذکر کیا ہے، '' جبکہ طلبا اجلاد کی باقیات کا منظّم انداز سے جائزہ لے رہے تھے، انہیں 132 نوٹس، خطوط، اور رسیدیں ملیں جو رائن کے علاقے سے نا معلوم عدالتی یاداشتیں ہیں اور کاغذ کے چھوٹے ٹکڑوں پر لکھی گئی ہیں۔ یہ 1577 میں چھپنے والی ایک کتاب کی بائنڈنگ میں چھپی ہوئی تھیں۔''

نہ پھینکے جا سکنے والے متروکہ فضلہ کی بجائے یہ ٹکڑے ایک ایسا ملبہ ہے جسے کتب کی جلدیں کرنے والوں نے ری سائیکل کر دیا تھا۔ کواکّل نے لکھا ہے کہ قرونِ وسطیٰ کے لکھے ہوئے مواد کی ری سائیکلنگ، ابتدائی جدید (قرونِ وسطیٰ) جلد سازوں کی ورکشاپس میں ایک معمول تھا۔ ''جب 1577 کی چھپی ہوئی ایک کتاب کو جلد میں پرویا جانا تھا، جلد سازوں نے ان 132 کاغذ کے ٹکڑوں کو اپنے نیلے ری سائیکلنگ والے ردی کے ڈبے میں سے نکالا، اور ہو سکتا ہے گیلا ہی گتّے کے ٹکروں میں ڈھال دیا ہو۔ اس نے کہا، ''اس کا مطلب یہ ہے کہ جو الفاظ کبھی بھی آنے والے وقتوں کے لوگوں کے لئے نہیں تھے، آج بھی پڑھے جا سکتے ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ کاغذ کے ٹکڑے اس لئے بھی قابلِ ذکر ہیں کہ یہ قرونِ وسطیٰ کی لکھی گئی اشیا کبھی کبھار ہی باقی بچ رہتی ہیں۔۔۔ چند ہی جگہیں ایسی ہیں جہاں اس طرح کی اشیاء صدیوں سے بلا خلل دبی ہوئی ہیں۔'' اُس کے مطابق، ''اس طرح سے ان کا لمبا سفر ہماری جدید دنیا کی طرف شروع ہوا، ایک بھگوڑے کی مانند۔۔۔ سولھویں صدی کے مواد سے لفٹ لے کر۔

رسیدوں، افسران کے نام، عرضیوں اور خریداری کی فہرستوں سمیت یہ ذخیرہ تاریخ

دانوں کے لئے نایاب کی حیثیت رکھتا ہے۔ کواکّل نے لکھا ہے کہ،''اس طرح کے پیغامات ہمیں حقیقی قرونِ وسطیٰ کے اتنا قریب لے جاتے ہیں، جتنا ہم جا سکتے ہیں۔ یہ قرونِ وسطیٰ کی آوازیں ہیں۔ جنہیں ہم عام طور پر نہیں سنتے، یہ زمین پر پیش آئے واقعات کی کہانی سناتے ہیں۔''

مزید یہ کہ یہ ذخیرہ اس سے کہیں بڑا ہوسکتا ہے جتنا پہلے سوچا گیا تھا۔ ایکس رے تیکنیک جسے پینٹنگز کی سطح سے نیچے مشاہدہ کے لئے اور ترکیب کے ابتدائی مراحل کا پتہ لگانے کے لئے وضع کیا گیا تھا، اس کو استعمال کرتے ہوئے کواکّل نے کتابوں کی بھر بھری جلدوں میں سے دیکھنے کا طریقہ ایجاد کیا۔ اس تکنیک کی مدد سے اکتوبر 2015 میں اس نے لیڈن یونیورسٹی کی لائبریری میں چھپی ہوئی کتابوں کا معائنہ کرنا شروع کیا۔

نئی تکنیک اس لحاظ سے حیران کن ہے کہ یہ قرونِ وسطیٰ کے اُن پرزوں کو دکھا سکتی ہے بصورتِ دیگر جنہیں نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔ کیونکہ یہ چرمی کاغذ کی تہہ کے نیچے چھپے ہوئے ہیں۔ کواکل نے اپنے پوشیدہ لائبریری پراجیکٹ کے بلاگ میں لکھا،''جبکہ تیکنیک میں بہتری کی ضرورت ہے، یہ ایسے عمل کی طرف اشارہ ہے، جو لائبریری میں پوشیدہ لائبریریوں کو ظاہر کر سکتا ہے۔''

''ممکن ہے ہم قرونِ وسطیٰ کی لائبریری تک پہنچ سکیں، اگر ہم جلدوں میں چھپے ہوئے ہزاروں مسودوں کے ٹکڑوں تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔''

ممتاز حسن کی لائبریری

فقیر سید وحید الدین

جناب ممتاز حسن کی شخصیت سرکاری اور علمی حلقوں میں کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ وہ نیشنل بنک آف پاکستان کے مینیجنگ ڈائریکٹر ہونے کے علاوہ سرکاری و نیم سرکاری کمیٹیوں، ادبی و تحقیقی انجمنوں اور علمی اداروں کے سربراہ بلکہ روح رواں ہیں۔ میرے ان کے درمیان ذاتی شناسائی کا آغاز قیامِ دہلی کے دوران ہوا تھا، جب وہ بھی سرکاری ملازمت میں تھے اور میں بھی۔ لیکن علمی تحقیق و جستجو اور تصنیف و تالیف کے موضوعات پر کھل کر باتیں کرنے کا موقع مجھے کراچی میں اپنی کتابیں مرتب اور شائع کرنے کے دوران ملا۔ میں نے ان کی علم دوستی اور ادب نوازی کی شہرت پہلے سے سن رکھی تھی اور ان کی شخصیت اور ذوقِ علم و ادب کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار ''روزگارِ فقیر'' جلد دوم میں بھی کر چکا ہوں، لیکن یہاں ان کی اس خوبی اور خصوصیت کا ذکر مقصود ہے جس نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا ہے اور سچ تو یہ ہے کہ اسی نے ان کی شخصیت کو منفرد اور انتہائی پرکشش بنا دیا ہے وہ ہے کتابیں جمع کرنا ان کا مطالعہ اس فیشن زدہ ماحول اور سستی شہرت کے زمانے میں بہت سے اہلِ علم کے لئے قابلِ رشک ہے۔ اردو، پنجابی، انگریزی، فارسی اور عربی زبانوں میں عبور رکھتے ہیں۔ انہوں نے فرنچ بھی سیکھی ہے۔ خداداد قوتِ حافظہ کے مالک ہیں۔ شعر و شاعری کا ذکر چھڑ جائے تو ایک ہی نشست میں فردوسی، حافظ، مولانا روم، امراء القیس، متنبّی، غالب، اقبال، گوئٹے اور شیکسپیئر کے منتخب اشعار سناتے چلے جاتے ہیں۔ اس کے اس ذاتی جوہر کا تعلق مطالعے سے ہے لیکن ان کا ذوق صرف مطالعے تک محدود نہیں کتابیں جمع کرنے کی ہر ممکن سعی اور جستجو نے اس کے حسن و لطافت میں اور بھی اضافہ کر دیا ہے۔

اسی ذوق کی بدولت ساری زندگی مسلسل جدوجہد کر کے انھوں نے ایک لائبریری قائم کی ہے۔ اگرچہ کتابوں کی ایک خاصی تعداد وہ اپنی مرحوم لڑکی کے نام پر پنجاب پبلک لائبریری کو نذر کر چکے ہیں لیکن جو ذخیرہ کتب ان کے پاس موجود ہے وہ کسی طرح ایک گراں قدر اور اچھی لائبریری سے کم نہیں۔

پٹنہ کی خدابخش لائبریری تو بین الاقوامی شہرت کی مالک ہے، مگر شخصی اور ذاتی کتب

خانوں میں حیدرآباد دکن کے نواب سالار جنگ اور نواب سرامین جنگ، یوپی کے مولوی سبحان اللہ گورکھ پوری اور نواب صدر یار جنگ، مولانا حبیب الرحمٰن شروانی کے کتب خانے بہت شہرت رکھتے ہیں۔ ممتاز حسن صاحب کے کتب خانے نے کراچی میں انھیں لائبریریوں کی چھوٹے پیمانے پر یاد تازہ کردی ہے۔ علم وادب کے ہر موضوع پر مختلف زبانوں میں کتابیں۔ وہ بھی اس اہتمام کے ساتھ کہ بہت سی کتابوں کے پہلے ایڈیشن کے نسخے موجود ہیں۔ متعدد کتابوں پر مصنفین کے دستخط ثبت شدہ ہیں جو کتابیں Out of print ہیں، ان کو اصل نسخوں سے فوٹو سٹیٹ کرا کے محفوظ کرلیا ہے۔ بعض نادر مخطوطات بھی ہیں۔ ان کتابوں کے جمع کرنے میں نہ جانے کتنا وقت اور روپیہ صرف ہوا ہوگا۔ پھر ان کا احتیاط اور سلیقہ سے رکھنا، کتنی محنت اور دردِسری چاہتا ہے جب بھی کوئی نئی کتاب انھیں مل جاتی ہے تو ان کی خوشی کی انتہا نہیں رہتی۔ غیر ملکوں کے دورے جاتے ہیں تو واپسی پر نایاب نئی یا پرانی کتابیں ان کے ہمراہ ضرور ہوتی ہیں۔ اسی طرح دانہ دانہ کرکے یہ خرمن انھوں نے جمع کیا ہے۔

جب میں ''روزگارِ فقیر'' جلد دوم مرتب کررہا تھا تو اسی لائبریری کی ورق گردانی کی بدولت تصاویر کا ایک بڑا خزانہ میرے ہاتھ آیا۔ اقبالیات کے موضوع پر اگر انھیں کسی مقام پر اور کسی زبان میں کاغذ کا ایک پرزہ، مطبوعہ یا غیر مطبوعہ ایک ورق بھی مل سکا ہے تو اسے ضرور محفوظ کرلیا ہے۔ یہ ایک ایسا کارنامہ ہے کہ آئندہ نسلیں اس سرچشمے سے اکتسابِ فیض کریں گی۔ ہمارے ہاں کتنے لوگ ایسے ہیں جو اپنا وقت اور روپیہ اس طرح کتابوں پر صرف کرتے ہیں اور کتابوں کو دل سے زندگی کا بہترین رفیق سمجھتے ہیں۔ حالانکہ یہ ایسی دولت ہے کہ ایک الماری میں جواہرات ہوں اور دوسری الماری میں کتابیں تو ایک صاحبِ ذوق کی دلچسپی کا مرکز کتابوں کی الماری ہوگی۔ علم اور علمی ذخیرے کی قدر و قیمت کا اندازہ حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ کے اس قول سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ

''علم ایک ایسا خزانہ ہے کہ اسے جتنا خرچ کیا جائے اس میں اتنا ہی اضافہ ہوتا ہے۔''

میرا کتب خانہ: نوعیت، انفرادیت اور مستقبل

ڈاکٹر معین الدین عقیل

تشکیلی دور

اپنی دل چسپیوں میں، جو بچپن سے میرے ساتھ رہیں، کتاب خوانی سب سے مستقل اور روز افزوں رہی۔ جب ہوش سنبھالا تو والد (سید ضمیر الدین) کو مستقل اور والدہ (عزیزہ بانو) کو اکثر مطالعے میں مصروف دیکھا۔ والد کو تاریخ سے دل چسپی تھی۔ وہ پڑھنے کے ساتھ ساتھ کچھ لکھتے بھی تھے اور ان کی لکھی ہوئی کچھ بیاضیں اور یادداشتیں محفوظ بھی رہیں۔ والدہ کو اس وقت افسانوی ادب سے دل چسپی تھی اور اسی لیے انھوں نے کچھ افسانے بھی لکھے جو شائع تو نہ ہوئے لیکن میں نے انھیں پڑھا تھا۔ کاغذ، قلم اور کتاب سے انسانی دل چسپی کے یہ وہ پہلے تجربات تھے جن کے زیرِ سایہ بلکہ زیرِ اثر میں نے زندگی شروع کی۔ ابھی یہ چار پانچ سال کی میری عمر کے تجربات تھے اور ہم ابھی پاکستان نہیں آئے تھے، مملکت حیدر آباد کے ایک شہر 'اودگیر' (نزد 'بیدر') میں رہائش پذیر تھے جہاں میرے والد اپنی ملازمت کے سلسلے میں تعینات تھے اور اس کے ایک نواحی قصبے 'لونی' میں ہماری کچھ جائیداد بھی تھی۔ ان سب کو چھوڑ چھاڑ کر مارچ ۱۹۵۳ء میں ہمارے اس خاندان نے، جس میں میرے ایک ہی بڑے بھائی (سید محی الدین نثار) بھی تھے، جو مجھ سے چار سال بڑے تھے، پاکستان ہجرت کی اور کراچی کو اپنا مستقل وطن بنا لیا۔

اس ہجرت یا نقلِ مکانی کے برسوں بعد تک، کہ جب خود ہم دونوں بھائی خود کفیل نہ ہوئے، حالات بہت مساعد اور کشادہ دست نہ رہے لیکن جو چیز نا مساعد حالات میں بھی جاری رہی وہ ہم سب کے مطالعے کی یکساں عادت تھی جس میں کبھی کوئی کمی نہ آئی۔ اس زمانے میں گلی کوچوں میں 'ایک آنہ لائبریری' ہوا کرتی تھیں جن میں عام دل چسپی کی کتابیں ایک دن کے لیے ایک آنہ کرایے پر ملا کرتی تھیں اور اس وقت مطالعے کے شائقین کے لیے بڑا سہارا ہوا کرتی تھیں۔ ان لائبریریوں میں زیادہ تر تو ناولیں یا افسانوی ادب ہی ملا کرتا تھا لیکن کبھی کبھی علمی، مذہبی اور تاریخی موضوعات پر بھی عام سی کتابیں آ جایا کرتی تھیں۔ کیوں کہ کتابیں رکھنے کے معاملے میں ان لائبریریوں میں بھی ایک مسابقت سی رہتی تھی اور ان کے مالکان کوشش کرتے رہتے تھے کہ قارئین

کی دل چسپیوں کی تسکین کا خوب سے خوب تر سامان فراہم کرتے رہیں۔ میں اس وقت ایک عام سی فضا کے زیرِ اثر افسانوی ادب زیادہ دل چسپی اور تواتر سے پڑھا کرتا تھا۔ چناں چہ میں نے ان ہی لائبریریوں سے اردو کا سارا افسانوی ادب، قدیم، جدید، معاصر یہاں تک کہ 'طلسم ہوشربا' اور 'داستان امیر حمزہ' جیسی کتابیں بھی پڑھ ڈالیں اور دیگر موضوعات پر بھی پڑھنے کا موقع ملتا رہا۔ میرے بھائی کو بھی مطالعے کا بہت شوق تھا بلکہ اس میں ایک بڑا فرق یہ تھا کہ عمر میں بڑے ہونے کی وجہ سے اور قدرے وسیلہ میسر آنے کی وجہ سے انھوں نے اپنے دائرۂ دل چسپی کے تحت ناولیں خرید کر پڑھنی شروع کیں۔ ابنِ صفی، جو اس وقت سب سے زیادہ پڑھا جانے والا مصنف تھا، ان کا بھی محبوب تھا۔ ابنِ صفی کی تمام ہی کتابیں انھوں نے ہر طرح کوشش کر کے خرید ڈالیں اور پھر وہ دیگر مقبول و معروف اور معیاری و کم معیاری ہر طرح کی کتابیں جو سستی بھی ہوتیں، خریدنے لگے۔ اس طرح مجھے ہر طرح کا مقبول ادب پڑھنے کی مزید سہولتیں اور آسانیاں فراہم ہونے لگیں۔ میں ان کی جمع کی ہوئی ساری کتابیں بصد شوق و دل چسپی اور بلا تفریق پڑھتا ہی نہیں 'پیتا' رہا۔

یہ میرے ہائی اسکول کے ابتدائی سالوں کا زمانہ تھا۔ اس وقت کچھ اچھے دوست بھی مقدر سے مل گئے۔ جن کے ساتھ علمی اور ادبی سرگرمیوں، محفلوں، اور ایسی ہی دل چسپی کے حامل 'بزرگوں' سے ملاقاتوں کے مواقع ملنے لگے۔ اس زمانے میں اسکول میں اساتذہ بھی بہت مخلص، شفیق اور مہربان تھے۔ ان میں ایک استاد اقتدار احمد اکبر کو ادب سے خاص دل چسپی اور مناسبت تھی۔ وہ شاعر بھی تھے اور شعری محفلیں اور تنقیدی نشستیں انھوں نے اسکول ہی میں بعد کے اوقات میں منعقد کر کے ان میں ہمیں بلانا شروع کیا اور ساتھ ہی ان میں کچھ لکھ کر پیش کرنے کے ساتھ ساتھ تنقید و رائے دینے کی تحریک اور اس طرح دراصل تربیت بھی دیتے۔ اس ضمن میں ہمارے شوق کو مزید مہمیز دینے کے لیے انھوں نے ازخود اپنی ذاتی کتابیں گھر سے لا کر ہمیں پڑھنے کے لیے دینی شروع کیں جو ادبی موضوعات اور تنقیدی مزاج کی ہوتیں۔ اس طرح مجھے افسانوی اور ہلکے پھلکے ادب سے بڑھ کر قدرے ٹھوس و معیاری ادب اور تنقیدی کتابیں پڑھنے کا موقع ملا اور یہ شعور پیدا ہونے لگا کہ معیاری ادب کیا ہوتا ہے اور کس طرح کی کتابیں زیادہ سے زیادہ مفید ہو سکتی ہیں۔ یوں میں نے اسکول کے زمانے ہی میں اردو کا قریب قریب سارا دستیاب جدید و قدیم تخلیقی ادب، ممتاز مصنفین، شاعروں اور نقادوں کو پڑھ ڈالا اور پھر ادبی موضوعات پر لکھنے کی طرف بھی آمادہ ہوا اور اسکول سے نکلنے والے 'میگزین' میں، بلکہ ایک دو طویل مضامین اخبارات میں بھی شائع ہوئے۔ پھر مزید دل چسپی یہ پیدا ہوئی کہ جو پڑھا جائے اسے خریدا بھی جائے اور بار بار

پڑھنے کے لیے یہ مفید بھی ہوگا۔اس طرح یہ کتابوں کی خریداری کے شوق اور کتابوں کے جمع کرنے کا آغاز تھا۔

آغاز

یہ شوق روز افزوں رہا اور اس حد تک کہ جنون کی صورت اختیار کر گیا۔ یہ سن ساٹھ کی دہائی کا ذکر ہے۔ جیب خرچ کے نام پر جو اور جتنی رقم ملتی، جو اتنی کم ہوتی کہ اس میں صِفر بھی نہ آتا، یا اسکول آمد و رفت کے لیے بس کے کرایے کی مد میں روزانہ جو دو آنے ملا کرتے پیدل آنے جانے کے ایثار کے سبب، وہ سب اس شوق کی نذر ہونے لگے۔ چوں کہ نئی کتابیں استطاعت سے باہر ہوتیں اس لیے، اور اس لیے بھی کہ مطلوبہ اور پسندیدہ کتابیں پرانی ہونے کے باعث دکانوں پر مل بھی نہ سکتی تھیں، پرانی کتابوں کے ٹھیلوں، کباڑیوں، ردی فروشوں اور فٹ پاتھوں پر تلاش کی جانے لگیں۔ اس وقت پرانی کتابیں خاصی تعداد میں ملا کرتی تھیں اور بہت سستی بھی ہوتی تھیں کہ کبھی کبھی اچھی کتابیں بھی ایک روپیے تک میں مل جاتی تھیں! یہ اس پر بھی منحصر ہوتا تھا کہ فروخت کرنے والا کس قدر تجربہ کار، گھاگ یا معصوم ہے۔ اس زمانے میں انتہائی نادر و نایاب کتابیں بھی میں نے دو چار روپے میں خرید لیں۔ ایک دو مخطوطات، جو نفیس کتابت اور عمدہ حالت میں تھے، مطبوعہ لگنے کے سبب میں نے ایک دو روپے میں بھی خریدے لیکن کبھی ہزاروں میں بھی بعد میں خریدنے پڑے۔ اُس زمانے میں شاید ہی شہر بھر کا کوئی کتاب فروش ایسا ہو جو مجھے نہ جانتا یا لحاظ بھی نہ کرتا ہو۔ چناں چہ ایسا بھی ہوتا کہ اہم اور نادر کتابیں، جو میری دل چسپی یا ذوق کے مطابق ہوتیں، میرے لیے الگ سے رکھ دی جاتیں یا مخصوص کر دی جاتیں۔ شاید ہی ایسا کوئی دن بھی ہوتا جب میں کتابوں کی تلاش میں بھوکا پیاسا مارا مارا نہ پھر رہا ہوتا۔ بھوک پیاس اور کھانے پینے کی اس شوق میں کبھی پروا نہ رہی۔ یہی وجہ ہے کہ زندگی کا ابتدائی بڑا حصہ اسی 'پرہیزگاری' میں گزرا۔ تنگ دستی اور قناعت عادتوں بلکہ جبلت میں شامل ہوگئی۔ ساری تفریحات اور دل چسپیاں کتابوں میں سمٹ گئیں۔ جب ملازمت شروع کی تو تنخواہ کا بیشتر حصہ اب کتابوں کی نذر ہونے لگا۔ بعض اوقات ماہانہ آمدن سے زیادہ کتابوں کی خرید ہونے لگی۔ یہ مشغلہ آزادانہ جاری تھا۔ جب ملازمت پیشہ نہ ہوئے تھے تو والدین کی طرف سے بھی پابندی یا اعتراض کبھی نہ کیا گیا بلکہ ان کی جانب سے میں خوشی کا اظہار ہی دیکھتا رہا۔ شادی کے بعد اگر چہ ایک عرصے تک فراغ دستی حاصل نہ تھی لیکن میری رفیقۂ حیات نے بھی میرے اس شوق کو قبول کر لیا بلکہ برداشت ہی کیا اور پھر جب جب موقع ملتا وقت نکال کر ان کی دیکھ بھال یا صفائی کی ذمے داری بھی ادا کرنے لگیں۔ یہ سلسلہ اب تک رہا۔ ایک وقت تو اپنی اس لگن میں انھوں نے کتابوں کی فہرست سازی تک شروع کی جو یوں سست پڑ گئی

یا رُک گئی کہ کتابوں کی آمد کی رفتار تیز تھی اور ان کی فہرست سازی کی سکت، ان کی روزمرہ کی گھریلو ذمے داریوں کے سبب، اس رفتار کا ساتھ نہ دے سکتی تھی۔ میرے والدین میری خریدی ہوئی کتابوں کا بصد شوق مطالعہ کرتے بلکہ میرے والد گاہے گاہے خستہ و بوسیدہ کتابوں کی مرمت اور صحت ایک جذبے کے تحت کیا کرتے۔ یہی کچھ، ان کے انتقال کے بعد، میری والدہ گاہے اب تک کرتی رہیں۔

میرا یہ شوق اس حد تک بڑھ گیا کہ اب صرف کراچی کے کتب فروش ہی نہیں دیگر شہروں میں جہاں جہاں جب جب جانا ہوتا وہاں کے کتب فروشوں اور کتابوں کے بازار میں جانا اور کتابیں خریدنا لازم ہو گیا۔ پھر روابط میں اضافہ ہوتا گیا اور فرمائشیں کرنے کا حوصلہ پیدا ہوا یا اس کا حق حاصل ہوا تو مطلوبہ کتابیں یوں بھی گھر بیٹھے دیگر شہروں اور بھارت سے آنے لگیں۔ خود نادر کتابوں کے تاجر اب راست گھر بھی پہنچنے لگے اور اس طرح اہم کتب یوں بھی حاصل ہونے لگیں۔ سفر پر جب بھی جانا ہوتا، چاہے وہ غیر ملکی سفر ہی کیوں نہ ہوتے، واپسی پر کوئی چیز نہیں صرف کتابیں ساتھ ہوتیں۔ جب زندگی مسلسل دس سال ملک سے باہر گزرے تو اس وقت تو اتر سے یا اس مستقل قیام سے قطع نظر، جب بھی سفر کے مواقع ملے اور یوں کئی بار دنیا کے گرد حقیقی چکر لگانے کے مواقع اپنی خاص دل چسپی کے تحت میسر آئے تو دنیا کا شاید ہی کوئی اہم کتب خانہ، جو علوم مشرقی کے ذخائر کے لحاظ سے اہم یا معروف ہو، میرے مشاہدے سے دور رہا ہو۔ اسی طرح ہر اہم اور بڑے شہر میں کتابوں کی دکانوں میں جانا ایک مشغلہ سا رہا۔ ان ملکوں اور شہروں میں صرف کتابوں کے بازار اور کتب خانوں کی سیر ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ نادر اور ناگزیر کتابوں کے عکس کے حصول کی کوشش بھی لازم ہوتی۔ اس کوشش کے ذیل میں ایک بڑی تعداد میں یورپ و امریکہ کے اہم اہم کتب خانوں سے ایسے نوادرات کے عکس یا ان کی مائیکرو فلمیں گراں قیمت پر حاصل کیں کہ وہ پاکستان اور بھارت میں شاید کسی اور کے پاس نہ ہوں۔ اس ضمن میں میری توجہ یا تو ایسے نوادر اور متون کی جانب رہی جن پر کام کرنا یا جن سے اپنے کاموں میں مدد لینا مقصد رہا یا کتب حوالہ یا کتب مراجع کا حصول یا ان کے عکس میری خاص دل چسپی و جستجو میں شامل رہے۔ یا پھر یہ بھی خیال رہتا کہ یہ چیزیں پاکستان میں کہیں نہیں، یہ دل چسپی یا ضرورت کی ہیں انھیں اپنے پاس ہونا چاہیے۔ اس طرح اس قسم کا ایک اچھا خاصا ذخیرہ میرے کتب خانے میں جمع ہو گیا جو اس کی ثروت و اہمیت بلکہ انفرادیت کا سبب بنا۔

نوعیت و انفرادیت

اس کوشش و جستجو میں اور اپنی خاص دل چسپی کے تحت میں نے کتب مراجع و کتب حوالہ

کے حصول کی جو کوشش کی اس کے نتیجے میں شاید ہی دنیا بھر کے ایسے کسی کتب خانے کی، جو علوم مشرقی کے ذخائر کی وجہ سے اہم ہو، فہرست یا کیٹلاگ، اصل یا عکسی صورت میں، میرے کتب خانے میں نہ ہو۔ اسی ذیل میں جنوبی ایشیا کے تاریخی و علمی موضوعات پر دنیا بھر میں مرتب و شائع ہونے والی موضوعاتی کتابیات کا ایک بہت بڑا ذخیرہ بھی اس کتب خانے میں جمع ہو گیا۔ یہی صورت فرہنگوں، قاموسوں اور لغات کے ضمن میں بھی کہی جا سکتی ہے۔ بلا کسی تکلف یا تردد، مجھے یہ اعتماد رہا ہے کہ کتبِ مراجع اور کتب حوالہ کا اتنا بڑا اور ہمہ جہت ذخیرہ ہمارے ملک کے بڑے بڑے کتب خانوں میں بھی دیکھنے میں نہیں آتا ہے۔ یہی انفرادیت اس کتب خانے کو اجتماعی یا مجموعی سوانحی کتب کے باعث، جنھیں ہم بہ سہولت 'تذکرہ' کہتے ہیں، حاصل ہے۔ فارسی و اردو شاعروں، مصنفین، علماً و صوفیہ، مدبرین، سیاست دانوں اور اکابر قوم وملت کے تذکروں اور سوانحی لغات کا ایک ایسا وقیع ذخیرہ اس کتب خانے کا امتیاز ہے جو شاذ ہی کسی اور ذاتی کتب خانے کے لیے کہا جا سکتا ہے۔ یہ امر واقعہ ہے کہ، خود ستائی کی معذرت کے ساتھ، کتب مراجع و کتب حوالہ اور تذکروں کی تعداد اور وقعت دونوں لحاظ سے اس کتب خانے کا تقابل ملک کے کسی اور کتب خانے سے شاید ممکن نہ ہو۔ یہ اس لیے ہو سکا کہ میں نے ایک ارادے اور منصوبے کے تحت کوشش کی تھی کہ میرے ذخیرے میں ہر 'تذکرہ'، اگر اصل و مطبوعہ نہیں تو اس کا عکس اور اسی طرح دنیا بھر کے ہر اہم و غیر اہم کتب خانے کے مخطوطات و مطبوعات کے کیٹلاگ یا فہرستیں، اصل یا عکس، جمع ہو جائیں، جو بڑی حد تک جمع ہوئیں۔ یہ اس لیے ممکن ہو سکا کہ میں نے یہاں رہ کر، دیگر شہروں کے کتب خانوں سے، دوست احباب کے ذخائر سے اور بھارت کے کتب خانوں اور مہربانوں سے ان کے حصول کی جو ممکنہ کوششیں ہو سکتی تھیں وہ بھی کیں اور پھر جب جب مجھے بیرون ملک سفر کے مواقع ملتے رہے، خصوصاً انگلستان اور جرمنی و فرانس کے کتب خانوں سے ان کے عکس یا ان کی مائکروفلمیں حاصل کرتا رہا۔

ان سب سے قطع نظر قلمی نسخوں کا بھی ایک گوشہ اس کتب خانے کا ایک وصف ہے جس میں متنوع موضوعات پر اردو، عربی و فارسی قلمی نسخوں کی ایک خاصی تعداد شامل ہے، جن میں بعض بہت قدیم و نادر بھی ہیں۔ یہ تعداد زبانوں کے لحاظ سے یوں ہے: عربی، ۷؛ فارسی، ۲۷؛ اردو، ۲۳؛ انگریزی، ۲۔

اس کتب خانے کے دیگر اہم گوشوں میں اگرچہ ادب اور تاریخ دونوں کے ذخائر کو فوقیت حاصل ہے لیکن دیگر علوم: اسلام اور دیگر مذاہب و مسلک، تفاسیر و مکاتیبِ فکر، تصوف، فلسفہ، نفسیات، تعلیم، علمی و تعلیمی ادارے، طبیعیات، جغرافیہ اور جنوبی ایشیا کے متنوع

گزٹیئر، لسانیات، صحافت، فنونِ لطیفہ، فنِ تعمیر، تہذیب وثقافت، وغیرہ جیسے موضوعات پر کتب کی ایک بڑی تعداد بھی اس کتب خانے کا ایک ایسا امتیاز ہے جو ذاتی کتب خانوں میں شاذ ہی یکجا دیکھا جاسکتا ہے۔ ادب (اردو، فارسی، علاقائی، یوروپی) کا شاذ ہی کوئی ایسا اہم موضوع ہوگا جس پر اس کتب خانے میں کوئی کتاب نہ ہو۔ زیادہ تر نایاب اور کمیاب کتابیں، قدیم ترین مطبوعات اور کلاسیکی متون اس کے اہم گوشے ہیں۔ ادبی تواریخ، تاریخ نویسی، سوانح عمریاں، خاکے، خود نوشتیں، تنقید، تاریخ گوئی، تذکرہ نویسی، سفر نامے، لسانیات، زبان وقواعد، خوش نویسی و خطاطی، تحقیق واصولِ تحقیق ارمغان جیسی کتب کے مستقل ومبسوط گوشے بھی اس کا ایک امتیاز ہیں۔ تاریخ میں خود تاریخ نویسی پر نہایت اہم اور کمیاب کتابیں، اردو وفارسی اور انگریزی میں، اور پھر جنوبی ایشیا کی تاریخ کے تمام ادوار اور علاقوں، خصوصاً تہذیبی مراکز، جیسے دہلی، اودھ، دکن وغیرہ پر خاصی تعداد میں اہم اور قدیم وجدید مقامی ومغربی مطبوعہ تاریخیں اس کتب خانے میں ایک بہت بڑی تعداد میں ضرورت مندوں کے بھی کام آتی رہی ہیں۔ زبانوں کے لحاظ سے یہ کتب خانہ اردو کے علاوہ بڑی تعداد میں انگریزی اور پھر فارسی وعربی کتابوں پر مشتمل ہے۔

جہاں تک تعدادِ کتب کا تعلق ہے، جس میں اردو وانگریزی رسائل وجرائد اور ملکی و عالمی جامعات کے تحقیقی مجلوں کی بھی ایک بہت بڑی تعداد شامل ہے، یہ تیس ہزار سے زائد ہے۔ جاپان کی ایک ممتاز جامعہ 'کیوتو یونیورسٹی' نے ستمبر ۲۰۱۱ء میں ایک سروے اس کتب خانے کا اس کے موضوعات وامتیازات کے حوالے سے کیا تھا، تو یہ تعداد ۲۷ ہزار تھی اور جس میں وہ تعداد جو مزید چار سے پانچ ہزار تک ہے بوجوہ اس میں شامل نہیں ہے۔ اسی یونیورسٹی کے کسی ایک جائزے کے مطابق یہ کتب خانہ عالمی سطح پر ذاتی کتب خانوں میں تعدادِ کتب کے لحاظ سے دوسرے نمبر پر ہے۔ پاکستان میں ذاتی کتب خانوں میں ڈاکٹر وحید قریشی اور مشفق خواجہ کے کتب خانوں کو بوجوہ بڑی شہرت حاصل رہی ہے۔ مزید اور بھی کتب خانوں کی شہرت بھی سننے میں آتی رہی ہے۔ ایک استفسار پر ایک موقع پر کوئی پندرہ سال قبل ڈاکٹر وحید قریشی صاحب نے مجھ سے فرمایا تھا کہ ان کے کتب خانے میں ۲۰ سے ۲۲ ہزار کے لگ بھگ کتابیں ہیں۔ مشفق خواجہ کے کتب خانے کو امریکی کنسورشیم نے اپنی تحویل میں لینے کے بعد اس کی جو فہرست ترتیب دی ہے اس کے مطابق اس کتب خانے میں کتابوں کی تعداد ۱۸ ہزار ہے۔

ذاتی کتب خانوں میں ڈاکٹر وحید قریشی اور مشفق خواجہ کے کتب خانوں کو خاصی شہرت حاصل رہی، لیکن دیگر اکابر کے ذاتی کتب خانے بھی اپنی اپنی جگہ، اپنے ذخائر کی نوعیت اور کثرت کے باعث، معروف رہے ہیں۔ گزشتہ چند دہائیوں میں تو ذاتی کتب خانوں کے جمع کرنے کا

رجحان بہت عام ہوا ہے۔ جن افراد کے پاس وسائل ہیں اور ساتھ ہی ذوق وشوق بھی تو پھر انھوں نے بڑھ چڑھ کر اس شوق کا ثبوت دیا ہے۔ جاگیرداروں اور وڈیروں کے پاس تو ان کی حیثیت روایتی ہے لیکن یہ صرف دکھانے اور سجانے اور مرعوب کرنے کے لیے ہوتے ہیں بلکہ جمع کیے جاتے ہیں۔ کراچی میں تو وسائل نہ ہونے کے باوجود ذاتی کتب خانے فروغ پائے ہیں۔ ایسے کتب خانے تو بھارت سے ہجرت کے نتیجے میں بھی کراچی منتقل ہوئے۔ ہر لکھنے پڑھنے والے نے اپنی اپنی ضرورت یا شوق کے تحت بھی اپنا کتب خانہ ترتیب دیا۔ پھر ایسے ذاتی کتب خانے بھی یکجا ہوئے جن کے مالکان کو محض کتابیں جمع کرنے اور سجانے اور دکھانے ہی کا شوق تھا اور انھوں نے بڑے عالی شان کتب خانے بنا ڈالے۔ بعض ذاتی کتب خانے اپنے ذخیرے کی وقعت کی وجہ سے اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ جیسے ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کا کتب خانہ تاریخ کے حوالے سے اور ڈاکٹر محمد ایوب قادری صاحب کا کتب خانہ جو خاص طور پر روہیلکھنڈ کی تاریخ پر نادر واہم کتابوں کے لحاظ سے منفرد اور مثالی تھا۔ مرزا علی اظہر برلاس کا کتب خانہ بھی اسی قبیل کا تھا لیکن اودھ کی تاریخ کے لحاظ سے۔ حمید الدین شاہد کا کتب خانہ دکنیات کے لحاظ سے اہم تھا۔ ڈاکٹر سہیل بخاری، ڈاکٹر شوکت سبزواری، ڈاکٹر ریاض الحسن، ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہانپوری جیسے متعدد نام ہیں جن کے کتب خانے کبھی شہرت اور اہمیت رکھتے تھے لیکن اب ان کے نام ونشان بھی نہیں۔ ان میں سے مرزا علی اظہر برلاس اور ڈاکٹر ریاض الحسن اور دیگر کئی افراد نے اپنے کتب خانے اور قیمتی نوادرات و مخطوطات مشفق خواجہ کی نذر کر دیے تھے۔ ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہانپوری صاحب نے اپنا کتب خانہ ایک دارالعلوم کے کتب خانے کو دے دیا۔ لیکن دیگر ذاتی کتب خانوں کا اب وجود نہیں رہا۔ ایسے بیشتر کتب خانے کراچی ہی نہیں لاہور بلکہ ہر شہر میں کباڑیوں اور ردی فروشوں یا فٹ پاتھوں پر فروخت ہوئے۔ اب ان کا نام ونشان نہیں۔ آج ہمارے اکابر میں کراچی میں ڈاکٹر جمیل جالبی اور ڈاکٹر فرمان فتحپوری کے کتب خانے بہت وقیع سمجھے جاتے ہیں۔ ان کے علاوہ سحر انصاری صاحب یا لاہور میں محمد عالم مختار حق، افضل حق قرشی، اکرام چغتائی، ڈاکٹر تحسین فراقی اور اقبال مجددی صاحبان وغیرہ کے کتب خانے بھی ایک مثال ہیں۔ لیکن ان سب کا مستقبل کیا ہے؟

ذاتی کتب خانوں کا مستقبل

یہ سوال ہر ایک کے لیے، جس جس کے پاس ذاتی کتب خانہ موجود ہے، اذیت ناک ہے۔ زیادہ سے زیادہ وہ یہ سوچتے ہیں کہ ان کے بعد ان کا کتب خانہ کسی لائبریری کو دے دیا جائے گا یا لائبریری میں پہنچ جائے گا۔ لیکن کراچی یونیورسٹی، ہمدرد یونیورسٹی اور پنجاب یونیورسٹی میں کئی ذاتی کتب خانے جمع ہوئے لیکن ان کا کیا حشر ہوا؟ یہ عبرت ناک ہے۔ کراچی یونیورسٹی میں احسن

مارہروی، مولوی بشیر الدین احمد، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی اور دیگر متعدد اکابر و مشاہیر کے کتب خانے بھی آئے لیکن منوں مٹی تلے دبے ہوئے ہیں اور کوئی ان کا پرسانِ حال نہیں۔ بعض ذخائر ابھی تک بوریوں میں بند پڑے ہیں اور یوں ہی تباہ ہو رہے ہیں، کوئی نہیں جو انھیں کھولنے اور ترتیب دینے تک کا سوچے، ان کی حفاظت اور دیکھ بھال اور انھیں ترتیب دینا اور قابلِ استفادہ رکھنا تو دور کی بات ہے۔ یونیورسٹیوں کے خود اپنے ذخائر اب انتہائی کس مپرسی کی حالت میں ہیں اور تباہ ہو چکے ہیں اور جو بچ گئے ہیں ان کا مستقبل بھی مختلف نہیں۔ جس طرح ہم اور ہمارا معاشرہ، ہماری اقدار، ہماری روایات ہر چیز تباہی کی طرف تیزی سے بڑھ رہی ہے اور ذمے داروں میں کوئی نہیں جو اس تباہی کو روکنے کے لیے کوشاں یا مستعد ہو۔ اسی طرح لائبریریاں بھی اور خاص طور پر جامعات کی لائبریریاں اپنے اربابِ اقتدار کی بے نیازی اور نااہلی کے سبب تباہی اور کس مپرسی کا شکار ہیں۔

میں نے بچپن میں، اپنے سب دوستوں کی طرح، اپنے مستقبل کے لیے دو منصوبے بنائے تھے یا دو خواہشیں کی تھیں۔ ایک یہ کہ ایک بڑا سا اپنا ذاتی کتب خانہ قائم کروں گا، اور دوسرے یہ کہ ساری دنیا کی سیاحت کروں گا۔ اللہ نے میری یہ دونوں خواہشیں، قابل رشک حد تک، پوری کیں۔ لیکن جب کتب خانہ بن گیا اور جب میں نے اپنے اکابر کے ذاتی کتب خانوں کی کتابیں فٹ پاتھوں سے خود خریدنی شروع کیں اور یونیورسٹیوں کے کتب خانوں میں اکابر کے ذاتی کتب خانوں کو برباد ہوتے بچشمِ خود دیکھا تو ایک اضطراب ہی میں ہمیشہ رہا کہ میرے اس کتب خانے کا بھی کیا ہوگا؟ کیا یہی انجام نہ ہوگا؟ پھر یہی سوال میں نے ہر ایسے شخص کے ذہن میں تڑپتا دیکھا ہے، جس کا اپنا ایک کتب خانہ ہے۔ محمد امین زبیری کا کتب خانہ بے حد اہم اور نادر و نایاب کتابوں اور دستاویزات پر مشتمل تھا۔ اب وہ کہاں ہے؟ ان کے کتب خانے کے کچھ مخطوطات اور دستاویزات میں نے برٹش لائبریری میں دیکھے جو ستر کی دہائی میں کسی طرح وہاں فروخت کر دیے گئے تھے۔ ایسے کئی کتب خانے اب کہاں ہیں؟ لطف اللہ خان کا آوازوں کا بے مثال ذخیرہ، جو لاکھوں آوازوں پر مشتمل ہے، خان صاحب ایک عرصے سے اس کے مستقبل کی طرف سے پریشان تھے۔ اس ضمن میں وہ لندن بھی تشریف لے گئے تھے کہ وہاں اس کے مستقبل کا کوئی انتظام کر سکیں اور وہ اس کو منتقل کر دیں لیکن برٹش میوزیم اور برٹش لائبریری دونوں اس کے لیے بوجوہ راضی نہ ہوئے۔

ملیشیا میں کوالالمپور کی بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی کے 'انسٹی ٹیوٹ اوف اسلامک سیویلائزیشن اینڈ تھوٹ' کا کتب خانہ بڑا وقیع اور عالیشان بن گیا ہے۔ گزشتہ چند دہائیوں میں

اس نے یہ حیثیت حاصل کی ہے، کیوں کہ اس 'انسٹی ٹیوٹ' نے دنیا بھر سے معروف ذاتی کتب خانے خریدنے شروع کیے اور اس طرح اپنے اس کتب خانے کو ایک مثالی کتب خانہ بنالیا ہے۔ عبدالرحمٰن بارکر، عبدالوہاب عزام اور دیگر عالمی شہرت رکھنے والے دانشوروں اور اسکالروں کے کتب خانے دنیا بھر سے اس 'انسٹی ٹیوٹ' نے خرید لیے ہیں اور یہ سلسلہ جاری ہے۔ خلیل الرحمٰن داؤدی صاحب نے اپنے کچھ مخطوطات یہاں فروخت کیے تھے۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے بھی کوشش کی تھی کہ ان کا کتب خانہ بھی یہ ادارہ خرید لے لیکن وہاں سے یہ شرط لگائی گئی کہ کتابیں وہاں خود پہنچائی جائیں۔ یہ قریشی صاحب کے لیے ممکن نہ تھا اور پھر وہ کچھ ہی عرصے بعد علیل ہوگئے۔ ڈاکٹر مختارالدین آرزو صاحب کا کتب خانہ علیگڑھ میں مثالی ہے۔ وہ بھی کوشاں رہے کہ ان کا کتب خانہ بھی یہ ادارہ خرید لے۔ میرے ملیشیا کے اسفار سے آرزو صاحب باخبر رہتے تھے۔ ایک دو مکتوبات میں انھوں نے یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ میں ان کے کتب خانے کی وہاں فروخت کے سلسلے میں طریقۂ کار معلوم کر کے انھیں مطلع کروں۔

میرے حلقۂ احباب میں مشفق خواجہ بھی اپنے کتب خانے کے مستقبل کی طرف سے فکر مند تھے۔ پہلے وہ خواہش مند رہے کہ ہمدرد فاؤنڈیشن، اب ہمدرد یونیورسٹی، کو اپنا کتب خانہ دے دیں لیکن اس شرط کے ساتھ کہ اس کتب خانے میں ان کے بیٹھنے کے لیے ایک کمرہ بھی مخصوص کر دیا جائے۔ یہ بات عام سننے میں آئی لیکن گفتنی ہے کہ ایک دو اور شرطیں بھی انھوں نے لگائی تھیں جو حکیم سعید کے لیے قابلِ قبول نہ تھیں۔ حکیم سعید نے ملک کے متعدد اکابر و اسکالرز کے کتب خانے خرید لیے جو اب ہمدرد کے کتب خانے میں شامل ہیں لیکن وہاں جانے والے سب دیکھ سکتے ہیں کہ وہاں وہ کس حال میں ہیں اور ان کا کیا حال ہو رہا ہے۔

بظاہر اقبال کا یہ شعر بطور ضرب المثل بھی ہمارے دلوں کو چھوتا رہتا ہے:

مگر وہ علم کے موتی کتابیں اپنے آبا کی
جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سی پارہ

لیکن یورپ و امریکہ کا وہ کونسا کتب خانہ ہے جس کے بارے میں ہم یہ کہہ سکیں کہ وہاں کتابیں کس مپرسی کی حالت میں برباد ہو رہی ہیں؟ یقیناً ان کتابوں پر قوم و ملت کا زیادہ حق ہے لیکن اگر وہ یہیں رہتیں تو کیا اب تک وہ باقی رہتیں؟ ہندوستان میں مسلم عہد حکومت کے کتنے ہی بے مثال اور عالی شان کتب خانوں کے ذکر سے ہماری علمی تاریخ بھری پڑی ہے، لیکن آج وہ کہاں ہیں؟ ان کی کتابوں کی فہرستیں بھی مرتب ہوئی تھیں لیکن وہ فہرستیں تک اب یہاں موجود نہیں وہ بھی یورپ ہی کے کتب خانوں کی زینت ہیں! یوں دیکھیں تو علمی حوالے سے مغرب کے جو احسانات

ہم پر ہیں، میں تو اسے بھی ان کے سامراجی اقدامات کے ساتھ ساتھ ایک ایسا اقدام بھی سمجھتا ہوں کہ جس کی وجہ سے ہماری علمی وتہذیبی فضیلتیں ایک ثبوت اور حقیقت کے طور پر وہاں محفوظ ہیں اور خود ہمارے استفادے کے لیے بھی موجود ہیں اور ہم ان سے حسبِ استطاعت فائدہ بھی اٹھاتے ہیں۔ اگر وہ سب کچھ، جو مغربی کتب خانوں میں آج محفوظ ہے، وہاں محفوظ نہ رہتا تو یہاں ہمارے عبرت ناک اور نہ رُکنے والے زوال کے باعث وہ سب بھی ضائع ہو چکا ہوتا۔ آج یہ بھی ہمارا دورِ زوال ہی ہے کہ ہم اپنے معاشرے اور اپنی اقدار کو محفوظ رکھنے کے لیے رمق بھر بھی کوشش نہیں کر رہے۔ ان ساٹھ پینسٹھ سالوں میں ہم نے ادارے بنائے نہیں، جو موجود تھے یا اگر کچھ بن بھی گئے تھے تو ہم نے انھیں بربادی کی حد تک پہنچا دیا ہے۔ ماضی تو ایک طرف جب ہمارا حال بھی تیز تر زوال کا شکار ہے اور ہمارے نظام میں اب کوئی ایسی امید افزا صورت نظر نہیں آتی کہ ہم اپنی حالت کو سنبھالا دے سکیں اور اس مزید زوال کو، جو ہمارا مقدر لگ رہا ہے، روک بھی سکیں۔

میرے کتب خانے کا مستقبل

ایسی صورت میں میرے سامنے اپنے کتب خانے کے مستقبل کے بارے میں فیصلہ کرنے کے لیے دو راستے تھے۔ یا تو میں یہی کرتا جو دیگر افراد نے کیا کہ اپنے کتب خانے کو حالات کے دھارے پر یوں ہی چھوڑ دیا کہ ان کی آئندہ نسلیں اس کو یوں ہی برقرار رکھیں گی، جو ماضی ہی نہیں حال میں بھی، ہمارے معاشرے میں کسی سے ممکن نہ ہوا۔ صاحبِ وسیلہ افراد بھی ہمارے اسی معاشرے میں رہے، شیخ محمد اکرام، ممتاز حسن اور خالد اسحٰق جیسے متعدد نام یہاں لیے جا سکتے ہیں لیکن ان کے کتب خانے بھی کیا ہوئے؟ مولوی محمد شفیع صاحب کا کتب خانہ کتنا قیمتی نہ ہوگا؟ ان کے بعد ان کے باذوق فرزند احمد ربانی بھی کتابوں کی اہمیت کو سمجھتے تھے لیکن نہ خود ان کی کتابیں محفوظ رہیں نہ وہ اپنے والد کی کتابیں محفوظ رکھ سکے۔ خالد اسحٰق صاحب کا کتب خانہ تو بے حد منظّم اور منضبط تھا بلکہ شاید ایسا کوئی اور ذاتی کتب خانہ ملک بھر میں نہ تھا۔ ایسے سب ہی کتب خانے بھی منتشر ہو گئے یا بکھر کر نابود ہو گئے۔ اب مسائل اور بھی ہیں اور آئے دن بڑھ بھی رہے ہیں۔ موجودہ اور اگلی نسلوں کے ذوق کا مسئلہ اور پھر بڑھتے ہوئے شہروں میں گنجائش کا مسئلہ، یہ مسائل ذاتی کتب خانوں کے قیام ہی کو نہیں انھیں برقرار رکھنے کے بھی امکانات کو مزید کم کر رہے ہیں۔ اس صورت میں میرا یہ فیصلہ کہ میں اس کے مستقبل کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دوں، میری حد تک دانشمندانہ نہیں ہو سکتا تھا۔

دوسرا امکان یہ تھا کہ میں اپنا کتب خانہ کسی کو فروخت کر دوں، جیسا کہ مشفق خواجہ نے کیا۔ لیکن یہ میرے لیے مشکل تھا کہ میں ایسی کوئی درخواست یا گزارش یہاں تک کہ یہ خواہش کسی

کے سامنے رکھ سکوں۔ اس صورت میں اگر خود کوئی پیش کش مجھے ملتی تو میں اب اس حق میں تھا کہ اپنا کتب خانہ کسی کی نذر کر دوں چاہے بلا معاوضہ ہی کیوں نہ دے دوں۔ بچپن سے قناعت اس طرح میری جبلت میں شامل ہوئی ہے کہ نہ کسی سے کچھ مانگنے پر طبیعت آمادہ ہوتی ہے نہ روپے پیسے کی کوئی خواہش یا لالچ ہی زندگی میں کبھی در آئی۔ اس طرف سے ایک بے نیازی میری عادت بنی رہی ہے۔ ایسی صورت میں میرے لیے ان کتابوں کی فروخت کے لیے کسی سے رجوع کرنا اور ان کتابوں کے معاوضہ کا حصول میرے لیے سب سے مشکل کام بلکہ ناممکن مرحلہ ہوتا۔ میں تو مستقبل میں بھی اس کے ایک عام اور مستقل استعمال اور اس کے کماحقہٗ عام استفادہ کے حق میں رہا ہوں۔ کراچی اور ملک کے حالات میں زندگی یوں بھی مزید بے اعتبار ہو کر رہ گئی ہے۔ پھر اپنی ۶۶ سالہ عمر میں زندگی سے اور کتنی توقع رکھی جا سکتی ہے، جب بینائی بھی جواب دے رہی ہو؟ اس لیے اب اس مرحلے پر میں پہنچ گیا تھا کہ جلد سے جلد اس کتب خانے کی قسمت اور اس کے مستقبل کا ایک مناسب فیصلہ ہو جانا چاہیے۔ اس کنسورشیم سے، جس نے مشفق خواجہ کا کتب خانہ خریدا، کچھ امکان تو تھا اور اس کے ایک ذمے دار جیمز نائے (James Nye) سے میرے ایک دو غیر ملکی بہی خواہوں نے امریکہ میں سلسلۂ معاملات بھی شروع کیا اور جیمز نائے نے غریب خانے پر آ کر بصد تعجب کتب خانے کا جائزہ بھی لیا لیکن نائے کی رضامندی کے باوجود مجھے رسمی کارروائیاں اس قدر طولانی نظر آئیں اور خود نائے کے بڑے حقیقت آمیز اشارے کے مطابق کنسورشیم کی ترجیحات اور مصلحتیں پاکستان کے حق میں آتے آتے شاید مزید برسوں کا معاملہ ہو جاتا اس لیے مجھے اس جانب سے کچھ زیادہ خوش گمانی نہ رہی۔

اس سارے عرصے میں میری ایک کوشش یہ بھی رہی کہ میں یہیں کراچی میں اس کے مناسب مستقبل کی کوئی راہ نکالنے میں کامیاب ہو سکتا۔ کسی جامعہ یا اور کسی کتب خانے کو ہدیہ کرنا میرے مشاہدے اور تجربے کی روشنی میں اطمینان بخش نہ تھا لیکن اگر اسے یہیں رہنا ہو اور خود اس کا اپنا کوئی انتظام ہو، جیسے کوئی ٹرسٹ یا ادارہ جو اس کو حفاظت سے رکھے اور قابلِ استفادہ رکھنے کا معقول انتظام جاری رکھ سکے تو اس ضمن میں سوچا جا سکتا تھا۔ اس لیے میرے ذہن میں ایک تجویز تھی۔ اُس وقت نعمت اللہ خاں ایڈووکیٹ کراچی کے میئر تھے۔ مخلص، دیانت دار، مستعد اور بے لوث۔ ایک بار ۱۹/ مئی ۲۰۰۳ء کو وہ میرے کتب خانے میں تشریف لائے اور دیکھ کر بے حد مسرت کا اظہار کیا۔ اس موقعے کو مناسب سمجھتے ہوئے میں نے ان سے ذاتی کتب خانوں کے مستقبل پر اور موجودہ سرکاری و نیم سرکاری کتب خانوں کی حالتِ زار پر بات کی اور اپنی وہ تجویز پیش کی کہ شہری حکومت اگر ایک ایسا مرکزی کتب خانہ قائم کرے جو سرکاری نہیں کسی ایک مضبوط ٹرسٹ کے

ماتحت رہے جس میں لائق اور مخلص افراد شامل ہوتے رہیں اور اس کی سرپرستی کریں۔ اس میں ہر اس شخص کو جس کے پاس پانچ ہزار سے زیادہ کتابیں ہوں اور وہ اس کو اس کتب خانے میں شامل کرنا چاہے تو اس کو لبیک کہا جانا چاہیے اور اس کا ایک مستقل گوشہ اس کتب خانے میں محفوظ و قابلِ استفادہ بنا دینا چاہیے۔ اسی طرح لوگوں کے پاس نوادرات اور دستاویزات بھی ہوتے ہیں جو ان کے بعد ضائع ہو جاتے ہیں۔ ان کی تعداد اگر زیادہ نہ بھی ہو تب بھی تاریخی لحاظ سے وہ اہم ہو سکتے ہیں۔ انھیں بھی اس کتب خانے میں محفوظ کیا جانا چاہیے۔ ہر وہ شخص جس کے پاس کتابیں اور نوادرات موجود ہیں اور جو ضائع ہو رہے ہیں، ضرور اس کتب خانے کو اپنے ذخیرے دینا پسند کرے گا۔ اس طرح قومی ورثہ ضائع ہونے سے بچ سکتا ہے اور اسے ضائع نہیں ہونا چاہیے۔ خان صاحب کو میری تجاویز بہت پسند آئیں چناں چہ انھوں نے دوسرے دن دفتر جا کر ایک سرکاری اجلاس اس موضوع پر منعقد کیا اور فیصلہ کیا کہ شہری حکومت ایک عالی شان مرکزی کتب خانہ قائم کرے گی جس میں ذاتی کتب خانوں کو یکجا اور محفوظ کیا جائے گا۔ اس مقصد کے لیے چھے ایکڑ کا ایک پلاٹ عزیز بھٹی پارک سے متصل مخصوص بھی کر دیا گیا۔ اجلاس کے یہ فیصلے اگلے دن تمام قومی اخبارات میں شائع ہوئے۔ لیکن ہونا کیا تھا؟ کچھ ہی دنوں میں شہری حکومت بدل گئی اور جب نئے میئر یا ناظم صاحب تشریف لائے تو وہی ہوا جس کا امکان تھا کہ اس پلاٹ پر کتب خانے کے قیام کا فیصلہ کالعدم قرار دے کر اس جگہ ایک مرکزِ خواتین کے قیام کا اعلان کر دیا گیا اور کتب خانے کا خواب، خواب ہی رہ گیا۔ چناں چہ میری یہ ایک موہوم سی امید بھی ختم ہو گئی۔ ۲۰۰۸ء سے ۲۰۱۰ء کے عرصے میں دو سال ایک کرم فرما کی مہربانی سے میں اسلام آباد میں انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی سے منسلک رہا۔ اسلام آباد میں 'ادارہ تحقیقاتِ اسلامی' کا کتب خانہ علوم اسلامیہ کے تعلق سے بہت عمدہ ہے۔ 'قومی محفوظات' (نیشنل آرکائیوز)، 'قومی کمیشن برائے تاریخ و ثقافت'، قائداعظم یونیورسٹی کے پاکستان اسٹڈیز اور 'انسٹی ٹیوٹ اوف پالیسی اسٹڈیز' کے کتب خانے اپنے موضوعات کے لحاظ سے اچھے ہیں اور فارسی زبان و ادب کے لیے 'مرکزِ تحقیقاتِ فارسی' کا بہت عمدہ ہے لیکن اردو ادب اور کتبِ حوالہ کے اعتبار سے ناکافی ہیں۔ بلکہ اردو ادب اور کتبِ حوالہ پر ذخائر قطعی قابلِ اطمینان نہیں۔ میرا ارادہ اسلام آباد میں صرف دو سال رہنے کا تھا لیکن کراچی کے حالات اور یہاں کے مستقبل کو مخدوش اور اسلام آباد کی خاموشی اور حسن کو دیکھتے ہوئے سوچتا رہا کہ اگر اسلام آباد میں حالات سازگار رہے تو یہیں منتقل ہو جاؤں اور کتب خانہ بھی یہیں منتقل کر لوں اور ممکنہ صورت میں اسی یونیورسٹی کے کتب خانے کو، جو ابھی نیا نیا ہے، ہدیہ کر دوں۔ لیکن مذکورہ یونیورسٹی میں جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ میری وہاں وابستگی میرے مذکورہ کرم فرما کی ایک مصلحت کے

تحت تھی کہ وہ سارے کام مجھ سے انجام پا جائیں جو ایک نومولود شعبے کے قیام اور ترقی کے لیے اور اس میں تحقیق کے لیے نصاب سازی اور دیرپا منصوبہ سازی کے لیے ضروری ہوتے ہیں۔ یہ کام ہو گئے تو ان موصوف کا رویہ، ان کی اقربا نوازی کی خاطر، ایسا بدلہ کہ میرے لیے وہاں رہنا قرینِ مصلحت نہ رہا۔ حالات ایسے رونما ہونے لگے کہ دل برداشتگی میں اسلام آباد منتقلی کا ارادہ ہی سرد پڑ گیا ورنہ اس طرح کتب خانے کا مستقبل شاید مخدوش نہ ہوتا اور اسلام آباد میں اس طرح کے کتب خانے کی کمی بھی دور ہو جاتی۔

میرے کتب خانے کی جاپان منتقلی

اس اثنا میں میرے پیشِ نظر ایک زیادہ اہم اور معتبر پیش کش جاپان کی ایک نہایت مؤقر اور بلند معیار جامعہ 'کیوتو یونیورسٹی' کی طرف سے آئی۔ اس یونیورسٹی کے لیے ایک نہایت نرم گوشہ میرے دل میں ہمیشہ سے رہا ہے۔ اس کی کئی وجوہات تھیں۔ جاپان اور جاپانیوں سے میرے راست روابط ۴۴ سالوں سے ہیں اور جاپان سے میرے منصبی روابط، بحیثیت مہمان پروفیسر اور ریسرچ فیلو، ۱۹۹۳ء سے کوئی دس سالوں اور چار مختلف اعلیٰ سطحی جامعات سے وابستگی پر محیط رہے ہیں۔ کیوتو یونیورسٹی ان میں سب سے مختلف اور اہم اس لیے ہے کہ ایک تو یہ کہ یہ جاپان کی بہترین جامعات میں ہے اور نمایاں بھی ہے اور پھر اس کا شمار دنیا کی دس بہترین جامعات میں ہوتا رہا ہے۔ پھر اس کا ایک اعزاز یہ بھی ہے کہ اس سے پانچ نوبل انعام یافتگان منسلک رہے ہیں، جو شاید ساری دنیا کی جامعات یا کم از کم ایشیا کی جامعات میں واحد مثال ہے۔ اس کی مزید اہمیت میری نظر میں یہ بھی ہے کہ ان دنوں اس میں مطالعاتِ اسلام کو بے حد فروغ حاصل ہو رہا ہے اور تعلیمی و علمی اور تحقیقی سرگرمیاں یہاں روز افزوں ہیں۔ اس کے دو کلیات: 'گریجویٹ اسکول اوف ایشین اینڈ افریقن ایریا اسٹڈیز'، جس سے ۲۰۰۸ء میں خود مجھے بھی بحیثیت ریسرچ فیلو منسلک رہنے کا اعزاز حاصل ہے، اور دوسرا 'اسلامک ایریا اسٹڈیز' انتہائی لائق و مخلص اساتذہ اور نہایت باذوق اور محنتی ریسرچ اسکالروں کے باعث جاپان بھر میں ان دنوں مثالی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ اس قدر اعلیٰ معیار کی حامل ہونے کے باوجود اس یونیورسٹی میں خاص طور پر اسلامی مطالعات اور علاقائی مطالعات کے ضمن میں جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کی تاریخ و تہذیب پر مآخذ ناکافی ہیں اور پاکستان اور تحریکِ پاکستان اور ہندوستانی مسلمانوں کی ملی و قومی تحریکات پر اردو کتابیں تو یکسر موجود نہیں۔ پاکستان کی عالمِ اسلام میں اور عالمی سطح پر آج جو اہمیت ہے وہ بھی اس جامعہ کے اربابِ اختیار کی نظروں میں ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ اس یونیورسٹی میں مطالعۂ پاکستان کا اہتمام بھی ہو لیکن عام اور سرسری تدریس کی حد تک نہیں بلکہ تحقیقی مطالعات کے موضوع کے طور پر۔ پی ایچ ڈی کی سطح

کے چند موضوعات پر اب یہاں کام کا آغاز بھی ہو چکا ہے۔ اور میری ایک طالبہ اپنے منصوبے کے آخری مرحلے میں پہنچ بھی چکی ہے۔

جاپان میں اسلام، پاکستان اور جنوبی ایشیا اور ساتھ ہی اردو زبان و ادب سے تعلق رکھنے والے موضوعات ان دنوں جس طرح جاپانی اسکالرز کی دل چسپی حاصل کر رہے ہیں یہ میرے علم اور مشاہدے میں ہے اور اس کا ایک اندازہ اس حوالے سے میری ایک کتاب: ''مشرقِ تاباں: جاپان میں اسلام، پاکستان اور اردو زبان و ادب کا مطالعہ'' (مطبوعہ: پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۰ء) سے ہو سکتا ہے۔

جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کی تاریخ و تہذیب کے تعلق سے دیگر متعدد جاپانی یونیورسٹیوں کے اسکالرز اور اس کیوتو یونیورسٹی سے منسلک اساتذہ سے میرا دیرینہ رابطہ رہنے کی وجہ سے اور ان کے کراچی آتے رہنے اور مجھ سے اور میرے کتب خانے سے استفادہ کرتے رہنے کے سبب یہ حضرات اور ان کے وسیلے سے اس یونیورسٹی کے اربابِ اختیار اس خواہش میں رہے کہ، بعض دیگر یونیورسٹیوں کی طرح، یہ جامعہ بھی ذاتی کتب خانے حاصل کر کے اپنی ضرورتیں پوری کرے۔ عام طور پر کتابوں کے بازاروں سے کتابیں خریدنے میں وہ فوائد حاصل نہیں ہوتے جو ذاتی ذخیروں سے حاصل ہوتے ہیں۔ اس لیے ایک موقع پر یہ خواہش برملا میرے سامنے پیش کر دی گئی کہ اگر مجھے منظور ہو تو وہ اپنی یونیورسٹی کے کتب خانے میں ایک گوشہ Aqeel Collection کے نام سے قائم کرنا چاہتے ہیں۔ ان کی یہ خواہش، مذکورہ تمام اسباب اور صورتِ حال کے باعث، جسے میں نے اوپر بیان کیا ہے، میرے لیے ایک بے حد اطمینان کے ساتھ ساتھ ایک اعزاز سے کم نہیں تھی۔ چناں چہ میں نے ایک خاصے غور و خوص کے بعد، تمام نتائج اور اثرات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اپنے کتب خانے کی کیوتو یونیورسٹی منتقلی پر رضامندی ظاہر کر دی۔

اس فیصلے کے پسِ پشت یہ خیال بھی میرے پیشِ نظر رہا ہے کہ جاپان میں جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کے علمی و تاریخی اور تہذیبی موضوعات پر وہ بنیادی اور اہم مآخذ جو اردو اور فارسی میں موجود ہیں، ان میں قدیم اور معاصر مآخذ بھی شامل ہیں، جاپان میں دستیاب نہیں۔ میں نے جاپان، بالخصوص ٹوکیو کی تقریباً تمام جامعات کے کتب خانے بالاستعیاب دیکھے ہیں اور وہیں علوم مشرقی کا ایک وقیع کتب خانہ 'تویو بنکو' بھی میرا دیکھا ہوا ہے جہاں عربی، ہندی اور مغربی زبانوں میں مآخذ کی کمی نہیں لیکن جنوبی ایشیا پر اور اردو زبان کے مآخذ نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اس صورت میں اگر میرا کتب خانہ جاپان منتقل ہو جاتا ہے تو وہاں پاکستان اور جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کے تعلق سے نہ صرف زیرِ تحقیق منصوبوں میں مدد ملے گی بلکہ آئندہ ایسے متعلقہ موضوعات پر تحقیقات کو یقینی

فروغ حاصل ہوگا۔ میں دیکھتا رہا ہوں کہ وہاں ایسے موضوعات، جن پر کام ہونا چاہیے اس لیے نہیں ہو پاتے کہ وہاں ان موضوعات پر مناسب آخذ یا تو موجود نہیں یا کافی نہیں۔ پھر ہر اسکالر اور طالبِ علم کے لیے پاکستان آنا ممکن بھی نہیں ہوتا۔ اس ضمن میں مناسب اور راسخ نقطۂ نظر کے حامل آخذ وہاں تحقیقات کو درست سمت میں لے جانے کے لیے بھی مفید و مؤثر ہوں گے۔ اس طرح میرے کتب خانے سے خاطر خواہ استفادہ وہاں مستقل اور ناگزیر رہے گا۔ یوں میرے زاویے سے یہ فیصلہ اور اقدام ثوابِ جاریہ کا حامل ہوگا۔

میرے اس فیصلے پر کیوتو ہی نہیں جاپان میں جس جس یونیورسٹی میں، جہاں جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کی تاریخ و تہذیب، مذہب اور ادب و ثقافت کے مطالعے کا آغاز ہوا ہے یا رجحان بڑھ رہا ہے، جیسے ٹوکیو یونیورسٹی، جہاں مطالعۂ اسلامیات کی روایت تو بہت قدیم اور پختہ ہے لیکن جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کے موضوعات اور مسائل کا رجحان اب عام ہو رہا ہے، 'یا واسیدا یونیورسٹی'، 'ہوکائیدو یونیورسٹی'، 'ناگویا یونیورسٹی' اور دیگر کئی یونیورسٹیاں اب اس جانب بڑھ رہی ہیں، میرے اس فیصلے کی اطلاع پہنچی تو اس پر نہایت گرم جوشی کا اظہار ہوا ہے اور یہ اظہار مستقل جاری ہے۔ کیوں کہ میرے کتب خانے کا بڑا حصہ جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کے ان موضوعات ہی پر مشتمل ہے جن پر آج کل ہر جگہ ہر نوعیت اور ہر سطح کے تحقیقی کام ہو رہے ہیں۔ اس میں زبان و ادب بھی شامل ہے، تاریخ و سیاست بھی شامل ہے اور علمی و قومی تحریکات اور ان سے متعلقہ شخصیات پر مطالعات بھی شامل ہیں۔

اس فیصلے کے فوری بعد کیوتو یونیورسٹی نے اپنے متعلقہ اساتذہ کا ایک گروپ اگست ۲۰۱۱ء میں کراچی بھیجا جس نے کئی دن قیام کر کے بڑے سائنسی انداز میں، جو میرے لیے حیران کن اور قابلِ رشک تھا، موضوعات کے لحاظ سے تمام کتابوں کو شمار کیا اور اس سارے ذخیرے کی ایک فہرست ترتیب دے کر لے گیا، جہاں اس کی سرکاری اور حکومتی سطح پر منظوری کے مراحل طے ہوئے اور فیصلہ کیا گیا کہ اگست ۲۰۱۲ء میں کتابوں کی منتقلی کو حتمی شکل دی جائے گی۔ لیکن اس اثنا میں وہاں میرے ذخیرے کو اسی موضوعاتی ترتیب سے رکھنے کے لیے، جس ترتیب سے یہاں کتابیں رکھی گئی تھیں، ایک نقشہ وضع کیا گیا جس کے مطابق ساری کتابیں رکھی جائیں گی۔ پھر یہ بھی طے کیا گیا کہ اساتذہ کا ایک گروپ کتابوں کی منتقلی کے وقت دوبارہ میرے کتب خانے میں آ کر تمام کتابوں پر ان کی موضوعاتی ترتیب کے مطابق نمبر چسپاں کرے گا۔ چناں چہ کیوتو ہی میں رہتے ہوئے یہ حضرات ہر کتاب کے لیے اس کا مقررہ نمبر اور 'شیلف نمبر' اسٹیکروں کی صورت میں طبع کر کے لائے اور ہر کتاب پر بڑی خوبی کے ساتھ چسپاں کیا تا کہ اسی ترتیب کے مطابق یہ کتابیں وہاں رکھی

جائیں۔ پھر خود اپنے ہاتھوں سے اپنے معیار کے مطابق ساری کتابوں کو ایک مقررہ جسامت (۲۰/ ۲۰/۲۴ انچ) کے ۲۵۷ ڈبوں میں بند کیا اور سمندری راستے سے لے گئے۔ یہ کتابیں اپنے مقررہ مقام پر ۵۸ الماریوں یا شیلف کے ۴۵۰ خانوں میں رکھی گئی ہیں۔ اب اس یونیورسٹی کے پیشِ نظر ان کتابوں کی مناسب اور سائنٹی فک انداز سے حفاظت اور انھیں بہتر صورت میں قابلِ استفادہ بنانا اور رکھنا ہے۔ پھر جلد ہی اس کی فہرست سازی، کیٹیلاگ سازی اور اس سارے ذخیرے کو 'اون لائن' کرنے کا منصوبہ بھی اس یونیورسٹی کے پیشِ نظر ہے۔

اس منتقلی میں اوساکا میں قائم پاکستان قونصل خانے کے سربراہ ڈاکٹر محمد اقبال تھیہیم نے بے حد تعاون کیا اور وزارتِ مالیات، حکومتِ پاکستان سے کتابوں کی منتقلی کی اجازت دلانے میں بڑا مؤثر کردار ادا کیا۔ ان کے پیشِ نظر اس منتقلی یا ہدیے سے اس موقعے پر کہ جب اس سال جاپان اور پاکستان میں سفارتی تعلقات کے ساٹھ سال مکمل ہونے پر دونوں جانب سرکاری سطح پر تقریبات منعقد ہو رہی ہیں، دونوں ملکوں کے سفارتی و دوستانہ روابط میں مزید بہتری آئے گی۔

بفضل تعالیٰ یہ سارے مراحل بصورتِ اطمینان طے ہوئے اور میرا کتب خانہ جاپان منتقل ہو گیا اور اب وہاں کیوتو یونیورسٹی کے کتب خانے میں Aqeel Collection کے نام سے موسوم ہے اور اب وہاں، صرف کیوتو یونیورسٹی ہی کے نہیں دیگر یونیورسٹیوں کے اسکالرز کے بھی ہمیشہ استفادے میں آتا رہے گا۔ یہ بھی طے ہوا ہے کہ تاحینِ حیات مزید جو کتابیں میرے پاس جمع ہوں گی، جب میں چاہوں، یا میرے بعد، وہ بھی اسی گوشے میں منتقل ہو جائیں گی۔

تشکر

میرا کتب خانہ جہاں میری پچاس سال سے زیادہ عرصے کی جستجو، کاوش اور لگن کا نتیجہ تھا وہیں میرے احباب، دوستوں، مہربانوں اور اداروں کی مستقل عنایات، تحائف، اور نوازشات کے باعث بھی ایک انفرادی حیثیت حاصل کر سکا۔ یہ عنایات ہر طرف سے بلکہ ساری دنیا سے مجھے حاصل ہوتی رہیں اور یہ سلسلہ تاحال جاری ہے۔ اس طرح ایک فطری تقاضے کے تحت ایک اور کتب خانہ تشکیل کے مرحلے میں ہے جس میں خاصی کتب یکجا ہو چکی ہیں جو اپنی نوعیت، قدر و قیمت اور افادیت کے لحاظ سے میرے روایتی ذوق و جستجو ہی کی مظہر ہیں۔

میں ان تمام دوست احباب اور اداروں کا شکرگزار اور ممنون ہوں کہ جو مجھے اپنی کتابیں تحفۃً عنایت فرماتے رہے ہیں۔ ان سب کو مطمئن رہنا چاہیے کہ ان کی عنایتوں اور تحائف سے نہ صرف میں نے بلکہ میرے طلبہ، دوست، احباب اور ان اسکالروں نے بھی خوب خوب استفادہ کیا جو یہیں کراچی ہی سے نہیں ملک بھر سے اور بیرونِ ملک سے بھی اس کتب خانے کے ذخائر سے

استفادے کی خاطر تشریف لاتے رہے۔ اب استفادے کا یہ سلسلہ مزید وسعت اختیار کر کے ایک ایسی قوم کے تصرف میں ہے جو بے حد علمی لگن اور تحقیقی ذوق وشوق اور ساتھ ہی ضرورت کے تحت آپ کی کتابوں سے کماحقہٗ فائدہ اٹھاتی رہے گی، جہاں انھیں دوام دینے، ان کی حفاظت اور انھیں زیادہ سے زیادہ قابلِ استفادہ بنانے اور استفادے کے دائرے کو تازہ برقی وسائل کے ذریعے مزید وسعت دینے کی ایک بہت مستقل روایت موجود اور مستحکم ہے۔

کتاب اور کتب خانے

ڈاکٹر ظہیر احمد بابر

کتاب کی تعریف

آج کے دور میں لفظ ''کتاب'' کی مختلف تعریفیں کی جاتی ہیں:

ا۔اوراق کا مجموعہ جس کو مجلد شکل میں رکھا جائے۔

ضرور پڑھیں: معروف بھارتی اداکارہ اور ڈرائیور، دونوں عرب ملک میں گاڑی کے اندر سے شرمناک کام کرتے رنگے ہاتھوں گرفتار

۲۔لکھے ہوئے اور چھپے ہوئے صفحات کو یکجا کر کے پشت سے سی دیا گیا ہو۔

۳۔ایک ایسی تصنیف جو ہاتھ سے تحریر کی گئی ہو یا چھاپی گئی ہو اور وہ ایک یا ایک سے زائد جلدوں پر مشتمل ہو۔

آکسفورڈ ڈکشنری کے مطابق کتاب سے مراد ایک ایسا تحریری یا مطبوعہ مقالہ ہے جو متعدد صفحات پر مشتمل ہو اور جسے تہہ کر کے ایک طرف سے سجا دیا گیا ہو۔

کتاب کی تاریخ وارتقا:

انسانی تہذیب کے ارتقاء کی داستان کتاب اور کتب خانوں کے تذکرے کے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔اس وقت بھی جب انسان کا ذہن کاغذ اور تحریر کے تصور سے نا آشنا تھا وہ ریت اور پتھر کی چٹانوں پر آڑھی ترچھی لکیریں کھینچ کر اپنا مافی الضمیر دوسروں تک پہنچانا جانتا تھا۔بعدازاں وہ اپنے خیالات، نظریات اور کارناموں کو مٹی کی الواح اور پیپائرس پر منتقل کرنے لگا۔تحریروں اور دستاویزات کے ان ذخیروں کو جس جگہ محفوظ کیا گیا وہی کتب خانے کی ابتدائی شکل تھی۔اس طرح پہلے انفرادی یا ذاتی اور بعد میں عوامی کتب خانے وجود میں آئے۔

تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ کتاب کی ابتدا اس وقت سے ہی ہو چکی تھی جب خالق

کائنات نے حضرت آدمؑ کو اپنا نائب اور خلیفہ بنا کر زمین پر اتارا۔ باری تعالیٰ نے اس وقت اپنے نائب کو ان تمام علوم سے نواز دیا تھا جن سے فرشتے بھی پوری طرح آگاہ نہیں تھے۔ کتاب کی ابتدا کی تاریخ جو ہم تک پہنچتی ہے اس کی ابتدا ہمیں دو مشہور اقوام کی تہذیبوں کے مطالعہ سے ملتی ہے۔ وادی دجلہ وفرات سے برآمد ہونے والی مٹی کی الواح نما کتابیں اور وادی نیل کی تہذیب مصر سے برآمد ہونے والی پیپائرس یعنی درخت کی چھال سے تیار کئے ہوئے کاغذ پر تحریری مواد۔ یہ دو قدیم تہذیبوں کے ابتدائی زمانے کی تحریریں کتاب کہی جاسکتی ہیں۔

کتاب کی تاریخ کا مطالعہ کرنے والے طالب علم وادی دجلہ وفرات اور وادی نیل سے برآمد ہونے والی ان تحریروں کو جدید دور کی کتابوں کی ابتدائی شکل کہہ سکتے ہیں۔ موہنجوداڑو (سندھ) ہڑپہ (پنجاب) اور مہر گڑھ (بلوچستان) سے کھدائی کے بعد جو کھنڈرات تہذیب جدید کے افق پر نمودار ہوئے وہاں سے برآمد ہونے والی پتھر کی چھوٹی چھوٹی تختیوں پر تصاویر اور تصوری خاکے دیکھ کر کتاب کے ابتدائی مراحل کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

نینوا (عراق) کے بادشاہ آشور بنی پال کے محل سے کھدائی کے بعد جو ہزاروں الواح برآمد ہوئیں ان سے اس بات کی بخوبی تصدیق ہوتی ہے۔ اصل میں تحریر کے بعد ان مٹی کی تختیوں کو دھوپ میں خشک کرلیا جاتا تھا اور پھر ان کو حفاظت سے تندور میں پکا کر پختہ کرلیا جاتا تھا۔ ان الواح پر باقاعدہ نمبر درج ہوتے تھے تاکہ ان کی بروقت شناخت کی جاسکے۔

اہل یونان سقراط اور سقراط سے پہلے کے علماء کے علوم ونظریات کو زیادہ دیر تک اپنے سینوں میں محفوظ نہیں رکھ سکتے تھے۔ وہ کوئی ایسا ذریعہ تلاش کررہے تھے جس میں اس بیش قیمت خزانے کو منتقل کرکے حفاظت سے رکھ سکیں۔ اور وہ ذریعہ کتابیں اور کتب خانے ہی ہوسکتے ہیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ یونان کے کلاسیکی عہد میں صرف یونان میں 11 سو سے زائد مصنفین موجود تھے۔ جن کی اپنی تحریروں سے شاندار کتب خانوں کا وجود میں آنا بعید از قیاس نہیں۔ یونان کے قدیم کتب خانوں میں سے جس کتب خانے کے وجود کو دلائل کی روشنی میں اور تاریخی شواہد سے ثابت کیا جاسکتا ہے وہ ارسطو کا کتب خانہ ہے۔ ارسطو کا کتب خانہ سینکڑوں کتابوں پر مشتمل تھا۔ ارسطو کا کتب خانوں کی ترقی میں سب سے بڑا حصہ سکندر اعظم کو علم وادب کی طرف پھیر دینا ہے۔ بطلیموس نے سکندریہ میں بہت بڑا کتب خانہ قائم کیا۔ یہ شاندار کتب خانہ صدیوں تک علم وحکمت کا مینار رہا۔ یہ شاندار کتب خانہ رومیوں اور عیسائیوں کے ہاتھوں تباہ ہوا۔

ہارون الرشید اور اس کا بیٹا مامون الرشید کتب خانوں کی تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ خلیفہ ہارون الرشید نے بغداد میں بیت الحکمت کے نام سے ایک عظیم کتب خانہ قائم کیا۔ جس کا

فیض ہلاکو خاں کے حملہ بغداد (تیرھویں صدی) تک جاری رہا۔ یہ پہلا پبلک کتب خانہ تھا جو اعلیٰ پیمانہ پر قائم کیا گیا تھا۔ اس بینظیر کتب خانہ میں عربی، فارسی، سریانی، قبطی اور سنسکرت زبانوں کی 10 لاکھ کتابیں تھیں۔

کتاب کیوں اہم ہے؟:

کتاب کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بخوبی ہوتا ہے کہ دنیا کے کم وبیش تمام مذاہب کے پاس ان کی اپنی متبرک کتاب موجود ہے۔ ان کتابوں اور صحیفوں میں اس وقت کی اقوام اور فرقوں کو راہ راست اور زندگی کے صحیح اصولوں اور ضابطوں پر عمل پیرا ہونے کی جابجا تلقین کی گئی ہے۔ گویا کہ خدا تعالیٰ نے خود انسانوں کی ہدایت کے لئے اپنے پیغمبروں پر کتابیں نازل فرمائیں اور خدا کے پیغامات کا یہ سلسلہ برابر جاری رہا۔ حتیٰ کہ اس نے اپنے پیغمبر آخرالزماں حضرت محمد ﷺ کے ذریعے آخری پیغام بھی قرآن مجید کے ذریعے ہی ارسال فرمایا۔ قرآن مجید جو دنیا کے لیے آفاقی پیغام پر مبنی ہے اس کی ابتدا ہی لفظ ''کتاب'' سے ہوتی ہے۔ یعنی ذٰلک الکتاب لاریب فیہ۔ یوں یہ بات قابل غور ہے کہ انسانوں کی ہدایت اور پیغام رسانی کا بہترین ذریعہ خدا بزرگ و برتر نے کتاب ہی کو ٹھہرایا ہے۔

کتابیں ایک کاغذی پیراہن ہی نہیں لئے ہوتیں بلکہ ان کا پیغام آفاقی ہوتا ہے۔ کتابیں کسی سوسائٹی کے افراد کی تربیت اور تعلیم میں جو کردار ادا کرتی ہیں، آج کا متمدن معاشرہ اس کی افادیت اور اہمیت سے انکار نہیں کر سکتا۔ کتابیں فرقہ واریت، علاقائیت اور قومیت جیسے محدود جذبوں سے ہٹ کر معاشرے کو انسان دوستی، بھائی چارہ اور روحانی قدروں کو جلا بخشتی ہیں جس سے قاری اور اس کے اردگرد رہنے والے افراد پوری طرح مستفید ہوتے ہیں۔ کتاب اپنے قاری کو ایک جذباتی پیغام ہی نہیں دیتی بلکہ اس کی شخصیت کو پوری طرح معاشرے کے لئے ایک مکمل زندگی گزارنے کا ڈھنگ بھی سکھاتی ہے اور دوسروں کے لئے اس کی شخصیت کو جاذب نظر اور پرکشش بھی بناتی ہے۔ آج کی ترقی میں کتاب نے جو مفید کردار ادا کیا ہے اس کی بدولت انسان نے تسخیر کائنات کے لئے کمندیں ڈالنی شروع کر دیں۔ آج وہ خلائی دور سے بڑھ کر چاند کی سرزمین پر اپنے قدم جما چکا ہے اور کائنات کے دوسرے سیاروں پر پہنچنے کی کوششوں میں اس قدر آگے بڑھ چکا ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تسخیر کائنات کے لئے چند گام اور بڑھنے کی دیر ہے۔ حصول علم کا بنیادی ذریعہ کتاب ہے۔ کتب خانے کتابوں کا ذخیرہ کہلاتے ہیں۔ جو اپنے دامن میں عقل و دانش کے صدیوں پرانے جواہر پارے سمیٹے وقت کے دھارے کے ساتھ ساتھ بدلنے والی قوموں اور حالات زمانہ کے حقیقی خدوخال کی امین بن کر آنے والی نسلوں کے لیے رہنمائی کا فریضہ ادا کرتے

ہیں۔دور جدید میں عوامی کتب خانے قوم کے عمرانی، اقتصادی، سیاسی، مذہبی، ادبی، سائنسی اور فنی ارتقاء میں بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔معاش ہو یا معاد، دین ہو یا دنیا سب کا دارومدار علم پر ہے اور علم کے حصول کا اہم ذریعہ کتاب ہے۔قلم، تحریر اور کتاب نے انسانی تہذیب وتمدن کے ارتقا میں ہمیشہ تاریخ ساز کردار ادا کیا ہے۔کتاب اپنے ارتقائی مراحل سے گزرتے ہوئے مختلف روپ اور شکلیں دھارتی رہی۔مگر اس کا پیغام لوگوں اور قبیلوں تک کسی نہ کسی طرح متواتر پہنچتا رہا۔اس پیغام کی روشنی میں اہل دانش اور مفکرین نے اپنی قوموں کے لئے گراں قدر کارنامے انجام دیئے۔آج کی ترقی بلاشبہ کتاب کی مرہون منت ہے۔انسان نے وقت کے ساتھ ساتھ اپنے حالات اپنے ایجاد کردہ آلات کی بدولت کہیں سے کہیں پہنچا دیئے جبکہ بیسویں صدی کے اواخر میں انسان نے چاند وسورج پر کمندیں ڈال دیں۔علم وسائنس کی ترویج وترقی کے موجودہ دور نے انسان کی ترقی کے گزشتہ تمام ریکارڈز کی بساط الٹ دی۔سائنس وتحقیق نے دنیا کی طنابیں سمیٹ کر رکھ دیں۔اطلاعاتی سہولتوں کی بدولت تحقیق اور ایجادات ہر سال ہر ماہ اور ہر لمحہ کوئی نہ کوئی حیرت انگیز کارنامہ انجام دے کر دنیا کو ورطہ حیرت میں ڈال رہی ہے۔ان تمام ایجادات واختراعات کے پس پردہ وہ اطلاعاتی دھماکہ کارفرما ہے جس میں کتاب نے ایک اہم عنصر کی حیثیت سے اپنا کردار ادا کیا ہے۔

جہالت اور لاعلمی کو دور کرنے کے لئے کتابوں کو دوست بنانا ہوگا۔کتب خانوں سے ناطہ جوڑنا ہوگا۔عوام کا تعلیم یافتہ ہونا نہایت ضروری ہے کیونکہ باخبر شہری اپنے ملک کے لیے بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔اچھے شہری کے اپنے ملک کے لئے اچھا کردار ادا کرنے میں اچھی کتابیں بہت اہم کردار ادا کرتی ہیں۔معاشرہ کی تعمیر میں حصہ لینے کے لئے جدید سائنسی معلومات اور ٹیکنالوجی، ادب وتاریخ، عمرانیات واخلاقیات جیسے مضامین کی درس وتدریس کے لیے کتابوں کی زیادہ سے زیادہ اشاعت ضروری ہے تاکہ اس ملک کے عوام، عظیم قوموں میں باعزت زندگی گزار سکیں۔

کتب خانوں کی تاریخ:

کتب خانوں کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے جتنی قدیم انسان کی تہذیب ہے۔تہذیب کے آغاز سے ہی انسان نے ہر دور میں حاصل ہونے والے علم کا ریکارڈ رکھنے کی کوشش کی ہے۔کتب خانوں کی تاریخ کا آغاز اس وقت سے ہوتا ہے جب انسان کے پاس لکھنے کے لئے کاغذ قلم نہ تھا اور وہ مٹی کی تختیوں، چمڑے اور ہڈیوں پر تحریر کو محفوظ کرتا تھا۔آج ہم لائبریری کی تاریخ کے اس عہد میں سانس لے رہے ہیں جہاں بات مائیکروفلم سے بھی آگے جا چکی ہے۔آج کمپیوٹر کا دور ہے اور ڈیجیٹل لائبریریوں نے دنیا میں انقلاب برپا کر دیا ہے۔آشور بنی پال، سکندریہ کا کتب خانہ،

عیسائیوں، ایرانی، ساسانی، یونانی، رومی کتب خانے، عربوں کے کتب خانے یورپ اور برصغیر کے حکمرانوں کے کتب خانے بہت مشہور ہیں۔

قدیم دور کے کتب خانوں میں آشور بنی پال، کتب خانہ سکندریہ اور کتب خانہ پرگامم قابل ذکر ہیں۔ سرزمین عراق کی تہذیب میسوپوٹیمائی کہلاتی ہے۔ وادی میسوپوٹیما کے مختلف شہروں کے کھنڈرات سے اس امر کی کافی شہادتیں ملی ہیں کہ وہاں پر سرکاری، مذہبی اور نجی کتب خانے موجود تھے۔ کلدانی میں سارگن بادشاہ نے ایک کتب خانہ قائم کیا جسے دنیا کا قدیم ترین کتب خانہ قرار دیا جاتا ہے۔ آشوریوں نے 200 ق،م سے 500 ق،م تک شاندار کتب خانے قائم کئے، آشوری عہد کا سب سے اہم کتب خانہ شاہی کتب خانہ تھا جسے سارگن دوم نے 705ء میں قائم کیا۔ آشور بانی پال نے اپنے دادا سارگن دوم کے قائم کردہ کتب خانے کو اپنے دارالخلافہ منتقل کر کے اسے اپنے نام سے موسوم کر دیا۔ آشور بنی پال کے کتب خانے میں 2 لاکھ 30 ہزار مٹی کی تختیاں تھیں اور اس کتب خانے کو پہلا عوامی کتب خانہ بھی کہا جاتا ہے۔ دنیا کا پہلا منظّم کتب خانہ سکندریہ تھا اور اس میں منہ مانگی قیمت پر کتب خرید کر رکھی جاتی تھیں اس میں رکھے گئے مواد کو مضامین کے اعتبار سے رکھا جاتا تھا۔ اس کا قیام 323 ق۔م میں مصر میں عمل میں آیا اور اس میں ذخیرہ کتب 9 لاکھ تھا۔ اس کی تعمیر و قیام میں بطیموس دوم نے اہم کردار سرانجام دیا تھا۔ یونانی کتب خانوں میں کتب خانہ ارسطو، کتب خانہ افلاطون اور پرگامم کا کتب خانہ قدیم ترین ہیں۔ افلاطون کے متعلق قیاس کیا جاتا ہے کہ اس کے پاس بھی ایک شاندار کتب خانہ موجود تھا جو اس کی وفات کے بعد کہاں گیا کسی کو کچھ معلوم نہیں ہے البتہ ارسطو کے کتب خانے کے حوالے سے تاریخی شواہد موجود ہیں۔ یہ کتب خانہ سینکڑوں کتابوں پر مشتمل تھا جو کہ ایک اندازے کے مطابق 4 سو رولز پر مشتمل تھا۔ نجی کتب خانوں کا بانی ارسطو کو کہا جاتا ہے۔ ارسطو نے کتب خانوں کی تنظیم و ترتیب سائنسی بنیادوں پر رکھنا شروع کی تھی۔ قدیم یونان کا دوسرا اہم ترین کتب خانہ پرگامم ہے جسے اتالوسی دوم نے 137ء سے 159ء تک قائم کیا۔ پرگامم کا مواد پیپرس رولز اور پارجمنٹ پر مشتمل تھا اور یہ ذخیرہ دو لاکھ کے لگ بھگ تھا۔ یونانی کتب خانوں میں ادب، تاریخ، سائنس، ریاضی، فلسفہ، مذہبیات، سیاسیات اور اخلاقیات جیسے موضوعات پر ذخیرہ کتب زیادہ تھا۔ سرزمین روم میں عوامی کتب خانے، نجی کتب اور مخصوص کتب خانے موجود تھے۔ 360ء سے 370ء تک روم میں 28 عوامی کتب خانے موجود تھے۔ کتب خانہ پلینی، سسرو، اٹیکس، سانونیکس اور سیلوسی کالیکس روم کے مشہور کتب خانے ہیں۔ روم کے یہ تمام کتب خانے 16 ویں صدی تک نیست و نابود ہو گئے۔ چوتھی یا پانچویں صدی عیسوی میں برصغیر پاک و ہند میں کتب خانے موجود تھے۔ جنہیں زیادہ تر مذہبی عمارتوں میں قائم کیا جاتا تھا۔ کتب

خانہ نالندہ یونیورسٹی، وکرم سلا، جین لائبریری اور سرسوتی بھنڈار برصغیر کے قدیم کتب خانے ہیں۔ پرانے وقتوں کے عظیم کتب خانوں کی دو اہم خصوصیات علم دوستی اور حکمرانوں کی ذاتی دلچسپی اور ان کی ہیت و تنظیم میں ہم آہنگی تھی۔

وہ کتب خانے جو جلا دیے گئے:

تاریخ اسلام کے تلخ حقائق میں سے ایک دردناک حقیقت کتب خانوں کا نذر آتش ہونا ہے۔ جس کے باعث میراث اسلامی اور علوم شریعت کا کثیر حصہ دنیا سے مفقود ہو گیا۔ چند واقعات حسب ذیل ہیں:

1۔ 503 ہجری میں طرابلس (لیبیا) پر عیسائیوں نے قبضہ کیا تو وہاں کے کتب خانوں کو جلا دیا۔

2۔ 656 ہجری میں ہلاکو خان نے بغداد تاراج کرنے کے بعد وہاں کے عظیم الشان کتب خانوں کو دریائے دجلہ میں پھینکوا دیا۔ دریائے دجلہ میں غرق کی جانے والی کتب کی تعداد 6 لاکھ سے متجاوز تھی۔ بغداد میں علامہ سید رضی موسوی کا کتب خانہ جہاں نہج البلاغہ جیسی معرکۃ الآراء کتاب تالیف ہوئی دریا برد ہو گیا۔

3۔ تاتاریوں نے بغداد کے کتب خانے تباہ کئے اور تمام کتب دریا میں ڈال دیں جس سے دریا کا پانی سیاہ ہو گیا۔ تاتاریوں کا یہ سیلاب صرف بغداد تک ہی محدود نہ رہا بلکہ ترکستان، خراسان، فارس، عراق اور شام سے گزرا اور تمام علمی یادگاریں مٹاتا چلا گیا۔

4۔ سپین میں عیسائی غلبے کے بعد وہاں کے کتب خانے جلا دیے گئے۔

5۔ Cardinal Ximenes نے ایک ہی دن میں 80 ہزار کتب نذر آتش کر دیں۔

6۔ صلیبی جنگوں کے دوران عیسائیوں نے مصر، شام، سپین اور دیگر اسلامی ممالک کے کتب خانوں کو بری طرح جلا کر تباہ و برباد کر دیا۔ ان کتب کی تعداد 30 لاکھ سے زائد تھی۔

7۔ قاضی ابن عمار نے طرابلس میں عالیشان کتب خانے کی تاسیس کی جس میں ایک لاکھ سے زائد کتابیں تھیں۔ یہ کتب خانہ صلیبی جنگوں کے دوران برباد کر دیا گیا۔

8۔ فاطمین مصر کے دور میں قاہرہ کے قصر شاہی کا عدیم النظیر کتب خانہ تمام اسلامی دنیا کے کتب خانوں پر سبقت لے گیا تھا جسے صلاح الدین ایوبی نے جلا کر خاکستر کر دیا۔

9۔ 420ھ میں سلطان محمود غزنوی نے رے فتح کیا تو وہاں کے کتب خانوں کو جلوا دیا۔

10۔ صاحب بن عباد وزیر کا عظیم الشان کتب خانہ ''جو دار الکتب رے'' کے نام سے معروف تھا،

سلطان محمود غزنوی نے جلا کر تباہ کر دیا۔

11۔ اسلامی دنیا کے سب سے پہلے عمومی کتب خانہ میں جسے ابو نصر شاپور وزیر بہاء الدولہ نے 381ھ میں بغداد کے محلّہ کرخ میں قائم کیا تھا اس کتب خانے میں دس ہزار سے زائد ایسی کتب تھیں جو خود مصنفین یا مشہور خطاطوں کی لکھی ہوئی تھیں۔ یاقوت الحموی جس نے دنیائے اسلام کے بہتر سے بہترین کتب خانے دیکھے تھے، لکھا ہے کہ دنیا میں اس سے بہتر کوئی کتب خانہ نہ تھا۔ اس کتب خانہ کو مورخین نے ''دار العلم'' کے نام سے موسوم کیا تھا۔ یہ مایہ ناز کتب خانہ 451ھ میں طغرل بیگ سلجوقی نے جلا دیا۔

12۔ بغداد میں ابو جعفر محمد بن حسن طوسی کا کتب خانہ 385ھ تا 420ھ کئی مرتبہ جلایا گیا۔ آخری مرتبہ 448 میں اس طرح جلایا گیا کہ اس کا نام بھی باقی نہ بچا۔

13۔ 549ھ میں ترکوں کے ایک گروہ نے ماوراء4النہر سے آکر نیشا پور کے کتب خانے جلا دیئے۔

ضرور پڑھیں: راجہ بشارت کی آڈیو کال منظر عام پر آنے کے بعد حنیف عباسی کی صاحبزادی ڈاکٹر اریبہ عباسی مستعفی، معاملہ نیا رخ اختیار کر گیا

14۔ 586ھ میں ملک المویدنے نیشا پور کے باقی ماندہ کتب خانوں کو جلا کر تباہ کر دیا۔

کتب خانوں کی اہمیت:

کتاب اور کتب خانوں کی افادیت اور اہمیت کو مہذب قوموں نے ہر دور میں تسلیم کیا ہے۔ اہل علم کسی ملک میں پائے جانے والے کتب خانوں کو اس ملک کی ثقافتی، تعلیمی اور صنعتی ترقی کا پیمانہ قرار دیتے ہیں۔ اگر کسی ملک کی ترقی کا جائزہ لینا مقصود ہو تو وہاں پر موجود تعلیمی اداروں کو دیکھا جائے اور تعلیمی اداروں کی ترقی کا جائزہ لینا ہو تو وہاں پر موجود کتب خانوں کو دیکھا جائے۔ کتب خانے جتنے فعال ہوں گے تعلیمی ادارے بھی اسی قدر تعلیم و تحقیق میں فعال ہوں گے۔ جس کا لازمی نتیجہ ملک کی معاشی و معاشرتی ترقی اور عوام کی خوشحالی ہے۔ بد قسمتی سے ابھی تک ہم اپنے تعلیمی نظام کو جدید سائنسی خطوط پر استوار نہیں کر سکے۔ ملک میں شرح خواندگی افسوس ناک حد تک کم ہونے کی وجہ سے ہم ترقی کے ہر شعبے میں دوسرے مما لک کے مقابلے میں بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ کتاب اور کتب خانے کی مدد سے ہم ان عظیم شخصیتوں سے رابطہ قائم کئے ہوئے ہیں جن کے اقوال زریں ہماری زندگی کی قیادت کرتے ہیں۔ کتاب ہمیں سیدھی راہ پر چلنے کی ہدایت کرتی ہے۔ اس کے ذریعہ ہم ماضی کے سبق آموز واقعات اپنی آئندہ زندگی کے لئے مشعل راہ بناتے ہیں۔ کتاب اور کتب خانے صرف کاغذ کے خشک اوراق کا مجموعہ نہیں ہیں بلکہ

زندگی کی گونا گوں عملی مصروفیات، تجربوں، عمل اور عقل، چلنا پھرنا وغیرہ کا ایسا خزانہ ہیں جس کی مدد سے ہر شخص اپنی زندگی کی خامیوں کو دور کر سکتا ہے۔ کتابوں کی مدد سے دماغ اور ذہن تسکین پاتے ہیں۔ اچھی کتاب ہماری رہبری اور عزم مسلسل پیدا کرتی ہے۔ اس کے مطالعے سے ہم اپنی کمزوریوں سے آگاہ ہو کر اپنی فکر کو روشنی بخشتے ہیں۔ اگرچہ آج ہمارے درمیان ارسطو، سقراط، افلاطون، بوعلی سینا، غزالی، اقبال اور قائداعظم جیسے عظیم مفکر اور اہل دانش موجود نہیں ہیں تاہم ان کے خیالات اور افکار پر مبنی جو کتابیں ہمارے کتب خانوں میں اور گھروں میں موجود ہیں، انہوں نے ان کو زندہ جاوید بنا دیا ہے۔ لاعلمی ایک بڑا جرم ہے۔ اس سے نجات حاصل کرنے کا واحد ذریعہ کتابیں ہیں۔ کتابیں امیر اور غریب، جوان، بوڑھے، بچے، عورت، مرد سب کے لیے یکساں اہمیت کی حامل ہیں۔ ان پر کسی ایک طبقہ یا کسی ایک جنس کا حق نہیں بلکہ اس سے پوری انسانی برادری یکساں طور پر فیض یاب ہو سکتی ہے۔ کتابیں علم کی تشنگی مٹاتی ہیں، قوت عمل کو بڑھا دیتی ہیں اور انسانی زندگی کو سہل اور مہذب بنا دیتی ہیں۔ پڑھنے والے اپنی ضرورت اور دلچسپی کے مطابق کتابوں سے استفادہ کرتے ہیں۔ مشہور فلسفی ایمرسن کا کہنا ہے ''اچھی کتاب مثالی دوست اور سچا ساتھی ہے جو ہمیشہ سیدھے راستہ پر چلنے کی صلاح دیتی ہے'' ایک اور عالم کے مطابق کتابوں کا پیار ہی انسانوں کو اپنے خالق کے پاس پہنچانے والا راکٹ ہے۔ سقراط نے خوب کہا ہے ''جس گھر میں اچھی کتابیں نہیں وہ گھر حقیقتاً گھر کہلانے کا مستحق نہیں وہ تو زندہ مردوں کا قبرستان ہے۔''

تعلیم وہ روشنی ہے جس کے بغیر ترقی کی راہ پر چلنا ناممکن ہے۔ جن ممالک میں تعلیم کم ہے ان کی سالمیت کو بھی خطرہ ہے کیونکہ ناخواندہ اور غیر تعلیم یافتہ عوام ملکی ترقی میں اس طرح بھرپور حصہ نہیں لے سکتے جس طرح تعلیم یافتہ لوگ لیتے ہیں۔ ناخواندگی سے غربت، مہنگائی، قتل و غارت، رشوت ستانی، بدعنوانی، سیاسی عدم استحکام جیسے مسائل جنم لیتے ہیں۔ تعلیم وہ زینہ ہے جس سے افراد ترقی کی منازل طے کرتے ہیں اور قومیں عروج حاصل کرتی ہیں۔ قوموں کے عروج و زوال کی ہزاروں داستانیں کتب خانوں سے وابستہ رہی ہیں۔ جن اقوام نے اس راز کو پالیا وہ آج بام عروج پر ہیں اور جنہوں نے کتب خانوں کی اہمیت، افادیت سے صرف نظر کر لیا وہ آج دنیا میں شاہراہ ترقی سے بہت پیچھے رہ گئی ہیں۔ کتابیں زمانے کی رفتار کے مطابق ہمارا ساتھ دیتی ہیں۔ زمانہ امن اور جنگ میں ہمارے اندر انقلابی روح بیدار کر دیتی ہیں۔ کتابیں مہمل اور موزوں دونوں طرح کی ہوتی ہیں۔ اب یہ قاری پر منحصر ہے کہ وہ اچھی اور بری کتاب میں تمیز کر کے بہتر طور پر فائدہ اٹھائے۔

شرف آباد بیدل لائبریری (ٹرسٹ)

ڈاکٹر تہمینہ عباس

کسی بھی قوم کی ترقی اور لوگوں کو بنانے میں کتب خانے اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ جس کی بے شمار مثالیں نہ صرف پاکستان میں بلکہ دوسرے ملکوں میں بھی موجود ہیں۔ کراچی شہر میں گو کہ بے شمار لائبریریاں موجود ہیں جن میں انجمنِ ترقی اردو کراچی کا کتب خانہ، جامعہ کراچی کی محمود حسین لائبریری، ادارہ یادگار غالب لائبریری، لیاقت نیشنل لائبریری وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ کچھ کتب خانے طلبا کی کتابوں تک رسائی کے ساتھ ساتھ ان کی ذہنی تربیت میں بھی اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ ایسا ہی ایک کتب خانہ مشہور فارسی شاعر بیدل کے نام پر قائم ''بیدل لائبریری'' ہے جو بہادر آباد کے عقب شرف آباد میں واقع ہے۔ بیدل لائبری کا پورا نام شرف آباد بیدل لائبریری ٹرسٹ ہے۔ اس کتب خانے کے اوقات کار، شام چار بجے تا رات آٹھ بجے ہیں۔ شرف آباد کلب کی دوسری منزل پر قائم بیدل لائبریری کراچی میں اپنی نوعیت کی قابل قدر لائبریری ہے. قدیم نادر و نایاب کتب و رسائل کے علاوہ نئی مطبوعات اور پرانے اخبارات کے حوالے سے اپنی مثال آپ ہے۔

ترکستان قبیلہ برلاس کے مرزا عبدالخالق کو اللہ تعالی نے ایک فرزند عطا فرمایا جسے دنیا عبدالقادر بیدل عظیم آبادی کے نام سے یاد کرتی ہے۔ بیدلؔ کی پیدائش ۱۰۵۴ء میں عظیم آباد پٹنہ میں ہوئی اور ان کا وصال ۱۱۳۳ھ دہلی میں ہوا۔ غالبؔ اور اقبالؔ دونوں بیدلؔ کے طلسم میں گرفتار رہے۔ ایران، افغانستان اور روس کے فارسی اثر والے علاقوں میں بیدلؔ شناسی ایک باقاعدہ موضوع ہے. بیدلؔ نے آٹھ مغل بادشاہوں کا زمانہ دیکھا. بیدلؔ ایک ایسے شاعر ہیں جنھوں نے عدم میں وجود کا تماشا دیکھا اور زندگی اور انسان کے وجود کو ابھارا. وہ عدم سے آفرینش تک کے مرحلوں کی تفہیم اور دید سے گزرے. انھوں نے حرف و معانی کا ایک گلشن تخلیق کیا اور اس میں نغمہ سرائی کی۔ اگر وہ گلشن نا آفریدہ رہتا تو وقت کی موج رواں پر بیدلؔ اپنا نام کیسے ثبت کرتے۔ بیدلؔ ذہن کی پنہائیوں اور فکر کی ان پیچیدگیوں کے شاعر ہیں جن کے بغیر تہذیب و ثقافت کا سفر یوں طے

نہیں ہوسکتا تھا۔

مت پوچھ دل کی باتیں وہ دل کہاں ہے ہم
میں
اس تخم بے نشاں کا حاصل کہاں ہے ہم ہیں
جب دل کے آستاں پر عشق آن کر پکارا
پردے سے یار بولا بیدلؔ کہاں ہے ہم ہیں

عبدالقادر بیدل کے نام پر یہ لائبریری کراچی میں ڈاکٹر ظفیر الحسن نے قائم کی۔ ڈاکٹر محمد ظفیر الحسن عظیم آباد پٹنہ میں پیدا ہوئے .۱۹۴۷ میں پاکستان آئے اور حکومت پاکستان کے محکمہ سپلائز کے ڈپٹی ڈائریکٹر ہوئے۔ فارسی میں پی۔ایچ ڈی کی .اردو، فارسی اور انگریزی زبان پر عبور تھا۔ عشق عظیم آبادی نے محمد ظفیر الحسن عظیم آبادی کو پہلے بیدلؔ اور پھر دلؔ عظیم آبادی کا دل دادہ کیا۔ فارسی اور عظیم آباد کی محبت نے شیخ محمد عابد دل عظیم آبادی کا دوسوسال پرانا کلام جو ناپید ہو گیا تھا از سرنو مرتب کیا جو علمی تحقیق کا شہ پارہ ہے۔ مہر نیم روز، قومی زبان اور آگہی میں مضامین لکھے. ماہنامہ ساقی اور جدید اردو کا اشاریہ بھی ترتیب دیا .بیدل لائبریری چند افراد خصوصاً ڈاکٹر ظفیر الحسن، فیض احمد صدیقی اور اے کے نعمان کے جنون کی داستان ہے۔ ڈاکٹر ظفیر الحسن کی خواہش تھی کہ جس طرح بھارت میں خدا بخش لائبریری ہے اسی طرح پاکستان میں بھی ایک لائبریری ہو۔ جولائی ۱۹۷۴ء میں ایک کمرہ اور ۳۰۰ کتب و رسائل سے شروع ہونے والی لائبریری اب اپنے دامن میں تقریباً ۵۸ ہزار سے زائد کتب و جرائد سمیٹنے ہوئے ہے لائبریری کا رقبہ ۱۲۵۰ مربع گز ہے۔

بیدل لائبریری میں فارسی اور اردو زبان میں مخطوطات موجود ہیں۔ ہندو پاک کے رسائل کے ذخائر لائبریری کی شناخت ہیں۔ تحقیق اور جستجو کے لیے دور دراز سے آ کر اپنی تشنگی اور تحقیق ذوق کی تکمیل کرنے والے اہل علم بیدل لائبریری کی اہمیت سے بخوبی واقف ہیں۔ لائبریری میں مختلف گوشے موجود ہیں۔

۱۔ لائبریری میں موجود ایم اے، ایم فل اور اپی ایچ ڈی کے مقالے

۲۔ اخبارات، روزنامہ جنگ، نوائے وقت، امت، ایکسپریس، اسلام، ریاست، قومی اخبار، ڈان، بزنس ریکاڈ، ملت، کاوش، جسارت کی فائل موجود ہیں۔

گوشہ کتب:

جن حضرات نے بیدل لائبریری کو کتب و رسائل عطیہ کیے ہیں۔ ان کے نام سے کتب

خانے میں علیحدہ علیحدہ گوشے یا کتابوں کی الماریاں موجود ہیں۔ جن میں مندرجہ ذیل مقتدرہ شخصیات شامل ہیں۔ محمد حسن عسکری، ڈاکٹر اسلم فرخی، ڈاکٹر آصف فرخی، شہزاد منظر، تابش دہلوی، صبیح محسن، نعیم آروی، تقی حسن خسرو، ڈاکٹر شمیم رضوی، مہتاب ظفر، سید ابوالعاص، عصام عظیم آبادی، مطیع الامام، ابوزر عنایت اللہ، ڈاکٹر غلام سرور، امان اللہ، ایس ایچ ہاشمی، ایس منافی، سید قمر الدین، ہارون رشید، سید علی قدوائی، ڈاکٹر وفا راشدی، مولانا محمد جعفر شاہ پھلواری، جمیل زبیری، شفیع احمد، بشریٰ رحمٰن، عذرا قمر، صادق امام، سید حسن امامی وارثی، امیر علی امام، محمد رئیس، مرزا نظام بیگ، سید حسن مثنیٰ ندوی، ایچ ایس صدیقی، ڈاکٹر محمد حسن، اجمل کمال، پرویز بلگرامی، طاہرہ کشفی، بلقیس شاہین، ڈکٹر سید محمد ابوالخیر کشفی، ڈاکٹر نگار سجاد ظہیر، قرطاس پبلی کیشنز، سید صبیح الدین رحمانی، نسیم انصاری، احمد زین الدین، زوار اکیڈمی، ملک نواز عوان، ناصر بغدادی، مدیر رضوی، زاہدہ حنا (محترمہ زاہدہ حنا صاحبہ) باقر رضوی صاحب سے کہہ کر لائبریری میں UPS لگوایا)، ایچ بی خان، رفعت القاسمی، ڈاکٹر روبینہ ترین، ڈاکٹر طاہر تونسوی، رفعت القاسمی، احمد حسین صدیقی، احمد حسین، ثاقبہ رحیم الدین بتوسط شمائلہ اقبال، انیس ارحمان ایڈووکیٹ، لطیف الزاماں خان، علی اقبال، طارق فضلی، شاہد حنا، ڈاکٹر ایوب قادری، مسرت صدیق، قیصر نجفی، شاہین، حیات نظامی.

ملکی اور غیر ملکی شخصیات جنھوں نے لائبریری کا دورہ کیا:

سید سلمان ندوی، سید صباح الدین عبدالرحمٰن، سید مصطفےٰ کریم (برطانیہ)، کلیم عاجز، سید مرتضیٰ حسین بلگرامی (مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)، ڈاکٹر قیوم الدین محمد یوسف پٹنہ، مشتاق احمد (ڈائریکٹر بہار اردو اکیڈمی) سید شہاب الدین دسنوی (سیکریٹری دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ)، مختار الدین احمد (صدر شعبہ عربی ڈین فیکلٹی آف آرٹس مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)، پروفیسر سید محمد حسن (شعبہ اردو علی گڑھ یونیورسٹی گیا انڈیا)، محمد اسماعیل خدا بخش لائبریری، شمس قدر آزاد (پٹنہ)، جمیل اختر (جواہر لال نہرو یونیورسٹی نئی دہلی)، پروفیسر احمد سجاد (شعبہ اردو رانچی یونیورسٹی بہار)، حمید اللہ قاسمی (مدرسہ قاسمیہ گیا، بہار)، سید کلیم اللہ شیر گھاٹوی (جمشید پور بہار)، ڈاکٹر کلیم سرامی (راجہ شاہی یونیورسٹی، بنگلہ ڈیش)، محمد علی خان (صدر شعبہ اردو کالج آف کامرس پٹنہ)، ہلال احمد قادری (خانقاہ صبیحہ پھلواری شریف پٹنہ)، شمیم الدین احمد منعم (خانقاہ، منعمیہ قمر بہ متین گھاٹ پٹنہ سٹی)، ڈاکٹر خلیل طوق آر (جامعہ استنبول، ترکی)۔

یہ کتب خانہ اس حوالے سے بھی اہم ہے کہ یہاں نہ صرف کراچی کے طلبہ آتے ہیں بلکہ دیگر شہروں کے اساتذہ اور طلبہ اکثر اوقات مختلف ماخذات تک رسائی کے لیے اس کتب خانے کا رخ کرتے ہیں۔ یہ کتب خانہ ایک مکمل جہان اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ ہر سال شعب? اردو میں

تعلیم حاصل کرنے والے ان گنت طلبہ تحقیق کے سلسلے میں اس کتب خانے کا رخ کرتے ہیں۔ اسلامی تاریخ، علومِ اسلامیہ، سیاسیات اور مطالعہ پاکستان کے علاوہ اکثر اوقات انگریزی زبان و ادب کے طلبہ بھی اس کتب خانے میں استفادے کے لیے نظر آتے ہیں۔ ان طلبہ میں ایم اے، ایم فل اور پی ایچ ڈی کے علاوہ جامعہ کراچی، وفاقی اردو یونیورسٹی، محمد علی جناح یونیورسٹی، جناح یونیورسٹی فار ویمن کے علاوہ جامشورو یونیورسٹی، شاہ عبداللطیف یونیورسٹی، پنجاب یونیورسٹی، بہاولپور، اسلام آباد، گوجرانوالہ وغیرہ سے آئے ہوئے طلبہ بھی شامل ہیں۔

عام طور پر لائبریرین کا رویہ انتہائی خشک ہوتا ہے مگر بیدل لائبریری کا ماحول دیگر کتب خانوں سے یکسر مختلف ہے. ''بیدل لائبریری'' کی خاص بات یہاں کا ماحول ہے۔ بیدل لائبریری کے لائبریرین کا رویہ طلبہ کے ساتھ شفقت آمیز ہے۔ یہاں کے لائبریرین زبیر صاحب طلبہ اور اساتذہ کے ساتھ بے حد تعاون کرتے ہیں .اکثر اوقات نادر اور نایاب کتب جو لائبریری میں موجود نہیں ہوتیں ان کے حصول میں اپنے ذاتی وسائل کا استعمال کر کے طلبہ کی مدد پہ آمادہ نظر آتے ہیں۔ وہ ہنستے مسکراتے لائبریری میں آنے والے تمام طلبہ کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ وہ سب ہی کے لیے ایک دوست، بھائی، مشفق بزرگ اور ساتھی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ لائبریری کی کتابوں کا ریکارڈ مختلف رجسٹروں میں موجود ہے مگر وہ اپنی یادداشت کے بل بوتے پر طلبہ کی خواہش پر منٹوں میں کتاب حاضر کر دیتے ہیں .انھیں اکثر اوقات رجسٹر دیکھنے کی بھی ضرورت نہیں ہوتی۔ ان کا طلبہ سے یہ اصرار بھی جاری رہتا ہے کہ انتہائی مستقل مزاجی سے جلد از جلد پی ایچ ڈی کرلو۔ وہ طلبہ کو یہ بھی سمجھاتے ہیں تحقیق میں ذرا سا تعطل، تحقیق میں بڑے وقفے کا سبب بن جاتا ہے۔ وہ لائبریری آنے والے طلبہ کو نہ صرف کتابیں مہیا کرتے ہیں بلکہ وہاں آنے والے اکثر لوگ ایسے بھی ہیں جو ان کی چائے سے بھی لطف اندوز ہوتے ہیں وہ تنہا چائے پی ہی نہیں سکتے یہی وجہ ہے کہ چائے چاہے پٹھان کے ہوٹل سے آئے یا مغرب کے بعد لائبریری میں کام کرنے والا اٹر کا حفیظ بنائے' ہر صورت میں وہاں موجود تقریباً تمام لوگوں کو چائے کا پوچھا جاتا ہے .لائبریری آنے والا شاذ ہی کوئی شخص ایسا ہوگا جس نے یہاں چائے سے لطف نہ اٹھایا ہو۔

زبیر صاحب بیدل لائبریری کے روحِ رواں اور ان کا اسسٹنٹ امان لائبریری میں ایک خاموش مجاہد کی حیثیت رکھتا ہے۔ انتہائی خاموشی سے کتابوں کی بائنڈنگ کرنا، مطلوبہ کتابوں کو الماریوں میں پہنچانا، طلبہ کی فرمائش پر ان کی مطلوبہ کتابیں نکال کر دینا امان کا کام ہے۔ خاموش طبیعت امان جس دن لائبریری میں موجود نہیں ہوتا لائبریری میں سناٹے کا راج ہے۔ لائبریری میں آنے والے ہر استاد اور طالب علم کا واسطہ امان سے پڑتا ہے۔

لائبریری میں ایک لڑکا حفیظ کام بھی کرتا ہے۔کم عمر،معصوم اورانتہائی شریف،حفیظ کا کام رسائل سیکشن،اوراسٹڈی روم کی نگرانی ہے۔رسائل سیکشن میں شرف آباد کےاکثر لوگ اخبار پڑھنے اور رسالے پڑھنے آتے ہیں۔رسائل سیکشن میں انٹراور بی اے کے نصاب کی تمام کتب بھی موجود ہیں .اکثراوقات شام میں طلبہ گھر کےشور ہنگامے سے بچ کر یہاں آجاتے ہیں اوراپنے امتحانات کی تیاری کرتے ہیں۔حفیظ کا کام رسائل سیکشن میں رسالے،کتابیں اوراخبارایشو کرنا ہے۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو بیدل لائبریری کراچی کی ایک ایسی لائبریری ہے جو پاکستان کی مختلف جامعات کےاساتذہ اورمحققین کے لیے بھرپور خدمات انجام دے رہی ہے۔اکثرمعروف اسکالرزاورصحافی حضرات کی علمی اورادبی نشستیں بھی اس لائبریری میں منعقد ہوتی نظر آتی ہیں۔غیر ملکی شخصیات کے اعزاز میں مختصر نشست کا اہتمام بھی کیا جاتا ہے۔اردو، اسلامک لرننگ،تاریخ اسلامی اورمطالعہ پاکستان کے محققین کے لیے یقیناً یہ ادارہ قابل قدر خدمات انجام دے رہا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ یہاں موجود کتب رسائل اور مخطوطات کو کمپیوٹرائزڈ کیا جائے اور اگر وسائل میسر ہوں تو بیدل لائبریری میں موجود کتب کوانٹرنیٹ پراپ لوڈ کر دیا جائے تاکہ جس طرح طلبہ کی اکثریت ریختہ ڈاٹ کام سے استفادہ کررہی ہےاس کتب خانے سے بھی بھرپوراستفادہ کیا جاسکے۔

اگر ہمارے کتب خانے رات دیر تک کھلے رہیں!

بشیر زہری

''اگر ہمارے کتب خانے رات دیر تک کھلے رہیں گے تو دنیا کی کوئی طاقت ہمیں شکست نہیں دے سکتی۔'' یہ خوبصورت جملہ مشہور برطانوی وزیراعظم ونسٹن چرچل نے کہا تھا۔ مسٹر چرچل نے یہ جملہ تب ادا کیا جب ان کی افواج دوسری جنگ عظیم کے دوران ہٹلر سے برسرپیکار تھیں۔ اب ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ مسٹر چرچل ایسے نازک موقعے پر اپنی افواج یا ہتھیاروں پر ناز کرتے، مگر اس کے بجائے انہوں نے کتب خانوں پر فخر کیا اور انہیں طاقت کا مرکز قرار دیا۔ بلاشبہ عظیم قومیں اپنے علمی سرمائے کی اہمیت سے بخوبی واقف ہوتی ہیں۔

عہد قدیم سے لے کر جدید انفارمیشن ٹیکنالوجی کے دور تک کتب خانوں کی اہمیت میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ کتب خانے ہر دور میں انمول رہے ہیں۔ قدیم دور میں بادشاہ اپنے کتب خانے کی چابیاں اپنے پاس رکھتے تھے گویا وہ لائبریرین بھی ہوتے تھے۔ ماہرین آثار قدیمہ کو دنیا بھر میں جہاں بھی کھدائی کے دوران اگر کسی متمدن تہذیب آثار ملے ہیں تو اس میں لائبریری کے آثار ضرور شامل رہے ہیں۔ مسلمان بھی کتب اور کتب خانوں کے شیدائی رہے ہیں۔

بلوچستان یونیورسٹی میں لائبریری سائنس ڈیپارٹمنٹ کے پروفیسر طاہر بلوچ ایک بہت مشہور واقعہ بیان کرتے ہیں کہ علمی لحاظ سے مسلمانوں کے عروج کے دور میں کتابوں کی کسی دکان پر ایک بہت ہی خوبصورت کتاب رکھی تھی جس کے سرورق پر نہایت خوبصورت نقوش ونگار بنے تھے۔ وہاں موجود دو گاہکوں نے کتاب میں دلچسپی لی، اور وہ دونوں ہی یہ کتاب خریدنے کیلیے بضد تھے۔ ان دونوں نے کتاب کیلیے اس کی قیمت سے کئی گنا زیادہ بولی لگا رہے تھے کیونکہ دونوں ہی اس کتاب کو اپنی اپنی لائبریری کی زینت بنانا چاہتے تھے۔ بالآخر ایک شخص اس لئے دستبردار ہوگیا کیونکہ وہ اس سے زیادہ قیمت ادا نہیں کرسکتا تھا۔ اس کے علاو؟ اس وقت لوگ اپنے گھر کی زیب وزینت میں کتابوں کو اہم مقام دیتے تھے۔ کتب خانوں کی اہمیت میں کبھی کمی نہیں آئی۔ آج بھی دنیا کی معلومات کا صرف 20 فیصد حصہ انٹرنیٹ پر موجود ہے جبکہ 80 فیصد حصہ اب بھی کتابوں میں درج ہے۔ ان معلومات کو حاصل کرنے کا واحد ذریعہ کتب خانے ہیں۔ دور جدید میں

جہاں انفارمیشن ٹیکنالوجی نے ایک انقلاب برپا کیا ہے جبکہ کتب خانوں نے بھی آئی ٹی کو اپنے اندر سمو کر اپنی کارکردگی کو مزید بہتر بنایا ہے۔ بیشتر کتب خانے انٹرنیٹ استعمال کر کے الیکٹرونک کتب یا ڈیجیٹل لائبریریز کے ذریعے اپنے قارئین کو گھر بیٹھے خدمات فراہم کر رہے ہیں۔

معاشرے میں کتب خانے ذہنی اسپتال کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہاں روزمرہ کی زندگی کی بھاگ دوڑ سے بیزار لوگ چند لمحے سکون کے پا لینے کیلیے بھی آتے ہیں۔ خاموش اور پرسکون ماحول میں بیٹھ کر اپنی پسند کی کوئی کتاب پڑھنا بھی گویا غنیمت ہے۔ لائبریری اسٹاف، اس بات سے قطع نظر کہ اس کا قاری کس زبان، رنگ و نسل سے تعلق رکھتا ہے، بلاتفریق سب کی خدمت کرتا ہے۔

باقی دنیا کی نسبت ہم پاکستان کی بات کریں تو بدقسمتی سے یہاں لائبریریز کو استعمال کرنے کا رواج بہت ہی کم ہے۔ ہمارے برعکس یورپ میں آج بھی کتاب دوستی اپنے عروج پر ہے۔ سفر کیدوران اگر انہیں کسی سگنل پر پانچ منٹ رکنا پڑے تو اس وقت وہ اپنی پسندیدہ کتاب کے مطالعے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ اگرچہ ہم یورپ اور امریکا کی ترقی کو رشک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور بارہا یہ گلہ بھی کرتے ہیں کہ وہ لوگ ہم پر راج کیوں کر رہے ہیں۔ مگر حقیقت میں ان جیسا بننے کی کوشش کبھی نہیں کی۔ کوئی شک نہیں کہ انھوں نے یہ سب اپنے علم کی بدولت حاصل کیا ہے جس میں ان کے کتب خانوں کا بہت بڑا کردار ہے۔ زیادہ دور نہیں، اٹھارویں اور انیسویں صدی میں جب ہم خواب خرگوش کے مزے لے رہے تھے، تب وہ لائبریری آف کانگریس، برٹش میوزیم اور ان جیسی دیگر عظیم لائبریریز بنا رہے تھے جو آج کے زمانے میں دنیا کی سب سے بڑی لائبریریز میں شمار ہوتی ہیں۔ اگر پاکستانی قوم کو اب ترقی کرنا ہے تو اپنے تعلیمی اداروں اور کتب خانوں کی حالت بہتر بنانا ہوگی، تب جا کر ہم ترقی یافتہ اقوام کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا سکتے ہیں۔ اب ضرورت اس امر کی ہے کہ پھر سے کتابوں اور لائبریریز سے اپنا ٹوٹا ہوا رشتہ دوبارہ استوار کیا جائے۔

جتنا وقت ہم سوشل میڈیا کو دیتے ہیں، اگر اس سے آدھا وقت بھی کتابوں کے مطالعے اور لائبریریز کو دیں تو غنیمت ہے۔ اپنے بچوں میں کتب بینی کا شوق پیدا کرنے کیلیے بازار سے کھلونے خریدتے وقت انہیں کتابوں کی دکانوں پر بھی لے کر جانا چاہیے تاکہ انہیں بھی کتب بینی کی طرف راغب کیا جا سکے۔ ایسی کتابیں جو آپ کی ضرورت کی نہ ہوں، انہیں ضرورت مند لوگوں میں تقسیم کر دینا چاہیے تاکہ کسی کے کام آ سکیں۔ دوستوں اور رشتہ داروں کو خوبصورت تحفہ کتاب کی صورت میں دیا جائے۔ جن علاقوں میں پبلک لائبریریز موجود ہیں ان کو زیادہ سے زیادہ استعمال کیا جانا چاہیے؛ اور جہاں پبلک لائبریریز نہ ہوں وہاں حکومت کی توجہ دلانے کے لیے بھرپور کوشش کرنی چاہیے کیوں کہ ''لائبریری لیجسلیشن ایکٹ'' کے تحت ہر پانچ ہزار کی آبادی کیلیے ایک پبلک لائبریری لازمی ہونی چاہیے۔

لائبریریاں......ہمارا سرمایہ، ہمارا مستقبل!

رضی الدین سید

اگر ہم آسان زبان میں لائبریری کی تعریف کرنا چاہیں تو کہہ سکتے ہیں کہ یہ انسانوں کے علم، تجربے اور مذہب کا دوسرا نام ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ ہمارے بزرگ اور ان بزرگوں کے بزرگ اب اس دنیا میں موجود نہیں ہیں کہ ہم ان سے پوچھ سکیں کہ انسانوں نے دیوہیکل مشینیں کیسے ایجاد کیں؟ انسانوں کے پیغمبر کون ہیں؟ انہیں اس دنیا میں کیا کیا تکلیفیں جھیلنی پڑیں؟ انسان چاند پر کیسے پہنچا؟ اور مسلمانوں نے اسپین میں آٹھ سو سال تک کیسے حکومت کی؟ وغیرہ۔ ان تمام سوالوں کے جوابات اب ہمیں صرف کتابوں میں مل سکتے ہیں۔ جنہیں ہم دوسرے الفاظ میں لائبریری کہتے ہیں۔ ان کتابوں کو پڑھ کر ہمیں حوصلہ اور نئی زندگی ملتی ہے۔ یہی کتابیں ہیں جنہیں پڑھ کر پرانے وقتوں میں لوگوں نے کارہائے نمایاں انجام دیے۔ انہوں نے ماضی کے واقعات، شخصیات سے سرزد ہونے والی غلطیوں سے بچنے اور ان سے ظہور ہونے والی کامیابیوں کو اپنانے کی کوشش کی ہے۔ آج دنیا ترقی کرتی ہوئی جو اس جدید پرسہولت دور تک پہنچی ہے تو اس میں بڑی حد تک ہاتھ انہی لائبریریوں کا ہے۔ یہ لائبریریاں ماضی اور مستقبل سے انسانوں کا رشتہ جوڑتی اور انہیں بے حد وحساب معلومات فراہم کرتی ہیں۔ اگر لائبریریاں نہ ہوں تو ہمیں انسانوں کے تجربوں، علم اور مذہب کے بارے میں کچھ بھی معلومات نہ ہو سکیں۔

لیکن بچوں کے لیے یہ بات بھی حیرت انگیز ہوگی کہ کتابوں اور علم کی اتنی افادیت کے باوجود یورپ کل تک ان کا بدترین دشمن تھا۔ کتنے تعجب کی بات ہے کہ آج جس مغرب کے علم سے ہم مرعوب ہیں کل تک وہ اسی علم کا بدترین مخالف تھا۔ ان کے پادری اپنے عوام کو کسی نئی علمی تحریک یا نظریے سے آشنا نہیں ہونے دینا چاہتے تھے۔ ان کی علم دشمنی کا یہ حال تھا کہ انہوں نے اپنے دور میں ابھرنے والے نئے نظریات کے بانیوں پر تشدد کیا، ان پر پابندیاں لگائیں حتیٰ کہ انہیں موت کا پیالہ پینے اور کھولتے ہوئے تیل میں جلنے پر مجبور کیا۔ جب گلیلیو اور کوپرنیکس نے سورج کے گردشی نظریے سے اختلاف کرتے ہوئے زمین کی گردش کا نظریہ پیش کیا تو پادری علماء نے ان پر بے پناہ تشدد کیا حتیٰ کہ گلیلیو کو پادریوں کے سامنے اپنے نظریات سے خود ہی انحراف پر مجبور ہونا پڑا۔ علم دشمنی کا یہی بدترین رویہ تھا جس کی بنیاد لوتھر نے ان پادریوں کے تشدد سے بغاوت کی راہ اختیار کی اور ایک نیا عیسائی فرقہ ''پروٹسٹنٹ'' پیدا کیا۔

اس کے برعکس مسلم دنیا میں علم وفن کا روز وشب چرچا تھا۔قرآن پاک نے مسلمانوں کو جا بجاہدایات دی ہیں کہ وہ اپنے جسم اور زمین وآسمان کی بناوٹ پرغور کریں اوراس امر پر توجہ دیں کہ پھل کیسے پیدا ہوتے اور کیسے پکتے ہیں؟ قرآن پاک نے انسانوں کو زمین کی سیر پر اکسایا ہے تا کہ انہیں دنیا کے تجربات حاصل ہوسکیں۔لہٰذا ان بنیادوں پر مسلم اہل علم نے اموی،عباسی اور مغلیہ ادوار میں بے شمار علوم پر کام کیا۔انہوں نے گھڑی ایجاد کی،ستاروں کی نقل وحرکت جاننے کے لیے اضطراب استعمال کیا،آنکھوں کے قرنیے کا علاج دریافت کیا۔جغرافیہ اور تاریخ لکھی۔زمین کا محیط اور قطر دریافت کیا۔ انجینئرنگ میں کمال حاصل کیا۔آلات جراحی ایجاد کیے۔ابن بطوطہ نے دنیا کے ایک بڑے حصے کا سفر کیا۔بوعلی سینا، رازی اور ابن الہیثم کی کتابیں یورپ کی یونیورسٹیوں میں آج سے ۳۰۰ سال پہلے تک باقاعدہ نصاب کے طور پر پڑھائی جاتی تھیں۔ Astrolobe اور Cornea کے نام (الفاظ) انہوں نے عربی ہی کے ''اصطرلاب'' اور ''قرنیہ'' سے چرائے ہیں۔ ان کی یہ چوری علم میں مسلمانوں کی ترقی کی محض ایک مثال ہے (بعض انگلش ڈکشنریوں میں ہر لفظ کی root یا اصل کا ذکر ہوتا ہے،ایسی لغات ملاحظہ کر کے دیکھا جاسکتا ہے کہ کون کون سے عربی الفاظ آج انگلش میں یوں شامل ہیں کہ ہمیں گمان تک نہیں ہوتا کہ ان کی اصل دراصل عربی ہے، خصوصاً سائنسی اصطلاحات مسلمانوں کی سائنسی ترقی کا ثبوت دینے کے لیے کافی ہوں گی۔) مغربی دنیا میں ایک طویل عرصے تک اندھیرا رہا ہے۔ان کی گلیاں کیچڑ اور گھوڑے کی لید سے بھری رہتی تھیں۔لیکن مسلم شہروں میں ہر طرف روشنی ہی روشنی ہوتی تھی،ان کی گلیاں پختہ اور صاف ہوا کرتی تھیں۔ مدرسے آباد وار کتب خانے معمور ہوا کرتے تھے۔

اس زمانے میں ہمارے بادشاہ بھی انتہائی علم دوست ہوا کرتے تھے۔وہ خود بھی تحقیق و تصنیف میں دلچسپی لیتے تھے اوراپنے دربار میں عالموں اور فاضلوں کو اہم مقام دیا کرتے تھے۔ان کے دور میں یونان میں علم وحکمت کا بہت چرچا تھا۔ جہاں سقراط،افلاطون اور فیثا غورث جیسے نامور حکماء پیدا ہوئے تھے (یہ الگ بات ہے کہ سقراط کو بھی بعد میں زہر کا پیالہ پیدا پڑا) ہمارے بادشاہ ان حکماء کی کتابیں اونٹوں پر لادکر بغداد منگوایا کرتے تھے جہاں لسانیات کے ماہرین ان کتابوں کو عربی میں ترجمہ کرتے تھے تاکہ عوام الناس ان سے مستفید ہوسکیں۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز، ہارون الرشید، مامون الرشید،عبدالرحمٰن الداخل،محمود غزنوی اور اورنگزیب عالمگیر ان عالم بادشاہوں اور خلیفاؤں کی محض چند مثالیں ہیں۔ دنیا کو جدید آسائشوں سے واقف کرانے والے یہ ہمارے ہی بزرگ تھے ورنہ مغرب کو تو اس وقت تک تہذیب اور ETIQUETTES کا پتہ بھی نہ تھا۔ برسوں گور جاتے تھے اور بادشاہوں کے غسل

کی نوبت نہ آتی تھی، حتیٰ کہ جسم کی بدبو کو دبانے کے لیے خوشبو میں استعمال کی جانے لگیں۔ جو یورپی باشندہ نہاتا ہوا پایا جاتا، پادری اسے برا بھلا کہتے اور اس کا مذاق اڑاتے تھے۔

بعد میں ہوا یہ کہ مسلم حکمران عیاشیوں میں ڈوب گئے، شراب اور حرم ان کی مصروفیات کا مرکز اور محبوب مشاغل بن گئے۔ عوام کے اندر فرقہ پرستیاں اور گروہ بندیاں عام ہو گئیں۔ خانہ جنگیاں پھیلنے لگیں اور اندرونی سازشیں برپا ہونے لگیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ علمی تحقیقات اور جستجو کنارے لگ گئیں اور لائبریریاں ویران ہونے لگیں۔ علمی کتابوں کی جگہ فرقہ وارانہ کتابیں منظر عام پر آنے لگیں اور راگ راگنی کے فنون پر مباحثے ہونے لگے۔

بہر حال علم آگے بڑھ رہا تھا اور ماحول علمی عروج کی طرف جا رہا تھا اس لیے باوجود تشدد کے مغرب نے کتابیں پڑھنی شروع کیں اور وہ علمی ماحول جسے مسلمانوں نے ایک مقام پر چھوڑا تھا مغرب نے اسے وہیں سے آگے بڑھایا۔ مغرب کے لوگ لائبریریوں اور کتابوں کے دیوانے ہو گئے اور عربی کتابیں منگوا کر انگریزی اور فرانسیسی میں ترجمے کرانے لگے۔ چنانچہ یورپ علم، سائنس اور ٹیکنالوجی میں ہم سے بہت آگے نکل گیا۔ آج جو کچھ بھی ایجادات آ رہی ہیں وہ سب کی سب مغربی دنیا سے آ رہی ہے۔ مسلمانوں کو تو اب ایجادات سے دلچسپی ہی باقی نہیں رہی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے کتابوں اور لائبریریوں سے اپنا رشتہ توڑ لیا ہے۔ آج مغرب کے پاس سائنس اور ٹیکنالوجی ہے اسی وجہ سے وہ ساری دنیا پر حکمرانی کر رہا ہے۔ وقت تقاضا کر رہا ہے کہ ہم کتابوں سے اپنا تعلق دوبارہ استوار کریں، کیوں کہ کتابوں سے بہترین دوست اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ یہ ہماری زندگی کا رخ متعین کرتی ہیں۔ یہ ہمیں علم کا سمندر عطا کرتی ہیں اور یہ ہمیں دنیا انصاف سے حکمرانی کے اصول سکھاتی ہیں۔ کیا اب مسلم قوم اتنی بانجھ ہو چکی ہے کہ اس میں کوئی اقبال، کوئی جابر بن حیان اور کوئی بوعلی سینا پیدا نہیں ہوگا؟

لیکن یہ بات بھی ضروری ہے کہ کتابوں کے مطالعے سے پہلے ہمیں ان کی پہچان کرنی چاہیے۔ کتابیں بھی دو طرح کی ہوتی ہیں۔ ایک کتاب زہر ہلاہل ہے۔ ایک آبِ حیات ہوتی ہے۔ ایک کتاب بگاڑنے والی ہوتی ہے اور ایک سنوارنے والی ہوتی ہے۔ اس لیے لائبریریوں میں جانے سے قبل سوچ لینا چاہیے کہ ہمیں کون سی کتابیں پڑھنی ہیں؟ دوسرے افراد اگر غلط مشغلوں، پتنگ بازی، میوزک کنسرٹ، بسنت میلے اور ویلنٹائن ڈے جیسے پرفریب مشغلوں میں مصروف ہوں تو انہیں یہ مشغلے مبارک ہوں ہمیں تو محض لائبریری اور کتاب سے عشق ہونا چاہیے۔ لائبریریاں اور کتابیں ہی ہمارا سرمایہ اور ہمارا مستقبل ہیں۔ لائبریریوں اور کتابوں سے تعلق رکھنے والا کبھی کم حیثیت کا مالک نہیں ہو سکتا۔

مطالعہ کتابیں اور میری سرگزشت

سلمیٰ اعوان

مضمون کے آغاز سے قبل تمہیدی طور پر سو پیسے سچا آپ بیتی ٹائپ ایک لطیفہ نما واقعہ سُن لیجیئے ۔ موٹے سے حساب کتاب میں پڑوں تو یہی کوئی تیس (30)، پینتیس (35) سال قبل میں نے ایک دن اپنے شوہر سے کہا۔

''ہائے اگر ہمارے گھر میں چور آ جائیں تو بیچاروں کو کتنی مایوسی ہوگی کہ یہاں یا تو کتابیں ہیں یا پھر لنڈے کے کپڑے۔'' پھر یوں ہوا کہ مدتوں بعد ایک دن ہمارے گھر چور نہیں ڈا کو آ گئے ۔ بہو کچن میں چولہے کے سامنے کھڑی تھی ۔ موزر اس کی کنپٹی پر رکھتے ہوئے انہوں نے اُسے کمروں میں گھمانا شروع کر دیا۔ ہر کمرے میں کتابیں تھیں یا کپڑے۔ ایک نے کہا۔

''اے تے پاڑیاں (پڑھنے والے) دا کر لگدا اے۔'' (یہ پڑھے لکھے لوگوں کا گھر لگتا ہے۔)

دوسرا بولا'' نال اے وی کہہ فقیر وی نیں۔'' (ساتھ یہ بھی کہو فقیر بھی ہیں) تفصیل کبھی پھر سہی ۔ بڑی ہی دلچسپ ہے یہاں بتانا صرف اتنا مقصود ہے کہ کتاب کو ہم نے اگر معشوق سمجھا تو اُسے پڑھنا ہمارا عشق ہے۔

جب عشق و عاشقی کا سلسلہ ایسا زوردار قسم کا ہو تو پھر تعلق کے ڈانڈے کہیں پوتڑوں سے ہی جا جڑتے ہیں۔

بس تو یہی کچھ میرے ساتھ بھی تھا کہ کچی پکی جماعت سے بھی قبل اس لڑکی کو نام جس کا اس کی پھوھی نے بڑے چاؤ سے سلمیٰ رکھا تھا۔ چھٹپنے ہی سے کہانیاں سُننے اور انہیں گھڑنے سے غیر معمولی رغبت تھی۔

مشرقی پنجاب کے ضلع جالندھر کے ایک گاؤں سے ہجرت کر کے آنے والے گھرانے کی جٹی مٹیار عورتوں کو جو رشتے ناطوں کی گنجل سنگلیوں میں ایک دوسری سے یوں پیوست تھیں کہ پھوپھیاں ممانیاں بھی ہیں اور چچیاں سگی خالائیں بھی ۔ اور الا ماشاء اللہ سب کی سب تیز طرّار جھانسی، کانپور، لکھنو بھائیوں اور شوہروں کی ملازمتوں کے سلسلے میں دیکھے ہوئے، گھاٹ گھاٹ کا

پانی پیئے ہوئے تھیں۔ اِس نئے ملک میں آتے ہی لیڈی ہملٹن کے سیاہ برقعوں میں ملبوس ٹانگوں پر چڑھ کبھی شالامار باغ، کبھی لنڈے، کبھی دلّی، بھاٹی دروازے اور کبھی رنگ محل جا دھمکتیں۔ سچی بات تو یہی ہے کہ وہ پون درجن عورتیں تو میری کم سنی سے ہی یہ فتوی دیئے بیٹھی تھیں کہ اللہ بچائے اِس کم بخت بالشت بھر کی لونڈی سے کیسے رائی کے پہاڑ بناتی ہے۔ دو لفظوں کی بات ہو اور پورا افسانہ گھڑ کے کان کھاتی ہے۔

اب میری بھی سُنیے۔ میں تو ٹھہری ننھی مُنی بچی اور وہ ڈشکریاں قصّے کہانیوں کی رسیا۔ پچاس اور ساٹھ کی دہائی کا زمانہ، گرمیوں کی لمبی دوپہریں اور سردیوں کی طویل راتوں میں سب بڑے کمرے میں اکٹھی ہوتیں۔ اُس زمانے کے خواتین کے مشہور رسائل زیب النساء، حور، عفت اور بتول جو ہمارے گھر میں باقاعدگی سے آتے تھے۔ چھوٹی خالہ جو اِن دنوں جماعت دہم کی طالبہ تھی افسانہ پڑھنا شروع کرتی۔ کہانی کا اُتار چڑھاؤ، کرداروں کے منفی مثبت رویے، واقعات کا بہاؤ، خواتین کا انہماک، کہیں قہقہے، کہیں آنسو، کہیں لعن طعن اور کہیں تحسین آمیز کلمات۔ میں یہ سب دیکھتی تھی۔ وہ بخیئے اُدھیڑ دیتیں۔ بہت زیادہ سمجھ نہ آنے کے باوجود لطف اٹھاتی تھی۔ خیال ہے کہ لکھنے کے جراثیم تبھی پھلنے پھولنے لگے تھے۔ اور اگر یہ کہوں کہ کہانی کی بُنت کو کس کر کیسے رکھنا ہے کہ اس میں جھول نہ آئے تو یہ کچھ اس تربیت اور کچھ مطالعے کے صدقے ملی۔

اب میرے اپنے چسکے کا زمانہ شروع ہوگیا تھا۔ بچوں کی طلسماتی کہانیاں، الف لیلیٰ اور کوہ قاف کی کہانیاں۔ کھلونا، بچوں کی دنیا، نونہال جیسے رسائل میں بھی جان اٹکنے لگی تھی۔

یہ ایک ایسا نشہ تھا۔ ایک ایسی چاٹ تھی کہ ایک پیسہ کرایہ پر کتاب لاتی۔ آٹھ دس صفحے کی کتاب جو میرے ایک گھنٹے کی مار ہوتی۔ اُن وقتوں میں پیسے کی کہاں فراوانی تھی۔ غریبی، ابّا کی معمولی سی تنخواہ۔ اماں مہینہ گویا سوئی کے ناکے سے گزارنا جیسے محاورے کے مطابق اِسے گزارتیں۔ ایک پیسے کا ملنا بڑی بات تھی۔

اب پان سگریٹ کے کھوکھے والے پھا جمیل سے جس کی دکان کے اوپر یہ کہانیاں رسیوں سے لٹکی کیسے من للچاتی تھیں۔ جی چاہا کرتا اِن رسیوں کو توڑ کر اِن کا کلاوہ بھروں اور کہیں بھاگ جاؤں۔ پھا جمیل بھی ایک نمبر کا ئیاں۔ اُدھار پر کہانیاں پڑھواتا رہا اور جب بل کوئی آٹھ آنے کے قریب ہوگیا تو ایک دن گھر پہنچ گیا۔

اُف امّاں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ لتر اُتار کر وہ ٹھکائی کی کہ آج جب لکھنے بیٹھی ہوں تو مار سے کہیں زیادہ اس بے عزتی اور تذلیل کا احساس بے طرح یاد آنے لگا ہے جو اُس وقت پھا جمیل کے سامنے ہوا تھا۔ پر سچی بات ہے آپ سے کیا پردہ۔ میں بھی بڑی ڈھیٹ ہڈی تھی۔ چار چاروں

والی اِس مار کا مجھ پر خشخش کے دانے جتنا اثر نہ تھا۔

یہاں الف لیلیٰ کی کہانیوں کے حوالے سے یہ لکھتے ہوئے عجیب سی سرشاری محسوس کرتی ہوں کہ جب اُدھیڑ عمری میں عراق گئی تو بغداد کے خرامانہ یا علی بابا سکوائر میں میرے بچپن کی ساری ہنسی میری آنکھوں میں پھیلی تھی۔ میرا وجود کسی معصوم بچے کی طرح کلکاریاں مارنے لگا تھا۔ میری اور ہم سب کہانیاں پڑھنے والے پاکستانیوں کی وہ محبوب علی بابا چالیس چور کی ہیروئن مرجانہ گھڑوں میں چُھپے چوروں پر اپنے ہاتھ میں پکڑے فوارے نما برتن سے بظاہر پانی مگر درحقیقت کھولتا ہوا تیل ڈال رہی تھی۔

یاد آیا تھا۔ ہائے کتنی بار شاید بارہا میں نے خود کو مرجانہ تصور کیا تھا۔ علی بابا بوڑھا، میرے ابّا جیسا مزدور ہائے کاش کوئی ایسا ہی خزانہ میرے ابّا کے ہاتھ بھی لگ جائے تو موجیں ہو جائیں۔

میری خوشی اور سرشاری اس وقت عین عروج پر تھی جب ابونواس روڈ پر عین دجلہ کنارے ایک ہزار ایک داستانوں والی شہرزاد کو دیکھا تھا۔ شہرزاد میری آئیڈیل۔ پہلی بار شہرزاد کو پڑھا تو جیسے دل میں کُھب گئی۔ آنکھوں میں سما گئی۔ اس رات شہرزاد کی جگہ میں خود شہریار کی خواب گاہ میں تھی۔ اُسے کہانی سُناتے ہوئے۔ بہت مہینوں یہ سلسلہ چلا۔

اُس وقت اِس خوبصورت یادگار کے کونے میں کھڑی شہرزاد کو ہاتھوں کو تمثیلی انداز میں پھیلائے تخت پر تمکنت سے نیم دراز چیچڑ سے شہریار کو دیکھ کر میری ہنسی چھوٹ گئی تھی۔

میں نے کھلکھلا کر اپنے آپ سے کہا تھا۔

''اُف میں کتنی اُلو کی پٹھی تھی۔ اِس میراثی سے شہریار کے لئیے مری جاتی تھی۔''

عبدالقادر جیلانی کے مزار مبارک پر وہ پیارا سا لڑکا جو علم حاصل کرنے جاتا ہے۔ سچ بولتا ہے۔ ڈاکوؤں کا پورا گروہ تائب ہو جاتا ہے۔ میرے بچپن کا دیومالائی کردار۔ اُن کے مزار کی جالیوں سے جھانکتے ہوئے میں نے سرگوشی کے سے لہجے میں اُن سے کہا تھا۔

آپ تو جانتے ہی ہوں گے کہ اللہ والے ہیں کہ آپ کی کہانی پڑھ کر ختم تو کر لیتی۔ مگر کوئی نہیں جان سکتا تھا کہ اس چھوٹی سی لڑکی کی جان کس سیاپے میں پڑ گئی ہے۔ میرے پیارے عبدالقادر جیلانی جنگل، شیر ببر، چیتے، ہاتھی، سانپ اور اژدھے سب اس کے خیالوں میں دوڑے چلے آتے۔ ڈاکوؤں کی خوفناک صورتیں۔ بچے کے ساتھ اُن کے سوال جواب۔ اللہ تو کتنا اچھا ہے تو نے اُس پیارے سے لڑکے کو اُن سبھوں سے بچایا اور انہیں نیک بھی کر دیا۔ یہ سب باتیں میں نے انہیں سنائی تھیں۔

پیٹرز برگ میں کوہ قاف کی لڑکیوں کو دیکھ کر بے اختیار میں نے دو کے ہاتھ پکڑ لیے تھے۔ میرے جذبات کیسے امنڈ پڑے تھے۔ کوہ قاف کی پریو میں نے خود کو تمہارے روپ میں کتنا ڈھالا۔ گنوانا چاہوں تو گنوا نہ پاؤں گی۔

وینس ریلوے اسٹیشن پر گھنٹہ بھر بیٹھی وینس کے سوداگروں کو یاد کرتی رہی کہ کہانیوں کہ سوداگر تو زیادہ یہاں کے ہی ہوتے تھے۔

اِن اجنبی جگہوں پر کیسے میرا بچپن ھمک ھمک کر میرے سامنے آتا تھا۔ وہ لُو برساتی دوپہریں، وہ گھر کی چھت، بنیرے کی ذراسی اوٹ اور پیسہ کرایہ پر لی ہوئی الف لیلیٰ کی یہ کہانیاں ہائے کیا زمانہ تھا۔

میں اب پانچویں جماعت کی طالبہ تھی۔ بچوں والی کہانیوں سے نکل کر بالغوں والی دنیا میں داخل ہوگئی تھی۔ گلشن نندہ ،دت بھارتی اور اسی قبیل کے دوسرے مصنفوں کی دنیا، کچھ مشکل، کچھ عجیب ، کچھ سمجھ آتی ، کچھ گھمن گھیریوں میں اُلجھاتی۔ جون کی چلچلاتی دوپہروں میں بنیرے کی ذراسی اوٹ ماحول وہی تھا۔ مگر خوف بڑھ گیا تھا۔ پڑھنے کے ساتھ ساتھ مضطرب ہوکر اُس گلیارے کو بھی دیکھنا نہ بھولتی جہاں سیڑھیاں تھیں اور نیچے سے گھر کا کوئی فرد بیت الخلاء جانے کے لیے آسکتا تھا کہ اُن دنوں لیٹرین چھتوں پر ہوتی تھی۔

کرایے بابت بھی میرا اسٹیٹس اونچا ہوگیا تھا۔ پھا جمیل ایک پیسے والے سے نسیم لائبریری کرایہ آنہ والے سے جڑ گیا تھا۔ یہ آنہ کیسے اکٹھا کرتی۔ سب ہیرا پھیری کے حربے چلتے تھے۔ رضیہ بٹ، فاطمہ مبین، اے آر خاتون، زبیدہ خاتون، نسیم حجازی اب یہ محبوب بن گئے تھے۔ شمع ناول کا ہیرو ڈاکٹر منصور ہائے اپنا ہیرو بن گیا تھا۔ منصور نام سے عشق تب سے ہے اور آج بھی یہ نام ہانٹ کرتا ہے۔

نسیم حجازی کے ناولوں نے بھی بڑا ذہنی اُدھم مچایا۔ یوسف بن تاشفین کا بدر بن مغیرہ کیا کہوں اب۔ اُندلیسہ کی سیاحت میں یہ کردار کتنا یاد آئے۔ غرناطہ اور قرطبہ میں نسیم حجازی سے دامن چھڑانا مشکل ہوگیا تھا۔

بلوغت کے دوسرے دور میں میرے پسندیدہ لکھاری بدل گئے تھے۔ اردو ادب کے سب قابل ذکر اہم نام میرے پسندیدہ بن چکے تھے۔ راجندر سنگھ بیدی، قرۃ العین حیدر، احمد ندیم قاسمی، انتظار حسین، اشفاق احمد، بانو قدسیہ، خدیجہ مستور، ہاجرہ مسرور، عصمت چغتائی، خواجہ احمد عباس، مستنصر حسین تاڑر، کشور ناہید، کشور کی دلیری اور جی داری کو ہمیشہ آئیڈلائز کیا۔ جیلانی بانو، واجدہ تبسم ،الطاف فاطمہ۔ ناموں کی بڑی لمبی لام ڈور ہے جن کی کتابیں خریدیں، پڑھیں اور

اپنی لائبریری میں انہیں سجایا۔

''میرے بھی صنم خانے'' سے لے کر'' کارِ جہاں دراز ہے'' قرۃ العین کی سب کتابیں پڑھی ہی نہیں گھول کر پی بھی۔ کچھ ایسا ہی حال احمد ندیم قاسمی اور بانو قدسیہ کے ناولوں اور افسانوں کے ساتھ ہوا۔

''آگ کا دریا'' تین بار پڑھی۔ پہلی بار سر پر سے گزر گئی۔ دوسری بار تھوڑی سمجھ آئی اور پینتیس سال کی عمر میں تیسری بار پڑھنے پر میں نے اُسے سمجھا اور جانا کہ وہ کتنا بڑا ناول ہے اور کتنے بڑے کینوس پر پھیلا ہوا ہے۔ کچھ ایسا ہی حال ڈاکٹر انور سجاد کی ''جنم جلی'' کے ساتھ ہوا تھا۔ ''دستک نہ دو'' نے بہت ہانٹ کیا۔ مستنصر ہمیشہ بڑا پسندیدہ رہا۔ سفرناموں سے بھی اور اپنے ناولوں سے بھی۔

میری ذہنی بلوغت اور مطالعے کا تیسرا دور اس وقت شروع ہوا جب میری بیٹی نے کینئرڈ کالج میں داخلہ لیا اور اس نے لازمی مضمون کے طور پر انگلش لٹریچر کا انتخاب کیا۔ میری عمر کے اردو میڈیم اور ٹاٹ سکولوں کے طالب علموں کو انگریزی سے رغبت بس رٹو طوطے کی طرح امتحان کے پاس کرنے کی حد تک ہی تھی۔ رہی آشنائی تو اس کا عالم کچھ یہ تھا کہ ترجمہ شدہ کہانیوں میں کرداروں کے ناموں کی نامونسیت بھی طبیعت پر گراں گزرتی تھی۔ وہ لُطف نہیں آتا تھا جو بلونت سنگھ کی کہانیوں اور ناولوں کو پڑھ کر ملتا تھا۔ ''رات، چور اور چاندنی'' کو کوئی تین بار تو ضرور پڑھا تھا اور لطف اٹھایا تھا۔ کالج میں سال دوم میں شارلٹ برونٹے کی جین آئیر Jane Eyre اور ایملی برونٹے کی Wuthering Heights لائبریری سے اشو ضرور کروائی تھیں۔ پڑھیں بھی مگر وہ رضیہ بٹ کا سا لُطف و سرور کہاں کہ اگر ہیرو کچھ دیر کے لیے منظر سے غائب ہوا تو اچھل پیڑ سے لگ جائیں۔ ورقے پلٹے جائیں کہ کہاں دفع ہو گیا ہے یہ شہزادہ۔ رومانوی منظروں میں ہیروئنوں کے دلوں کی دھڑکنیں تو کیا تیز ہوتی ہوں گی جو ہم پڑھنے والوں کا حشر ہوتا تھا۔

تاہم اُس زمانے میں بھی جب ذہنی بلوغت ابھی کچے پکے مرحلے میں مجھے جین آئیر و درنگ ہائیٹس اور جین آسٹن کی Pride and Presudice پڑھ کر یہ ضرور احساس ہوا تھا کہ اِن ناولوں میں آخر ہے کیا۔ اٹھارہویں اور انیسویں صدی کے برطانوی معاشرے کی معاشرتی، ثقافتی اور تہذیبی زندگی کی جھلکیاں اور شمار ہوتا ہے ان کا کلاسیک میں۔ انگریزی ادب اِن کے بغیر مکمل ہی نہیں۔ جب کہ ہمارے اردو ادب میں اسی نوع کی عکاسی اے آر خاتون کے ناولوں میں بیسویں صدی کے ہندوستانی مسلم معاشرے دلّی اور لکھنو کی معاشرتی اور تہذیبی زندگی کی عکاس ہے مگر ان کا کہیں کوئی مقام یا جگہ نہیں۔ پاپولر فکشن کہہ کر گویا ردّی کی ٹوکری میں پھینکنے والی

بات کا سا سلوک ہے۔

مگر جب مطالعہ کرتی گئی اور دوبارہ بیٹی کے ساتھ اِن تینوں بہنوں کے سب ناولوں کو پڑھا تو احساس ہوا کہ اردو ادب کی برونٹے سسٹرز بلاشبہ ہماری خدیجہ مستور اور ہاجرہ مسرور ہیں۔اُن دونوں بہنوں کو اُردو ادب کی برونٹے سسٹرز بھی کہا جا سکتا ہے۔

تاہم میری ناقص رائے کے مطابق دونوں برونٹے سسٹرز سے کہیں زیادہ خوبصورت لکھنے والیاں ہیں۔بیسویں صدی کی دوسری، تیسری دہائی سے برصغیر جن سیاسی تبدیلیوں اور تہذیبی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو رہا تھا اور نت نئے مسائل کے ساتھ ساتھ جو معاشی اور معاشرتی مسائل اور روّیے سامنے آرہے تھے اُن کی جتنی بھرپور اور خوبصورت عکاسی اِن دونوں بہنوں یعنی خدیجہ مستور اور ہاجرہ مسرور نے کی اُس کا یقیناً جواب نہیں۔

زمانہ طالب علمی کی پڑھی ہوئی Oliver Twist کو پھر پڑھا۔روبنسن کروسو Robinson Crusoe نے لُطف دیا۔جوناتھن Jonathan Swift کی گلیورز ٹریولز Gulliver's Travels۔او ہنری کی کہانیاں۔ارنسٹ ہیمونگولے، دوستوفسکی، ٹالسٹائی، گورکی۔سب کے انگریزی ترجمے پڑھے چارلس ڈکنس کی Great Expections مزہ آیا اُسے پڑھ کر۔

جین آسٹن کے سب ناول پڑھے Sense and sensibility ایما اور Northanger Abbey۔تھامس ہارڈی کے ناول Tess نے بہت متاثر کیا۔ انگلینڈ کی دیہی زندگی کی سماجی اور اقتصادی مسائل جو اس زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں انہیں جس انداز میں ہارڈی نے پیش کیا وہ متاثر کن تھا۔ٹیس نے وکٹورین جنسی روایات اور اخلاقیات پر جس انداز میں لکھا یہ صورت بھی بڑی چیلنج والی تھی۔وکٹورین روایات لڑکیوں کی جنسی اخلاقیات میں سخت اقدار کی حامل تھیں اس کا بہت گہرا ادراک مجھے اپنی عراق کی سیاحت کے دوران جرٹروڈ بیل کے مطالعہ سے ہوا جو پہلی جنگ عظیم کا ایک بڑا کردار تھی۔مشرق وسطیٰ کی ساری سیاست اس کے گرد گھومتی تھی۔وہ کنگ میکر تھی۔Shapes of the nations اور فی میل لارنس آف عریبیا کا خطاب اُسے اتحادی فوجوں نے دیا تھا۔The woman who made Iraq جیسا ٹائیٹل اُسے عراقی عوام کا عطا کردہ تھا۔وہ بیسویں صدی کی عظیم لکھاری، دلیر سیاح اور عظیم منتظم عورت تھی اس کی زندگی کی کہانی نے مجھے وکٹورین روایات سے بھرپور انداز میں روشناس کروایا تھا۔

میرے خیال میں مجھے یہ کہنے دیجئیے کہ میرے غیر ملکی اسفار نے مجھے دنیا کے عظیم

ادیبوں اور شاعروں سے روشناس کروانے میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔

پہلا سفر نوعمری کا تھا۔ یہ 1969 میں ڈھاکہ یونیورسٹی کے لیے تھا۔ درحقیقت وہاں جانے کا واحد مقصد مشرقی پاکستان کو جاننے کی ایک تڑپ اور لگن تھی۔ اُن کے دکھ، اضطراب اور کرب کے پس منظر سے آگاہ ہونے کا ایک جنون تھا جسے قلم کے ذریعے مغربی پاکستان کے لوگوں تک پہنچانے کی شدت سے خواہش مند تھی۔ بنگال کا جادو بنگال کا اسرار سب گھسیٹ کر وہاں لے گئے۔

یہاں میں رابندر ناتھ ٹیگور سے تفصیلی آشنا ہوئی۔ میں رابندر کے نام سے آشنا ضرور تھی۔ ایک دو کہانیاں بھی ترجمہ شدہ پڑھ بیٹھی تھی مگر اس سے زیادہ کچھ خاص جانتی وانتی نہ تھی۔ پہلی رات ہی جو تعارف ہوا وہ دلچسپ تھا۔ رقیہ ہال کے آڈیٹوریم میں چترانگدا ڈرامہ سٹیج ہو رہا تھا۔ جیسور کی اردو سپیکنگ فاخرہ جو چند ہی گھنٹوں میں میری دوست بن گئی تھی نے سارا ڈرامہ سمجھا دیا ،سنا دیا۔ سچ تو یہ ہے کہ رابندر ناتھ ٹیگور کو میں نے روح افزاء کے ٹھنڈے میٹھے گھونٹوں کی طرح دھیرے دھیرے پیا۔ کہیں ڈراموں کی صورت کہ بلبل اکیڈمی ڈرامے سٹیج کرنے میں بڑی تگڑی تھی۔ فاخرہ ڈراموں کی بھوکی۔ جہاں کہیں گیتوں کا مقابلہ ہوتا فاخرہ کی حاضری یقینی اور ساتھ ہی میری بھی۔ بلبل اکیڈیمی کی ڈرائیکٹر ڈاکٹر لطف انساء نے ٹیگور پر ہی ڈاکٹریٹ کی تھی اور وہاں ڈرائیکٹر تھی اور ٹیگور پر باتیں کرتی اور نت نئی کتابیں پڑھواتی نہ تھکتی تھی۔

عظیم اور لافانی شخصیت جن کی شاعری، مصوری، افسانہ، ناول، ڈرامہ، موسیقی، مقالہ نویسی غرض کہ کون سی صنف ایسی تھی جس کے وہ شہسوار نہ تھے۔ قلم اُن کا وہ ساتھی تھا جو کبھی اُن سے جدا نہ ہوا اور زندگی کا وہ کون سا ایسا گوشہ تھا جس پر انہوں نے نہ لکھا۔ ادب، فلسفہ، تاریخ، تصوف، مذہب، سیاست، اخلاقیات، سماجیات جسے پکڑا اُس کے اندر یوں اُترے کہ وہ تحریر جاوداں ہوگئی۔ جو لفظ چنا اُسے معتبر کر دیا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ اچھی شاعری کی بنیاد شدید قسم کی جذبایت اور تیز حسیات کی مرہون منت ہوتی ہے۔ تخیل کی رنگینی اور زبان کی سادگی جس شاعر کے ہاں ملے گی وہی حقیقی اور سچا شاعر کہلائے گا۔ ہم دیکھتے ہیں ٹیگور کے ہاں خیالات کی جدّت ہے۔ تیز رفتار تخیل کی جولانیاں ہیں۔ رنگینی ہے، جذبات کی شدت اور احساسات کا تیز بہاؤ ہے۔ خیالات میں گہرائی اور گنگناتی ہوئی سادہ زبان۔ اُس کے انہی اوصاف نے اُسے ایک عظیم شاعر بنا دیا۔

یہ حقیقت ہے کہ جب اُن کی شہرہ آفاق تصنیف گیتا نجلی کا انگریزی ترجمہ یورپ میں پڑھا گیا تو ایک تہلکہ مچ گیا۔ دنیا نے اُسے کِس کِس انداز میں تعظیم دی۔ کِسی نے کہا۔ ٹیگور شاعر

کائنات ہے۔ کسی نے کہا وہ بیسیوی صدی کے عظیم ترین شعرا کی قطار میں سب سے آگے ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ اس کی شاعری نے نئی نئی جہتوں کو نئے نئے انداز میں دریافت کیا اور وہ نئے نئے راستوں پر چلی۔ شاعری کی مروجہ پرانی ریت وروایتیں اور تنگ راستے سبھوں سے اُس نے اپنا تعلق واسطہ نہ رکھا۔

الیگزینڈر سرگیووچ پشکن (Alexander Sergeyvich Pushkin) کی طرح جس نے روسی زبان کو اپنی بے مثال شاعری سے مالا مال کیا اور یورپی زبانوں کے مقابل لا کھڑا کیا۔ ٹیگور نے بنگلہ زبان کو وہی درجہ دیا کہ وہ ٹیگور کی شاعری کی بدولت ارتقا کی بلندیوں کو چھونے لگی۔

روم میٹ بنگالی فینی ادب میں ایم اے کر رہی تھی۔ اور فاخرہ انگریزی ادب میں ایک ایم اے کے بعد اب دوسرا بنگالی میں کر رہی تھی۔ ایک کی تھیسس کا موضوع رابندر ناتھ ٹیگور اور دوسری کا نذرا سلام تھا۔ دن رات کی اس صحبت کا نتیجہ صرف چند ماہ میں ہی میرے سامنے آ گیا کہ میں رابندر وشنگیت اور نذرل کی شاعری کا فرق سمجھنے لگ گئی تھی۔ فاخرہ جو کتابیں انگریزی میں ایشو کروا کے لاتی پہلے وہ خود پڑھتی بعد میں مجھے دیتی۔ ہم لوگ چلتے پھرتے ان کتابوں پر تبصرہ کرتے۔

ٹیگور کو پڑھا۔ نذرل اسلام کو پڑھا، جسیم الدین کے بارے جانا۔ بنگالی زبان کی امیرانہ عظمت کو بس تھوڑا سا رائی کے دانے کے برابر جانا۔

اندرون ملک اسفار کا سلسلہ 1986 سے شروع ہوا۔ جن میں پاکستان کے دشوار گزار شمال کے علاقے تھے۔ صدیوں کی پرانی تہذیبوں میں گندھے ہوئے۔ اُن کی شاعری خصوصاً عورتوں کی شاعری نے دل موہ لیا۔ فوک وزڈم لفظ لفظ سے جھانکتی تھی۔ معروف اور غیر معروف ناموں کی لمبی فہرست ہے۔

دوسرا مرحلہ غیر ملکی سفروں کا شروع ہوا۔

نجیب محفوظ کی Adrift on the Nile میں نے قاہرہ کی رعمیس سٹریٹ سے خریدی تھی۔ کتاب کا عربی نام ثرثرہ فوق النیل تھا جسے فرانسیس لیارڈٹ Frances Liardet نے ترجمہ کیا تھا۔

شام کے عظیم انقلابی شاعر نزار قبانی سے بھی میرا پہلا تعارف یہیں ہوا تھا کہ دوکان کا مالک شاعر کا مجموعہ کلام قالت لی السمر ا کی جلدیں اپنی ذاتی نگرانی میں اتروا رہا تھا۔ اس کے لہجے میں شاعر کے لیے جس محبت اور عقیدت کا دریا ٹھاٹھیں مار رہا تھا اُس نے مجھے متاثر کیا تھا اور

میں نے جانا تھا کہ اِس کا ترجمہ انگریزی میں ہو چکا ہے۔اُن کے پاس نہیں تھا۔انہوں نے کہا۔اسکندریہ اگر جائیں گی تو وہاں سے مل جائیگا۔مگر The Brunette told me اسکندریہ، کیا اسوان اور کیا قاہرہ سے ڈھنڈونے کی سرگرم کوشش کے باوجود نہیں ملا۔ہاں جب دمشق گئی تو وہاں سے ملی۔یہ رومان، جنس اور معاشرے کی گھٹن زدہ حالت کا عورت کو احساس دلاتی انقلابی قسم کی شاعری تھی۔صرف اِس کی ایک چھوٹی سی مثال دیتی ہوں۔

بہت گہری محبت مت کر
جب تک کہ تمہیں یقین نہ ہو جائے
کہ دوسرا بھی تمہیں اسی گہرائی سے پیار کرتا ہے
آج تمہاری محبت کی گہرائی
کل تمہارے زخم کا باعث بنے گی

ایک اور نظم پڑھیئے تب کے مرد غالب معاشرے کے غصے اور اشتعال کا اندازہ لگائیے۔

تمہیں بدلنے کی میرے پاس طاقت اور اختیار نہیں
نہ ہی تمہارے طور طریقوں کے لئے وضاحت کی
کبھی مت سوچو کہ مرد عورت کو بدل سکتا ہے
جو ایسا کہتے ہیں وہ دغاباز ہیں
جو سوچتے ہیں
کہ انہوں نے عورت تخلیق کی
اپنی پسلیوں میں ایک سے
عورت مرد کی پسلی سے نہیں نکلی
کبھی نہیں

یہ وہ ہے جو اس کے رحم سے نکلا ہے
اُس مچھلی کی طرح جو پانیوں کی گہرائیوں سے اُٹھتی ہے
یہ وہ ہے جو اس کی آنکھوں کی روشنی کے دائروں میں
خود کو وہاں رکھنے کے خواب دیکھتا ہے

نزار قبانی کو میں نے بہت تفصیلاً پڑھا۔محبت اور چاہت سے پڑھا۔ڈھونڈ ڈھونڈ کر پڑھا۔عرب حکمرانوں، امریکہ اور اسرائیل پر لعن طعن اور تبرّوں کی للکار اور گونج کی تُندی نے اُسے

پورے مشرقِ وسطیٰ کا ہیرو بنا دیا تھا۔ وہ لوگوں کی زبانوں پر تھا، ان کے دلوں میں تھا، ان کی چاہتوں میں تھا۔

عراقی قوم پڑھنے کی شوقین کتاب سے محبت کرنے والی، روشن خیال اپنے ثقافتی اور تہذیبی ورثے پر ناز کرنے والی۔ ماضی کے متنازعہ شاعر ابونواس ہو یا المتنابی۔ بغداد کے کوچہ بازاروں میں عظمتوں کا تاج پہنے کھڑے ہیں۔ بلا سے کوئی مرتد تھا یا پیغمبری کا دعوے دار۔

1950 کا زمانہ ادب اور آرٹ کے لحاظ سے ایک طرح کا نشاۃ ثانیہ کا زمانہ۔ نثر اور نظم دونوں میں نئے رجحان سامنے آئے۔ آزاد نظم نے زور پکڑا۔

بغداد کی ال شابندر کافی شاپ ہمارے حلقہ اربابِ ذوق ٹی ہاؤس ہی کی طرح کا ایک ادارہ ہے۔ برس ہا برس سے ادیبوں کی تربیت کرتا ہوا۔ یہاں میری ملاقات ادیبوں سے ہوئی۔

المتنابی بازار سے مجھے انگریزی کتابیں تو نہ مل سکیں۔ مگر عبدالمالک نوری کے بارے میں کافی کچھ جانا۔ اور اس کے ناول نشاد الارض Nashid-al-Ard (دھرتی کا گیت) کچھ المتنابی بازار کے کتب خانے الفردوس کے تہہ خانے میں جہاں کوئی نو دس ادیبوں سے میری ملاقات ہوئی۔ کچھ ال شابندر کافی شاپ میں بیٹھنے والے ادیبوں نے تعریفوں کے پل باندھے۔ سچی بات ہے کتاب کو ڈھونڈنے کی پوری کوشش کی اور یہ مجھے مل بھی گئی۔

یہ سوسائٹی کے پسے ہوئے طبقات کی عکاس، نمائندہ کتاب تھی۔ قانون اراضی ایکٹ میں جس طرح عراقی معاشرے کی لوئیر، مڈل کلاس کو زرعی غلام بنا کر رکھ دیا تھا۔ اعلیٰ تعلیم اور مراعات بالائی اور متوسط طبقے کے لیے مخصوص ہو گئی تھیں۔ اس سے جو بے چینی، گھٹن اور اضطراب پیدا ہوا اُسے نوری نے جس طرح پورٹریٹ کیا وہ کمال کا تھا۔

Exile from Exile جسے نینسی ای برگ نے لکھا۔ اس کی بھی بڑی تعریف سُنی تھی اور یہ بھی مجھے وہاں سے مل گئی تھی۔ یہ ان یہودیوں کے دکھوں اور المیوں سے بھری ہوئی کتاب ہے جو اسرائیل کی ریاست بننے سے یورپی یہودیوں کی نفرت کا نشانہ بنے۔ یہ لوگ جو دربدر ہوئے۔ اسرائیلی ریاست میں جا کر اُن پر عرب ذہنیت اور عرب تہذیب میں گندھے ہونے کے باعث اشکیازیوں نے (یورپی یہودی) جس طرح اُن پر نفرتوں و تعصب کے وار پر وار کیے وہ قابل نفرت تھے۔ صدیوں کے عرب مانوس کلچر میں رہنے والے یہ لوگ جو درحقیقت اسرائیلی ریاست کے حامی ہی نہ تھے کیوں کہ جانتے تھے کہ انھیں اس کرب سے گزرنا پڑے گا وہ اپنے ہی ہم مذہبوں کے ہاتھوں مظلوم ہو کر رہ گئے تھے۔

ایڈورڈ سعید Edward W.Said کی آؤٹ آف پلیس Out of

Place کا بھی پڑھنے سے تعلق ہے۔اسے میں نے دمشق سے مونا عمیدی کی کتابوں کے ساتھ خریدا تھا۔اسے ایڈورڈ سعید کی آپ بیتی کہہ لیں ۔یہ جلاوطنی کے دکھ اور بستے رستے گھروں سے نکالے جانے والے کرب سے بھری کتاب ہے۔جلاوطنی کا دکھ اور کرب جب آپ اپنی ہی سرزمین پر اجنبی بنتے ہیں جس سے آپ کا ناطہ صدیوں پر محیط ہوتا ہے۔جس کی سرزمین میں آپ کے آباؤ اجداد کی ہڈیاں دفن ہوتی ہیں۔سچ تو یہ ہے کہ اس کتاب نے مجھے جس طرح رلایا میں اسے شاید لفظو ں میں بیان ہی نہ کرسکوں۔

روس کے سفر کا شکریہ کہ اِس سفر نے مجھے روس کے شہروں ،شخصیات اور تاریخ سے ہی نہیں روشناس کروایا بلکہ میں عظیم روسی ادب سے مزید آشنا ہوئی۔ وار اینڈ پیس خریدی اور پڑھی۔اینا کرینینا پڑھی۔ بہت بڑا ناول اینا کرینینا۔جسے خود ٹالسٹائی نے اپنا سچا اور کھرا ناول کہا۔

صوفیہ ٹالسٹائی کی یادداشتوں کو پڑھا اور ٹالسٹائی کی تحریروں کو اس کے آئینے میں دیکھا۔ سچی بات ہے ٹالسٹائی سے محبت وعقیدت میں کمی آ گئی تھی۔اتنے بڑے لکھنے والے کے کردار کا یہ پہلو کتنا افسوس ناک تھا۔لینن اس کا بہت بڑا مدّاح تھا۔اس کی تحریروں کا دیوانہ۔کرپسکایا کے ہاتھ پکڑ کر انہیں جُھلاتا اور کہا کرتا۔

''کرپسکایا تم یوروپ میں اس کا مقابلہ کِس سے کروگی۔''اور پھر خود ہی سرمستی میں جھوم جھوم کر کہتا۔

''ارے کِسی سے بھی نہیں۔اُس جیسا تو ایک بھی نہیں۔''

سچی بات تو یہ ہے کہ اینا کرینینا کی بات ہی اور ہے۔یہ اُسکا دوسرا ناول تھا۔اینا کرینینا کے کچھ حصّے میں روس کی ترکی کے ساتھ جنگ کا بھی ذکر ہوا۔تاہم یہ سچائی کی حقیقت نگاری اور جذبوں کی انتہاؤں کو چھوتا ایسا دلکش ناول جس نے اپنے وقت اور عہد کے بہترین لکھاریوں سے خود کو منوایا۔نقادوں کی رائے ہے۔

This is less a work of art than a piece of life, but
what it loses in art it gains in reality.

اُس کے سارے کردار تو جیسے چھم چھم کرتے میری آنکھوں کے سامنے آ گئے تھے۔اینا کرینینا کے چہرے پر پھیلی متانت اور خوبصورتی کی گھمبیرتا اس کے احساسات کی داخلی کشمکش ،روح کی افسردگی ،ورونسکی کے اندر بھرا ہوا جوش و جذبہ،جوانی کا حُسن اور جنون ایک شادی شدہ عورت سے انتہا درجے کا عشق، دلیر مگر اندر سے خوف زدہ بھی۔ورونسکی کے کردار کے اِن پہلوؤں کی عکاسی کس درجہ خوبصورت تھی۔

لیوین Levin بھی انتہا درجے کا متاثر کن کردار ہے جو اُنیسویں صدی کی آخری نصف صدی کے روسی معاشرے پر اثر انداز ہوتے مختلف رجحانات جن میں تعلیم، خواتین کے حقوق ، سیاسی نظریات، کسانوں کا معاشرے میں کردار جیسے موضوعات پر بے باکانہ اظہار لیوین کی شخصیت کو دل کش بناتے تھے۔

دراصل جب لکھنے والا اپنے زمانے کی معاشرتی خرابیوں کو موضوع بناتا ہے تو جاذبیت بڑھ جاتی ہے۔اس ناول نے روسی معاشرے میں پھیلے ہوئے منافقانہ رویوں ، ایک دوسرے کی ٹانگیں کھینچنے کی عادتوں، حسد، بغض سے بھرے جذبوں کی بڑی کھل کر عکاسی کی تھی۔

خاندانوں میں شادی بیاہ کے مسائل بھی اس وقت کا ایک اہم مسئلہ تھا۔ ناول میں یہ پہلو بھی مختلف انداز میں زیر بحث آیا۔سوسائٹی میں نفسانی خواہشات کے بے ڈھنگے اور بے ڈھبے اظہار، اخلاقی اقدار کی کمی، شہری زندگی کے طرز معاشرت میں دیہی زندگی اور زرعی مسائل کا دخول سب ایسے موضوع تھے کہ جو اُس وقت کی سوسائٹی میں رچے بسے ہوئے تھے۔جن کی خامیوں اور کہیں خوبیوں سے معاشرے کا تانا بانا بنا ہوا تھا۔

مزے کی بات یہاں ٹالسٹائی کا منفرد اسلوب سامنے آتا ہے کہ ان پر لکھتے ہوئے ٹالسٹائی ان کی اخلاقی نقطہ نظر یا بطور نشان دہی کے کِسی وضاحت کے چکر میں ہرگز نہیں پڑا بلکہ وہ اپنے موضوع اور خیالات کو روسی زندگی کے وسیع پینو راما میں پھیلاتے ہوئے چلا جاتا ہے اور وہ جو پیغام دینا چاہتا ہے وہ بھی عیاں ہو جاتا ہے۔ کہہ لیجئیے کہ لیوین کے کردار میں خود ٹالسٹائی ہے۔اس کی فکر، اس کے خیالات، اس کی جدوجہد، اسکے تجربات سبھی کا کھل کر اظہار سامنے آتا ہے۔

''دراصل تو سارا کمال ہی مصنف کا ہے۔سچ تو یہی ہے کہ اُس کی ناول نگاری نے روسی سوسائٹی کی سبھی پرتوں کو جن میں وہ خود بھی رہ رہا تھا تہہ در تہہ کھول کر اپنے قارئین کے سامنے پیش کیا ہے۔

مگر جب آپ صوفیہ کو پڑھتے ہیں تو وہی منظر سامنے آتے ہیں۔جب چونتیس (34) سالہ کونسٹیٹن Constantion اپنی اُنیس سالہ منگیتر کیٹی کو ڈائریاں دیتے ہوئے کہتا ہے۔

''انہیں پڑھ لینا میرے ماضی سے واقف ہو جاؤ گی۔''

ہے نا المیے کی بات۔

اب کوساکز The Cossacks کو ہی دیکھیں۔یہ ناول بھی بنیادی طور پر ٹالسٹائی کے تجربات پر ہی مبنی ہے۔جب وہ کاکیشیا کے علاقوں میں رہا تھا۔

کہانی دیکھیں ذرا۔اس کے ایک مرکزی کردار دمیتری آلینن Olenin جو روسی فوج کا کیڈٹ ہے۔جس پراُس علاقے کا فطری حُسن ، انسانی نفسیات اور رویوں کی پیچیدگیاں ،سچائی ،انسان کے اندر نیکی کا حُسن اور کوساک معاشرہ اپنے تمام تر حُسن اور کجیوں کے ساتھ آشکارہ ہوا تھا۔کوساک لڑکی کی مارینا کی سادگی ، اُس کا کا کیشیائی حُسن ، پہناوے اور لوکا Luka مارینا کے منگیتر کی دلیری ، شجاعت ، کینہ ،نفرت جیسے جذبات کے ساتھ ناول ایک خوبصورت ادب پارہ بن گیا ہے۔

پُشکن کو بھی بہت تفصیل سے پڑھا۔اس نے بہت متاثر کیا۔اُس کی طویل نظمیں رُوس کے جنوب کی ان ریاستوں کے کلچر ،ان کی ثقافت اور تاریخ بابت تھیں جن پر کبھی تاتاریوں کے جھنڈے لہراتے تے۔

The Fountain of Bakhchisarai

The Caucasian Captive

The Gypsies

اس کی طویل نظمیں ،شاہکار نظمیں۔

اس کی ایک طویل بیانیہ نظم رُسلان اور لُدمیلا روسی معاشرے کی ایک فوک عشقیہ داستان ،تین ہزار مصرعوں کی اس نظم نے روسی شاعری کو نئے رنگ و آہنگ سے سجا کر دنیا کی ترقی یافتہ شاعری کے مقابلے پر لا کھڑا کیا تھا۔روسی اس پر بے حد نازاں ہیں۔

دوستو وسکی کا ایک ناول اُردو ترجمہ کی صورت پڑھا تھا۔ Crime and Punishment مگر یہ کس پس منظر میں لکھا گیا تھا۔اس کے بارے تفصیل مجھے اُن کتابوں سے ملی جو میں نے پیٹرز برگ سے خریدیں۔

اومسک Omsk جیل میں چار سالہ مشقت بھری قید نے اسے اتنی تکلیف نہیں دی جتنی قلم کاغذ اس کے ہاتھ سے چھننے پر ہوئی۔اسے اسی کا ڈر تھا اور یہی اُس نے کہا۔

’’اگر مجھے لکھنے نہ دیا گیا تو میں مر جاؤں گا۔کاغذ اور قلم کے ساتھ میں پندرہ برس کی سزا کو بھی بخوشی کاٹنے کے لئے تیار ہوں۔‘‘

بیرکوں میں یہ چار سال چوروں ، ڈاکوؤں اور قاتلوں کے ساتھ اُس نے گزارے۔ان کرداروں میں جو گہرائی ،توانائی اور خُوبصورتی اس نے دیکھی وہ کہنے پر مجبور ہوا۔

’’یہ تو بدصورت سیپیوں میں بند وہ سونا ہے جن کی دریافت میں نہ مجھے اپنے برسوں کے ضائع ہونے اور نہ کاغذ قلم نہ ہونے کا دُکھ ہے۔میں نے ان حیرت انگیز لوگوں کو باریک بینی اور

سچائی سے پڑھنے اوران کے کرداروں کی بے شمار جہتوں کو پرکھنے کی جو کوشش کی ہے وہ میرے لئے بہت بڑا اثاثہ ہے۔ میں نے رُوس کو نہیں پر رُوسی لوگوں کو ضرور جانا اور سمجھا ہے۔'' Crime and Punishment اس کے بعد لکھی گئی۔

برادرز کراموزوو Brothers Karamazov اور The Gambler دونوں کتابیں میں نے پیٹرز برگ سے خریدیں۔

تاہم بورس پاسترنک کو پڑھنا میرے لیے کس قدر خوبصورت تجربہ تھا۔

ڈاکٹر ژواگو اور بورس پاسترنک کا نام بچپن کی یادوں میں کہیں محفوظ تھا۔ گھر کے مرد نظریاتی طور پر سبز اور سرخ یا دائیں بائیں میں منقسم تھے۔ 1958 کے دن جب گھر کے کشادہ آنگن میں ڈاکٹر ژواگو پر نوبل ایوارڈ دینے پر بحث مباحثے نے قدرے لڑائی کی صورت اختیار کرلی تھی۔ آٹھویں میں پڑھنے والی لڑکی سوویت کو نیچا دکھانے کی سازش ہے یا یورپی طاقتیں روس کے انقلاب سے خائف ہیں جیسی باتوں کو کیا سمجھتی۔ ہاں کالج پہنچ کر ڈاکٹر ژواگو لائبریری سے لی مگر وہی انگریزی کا مرنا۔

پھر سالوں بعد اِسے پڑھا تھا اور لُطف اٹھایا تھا ویسا ہی لُطف جیسا ''گورکی کی ماں'' جسے پڑھ کر آپ دنوں اس کے خمار میں رہتے ہیں۔

اس کی Themes and Varitions اور Second Birth مجھے ماسکو میں ایک کھوکھے سے صرف سات روبل میں ملی تھیں۔

کولمبو میں ہمارا قیام YWCA میں تھا۔ یہ ایک طرح سیاح عورتوں، ورکنگ وومن اور طالبات کا ہوسٹل تھا۔ ان لڑکیوں نے سنہالی اور تامل ادب اور کلچر پر جس طرح باتیں کیں۔ میرے تو چودہ طبق روشن ہوگئے۔ میں اپنے ملک کی اس عمر کی لڑکیوں سے ادب پر اتنی سنجیدہ گفتگو کی توقع ہی نہیں کرسکتی تھی۔ اکثر کالجوں اور یونیورسٹیوں کی ایم فل کرنے والی لڑکیوں سے بات چیت ہوتی ہے تو سر پیٹ لینے کو جی چاہتا ہے۔

میں نے ایک دن پہلے کی خریدی گئی کتابوں کا ذکر کیا۔ اشوک فیری کا ناول The good little ceylonese girl، امینہ حسین کا The moon in the water ماریہ تو نام سنتے ہی اچھل پڑی۔

''ارے بہت شاندار ناول ہے۔ لنکن مسلم کیمونٹی کی سماجی، تہذیبی اور ثقافتی زندگی کا نمائندہ۔ امینہ نے کمال خوبصورتی سے کچھ خرابیوں اور مسلم وراثتی قانون بارے لکھا ہے جو اُس نے محسوس کیا۔ میں نے پڑھا ہے اِسے۔''

رومیش کے The Prisoner of Paradise اور اے وی سوراویرا کا Tread Softy کے متعلق بتایا۔ دونوں ناول کسی نے نہیں پڑھے تھے۔

ابھی تو بہت سارے لوگ باقی ہیں۔ اب ایسے میں مجھ جیسی پر تو وہ ہی مثال صادق آتی ہے نا کہ کیا پدّی اور کیا پدّی کا شوربہ۔ کیا میں اور کیا میری لکھنے کی اوقات اور کاوش۔ پر کروں کیا؟ چھوٹا سا قلم اُس نے ہاتھ میں پکڑا دیا ہے اور ساتھ تھوڑے سے سفر بھی مقدر کر دیئے۔ جب اُن اجنبی زمینوں پر گئی تو جانی کہ کیسے کیسے لعل و گوہران دھرتیوں نے ماضی قریب کے زمانوں میں پیدا کئے۔ انہیں پروان چڑھایا۔ دنیا کو اُن کی خوشبو سے مہکایا اور پھر کہیں اپنے اندر جذب کیا یا پھر کِسی دوسری مٹی کو یہ اعزاز بخش دیا کہ وہ انہیں سنبھالیں۔

اب یہ جن اور دیو سامنے ہیں۔ سچی بات ہے پنجابی زبان کی وہ کہاوت یاد آ رہی ہے۔ پلّے نہ سیر آٹا تے گاوندی داسنگھ پاٹا۔ تاہم اتنا سا کہنا ہے کہ میں نے اِن قد آور شخصیات کی بس ایک ہلکی سی جھلک ہی آپ کے سامنے پیش کی ہے۔ اُن کے فن کے دریاؤں میں سے بس کنارے پر کھڑے کھڑے چلّو بھر پانی سے ہی خود کو گیلا کیا ہے۔ پرچے کے لیے تو اور بھی مسئلہ ہے کہ آخر کتنے صفحے لے سکتی ہوں۔

یورپ کے شاعر اور مصنف جن کے گھروں میں جو بھی میوزیم بن گئے ہیں گئی ان کے ساتھ وقت گزارا۔ ان کی کتابیں خریدیں انہیں پڑھا اور اب اپنی کتاب ''عالمی ادب کی فروزاں قندیلیں'' کا دوسرا والیوم تیار کر رہی ہوں۔ انشاءاللہ اس پر اگر قاسم نے کہا تو دوسرا حصّہ ضرور لکھوں گی۔ ہاں مگر ذرا ختم کرنے سے پہلے ایک دلچسپ واقعہ ضرور سُن لیجیئے۔ میں کبھی کِسی بھی ملک سے کوئی بیگ، کپڑا، جوتی کوئی آرائشی چیز نہیں خریدتی۔ حتیٰ کہ سیونیرز بھی نہیں شاید ایک آدھ کی مثال قسم توڑنے والی ہو۔ ہاں کتابیں دل کھول کر خریدتی ہوں۔ بس دھیان رکھتی ہوں کہ وزن نہ بڑھے اور وہ بڑھتا بھی نہیں کہ اٹیچی میں اور کچھ تو ہوتا نہیں تین چار جوڑوں کے سوا۔ بندرانائیکے ایئرپورٹ پر سامان چیکنگ کے مرحلے میں اِس سوال کی تو توقع ہی نہیں تھی جو ہوا۔

''آپ نے کوئی چیز نہیں خریدی۔ چائے نہیں، جم نہیں، گولڈ کی کوئی چیز نہیں۔ کوئی سوونئیر نہیں، کوئی لکڑی کا مجسمہ کندہ کاری سے سجا، بانس سے بنا کوئی تحفہ، کوئی ڈانسنگ ماسک، Brass ورک کی کوئی سوغات۔''

مجھے محسوس ہوا تھا جیسے وہ لڑکا صدمے کی سی کیفیت میں ہو۔ میں نے اس کے دُکھ کو سمجھا۔ اس کا اتنا خوبصورت ملک اتنی سوغاتوں والا۔ اور میرا چھوٹا سا اٹیچی کیس کسی فقیر فقرے کی کٹیا کی طرح خالی خالی، اجڑا اجڑا سا۔

میں نے انتہائی پھرتی سے اپنے چار جوڑے کپڑوں کے درمیان رکھی کتابوں میں سے پہلی کتاب اٹھائی۔اُسے دکھائی اور بولی۔

’’اسے دیکھو یہ تمہارے بہت بڑے لکھنے والے اشوک فیری Ferry کا خوبصورت ناول ہے۔ The good little Ceylonese girl۔میں نے دوسری کتاب اٹھائی ۔اس کے چہرے کے سامنے کی۔یہThe moon in the water تھی۔

لڑکے کو دو مزید کتابیں دکھاتی ہوں۔رمیش کی The Prisoner of Paradise،اوراے وی سوراویرا کیTread Softy۔‘‘

دوسری اور نچلی تہوں سے Insight Sri Lankaجیسی بھاری بھرکم Sri Lanka بھی ہاتھ میں پکڑ کرلہراتی ہوں۔

’’بولو۔کہو۔ابھی بھی شکایت ہے کہ میں نے کچھ نہیں خریدا۔میں تو اپنے ساتھ تمہارا سارا ملک لے کر جارہی ہوں۔لڑکا مسکرایا۔

میرے ہاتھوں کو تھاما اور بولا معاف کر دیجیئے گا۔‘‘

’’جیتے رہو۔تم اور تمہارا ملک آباد رہے۔شاد رہے۔امین‘‘

پیتل کا شہر

آصف فرّخی

جب چار سو باسٹھویں رات آئی تو میں نے دل ہی دل میں پوچھا، آج رات کون سی کہانی بیان کروں؟ کہانیاں تو بہت سی تھیں مگر جو کتاب ہاتھ آئی وہ ابن خلدون کی یہ ''ذہنی سوانح عمری'' تھی جو حال میں چھپی ہے اور اس کے لکھنے والے رابرٹ ارون ازمنۂ وسطیٰ کے عربی مطالعات میں بڑا معروف نام ہیں۔ خاص طور پر الف لیلہٰ اور پرانی داستانوں پر ان کا کام بڑا دل چسپ ہے۔ اس کی عالمانہ وقعت کیا ہے، یہ تو میں نہیں کہہ سکتا مگر پرانی باتوں میں جان ڈالنے کا فن انھیں خوب آتا ہے۔ چند ایک کتابیں انھوں نے آج کل کی روشِ عام کے مطابق صوفیانکے واقعات پر بھی لکھی ہیں مگر میں نے ان کا صرف اشتہار دیکھا ہے، کتاب دیکھنے کا موقع نہیں ملا۔

ابن خلدون پر یہ کتاب جو ملی تو میں نے بڑے شوق سے پڑھنا شروع کیا اور جتنی کہانیاں میری منتظر تھیں، ان سے سوا ہی پایا۔ اتنی ہی دل چسپ، قدم قدم پر حیرت اور تعجّب کا سامان کہ اچھا، یوں بھی ہوتا ہے زمانے میں۔ مَیں پڑھتا گیا اور نشان لگاتا گیا، کہیں خیال افروز اور کہیں حیرت انگیز۔ بعض فقرے ایسے کہ پچھلے مفروضوں اور ذہن میں مدّت سے بسے ہوئے خیالات کو دوبارہ سوچنے پر مجبور کر دیں اور بعض ایسے کہ بظاہر غیر مربوط اور منتشر باتیں ذہن میں منوّر نقطوں کی طرح چمک اٹھیں۔ دو، ڈھائی سو صفحوں کی کتاب کے پڑھنے میں کئی دن لگ گئے۔ پھر یوں محسوس ہونے لگا کہ آج کل کے الجھے ہوئے بہت سے معاملات جن کے بارے میں بساط بھر سوچنے سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں، ان کا سیاق و سباق نظروں میں آ گیا۔ اردگرد جو کچھ ہو رہا ہے اس کے مفاہیم، دبے ہوئے نقش میں سے ابھر کر صاف نظر آنے لگے بلکہ اپنے چاروں طرف روشنی بھی ڈالنے لگے۔ غرض اس کتاب نے کئی ناولوں والا کام پورا کیا۔

مگر قصّے کہانی سے گُریز کہاں؟ یہ کتاب تو شروع ہوتی ہے الف لیلہٰ کے حوالے سے۔ تاریخ کا عجب ماجرا ہے کہ مجھے الف لیلہٰ کے سراغ میں مشغول کر ڈالا۔ اس میں الف لیلہٰ کا حوالہ بھی آتا ہے، پرانی داستانوں کا بھی، تو ماس مان کے شان دار ناول بڈن بروکس کا بھی اور نجیب محفوظ کے وسیع و عریض حرافش کا بھی۔ اور تو اور، بروس چیٹ ون کے عجیب و غریب اور اصناف کو

توڑنے والے کام song lines کی پیش روی بھی ہے۔یعنی تمام شواہد معتبر ذرائع سے آئے ہیں اور حوالے مستند ہیں۔

لیکن الف لیلہٰ سے پہلے ابن خلدون۔کتاب کے مقدمے میں ___ یہ لازم ہے کہ ابن خلدون پر لکھی جانے والی ہر کتاب کا باضابطہ مقدمہ ہو ___ رابرٹ اروِن نے بیسویں صدی کے اہم مورخ آرنلڈ ٹوئن بی کا حوالہ دیا ہے جس میں وہ ابن خلدون کے مقدمے کو خراج تحسین پیش کرتا ہے کہ بلاشبہ اپنی وضع کا اہم ترین کارنامہ جو کسی بھی دور میں یا کسی بھی مقام پر تخلیق کیا گیا۔مختلف تجزیوں میں ابن خلدون کو میکاولی، ہوبز، مونتیسکو، وِچو، کارل مارکس، ویبر اور درخائم کے پیش رو کے طور پر دیکھا گیا ہے۔ بہت سوں کے نزدیک وہ تاریخ میں ایک واضح نقطۂ نظر اور اسباب و علل کی تلاش کا سب سے اہم نام ہے۔بعض لوگوں کے لیے وہ حکمت و فکر کا داعی ہے۔علم عمرانیات در حقیقت اس کی سعی و تلاش کا مرہون منّت ہے۔شہروں کی منصوبہ سازی اور معاشی معاملات کی منصوبہ سازی میں اس کا نام احترام کے ساتھ لیا جانا چاہیے۔علم معاشیات میں مارکس اور اینگلز سے پہلے ابن خلدون نے معیشت اور سیاسی استحکام کے گہرے رشتے کی طرف اشارہ کیا تھا۔بعض لوگوں نے بڑے فخر کے ساتھ امریکا کے (اس وقت کے) صدر رونلڈ ریگن کی اکتوبر ۱۸۹۱ء کی پریس کانفرنس کا حوالہ دیا ہے جس میں ''سپلائی سائڈ اکنامکس'' کے اپنے نظریے کی تائید کے طور پر ابن خلدون کا نام لیا۔(صدر ریگن کے توسط سے ابن خلدون کی تکریم فہمیدہ ریاض نے اپنی مختصر کتاب میں بھی کی ہے جو کم عمر پڑھنے والوں کے لیے خاص طور پر مفید ہے) مگر اروِن نے اس بات کو سرے سے مسترد کر دیا کہ ریگن کی تقریریں لکھنے والے اصحاب سے سمجھنے میں غلطی ہوئی اور ابن خلدون جدید معانی میں ماہر معاشیات نہیں ہے۔

خیر، ٹوئن بی اور مارکس اپنی جگہ، ابن خلدون اپنی جگہ اور ابن خلدون کی یہ جگہ مرکزی ہے۔کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ابن خلدون کی زندگی کا اس کے پورے سیاق و سباق میں اس طرح جائزہ مرتّب کیا ہے کہ وہ اپنی جگہ اہم معلوم ہوتا ہے اور پھر چودھویں صدی عیسوی کے مصر و اندلس میں موجود اور اسلامی فکر و فلسفے میں رونما تبدیلیوں کے مرکزی دھارے سے تشکیل پانے والی شخصیت کے طور پر دیکھا گیا ہے جس کے ذریعے سے ان کا تنقیدی جائزہ لیا جا سکتا ہے۔ رابرٹ اروِن ابن خلدون کی سوانح و افکار سے براہِ راست واقف ہے اور اس کی وجہ سے غیر معمولی بصیرت کا حامل ہو جاتا ہے لیکن وہ نہ تو کسی طرح کی جذباتی عقیدت کا شکار ہوتا ہے اور نہ ابن خلدون کی پیش روی کو مشرقی افکار کی برتی کے ثبوت کے طور پر سامنے لانے پر اصرار کرتا ہے، جو ہمارے ہاں فی زمانہ بعض اسلامی مفکرین و حکماء کے لیے ایک عام طریقہ بن گیا ہے جو عقیدت پر مبنی

ضرور ہے لیکن فکر و معنی تک رسائی نہیں دیتا۔ اروِن کے تجزیے سے بعض مقامات پر تھوڑے بہت اختلاف کے باوجود میں اس کے اندر تحریر کو بہت منفرد سمجھتا ہوں کہ اس کے ذریعے سے اس بنیادی اور کلیدی مفکرّ کے کام کو سمجھنے میں مدد ملے گی بلکہ اس مفکر کے وسیلے سے تاریخ کے تغیّر، معاشرے کی تعمیر و تخریب اور زندگی کے بیانیے میں سامنے آنے والے پیچ و خم کو جاننے اور برداشت کرنے میں مدد ملے گی۔ بہت کم کتابیں یہ فریضہ سرانجام دے سکتی ہیں۔

ابن خلدون کی اہمیت اس مختصر انگریزی کتاب سے بھی اجاگر ہوتی ہے جسے فہمیدہ ریاض نے قلم بند کیا ہے اور آکسفرڈ یونیورسٹی پریس نے کراچی سے شائع کیا ہے۔ کیا ہی اچھا ہو کہ یہ کتاب نوعمر پڑھنے والوں کو درس گاہوں میں بہم پہنچائی جائے جہاں تاریخ کے نام پر صنعتی فضلے کی قسم کا مال ان کے دماغوں میں انڈیلا جاتا ہے۔ لیکن ایسی مفید کوشش بارآور ہونے کے بجائے بُھلا دی جاتی ہیں۔ مجھے یاد آیا نادم سیتاپوری نے بھی اس قسم کی کتاب تیار کی تھی جو فیروز سنز سے شائع ہوئی۔ برسوں بعد پرانی کتابوں کے بازار میں اس سے ملاقات ہوئی تو ایسی کتابوں کے سلسلے یاد آئے۔

یوں تو اس کتاب میں کئی تفصیل طلب مقامات ہیں مگر میں خاص طور پر الف لیلیٰ کے اس حوالے کا ذکر کرنا چاہوں گا جس سے اس کا آغاز ہوا ہے۔ بڑی عجیب سی بات ہے کہ ایک عالمانہ کتاب جس کو پرنسٹن یونیورسٹی پریس جیسے سنجیدہ ادارے نے شائع کیا ہے، شروع ہوتی ہے تو الف لیلیٰ کے حوالے سے جسے آج بھی خرافات سمجھنے والوں کی کمی نہیں۔ مگر یہ رابرٹ اروِن کی کتاب ہے، ابن خلدون کے بارے میں، جو نہ ہو سو تھوڑا ہے۔

الف لیلیٰ میں ایک قصّہ ہے جو کئی راتوں پر پھیلا ہوا ہے اور پیتل کے شہر کے نام سے معروف ہے۔ ابن خلدون والی کتاب کے درمیان میں الف لیلیٰ کھول لیتا ہوں۔ ابوالحسن منصور احمد کی ترجمہ کردہ الف لیلیٰ ولیلہ کی جلد چہارم میں، جسے انجمن ترقّی اردو نے مولوی عبدالحق کے زیر اہتمام شائع کیا تھا، پانچ سو چھیاسٹھویں رات میں ان لٹّیوں کی کہانی ہے جن میں حضرت سلیمان علیہ السلام دیووں کو بند کیا کرتے تھے۔ خلیفہ عبدالملک بن مرواں کے دربار میں گزشتہ اقوام کی بحث چھڑ گئی اور وہ ان لٹّیوں کو دیکھنے کے لیے بے چین ہوا تو طالب بن سہل نے کہا کہ اپنے بھائی کو لکھ دے کہ موسیٰ بن نصیر کے ذریعے مراکش سے منگوا دے۔ خلیفہ کی فرمائش شہرزاد کی زبان سے اور بھی نامانوس معلوم ہوتی ہے مگر اس سے بھی بڑھ کر اس حکم کی بجا آوری کے دوران موسیٰ بن نصیر کی کوششیں جو مختلف پرانے آثار میں گھومتا پھرتا ہے اور ان پر کندہ عبارتوں میں دنیا کی بے ثباتی کا حال پڑھ کر زار زار روتا جاتا ہے، اسی دوران پیتل کے شہر جا پہنچتا ہے جو عجائبات کا نمونہ ہے۔

احتیاط کی خاطر امیر موسیٰ اپنے آدھے لشکر کو لے کر شہر میں داخل ہوتا ہے تو اسے زندگی کے بجائے موت نظر آتی ہے:

''دیکھا کہ ان کے ساتھی مرے پڑے ہیں، انھیں دفن کیا۔ اب ان کی نظر دربانوں، نوکروں، حاجبوں اور نوّابوں پر پڑی جو ریشم کے فرش پر مُردہ پڑے تھے۔ اس کے بعد وہ شہر کے بازار میں گئے، دیکھا کہ بڑا شان دار بازار ہے عمارتیں اونچی اونچی ہیں مگر ایک سے ہو کر دوسرے میں راستہ نہیں، دکانیں کھلی پڑی ہیں، ترازوئیں لٹکی ہوئی اور پیتل کے برتن ایک قطار میں رکھے ہوئے ہیں، سرائیں مال و اسباب سے پٹی پڑی ہیں، دکانوں میں سوداگروں کے مُردے ہی مُردے دیکھے جن کی کھالیں سوکھ گئی ہیں، ہڈیاں سڑ گئی ہیں اور انھیں دیکھنے سے عبرت حاصل ہوتی ہے۔ اسی طرح انھوں نے چار بازار دیکھے جو الگ الگ تھے اور جن کی ہر دکان مال و اسباب سے بھری ہوئی تھی۔ ان سے گزر کر وہ ریشم کے بازار میں گئے۔ ریشم کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ زربفت دیکھا جو رنگ برنگ کا سُرخ سونے اور سفید چاندی سے بنا ہوا تھا مگر دکان دار چمڑے کے فرش پر مرے ہوئے پائے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ابھی بول اٹھیں گے۔ وہاں سے ہوتے ہوئے وہ جواہرات، موتیوں اور یاقوتوں کے بازار میں پہنچے پھر صرّافوں کے بازار میں۔ دیکھا کہ انھیں بھی سانپ سونگھ گیا ہے۔ ان کے نیچے طرح طرح کے پختہ اور کچّے ریشم کے فرش بچھے ہوئے ہیں اور ان کی دکانوں میں سونا، چاندی بھرا پڑا ہے۔ آگے بڑھے تو عطاروں کے بازار میں آئے طرح طرح کے عطر، مشک، عنبر، عود، اگر اور کافور وغیرہ کی بوریاں دکھائی دیں مگر ان کے مالکوں کا وہی حال تھا۔''

''عطاروں کے بازار سے نکل کر انھیں قریب میں ایک مضبوط اور شان دار محل دکھائی دیا۔ اندر گئے دیکھا کہ جھنڈے لہلہا رہے ہیں، تلواریں میانوں سے نکلی پڑی ہیں، کمانوں پر چلّے چڑھے ہوئے ہیں، ڈھالیں سونے اور چاندی کی زنجیروں میں لٹکی ہوئی ہیں، خودوں پر سُرخ سونے کا پانی چڑھا ہوا ہے اور محل کی دہلیز میں ہاتھی دانت کے چبوترے ہیں جن پر سونے کے پتّر چڑھے ہوئے ہیں، ریشم کا فرش بچھا ہوا ہے اور ان پر لوگ بیٹھے ہوئے ہیں جن کی کھالیں ہڈیوں پر سوکھ کر رہ گئی ہیں، ناسمجھوں کے خیال میں وہ سو رہے ہیں مگر دراصل وہ مارے بھوک کے مر گئے ہیں۔ یہ دیکھ کر امیر موسیٰ ٹھہر گیا اور خدا کی پاکی بیان کرنے لگا۔''

صبح کے آثار ہونے پر شہرزاد رکتی ہے اور ایک رات مزید اجازت ملنے کے بعد حسن و جمال کی پیکر لڑکی کا احوال سناتی ہے جو سلام کا جواب نہیں دیتی، اس لیے کہ وہ مر چکی ہے مگر اس کے تخت پر عبارت کندہ ہے جس کی عبارت میں یہ الفاظ بھی آتے ہیں:

''سب تعریفیں اس کے لیے ہیں جس نے انسان کو پیدا کیا جو پروردگاروں کا پروردگار اور اسباب کا پیدا کرنے والا ہے۔ شروع کرتی ہوں میں اللہ کے نام سے جو ہمیشہ رہنے والا اور دائم وقائم ہے۔ شروع کرتی ہوں اللہ کے نام سے جس نے قضا وقدر کو مسلط کیا۔ اے آدم کی اولاد، تو امیدوں کی وجہ سے کتنا جاہل ہو رہا ہے اور موت کو بُھلا رکھا ہے! تجھے معلوم نہیں کہ موت تجھے بلا رہی ہے اور تیری جان نکالنے کے پیچھے پڑی ہوئی ہے۔ سفر کی تیاری کر اور دنیا سے توشہ لے لے کیوں کہ تو اسے جلد چھوڑنے والا ہے۔ کہاں ہے آدم جو انسانوں کا باپ تھا! کہاں ہے نوح اور اس کی نسل! کسریٰ اور قیصر کدھر چلتے بنے! ہند اور عراق کے بادشاہ کیا ہوئے! دنیا کے بادشاہ اور عمالقہ اور شاہنشاہ کہاں گئے! دنیا ان سے خالی ہوگئی اور اپنے گھر والوں اور وطن کو چھوڑ کر چل بسے۔ کہاں ہیں عرب اور عجم کے حکم راں! سب مر کر خاک ہوگئے۔ بڑے بڑے سردار کیا ہوئے! سب کے سب مٹ مٹے! کہاں ہیں قارون اور ہامان! کہاں ہے شدّاد بن عاد! کیا ہو گیا کنعان اور ذوالاوتاد! عُمروں کو ختم کرنیوالی موت نے ان کی عمریں ختم کر دیں اور ملکوں کو ان سے خالی کر دیا۔ کیا انھوں نے آخرت کا توشہ مہیا کیا اور بندوں کے پروردگار کے سامنے جواب دہی کے لیے تیار رہیں؟ اے شخص، اگر تو، مجھے پہچانتا نہیں تو میں خود تجھے اپنا نام ونسب بتاتی ہوں۔ میں ان عمالقہ بادشاہوں کی بیٹی تدمرہ ہوں جنھوں نے ملکوں پر انصاف کے ساتھ حکم رانی کی ہے۔ میری حکومت کے برابر کسی بادشاہ کی حکومت نہ تھی۔''

ماجرا دل چسپ مگر عبارت داستان کے بجائے تاریخ کی کتاب کے قریں معلوم ہوتی ہے۔ اس موقعے پر انتظار صاحب یاد آئے اور میں نے سوچا لاؤ، اس احوال کو رتن ناتھ سرشار کی ہزار داستان میں دیکھیں جسے بڑے عمدہ مقدمے کے ساتھ انتظار حسین نے مرتّب کیا تھا۔ سرشار کی ہزار داستان میں اس باب کا عنوان شہر برنج ہے اور خلیفہ کا دربار اس طور ترتیب پاتا ہے:

''زمان پاستان میں شہر دمشق میں ایک بادشاہ ستارہ سپاہ خلیفہ جم جاہ عبدالملک ابن مردان نام رہتا تھا۔ ایک روز اس کے دربارودربار میں بادشاہ اور سلاطین اور امراء بیٹھے تھے اور زمان سلف کی قوموں کا ذکر ہو رہا تھا۔ کبھی حضرت سلیمان ابن حضرت داؤد کا ذکر مذکور تھا کہ دوسرا خسرو عالی جاہ ان کا نقطہ مقابل نزدیک نہ دور تھا۔ اجنہ اور انسان اور طیور تک کے بادشاہ بڑے کروفر کے خسرو عالم پناہ تھے۔ کتب ماضیہ میں درج ہے کہ خدا نے یہ عظمت پرسطوت وشان اوران ہفت اقلیم کے کسی بادشاہ کو نہیں عطا کی تھی۔ حق یوں ہے کہ تمام عالم کے شاہان نامدار پر ترجیح دی تھی۔ جب تو جن اور خبیث اور عفریت تابع حکم حضور تھے۔ ساری خدائی میں مشہور تھے۔ بوتلوں میں جنوں کو بند کر کے سیسہ ان پر چھوڑا۔ جس نے بجا آوری ارشاد سے منھ موڑا۔ اس نے منھ کی کھائی۔

اچھے اچھوں نے کبھی گردن نہ اٹھائی۔‘‘

امیر موسیٰ کو دیواروں پر کندہ نصیحت نظر آتی ہے:

’’امیر موسیٰ اور شیخ عبدالصمد مع ہمراہیوں کے وہاں گئے۔ دیکھا تو آنکھیں کھل گئیں۔ دیواروں پر طلائی کام تھا۔ نمونہ ارم اس کا ہر مقام تھا۔ شیخ عبدالصمد نے کہا، وہ نصیحت سامنے والی دیوار پر کندہ ہے۔ پڑھ کر ترجمہ کیا تو یہ تھا۔ (اس مقام پر وہ تاجدار اور نامور شہریار رہتے تھے جواب خاک ہیں، آلودہ ہیں۔ جو کچھ انھوں نے پیدا کیا وہ سب بھی خاک میں مل گیا۔)

امیر موسیٰ یہ نصیحت پڑھ کر زار زار رویا اور غش کھا کے گر پڑا۔ جب غشی دور ہوئی تو خدائے پاک کو یاد کیا اور اس قصر فلک شکوہ کی تصویریوں، کمروں اور شہ نشینوں کو دیکھ کر عش عش کرنے لگا۔ جب دوسرے دروازے کے قریب داخل ہوا تو یہ اشعار نظر سے گزرے۔

کیا بھروسہ ہے دار فانی کا
کیا بھروسہ ہے زندگانی کا
قبر میں ایک روز جانا ہے
زندگی کھیل ہے بہانہ ہے
ایک دن موت سب کو آنی ہے
زندگی خواب ہے کہانی ہے

اِدھر اُدھر سیر کی تو مکان کو بالکل خالی اور سنسان پایا۔ چھوٹا بڑا کوئی نظر نہ آیا۔ وسط عمارت میں ایک گنبد بلند تھا۔ اردگرد چار سو قبریں بنی ہوئی تھیں۔ ان قبروں میں ایک سنگ مرمر کی نظر آئی۔ اس پر نصیحت کندہ پائی۔

(میں جنگ آزمودہ ہوں مگر اب تہ خاک آسودہ ہوں۔ ہنگامہ رستخیز اور میدان ستیز میں گولی اور گولے اور آگ سے مقابلہ کیا مگر آتش اجل کی آنچ نے مار ڈالا۔ سارا کس بل نکالا۔ جو کان مہ وشان ناہید نغمہ کی خوش الحانی اور نازک آوازی کے خوگر تھے، ان کو کیڑوں نے کھایا۔ افسوس کہ جیتے جی مرنے کا کبھی خیال ہی دل میں نہ آیا۔)‘‘

شہر برنج کا احوال یوں سامنے آتا ہے:

’’امیر اندر داخل ہوا اور اس کے ہمراہ آدھے آدمی بھی گئے۔ جن کے پاس اسلحہ جنگ و حرب وضرب موجود تھے۔ اس قافلے نے اپنے بارہ ساتھیوں کی لاشیں بھی پائیں اور اسی شہر میں دفنائیں دیکھا کہ امراء اور روٴسا اور عمائد شہر ریشمی بستروں پر مردہ پڑے ہوئے ہیں۔ بازار میں جا کر دیکھا تو بہت بڑا اونچا ہے اور اونچی اونچی عمارتوں کو دورویہ قطار ہے مگر بلندی سب کی یکساں

ہے۔ دکانیں کھلی ہوئی۔ برنجی برتن قرینے سے چُنے ہوئے اور ترازو لٹکی ہوئی۔ کوٹھیوں اور سراؤں میں انواع واقسام کا اسباب موجود ہے مگرآدم زادمفقود ہے۔ سوداگر دکانوں میں مردہ لاشیں خشک ہوگئی ہیں۔ استخوان بوسیدہ عبرت کا مام تھا۔ کل اشیاء مہیا مگرآدمی کا نشان نہ نام تھا۔

اس کے علاوہ ایک خاص قسم کی دکانوں کے چار بازار نظر آئے جن میں دولت بھری ہوئی تھی۔ یہاں سے ریشم کے بازار کو گئے۔ دیکھا تو ریشمی تھان جن پر سنہرا بھاری کام کیا ہوا تھا۔ کثرت سے پٹے پڑے تھے۔ مردے ان تھانوں پر گرے ہوئے ہیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ بولا ہی چاہتے ہیں، زبان کھولنا ہی چاہتے ہیں۔

یہاں سے جوہری بازار اور چاندی بازار گئے اور پھر صرافے کی راہ لی۔ وہاں سے عطر کے کارخانوں میں آئے۔ یہاں عطر اور عنبر اور مشک اذفر کی خوشبو جو آئی تو دماغ طبلہ عطار بن گیا۔

یہاں سے چلے تو ایک قصر نور بازار نظر افروز ہوا۔ دیکھا تو نشانوں کے پھریرے اڑ رہے ہیں۔ ڈھالیں سونے چاندی کی زنجیروں سے لٹکے ہوئے ہیں اور زرہ اور خود اور تیر وکمان بھی لٹکے ہیں۔ اس محل معلٰی اور قصر نور بار میں جابجا ہاتھی دانت کی تپائیاں پڑی تھیں۔ لوگ ان پر مرے ہوئے میٹھی نیند ہو سو رہے۔

کچھ ایسا سوئے ہیں سونے والے کہ جاگنا حشر تک قسم ہے۔''

اسی شہر میں وہ حسین وجمیل پری پیکر نظر آتی ہے جو اس درجہ متاثر کرتی ہے کہ امیر موسیٰ ''اس کے جمال اور حسن گلاسوز اور نور عالم افروز پر عش عش کرنے لگا کہ واہ واہ۔''

''امیر سمجھا کہ یہ زندہ ہے مگر طالب نے کہا، حضور خدا جانے یہ پری پیکر کب سے مُردہ ہے۔ یہ ہاتھ سے جو سلام کہا یہ فقط اجزاء کی ترکیب ہے اور اس کے مرنے کے بعد اس کی آنکھیں نکال لی گئیں اور پارہ ڈال دیا گیا۔ جب ہوا اس میں پہنچتی ہے تو وہ جنبش کرنے لگتی ہے اور زندوں کی طرح پتلیاں گھومتی ہیں مگر دیکھنے والوں کو یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ گویا آنکھیں کھلی ہوتی ہیں۔۔۔''

نصیحت آمیز اشعار کی دل سوزی اپنی جگہ اور موسیٰ بن نصیر کو مائل بہ رقّت کرنے کے لیے عین مناسب مگر اس حسین وجمیل پیکر کی مُردہ بہ انداز زندہ آنکھوں میں بھرے، ہوا کے ساتھ حرکت کرتے پارے سے سمجھ میں آتا ہے کہ الف لیلہٰ کی یہ داستان تاریخ کے اس عبرت ناک سبق کو دہرا رہی ہے جو ابن خلدون کے لیے معنی خیز تھا اور مقدمے کی غایت تصنیف سے قریب تر۔ بربار دہروں اور تباہ حال ویرانوں میں اس نشانیاں نظر آتی تھیں۔ رابرٹ اروِن لکھتا ہے__

can be seen as a fantastical The story of "The City of Brass"

prefiguration of the theme that so preoccupied Ibn Khaldun__

اور وہ موضوع، اس کے مطابق یہی ہے، شمالی افریقہ کے کھنڈرات اور ان سے حاصل ہونے والے سبق، یعنی عبرت سرائے دہر۔ پھر اس کی تہہ میں یہ سوال کہ اس شان و شوکت کے بعد یہ عبرت ناک بربادی لازمی تھی، کیا اس کو تدبیر سے روکا نہیں جا سکتا تھا؟

سوال بہت واضح ہے مگر ظاہر ہے کہ ''مقدمہ'' میں یہی ایک مسئلہ نہیں، اس میں پیچ در پیچ سوال ہیں۔ فی الوقت میں اس ایک سوال پر رُک گیا ہوں، اپنے وقت کی مجبوری سے۔ اسے محض اتفاق سمجھیے یا تاریخ کی ستم ظریفی کہ رابرٹ اروِن کی فکر انگیز کتاب ایسے دنوں میں پڑھ رہا ہوں جب ہر طرف شور بپا ہے، کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی۔ الیکشن کی گہما گہمی، تجزیے، رپورٹ، ٹی وی کے ٹاک شوز کی بھرمار، نئی حکومت بنانے کی تیاریاں، خوش فہمی اور اندیشے، کیا موقع ہاتھ سے گنوا دیا یا ایک موقع اور مل گیا؟ یہ افراتفری تو اب ہمارا معمول بن گئی ہے۔ بحران کے دن تو میرے ملک میں چلتے رہتے ہیں۔ کان پڑی آوازیں جہاں سنائی نہ دے سکیں ایک بزعمِ خود رہ نما حلق پھاڑ کر چیخ رہا ہے کہ بربادی کے اصل ذمہ دار سابق حکمران ہیں، کوئی اور نہیں۔ ایک اور لیڈر اس سے بڑھ کر چیخ رہا ہے ___ آخر کیا وجہ ہے ہمارا پیارا پاکستان آگے جانے کے بجائے تیزی سے پیچھے کی طرف جا رہا ہے۔ اس کی وجہ بھی ___ وہ نہ جانے کیا کہہ رہا ہے۔ مجھے اس کی تقریر کے بجائے سحر انصاری کا شعر یاد آ گیا جو بھلائے نہیں بھولتا:

تمہیدِ کمال ہوتے ہوتے
تکمیلِ زوال ہو گئے ہم

اچھا، جو ہوا سو ہوا۔ لگتا ہے ان خود ساختہ رہ نماؤں نے صبح اٹھ کر آئینے میں اپنا چہرہ نہیں دیکھا۔ ابن خلدون کا مقدمہ پڑھ لینے کی ان سے کیا توقع کی جائے۔ انھوں نے الف لیلیٰ بھی نہیں پڑھی۔ شاید اپنے بچپن میں بھی نہیں۔

ورنہ نوشتۂ دیوار پڑھ سکتے تھے۔

اور جو دیوار ان کے چاروں طرف ہے اس کا نام دیوارِ قہقہہ ہے۔

متاثر کن کتابوں کی ایک یاد

سیّد کاشف رضا

اگر کسی سے اس کی پسندیدہ کتابوں کی فہرست بنانے کو کہا جائے تو وہ اس فہرست کے بارے میں کئی طرح سے سوچ سکتا ہے۔ وہ چاہے تو ان کتابوں کے نام لکھ سکتا ہے جنھوں نے اس پر گہرا اثر ڈالا، یا پھر وہ کتابیں جنھیں وہ عظیم کتابیں سمجھتا ہے، یا پھر وہ کتابیں جنھیں وہ پسندیدہ کتابیں سمجھتا ہے۔ یہ تینوں قسم کی کتابیں مختلف ہوسکتی ہیں۔ کبھی آپ پر کوئی ایسی کتاب زیادہ اثر ڈال سکتی ہے جو دنیا کی معروف ترین کتابوں میں شامل نہ ہو۔ کبھی کوئی ایسی کتاب آپ کی پسندیدہ کتابوں میں جگہ بنا سکتی ہے جسے باقی لوگ اہم یا بڑی کتاب نہ سمجھتے ہوں۔ اس کے علاوہ ایک قاری مختلف اصناف کی کتابیں پڑھتا ہے اور ان سب کے درمیان موازنہ کر کے چند موثر ترین، عظیم ترین یا پسندیدہ ترین کتابوں کا نکالنا کارِ دشوار ہوتا ہے۔ ایسی فہرست سازی کا آسان طریقہ یہ ہے کہ لوگ معروف ترین کتابوں کے ناموں میں سے چند نام چن لیں۔

میں یہ سمجھتا ہوں کہ بچپن اور لڑکپن کی عمر میں پڑھی جانے والی کتابوں کا اثر زیادہ اور تادیر ہوتا ہے، اس لیے ان کی فہرست کو عظیم ترین کتابوں اور پسندیدہ ترین کتابوں کی فہرست سے الگ رکھنا چاہیے۔ میں ذاتی طور پر اچھی کتابوں کو دو اور طریقے سے بھی تقسیم کرتا ہوں: کتابیں جنھوں نے مجھے بہت خوشی دی اور کتابیں جنھوں نے مجھے اداس یا مضطرب کر دیا۔ پچھلے دنوں میں نے فیس بک پر اپنے پسندیدہ ترین بیس ناولوں کی فہرست شیئر کی تو اس میں دوستوئفسکی کا ناول 'کارامازوف برادران' شامل نہیں تھا۔ وجہ یہ تھی کہ یہ ناول ان ناولوں میں شامل تھا جنھوں نے مجھے بہت مضطرب رکھا تھا۔ دوسری جانب 'ہکل بری فن' اور 'ٹریژر آئی لینڈ' جیسے ناول تھے جن کی ادبی عظمت کے بارے میں کوئی کچھ بھی کہے مگر انھیں میں اپنے دل کے بہت قریب پاتا ہوں اور انھیں کسی بھی طور اپنے پسندیدہ ترین ناولوں کی فہرست سے خارج نہیں کر سکتا تھا۔ تاہم اگر میں دنیا کے عظیم ترین ناولوں کی فہرست بناؤں تو کارامازوف برادران اس میں ضرور شامل ہوگا۔

کتابوں کے سلسلے میں سب سے پہلی یاد یہ ہے کہ جب میں تین چار سال کا تھا تو میرے ابو مجھے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سوانح حیات پڑھ کر سنایا کرتے تھے۔ اس میں ان کا نام

حضور درج ہوتا تھا اور میں اسے ہی ان کا اصل نام سمجھا کرتا تھا۔ وہ پاکٹ سائز کی ایک کتاب تھی جس کے صفحات زرد تھے۔ تب تک میں دنیا کا کوئی بھی رسم الخط پڑھنے کے قابل نہیں ہوا تھا اس لیے ابو کی غیر موجودگی میں اس کتاب کے صفحے کھول کر ان دنوں کو یاد کرتا تھا جب میں اس کتاب کو پڑھنے کے قابل ہونے والا تھا۔

پہلی کہانی جو خود پڑھی وہ پہلی جماعت کے نصاب کی کتاب میں تھی اور کچھ یوں تھی: ''خالد بازار سے گزر رہا تھا۔ اس نے بازار میں ایک بڑے میاں کو دیکھا۔ بڑے میاں نابینا تھے۔ وہ لاٹھی ٹیک ٹیک کر چل رہے تھے۔ ڈر تھا کہ کسی سے ٹکرا نہ جائیں۔'' بڑے میاں کیا ہوتے ہیں؟ وہیں سفید داڑھی والے ایک آدمی کی تصویر تھی۔ اچھا تو بڑے میاں میرے نانا جیسے ہوتے ہیں جن کی سفید داڑھی تھی۔ میرے گھر میں پنجابی بولی جاتی تھی اور میری اردو کی لغت میں پہلے خالص اردو لفظ کا اضافہ ہوا تھا۔

میں سات سال کا تھا جب ابو کی پوسٹنگ کراچی ہوگئی۔ ابو گھر میں جمعے کیک روز جنگ اخبار لانے لگے۔ میں اس میں چھپنے والی ٹارزن کی کہانی پڑھتا جو قسط وار اور باتصویر شائع ہوتی تھی۔ اس کے بعد بچوں کا صفحہ اور پھر عالمی واقعات کے صفحے میں علی سفیان آفاقی اور صداقت حسین سوز کے مکاتیب میری توجہ کے مرکز بنے۔ میں بچوں کی کہانیاں پڑھنے لگا جو ان دنوں پچاس پیسے میں دست یاب تھیں۔ ان میں سے عمرو عیار اور امیر حمزہ کی کہانیاں مجھے خاص طور سے پسند آئیں۔ شاعری میں مجھے علامہ اقبال کی بچوں کی نظمیں بہت پسند تھیں۔ قرآن پڑھنے جاتا تو اس کے تفسیری حواشی میں زیادہ دلچسپی لیتا۔ کراچی میں میرے پھوپھا کے گھر اسلامی کتب کا بہت بڑا ذخیرہ تھا۔ وہاں سے جلال الدین سیوطی کی تاریخ الخلفاء اور مفتی جعفر حسین کی چودہ ستارے پڑھی۔ ان کے متعدد فقرے اب تک یاد ہیں۔

آٹھویں جماعت تک ادب سے میری دلچسپی بہت کم تھی کہ نسیم حجازی کے ناولوں نے مجھے ایک طوفان کی طرح آ لیا۔ میں نے ان کے ناول 'آخری چٹان' سے یہ مطالعاتی سفر شروع کیا اور دسویں جماعت پاس کرتے کرتے ایک آدھ کے سوا ان کے تمام ناول پڑھ چکا تھا۔ ان ناولوں میں ان کے مزاحیہ ناول بھی شامل تھے جن میں سے ایک میں ترقی پسندوں کی خاص طور پر بھد اڑائی گئی تھی۔ ان کتابوں کے مطالعے سے میں تاریخ کے ایک خاص نقطۂ نظر کا حامل ہوگیا۔ انھی دنوں جنرل ضیاء الحق کی ہلاکت کے بعد ملک میں نئے انتخابات کا غلغلہ بلند ہوا اور میں ان بچوں میں شامل تھا جو بےنظیر بھٹو کو ملکی سلامتی کے لیے رسک سمجھتے تھے۔

پیپلز پارٹی کی حکومت آئی تو اس نے پی ٹی وی پر مزاحمتی شاعروں کے حوالے سے ایک

پروگرام شروع کیا۔ پشتو کے شاعر غنی خان ان دنوں زندہ تھے، ان کا پروگرام آج بھی یاد ہے۔ میں نے فرسٹ ایئر میں فیض احمد فیض اور حبیب جالب کی شاعری پڑھی لیکن یہ اختر شیرانی تھے جنھوں نے میرے اندر شاعری کے چراغ کو اور بھڑکا دیا تھا۔ ان کی شاعری میں پہاڑی علاقے کے آبشاروں جیسی روانی اور سرمستی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ اس روز میں پی اے ایف کالج چکلالہ کی دوسری منزل پر واقع لائبریری میں بیٹھا ہوا تھا جب میں نے اختر شیرانی کی کتاب 'اختر ستان' نکالی تھی۔ اسے پڑھتے ہوئے مجھ پر ایسی سرخوشی طاری ہوئی تھی کہ جی چاہتا تھا کہ فوری طور پر ایک عدد عشق میں خود کو مبتلا کر ڈالوں۔ اور حقیقتاً میں نے ایسا کر بھی ڈالا۔ وہ ترشے ہوئے بالوں والی ایک لڑکی تھی جوان دنوں اسی لائبریری میں بیٹھ کر بپسی سدھوا کا ناول 'دا کروا یٹرز' پڑھا کرتی تھی۔

اختر شیرانی کی شاعری کے بعد فیض احمد فیض اور پھر ایملی برانٹے کے ناول 'ودھرنگ ہائٹس' نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا اور محبت نے ایک طوفانِ بلاخیز کی طرح مجھ کو آلیا۔ میں، جواب تک بچوں کی نظمیں اور ملی نظمیں لکھنے کی کوشش کیا کرتا تھا، رومانی شاعری کرنے لگا۔ مختار صدیقی کے ترجمے میں لن یوتانگ کی کتاب 'جینے کی اہمیت' پڑھی تو اس کے اسباق ہمیشہ کے لیے از بر کر لیے۔ آج بھی ہر نوجوان کو یہ مشورہ دیتا ہوں کہ اگر اس نے 'جینے کے اہمیت' نہیں پڑھی تو پہلی فرصت میں پڑھ لے تاکہ وہ خود کو زندگی کے انعامات سے لطف اندوز کرنے کے قابل کر لے۔ دوسری جانب آر ایل اسٹیونسن کے ناول 'ٹریژر آئی لینڈ' اور مارک ٹوئین کے ناول 'ہکل بری فن' کے مطالعے سے اپنے دل میں دبی دبی ایڈونچر اور سیاحت کی چنگاری دریافت ہوئی جو آج تک فروزاں سے فروزاں تر ہوتی چلی جاتی ہے۔ ان دونوں ناولوں کو میں ایک سے زائد بار پڑھ چکا ہوں اور ان کی یاد آج بھی دھڑکنوں میں ارتعاش پیدا کر دیتی ہے۔

جب میں سرسید کالج راولپنڈی پہنچا تو سیاسی طور پر ویسا ہی قدامت پسند تھا۔ یہاں کلاس میں میری ملاقات شجاعت علی سے ہوئی جسے ن م راشد کی نظمیں زبانی یاد تھیں۔ شجاعت کی وساطت سے اس کے بڑے بھائی رفاقت حیات سے ملاقات ہوئی اور ان دو بھائیوں سے یہ ملاقات زندگی بھر کی دوستی میں بدل گئی۔ شجاعت اور رفاقت بائیں بازو کی فکر سے متاثر تھے۔ میں نے ایک مرتبہ لیاقت لائبریری سے کمیونسٹ مینی فیسٹو جاری کروا کر پڑھی تھی مگر اس میں کوئی خاص دلچسپی پیدا نہیں ہو سکی تھی۔ شجاعت علی کی تحریک پر میں نے سبطِ حسن کی کتابوں کا مطالعہ شروع کیا۔ سبطِ حسن کی کتاب 'ماضی کے مزار' نے میرے اندر کی دنیا ہلا کر رکھ دی۔ مجھے یہ کتاب پڑھ کر غصہ تو بہت آیا مگر میں کوشش کے باوجود یہ تلاش کرنے میں ناکام رہا کہ انھوں نے کتاب میں مذہب کی توہین کہاں کی ہے۔ ساتھ ہی میں فیض احمد فیض، ترقی پسند تحریک اور پاکستان کے جمہوریت پسند

سیاست دانوں کا موقف سمجھنے کے لیے خود کو زیادہ سے زیادہ آمادہ ہوتا گیا۔ فیض احمد فیض کی کتاب 'میزان' انھی دنوں پڑھی اور ان کا یہ فقرہ آج تک دل پر نقش ہے کہ 'ادیب پر مشاہدہ ہی نہیں، مجاہدہ بھی فرض ہوتا ہے'۔

تاہم یہ ن م راشد تھے جن کی شاعری اور شخصیت مجھے سب سے زیادہ پسند آئی تھی۔ میں ان کی کلیات کے پیچھے چھپی ان کی گنجے سر والی تصویر تا دیر دیکھتا رہتا اور طے کرتا کہ شاعر کو راشد صاحب ہی کی طرح باوقار زندگی گزارنی چاہیے۔

والد صاحب کی پوسٹنگ کے بعد مجھے اہل خانہ کے ساتھ کراچی آنا پڑا تو یہاں دو تین سال میں راول پنڈی کے فراق میں تڑپتا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ یہاں کے ادیبوں سے ملاقاتیں شروع ہوئیں۔ ان دنوں میں اور شجاعت علی دونوں ڈی ایچ لارنس کے مداح ہو چکے تھے۔ ہم نے انھی دنوں لارنس کے دو بڑے ناول 'سنز اینڈ لورز' اور 'ویمن ان لو' پڑھے تھے۔ بی اے کے دوران ہم دونوں کو انگریزی فکشن کی ایسی چاٹ پڑی کہ ہم نے اسے اپنے طرزِ زندگی کے طور پر اختیار کر لیا۔ آج بھی ہم محض اردو ادب پر گزارہ کرنے والوں کو اوپر سے نیچے دیکھتے ہیں۔

اوپر سے نیچے دیکھنا انگریزی روزمرہ ہے اور اس کے لفظی ترجمے سے مجھے محمد خالد اختر صاحب یاد آتے ہیں جو کراچی میں ڈیفنس کی امام بارگاہ سے 'ایک پتھر کی مار پر' رہتے تھے۔ میں ٹریژر آئی لینڈ کا دیوانہ تھا اور وہ اسکاٹ لینڈ سے باہر رابرٹ لوئی اسٹیونسن کے سب سے بڑے مداح تھے۔ انھوں نے مجھے انگریزی میں نثر لکھنے والے ایک پورے گروہ سے متعارف کرایا جنھیں میں 'آوارگاں' کے نام سے یاد کرتا ہوں۔ ان میں ہیلیئر بیلاک، ڈبلیو ایچ ہڈسن، ارنسٹ ہیمنگوے اور اے جی گارڈنر عرف الفا آف دی پلاؤ شامل تھے۔ (خالد صاحب نے بتایا تھا کہ لاہور کے ایک ادیب نے الفا ہی کے نام کا ترجمہ کر کے اپنا نام 'الف المحراث' رکھا تھا)۔ ان آوارگاں کی محبت میں صرف خالد اختر صاحب میرے شریک تھے۔ وہ ہر لحاظ سے میرے ہم عمر اور ایک بیس بائیس برس کے لڑکے تھے اور میں افسوس کرتا تھا کہ ان کی جسمانی حالت ایسی نہیں تھی کہ ہم دونوں مل جل کر کسی دور دراز علاقے کے لیے گھر سے چل نکلتے۔ ان کی وفات کے بعد کتنی ہی کتابیں تھیں جن کے مطالعے کے دوران میں نے خالد اختر صاحب کو بہت یاد کیا۔ ایک مرتبہ بحری قزاقوں اور ان کے سامان سے متعلق ایک تصویری کتاب میرے ہاتھ لگی۔ اسے دیکھ کر میرا دل جوش و خروش سے بھر گیا اور میں نے سوچا کہ آج خالد اختر صاحب زندہ ہوتے تو میں سیدھا ان کے گھر جاتا اور وہ اس کتاب کو دیکھ کر کتنا خوش ہوتے۔ یہ ایک موضوع کے لیے ہم دونوں کی مشترکہ فریفتگی تھی جس کا اندازہ کسی اور دوست کو نہیں ہو سکتا تھا۔ خالد اختر صاحب کی کمی کوئی اور دوست پوری نہیں کر سکا۔

کراچی میں میں سب سے پہلے سحر انصاری اور صابر ظفر سے ملا تھا۔ کچھ ماہ بعد شجاعت اور رفاقت بھی راول پنڈی سے کراچی آ گئے۔ شجاعت انڈونیشیا چلا گیا تو میری ملاقاتیں رفاقت سے ہونے لگیں۔ وہ اردو فکشن اور روسی تراجم کا رسیا تھا اور مجھے ان کی طرف متوجہ کرتا تھا۔ میں اسے اپنے انگریزی زبان محبوب مصنفین کی جانب کھینچ لانے کی کوشش کرتا تھا۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کی سفارش پر بہت سی کتابیں پڑھیں لیکن ہمارا مطالعاتی ذوق اور زندگی کو دیکھنے کا رویہ جوہری طور پر مختلف ہی رہا۔

خالد اختر اور ان کے دوست کراچی میں صدر کے قریب آواری ہوٹل کے ریستوران بیک اینڈ ٹیک میں بیٹھتے تھے۔ ان سب ادیبوں میں ایک قدرِ مشترک یہ تھی کہ یہ سب مطالعہ بہت کرتے تھے جب کہ کراچی کے باقی شاعر ادیب اپنا قد بڑھانے کی فکر میں زیادہ غلطاں رہتے تھے۔ ان کی گفتگو میں ان دنوں میلان کنڈیرا کا بہت حوالہ آتا تھا۔ میلان کنڈیرا کا ناول 'دی جوک' اور محمد عمر میمن کے تراجم پر مشتمل کتاب 'آوارگی' کے مطالعے نے میرے لیے جدید فکشن کا راستہ روشن کر دیا۔ 'آوارگی' میں کنڈیرا کے انٹرویو اور مضامین بھی شامل تھے جنھوں نے نہ صرف فکشن بلکہ مجموعی طور پر زندگی کو دیکھنے کے ایک نئے اور انوکھے انداز سے متعارف کرایا۔ میں نے اپنی مخصوص افتادِ طبع کے باعث خود کو کنڈیرا کے خیالات کے لیے بہت آمادہ پایا۔ آج میں اپنے کتب خانے میں میلان کنڈیرا کی تصانیف میں سے کسی ایک کو اٹھاتا ہوں تو اس کے اندر کئی رنگوں سے لکیریں لگی اور حاشیے درج دیکھتا ہوں۔ کسی اور مصنف کی کتابوں پر میری دلچسپی اور پسندیدگی کی اس قدر گواہیاں موجود نہیں۔

نثری نظم سے میری ملاقات ذی شان ساحل کی کتاب 'ایرینا' کے ذریعے ہوئی تھی جو مجھے ایک روز اردو بازار سے ملی تھی۔ اس کتاب کا دیباچہ بھی بہت دلچسپ لگا تھا جس میں ذی شان نے لکھا تھا کہ اسے گٹار اور ٹینس کی خاتون کھلاڑی پسند ہیں اور وہ مغربی بود و باش کو عزیز رکھتا ہے۔ مجھے لگا کہ وہ گٹار ہاتھ میں لیے جینز پہننے والا ایک کھلنڈرا نوجوان ہوگا لیکن اس سے ملاقات کر کے معلوم ہوا کہ شاعری اس کے لیے شخصیت کے اظہار کے ساتھ ساتھ شخصیت سازی کی بھی کوشش تھی۔

اجمل کمال، افضال احمد سید اور آصف فرخی بہت زیادہ مطالعہ کرنے والے ادیب تھے لیکن یہ سب اتنے ہائی برو تھے کہ ان سے گفتگو سہل نہ تھی۔ ایسے میں عذرا عباس اور انور سن رائے کی بیٹھک وہ جگہ تھی جہاں بولنے اور کھل کر بولنے کی پوری آزادی تھی۔ بعد کے برسوں میں پہلے تین دوستوں سے بھی بات چیت سہل ہوتی گئی۔ بہت سی کتابیں ایسی تھیں جن کا ذکر سب سے پہلے انھی

سب سے سنا۔ اگر ان پانچ سے ملاقات اور پھر مسلسل رابطہ نہ ہوتا تو شاید میری مطالعاتی زندگی مختلف ہوتی۔

جب بے حد متاثر ہونے کی عمر نکل گئی تو اور بہت سی کتابیں ان کتابوں سے بھی بہتر لگیں۔ ٹالسٹائی، چیخوف، مارکیز اور بورخیس خاص طور پر بہت پسند آئے۔ دیوانِ غالب، دیوانِ حافظ اور فیض احمد فیض کی کلیات شاعری کی وہ کتابیں ہیں جن کی جانب میں بار بار لوٹا اور جن کی شاعری اور رویوں کی بار بار یاد آئی۔ مزاح میں محمد خالد اختر کے ساتھ ساتھ ابنِ انشاء اور کرنل محمد خان کی کتابیں مجھے بہت عزیز رہیں۔ تاہم وہ کتابیں جنھوں نے مجھے زندگی میں بہت متاثر کیا ان کتابوں سے مختلف ہیں جنھیں میں عظیم ترین کتابیں قرار دوں گا۔ مثلاً میرے خیال میں دنیا کا کامل ترین ناول 'آننا کارینینا' ہے اور اس کے بعد میلان کنڈیرا اور گابرئیل گارشیا مارکیز کے ناول دنیا کے عظیم ترین ناول ہیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ ان کتابوں کے ذکر اور ان کی پسندیدگی کی وجوہات کے بیان کے لیے مجھے ایک اور مضمون لکھنا چاہیے، جو کسی اور اسلوب کا حامل ہو۔ یادوں کی بازیافت اور کسی تنقیدی مضمون میں اتنا فرق تو ہونا ہی چاہیے۔

کتابیں: میری زندگی

بیگم صالحہ عابد حسین

مطالعہ کا لپکا کب پڑا یہ یاد نہیں۔ ہوش سنبھالا تو اپنے کو کتابوں کا شیدا پایا۔ اماں کے پاس کتابیں تھیں۔ چھوٹی باجی کتابیں منگاتی بھی تھیں لائبریریوں سے اور خریدتی بھی تھیں۔ خالہ اماں کے گھر ایک پوری الماری کتابوں کی بھری موجود تھی۔ پھول، تہذیبِ نسواں، رسالہ خاتون، ظل السلطان وغیرہ کسی نہ کسی بہن یا خالہ کے نام جاری تھے۔ بھائی جان کی کتابیں بھی اوپر کے کمرے کی الماری میں موجود تھیں مگر وہ ہمارے بس کی نہ تھیں۔

بھائی جان کو یہ شوق تھا کہ جو اچھی کتاب یا رسالہ ہمارے کام کا شائع ہو وہ بہنوں کے لئے خرید کر بھیجیں۔ میں تو خیر بہت چھوٹی تھی مگر چھوٹی باجی کے لئے یہ کتابیں آیا کرتی تھیں۔ کسی بھوکے کے سامنے اتنے خوان نعمت ہوں تو وہ کیسے بھوکا رہ سکتا ہے۔

دس بارہ سال کی عمر تک میں ہر قسم کی کتابیں جو میری راہ میں آئیں پڑھ چکی تھی۔ بچوں کی کتابیں، لڑکیوں کی کتابیں، عورتوں کے لئے لکھی گئی کتابیں، عورتوں کی لکھی کتابیں، جاسوسی کتابیں (یہ شوق جلد دم توڑ گیا)، ادبی کتابیں، شاعروں کے دیوان، مثنویاں، مسدس حالی وغیرہ جو بھی کتاب ہاتھ لگ جاتی سمجھ میں آتی یا نہ آتی پڑھی ضرور جاتی تھی۔ بعض کتابوں کو ہمیں پڑھنا منع تھا مگر میری سمجھ میں یہ بات نہ آتی تھی کہ جو کتاب چھوٹی باجی پڑھ سکتی ہیں وہ میں کیوں نہیں؟ عمر میں بڑی ہیں تو ہوا کریں۔ چنانچہ لک چھپ کر شرر اور رسوا کے ہی ناول نہیں فسانہ آزاد تک پڑھا۔ کس طرح؟ یہ ہمارا دل ہی جانتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس وقت اس قسم کے ناولوں کا دس فیصد حصہ بھی پلے نہ پڑتا تھا، ہاں خواتین کی لکھی کتابیں اور ان کے لئے جاری کئے رسالے سمجھ میں آجاتے تھے۔ جنگل کی کہانی (یا زلفی) جو امتیاز علی تاج نے انگریزی سے اخذ کر کے لکھی تھی بڑے شوق سے پڑھی تھی۔

عمر کے ساتھ شوق میں ترقی ہوتی گئی۔ ذوق بہتر ہوا، سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہوئی، کہانیوں اور ناولوں کے ساتھ ساتھ شاعروں کو بھی پڑھنا شروع کیا، حالی کو تو بہت بچپن سے پڑھا تھا۔ انیس تو پڑھے اور سنے ہی جاتے تھے۔ مگر اب مسدس اور بیوہ کی مناجات اور دوسری نظمیں سمجھ

میں آتی تھیں اور انیس کے سلام اور مرثیوں کو سمجھنا اور خود تکیہ پر بیٹھ کر پڑھنا شروع ہو چکا تھا۔ پھر اپنے شوق سے میں نے غالب، میر، حسرت، فانی، اختر شیرانی وغیرہ کو پڑھنا شروع کیا۔ میرے پاس اس زمانے کی ایک کاپی ہے جس میں میں اپنے پسند کے شعر اور نظمیں غزلیں نقل کیا کرتی تھی۔ اس کاپی میں اقبال، حالی، غالب، حسرت، اختر شیرانی، فانی اور بعض اور شاعروں کی غزلیں، نظمیں ، قطعات اور متفرق اشعار وغیرہ لکھے ہوئے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بارہ تیرہ سال کی عمر میں میرا شعری ذوق وشوق خاصا وسیع ہو چکا تھا۔ ۶۸ اور ۶۹ میں والدہ اور بہن کی وفات کے بعد اس قسم کے حسبِ حال شعر اور نظمیں تلاش کر کے ان میں تصرف کر کے اور اپنا نام ڈال کر میں نے اس کاپی میں نقل کر کے گویا اپنے تڑپے دل کو تسکین دینے کی کوشش کی ہے۔ پسندیدہ اشعار کہیں نہ کہیں لکھ لینے کا شوق کم وبیش ہمیشہ رہا، اب بھی ہے۔

شادی کے بعد شعر وشاعری کے ذوق میں عابد صاحب کی صحبت میں وسعت پیدا ہوئی ۔ اب صرف مذہبی یا اخلاقی اور اصلاحی چیزیں ہی نہیں دوسرے قسم کے شاعروں کو بھی پڑھتی تھی اور اپنے اندر اس کا ذوق پیدا کرتی رہی۔ پھر آنرز ان اردو کرنے کے زمانے میں تقریباً سبھی کلاسیکل شاعروں کو پڑھا۔ قلی قطب شاہ علی اور ولی سے لے کر ذوق، میر، غالب، اقبال اور پھر موجودہ دور کے شاعروں کا بہت سا کلام پڑھا۔ غالب اور اقبال کے بعض حصے اور ذوق اور سودا کے قصائد عابد صاحب نے خود پڑھائے۔ ریختی اور رنگین شاعری جو مجھے پسند نہ تھی وہ بھی پڑھی۔ اپنے دور کے شاعروں کا کلام بھی (اچھے شاعروں کا) زیرِ مطالعہ رہا اور اب بھی رہتا ہے۔ موزوں اور ناموزوں کلام کو کان ہمیشہ سے پرکھ جاتے تھے مگر شعر کو پرکھنے اور برے اور اچھے شعر میں امتیاز کرنے کی پوری صلاحیت عابد صاحب کی صحبت میں حاصل کی۔ ان کا شعری مطالعہ بہت وسیع اور ذوق بہت بلند تھا۔

مگر مجھے نثر سے کم اور شعر سے زیادہ دلچسپی رہی۔ سب سے زیادہ تو ناول، کہانیوں اور ڈراموں سے۔ پھر دل پر جبر کر کے دائرہ وسیع کیا۔ تاریخ ادب اردو، تنقید کی کتابیں، سوانح عمریاں، ادبی کتابیں، ادبی مضامین، کچھ علمی کتابیں بھی پڑھنی شروع کیں۔ عابد صاحب کے دقیق اور علمی کتابوں کے ترجمے بھلا کیسے نہ پڑھتی بلکہ کئی ترجمے تو خود میں نے ان کے ساتھ لکھوائے ہیں۔ سیدین صاحب، ذاکر صاحب، مجیب صاحب کی کتابیں پڑھیں۔ مذہبی یا نیم مذہبی کتابوں سے مجھے خود بھی کافی دلچسپی تھی۔ اس سلسلہ میں میں نے مولانا مودودی اور کئی شیعہ عالموں کی کتابوں کا مطالعہ بھی کیا۔ دل کی گیتا بھی پڑھی۔ سیدین صاحب کی یہ کوشش رہتی تھی کہ میں سنجیدہ کتابیں تو پڑھتی رہوں ساتھ ہی انگلش کی کتابیں پڑھنے کی چاٹ بھی انھی نے مجھے لگائی۔ بچپن میں مجھے

انگریزی قصے سناتے اور بتاتے کہ یہ فلاں کتاب میں فلاں نے لکھا ہے۔ پھر انھوں نے انگریزی کی آسان کتابیں مجھے لا کر دینی شروع کیں۔ عابد صاحب نے بھی کچھ سہارا دیا مگر وہ کہتے تھے کہ ڈکشنریوں سے مدد لوں اور وہ میرے بس کی چیز نہ تھی۔ میری انگلش کی تعلیم ناکافی تھی مگر مطالعہ کی چاٹ نے مجھے انگریزی کے ناول، کہانیاں اور ڈرامے جن میں سے بیشتر کلاسیکل ہیں (ان میں شیکسپیئر شامل نہیں۔ اسے میں نے اردو ترجموں ہی سے جانا ہے) پڑھوا ڈالے۔ LITTLE WOMEN سے شروع کیا اور ڈکنس، ٹالسٹائے، چیخوف، ترگنیف، برنارڈ شا، شارلٹ برانٹی، جین آسٹن پرسٹیلے، ارون سٹون اور جانے کتنے بہت سے انگلش میں لکھنے والے یا اس میں ترجمہ ہونے والے مصنفوں کو پڑھتی رہتی ہوں۔ ٹیگور، سرت چندر اور کئی اور بنگالی اور ہندوستان کی دوسری زبانوں کے مشہور مصنفوں کو بھی میں نے انگریزی میں زیادہ پڑھا ہے۔ اردو میں ترجمے اول تو ہوتے کتنے ہیں اور ہوتے ہیں تو اکثر بہت زیادہ خراب انگریزی کی بلا مبالغہ میں نے سینکڑوں کتابیں پڑھی ہیں۔ کچھ پوری سمجھ کر کچھ ادھوری اور کچھ اٹکل سے مطلب نکال کر رفتہ رفتہ اتنا محاورہ ضرور ہو گیا ہے کہ اب وہ زیادہ اچھی طرح سمجھ میں آنے لگی ہیں، مثلاً بیس برس پہلے میں نے ڈیوڈ کو پر فیلڈ پڑھی تھی تو جانے کیا سمجھ میں آیا تھا۔ پچھلے دنوں اسے دوبارہ پڑھا اور بیحد لطف آیا۔ میرا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ میرا انگریزی کا مطالعہ کوئی قابلِ ذکر۔ ظاہر ہے کہ زبان جاننے والا صرف ناول، کہانیاں ڈرامے نہیں پڑھتا اور بھی بہت پڑھنے کو اس بے مثال زبان میں موجود ہے۔ میں تو اپنے شوق کے ہاتھوں اس کٹھن زبان (جی ہاں یہ میرے لئے بہت کٹھن رہی ہے) کی کتابوں کو پڑھتی اور ان سے کچھ جواہرات چنتی رہی ہوں۔

رہی اردو تو وہ میری مادری زبان ہے۔ میری محبوب ہے میرا اوڑھنا، بچھونا ہے، میں نے اس میں ہزاروں صفحے لکھے ہیں لاکھوں پڑھے بھی ہیں۔ اردو کی اتنی کتابیں پڑھی ہیں جن کی گنتی یاد نہیں رہ سکتی تھی۔ ان میں اچھی بھی تھیں بہت اچھی بھی، معمولی بھی، بری بھی۔ اکثر کتابوں کو میں نے بار بار پڑھا ہے۔ یعنی سال دو سال بعد مثلاً دس پانچ سال بعد منشی پریم چندر، ٹیگور، یا سرت چندر، یا رسوا یا بعض دوسرے ادیبوں کے عمدہ ناول وغیرہ (کبھی خود اپنے بھی) ایک بار اور پھر پڑھ کر دل خوش کر لیتی ہوں کہ بری کتاب سے بہر حال پرانی کتاب اچھی ہوتی ہے۔ لیکن میں بہت معمولی یا آج کل کے نوجوانوں کی زبان میں ''پھر یری'' کتابیں (ناول وغیرہ) بھی پڑھ لیتی ہوں۔ اس لئے بھی کہ دیکھوں تو کہ یہ نوجوان مرد عورت کہتے کیا ہیں؟ مگر زیادہ تر ان میں یا تو حسن وعشق کے وہی گھسے پٹے افسانے ہوتے ہیں یا پھر آج کل کے نہ سمجھ آسکنے والے الجھے ہوئے خیالات۔ مگر جس طرح لوگ تھکے دماغ کو سکون دینے کے لئے جاسوسی قصے پڑھ لیتے ہیں، اسی

طرح یہ ہلکے پھلکے یا ''بے معنی'' ناول پڑھ لیتی ہوں، اگر چہ صبح تک کچھ یاد نہیں رہتا تھا کہ اس میں تھا کیا؟ جاسوسی ادب میں مجھے شرلاک ہومز پسند ہے اسے میں نے انگریزی اور اردو دونوں میں پڑھا ہے اور بہرام کی گرفتاری، چوروں کا کلب کو بھی شوق سے پڑھا کرتی تھی۔ مگر ویسے جاسوسی ناولوں کا شوق کسی طرح پیدا نہ کرسکی۔ عابد صاحب نے بہت چاہا۔ ''چھوٹے'' نے بہت کوشش کی دو چار کتابیں پڑھیں بھی مگر لطف نہ آیا۔ وقت ضائع ہوا وہ الگ۔

کتابیں پڑھنے کے ساتھ ساتھ مجھے کتابیں جمع کرنے کا بھی بہت شوق ہے۔ اس وقت میرے پاس کتابوں اور خاص خاص رسالوں کی مجلد جلدوں سے بھری ہوئی تقریباً دس الماریاں ہیں ان میں ناول بھی ہیں اور افسانے بھی، تنقید بھی ہے ادبی تاریخ بھی، علمی کتابیں بھی ہیں اور ادبی، مذہبی بھی ہیں اور سفرنامے بھی۔ شاعروں کے دیوان، مجموعے بھی اور بہت سے ترجمے بھی۔ ایک الماری انگریزی کتابوں سے بھری ہوئی موجود ہے اور سیکڑوں کتابیں اور رسالے لوگوں کو بانٹے جاتے رہتے ہیں۔ لائبریریوں میں بھی بھیجے جاتے رہے اور بہت سی میری اچھی اور پسندیدہ کتابیں (جن میں میری اور عابد صاحب کی ایسی تصانیف بھی ہیں جو اب نایاب ہیں) لوگوں نے لے لی ہیں اور واپس نہیں کی ہیں۔ ان کتابوں میں میری خریدی ہوئی بہت سی کتابوں کے علاوہ تحفے میں ملی کتابیں بھی ہیں جو ادیب و شاعر ازراہِ عنایت مجھے اور عابد صاحب کو دیتے رہے ہیں۔ عابد صاحب نے اپنی جرمن کتابوں کا ذخیرہ اور بہت سی دوسری کتابیں جامعہ لائبریری کو بہت عرصہ پہلے ہی دے دی تھیں۔ ادق، خالص علمی اور اونچے درجے کی مذہبی اور سیاسی کتابیں جو اردو اور انگلش دونوں میں ہوتیں ان کی الماری میں رہتی ہیں۔ مگر شعر و ادب کی مجھے دے دی جاتی تھیں۔ یہ تو نہیں کہہ سکتی کہ میں نے وہ سب ہی کتابیں پڑھی ہیں جو تحفے میں ملتی ہیں مگر ہاں جو میرے مذاق کی نہ بھی ہوں ان پر بھی ایک نظر ضرور ڈال لیتی ہوں۔ کتابیں خریدنے کے علاوہ رسالے وغیرہ بھی خریدے ہوئے ہیں اور اب تو بہت سے مفت بھی مل جاتے ہیں اور ان میں سے بیشتر کو پڑھتی ہوں ورنہ ایک نظر ڈال لیتی ہوں۔ سیدین صاحب اور بھابی جان کی کتابوں میں سے بھی میں نے بہت سی کتابیں پڑھی ہیں، بھابی جان کے پاس بہت پرانی کتابیں (قصے کہانیوں کے اور شاعروں کے دیوان) تھیں ان کو پڑھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ اردو زبان نے کہاں سے کہاں پہنچ کر دم لیا ہے۔ جامعہ لائبریری، دلی پبلک لائبریری، علی گڑھ یونیورسٹی کی لائبریری اور مکتبہ جامعہ سے لے کر بھی کتابیں پڑھی جاتی ہیں اور جیسا کہ میں نے کہا اگر نئی کتابیں نہ ملیں تو پرانی پڑھتی ہوں مگر جو لطف نئی کتاب خرید کر پڑھنے میں آتا ہے وہ اور ہی کچھ ہوتا ہے۔ اس لئے سخت سے سخت زمانے میں بھی کتابیں خریدتی رہی ہوں۔ اگر چہ آج کتابوں کے دام سونے کے دام کی طرح چڑھ رہے

ہیں اور کتابیں خریدنا آسان نہیں رہا پھر بھی۔ اگر اچھا ناول یا اچھی کتاب شائع ہو تو کیسے نہ خریدی جائے چاہے اس کی قیمت بیس تیس روپے ہو یا پچاس روپے۔ دوپہر کو دو گھنٹے اور رات کو گیارہ بارہ بجے تک یہ میرے وہ فرصت کے وقت ہوتے ہیں جن میں سکون سے پڑھ سکتی ہوں۔ کتنی ہی پسندیدہ اور دلچسپ کتاب ہو، میرے گھر کے کاموں، عام معمولات اور عبادت کے وقت میں نہیں پڑھی جاتی مجھے اتنا دل پر قابو ہے۔

گذشتہ دنوں مجھے ہارٹ اٹیک ہوا تو دو ماہ تک لکھنے پڑھنے یا کوئی بھی کام کرنے کی ممانعت تھی۔ جب تک زیادہ طبیعت خراب رہی مجبوری تھی لیکن جب طبیعت سنبھلنی شروع ہوئی تو معاملہ زیادہ کٹھن نظر آیا۔ اگر پڑھ نہ سکی لکھ نہ سکی تو پھر اب زندگی میں رہ ہی کیا گیا ہے۔ نماز تو لیٹے لیٹے پڑھ لیتی تھی پھر اپنی چھوٹی حمائل منگا کر لیٹے لیٹے ہی کلام پاک کی تلاوت اور کچھ دعائیں پڑھنا شروع کیں (نرسیں آکر دیکھتیں مگر مذہبی چیزوں کے پڑھنے پر بجائے اعتراض کے تحسین کا جذبہ ان کے چہروں پر ابھرتا تھا) اور پھر رسالے اور کتابیں بھی پڑھی جانے لگیں۔ اس پینتالیس سال میں کیسی کیسی سخت بیماریاں نہیں جھیلیں مگر کسی حال میں پڑھنا نہیں چھوٹا۔ اب یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ خدانخواستہ وہ منزل نہ آجائے جب زندگی کی واحد اور سب سے بڑی مسرت بھی چھن جائے۔ ڈاکٹر کہتے ''لائٹ ریڈنگ'' کرو۔ مشکل یہ کہ جاسوسی کا شوق نہیں اور اردو کی گھٹیا کتابیں اور ناول ذہن کو اور زیادہ پراگندہ اور پریشان کرتے ہیں۔

ہاں کتابیں میری زندگی ہیں، میری دوست، میری مشیر، میرے دکھ سکھ کی ساتھی، میری رہنما بھی ہیں۔ سالِ گذشتہ عابد صاحب کی بیماری کے زمانے میں جب راتیں جاگتے ہی گذرتی تھیں اور ناول افسانے میرا دکھ نہ بٹاتے تھے میں نے جامعہ لائبریری سے مولانا شبلی اور سید سلیمان ندوی کی لکھی سیرت النبیؐ کی پانچ زخیم جلدیں منگا کر پڑھ ڈالیں جس سے رہنمائی بھی ملی اور دل کا سکون بھی۔ لیکن وہ کتاب جس سے میری زندگی بنانے، میری سیرت ڈھالنے، میری شخصیت تشکیل کرنے، ہر مصیبت اور دکھ میں ڈھارس بندھانے، ہر خوشی اور راحت میں احساسِ شکر و احسان جگانے کا کام کیا ہے جس نے موت اور زیست کی کش مکش کو برداشت کرنے کی قوت بخشی ہے اور جان لیوا غموں اور جدائیوں میں مجھے پاگل ہونے سے بچایا ہے میری سب سے محترم اور محبوب کتاب۔ وہ کتابِ مقدس ہے جس پر ایمان لانا ہر مسلمان کا فرض ہے اور جو ہمیشہ میرے لئے حرزِ جاں رہی ہے، کلامِ پاک پڑھنا تو بچپن سے لیا تھا مگر بڑے ہونے کے بعد باترجمہ پڑھنا شروع کیا اور پھر جب مولانا آزاد کا ترجمان القرآن باتفسیر اور سوہ فاتحہ کی تفسیر تک پہنچ ہوئی تو زیادہ تر میں اس کو پڑھتی ہوں۔ تیس پینتیس سال سے میرا معمول ہے کہ میں باترجمہ قرآن پاک پڑھتی رہتی ہوں،

میں اس کے بغیر رہ نہیں سکتی۔ مولانا آزاد کے علاوہ میں نے مولانا فرمان علی، مولوی مقبول احمد، مولانا علی نقی اور مولانا مودودی اور مولوی نذیر احمد کے ترجمے بھی پڑھے ہیں مگر جو تسکین آزاد کے ترجمہ سے ہوئی ہے اور دل میں اٹھتے سوالوں کا جو جواب اس سے ملتا ہے کسی اور کے ہاں نہیں مل سکتا، میرے چچا خواجہ غلام حسنین کی لکھی اور بتائی بہت سی دیگر مذہبی کتب بھی میں نے پڑھی ہیں۔ اہلِ سنت کی بعض مذہبی کتابوں کا مطالعہ کیا ہے اور پھر تھوڑا بہت بائبل اور گیتا کی بھی، لیکن کلام پاک کی عظمت اور رہنمائی پر میرا ایمان ہے کہ دنیا کے آخری پیغمبر پر نازل کی ہوئی یہ آخری کتابِ مقدس ہر مقدس کتاب کی تعلیم اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ شاید اس زندگی کے بعد کی زندگی میں اس لافانی کتاب کا عشق میری نجات کا باعث بن جائے۔

میں مطالعہ کس طرح کرتا تھا

قائدملت بہادر یار جنگ

میری حالت ان نو جوانوں سے مختلف نہ تھی جو ابتدائی درسی کتابوں سے فارغ ہوکر عام مطالعے کی ابتدا کرتے ہیں۔ اس عمر میں جب کہ دماغی صلاحیتیں پوری طرح ابھری نہیں ہوتیں۔ اچھی اور بری کتاب کی تمیز بہت کم ہوتی ہے۔ قصص اور حکایات مبتدی کی توجہ کو جلد اپنی طرف پھیر لیتے ہیں میرے مطالعے کی ابتدا بھی حکایات وقصص سے ہوئی۔ مدرسے اور گھر پر اساتذہ کی گرفت سے چھوٹنے کے بعد جو اوقات فرصت کے مل جاتے وہ زیادہ تر کسی ناول یا افسانے کی نذر ہو جاتے کھیل کود سے مجھے کچھ زیادہ دلچسپی نہ تھی، سچی بات یہ ہے کہ میں کھیل کود کے قابل ہی نہیں بنایا گیا تھا قد کی بلندی نے اب اعضا میں تھوڑا تناسب پیدا کر دیا ہے ورنہ اپنی عنفوان شباب کی تصویر دیکھتا ہوں تو موجود متحارب اقوام کے بنائے ہوئے کسی آتش افروز بم کی تشبیہ زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔ چار قدم چلتا تو ہانپنے لگتا تھا اور کھیلنے کے بجائے خود دوسروں کے لیے تماشہ بن جاتا تھا۔ اس لیے میری زندگی کا عملی دستور ''اگر خواہی سلامت بر کنار است'' تھا نگاہیں کبھی کھیلتے ہوئے احباب پر پڑتی تھیں اور کبھی صفحات کتاب کے میدان میں دوڑنے لگتی تھیں اور جب پلے گراؤنڈ سے اٹھ کر گاڑی میں سوار ہوتا تو مدرسے سے گھر پہنچنے تک ناول کے ایک دو باب ضرور ختم ہو جاتے تھے۔ رفتہ رفتہ اس شوق نے جنون کی شکل اختیار کر لی۔ میوہ خوری کے نام سے جو کچھ ملتا وہ کتابوں کی نذر ہو جاتا تھا۔ اتالیق سمجھا کر تھک جاتے۔ مگر ناشتے کے دسترخوان پر بھی ہمارے ہاتھ سے کتاب نہ چھوٹتی۔ عمر جیسے جیسے بڑھتی گئی یہ جنون ویسے ویسے اعتدال پر آتا گیا۔ ایک طرف موضوع مطالعہ میں تبدیلی ہوئی اور افسانوں اور حکایات کے بجائے سوانح عمری اور سیرت کا مطالعہ شروع ہوا اور مطالعے کے اوقات معین اور متعین ہو گئے۔

بیسویں صدی کے ہر نو جوان کی طرح شاعری کا خبط شعور کی ابتداء کے ساتھ پیدا ہو چکا تھا اور شوق شعر گوئی نے شعراء کے تذکروں وار دواوین کی طرف متوجہ کر دیا۔ آج اپنے کلام کا پورا نمونہ سامنے آجاتا ہے تو بے اختیار ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگتی ہے لیکن آج سے پچیس برس قبل ہم اپنے آپ کو غالب اور ذوق سے کچھ زیادہ نہیں تو کم بھی نہ سمجھتے تھے۔ ہماری شعر گوئی اور مطالعہ

دواوین کا سب سے اچھا وقت صبح کے ابتدائی لمحات ہوا کرتے تھے۔ لیکن جیسے جیسے ادب نے ایک معیاری کیفیت پیدا کی تو خود بخود یہ احساس ہونے لگا کہ شاعر پیدا ہوتا ہے بنتا نہیں اور ہماری میز سے ہٹ کر دواوین الماریوں کی زینت بنتے گئے اور بانگ درا کے سوا میز پر کچھ باقی نہ رہا۔ آخری دور میں اگر کسی کلام نے اقبال کے کلام کا ساتھ دیا تو وہ مولائے روم کی مثنوی اور سعدی کی گلستان تھی۔

مطالعے کا طریقہ یہ تھا کہ ایک پنسل ہاتھ میں ایک نوٹ بک جیب میں ہوتی۔ میرے کتاب خانے میں مشکل سے کوئی کتاب ہوگی جس پر تاریخ ابتداء اور انتہائے مطالعہ درج نہ ہو۔ جو فقرے ادبی و تاریخی یا کسی اور حیثیت سے پسندیدہ ہوتے ان پر یا تو کتاب ہی میں نشان لگا دیا جاتا اور بار باران پر نظر ڈالی جاتی یا پھر نوٹ بک پر درج کر لیے جاتے اور ان کو یاد کرنے کی کوشش کی جاتی۔ والد مرحوم کی خدمت میں شمالی ہند کے اکثر اصحاب تشریف لایا کرتے تھے۔ ان کی گفتگو سن کر اپنی زبان کے نقائص کا احساس بڑھتا گیا۔ نتیجتاً سب سے زیادہ توجہ زبان کی درستی پر مرکوز رہی۔ کوئی اچھی ترکیب کوئی نئی تشبیہ، کوئی انوکھا استعارہ نظر سے گذرتا تو سب سے بڑی یہ فکر دامن گیر ہو جاتی تھی کہ اس کو جلد سے جلد صحیح طریقے پر اپنی گفتگو میں استعمال کر لیا جائے۔ ابتداً یہ تمنا صرف جذبہ خودنمائی کا نتیجہ تھی لیکن بعد میں یہ ثابت ہوا کہ حافظہ کسی بات کو اس وقت تک صحیح طور پر محفوظ نہیں رکھ سکتا جب تک ایک مرتبہ زبان یا قلم اس کو استعمال نہ کرے۔ آج اپنی زندگی میں اپنی اسی عادت کے نتائج کو پوری طرح کارفرما دیکھتا ہوں۔ اس عادت نے رفتہ رفتہ اتنی شدت اختیار کر لی تھی کہ میں اچھے ادیبوں کے کئی کئی فقرے بے تکلف اور بلا کسی کمی بیشی کے استعمال کرتا تھا اور یہی میری زبان کی درستی کا سب سے بڑا آلہ ثابت ہوا۔

جب ہم اپنے گھر میں جوان اور بڑے سمجھے جانے لگے تو ہماری بیٹھک کے کمرے الگ کر دیے گئے اور احباب کے ساتھ مل کر مطالعہ شروع کیا۔ یعنی یہ ہوتا کہ الہلال، ہمایوں، ہزار داستان، معارف، زمانہ یا کوئی اور معیاری ادبی و علمی رسالہ یا کوئی اچھی کتاب کسی ایک صاحب کے ہاتھ میں ہوتی اور اکثر میں ہی قاری کی خدمت انجام دیتا ایک فقرے پر ہم اکٹھے خیال آرائیاں کرتے، اختلاف، اتفاق ہوتا، بحث و تکرار ہوتی اور یہ بحث دماغ کے صفحے پر خیالات کے کبھی نہ مٹنے والے ارتسامات کا باعث بنتی۔ تجربے نے بتلایا کہ خاموش اور انفرادی مطالعے سے یہ مشترک مطالعہ زیادہ مفید اور کارآمد ہے۔ جب تراجم، تذکرہ، تاریخ سے آگے بڑھ کر ذوق مطالعہ نے ٹھوس اور سنجیدہ فلسفیانہ، سیاسی، اخلاقی اور مذہبی علوم کی طرف توجہ کی تو ایک اور طریقے نے مجھے بہت فائدہ پہنچایا۔ فلسفہ، علم کلام یا مذہب و سیاست کے کوئی مقامات اگر سمجھ میں نہ آتے تو میں ان کو اپنی چھوٹی نوٹ بک میں جو میری جیب کا مستقل سرمایہ بن گئی تھی نوٹ کر لیا کرتا اور جن بزرگوں کی نظر ان علوم پر میری نظر میں عمیق تھی ان سے ملاقات کے جلد سے جلد مواقع تلاش کرتا اور ان سے

اس اشکال کو حل کرنے کی کوشش کرتا۔ آج اپنے ان لمحات کو اپنی حیات گذشتہ کا سب سے قیمتی سرمایہ سمجھتا ہوں۔ لوگ صرف کتاب پڑھنے کو مطالعہ سمجھتے ہیں۔ میرے نزدیک کسی کے مطالعے کا مطالعہ ہی سب سے اچھا مطالعہ ہے۔

جب والد مرحوم کے انتقال کی وجہ سے اٹھاہ برس کی ابتدائی عمر میں میرے سر پر گھر کی ساری ذمہ داریوں کا بوجھ پڑ گیا اور مدرسے کی تعلیم ناقص حالت میں ختم ہوگئی تو میرے مطالعے کا سب سے بہترین طریقہ یہ تھا کہ جن لوگوں نے مختلف اصناف علم میں زیادہ سے زیادہ مطالعہ کیا ہے ان وک اپنے اطراف جمع کرلوں یا ان کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں اور ان کی عمر بھر کے مطالعے کا نچوڑ ان سے سنوں اور پھر کانوں کے ذریعے اس کا مطالعہ کروں اسی تمنا نے آوارہ گردی اور صحرا نوردی پر آمادہ کیا۔ مصر، شام، عراق، ترکیہ، ایران اور افغانستان کی مشکل سے کوئی ایسی اہم ہستی ہوگی جس سے شرف تقرب کی کوشش نہ کی ہو اور آج اپنے قلب اور دماغ کو ان کے مطالعے کے نتائج کا مرہون منت پاتا ہوں۔ لوگ اوراق کاغذ کے مجموعے کو الٹنے اور اس پر لکھی ہوئی سیاہ لکیروں کو پڑھنے کا نام مطالعہ سمجھتے ہیں۔ میرے پیش نظر ہمیشہ سے ایک اور کتاب رہی ہے جس کے صرف دو ورق ہیں لیکن جس میں سب کچھ ہے اور یہ کتاب صحیفۂ کائنات ہے۔ آسمان اور زمین کے دو اوراق کے درمیان مہر و ماہ، کواکب و سیارات، شفق، قوس وقزح، ابر و باد، کوہ وصحرا، سمندر اور ریگستان نے ایسے ایسے خطوط کھینچے ہیں جن میں فکر کرنے والی نگاہ اپنے لیے سب کچھ حاصل کرسکتی ہے۔ مجھے اس کتاب کی طرف آذر کے بیٹے نے متوجہ کر دیا جس نے ڈوبتے ہوئے سورج اور غروب ہوتے ہوئے چاند اور تاروں کو دیکھ کر لا احب الافلین اور فاطر السموات والارض کا پتہ چلایا تھا۔ میرے اس خیال کی تصدیق حرا کے بیٹھنے والے نے بھی کی۔ اور یہی دو مجھے اس مطالعے کی طرف متوجہ کرنے کا باعث ہوئے اور یہ پہچاننے میں زیادہ دیر نہ لگی کہ کس طرح دنیا میں اگنے والے درختوں کا ہر ورق معرفت کروگار کا ایک دفتر ہے۔

آہ دنیا بدل گئی۔ فرصت کے وہ رات دن اب خود میرے لیے افسانہ بن گئے۔ اب جی ڈھونڈتا ہے مگر پا نہیں سکتا۔ قوم وملت کی جو ذمہ داریاں ہم نے ابتداء اوقات فرصت صرف کرنے کے لیے اپنی مرضی سے قبول کی تھیں اپنی زندگی کے سارے لمحات پر مسلط ہوگئیں۔ کتاب سامنے آتی ہے تو تنگی وقت کا تصور آہ بن کر زبان سے نکلتا ہے۔ اخبار ہی پڑھنے کی فرصت نہیں کتاب کا ذکر کیا۔ اب کتاب پڑھنے کی سب سے اچھی جگہ ریل گاڑی کا ڈبہ ہے اور سفر کی وہ منزلیں جو طے ہونے سے رہ جائیں۔ جب سفر پر جاتا ہوں تو سامان کے صندوق کے ساتھ ان کتابوں کا ایک ڈبہ ہوتا ہے جن کو اس عرصے میں پڑھنے کے قابل سمجھ کر جمع کر لیتا ہوں اور غنیمت سمجھتا ہوں کہ زندگی کے گزرتے ہوئے لمحات کی یاد سفر کے ان اوقات میں تازہ ہو جاتی ہے۔

آپ ہمارے کتابی سلسلے کا حصہ بن سکتے
ہیں مزید اس طرح کی شان دار،
مفید اور نایاب کتب کے حصول کے لئے
ہمارے وٹس ایپ گروپ کو جوائن کریں

ایڈمن پینل

عبداللہ عتیق : 03478848884
سدرہ طاہر : 03340120123
حسنین سیالوی : 03056406067

میری پسندیدہ کتابیں

رحمان مذنب

یہ کثرت مطالعہ کا فیضان ہے کہ مشکل کتابیں آسانی سے پڑھ لیتا ہوں اور آسان کتابیں مجھ سے پڑھی نہیں جاتیں۔ علمی کتابیں میں بڑی آسانی سے پڑھ لیتا ہوں جیسے ناول ہوں۔

یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ دنیا کی سب سے پہلی کتاب کب معرض وجود میں آ گئی تاہم یہ ایک حقیقت ہے کہ وہ جذبہ جو آج ایک فن کار کو اظہار ذات کے لیے اپنے تخلیقی سرمائے کو کتاب کے پیکر میں ڈھالنے پر آمادہ کرتا ہے انسانی شعور کی پہلی صبح بھی موجود تھا۔ کاغذ، قلم، دوات، پیسٹ مشین بہت بعد کے تکلفات ہیں۔ آدمی نے اپنے تخلیقی نقوش اس وقت ابھارے جب وہ ابھی غاروں اور جنگلوں میں رہتا تھا۔ وہ جانے کب تک ارکی سنگین دیواروں اور پیڑوں کے تنوں کو اپنی تخلیقی کاوشوں سے سرفراز کرتا رہا۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا آدمی نئے نئے سہارے معلوم کرتا گیا۔ ہڈیوں، پتوں خشتی الواح اور پے پی رس سرکنڈوں سے تیار کیے ہوئے کاغذ سے بھی کام لیا گیا۔ قدیم انسان کا سب سے گراں قدر سرمایہ جو ہم تک پہنچا ہے۔ اور جس نے ہمارے لیے دانش کے نئے دروازے کھولے اور جہالت کے اندھیرے دور کیے پتھر کی سلوں، خشتی الواح اور پے پی رس میں محفوظ و منتقل کیا گی۔ اگر ہمیں نینوا کے اشور بنی پال کے شاہی کتب خانے کا سراغ نہ ملتا اور ہفت الواح ہم تک نہ پہنچتیں تو ہم وادئ فرات و دجلہ کی دانش سے محروم رہتے۔ دنیا کی کوئی دولت اس کا بدل ثابت نہ ہوسکتی۔ اسی طرح نیل دیس کی کتاب رفتگاں (The Book of the Dead) یا پتھر کی سلوں میں ڈھلے ہوئے مستون اہرامیہ و ریاضت نہ ہوتے تو ہم دینی فلسفے کے ارتقاء کی کہانی کبھی مکمل نہ کر سکتے۔ ہمیں حیات بعد از ممات، دوزخ، جنت، قیامت اور مرنے کے بعد کے نظام عدل کی نسبت پوری پوری معلومات حاصل نہ ہوتیں۔ خوش قسمتی سے قدیم انسان کی دانش کا ایک قلیل حصہ ہم نے پالیا ہے۔ ہڑپہ اور موئنجو ڈارو کے خزانوں کی فراست سے تا حال محروم ہیں۔

ماضی نے ہمیں جو کچھ دیا وہ اب کاغذی پیرہن قبول کر چکا ہے۔ آج بھی کتاب علم و دانش کی ترویج کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ آج کتاب شاہی قبرستان یا شاہی کتب خانے کی

زینت نہیں بلکہ مجھ ایسے کم وسیلہ کی بھی دسترس میں ہے۔ وادئ فرات و دجلہ، نیل دیس یونان اور ہندوستان کی حکمت پارینہ میرے گھر کی الماریوں میں اسیر ہے۔

میرے گھر میں کتاب مجھ سے پہلے موجود تھی۔ جب میں نے ہوش سنبھالا تو ''قال قال رسول اللہ'' کی صدا میرے کانوں میں پڑی۔ خازن، ترمذی، ہدایہ، فتاویٰ عالمگیری، ردالمختار فی شرح درالمختار اور اسی نوع کی بڑے سائز کی کتابیں جمع تھیں۔ عربی کی کتابیں بہت زیادہ تھیں، فارسی کی ان سے کم۔ چند اردو کی کتابیں بھی تھیں۔ والد مرحوم کے کتب خانے ہی میں سے شبلی نعمانی کی تالیف ''سکندریہ کا کتب خانہ'' دستیاب ہوئی، شبلی نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ اس انمول خزانے کو عیسائیوں نے غارت کیا تھا۔ عیسائی محققین آج اس حقیقت کے اعتراف میں کسی قسم کی جھجک محسوس نہیں کرتے۔ شبلی کی اس چھوٹی سی کتاب نے مجھے بڑی بڑی عملی کتابیں پڑھنے پر اکسایا۔ تاریخ میرا مضمون نہیں لیکن اپنے پسندیدہ موضوعات کے افہام کی خاطر مجھے رحطی (تاریخ شام) بریسٹڈ (تاریخ مصر) ایوران (تاریخ یونان) اسلم جیراج پوری (تاریخ اسلام) اور امیر علی (تاریخ اسلام) کو بنظر غائر پڑھنا پڑا۔ پروفیسر جے۔ بی۔ بری کی ''اے ہسٹری آو گریس'' اگر چہ مختصر سی کتاب ہے (۸×۲/۱-۵ انچ سائز میں باریک ٹائپ کے ۸۸۶ صفحات پر مشتمل ہے) تاہم صحت اور افادیت کے پیش نظر اسے بطور خاص پڑھا۔ اسی سلسلے میں ہیرودوتس کا سفرنامہ بھی پڑھا۔ ایچ۔ جی۔ ویلز کی تاریخ عالم بھی پڑھی۔

میں ادب کی دنیا میں اوّل اوّل ڈراما نویس کی حیثیت سے داخل ہوا۔ ۱۹۳۹ء میں ماہنامہ ''ہمایوں'' میں میرا پہلا ڈراما ''سپاہی'' چھپا جو میں نے جوشوا فضل الدین کے ایک ڈرامے سے اخذ کیا تھا۔ اس کے بعد سے اب تک ڈرامہ نگاری کا سلسلہ جاری ہے۔ ڈرامہ نگاری کے شوق نے مجھے ڈرامے پڑھنے کی ترغیب دی۔ میں نے محض تفریح کے لیے بہت کم کتابیں پڑھی ہیں۔ میں علم وفن کے حصول کی غرض سے کتابیں پڑھتا ہوں۔ سستا اور سنسنی خیز فکشن میرے بس کا روگ نہیں۔ پھر اتنی فرصت بھی نہیں کہ پروگرام کو نظر انداز کر کے ادھر ادھر کی کتابیں پڑھوں۔ میں کتاب علمی افادیت کی خاطر پڑھتا ہوں۔ اوّلین فرصت میں وہ کتابیں پڑھتا ہوں جو مجھے تالیف وتصنیف کے کام میں مدد دیں۔ ویسے تو میں نے تعمیرات پر سر گنگا رام کی لکھی ہوئی پانسو چھ سو صفحے کی ایک گائیڈ بک بھی لفظ بہ لفظ پڑھ ڈالی کیوں کہ یہ کتاب اردو میں اور اس میں سول انجینئرنگ کی اصطلاحات کا ذخیرہ موجود تھا۔ میں یہ بھی سمجھتا ہوں کہ حالات سازگار رہوں۔ فرصت میسر آئے تو آدمی اکتساب علم کے واسطے زیادہ سے زیادہ کتابیں پڑھے اور موضوع کے معاملے میں کم از کم پابندی اختیار کرے۔ مجھے اصطلاحات جمع کرنے کا شوق ہے۔ سید سلیمان ندوی کی عربی

اصطلاحات کی لغت بھی میں نے مذکورہ بالا گائیڈ بک ہی کی طرح انہماک سے پڑھی۔ یہی حال فارسی اصطلاحات کی جدید لغت نیز نفسیات، جغرافیہ سیاسیات اور معاشیات کی لغت کا ہے۔ اصطلاحات کی لغت اور عام لغت کا مطالعہ بھی ازبس ضروری ہے۔ صحیح زبان لکھنے کے لیے جہاں ادب کا مطالعہ ضروری ہے وہاں عام لغت کا مطالعہ بھی ضروری ہے۔ لغت آپ کو صرف معانی ہی نہیں بتاتی بلکہ صحیح تلفظ بھی بتاتی ہے۔ لغت سے بے اعتنائی برتنے والے عفی عنہ کو عفی عنہ من وعن منوعن، معنون کو معتون، جدوجہد کو جدوجہد، اقدام کو اقدام، موقف کو موقف غلط کو غلط اور حصار کو حصار پڑھتے ہیں۔ ادبی محافل، ریڈیو اور ٹیلی ویژن میں شب وروز غلط تلفظ کا مظاہرہ کیا جاتا ہے اور ایک زمانے میں قاموس، منجد اور غیاث اللغات (مع چارغ اللغات) میرے پاس تھی۔ ان سے کام نہ چلتا تو لائبریری چلا جاتا۔ اصولاً میں لائبریری میں جانے سے گریز کرتا ہوں۔ میرا یہ اصول ہے کہ کام کی کتاب خرید لی جائے۔ یہ ایک دلخراش حقیقت ہے کہ لاہور میں ایک بھی ایسی لائبریری نہیں جو بدرجۂ اتم میری ضرورت پوری کر سکے۔ مجھے اپنے ایک مقالے کی تالیف کے ضمن میں اے سی کک کی کتاب 'زیوس' مطلوب تھی لیکن پنجاب پبلک لائبریری میں نہ ملی۔ آخر اس اہم کتاب کا مطالعہ کیے بغیر ہی مجھے اپنا مقالہ ''یونان کا عہد جاہلیت اور دیومالا کا ارتقاء'' لکھنا پڑا۔ سنسکرت ڈرامے پر مقالہ لکھنے کے لیے رگ وید درکار تھا۔ پنجاب پبلک لائبریری میں یہ بھی نہ ملا۔ رو پرٹ فرتو کس کی ''امرتسر میں قتل عام'' بھی ندارد ریہ ''مشتے نمونہ از خروارے'' ہے ورنہ نہ جانے یہاں کون کون سی کتاب مفقود ہے۔ میں لائبریری سے بہت کم رجوع کرنے کا قائل ہوں لیکن اب تو لائبریری کی یہ اندوہناک حالت دیکھ کر اس سے قریب قریب بیزار ہوں۔ ویسے عملی کام کرنے والے کو اپنی لائبریری بنانی ہی پڑتی ہے اور پھر میرے لیے تو خانگی لائبریری اور بھی ضوری ہے کیوں کہ میں مطالعے کے وقت کتاب کو بری طرح مسخ کرتا جاتا ہوں۔ اردو کی کتاب ہو تو ہر اہم مقام پر سطر کے اوپر خط کھینچتا ہوں اور انگریزی کی ہو تو سطر کے نیچے، اوپر تلے خط کھینچنے کا یہ طریقہ ہمارے استادوں نے سکھایا تھا۔ اب شاید استاد یہ سکھاتے ہیں کہ کتاب انگریزی کی ہو یا اردو کی خط سطر کے نیچے ہی کھینچا جائے۔ پھر میں حاشیے پر ہر اہم بات نوٹ کرتا جاتا ہوں۔ چلیپائی حوالے Cross Reference بھی دیتا ہوں۔ اس کے لیے میں کی علامت ڈال دیتا ہوں اور اس کے ساتھ کتاب کا صفحہ لکھ دیتا ہوں۔ اگر کسی دوسری کتاب سے حوالہ ملانا ہو تو اس کا ذکر بھی کر دیتا ہوں۔ مخفف ہے ''Link it with'' کا کچھ علامتیں بھی میں نے وضع کی ہیں۔ کتاب میں اپنی معلومات یا آراء بھی درج کر دیتا ہوں۔ کتاب کے شروع میں چند خالی صفحے چسپاں کر لیتا ہوں ان پر خلاصہ لکھتا ہوں۔

یہ چھوٹی چھوٹی باتیں میں نے اس لیے عرض کی ہیں کہ میں کتاب سے پورا پورا فائدہ اٹھاتا ہوں۔ مجھے اپنی نشان زدہ کتاب بے حد عزیز ہوتی ہے اگر خدانخواستہ یہ گم ہو جائے تو بے حد قلق ہوتا ہے۔ پیسہ گم ہو جائے تو آدمی اسے بھول جاتا ہے لیکن پڑھی ہوئی کتاب گم ہو جائے تو اس کا صدمہ ہمیشہ رہتا ہے۔ایک تو علمی کتابیں ملتی ہی مشکل سے ہیں اور پھر مل گم ہو جائیں تو تلافی کی کوئی صورت نہیں۔

میں صرف ڈراما لکھتا ہی نہیں بلکہ ڈراما پڑھنے کا بھی شوق ہے۔ مجھے شیکسپیئر کے چند ڈرامے خصوصیت سے پسند ہیں لیکن کنگ لئرز، پسند نہیں۔ شیکسپیئر کے ڈراموں کے ڈراموں میں نیک و بد کا جو ہولناک تصادم ہوتا ہے۔اس سے بڑا ڈراما بنتا ہے۔ وہ شیطانی کرداروں کو اس خوبی سے ابھارتا ہے کہ وہ نہ ہوں تو بڑا ڈرامہ پیدا ہی نہ ہو۔ یہ شیطانی کردار کلیدی درجہ رکھتے ہیں۔ شائیلاک کے بغیر ''مرچنٹ اودوینس''، لیڈی میکبتھ کے بغیر ''میکبتھ ، ای اگو کے بغیر ''اوتھیلو'' اور کے شیس کے بغیر ''جولیس سیزر'' معرض وجود ہی میں نہ آسکتے۔ شیکسپیئر کی بڑائی اس میں ہے کہ اس نے نہایت انہاک سے خیر وشر کا مطالعہ کیا ہے اور غالباً شر کا مطالعہ کچھ زیادہ ہی کیا ہے۔ فنکار جب تک پوری طرح نیک و بد کا ذاتی تجربہ نہ رکھتا ہو، اچھی بری زندگی بسر نہ کرے، نیکی اور بدی کا پورا پورا مزا نہ چکھے، فنکار کے طور پر نامکمل رہتا ہے۔ اس کی تخلیقات میں جلا پیدا ہی نہیں ہوتی۔ پھر شیطان اور جہنم کا ذکر کسی دوسرے ذکر سے کم دلچسپ نہیں۔ اقبال کا شیطان ہو یا دانتے کی جہنم، تخلیقی پہلو سے دلچسپ ترین خیال اور تجربے کی نشان دہی کرتا ہے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ شیکسپیئر نے نئی راہیں نکالیں۔ میرے خیال میں اس نے راہیں مسدود کیں۔ ایک کامل فنکار آنے والی نسلوں کے لیے دشواریاں کھڑی کرتا ہے۔ وہ اپنے مخصوص رنگ میں کمال حاصل کرتا ہے اور اپنی انفرادیت کو اچھوت بنا دیتا ہے۔ دوسرے فنکار اس راستے پر چلتے ہیں تو چند گام کے بعد رہ جاتے ہیں۔ غالب کے بعد غالب کہاں؟ داغ اور میر کا انداز کسے نصیب ہے؟ اقبال کے بعد ایک دنیا نے اس کی پیروی کی لیکن کوئی اس کی گرد کو نہ پہنچا۔ وقت آتا ہے، ایک مخصوص ماحول کو تو جنم دیتا ہے۔ ایسے میں ایک فنکار پیدا ہوتا ہے۔ اس جیسا دوسرا نہیں ہوتا کیوں کہ وقت گزر چکا ہوتا ہے اور ماحول بدل چکا ہوتا ہے: امراؤ جان ادا (ناول رسوا) ایک خاص وقت اور ماحول کی پیداوار ہے۔ چترلیکھا (ناطول فران کی تاسیس سے ماخوذ اور آنکھوں کا نشہ (حشر) کا بھی یہی حال ہے۔ انھیں وقت اور ماحول کی قید سے آزاد نہیں کیا جا سکتا۔ جین کوکتو کی Internal Machine اور سارتر کی Flies پڑھیے۔ دونوں کا تعلق قدیم یونان سے اوّل الذکر ایڈی پسن کے بچپن سے متعلق ہے اور ثانی الذکر اوریسٹر ے۔ انھیں مخصوص وقت اور ماحول میں

اسیر کیا گیا لیکن ان کا لب ولہجہ رنگ اور رنگ روپ سونوکلیز (۴۰۶۔۴۹۶ ق م) اور یوری پیڈیز اور ایسکی لس (۴۰۶۔۴۸۰ ق م) سے مختلف ہے۔ انیس کے مراثی بہت پیارے ہیں۔ ان کا ہیرو بے مثال ہے، المیہ بے نظیر ہے لیکن وہ وقت اور ماحول سے روگردانی کر گئے، انھوں نے اپنے ہیرو کو لکھنؤ کے ماحول میں پیش کیا چنانچہ اس پر کلچر کا Impact نہ آیا۔ کون جانے کب کوئی عظیم فنکار پیدا ہو اور وہ المیہ کربلا تخلیق کرے، ایک نیا رزمیہ معرض وجود میں لائے۔ ایلیڈ اودیسے، رامائن، مہابھارت اور شاہنامہ میں یہ خصوصیت موجود ہے کہ یہ وقت اور ماحول سے بے تعلق نہیں۔ اسی لیے پڑھتے وقت اجنبیت محسوس نہیں ہوتی۔

میں نے ابھی ابھی ہومر کا نام لیا تھا۔ اسی کے ساتھ مجھے سونوکلیز کا نام بھی لینا ہے۔ سونوکلیز دنیا کے چار عظیم المیہ نگاروں میں سے ایک ہے۔ باقی تین ایسکی لس، یوری پیڈیز اور شیکسپیئر ہیں۔ ہومر اور سوفوکلیز میں چار پانچ صدی یا شاید اس سے بھی زیادہ فرق ہے۔ یہ فن کار یونان کے اصل اور قدیم باشندوں کے مذہب کو مٹانے پر مامور تھے۔ قدیم یونان میں زمین پرستی (دھرتی دھرم) کا چلن تھا۔ ہومر اور سوفوکلیز فلک پرست تھے چنانچہ انھوں نے اپنی تخلیقات میں اپنے تعصّبات داخل کیے۔ اس سے وقت اور ماحول ایک حد تک بدلے۔ سوفوکلیز کی تمثیل ای وی پس کو لیجیے۔ انجان ایڈیپس اپنی ماں (بیوہ جیکوستا) سے بیاہ کرتا ہے۔ قبل ازیں وہ لاعلمی میں باپ کو ہلاک کر چکا ہے۔ یوں وہ دو کبیرہ گناہوں کا مرتکب ہوتا ہے۔ رب الشّمس اپالو ناراض ہوتا ہے اور تھی بیز پر طاعون نازل کرتا ہے۔ اپالو مداخلت بیجا وقت اور ماحول پر اثر انداز ہوئی۔ ایڈی پس زمین پرست ہے۔ اسے یا اس کی قوم کو فلک پرستی سے کوئی تعلق نہیں۔ اس کے زمانے میں فلک پرستی رائج ہی نہیں تھی۔ چونکہ سوفوکلیز فلک پرست تھا۔ اس لیے اس نے اپنے ملک کی تبلیغ کی خاطر اس کا بیجا استعمال کیا۔

یہاں میں نے ایسکی لس اور یوری پیڈیز کے ڈراموں کا حوالہ نہیں دیا جو بے مثال ہیں اور مطالعے کے لائق۔ یہ دونوں عظیم فنکار سوفوکلیز سے مختلف ہیں۔ ان پر یونان کے ابھرتے ہوئے فلسفیوں کے افکار کا اثر تھا۔ یہ باغی شاعر تھے اور فلک پرستی کی مخالفت کرتے تھے۔ اس سلسلے میں انھوں نے عوام کا غضب مول لیا اور بہ صد مشکل ان کے ہاتھوں ہلاک ہوتے ہوتے بچے۔ یونانی ڈرامے کا نکھار اس وقت تک طلوع نہیں ہوتا جب تک ارسطو کو پڑھا جائے۔ ارسطو خود یونانی تھا۔ اس نے یونانی تھیٹر بہ نفس نفیس دیکھا۔ یونان کا وہ تمام ادب اس کے مطالعے میں آیا جس کا بمشکل دسواں حصہ ہم تک پہنچا ہے۔ یونانی ڈرامے کو سمجھنے کے لیے میں نے بوطیقا پڑھی لیکن اس کا پہلا جملہ ہی میری سمجھ میں نہ آیا۔ ارسطو کہتا ہے کہ ڈراما ڈتھی ریمب سے نکلا لیکن یہ ڈتھی ریمب کیا

ہے؟ دتھی ریمب کو سمجھنے کے لیے فریزر سے رجوع کیا۔ فریزر خود ایک سمندر تھا۔ گولڈن بو (Golden Bough) پڑھنے کے بعد معلوم ہوا کہ جادو کا مطالعہ وقت چاہتا ہے چنانچہ فریزر کو پڑھنے کے بعد میں ویبسٹر، پروفیسر کابرٹ مرے، مس جین ایلین ہیری سن، ایڈتھ ہملٹن، بریسٹڈ اور ہک کی کتابیں پڑھیں۔ یونان، مصر اور میسوپوٹیمیا کی دیومالا نیز جادو کے بارے میں ان کی کتابیں بے حد افادیت اور اہمیت رکھتی ہیں۔ اگر محض کہانیاں پڑھنی ہوں اور علمی اعتبار سے دیومالا کا مطالعہ مقصود نہ ہو تو بلفنچ اور اروِن گوش The Dance of Shiva سے رجوع کرنا چاہیے۔ ایڈتھ ہملٹن نے بھی کہانیاں لکھی ہیں۔ مس جین ایلین ہیری سن کی ایک کتاب بے حد اہم ہے۔ یہ یونان کی دیومالا کے ارتقاء سے تعلق رکھتی ہے، اس کا نام ہے۔ Prolegomena to the Study of Greek Religion اس کے مطالعے سے زمین پرستی اور فلک پرستی کی طویل کشمکش، ہومر اور اس بعد کے یونانی مصنفوں (خصوصاً ڈراما نگاروں، کی عصبیت اور دروغ گوئی نیز دونوں مسلکوں کے اختلاف اور اختلاط کی گتھی سلجھ جاتی ہے۔ یہ کتاب اہم ترین کتابوں میں سے ہے۔ میں نے اپنے مقالے ''یونان کا عہد جاہلیت اور دیومالا کا ارتقاء'' (مطبوعہ سہ ماہی اقبال، لاہور اکتوبر ۱۹۶۴ء، اپریل ۱۹۶۵ء) کی تسوید میں اس گرانقدر تصنیف سے پوری طرح استفادہ کیا۔ اس کتاب کی عظمت کا اندازہ اس بات سے لگ سکتا ہے کہ پروفیسر گلبرٹ مرے ایسی شخصیت نے اپنی کتاب Five Stages of Greek Religion کے پہلے باب کا تقریباً سارا مواد مس ہیریسن سے لیا ہے۔

کتابوں کے مطالعے سے جہاں مجھے روشنی ملی، جہالت کے اندھیروں سے نجات ہوئی اور توہمات کی غلامی سے آزاد ہوا۔ وہاں میرا کام بھی بڑھ گیا۔ پہلے میں صرف ڈرامے پڑھتا اور ڈرامے لکھتا۔ اب دیومالا، جادو اور ڈرامے کی تاریخ وتنقید کے مطالعے سے مجھے ان موضوعات پر مقالے لکھنے پڑے۔ بسا اوقات ایک مقالے کی تسوید پر بلا تکلف ایک ایک سال لگ گیا۔ ایک بار خاصی الجھن پیدا ہوئی۔ میں نے یونان کے تھیٹر پر ایک طویل مقالہ لکھا۔ سہ ماہی اقبال، لاہور (اکتوبر ۱۹۶۰ء) میں شائع ہوا۔ جب میں نے اسے لکھنا شروع کیا تو بیشتر مواد پروفیسر نکل کی کتاب (اولڈ ڈراما) شیلڈن چینے کی کتاب ''دی تھیٹر'' اور کارل مانت زیوس کی کتاب ''دی ورلڈ تھیٹر'' (تین جلد) سے لیا۔ اسی سلسلے میں (The Stage is Set) سے بھی استفادہ کیا۔ تھیٹر کے فن اور فکری انداز پر یہ نہایت ہی اہم تصنیف ہے۔ اس میں اداکاری کی نفسیات پر طویل بحث کی گئی ہے۔ اس میں کتابیات نئے طریقے سے مندرج ہیں۔ کتابیات کو تنقیدی مقالے کی شکل میں پیش کیا ہے اور حوالے کی کتابوں کے حسن وقبح پر روشنی ڈالی ہے۔ اسی کارل مانت زیوس کے بارے

میں لکھا تھا کہ تھیٹر کی تاریخ کے مطالعے کے ضمن میں اگرچہ اس کی تالیف ناگزیر ہے کہ اس نے تمام معلومات فراہم کر رکھی ہیں تاہم مواد کے انتخاب اور استعمال میں احتیاط برتنے کی ضرورت ہے۔ کارل مانت زیوس کہیں کہیں غیر محتاط ہو جاتا ہے۔ یہ بات اس وقت معلوم ہوئی جب میں مسودہ تیار کر چکا تھا اور میاں محمد شریف مرحوم (مدیر: اقبال) کی خدمت میں بھیجنے کو تھا۔ ایک دم مقالہ روک لیا اور جہاں جہاں کارل مانت زیوس سے مواد لیا تھا اس کی چھان پھٹک کی اور تصحیح کے بعد میاں صاحب کو مسودہ بھیجا۔ تحقیق و تفتیش کا کام جس قدر دشوار ہے، اسی قدر اس کی ناقدری ہوتی ہے۔

میرے مذاق کی پختہ کاری میں جہاں کتابوں سے فائدہ پہنچا وہاں رسائل و جرائد اور روزناموں کا بھی حصہ ہے۔ معارف (اعظم گڑھ)، زمانہ (کانپور)، نگار (لکھنؤ)، جامعہ (دہلی)، ساقی (دہلی)، نیرنگ خیال (لاہور)، ہمایوں (لاہور)، مخزن (لاہور)، عالمگیر (لاہور)، زمیندار (مولانا ظفر علی خان)، انقلاب (مہر و سالک)۔ ان کے علاوہ میں مستانہ جوگی، مصور و کیلی (بمبئی)، پریت لڑی، ریاست اور چند فلمی پرچے بھی شوق سے پڑھتا تھا اور فلمی مضمون بھی لکھتا تھا۔

یہ کثرت مطالعہ کا فیضان ہے کہ مشکل کتابیں آسانی سے پڑھ لیتا ہوں اور آسان کتابیں مجھ سے پڑھی نہیں جاتیں۔ علمی کتابیں میں اسی آسانی سے پڑھتا ہوں جس آسانی سے دربار اکبری یا ڈپٹی نذیر احمد کے ناول پڑھ لیتا ہوں۔

مطالعے کے دور طفلی میں نے صرف شبلی نعمانی کی کتاب اسکندریہ کا کتب خانہ کا نام لیا ہے۔ ویسے اس سے بھی پہلے میں نے آزاد کی ''اردو کی پہلی کتاب'' پڑھی۔ یہ درسی کتاب تھی۔ لیکن میرے زمانے میں مدرسوں میں رائج نہیں تھی۔ مجھے یہ کتاب نہایت عجیب و غریب لگتی۔ نہ کبھی گلیوں بازاروں میں پنڈت جی کی پہلی نظر آئی اور نہ مولوی صاحب کا گھوڑا دکھائی دیا۔ لاہور میں اس زمانے میں ٹم ٹم اور تانگے کا رواج تھا۔ پشاوری تانگہ بھی بعد میں نازل ہوا ہے۔ پنڈت بھی رام رام کرتے راوی کے اشنان کو جاتے اور پیدل آتے۔ مر جاتے تو ان کی ارتھی نکلتی۔ ان کی لاش لٹانے کی بجائے بٹھا کر دریا میں لے جاتے۔ ہمارے مدرس ایشور خال خال ہی ہوتے۔ کلین شیو کرتے۔ پیدل آمد و رفت کرتے نہ تو گھوڑے پر سوار ہوتے اور نہ راستے میں شاگردان کا دم چھلہ بنتے کہ استاد صاحب گھوڑے پر سوار ہیں، ساتھ ساتھ شاگرد ہیں او وہ سبق لیتے جا رہے ہیں۔ درس رواں کا یہ سلسلہ نہ معلوم کس زمانے کی انمول شے ہے۔ بہرحال ''اردو کی پہلی کتاب'' آج بھی ایک جاندار تخلیق ہے۔ جب پطرس نے اس کے چند اسباق کی پیروڈی کی۔ تو میں نے دوبارہ کتاب پڑھی۔ لطف دوبالا ہوا۔ اور پطرس کے وسیلے ہی سگھڑ بیوی کی یہ ادا بہت لبھائی کہ اس نے

برتن بڑے قرینے سے صندوق میں رکھے ہیں تا کہ ڈھکن نہ کھل سکے۔اگر چہ یہ کتاب میں سینت سینت کر رکھتا رہا لیکن کتاب چوروں سے خدا بچائے۔ بڑی صفائی سے کتاب چراتے ہیں۔ چرائی جانے والی کتابوں میں اس کا پہلا نمبر ہے۔اب یہ کتاب دوبارہ چھپ گئی ہے۔دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا لیکن مجھے تو اپنی ہی گم شدہ کتاب یاد آ رہی ہے۔جوجلی قلم میں لکھی تھی۔اس میں دوم یا شاید سوم درجے کے مصور کی کھینچی ہوئی تصویریں تھیں لیکن جلی قلم اور بھونڈی تصویریں میرے بچپن سے تعلق خاطر رکھتی تھیں۔ان سے کھی میں نے آسودگی پائی تھی۔اس سے انھیں بھولنا اپنے ماضی کو بھولنا ہے، پلٹ کر نہ آنے والے زریں عہد اوّل کو بھولنا ہے۔

اسی زمانے میں والد مرحوم (مفتی عبدالستار) نے مجھے لطائف کی ایک کتاب لا دی جسے شاہد احمد دہلوی نے مرتب کیا تھا۔ہنسی کے گول گپے میں خود لے آیا۔اور مزاح پسندی کی نوبت شوکت تھانوی کی ''سودیشی ریل'' تک پہنچی۔ بچپن میں ''سودیشی ریل'' پڑھی تھی، مدت بیت گئی لیکن آج بھی اس کا نقش ذہن پر مرتسم ہے۔یہی حال ''مجھے دوستوں سے بچاؤ'' کا ہے۔آج تک اس کی کہانی یاد دل میں موجود ہے۔سجاد حیدر یلدرم کے تمام افسانے پڑھے لیکن اثر انگیز اور دیرپا نہیں ثابت ہوا۔ میں سجاد حیدر یلدرم کی خیال افرینی کا عاشق ہوں۔ان کے افسانے بڑے پیارے اور دلکش ہیں لیکن ''مجھے دوستوں سے بچاؤ'' کی حقیقت آفرینی اور ہی لطف دیتی ہے۔ عجیب بے ساختہ پن ہے۔مزاح کی بھینی بھینی سی خوشبو آتی ہے اور اس کے مقابل عظیم بیگ چغتائی یا شفیق الرحمن کی تیز تیکھی مہک ناپائیدار لگتی ہے۔عظیم بیگ چغتائی کا ''چپ ٹرڈ کٹر'' (غالباً یہی عنوان تھا ان کے ایک مزاح پارے کا) مزے کی چیز ہے لیکن اس کا اثر عارضی تھا۔شفیق الرحمان بے حد مقبول ہیں۔ان کے مزاح پارے شوق سے پڑھے جاتے ہیں لیکن مجھے ان کی ایک سنجیدہ کہانی پسند ہے۔ یہ میں نے ۱۹ء میں پڑھی تھی۔ ''سناٹا'' اتنی عمدہ کہانی ہے کہ میں اسے آج تک نہیں بھولا۔اس میں ذرا مزاح نہیں۔سیدھی سادی اثر انگیز کہانی ہے۔

کہانیاں تو بے شمار لکھی گئیں لیکن عظیم کہانیاں بہت تھوڑی تعداد میں ملیں گی۔کہانیوں کے باقاعدہ مطالعے سے قبل مجھے رتن ناتھ سرشار کا شاہکار ''فسانۂ آزاد'' پڑھنے کا موقع ملا۔اس کے شیے میں ہر شام پنجاب پبلک لائبریری میں جاتا۔خوشی کی بات تھی کہ مجھے یہ کتاب بآسانی مل جاتی۔کوئی دوسرا اسے نہ نکلواتا۔کم از کم ان دنوں تو یہی کچھ ہوا جن دنوں میں اس کا مطالعہ کرتا رہا۔ مجھے خوب یاد ہے کہ جب میں اسے پڑھتا تو بار بار میری ہنسی نکل جاتی اور میں اردگرد بیٹھے ہوئے حضرات کے خوف سے بار بار منہ پر رومال دھر لیتا۔ پھر جب ہنسی کا دورہ طوالت اختیار کرتا تو میں معمول پر آنے تک مطالعہ ملتوی کر دیتا۔میرے نزدیک زبان سیکھنے کے لیے رتن ناتھ سرشار کا

مطالعہ ازبس ضروری ہے۔ اس کے یہاں قدم قدم پر محاورے ملتے ہیں۔ چٹخارے والی زبان ملتی ہے۔

انھی ایام اسی لائبریری میں میں نے سدرشن کے افسانے پڑھے۔ غالباً یہ دونوں مجموعوں پر مشتمل تھے۔ سدرشن کے بعد پریم پچیسی اور پریم چالیسی کا مطالعہ کیا۔ اردو کے رسائل بڑے اہتمام اور احترام سے منشی پریم چند کا عہد آفریں افسانہ ''کفن'' چھپا تھا۔ فنی اعتبار سے یہ شاہکار اس قدر کامل تھا کہ آج بھی بڑے بڑے افسانے اس سے آگے نہیں نکل پائے۔ گھیسو ایک لافانی کردار ہے۔ ''امراؤ جان ادا'' ایک ایسا ناول ہے جسے نہ پڑھنا کفر ہے۔ لکھنؤ کے زوال پذیر معاشرے کی یہ رنڈی نفاست پسندوں کے لیے بڑی لکشی رکھتی ہے۔ دراصل یہ بازار کی نہیں بلکہ انجمن کی ہے۔ اس سے صرف محفل طرازی کا کام لیا جاسکتا ہے۔ افسوس ایسی بامذاق ڈیرہ دارنیاں اب تمام ہورہی ہیں اور ان کی جگہ جذباتی تسکین کا سامان فراہم کرنے والی لے رہی ہیں۔ ڈیروں کو گھن لگ رہا ہے اب ڈیرے اور چکلے میں بہت تھوڑا سا فاصلہ رہ گیا ہے۔ حکومت نے ٹیکیائی کو ختم کردیا بہت اچھا کیا لیکن ڈیرہ دارنی میں ٹیکسائی سمارہی ہے۔ ایسے میں ''امراؤ جان ادا'' ڈھونڈنے سے نہیں ملتی۔

ہارڈی کے ناول بے حد اثر انگیز ہوتے ہیں۔ ٹیس اور میسٹر اودکیسٹر برج پڑھنے کے بعد بھولتے نہیں کیوں کہ ان کے کیریکٹر اپنی انفرادیت کے باعث قاری کی یادداشت سے دائماً الجھے رہتے ہیں۔

''گلیور کا سفرنامہ'' بھی مزے کی چیز ہے۔ سونے سے پہلے پڑھنا چاہیے۔ اگر یہ بھی معلوم ہوجائے کہ سوفٹ اس سفرنامے میں جو کردار اور واقعات پیش کرتا ہے وہ س کے کن کن دوستوں، حریفوں اور درباری سرگرمیوں کا عکس جمیل ہیں تو لطف دوبالا ہوجاتا ہے۔ مثال کے طور پر اس واقعے کو لیجیے! بونوں کے بادشاہ سلامت ایک رسن گیر کا تماشا دیکھتے ہیں۔ نٹ صاحب رسی پر ناچتے ناچتے نیچے گر پڑتے ہیں۔ اسی آن ملکہ صاحبہ نیچے ایک تکیہ دھر دیتی ہیں۔ رسن گیر بچ جاتا ورنہ بصورت دیگر ان کی گردن ٹوٹ جاتی۔ یہ سوفٹ کے زمانے کے ایک واقعے کی پیروڈی ہے۔ ان کے زمانے میں ایک درباری بادشاہ کے عتاب کا شکار ہوا۔ اس ملکہ سلامت نے اس کی مدد کی او وہ بچ رہا۔ اسی طرح بونے یا بے حد طویل القامت انسان محض علامتی اہمیت رکھتے ہیں۔ دراصل سوفٹ اپنے عہد پر طنز کرتا ہے۔ چونکہ وہ براہ راست اپنے ہم عصروں کو رسوا نہیں کرسکتا اس لیے اس نے عجیب وغریب سفرنامے کی آڑ میں اپنا مطلب پورا کیا۔

آج کل میں اپنے کتب خانے میں سے چند کتابیں چھانٹ کر علیحدہ کر رہا ہوں۔

مقصد یہ ہے کہ جب طبیعت اداس ہو تو ان میں سے کوئی کتاب لے کر پڑھ لوں۔ ان میں قرآن سرفہرست ہے۔ مجھے عربی نہیں آتی تاہم ترجمے کی مدد سے سمجھ لیتا ہوں۔ تین نسخے انگریزی ترجمے کے ہیں۔ ایک میں اعلیٰ درجے کے حواشی بھی ہیں۔ چوتھا نسخہ اردو ترجمے والا ہے۔ اگرچہ لکھائی چھپائی چاروں کی نفیس ہے لیکن کتابت کی جو خوبی اردو کے نسخوں میں پائی جاتی ہے۔ وہ انگریزی نسخوں میں نہیں پائی جاتی۔ میرے خیال میں اردو کے بہترین خوشنویس پاکستان میں پائے جاتے ہیں۔ قرآن کتاب ہدایت ہے۔ اس سے روح میں بالیدگی آتی ہے۔ پھر الفاظ کا آہنگ تو مسحور کن ہے۔

قرآن ہی ایک ایسی کتاب ہے جو پاکستان میں سب سے زیادہ پڑھی جاتی ہے۔ گاؤں کے مرد وزن اسے فرض کے طور پر پڑھتے ہیں لیکن یہ ایک افسوسناک حقیقت ہے کہ جہالت پھر بھی دور نہیں ہوتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگ ترجمے کے بغیر ہی قرآن پڑھتے ہیں اور کورے کے کورے رہتے ہیں۔ اگر وہ ترجمے سے پڑھیں تو بہت جلد جہالت دور ہو جائے۔ پھر احکام الٰہی سے بھی آگاہ ہو جائیں اور غلط سلط تعلیمات پر ایمان نہ لائیں۔

انجیل، نیا عہد نامہ، رامائن، مہا بھارت، گیتا، ایلی؟؟؟؟ کا مطالعہ تفریح کی خاطر ہے۔ ان میں بھی دانش کا خزانہ ہے۔ لیکن اب یہ ہمارے لیے قابل عمل نہیں۔ میری رائے میں یہ ہلکی پھلکی کہانیاں ہیں۔ میں ایک دوست کا احسان مند ہوں۔ اس نے مجھے انگریزی میں ابن اسحاق (مرتبہ: ابن ہشام) کی ضخیم اور لاثانی سیرۃ النبی دی۔ کتاب کا ٹائپ بہت باریک ہے اور صفحات ہزار کے لگ بھگ ہیں لیکن محبوب کبریا ﷺ کے بارے میں اس مفصل سوانح حیات کو پڑھے بغیر مطالعہ ادھورا رہتا ہے۔ اسی طرح شاہ سلمان کی رحمۃ اللعالمین بھی پڑھنے کے لائق ہے۔ زبان بے حد پیاری اور دلفریب ہے۔ دل میں اتر جاتی ہے۔ شاہ صاحب نے یہ کتاب بڑی عقیدت سے لکھی ہے۔ رسول ﷺ کی زندگی پر لکھنے کے لیے بڑی عقیدت مندی کی ضرورت ہے۔ ایک فرانسیسی مصنف کی کتاب (The Prophet) بھی مجھے بے حد محبوب ہے لیکن اس کتاب میں افسانوی انداز اختیار کیا گیا ہے۔

مکالماتِ فلاطون اور مکاتیب غالب بھی یکساں طور پر پرلطف کتابیں ہیں۔ مکالماتِ فلاطون میں سقراط کا سہارا لے کر افلاطون نے بڑی مزیدار فلسفیانہ باتیں کی ہیں۔ وہ ایک مثالی ریاست بھی قائم کرنا چاہتا تھا لیکن اسے کوئی شہزادہ نہ ملا جو اس کے فلسفے کو اپنا لیتا تاہم اس نے خیالوں کو طلسم ضرور قائم کیا ہے۔ مکاتیب غالب طلسم خانۂ خیال تو نہیں لیکن اس میں ایک بے مثال فن کار کا دل دھڑکتا محسوس ہوتا ہے جو اپنی روز و شب کی سرگرمیوں اور الجھنوں کا ذکر بڑی بے تکلفی سے

کرتا ہے۔

میر، غالب، حافظ، بیدل، اقبال، اختر شیرانی، عدم، فیض، سحر کے چند مجموعے بھی مونس تنہائی بنتے ہیں۔

برنارڈ شا کا ایک ڈراما، جوفن کی انتہائی بلندیوں تک پہنچتا ہے سینٹ جون ہے۔ اگر شاید یہ ڈرامانہ لکھتا تو شاید اتنا عظیم ڈراماٹسٹ نہ بن سکتا۔ یہی وہ شاہکار ہے جس میں فن کے سوا کچھ نہیں Wit تو خیر اس کا انفرادی وصف ہے۔ یہ اس کی ہر تحریر میں ملتا ہے لیکن اس کے علاوہ اپنی اشترا کی اور سیاسی افکار بھی اپنے فن پاروں میں داخل کرتا ہے جس سے فن کے تقاضے نسبتاً نظر انداز ہو جاتے ہیں۔ پھر اس کے لمبے لمبے دیباچے پڑھنے کے لائق ہوتے ہیں۔ ایک بات ضرور ہے۔ فن پارہ جتنا اچھا ہوگا دیباچہ اسی نسبت سے ہلکا ہوگا۔

''سیب کا درخت'' بھی ایک ناقابل فراموش شہ پارہ ہے۔ آج بیس پچیس سال پہلے ''کارواں'' کے پہلے ضخیم شمارے میں چھپا تھا۔ اسے مجید ملک نے مرتب کیا تھا۔ نہایت حسین اور دلفریب مصور پرچہ تھا۔ اتنی دقتِ نظر، محنت اور خوبصورتی سے اب پرچے نہیں چھپتے۔ بے عیب کتابت اور بے عیب چھپائی اب کہاں؟ آج کی آفسٹ اور ان وقتوں کی سنگی چھپائی ایک برابر سمجھیے!

اچھا مختصر افسانہ بھی مجھے بہت پسند ہے جس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ مختصر ہوتا ہے۔ مجھ ایسا قاری جسے بیشتر وقت ملازمت میں صرف کرنا پڑتا ہے اور لکھنے پڑھنے کے لیے بہزار دقت وقت ملتا ہے، انسانوں ہی پر قناعت کر سکتا ہے، ورنہ پڑھنے کو تو ناول کے رنگ میں دنیا کا عظیم ادب محفوظ ہے۔ ابتداء میں سدرشن اور منشی پریم چند کو پڑھا تھا اور پسند کیا تھا۔ پریم چند کا افسانہ ''کفن'' عہد آفریں ہے حسن عسکری، راجندر سنگھ بیدی، احمد ندیم قاسمی، ممتاز شیریں اور نئی نسل میں سے اشفاق احمد، شمس آغا مرحوم، اے حمید اور قاسم محمود کے اکثر افسانے مجھے پسند ہیں۔

پنجابی ادب میں مجھے وارث شاہ بہت پسند ہے کیوں کہ اسی میں دنیا داروں کی باتیں ہیں۔ کہنے کو وارث شاہ ہیر رانجھا، کیدو اور دوسرے کرداروں کو اپنے متصوفانہ نظریات کی علامت بتاتے ہیں۔ پوری داستان کی ترجمانی نئے انداز سے کرتے ہیں لیکن فنی طور پر داستان اتنی مکمل ہے اور اسے وارث شاہ کے ذاتی نظریے سے پڑھنے کی ضرورت نہیں۔ مصنف اپنے فن پاروں کی نسبت ذاتی نقطۂ نظر رکھنے کا مجاز ہے لیکن وقت طے کرتا ہے جسے صحیح ذوق مطالعہ نصیب ہو جائے وہ ہر وقت نت نئی کتاب کے لیے بے قرار رہتا ہے۔ کتاب تسکین قلب کا قابل قدر ذریعہ ہے۔

پراثر اور پسندیدہ کتابیں

یونس خان

مذہبی وابستگی ایک الگ چیز ہے مذہب سے بالاتر ہوکر اگر خالصتاً علمی و ادبی پوائنٹ آف ویو یا نقطہ نظر سے کتابوں کی افادیت، دلچسپی اور اثر پزیری دیکھتا ہوں تو القرآن کو ایک اہم کتاب پاتا ہوں یہ ایک ایسی کتاب ہے کہ جس کے متن کو سمجھے بغیر بھی اگر صرف اس کی تلاوت ہی کیوں نہ کی جائے تو وہ بھی اثر کرتی ہے۔ یہ کتاب قاری کی محویت اور جزبیت جلد حاصل کر لیتی ہے اور جوں جوں قاری اس کی تلاوت کرتا ہے اس میں جزب ہوتا چلا جاتا ہے اور اگر اس کے ترجمہ کی بات کی جائے تو اس کا ترجمہ پڑھنا اور بار بار پڑھنا بھی اس کی اثر پزیری کو کم نہیں کرتا بلکہ ہر دفعہ معنویت کی ایک نئی تہہ دریافت ہو جاتی ہے اور بڑی کتابیں ایسی ہی ہوتی ہیں جو وقت اور تجربے کے ساتھ معنی در معنی کھلتی جائیں۔ یہ ضخیم کتاب ہے اسے پڑھنے اور سمجھنے کے لئے سالوں درکار ہیں اسے غیر مسلموں نے بھی سراہا اور خوب سراہا ہے۔ حالیہ دور میں سیرت پر لکھی گئی کتاب "فرسٹ مسلم۔۔۔ دی سٹوری اف محمد ﷺ" کی لکھاری لیز لی ہزلٹن کہتی ہیں "شاید سب سے بڑی اور حیران کن بات یہ ہے کہ۔۔۔قران کتنا لچک دار ہے خاص طور پر ان اذہان کے کے لئے جو بنیادی طور پر غیر لچک دار ہیں۔"

القران کے بعد بائبل ہے یہ بھی ایک آفاقی کتاب ہے بلاتفریق مذہب یہ بھی بار بار پڑھنے کی کتاب ہے یہ کتاب بحثیت مسلمان ہمارے ایمان کو کمزور نہیں بلکہ مضبوط کرتی ہے یہ کتاب بھی سالوں مانگتی ہے۔ یہ ایسی کتاب ہے جو ابن خلدون کو پہلا سوشیالوجسٹ بنا دیتی ہے۔ القران اور بائبل ایسی کتابیں ہی جو قاری کو کبھی مایوس نہیں کرتیں۔ قران تو کہتا ہی یہی ہے کہ " ذٰلِکَ الْکِتَابُ لَا رَیْبَ فِیہِ " یہ وہ کتاب ہے کہ جس میں کوئی شک نہیں۔ القران اتنی بڑی کتاب ہے کہ اس تک پہنچنا بھی ایک مشکل کام ہے قران کو سمجھنے کے لئے اپنے علم کو مسلسل بڑھانا پڑتا ہے۔ اسلام کی جڑیں یہودیت میں موجود ہونے کے باوجود اسلام اور یہودیت میں ایک مناقشہ موجود ہے اور مناقشے کی وجہ اسرائیل ہے۔ سیاسی اور مذہبی اسلام میں آخر مناقشہ کیا ہے۔ مذہبی طور پر ایک ہی جڑیں رکھنے والے مزاہب یہودیت، عیسائیت اور اسلام، آخر سیاسی طور پر مناقشے کی زد پر

کیوں ہیں؟

یہودیت، عیسائیت اور اسلام میں آخر مناقشہ ہے کیا؛ اسے خوب صورتی سے قلم بند کیا ہے کیرن آرم سٹرانگ نے اپنی کتاب "یروشلم: تین مذہب، ایک شہر" میں۔ عیسائیوں اور یہودیوں کا یروشلم اور مسلمانوں کا بیت المقدس؛ ایک ایسا شہر جو اِن تینوں مذاہب کے ماننے والوں کے لئے ایک بہت زیادہ تقدیس لئے ہوئے ہے۔ یروشلم کی تاریخ کیا ہے اور یہ تاریخ کب اور کیوں بنتی اور بگڑتی رہی یہ اس کتاب کا موضوع ہے۔ اس مناقشے کو سمجھنے کے لئے اس کتاب کا مطالعہ اشد ضروری ہے۔

اس کتاب میں کنعانی، یہودی، یبوسی، یونانی، رومی، بازنطینی، عرب، مملوک، عثمانی، برطانوی، فلسطینی اور اسرائیلی ادوار کی روداد بلا کم و کاست بیان کی گئی ہے۔ یہ کتاب یہ تو نہیں بتاتی کہ یروشلم کا سیاسی مستقبل کیا ہوگا کیونکہ اس معاملے میں قیافے یا قیاس آرائیاں ہی کی جاسکتی ہیں لیکن اس کا مناسب حل نہیں بتایا جاسکتا۔ اس کتاب میں یہ جاننے کی کوشش کی گئی ہے کہ آخر یہودیوں، عیسائیوں اور مسلمانوں کے نزدیک "مقدس" کے معنی ہیں کیا؟ یہ کتاب نہ صرف ''یروشلم'' کی سیماب صفت تاریخ کا احوال ہے بلکہ یہ کتاب 3200 ق م کے دور سے لے کر بیسویں صدی کے آخری عشرے تک کے یروشلم کا مکمل روحانی اور طبعی منظر نامہ بھی ہے۔ "یروشلم" عیسائیت کے لیے اس لئے بھی اہمیت اختیار کرتا ہے کہ یہ اس مذہب کا مولودی وطن ہے جبکہ یہودیت اور اسلام صحرائے سینا اور ارض حجاز میں تشکیل پائے۔ جب کہ یہی یروشلم لگ الگ ادوار میں ان دونوں مذاہب۔۔۔ عیسائیوں اور یہودیوں۔۔۔ کے زیر نگین رہا۔ کیرن آرم سٹرانگ "یروشلم" کے علاقے پہ یہودیوں اور بالخصوص صیہونیوں کے دعویٰ ملکیت کو مسترد کرتی ہیں ان کا کہنا ہے کہ اگر مسلمان یروشلم کے لیے اجنبی اور حملہ آور ہیں تو یہودی بھی اسی طرح اجنبی اور حملہ آور ہیں۔ اہم سول یہ ہے کہ یہ شہر ابتداً کس کا تھا اور اب اسے کس کی ملکیت ہونا چاہئے؟

یہ "صیہون" سے "صیہون؟" تک کا سفرنامہ ہے۔ جو قاری کو صیہون۔۔۔ یروشلم کی ایک پہاڑی جس پر حضرت داؤد علیہ السلام کی عبادت گاہ اور محل واقع تھا۔۔۔ سے آج کی صیہونیت تک لے جاتا ہے۔ یہ 5000ء سے زائد سالوں پر محیط تاریخ کی کہانی ہے۔

. کیرن رومن کیتھولک نن کی حیثیت سے سات سال تک خدمات انجام دیتی رہیں پھر اس نے یہ آرڈر چھوڑ دیا اسکے باوجود کہ مصنفہ کی پیدائش ایک عیسائی گھرانے میں ہوئی یہ مصنفہ کا کارنامہ ہے کہ دوران تصنیف وہ مکمل طور پر غیر جانبدار رہیں اور انہوں نے مذہبی تعصب سے اپنے دامن کو بچائے رکھا۔ بعد ازاں کیرن آرم سٹرانگ نے کتاب "محمد ﷺ" لکھی جو کہ ایک خوب

صورت کتاب ہے اسے مغربی ذہن کو مدنظر رکھتے ہوئے لکھا گیا۔ یہ کتاب 11 / 9 کے واقعے کے بعد لکھی گئی۔

کنفیوشس ایک چینی فلاسفر ہے جس کی کتابوں کو مقدس تو نہیں مانا جاتا لیکن اس کی "پانچ کتابیں" ایسی ہیں جو انسانی نفس کی گہرائیوں کو ٹٹولتی ہیں۔ یہ ایسی کتابیں ہیں جنھوں نے چینیوں کے اذہان پر صدیوں حکمرانی کی ہے اور یہ کتابیں چینی قوم کے سب کانشس مائنڈ (لاشعور) کا حصہ ہیں وہ اس سے باہر نکل ہی نہیں سکتے جب کہ بطور مسلمان ہم قرآن مجید سے من حیث القوم مستفیذ ہی نہیں ہوئے ہم آج بھی انسانیت کو مذہب کے طور پر قبول نہیں کر پائے۔ ہماری سماجی بنیادیں آج بھی مذہبی مناقشے پر کھڑی ہیں۔ (راقم نے کنفیوشس کی ان پانچ کتابوں میں سے تین کتابوں کو "سنگی کتابیں، کاغذی پیراہن" کے عنوان سے ترجمہ کیا ہے۔ یہ کتاب ابھی پبلشنگ کے مراحل میں ہے۔)

یہودیت، عیسائیت اور اسلام مذہب کی بات کرتے ہیں جبکہ کنفیوشس ایک ہیومنسٹ فلاسفر ہے اس کے اقوال سوشل انٹرایکشن کے بارے میں ہیں۔ کنفیوشس ایک اعلی اور ارفع انسان کے ساتھ ایک مضبوط، طاقتور اور ایک عملی حکمران کی بات کرتا ہے، جب کہ سامی مذاہب میں مضبوط، طاقتور اور جابر حکمران کا تصور ایک مضبوط، طاقتور اور جابر خدا کے تصور میں ڈھل جاتا ہے۔

کنفیوشس مت، عیسائت سے بہت پہلے کا مذہب ہے اسے ہم یہودیت کا ہم عصر کہہ سکتے ہیں کہ کنفیوشس حضرت عیسی سے کوئی ساڑھے چار سو برس پہلے پیدا ہوا تھا۔ کنفیوشس مت اور اسلام میں ایک لنک ملتا ہے محمد رسول اللہ ﷺ جب فرماتے ہیں کہ اگر علم حاصل کرنا ہے تو چین کو جایئے تو رسول اللہ کس کے متعلق کہہ رہے ہیں؟ یقیناً کنفیوشس کے متعلق۔ کنفیوشس کا اصل نام کونگ یا کنگ تھا اور اسے احترامی طور پر فوزی کہا جاتا تھا۔ عربی میں لفظ فوزی مذکر ہے اس کا مونث فوزیہ ہمارے ہاں مستعمل ہے۔ جس کا لغوی معنی ہی فلاح پانے والے کے ہیں۔ یہ تو لاطینی مبلغین تھے جنھوں نے کونگ فوزی کو کنفیوشس بنا دیا۔ کنفیوشس کے اقوال میں ایک ایسا قول بھی موجود ہے جو کنعان کے ایک شہر آئی (Ai) کے متعلق ہے۔ جس سے پتا چلتا ہے کہ چینیوں اور عربوں کے درمیان ایک قدیمی تعلق ضرور موجود تھا یہی وجہ تھی کچھ روایات کہ مطابق ہجرت حبشہ کے بعد سعد بن ابی وقاص مکہ واپس آنے کی بجائے ہانگ کانگ کے قریب کنٹن یا گوانگ زاہو چلے جاتے ہیں اور تبلیغ اسلام میں مشغول ہو جاتے ہیں وہیں ان کا مزار آج بھی مرجع عام ہے۔ جیسے ہم مسلم اور غیر مسلم کی تفریق کرتے ہیں ویسے ہی چینی اپنے آپ کو ہان جب کہ مسلمانوں کو ہوئی کہتے ہیں۔

ذرا اور پیچھے چلتے ہیں نوح کا کردار سیلاب عظیم کے حوالے سے جب متھ بنتا ہے تو انڈیا پہنچ کر وہ "منوح" بن جاتا ہے یہی تصور چین پہنچتا ہے تو" گریٹ یو" بن جاتا ہے۔ان کرداروں کے درمیان ایک قدر "پانی یا سیلاب" ہے۔اس کی بنیاد پر کہا جا سکتا ہے کہ چین اور مشرق وسطی کے درمیان ایک رابطہ ہمیشہ موجود رہا ہے۔

کنفیوشس مت بطور طریقہ زیست چین کی حدود سے نکل کر مشرق بعید تک پہنچ جاتا ہے وہ تائیوان ہو، کوریا ہو، جاپان ہو ویت نام ہو؛ اسے اتنی پزیرائی ملتی ہے کہ وہاں کنفیوشس مت ایک مذہب کی حثیت اختیار کر جاتا ہے۔کنفیوشس نے اگر چہ کبھی بھی کسی خدا، مذہب، آسمانی کتاب، قیامت، جنت، دوزخ، گناہ یا ثواب کا زکر نہیں کیا۔کنفیوشس مت ان خطوں کے رہنے والوں کی زندگیوں کا ایک لازمی جزو بن جاتا ہے۔ دوسری طرف یہ ایک ایسا مکتبہ فکر ہے کہ جسے اپنے ابتدائی دور میں ہی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور اسے ختم کرنے کی کوشش میں نہ صرف اس کے مبلغین کو زندہ جلا دیا جاتا ہے بلکہ کنفیوشس کی کتابوں کو بھی جلا دیا جاتا ہے۔ پھر زیادہ دور کی بات نہیں جلد ہی کنفیوشس کے نظریات کو نہ صرف سرکاری طور پر اپنا لیا جاتا ہے بلکہ علم وانصاف کے معاملے میں کنفیوشس کے وضع کردہ ضوابط سے راہنمائی لی جانے لگ جاتی ہے۔شاہی ملازمت کے تقاضے پورے کرنے کے لئے اور بڑھتی ہوئی سلطنت کے لئے ماہر بیوروکریسی کی ضرورت پیش آتی ہے تو کنفیوشس کی "پانچ کتابوں" کو بنیادی سلیبس کا درجہ حاصل ہو جاتا ہے اور پھر کم وبیش دو ہزار سال تک کے لئے یہ نظریات چینی معاشرت کا ایک لازمی جزو بن جاتے ہیں اور کنفیوشس کی کتابیں چینی اذہان پر براہ راست حکومت کرتی ہیں اور آج بھی وہ ان طے شدہ معاشرتی ضوابط سے باہر نہیں آسکے یہ انداز زیست ان کی زندگی کا لازمی حصہ ہے۔کنفیوشس مت کا بنیادی اصول ہی یہی ہے کہ دوسروں کے لئے بھی وہی پسند کرو جو آپ اپنے لئے پسند کرتے ہو۔

یہی وہ دور ہے جب انڈیا میں بدھا کا ظہور ہوتا ہے۔ بدھا روحانیت کی بات کرتا ہے۔ ہندومت بہت سارے خداؤں پر یقین رکھتے ہیں لیکن بدھ مت ہندومت کے تضاد میں آگے بڑھتا ہے۔ بدھا کہتا ہے کہ نہ میں پہلا بدھ ہوں نہ آخری؛ میرے بعد متیریا آئے گا۔ایسی ہی بات کنفیوشس بھی کہتا ہے کہ میں تو پیغام بر ہوں۔ بدھا کا نام سدھارتھ تھا اسی کے نام کو آگے لے کر ہرمن ہیسے "سدھارتھا" کے نام سے ایک ناول لکھتا ہے جو بدھا کے حالات زندگی اور فلاسفی کو عیاں کرتا ہے۔سدھارتھ ہندوستان کے روحانی اور معاشی پس منظر سے ابھرتا ہوا ایک ایسا کردار ہے جو زہنی کشمکش میں مبتلا رہتے ہوئے حق کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ سدھارتھ اور گوتم کے کرداروں میں یکسانیت کے باوجود ہرمن ہیسے نے دونوں کرداروں کی انفرادیت کو قائم رکھا ہے۔ بدھا کے

فلسفے کے علاوہ اس ناول میں قدیم ہندوستان کے رسم و رواج اور تہذیب کی خوب صورت عکاسی بھی موجود ہے۔

انسانی نفسیات کی مختلف جہتیں متعارف ہو رہی ہیں ابھی ایک جہت باقی ہے اور وہ ہے منطق یا استدلال اور وہ ہے سقراط اور افلاطون جو اس کو بڑھاوا دیتے ہیں۔ "مکالمات افلاطون" میں سقراط مکالمہ کرنا سکھاتا ہے وہ حتمیت اور قطعیت کا قائل نہیں ہے وہ سوچنے اور سمجھنے کی دعوت دیتا ہے۔ یونان ایک ایسی جگہ ہے جو علم و ہنر، فلاسفی، سائنس، تاریخ اور آرٹ کا مرکز رہا ہے۔ آج دنیا میں جو بھی تبدیلی آرہی ہے وہ یونان کی وجہ سے ہے۔ سقراط ایتھنز کا سب سے زیادہ سمجھدار شخص تھا وہ جاننا چاہتا تھا کہ وہ جانے کہ کون سب سے زیادہ ذہین ہے تو اس نے تمام بڑے لوگوں کو اکٹھا کیا اور بحث مباحثے کے بعد جانا کہ لوگ یہ تو جانتے ہیں کہ وہ جانتے ہیں لیکن سقراط یہ جانتا ہے کہ وہ یہ نہیں جانتا۔ تو اہم یہ ہے کہ ہم کیا نہیں جانتے؟

مغربی فلاسفی کی بنیادیں سقراط کی فلاسفی پر کھڑی ہیں۔ سقراط کہتا ہے کہ ہم اس دنیا کے بارے میں، اپنی زندگی کے بارے میں اور اپنے بارے میں نہیں جانتے۔ ہم کس طرح سے پچھلے خداؤں کو یا روایتی تصورات کو بغیر جانچے پرکھے صحیح مان سکتے ہیں۔ یہی اس پر الزام تھا کہ وہ اس وقت کے رائج خداؤں کو نہیں مانتا اور یہ کہ وہ نوجوانوں کے اخلاق کو بگاڑ رہا ہے اسی لئے اسے زہر کا پیالا پینے پر مجبور کیا گیا۔ سقراط کہتا ہے کہ ایک ایسی زندگی جس کی جانچ پرکھ نہ کی گئی ہو زندہ رہنے کے قابل نہیں ہے "مکالمات افلاطون" میں افلاطون نے سقراط کے نام سے مکالمات کو قلمبند کیا ہے۔

قدیم دور سے آگے بڑھتے ہوئے جب ہم بیسویں صدی کے فلاسفہ کا جائزہ لیتے ہیں تو پتا چلتا ہے کہ بیسویں صدی کے فلاسفہ نے بالعموم مذہبی امور سے بحث سے گریز کیا لیکن برٹرینڈ رسل نے ان مباحث کو چھیڑا جو مذہبی اجارہ داروں کے قریب بحر حال گستاخی پر محمول تھے اور بہت پریشان کن بھی۔ مذہب سے اگر ہم سیکولرازم کی طرف آگے بڑھیں تو بڑا نام برٹرنڈ رسل کا ہے۔ رسل کہتا ہے کہ فلسفہ؛ مذہب اور سائنس کے درمیان ایک پل ہے۔ منطق اور استدلال رسل کے فلسفہ کی بنیاد ہے۔ فلسفہ، سیاسیات، منطق، ریاضیات اور لسانیات رسل کے اہم موضوع ہیں۔ رسل کو تجزیاتی فلسفہ کا بانی سمجھا جاتا ہے۔

سیاسیات میں رسل کی دلچسپی آغاز زندگی ہی سے شروع ہو گئی تھی۔ یہ ایک طرح سے اس کا ورثہ بھی تھا۔ سیاسی نظریات میں اس کی بے باکی کا عام تذکرہ رہا ہے۔ تاہم عملی سیاست میں ان نظریات کے اطلاق میں اس نے تجزیاتی طریق کار کو اپنائے رکھا۔ سیاست میں اس کی دلچسپی کا

ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ نوبیل انعام قبول کرتے ہوئے اس نے جو تقریر کی تھی اس کا عنوان تھا" سیاسی اعتبار سے اہم ترجیحات"۔ رسل کی پہلی کتاب "جرمنی کی اشتراکی جمہوریت" 1896ء میں شائع ہوئی تھی۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اس نے کم وبیش چالیس سال قبل ان رجحانات کا صحیح طور پر اندازہ لگا لیا تھا جو بعد میں جرمنی میں آمریت اور جنگجوئی کی صورت میں نمو پذیر ہوئے۔
حسب معمول اس کا موقف وقت کے ساتھ ساتھ تبدیل ہوتا رہا۔ اپنے موقف کی تبدیلی کے بارے میں رسل کا ادعا یہ تھا کہ " موجود حقائق و واقعات کے بے لوث تجزیئے سے صداقت کا صرف قرب ہی نصیب ہوسکتا ہے، قطعیت کی تمنا عبث ہے۔" مختلف شعبہ ہائے علم میں اس کی آراء اکثر بدلتی رہی ہیں۔ وہ اس پر کبھی خجل نہیں ہوا کہ یہ اس کی سوچ کا ارتقائی عمل تھا اور اس حریت فکر کا ایک مظہر جس کی اس نے خود تمام عمر آبیاری کی۔ جن اہلیتوں کی بنا پر اسے نوبیل انعام کا حقدار گردانا گیا ان میں یہ حریت فکر سرفہرت تھی البتہ وقت کی ستم ظریفی دیکھے کہ جب 1910ء میں اس نے برطانوی پارلیمنٹ کے انتخابات میں حصہ لینا چاہا تو انتخابی کمیٹی نے اسی بناء پر اسے نااہل قرار دے دیا۔
"طاقت" کا مسئلہ اس کے لئے خاص اہمیت کا حامل رہا۔ چنانچہ اس نے کمال دقت نظر کے ساتھ فاشزم اور کمیونزم کے نظریات کی بنیادی خامیوں کی نشاندہی کی۔ رسل کے نزدیک صرف طبقاتی کشمکش ہی تاریکی مناقشات کی وجہ نہیں ہے بلکہ دوسرے نفسیاتی عوامل بھی اس میں اتنے ہی اہم ہوسکتے ہیں۔

تاریخ میں رسل پیشہ ور تاریخ دان ہونے کے دعوے سے دستبردار ہونے ہی میں عافیت سمجھتا تھا۔ تاہم یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ تاریخ میں اس کی دلچسپی اوائل شباب سے لے کر آخری عمر تک قائم رہی۔ فلسفے کی تاریخ مرتب کرنے کا محرک بھی یہی دلچسپی تھی۔ رسل نے "ہسٹری اف ویسٹرن فلاسفی" 1945ء میں لکھی جس پر اسے 1950ء میں نوبیل پرائز سے نوازا گیا۔
جناب سلیم الرحمٰن کی کتاب مشاہیر ادب یونانی (قدیم دور) قدیم دور کے فلاسفہ کو سمجھنے کی طرف ایک اہم قدم ہے۔ جب کہ جلیل القدر فلسفیوں کے سوانح وافکار پر ول ڈیورینٹ کی کتاب داستان فلسفہ ایک بہت خوب صورت کتاب ہے اس کا ترجمہ جناب عابد علی عابد کا ہے۔ تاریخ فلسفہ یونان جناب ڈاکٹر نعیم احمد کی ایک خوب صورت کتاب ہے۔ ڈاکٹر نعیم احمد نے عام قاری کو مدنظر رکھتے ہوئے "رسل کی بنیادی تحریریں" کے عنوان سے رسل کے مضامین کا ترجمہ بھی الگ سے پیش کیا ہے۔ اس کتاب میں فلسفہ کے دقیق مسائل کو شامل نہیں کیا گیا۔ برٹرینڈ رسل کہتا ہے "ہر شخص خدا بننا چاہتا ہے بشرطیکہ یہ ممکن ہو۔ عجب بات یہ ہے کہ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اسے

خارج از امکان ماننے پہ آمادہ نہیں ہوتے۔"

سیکولرزم سے آگے بڑھتے ہوئے اگر ہم مسلم فلسفہ کی بات کریں تو "مسلم فکر و فلسفہ، عہد بعہد" کو ایک اہم کتاب پاتے ہیں۔ اس اہم تصنیف کو محمد کاظم نے مرتب کیا ہے۔ اس کتاب میں دو چیزیں اہم ہیں ایک تو یہ کہ اس کتاب کا دائرہ بہت زیادہ وسیع ہے۔ یہ دائرہ یونانی فلسفے کی آغاز سے لے کر علامہ اقبال کی سوچ اور فلسفے تک کا احاطہ کرتا ہے اور یہ کوئی پچیس سو سال کا وقت بنتا ہے۔ دوسرا یہ کہ محمد کاظم نے اسے عام قارئی کو مدنظر رکھ کر عام فہم انداز میں لکھا ہے۔ مسلم فکر و فلسفہ کا جائزہ لیتے ہوئے اس کا اغاز یونان سے ہونے کی وجہ یہ ہے کہ مسلم فکر کے دو ماخذ ہیں ایک قران اور دوسرا فلسفہ یونان۔ جب یونانی فلسفہ ترجمہ کے ذریعے عربی زبان زبان تک پہنچتا ہے تو مسلمانوں میں فلسفیانہ سوچ کا آغاز ہوتا ہے اور ان کے علم میں آتا ہے کہ انسان اور کائنات کے مسائل میں یونانی فلاسفہ نے کیا کچھ کیا ہے، جانا ہے اور کیا نتائج اخذ کئے ہیں۔ محمد کاظم نے مسلم فکر و فلسفہ پہ بات کرنے سے پہلے یہ بتانا ضروری سمجھا کہ فلسفہ کیا ہے؟ اس کا میدان کار کیا ہے؟ یہ کب اور کہاں شروع ہوا اور کن حالات سے گزرا؟

محمد کاظم کے بقول اسلام سے پہلے عربوں میں فکر کی کوئی قابل ذکر روایت موجود نہیں ملتی۔ اسلام نے اپنے ماننے والوں کو ایک واضح اور مربوط تصور کائنات دیا اور ساتھ ہی انہیں اس عالم اور اس کے مظاہر میں فکر و تدبر کرنے اور اگلی تہذیبوں کے حالات پڑھ کر ان سے سبق سیکھنے کی ترغیب دی لیکن علم الکلام کی ابتدا سے پہلے مسلمانوں کے اندر کچھ ایسے فرقے پیدا ہو گئے تھے کہ ان کے وجود میں آنے کی وجہ ان کی خاص سیاسی سوچ تھی جو بعد میں دینی فکر میں ڈھل گئی۔ یہیں سے کچھ مسائل کھڑے ہوئے ابتداً دو فرقے وجود پذیر ہوئے؛ شعیان علی اور خوارج۔ ان دو فرقوں کی اویزش کی وجہ سے ایک تیسرا فرقہ پیدا ہوا مرجئہ کے نام سے۔ یہ معتدل مزاج اور امن پسند اصحاب پر مشتمل ایک گروہ تھا جب کہ پہلے دونوں فرقے انتہا پسندانہ سوچ کے مالک تھے ایک طرف خوارج حضرت عثمان اور حضرت علی اور تحکیم کو ماننے والوں کو کافر قرار دے رہے تھے تو دوسری طرف شعیان علی حضرت ابوبکر اور حضرت عثمان اور ان کے حامیوں پر کفر کا الزام لگا رہے تھے۔ مرجئہ نے ان سب کے ساتھ مصالحت کا رویہ اختیار کیا جب کہ مرجئہ کے معنی ارجاء یعنی مہلت دینے کے ہیں۔ اس طرح مسلمانوں میں سوچنے اور اس سوچ کی بنیاد پر اپنا رویہ متعین کرنے کی ابتدا تو سیاست سے ہوئی لیکن پھر اس میں ایمان اور عقیدے سے متعلق امور بھی شامل ہوتے چلے گئے اور اس طرح نئے نئے فرقے ظہور پذیر ہوتے چلے گئے۔ ان تمام امور کا جائزہ جناب محمد کاظم نے مسلم فکر و فلسفہ؛ عہد بعہد میں بخوبی لیا ہے۔

''اے شارٹ ہسٹری اسلام'' کی صورت اس میں اضافہ کیرن آرم سٹرانگ نے کیا ہے جو 2000ء تک کا اسلامی فکر کا جائزہ ہے جس میں ایرانی انقلاب کی سوچ اور فلسفے تک کا احاطہ کیا گیا ہے۔ یہ کتاب ''مسلمانوں کا سیاسی عروج و زوال'' کے نام سے ترجمہ ہو چکی ہے۔

کیرن آرم سٹرانگ ''ہسٹری اف گاڈ'' میں ایک غلط فہمی کا ازالہ کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ ہمارے ہاں عربوں کی قبل اسلام دور کو جاہلیت کہنے کے حوالے سے عام غلط فہمی پائی جاتی ہے کہ اس میں جاہلیت کا وہی مفہوم ہے جو عام طور پر سمجھا جاتا ہے، جب کہ کیرن کے بقول پیغمبر اسلام کی بعثت سے پہلے کا عرب معاشرہ بہت سی اعلی انسانی خوبیوں اور اوصاف کا بھی حامل تھا اسی لئے عرب معاشرے کو بعثت نبی اور اسلام کے لیے چنا گیا۔ جہاں تک قبل اسلام کو جاہلیت کا دور کہنے کی بات ہے اس میں جاہلیت کے درست معنی متعین کرنا ضروری ہیں، عرب معاشرے کی جن عادات کی وجہ سے اسے جاہلیت کہا گیا اور جن عادات کو پیغمبر اسلام کے ذریعے ختم کیا گیا ان میں دراصل عربوں کی تند مزاجی اور جھگڑالو پن ہے جب کہ اسلام کے معنی ہی اطاعت قبول کرنے اور سر تسلیم خم کرنے کے ہیں۔ کیرن نے اس کتاب میں حضرت ابراہیم سے لے کر آج کے دور تک تصور خدا کی تشکیل کو یہودیت، عیسائیت، اسلام بدھ مت اور ہندو مت کے حوالے سے دیکھا ہے۔ یہ تصور خدا کی چار ہزار سالہ جستجو کی تاریخ ہے۔

اسی پس منظر میں اگر ہم آگے بڑھتے ہیں تو انسانی تہذیب کی ترقی کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم پرانی تہذیبوں کی تاریخ، ادب اور افکار و عقائد کا جائزہ لیں۔ ابتداً تہذیبیں دریاؤں کے کناروں پر پروان چڑھیں، ہمارا خطہ دریائے سندھ کے حوالے سے انڈس ویلی سویلائزیشن کہلاتا ہے۔ چونکہ یہ تہذیب ہندو تہذیب تھی ہم نے اسے اپنے ماضی کے طور پر تسلیم نہیں کیا جب کہ ہندوؤں نے اسے انڈس۔ سرسوتی تہذیب کا نام دے دیا اور وہ اس تہذیب کو اپنے ماضی کے طور پر تسلیم بھی کرتے ہیں۔ رومیلا تھاپر نے قدیم تاریخ پر بہت زیادہ کام کیا ہے اس کی کتاب "اے ہسٹری اف انڈیا" ایک بہت اہم کتاب ہے جو اس قدیم خطے کی تہذیب کو سمجھنے کے لئے بہت ضروری ہے لیکن اس سے بھی اہم ایک اور کتاب ہے اور وہ ہے سبط حسن کی "ماضی کے مزار"۔

بنیادی طور پر تین تہذیبوں کو قدیم ترین تہذیبیں سمجھا جاتا ہے: مصر کی تہذیب، میسوپوٹامیہ یا عراق کی تہذیب اور ہڑپہ یا سندھ کی تہذیب۔ سبط حسن نے بابلی تہذیب کے ارتقاء کا جائزہ ماضی کے مزار میں لیا ہے۔ تخلیق کائنات، تقدیر اور حیات بعد الموت سے یہاں بحث کی گئی ہے۔ جب تک ہم یہ کتاب نہیں پڑھتے ہم اپنے اجداد کی اقدار حیات، طرز معاشرت اور انداز فکر و

احساس سے بڑی حد تک ناواقف رہتے ہیں۔ ماضی کے مزار میں پرانی قوموں کی ان رسوم ورواج پر روشنی ڈالی گئی ہے جو سبط حسن کے مطابق ہمارے مروجہ عقائد کی اساس ہیں اور اس تاریخی پس منظر پر روشنی ڈالی گئی ہے جن سے ہمارے معاشی، سماجی اور تہذیبی محرکات کھل کر سامنے آتے ہیں۔ سبط حسن کی ائیڈیالوجی سے ہم اختلاف کرسکتے ہیں کہ وہ ایک خاص مائنڈ سیٹ کو مدنظر رکھ کر لکھی گئی لیکن تہذیبی ارتقاء کو سمجھنے کے لئے یہ ایک اہم کتاب ہے کہ جس کا مطالعہ ضروری ہے۔

''دی ہیریٹیج اف ورلڈ سوئلائزیشن'' از کریگ، گراہم، اوراوزمنٹ ایک اہم تحقیقی کتاب ہے جسے سولائزیشن کے ارتقاء کے سمجھنے کے لئے پڑھنا ضروری ہے۔

تہذیب سے اگر ہم مذہب کی طرف آئیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ ہندوستان کی مذہبی تاریخ میں '' گیتا '' ایک اہم کتاب ہے۔ گیتا میں کرشن اور ارجن کے درمیان ایک مکالمہ روپذیر ہے جس میں کرشن ارجن کو جنگ کے رموز اور اداب سمجھا رہا ہے۔ جب کہ یہ جنگ استعاراتی طور پر زندگی کی جنگ بن جاتی ہے جو ہم ہر وقت لڑتے ہیں۔ اس جنگ کے کیا اصول اور آدرش ہوسکتے ہیں ان کو کرشن اس مکالمے میں زیر بحث لارہا ہے۔

گیتا ایک طویل رزمیہ یا جنگ نامہ، مہا بھارت کا حصہ ہے۔ ہندوؤں کے نزدیک گیتا کتاب شریعت ہی نہیں ہے بلکہ دیگر مذہبی کتابوں میں پوشیدہ سچائی کا پیمانہ بھی ہے۔ واقعات کچھ یوں ہیں کہ سرزمین ہند کے بہادر سپوت پانڈو اور کوروا اپنے اپنے لشکر صف آراء کئے آمنے سامنے کھڑے ہیں۔ ارجن رتھ پر سوار ہے۔ شری کرشن اس کا رتھ چلا رہے ہیں اور اس کی درخواست پر رتھ کو دونوں فوجوں کے درمیان لاکر کھڑا کردیتے ہیں۔ ارجن کوروؤں کی فوج کی طرف نگاہ ڈالتا ہے اسے نظر آتا ہے کہ کہیں اس کے گورو کھڑے ہیں، کہیں چچا، کہیں چچیرے بھائی، کہیں خالو، کہیں بھتیجے، کہیں دوست، اور یہ سب ایک دوسرے سے جنگ کے لئے تیار ہیں۔ یہ صورت حال دیکھ کر اس کا دل نرم پڑ جاتا ہے۔ اس کے من میں ایک اور جنگ شروع ہوجاتی ہے۔ کشتری کی حثیت سے لڑنا اس کا دھرم ہے۔ رحم دل انسان کی حثیت سے لڑنا اور پھر اپنے عزیزوں سے لڑنا اس کے لئے ادھرم ہے۔ یہ دھرم اور ادھرم کی جنگ، یہ فرائض اور جزبات کی جنگ اس کے دل کو کمزور کردیتی ہے۔ وہ اس اندرونی جنگ کی راہنمائی بھی شری کرشن کے سپرد کردیتا ہے تاکہ وہی اس کے من کے رتھ کو بھی چلائیں، اور وہ خود جزبات سے متاثر ہوکر اپنی کمان پھینک دیتا ہے اور رتھ میں دل شکستہ ہو کر بیٹھ جاتا ہے۔ اب شری کرشن اسے وعظ دیتے ہیں اس کی ٹوٹی ہوئی ہمت کو پھر استوار کرتے ہیں اور اسے جنگ کے لئے امادہ کرتے ہیں۔ یہ وہ موقع ہے کہ جب دونوں طرف فوجیں ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہیں اور اس وقت نہ صرف ملک کی تقدیر جوکھم میں ہے بلکہ دھرم بھی خطرے میں

ہے۔اس وقت کرشن نہ صرف سیرت کے مسئلے سے بحث کرتا ہے بلکہ مابعدالطبعیاتی مسائل کی بھی تشریح کرتا ہے جس کا کہ حل ان لوگوں کے لئے اشد ضروری ہے جو بغیر کسی باطنی ناموافقت کے زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔ گیتا کی عملی تعلیم میں تو اس حد تک کوئی شک وشبہ نہیں ہے کہ اس کی وجہ خود اس کا ماحول ہے۔شروع میں ہم دیکھتے ہیں کہ ارجن دل شکستہ ہے اور جنگ کرنے سے انکاری ہے لیکن سری کرشن کی ترغیب کے نتیجے کے طور پر وہ لڑائی میں حصہ لینے لئے تیار ہو جاتا ہے اور اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں اس تعلیم کا مرکزی موضوع حصول عمل ہے یا گیتا کی اصطلاح میں کرم یوگ ہے۔کرم یوگ کے معنی ہیں سماجی فرائض کی انجام دہی میں جاں نثاری۔عمل کے اس اصول کی پیروی سے ایک اہم نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ایک شخص کامل سکون قلب کے ساتھ کام کر سکتا ہے لیکن جب خواہش یا خودغرضی ہم پر غالب آ جاتی ہے تو نیکی کی تمیز کرنے میں ہم اندھے ہو جاتے ہیں اور اگر اس وقت بظاہر ہم نیک کام منتخب کرنے میں کامیاب بھی ہو جاتے ہیں تو اس کے آغاز (پہل) کے لئے غیر ضروری اشتیاق ہمیں راست بازی کے راستہ سے قدم ہٹا لینے کا لالچ دیتا ہے اس طرح کرم یوگ کے معنی یہ ہوئے کہ سماج کا رکن رکین ہونے کے ناطے ہمیں کام کا آغاز عام طریقہ سے کرنا چاہئے مگر اس کام سے حاصل ہونے والے ذاتی مفاد کے تصور کو اپنے من سے بالکل ہٹا لینا چاہئے۔یہی گیتا کی تعلیم ہے اور یہی گیتا کا خاص پیغام۔گیتا محض ایک کتاب ہی نہیں ہے بلکہ برصغیر کی روحانی تاریخ کا ایک واضح باب بھی ہے۔

اگرچہ برصغیر کی بات چل رہی ہے تو برصغیر بلکہ قدیم ٹیکسلا کا ایک قدیم پولٹیکل فلاسفر ہے چانکیہ اس کی کتاب ''ارتھ شاستر'' ایک اہم کتاب ہے اس کتاب میں کوٹلیہ چانکیہ نے انسان کی مکاری اور عیاری کو کھول کر بیان کیا ہے اور بتایا ہے کہ مذہبی اقدار کا سیاسی اقدار سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے اقتدار میں صرف اپنے مفادات عزیز ہوتے ہیں کہ جن کا تحفظ کیا جاتا ہے۔ پولٹیکل سائنس کی یہ اہم کتاب ہے کہ جس کے پڑھے بغیر ہم سیاسیات کی ابجد کو سمجھ نہیں سکتے تو سیاسیات کو سمجھنے کیلئے اس کتاب کا مطالعہ اشد ضروری ہے۔مغرب میں میکیاولی کو مکاری اور عیاری کا باپ سمجھا جاتا ہے جب کہ چانکیہ میکیاولی کا بھی باپ ہے۔چانکیہ نے ارتھ شاستر میں میکیاولی سے کہیں زیادہ سیاسی گر سمجھائیں ہیں اور یہ گر آج کی سیاست میں اتنے ہی کارآمد ہیں جتنے کہ یہ قدیم دور میں تھے۔یہ چانکیہ کی سیاسی فہم اور تعلیم کا نتیجہ تھا کہ چندر گپت تھوڑے ہی عرصے میں ہندوستان کا مالک بن گیا۔اس سے زیادہ قابل عمل کتاب کون سی ہو سکتی ہے؟

مہابھارت کا اگر متبادل بیانیہ پڑھنا ہے تو اعتزاز احسن کی کتاب ''سندھ ساگر'' اہم ہے اس میں وہ لکھتے ہیں" ایک تشنہ سوال یہ ہے کہ کیا ہندوستان کی مائل بہ مرکز کشش کوئی، فوق

الفطرت قوت ہے جو وادی سندھ کو دوبارہ خود میں ضم کر لے گی؟ یا سندھ کی وادی (پاکستان) کا وجود اساسی طور پر ہندوستان سے ماورا ہے؟ کیا اس علاقے میں اپنی کوئی مرکز گریز قوت نہیں ہے؟"

اعتزاز احسن کے بقول "جب میں ماضی بعید کی طرف یادوں کے سفر پر نکلا تو مجھ پر یہ راز کھلا کہ چھ ہزار سال کی معلوم تاریخ میں سے ساڑھے پانچ ہزار سال تک پاکستان ایک علیحدہ اکائی کے طور پر قائم رہا ہے۔ اس دوران وادی سندھ شاز و نادر ہی ہندوستان کا حصہ رہی تھی۔ اس انکشاف نے مجھے اپنے بارے میں ایک آگہی دی کہ میں ایک شاندار تسلسل کا حصہ ہوں۔" سندھ ساگر میں وادی سندھ کے اصل باشندوں کا کھوج لگانیکی کوشش کی گئی ہے۔ یہ کتاب قبل از تاریخ سے 1947ء کے بٹوارے تک کے عرصے پر محیط ہے۔

بیسویں صدی کا ایک اہم پولیٹیکل فلاسفر انٹونیو گرامچی ہے جس کی طرف ہمارے ہاں زیادہ توجہ نہیں دی گئی۔ گرامچی کو "پوسٹ لینینسٹ مارکس ازم" کا سب سے اہم لکھاری اور نظریہ ساز مانا جاتا ہے۔ گرامچی 1891ء میں اٹلی میں پیدا ہوا۔ بچپن میں بیماری کیباعث اس کا قد چھوٹا رہ گیا اور وہ کسی حد تک کبڑا ہوا گیا۔ 1911ء میں اس کا ٹیورن یونیورسٹی میں سکالرشپ پر داخلہ ہو گیا۔ 1913ء میں وہ "اٹالین سوشلسٹ پارٹی" کا رکن بنا اور جلد ہی اس کا اہم عہدہ دار بن گیا۔ 1915ء میں خراب صحت اور کسی حد تک معاشی مسائل کی وجہ سے اس نے اپنی تعلیم کو ادھورا چھوڑ دیا۔ اس کی تعلیم چھوڑنے کی ایک وجہ اس کی بڑھی ہوئی سیاسی زمہ داریاں بھی تھیں۔ گرامچی نے اگرچہ 1914ء میں یونیورسٹی کی تعلیم کے دوران ہی سوشلسٹ اخباروں کے لئے لکھنا شروع کر دیا تھا تاہم 1919ء میں اس نے اپنا اخبار بھی قائم کر لیا۔ 1921ء میں گرامچی نے "کیمونیسٹ پارٹی اف اٹلی" کی بنیاد رکھی وہ سمجھتا تھا کہ سوشلسٹ پارٹی کی "ورکرز کونسل "ایک قومی تحریک بننے میں کامیاب نہیں ہوسکی۔ 1926ء میں اٹلی میں مسولینی کی فاشسٹ حکومت قائم ہوئی تو اس حکومت نے بہت سے لوگوں کو گرفتار کر کے جیلوں میں بند کر دیا ان میں گرامچی بھی تھا اگرچہ گرامچی پارلیمنٹ کا ممبر اور کیمونسٹ پارٹی کا جنرل سیکرٹری تھا اسے بھی مخالف نظریات کی وجہ سے پکڑ کر جیل میں ڈال دیا گیا جب کہ اس کے پراسیکیوٹر نے جج سے کہ کہا کہ "ہر حال میں اس ذہن کو بیس سال کے لئے روک دیا جانا چاہئے۔" اسے فوری طور پر پانچ سال کی سزا سنا دی گئی جسے بعد ازاں بیس سال تک بڑھا دیا گیا۔ یہیں جیل میں گرامچی نے کوئی 3000 صفحات پر مشتمل 30 سے زائد نوٹ بکس لکھیں۔ جو بعد ازاں "پرزن نوٹ بکس" کے عنوان سے شائع ہوئیں۔ جیل میں رہتے ہوئے وہ بے شمار بیماریوں کا شکار ہوا اور بالاخر 1937ء میں جب کہ ابھی وہ صرف چھالیس سال کا تھا اس

دارفانی سے کوچ کر گیا۔

گرامچی نے اپنا سب سے اہم تخلیقی اور ادبی کام جیل میں کیا۔اس کا سب سے اہم کام ؛تاریخ اور کلچر،سٹیٹ اور سول سوسائٹی کا طریقہ کار، مارکس ازم،تعلیم اور فلاسفی پر ہے۔گرامچی نے جو اہم تصورات دیئے ان میں ثقافتی غلبہ، وار اف پوزیشن، روایتی اور ارگینک انٹلیکچوئلز،سٹیٹ اور سول سوسائٹی کا طریقہ کار اہم ہیں۔

گرامچی کے نزدیک ریاست یا سٹیٹ محدود معنوں میں حکومت نہیں ہے۔اس کی بجائے گرامچی سٹیٹ کو دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے؛ اولا: "پولیٹیکل سوسائٹی" یعنی پولیس، آرمی، لیگل سسٹم وغیرہ۔۔۔انہیں گرامچی سیاسی ادارے اور آئینی کنٹرول کا اکھاڑہ کہتا ہے۔دوئم:"سول سوسائٹی" یعنی خاندان، تعلیمی ادارے،ٹریڈ یونینز وغیرہ۔۔۔انہیں عمومی طور پر ہم پرائیویٹ یا نان سٹیٹ کرّے کے طور پر دیکھتے ہیں یہ ریاست اور اکانومی کے درمیان مصالحت کار کا کردار ادا کرتی ہے۔

گرامچی کے بقول یہ تقسیم صرف تصوراتی ہے جب کہ عملی طور پر یہ دونوں کلی یا جزوی طور پر ایک دوسرے کو مکمل طور پر ڈھانپے ہوئے ہیں یا اوور لیپ کر رہے ہیں۔

گرامچی مزید کہتا ہے کہ کیپٹیلسٹ سٹیٹ دراصل طاقت اور رضامندی کے ذریعے حکمرانی کرتی ہے؛"پولیٹیکل سوسائٹی" کی قلمرو طاقت ہے اور"سول سوسائٹی" کی قلمرو رضامندی۔

گرامچی یہ سمجھانے کی کوشش کرتا ہے کہ ماڈرن کیپٹیلزم میں بورژوازی طبقہ(سرمایہ دار استحصالی طبقہ)سول سوسائٹی کے بیچ،ٹریڈ یونینز اور بڑی سیاسی پارٹیوں کی پیش کی گئی چند ڈیمانڈز کو پورا کر کے اپنا معاشی کنٹرول قائم کرتا ہے جس پر سیاسی کرّے کے ذریعے عمل درامد کرایا جاتا ہے۔ اس طرح بورژوازی طبقہ اپنے فوری معاشی مفادات سے بالا ہو کر اپنے "ثقافتی غلبہ" کی مختلف شکلوں کو تبدیلی کی راہ پر ڈال کر "مجہول یا غیر متحرک انقلاب"میں مشغول رہتا ہے۔

گرامچی واضح کرتا ہے کہ تحریکیں جیسا کہ ریفارم ازم اور فاش ازم اور اسی طرح فریڈرک ٹیلر کی سنٹیفک مینجمنٹ یا ہنری فورڈ کی اسمبلی لائن میتھڈز اس ثقافتی غلبے کی مثالیں ہیں۔

گرامچی ثقافتی غلبے یا کلچرل ہیجمنی کی تھیوری کی وضاحت کرتے ہوئے کہتا ہے کہ سٹیٹ اور رولنگ کیپٹیلیسٹ سوسائٹیز میں کیپٹلسٹ یا بورژوازی کلاس ثقافتی اداروں کو اپنی طاقت کو قائم رکھنے کے لئے استعمال کرتی ہے۔گرامچی کے مطابق کیپٹیل ازم نہ صرف تشدد اور سیاسی اور معاشی جبر بلکہ اپنی ائیڈیالوجی کے ذریعے اپنی اقدار اور اپنے مفادات کو اس طرح اشاعت پزیر کرتا ہے کہ وہ ہر شخص کو "کامن سینس" کے طور پر اپنی اقدار لگتی ہیں اور اس طرح

بورژوازی طبقہ "سٹیٹس کو" کو قائم رکھنے میں کامیاب رہتا ہے۔اس طرح "غلبے کی طاقت" رضامندی کو" کیپٹلسٹ آرڈر" کے طور پر قائم کرتی ہے نہ کہ نظم وضبط قائم کرنے کے لئے" غلبے کی طاقت" کو عمل میں لاتی ہے۔مقتدرہ اس ثقافتی غلبے کو اداروں،سماجی تعلقات اور تصورات کے گٹھ جوڑ کے ذریعے بار بار پیدا کرتی ہے اور ختم کرتی ہے جو کہ "سپر سٹرکچر" بناتے ہیں۔اس طرح گرامچی تجزیہ کرتے ہوئے بتاتا ہے کہ برسر اقتدار کیپٹلسٹ کلاس۔۔۔بورژوازی طبقہ۔۔۔کس طرح اپنا تسلط قائم اور برقرار رکھتا ہے۔

تقلید پسند مارکس ازم یا ارتھوڈوکس مارکس ازم،نے یہ پیشین گوئی کی تھی کہ سرمایہ دارانہ نظاموں میں سوشلسٹ انقلاب ناگزیر ہے جب کہ بیسویں صدی کے اغاز میں ترقی یافتہ اقوام میں ایسا کوئی انقلاب برپا نہیں ہوا بلکہ ایسا محسوس ہونے لگا کہ سرمایہ دارانہ نظام پہلے سے کہیں زیادہ مورچہ بند ہو گیا ہے۔یہ صرف گرامچی کے دو نظریات ہیں جن کا یہاں زکر ہوا ہے اس کے علاوہ اس کا "روایتی اور ارگینک انٹلیکچوئلز" کا نظریہ بھی بہت اہم ہے۔تاہم کہا جا سکتا ہے کہ گرامچی کی فلاسفی اج بھی اسی طرح عمل پذیر ہے جس طرح بیسویں صدی کے اغاز پر تھی اس کے نظریات آج بھی اتنے ہی قابل غور ہیں جتنے کے کل تھے اس طرح "سیلیکٹیڈ فرام پرزن نوٹ بک" ایک اہم کتاب بن جاتی ہے کہ جس کا مطالعہ آج بھی اتنا ہی اہم ہے جتنا کہ کل تھا۔

''مکیاولی سے گرامچی تک'' اشفاق سلیم مرزا کی کتاب ہے۔اشفاق سلیم مرزا سیکولر اور سائنسی اندازفکر کے قائل ہیں۔زیر نظر کتاب میں انہوں نے اسی فکری پس منظر میں رہتے ہوئے جدید سیاسی فکر کا محاسبہ کیا ہے۔کتاب میں ان کا بنیادی مقدمہ یہ ہے کہ جدید سیاسی فکر کے اکثر نظریات ذاتی ملکیت کے سوال کے جواب میں سامنے آئے ہیں۔بعض نظریات میں ذاتی ملکیت کو انسان کا بنیادی حق سمجھا گیا ہے جن میں لبرلزم اور سرمایہ داری شامل ہیں جبکہ کچھ نظریات مثلاً سوشلزم میں ذاتی ملکیت کو سماجی خرابیوں کی جڑ قرار دیا جاتا ہے۔مصنف کی رائے میں ذاتی ملکیت کے تاریخی ارتقا کا بہترین تجزیہ فریڈرک اینگلز کی کتاب خاندان،ریاست اور ذاتی ملکیت کا آغاز میں ملتا ہے۔مصنف ذاتی ملکیت سے جنم لیتے معاشی استحصال کو پسند نہیں کرتے لیکن ان کے خیال میں ذاتی ملکیت پر پابندی کا سوویت سوشلسٹ ماڈل انسانی آزادی کی ضمانت دینے میں ناکام ثابت ہوا ہے۔دو صدیوں پر پھیلی اس اکھاڑ پچھاڑ کا جائزہ لیتے ہوئے وہ اس نتیجہ تک پہنچتے ہیں کہ ذاتی ملکیت کا یکسر خاتمہ غیر حقیقی ہے اور قرین واقعہ یہ ہے کہ اسے انسانی حقوق میں شامل سمجھا جائے۔تاہم وہ سرمایہ کو بے لگام نہیں دیکھنا چاہتے اور اسکنڈے نیوین ماڈل کی فلاحی ریاست کی تجویز دیتے ہیں۔

یاسر حبیب کہتے ہیں شاید ول ڈیورنٹ کا قول ہے کہ فلسفہ ہمیشہ مورخین کو لکھنا چاہیئے اور تاریخ ہمیشہ فلسفیوں کو۔ اشفاق سلیم مرزا اس نزاکت کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ چنانچہ جب فکری امور اور نظریات کی گفتگو ہو تو مرزا صاحب تاریخی تناظر کا حوالہ لازمی سمجھتے ہیں اور جب تاریخی عمل کی بات ہو تو ان کے نزدیک اس عمل کا بہترین سراغ اس دور کی فکر اور اس کے ارتقا میں تلاش کیا جانا چاہیئے۔

اگر ہم بیسیویں صدی کے فلاسفہ کی طرف مزید آگے بڑھیں تو روسی نژاز امریکن فلاسفر آئن رینڈ کو ایک اہم لکھاری کے طور پر پاتے ہیں۔آئن رینڈ کے دوناول "دی فاونٹین ہیڈ" اور "اٹلس شرجڈ" مقبولیت عامہ حاصل کر چکے تھے جب کہ اس کے فلاسفیکل مضامین کی کتاب "فلاسفی ہو نیڈز زاٹ" رینڈ کی وفات کے بعد 1982ء میں شائع ہوئی ابتداًا سے پزیرائی نہ مل سکی لیکن بعد میں اس کی فلاسفی کو تسلیم کیا جانے لگا۔آئن رینڈ کو معروضی فلسفے کا بانی سمجھا جاتا ہے۔
رینڈ کے مطابق تمام انسانی زمہ داریوں میں فلاسفی ایک اہم رول ادا کرتی ہے کہ ہر عمل اور تصور کی بنا کچھ مفروضے ہوتے ہیں جب کہ ان مفروضوں کو جانچنے کی ضرورت ہوتی ہے تا کہ ایک بامعنی اور مکمل زندگی گزاری جاسکے۔

رینڈ کہتی ہیں کہ وہ کیپٹیل ازم کی حامی نہیں ہیں بلکہ وہ "خود بینی" کی حامی ہیں۔وہ مزید کہتی ہیں کہ وہ خود بینی کی حامی نہیں ہیں بلکہ وہ "سبب" یا ریزن کی حامی ہیں۔
"سبب"،معروضی فلسفے کے مطابق،انسان کا نمایاں وصف ہی نہیں ہے بلکہ اس کا بنیادی وصف ہے مزید یہ کہ انسان کی بقا کا بنیادی زریعہ ہے۔"سبب" ادراکی طور پر حاصل کیئے گئے حقائق کو ایک "طرز فکر" میں ڈھالنے کا نام ہے۔یہ مقصد آخر کار ایک وسعت میں ادغام پزیر ہوتا ہے۔۔۔
ایسے ادغام جو انسان کو کائنات کا علم عطا کرتے ہیں جس میں وہ عمل کرتا ہے،علم حاصل کرتا ہے اور موزوں اقدار حاصل کرتا ہے۔اسی لئے انسان کو "مابعد الطبیعات،نظریہ علم،اور اخلاقیات" کی ضرورت پیش آتی ہے یعنی اسے فلاسفی کی ضرورت ہوتی ہے تا کہ وہ سوچنے،عمل کرنے اور زندہ رہنے کے قابل ہو سکے۔
میں نے تمام کتاب سے تو اکتساب حاصل نہیں کیا لیکن جستہ جستہ اسے پڑھا ہے اس سے میں نے جانا کہ آئن رینڈ کہتی ہیں کہ "اگر بظاہر ایک ان پڑھ انسان ہے لیکن اگر وہ اپنے کام کا ماہر ہے تو وہ ان پڑھ کیسے ہو سکتا ہے؟"

مزید آگے بڑھتے ہوئے جب ہم انسانی تہذیبوں کا جائزہ لیتے ہیں تو ہم جانتے ہیں کہ انسانی تاریخ دراصل مختلف تہذیبوں کی تاریخ ہے۔ایک نقطہءنظر کے مطابق مذہب ہی وہ واحد

وصف ہے جو تہذیبوں کی تشکیل کرتا ہے جب کہ اس نظریئے سے اختلاف کرنیوالے کہتے ہیں کہ پھر دنیا یہودی تہذیب کو اسرائیل کے حوالے سے کیوں ایک تہذیب تسلیم نہیں کرتی؟ کیا ایسا تہذیبوں کے درمیان تصادم کی کیفیت کی وجہ سے ہے؟ کیا عالمی سیاست کے مستقبل میں تہذیبوں کی درمیان جھگڑے چھائے رہیں گے؟ یہ اہم سوال ہیں کہ جن کا جواب سیموئل۔ پی ہٹنگٹن نے 1997ء میں اپنی شائع ہونے والی کتاب "تہذیبوں کا تصادم اور بین الاقوامی نظام کی تشکیل نو" میں دیتے ہوئے پیشین گوئی کی کہ تہذیبوں کے درمیان تصادم عالمی امن کے لئے سب سے بڑا خطرہ ہے نیز ہٹنگنٹن نے بتایا کہ تہذیبوں کی بنیاد پر تشکیل دیا گیا بین الاقوامی نظام جنگ سے بچاؤ کا واحد وسیلہ ہوسکتا ہے۔ گزشتہ برسوں میں رونما ہونے والے واقعات نے ہنگٹن کی اس پشن گوئی کو سچ ثابت کیا۔ آج سرد جنگ کے بعد کی دنیا میں لوگوں کے درمیان واضح تقسیم و تفریق نظریاتی یا معاشی نہیں ہے بلکہ ثقافتی ہے۔ عالمی سیاست ثقافتی خطوط پر نئے سرے سے تشکیل پا رہی ہے۔ نئی طرز کے مناقشے اور دوستیاں سرد جنگ کے مناقشوں اور دوستیوں کی جگہ لے رہے ہیں۔ مجموعی طور پر تہذیبوں کا تصادم مغربی تہزیب کے امریکی حصے کی حکمت عملی کو منکشف کرتے ہیں۔ ہنگٹن نے پشین گوئی کرتے ہوئے کہا تھا "ایسا دکھائی دیتا ہے کہ آنے والے پورے عشرے میں مغرب اپنی بقا کے لئے غیر مغربی خصوصاً اسلامی، چینی اور اس خطے کی دوسری بڑی تہذیبوں ے خلاف جاری کارروائیوں میں مزید اضافہ کردے گا اور دنیا تاریخ میں رونما ہونے بڑے المیوں اور خونریزیوں کو مستقبل میں بہت معمولی کہے گی" اور یہ پشین گوئی سچ ثابت ہو رہی ہے۔ تہذیبوں کے تصادم کو سمجھنے کے حوالے سے یہ کتاب آج بھی اہم ہے۔

ہم آگے بڑھتے ہیں اور نفسیات کو دیکھتے ہیں کہ یہ ایک مضمون ہے کہ جس کا پڑھا جانا بھی ضروری ہے۔ میری ناپسندیدہ کتابوں میں اردو میں لکھی گئی ایک کتاب ہے جس کا عنوان ہے "نفسیات"۔ اب میں اس کے لکھاری کا نام نہیں لینا چاہتا یہ وہ کتاب تھی جسے میں نے اپنی ابتدائی زندگی میں خریدا اور یہ پہلی کتاب تھی جسے میں نے خرید کیا لیکن اس کتاب نے مجھے مایوس کیا۔ نفسیات بطور مضمون مجھے پسند ہے میں نے کبھی "ابنارمل سائیکالوجی" پڑھی تھی جو بہت زیادہ پسند بھی آئی۔

یہ پہلی عالمی جنگ تھی کہ جس کے نتیجے میں نفسیات کی ایک اہم برانچ کی بنیاد رکھی گئی جب کہ فرائیڈ نے ''تحلیل نفسی'' کا نظریہ پیش کیا۔ یہ پہلی عالمی جنگ کا نتیجہ تھا کہ لوگ خاص طور پر ویانا کی ایلیٹ کلاس کی خواتین جو حسد، رقابت، محبت، نفرت، خوف، دہشت، ندامت اور پشیمانی کے مداوے کے لئے فرائڈ کے پاس پہنچتی تھیں۔ ان علامتوں اور ان رویوں کے مطالعے کے بعد

فرائڈ نے اپنے نظریات کو ایک واضح شکل دینا شروع کی۔ یوں عالمی جنگ کی تباہ کاریوں اور جنگ کے دوران ہونے والی سماجی ٹوٹ پھوٹ نے فرائڈ کے نظریات کو جلا بخشی اور ان نظریات نے کسی نہ کسی طور دانشوروں کے طبقے میں مذہب کی سی اہمیت بھی اختیار کر لی۔ آج کے جدید انسان کی ذہنی تشکیل میں جہاں تنہائی، کرب، مغائرت اور تشکیک کے علاوہ اور بہت سے عوامل کار فرما ہیں وہاں فرائڈ کا نظریہ تحلیل نفسی خاص اہمیت کا حامل ہو جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ انسانیت کو تین دھچکے لگے ہیں۔ پہلا دھچکا کوپرنیکس نے لگایا۔ کوپرنیکس سے پہلے یہ نظریہ عام تھا کہ ہماری زمین ساری کائنات کا مرکز ہے جس کے گرد سورج، چاند اور دیگر سیارے گھومتے ہیں لیکن کوپرنیکس کی علمی تحقیق نے یہ ثابت کیا کہ زمین تو ایک چھوٹا سا سیارہ ہے جو کہ سورج کے گرد گھومتا ہے اس طرح لوگوں کے اس رجحان کو کہ زمین پوری کائنات کا مرکز ہے جس کے گرد سورج چاند ستارے گھومتے ہیں کو شدید دھچکا لگا۔ دوسرا دھچکا ڈارون نے لگایا۔ لوگ جہاں زمین کو مرکز کائنات سمجھتے تھے وہیں انسان کو بھی اشراف المخلوقات کی حثیت سے کائنات کا مرکز و محور سمجھتے تھے۔ ڈارون کا یہ کہنا کہ انسان کمتر جانوروں کی ارتقا یافتہ شکل ہے، انسانیات کے لئے دوسرا دھچکا ثابت ہوا جس کا علمی اور مذہبی حلقوں میں شدید ترین ردعمل ہوا۔ انسانیت کو تیسرا دھچکا فرائڈ کے نظریہء تحلیل نفسی نے لگایا۔ فرائڈ کی علمی کاوشوں سے نفس انسانی کی عمیق ترین تہوں کا سراغ ملا اور جنسیت کو انسانی کردار کی قوت محرکہ قرار دیا گیا۔ فرائڈ سے قبل جنسیت کو شر اور گناہ کا مصدر و منبع سمجھا جاتا تھا اور روحانی اور اخلاقی ترقی کے لئے جنسی داعیات کی نفی کو ضروری سمجھا جاتا تھا۔ قرون وسطی کے متعصّبانہ ذہنی رویوں کے لئے فرائڈ کا نظریہ تحلیل نفسی ایک بہت بڑا صدمہ تھا۔ جناب ڈاکٹر نعیم احمد نے فرائڈ کے نظام فکر کو سائنسی معروضیت کے ساتھ کتاب ''تحلیل نفسی'' میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ ایک جامع کتاب ہے اس میں اردو اصطلاحات کے ساتھ ساتھ ان کے انگریزی مترادفات بھی دیئے گئے ہیں اور بعض تصورات کی تشریح حواشی میں کئی گئی ہے۔ انسانی نفسیات کو سمجھنے کے لئے تحلیل نفسی ایک کارآمد اور سہل کتاب ہے کہ جس کا مطالعہ ضروری ہے۔

نفسیات کا شمار سائنس میں ہوتا ہے تو سائنس کی ایک اہم کتاب سٹیفن ہاکنگ کی " بریف آنسرز ٹو دی بگ کوئسچنز " ہے جو حال میں ہی شائع ہوئی ہے۔ یہ کتاب سٹیفن ہاکنگ کی وفات کے بعد شائع ہوئی جسے کچھ دوسرے لوگوں نے مرتب کیا۔ کتاب کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے: ہم یہاں کیوں ہیں؟ کیا ہم زندہ رہیں گے؟ کیا ٹیکنالوجی ہمیں سنوارے گی یا بگاڑے گی؟ کیا ہم پھلے پھولیں گے ترقی پائیں گے؟

یہاں دس اہم اور بڑے سوالوں کو زیر غور لایا گیا ہے: کیا خدا ہے؟ اس کائنات کا آغاز کیسے ہوا؟

بلیک ہولز کے اندر کیا ہے؟ کیا ہم مستقبل کی پشین گوئی کر سکتے ہیں؟ کیا ٹائم ٹریول ممکن ہے؟ کیا ہم زمین پر زندہ رہیں گے؟ کیا اس زمین پر کوئی اور زہین زندگی بھی موجود ہے؟ ہم مستقبل کو کیسے کوئی واضح شکل دے سکتے ہیں؟ کیا خلا میں ہم کالونیاں بنا پائیں گے؟ کیا مصنوئی زہانت ہمیں زیادہ ہوشیار بنا دے گی؟ ہم اپنے مستقبل کو کیسے متشکل کریں گے؟سٹیفن ہا کنگ نے سائنسی نقطہ نظر سے ان سوالوں کے جواب بڑی خوب صورتی سے دیئے ہیں۔ یہ کتاب بھی پڑھنے کے قابل ہے۔

اب ہم آگے بڑھتے ہیں اور نان فکشن کی دنیا سے فکشن کی دنیا کی طرف آتے ہیں اگر چہ گرامچی کے حوالے سے فسطائیت کا زکر قبل ازیں ہو چکا ہے جب کہ فسطائیت کے خلاف اگر ہم فکشن کی طرف آئیں تو فونطامارا کو ایک اہم ناول پاتے ہیں کہ جس کا زکر بہت ضروری ہے۔ لبرل ازم، مارکسزم، اور انارکزم کی تحریکیں کسی نہ کسی طور پہلی جنگ عظیم کے وقت موجود تھیں لیکن دوسری جنگ عظیم کے دوران اٹلی میں ان تحاریک کے بالکل خلاف ایک نئ تحریک فاشزم کا اغاز ہوا۔ فاشزم ایک ایسا استبدادی طرز حکومت ہے جس میں حکومت کے پاس بے پناہ طاقت ہوتی ہے جب کہ عوام کے پاس سیاسی آزادیاں نہ ہونے کے برابر رہ جاتی ہیں۔ پہلی جنگ عظیم (1914ء تا 1918ء) کے نتیجے میں جنگ کے طریقہ کار، معاشرے اور ریاست کے ساتھ ٹیکنالوجی میں نمایاں تبدیلیاں فاشزم کو تقویت دینے کا باعث بنیں۔ فاشٹ ان تبدیلیوں کو انقلاب سمجھ رہے تھے جس کے نتیجے میں 1926ء کے اغاز میں اٹلی میں مسولینی اپنی جابرانہ حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔(اس سے پہلے 1917ء میں روس میں انقلاب آ چکا تھا۔ جس میں زار روس کی مطلق العنان حکومت ختم ہوئی اور سویٹ رشیا(USSR) کا احیاء ہوا۔ یہ سوشلسٹ انقلاب تھا جس کا داعی لینن تھا۔) ابھی فسطائیت کی ہولنا کیوں کے چرچے عام ہونا ہی شروع ہوئے تھے کہ اگنازیوسلونے جو پادری بننا چاہتا تھا لیکن جبر کے ہاتھوں مجبور ہو کر کسان تحریک میں شامل ہو کر فسطائیت کے خلاف مزاحمت کار بن گیا۔ جب تشدد بہت زیادہ بڑھا تو اگنازیو نے اٹلی کو خیر باد کہا اور سوئٹزر لینڈ چلا آیا اسی دوران جرمنی بھی نازی پارٹی کے سربراہ اڈولف ہٹلر کی گرفت میں چلا گیا۔ ردعمل کے طور پر ''فاشسٹ دشمن تحریکوں'' نے بھی جنم لینا شروع کر دیا تھا یہی وہ حالات تھے کہ جس کے نتیجے میں فونطامارا کا ظہور ہوا۔ فونطامارا 1930ء کی دہائی کے آخری دنوں میں اٹلی کی صورت حال کی عکاسی کرتا اگنازیوسلونے کا ناول ہے جو 1934ء میں شائع ہوا۔ اس ناول نے یورپ سے اٹھنے والی فاشزم دشمن تحریکوں کو ہی مہمیز نہیں دی بلکہ ہم جیسے تیسری دنیا کے ممالک کے بسنے والوں کی سامراج دشمن تحریکوں کو بھی سہارا دیا۔ یہی وجہ تھی کہ فونطامارا کے تراجم دھڑا دھڑ

دوسری زبانوں میں منظرعام پر انا شروع ہو گئے۔ یہ اس صدی کی چوتھی یا پانچویں دہائی کے ابتدائی سال تھے جب فونطامارا کا ترجمہ لاہور میں شائع ہوا۔

جنگ عظیم کے بعد کے مضمحل اٹلی اور جرمنی کی غیر مطمعن عوام کو اپنے اردگرد جمع کرنا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ ہٹلر اور مسولینی نے عوام کی مشکلات کا بھرپور فائدہ اٹھایا۔ عوام سے کہا گیا کہ ان کے سب سے بڑے دشمن یہودی، بولشویک، سرمایہ دار اور سوشلسٹ ہیں اور عوام کو بدنما ماضی سے بہت بہتر مستقبل دینے کا وعدہ کیا۔ انہوں نے اپنے پیروؤں کو تلقین کی کہ طاقت ہی ان کے مسائل کا حل ہے لہذا انہوں نے اپنے ساتھیوں کو تشدد کا سبق دیا جو کہ فاشزم کا بنیادی ہتھیار ہے۔ یہ بات اہم ہے کہ ہم آج بھی کسی نہ کسی طور ایک طرح کی نہ صحیح کسی دوسری طرح کی فسطائیت کا شکار ہیں اس حوالے سے یہ ناول اور بھی زیادہ اہمیت اختیار حاصل کر لیتا ہے کہ جس کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔ فاشسٹ اپنی طاقت اور پوری توانائی اور مقبولیت عوام کی شکایات اور ان کی نفرت سے حاصل کرتا ہے۔ فاشزم ان بے کار اور بے روزگار نوجوانوں سے ان عناصر سے انتقام لینے کا وعدہ کرتا ہے کہ جن کی وجہ سے ان لوگوں کو بے روزگاری اور بے کاری کی چکی میں پسنا پڑتا ہے۔ فسلطائی لیڈر اور ان کے مالی حوالی عوام کی شکایات اور ان سے پیدا شدہ نتائج کی بیخ کنی کا وعدہ کرتے ہیں۔ انہیں خوب سبز باغ دکھاتے ہیں اور بڑے بڑے وعدے کرتے ہیں ایسے وعدے کہ ایک عالم پر عیاں ہوتا ہے کہ ان وعدوں کی تکمیل ناممکن ہے لیکن اس کے باوجود فسطائی تحریکیں خوب پھلتی پھولتی ہیں کہ نوجوان کسی دوسرے کی بات سننے کو تیار نہیں ہوتے اور اس طرح کنزرویٹوز کو ایک گالی بنا دیا جاتا ہے۔ کیا ہمارے ہاں بھی ایسا ہی نہیں ہو رہا؟ اگنازیو سلونے تادم مرگ 1978ء تک جنیوا سوئٹزرلینڈ میں رہا۔ اگنازیو 1900ء میں اٹلی میں پیدا ہوا تھا۔

اس سے پہلے بتایا جا چکا ہے کہ 1930ء تک فاشسٹ دشمن تحریکیں جنم لے چکی تھیں۔ ان تحریکوں کے نتیجہ میں 1936ء میں سپین میں خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ اس خانہ جنگی میں جارج اورویل بھی ایک سپاہی کے طور پر شامل تھا۔ یہ جنگ تھی جو اورویل کے سیاسی نظریات کو متشکل کر رہی تھی جس کا اظہار اس نے اپنے ناولوں؛ 1984 اور اینیمل فارم میں کیا۔ جب کہ جنگ کے مشاہدات کو جارج اورویل نے ''ہومیج ٹو کیٹیلونیا'' میں قلم بند کیا۔ یہ کتاب 1952ء تک امریکہ میں شائع نہ ہو سکی جب کہ یہ کتاب 1938ء میں برطانیہ میں شائع ہو چکی تھی۔

یہ سپین کی خانہ جنگی تھی کہ جس نے دوسری جنگ عظیم کی راہ ہموار کی۔ یہ نظریات کے ساتھ ساتھ مفادات کی بھی جنگ تھی۔ برطانیہ، فرانس اور امریکہ کی حکومتیں سپین کے شانہ بشانہ کھڑی تھیں جبکہ جنرل فرانسکو فرانکو کو پوری اجازت دی گئی کہ وہ ہٹلر اور مسولینی سے خاطر خواہ مدد

حاصل کر سکے جب کہ دوسری طرف بائیں بازو کے وفادار ریپبلکن تھے۔
ایک طرف فاشسٹ محوری طاقتیں تھیں جن میں جرمنی، اٹلی اور جاپان شامل تھے۔ پہلا معاہدہ 1936ء میں جرمنی اور اٹلی کے درمیان ہوا جب کہ اسی سال دوسرا معاہدہ جرمنی اور جاپان کے درمیان ہوا جس کی رو سے ان کے درمیان جنگی اتحاد قائم ہو گیا۔ دوسری طرف ان کے مقابل اتحادی فوجیں تھیں جن میں ابتداً فرانس، پولینڈ، برطانیہ عظمیٰ اور برطانوی ہند شامل تھے جلد ہی ان میں اسٹریلیا، کینڈا، نیوزی لینڈ اور جنوبی افریقہ بھی شامل ہو گئے۔ جرمنی کے شمالی یورپ پر حملے کے نتیجے میں نیدرلینڈ، بلجیئم، یونان، یوگوسلاویہ نے بھی اتحادیوں کے ساتھ شامل ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ جب جرمنی نے روس پر حملہ کیا تو روس بھی 1941ء میں اتحادیوں میں شامل ہو گیا۔ دسمبر 1941ء میں امریکن نیول بیس پرل ہاربر پر جاپانی حملے کے نتیجے میں امریکہ بھی اس جنگ میں کود پڑا۔ 8 مئی 1945 کو ہٹلر کی خودکشی، جرمنی کے غیر مشروط طور پر ہتھیار پھینکنے اور روس کے برلن پر قبضے کے بعد 26 جولائی 1945ء کو اتحادیوں نے ایک معاہدہ سائن کیا جس کے مطابق جاپان کو غیر مشروط طور پر ہتھیار پھینکنے کا کہا گیا جب کہ جاپان نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ تب 6 اور 9 اگست کو ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم برسا دیئے گئے جس کے نتیجے میں جاپان ایک ہولناک تباہی سے دوچار ہوا جس کے نتیجے میں جنگ تو ختم ہو گئی لیکن جاپان میں جس انسانی المیئے نے جنم لیا اس کا احوال ماسوجی ایبوسے نے اپنے ناول "کالی بارش" میں کیا ہے۔

ناول کا بیانیہ زمانی اعتبار سے چار مختلف سطحوں پر متواتر حرکت پزیر رہتا ہے۔ جنگ سے پہلے کا پرسکون اور ہموار وقت، جنگ کے دوران کا فوجی فسطائیت اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی دشواریوں سے پُر زمانہ، جنگ کے نقطہ عروج پر بم کی ہلاکت خیزیوں کے دن اور جنگ کے خاتمے کے بعد کی زندگی۔ وقت کی یہ چاروں سطحیں انسانی احساس، امتزاج اور رویے کی رنگا رنگی ہے جس سے مل کر یہ زندگی ترتیب پاتی ہے۔ ماسوجی ایبوسے کا ناول کالی بارش دریاؤں اور پلوں سے آراستہ ایک حسین شہر کی ہولناک تباہی، ایک غیر معمولی صورت حال کا سامنا کرتے ہوئے معمولی انسانوں کے شب روز اور لمحہ بہ لمحہ شکست کی جانب بڑھتی ہوئی ایک قوم کی نفسیاتی کیفیت کی تصویر کشی کرتا ہے اور جنگ اور ایٹم بم سے نفرت کا ایک ہم گیر پیغام ہی نہیں ہے بلکہ زندگی کی رنگارنگی اور ہمہ گیری کا اثبات بھی ہے۔ یہ ناول پہلی بار 1965ء میں شائع ہوا۔

قبل ازیں ہرمن ہیسے کا ناول سدھارتا کے حوالے سے زکر ہو چکا۔ ہرمن ہیسے کا تعلق جرمنی سے تھا اس نے یہ ناول پہلی جنگ عظیم کے بعد 1922ء میں لکھا تھا۔ 1930ء میں جرمنی میں بے شمار سکالرز کی کتابوں کو آگ سے جلایا گیا اور ان کی تحریر اور تقریر پر پابندیاں لگائی گئیں۔

نازی ازم کے خلاف نقطہ نظر رکھنے اور اس کے اظہار پر پابندی لگانے کے لئے ہرمن ہیسے کی کتابوں کو بھی جلایا گیا اور اسے بھی تحریر اور تقریر کی پابندی پر دداشت کرنا پڑی۔ پہلی جنگ عظیم کے اغاز 1914ء میں ہرمن ہیسے نے امپیریل آرمی میں رضا کار کے طور پر اپنے آپ کو رجسٹر کروایا لیکن اسے دوبدو جنگ کے لئے ان فٹ قرار دے دیا گیا جس کی بنا پر اسے جنگی قیدیوں کی دیکھ بھال کی زمہ داری دے دی گئی۔

میں نے اس کا ناول ''ڈیمی آن'' پڑھا تو نہیں ہے لیکن جائزوں کے مطابق اس ناول نے جنگ کے بعد گھروں کو واپس آنے والی نسل پر بہت زیادہ گہرے اور تادیر رہنے والے دیرپا اثرات مرتب کیئے۔ ناول کا ہیرو ایمل سنکلئیر ایک مڈل کلاس میں پلا بڑھا نوجوان لڑکا ہے۔ سنکلئیر کی تمام کہانی دو دنیاؤں کے درمیان جہدالبقا کی ہے یہاں ایک دنیا ہے "روشنی کی دنیا" جب کہ دوسری دنیا ہے "سراب کی دنیا"۔ ہرمن ہیسے نے یہ ناول جنگ عظیم کے فوری بعد 1919ء میں لکھا اور اسے اس ناول کو ایک فرضی نام سے چھپوانا پڑا۔

یہ دوسری عالمی جنگ کے بعد کے حالات کا کرشمہ ہے کہ ایشیا اور افریقہ میں نوآبادیات سے دست برداری کا عمل شروع ہوا اور اس طرح افریقہ اور ایشیا کے بے شمار ممالک آزاد ہوئے۔ نائجیریا کے ممتاز ناول نگار چنوا اچیبے کا ناول ''بکھرتی دنیا'' نوآبادیاتی دور کے ان کی قبائلی زندگی پر اثرات کی حقیقی تصویر کشی ہے۔ اس ناول میں افریقہ اپنے تہذیبی طور پر بھرے پُرے اور بھید بھرے قدیم کے ساتھ سانس لیتا نظر آتا ہے یہاں ایک ایسے افریقی معاشرے کو ہم جیتی جاگتی صورت میں دیکھتے ہیں جو اپنے قبائلی طور طریقوں، ریت اور رسم ورواج، عقائد اور خیالات میں پوری طرح مگن ہے ابھی باہر کے کسی عقیدے، کسی تہذیب نے ان کے رہن سہن میں رخنہ نہیں ڈالا ایسے میں سفید فاموں کے سبز قدم یہاں پہنچتے ہیں اور پھر تھوڑے ہی عرصے میں کس طرح ان کی قبائلی ثقافت کی ہر چیز بکھر جاتی ہے یہی موضوع ہے اس ناول کا۔ پھر سفید فاموں کا اثر ونفوس ہے کہ بڑھتا چلا جاتا ہے اور ادھر دراڑیں ہیں کہ بڑھتی چلی جاتی ہیں جیسا کہ پوری قبائلی زندگی بکھر رہی ہو۔ انجام یہ ہوتا ہے کہ ادھر بیٹا عیسائی مشنریوں کیساتھ مل کر ایک نئے عقیدے کا مبلغ بن جاتا ہے ادھر باپ اپنی قبائلی روایات کا علمبردار بن کا ایک سفید فام کو موت کے گھاٹ اتار دیتا ہے اور یہ دیکھ کر کہ اس کے قبیلے میں اب جنگ کا حوصلہ نہیں رہا خودکشی کر لیتا ہے۔ یہ سیدھے سادھے حقیقت نگارانہ انداز میں لکھا ہوا ناول ہے جو چیز اسے موثر اور معنی خیز بناتی ہے وہ تجربے کی تازگی اور سچائی ہے۔ یہی اس ناول کی خوب صورتی ہے۔

جب میں پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں تو جنگ ہی جنگ نظر آتی ہے تو ایک ایسی قدیم کتاب جو

جنگ کے فلسفے پر ہے ضروری ہو جاتی ہے کہ اس کا ذکر بھی کیا جائے اور اس کتاب کا نام ہے ''آرٹ اف وار''۔ اسے ماہر جنگ سَن زی نے پانچویں صدی قبل مسیح میں لکھا۔ یہ ایک مختصر سی کتاب ہے اس کے تیرہ ابواب ہیں جب کہ ہر باب کسی ایک جنگ حکمت عملی کے متعلق ہے۔ سن زی کنفیوشس کا ہم عصر تھا۔ کنفیوشس کی کتابوں کی طرح یہ کتاب بھی مشرقی ایشیا میں ملٹری سروس کے امتحانات کے سلیبس کا حصہ رہی ہے۔ یہ ایک ایسی کتاب ہے کہ جس کو ملٹری کے علاوہ دیگر شعبہ ہائی زندگی میں بھی خوب صورتی سے برتا گیا ہے۔ آرٹ اف وار کے متن کا زیادہ تر حصہ یہ بتاتا ہے کہ لڑائی کیئے بغیر کس طرح جنگ لڑی جا سکتی ہے۔ بہت ساری کاروباری کتابوں میں اس کتاب کے اسباق کا اطلاق کیا گیا ہے۔ جاپان میں تو اہم ایگزیکیٹوز کے لے اس کا مطالعہ لازی قرار دیا گیا ہے۔

آرٹ اف وار کا ایک اصول جو پہلے باب میں بیان ہوا ہے کچھ یوں ہے "ہر جنگ کی بنیاد فریب ہے اس لئے جب ہم حملہ کرنے کے اہل ہو تو لگنا چاہئے کہ ہم ایسا نہیں کر سکتے اور جب ہم اپنی طاقت کا استعمال کرتے ہیں تو ایسا ظاہر ہونا چاہئے کہ ہم تو بالکل کاہل ہیں، جب ہم قریب ہوں تو دشمن کو یہ باور کروانا چاہئے کہ ہم بہت دور ہیں اور جب ہم بہت دور ہوں تو دشمن کو یقین ہونا چاہیے کہ ہم اس کے بالکل قریب ہیں۔"

دوسری عالمی جنگ کے موقع پر امریکہ کو تو کسی بڑے نقصان سے دوچار نہیں ہونا پڑا جب کہ باقی دنیا تباہی کے کنارے پر جا پہنچی تھی اس طرح امریکہ کو ایک پنپنے کا ایک سنہری موقع مل گیا۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ ترقی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ جنگ ہے۔ ماہر تاریخ سکاٹ برگ کا کہنا ہے کہ وڈرو ولسن نے ہمیں تین سال تک جنگ سے باہر رکھنے کی کوشش کی ہم اس جنگ میں صرف آخری چھ ماہ کے لئے شامل ہوئے ہم نے بہت کچھ گنوایا لیکن برطانیہ نے تو اپنی نسلیں گنوالیں۔''

ایسے میں 1936ء میں ڈیل کارنیگی کی کتاب ''ہاؤ ٹو ون فرینڈز'' آئی جس نے تہلکہ مچا دیا۔ جس کا ایک خوبصورت ترجمہ جناب کمال احمد رضوی نے "میٹھے بول میں جادو ہے" کے عنوان سے کیا۔ یہ ایک ایسی اہم کتاب ہے کہ جسے ابتدائی عمر میں ہی بچوں کو پڑھانا چاہئے اور جو بڑھے ہو گئے ہیں انہیں بھی اس کتاب کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے کہ انسان اپنے سبجیکٹ کا جس حد تک بھی ماہر ہو جائیں لیکن سب سے اہم چیز جو ہے وہ ہے انسانی تعلقات جس کی بنیاد کمیونیکیشن یا مواصلت ہے اس پر ہم پورا اتر نہیں پاتے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہم سماجی زندگی میں ناکام ہو جاتے ہیں یا جس حد تک کامیاب ہونا چاہئے وہ نہیں ہو پاتے۔ ہم اگر چہ آپنے مضمون کے مہا گرو بن جائیں لیکن ہم بحر حال مشین نہیں ہیں انسان ہیں، انسانوں سے رابطہ کرنے اور رکھنے کے لئے

اس کتاب میں بتائے گئے اصول اہم ہیں۔ کامیاب زندگی گزارنے کے لئے یہ کتاب اہم ہے۔

اگر ہم کارآمد لیکچرز کی بات کریں تو سیلف ہیلپ یا سیلف ڈویلپمنٹ پر برائن ٹریسی کے لیکچر قابل قدر ہیں۔ بوب پراکٹر ہیں، نپولین ہل ہیں، ٹونی روبنز ہیں، جم روہن ہیں کہ جن کو پڑھنا اشد ضروری ہے کہ یہ لوگ پہلے خود کامیاب ہوئے پھر انہوں نے کامیابی حاصل کرنے کے طریقے لوگوں کو بتانا شروع کئے اور یہ طریقے قابل عمل ہیں کہ انہی راستوں پر چل کر بہت سے لوگوں نے کامیابیاں حاصل کیں۔ ایڈورڈ ڈی بونو کی سکس تھنکنگ ہیٹ تعلیمی حوالوں سے ایک اہم کتاب ہے۔ اپنی عملی زندگی میں نئے قدم رکھنے والوں کے لئے رابرٹ ٹی کی اُوساکی کی کتاب "رچ ڈیڈ، پوور ڈیڈ" اہم ہے۔ کی اوساکی کا پوور ڈیڈ پی۔ ایچ۔ ڈی ہے جب کہ رِچ ڈیڈ اس کے دوست کا والد ہے کہ جس کے مشوروں پر عمل کر کے کی اوساکی ایک کامیاب شخص بنا۔ رابرٹ ٹی کی اوساکی نے ایک کتاب امریکہ کے صدر ڈونلڈ ٹرمپ سے مل کر لکھی ہے جبکہ کی اوساکی کی ورتھ اب بلین ڈالرز میں ہے۔ کی اوساکی کا ایک لیکچر ''سکسٹی منٹ ٹو گٹنگ رِچ'' اہم ہے۔

یہ ایک تدریجی عمل ہے کہ وقت اور تجربے کے ساتھ کتابوں کی اہمیت و اثر پزیری تبدیل ہوتی رہتی ہے یہ کتابیں سیڑھی کا کام دیتی ہیں کہ ان کتابوں کے بیچ سے ہوتا ہوا قاری نئی منزلوں اور نئے میدانوں تک جا پہنچتا ہے عمر کے ہر دور میں بہت ساری کتابیں اثر پزیر ہوتی ہیں ہماری توجہ حاصل کرتی ہیں پھر ان کی جگہ نئی کتابیں لے لیتی ہیں۔ حال ہی میں قاسم یعقوب کی کتاب پڑھی تھی "لفظ اور تنقید معنی" یہ قابل قدر کتاب ہے۔

اب اگر اردو فکشن کی طرف آئیں تو یہ طے ہے کہ اردو ادب کے اساتذہ کا تعین تو ہو چکا یہاں ان کا زکر کرنے کی ضرورت نہیں وہ اشفاق احمد ہوں، بانو قدسیہ ہوں، انتظار حسین ہوں، عبداللہ حسین ہوں، قراۃ العین حیدر ہوں یا کچھ دیگر احباب ان سب کی کتابوں کی اپنی ایک اہمیت ہے جسے جھٹلایا نہیں جا سکتا۔

اگر ہم اردو ناول کی طرف آئیں تو آگ کا دریا کو ایک بڑا ناول پاتے ہیں۔ قرۃ العین حیدر کا بڑا اور نمایاں کام ''آگ کا دریا'' لکھنا ہے۔ یہ ناول 1959 میں شائع ہوا۔ آگ کا دریا میں چوتھی صدی قبل مسیح کے ہندوستان کی تقسیم ہندوستان تک کی کہانی ایک تسلسل کے ساتھ بیان کی گئی ہے۔ آگ کا دریا اپنی موضوعاتی وسعت، پھیلاؤ، اور برتاؤ کے اعتبار سے بہت پیچیدہ اور متنوع ہے۔ اس ناول میں اسلوب کی ہمہ گیر صفات اور زماں و مکاں کے تاریخی، ثقافتی، تہذیبی، مظاہر ناول نگاری کے نئے اسلوب کا سنگِ میل ہیں۔

قرۃ العین حیدر نے ان تمام علمی، ادبی اور تاریخی معاملات کو ایک خاص زمانی ترتیب کے ساتھ اعلیٰ

ادبی زبان میں پیش کیا ہے۔اس ناول میں نظم وضبط کا اتنا خاص اہتمام کیا گیا ہے کہ تاریخ کا ڈھائی ہزار سالہ تناظر بھی اس کی زمانی وحدت کو متاثر نہیں کر سکا۔ ہر شے، ہر واقعہ، ہر منظر، ہر کردار اور ہر علمی بحث اپنے اپنے مقام پر اس طرح موجود ہے جیسے دیوار کی ایک اینٹ دوسری اینٹ پر رکھی جاتی ہے۔اس ناول میں کئی طرح کی ٹیکنیک کو بروئے کار لایا گیا ہے۔کہیں قدیم ہندوستانی ناٹکوں کا اسلوب استعمال کیا گیا ہے اور کہیں جدید تھیٹر کا اور پھر برصغیر کے وسیع تاریخی، تہذیبی، تمدنی اور معاشرتی کینوس پر پھیلے اس ضخیم ناول میں ایسی تصویر کشی کی گئی ہے جو قاری کے دل پر نقش ہو جاتی ہے۔

اب اگر میں عصر حاظر کے لکھاریوں اور مبلغوں کا زکر کروں تو جناب مستنصر حسین تارڑ میرے پسندیدہ لکھاری ہیں ان کے ناولوں کی ایک لمبی فہرست ہے۔ان کا ہر ناول ایک سے بڑھ کر ایک ہے وہ بہاؤ ہو، راکھ ہو، قربت مرگ میں محبت ہو، خس وخاشاک زمانے ہو یا اے غزال شب ،ان تمام ناولوں کی اپنی الگ الگ اہمیت ہے جب کہ تارڑ کے نئے ناول منطق الطیر جدید کی بھی خوب پزیرائی ہو رہی ہے۔ان کے سفرنامے بھی خاصے کی چیز ہیں ان کے دو سفرنامے خاص طور پر ایسے ہیں کہ جن میں بہت زیادہ گہرائی ہے ان میں ایک ہے "یاک سرائے" اور دوسرا" نیویارک کے سو رنگ " اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ باقی سفرنامے کمزور ہیں شمالی علاقوں کا سفرنامہ کے ٹو کہانی ہو یا حج کا سفرنامہ منہ ول کعبہ شریف، یا غار حرا میں ایک رات ہو یا ان کا ابھی کا سفرنامہ حراموش ناقابل فراموش؛ تمام سفرنامے ایسے ہیں کہ جن کی ریڈ ابیلیٹی بہت زیادہ ہے۔ ان سفرناموں کو بڑی کتابوں کے بیچ رکھا جا سکتا ہے۔ تاریخ، جغرافیہ، منظر کشی، فینٹیسی، سٹریم اف کانشنس کیا ہے جو تارڑ کے ناولوں کا حصہ نہیں ہے بلکہ یہ سب کچھ تارڑ کے سفرناموں کا بھی اسی طرح حصہ ہیں۔

جہاں تک ناولوں کا سوال ہے تو میں کہہ سکتا ہوں کہ وقت کی گرد سے بچ کر اگر کوئی ایک ناول ابھرے اور کوئی کہے کہ یہ " خس وخاشاک زمانے " ہے اور وہ اَمر ہو جائے تو ہاں ایسا ممکن ہے کیونکہ جب تک پاکستان قائم و دائم ہے تقسیم کا زکر ہوتا رہے گا۔ جب تقسیم کا زکر ہو گا تو " خس و خاشاک زمانے " ایسا ناول ہے کہ جس کے وہ حصے جو تقسیم کے متعلق ہیں ان کا زکر ضرور ہو گا۔ تقسیم ہند کے وقت ہونے والے مظالم کا زکر اس سے اچھا کس نے پینٹ کیا ہوا گا؟ منٹو نے شائد ایسی کہانیاں لکھی ہوں۔منٹو کے علاوہ وہ کون ہو سکتا ہے جو ان اندوہناک واقعات کو تحریر کرتا، پینٹ کرتا۔۔۔اب تارڑ نے ان مناظر کو پینٹ کر دیا ہے۔۔۔ محفوظ کر دیا ہے۔۔۔اصحاب کہف کی طرح جب ہماری نئی نسل اپنے ماضی کو جاننے کے لئے اٹھے گی اور ان واقعات کو پڑھے گی تو انہیں

یہاں ٹھہرا ہوا وقت ملے گا۔۔۔ مشرف عالم ذوقی کے نزدیک "خس وخاشاک زمانے" وہ ناول ہے کہ جس کو آپ دنیا کے کسی بھی عالمی شہ پارے کے سامنے فخر سے رکھ سکتے ہیں۔ سب سے دلچسپ ہے ناول کی زبان اور وہ گہرا کنواں جہاں سے ننھے ننھے بونے نکل کر ہماری آپ کی دنیا مین پھیل جاتے ہیں۔ دیکھا جائے تو ناول بھی صدیوں پر محیط ہے۔"

خس وخاشاک زمانے پڑھتے ہوئے انسان گویا گنگ ہو جاتا ہے، بوجھل ہو جاتا ہے، بے چین ہو جاتا ہے۔ ناول کے آغاز میں انچ دھیمی ہے پھر یہ آنچ اہستہ آہستہ بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اس ناول میں محبت کے مختلف شیڈز ہیں۔ ہر قاری کی جزباتی وابستگی مختلف واقعات کیساتھ مختلف ہو سکتی ہے۔ یہ ناول بتاتا ہے کہ تاریخ کے اہم واقعات مثلاً تشکیل پاکستان ہو یا سقوط ڈھاکہ یا پھر نو گیارہ، یہ کسی حساس شخص پر کس طرح اثر انداز ہوتے ہیں۔ اسی طرح بہاؤ ہے، راکھ ہے، قربت مرگ میں محبت ہے، ڈاکیا اور جولاہا ہے، قلعی جنگی ہے، اے غزال شب ہے۔

مستنصر حسین تارڑ کا ناول" منطق الطیر (جدید)" حال ہی میں منصۂ شہود میں آیا ہے۔ منطق الطیر جدید کے بارے میں اقبال خورشید کچھ یوں رقم طراز ہیں۔ "چار چیزیں ہیں جو تارڑ کی تحریر میں رواں دواں ہیں ایک قوت تخیل ہے جو کسی پرندے کی طرح آسمانوں کی وسعتوں میں پرواز کرتا ہے۔ ایک ہے مسلسل سفر سے ہونے والا تجربہ۔ ایک بے پناہ مطالعہ ہے اور ایک ہے لکھنے کی میز۔ تارڑ کا لکھنے کی میز سے اٹوٹ رشتہ ہے۔ قلم دوات نے بھی کبھی بے وفائی نہیں کی اور یوں ایک کے بعد ایک دل میں کھب جانے والی کتابیں جنم لیتی ہیں اور ان کتابوں میں سرفہرست ہے "بہاؤ" جو اپنی نوعیت کا منفرد واقعہ ہے۔ پاروشنی کی کہانی بقول عبداللہ حسین اردو فکشن کا مضبوط ترین نسوانی کردار ہے۔ یہاں پاروشنی موضوع نہیں گو وہ مصنف کی ریت کا جزو ہے مگر فل حال ہمارا موضوع پرندے ہیں۔

الگ الگ خطوں سے آنے والے پرندے ٹلا جوگیاں کی سمت جو جہلم سے تیس میل دور تین ہزار دو سوفٹ کی بلندی پر واقع ہے کی طرف محو پرواز ہیں۔ یہ پرندے جوگیوں کی خانقاہ کی سمت پرواز کرتے ہیں جو ایک چوٹی پر واقع ہے جس کی بنیاد ایک جوگی نے دو ہزار سال پیشتر رکھی۔ یہاں اکبر نے جوگیوں کے لئے ایک تالاب تعمیر کروایا تھا۔ فریدالدین عطار کی لازوال کتاب منطق الطی کے پرندے جنھوں نے مولانا رومی کو بھی گھائل کیا وہ پرندے لاہور کے تارڑ کے دل کی کائنات میں اڑتے پھرتے ہیں اس کی کہانیوں میں در آتے ہیں، پانی اور موت کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ پرندے، پانی اور موت یہ تین چیزیں ہیں جو تارڑ کے فکشن کا جزو ہیں۔ نیشا پور کے عطار کی لازوال کتاب جس کا اثر بانو قدسیہ کے ناول راجہ گدھ پر گہرا ہے اسے دوبارہ لکھنے کی ہمت وہ کر سکتا ہے جو

عشق سے لبریز ہو جو چھلک رہا ہو۔ صاحبو! جو موضوع شجر ممنوعہ ٹھہرے جسے مذہب اس پہ قلم اٹھانے کے لئے بڑا حوصلہ درکار مگر فکشن کے دنیا میں حوصلہ کافی نہیں یہاں فن شرط ہے۔ حساس موضوع کو فکشن کرنا پل صراط عبور کرنے کے مترادف ہے۔ منطق الطیر جدید کا مصنف یہ کر گزرتا ہے کہ وہ ایک بلند پایا ادیب ہے۔ ایک پنچھی جو اس آسمان پر پرواز کرتا ہے جہاں خوف کی پہنچ نہیں اور قلاکار ایسا کہ اپنے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ سے گرویدہ بنا لینے والے دل کش مناظر کو جنم دیتا ہے۔ اک ماسٹر رائٹر کی مانند تارڑ نے ٹلا جوگیاں کے سفر کی ایک خواب ناک سی دنیا تخلیق کی ہے، ناممکن دنیا، ایک انوکھی دنیا یہاں تاریخ، اساطیر اور مذہبی روایات سے نکلنے والے کرداروں سے ہماری ملاقات ہوتی ہے۔ منطق الطیر جدید، مذہبی روایات اور اساطیر سے واقفیت کا تقاضا کرتا ہے، اس لئے ایک مشکل ناول ہے۔"

امید اور نا امیدی کے درمیان گھومتی، خوف اور خدشات میں گھری، زندگی کے بیچ میں کھڑی موت سے دل لگاتی اور موت کے دروازے پر پہنچ کر زندگی کی طرف لپکتی ''بہاؤ'' کی پاروشنی کی بھی وہی انسانی جبلت ہے جو انسانوں کو مشکلیں پار کرنے کا حوصلہ دیتی ہے۔ جو سیلابوں کے، زلزلوں اور قحط کے خلاف کھڑی ہو جاتی ہے اور اپنی حیات کے موسم خود تخلیق کر لیتی ہے۔ پا روشنی وہ جذبہ ہے جو انسان کے اشرف المخلوقات ہونے اور ایک طاقتور تخلیق ہونے کا اعلان کرتا ہے۔ صوفیہ کاشف بہاؤ کے متعلق لکھتی ہیں۔ بہاؤ زندگی کا نام ہے وہ زندگی جو پانی کے سنگ بہتی ہے، پانی کے ساتھ ٹھہرتی ہے اور پانی کے ساتھ ہی کوچ کر جاتی ہے۔ یہ زندگی کے، وقت کے، تہذیب اور فطرت کے سفر کا نام ہے کہ یہ سب ایک تغیر میں ہیں، ہونے سے نہ ہونے اور گم ہو جانے سے پھر سے دوبارہ طلوع ہو جانے تک کے سفر کا۔ مستنصر حسین تارڑ کا ناول 'بہاو؟' زندگی کے ہر بنیادی عنصر کی علامت کو بیان کرتا ہے، یہ امید سے نا امیدی تک اور خشکی سے تری تک کا سفر ہے۔

مستنصر حسین تارڑ کے بعد مشرف عالم ذوقی ہیں کہ جو بسیار نویس ہیں ان کی کہانی اپنی طرف کھینچتی ہے۔ وہ جارج اورویل ہوں، سولزے نتسین ہوں، کافکا ہوں، ان کا رنگ مشرف عالم ذوقی کی کہانیوں میں واضع طور پر نظر آتا ہے۔ ذوقی کی ادبی کائنات کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ آج کی سائبر سپیس یا آئی ٹی کی دنیا کا کون سا ایسا موضوع ہے جو ذوقی کی تحریر کا حصہ نہیں ہے۔ وہ انسانی خلیات کا عمیق مطالعہ ہو یا تاریخی حقائق سب پر ذوقی کی گہری نظر ہے۔ مشرف عالم ذوقی بلا شبہ مستنصر حسین تارڑ کے بعد ایک بڑا نام ہے۔ مستنصر حسین تارڑ کے بعد مشرف عالم ذوقی کو بھی دوحہ قطر عالمی اردو ایوارڈ سے نوازا جا چکا ہے۔ ذوقِ جمال ہو یا خیال افرینی

ہر رنگ کو چابک دستی سے پینٹ کرنا ہی ذوقی کا کمال ہے۔ ذوقی کی ادبی کائنات بہت وسیع ہے لیکن افسوس یہ ہے کہ ذوقی کو ابھی تک پاکستان میں کتابی صورت میں چھاپا نہیں گیا۔ ذوقی کی "پانچ کہانیوں سے سلگتا ہندوستان" اور ناول "اردو" زیرِ طبع ہیں جب کہ ذوقی کے اب تک بے شمار ناول اور کہانیاں انڈیا میں کتابی صورت شائع ہو چکے ہیں۔ ذوقی کی ہمیشہ سماجی اور معاشرتی بدلتے منظرنامے کو نہ صرف باریک بینی سے دیکھتے ہیں بلکہ اسے شدت سے محسوس بھی کرتے ہیں پھر انہیں احساسات کو افکار و اظہار کی صورت افسانوں کے قالب میں ڈھال کر ایک نئی معنویت سے ہمکنار کر دیتے ہیں۔ ذوقی کے ناول قاری کو ایک تحیر کی دنیا میں لے جاتے ہیں یہ ذوقی کی کرافٹس مین شپ ہے کہ اس کے ناول میں واقعات کو ایک بہترین لڑی میں پرویا ہو محسوس ہوتا ہے۔

سیمیں کرن لکھتی ہیں " مشرف عالم ذوقی کے ناول 'نالہ ءشب گیر' کے مطالعہ کے دوران میں کئی اہم سوالوں سے گزری۔ ان کا جواب تلاش کرنا ضروری تھا۔ نالہ ءشب گیر بہت سے سوالوں کو جنم دیتا ہے۔۔۔ ان کے حل پیش کرتا ہے۔۔۔ عظیم فلسفیوں کی طرح ذوقی صاحب نے بھی ایک مثالی انسان کا تصور دیا ہے۔۔۔ مگر سب سے بڑا دہلا دینے والا تجربہ یہ ہے کہ انسان کے اب تک کے تجربوں کے برخلاف اس عورت کو پیش کیا گیا ہے جو ایک عظیم عورت ہے، ایک مفکر ہے۔۔۔ آگ پہ پکی کندن کی طرح، جس کے رشتے ناطے اور ممتا کی بیڑی بھی نہیں۔ یہیں سوال تو یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ عورت مشرف عالم ذوقی کے ذہن کی پیداوار ہے یا اس نے ایسی کسی عظیم عورت کا مشاہدہ کیا؟ سوال تو یہ بھی ہے کہ وہ کون سے عوامل ہیں جو مصنف کو مرد کے اس حد تک خلاف جانے کی اجازت دیتے ہیں؟ سوال تو یہ بھی ہے کہ مشرف عالم ذوقی نے کیسے عورت کے من میں بیٹھ کر اس کے ہر خوف اور زخم کو کھوجا ہے اور بیان کرنے کی جرات بھی کی ہے وہ مردانہ سماج کی ان عورتوں سے زیادہ عورت سے مخلص نظر آتے ہیں۔''

اسی طرح خالدہ حسین اردو افسانے کا ایک اہم اور نمایاں نام ہیں جن کی کتابیں تو آج بھی موجود ہیں مگر وہ اب خود موجود نہیں ہیں وہ اپنی زندگی میں بھی خود منظرِ عام پر آنا پسند نہیں کرتیں تھیں۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں جو انداز اپنایا ہے وہ ان کا اپنا انوکھا اور منفرد انداز ہے جو ان کی تحریروں میں فطرتاً موجود تھا۔ خالدہ حسین کی ایک پہچان اس کا اسلوب بھی ہے۔ ساٹھ کی دہائی کے جدت پسندوں میں خالدہ حسین وہ واحد افسانہ نگار ہے جو باقاعدگی سے اور تخلیقی جواز کے ساتھ افسانے لکھتی رہیں۔ وہ جانے پہچانے منظرنامے میں عجب قرینہ رکھ کر ایک دھند سے تجسس ابھارتی ہے اور اسی تجسس سے کئی سوال اٹھاتی ہے۔ اس کے ہاں تجرید اور علامت کا نظام اسی دھند کی دین ہے۔ افسانوں میں وہ متن کو آگے بڑھاتے ہوئے خود آگے نہیں لپکتی جہاں ہوتی ہیں وہیں رہتی

ہے۔ لہٰذا متن اس کا اپنا جذبہ بن کر جذباتیت کا شکار نہیں ہوتا۔ یہ ایسا طرزِ عمل ہے جس سے پیچیدہ سے پیچیدہ بات وہ سہولت اور سفا کی سے کہہ جاتی ہیں۔ خالدہ حسین کا مقبول ترین ناول ''کاغذی گھاٹ'' ہے جس کے کرداروں کا تعلق لاہور اور لائل پور سے ہے۔

خالدہ حسین کا تازہ افسانوی مجموعہ ''جینے کی پابندی'' حال میں ہی شائع ہوا ہے۔ زاہدہ حنا کہتی ہیں ''اول اول انھوں نے ذات کی شناوری کی اور افسانے لکھے، پھر ملکی اور عالمی سیاست ان کی کہانیوں میں اپنا رنگ جمانے لگی۔ شرقِ اوسط میں دہشتگردی کو شکست دینے کے لیے جو فوج گردی ہو رہی تھی اس نے خالدہ کو اپنی بنیادوں سے ہلا کر رکھ دیا اور انھوں نے ''ابن آدم'' ایسا دہلا دینے والا افسانہ لکھا۔ یہ وہ افسانہ ہے جس کی حرف حرف تفصیل ہم نے اخباروں میں پڑھی، ٹیلی ویژن پر دیکھی۔

ہماری تاریخ ابتداء سے ہی ہنگامی حالات کی کتھا کہانی ہے۔ وہ لکھتی ہیں کہ ہر حکمران اپنے ساتھ ہنگامی حالات لاتا ہے۔ کبھی جب ہنگامی حالات کا نفاذ ہوتا تھا تو سب چونک جاتے تھے، سنتے تھے، سمجھتے تھے، پھر انھیں مکڑی یاد آ جاتی ہے اور اس کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتی ہیں ''مگر کون نہیں جانتا کہ اس ملک کے اصل حاکم کہاں بستے ہیں۔ وہ کون لوگ ہیں جو ایشیا اور افریقا کے نو آزاد ملکوں میں مکڑی کی طرح جالا بنتے ہیں۔ ''مکڑی تو کوئی اور ہے جس نے یہ جالا بنا ہے اور میں اس کا شکار نرم ریشمیں تانے بانے میں اتر آیا ہوں۔ میں تو محض اپنے سر کی تلاش میں ہوں کہ نا معلوم دنیا کے کس خطے میں، کس زمین میں اور اپنی گنگ زبان میں میرے اعضاء کو علیحدہ علیحدہ پکارتا ہے۔''

خالدہ حسین کے بعد محترمہ الطاف فاطمہ نے بھی فوری یہ جگ چھوڑ دیا اور اگلے جہان سدھار گئیں۔ ان کا ناول ''چلتا مسافر'' بنگلا دیش کے پس منظر میں لکھا گیا ہے۔ ڈاکٹر رانی آکاش لکھتی ہیں'' الطاف فاطمہ کا چلتا مسافر پڑھ کر حیرانی ہوتی ہے۔ مصنفہ نے بنگلہ دیش میں قدم رکھے بغیر وہاں کی سیاست اور سماج کو اس قدر کھول کر اور واضح بیان کیا ہے کہ حیرانی ہوتی ہے۔ الطاف فاطمہ کے ناول ''چلتا مسافر'' کو سقوط ڈھاکہ پر لکھے جانے والے ادب میں نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ یہ ناول اپنی ابتداء سے انتہا تک معاشرتی و سیاسی چیرہ دستیوں اور انسانی استحصال کے دوہرے رویوں پر مبنی جھوٹی سیاست کے اصل چہرے بے نقاب کرنے ایک کاوش ہے۔ ناول میں بیان کیے گئے حقائق قاری کو سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔ جغرافیائی بعد اور حکمرانوں کی غفلت کے باعث جس بدنظمی اور انتشار کا سامنا عوام الناس کو کرنا پڑا اور جنگ کے نتیجے میں جو خون خرابہ اور پکڑ دھکڑ ہوئی مصنفہ اُس کا ذمہ دار اُس دھڑے کو ٹھہراتی ہے جس نے شروع سے پاکستان کی جڑوں کو

کھوکھلا کیے رکھا۔ ایک ہی ملک کے رہنے والے باشندے ایک دوسرے کے دشمن بن گئے تھے، تم بنگالی ہو؟ تم بہاری ہو؟ تم پنجابی ہو؟ یہ جملے ہر کوئی ایک دوسرے سے بول کر اعتبار کی زمین پر اپنے گرتے قدم دوبارہ رکھنا چاہ رہا تھا۔ رشتے ناطے، انسانیت اور قدریں اس وقت تباہ ہو جاتی ہیں۔ جب انسان نسل پرستی کی آڑ میں ایک دوسرے کے دشمن بن جاتے ہیں اس وقت انسانیت کہیں دور کھڑی آنسو بہا رہی ہوتی ہے۔ کیونکہ جب بھوک سر سے ہو کر پیٹ تک پہنچتی ہے تو پھر کچھ نہیں بچتا ہے۔ بھوک کے بعد نفرت کی آگ ہے جو جلا کر انسانوں کو بھسم کر دیتی ہے۔ 1947ء میں بھی لاشوں کے انبار تھے اور 1971ء میں بھی یہی صورت حال تھی۔ انسان یوں مر رہے تھے جیسے پانی سوکھ جائے تو پانی کے جانور مر جائیں اور کیڑے، مکوڑے پاؤں کے نیچے آ کر کچلے جائیں۔ یہی وہ شکل ہے اس مرتی ہوئی انسانیت کی جس کو ناول نگار نے مختلف جگہوں پر واضح کیا ہے۔

الطاف فاطمہ 1929ء میں لکھنو میں پیدا ہوئیں تھیں۔ دوران تعلیم ہی الطاف فاطمہ کی ایک آنکھ کی روشنی جاتی رہ تھی تب ان کی والدہ نے ان کے مطالعہ کرنے پر پابندی عائد کر دی۔ انہیں حالات میں انہوں نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے لکھنا شروع کیا۔ ان کی تحریروں کی سب سے زیادہ حوصلہ افزائی ان کی والدہ نے کی۔ ان کا پہلا افسانہ 1962ء میں مؤقر ادبی جریدے ''ادبِ لطیف'' میں شائع ہوا۔ الطاف فاطمہ کے یہ چار ناول منظر عام پر آئے " خواب گر، چلتا مسافر، دستک نہ دو، نشان محفل۔"

ڈاکٹر تہمینہ عباس بتاتی ہیں کہ الطاف فاطمہ کا ناول ''دستک نہ دو'' بے حد مشہور ہوا۔ اس ناول کو ڈرامائی شکل میں پاکستان ٹیلی وژن نے بھی نشر کیا۔ نیز اس ناول کا انگریزی ترجمہ رخسانہ احمد نے کیا۔ ریڈیو اور ٹیلی وژن پر الطاف فاطمہ کے متعدد ڈرامے نشر ہوئے۔ الطاف فاطمہ نے شادی نہیں کی تھی بلکہ اپنی زندگی اپنی مرحومہ بہن کے بچوں کے لیے وقف کر دی تھی۔ ان کا تخلیقی سفر نوے برس کی عمر میں بھی جاری رہا۔ ترجمہ اور تخلیقی کاموں کے ساتھ ساتھ مطالعہ بھی ان کے مشاغل میں شامل تھا۔

الطاف فاطمہ کے افسانوں کے مندرجہ زیل مجموعے ان ناموں سے منظر عام پر آئے "تارِ عنکبوت، جب دیواریں گرتی ہیں، وہ جسے چاہا، دید وادید۔" اس کے علاوہ الفاط فاطمہ کے متعدد تراجم بھی منظر عام پر آئے۔

فہمیدہ ریاض کا تعلق نسائی اور تانیثی ادب کے پیش رووں میں ہوتا ہے۔ فہمیدہ ریاض بھی چل بسیں ان کے متعلق نیل احمد لکھتی ہیں "ادب، جو اپنے گرد و پیش میں بکھری ہوئی زندگی اور اپنے عہد کے عصری تقاضوں سے بے خبر ہو وہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے کچے رنگوں سے بنی کوئی تصویر

جو موسم کی سختیوں سے متاثر ہو کر اپنی دلکشی کھو بیٹھتی ہے۔ ہر دور کا ادب اپنے اپنے عہد کے چہرے پر پڑی وقت کی خراشوں سے ایسے خدوخال ابھارتا ہے جو لفظوں، لکیروں اور رنگوں کے محتاج نہیں ہوتے اور پھر وقت کی بے رحمیوں کے سبب ہونے والی شکست وریخت کے چارہ گر بھی یہی فنکار ہوا کرتے ہیں۔

ایک ماہر فنکار اپنے عہد کی وسعتوں میں غوطہ زن ہو کر سماج کی ناہمواریوں کو سوچ کی گہرائیوں اور الفاظ واستعاروں کی حسین ترکیبوں کی مختلف پرتوں میں پیوست کرتا جاتا ہے بالکل ایسے ہی فہمیدہ ریاض اپنے عہد کے حالات وواقعات اور جمالیات وجذبات کو تخلیقیت کا لبادہ اوڑھا دیا۔ نطشے کا کہنا ہے ''جو تاریخ میں درج نہیں، تلاش کیا جاسکتا ہے'' گویا جستجو انسان کے زندہ اور حساس ہونے کی دلیل ہے اور فہمیدہ ریاض اس مقولے پر پوری طرح موزوں ٹھہرتی ہیں، انھوں نے وہ کیا جو پہلے کسی اور نے نہیں کیا تھا۔

جس طرح ہر فلسفے کا آغاز اضطراب اور انحراف سے ہوتا ہے اسی طرح ہر شاعری یا تخلیق کسی نہ کسی کسک سے جنم لیتی ہے۔ انسان کو اپنے آپ کو دریافت کرنے کا عمل تہہ دار اور کرب آمیز ہے، جذبات واحساسات کا جلترنگ فہمیدہ ریاض کے یہاں سر چڑھ کر بولتا ہے۔"

قاسم یعقوب لکھتے ہیں'' ستر اور اسی کی دہائی میں ہی نظموں میں نسائیت کے ساتھ ساتھ تانیثی تنقید کی پہچان کو بھی مرکز بنایا جانے لگا۔ اس دفعہ یہ بیڑہ خود خواتین نے اپنے ہاتھوں اٹھایا۔ عموماً عورت کو مرد تناظر سے دیکھا جاتا اور اسی فضا میں عورت کو سمجھا جاتا تھا۔ اس رویے کے خلاف بھی ایک ردعمل سامنے آتا ہے۔ اس حوالے سے کشور ناہید اور فہمیدہ ریاض کے نام صرف دو نام ہی نہیں بلکہ تانیثی نقطہ نظر کو سمجھنے کی طرف دو اسکول بھی ہیں۔ فہیدہ ریاض کی کتاب'' بدن دریدہ'' 1973ء میں شائع ہوئی جب تانیثی تھیوری کا نام ونشان بھی اردو مین موجود نہیں تھا۔ فہمیدہ اردو میں پہلی دفعہ عورت کے اظہار کو مرد کی عینک (اصل میں معاشرے کے پاس پدرسری حاکمیت کا سٹیفکیٹ ہے) سے دیکھنے کی بجائے آزادانہ اظہار کو اپنا وسیلہ بناتی ہے۔ اس کتاب پر بہت لے دے ہوئی۔ عورت کی جنسی خواہش کے اظہار کو فحش گوئی اور بدتہذیبی قرار دیا گیا۔ فہمیدہ ریاض نے اس تفریق پر مبنی دانش وری کو ایک مثال سے یون بیان کیا ہے کہ ایک نظم جب عورت لکھتی ہے تو وہی الفاظ عورت کے تناظر سے غیر مہذب اور غیر اخلاقی کہلائے جاتے ہیں جب کہ وہی الفاظ اگر مرد اپنی نظم میں استعمال کرتا ہے تو اسے اظہار میں مہذب اور بااخلاق کے علاوہ بے باک اور جزبات سے مزین کہلاتا ہے۔''

فہمیدہ ریاض نے فروغ فرخ زاد کی نظموں اور دیوان شمس تبریز کے تراجم بھی کیے۔

اسد محمد خاں ہمارے سینئر لکھاری ہیں انہوں کم لکھا ہے لیکن جتنا لکھا ہے وہ قابل قدر ہے۔ جناب اسد محمد خاں کی صلاحتیوں کے اس وقت کے تمام بڑے لکھاری معترف تھے جن میں فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی، ناصر قاسمی اور دیگر شامل تھے۔

اسد محمد خاں 1932ء میں بھوپال میں پیدا ہوئے ان کا پہلا مختصر افسانہ "باسودے کی مریم" 1971ء میں فنون میں شائع ہوا جس کی خوب پزیرائی ہوئی۔ اسد محمد خاں کے افسانوی مجموعوں میں " کھڑکی بھر آسمان، برج خموشاں، غصے کی نئی فصل اور جانور" شامل ہیں۔اسد محمد خاں نے پی ٹی وی کے لئے بھی ڈرامے بھی لکھے جن میں سلسلہ وار بھی شامل تھے۔اس سلسلے کے تحقیقی کام نے انہیں تھائی لینڈ، مالدیپ، پرتگال، اسپین اور فرانس کی سیر سیاحت کے مواقع بھی مہیا کئے۔ پی ٹی وی پر پیش کیا جانے والا تاریخی سیریل "شاہین "اپنے دور کا ایک بہترین اور کامیاب تاریخی ڈرامہ تھا۔اس کے باوجود اسد محمد خاں مختصر افسانے کو اپنا اصل میدان اور عام لوگوں کی زندگی کو اپنا اصل موضوع سمجھتے ہیں۔

جناب سلیم الرحمٰن کے مطابق " یہ ناممکن ہے کہ اسد محمد خاں کی ماہرانہ انداز میں تخلیق کی ہوئی فکشن سے لطف اندوز نہ ہوا جا سکے ان کی تخلیقات کسی کوشش کے بغیر زہانت اور زندگی کی آئینہ دار ہوتی ہیں ان میں صورت حال کو اور کرداروں، تصویروں اور لفظوں کو بڑے مؤثر طریقے سے استعمال کیا جانا جاتا ہے۔ مکالمے جاندار ہوتے ہیں۔ان میں ڈرامے کا بڑا گہرا شعور پایا جاتا ہے۔ کہانیاں ایک ایک فریم کر کے آگے بڑھتی ہیں۔ بالکل فلموں جیسے واضح انداز میں۔"

اسد محمد خاں کی کچھ کتابوں کے نام یوں ہیں؛ ٹکڑوں میں کہی گئی کہانی، تیسرے پہر کی کہانیاں، جو کہانیاں لکھیں، نربدہ اور دوسری کہانیاں، کھڑکی بھر آسمان، اک ٹکڑا دھوپ کا اور شاعری کی کتاب رکے ہوئے ساون ہے۔

حسن منظر پیشے کے اعتبار سے نفسیاتی معالج ہیں اپ کم از کم چھ افسانوی مجموعوں اور پانچ ناولوں کے خالق ہیں لیکن اس کے باوجود ایک بے قدری کی دھند ہے جس میں گم ہیں۔ حسن منظر 4 مارچ 1934ء کو اتر پردیش میں پیدا ہوئے لیکن شائد کچھ زیادہ ہی شرمیلے واقع ہوئے ہیں کہ چلمن سے لگے بیٹھے ہیں اور ہمیں ان کی تحریروں کی خبر ہی نہ ہوئی۔ اپ کی تحریروں کے فیض احمد فیض ہی نہیں جوگندر پال، انور سدید، رشید امجد اور مستنصر حسین تارڑ بھی معترف ہیں۔ آپ مین سٹریم کے لکھاری نہیں ہیں شائد آپ اپنی پی۔ آر بنانا نہیں جانتے۔ "رہائی، ندیدی، انسان کا دیش، سوئی بھوک، ایک اور آدمی، خاک کا رتبہ، فرفر اور رنگو" افسانوی مجموعے جب کہ "وبا، العاصفہ، ماں بیٹی، دھنی بخش کے بیٹے، بیر شیبا کی لڑکی" ان کے ناول ہیں۔

ڈاکٹر قمر رئیس لکھتے ہیں " حسن منظر کی کہانیوں نے روز اول سے فکر کی متانت اور تکنیک کی پر کار سادگی سے چونکا دیا تھا۔حسن منظر افسانہ کے نحیف پیکر میں بڑے سنگین، کثیر الجہت اور آج کے چبھتے ہوئے موضوعات سمونے کی کوشش کرتے ہیں اور وہ بھی پورے معاشرتی تناظر میں یہی نہیں وہ ان موضوعات کا احاطہ نفسیاتی اور فلسفیانہ دونوں سطح پر ایک ساتھ کرتے ہیں اس کے لئے کبھی وہ فینٹیسی کا سہارا لیتے ہیں جیسے "زمین کا نوحہ "اور کبھی واقعیت پسندی کا جیسے " کانہا دیوی کا گھرانہ "۔اکثر افسانوں میں ان کا تخلیقی رویہ افسانہ کی بجائے ناول کے تخلیقی عمل سے مشابہت رکھتا ہے یعنی یہ کہ وہ بڑے وسیع تناظر میں کہانی کے تارو پود تیار کرتے ہیں۔معمولی لیکن معنی خیز جزئیات کو کہیں نظر انداز نہیں کرتے اور کئی طرح کے کردار ان کی گرفت میں رہتے ہیں جن کے تقابل اور تراکیب سے وہ افسانہ میں دلچسپی کی لہریں پیرا کرتے ہیں۔مخبر، ہوا بند کیوں ہے، ہمارے دن ہمارا زمانہ؛ ایسے افسانے ہیں جو آج کی بصیرت اور حسیت سے مالا مال ہیں۔"

سلمیٰ اعوان کو اگر عورتوں کی مستنصر حسین تارڑ یا عورتوں کی ابن بطوطہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ وہ کون سا ملک اور علاقہ ہے کہ وہاں وہ گھومنے پھرنے نہ جا پہنچی ہوں اور پھر وہاں کا احوال نہ لکھا ہو۔ چار چیزیں ہیں جو سلمیٰ اعوان اور جناب مستنصر حسین تارڑ میں مشترک ہیں۔دونوں سفر کرتے ہیں، دونوں سفر نامہ نگار ہیں، دونوں ناول نگار اور کہانی کار ہیں دونوں مضامین اور کالم لکھتے ہیں۔

سلمیٰ اعوان کا ناول ''تنہا'' سانحہ مشرقی پاکستان کے پس منظر میں لکھا گیا ہے۔ یہ ایک ایسا ناول ہے کہ جس چھپنے میں بارہ سال لگے۔سینسر کی پابندیاں تھیں کہ اس ناول کوئی بھی چھاپنے کو تیار نہ تھا۔سلمیٰ اعوان "ایک شکایت، ایک حکایت " کے عنوان سے کتاب کے شائع نہ ہونے کا احوال یوں لکھتی ہیں "انسانوں کی طرح کتابوں کا بھی نصیب ہوتا ہے۔بعض کتابیں بڑی بخت آور ہوتی ہیں ادھر لکھی گئیں ادھر چھپ کر قارئین سے داد یا بیداد وصول کرنے منظر پر آ گئیں۔اس لحاظ سے بیچاری "تنہا" کا کھاتا بڑا کرب ناک ہے۔ جون 1970ء میں ڈھاکہ یونیورسٹی سے واپس کے بعد اسے لکھنا شروع کیا، جنوری 1972ء میں یہ سنگ میل پبلی کیشنز کے پاس گئی۔ جناب نیاز صاحب نے مسودہ میرے ہاتھوں میں واپس پکڑاتے ہوئے کہا "بی بی! جیل جانے کا ارادہ نہیں میرا" اسی طرح کوئی بھی پبلشر اسے چھپانے کے لئے تیار نہ تھا۔آخر کار 1982ء ڈاکٹر اعجاز حسین قریشی یہ کتاب چھاپنے پر راضی ہوئے اور یوں بارہ سال بعد یہ کتاب چھپ کر مارکیٹ میں آئی۔کتاب شائع ہو کر یونہی مارکیٹ میں ائی اس کی خوب پزیرائی ہوئی۔اس وقت کے نامور ادیبوں، صحافیوں اور پڑھے لکھے لوگوں نے کتاب کی بہت تعریف کی لیکن اس احساس کا

اظہار کم وبیش ہر فرد نے کیا کہ کاش یہ کتاب سقوط ڈھاکہ کے فوراً بعد چھپتی۔ اشفاق احمد کہتے ہیں میں اور بانو اس عظیم ناول کے دل سے قائل ہیں۔ سانحہ مشرقی پاکستان پر ڈھیر سارا ملکی اور غیر ملکی مواد پڑھ چکنے کے بعد اگر آپ تحیر کے عالم میں ہیں تو تھوڑا سا وقت نکال کر "تنہا" ضرور پڑھیئے۔ آپ پہ ساری صورتحال واضح ہو جائے گی۔"

تنہا سانحہ مشرقی پاکستان کی ایک تاریخی دستاویز ہے جس میں جو تجزیہ پیش کیا گیا ہے وہ بہت اہم ہے۔ اگر کسی نے تنہا نہیں پڑھا تو وہ اردو ادب سے نابلد ہے اسے فوری طور پر تنہا پڑھنا چاہیئے۔ موجودہ حالات میں تو اس کی ضرورت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔

''طاؤس فقط رنگ''، نیلم احمد بشیر کا امریکن پس منظر میں لکھا ناول ہے یہ ناول اتنا حقیقی ہے کہ لگتا ہی نہیں ہے کہ اسے نیلم احمد بشیر نے لکھا ہے۔ اس کے تمام کردار حقیقی لگتے ہیں۔ امریکی معاشرت کا اتنا حقیقی اور پر اثر جائزہ ہے کہ جیسے یہ ان کی اپنی ہی کہانی ہو۔ نیلم احمد بشیر ایسا ہیرہ ہے کہ جسے میں نے اب دریافت کیا ہے۔ ناول دو مرکزی حادثات کے گرد گھومتا ہے ایک ہے نو/ گیارہ کا واقعہ جس سے امریکہ جیسے ہرکولیس کی طاقت اور دہشت اور اندرونی کمزوریاں اور کوتاہیاں عیاں ہوتی ہیں۔ یہ امریکہ کے شب و روز کی داستان ہے جس میں پاکستانی رہتے ہیں اور مابعد نو/ گیارہ کیا اثرات ہیں جو ان کی زندگیوں پر ظاہر ہوتے ہیں۔ دوسرا واقعہ 1978ء کا گیانا میں ہونے والا ایک دل خراش واقعہ ہے جس میں سینکڑوں لوگ جان سے گئے اس میں بچ نکلنے والے کچھ کردار ہیں جن کے گرد یہ کہانی گھومتی ہے۔ اس واقعے کی گہرائی سے نیلم کے گہرے تاریخی شعور کا بھی پتا چلتا ہے۔ گیانا ٹریجڈی 1978ء کا نائن الیون تھی، گیانا کی تاریخ کے سینے پر ایک گہرہ سرخ گھاؤ اور سیاہ بدنما داغ۔ ٹم جونز نے گیانا میں اپنے تئیں ایک جنت قائم کی تھی جہاں ہر شخص کو ایک دوسرے کے ساتھ آزادانہ جنسی تعلقات رکھنے کی نہ صرف اجازت تھی بلکہ انہیں ایسا کرنے پر زبردستی مجبور بھی کیا جاتا تھا۔ اس کے مقلد لوگ اس کی شخصیت کے سحر کے آگے بے بس ہو کر زندگی کی بازی ہار گئے تھے کہ انہیں اجتماعی خودکشی کی طرف راغب کر دیا گیا تھا اور وہ بے سوچے سمجھے موت کا جام نوش کر گئے۔ جو بچ نکلے وہ اس کے سحر اور دکھ سے کبھی آزاد نہ ہو سکے۔ ان کی زندگیوں پر اس حادثے کے اثرات ہمیشہ ہمیشہ قائم رہے۔ اب نائن الیون تھا کہ جس کے اثرات خاص طور پر پاکستانی امریکنوں پر مرتب ہوئے۔ یہ ناول مابعد نو گیارہ کے اثرات کا اظہاریہ ہے۔ یہ ناول امریکہ کی آزادروی کے باعث خاص کر نوجوانوں کی ذہنی ٹوٹ پھوٹ کا بیان ہے جس نے انسان کو اکیلا کر دیا ہے خاندانی نظام ختم ہو گیا ہے جس نے انسانوں میں ناخوشی کو بھر دیا ہے۔ آج کا امریکی نوجوان تنہا ہے ناخوش ہے۔ اس ناول میں امریکہ کا دوسرے معاشروں سے تقابل بھی ملتا ہے۔ انسانی

کمزوریوں کی داستان بھی ہے جس نے وہاں کے ہر انسان کو ناخوش کر رکھا ہے۔ یہ آج کی کہانی ہے۔ طاؤس فقط رنگ کہانی ہے امریکہ کی اور پاکستان کی بچے جو امریکن ہیں اور ماں جو پاکستانی ہے۔

نیلم کہتی ہیں آج امریکہ وہ خوب صورت طاؤس ہے جس کے رنگوں کے سحر میں سبھی قومیں گرفتار ہیں ہر گزرتے ہوئے عہد کی نفسیاتی وثقافتی اور سماجی صورتحال کے روداد ہے۔ تمام ناول میں قاری مسلسل ایک کشمکش سے گزرتا ہے۔ مسٹری تھرلر فلم کی طرح سین جلدی جلدی گزرتے ہیں ناول فلم کا سا انداز لئے ہوئے ہے۔ طاؤس فقط رنگ کا عنوان علامہ اقبال کے مصرے "بلبل فقط آواز ہے، طاؤس فقط رنگ" سے مستعار لیا گیا ہے۔

مرزا اطہر بیگ کا پہلا ناول غلام باغ 2006ء میں شائع ہوا تو اس کی خوب پزیرائی ہوئی۔ قارئین اور ناقدین دونوں کو ہی اس ناول نے اپنے حصار میں لے لیا۔ غلام باغ ایک پر پیچ ناول ہے اس ناول میں تجریدی تجربات کے ساتھ ساتھ فلسفیانہ فکر بھی نظر آتی ہے۔ جب مرزا اطہر بیگ سے اقبال خورشید نے پوچھا کہ ''کیا غلام باغ میں ایک خاص طرح کی دیوانگی اور پاگل پن ہے تو انہوں نے کہا ہاں، دیوانگی، غلام باغ کے بنیادی موضوعات میں سے ایک ہے۔ فلسفے کے طالب علم کی حثیت سے بھی یہ موضوع مجھے بہت زیادہ متاثر کرتا ہے۔ مجھے یہ محسوس ہو رہا تا کہ دیوانگی بڑی حد تک ایک لسانی مسئلہ ہے جب ہماری لسانی نظام میں کسی سطح پر بگاڑ پیدا ہوتا ہے تب ہی دیوانگی کا اظہار ہوتا ہے جب دوران گفتگو انہیں محسوس ہوتا ہے کہ کلام ان کے ہاتھ سے نکلتا جا رہا ہے ہذیان کی سطح آ جاتی ہے مگر بات دیوانگی پر ختم نہیں ہوتی بلکہ یہ وجود کی، انسان کے انسان سے تعلق کی، ایک اور سطح تلاش کرنے کی کوشش ہے۔ کبیر اور زہرہ کا تعلق، عورت اور مرد کے تعلق کی انتہائی شکل تک پہنچنے کی کوشش ہے، جہاں من وتو کا مسئلہ ختم ہو جاتا ہے۔''

مرزا اطہر بیگ نے اپنے نئے ناول ''حسن کی صورتحال: خالی جگہیں پر کرو'' میں نئے طرح کے تجربات کئے ہیں۔ اس ناول میں اس بنیادی منتشر بھری، شعوری اور لاشعوری تجربات کو گرفت میں لینے۔۔۔ کہہ لیں ناول بنانے کی کوشش کی ہے جو نہ صرف ادب، بلکہ سائنس اور فلسفے کا بھی نقطہء آغاز ہے۔ موضوع اور کرافٹ کے لحاظ سے یہ ناول بہت زیادہ توجہ چاہتا تھا اس سے کچھ دوسرے بیانیے مثلاً فلم اسکرپٹ اور اسکرین پلے کو بھی استعمال کیا گیا ہے۔

حسن کی صورتحال مین نان فکشن کو فکشنائلائزڈ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جس مین تنقیدی اجزا بھی ہیں، فلسفہ بھی اور نفسیات بھی۔ یہ ایک ایسا ناول ہے کہ جس میں بہت ساری چیزیں پہلی خواندگی میں ہمارے شعور یا لاشعور کا حصہ نہیں بن پاتیں اور یہی اس ناول کی خوب

صورتی ہے۔

خالد فتح محمد معروف افسانہ نگار، ناول نویس، مترجم، نقاد اور تجزیہ نگار ہیں۔ ان کا ناول ''خلیج'' 1971ء کے سقوطِ ڈھاکہ کے سانحے کے تناظر میں لکھا گیا ہے۔ اگرچہ اس المیے پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور قومی تاریخ کے اس سانحے پر بہت سے ادیبوں اور شاعروں نے قلم اٹھایا، خالد فتح محمد کا یہ ناول مشرقی پاکستان کے المیے پر ایک مستند دستاویز ہے۔ ناول کے مرکزی کردار کا تعلق پاک فوج سے ہے، جس کے مشاہدے میں آنے والے واقعات اور گردوپیش کو مصنف نے بڑی سہولت سے بیان کیا اور سیاسی حالات پر غیر جانب داری سے نگاہ دوڑائی ہے۔

خالد فتح محمد کا نیا ناول ''زینہ'' ہے جو حال ہی میں شائع ہوا ہے اور لوگوں کی توجہ حاصل کر رہا ہے۔ خالد فتح محمد کا یہ اٹھواں ناول ہے اس کی ڈکشن ایسی ہے کہ جیسے ڈکنز کا انداز ہو کہ بیک وقت دو متضاد کیفیات کا اظہار ہو رہا ہوتا ہے۔ فقروں کی چاشنی توجہ کو بھٹکنے نہیں دیتی۔ کہانی اپنے فطری بہاؤ میں آگے بڑھتی ہے۔ اقبال خورشید کہتے ہیں "معمول کے واقعہ سے کھلنے والے اس بیانیے کے جوں جوں قدمچے پھلانگتا ہوں کچھ غیر متوقع، کچھ انوکھا قریب آتا جاتا ہے۔ کبھی یوں لگتا ہے کہ یہ مارکیز کی جادوئی حقیقت نگاری ہے کہ جہاں جادو عین حقیقت ہے جسے سیدھے سبھاؤ سے شروع ہونے والی کہانی پر پیچ دنیا میں داخل ہونے کو ہے۔"

ان کے بعد افسانوی دنیا کا ایک اہم نام محترمہ سیمی کرن کا ہے ان کی کہانیاں پر اثر ہیں۔ محترمہ سیمیں کرن کے دو افسانوی مجموعے "شجر ممنوعہ کے تین پتے"، "بات کہی نہیں گئی" اور ایک ناول "خوشبو ہے تو بکھر جائے گی" شائع ہو چکے ہیں جب کہ تیسرا افسانوی مجموعہ "تخلیقی منطقے کا موسم" زیر طبع ہے۔ سیمیں کرن کی کہانی کے نہ صرف مستنصر حسین تارڑ معترف ہیں بلکہ مشرف عالم ذوقی اور شاہد حمید بھی سیمیں کرن کے افسانے میں رطب السان ہیں۔ "بات کہیں نہیں گئی" کا بیک فلیپ جناب مستنصر حسین تارڑ کا لکھا ہوا ہے۔

مستنصر حسین تارڑ لکھتے ہیں" فکشن میں سیمیں کرن نہایت تیزی سے افسانوی ادب پر اپنی موجودگی کو ثابت کر رہی ہیں۔ پاکستان اور ہندوستان میں چھپنے والے تمام ادبی پرچوں میں یہ ممکن ہی نہیں کہ کرن کا کوئی نہ کوئی عمدہ افسانہ شامل نہ ہو۔ ان کے افسانوں کے تازہ مجموعہ "بات کہی نہیں گئی" ان کی بے پایاں تخلیقی صلاحتیوں کا مظہر ہے۔ اگر برصغیر کے اہم ناول نگار اور افسانہ نویس مشرف عالم ذوقی ان کے معترف ہیں تو انہیں کسی اور توصیف کی حاجت ہی نہیں۔ میں انہیں نمایاں ترین افسانہ نگاروں میں شمار کرتا ہوں۔"

جب کہ مشرف عالم ذوقی کا کہنا ہے کہ "''مشہور شاعرہ ادا جعفری نے لکھا کہ برصغیر میں مرد کا پندار

برتری نے عورت کو علم و آگہی کے قابل ہی نہیں سمجھا۔ مدتوں عورت احساس محرومی سے بھی محروم رہی۔ احساسِ محرومی سے بھی محروم رہنے والی یہی عورت سیمیں کرن کے افسانوی سفر میں تلاش و دریافت اور تحقیق کا اصل موضوع ہے۔ سیمیں کرن کی ایک خوبی یہ ہے کہ اپنے افسانوی سفر میں وہ پختہ اور بالغ سیاسی شعور کی انگلیاں تھام کر بڑی ہوئی ہے۔ وہ سماجی اور سیاسی موضوعات پر کالم بھی لکھتی ہیں اور جب زیادہ مضطرب ہوتی ہیں تو وادی پرخار یعنی افسانوں کو وسیلہ بنا لیتی ہیں۔"

مستنصر حسین تارڑ کی رائے جو کتاب کے بیک فلیپ پر درج ہے وہ کچھ یوں ہے
"''ادب کی دنیا ایک وہ ہوتی ہے جس میں بڑے شہروں کے حادثاتی ادیب اپنی عظمت کی ڈفلیاں بجاتے، غل غپاڑہ کرتے، اپنے آپ کو زبردستی نمایاں کرتے ہیں اور ان شہروں سے دور گم نام بستیوں میں کچھ ایسے لکھنے والے بھی ہوتے ہیں جن کا چرچہ نہیں ہوتا لیکن وہ ان بڑے ادیبوں کی عظمت کو اپنی تحریروں سے راکھ کر دیتے ہیں اور یہ ادب میں روشنی کی کرن۔ سیمیں ان میں سے ایک ہے۔ سیمیں ایسی کہانیاں لکھتی ہے جو آپ کو بے آرام کرتی ہیں ان میں لطف اندوزی نہیں، اذیت کے سامان ہیں اور ادب کیا ہے جو آپ کو بے آرام کرے، سوچنے پر مجبور کرے، اذیت دے کر معاشرے کی ناہمواریوں اور ظلم کے خلاف کمر بستہ کر دے۔ اس کی کہانیاں حیرت انگیز اور عجب خوابوں میں مبتلا ایسی ہیں کہ وہ یک دم بڑے نثر نگاروں میں شامل ہو گئی ہے۔"

سیمیں کرن کے افسانے بھرپور بیانیہ لئے ہوئے ہیں۔ ان کا اسلوب زندگی آموز اور زندگی آمیز روانی سے مزین ہے جب کہ ان کا ہر افسانہ زبان و بیان کی پختگی سے مزین ہے۔ سیمیں کرن اردو افسانے کی ایک توانا آواز کے طور پر ظاہر ہوئی ہیں۔ ان میں اتنا پوٹینشل ہے کہ وہ بہت آگے جاتی ہوئی نظر آتی ہیں۔

ولیم ڈیلریمپل اپنی کتاب ''وائٹ مغل'' میں بتاتا ہے کہ 1857ء سے پہلے جو انگریز یہاں رہتے تھے وہ "نباب" کہلوانا پسند کرتے تھے، وہ حقہ بھی پیتے تھے اور حرم بھی رکھتے تھے جب کہ 1857ء کی جنگ کے بعد حالات تبدیل ہو گئے اور بہت سے انگریزوں نے ہندوستانی رہن سہن کو ترک کر دیا جب کہ کچھ لوگ بدستور اسی ٹھاٹ باٹھ سے رہتے رہے۔ ایسا ہی کردار "ولیم" ہے جس کا پڑدادا ایسٹ انڈیا کمپنی کے ساتھ انڈیا آیا اور پھر یہی کا ہو رہا۔ ولیم خود آئی سی ایس افسر ہے اس کا باپ بھی ڈپٹی کمشنر تھا جب کہ اس کے دادا نے منٹگمری کے نزدیک گوگیرہ کے مقام پر ایک کوٹھی بنوائی جس پر اس وقت کے حساب سے کوئی نو لاکھ روپے خرچ ہوئے جس کی بنا پر اس کے دادا نے اسے نولکھی کوٹھی کہنا شروع کیا جب کہ گوگیرہ کا نام بھی اس کے دادا کے نام پر ہی تھا۔ علی اکبر ناطق کا ناول" نولکھی کوٹھی "اسی خاندان کے کردار ولیم کے حالات و واقعات پر ہے۔ اسے کسی

حد تک تاریخی، سوانحی ناول کہا جا سکتا ہے کہ ولیم آئی سی ایس افسر ہے جب کہ اس علاقے میں بہت سارے ترقیاتی کام اس کے نام سے موجود ہیں۔ ولیم اگرچہ گوری چمڑی والا تھا لیکن وہ اپنے آپ کو انڈین ہی تصور کرتا تھا جہاں جہاں بھی وہ افسر رہا اس نے ہندوستانیوں کی فلاح و بہبود کو اپنی زمہ داری سمجھا۔ اس کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کی بنا پر اس کے خلاف ریشہ دوانیاں بھی جاری رہتیں۔ اسی اثنا میں دوسرے جنگ عظیم پھوٹ پڑی جس کے اثرات انڈیا پر بھی پڑے۔ انگریز حکومت دھڑا دھڑ ایک طرف تو اپنی فوج کے لئے رنگروٹ بھرتی کر رہی تھی جب کہ دوسری طرف آزادی کی تحریک شروع ہونے کے باعث ولیم اس شش و پنج کا شکار تھا اسے بھی لگتا تھا کہ اس کے بڑے اصل میں انگریزوں کا یہاں سے نکال کر خود حکمران بننا چاہتے ہیں اور یہیں اس کے ذہن میں یہ اندیشے بھی سر اٹھاتے تھے کہ کیا یہ ہندوستانی اسے بھی یہاں سے نکال باہر کریں گے؟

یہیں سے ایک اور گتھی بھی سلجھنا شروع ہوتی ہے کہ یہ جنگ کی تباہ کاریوں کا نتیجہ تھا کہ انڈین سول سروس کمزور ہونا شروع ہوئی اور ملٹری اسٹیبلشمنٹ توانا ہونا شروع ہوئی کہ وہ اب قانون قاعدے کے پابند نہیں رہے تھے وہ سول انتظامیہ کو براہ راست آرڈر دینا شروع ہو گئے تھے۔

اگرچہ اگست 1945ء مین برلن میں جرمنی کے ہتھیار ڈالنے پر جنگ ختم ہو گئی تھی لیکن اس کے ساتھ ہی ہندوستان میں برطانوی حکومت کے دن بھی گنے جا چکے تھے جس کا احساس ولیم سال بھر پہلے ہو چکا تھا مگر اس کا یقین تھا کہ یہ کام کہیں اس کی ریٹائرمنٹ تک جا کر ہو پائے گا۔ ولیم اس تمام صورتحال سے ناخوش تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ سو سال میں جو دولت برطانیہ نے اکٹھی کی تھی وہ پانچ ہی سال میں ٹھکانے لگ گئی تھی بالکل ایسے ہی جیسے ماشکی کی وہ مشک خالی ہو جائے جس میں سوراخ ہو چکے ہوں۔ دوسری طرف ہندوستانی بھی چالاک اور عیار ہو گئے تھے وہ اس چکر میں تھے کہ انگریز اب جلدی جلدی یہاں سے نکلیں تا کہ وہ کاروبار حکومت خود سنبھال سکیں۔ ولیم یہ سب کچھ ہوتا نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس وقت تو اسے اور بھی غضب آتا جب وہ کسی انگریز کو ہندوستان چھوڑنے کے متعلق گفتگو کرتے دیکھتا یا اسے پتا چلتا کہ اس کے دوست اپنا بوریا بستر سمیٹ کر انگلستان روانہ ہو رہے ہیں۔ ولیم کا خون اس وقت کھولنے لگ جاتا گویا یہ سب اس کے خلاف سازش تھی جس میں انگریز، مسلمان، ہندو سب شامل تھے۔ اس کی تمام زمین جائیداد حتی کہ نولکھی کوٹھی بھی جو کہ اس کے دادا نے بنوائی تھی جو پاکستان میں شامل ہو جاتی ہے۔ پاکستان بننے کے بعد اگرچہ ولیم نے ایک درخواست حکومت پاکستان کو گزاری کے اسے پاکستان میں کمشنر کے عہدے پر برقرار رکھا جائے لیکن یہاں ایک مشکل صورتحال پیدا ہو گئی تھی کہ اسے رکھا جائے یا نہ رکھا جائے؟ حکومت پاکستان کے نزدیک وہ ایک غیر مقامی شخص تھا۔ بٹوارے میں صرف مسلمان، ہندو اور

سکھوں کو ہی ہجرت نہیں کرنا پڑی بلکہ بہت سے انگریزوں کو بھی یہ ہجرت کرنا پڑی اگرچہ انگلستان ان کے لئے اتنا ہی غیر تھا جتنا کہ باقی مقامی لوگوں کے لئے۔

امجد سلیم منہاس لکھتے ہیں "علی اکبر ناطق حیران کر دینے والا شاعر اور کہانی کار تو تھا ہی لیکن اب ناول نگاری کی دنیا کو نیا رک دینے بھی آن پہنچا ہے۔ تاریخ، ادب اور سیاسیات میں قائم لگے بندھے تصورات کو چیلنج کرنیکے نتیجے میں ہونے والی ٹوٹ پھوٹ سے لگتا ہے کہ ایک نیا بیانیہ تخلیق ہونے جا رہا ہے" ایسے ہی اظہارئے کا نام نولکھی کوٹھی ہے۔ علی اکبر ناطق کے دو افسانوی مجموعے قائم دین اور شاہ محمد کا ٹانگہ پہلے ہی شائع ہو چکے ہیں۔

''دیوار گریہ کے آس پاس'' یہ وہ سرزمین ہے کہ جس کا جغرافیہ مختصر تاریخ طویل اور فساد لامتناہی ہے۔ کیا مملکت ہے ڈیڑھ ہزار سال ہونے کو آئے اس کا ماضی خون میں لتھڑا ہوا۔ حال تصادم میں الجھا ہوا اور مستقبل غیر یقینی ہے۔ یہ کاشف مصطفے کی یہودیوں کا اسرائیل یا ہمارے بیت المقدس اور فلسطین کی یاترہ کی کہانی ہے جسے میں نے دو نشستوں اور چھ گھنٹوں میں مسلسل پڑھا نہ اونگھ آئی نہ پیاس لگی۔۔۔۔

اسے کتاب کا قالب دیا ہے جناب اقبال دیوان نے اور کیا خوبصورت اردو میں اسے ڈھالا ہے۔ سفرنامے کی دلکشی اپنی جگہ الفاظ کی خوب صورتی الگ سے جیسے نگینے جڑے ہوں۔ جسے جناب اقبال دیوان نے جناب کاشف مصطفے کی آنکھ سے دیکھا اور اپنے من میں ڈوب کر دل کی سیاہی سے اسے لکھا۔

" دیوار گریہ کے آس پاس" سے متعلق ارٹیکل لکھتے ہوئے مستنصر حسین تارڑ سب سے پہلے اسرائیل اور فلسطین کے حالات پر پورا ایک کالم لکھتے ہیں بعد ازاں "دیوار گریہ کے آس پاس" کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں " ویسے آپ شک تو کر رہے ہوں گے کہ بابا تارڑ بہک گیا ہے۔ یہودیوں کی توصیف کر رہا ہے اور اسرائیل کے قصے چھیڑ رہا ہے تو یقین جانیئے اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔ یہ جنوبی افریقہ میں مقیم پاکستانی نژاد سرجن کاشف مصطفیٰ کے لکھے ہوئے اسرائیل کے سفرنامے "دیوار گریہ کے آس پاس" کا قصور ہے۔ اکثر سفرنامے پڑھتے ہوئے مجھے خیال آتا ہے کہ یہ نہ لکھے جاتے تو اچھا تھا جب کہ "دیوار گریہ کے آس پاس" پڑھتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ بندہ سفرنامہ لکھے تو ایسا لکھے۔"

دیوار گریہ کے اس پار پڑھتے ہوئی ایک کسک رہتی ہے کہ ہم وہاں نہیں پہنچ سکتے ایک اور چیز کا شدت سے احساس ہوتا ہے کہ وہاں ہزاروں سال پرانے آثار آج بھی محفوظ حالت میں ملتے ہیں ہمارا ماضی پوری آب و تاب سے وہاں قدم قدم پر موجود ہے جب کہ جہاں ہمارے سب

سے اہم متبرک مقامات ہیں وہاں بمشکل ہی چند تاریخی اور مزہبی آثار ہمیں مل پاتے ہیں شائداس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارا تصور اسلام یہ ہے کہ بادشاہ خدا کا نائب ہوتا ہے اور پھر ایک وقت آتا کہ بادشاہ خدا کے مقابل ہوتا ہے تو اپنی بقا کے لئے ضروری ہوتا ہے ہر نقش کہن کو مٹا دیا جائے یا چھپا دیا جائے۔ اس سفر نامے نے ہمارے بہت سارے مغالطّوں کو بھی دور کیا ہے خاص گنبد صخرہ کے متعلق۔ راوی تاریخ اور جغرافیے سے خوب واقفیت رکھتا ہے۔ خوب صورت گلیزڈ پیپر اور چھپن تصاویر اور دوسو بارہ صفحات پر مشتمل اس سفر نامے کی قیمت انتہائی معقول ہے۔

''پندرہ جھوٹ اور تنہائی کی دھوپ'' اقبال دیوان کا تازہ افسانوی مجموعہ ہے۔ پندرہ جھوٹ اور تنہائی کی دھوپ پہلا افسانہ ہے۔ تین مرد، دو بچے اور چھ برس۔ ایک محبوب دو خاوند، نوخیزی کی محبت، پندرہ جھوٹ۔ جھوٹ اس نے بولے جو اس کا محبوب تھا۔ "ماہم نے یہ وعدہ کیا کہ اس کے بعد وہ بیوی تو بن سکتی ہے مگر تا حیات محبت اسی سے کرے گی۔"

نویدہ کوثر کہتی ہیں" ماہم کا جو پیکر بنایا ہے، سچی مرد تو مرد، خواتین کو بھی پیار ہونے لگتا ہے م، جھوٹ کو جھوٹ سمجھ کر بھی محبت کرنا کیسی گہری بات ہے، ہم سب تو ایک خامی برداشت نہیں کرتے، مزے دار ہے ناں اور جزئیات نگاری کا حسن کمال الگ۔"

''پندرہ جھوٹ اور تنہائی کی دھوپ'' ایک ایسی محبت کی روداد ہے جس میں ایک طرف آہستہ آہستہ سلگتا ہوا الگاؤ ہے تو دوسری طرف جھوٹ تہ در تہ جمع ہو کر اس لگاؤ کو سہارا دیتا رہتا ہے۔ حیرت اور حسرت بھری اس کہانی میں دکھ بہت ہے لیکن محبت اپنا جواز اور مداوا آپ بن گئی ہے۔

محمد اقبال دیوان کی تمام تحریروں میں قدیم اور جدید کا عجیب سا امتزاج پایا جاتا ہے، قدرے الف لیلوی، قصہ در قصہ، رنگ ڈھنگ اور ساتھ میں تھوڑی سی دور حاضر کی سنسنی اور قساوت۔

دوسرا افسانہ " شہر کو سیلاب لے گیا" کا تعلق جنوبی پنجاب کے دیہی علاقے سے ہے جہاں دہشت گردی اپنے قدم جما رہی ہے۔ اس میں آنے والے دنوں کی چاپ سنی جا سکتی ہے۔ تیسرا افسانہ "رات بھی نیند بھی کہانی بھی "میں ایک ڈاکٹر اور رات بھر کے لیے دستیاب لڑکی کا قصہ ہے۔

اگلا افسانہ "وہ جو مایا تھی" میں محبت سراسر فریب آمیز اور الم ناک ہے۔ اس فکشن میں ہمارا اگر دو پیش اپنے تمام خدشات، حادثات اور توقعات کے ساتھ سانس لیتا نظر آتا ہے۔ اقبال دیوان کی یہ تیسری کتاب ہے اس سے پہلے ان کے دوناول شائع ہو چکے ہیں

''چار درویش اور ایک کچھوا" میں لکھنے کی ٹیکنیک کو تجرباتی سطح پر لیا گیا بالکل ویسے ہی

جیسے مرزا اطہر بیگ کے ناول "حسن کی صورتحال" میں ہے وہاں ایک ایڈیٹر ہے یہاں ایک راوی۔ کاشف رضا کہتے ہیں کہ بہت ساری باتیں انسان اپنے آپ سے بھی کرنے سے ڈرتا ہے اس لئے یہاں ایک کچھوا ہے جو آپ کے من بھیتر سے بولتا ہے۔ یہاں بہت سی باتیں ہیں جنہیں کچھوے کے منہ سے کہلوایا گیا ہے۔ کاشف رضا کا کہنا ہے کہ انہوں نے حسن کی صورتحال ناول پڑھا ہی نہیں ہے۔

جس طرح ایک قصے کو بیان کرنے کا ذکر ہوا ہے تو فوری طور پر ایک ناول اور ایک فلم میرے ذہن میں آئیں ہیں۔ فلم جاپانی ہے بلیک اینڈ وائٹ ہے "راشومان" جس میں ایک واقعہ ہے اور اس کے پانچ راوی ہیں۔ دوسرا ایک ناول ہے پاؤلو کوایلٓہو کا "اے وچ آف پورٹو بیلو" جہاں ایک کردار کو سمجھانے کو دوسرے کردار موجود ہیں۔

سیرایلزم اور حسن کی صورتحال کے کچھ اثرات محسوس ہوتے ہیں کہ ایک دم سے خواب کی سی کیفیت میں واقعہ بیان ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ کراچی میں ایسے واقعات ہوتے رہتے ہیں لگتا ہے کہ یہ لکی بھائی کی کیفیات اپنی نہیں تو کسی کی تو ہیں۔ ناول آغاز سے ہی آپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔

آفتاب اقبال، جاوید اقبال کے متضاد کردار کے طور پر سامنے آتا ہے ایک اور کردار بھی ہے اور وہ ہے محمد اقبال۔ یہ کہانی ایک سیاسی واقعے سے جنم لیتی ہے اور پھر مختلف کردار اس کہانی سے جڑتے جاتے ہیں۔

اتنا کاما سوترا تو تارڑ صاحب بھی بیان کرنے سے قاصر رہے ہیں جتنا اس کچھوے نے بیان کر دیا ہے۔ ضروری نہیں کہ ہم کسی ایک ریالٹی سے اتفاق کریں اس کے مقابل ایک اینٹی تھیسیز بھی کھڑا کیا جا سکتا ہے کہ ہر شخص کی اپنی ایک ریالٹی ہے ہر ریالٹی کے اوپر بھی کوئی سپر ریالٹی ہو سکتی ہے۔ حیران کن، بالغ اور پر اثر ناول۔

''تکون کی چوتھی جہت'' اقبال خورشید کا ناولٹ ہے جس کے متعلق مستنصر حسین تارڑ رقم طراز ہیں "روایت اور اسلوب سے بغاوت وہی کرتے ہیں، جو یا تو بیوقوف ہوتے ہیں کہ اپنے احساس کم تری کو پوشیدہ رکھنے کی ناکام کوشش میں اپنے تئیں دوسروں سے الگ ہو کر نمایاں ہونے کی سعی کرتے ہیں، اور یا پھر اقبال خورشید ہوتے ہیں۔

وہ جان بُوجھ کر بغاوت پر آمادہ نہیں ہوتے، بلکہ بہ قول مصطفیٰ زیدی: ''شعلہ جس نے مجھے پھُونکا میرے اندر سے اٹھا'' کہ مصداق اُس شعلے میں راکھ ہوتے ہیں، ایک نیا جنم لیتے ہیں، اور روایت اور اسلوب کے الگ راستے اختیار کر لیتے ہیں میں اقبال خورشید کے خاموش قدموں کی آواز سنتا

ہوں وہ آتا ہے ہمیشہ آتا رہے گا اور اُس کے قدموں کا زریں مَس ہے، جو میری مسرتوں کو درخشاں بنا دیتا ہے۔

شہر بارش کی قید میں تھا
میری رُوح کا نغمہ، اُس شام میلوں پرے تھا
اور دیوار پر ایک چیونٹی رینگ رہی تھی
آواز دور سے آتی معلوم ہوئی، مُجھ میں کنول کھلا
جانے کیوں، گھر میں چیونٹیوں کی تعداد بڑھ گئی ہے
جنت سے اترنے والی تتلیوں نے اُسے ڈھانپ رکھا تھا

اقبال خورشید، اس ناولٹ کے بعد میرے لیے ایک بڑا نام ہے، اور میں امید کرتا ہوں کہ آیندہ کے زمانے بھی اُسے ایک بڑے ادیب کے طور پر تسلیم کریں گے، اگر وہ مسلسل لکھتا رہا تو۔''

''گل مصلوب'' سبین علی کی کہانیوں کا پہلا مجموعہ ہے یہ کتاب 22 مختصر کہانیوں پر مشتمل ہے۔اس سے قبل میں سبین علی کو ان کی چند کہانیوں اور دیدبان کی ایڈیٹرشپ کے حوالے سے جانتا ہوں گل مصلوب کے ذریعے مجھے ان کے فن میں کسی حد تک جھانکنے کا موقعہ ملا ہے جو بہت حد تک حوصلہ افزا ہے۔گل مصلوب میں شامل بہت سی کہانیوں نے مجھے متاثر کیا ہے ان میں خاص طور کتن والی، ان ٹیوشن، کلمہ ومہمل، اور گل مصلوب شامل ہیں۔

عاطف علیم لکھتے ہیں میری اب تک کی کتاب بینی کے مطابق سبین ایسے کرداروں کا انتخاب کرتی ہیں جو جدید مشینی دور میں اپنی جان وتن کا رشتہ برقرار رکھنے اور اپنی ذات کا اثبات کرنے کی جدوجہد میں مصروف ہیں۔ وہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ جس طاقت کے خلاف نبرد آزما ہیں وہ مہیب ہے اور انسانی حسیات کی نزاکت اور لطافت کو سمجھنے سے محروم ہے، اس پر مستزاد یہ کہ ان کی ہار نوشتہ دیوار ہے۔اس جدل میں وہ اپنے بدن میں چھپی مخفی توانائی کو بھی بروئے کار لانے پر مجبور ہیں کیونکہ وہ ہار ماننے سے انکاری ہیں۔

سبین علی نے ایک فنکار کے طور پر خود کو زندگی کی مثبت اقدار کے ساتھ وابستہ کیا ہے جو ان کے فنی خلوص کا ثبوت ہے۔''

ناصر عباس نیئر نقاد کے ساتھ ساتھ افسانہ نگار بھی ہیں۔''راکھ سے لکھی گئی کتاب'' ان کا تازہ افسانوی مجموعہ ہے۔ اس سے پہلے ان کے دو افسانوی مجموعے ''خاک کی مہک'' اور ''فرشتہ نہیں آیا'' شائع ہو چکے ہیں۔

''ان کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ جب تک غار میں رہے کسی سے نہیں ملے۔ان کا

خیال تھا کہ انہوں نے عمر کے جو بیس سال غار سے باہر کی دنیا میں گزارے تھے اس کی یادداشت میں کسی کو خلل انداز نہیں ہونے دینا چاہتے تھے۔ وہ کہتے تھے یادداشت اگر بے خلل رہے تو معجزے دکھا سکتی ہے۔ ان کی تصویر کو دیکھنے والے اس بات پر فوراً یقین کر لیتے تھے۔ یہ بھی مشہور تھا کہ جیسے ہی انہوں نے تصویر مکمل کی، دونوں غار سے غائب ہو گئے۔'' یہ اقتباس ہے ناصر عباس نیّر کے ایک افسانے کا۔

ان کی تحریر کا انداز آپ کے سامنے ہے عنوان کی معنویت اپنی جگہ۔ راکھ سے لکھی گئی کتاب میں چودہ کہانیاں شامل ہیں جو پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔

میرے نزدیک تنقید کی کتاب پڑھنے کی حیثیت توضیع اوقات سے زیادہ نہیں تھی لیکن میری اس رائے کو قاسم یعقوب کی کتاب "لفظ اور تنقید معنی" نے غلط ثابت کیا ہے۔ لفظ اور تنقید معنی، کافی معلومات افزا ہے جو قاسم یعقوب کی علم دانی کا ثبوت۔ انیلیسز جاندار ہیں جو ان کی محنت کا ثبوت ہیں۔ قاسم نے اصطلاحات کو اردو میں پیش کرنے کے ساتھ ساتھ انگریزی میں بھی پیش کر کے تفہیم کو ایک زبان دی ہے جس سے کتاب کی معنویت میں اضافہ ہوا ہے۔ "تانیثت اور تانیثی تھیوری" اور "شاعرات کی اردو نظموں میں تانیثی رجحانات" دو پاور فل ابواب ہیں۔ تانیثی رجحانات میں نظموں کی توضیح اور تشریح کا نفسیاتی اظہار حیران کن ہے۔ تنقید کی یہ کتاب تنقید کی بہت ساری کتابوں سے ہزار گنا بہتر، مضبوط اور منطقی ہے۔ اس کتاب کو زیادہ اعتماد سے چھاپا گیا ہے۔ اس کا گیٹ اپ خوب صورت ہے۔

قاسم یعقوب نے تمام ابواب کو ایک خاص آہنگ سے لکھا ہے۔ تمام ابواب کو طوالت سے بچایا گیا ہے۔ اس سے پہلے کہ قاری بوریت کی طرف بڑھے مضمون اختتام تک پہنچ جاتا ہے۔ میرے نزدیک یہ تنقید کی کتاب نہیں بلکہ تنقیدی فلسفے کی کتاب ہے۔

ناصر عباس نیّر رقم طراز ہیں'' قاسم یعقوب کا شمار ان معدودے چند معاصر اردو نقادوں میں ہوتا ہے جو اکیسویں صدی میں تنقید کے بدلے ہوئے کردار کا نہ صرف فہم رکھتے ہیں بلکہ اس کی روشنی میں ادب کا مسلسل مطالعہ بھی کرتے رہتے ہیں۔'' ناصر عباس نیّر مزید لکھتے ہیں'' معاصر تنقید محض 'کیا' کی بجائے 'کیسے' کا جواب دیتی ہے اور اس کے لئے وہ دوسرے علوم سے بیش از بیش مدد لیتی ہے۔ 'کیسے' کا جواب دینے کے لئے تھیوری ناگزیر ہے۔ قاسم یعقوب نے اس مجموعے میں بھی تھیوری پر چند مضامین شامل کئے ہیں، جو یہ باور کرواتے ہیں کہ تھیوری دراصل ادب کے معانی اور ان معانی کی تشکیل کا سراغ لگانے ہی کا ایک طریقہ ہے اور جس کے لئے ادب کے پختہ ذوق کے ساتھ ساتھ غیر معمولی ذہانت، وسیع مطالعہ اور باریک بینی کی صلاحیت درکار

ہے۔ اسی سے تھیوری کے بحثوں کے خلاف مزاحمت بھی سمجھ آتی ہے۔ قاسم یعقوب نے اس تھیوری کی روشنی میں تنقید کے عمدہ نمونے بھی پیش کئے ہیں اور اس اعتراض کا جواب بھی دیا ہے کہ مابعد جدید اطلاقی تنقید میں نیا کیا ہے۔‘‘

قاسم نے لفظ اور تنقید معنی میں تمام مضامین کو لگن اور شوق سے لکھا ہے۔ یہ محنت سے نہیں محبت سے لکھی کتاب ہے۔

ناصر عباس نیئر کی نئی کتاب ’’نظم کیسے پڑھیں‘‘ تنقیدی کتب میں ایک خوب صورت اضافہ ہے۔ نظم کیسے پڑھیں دراصل جدید نظم پر تنقید ہے جو اس کے تاریخی، ثقافتی، مذہبی، اسطوراتی، سماجی، روایتی، نوآبادیاتی اور شعریاتی پس منظروں میں کی گئی ہے۔

ناصر عباس نیئر لکھتے ہیں "جدید نظم کو دو طرح سے سمجھا جا سکتا ہے۔ تاریخی زاویے سے اور شعریات کی روشنی میں۔ جدید اردو نظم کے تاریخی معاملات چند نقادوں نے کئے ہیں مگر اس کی شعریات کو سمجھنے کی کوشش بہت کم ہوئی ہے چنانچہ یہ جدید اردو نظم کے تاریخی ارتقاء سے متعلق معلومات ادب کا ہر طالب علم جانتا ہے مگر شعریات یا نظم کی گرائمر سے نقادوں کی عمومی بے نیازی کے سبب، جدید نظم آج بھی اکثر لوگوں کو مشکل محسوس ہوتی ہے اس میں کوئی مبالغہ نہیں کہ ادب کے طلبا و اساتذہ کے ساتھ ساتھ عام قارئین کے لئے، میرا جی سے لے کر افظال احمد سید اور علی محمد فرشی کی نظم معمہ محسوس ہوتی ہے۔ شعریات ایک طرف نظم نگاری کے پس منظر میں کارفرما اصولوں، تصورات، اقدار، رسمیات وغیرہ سے عبارت ہوتی ہے جن سے نظم ایک فن پارے کے طور پر قائم ہوتی ہے اور دوسری طرف تاریخی وسماجی تبدیلیوں کو خاص طرح سے گرفت میں لیتی ہے۔ زیر نظر کتاب میں جدید نظم کے فنی، ہیتی، اسلوبی تکنیکی مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے نیز جدید نظم، معاصر نظم اور مابعد جدید نظم کے امتیازات کی وضاحت بھی کی گئی ہے۔"

’’پاکستان ناگزیر تھا‘‘ سید حسن ریاض کی ایک اہم کتاب ہے۔ 1980ء کی دہائی میں اردو ٹائپ رائٹر آیا تو بہت ساری کتابیں اردو ٹائپ میں چھاپی گئیں انہیں کتابوں میں سے یہ ایک ہے۔ پہلا ایڈیشن 1967ء میں آیا تھا جبکہ آٹھواں ایڈیشن 2018ء میں۔ قیمت انتہائی کم صرف تین سو روپے لیکن ایک مسئلہ بھی ہے کہ فانٹ باریک ہے پڑھنے میں دشواری ہے ہارڈ بائینڈنگ ہے صفحات 616 ہیں۔ سستی کتابوں کے متعلق سوچنا چاہیے جب کہ یہ ایک سستا ایڈیشن ہے۔

’’عالمی سب رنگ افسانے‘‘ ایسے شاندار غیر ملکی افسانوں کا مجموعہ ہے کہ جس میں اٹلی، افغانستان، امریکا، ایران، آئرلینڈ، برازیل، نبنگال، برطانیہ، تُرکی، جرمنی، چلّی، چیکوسلواکیا، چین، روس، رومانیہ، سربیا، شام، فرانس، مراکش، مصر، ناروے، ویت نام، ہندوستان، ہنگری

وغیرہ کے افسانے شامل ہیں۔ عافیہ جہانگیر کہتی ہیں کہ اس کتاب میں ایک خاص بات پائی۔ وہ یہ کہ اس میں جتنا بھی ادب شامل کیا گیا ہے انتہائی معیاری اور مکمل ہے تمام مختصر افسانوں کے صفحات تقریباً ایک ہی تعداد میں ہیں۔ اسے اتفاق کہیے یا باقاعدہ منصوبہ بندی، جو بھی ہے خوبصورت بات ہے۔ اس سے قاری پر ایک خوشگوار تاثر پڑتا ہے۔ کئی افسانے ایسے تھے جن کی مجھے تلاش تھی اور اُردو میں اُن کا خاصا نام ہوا تھا مگر اب انہیں تلاش کرنا بہت مشکل تھا۔ وہ اسی مجموعے میں دیکھ کر خوشگوار حیرت نے آن گھیرا اور کچھ افسانے ایسے ہیں جو بار بار پڑھے جانے کے لائق ہیں جیسے ہندوستانی ادب نگاری کا بہترین شاہکار ''عورت، رات اور چور''۔ دکھوں کے لبادے میں سمٹی خوشیاں اچانک کیسے سامنے آتی ہیں۔ یہ خوبصورتی اس کتاب کے کئی افسانوں میں جا بجا بکھری ملتی ہے اور اسی خوشبو کو یکجا کر کے اس ڈھیر کو نام دیا گیا ہے ''عالمی سب رنگ افسانے'' اور انہیں مرتب کیا ہے جناب حامد سراج نے۔ اسے اچھے گلیزڈ پیپر پر چھاپا گیا ہے لیکن اس کی قیمت بہت زیادہ ہے جو عام قاری کے سکت سے باہر ہے۔

''یوروپین نو آبادیات کے ایبوریجنل ادب پر اثرات؛ امریکہ وکینیڈا کے حقیقی باشندوں کے گیت اور خواتین کی شاعری کے تراجم'' جنہیں ترجمہ اور مرتب کیا ہے نسیم سید نے جو خود کینیڈا میں رہتی ہیں انہوں نے نہ صرف خوب صورت نظموں کا چناؤ کیا ہے بلکہ انہیں خوب صورتی سے ترجمہ بھی کیا ہے۔ ''محبت، بغاوت اور نظمیں پرانی نہیں ہوتیں'' کے عنوان سے شہناز شورو نے اس کا مقدمہ لکھا ہے جس میں وہ لکھتی ہیں تاریخ انسانی میں سامراجی قوتوں کا کردار۔۔۔ قتل و غارت گری۔۔۔ ملکیتوں اور زمینوں پر جبراً غاصبانہ قبضے اور سادہ لوح اقوام کی تہذیبوں کی پامالی اور لاشوں کے ڈھیر لگانے کے بعد کولونیل قوتوں کا حملہ قابض زمینوں کے تہذیب وتمدن، زبان و ادب، رہن سہن اور ثقافت روایات پر ہوتا ہے۔ سامراج، چونکہ اس خبط میں مبتلا ہوتا ہے کہ اس کی تہذیب، زبان، بودوباش، علمیت وترقی، مفتوح قبیلے، گروہ، طبقے اور ملک سے برتر، ارفع و اعلی ہے، لہذا وہ مفتوح اقوام کو یہ باور کرواتا ہے کہ ان کی تاریخ، ان کے آباؤ اجداد کی دانائی کے قصے، ان کہانیاں، ان کی نظمیں، ان کی داستانیں، ان کے ہیروز۔۔۔ غرض یہ کہ ان کا حال ان کا ماضی۔۔۔ سب کچھ تاریخ کے کوڑے دان میں پھینکنے کے لائق ہیں۔ ان کی روایات ماضی کے چبائے ہوئے لقموں سے بدتر ہیں۔۔۔ ان کی تہذیب کچرے کا ڈھیر ہے۔۔۔ اور اب ان کی ایک پہچان ہے کہ وہ "غلام" ہیں، جسمانی، ذہنی، روحانی اور جنسی غلام۔ ان کی بقا اپنے آقا کی تقلید کرنے، اس کی زبان سیکھنے اور خود پر مسلط کردہ جابروں، آمرو اور لٹیروں کو عظیم، فاتح سمجھنے میں پنہاں ہے۔

تسلط کار،ظلم، زیادتی، نفرت، قتل و غارت گری کے ساتھ ساتھ نفسیاتی داؤ پیچ سے کام لیتا ہے ہر غیر اخلاقی ہتھکنڈے کو جائز کہتا اور منواتا ہے۔وہ یہ جھوٹ اس شدومد سے، اتنی بار اور اتنی سفاکیت سے رٹواتا ہے کہ۔۔۔صدیوں کی ثقافت کے تانے بانے میں بندھے، اپنی دھرتی کی گہری جڑوں کی محبت میں گندھے اپنے لوگوں، اپنے پیاروں، اپنے رقص وموسیقی اور اپنے لوک گیتوں کی عشق میں ڈوبے لوگ۔۔۔حال کے جبر وظلم میں زندہ رہنے کی جدوجہد میں، اپنی تاریخ، اپنا جغرافیہ، اپنی زبان، اپنی ثقافت، اپنی بود و باش ۔۔۔بدلنے اور بولنے میں جت جاتے ہیں۔ دن رات خود کو فراموش کرنے کی بے سود کاوشیں کرتے ہیں اور اسی رنگ میں رنگنا چاہتے ہیں جس رنگ میں ان کے آقا رنگے ہوتے ہیں۔''

تاریخ کا زلت امیز دور۔۔۔جن خطوں اور تہذیبوں نے دیکھا ہے اس میں ہم بدبخت بھی شامل ہیں (اور شائد یہ دور آج بھی جاری ہے) مگر ایک فرق کے ساتھ، ہم آج بھی سامراج کے گماشتوں اور لٹیروں کو اپنے نجات دہندہ سمجھتے ہیں مگر کینیڈا کے حقیقی باشندوں نے بدترین مظالم کو سہتے ہوئے بھی اپنے اصل سے رشتہ نہ توڑا۔ اس کتاب میں کینیڈا کے حقیقی باشندوں، جنہیں ایبوریجنل اور اب فرسٹ نیشن بھی کہا جاتا ہے کی تاریخ کے تلخ دور کی نظموں کے تراجم کو شامل کیا گیا ہے۔

''لوح افسانہ نمبر'' ایک ایسی دستاویز ہے جس میں ایک سو پندرہ سالوں کی افسانوی تاریخ کے اہم اور ناگزیر افسانوں کا انتخاب اکٹھا کیا ہے جناب ممتاز شیخ نے۔ یہ ضخیم شمارہ 1120 صفحات پر مشتمل ہے جس میں اتنا مواد اکٹھا کرنا، بڑے لکھاریوں کے بے شمار کام میں سے ان کے نمائندہ افسانے ڈھونڈھنا ریت میں موتی پھرولنے کے مترادف ہے جو جنوں کا کام ہے، ایک فردواحد اتنا پر مشقت کام اکیلا کیسے سرانجام دے سکتا، یہ صرف ممتاز شیخ کی محبت اور جنون ہے جس نے یہ سب کچھ ممکن بنایا ہے۔بہترین لے اوٹ، خوب صورت کمپوزنگ بہترین کاغذ اور بہت اعلی چھپائی کا مرقع ہے لوح۔

کم وبیش پونے دوسو مایہ ناز لکھاریوں کے نمائندہ افسانے اس میں شامل ہیں کون سا ادیب ہے جو اس میں شامل نہیں ہے۔اس میں اگر قدیم دور سے باقر علی ہیں، اپندر ناتھ اشک ہیں، پریم چند ہیں، سجاد حیدر یلدرم ہیں، ملک راج انند ہیں، سجاد ظہیر ہیں تو دور متوسط کے بڑے نام احمد ندیم قاسمی، سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی، غلام عباس، کرشن چندر، ممتاز مفتی جیسے بڑے نام بھی شامل ہیں اور عصر حاضر کے لکھنے والوں میں مستنصر حسین تارڑ، مشرف عالم ذوقی، شمس الرحمان فاروقی، حامد سراج، طاہرہ اقبال، سمیں کرن اور ممتاز شیخ کے نام بھی شامل ہیں۔اردو ادب کے

قاری کے کے لئے یہ ایک گراں پایاں تحفہ ہے۔ اردو افسانوی ادب کی ایک سو پندرہ سالہ تاریخی دستاویز ایک ایسا ضخیم ادبی سرمایہ ہے جسے ممتاز شیخ نے آنے والے نئے قاری کے لئے محفوظ کر دیا ہے۔

کرنٹ افیئر میں وجاہت مسعود اور خورشید ندیم میرے پسندیدہ کالم نگار ہیں۔ جناب وجاہت مسعود کے آرٹیکلز کی کتاب ہے "محاصرے کا روزنامچہ "یہ عنوان بزاتہ معنی خیز اور ادبی رنگ لئے ہوئے ہے۔ یہ موصوف کی تاریخ، سیاست اور ادب پر مضبوط گرفت کی نشاندہی کرتی ایسی کتاب ہے کہ جس کے پڑھے بغر گزارہ نہیں۔ وجاہت مسعود حالات حاضرہ کو تاریخ، سیاست اور ادب کی عینک سے دیکھتے ہیں اور پھر اسے بغیر کسی ڈر اور خوف کہ ایک ارٹیکل میں سمو دیتے ہیں کہ موصوف جمہوریت پسند ہیں اور حق بات کہنا عین ثواب سمجھتے ہیں۔ جناب وجاہت مسعود 1994ء سے جمہوری کمیشن برائے انسانی ترقی کے بانی رکن ہیں۔ جناب خالد احمد، وجاہت مسعود کی تحریر پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں ''اگر ریاست کے نظریے کے زوال کے بعد جمہوری عمل کی نئ سچائیاں قومی ذہن کو بیدار کر دیں تو وجاہت مسعود کی بغاوت تسلیم شدہ بیان ٹھہرے گی''۔ جب کہ آئی۔اے رحمٰن کہتے ہیں" وجاہت مسعود کے باکمال کالم نویس ہونے میں زبان و بیان پر عبور ہونے کے علاوہ جن عوامل کا دخل شامل ہے ان میں ان کا تاریخ، سیاست اور ادب کا وسیع مطالعہ، تاریخی حوالوں تک دسترس اور ایک حیران کن یادداشت کلیدی حثیت رکھتے ہیں۔" محاصریکا روزنامچہ ایک ایسی دستاویز ہے جو قاری کے ذہنی افق کو وسیع تر کرتی ہے جس سے برسر کار سیاسی عوامل کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

خاکوں کے حوالوں سے عرفان جاوید کی ''سرخاب'' اور ''دروازے'' ایک اچھا اضافہ ہے اس میں جناب مستنصر حسین تارڑ اور جناب امجد اسلام امجد کے علاوہ اور بہت سارے دیگر خلائق کے خاکے بہت تخلیقی انداز میں پیش کئے گئے ہیں۔

''شرف ہم کلامی۔۔۔انتظار حسین سے ملاقاتیں اور باتیں'' تصنیف ہے جواں سال محمود الحسن کی۔محمود الحسن کو جناب انتظار حسین کے آخری چند برس نیازمندی کا موقع ملا اور وہ ایک نیازمند کے طور پر ان کے پاس اٹھتے بیٹھتے رہے جس سے اسے بہت کچھ جاننے اور سمجھنے کا موقع ملا۔ انتظار حسین، ایک ایسا فرد جو برصغیر کی ادبی اور ثقافتی میراث کا امین تھا اس شخص سے انہیں ملاقاتوں کا حاصل شرف ہم کلامی ہے۔شرف ہم کلامی میں ایسے بہت سے واقعات اور خیالات آگئے ہیں جو کہیں اور نہ ملیں گے۔ یادوں کا یہ مجموعہ چھوٹی سی سیرگاہ ہے جہاں جب بھی کوئی جائے اس کے دل و جان کو فرحت ملتی ہے۔

مزاح میں مشتاق احمد یوسفی کی سرگزشت اہم ہے۔ یوسفی نے مزاح کو بڑے سنجیدہ انداز میں لکھا ہے یوسفی کی تحریر کی اوپری سطح پر تو مزاح موجود ہوتا ہے لیکن بین السطور اس میں ایک کرب موجود ہوتا ہے جو ''آب گم'' میں نظر آتا ہے۔

شفیق الرحمٰن کی ''دجلہ'' مزاح کے حوالے سے اہم کتاب ہے۔ اس کتاب کی خوب صورتی یہ ہے کہ نصف صدی پہلے کے لکھے مزاح میں آج بھی اتنی ہی تابندگی اور تازگی ہے جتنی کہ اس وقت تھی۔ اسی طرح کرنل محمد خاں کی ''بسلامت روی'' ہے۔ یونس بٹ نے ٹی وی کا رخ کرنے سے پہلے بہت خوب صورت مزاح لکھا ہے جن میں ''شیطانیاں'' اور ''بٹ تمیزیاں'' وغیرہ اہم ہیں۔ اب گل نوخیز اختر مزاح میں اپنا نام بنارہے ہیں۔

مختصر کہانیوں میں مبشر زیدی اور اقبال خورشید اپنا نام بنا رہے ہیں۔ اس کے بعد مذہب اور سماج پر جناب جاوید احمد غامدی ہیں جو توجہ حاصل کرتے ہیں۔

غلام جیلانی برق کی ''من کی دنیا''، مختار مسعود کی ''آواز دوست'' بہترین کتابیں ہیں۔ شاعری میں ابن انشاء کی ''اس بستی کے اک کوچے میں'' اور پروین شاکر کی ''خوشبو'' مجھے پسند ہیں۔

سیمون ڈی بووا کا ناولٹ ''شعور کی عمر'' اور ریمنڈ کارور کی کہانی ''کتھیڈرل'' مجھے پسند ہیں ان کو ترجمے کا روپ بھی راقم نے دیا تھا۔

روسی ادب میں دستوئیوسکی کی "جرم وسزا"، "زلتوں کے مارے لوگ" سولزے نیتسن کا "گلاگ ارکی فلاگو" اور میکسم گورکی کی "ماں" پسند ہیں کافکا کی "میٹا مورفوسس" قابل قدر ہیں۔ پائلو کوایلہو کی "اے وچ آف پورٹو بیلو" پسند ہے۔

یہ اپنے احساس کی بات ہے کہ ہمیں کچھ لکھاری بہت اچھے لگتے ہیں کچھ لکھاری بطور لکھاری تو اہم ہوتے ہیں لیکن ہمیں ان تک پہنچنے میں دشواری ہوتی ہے اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ وہ لکھاری اچھے نہیں ہیں یا یہ کہ یہی لکھاری ہیں جو سب سے اچھے ہیں۔ پسند ناپسند انفرادی معاملہ ہوسکتا ہے۔ لکھاریوں تک رسائی بھی ایک اہم معاملہ ہے کہ بہت سارے لکھاریوں تک ہم پہنچ نہیں پاتے کہ کتاب بحرحال خرید کر پڑھنا ہوتی ہے

میں لٹریچر پر اتھارٹی نہیں ہوں یہ وہ کتابیں کہ جن تک میری رسائی ہوئی اور یہ کتابیں مجھے پسند بھی آئیں۔ باقی میری کم مائیگی ہے کہ میں نے بہت سی کلاسیکل کتابیں نہیں پڑھیں اور نہ ہی اپنے بے شمار ہم عصروں کو پڑھا ہے کہ جن کے متعلق رائے دینے سے بھی قاصر ہوں اس کے باوجود ایک پورا دفتر ہے جو یہاں سما گیا ہے اب مجھے اس باب کو بند کرنا ہے۔ ایک "بڑے ایوان" پر لگے دس روپے کی ٹکٹ پر تماشہ دیکھنے والے کب کے اپنے گھروں کے دروازے بند کر کے خواب

خرگوش میں محو تھے جب کہ بھکشو اپنی محویت میں بدھا سے ہم کلام تھا۔" بھکشو نے بدھ سے پوچھا، 'سپھل ہونے کی راہ کیا ہے؟' جواب آیا۔'با لک، کامیابی لمحہ موجود کو معنی دینا ہے۔سوال کیا 'معنی باہر سے آتا ہے؟' تھوڑا تامل اور پھر جواب ملا 'معنی کے لیے جستجو کرنا پڑتی ہے۔اجالے کی سہائتا کی جاتی ہے'۔بھکشو نے بے بسی سے کہا'مہاراج مجھے سچ کہاں سے ملے گا'۔جواب دیا'اپنے بھیتر میں رہ اور باہر پر آنکھ رکھ۔زمین پر آوازیں بہت ہیں،ساگر میں مچھلیاں بہت ہیں اور سچ کی صورت لمحہ بہ لمحہ بدلتی ہے'۔'ہے مہاراج۔۔۔پیڑ اور مکان گزرتے جارہے ہیں اور سفیدی تو اب مرغی کے انڈے برابر رہ گئی ہے'۔بدھ نے دھیرج بندھاتے ہوئے وچن دیا،'تو چنتا مت کر۔گیا کی ترائیوں میں برگد کے پیڑ بہت ہیں اور رات ابھی باقی ہے'۔'' کتابیں ابھی بہت ہیں اور رات بھی ابھی باقی ہے۔۔۔کتاب کو دوست بنائیے اور اپنی راہ کو سپھل کیجئے کہ سپھل ہونے کی بس یہی اک راہ ہے۔

میرا مطالعہ اور سائنس کی دنیا

محمد علی شہباز

سائنس دور جدید میں علم کا بہترین وسیلہ سمجھتی جاتی ہے۔ تاریخ انسانی میں ہمیشہ سے اسکا وجود کسی نہ کسی شکل میں موجود رہا ہے۔ ہربرٹ سپنسر کے مطابق سائنس اشیاء کے بارے ایک منظّم علم کا نام ہے۔ اشیاء کے اس علم میں بنیادی حیثیت مشاہدے کو حاصل رہی ہے۔ اس مشاہدے کی بنا پر ذہن انسانی اشیا کو کچھ خاص تراکیب یا درجات میں ترتیب دیتا ہے جس سے مختلف نوع کے علوم وجود میں آتے ہیں۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو معلوم تاریخ سے قبل کا انسان بھی کسی نہ کسی سائنس کا قائل رہا ہوگا۔ شکار کے عہد میں انسان مطلوبہ شکار تک رسائی کے لئے اسی سائنس کا سہارا لیتا ہوگا۔ ایسے ہی اوزار جیسے چاقو یا چھری کی بناوٹ میں بھی کچھ خاص مشاہدات کارفرما رہے ہونگے۔ سادہ ترین اور سطحی نوعیت کے مشاہدات سے کائنات کے بارے میں ان کا ایک نقطہ نظر قائم ہوتا ہوگا جسے ہم آج میتھالوجی یا فکشن کا نام دیتے ہیں۔ یہ بلاشبہ اس دور کی سائنس ہوگی۔ قدیم ادوار میں جن اہم خطوں کا ریکارڈ ملتا ہے ان میں مصر، چین، ہند، یونان اور عرب شامل ہیں۔ سائنس کی تاریخ کے حوالے سے اہم کتاب ''تاریخ سائنس'' ہے جس کے مصنف جارج سارٹن نے نہایت تفصیل سے ان مختلف ادوار کا جائزہ لیا ہے۔ یہ کتاب چار جلدوں پر مشتمل ہے۔ ہر جلد کے آخر پر حوالہ جات موجود ہیں جو اس کتاب کو ایک اہم تاریخی دستاویز بنا دیتے ہیں۔

ان قدیم تہذیبوں کی سائنس کے بارے میں ہماری جانکاری کے ماخذ اولین تو ان کے کھنڈرات ہیں جن کو ماہرین ارضیات اور انسانیات نے ڈھونڈا ہے۔ مزید ان کے بارے میں علم اس دور کی مقدس کتابوں، روایات اور تحریروں سمیت آرٹ میں ملتا ہے۔ بائبل یعنی انجیل و تورات و زبور وغیرہ کے علاوہ سکندر یونانی کے دور کی کتب تاریخ اس ضمن میں قابل ذکر ہیں۔ ایسے ہی ہند میں مہابھارت میں استعمال ہونے والے اوزار اور ہتھیاروں سمیت قدیم ہڑپہ اور موہنجوداڑو کی ثقافت سے بھی اس دور کی سائنس کے آثار ملتے ہیں۔

مصر کی اہم سائنسی دریافتوں میں کلہاڑے، برچھیاں، مٹی کے برتن، سوت کاتنے کا

فن اور سب سے قابل ذکر کاشتکاری کے اوزار تھے کیونکہ دریائے نیل کے کنارے واقع مصر کی زمین زرعی پیداوار کے لئے موزوں ترین رہی ہوگی۔ مصر ہی میں تحریر کا فن ایجاد ہوا۔ اس دور کی تحاریر زیادہ تر کاروباری حساب کتاب اور بادشاہوں کی تواریخ پر مشتمل تھی۔ قوانین حرکت اور جیومیٹری کے حوالے سے مصر قابل تحسین ہے۔ اہرام مصر آج بھی دنیا کو مصری سائنس کے عروج کی داستان سناتے ہیں۔ علم فلکیات میں بابل یعنی مصر کی تہذیب نے گرانقدر کام کیا۔ موجودہ مہینوں اور دنوں کی گھنٹوں میں تقسیم اسی علم فلکیات کا نتیجہ ہے۔ یہی مصری علوم کی بنا پر مشہور یونانی فلسفی طالیس نے سورج گرہن کی پیشین گوئی کی تھی جو بعدازاں اہل یونان کی علم یا فلسفہ میں دلچسپی کا باعث بنی۔

مصر کے علوم کا اثر اہل یونان پر بھی پڑا۔ اور وہاں ایک عظیم تہذیب نے جنم لیا۔ موجودہ مغربی تہذیب خود کو اہل یونان کا وارث قرار دیتی ہے۔ قدیم یونان پر بے بہا کتب اور مقالے تحریر کیے گئے ہیں۔ ان اہل یونان میں فیثا غورث کا نام سب سے زیادہ قابل ذکر ہے۔ اس نے سائنس اور بالخصوص جیومیٹری وحسابیات میں بہت اہم دریافتیں کیں۔ شاید وہ پہلا شخص تھا جو سمجھ سکا کہ زمیں ایک گیند کی مانند خلا میں دوڑ رہی ہے۔ اس کے بعد یونانی حکما کی ایک لمبی فہرست ہے جس میں زینوفینز، دیموقراطیس، انکز یمنڈر، زینو ایلیائی، ایمپی ڈاکلز، سقراط، افلاطون اور ارسطو وغیرہ شامل ہیں۔ پارمینڈس نے کہا کہ انسان مچھلی کے بطن سے پیدا ہوا۔ انکز یمنڈر نے بتایا کہ ہوا کیسے چلتی ہے اور شہاب ثاقب کیسے گرتے ہیں۔ دیموقراطیس نے ایٹم کا نظریہ پیش کیا۔ اقلیدس نے جیومیٹری کے بنیادی اصول وضع کیے۔ بطلیموس نے سورج چاند اور ستاروں کی گردش واضح کی۔ ارشمیدس نے اچھال کی قوت اور حرکیات کے اصولوں پر بحث کی۔ یہ بات اہم ہے کہ طبیعات سمیت دیگر سائنسی موضوعات پر پہلی باقاعدہ کتب ایک یونانی فلسفی ارسطو ہی نے ترتیب دی تھیں۔

پانچویں صدی عیسوی کے بعد سے تیرہویں صدی عیسوی کے دور تک مغربی ریاستوں میں سائنس پر قابل ذکر کام نہیں ملتا۔ اس دور میں عرب کے قبائل اور ایرانی تہذیب میں سائنس کے حوالے سے کافی پیش رفت نظر آتی ہے۔ سمرقند و بخارا، شام و عراق، اندلس و بصرہ میں مسلم سائنسدانوں نے بے بہا ایجادات کیں۔ مشہور سائنسداں جم الخلیلی کی کتاب ''سالک راہ'' میں ان سائنسدانوں کے کام پر تفصیلی گفتگو موجود ہے۔ نویں صدی عیسوی سے اہل عرب نے یونانی کتب سمیت دنیا بھر کے علوم کو عربی میں ترجمہ کروایا۔ بطلیموس کی کتاب ''الکونیات'' کو اہلِ یورپ میں عربی سے لاطینی ترجمے کے ساتھ متعارف کروایا گیا۔ عربوں کی دلچسپی زیادہ تر فلکیات، ریاضی اور طب کے میدان میں رہی۔ ابن الہیثم کی ''کتاب المناظر'' میں روشنی، البیرونی کی

''کتاب الہند'' میں سفرنامہ، ابن سینا کی کتاب ''القانون'' اور ''الطبیعات فی الشفا'' میں طب اور فزکس پر سیر حاصل گفتگو اور مشاہدات موجود ہیں۔ الرازی نے سرجری اور جابر بن حیان نے کیمیا کی بنیادیں ڈالی۔

تیرہویں صدی عیسوی میں مغرب ایک نشاۃ ثانیہ کے دور سے گزر رہا تھا۔ عرب دنیا میں تاتاریوں کے حملے اور عقلی علوم کی سرزنش سے سائنسی زوال شروع ہو رہا تھا تو دوسری جانب فرانسس بیکن کی تحریریں اٹلی میں جدید سائنس کی بنیادیں رکھ رہی تھیں۔ عربوں نے سائنس کے متعدد شعبوں میں تجربات اور مشاہدات کو فوقیت دی۔ بعد میں آنے والے مغربی مفکرین نے ان تجربات سے فائدہ اٹھایا اور انہیں ایک منظّم طریقہ کار کے تحت نت نئی ایجادات میں استعمال کیا۔

کوپرنیکس نے 1543 میں اپنی کتاب ''آسمانی اشیاء کی دوری حرکت'' سے نظام شمسی میں بطلیموس کے خیالات کو رد کی۔ اس کتاب میں کوپرنیکس نے اس دور کے مروجہ ریاضی کی زبان میں ثابت کیا کہ زمین نظام شمسی کا مرکز نہیں ہے۔ اس کتاب کے دیباچے میں پوپ پال سوم کو مخاطب کرتے ہوئے کوپرنیکس نے اس نئے نظام کو متعارف کروایا۔ کوپرنیکس جانتے تھے کہ صدیوں سے رائج بطلیموس کے سکوت ارضی کے نظام کو چیلنج کرنا مذہبی اور معاشرتی تنقید کا نشانہ بننے کے مترادف ہے اسی لئے انہوں اپنی اس کتاب کو تاخیر سے شائع کیا اور اس میں ان نے دوستوں کا بنیادی کردار تھا۔ اپنے دیباچے میں وہ پوپ کو واضح کرتے ہیں کہ انکا ارادہ کسی تسلیم شدہ نظام کی تضحیک نہیں بلکہ خدا کے عطا کردہ گیان کی دین ہے۔ اور یہ کہ انکے یہ نتائج حتمی نہیں ہیں اور بعد میں آنے والوں کے لئے ہدایت ہوں گے۔ انکی اس کتاب کا انگریزی ترجمہ جان ہاپکنز یونیورسٹی پریس کی جانب سے شائع کیا گیا ہے۔

اس کے بعد اٹلی کے مشہور سائنسدان گلیلیو گلیلی نے دوربین کے استعمال سینئے سیارے اور ان کے چاند دریافت کیے۔ گلیلیو کی اہم تصنیف ''دو عظیم عالمی نظاموں پر مکالمہ'' ہے جو 1632ء میں شائع ہوئی۔ کوپرنیکس کے بعد سے زمین کی حرکت اور بطلیموس کے نظام فلکیات پر کافی سوالات اٹھائے گئے اور عوام سمیت مذہبی حلقوں میں ان پر گفت وشنید ہوتی رہی۔ گلیلیو نے کوپرنیکس کے نظام کی حمایت کا اعلان کیا۔ اس کا انداز کافی تلخ اور لہجہ تند تھا۔ کتاب کے دیباچے میں وہ عوام کو واضح طور پر کہتا ہے کہ جن لوگوں کو فلکیات کا علم نہیں وہ ان بحثوں میں اپنی رائے نہ دیں۔ اسی طرح اس دور کے مشائی فلسفیوں پر کڑی تنقید کرتے ہوئے کہتا ہے کہ یہ فلسفی ماسوا چند رٹے رٹائے اصولوں کے کچھ نہیں جانتے۔ اپنی اس کتاب میں ایسے ہی دو فلسفیوں ساگریدو اور سالویتی جو کہ فلورنس اور وینس کے رہائشی تھے کے ساتھ گلیلیو کے مکالمات پیش کئے گئے ہیں۔ اس

کتاب کا انگریزی ترجمہ موجود ہے۔

اسی عہد کی ایک مشہور کتاب 'مائیکروگراف' ہے جو 1665ء میں شائع ہوئی۔ اس کے مصنف رابرٹ ہک ہیں جنہوں نے پہلی مرتبہ محدب عدسوں یعنی خوردبین کی مدد سے چھوٹے جانداروں کا مشاہدہ کیا۔ کتاب کے دیباچے میں مصنف نے بادشاہ وقت کی علم دوستی کی تعریف کرتے ہوئے اپنی کم علمی کا اعتراف کیا۔ بعدازاں وہ انسانی عقل کے نقائص کا ذکر کرتے ہیں جس میں بنیادی وجوہات یادداشت کا نقص اور حواس کی حدود ہیں۔ ان نقائص کو تجرباتی سائنس کی مدد سے کم کیا جاسکتا ہے۔ فطری حواس کے نقص کو کم کرنے کے مصنوعی حواس آلات یا مشینوں کی شکل میں سامنے آتے ہیں۔ اس حوالے سے خوردبین بھی ہمارے حواس کے نقص کم کرتی ہے۔ اسکے بعد کتاب میں خوردبین کی ساخت اور اسکے استعمال پر کافی تفصیل موجود ہے۔ یہ کتاب موجودہ مالیکیولر بائیولوجی اور جینیات کے شعبوں میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔

نیوٹن کی اہم تصنیف ''پرنسپیا'' جس کا پورا نام ''فطری فلسفہ کے ریاضیاتی اصول'' ہے نے جدید فزکس کی بنیاد رکھی۔ یہ کتاب سر آئزک نیوٹن نے 1687ء میں شائع کی۔ اس کتاب میں پہلی مرتبہ کیلکولیس کے اصول بھی وضع کئے گئے۔ یہ وہ اصول ہیں جنکی بنیاد پر نیوٹن اس قابل ہوسکا کہ وہ اپنے مشاہدات کو ریاضی کی زبان میں پیش کرسکے اور اس کتاب کی مدد سے سائنس کو ایک ایسی زبان میسر آگئی جس کی وجہ سے کائنات کے قوانین کو سمجھنا قدرے آسان ہوگیا۔ نیوٹن نے کتاب کے دیباچے میں واضح کیا کہ حرکیات کو عقلی سطح پر بالکل صحیح علم یعنی جیومیٹری اور عملی سطح پر ناقص یعنی میکانیات سمجھا جاتا رہا ہے۔ یہ غلط رویہ جیومیٹری کی وجہ سے نہیں بلکہ اس سوچ کا ہے جو اس کو عملی نہ بناسکی۔ لہٰذا نیوٹن نے اپنی کیلکولس سے میکانیات کو علم کا درجہ عطا کیا اور جیومیٹری سے اسکی تائید بھی کی۔ اس کتاب کو تمام سائنس میں بنیادی حیثیت دی جاسکتی ہے۔ کیونکہ نہ صرف طبیعات بلکہ طب، کیمیا، فلکیات سمیت تمام مظاہر فطرت جن سادہ ترین قوانین پر کام کرتے ہیں انہیں ریاضیاتی مقداروں کی مدد سے سمجھا جاسکتا ہے اور اسکے لئے نیوٹن کی یہ کتاب آج بھی مشعل راہ ہے۔

یہاں ضروری ہے کہ 1690ء میں شائع ہونے والے لائبنیز کے مضامین کا بھی ذکر ہو جس میں انہوں نے نیوٹن کی تقسیم پذیر کیلکولس کے برخلاف تسلسل کی میکانات پر بحث کی لیکن جسے پذیرائی نہ ملی۔ اس کتاب میں لائبنیز نے ایٹمی نظریے کی مخالفت میں دلائل پیش کئے ہیں۔ مزید انہوں نے نیوٹن کی طرح مادے کا جوہر محض عرض کی بجائے انرشیا یعنی جمود کو قرار دیا اور ایسے ہی جمود کے مقابل ایک قوت کا تصور ہے جو تبدیلی کا باعث ہے۔ دیکارت اور کیپلر بھی ایسے ہی

قوت کے تصور کے قائل تھے۔ لائبنیز جمود کو بھی ایک قوت قرار دیتے تھے جسے انہوں نے 'جوہری قوت' کا نام دیا۔ خط مستقیم کی حصوں میں تقسیم ایک ذہنی عمل ہے نہ کہ حقیقی۔ حقیقت میں یہ ایک تسلسل ہے۔ وہ کائنات کو ایک حکمت سے بھرپور شے قرار دیتے ہیں جس کے تمام حصے باہم مربوط ہیں۔ اور ان کا بنانے والا ایک مدبر قسم کا جیومیٹری دان ہے۔ بائیولوجی کے حوالے سے ایک مضمون میں وہ فاسلز پر بحث کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ ہڈیاں یا فوسلز جو زمین سے ملتے ہیں فطرت کا ایک دھوکہ ہیں۔ یہ کسی جاندار کے نہیں جو ہم سے پہلے ہو گزرے ہوں۔ یہ زمین اور چٹانوں کے باہمی تعاملات ہیں اور جانوروں کی ہڈیاں نہیں ہیں۔ گویا وہ ارتقائی نظریہ کے قائل نہ تھے۔

اٹھارہویں اور انیسویں صدی عیسوی کو یورپ میں سائنسی انقلاب کا آغاز سمجھا جاتا ہے۔ تجرباتی منہاج بطور سائنسی طریقہ کار طے پاتے ہی مغربی سائنسدانوں نے وسیع پیمانے پر فطرت کی اشیا پر تجربات شروع کر دیے۔ چونکہ توانائی اور بجلی کا استعمال صنعتی ترقی میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے لہذا ان شعبوں میں سب سے زیادہ کام ہوا۔ درجہ حرارت کی تعریف کرنے اور اسے ماپنے کے لئے سیلسی اس، فارن ہائیٹ اور کیلون نے بہتر کام کیا۔ اسی طرح بجلی کی پیدائش اور اسکی ترسیل میں گلبرٹ، ہاؤکسبی، ولیم گرے وغیرہ نے بہت کام کیا۔ بجلی کے کاروباری یا صنعتی استعمال میں سب سے پہلے گوٹلیب کروگر کا نام آتا ہے جس نے طب کے شعبے میں بجلی کا استعمال کیا اور بتایا کہ انسانی جسم پر بجلی کے کیا اثرات ہوتے ہیں۔ اسی طرح ایک پادری آندریگورڈن نے گرجا گھر کی گھنٹی کو خودکار مشین کے طور پر بجلی سے چلایا۔ اسے بلاشبہ پہلی باقاعدہ "موٹر" کا درجہ دیا جا سکتا ہے۔ بجلی کو ذخیرہ کرنے کا ہنر جرمنی کے سائنسدان وان کلیسٹ کے حصہ میں آیا جس نے پہلا "لیڈن مرتبان" یا بجلی گھر ایجاد کیا۔ بجلی کے یہ کرشمے بادشاہوں کے درباروں اور عوامی میلوں ٹھیلوں میں کرتب کے طور پر دکھائے جاتے تھے۔ جس سے عوام میں سائنس کی علمی دھاک بیٹھنا شروع ہوئی۔ یورپی ممالک بالخصوص فرانس، انگلینڈ اور جرمنی میں ہونے والے یہ تجربات آہستہ آہستہ سمندر پار امریکہ تک جا پہنچے۔

بنیامین فرینکلن جو کہ امریکہ کے صدر بھی رہے، انہیں بجلی کے متعلق کافی شوق پیدا ہو گیا۔ فرینکلن نے نہ صرف تجربات کیے بلکہ بجلی کے متعلق باقاعدہ نظریہ بھی تشکیل دیا۔ ان کے مطابق بجلی ایک فلوئڈ یعنی مائع نما چیز ہے جو ہر جسم میں ذخیرہ ہوتی ہے۔ عام حالات میں یہ مائع توازن میں رہتا ہے۔ لیکن کسی بیرونی اثر سے اس کا لیول اوپر نیچے ہو سکتا ہے جس کی وجہ سے اجسام پر برقی بار پیدا ہوتے ہیں۔ اوپر والا بار "مثبت" جبکہ نیچے درجے والا بار "منفی" ہوتا ہے۔ آج یہ نظریہ اگرچہ درست نہیں مانا جاتا لیکن فرینکلن کی برقی بار کی مثبت اور منفی میں تقسیم آج بھی رائج

ہے۔فرینکلن اس وقت فیلاڈیلفیا میں اخبار چلاتے تھے۔انہوں نے رائل سوسائٹی کو اپنی دریافت کے بارے خط لکھا لیکن برطانوی سائنسدانوں نے ان کا خط پڑھا ہی نہیں کیونکہ ایک نوآبادیاتی پس ماندہ علاقے سے سائنس جیسی عظیم شے کی دریافت ہونا ہی بیوقوفی تھی! لیکن بہرحال فرانسیسی سائنسدانوں نے ان کے کام کو سراہا۔فرینکلن نے ثابت کیا کہ آسمانی بجلی وہی ہے جو یہاں زمین پر تجربہ گاہ میں بنائی جاتی ہے۔ اس کے بعد ایمپیئر ، گاؤس، مائیکل فیراڈے، اوئیسٹڈ اور میکسول وغیرہ نے برقیات اور مقناطیسیت کے بنیادی قوانین وضع کیے۔میکسول کی کتاب "برقیات و مقناطیسیت پر ایک مضمون" میں انکے بنیادی نظریات واضح کئے گئے ہیں۔

انیسویں صدی کی اہم کتب میں چارلس ڈارون کی کتب کا نام سرفہرست ہے۔ڈارون 1809ء میں ایک انگریزی خاندان میں پیدا ہوئے۔1831ء میں وہ 'بیگل' نامی ایک بحری جہاز میں سوار ہوئے اور 6 سال تک مختلف جزیروں کی سیر کرتے رہے۔اس دوران انہوں نے مختلف انواع کے جانداروں پر خصوصی مشاہدات کئے۔ان کے یہ مشاہدات ان کی کتاب "بیگل کے سفر" میں درج ہیں جو 1839ء کو شائع ہوئی۔اس سے پہلے لامارک نامی ایک ماہر حیاتیات نے 1801ء میں "فلسفہ حیوانیات" نامی کتاب میں یہ نظریہ پیش کیا تھا کہ مختلف حیوانات بشمول انسان دوسرے جانداروں سے ارتقاء پذیر ہوئے ہیں۔کیونکہ انکے سامنے بڑا سوال یہ تھا کہ جانداروں کی اتنی زیادہ تعداد کیسے وجود میں آئی ہوگی؟اور یہ کہ کیا ان تمام جانداروں کا کوئی باہمی تعلق ہے؟ کیونکہ یہ عام مشاہدات تو پالتو جانوروں اور پودوں سے بھی کئے جا سکتے ہیں کہ ان میں کچھ مشترک اقدار پائی جاتی ہیں جن کی بنیاد پر انہیں مختلف گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔اس شعبے میں اہم کام مائیکروسکوپ کی دریافت سے ہوا جس سے یہ دیکھنے میں آیا کہ کس طرح مختلف جانداروں کے ایمبریو کی ڈویلپمنٹ ایک جیسے انداز میں ہوتی ہے۔1858ء میں شائع ہونے والے "مضامین" میں مشہور سائنسدان و فلسفی ہربرٹ سپنسر نے جانداروں میں آہستہ اور درجہ وار تبدیلی آنے کے عمل کو "ارتقاء" کا نام دیا۔ اسی دوران مسٹر والس اور ڈارون کا مشترکہ نظریہ یعنی "فطری چناؤ" سامنے آ گیا۔جس میں یہ ثابت کیا گیا کہ تمام جاندار یک لخت کسی معجزاتی طریقے سے پیدا نہیں ہوئے بلکہ ایک خاص سلسلہ وار ارتقا کے نتیجے میں پیدا ہوئے ہیں۔انہوں نے یہ نظریات اپنی کتاب ''انواع کی ابتدا'' میں پیش کیے جو 1859ء میں شائع ہوئی۔

اس کتاب کے نام ہی میں وہ اپنے نظریے کو واضح کر دیتے ہیں۔یعنی فطری چناؤ کے ذریعے انواع کی ابتداء ہوئی۔یا زندگی کی دوڑ میں چنیدہ نسلوں کی بقا ہوئی۔کتاب کے دیباچے ہی میں وہ بارہا یہ تاکید کرتے ہیں کہ یہ کتاب ٹھوس شواہد پر مبنی ہے۔وہ بتاتے ہیں کہ 'نیچری' حضرات

یہ تسلیم کرتے ہیں کہ جانداروں پر ماحول کا اثر ہوتا ہے لیکن وہ سب ایک دوسرے سے کیسے ارتقاء پذیر ہوتے ہیں اور ماحول سے مطابقت کیسے پیدا کرتے ہیں یہ انہیں معلوم نہیں ہے۔ لہذا یہ کتاب لکھی گئی۔ مالتھس نے جہد للبقاء کی بات کی تھی جسے ڈارون ایک عالمگیر نظریہ سمجھتے ہیں۔ بقاء کی اس جدوجہد میں جو جاندار فطرت کے جبر سے مقابلہ کرنے کی صلاحیت پیدا کرلے گا صرف اسی ہی کی نسل مزید بڑھے گی۔ ڈارون ہی کی دوسری کتاب "انسان کی پیدائش" میں انہوں نے انسانی نوع کے ارتقاء پر بات کی۔ لازم ہے کہ اس نظریے سے یک لخت تخلیق آدم کے مذہبی نظریہ کی نفی ہوتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ تمام تر شواہد اور سائنسی بنیاد کے باوجود نظریہ ارتقاء کو کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ ارتقاء کی بنیاد پر سوشل ڈارون ازم کے نظریات نے پرورش پائی۔ مشہور جرمن فلسفی نطشے نے مشہور زمانہ ناول "زردشت نے کہا" میں جس فوق البشر کی نوید سنائی تھی وہ بھی نظریہ ارتقاء ہی کی بنیاد پر قائم تھا۔ فریدرک انگلز نے "فطرت کی جدلیات" نامی کتاب میں ہیگل اور مارکس کے جدلیاتی طریقہ کار کو نظریہ ارتقاء کے تحت واضح کیا۔ بیسویں صدی کی زیادہ تر بحثوں کا محور نظریہ ارتقاء ہی تھا۔

حیاتیات میں نظریہ ارتقاء کے ساتھ ہی ساتھ مغربی فکر میں ایک دلچسپ موڑ فزکس کی وجہ سے پیدا ہونا شروع ہوا۔ جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا کہ بیسویں صدی کے آخر تک برقیات اور مقناطیسیت سمیت روشنی، حرارت اور ٹیکنالوجی کے دیگر شعبوں میں کافی کام ہو چکا تھا۔ لہذا اب یہ عمومی تاثر پیدا ہو رہا تھا کہ سائنس اپنی بنیادوں میں ایک مکمل علم ہونے کا دعوی کرے۔ یہی وجہ کہ اب فلسفے اور نفسیات سمیت دیگر علمی شعبوں میں بھی سائنسدان ایک عالمگیر سائنسی ڈھانچہ تشکیل دے رہے تھے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر ارنسٹ ماخ کی کتاب "حسیات کا تجزیہ" قابل ذکر ہے جو 1885ء میں پہلی مرتبہ شائع ہوئی۔ اس کتاب میں انہوں نے انسانی نفسیات اور حواس خمسہ کا تفصیلی جائزہ پیش کیا۔ لیکن اس کتاب کے دیباچے ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں سائنسدان ان موضوعات کو طبعی علوم میں ڈھٹائی نہیں بلکہ عاجزی کے ساتھ شمار کرتے تھے۔ شوپنہائر کے فلسفہ خود ارادیت اور گوئٹے کی مابعدالطبیعات کے برعکس ماخ کا رجحان حسیاتی علوم کا طبعیات کے دائرے میں جائزہ تھا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ فزکس ہی کو کل علم مانتے تھے۔ بیسیویں صدی سائنس کی دنیا میں حیرت انگیز ترقی کا باعث ہوئی ہے۔ شاید اس ایک صدی میں ٹیکنالوجی اور دیگر سائنسی نظریات نے اسقدر زیادہ ترقی کی ہے کہ شاید ہی تاریخ انسانی میں ایسا ہوا ہو۔ تمام سائنسی علوم میں بنیادی انقلابی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ اس حوالے سے ہم صرف چند اہم نظریات یا دریافتوں کا ذکر کرتے ہیں۔

1905ء میں جرمنی کے گمنام سائنسدان جو اس وقت ایک سوئس پیٹنٹ آفس میں کلرک تھے، انہوں نے 3 اہم پرچے شائع کیا جن کی اشاعت نے صدیوں سے قائم طبیعات کے نظریات میں انقلاب پیدا کر دیا۔ان کا نام البرٹ آئن سٹائن تھا۔آئن سٹائن نے روشنی کی ساخت پر میکسول کی مساوات اور مائکلسن مورلے کے تجربات کا بخوبی جائزہ لیا۔اور لورنز نامی ایک ریاضی دان کی بنائی ہوئی مساواتوں کو بنیاد بنا کر ایک نیا نظریہ پیش کیا۔اس نظریہ کے مطابق خلاء میں کسی مادی شے کی رفتار روشنی کی رفتار سے تجاوز نہیں کر سکتی اور یہ کہ ایک مشاہدہ کرنے والا زمان مکاں میں جن طبعی مقداروں کا مشاہدہ کرے گا وہ کسی دوسرے مشاہد سے مختلف ہونگی۔ گویا ایک ہی واقعہ جو ہماری روزمرہ کی پیائش میں ایک خاص وقت میں ظہور پذیر ہوتا ہے وہ اب مختلف شاہدین کے لئے مختلف اوقات میں ہوگا۔یعنی دو شاہدین کی پیائش ایک دوسرے کے لحاظ سے اضافی ہونگی۔اسے آج ہم خصوصی نظریہ اضافیت کا نام دیتے ہیں۔

1915ء میں آئن سٹائن نے اپنے ایک ساتھی منکوسکی کے ساتھ مل کر نظریہ اضافیت کو گریوٹی یعنی کشش ثقل کی فہم میں استعمال کیا۔دس سال کی انتھک محنت اسلئے ہوئی کہ نیوٹن کے دور سے ہی زمان و مکاں کو ایک مطلق اور جامد حیثیت دی گئی تھی۔لیکن اس کی وجہ سے کچھ مسائل تھے جن کا حل نیوٹن اور اسکے بعد بھی نہ مل سکا تھا۔اب جامد زمان و مکاں کے لئے جو ریاضیاتی مفروضے استعمال میں لائے جاتے تھے ان سے نظریہ اضافیت واضح نہیں ہوتا تھا۔لہذا ایک نیا قسم کا ریاضی متعارف کروانے کی ضرورت تھی۔آئن سٹائن کو یہ ریاضی ریمان کے علم الہندسہ کی شکل میں دستیاب ہوا۔اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ زمان و مکاں ایک اکائی کی شکل میں متحرک حیثیت پا گئے۔یعنی زمان و مکاں میں مادہ یا توانائی کی موجودگی سے انکی ساخت تبدیل ہو جاتی ہے۔اور ساخت کی یہ تبدیلی ہی وہ شے ہے جسے نیوٹن کبھی گریوٹی کی قوت قرار دیتا تھا۔ حیاتیات کے نظریہ ارتقاء کی طرح یہ نظریہ بھی ایک انقلابی نظریہ ثابت ہوا۔اگرچہ اس نظریہ اضافیت کی سمجھ بوجھ کے لئے کافی ریاضی اور جیومیٹری کے ساتھ فزکس کی بنیادی مساواتوں کا علم ضروری ہے اس لئے بہت سے افراد اک کی گہرائی تک نہیں جا پاتے۔

نظریہ اضافیت کی تفہیم عامہ کے لئے آئن سٹائن سمیت دیگر کئی اہم فلسفیوں اور سائنسدانوں نے عام فہم زبان میں کتب تحریر کرنا شروع کر دی۔آئن سٹائن خود بھی مختلف عوامی محفلو ں میں لیکچر کے ذریعے اپنے نظریات کی ترویج کرتے رہے۔ اس ضمن میں آئن سٹائن کی کتاب " نظریہ اضافیت: خصوصی و عمومی" (1916) قابل ذکر ہے۔ جو جرمن زبان میں لکھی گئی اور بعد ازاں اس کا انگریزی ترجمہ شائع ہوا۔آئن سٹائن ایک ایسے عہد میں پیدا ہوئے تھے جب

دنیا ذرائع ابلاغ کی ترقی سے سمٹ کر ایک گلوبل ولیج بنتی جارہی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں جلد ہی دنیا بھر میں عزت اور مقام حاصل ہوگیا۔ اور وہ ایک غیر معمولی شخصیت کے روپ میں ڈھل گئے۔ ان کے اہم نظریات اور رسائل وخطبات کو نیویارک میں بونینزا پبلشرز نے 1988ء میں یکجا کرکے شائع بھی کیا۔ آئن سٹائن ہی کی ایک اور کتاب "فزکس کا ارتقاء" کے نام سے شائع ہوئی۔ یہ کتاب اس لحاظ سے اہم ہے کہ اس میں ایک عظیم دماغ نے فزکس کی تاریخ اور اس کے اہم نظریات پر روشنی ڈالی ہے۔ دیباچے ہی میں لکھتے ہیں کہ اس کتاب کا مقصد یہ دیکھنا ہے کہ انسانی ذہن اور مظاہر فطرت میں کیسی مطابقت پائی جاتی ہے۔

جیسا کہ پہلے کہا گیا کہ بیسویں صدی کے آغاز تک سائنسی علم کو دیگر تمام ذرائع یعنی مابعدلطبیعات وغیرہ پر فوقیت ملنا شروع ہوگئی تھی۔ اس ضمن میں ہم نے ماخ کا ذکر کیا۔ اس کے ساتھ ہی ایک اہم اور مشہور نام برٹرینڈ رسل کا بھی ہے۔ اگرچہ دنیا میں رسل کا نام ایک فلسفی کے طور پر جانا جاتا ہے۔ لیکن انکی ابتدائی تعلیم ریاضی کے شعبہ میں تھی۔ سائنس کو کائناتی تفہیم کا ذریعہ سمجھنے والوں میں سب سے بلند آواز رسل ہی کی ہے۔ رسل نے منطق اور فلسفے کو بھی سائنسی بنیادوں پر استوار کرنے کی کوشش کی۔ آئن سٹائن کے نظریہ اضافیت کے متعلق ان کی 1925ء کی کتاب "اضافیت کی الف ب" اس موضوع پر بہترین کام سمجھا جاسکتا ہے۔ اس کے ساتھ الفرڈ نارتھ وائیٹ ہیڈ کا نام بھی قابل ذکر ہے۔ جن کے ساتھ مل کر برٹرینڈ رسل نے "اصول ریاضی" نام کی ایک ضخیم کتاب تحریر کی۔ اس کتاب میں ریاضی کو علامتی منطق کی شکل دینے کی کوشش کی گئی ہے۔

برٹرینڈ رسل نے اپنی دیگر کتابوں جیسے "فلسفہ کے مسائل" اور "فلسفے کا تعارف" سمیت دیگر کتابوں میں جس فلسفے کی حمایت کی ہے وہ "سائنسی فلسفہ" ہی ہے۔ یعنی کہ فلسفے کو سائنسی منہج پر تشکیل دینا چاہیے۔ اسی سلسلے کے دیگر اہم ناموں میں ہنری پوئن کیرے کا نام بھی قابل ذکر ہے۔ وہ اپنے عہد کے سب سے عظیم سائنسدانوں میں شامل ہوتے ہیں۔ انکی کتاب "سائنس اور سائنسی طریقہ کار" میں وہ ریاضی کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہیں۔ اس کتاب کا دیباچہ برٹرینڈ رسل نے لکھا ہے اور سائنسی فلسفہ کے حوالے سے پوئن کیرے کی اس کتاب کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے۔ انہی کی ایک اور کتاب "سائنس کی قدر" ہے جس میں وہ سائنسی طریقہ کار پر سیر حاصل بحث کرتے ہیں۔ رسل کے ساتھ ساتھ اوس پنسکی اور وائٹ ہیڈ بھی اسی طرز کے مفکر تھے۔ وائٹ ہیڈ کی اہم تصنیفات میں "سائنس اور جدید دنیا" شامل ہے۔ مشہور امریکی فلسفی جان ڈیوی نے اس کتاب کو سائنس اور فلسفہ کے حوالے سے سب سے اہم تصنیف قرار دیا ہے۔ وائٹ ہیڈ کی یہ کتاب انکے خطبات پر مشتمل ہے جو انہوں نے ہارورڈ یونیورسٹی میں "لوویل لیکچرز سیریز" کے نام سے پیش

کیے۔ایسے ہی کیمبرج یونیورسٹی پریس کی 1919ء میں شائع کردہ کتاب "فطری علوم کی تحقیق" ایک زبردست حوالہ ہے جس میں وائٹ ہیڈ نے زبان و معنی، ذہن و شعور، زمان و مکاں اور معروض و موضوعنیت پر سیر حاصل مباحث پیش کیے ہیں۔ریاضی کے حوالے سے ان کی اہم کتاب "ریاضی کا تعارف" ہے جو رسل ہی کی طرح ریاضی کی بنیادوں میں موجود منطقی نظام کی تشریحات پیش کرتی ہے۔

رسل کے بعد فلسفے میں بالخصوص اور تمام علوم انسانی میں بالعموم سائنسی طریقہ کار ہی کو سچائی کی کسوٹی قرار دیا جانے لگا۔منطقی اثباتیت والوں نے کسی بیان کے صحیح اور غلط ہونے کا معیار منطقی و تجرباتی تصدیق کو قرار دیا اور کارل پوپر نے سائنسی و غیر سائنسی نظریات کی پرکھ کا معیار ان کی تردید کا ہونا قرار دیا۔اسی دور میں عالمی جنگوں اور نوآبادیاتی نظام کے دوران جدید سائنس نے ترقی کی اور سائنسی کرشمے اس قدر تعداد میں سامنے آئے کہ اس دور کو سائنسی عہد کا نام دیا جانے لگا ہے۔نظریہ اضافیت کی طرح کوانٹم فزکس نے بھی انسانی علوم پر گہرا اثر چھوڑا ہے۔کوانٹم نظریہ بیسویں صدی کی دوسری اور تیسری دہائی میں قائم ہوا۔اس نظریہ نے ہزاروں سال کی انسانی فہم میں انقلابی کردار ادا کیا۔اس سلسلے میں کوانٹم نظریہ کے بانی ورنر ہائزن برگ کی کتاب "فزکس اور فلسفہ" قابل ذکر ہے۔اس کتاب میں ہائزن برگ نے کوانٹم نظریہ کے دلچسپ اور عجیب حقائق کی بنیاد پر فلسفے کے مسائل کا از سر نو جائزہ لیا ہے۔یہ کتاب کوانٹم فزکس اور اس سے پھوٹنے والے دیگر مباحث میں اہم کردار کی حامل ہے۔کتاب کے دسویں باب میں انہوں نے 'زبان اور حقیقت' کا جائزہ طبیعات کی جدید تشریح کی شکل میں پیش کیا ہے جو لسانیات اور علم الانسان کے حوالے سے اہم ہے۔

ہائزن برگ کے علاوہ ایک اور اہم نام ارون شروڈنگر کا ہے جو کوانٹم طبیعات میں حرکت کی مساوات پیش کرنے کے حوالے سے زیادہ جانے جاتے ہیں۔شروڈنگر کی تحریروں میں زندگی کے مختلف پہلو نظر آتے ہیں۔ان کی اہم کتب میں "زمان و مکاں کی ساخت" جو کہ نظریہ اضافیت پر لکھی گئی ہے اور "فطرت اور یونان؛ سائنس اور انسان" جس کا تعارف مشہور سائنسدان سر راجر پنروز نے تشکیل دیا ہے اور "زندگی کیا ہے" نامی ایک رسالہ شامل ہیں جس میں وہ حیاتیات اور طبیعات کے حوالے سے زندگی کا جائزہ لیتے ہوئے مسئلہ جبر و قدر پر گفتگو فرماتے ہیں۔شروڈنگر نے آخری عمر میں کوانٹم نظریہ کی رائج تشریح یعنی کوپن ہیگن تشریح کی مخالفت بھی کی۔مائیکل بیٹبال نے بوسٹن یونیورسٹی کی طرف سے شائع کردہ "فلسفہ سائنس" کے اندر شروڈنگر کی کوانٹم مخالفت کے حوالے سے اہم مواد اکٹھا کیا ہے۔اسی طرح 2012ء میں جان گربن کی کتاب "اروین شروڈنگر

اور انقلاب کوانٹم" میں اس حوالے سے اپنی تحقیق پیش کی ہے جسے بینٹم پریس نے شائع کیا ہے۔

اریون شروڈنگر کے علاوہ کوانٹم فزکس میں تیسرا بڑا نام لوئی دی بروئی کا ہے جنہوں نے مادی لہروں کی مساوات پیش کرتے ہوئے ثابت کیا کہ مادہ جن ذرات سے ملکر بنا ہے وہ لہروں کی مانند بھی موجود ہو سکتے ہیں۔1930ء میں انکی اہم کتاب "موجی میکانیات کا تعارف" شائع ہوئی۔اگرچہ یہ کتاب فزکس کے طلباء کے لئے تکنیکی انداز میں لکھی گئی لیکن یہ کوانٹم فزکس پر لکھی جانے والی اولین کتابوں میں شامل ہے۔ پرنس لوئی دی بروئی کے تصور موج کی وجہ سے کائناتی حقیقتوں پر اہم سوال پیدا ہوگئے جن میں ایک یہ تھا کہ کیا کائنات میں ہر شے کی حقیقت کو کلی طور پر جانا جا سکتا ہے یا نہیں اور یہ کہ یہ حقیقت اصل میں کیا ہے۔1926ء میں میکس بورن نامی طبیعات دان نے کوانٹم فزکس کے نتائج کی یہ تشریح پیش کی کہ فی الحقیقت اشیاء کے وجود کا پایا جانا ایک امکان کی صورت میں ہوتا ہے نہ کہ مطلق موجود رہتی ہیں۔اس پر آئن سٹائن نے اعتراض کرتے ہوئے میکس بورن کو ایک خط میں لکھا کہ "خدا پانسہ نہیں کھیلتا" جس کا معنی یہ کہ وجود مطلق موجود رہتا ہے نہ کہ امکانی صورت میں۔کیونکہ امکانی صورت میں قانون علیت پر ضرب آتی ہے۔آئن سٹائن اپنے دور کے دیگر فلسفیوں جیسے چارلس پرس اور کارل پوپر کی طرح سائنسی حقیقت پسندی کا قائل تھا۔ جبکہ اس کے مقابلے میں نیلز بوہر، ہائزن برگ وغیرہ اس قدر سخت سائنسی حقیقت پسند نہ تھے۔1927ء میں بوہر اور آئن سٹائن سمیت ایک کانفرنس بلوائی گئی جس میں 29 لوگوں نے شرکت کی جن میں سے 17 لوگ نوبل انعام یافتہ تھے۔ وہاں بوہر اور آئن سٹائن کے درمیان ایک مباحثہ چل نکلا جس کی تفصیل نیل بوہر نے اپنے ایک مضمون " آئن سٹائن سے مذاکرات؛ ایٹمی طبیعات میں مسائل علم" کی شکل میں شائع کی۔ بوہر کا جملہ بہت مشہور ہے کہ وہ آئن سٹائن سے کہتا ہے "خدا کو مت بتائیں کہ اسے کیا کرنا ہے" یعنی کہ امکانی یا واجبی کونسا وجود تخلیق کرنا ہے۔آج دنیا میں نیل بوہر کی پیش کردہ کوانٹم تھیوری ہی کو پذیرائی حاصل ہے اور جدید دنیا میں ہونے والے تکنیکی انقلابات اسی کے مرہون منت ہیں۔کوانٹم طبیعات کے دیگر عظیم نام وولف گینگ پالی اور پال ڈیراک ہیں۔

اسی دور میں 1953ء میں دو امریکی سائنسدانوں یعنی جیمز واٹسن اور فرانسس کرک نے ڈی این اے کی ساخت دریافت کی۔یہ دریافت کس قدر اہم ہے اس کا اندازہ ہر انسان کو ہے کیونکہ یہ وہ بنیادی مالیکیول ہے جو تمام جاندار بشمول نباتات، حیوانات اور انسان کی بنیادی ساخت ہے۔یہی وہ شے ہے کہ جس کے ذریعے آج ہم نظریہ ارتقاء کو زیادہ اچھی طرح سے سمجھتے ہوئے جینٹک انجینئرنگ اور مالیکیولر بیالوجی کے کرشمے دیکھ رہے ہیں۔آج کھربوں روپے کی صنعت میں

ڈی این اے پر تحقیق ہورہی ہے۔اس کے ذریعے انسانوں کی پہچان کا عمل قانون ساز اداروں کی مدد کرتا ہے۔تاریخ دان پرانی بستیوں میں موجود نباتات اور فوسلز کا پتا چلاتے ہیں۔ پیدائش اور نسل کی افزائش میں اسکا مطالعہ اہم کردار ادا کرتا ہے۔ایکس رے اور وائرس کی معلومات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے واٹسن اور کرک نے یہ دریافت کی۔اس حوالے سے جیمز واٹسن کی کتاب "ڈبل ہیلکس" ایک اہم دستاویز ہے جس میں وہ اپنے ذاتی مشاہدات قلمبند کرتے ہیں۔اس کا دیباچہ مشہور سائنسدان لارنس بریگ نے لکھا ہے جو ایکس رے کرسٹلوگرافی کے اولین بانیوں میں شمار ہوتے ہیں۔انکی ایک اور اہم تصنیف "راز حیات" ہے جو کہ کافی تفصیلی کتاب ہے۔1929ء میں سر الیگزنڈر فلیمنگ نے دنیا کی پہلی اینٹی بائیوٹک پینسلین دریافت کی۔

جنگ عظیم دوم کے بعد بنیادی فطری علوم میں دوبارہ ایک تیزی دیکھنے میں آئی۔ایلن ٹیورنگ نے مصنوعی ذہانت کی مشین یعنی جدید کمپیوٹر ایجاد کیا۔آئن سٹائن کے نظریات جو کہ 1915ء میں مکمل ہو گئے تھے اور اسی سال کارل شوارز چلڈ نے نظریہ عمومی اضافیت کا ایک سقم تلاش کر لیا تھا جسے آج ہم بلیک ہول کا نام دیتے ہیں، بیسویں صدی کے دوسرے نصف میں عروج پکڑتے گئے۔بیلجیم کے ایک پادری اور ریاضی دان جارج لامیتر نے 1927ء میں ایک وسعت پذیر کائنات کا نظریہ پیش کیا تھا جسے وہ آئن سٹائن کی مساواتوں میں تلاش کر چکا تھا۔اس نظریے کے مطابق کائنات ایک نقطہ سے باہر کی طرف پھیل رہی ہے۔آج ہم اس نقطے کو بگ بینگ کا نام دیتے ہیں۔آئن سٹائن ایسی پھیلاؤ والی کائنات کا قائل نہ تھا۔لیکن جب 1929ء میں کہکشاؤں کا مطالعہ کرتے ایڈون ہبل نے ثابت کیا کہ پھیلاؤ درست ہے تو آئن سٹائن کو اپنی بات پر پچھتاوا ہوا۔اسی بگ بینگ نظریے نے لندن کے ایک نوجوان کو اپنی گرفت میں لے لیا جو کہ بعد میں دنیا میں ایک اہم نام حاصل کرنے والا تھا۔اور جس کے بعد سائنس کی دنیا میں دلچسپی اور عوامی مقبولیت کا چرچا ہونے والا تھا۔اس نوجوان نے اپنی شدید بیماری کے باوجود اپنی ریاضی کی صلاحیت سے بگ بینگ نظریہ کو ٹھوس بنیادیں فراہم کردیں۔اس نوجوان کو دنیا سٹیفن ہاکنگ کے نام سے جانتی ہے۔

سٹیفن ہاکنگ نے بگ بینگ نظریے کے لئے اپنے استاد سر راجر پنروز کے بلیک ہول والے اہم نظریات کا سہارا لیا اور انہیں کائنات کے پھیلاؤ کے ساتھ منطبق کر کے وقت کی تاریخ نکال لی۔ان کی اہم تصنیف "وقت کی مختصر تاریخ" شاید دنیا میں پڑھی جانے والی کتابوں میں پہلے درجے پر ہو۔اگرچہ بعد میں ہاکنگ نے کئی کتابیں لکھی جیسے "ایک دانے میں کائنات" اور "بلیک ہول اور چھوٹی کائناتیں" اور "عظیم منصوبہ" وغیرہ لیکن مقبولیت میں وقت کی تاریخ والی کتاب

سب سے آگے ہے۔ سٹیفن ہاکنگ چونکہ موٹر نیورون کے مرض کی وجہ سے ویل چیئر سے لگے رہتے تھے اور ہاتھ سے کیلکولیشن نہ کر سکتے تھے لہذا انہوں نے کائنات کے بارے میں تصویروں کی مدد سے سوچنا شروع کیا۔ اور اس طرح وہ زمان ومکاں کی ساخت کے بارے میں بلا خیز فہم کے مالک بن گئے۔ انکی میڈیا میں مسلسل تشہیر کے باعث وہ جدید دنیا میں سائنسی فہم کے نمائندہ بن کر ابھرے۔ حالانکہ اس سے پہلے آئزک ایسی موف، ایچ جی ویلز اور کارل ساگان بھی سائنسی فہم میں کافی کام کر چکے تھے۔

کارل ساگان جو کہ امریکی ادارے ناسا میں ڈائریکٹر فلکیات بھی رہے، وہ ادب اور سائنس کے حوالے سے عوام میں کافی مقبول رہے ہیں۔ ستاروں کی زندگی پر ان کی اہم کتاب " کونیات" بہت مشہور ہے جس کی بنیاد پر ایک ڈاکیومنٹری فلم بھی بنائی گئی اور اسی طرز پر اکیسویں صدی کے ایک مشہور ماہر فلکیات نیل ڈیگرس ٹائی سن نے بھی ایک ڈاکیومنٹری بنائی ہے۔ اسی طرح "زرد نیلا نقطہ" بھی ساگان کی اہم کتاب ہے جو کہ خلا میں موجود اجرام فلکی پر ایک دلچسپ کتاب ہے۔ یہاں زرد نیلا نقطہ ہماری زمین کی وہ تصویر ہے جو ٹیلی سکوپ کی مدد سے لی گئی ہے۔ زمین کے علاوہ دیگر سیاروں پر کوئی خلائی مخلوق اگر موجود ہے تو انسانوں کا اس سے رابطہ کیسے ہوگا اور اس سے کیا نتائج برامد ہوں گے اس بارے میں ساگان کی کتاب "رابطہ" کا مطالعہ بہت دلچسپ ہے۔ اسی طرح آئزک ایسی موف اور ایچ جی ویلز وغیرہ کا سائنسی فہم میں اس قدر کردار ہے کہ ایک الگ مضمون درکار ہے۔

ابھی تک ہم نے جن کتابوں کا ذکر کیا ہے وہ تاریخی اعتبار سے کافی اہم ہیں۔ اور ہم نے کوشش کی ہے کہ سائنس کے ہر شعبہ میں سے منتخب کتابوں کا ذکر کیا جائے۔ اور اپنی اس کاوش میں بہت سی کتابوں اور مصنفین کا ذکر نہیں ہوسکا۔ بیسویں صدی کے آخر سے لے کر آج تک بہت سے اہم مصنف ہیں جنہوں نے جدید موضوعات پر بہت کچھ لکھا ہے اور امریکہ و یورپ سمیت دیگر دنیا میں سائنسی فہم جرنلزم کا ایک باقاعدہ حصہ بن چکا ہے۔ ان میں کچھ اہم کتابوں کا صرف ذکر بہتر ہوگا۔ جیسے نظریہ ارتقا اور اس سے پیدا ہونے والی مذہبی بحثوں میں آکسفورڈ یونیورسٹی کے رچرڈ ڈاکنز کی کتابیں "خدا کا وہم" اور "لالچی جین" وغیرہ اہم ہیں۔ کاسمولوجی یا علم الکونیات کے حوالے سے بہت سے مصنفین ہیں جیسے لارنس کراوز (عدم سے کائنات)، شان کیرول (تصویر عظیم)، لیزا رانڈل (ڈارک میٹر اور ڈائنوسار، آسمانی دروازے پر دستک)، کارلو رویلی (جن کی کتاب "فزکس کے سات سبق" کا ترجمہ میرے محترم دوست فیصل منظور اور زاہد امروز نے اردو میں کیا)، پال ڈیویز (ذہن خدا، آخری تین منٹ)، جم الخلیلی (ان کی اہم کتاب "متلاشیان حق" اسلامی سائنس یا

عربوں پر اہم کتاب ہے)، میشو کا کو (انکی کتاب " مستقبل کی فزکس" اور " ناممکن کی فزکس" قابل قدر ہیں)، برائن گرین (کونیاتی جال، پوشیدہ حقیقت)، سٹیون وائنبرگ (پہلے تین منٹ، ان کو عبدالسلام کے ساتھ نوبل انعام ملا تھا)، لی سمولن (فزکس کا مسئلہ، نومولود وقت)، راجر پنروز (شہنشاہ کا نیا ذہن)، برائن کاکس (کائناتی عجائب، کوانٹم کائنات)، رچرڈ فائن مین (اشیا کے علم کی لذت، انکے فزکس کے لیکچر عوام کے لئے عوامی زبان میں موجود ہیں)، گورڈن فریزر (اکیسویں صدی کی نئی فزکس، ذرات کی صدی، غضب جہاں، یہ کتاب پروفیسر عبدالسلام کی زندگی اور خدمات پر اہم کتاب ہے)، نیل ڈگرس ٹائیسن (بلیک ہول کے نزدیک موت، مرلن کا کائناتی سفر)، نیل ترک (اندرونی کائنات)، آئزک ایسی موف (ان کی بیشتر تحریروں کا ترجمہ مشعل لاہور سے اردو میں شائع ہوا ہے)، مارٹن ریس (صرف چھ اعداد)اور اس کے علاوہ دیگر سائنس دانوں نے کثیر تعداد میں سائنسی فہم پر لکھا ہے۔

بہرحال اس مختصر تحریر میں ہم نے تمام انسانی تاریخ کی اہم کتب کا ایک اجمالی ذکر پیش کیا ہے جس سے سائنس کی اہم دریافتوں اور سائنسی فہم میں مدد ملتی ہے۔ بلاشبہ یہ عہد سائنس کا عہد ہے۔ اور بقول کپ تھورن یہ سائنسی فہم اب یہ کلچر بنتا جا رہا ہے۔ ہمارے بعد آنے والی انسانی نسلیں اگر اپنے اجداد کی تاریخ پر نظر دوڑائیں گی تو یہ کتابیں انہیں ہمارے عہد کو سمجھنے میں اہم کردار ادا کریں گی اور اس دور کی انسانی عقل کی معترف رہیں گی!

میری پسندیدہ کتب

عامر ہاشم خاکوانی

بچوں کے ادب سے شروع کرتا ہوں۔ داستان امیر حمزہ اور طلسم ہوشربا، یہ دونوں بچوں کے لئے ہی لکھی گئی تھیں اور غالباً انہیں فیروزسنز نے شائع کیا تھا۔ان میں سے ایک کو مقبول جہانگیر نے لکھا اور دوسری شائد مظہر کلیم نے لکھی۔ میں آج تک ان دونوں کتابوں کی سیریز کو نہیں بھول سکا۔اگرچہ طلسم ہوشربا اصلی والی بھی پڑھی،مگراس میں وہ مزا نہیں ہے۔میرا خیال ہے کہ کوئی صاحب ہمت کر کے طلسم ہوشربا کو دوبارہ لکھ ڈالیں یا اس کی کم ازکم تسہیل ہی کرڈالتے، مجھے زیادہ کوفت اس وقت ہوتی ہے، جب اس میں عمروعیار کے بجائے ان کے بیٹوں اور شاگردوں کے کردار زیادہ نمایاں لگتے ہیں، حالانکہ جو ہم نے پڑھی اس میں عمروعیار ہی اصل عیار تھے۔آکسفورڈ یونیورسٹی پریس نے اس کو اچھے طریقے اور مہنگے نرخوں پر دوبارہ چھاپا ہے،مگر اسلوب وہی پرانا ہے، جو نئے قارئین کو کھٹکتا ہے۔

اشتیاق احمد کی انسپکٹر جمشید سیریز، انسپکٹر کامران سیریز، ابن صفی اور مظہر کلیم کی عمران سیریز کو میں سکول لیول کے جاسوسی مطالعے تک ہی محدود سمجھتا ہوں،نسیم حجازی کے ناول بھی میٹرک تک ہی پڑھے جاسکتے ہیں، ابن صفی کے پرستار ناراض ہوجاتے ہیں،مگران کی تحریریں بھی عمر کے اوائل حصے ہی میں پڑھی جاسکتی ہے۔ پڑھنے کا چسکا لگ جاتا ہے ان سے۔تاریخ کی کتابیں، خاص کر تاریخ طبری، ابن خلدون، ابن کثیر وغیرہ پڑھنے کا چسکا مجھے کالج کے ابتدائی دو برسوں میں پڑا۔ انہی دو برسوں میں دیوبندی، بریلوی روایتی بحث مباحثوں نوربشر، حاضر ناظر کے لئے بھی کچھ وقت صرف کرنا پڑا، خلافت وملوکیت بھی اسی عرصے میں پڑھ لی تو اس حوالے سے جو تنازعات، مباحث کھڑے ہوئے، وہ بھی اسی عرصے میں نمٹائے۔ یادرہنے والی کتابیں ان دوتین برسوں میں مستنصر حسین تارڑ کے سفرنامے، خاص کر نکلے تیری تلاش میں، خانہ بدوش اور ناولوں میں پیار کا پہلا شہر شامل ہے،جپسی اپنے تلذز کی وجہ سے تھوڑا سا یاد ہے۔البتہ تارڑ صاحب کے دوسرے اہم ناول بہاؤ، قربت مرگ میں محبت، ڈاکیہ اور جولاہا، خس وخاشاک زمانے وغیرہ بعد میں پڑھے۔

ہاں سفرناموں میں تارڑ کا ایک بہت اہم سفرنامہ اندلس میں اجنبی کو کون بھول سکتا ہے، میں تو اس
ہائی ریٹ کرتا ہوں۔ پاکستان کے حوالے سے ان کے درجن بھر سفرنامے پڑھے، یاد ایک بھی نہیں،
ایک کا تاثر دوسرے میں گڈ مڈ جاتا ہے۔ تارڑ صاحب نے شمالی علاقوں کے سفرناموں میں خود کو
بہت دہرایا ہے۔

اسی زمانے کی دوسری یاد رہنے والی کتابوں میں مولانا آزاد کی غبار خاطر نے دل موہ
لیا، اسے بعد میں بھی کئی بار پڑھا، مولانا ہی کی تذکرہ اور قول فیصل بھی پسند آئیں، انڈیا ونز فریڈم
بعد میں پڑھی، مگر اس نے زیادہ متاثر نہیں کیا، مولانا نے مصلحت سے کام لیا اس میں اور کھل کر
باتیں نہیں لکھیں، مجھے تو حیرت ہوتی ہے کہ اس کے تیس صفحات میں کون سی ایسی بات تھی، جسے تیس
سال کے لئے محفوظ رکھا گیا۔ ایک اور مولانا آزاد یعنی محمد حسین آزاد کی آب حیات میں نے تین چار
بار پڑھی، مرزا فرحت اللہ بیگ کی دلی کا آخری معاشرہ ان کی ٹکسالی اردو نثر کا مزا لینے کے لئے
پڑھی۔ کالج کے تین چار برسوں مین یعنی بی ایس سی تک ہی کالج کی لائبریری اور شہر کی میونسپل
لائبریری سے بہت سی اور کتابیں پڑھیں، کچھ کو کبھی نہ بھول سکا۔ مختار مسعود کی آواز دوست ان میں
سرفہرست ہے، ان کی بعد میں لکھی سفر نصیب زیادہ پسند نہیں آئی، لوح ایام البتہ خوب ہے۔ مشتاق
یوسفی کی پہلی تینوں کتابیں انھی برسوں میں پڑھیں، چراغ تلے، خاکم بدہن اور زرگزشت، آب گم
برسوں بعد میں پڑھی۔ یوسفی صاحب کے سحر کے بارے مین کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ البتہ میں
مزاح نگاری مین ابن انشا کا بھی بڑا قائل ہوں۔ ویسے تو شفیق الرحمٰن کا اپنا مزا ہے، خاص کر
حماقتیں، مزید حماقتیں وغیرہ کا۔ محمد خالد اختر کو البتہ ہمارے ہاں انڈراسٹیمیٹ کیا گیا۔ مجھے فرسٹ
ائیر میں ان کی کتاب چاکی واڑہ میں وصال پڑھنے کا موقعہ ملا، بہت پسند آئی، دس بارہ سال بعد پھر
پڑھی، محمد خالد اختر کی اور کتابیں بھی اچھی لگیں، چچا عبدالباقی کی کہانیاں وغیرہ۔ میں خالد اختر کا بڑا
قائل ہوں، ان کی کتابوں پر تبصروں کی کتاب دو تین برس پہلے پڑھی، مزا آ گیا۔ آکسفورڈ نے ان کا
تمام کام اکٹھا کر چھاپا ہے۔ ضرور پڑھنا چاہیے۔ فیض احمد فیض چاکیواڑہ میں وصال کے بڑے
قائل تھے۔ انہی دنوں اخلاق احمد دہلوی کے خاکون کی کتاب پھر وہی انداز بیاں پڑھی، کمال کی
زبان تھی ان کی، یہ کتاب بعد میں بڑی ڈھونڈی، مگر نہ مل سکی۔ شاہد احمد دہلوی کی اجڑا دیار بھی کمال
ہے۔ جوش کی یادوں کی برات نے ان دنوں مسحور کر دیا تھا۔ کئی برس تک یہ طریقہ رہا کہ جب
خیالات بنجر محسوس ہوتے، یادوں کی برات دوبارہ پڑھتا، سرشاری کی کفیت طاری ہو جاتی، اب
چند ماہ پہلے پھر پڑھی تو خوفناک قسم کی مایوسی ہوء۔ حیرت ہوئی ایسی پوچ اور بچکانہ قسم کی کتاب اتنی
پسند تھی۔ معلوم نہیں اب بدذوق ہو گیا یا اب سمجھ آ گئی ہے۔ کالج کے انہی برسوں؟ مین شاعری

خاصی پڑھ لی، فیض سے ناصر، منیر، قاسمی، فراز، شکیب جلالی وغیرہ۔ مجید امجد البتہ اس وقت بور لگے، ان کی شاعری بعد میں اچھی لگی، البتہ ن م راشد نے مسحور کر دیا تھا۔

لاہور آنے کے بعد کچھ فکری کتابیں بھی پڑھنے کا موقعہ ملا۔ مولانا ابوالحسن ندوی کی کتابیں؟ والد صاحب کی لائبریری میں تھیں وہ پڑھ چکا تھا، سید مودودی کی کئی کتابیں بھی انہی دنوں پڑھیں۔ لاہور میں البتہ مولانا فراہی اور مولانا اصلاحی کو پڑھنے کا موقعہ ملا، جعفر شاہ پھلواروی کی دو تین کتابیں پڑھیں، کئی نئے زاویے سامنے آئے۔ شاہ ولی اللہ کی حجتہ البالغہ انہی برسوں میں پڑھی، امام غزالی کی چند کتابیں بھی پڑھین، مولانا وحیدالدین خان سے بھی انہی دنوں واقفیت ہوئی، غامدی صاحب کو پڑھا اور براہ راست سننے کا بھی موقعہ ملا۔ ڈاکٹر اسرار نے مجھے کبھی متاثر نہیں کیا۔ میں مولانا ندوی سیمتا ثر رہا، تاریخ دعوت وعزیمت، اسلامی دنیا میں مغرب اور اسلامیت کی کشمکش، قادیانیت ایک مطالعہ وغیرہ۔ ہاں کربلا کے حوالے سے بھی کچھ لٹریچر لاہور آنے سے پہلے پڑھا، ان میں مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی کی دو کتابیں مختلف لگیں۔ تفصیل سے میں اعراض کرنا پسند کروں گا۔ ایک دوست نے مولانا حبیب الرحمٰن کاندھلوی کی کتابیں پڑھنے کو دیں، امید کرتا ہوں کہ نام درست لکھا گیا ہے، دینی روایات کے نام سے چار جلدوں پر مشتمل کتاب تھی، ایک بار تو ہلا کر رکھ دیا اس نے۔ ہاں بریلویت دیوبندی کشمکش کے دنوں میں مولانا ارشد القادری کی ایک کتاب زلزلہ پڑھی، جس مین مولانا عامر عثمانی مدیر تجلی دیوبند کے بہت سے حوالے تھے، بعد میں پتہ چلا کہ اس کا جواب بھی لکھا گیا۔ خیر اللہ نے کرم کیا اور ان سطحی بحثوں سے اوپر اٹھنے میں کامیاب ہو گئے۔ علامہ شبلی نعمانی نے بھی انھی دنوں متاثر کیا، ان کا تقریبا سب کام، خاص کر الفاروق، المامون وغیرہ۔ برسوں بعد ان کے مقالات کی چھ سات کتابیں پڑھیں وہ سب پسند آئیں۔

لاہور آنے کے بعد اردو ڈائجسٹ لائبریری سے خاصا استفادہ کیا یا پھر قائداعظم لائبریری چلے جاتے، وہاں گھنٹوں پڑھتے رہتے۔ سید سبط حسن، عبداللہ ملک وغیرہ کو انہی دنوں پڑھا۔ اردو ڈائجسٹ مین ماہر القادری کے کتابوں پر شاندار تبصرے پڑھے، وہ دلچسپ تھے۔ انہی دنوں احمد بسیر کے منفرد خاکوں کا مجموعہ جو ملے تھے راہ میں پڑھا، بہت پسند آیا۔ ممتاز مفتی کی علی پور کا ایلی اور پھر کئی برس بعد الکھ نگری بھی لاہور ہی میں پڑھی، مجھے مفتی کے افسانوں نے زیادہ متاثر نہیں کیا، البتہ ان کے خاکے دلچسپ ہیں۔ یہیں پر منٹو، کرشن چندر، بیدی، عصمت، غلام عباس، اشفاق احمد اور بانو قدسیہ کو پڑھا۔ ان میں منٹو ہی یاد رہا۔ بیدی میری ناچیز رائے میں اوور ریٹیڈ رائٹر ہے، کرشن چندر کو ترقی پسند ادب لے ڈوبا، مگر اس کے دامن میں چند ایک عمدہ افسانے موجود ہیں، عصمت نے ہمیں تو کبھی متاثر نہیں کیا۔ واجدہ تبسم میں تلذذ ہی ہے، جیلانی بانو کے البتہ بعض

افسانے اچھے ہیں، ہاجرہ مسرور کے افسانون ؟ کی کلیات میں نے کراچی میں پڑھی، ایک بھی یاد نہیں، نہ ہی خدیجہ مستور کا لکھا کچھ یاد ہے، آنگن سمیت۔ جمیلہ ہاشمی البتہ اپنی تروتازگی کے ساتھ یاد ہیں۔ تلاش بہاراں ؟ مجھے زیادہ اچھا نہیں لگا، دشت سوس کمال کا ناول ہے، قرۃ العین طاہرہ پر بھی جمیلہ ہاشمی نے ایک حیران کن ناولٹ لکھا، جو آؤٹ آف پرنٹ ہے۔ بانو آپا کا سب سے بہتر کام راجہ گدھ ہی ہے۔ عبداللہ حسین کا سب کام لاہور کے ابتدائی برسوں میں پڑھا۔ اداس نسلیں، نشیب، باگھ وغیرہ اور آخری ناول نادار لوگ۔ یار رہنے والا ان کا اداس نسلیں ہی ہے، نادار لوگ بھی اچھا ہے۔ حال ہی میں یعنی پچھلے دو تین برسوں میں دو تین اچھے ناول پڑھے، شمس الرحمٰن فاروقی کا کئی چاند تھے سر آسمان غیر معمولی ناول ہے، مرزا اطہر بیگ کا ناول غلام باغ، سائبر سپیس کا منشی بھی اچھا لگا۔

عالمی ادب سے زیادہ واسطہ تراجم کے ذریعے پڑا۔ ٹالسٹائی کے وار اینڈ ؟ پیس اور دوستوفسکی کے برادرز کرامازوف کے تراجم کے لئے اردو کے قارئین کو شاہد حمید صاحب کا شکر گزار ہونا چاہیے۔ انہوں ن حیران کن کام کیا ہے۔ جرم وسزا کا بھی ترجمہ ہی پڑھا تھا۔ یہ تینوں بہت بڑے ناول ہیں۔ ان کے ساتھ محمد حسن عسکری کا ترجمہ شدہ موبی ڈک مجھے بہت اچھا لگا۔ چیخوف اور موپساں کے افسانے، اوہنری کی کہانیاں، گوئٹے کا فاوسٹس، کافکا کا دی ٹرائیل، کیسل اور دیگر کام۔ سارتر اور کامیو کی وجودیت کا پس منظر لئیناول اور کہانیاں۔ اینا کرینینا بھی ٹالسٹائی کا ایک شاندار ناول ہے۔ بعد میں تراجم ہی کے ذریعے میں تو گارشیا مارکیز سے متعارف ہوا اور مسحور ہوکر رہ گیا۔ تنہائی کے سو برس، وبا کے دنوں میں محبت، کرنل کو کوئی خط نہیں لکھتا، ایک پیش گفتہ موت کی روداد۔ مارکیز کو جتنا پڑھا، لطف اور حیرت بڑھی۔ پائلو کوہیلو کا الکیمسٹ کمال کا ناول ہے، مگر دوسرے ناولوں میں وہ متاثر نہیں کر پایا۔ اوحان پاموک کو حال ہی میں پڑھا، اس نے مجھے اپنی گرفت میں لے لیا۔ سفید قلعہ اور حال ہی میں پڑھا جانے والا مائی نیم از ریڈ۔ پاموک بہت مختلف رائٹر ہے، اسے ضرور پڑھنا چاہیے۔ حوزے سارا گوما کا ناول اندھے لوگ قیامت خیز قسم کی تحریر ہے۔ اسے پڑھنے کے بعد آپ مختلف انداز سے زندگی اور دنیا کو دیکھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ میلان کنڈیرا بھی حیران کر دینے والا ادیب ہے۔ عرب ادیبوں میں سے نجیب محفوظ متاثر کن ہے۔ اروندھتی رائے کا ناول گاڈ آف سمال تھنگز اردو مین مشکل لگا، انگریزی میں اچھا لگا۔ اروند اڈیگا کا بکر پرائز یافتہ ناول بھی اچھا لگا۔ وکرم سیٹھ نے مجھے البتہ زیادہ متاثر نہیں کیا۔

علما کی تحریروں مین مجھے مولانا مناظر احسن گیلانی نے متاثر کیا۔ کمال کی تحریر ہے ان کی۔ وحیدالدین خان میں کئی تضادات ہیں، مگر ان کا اعراض کا نظریہ خوب ہے۔ غامدی صاحب

کی کئی چیزوں سے اختلاف ہے، مگر بہرحال وہ چونکاتے ہیں، مجھے یہ البتہ اب لگنے لگا کہ وہ بعض معاملات میں دانستہ چونکانے کی طرف چلے جاتے ہیں۔ علامہ یوسف قرضاوی کی پچھلے سال دو کتابیں پڑھیں دونوں پسند آئیں۔ خاص کر دین میں ترجیحات کا معاملہ۔ سید فتح علی گولن کی کئی کتابیں پڑھی ہیں، اچھا لکھتے ہیں، اخوانی ادیبوں مین سید قطب مشکل پسند مگر چونکا دینے والے سکالر ہیں، مجھے محمد الغزالی نے بھی متاثر کیا ہے۔ مولانا تقی عثمانی صاحب کی تحریریں ابھی تک نہیں پڑھ سکا، چاہ رہا ہوں کہ انہیں پڑھا جائے۔ مولانا زاہد الراشدی کا توازن اور اعتدال اچھا لگا، نوجوان لکھنے والوں میں عمار ناصر قابل ذکر ہیں، مگر مجھے خدشہ ہے کہ وہ بہت تیزی سے متنازع ہورہے ہیں، جو اچھی علامت نہیں۔ پچھلے سال بک ایکسپو سے ڈاکٹر محمود احمد غازی کے محاضرات سیرت، قران، فقہ اور غالباً حدیث پڑھے۔ ڈاکٹر صاحب نے متاثر کیا ہے۔ ایک ناول جو دینی حوالے سے لکھا گیا، ابو یحییٰ کا جب زندگی شروع ہوگی۔ اس نے مجھے ہلا کر رکھ دیا اور میرے سوچنے کا انداز ہی بدل گیا۔ میرے اوپر اس ناول اور اس کے ادیب کا بڑا احسان ہے۔

محمد کاظم سے عربی ادب کے حوالے سے تعارف ہوا۔ ان کی لکھی عربی ادب کی تاریخ ایک شاندار کتاب ہے۔ عربی ادب میں مطالعے، اخوان الصفہ اور دیگر مضامین اور ایک اور اہم کتاب مسلم فلسفہ عہد بہ عہد قابل ذکر ہیں۔ مغربی فلسفے کی تاریخ کے حوالے سے برٹرینڈ رسل اور ول ڈیوراں کو کون بھول سکتا ہے۔ ویسے تو ناروے کے ایک فلسفے کے ٹیچر نے صوفی کی دنیا کے نام سے جو ناول لکھ دیا، اس میں پورے مغربی فلسفے کو سمودیا گیا ہے۔ شاہد حمید نے اس کا بھی کمال ترجمہ کیا۔ عربی ادب کے حوالے سے ڈاکٹر خورشید رضوی کی کتاب بھی اہم ہے۔ مگر بلوغ العرب پڑھے بغیر عرب کلچر اور عرب زندگی سمجھ ہی نہیں آتی۔ چار جلدوں پر محیط یہ شاندار کتاب مجھے اردو سائنس بورڈ سے ملی، اسی طرح مقتدرہ قومی زبان کی شائع کردہ چار جلدوں پر گبن کی مشہور زمانہ کتاب انحطاط وزوال سلطنت روما اور بابائے تاریخ کا تواریخ اور جدید عہد میں ٹائن بی کی لکھی سٹڈی آف ہسٹری پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔

نثر میں میری پسندیدہ کتابیں

وجاہت مسعود

کچھ نوجوان دوستوں نے استفسار کیا ہے کہ اردو غیر افسانوی نثر کی کون سی کتابیں پڑھنا مفید ہوگا تا کہ ان کی اپنی تحریر میں سلاست اور روانی پیدا ہو سکے۔ نیز وہ اردو نثر کے مختلف اسالیب سے آشنا ہوسکیں۔ مجھے ان کی اس درخواست سے بہت خوشی ہوئی ہے۔حقیقت یہی ہے کہ وسیع مطالعے کے بغیر ہمارے نوجوان اردو زبان پر کما حقہ عبور حاصل نہیں کر سکیں گے۔ اور اگر ان کی تحریر کی زبان غیر مؤثر ہوگی تو ان کے دلائل بھی اپنا وزن کھو بیٹھیں گے۔حقیقت تو یہ ہے اس موضوع پر لاہور میں محمد سلیم الرحمٰن صاحب، عارف وقار صاحب، محمد خالد صاحب، مسعود اشعر صاحب اور خواجہ محمد زکریا صاحب، ادھر کراچی میں غازی صلاح الدین صاحب، رضا علی عابدی صاحب، آصف اسلم فرخی صاحب اور افضال احمد سید صاحب سے رہنمائی لینی چاہیے۔ ملتان میں ڈاکٹر انوار احمد، ڈاکٹر قاضی عابد اور پروفیسر خالد سعید سے فیض اٹھایا جا سکتا ہے۔ڈاکٹر ناصر عباس نیر، ڈاکٹر روش ندیم اور ڈاکٹر ضیاالحسن نہایت گہری بصیرت رکھتے ہیں اور طالب علموں کی پرخلوص رہنمائی فرماتے ہیں۔ جن اصحاب کی رسائی ان اساتذہ تک نہ ہو سکے، انہیں اپنے شہر کے کسی بھی صاحب مطالعہ استاد سے رجوع کرنا چاہیے۔

کوشش کیجئے کہ اس استاد سے رابطہ کریں جس کا مطالعہ تازہ ہو۔ ایسے اساتذہ جنہوں نے گزشتہ تیس برس سے کسی نئی کتاب کو ہاتھ نہ لگایا ہو، انہیں نہایت احترام سے ملئے لیکن یاد رکھئے کہ ادب کی فہم ان پر نہیں اترتی جو مطالعے سے بے نیاز ہونے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ یہ غلط فہمی بھی دور کرلیں کہ اردو ادب کے بارے میں صرف اسی استاد کی رائے مستند ہوگی جس نے اردو ادب میں ایم اے کر رکھا ہوگا۔ اردو کے خزانے زیادہ امکان ہے کہ آپ کو انگریزی یا سائنس کے اساتذہ میں مل سکیں۔ اسی طرح افسانوی نثر کے شناور بالکل مختلف ہوں گے۔ شعر کی دنیا البتہ الگ ہے اور یہاں اس سے بحث نہیں ہو رہی۔ فہرست سازی کتب کی ہو یا اساتذہ کی، اس میں سہو اور غلطی کا امکان ہمیشہ رہتا ہے۔ یہ خاکسار ایک مبتدی ہے اور اس کی رائے محض ایک ابتدائی نصابی خاکے کی حیثیت رکھتی ہے۔ میں تو اس امید پر کچھ نام تجویز کرنے کی جسارت کر رہا ہوں کہ ہمارے نوجوان

اردو ادب کے ان جواہر پاروں سے آشنا ہوں گے تو ان کا ذوق جاگے گا اور پھر وہ اپنی ذاتی جستجو کی مدد سے نئے نئے موتی اور گوہر نکال لائیں گے۔

(غالب) خطوط غالب،

(محمد حسین آزاد) آب حیات

(فرحت اللہ بیگ) مضامین فرحت اللہ بیگ،

(رشید احمد صدیقی) ذاکر صاحب

(نیاز فتح پوری) من و یزداں،

(خلیفہ عبدالحکیم) فکر اقبال

(داؤد رہبر) نسخہ ہائے وفا،

(ڈاکٹر آفتاب احمد) بنام صحبت نازک خیالاں

(سید سجاد ظہیر) روشنائی،

(علی عباس جلالپوری) عام فکری مغالطے

(سید سبط حسن) نوید فکر،

(عبدالمجید سالک) یاران کہن

(چراغ حسن حسرت) حرف وحکایت،

(فیض احمد فیض) صلیبیں مرے دریچے میں

(انتظار حسین) چراغوں کا دھواں،

(ابوالکلام آزاد) غبار خاطر

(رستم کیانی) افکار پریشاں،

(ڈاکٹر مبشر حسن) رزم زندگی

(اخلاق احمد دہلوی) یادوں کا سفر

،(سراج منیر) مقالات سراج منیر

(آغا بابر) خدوخال،

(انتظار حسین) قطرے میں دریا

(ناصر کاظمی) خشک چشمے کے کنارے،

(شیخ صلاح الدین) ناصر کاظمی، ایک دھیان

(احمد بشیر) جو ملے تھے راستے میں،
(سعادت حسن منٹو) گنجے فرشتے
(صفدر میر) مضامین،
(عاشق حسین بٹالوی) یادیں اور تاثرات
(الطاف گوہر) لکھتے رہے حکایات خونچکاں
(پطرس بخاری) پطرس کے مضامین
(ڈاکٹر فاخر حسین) راہ ساز
(مشتاق احمد یوسفی) آب گم
(محمد خالد اختر) مکاتیب خضر،
(ابن انشا) دنیا گول ہے
(قدرت اللہ شہاب) شہاب نامہ
(سید امجد حسین) اپنا گریباں
(کرنل محمد خاں) بجنگ آمد
(مجتبیٰ حسین) نیم رخ
(حمید احمد خان) مرقع غالب
(حکیم احمد شجاع) لاہور کا چیلسیا
(مختار مسعود) سفر نصیب
(شیخ منظور الٰہی) سلسلۂ روز و شب
(احسان دانش) جہان دانش
(میراجی) مشرق و مغرب کے نغمے
(حسن عسکری) مجموعہ
(مظفر علی سید) یادوں کی سرگم
(فراق گورکھپوری) اندازے،
(ملا واحدی) دلی جو ایک شہر تھا
(جوش ملیح آبادی) یادوں کی بارات
(سید ابو اعلیٰ مودودی) خلافت اور ملوکیت
(اقبال شیدائی) انقلابی کی سرگزشت

(محمد اکرم) قید یاغستان

(مولوی عبدالحق) چند ہم عصر

(مشفق خواجہ) خامہ بگوش کے قلم سے

(جعفر تھانیسری) کالا پانی

(مولوی محمد سعید) آہنگ باز گشت

(چراغ حسن حسرت) حرف وحکایت

(ممتاز شیریں) معیار

(اخلاق احمد دہلوی) یادوں کا سفر

(شاہد احمد دہلوی) بزم شاہد

(آغا افتخار حسین) قوموں کے عروج وزوال کے اسباب

(حمیدہ رائے پوری) ہم سفر

(اختر حسین رائے پوری) گرد سفر

(مبین مرزا، مرتب) اردو کے بہترین خاکے

(عطاالحق قاسمی) بارہ سنگھے

(نیئر مسعود) انیس (سوانح)

(ذوالفقار بخاری) سرگزشت

(شفیق الرحمٰن) دجلہ

(جمال پانی پتی) اختلاف کے پہلو

(حسن نظامی) آپ بیتی

(محمد کاظم) کل کی بات

(ظہیر دہلوی) داستان غدر

(دیوان سنگھ مفتون) ناقابل فراموش

(حمید نسیم) ناممکن کی جستجو

(اشرف صبوحی) بزم صبوحی

’میرا مطالعہ‘: علمی سفر نامے

تعارف وانتخاب: شاہد اعوان

’’میرا مطالعہ‘‘ کے نام سے معروف اہلِ علم کی مطالعاتی زندگی پہ ایک کتاب عرفان احمد نے مرتب کی ہے جو ایمل مطبوعات اسلام آباد سے شائع ہوئی۔ اس کتاب کی خوبی یہ ہے کہ اس میں معروف اہلِ قلم سے اُن کے مطالعاتی سفر پہ گفتگو کو جمع کیا گیا ہے۔ اس کتاب کی تدوین عبدالروف نے کی‘‘ (ادارہ)

آج، ٹیکنالوجی کے دور میں کتاب پر بات کرنا بجائے خود ایک نیکی ہے اور پھر یہ گفتگو کرنے والے علم وادب کی دنیا کے روشن نام ہوں تو گویا نورٌعلیٰ نور کا مضمون ہو جاتا ہے۔

مطبوعہ کتاب کے مستقبل کے بارے میں ماضی قریب میں پیدا ہونے والی تشویش تو خیر وقت نے غلط ثابت کر دی۔ برقی کتاب ebook کسی طور پر کاغذ کے نامیاتی احساس کا متبادل نہیں بن پائی۔ Hard Book بہت سخت جان ثابت ہوئی۔ مطالعہ کا عمل باصرہ اور لامسہ کے رومانی امتزاج کے بغیر علم کو شخصیت کا جزو نہیں بننے دیتا۔

’’میرا مطالعہ‘‘ میں شامل یہ تحریریں کتاب شناسی اور کتب بینی کے ذوق کی آبیاری کے علاوہ ہمارے علمی سرمایہ کی بازیافت کا کام بھی کریں گی اور وقت کی کمی کے شکار قاری کو قابل مطالعہ کتب کا انتخاب کرنے میں مدد فراہم کریں گی۔ یہ مقالات دراصل ان ادیبوں اور دانشوروں کے فکری وعلمی سفر نامے ہیں جن کے ذریعہ قاری چند صفحات میں کئی دھائیوں کے سفر کی روداد پڑھ سکتا ہے۔ کچھ تحریریں پڑھتے ہوئے گویا اردو کی روایتی داستان گوئی کا تجربہ ہونے لگتا ہے۔ لکھنے والا اپنی داستان سنا رہا ہے اور سامع وارفتگی اور تجسس کے عالم میں ساتھ بہتا جا رہا ہے۔ ہر کتابی موڑ اور ہر علمی پڑاؤ داستان کے رنگ میں اضافہ کر رہا ہے۔

’’میرا مطالعہ‘‘ سے ایک انتخاب یہاں پیش کیا جا رہا ہے جو زاہدہ حنا، ڈاکٹر اسلم فرخی، احمد جاوید، ڈاکٹر مبارک علی اور آصف فرخی کے علمی مطالعات پہ مشتمل ہے:

کتابوں کی دنیا میں قیام

زاہدہ حنا

میں ہندوستان کے صوبے بہار کے شہر سہسرام میں پیدا ہوئی۔ ہوش کراچی میں سنبھالا۔ پہلی کہانی 9 برس کی عمر میں لکھی۔ پہلی تحریر 13 برس کی عمر میں شائع ہوئی۔ 16 برس کی عمر سے میرے مضامین اور افسانے ملک کے اہم رسائل اور جرائد میں شائع ہونے لگے تھے۔ میری کہانیوں کے دو مجموعے ''قیدی سانس لیتا ہے'' اور ''راہ میں اجل ہے'' کے کئی ایڈیشن پاکستان اور ہندوستان میں شائع ہو چکے ہیں۔ افسانوں کا ایک انتخاب ''تتلیاں ڈھونڈنے والی'' لاہور سے چھپا ہے۔ تازہ افسانوں کا مجموعہ ''رقص بسمل ہے'' شائع ہونے والا ہے۔ ایک ناولٹ 'نہ جنوں رہا نہ پری رہی' اردو اور ہندی میں شائع ہو چکا ہے' اس کا انگریزی ترجمہ نیلم حسین نے کیا ہے جو اس سے پہلے خدیجہ مستور کے ناول ''آنگن'' کا ترجمہ کر چکی ہیں۔ اس ناول کا سندھی ترجمہ بھی شائع ہونے والا ہے۔ مضامین پر مشتمل ''ضمیر کی آواز'' اور کئی دوسری کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔ ''عورت زندگی کا زنداں'' مضامین کا مجموعہ ہے۔ جس کے دو پاکستانی اور ایک ہندوستانی ایڈیشن شائع ہو چکا ہے۔ اس کا ہندی ترجمہ بھی چھپ گیا ہے اور افسانوں کا مجموعہ بھی ہندی بھی شائع ہوا ہے اور 31 جنوری 2010ء کو دلی میں ہونے والے انٹرنیشنل بک فیئر میں اس کی تقریب اجرا ہوئی ہے۔ ''پاکستانی عورت: آزمائش کی نصف صدی'' کا ترجمہ ڈاکٹر طاہرہ پروین نے ہندی میں کیا ہے اور ہندوستان میں شائع ہونے والا ہے۔ امن اور جنگی جنون کے حوالے سے میرے مضامین کا ایک مجموعہ ترتیب کے آخری مرحلوں میں ہے۔ کہانیوں کے ترجمے انگریزی' جرمن' ہندی' سندھی' پنجابی اور بنگالی میں شائع ہو چکے ہیں۔ میرے لیے یہ اعزاز کی بات ہے کہ میرے افسانوں کا ترجمہ فیض احمد فیض' پروفیسر فائفر' جے رتن' سی ایم نعیم' پروفیسر محمد عمر میمن' جاوید آنند' ثمینہ رحمان' رشمی گووند اور کئی دوسروں نے کیا ہے۔ گزشتہ 22 برس سے میرے کالم اور مضامین پاکستان کے اہم ترین اخبارات اور مستند جرائد میں شائع ہو رہے ہیں جن کی تعداد تین ہزار سے زیادہ ہو چکی ہے۔ پہلے میں ''جنگ'' میں لکھتی تھی۔ اب ہفتے میں دو کالم روزنامہ ''ایکسپریس'' میں شائع ہوتے ہیں۔ میرے ہفتہ وار کالم پاکستان میں ہی نہیں ہندوستان کے مقبول ہندی اخبار ''دینیک بھاسکر'' اور سعودی

عرب میں چھپنے والے اردو کے سب سے بڑے اخبار ''اردو نیوز'' میں شائع ہوتے ہیں۔ میں پاکستان کی واحد اردو کالم نگار ہوں جس کے کالم ترجمہ ہوکر ہر ہفتے سندھی کے مشہور اخبار ''عبرت'' میں شائع ہوتے ہیں۔ میں نے بہت سے مضامین اور کئی کتابوں کے ترجمے کیے کئی کتابوں کی تلخیص کی۔ ان میں ویت نام جنگ پر Richard Hammer کی کتاب One Morning in Warایلون ٹوفلر کی The Third Wave کے ابتدائی ابواب کا ترجمہ' ڈیفنی ڈیماریر کے ناول French Man,s Creekاور اگاتھا کرسٹی کے ناول Murder of Roger Ackroyed کی تلخیص شامل ہے۔ کرسٹی کے اس ناول کا شمار کلاسیکس میں ہوتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ یہ ناول اس کے فن کا نقطہ ? عروج ہے۔ اس کے علاوہ میں نے کنیزے مراد کے نیم سوانحی ناول Memoirs Of An Ottoman Princess کا ترجمہ اور تلخیص کی جو دنیا رجبیں کے میرے قلمی نام سے چھپی۔ ''امراؤ جان ادا'' کے فلم ساز مظفر علی کی بہن کنیزے مراد نے یہ ناول فرانسیسی میں لکھا اور اسے فرانس کا ایک بڑا ادبی انعام ملا۔ Deborah Mann کے ناول The Song of Salomeاور لیلیٰ خالد کی ڈائری کا ترجمہ کیا۔ یہ کتابیں قسط وار شائع ہوئیں لیکن کبھی یہ توفیق نہیں ہوئی کہ انہیں کتابی شکل میں چھپوا لیا جائے۔ ڈاکٹر گلین پیج کی کتاب Nonkilling Global Political Science کا ترجمہ ''ہلاکت گریز عالمی سیاسیات'' کے نام سے شائع ہوا۔ فاطمہ مرنسی کی کتاب Scherzade Goes West کا ترجمہ عن قریب شائع ہونے والا ہے۔ اس کے علاوہ کئی کتابیں مختلف رسائل کے لیے ترجمہ کیں جو ان میں قسط وار شائع ہوئیں۔ سندھ یونی ورسٹی سے، میرے کام پر 1997ء میں کنول رعنا نے مطالعہ لکھا۔ 2007ء میں دہلی یونی ورسٹی کے شعبہ ? اردو کی مسرت آراء نے ''زاہدہ حنا کی افسانہ نگاری: تانیثی ادب کے حوالے سے'' تحریر کیا جس پر انھیں ایم فل کی ڈگری ملی۔ 2009ء میں کراچی یونی ورسٹی کے ماس کمیونیکیشن ڈیپارٹمنٹ سے مجھ پر تھیسس صائمہ حیات نے کیا اور اس کا عنوان ''زاہدہ حنا کی کالم نگاری'' ہے۔ شعبہ ? اردو کی طالبہ مہوش ناز کے تھیسس کا عنوان ''زاہدہ حنا کے افسانوں کا فنی تجزیہ'' ہے۔ کئی ملکی اور غیر ملکی ایوارڈ دے کر میری عزت افزائی کی گئی ہے۔ ان میں سارک ادبی ایوارڈ 2001ء بھی شامل ہے جسے صدر جمہوریہ ہند نے عطا کیا تھا۔ میں تین سال تک ایمنسٹی انٹرنیشنل پاکستان کی نیشنل کوآرڈی نیٹر فار ویمن رائٹس رہ چکی ہوں۔ ٹی وی پر طویل دورانیے کے کئی ڈرامے اور سیریل بھی نشر ہوکر مقبول ہوئے ہیں۔ بی بی سی اردو سروس اور وائس آف امریکا سے وابستہ رہ چکی ہوں۔ 2006ء میں مجھے پرائیڈ آف پرفارمنس' پریذیڈنٹ ایوارڈ دینے کا اعلان کیا گیا تھا جسے میں نے لینے سے انکار کردیا، کیونکہ میں اس ملٹری ڈکٹیٹر سے کوئی

اعزاز نہیں لے سکتی تھی جس کے خلاف 1999ء سے لکھ رہی تھی۔

میں نے اردو کی کتابیں چھ ساڑھے چھ برس کی عمر سے پڑھنی شروع کردی تھیں۔ گھر میں کتابوں کی فراوانی تھی اور والد اور والدہ دونوں کتابیں پڑھنے پر اصرار کرتے تھے۔ انعام میں کتابیں ملتی تھیں۔ میں ایک ایسے گھرانے سے تعلق رکھتی ہوں جو علم دوست اور ادب دوست تھا۔ میرے ایک پردادا مرزا عبدالستار بیگ نے تصوف کی تاریخ مسالک السالکین فی تذکرۃ الواصلین لکھی جو تین جلدوں میں ہے اور لگ بھگ بارہ سو صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب انھوں نے انیسویں صدی کے آخری برسوں میں لکھی تھی۔ لیکن اس کی پہلی جلد کی اشاعت 1919ء اور دوسری 2 جلدوں کی اشاعت 1925ء میں ممکن ہوئی جب میرے دادا یوسف علی ڈپٹی کلکٹر ہوئے اور اسے چھپوانے کے اہل ہو سکے۔ میری نانیاں، دادیاں فارسی اور اردو کی کتابیں پڑھتی تھیں، میری دادی دیونا گری جانتی تھیں، مردوں اور عورتوں کی اپنی اپنی بیاض ہوتی تھی جس میں پسندیدہ فارسی، اردو کے اشعار، اور ہندی کے دوہے، اقوال، حکایتیں اور چند پند سودمند لکھی ہوئی ہوتی تھیں۔ خواتین اس میں گھریلو نسخے، ٹوٹکے اور خاندان کے افراد کی تاریخ پیدائش اور وفات بھی ٹانک لیتی تھیں۔ میرے پاس اپنے دادا کی بیاض آج بھی موجود ہے۔ میری ننہیال اور ددیہال دونوں گھرانوں میں لائبریریاں تھیں۔ ان میں تصوف، تاریخ، قانون اور ادب کے موضوعات پر کتابیں تھیں۔ قلمی نسخے تھے۔ کتابوں کا اور لکھنے والوں کو بہت احترام ہوتا تھا۔ میرے والد کراچی میں 1946ء سے تھے۔ تقسیم کے بعد انہوں نے یہیں رہنے کا فیصلہ کیا۔ 1948ء میں جب وہ گھر سے اپنا ساز وسامان بحری جہاز سے لے کر آئے تو اپنی بہت سی کتابیں اور گراموفون ریکارڈ ساتھ لائے۔ متعدد ریکارڈوں کے علاوہ والدہ اور والد کی درجنوں کتابیں آج بھی میرے پاس موجود ہیں۔

زندگی کا آغاز ''کریما بہ بخشائے بر حال ما... کہ ہستم اسیر کمند ہوا'' کے ورد سے ہوا جو صبح سویرے والد سنتے تھے۔ گلستان و بوستان ختم کرنے کے بعد اردو نثر پڑھائی گئی۔ مطالعے کے حوالے سے میری راہ نمائی والد اور والدہ نے کی۔ میں نے روانی سے اردو پڑھنی شروع کی تو سب سے پہلے والدہ نے مجھے 16 صفحے کی چھوٹی چھوٹی کتابیں پڑھنے کو دیں۔ یہ دس بارہ کتابیں تھیں، ان کا نام ''لڑکیوں کا بستہ'' یا کچھ اسی طرح کا تھا۔ اس بستے میں چڑے چڑیا کی کہانی، ہنڈ کلھیا اور ایسی ہی دل چسپ کہانیاں تھیں۔ وہ کتابیں میں نے چند دنوں میں ختم کر دیں۔ اس کے بعد والدہ نے مجھے ''مراۃ العروس'' کا اپنا نسخہ دیا۔ 1926ء کا چھپا ہوا یہ نسخہ آج بھی میرے پاس ہے۔ ''مراۃ العروس'' نے میرے لیے ایک نیا جہان کھول دیا۔ میں ایک تنہا بچی تھی، ہمیں کہیں آنے جانے اور کسی سے ملنے کی اجازت نہ تھی، والد کا خیال تھا کہ ہم اشراف ہیں اور دو تین گھرانوں کے

سوا ہمارے اردگرد رہنے والوں کی اکثریت اس قابل نہیں کہ ان سے ملا جائے، اسکول میں جا نہیں سکتی تھی کیونکہ والد کے حالات ایسے نہ تھے کہ وہ مجھے شہر کے کسی اچھے اسکول میں پڑھواتے جہاں ان کی بھتیجیاں پڑھ رہی تھیں۔ سو میں تھی، چوتھی منزل کا ہمارا پینٹ ہاؤس تھا' کھلا ہوا صحن' بڑے بڑے کمرے' بالکنی میں کھڑے ہونے کی اجازت نہ تھی کہ کہیں جھانکتے ہوئے گر نہ جاؤں۔ کتابیں میرے لیے اس قید سے نجات کا پروانہ بن گئیں۔ کتابیں میری انگلی تھام کر کہاں کہاں نہیں لے جاتی تھیں۔ والدہ نے ''مراۃ العروس'' کے بعد ڈپٹی صاحب کی دوسری کتابیں دیں۔ ''بنات النعش'' اور ''توبۃ النصوح'' میں نے پڑھی لیکن ان میں جی نہیں لگا۔ والدہ کے پاس مرزا عظیم بیگ چغتائی کے ناولوں کا پورا سیٹ ''الف لیلہ'' عبدالحلیم شرر کے تاریخی ناول' علامہ راشد الخیری اور خواجہ حسن نظامی کی کتابوں کے سیٹ تھے۔ فیاض علی ایڈووکیٹ کے دونوں ناول ''شمیم'' اور ''انور'' تھے۔ اب سوچتی ہوں تو حیرت ہوتی ہے کہ والدہ نے عشق ومحبت میں شرابور یہ کہانیاں اور ناول ساڑھے سات آٹھ برس کی بچی کو کیسے پڑھنے دیئے۔ شاید اس لیے کہ ان کی پرورش کھلے ہوئے ماحول میں ہوئی تھی۔ ان کی چچی انگریز تھیں۔ انھوں نے رانچی کے گورنر ہاؤس میں جو شاید گورنمنٹ ہاؤس بھی کہلاتا تھا اپنے چچا اور چچی کے ساتھ کچھ دن گزارے تھے۔ ان کے خاندان کے بارہ' پندرہ لڑکے ولایت میں قانون اور طب پڑھ رہے تھے۔ لڑکیوں کے لیے زمینداری کی کھنچی ہوئی طنابوں کے ساتھ ہی فرنگی کے عہد کی روشن خیالی بھی مجبوری بن چکی تھی۔ زنانہ مشن کی وہ غریب انگریز اور اسکاٹ عورتیں تھیں جو اشراف کے گھروں میں آ کر ان کی لڑکیوں کو انگریزی' حساب اور جغرافیہ پڑھاتی تھیں۔ یہ وہ لوگ تھے جو اپنی بیٹیوں کو اسکول بھیجنا گوارا نہیں کرتے تھے۔ شاید یہی وجہ ہو یا کوئی اور میں نہیں جانتی لیکن والد نے اپنی کتابوں کی الماریاں میرے لیے کھول دیں اور میں تنہائی کی ماری' ہم عمر سہیلیوں کو ترستی ہوئی ندیدوں اور مربھکوں کی طرح ان کتابوں پر ٹوٹ پڑی۔ میرا یہ مسئلہ تو تھا ہی نہیں کہ کتاب کس موضوع پر ہو' کیسی ہو' کچھ بھی ہو پڑھنے کے لیے ہو۔ میں نے دھنیے' مرچ اور زیرے کی پڑیاں تک کھول کر پڑھی ہیں۔ صرف ایک کتاب ایسی تھی جس کے پڑھنے پر والدہ اور والد دونوں نے نہایت سخت سرزنش کی اور وہ تھی ''بہشتی زیور''۔

آپ نے اپنے سوال میں ''ذوق مطالعہ'' اور ''مہمیز'' جیسے ثقہ اور بھاری بھرکم لفظ استعمال کیے ہیں جن پر میں صرف ہنس سکتی ہوں اور شاید آپ بھی ہنس رہے ہوں۔ دس گیارہ برس کی عمر تک والد اور والدہ نے مطالعے میں میری راہ نمائی کی۔ انھوں نے مجھے مثنوی مولانا روم کے کچھ حصے پڑھائے۔ لیکن جب مجھے حکایات کی شکل میں یہ کہانیاں ملیں تو مثنوی کے دفاتر کی طرف سے میری توجہ ہٹ گئی جس کا والد کو صدمہ رہا۔ اسی طرح ''گلستان'' ''بوستان'' ابتداء میں فارسی

میں پڑھی لیکن پھر مولانا سجاد حسین کے تراجم دل کو زیادہ اچھے لگے۔ ہمارے شیخ سعدی کی حکایات کی طرح مغرب میں ''ایسوپس فیبلز'' کا شہرہ ہے جنھیں ہمارے یہاں ''حکایات لقمان'' بھی کہا جاتا ہے۔ ''ایسوپس فیبلز'' کلیلہ و دمنہ'' اور ''جوگ بشسٹ'' کی کہانیاں اور ''جاتک کہانیاں'' والد نے پڑھائیں۔ ان دونوں کتابوں میں عجب کہانیاں تھیں جن میں کہیں سادھو تھے اور کہیں مہاتما بدھ کی پرانی زندگیوں کے قصے۔ یہ ایک نرالی دنیا تھی جس میں جنگل، جانور اور انسان آپس میں باتیں کرتے تھے۔ اس کے کئی برس بعد ''الف لیلہ'' ''باغ و بہار'' ''آرائش محفل'' اور ''فسانہ ؟ عجائب'' پڑھی۔ ''کتھا سرت ساگر'' کی باری بعد میں آئی اور اس کے بعد ''طلسم ہوشربا'' جس میں کہانیوں کا ایسا جنگل اور ایسی پراسرار گپھائیں تھیں جن میں داخل ہونے والوں کو پھر واپسی کا راستہ نہیں ملتا۔

کم عمری سے ہی پڑھنے کے بارے میں میرا احوال اس خودرو گھاس کا رہا ہے جو پختہ فرش کی درزوں اور دیواروں کی دراڑوں سے بھی اپنا سر نکال دیتی ہے۔ میں نے کسی منصوبہ بندی کے تحت مطالعہ نہیں کیا۔ یوں تھا کہ جس وقت جو کتاب ہاتھ لگی وہ میں نے پڑھ ڈالی۔ ''طویل نیند'' کی کہانیوں نے مجھے ابتداء میں بہت متاثر کیا۔ ''قصص الانبیا'' میں اصحاب کہف کا قصہ کس قدر استعاراتی ہے۔ ایک ایسی نیند جس میں انسانوں کے ساتھ ان کا وفادار کتا قطمیر بھی سینکڑوں برس سوتا رہتا ہے اور جب یہ لوگ جاگتے ہیں اور نان خریدنے کے لیے بازار جاتے ہیں تو ان کی جیب میں پڑے ہوئے سکے اب متروک ہو چکے ہیں۔ کم عمری کا زمانہ تھا جب ''کھلونا'' دہلی میں رپ وان ونکل کی کہانی پڑھی۔ ایک مشہور ولندیزی لوک کہانی جسے بعد میں امریکی ادیب واشنگٹن ارونگ نے بھی لکھا تھا۔ بہت بعد میں ''نقوش'' کے صفحوں پر کسی روسی ادیب کا طویل ناولٹ ''صد سالہ سفر'' پڑھا جسے ہمارے فراموش کردہ ادیب آل احمد سرور نے ترجمہ کیا تھا۔ اصحاب کہف کا قصہ قرآن میں بھی ملتا ہے جب کہ رپ وان ونکل کی کہانی میں وہ شخص ہے جو گھریلو جھگڑوں سے تنگ آ کر کسی غار میں جا سویا تھا۔ بیس برس بعد آنکھ کھلی تو بیوی مر چکی تھی اور گھر کھنڈر ہو گیا تھا۔ ''صد سالہ سفر'' کے ہیرو کی طویل نیند ایک سائنسی تجربے کا حصہ تھی۔ سو برس بعد جب وہ اپنی نیند سے جاگتا ہے تو اس کی ''محبوبہ'' اس پر جھکی ہوئی ہے اور وہ یہی سمجھتا ہے کہ اس پر ہونے والے تجربے کا ابھی آغاز بھی نہیں ہوا۔ یہ بات تو اس پر بعد میں آشکار ہوتی ہے کہ اس کی محبوبہ پچاس ساٹھ برس پہلے ختم ہو چکی اور وہ اس کی ہم شکل پوتی یا پرپوتی کو دیکھ رہا ہے۔ ایک امریکی ناول "Far Arena" بھی تھا۔ عہد روما کے دور کا ایک گلیڈی ایٹر جو برف میں منجمد ہو گیا تھا اور بیسویں صدی کی آخری دہائیوں میں سائنس دانوں نے اسے برف کے تودے سے رہائی دلا کر زندہ کر دیا تھا۔

سچ یہ ہے کہ امریکیوں اور روسیوں نے سائنس فکشن کو درجہ ؟ کمال پر پہنچایا۔ ہمارے

یہاں بھی بعض لکھنے والوں میں یہ رجحان موجود تھا۔ اس کی ایک اعلیٰ مثال ابن صفی تھے لیکن ہمارا سماج تو آج بھی اس بحث میں الجھا ہوا ہے کہ قرنیے یا گردے کی پیوند کاری جائز ہے یا ناجائز۔ تقسیم سے پہلے کی چھپی ہوئی ایک کتاب ''اخوان الشیاطین'' والدہ کی کتابوں میں موجود تھی' اس میں کچھ طبع زاد اور کچھ ماخوذ کہانیاں تھیں۔ اس کے مصنف کا نام مجھے یاد نہیں لیکن اس کی سریت آمیز فضا مجھ سے آج تک بھلائی نہ جاسکی۔ ''اخوان الشیاطین'' ماخوذ سہی لیکن وہ شاید اردو کا پہلا سائنسی افسانہ تھا۔

ہمارے مشہور شاعر سراج الدین ظفر کی والدہ مسز عبدالقادر تھیں جن کا آج کوئی نام بھی نہیں لیتا لیکن انھوں نے کیسی بے مثال گوتھک کہانیاں لکھیں۔ اردو میں یہ صنف ان سے شروع ہو کر ان ہی پر ختم ہوگئی۔ ایڈگر ایلن پو کی کہانیاں پراسرار اور دہشت زدہ کر دینے والی دنیا میں لے جاتی تھیں۔ سر رائیڈر ہیگرڈ کے تراجم جو مولوی عنایت اللہ دہلوی نے ''عذرا'' اور ''عذرا کی واپسی'' کے نام سے کیے۔ ''عذرا کی واپسی'' میں عذرا کا حیات ابدی حاصل کرنے کے لیے شعلوں میں نہانا ایک ایسا منظر تھا جو پڑھنے والوں کے ذہن پر ہمیشہ نقش رہے گا۔

اسی زمانے میں سیکس روہمر کے کردار ''فومانچو'' سے ملاقات ہوئی۔ ایک زرد فام چینی جس کا عیاری میں کوئی ثانی نہ تھا اور جس کی دہشت سے دنیا کی بڑی بڑی حکومتیں کانپتی تھیں۔ یہ اندازہ تو بعد میں ہوا کہ یہ ناول اس پروپیگنڈا مہم کا حصہ تھے جن میں ''فومانچو'' کا تعاقب کرنے والا برطانوی کردار ہمیشہ برطانوی حکومت کے اس دشمن کو شکست دیتا تھا لیکن فومانچو اپنی عیاری سے پھر بچ نکلتا تھا۔ اقبال جب ''ساقی نامہ'' لکھتے ہوئے یہ کہہ رہے تھے کہ ''گراں خواب چینی سنبھلنے لگے'' اور ماؤ اپنی آزادی کی جدوجہد کا آغاز کر رہے تھے۔ عین اسی زمانے میں ''فومانچو'' کے کردار پر مبنی ناول ایسے انسان دشمن چینی کو نہایت دل چسپ انداز میں پیش کر رہے تھے جس سے مشرق و مغرب اور شمال و جنوب کی تمام قوموں اور تہذیبوں کو خطرہ تھا۔ 1998ء میں جب چینی مصنفین کی انجمن (CWA) کی دعوت پر 8 ادیبوں کا ایک وفد چین گیا تو میں بھی اس میں شامل تھی۔ ہمارے وفد کی سربراہی معروف ترقی پسند دانش ور عبداللہ ملک کر رہے تھے اور ہمارے ساتھ صاحب طرز شاعر شہزاد احمد' محسن احسان' اصغر ندیم سید بھی تھے۔ مجھے نہیں معلوم کہ جب ان لوگوں نے دیوار چین پر قدم رکھے تو انھیں کیا محسوس ہوا لیکن مجھے جہاں لوشون کی تحریروں کے اردو ترجمے یاد آئے وہیں فومانچو کا منفی کردار بھی ذہن میں آیا۔ والدہ کی کتاب ''قدیم تہذیبیں'' پڑھتے ہوئے میرے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ میں کبھی اس دیوار چین پر قدم رکھوں گی جو دنیا کے سات عجائبات میں سے ایک ہے' جس کی تعمیر کا قصہ صدیوں پر محیط ہے اور جس میں لگنے والا ایک ایک پتھر بے نام ونشان

چینی کسانوں کے بدن کی ناقابل برداشت مشقت کے مسالے سے جوڑا گیا تھا۔

''پرومی تھیس'' کا اساطیری کردار' سلطنت روما کے خلاف غلاموں کی بغاوت کے ہیرو اسپارٹکس پر ہاورڈ فاسٹ کا ناول' نازیوں کے مظالم کا شکار ہونے والی لڑکی این فرینک کی ڈائری اور 60ء کی دہائی کے ''ریڈرز ڈائجسٹ'' میں نسلی اور مذہبی تعصب کا شکار ہونے والے کرنل ڈریفس کی داستان ابتلا جسے غداری کے ایک جھوٹے مقدمے میں سزا ہوئی اور جس کی بے گناہی کو ثابت کرنے کے لیے اپنے وقت کے دو مشہور فرانسیسی ادیبوں ایمل ژولا اور اناطول فرانس نے ایک نہایت مشکل لڑائی لڑی۔ ''غدار'' اور ''بے دین'' کہے گئے۔ ان معاملات کے بارے میں کتابوں اور مضامین کو پڑھ کر میں نے یہ جانا کہ سچ کا ساتھ دینا کس قدر جاں گسل معاملہ ہے۔ مختلف زمانوں میں مذہبی اقلیتوں سے بے پناہ نفرت اور ان کے خلاف پھیلائے جانے والے جھوٹ اور امتیازی قوانین کے ذریعے انہیں سماج میں اچھوت بنا دینا' اذیت ناک سزائیں دینا' بعض حالات میں ان مظلوموں کی جان لے لینا ایک معمول کی بات رہی ہے اور آج بھی یہی کچھ ہو رہا ہے۔ ایسے میں ژولا اور اناطول فرانس جیسے باضمیر دانش ور اور ادیب ان بدبخت گروہوں اور افراد کی تیرہ و تار زندگی میں روشن ستاروں کی طرح نظر آتے ہیں جنھوں نے ناانصافی کا شکار ہونے والوں کو انصاف دلانے کے لیے آواز بلند کی جب کہ وہ خود اکثریتی طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ اپنی اس حق گوئی اور انصاف پسندی نے انھیں اپنے سماج میں ہدفِ ملامت بنا دیا۔ اس نوعیت کے متعدد واقعات اور ان کے بارے میں لکھی جانے والی کتابوں نے انسان پرستی' انصاف پسندی کے مفہوم سے آشنا کیا' اقلیتوں کے ساتھ ہونے والے مظالم کے بارے میں جان کاری دی اور میری زندگی کی راہیں متعین کیں۔

میرے مطالعے کا ایک اہم حوالہ تحریک آزادی؟ نسواں بھی ہے۔ اس بارے میں' میں یہ کہوں گی کہ آزادی؟ نسواں کے حوالے سے رقیہ سخاوت حسین کی کہانی ''سلطانہ کا خواب'' مجھے بہت دل چسپ اور خیال انگیز محسوس ہوئی۔ یہ کہانی کتابی شکل میں بہت بعد میں آئی' میں اس سے پہلے اسے پڑھ چکی تھی۔ رسالہ ''عصمت'' میں کم عمری سے ہی عورتوں کی تعلیم اور ان کے حقوق کے بارے میں بہت سے مضامین پڑھتی رہی تھی لیکن یہ مضامین خاص مشرقی دائرے میں رہتے ہوئے عورتوں کی تعلیم کی بات کرتے تھے' ان میں پردے کی بات بھی کی جاتی تھی جبکہ ''سلطانہ کا خواب'' ان معاملات کے بارے میں ایک دوسرا زاویہ نظر پیش کرتی تھی۔ اس کے بعد ہی میں نے اس نہایت اہم موضوع پر خصوصی طور سے پڑھنا شروع کیا جو براہ راست مجھ سے اور میری صنف سے متعلق تھا۔ یہ ایک مشکل کام تھا کیونکہ اب سے پینتیس چالیس برس پہلے فیمنسٹ دانش وروں کی

کتابیں مشکل سے ملتی تھیں۔ پھر بھی میری وول اسٹون کرافٹ، شارلٹ کیتھرین گل مان اور میٹلڈا گیج وغیرہ کو پڑھا۔ پھر اپنے عہد کی سب سے بڑی خاتون دانش ور اور نظریہ ساز سیمون دی بووا کا علمی کارنامہ The Second Sex پڑھنے کا موقع ملا۔ جس میں اس نے 40 کی دہائی میں عورتوں کی محکومیت کے اسباب بیان کیے اور نہایت جرا؟ت سے اس خیال کو رد کیا کہ عورت کا مقام گھر اور اس کا فطری کردار مردوں کو محض راحت و آرام پہنچانا ہے۔ اپنے اس مو؟قف کی سیمون دی بووا نے عمر بھر بھاری قیمت ادا کی اور اس کے ساتھ ہی اسے بے حد تکریم اور شہرت بھی ملی۔ 70ء کی دہائی میں اس کی خودنوشت چار جلدوں میں شائع ہوئی Dutiful Memoris of A Daughter, Prime of Life, Force of Cirunmstances, All Said and Done یہ چاروں جلدیں پڑھیں تو اس خاتون فلسفی کی ذاتی زندگی سے آگہی ہوئی اور ساتھ ہی اس میں بیسویں صدی کے یورپ کی ادبی اور دانش ورانہ زندگی کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں۔ بائیں بازو سے تعلق رکھنے والے ادیبوں اور فن کاروں کی تحریکیں، ان کے درمیان ادبی چشمکیں اور رقابتیں نظر آتی ہیں۔ دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں فرانسیسی اور یورپی ادیبوں اور فن کاروں نے قیامت کی اس گھڑی کو کس طور گزارا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد کی عالمی سیاست جس میں، نہر سوئز کا تنازعہ، ویت نام کی خونیں جنگ، کیوبا کے معاملات اور فرانسیسی نوآبادی الجزائر میں جدوجہد آزادی کا ابھار اور اس بارے میں سارتر اور سیمون کا جرات مندانہ مو؟قف، اپنے اور سارتر کے دوستانہ تعلقات کی نزاکتیں اور ضمیر کی عدالت میں ہمیشہ ان افراد اور گروہوں کا ساتھ دینا جو کمزور اور مظلوم تھے۔ سیمون دی بووا کی اس طویل خودنوشت کے ذریعے یہ جانا کہ آزاد عورت اور آزاد انسان ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔ اس کے برسوں بعد میں نے ایما گولڈ مان کی خودنوشت Living My Life کے ترجمے ''سرخ روایما'' کا ضخیم مسودہ پڑھا اور اس کا دیباچہ بھی لکھا۔ یورپ اور امریکا کی عورتوں کی سیاسی اور ادبی جدوجہد کو سمجھنے میں ایما گولڈ مان اور سیمون دی بووا کی خودنوشت بہت مدد دیتی ہے۔ ہمیں یورپ کی بورژوازی اور محنت کش عورتوں کی زندگیوں میں جھانک کر دیکھنے کا موقع ملتا ہے اور اس کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ مغرب میں ہر طبقے کی عورت نے آزادی اور اپنے حقوق کی لڑائی کس بے جگری سے لڑی ہے اور یہ عورتیں کتنے مشکل مرحلوں سے گذری ہیں۔ یہ وہ تھیں جو عورتوں اور مردوں کے درمیان مساوات کی بات کرتی تھیں۔ یہ کتابیں ہمارے سامنے ایک ایسی دنیا کو آشکار کرتی ہیں جس میں لکھنے والی عورتیں سیاسی اور ادبی منظرنامے پر پوری قوت سے نمودار ہوئیں اور انھوں نے اپنے اپنے وقت کی دنیا کو بدل دینے کے لیے حیران کن عملی اور علمی عزم کا مظاہرہ کیا۔ عورتوں کے حقوق کے حوالے سے ایک مرد کی لکھی ہوئی کتاب

بھی اس حوالے سے بہت اہمیت رکھتی ہے۔ یہ جون اسٹورات مل کی The Subjection of Women تھی۔

میرے اس ذہنی سفر میں ورجینیا وولف کی کتاب A Room of Ones Own کا بھی اثر رہا جس میں اس نے عورتوں کی معاشی خودمختاری اور ان کی تخلیقی زندگی کے لیے ان کی خلوت کے احترام کی بات کی ہے اور اس بات پر اصرار کیا ہے کہ انھیں بھی مردوں کی طرح تخلیق کے لیے تنہائی، سفر اور تفریح کے مواقع میسر آنے چاہئیں۔ دوسرے لفظوں میں وہ عورتوں کو مساوی مواقع میسر آنے کی بات کرتی ہے تا کہ وہ بھی ادب، شاعری اور دیگر علوم میں اپنی تخلیقی صلاحیت کا مظاہرہ کرسکیں۔ اپنی اس کتاب کی ابتداء میں ہی ورجینیا وولف نے ولیم شیکسپیئر کی ایک فرضی بہن کا ذکر کیا ہے۔ شیکسپیئر کی اس فرضی بہن کے حوالے سے اس نے جو سوال اٹھائے ہیں وہ بہت خیال انگیز اور برجستہ ہیں۔ ورجینیا وولف کی یہ کتاب تخلیقی ذہن رکھنے والی ہر عورت کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتی ہے۔

والد کے دوستوں میں علامہ امتیاز علی خان عرشی، ڈاکٹر عندلیب شادانی، خان محبوب طرزی، نسیم انہونوی، حشر رام پوری اور دوسرے کئی ادیب اور شاعر تھے جن سے ان کی خط و کتابت رہتی تھی۔ ہمارے پڑوسیوں میں سے ایک علامہ عبدالحئی حبیبی تھے، وہ افغانستان کے سابق وزیر تعلیم اور پشتو کے جید عالم، دانش ور اور متعدد کتابوں کے مصنف تھے۔ ان کے پاس جامعہ از ہر سے عربی اور فارسی کی نادر کتابوں کی مائیکرو فلمیں آتی تھیں جنھیں پڑھنے کے لیے وہ مائیکرو ریڈر استعمال کرتے تھے، اس زمانے میں یہ اتنی نادر بات تھی جس کا آج اندازہ نہیں لگایا جاسکتا جب ہر گھر میں کمپیوٹر موجود ہے اور ہر ہاتھ میں موبائل۔ ہمارے دوسرے پڑوسی ڈاکٹر سید عارف شاہ گیلانی تھے وہ پہلے حیدر آباد میں رہتے تھے اور گورنمنٹ کالج حیدر آباد کے پرنسپل تھے۔ انہوں نے سندھ مدرستہ الاسلام میں تعلیم پائی تھی، وہ میرے والد سے اپنے پرنسپل خان صاحب مرید علی قادر بخش اور ڈی جے سندھ کالج کے پروفیسر سلیمان اسد صفوی کا اکثر تذکرہ کرتے۔ شمس العلماء ڈاکٹر عمر محمد داؤد پوتہ کے وہ فدائی تھے۔ انہیں مرشد کہہ کر یاد کرتے، ڈائریکٹر تعلیمات ہو کر کراچی آ گئے تھے۔ ان کے پاس بہت سی کتابیں تھیں، ان کی بیگم مسز اختر سلطانہ گیلانی انگریزی ادب میں ایم اے تھیں اور انگریزی کی پروفیسر تھیں۔ ڈی جے یا شاید ایس ایم کالج میں پڑھاتی تھیں اور ہمیں ڈانٹ ڈانٹ کر شیکسپیئر اور برانٹی سسٹرز کے بارے میں بتاتی تھیں۔ ان کے دونوں بڑے بچے میڈیکل پڑھ رہے تھے۔ وہ لوگ اپنی پڑھائی میں جٹے رہتے۔ اس لیے میں ان کے ہاتھ لگتی تھی۔ میں نے ابتدائی عمر میں انگریزی ادب کے بارے میں بہت کچھ ان سے سنا۔

اب آپ ہی بتائیے کہ جب گھر میں اور پڑوس میں ہر طرف کتابیں ہوں اور کتابوں کا تذکرہ ہو، والدہ کے نام ہر مہینے ماہنامہ ''عصمت'' آتا ہو۔ والد ادبی رسالوں کے خریدار ہوں، میرے لیے ماہ نامہ ''کھلونا' دہلی' بھائی جان' ساتھی اور 'تعلیم و تربیت'' اخبار والا ہر مہینے لاتا ہو، مجھے تحفے اور انعام میں کتابیں ملتی ہوں، پڑوسیوں کے یہاں انگریزی اور فارسی کتابوں کی ریل پیل ہو۔ جامعہ ازہر سے مائیکروفلموں کے ڈبے آتے ہوں۔ ڈاکیے کا انتظار اس لیے کیا جاتا ہو کہ رضا لائبریری، رام پور سے اس کے مہتمم عبدالواحد خان کا یا علامہ امتیاز علی خان عرشی کا خط یا کتابوں کا پارسل آئے گا تو لکھنے پڑھنے کے علاوہ توجہ اور کس طرف جائے گی؟۔ ہمارے گھر میں سب سے اہم چیز کتاب تھی۔ پریشاں حالی کے دنوں میں ادھار پر کتابیں لی جاتیں۔ میرے والد نے کچھ دنوں ایک برٹش فرم گل اینڈ کمپنی میں کام کیا تھا۔ وہیں ووڈ اسٹریٹ پر چارٹرڈ بینک چیمبرز میں ایس ایم میر صاحب کی کتابوں کی دکان تھی۔ میر صاحب ایک کشمیری پنجابی تھے۔ وہ اکثر ہمارے گھر آتے، زعفرانی رنگ، بڑی بڑی آنکھیں۔ لمبے بال، میٹھے لہجے میں باتیں کرتے۔ والد کی اور ان کی ساری گفتگو فارسی اور اردو شاعری، رومی اور اقبال کے بارے میں ہوتی، اس زمانے میں کتب فروش وہ لوگ ہوتے تھے جنھیں علم و ادب سے دل چسپی اور وابستگی ہو۔ ان میں سے کچھ کی یہ وابستگی، وارفتگی کی حد تک پہنچ جاتی، ان میں سے ایک مثال آغا شاعر قزلباش کے خاندان کی ہے جس نے کراچی میں ''کتاب محل'' قائم کیا۔ آغا سرخوش اور آغا آفتاب قزلباش کی کتابوں کی یہ دکان کراچی کی علمی اور ادبی پہچان تھی۔ بات ہو رہی تھی میر صاحب اور ان سے خریدی جانے والی کتابوں کی۔ جس زمانے میں والد کا ہاتھ تنگ ہوتا، میر صاحب سے ادھار پر کتابیں لی جاتیں اور ہر مہینے کی پہلی کو ان کتابوں کی قسط جاتی، میرے پاس آج بھی وہ کتابیں موجود ہیں جو والد نے ان سے خریدی تھیں۔ مسائل سنگین ہو جاتے یا ہندوستان سے کوئی خاندان ترک وطن کر کے آتا تو آٹھ دس مہینے یا سال دو سال کے لیے ہمارے گھر ٹھہر جاتا اور اس کی کفالت والد کی ذمہ داری ہوتی۔ ایسے میں امی کے زیور بکتے۔ ان سے ملنے والی رقم میں سے بھی کتابیں خریدنے کا حصہ ضرور نکلتا۔

آٹھویں میں تھی تو صرف ایک برس کے لیے حمراء فردوس صاحبہ میری استاد ہوئیں۔ اس ایک برس میں انھوں نے لکھنے کی مشق کرائی، اس طرح ان سے اور ان کے خاندان سے اتنا گہرا تعلق ہوا جسے 2009ء میں پچاس برس مکمل ہو گئے ہیں۔ وہ اب ایک عرصے سے حمرا خلیق کے نام سے معروف ہیں اور 30ء کی دہائی میں مشہور ہو جانے والی شاعرہ رابعہ پنہاں کی بیٹی ہیں۔ ان کی خالائیں آمنہ عفت، بلقیس جمال، میمونہ غزال، اپنے عہد کی باکمال شاعرات اور نثر نگار تھیں جو آل انڈیا مشاعروں اور آل انڈیا ریڈیو کے مشاعروں میں پڑھتی تھیں۔ حمرا آپا کے توسط سے آمنہ عفت

اور رابعہ پنہاں صاحبہ سے میری ملاقات ہوئی جن کا ادبی ذوق بے مثال تھا۔ ان ہی کے گھر ان کی بڑی بہن اسماء فردوس سے ملی۔ ان سے ملاقات سے پہلے میں صرف اردو کتابیں پڑھا کرتی تھی لیکن اسماء آپا نے مجھے انگریزی ادب پڑھنے کی طرف مائل کیا۔

نویں میں سائنس اور ریاضی کے میرے استاد خانزادہ عبدالسلام نے مجھے ول ڈیوراں کی ''داستان فلسفہ'' اور مارکس کے بارے میں چند کتابیں پڑھنے کو دیں۔ یوں میں اردو ادب اور تاریخ اسلام کے علاوہ ایک نئے ذائقے کی کتابوں سے آشنا ہوئی۔ اسی زمانے میں یونانی اضامیات کے بارے میں Edith Hamilton کی کتاب سے ملاقات ہوئی اور ''نقوش'' میں سید سبط حسن کا مضمون ''گل گامش کی داستان'' نظر سے گزرا۔ میٹرک کرنے کے کچھ ہی دنوں بعد میری ملاقات مرحوم قیصر ابن حسن سے ہوئی وہ لیاقت نیشنل لائبریری کے چیف لائبریرین تھے۔ ان جیسے شریف اور طالب علموں کی راہ نمائی کرنے والے لوگ پہلے بھی کم ہوتے تھے اور اب تو شاید نایاب ہیں۔ ان کے توسط سے میں نے بہترین کتابیں پڑھیں۔ ان سے جب نیاز حاصل ہوئے تو اس سے پہلے میں ''آگ کا دریا'' پڑھ چکی تھی اور کچھ لوگوں سے یہ بھی سن چکی تھی کہ یہ ناول ''وولگا سے گنگا'' کا چربہ ہے۔ قرۃ العین حیدر میرے نزدیک اردو کی بہت بڑی لکھنے والی تھیں اور ان کے بارے میں یہ بات مجھے ناگوار گزرتی تھی۔ میں نے ''وولگا سے گنگا'' بہت تلاش کی لیکن مل نہیں سکی۔ یہ مرحوم قیصر ابن حسن تھے جنھوں نے مجھے لیاقت نیشنل لائبریری سے راہل سانکریتاین کا یہ ناول پڑھنے کے لیے دیا جو ویدوں کے زمانے سے بھی پہلے کے دور سے شروع ہوتا ہے اور جس کی ابتداء میں مادرسری سماج کو دکھایا گیا ہے ارتقائی دور سے گزر کر یہ کس طرح پدرسری سماج میں بدلا۔ اس ناول میں ہندوستان میں آریاؤں کی اور پھر مسلمانوں کی آمد اور انگریزوں کا دور دکھایا گیا ہے۔ اسے پڑھ کر مجھے اطمینان ہوگیا کہ اس کا ''آگ کا دریا'' سے بس اتنا ہی تعلق ہے کہ اس میں بھی ہزاروں برس کو سمیٹا گیا ہے۔ راہل جی نے اس میں جس طرح مادرسری سماج کو دکھایا ہے وہ میں نے کسی اور ناول میں نہیں پڑھا۔ افسوس کہ یہ ناول اردو میں اب نایاب ہے لیکن ہندی میں مل جاتا ہے۔

مطالعے کے حوالے سے میری زندگی میں لائبریریوں کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ ہمارے محلے کی آنہ لائبریری ''دارالکتب'' تھی، یہاں اخبار اور رسالے بکتے تھے، یہ دکان نما لائبریری تقسیم سے پہلے کی تھی اور اس میں اعلیٰ ادبی کتابیں تھیں۔ نیاز فتح پوری کی ثقیل کتابوں سے لے کر منٹو، کرشن چندر، سرت چندر چٹرجی اور ٹیگور کی کتابیں میں نے اسی لائبریری سے لے کر پڑھیں۔ اس کے بعد اسکول لائبریری اور پھر اس کے بعد برٹش کونسل، امریکن لائبریری اور ووکس لائبریری

جو بعد میں فرینڈ شپ ہاؤس کے نام سے مشہور ہوئی ان سب کا بہت اہم کردار رہا ہے۔ ان لائبریریوں کے ذریعے میں نے بہت عمدہ کتابیں پڑھیں۔ دوکس لائبریری سے میں نے روسی ادیبوں کی وہ تمام کتابیں پڑھ ڈالیں جو ماسکو کے دارالترجمہ سے اردو میں شائع ہوئیں تھیں۔ سید سبط حسن سے میری پہلی ملاقات 67ء میں ہوئی تھی لیکن اس کے دس برس بعد ان سے ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہوا جو ان کی زندگی کے آخری لمحوں تک جاری رہا۔ ان کے پاس مارکسی تاریخ اور ادب کی بہت اعلیٰ کتابیں تھیں ان میں سے چند میں نے بھی پڑھیں۔

جہاں تک وقت کے ساتھ ساتھ ذوق مطالعہ میں تبدیلی کا تعلق ہے تو وہ یقیناً ہوئی ہے۔ کم عمری میں غالب رجحان دل چسپ ناول اور کہانیاں پڑھنے کا تھا۔ آہستہ آہستہ توجہ عالمی ادب کی طرف بڑھتی رہی، انگریزی میں مطالعے کا رجحان بھی بڑھتا گیا۔ تاریخ سے متعلق کتابیں زیادہ مطالعے میں آئیں۔ سندھ کی تاریخ اور ادب سے دل چسپی بڑھی۔ سب سے اہم بات یہ ہوئی کہ حقوق انسانی، تحریک نسواں اور پاکستان کی درست تاریخ پڑھنے کی طرف توجہ ہوئی جس کی وجہ سے پیچیدہ سیاسی معاملات کے بہت سے نئے پہلو سامنے آئے۔ پاکستان میں ابتداء سے جو جھوٹ بولے گئے ان سے آگاہی ہوئی۔ یہ معلوم ہوا کہ حقوق انسانی اور حقوق نسواں کی تحریک کتنی صدیوں پر پھیلی ہوئی ہے۔ ایذا دہی کے بارے میں پرانی کتابیں میری مراد Inqusition کی تاریخ سے ہے پڑھیں پھر ایمنسٹی انٹرنیشنل کی تشدد اور ایذا دہی کی رپورٹیں پابندی سے پڑھیں اور آج بھی پڑھتی ہوں جنھوں نے بتایا کہ انسان سے بڑا حیوان کرہ؟ ارض پر پایا نہیں جاتا۔ انسانی حقوق اور حقوق نسواں کے معاملات سے میری دل چسپی اتنی بڑھی کہ میں نے ایمنسٹی انٹرنیشنل کی کئی رپورٹیں ترجمہ کیں اور پھر 3 برس تک ایمنسٹی انٹرنیشنل کی میڈیا کو آرڈی نیٹر فار ویمن رائٹس رہی اور اس وقت بھی نیٹ ورک فار ویمن رائٹس کی وائس چیئر پرسن ہوں۔

کتابوں کی بات ہو رہی ہے تو میں ایک ناول ''فیرن ہائٹ 451'' کا بہ طور خاص ذکر کرنا چاہوں گی۔ 1954ء میں چھپنے والے اس امریکی ناول کا شمار ''سائنس فکشن'' میں کیا جاتا ہے۔ میں نے اسے بیس اکیس برس کی عمر میں پڑھا۔ یہ ایک دل چسپ اور سنسنی خیز ناول تھا، ایسے ناول عموماً پڑھ کر بھلا دیے جاتے ہیں لیکن اس میں کچھ ایسی بات تھی کہ ذہن کے کسی دور دراز گوشے میں اس کے حوالے سے ایک خلش سی رہ گئی۔ برسوں بعد اس ناول کو دوبارہ پڑھنے کی خواہش ہوئی تو اسے ڈھونڈنے میں برسوں لگ گئے۔ جب یہ ناول دوبارہ ہاتھ آیا اور اسے توجہ سے پڑھا تو حیرت ہوئی کہ میں اس سے اس قدر سرسری کیوں گزر گئی تھی۔ جارج آرویل کے 1984ء کی طرح رے بریڈ بری نے بھی ایک خیالی دنیا کا قصہ لکھا ہے۔ ایک ایسی دنیا جہاں کتابوں کو

خطرناک سمجھا جاتا ہے‘ ایک ایسا سماج جس میں لوگوں کو بتایا جاتا ہے کہ کتابیں انسانی خوشی کی دشمن ہیں‘ یہ کتابیں ہیں جو انسانوں کے درمیان فساد اور جھگڑے کا سبب بنتی ہیں اس لیے انھیں جلا دینا چاہیے۔ اس سماج میں کتابیں لکھنا اور انھیں پڑھنا ’’جرم‘‘ ٹھہرتا ہے‘ ایک محکمہ قائم کیا جاتا ہے جس کا کام ہی کتابوں کو جلا دینا ہے۔ ہر گھر سے کتابیں نکال کر بہ حق سرکار ضبط کر لی جاتی ہیں۔ جدید ترین سائنسی ایجادات کے ذریعے ان لوگوں کا ’’کھوج‘‘ لگایا جاتا ہے جو اس قانون کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔ کتابوں کو چھپا کر رکھتے ہیں‘ انھیں محفوظ کرتے ہیں۔ جس سماج میں یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔ وہاں منحرفین اور باغیوں کی ایک برادری وجود میں آجاتی ہے۔ کتابوں کو محفوظ رکھنے کی خواہش میں ضخیم کتابوں کے باب آپس میں تقسیم کر لیے جاتے ہیں‘ کوئی شخص رسل کی کسی کتاب کے ابتدائی 100 صفحے یاد کر لیتا ہے تو کوئی دوسرا اس کے اگلے 100 صفحے۔ 500 صفحوں کی ایک کتاب پانچ انسانوں کے حافظے میں محفوظ ہو جاتی ہے۔ اس امید میں کہ جب تاریک دور سے نجات ملے گی تو یہ پانچوں اپنے حافظے کو کتاب کی شکل دے دیں گے۔ ان میں سے کوئی ختم ہو جائے گا تو کسی اور شہر‘ کسی اور قصبے میں کوئی اور مل جائے گا جسے وہ صفحے یاد ہوں گے۔

رے بریڈ بری نے اپنے اس ناول کو ’’فیرن ہائٹ 451‘‘ کا نام دیا۔ کاغذ اس درجۂ حرارت پر آگ پکڑ لیتا ہے۔ یہ ناول اس وقت لکھا گیا جب امریکا میں ’’میکارتھی ازم‘‘ اپنے عروج پر تھا اور آزادیٔ فکر و خیال کو کچلنے کے لیے ہر حربہ استعمال کیا جاتا تھا۔ یہ ناول ’’سنسر شپ‘‘ کے خلاف اور آزادیٔ تحریر اور اس کی اشاعت کے انسانی حق پر اصرار کا ایک شاندار اظہار ہے۔ انسان کے اندر ’’یزداں‘‘ اور ’’اہرمن‘‘ نیکی اور بدی کی دونوں طاقتیں موجود ہیں‘ ان کے درمیان کش مکش کو بریڈ بری نے جس طرح لکھا ہے اس کی بے حد پذیرائی ہوئی اور اس کا موازنہ ایڈگر ایلن پو‘ جارج آرویل اور آلڈس ہکسلے سے کیا گیا۔ ہمارے یہاں علم دشمنی جس طرح عروج حاصل کر رہی ہے اور ایک خاص نوع کی کتابوں کے علاوہ دوسرے نقطۂ نظر پر مبنی کتابوں‘ روشن خیالی اور خرد افروزی کے خیالات پر مشتمل کتابوں کو جس طرح حقارت کی نظر سے دیکھا جا رہا ہے‘ اس ماحول میں ’’فیرن ہائٹ 451‘‘ ایسی کتابیں ہمیں بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتی ہیں۔

جیسا کہ میں پہلے کہہ چکی ہوں میں نے پڑھنے کا آغاز کہانیوں‘ ناولوں اور تاریخ کی کتابوں سے کیا۔ والدہ کے پاس علامہ راشد الخیری کی کتابوں کا مکمل سیٹ تھا۔ صبح زندگی‘ شام زندگی‘ شب زندگی اس کے علاوہ خواجہ حسن نظامی کے لکھے ہوئے ’’غدر کے افسانے‘‘ جس میں بہادر شاہ ظفر پر چلنے والے مقدمے کی تفصیلات سے لے کر ’’دلی کے آنسو‘‘ اور ’’شہزادیوں کی بپتا‘‘ سب ہی شامل تھیں۔ مرزا عظیم بیگ چغتائی کی کتابوں کا مکمل سیٹ جس میں ’’مسز کرٹ ھلے‘‘ سے لے

کر'دیکھا جائے گا' 'خانم' سوانہ کی روحیں' شہزوری' کمزوری' اوران کی تمام کہانیاں اورمختصر ناول تھے۔اسی طرح فیاض علی ایڈووکیٹ کے دوناول ''شمیم'' اور''انور'' جنہیں پڑھنے کا اس زمانے میں فیشن تھا۔منشی نول کشور کی چھپائی ہوئی ''الف لیلہ'' بھی انھیں کی تھی۔

ان کہانیوں اور ناولوں کو پڑھنے کے ساتھ ہی میری دلچسپی تاریخ سے گہری ہوتی چلی گئی۔اس دل چسپی کا سبب والدہ کی ایک خستہ حال کتاب ''قدیم تہذیبیں'' بنی۔اس کے ابتدائی صفحے پھٹے ہوئے تھے اور کتاب مصر کے تذکرے سے شروع ہوئی تھی اور اس میں درج باتیں کہانیوں سے زیادہ دلچسپ تھیں۔اس کے بعد علامہ شبلی نعمانی' مولانا سید صباح الدین عبدالرحمان' سید سلیمان ندوی' کی کتابیں اور اس کے ساتھ ہی مولانا عبدالحلیم شرر' صادق حسین سردھنوی' خان محبوب طرزی اور نسیم حجازی کے تاریخی ناول پڑھے' ان ناولوں میں سے شاید ہی کوئی مجھ سے چھوٹا ہو۔اسی دوران دس گیارہ سال کی عمر میں مجھے جاسوسی ناول پڑھنے کا چسکا لگ گیا۔اس کی ابتدا ظفر عمر کی ''نیلی چھتری'' اور تیرتھ رام فیروز پوری کے ترجموں ''اسرار دربار لندن' آتشیں کتا' آرسین لوپن کے کارنامے' اور' آرسین لوپن کی واپسی'' سے ہوئی۔اس کے بعد ابن صفی اور اکرام الہ آبادی کا ہر ناول پڑھ ڈالا۔ان ہی دنوں چند ایسے عمدہ ناول زیر مطالعہ آئے جو مولوی عنایت اللہ دہلوی نے انگریزی سے ترجمہ کیے تھے۔جن میں ''تائیس''سلامبو''عذرا'' اور''عذرا کی واپسی'' سرفہرست ہیں۔''عذرا'' اور''عذرا کی واپسی'' دو ایسی کتابیں ہیں جو بہت دنوں میرے حواسوں پر طاری رہیں' میں نے ان دونوں کو بعد میں انگریزی میں پڑھا لیکن اردو ترجمے والا لطف نہیں آیا۔ان ہی دنوں مجھے سر آرتھر کانن ڈائل کو پڑھنے کا شوق ہوا اور کانن ڈائل کی تمام مختصر کہانیاں اور ناول پڑھ ڈالے''شرلاک ہومز'' کا کردار مجھے کس قدر عزیز رہا ہوگا اس کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ 1987ء میں بی بی سی میں کام شروع کیا تو بیکر اسٹریٹ کا پھیرا لگایا۔2007ء میں جب دوبارہ لندن گئی تو 20 برس بعد ایک بار پھر بیکر اسٹریٹ میں اس گھر کی سیر کو گئی جسے سر آرتھر کانن ڈائل نے اپنے بے مثال کردار شرلاک ہومز اور اس کے ساتھی ڈاکٹر واٹسن کا گھر بتایا تھا اور جہاں لگ بھگ ایک صدی سے شرلاک ہومز کلب قائم ہے۔تاریخ کے شوق نے مجھ سے ہیرلڈ لیمب کے تاریخی ناولوں کے ترجمے پڑھوائے اور وہ ناول جو ترجمہ نہیں ہوئے تھے انھیں میں نے انگریزی میں پڑھا۔

جون گنتھر' ابن خلدون' مولانا غلام رسول مہر' رئیس احمد جعفری' ٹوائن بی اور ول دیوراں' ڈی ڈی کوسمبی' بشام' پرسیول اسپیئر' رومیلا تھاپر اور دوسروں کی باری تو بہت بعد میں آئی۔ تاریخی ناولوں سے ہٹ کر تاریخ عالم پڑھنے کی طرف مجھے پنڈت نہرو کی کتاب Glimpses

of the World History نے مائل کیا جسے والد نے نصاب کی طرح پڑھایا تھا۔ معین الحق صاحب کی ''قدیم مشرق'' اور سبط حسن صاحب کی کتابوں نے تاریخ کی دوسری کتابیں پڑھنے کی راہ دکھائی۔

مطالعے کے حوالے سے زندگی کے کئی دور رہے۔ نویں میں آئی تو اس وقت بہ آسانی روسی ادیبوں کے ناولوں کے ترجمے دست یاب تھے۔ ان میں ٹالسٹائی' ترگنیف' چیخوف' پشکن' دوستو وسکی' نکولائی آسترا وسکی' سے لے کر چنگیز آیتماتوف اور اس کے بعد کے جدید روسی ادیبوں کو پڑھنے کا موقع ملا۔ لاہور سے 'مادام بوواری' ہمیں چراغ ہمیں پروانے' بڑھا گوریو' اور 'انسانی تماشا' کے علاوہ دوسرے فرانسیسی اور انگریزی ناولوں کے ترجمے چھپ رہے تھے۔ مکتبۂ فرینکلن والے امریکی ادب ترجمہ کروا کے شائع کر رہے تھے۔ کتابیں اب پہلے سے کہیں زیادہ چھپتی ہیں لیکن معیار کا معاملہ کہیں دور رہ گیا ہے۔

میٹرک تک پہنچی تو زندگی میں کارل مارکس اور اینگلز داخل ہو چکے تھے۔ انھوں نے چیزوں کو دیکھنے کا ایک نیا زاویہ دیا۔ اس کے ساتھ ہی ایلیڈ اور اوڈیسی سے تعارف ہوا جس کے بعد یونانی اضامیات میں دل چسپی پیدا ہوئی۔ Edith Hamiltion اور Bull Finch کی کتابوں نے ایک نئی دنیا سے آشنا کیا۔ جس کے بعد وہ دور آتا ہے جس نے سارتر' سیمون دی بورا' کافکا' کامیو اور ان گنت دوسروں سے ملاقات کرائی۔ ادب اور تاریخ دونوں ایسے موضوعات ہیں کہ رگ و پے میں سرایت کر جاتے ہیں۔ یا شاید یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ ہمیں جس موضوع سے دل چسپی ہو وہی ہمارا اوڑھنا بچھونا بن جاتا ہے۔

سیاست سے متعلق کتابیں پڑھنے کا سلسلہ جاری رہتا تھا لیکن 1988ء سے جب میں نے اخباری کالم لکھنے شروع کیے تو عالمی سیاست' انسانی حقوق اور دوسرے بنیادی سماجی موضوعات پر لکھی جانی والی رپورٹوں اور کتابوں سے دل چسپی میں اضافہ ہوا۔ اخبار پڑھنے کی عادت 6 برس کی عمر سے ہوگئی تھی لیکن اب 22 برس سے یہ عادت میری کالم نگاری کی وجہ سے کہیں زیادہ راسخ ہوگئی ہے۔ اب میں روزانہ اردو اور انگریزی کے کم سے کم 6 اخبار ضرور دیکھتی ہوں۔ ''دیکھتی ہوں'' میں نے اس لیے کہا کہ خبریں سرسری طور پر لیکن کچھ کالم پابندی سے پڑھتی ہوں۔ انگریزی اخباروں میں پڑھنے کے لیے زیادہ سامان ہوتا ہے' کالم نگار کے لیے حالات حاضرہ سے واقفیت لازمی ہے اور اسی بنیاد پر بین الاقوامی سیاست اور سماجی مسائل سے متعلق رسائل وجرائد کا مطالعہ ضروری ہو جاتا ہے اور اب اس میں غیر ملکی اخباروں کے انٹرنیٹ ایڈیشن کا اضافہ ہو گیا ہے لیکن پابندی سے نہیں۔ اردو کے علاوہ میری پہنچ صرف انگریزی تک ہے۔

میں یہ تو نہیں کہہ سکتی کہ اردو یا انگریزی میں میرا مطالعہ وسیع ہے لیکن اب پچیس، تیس برس سے انگریزی کتابیں زیادہ پڑھی ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ انگریزی میں شائع ہونے والی کتابیں کہیں زیادہ متنوع اور معیاری ہیں۔

آپ نے ایک ہی سانس میں بہت سی باتیں پوچھ لی ہیں۔ میرے خیال میں عمر کے ساتھ پسندیدگی اور ترجیحات بدلتی رہتی ہیں۔ مثال کے طور پر علامہ شبلی نعمانی کی ''شعر العجم'' آج بھی میری محبوب کتابوں میں ہے لیکن ''المامون'' اب متاثر نہیں کرتی۔ علامہ نیاز فتح پوری کی ''من و یزداں'' ذہن پر جس طرح اثر انداز ہوئی، وہ اثرات ''کیوپڈ اور سائیکی'' نے مرتب نہیں کیے۔ اردو ادب کی طرف آیئے تو قرۃ العین حیدر کا ''آگ کا دریا'' ''آخرِ شب کے ہم سفر'' ''سیتا ہرن'' اور ''اگلے جنم موہے بٹیا نہ کیجیو'' پڑھنے کا بار بار جی چاہتا ہے۔ منٹو، عصمت اور کرشن چندر کے افسانے سالہا سال پہلے پڑھے تھے لیکن ان میں سے کئی آج تک بھلائے نہ جا سکے۔ عصمت کا افسانہ ''ننھی کی نانی'' میرے ذہن پر نقش ہے۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ زندگی میں میری ملاقات بھی ''ننھی'' سے ہوئی اور اس کی بربادی میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے جب کہ اسے برباد کرنے والے عمر میں اس سے پچاس برس بڑے تھے۔ ان کے کرتوتوں کے بارے میں سب جانتے تھے لیکن وہ زندگی کی آخری سانس تک محترم رہے، ان کی تہجد گذاری کی مثالیں دی جاتی رہیں۔ اور ''ننھی'' نیچ اور بدذات تھی، دھتکاری گئی۔ شاید عورت کے حقوق اور اس پر ہونے والے ظلم کے خلاف لکھنے اور بولنے کا سبب لاشعوری طور پر یہ افسانہ اور اس کے کردار کا زندگی میں مل جانا بنا۔ ہمارے یہاں مرزا عظیم بیگ چغتائی کا سنجیدگی سے مطالعہ نہیں کیا گیا، ورنہ سچ تو یہ ہے کہ انہوں نے عورت کے حقوق اور اس کے مسائل کے بارے میں بہت کچھ لکھا۔

Will Durant اور Arial Durant کی The Story of Civilization نے مجھے زمانوں اور زمینوں سے آشنا کیا۔ ان دونوں نے مختلف براعظموں اور ان میں سانس لینے والی اقوام کی تہذیبی، ثقافتی، علمی اور ادبی تاریخ کو جس طرح اپنی اس کتاب کی مختلف جلدوں میں سمیٹا ہے۔ وہ کوزے میں دریا بند کرنے کے مترادف ہے۔

''عہد نامۂ قدیم'' کے متعدد ابواب مجھے متاثر کرتے ہیں جن میں ''غزل الغزلات'' ''زبور'' ''یرمیاہ'' اور ''نوحہ'' میرے محبوب ابواب ہیں۔

جہاں تک پسندیدہ رسائل کا تعلق ہے تو ان میں ''عصمت'' ''نگار'' ''نقوش'' ''ادبی دنیا'' ''نیا دور'' ''سیپ'' ''فنون'' اور ''اوراق'' سرفہرست رہے۔ اب بھی اچھے رسائل نکلتے ہیں لیکن وہ بہت باقاعدہ نہیں ہوتے اور بعض میں معیار کا اس طرح خیال نہیں رکھا جاتا۔ گزشتہ دس

پندرہ برس سے چند اچھے پرچے نکل رہے ہیں جن میں ''ارتقا''''مکالمہ'' ''دنیا زاد'' ''آج'' ''آئندہ''''موبتاج''''سخن زار'' نظر سے گزرتے ہیں۔''آثار'' ایک اچھا پرچہ تھا لیکن بند ہو گیا۔ شاید 76ء یا 77 کا سال تھا جب مرحوم حکیم سعید نے یونیسکو کا رسالہ Courior اردو میں ''پیامی'' کے نام سے شائع کرنا شروع کیا۔ اس کے موضوعات کا تنوع حیران کن تھا۔ چکنے کاغذ پر رنگین طباعت کے ساتھ ایسا پرچہ آج تک اردو میں کبھی نہیں نکلا۔ اس کے سرورق پر ''کاشفِ حالاتِ جہاں'' لکھا ہوا ہوتا تھا۔ حکیم صاحب کا یہ ایک بڑا کارنامہ تھا لیکن وہ رسالہ جو دنیا کی متعدد زبانوں میں آج بھی شائع ہوتا ہے۔ وہ اردو والوں کو راس نہ آیا۔ اس کی قیمت صرف 4 یا شاید 5 روپے تھی لیکن کوئی اسے خریدنے کو تیار نہ تھا۔ آخر کار کئی برس بعد حکیم صاحب اسے بند کرنے پر مجبور ہوئے۔ اس رسالے کی رحلت کا مجھے آج بھی صدمہ ہے۔

میرے پسندیدہ افسانہ نگاروں میں کئی لوگ شامل ہیں۔ ان میں قرۃ العین حیدر، عزیز احمد، منٹو اور قاضی عبدالستار کا ذکر بہ طور خاص کروں گی۔ کالم نگاروں میں ابراہیم جلیس، ابن انشاء، مجید لاہوری اور انعام درانی پسند رہے۔ مزاح نویسوں میں کنہیا لال کپور اور شوکت تھانوی کا نام لوں گی۔

یہ ایک مشکل سوال ہے زندگی میں کوئی ایک نہیں بہت سی کتابیں اور مصنفین ذہن پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ کم سے کم اپنے بارے میں یہی کہہ سکتی ہوں کہ اگر عمر کے ساتھ ساتھ مطالعہ جاری رہے تو یوں بھی ہوتا ہے کہ اچانک کوئی کتاب آپ کو گرفتار کر لیتی ہے۔ ہیروشیما پر بم گرانے والے پائلٹ میجر کلاڈ ایتھرلے اور آسٹریا کے دانش ور گنتر اینڈرز کے خطوط کے مجموعے کا نام Burning Conscience ہے۔ اس کا ابتدائیہ برٹرینڈ رسل نے لکھا ہے۔ اس کتاب نے مجھے اپنی بنیادوں سے ہلا کر رکھ دیا اور اس کے بعد ایٹمی تباہ کاریوں کے بارے میں کتابیں پڑھیں۔ میں یہی کہہ سکتی ہوں کہ جنگ دشمنی میرے اندر رسل کی کتاب ''ویت نام میں امریکی جنگی جرائم'' اور ایٹمی ہتھیاروں سے نفرت میجر کلاڈ ایتھرلے کے خطوط کے مجموعے نے راسخ کی۔ شاید یہ کہنا غلط نہ ہو کہ ان کتابوں نے مجھے ایک اداس انسان بنا دیا۔ اس کے بعد میں نے ایسی کئی کتابیں پڑھیں جن سے اداسی میں اضافہ ہوا اور اس بات کا احساس ہوا کہ ایک لکھنے والے کے طور پر مجھے جنگ مخالف ہونا چاہیے۔ ویسے ایٹمی ہتھیاروں اور جنگ سے نفرت کا ابتدائی بیج جالب صاحب کی ایک نظم نے بویا تھا جو بچوں کے رسالے ''بھائی جان'' میں شائع ہوئی تھی۔ بہت کم عمری میں ہندو اور بہ طور خاص راجپوت تہذیب و ثقافت کے نقش ذہن پر عظیم بیگ چغتائی کے افسانے ''مہارانی کا خواب'' اور ''سوانہ کی روحیں'' سے مرتب ہوئے۔ اس کے بعد راہل سنکرتائین کے ناول ''وولگا

سے گنگا'' نے آریائی تہذیب سے متعلق کیا۔ اور پھر پندرہ برس کی عمر میں ''آگ کا دریا'' نے ہندوستان کی عظیم تہذیب سے متاثر ہونے کا دائرہ مکمل کر دیا۔ اردو میں ''آگ کا دریا'' کو میں اپنی زندگی کا اہم ترین ناول کہہ سکتی ہوں۔ اس کا صدیوں پر پھیلا ہوا کینوس' وقت کے حوالے سے اس میں اٹھائے جانے والے سوالات' انسان کی مطلق بے بسی' جلاوطنی' بے سمتی اور بے زمینی۔ تہذیبوں کا ابھرنا اور ڈوبنا' حوادث کا سیل رواں اور اس پر تنکے کی طرح ڈولتے ہوئے انسان۔ اگر میں یہ کہوں تو مبالغہ نہ ہوگا کہ میں نے آگ کے اس دریا میں خود کو ڈوبتے ہوئے محسوس کیا ہے۔

بارہ تیرہ برس کی عمر تھی جب والد نے اپنی کتابوں میں سے Harriet Beecher Stowe کی ''انکل ٹامس کیبن''، ایڈولف ہٹلر کی ''مین کامف'' اور پنڈت نہرو کی Glimpses of the World History نصاب کے طور پر پڑھائیں۔ ان کا طریقہ یہ تھا کہ جس کتاب کو پڑھا رہے ہوتے اس کے کم سے کم پانچ چھ صفحے روزانہ پڑھنے پڑتے تھے۔ اس کے بعد ان کے بارے میں سوال کرتے جن کے جواب دینے ہوتے تھے۔ اپنی بیٹی اندرا پریہ درشنی کے نام پنڈت جی کے خطوط مجھے بہت بھائے اور دنیا کی تاریخ مجھے قصہ کہانی لگی۔ ''انکل ٹامس کیبن'' نے رُلا دیا اور نسل پرستی کے فلسفے سے آگاہی ہوئی ''مین کامف'' میں نے روتے پیٹتے اس لیے پڑھی کہ والد کے انتخاب کو رد کرنے کی بھلا کس کو مجال تھی۔ انھیں ہٹلر بہت پسند تھا جب کہ مجھے اس سے نفرت تھی۔ میں اس کے بارے میں چند کتابیں پڑھ چکی تھی۔ ہٹلر اور اس کے فاشزم کے فلسفے نے یہ سمجھایا کہ تہذیبیں اور قومیں اگر فاشزم کو اختیار کر لیں تو کس طرح غارت ہو جاتی ہیں۔

کتابوں سے میری جنون کی حد کو پہنچی ہوئی وابستگی کا مختصر احوال برادرم سید قاسم محمود نے 1964ء کے ''سیارہ ڈائجسٹ'' کے کسی شمارے میں لکھا تھا۔ ان دنوں وہ اس کے مدیر تھے اور لوگوں کے مطالعے کی عادات کے بارے میں سروے کر رہے تھے اپنے پرچے میں انہوں نے ایک سوال نامہ شائع کیا جسے میں نے بھی پُر کر کے بھیجا تھا۔ ان ہی دنوں وہ کراچی آئے تو ہمارے گھر آئے۔ شاید وہ میرے جوابات کی تصدیق کرنے آئے تھے۔ وہ سوال و جواب وقت کی گرد میں کہیں کھو گئے لیکن ان سے جو گھریلو تعلقات استوار ہوئے وہ آج تک قائم ہیں۔

میں آپ سے عرض کروں کہ پسندیدہ مصنفین کی فہرست وقت کے ساتھ ساتھ بدلتی رہتی ہے۔ رابندر ناتھ ٹیگور اور نیاز فتح پوری کی تحریروں نے مجھے ابتدائی عمر میں بہت متاثر کیا کسی زمانے میں رائیڈر ہیگرڈ اور آرتھر کانن ڈائل پسند تھے تو بعد میں فرانسیسی اور روسی ادیب عزیز ہو گئے۔ ''انا کرنینا'' سولہ برس کی عمر میں بھی اچھی لگتی تھی۔ آج پڑھتی ہوں تب بھی دل کا وہی عالم ہوتا ہے۔ بعد کے زمانوں میں پاسترناک اور سولزے نتسن بہت اچھے لگے۔ ارنسٹ ہیمنگوے

مارک ٹوائن، آسکر وائلڈ اور موپساں کی کہانیوں نے دل کو موہ لیا۔ بہ طور خاص ہیمنگوے کے ناول A Farewell to Arms نے۔ ایک زمانے میں Gone with the Wind بہت پسند تھی۔ مجھے سائنس فکشن نے بھی بہت لبھایا ہے۔ آئزک آئزاموف، آرتھرسی کلارک، ایچ جی ویلز۔ جیمز ہلٹن کا ناول Lost Horizon کارل ساگاں کی ''کاسموس'' اور ''Brocas Brain'' عالم تحیر میں غرق کر دینے والی یہ کتابیں کیسے کیسے سوال اٹھاتی ہیں۔ ایسے سوال جن میں سے بہت سوں کے جواب ابھی ہمیں نہیں معلوم۔ ان کے جواب شاید ہماری اگلی نسلوں کو ملیں گے۔ مجھے یقین ہے کہ آنے والے زمانے جہاں پرانے زمانوں میں اٹھنے والے سوالوں کا جواب ساتھ لائیں گے۔ وہیں اس دور کی نسل انسانی کے سامنے نئے سوالات کے انبار لگا دیں گے۔

گلبرٹ ہائٹ کی کتاب Man,s Unconquerable Mind کا اردو ترجمہ ''ناقابل تسخیر ذہن انسانی'' اور سوفو کلیز کے ڈرامے ''اینٹی گنی'' نے ذہن کو بہت سے معاملات پر سوچنے کے لیے مائل کیا۔ بہ طور خاص ''اینٹی گنی'' نے میرے اندر طاقت اور جبروت کے خلاف مقاومت اور مزاحمت کا رویہ پیدا کیا۔ جہاں تک اردو کتابوں کا تعلق ہے تو ''مکالمات افلاطون'' کا ترجمہ ڈاکٹر سید عابد حسین نے کیا ہے۔ اس کے دو ابواب نے مجھ پر بہ طور خاص گہرا اثر چھوڑا۔ ان میں سے ایک ''کرائٹو'' ہے اور دوسرا ''معذرت'' یہ دونوں باب سقراط پر چلنے والے مقدمۂ عدالت کے سامنے اس کے جواب اور اس کی زندگی کے آخری لمحات کا قصہ ہیں۔ انہیں پڑھ کر سقراط کی بڑائی کا اندازہ ہوتا ہے۔ موت سے اس کی بے اعتنائی جان بچانے کے لیے شاگردوں کی کوششوں کو ناپسند کرنا، فرار کی تجویز کو مسترد کر دینا اور زہر کے پیالے کو مسکرا کر پی لینا، یہ وہ معاملات ہیں جو اس کا قامت دیوتاؤں سے بلند کر دیتے ہیں۔ ان ہی دنوں کسی امریکی خاتون کا لکھا ہوا ناول ''سقراط'' بھی پڑھا تھا جو ترجمہ تھا اور لاہور سے چھپا تھا۔ پلوٹارک کی ''مشاہیر یونان وروما'' سلطنت روما میں غلاموں کی شان دار بغاوت پر ہاورڈ فاسٹ کا ناول ''اسپارٹکس'' ''واشنگٹن ارونگ کی ''قصص الحمراء'' جسے شاید ابن انشاء نے ترجمہ کیا تھا۔ مسز عبدالقادر کے طویل پراسرار افسانے۔ آٹھویں کلاس میں مجھے اسکول کی بہترین مضمون نگار قرار دیا گیا تھا انعام میں خلیل جبران کی ''اشک وتبسم'' ملی۔ جبران کی اس کتاب کو پڑھنے کے بعد میں نے ڈھونڈ کر اس کی ترجمہ شدہ تمام کتابیں پڑھ ڈالیں، اس کی زندگی پر بشیر ہندی نے جو کتاب لکھی تھی، وہ بھی پڑھی جس سے اندازہ ہوا کہ جبران کی شخصیت اور افکار کا پس منظر کیا تھا۔

''مراۃ العروس'' کی اصغری اپنی تعلیم اور ذہانت کے بل بوتے پر اپنی اور اپنے اردگرد رہنے والیوں کی، حد تو یہ ہے کہ اپنے گھر کے مردوں کی زندگی بدل دیتی ہے، وہ 1860ء یا 1865ء

کے آس پاس ہمیں دلی سے سیالکوٹ کا سفر کرتی نظر آتی ہے تاکہ وہ اپنے شوہر محمد کامل کو غلط دوستوں کی صحبت سے بچا سکے۔ یہ انیسویں صدی کا قصہ ہے جب کہ ہماری عورت اپنی تقدیر پر صابر و شاکر تھی اور اس کی بھاری اکثریت کو تعلیم سے محروم رکھا جاتا تھا۔ ''مراۃ العروس'' میری زندگی کا پہلا قصہ ہے جو میں نے پڑھا۔ 1926ء کا چھپا ہوا یہ نسخہ میری والدہ کا تھا جو انھوں نے مجھے دیا اور آج بھی پاس موجود ہے۔ اسے میں نے نہ جانے کتنی مرتبہ پڑھا۔ ڈپٹی نذیر احمد مرحوم کی قبر نور سے بھری رہے۔ اس قصے کی ابتداء میں انھوں نے ایک جملہ لکھا ہے کہ ''لکھنا ایک ہنر ہے جو ضرورت کے وقت بہت کام آتا ہے۔'' ان کا یہ جملہ میرے دل پر جیسے نقش ہو گیا تھا اور سچ یہ ہے کہ میری زندگی اسی ہنر کے سہارے گزری۔

''مراۃ العروس'' کے بعد جس کتاب نے بچپن میں متاثر کیا وہ ''قصص الانبیاء'' تھی وہ بھی والدہ کی تھی۔ کیا کتاب ہے اور کیا اس کی کہانیاں ہیں۔ تخیل کی پرواز کا جواب نہیں۔ یہ بیان کہ ''قلم'' خدا کے نور سے پیدا ہوا۔ بدن میں ایک سنسنی پیدا کرتا تھا۔ تختی لکھتے ہوئے مجھے یقین ہوتا تھا کہ کسی روز میرے سرکنڈے کے قلم سے خدا کا نور پھوٹے گا اور ہر طرف روشنی پھیل جائے گی۔ اسی میں ایک جگہ پڑھا کہ ایک گائے ہے جس کے کئی ہزار سینگ ہیں اور ایک سے دوسرے سینگ کا فاصلہ سینکڑوں میل کا ہے اور وہ گائے مچھلی کی پشت پر کھڑی ہے اور اس گائے کے ایک سینگ پر دنیا رکھی ہے۔ ''قصص الانبیا'' میں تخیل کی فراوانی اور جملوں کی روانی اس قدر تھی کہ اس میں ڈوب جانے کے سوا اور کچھ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ برسوں بعد جب میں نے سائنس فکشن پڑھنا شروع کیا تو کئی مرتبہ قصص الانبیاء یاد آئی۔

اسی طرح شیکسپیئر کا مشہور ڈرامہ ''مرچنٹ آف وینس'' اس ڈرامے کے ایک بنیادی کردار بسانیو کو پورشیا سے عشق ہے، جو امیر زادی ہے۔ وہ اس سے شادی کرنے کے لیے اپنے دوست انتونیو سے تین ہزار اشرفیاں قرض مانگتا ہے۔ انتونیو ایک مشہور سوداگر ہے لیکن اس وقت اس کے پاس رقم موجود نہیں کیونکہ اس کے جہاز سامان تجارت لے کر گئے ہیں۔ وہ شہر کے مشہور سود خور شائیلاک سے اس شرط پر قرض لیتا ہے کہ اگر اس نے رقم مقررہ وقت پر واپس نہ کی تو وہ انتونیو کے بدن سے ایک پونڈ گوشت کاٹ لے گا۔ پورشیا اور بسانیو ہنسی خوشی زندگی گزار رہے ہیں، اتنے میں خبر آتی ہے کہ انتونیو کے جہاز تباہ ہو گئے ہیں اور سارا سامان تجارت ڈوب گیا ہے۔ شائیلاک مقررہ تاریخ پر رقم نہ ملنے کے سبب انتونیو سے بدن کے ایک پونڈ گوشت کا مطالبہ کرتا ہے۔ مقدمہ عدالت میں پہنچتا ہے جسے لڑنے کے لیے پورشیا بھیس بدل کر عدالت میں آتی ہے۔ شائیلاک سے رحم کی اپیل کرتی ہے اور جب وہ اس کی بات نہیں سنتا تو وہ کہتی ہے کہ تمھارا دعویٰ سچا

ہے تم انتونیو کے بدن سے ایک پونڈ گوشت لے سکتے ہو لیکن شرط یہ ہے کہ انتونیو کے بدن سے لہو کی ایک بوند نہ نکلے۔ اور نہ گوشت کا وہ ٹکڑا ایک پاؤنڈ سے ایک رتی زیادہ ہو۔ شائیلاک مقدمہ ہار جاتا ہے۔ اس وقت یہ راز کھلتا ہے کہ اتنا مشکل مقدمہ جیتنے والا وکیل دراصل انتونیو کے دوست بسانیو کی ذہین اور حسین بیوی پورشیا ہے۔

شیکسپیئر کے اس ڈرامے نے مجھے سحر زدہ کر دیا تھا۔ اس نے میٹرک میں ہی کئی باتیں سمجھا دی تھیں۔ ایک یہ کہ انگلستان جسے ہمارے یہاں ایک مثالی ملک سمجھا جاتا تھا وہاں بھی ذہین عورت کو اپنی صلاحیتیں ثابت کرنے کے لیے مرد کا بہروپ بھرنا پڑتا تھا۔ دوسرا یہ کہ ذہانت سب سے بڑی دولت ہے۔ موسم ناسازگار ہو تو سامانِ تجارت لے جانے والے جہاز سمندر میں ڈوب جاتے ہیں۔ لیکن اگر عورت یا مرد پڑھے لکھے ہوں، کسی بیماری میں مبتلا نہ ہوں تو ذہانت ایک ایسا خزانہ ہے جو کبھی ختم نہیں ہوتا۔ اس ڈرامے کو پڑھ کر میرا جی چاہا تھا کہ میں پورشیا جیسی ہو جاؤں جس نے ایک ہارا ہوا مقدمہ جیت لیا تھا۔ آج بھی جب کسی ناول یا فلم میں عدالت کا منظر پڑھتی یا دیکھتی ہوں تو مجھے پورشیا یاد آتی ہے۔

والد کے پاس ''رباعیات سرمد'' اور اس کا منظوم اردو ترجمہ تھا۔ تقسیم سے پہلے کا چھپا ہوا۔ اس میں ''سوانح سرمد شہید'' مولانا ابوالکلام آزاد کی لکھی ہوئی تھی۔ آزاد کی اس تحریر نے مجھے بے پناہ متاثر کیا۔ شہنشاہی کے سامنے ایک مجذوب کی کج کلاہی سر دے کر کس طرح سربلند ہوتی ہے، یہ میں نے اس تحریر سے جانا۔ اسی طرح والد نے ''شعر العجم'' پڑھاتے ہوئے مجھے فردوسی کی وہ جو پڑھائی تھی جو اس نے شاہ نامہ لکھنے کے بعد سلطان محمود غزنوی کی بے اعتنائی اور وعدہ خلافی سے دل شکستہ ہو کر لکھی تھی۔ 17 مرتبہ ہندوستان پر حملے کرنے اور یہاں کی دولت سمیٹ کر لے جانے والا محمود چند اشعار پر مشتمل اس ہجو کے ایک شعر تو دور کی بات ہے، اس کے ایک مصرعے کو بھی شکست نہ دے سکا اور اس ہجو میں ''عجم زندہ کردم بدیں پارسی'' کا دعویٰ کرنے والا فردوسی دنیا کے عظیم ترین شاعروں میں شمار ہوتا ہے۔ آج بھی اس ہجو کے شعر کسی وقت یاد آجائیں تو بدن میں سنسنی سی دوڑ جاتی ہے اور اس بات پر یقین راسخ ہو جاتا ہے کہ ''قلم گوئید کہ من شاہ جہانم''۔ میٹرک کے انگریزی نصاب میں ایک نظم "Casabianca" تھی جس کی پہلی سطر The boy stood on the burning deck تھی۔ یہ نظم ہمیں اسکول کی پرنسپل مس ستارہ جبیں جعفری نے پڑھائی تھی جو مشہور شاعر علی سردار جعفری کی عزیزہ تھیں۔ اسے پڑھاتے ہوئے انہوں نے ہم میں سے بیشتر کو رلا دیا تھا اور خود بھی روتی رہی تھیں۔ ایک لڑکا ہے جس کا کپتان باپ اسے جہاز کے عرشے پر کھڑا رہنے کے لیے کہہ گیا ہے۔ جہاز آگ کے شعلوں میں لپٹا ہوا ہے۔ سب اپنی جان بچانے

کے لیے کشتیوں میں کود رہے ہیں لیکن وہ لڑکا اپنی جگہ پر کھڑا ہے اور باپ کے اگلے حکم کا منتظر ہے اور نہیں جانتا کہ باپ مارا جا چکا۔ فرض شناسی اور دلاوری کی جو کیفیت اس نظم میں ہے وہ دل کے ٹکڑے بھی کرتی ہے اور اس لڑکے کی طرح زندہ رہنے اور مر جانے پر اکساتی ہے۔ اس نظم نے میری زندگی پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ یہ نظم برطانوی شاعرہ فیلیسیا ہیمانز کی لکھی ہوئی تھی۔

اسی طرح مولانا ابوالکلام آزاد کی وہ تاریخی تقریر پڑھ کر بھی دل پر بے حد اثر ہوا۔ جو انھوں نے پاکستان بننے کے فوراً بعد جامع مسجد دہلی میں حواس باختہ اور پراگندہ خاطر مسلمانوں کے سامنے کی تھی اور جو شاید سننے والوں میں سے کئی کے لیے اس پرُ آشوب دور میں ایک بڑا اخلاقی سہارا ثابت ہوئی ہو۔ جوش صاحب کی نظم ''ایسٹ انڈیا کمپنی کے سوداگروں سے خطاب'' نے برطانوی استعمار کے حوالے سے قوم پرستی راسخ کی۔ عصمت چغتائی کا افسانہ ''ننھی کی نانی'' اور قرۃ العین حیدر کا ''جلاوطن'' اور ''اگلے جنم موہے بٹیا نہ کیجو'' دل پر ایسی خراشیں ڈال گئے جن کی تکلیف آج بھی محسوس ہوتی ہے۔

ابھی تک تمام باتیں نثری ادب کے حوالے سے ہوئی ہیں جب کہ آپ نے نظموں کے بارے میں بھی پوچھا ہے۔ اس بارے میں یہ عرض کروں کہ بچپن میں والد نے ''مسدس حالی'' ''شکوہ'' ''جواب شکوہ'' اور ''مسجد قرطبہ'' حفظ کرائیں۔ ان نظموں میں ''مسدس حالی'' سب سے طویل تھی اور ایک زمانے تک اس کے بند کے بند یاد تھے اور اب بھی اس کے مصرعے یاد آ جاتے ہیں۔ عروس البلاد بغداد پر جب امریکا اور اتحادیوں نے پہلا حملہ کیا تو ہفتوں ''مسدس'' کے یہ اشعار دل کو بے قرار کرتے رہے کہ

وہ بلدہ کہ فخر بلاد جہاں تھا
تر و خشک پر جس کا سکہ رواں تھا
اڑا لے گئی بادِ پندار جس کو
بہا لے گئی سیلِ تاتار جس کو

میر انیس کے مراثی مجھے بہت محبوب رہے ہیں۔ ان میں سے ''جب نو جواں پسر شہ دیں سے جدا ہوا'' اور

آج شبیر پہ کیا عالم تنہائی ہے
ظلم کی چاند پہ زہرا کے گھٹا چھائی ہے

میرے پسندیدہ مرثیے ہیں۔ ان کا بے مثال سلام

سدا ہے فکر ترقی بلند بینوں کو

ہم آسمان سے لائے ہیں ان زمینوں کو

خیال خاطر احباب چاہیے ہردم

انیس ٹھیس نہ لگ جائے ان آب گینوں کو

آج بھی انیس کے اس سلام کا کوئی شعر یاد آ جائے تو دل بے قرار ہو جاتا ہے۔

اقبال کی ''مسجد قرطبہ'' نے بہت متاثر کیا۔اس میں وقت کے سیل رواں کو جس طور پر بیان کیا گیا ہے وہ بھلایا نہیں جا سکتا

سلسلۂ روز و شب نقش گرِ حادثات

سلسلۂ روزو شب اصل حیات وممات

تیرے شب وروز کی اور حقیقت ہے کیا

ایک زمانے کی رو جس میں نہ دن ہے نہ رات

اسے پڑھتے جایئے یوں محسوس ہوتا ہے کہ لفظ گرم موم کی طرح پگھل کر وقت کی دھارا میں بہہ رہے ہیں۔اردو میں روزنامہ ''ایکسپریس'' ''جنگ'' اور ''آج کل''۔ انگریزی میں ''ڈان''، ''نیوز'' اور ''ڈیلی ٹائمز'' ان اخبارات کا مطالعہ روزانہ ڈھائی سے تین گھنٹے لے لیتا ہے۔

اگر سفر دو ڈھائی گھنٹوں کا ہو تو اخبارات پڑھتی ہوں لیکن اگر یورپ' امریکا یا ایسا ہی کوئی لمبا سفر درپیش ہو تو انگریزی کا کوئی دل چسپ ناول یا خودنوشت ساتھ لے جاتی ہوں۔

میں صبح سویرے یا پھر رات کو پڑھتی ہوں۔اس میں وقت کی کوئی پابندی نہیں ہوتی کیونکہ رات تو اپنی ہوتی ہے۔کبھی کبھی ڈھائی تین بھی بج جاتے ہیں۔اردو کتاب پڑھنے کی رفتار تیز ہوتی ہے انگریزی کتاب کے پڑھنے کی رفتار نسبتاً کم ہوتی ہے۔

ایک زمانہ تھا کہ حافظہ بہت تیز تھا لیکن اب وہ پہلی سی بات نہیں رہی' اس کے باوجود کتابوں کے اور مصنفین کے نام عموماً یاد رہتے ہیں۔مضامین لکھنے والوں کے نام بعض اوقات ذہن سے نکل جاتے ہیں میرے لیے تنہائی اور خاموشی مطالعے کے لیے بنیادی شرط تو نہیں ہے لیکن اگر تاریخ یا سماجی علوم کی کوئی خاص کتاب پڑھ رہی ہوں تو اس کے لیے اردگرد سکون اور خاموشی کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ توجہ نفسِ مضمون پر مرکوز رہے۔

کتاب پر نشان لگانے اور اس کے حاشیے پر لکھنے کی عادت والد کو تھی۔ان کی کتابوں کے حاشیے عموماً سیاہ رہتے۔افسوس کہ میں نے ان سے یہ عادت نہیں سیکھی۔ میں کتابوں کے نوٹس بھی نہیں بناتی۔اب احساس ہوتا ہے کہ اگر ایسا کرنے کی عادت ہوتی تو بہت فائدے میں رہتی۔ خلاصہ لکھنے کا شوق نہیں رہا۔

میں نے بچوں کی راہ نمائی کی اپنی سی کوشش ضرور کی لیکن آج کے بچوں کی دل چسپیاں بے شمار ہیں۔ ریڈیو، ٹیلی ویژن، کمپیوٹر اور اب موبائل پر میسجنگ۔ تاہم میری بیٹیوں فینانہ اور سحینا کو اردو اور انگریزی کے ناول پڑھنے کا شوق ہے۔ سحینا پابندی سے مطالعہ کرتی ہے۔ بیٹے زریون کو صرف انگریزی کی کتابیں پڑھنے سے دل چسپی ہے، وہ بھی وائلڈ لائف، ماحولیات یا بزنس کے موضوعات پر۔ میرے والد کو مجھے پڑھانے کا جس طرح کا جنون تھا، میں اپنے بچوں کی تعلیم کے لیے اس جنون کو اختیار کر بھی نہیں سکتی تھی۔ میرے والد اپنی بیماری اور غیر فعال زندگی کا مداوا مجھ میں ڈھونڈتے تھے اور میں ساڑھے پندرہ برس کی عمر سے گھر کی کفیل تھی، جب بچے ہوئے تو مجھے ان کے لیے بھی روٹی کمانی تھی۔ میں انھیں اسکول میں تعلیم دلا سکتی تھی لیکن سب کچھ تج کر ان کو اس طرح نہیں پڑھا سکتی تھی جس طرح میرے والد نے مجھے پڑھایا، اس طرح تو میرے بچے فاقوں مر جاتے۔

جی ہاں میں نے کچھ کتابیں اکٹھا کی ہیں۔ یہ چند ہزار کتابیں میری زندگی کا سرمایہ ہیں۔ میں نے گھر نہیں بنایا، زیور اور کپڑے نہیں خریدے اس لیے کہ کتابوں کی خریداری میرے نزدیک سب سے اہم تھی۔ میرے پاس برٹانیکا، کولیرز انسائیکلوپیڈیا، ٹائم لائف سیریز، دائرۃ المعارف، متعدد لغات اور دوسری حوالہ جاتی کتابیں ہیں۔ تاریخ، اضامیات، ناول اور کلاسکس اس کے علاوہ ہیں۔ نوبیل انعام یافتہ ماہر معاشیات امریتا سین نے اپنی کتاب The Argumentive India مجھے اپنے دستخطوں سے اس وقت عنایت کی تھی جب میں TLMS کی جیوری میں شامل تھی اور وہ اس ایوارڈ کی تقریب کے صدر تھے۔ قرۃ العین حیدر، سبط حسن اور دیگر متعدد ادیبوں کی دستخط شدہ کتابیں ہیں۔

میرے خیال میں کتابیں مستعار دینا اور لینا خطرے سے خالی نہیں اس لیے اس سے گریز کرنا چاہیے۔ اہم کتابوں سے ہاتھ دھو بیٹھنے کے بعض ناخوش گوار تجربے ہوئے ہیں۔

زندگی مصروف ہو یا نہ ہو کتابیں پڑھنے کا شوق ایک ایسا معاملہ ہے جو اگر لاحق ہو جائے تو عشق کی طرح جان کے ساتھ جاتا ہے۔ جنھیں آپ ''اوسط درجے کا عام تعلیم یافتہ'' کہہ کر ان کے ذکر سے سرسری گزر رہے ہیں۔ وہی لوگ کتابیں خریدتے ہیں، پڑھتے ہیں، لکھے ہوئے لفظوں کا احترام کرتے ہیں اور کتابوں کی طباعت اور فروخت کا کام ان ہی کے دم سے چل رہا ہے۔ ادبی مطالعہ تہذیب نفس اور علم کی توسیع کے لیے لازمی ہے۔ کوئی ایسا شخص جو مطالعہ نہ کرتا ہو، وہ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ طلبہ کے لیے یہ تجسس اور تفکر کا راستہ ہے جس پر چل کر وہ آنے والے برسوں میں بڑائی کا سفر آغاز کر سکتے ہیں۔

میرے خیال میں مطالعے کی پہلی سیڑھی تفریحی مطالعہ ہے۔ مشرق ومغرب کے ہمارے تمام فلسفیوں اور دانش وروں نے بھی اپنی زندگی کی ابتداء قصے کہانیوں سے ہی کی تھی، یہ تفریحی مطالعہ ہی بہت سے لوگوں کو علمی اور ادبی مطالعے کی طرف راغب کرتا ہے۔ میرے خیال میں مطالعے نے ہی میری شخصیت اور ذہنی صلاحیت کی تعمیر کی۔ عمر کے ساتھ ساتھ مطالعہ اگر جاری رہے تو یقیناً ذہنی نشوونما میں نہایت اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اگر ایسا مرحلہ درپیش ہو تو میں ول ڈیوراں اور ایئریل ڈیوراں کی ''دی اسٹوری آف سولائزیشن' جاتک کہانیاں'' اور ''دیوان غالب'' کا انتخاب کروں گی۔ مایوسی تو شاید کبھی نہیں ہوئی لیکن وہ تحریریں جو عقیدے، رنگ، نسل، صنف اور علاقے کی بنیاد پر انسانوں میں امتیاز برتتی ہوں یا دوسروں سے نفرت پر اکساتی ہوں، انھیں پڑھ کر یقیناً جھنجھلاہٹ محسوس ہوتی ہے۔

کتابوں کے ساتھ

احمد جاوید

معروف ادیب دانش وراور فلسفی مربی احمد جاوید (پ 1954) بھارت کے معروف شہر الہ آباد کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کراچی میں حاصل کی۔ بہاؤ الدین زکریا یونی ورسٹی ملتان سے ایم اے اردو کیا۔ 1985 میں اقبال اکیڈمی جوائن کی، طویل عرصہ تک اقبال اکیڈمی کے ڈپٹی ڈائریکٹر کی حیثیت سے کام کیا۔ آج کل ڈائریکٹر کی ذمہ داریاں نبھا رہے ہیں۔ تصوف، فلسفہ، شعر و سخن اور ادب پر ان کی گہری نظر ہے۔ ترک رزائل، تزکیہ و تصوف پر ان کی کتاب بہت معروف ہے۔ مختلف علمی موضوعات پر لکھے گئے مضامین کا ایک مجموعہ زیر ترتیب ہے۔

ذاتی حالات کے بارے میں گفتگو کرنا بڑا مشکل کام ہوتا ہے۔ مختصراً عرض کرتا ہوں کہ میں 1954 میں یو پی کے مشہور شہر الہ آباد کے ایک گاؤں میں پیدا ہوا۔ بالکل شروع کے تین سال اپنے دادا دادی کے ہاں بسر ہوئے۔ اُس کے بعد ہم لوگ پاکستان آ گئے پھر جوانی تک کراچی میں رہا۔ 1981 میں وہاں کے حالات کی وجہ سے کراچی چھوڑ دیا۔ 1985 تک صوبہ خیبر پختون خواہ میں رہا۔ 1985-86 میں لاہور آ گیا اور اقبال اکیڈمی جوائن کر لی۔

فکشن کا مطالعہ میرا تا حال کم ہے۔ کیوں کہ افسانہ میں سلیم احمد کی دل چسپی نہیں تھی اس لیے فکشن میں نے تھوڑا پڑھا، لیکن یہ کہ جیسے ابتدائی زمانے میں پسندیدگی Develope ہو جاتی، قراۃ العین حیدر کے افسانے اچھے لگے تھے، خیر بعد میں، میں نے فکشن پڑھا اپنی ضرورت کے لیے تو اندازہ ہوا کہ اردو فکشن خاصا کمزور ہے۔ جب دوسری زبانوں کا فکشن دیکھا تو یہ فکشن کسی شمار قطار میں نہیں آتا تھا۔ میری یہ رائے اپنی ہے۔ زیادہ متاثر کن فکشن روسی افسانوی ادب ہے اور نارتھ امریکہ کا فکشن ہے اور جنوبی ہندوستان کا فکشن ہے۔ تامل وغیرہ زبانوں میں اگر مجھ سے پوچھا جائے کہ فکشن میں میری انتہائی پسندیدہ شخصیات کون ہے تو وہ دوستوفسکی۔ جوزف کا دنولٹ۔ اور سموئیل پنکوٹ، جو انگلینڈ کا ہے۔ یہ لوگ ایسا لکھتے ہیں جو آپ کو مجبور کر دیتے ہیں کہ آپ انھیں بار بار پڑھتے رہیں۔ بہت سی چیزیں آپ کو عالم وجود سے بلند کر دیتی ہیں۔

اِن کے ناول بھی جوزف کا ونونٹ کا جو ناول ہے Art of Japanese ہے۔ دنیا

کے بڑے ناولوں میں سے ایک ہے۔ دوستوفکسی بھی اہم ناولسٹ ہے۔ سیموئیل بیلٹ Play writer ہے۔ Cater of Abselt کے بانیوں میں سے ہے۔ اِس کا waiting for God to Happy days بہت بڑی چیزیں ہیں۔ Jay fone جو ہیں۔ اس نے ناول لکھے ہیں لیکن اُسے دنیا کا سب سے بڑا Short story writer کہتے ہیں۔ Short stories میں ان کا بہت بڑا نام ہے اور ناول میں بھی ہے۔ Gille Descal یہ اِس کے دو بڑے ناول ہیں۔ اِس کی بڑی دل چسپ کہانیاں بھی ہیں۔ Hunger Artist۔

عربی مجھے نہیں آتی۔ انگریزی میں طنز ومزاح میں نہیں پڑھ سکا۔ مجھ سے انگریزی میں نہیں پڑھا گیا کیوں کہ میرے خیال میں جب تک کسی زبان کی انتہائی محاوراتی سطح پر عبور نہ ہو اور ظاہر ہے اہل زبان کی ندرت کسی دوسری زبان میں نہیں ہوسکتی کہ وہ اِس زبان کو اہل زباں کی طرح سمجھ سکیں اور طنز ومزاح کو انجوائے کریں اس لیے طنز اور مزاح کو انگریزی میں نہیں پڑھا ہے۔

اردو زبان میں جس تحریر نے مجھ پر بہت اثر ڈالا ہے وہ جو سننے میں آپ کو عجیب لگے گی۔ مجھے بہت زیادہ اثر پڑا ہے ''تواریخ محبّ الٰہ کا''۔ یہ سب باتیں میں ماضی میں ہوکر کر رہا ہوں۔ یہ سیرت کی ایک کتاب ہے۔ صوفی عنایت احمد کا کوروی صاحب کی جب وہ کالے پانی کی سزا پر تھے۔ اور محض حافظے کی بنیاد پر انھوں نے لکھا تو اُس کتاب میں جیسی تاثیر ہے وہ اگر کسی کو Catch کر لے تو وہ پورا بدل جاتا ہے۔ مطلب یہ ایک ایسی کتاب ہے جس کا میں ایک صفحہ بھی شدت جذبات سے پڑھے بغیر نہیں رہ سکا۔ جب کوئی چیز آپ کے ذہن کو بدل دے اور آپ کے جذبات کو بھی بدل دے یہ ہوتا ہے مکمل انقلاب۔ اِس کتاب کی یہ تاثیر میرے تجربے میں ہے کہ اس نے میرے ذہن اور میرے احساسات کو بالکل ایسے بدل دیا اور آج بھی مجھے کوئی روحانی مسئلہ ہو تو میں یہ کتاب دیکھتا ہوں۔

اخبار میں بالکل سرسری طور پر پڑھتا ہوں۔ ایک ہی پڑھتا ہوں۔ جنگ اور کبھی کبھار نوائے وقت دیکھ لیتا ہوں۔ یعنی اخبار بینی سے مجھے مناسبت کبھی نہیں ہوئی۔ میرا سفر مطالعہ کے بغیر تو کٹ نہیں سکتا۔ خاص طور پر ٹرین یا بس میں۔ جو بھی کتاب ہاتھ لگ جائے پڑھتا ہوں۔ مثلاً فلسفے کی کئی کتابیں سفر میں پڑھیں ہیں اور شاعری بھی اکثر دوران سفر پڑھی ہے۔

فلسفے میں سب سے زیادہ مجھ پر اثر ہوا ہے Dialouges of Plato (مکالمات افلاطون) اور kant (کانٹ) کا۔ Critic of Pure Reason پر Nikshey کی ?........Dus state of یہ دو کتابیں ہیں جو بہت حد تک اثر انداز ہوتی ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ خیالات کیا ہیں لیکن یہ کتابیں آپ کو کہیں اور کھڑا ہو جانے پر مجبور

کر دیتی ہیں۔اس طرح امام غزالی کی ''تہافتہ الفلاسفہ'' اور'' مقاصد الفلاسفہ'' یہ دو کتابیں ہیں جس نے میرے ذہن کو بہت زیادہ متاثر کیا اگر کوئی آدمی فلسفہ پڑھنا چاہے تو اسے چاہیے کہ ابتدا کسی اچھی تاریخ فلاسفہ سے کرے مثلاً میں نے جو پڑھی تھی۔ وہ Story of philosophy تھی۔اِس کی خوبی یہ ہے کہ یہ بہت ہی شگفتہ نثر میں ہے ول ڈیورنٹ نے انگریزی لکھنے والوں میں بہت ہی خوب صورت قسم کی نثر لکھی ہوئی ہے اور ول ڈیورنٹ کی Pleasure of philosophy پڑھیں۔اوراُس کے بعد برٹانیکا یا کسی اور انسائیکلوپیڈیا سے اپنے ذوق اور نقطہ نظر کے مطابق کوئی مکتب فکر Adopt کرے۔لیکن جو بنیادی Skill ہے اِن دو چیزوں سے حاصل کرلے۔

دوسری اہم ترین بات اگر کوئی بھی علم حاصل کرنا ہے تو اس کے لیے کتاب ڈھونڈنے سے پہلے استاد ڈھونڈنا چاہیے۔ورنہ آپ چند مستقل غلط فہمیوں میں مبتلا رہیں گے۔

میرے مطالعے کے کوئی خاص اوقات نہیں ہیں۔پڑھتا اب بھی کم ہوں۔اب پڑھنا ضرورت کے تابع ہے۔پہلے میں آٹھ آٹھ گھنٹے پڑھتا تھا۔حافظہ پہلے تو اچھا تھا لیکن اب کمزور ہو گیا ہے۔اس طرح نہیں جو پہلے تھا۔

میرے مطالعے میں کوئی چیز اثر انداز نہیں ہوتی۔شور ہو، مجمع ہو، جب مجھے پڑھنا ہے تو پڑھ لیتا ہوں۔یہ ٹھیک ہے کہ خاموشی اور تنہائی میں مطالعہ زیادہ آسان ہو جاتا ہے۔لیکن شور شرابا ہو تو پھر بھی میرے لیے مطالعہ بہت زیادہ مشکل نہیں ہوتا۔نوٹس لکھتا تھا۔کتاب کے حاشیے پر۔یہ میری عادت ہے۔

اپنے مطالعہ میں بچوں کو شامل کرتا ہوں انھیں کو پڑھاتا ہوں، لیکن میری اب ترجیحات بدل گئی ہیں۔میرے مقاصد اُن کے لیے ذہنی سے زیادہ اب دینی ہیں۔میں زیادہ وقت اُن کی دینی تربیت کے لیے صرف کرتا ہوں اور اِس میں اِس بات کا خیال رکھتا ہوں کہ اُن کی ذہانت میں ترقی ہو۔ میرے خیال میں ذہانت اور اخلاق یہ دینی ضروریات ہیں۔اِس لیے میں کافی اہتمام کرتا ہوں۔ لیکن ذہانت فلسفے کے حوالے سے نہیں پیدا کرنا چاہتا۔کیونکہ فلسفے کا آزاد مطالعہ بہت خطرناک ہو سکتا ہے۔اسی لیے میں نے اپنے بچوں کو فلسفے سے دور رکھا ہے Logic وغیرہ سے بھی۔لیکن کوشش یہ ہوتی ہے کہ یہ کامیاب نہیں بن سکتے تو نہ بنیں، بہت قابل نہیں بن سکتے تو نہ بنیں لیکن نیک ضرور بن جائیں۔

میں نے جتنی کوشش کی ہے کتابیں لینے میں وہ شاید کم لوگوں نے کی ہے۔یا جتنے شوق سے میں کتابیں لینے جاتا تھا اب وہ کم ہو گیا۔لیکن ایک دوسری عادت مجھ میں ہے کہ میں کتابیں جمع

نہیں کرتا۔ اُس میں اپنے آپ کو ایک ذریعہ سمجھتا ہوں کہ اگر میں نے پڑھ لی ہے تو آگے دے دوں۔ تو جہاں تک لائبریری کی بات ہے تو میرے پاس کوئی لائبریری وغیرہ نہیں لیکن یہ ہے کہ وہ سب کتابیں میری دسترس میں رہی ہیں۔ ہم لوگوں نے ایک اچھا نظام بنایا ہوا ہے جس میں کتابیں گویا سب کی ملکیت ہیں۔ اور سب کی دسترس میں ہیں۔ چند کتابیں جو کہ جو مذہبی ہیں۔ میں گھر میں رکھتا ہوں یہ صرف 7، 8 ہزار تک کتابیں ہوں گی۔

میں اس معاملے میں کتابیں نظر کر دیتا ہوں۔ اور جب بھی کسی سے کوئی کتاب مانگی ہے اُس نے دے دی ہے۔ اور اُس میں مجھ سے کئی مرتبہ کوتاہی ہوئی ہے دینے میں۔ اگر اِس معاملہ میں کبھی مجھ سے کوتائی ہوئی ہے تو یہ میری طرف سے ہوتی ہے۔ مجھے کسی نے کوئی تکلیف نہیں پہنچائی۔

بہت کتابیں ایسی ہیں جو نایاب تھیں بہت مشکل سے ڈھونڈی گئیں۔ کچھ پرانے ٹیکسٹ تھے تصوف کے وہ مشکل سے ملے۔ ایک صاحب تھے ابو طالب مکی۔ اُن کی کتاب ہے ''قوت القلوب'' وہ میری رائے میں تصوف کی بنیادی کتاب ہے۔ مفصل ہے اور نہایت ہی ضخیم اور اِس کا اثر غزالی جیسے آدمی نے بھی قبول کیا ہے۔ اگر آپ مجھ سے یہ کہیں کہ میرے تصوف سے وابستہ تصورات کی تشکیل میں کس کتاب نے سب سے زیادہ اثر ڈالا تو اس ضمن میں نام لوں گا ''قوت القلوب'' کا' آپ یہ تصور کر سکتے ہیں کہ میں نے تصوف کی ہر کتاب پڑھی ہوگی۔

مطالعے کا پروگرام مطالعے کرنے والوں کی صحبت سے بنتا ہے۔ ایسے کوئی نہیں بنا سکتا کہ آپ اُس کو کہیں کہ گھنٹہ لگائے یا دو گھنٹے۔ اصل چیز یہ ہے کہ جو لوگ کتابیں پڑھتے ہیں ان لوگوں سے ہم نشینی اور صحبت جاری رہنی چاہیے۔ ایسے لوگوں کی صحبت میں رہ کر آپ کو اپنے مطالعے کی ضروریات کا اندازہ ہوگا اور وہ بنیادی شوق پیدا ہوگا جو آپ سے وقت Spare کروائے گا۔ میرا مشورہ ہر ایک سے یہی رہتا ہے کہ پڑھے لکھے لوگوں کی صحبت میں بیٹھا کرو، ان شاء اللہ مہینے بعد ہی تم خود کتابیں ڈھونڈتے نظر آؤ گے اور اپنی مصروفیات میں سے تردّد کر کے وقت نکالو گے، کیونکہ اب وقت ضائع ہونے کے اتنے ذرائع پیدا ہو گئے ہیں، مطلب کہ ایک عجیب دھوکا سا پیدا ہو گیا ہے کہ ہمارا وقت ضائع نہیں ہو رہا، ہم مصروف ہیں۔ اس کی موجودگی میں ہر کسی سے مجھے اتنا کہنا ہے کہ آپ دو گھنٹے پڑھا کرو۔ یہ بہت ضروری ہے یہ بے معنی باتیں نہیں۔ یعنی اُس کے ذہن میں یہ بات محفوظ ہی نہیں رہے گی۔ بہتر ہے کہ کوشش اور رغبت دونوں کی جائے۔ پڑھے لکھے لوگوں کی صحبت کی طرف۔ اِس کے بغیر کچھ نہیں ہوتا۔ کیوں کہ ہماری معاشرت نہیں ہے۔ یہ روایات باقی رہیں۔ لوگ پڑھتے تھے۔ اب ٹی وی نے ہماری زندگی میں مرکزی حیثیت حاصل کر لی ہے۔ اور

اب یہ روایت باقی نہیں رہی۔

ادبی مطالعہ ناگزیر ہے۔ایک تو یہ کہ اِس سے آپ کو زبان کا علم حاصل ہوتا ہے۔ادبی مطالعے کے بغیر زبان کا علم حاصل کرنے کا کوئی دوسرا ذریعہ نہیں ہے۔اور دوسرا فائدہ اِس کا یہ ہے کہ اِس سے آپ کا جمالیاتی شعور تربیت پاتا ہے۔یہ دونوں مقاصد اتنے بڑے اور اہم ہیں کہ اِن کو نظر انداز کرنا گویا انسانوں کی طرح زندگی گزارنے سے دست بردار ہونا ہے۔میری نظر میں وہ انسان نہیں ہے جس کو لفظ کا علم نہیں۔لفظ جس پر اثر نہیں کرتا۔لفظ جسے اپنے طرف کھینچتا نہیں۔مطلب یہ ہے کہ یہ ہماری بدیہی وفطری ضرورت بھی ہے روحانی ضرورت بھی ہے اور جمالیاتی ضرورت بھی۔

مطالعے کا تسلسل آپ کی فکر میں دونوں طرح کی تبدیلیاں پیدا کرسکتا ہے، ایک یہ کہ اُس کی تکمیل کرتا ہے۔تکمیل کا عمل بعض اجزا کو چھوڑنے سے اور بعض نئے اجزا کو اختیار کرنے سے ہوتا ہے، یہ بنیادی تبدیلی تو نہیں ہوتی یہ ایسے ہی ہوتا ہے جیسے آپ کے الگ خیال کی پرانی دلیلیں رد ہو جائیں اور کئی نئی دلیلیں حاصل ہو جائیں اور تبدیلی بھی آتی ہے کہ آپ کے بنیادی تصورات بدل جاتے ہیں۔

میرے خیال میں میں نے پہلی قسم کی تبدیلیوں کا تجربہ کیا ہے۔اور میرے بنیادی نظریات تو شاید مطالعے کی وجہ سے نہیں بدلتے لیکن اُن بنیادی نظریات کو Support کرنے والے دلائل جو ہیں وہ بدل گئے ہیں یہ مطالعے کا ایک قدرتی اثر ہے۔جو بہت سے لوگوں پر ہوتا ہے۔اگر باقی زندگی میں بالکل تنہائی کا موقع ملے تو اپنی زندگی کے لیے تین کتابیں جو اپنے ساتھ رکھنا چاہوں گا وہ ریاض الصالحین۔مثنوی مولانا روم اور دیوان حافظ رکھنا چاہوں گا۔

میری ایک مزاجی مجبوری ہے کہ میں غیر مذہبی تحریروں سے اشتعال محسوس کرتا ہوں۔آج بھی اور نوجوانی میں بھی کرتا تھا۔ہمارا جو ایمانی وجود ہے اُس میں جذبہ پہلے ہے خیال بعد میں۔جو آدمی اس ترتیب کو بدلنا چاہیے گا وہ اپنے ایمانی وجود کو کمزور کرے گا۔

سیرت کی ایک کتاب ہے حکیم عبدالرؤف دانا پوری کی کتاب ''اصح السیر'' وہ مجھے بہت اچھی لگی۔یا ابن قیم کی ایک کتاب سے ''زادالمعاد'' ہے بہت شوق سے پڑھتا ہوں۔یا مولانا مناظر احسن گیلانی صاحب کی کتاب ''النبی الخاتم'' ہے۔اور یہ سب سے مختصر ہے اور پر تاثیر بھی ہے اسی طرح علم پیدا کرنے کے لیے ایک مولانا اشرف علی تھانوی صاحب کی ایک کتاب ہے۔نشر لطیب فی ذکرالحبیب بہت ہی زبردست اور اہم کتاب ہے۔

میرے مطالعے کا سفر

ڈاکٹر اسلم فرخی

ممتاز دانش ور، استاد، صاحب طرز نثر نگار، ڈاکٹر محمد اسلم فرخی (پ 23 اکتوبر 1928ء) لکھنو میں پیدا ہوئے۔ ان کا وطن فتح گڑھ، ضلع فرخ آباد تھا۔ ذوق شعر وسخن ڈاکٹر صاحب کو خاندانی ورثے میں ملا۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد وہ درس وتدریس سے منسلک ہو گئے۔ فرخی صاحب نے کراچی کے مختلف کالجوں اور کراچی یونیورسٹی میں اردو پڑھائی۔ کراچی یونیورسٹی میں انھوں نے ناظم شعبہ تصنیف وتالیف وترجمہ اور رجسٹرار کے طور پر بھی کام کیا۔ زبان و ادب کے استاد اور معلم کی حیثیت سے ان کا بلند مرتبہ ہے اور استاد الاساتذہ کی حیثیت کے حامل ہیں۔ شاعری اور تحقیق سے زیادہ ان کی اصل پہچان خاکہ نگاری ہے، خصوصاً حضرت سلطان المشائخ نظام الدین اولیا کے حوالے سے ان کا کام۔ حضرت نظام الدین اولیا کے بارے میں وہ چھ کتابیں لکھ چکے ہیں۔

ان کی تالیف وتصانیف: محمد حسین آزاد۔ حیات وتصانیف، قتیل و غالب، قصص ہند، نظام رنگ، حضرت سلطان جی کا خاکہ، آنگن میں ستارے، بابا فرید، دبستان نظام، نظام الدین اولیا، بچوں کے سلطان جی، بچوں کے رنگا رنگ امیر خسرو، فرمایا سلطان جی نے، آنگن میں ستارے، سات آسمان، ''موسم بہار جیسے لوگ'' بہت معروف ہیں۔

اگر میں بیان کرنا شروع کروں گا تو آج کا دن کل کے دن میں بدل جائے گا، لیکن میرے دل کا حال پھر بھی بیان نہیں ہو سکے گا۔ چونکہ ہر آدمی جو میری عمر کا ہے اور جس نے لمبی زندگی گزاری ہے، اُسے اپنی عمر کے آخری حصے میں پہنچ کر ماضی کی بازیافت سے بہت دل چسپی پیدا ہو جاتی ہے۔ میں تو عملاً کبھی اپنے حالات زندگی کے بارے میں گفتگو نہیں کرتا۔ دوسری بات یہ ہے کہ اپنے بارے میں کچھ کہنا نہایت مشکل بات ہے اگر صحیح بات کہوں تو سننے والے یہ کہتے ہیں کہ صاحب بڑی تعلّی سے کام لیا اور بہت غلو سے کام لیا۔ اختصار برتوں تو سننے والے کچھ اور سوچیں گے۔ بہت مختصر بیان کرنا چاہوں تو اتنا کافی ہے کہ میں 23 اکتوبر 1924ء کو لکھنو میں پیدا ہوا۔ میں نے ابتدائی تعلیم بھی وہیں حاصل کی۔ میرے ننھیال لکھنو ہی میں تھے اور میرے نانا وہاں رہتے

تھے اور میں چونکہ اُن کی بڑی بیٹی کا بڑا بیٹا تھا اور اُن کے ہاں کوئی اولادِ نرینہ نہیں تھی، اس لیے انہوں نے مجھے بیٹے کی طرح پالا اور چاہا۔ جب میں بڑا ہو گیا تو میں اپنے والد کے پاس فتح گڑھ آ گیا جو ضلع فرخ آباد کا صدر مقام ہے۔ میرے نانا اور میرے دادا دونوں کا خاندانی کام کتابوں کی اشاعت کا تھا اور دونوں کے پریس تھے، نانا نے بہت سی کتابیں شائع کیں اور مشہور شاعر داغ دہلوی کے وہ تمام مجموعے جو رام پور میں مرتب ہوئے اُن کے حقوق میرے نانا کے پاس تھے۔ گلزار داغ، آفتاب داغ اور فریاد داغ وغیرہ۔ پھر اُس کے علاوہ ایک اور سلسلہ تھا جس میں آلھا نظم گائی جاتی تھی۔ وہ ایک خاص لے میں گائی جاتی تھی اور اچھے پڑھنے والے وہ نظم پڑھتے تھے، مسلمانوں نے بھی ایک نظم لکھی جس کا نام تھا اسلام کھنڈ اور اُس میں غزوات کے بارے میں اُسی زبان میں شاعری کی گئی تھی۔ وہ بھی بڑے شوق سے گائی جاتی تھی، لوگ سنتے تھے اور اُس سے محظوظ ہوتے تھے۔ یہ کتاب بھی بڑی مشہور ہوئی۔ اس کے علاوہ پریس کا کام تھا اُس زمانے میں Hand پریس ہوتے تھے۔ اب تو منٹوں میں چیزیں چھپتی ہیں۔ جب کہ اس وقت پتھر سے چھپائی کی جاتی تھی۔ کاتب پہلے کاغذ پر ایک خاص قسم کی روشنائی سے لکھتے تھے اور وہ پتھر پہ اُتاری جاتی تھی اور لکھنو میں بعض ایسے کاتب تھے جو کاپی نہیں لکھتے تھے بلکہ وہ معکوس رقم کہلاتے۔ پتھر ان کے سامنے ایک چھوٹی میز پر رکھ دیا جاتا تھا اور وہ اُلٹے رخ پر لکھتے جاتے تھے یعنی معکوس انداز میں لکھتے جاتے تھے۔ عبدالحلیم شرر کا جو رسالہ تھا ''دل گداز'' وہ اسی طرح پتھر پہ لکھا جاتا تھا۔ میں نے دیکھا ہمارے ہاں کاتب صبح نو بجے آئے ایک میز اُن کے سامنے رکھی گئی اور پتھر اُس پہ جمایا گیا اور دن بھر لکھتے رہے۔

ہمارے پردادا کے ہاں بھی پریس تھا وہ بھی کتابیں چھاپتے تھے اور مصنف بھی تھے۔ انھوں نے بعض اچھی کتابیں بھی چھاپیں۔ مثلاً اُن کی چھاپی ہوئی کتاب ''تاریخ فرخ آباد'' بہت مشہور ہوئی، تو کہنے کا مقصد یہ ہے کہ مجھے بچپن ہی سے علم و ادب کا ماحول ملا۔ یہ کتابیں کیسے لکھی جاتی ہیں؟ کتابیں لکھنے والے کون ہوتے ہیں؟ کتاب پڑھنے والے کون ہوتے ہیں؟ ان کے بارے میں تفصیل سے باتیں بعد میں ہوں گی پہلے ذرا تحریک پاکستان کے حوالے سے بات کرتے ہیں۔

میں قصبے کی مسلم لیگ کا سیکرٹری رہا۔ 1946ء کے الیکشن میں بھرپور حصہ لیا، گاؤں گاؤں پھرا۔ طالب علموں کا ایک گروہ تھا جو یہ کام کرتا تھا، سارے یوپی میں جو مسلمان طالب علم تھے وہ یہی کام کرتے تھے تو پھر نتیجہ یہ نکلا کہ پاکستان قائم ہو گیا۔

میں ستمبر 1947ء میں یہاں آیا اور ستمبر 1947ء ہی سے میں کراچی میں مقیم ہوں

یہاں میری نئی زندگی شروع ہوتی ہے۔ مجھے لکھنے پڑھنے کا شوق تھا۔ اُس زمانے کی مقبول تحریک ترقی پسند تحریک تھی۔ مجھے اُس تحریک کے اغراض و مقاصد سے دل چسپی تھی۔ اپنے قصبے میں اُس تحریک کی ایک شاخ میں نے بھی قائم کر رکھی تھی۔ یہاں آ گیا تو یہاں ساری سرگرمیاں اس لیے ماند پڑ گئیں کہ میں ریڈیو میں مسودہ نگار کی حیثیت سے چلا گیا اور نظم اور نثر ساری چیزیں ریڈیو کے لیے وقف ہو گئیں۔ پانچ سال میں ریڈیو میں رہا اور اس دوران بہت کچھ لکھا۔ نظمیں لکھیں، غزلیں لکھیں، فیچر لکھے، گیت لکھے، تقریریں لکھیں، بچوں کی تقریریں لکھیں اور جب ریڈیو پاکستان سے اسکول براڈ کاسٹ کا پروگرام شروع ہوا تو اُس کے بہت سے پروگرام لکھے۔ افسوس یہ ہے کہ کوئی چیز محفوظ نہیں ہے۔ بعض فیچر ایسے تھے جو مجھے خود پسند تھے۔ مثلاً خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیقؓ کے بارے میں ''رفیق رسالت ﷺ'' کے عنوان سے فیچر لکھا تھا اور بڑی محنت سے لکھا تھا بہت پسند کیا گیا تھا اور آفتاب عظیم ٹیلی ویژن کے ایک پروڈیوسر تھے وہ جب ملتے تھے تو کہتے تھے کہ میں اس کی ایک ویڈیو کیسٹ بناؤں گا۔ وہ بھی مصروف ہو گئے میرے پاس اب کچھ ریکارڈ بھی نہیں ہے۔ لیکن کبھی کبھی یاد آتا ہے کہ وہ بہت اچھا لکھا تھا۔ اس طرح واجد علی شاہ، بہادر شاہ ظفر پر فیچر تھے۔ فیچروں کے علاوہ ڈرامے بھی بہت سے لکھے، یہ سلسلہ چلتا رہا لیکن میرا یہ ارادہ تھا کہ میں ریڈیو میں زندگی نہیں گزاروں گا، مجھے تدریس کا شوق تھا۔ میرے والد نے جب میٹرک پاس کیا تو اُن کو گورنمنٹ اسکول میں جگہ مل گئی اور وہاں پڑھاتے رہے۔ لیکن اس دوران میں تحریک خلافت اور عدم تعاون کی تحریک شروع ہوئی اور مسلمانوں میں یہ تحریک چلی کہ انگریزوں کی ملازمت ترک کر دینا چاہیے تو انہوں نے ملازمت ترک کر دی اس لیے یوں کہنا چاہیے کہ تدریس میرے خون میں شامل ہے۔ میں یہ سوچتا تھا کہ میں ان شاء اللہ تعالیٰ کسی کالج یا یونی ورسٹی میں پڑھاؤں گا تو مجھے سندھ مسلم کالج میں جگہ مل گئی چونکہ اُس زمانے میں کالج بھی کم تھے۔ اور تعلیم کا ماحول بھی ایسا نہیں تھا۔ سندھ مسلم کالج میں جگہ مل گئی۔ میں چلا گیا بہت اچھا وقت گزرا۔ غلام مصطفیٰ شاہ صاحب پرنسپل تھے اور وہ بڑی زبردست شخصیت کے حامل تھے۔ بہت ہمدرد تھے جب تک زندہ رہے اُن سے تعلقات رہے اور میری طرح بہت سے نوجوان لوگ تھے جو پڑھا رہے تھے۔ پھر یہ ہوا کہ مرکزی حکومت نے سنٹرل گورنمنٹ کالج قائم کیا، اب بھی ہے تو اُس کالج میں پبلک سروس کمیشن نے اساتذہ کا تقرر کیا۔ تو اُس میں میرا بھی تقرر ہو گیا، میں بھی وہاں چلا گیا۔ نیا کالج تھا اور پڑھانے والے بھی نئے تھے۔ آدھا حصہ مغربی پاکستان اور آدھا حصہ بنگالی اساتذہ کا تھا۔ مگر یہ کہ روابط ایسے تھے کہ بنگالی اور غیر بنگالی میں کوئی فرق نہیں تھا۔ اتنے اچھے اور بے تکلف تعلقات تھے اور وہ اس طرح گھل مل گئے تھے کہ دن رات اُن کے گھروں میں جانا اور اُن کا ہمارے ہاں آنا۔ وہیں میں نے محمد حسین

آزاد کی حیات اور تصانیف کے عنوان سے اپنی پی ایچ ڈی کا Thesis لکھا۔ یہ دو جلدوں میں تھا اور مجھے بعد میں آدم جی ایوارڈ بھی ملا تھا، پھر گورنمنٹ کالج سے میں کراچی یونیورسٹی آ گیا۔ شعبہ اردو میں بہت خوش رہا کیوں کہ بہت اچھا ماحول تھا، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی تھے۔ ڈاکٹر ابوالخیر کشفی تھے ڈاکٹر شاہ علی تھے، ڈاکٹر فرمان فتح پوری تھے اساتذہ کا ایک پورا گلدستہ تھا۔ کراچی یونیورسٹی اُس زمانے میں اعلیٰ تعلیم کا ایک بہت بڑا اور بہت اچھا مرکز بھی تھی۔ ہر شعبے میں ایسے اساتذہ تھے جو بین الاقوامی سطح پر نامی گرامی سمجھے جاتے تھے۔ مثلاً تاریخ کے شعبے میں ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی اور ڈاکٹر محمود حسین تھے۔ ڈاکٹر یوسف تھے جو عربی کے بہت بڑے اسکالر تھے، فارسی میں ڈاکٹر غلام سرور تھے، ڈاکٹر ملیح الامام عابد علی خان تھے۔ یہ جو نام میں آپ کو گنوا رہا ہوں یہ وہ لوگ تھے جنہیں اپنے موضوع پر بہت بڑا عالم اور مستند سمجھا جاتا تھا۔ لکھنے پڑھنے کا بہت عمدہ دور گزرا۔ یہاں میں شعبہ تصنیف و تالیف کا ناظم رہا اور آخر میں یونیورسٹی کا رجسٹرار ہو گیا تھا، حالانکہ وہ ایک انتظامی کام ہے، چونکہ میں سینئر ٹیچر تھا لہٰذا ہر معاملے میں ٹھیک سمجھا جاتا تھا۔ بڑا کامیاب رہا۔ وہاں سے نکلا تو ایک دن بھی گھر میں فالتو بیٹھنا نصیب نہیں ہوا۔ نورالحسن جعفری انجمن ترقی اردو کے ناظم تھے۔ انہوں نے کہا کہ آپ کل سے انجمن میں آ جائیں۔ میں نے کہا کہ ایک آدھ مہینے آرام کروں تو انہوں نے کہا کہ صاحب آپ کو کل آنا ہے تو انجمن میں مشیر کی حیثیت سے چلا گیا وہاں کام کرتا رہا آٹھ دس سال۔ پھر اُس کے بعد صحت خراب ہو گئی تھی، گھر میں بیٹھ گیا۔

میرے حساب سے کوئی چار برس ہوئے ہوں گے کہ اردو یونی ورسٹی کی سینٹ کا ممبر بن گیا۔ سینٹ نے مجھ سے یہ کہا کہ ہائر ایجوکیشن کمیشن نے ایک بڑی گرانٹ اس لیے دی ہے کہ اردو میں سائنس کی درسی کتابیں تیار کی جائیں۔ اردو یونیورسٹی تو بن گئی ہے اور یونیورسٹی بن جانے کا مطلب ہے کہ تدریس اردو میں ہو۔ سائنس بھی اردو میں پڑھائی جائے تو میں نے کہا کہ میری صحت اجازت نہیں دیتی لیکن مجھے دو دفعہ کہا گیا تو مجھے قبول کرنا پڑا۔ اس طرح شعبہ تصنیف و تالیف کا اعزازی نگران اعلیٰ بن گیا۔ ایم ایس سی اور آنرز کی سطح کے لیے سائنس کی درسی کتابیں لکھواتا رہا ہوں۔ چند کتابیں شائع کیں لیکن مجھے بڑے افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ ہمارے ملک میں کتاب لکھنے کا کوئی تصور نہیں ہے۔ کتابیں تو بہت ہیں لیکن بعض بنیادی باتیں قابل توجہ ہیں اور وہ یہ ہیں کہ ادب اور شعر کی کتابیں تو آپ لکھتے ہیں اور سینکڑوں کی تعداد میں شائع ہوتی ہیں لیکن علمی کتابیں بہت کم لکھی جاتی ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ ایک مستند مکمل کتاب لکھنے کے لیے مصنف کا پوری طرح اپنے مضمون پر حاوی ہونا ضروری ہے اگر وہ اپنے مضمون پر کامل دستگاہ نہیں رکھتا اور اُس کا علم Upto date نہیں ہے تو وہ ٹیکسٹ بک نہیں لکھ سکتا۔ چنانچہ بیشتر اساتذہ ٹیکسٹ بک لکھنے

سے گھبراتے ہیں۔ میں نے سارے ملک میں دورے کیے، جامعات اور کالجوں میں گیا، سائنسی اداروں میں گیا۔ جو خوشامد کر سکتا تھا کی، کہ یہ علم کے فروغ کا مسئلہ ہے مگر کسی نے کتاب لکھنے کی حامی نہیں بھری اور اب بھی یہی حال ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایسی علمی اور تحقیقی کتابوں کی اشاعت کی رفتار بہت سست ہے۔

جہاں تک میری اپنی مطالعاتی زندگی کا تعلق ہے بچوں کی کتابیں بہت پڑھیں۔ دارالاشاعت پنجاب کا ایک ادارہ تھا وہ ایک رسالہ پھول چھاپتے تھے وہ پڑھا کرتا تھا۔ میری پہلی کہانی اس میں چھپی تھی اور مجھے کتنی خوشی ہوئی تھی۔ کراچی آنے کے بعد میں نے شمس تبریزی کے ساتھ مل کر بچوں کا ایک رسالہ ''میرا رسالہ'' شائع کرنا شروع کیا۔ برسوں جاری رہا۔ ایک ادبی رسالہ ''نقش'' بھی شمس صاحب کے ساتھ جاری کیا۔ اُس سے آگے بڑھے تو جو کتاب ہاتھ لگی پڑھی۔ ''آب حیات اور نیرنگ خیال'' میں نے بچپن میں پڑھی تب سے محمد حسین آزاد سے دل چسپی پیدا ہوگئی تو اب تک یاد ہے کہ نیرنگ خیال جو تھی وہ لمبے سائز پر تھی اور آب حیات بھی بڑے سائز پر تھی میں نے پچاسوں بار پڑھی۔ اسی طرح ''دربار اکبری'' بھی پچاسوں بار پڑھی۔

شاعری کی بہت سی کتابیں پڑھیں بچوں کی بھی بڑوں کی بھی۔ میرے والد کو چونکہ انگریزی کی کتابیں پڑھنے کا غیر معمولی شوق تھا وہ جو کتاب پڑھتے تھے میں بھی دیکھتا تھا۔ اور اس سے میرے شوق کو مہمیز ہوتی ملتی تھی اور میں بھی اس کتاب کا مطالعہ کرتا تھا۔ ایک بات اور بھی ہے کہ کتابوں کے حوالے سے طلسم ہوشربا کا کلچر بھی تھا وہ ہمارے یہاں اس طرح تھا کہ جو ہمارے مولوی صاحب تھے وہ ہمارے یہاں رہتے تھے اور شام کو اُن کے دوست احباب اُن سے ملنے آتے تھے اور چونکہ وہ خود بھی شوق رکھتے تھے اس لیے لالٹین روشن کی جاتی تھی۔ مولوی صاحب بہ آواز بلند طلسم ہوشربا پڑھتے تھے اور وہ بہت سے لوگ جو وہاں جمع ہوتے تھے اسے سنتے تھے۔ بہت دفعہ میں بھی وہاں جا کر بیٹھا اور سنتا رہا۔ طلسم ہوشربا کو خود بھی پڑھنے کی کوشش تھی لیکن میں نے اُس کی جتنی جلدیں تھیں (سات جلدیں تو ویسے ہی، اور پانچویں کی دو جلدیں ہیں پنجم اول اور پنجم دو) میں نے یہ کتاب اپنے لڑکپن میں پڑھ لی اور یہ دعویٰ تو نہیں کرتا کہ وہ سمجھ میں آئی، وہ روانی، وہ اسلوب، سجا ہوا مرصع طرز بیان لیکن پڑھا سب اور بڑا لطف حاصل کیا اور اُس کا بڑا اثر رہا۔ وہ ایک بڑی اہم کتاب رہی دوسری داستانیں بھی تھیں ''طلسم نور پیکر'' ہے۔ ''طلسم نور افشاں'' ہے۔ ''اول نامہ'' ''ایرج نامہ'' بہت پڑھا اور بہت یاد رکھا اور میرا خیال یہ ہے کہ اگر اُس کو آسان زبان میں لکھ کر بچوں کے لیے ایک کتاب تیار کی جائے تو بہت دل چسپ رہے۔

ہمارے ہاں کا دستور تھا لڑکوں کا ایک گروہ تھا جو چھپ کر گھٹیا جاسوسی ناول پڑھتے تھے،

ایک مصنف تھے منشی ندیم صہبانی فیروز پوری تھا، چار آنے میں اُن کا ناول آتا تھا۔ پیسے جمع کر کے اُن کا ناول پڑھتے تھے۔ پھر ہم نے اور ضمیر الدین احمد نے جو ہمارے دوست تھے یہ طے کیا کہ دلی جا کر منشی ندیم صہبانی فیروز پوری سے ملاقات کرنی چاہیے، بعد میں یہ عقدہ کھلا کہ وہ اور جتنے اس طرح کے لکھنے والے تھے وہ اصل میں کاتب تھے اور وہ کتابت کی ہوئی کتاب بالعموم دس روپے پندرہ روپے میں پبلشرز کو دے دیتے تھے۔ اُس زمانے میں پانچویں چھٹی جماعت میں وہ بہرام ڈاکو اور جاسوسوں کے کارنامے بڑے اچھے محسوس ہوتے تھے۔

بعد میں خیال آتا ہے کہ یہ کیا حماقت اور لغویت تھی۔

میرے والد انگریزی میں کتابیں منگواتے رہتے تھے۔ بعض کتابوں کی کہانیاں انھوں نے مجھے سنائیں مثلاً Victor Hugo کی کتاب لامزابل کی کہانی میں نے انھی سے سنی تھی اور پھر مجھے یاد ہو گئی تھی اور پھر میں نے خود بھی پڑھی اور بہت سی کہانیاں سنیں بھی جو میں نے بعد میں پڑھیں۔ انگری ناول پڑھنے کا جو سلسلہ شروع ہوا وہ اب تک جاری ہے۔ پھر Mob lick پڑھی۔ بہت مشکل کتاب تھی میری سمجھ سے ماورئی تھی لیکن پھر بھی میں نے پڑھی۔ پھر میں نے اس کو بار بار پڑھا اور پھر اُس پر ایک ریڈیو Play بھی لکھا۔ ڈارمے سے بڑی دل چسپی رہی۔ نئے ڈرامہ نگاروں کو پڑھا۔ اُن کے ڈراموں سے استفادہ کیا، تنقید پڑھی، تنقید نگاروں سے استفادہ کیا۔ انگریزی شاعروں سے استفادہ کیا۔ یہ پورا سلسلہ ہے جو آج تک جاری ہے۔

ادب کا شوق مجھے اپنے والد سے ورثے میں ملا تھا، مجھے کیا بلکہ سارے خاندان کو ملا، میری ایک چھوٹی بہن تنقید بہت اچھی لکھتی تھیں۔ میرے ایک چھوٹے بھائی انوراحسن صدیقی مرحوم معروف ادیب شاعر اور صحافی تھے۔ میرے بچے اور پوتا پوتی ادبی وراثت کے حصہ دار ہیں۔ میری بیوی ڈپٹی نذیر احمد کی پڑپوتی ہیں۔ انھوں نے شاہد احمد دہلوی کے بارے میں ایک کتاب لکھی ہے۔ ایک کتاب خدیجہ مستور کے بارے میں ہے۔ ایک کتاب ڈپٹی نذیر احمد کے بارے میں زیر طبع ہے۔ میرے بچوں کو ان کی ادبی وراثت سے بھی حصہ ملا ہے۔

میرے ذوق مطالعہ میں محمد حسین آزاد کے ساتھیوں میں ڈپٹی نذیر احمد کا نام قابل ذکر ہے میرا خیال ہے کہ جیسی گٹھی ہوئی نثر نذیر احمد نے لکھی ہے اردو کے کسی انشا پرداز نے نہیں لکھی۔ زبان پر چہرہ نگاری پر انسان کے کردار کو بیان کرنے پر اور تیز، حس مزاح کے ساتھ وہ لاجواب اسلوب تحریر اور انداز نگارش کے حامل تھے۔ کیونکہ اُن کے سامنے ایک مقصد تھا لہٰذا انہوں نے اپنی کتابوں میں اُس مقصد کو پورا ہوتا ہوا دیکھا۔

طنز و مزاح میں مشتاق احمد یوسفی صاحب کی نثر نہایت اعلیٰ قسم کی نثر ہے اور اردو

اسلوب کے اعتبار سے یوسفی صاحب کا اردو نثر میں بہت اہم مقام ہے۔ محمد حسن عسکری کی نثر ایک صاحب اسلوب کی نثر تھی اور جو نثر اختصار، اجمال، جامعیت اور استعجاب کا نمونہ ہے وہ سعادت حسن منٹو کی نثر ہے اور عصمت چغتائی کی نثر ہے۔ خدیجہ مستور کی نثر ہے۔ بڑی کاٹ دار بڑی چبھنے والی۔ ہمارا اردو ادب اچھے نثر گاروں سے خالی نہیں تھا اور شاہد احمد دہلوی جن سے میں نے نثر لکھنا سیکھی، ان کی شخصیت کا میری زندگی پر گہرا اثر ہے۔

بہت سے نام اور بھی ہیں انتظار صاحب جو ہمارے عہد کے بڑے افسانہ نگار ہیں۔ انھوں نے اردو افسانے کو نئی جہت دی ہے۔ راجندر سنگھ بیدی نے کراچی کے فسادات پر بعض بہت اچھے افسانے لکھے۔ احمد ندیم قاسمی صاحب، اشفاق احمد کا اضافہ کر لیجیے۔ خالدہ حسین کا اضافہ کر لیجیے۔ یہ بہت اچھے اور اعلیٰ درجے کے افسانہ نگار ہیں۔ بعض اور افسانہ نگار بھی ہیں۔ نام کہاں تک گنواؤں۔

جہاں تک ناولوں کا تعلق ہے بیسویں صدی میں اتنا بڑا ناول ''آگ کا دریا'' لکھا گیا۔ خدیجہ مستور نے ''آنگن'' لکھا، آنگن اتنا خوب صورت اور مکمل بھرپور ناول ہے، قیام پاکستان کے پورے عمل کو اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں کے جذبات کو اُن کی کوشش کو اور اُن کے مجاہدے کو اُن کے جوش وخروش کو خدیجہ مستور نے جس طرح ظاہر کر دیا ہے وہ بڑے کمال کی بات ہے۔ اسی طرح کا ''ٹیڑھی لکیر'' اور ''اداس نسلیں'' ہے۔ ''علی پور کا ایلی'' ہے۔ ''راجہ گدھ'' ہے یہ سب اچھے ناول ہیں اور آگ کا دریا کے ساتھ، قرۃ العین حیدر کے دوسرے ناول اور افسانے ہیں، زندگی اور وقت کا پورا طلسم ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی کا ''کئی چاند تھے سر آسماں'' زبردست ناول ہے۔ فاروقی صاحب ناول، افسانے اور تنقید کا بہت بڑا نام ہیں۔ عہد ساز، رجحان ساز اور ہمہ جہت ادیب ہیں۔

مولانا امین حسن کی تفسیر ''تدبر القرآن'' مجھے بہت پسند ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد کی ''مطالب القرآن'' جتنی بھی شائع ہوئی بڑی زبردست اور فکر انگریز کتاب ہے۔ میں اس کتاب سے بہت متاثر ہوا۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی تفسیر میں نے پڑھی ہے اور میں اُن کی ذہانت اور اُن کے علم اور اُن کے طرز بیان کا مداح ہوں۔ اُن کے خطوط کا مجموعہ ''غبار خاطر'' اردو نثر کا اعلیٰ نمونہ ہے اور اُن کی جو تفسیر ہے بہت اچھی تفسیر ہے۔ اس طرح مولانا مودودیؒ کی تفسیر ہے، میں مذہبی اسکالر یا دانش ور کی لیاقت اور قابلیت پر رائے دینے کا اہل نہیں ہوں۔ مولانا مودودی کا اسلوب بڑا سادہ اور بڑا پرکشش ہے۔ اُن کی پوری تفسیر میں آپ کو بڑی کامیاب نثر نگاری کا احساس ہوتا ہے۔

بات یہ ہے کہ سیرت کی کتب بڑی عقیدت سے لکھی گئی ہیں بڑی لگن سے لکھی گئی ہیں

لیکن ہم سب کو اس پہ غور کرنا چاہیے کہ ابھی تک سیرت نگاری کا حق ادا نہیں ہوا۔ مسلمان قوم ہی دنیا بھر میں وہ قوم ہے جس نے تاریخ کے علم کو علمی حیثیت دی ہے۔ مگر ہمارے ہاں تاریخ کا صحیح افادہ نہیں ہوا۔

سیرۃ النبی ﷺ کی کتابوں میں مولانا شبلی کی سیرۃ النبیؐ اعلیٰ کتاب ہے۔ شبلی کی سیرت النبیؐ کا جو پہلا ایڈیشن تھا وہ میرے پاس ہے اور اتنے بڑے سائز پر پہلا اور دوسرا ایڈیشن تھا کہ اب اتنے بڑے سائز پر کتابوں کی اشاعت کا رواج نہیں رہا۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ ایڈیشن اگر نایاب نہیں تو کم یاب ضرور ہے۔ بہت بڑے اہتمام سے شائع ہوا تھا۔ اسی طرح اور کچھ کتابوں کے پہلے ایڈیشن تھے وہ لوگوں کے پاس سے میرے پاس بھی آئے۔

تصوف کی طرف دل چسپی اپنے نانا کی وجہ سے پیدا ہوئی، انہیں بزرگان کرام سے بڑی دل چسپی تھی اور وہ بالعموم عرسوں میں شرکت کرتے تھے۔ نہ صرف میرے نانا جان عرسوں میں حاضری دیا کرتے تھے بلکہ ہمارے خاندان کے اور افراد بھی مزارات پر جایا کرتے تھے۔ اس طرح صوفیاء سے دل چسپی مجھے وراثت میں ملی اور نتیجتاً میں نے امیر خسرو کا خصوصی مطالعہ کیا، تو پھر میرا ذہن منتقل ہوا۔ حضرت نظام الدین اولیاء کی طرف اور خواجہ محبوب الٰہی کا خصوصی مطالعہ کیا اور میں بڑا متاثر ہوا اور میں اُن کی درگاہ میں سترہ سال تک مسلسل حاضر ہوا۔ اور میرا خیال ہے کہ میرا جو حاصل زندگی ہے وہ میری کتاب ''دبستان نظام'' ہے۔ 500 صفحے کی یہ کتاب اس مقصد کی خاطر لکھی گئی ہے کہ لوگ عام طور پر یہ تصور کرتے ہیں کہ صوفیائے کرام کے ہاں کرامتیں تھیں اور روحانی تجلیات تھیں۔ کبھی کسی نے یہ غور نہیں کیا کہ یہ سب کے سب جتنے بھی تھے اپنے عہد کے عالم اور معاشرتی مصلح بھی تھے۔ ان لوگوں نے اپنی مثالی زندگیوں سے معاشرے میں اصلاح کا کام کیا۔ مثلاً حضرت نظام الدین اولیاء کے حوالے سے ''تاریخ فیروز شاہی میں ضیا الدین برنی نے لکھا ہے کہ کیفیت یہ ہوگئی تھی کہ لوگ مضافات سے حضرت کے دیدار کے لیے آتے تھے تو لوگوں نے راستے میں جگہ جگہ چھپر ڈلوا دیئے تھے اور وضو کے لیے لوٹے رکھوا دیے تھے۔ مصلے بچھوا دیے تھے تا کہ وہ نماز ادا کریں اور لوگ ایک دوسرے سے یہ پوچھتے تھے کہ بھائی فلاں نماز میں حضرت صاحب کون سی سورہ پڑھتے ہیں اور فلاں نماز میں کون سی سورہ پڑھتے ہیں، شام کو کیا ورد ہوتا ہے اور صبح کو کیا ورد ہوتا ہے اور اس بات کی کوشش کرتے تھے کہ کون کون سے گناہ سے بچیں۔ تو صاحب اگر آپ کرامات کے قائل نہیں ہیں تب بھی یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ انسانوں کے قلوب کو نیکی فلاح کی طرف راغب کیا۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ یہ بزرگ علمی و ادبی اعتبار سے ایک بڑے دبستاں کی حیثیت رکھتے تھے۔ ایک بہت بڑا ادارہ ایک بہت بڑا Institution تھے۔ دبستان

نظام کا پہلا باب جو ہے وہ حضرت سلطان جی رحمتہ اعلیہ کی معلومات کی گہرائی ظاہر کرتا ہے۔ مثلاً یہ کہ اتنا حاضر علم تھا کہ کسی نے قرآن مجید کی کسی آیت کا کوئی لفظ منہ سے نکالا تو آپ نے وہ آیت پڑھ دی۔ کسی نے کسی حدیث کا تذکرہ چھیڑا تو آپ نے اُس حدیث کی روایت بیان کر دی۔ کسی نے کسی شعر کا مصرع پڑھا تو آپ نے پورا شعر پڑھ دیا۔ تو یہ چیز جو ہے۔ یہ برجستگی اور تیزی یہ حافظہ یہ یادداشت اس پہ قربان جانے کو دل چاہتا ہے اسی انداز پر امیر خسرو کو تربیت حاصل ہوئی تو پھر انیس برس کی عمر میں انہوں نے پہلا دیوان مرتب کیا اور حضرت کی خدمت میں آئے مسودہ دیا۔ حضرت نے ملاحظہ فرمایا اور کہا کہ بھائی اصفہانیوں کی طرح لکھا کرو اور پھر سمجھایا کہ اصفہانیوں کی طرح لکھنے کا مطلب کیا ہے اور اُن کی نظم ونثر کی اصلاح ہوتی رہی۔

کوئی کتاب امیر خسرو کی ایسی نہیں ہے جو حضرت سلطان جی کے ذکر سے معمور نہ ہو۔ حضرت امیر خسرو کی موسیقی کو چمکانے والے حضرت سلطان جی ہیں۔ پھر حسن سجزجو امیر خسرو کی ٹکر کے شاعر تھے۔ شبلی نے لکھا ہے کہ حسن اس پائے کے شاعر تھے کہ خسرو کو اُن پر ترجیح نہیں دی جاسکتی۔ وہ برجستگی میں خسرو سے بڑے ہیں۔ خواجہ حسن سجز نے وہ کام کر دیا جو یادگار ہے۔ حضرت سلطان جی کے ملفوظات فوائد الفواد کے عنوان سے مرتب کیے۔ 15 سال کے فوائد لکھے ہیں۔ وہ کتاب ایسی ہے جو ملفوظات کا پہلا مستند مجموعہ ہے اور میرا خیال یہ ہے کہ ہندوستان میں بنگلہ دیش میں ایران میں افغانستان میں وسط ایشیاء میں ہر جگہ بڑی دل چسپی سے پڑھی جاتی ہے۔

پھر خواجہ ضیاالدین برنی تاریخ فیروز شاہی والے نے تاریخ کا ہنر اور انداز حضرت سلطان ہی سے سیکھا۔ سیر الاولیا جیسی کتاب لکھی ایسی جو چشتیہ سلسلے کی انسائیکلو پیڈیا ہے۔ جس ذات گرامی نے اِن لوگوں کی تربیت کی وہ علم وادب کا نہایت اعلیٰ اور نہایت مستحکم دبستان تھا۔ میری کتاب دبستان نظام میں نے جس کے لکھنے میں تین برس لگائے اس کا ابتدائیہ حضرت کی درگاہ دلی میں لکھا تھا۔ اس کا اختتامیہ مدینہ منورہ میں لکھا اور میں سمجھتا ہوں کہ میری زندگی کا اگر کوئی کام ہے تو یہی ہے۔ تصوف کے بارے میں پیرومرشد ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان نے میرے بے ربط خیالات کی تہذیب کی ان کا فیض میرے لیے بڑی نعمت تھا۔

شاعری جو ہے وہ وقت کے ساتھ ساتھ آدمی کو Haunt کرتی ہے۔ مثلاً یہ کہ آج امیر خسرو کا شعر پڑھیں تو آپ ہفتوں سر دھنتے ہیں حافظ کا کوئی شعر پڑھا، کسی اور شاعر کا کوئی شعر پڑھا۔ اقبال کا کوئی شعر پڑھا، اُسی کو گنگنا رہے ہیں تو ہر شاعر کا کوئی نہ کوئی شعر اچھا لگتا ہے۔ نظیری ہوں، فیض ہوں، بیدل، غالب ہوں۔ خسرو ہوں اور صاحب آپ کے بڑے اچھے شاعر جنہیں آپ نہیں پڑھتے وہ واقف لاہوری ہیں کیا اچھی غزل ہے۔

ہر غنچہ بشگفت الادل من
اے وادل من صدا دل من

اور بیدل تو بہت ہی بڑا شاعر ہے۔غنیمت کی مثنوی نیرنگ عشق پہلے پڑھائی جاتی تھی بیدل بڑے شاعر تھے اور ہمارے اپنے زمانے کی اقبال کی جو غزلیں ہیں ''جاوید نامہ'' میں وہ اپنی جگہ ایک شاہ کار کی حیثیت رکھتی ہیں، مگر افسوس یہ ہے کہ ہمارے ملک سے فارسی کا چلن اُٹھ گیا ہے اور ہم اپنے ادبی اور ثقافتی سرمائے کے بڑے حصے سے محروم ہوتے چلے جارہے ہیں۔

جدید شاعروں میں جو بڑے شاعر ہیں وہ سب بہت اچھے ہیں۔ میں جوش کو بھی پڑھتا ہوں، فیض کو بھی پڑھتا ہوں۔منیر نیازی کو اور اپنے دوست احمد فراز کو بھی، قاسمی صاحب کو بھی، زہرا نگارہ، کشور ناہید اور فہمیدہ ریاض، فاطمہ حسن اور شاہدہ حسن کو بھی پڑھتا ہوں بلکہ فہمیدہ ریاض میں تو تصوف کی ایک لگن پائی جاتی ہے۔مولانا روم کی جن غزلوں کا اردو میں ترجمہ کیا وہ تو ایک بہت ہی نادر اور نفیس تجربہ ہے۔انہوں نے مولانا روم کی مثنوی فارسی میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔

ایک تو فوائد الفواد میری زندگی میں سب سے بڑی کتاب ہے۔میرے گھر کے ہر کمرے میں آپ کو یہ کتاب ملے گی۔میری صبح کا آغاز ایک سپارے کی تلاوت اور فوائد الفواد کی ایک مجلس کے مطالعے سے ہوتا ہے۔

میں روزنامہ ''ڈان'' باقاعدہ پڑھتا ہوں، 1942ء سے لے کر آج (8 مئی 2011) تک کے اخبارات باقاعدہ پڑھے اور ہندوستان میں دلی سے مسلم لیگ کا ایک اخبار نکلا کرتا تھا جس کا نام منشور تھا۔حسن ریاض ایڈیٹر تھے، ان کی کتاب ''پاکستان ناگریز تھا'' تاریخی اہمیت کی حامل ہے، وہ پڑھتا رہا۔کراچی کے اردو اخبار بھی پڑھتا ہوں۔

دورانِ سفر چھوٹے چھوٹے سفر کے لیے کبھی کوئی اور کبھی کوئی کتاب ساتھ رکھ لیتا ہوں اور حقیقت تو یہ ہے کہ اب ایک ہی سفر کرنا باقی رہ گیا ہے جس میں مطالعے کا کوئی تصور نہیں ہے۔ دورانِ سفر اخبار پڑھ لیا، رسالہ پڑھ لیا۔مطالعے کے لیے انسان کو اپنی پوری صلاحیتوں کو مجتمع کرنا پڑتا ہے۔حافظے کا معاملہ کچھ ایسے ہے کہ مجھے ہزاروں شعر یاد ہیں اور واقعی یہ بات بالکل صحیح ہے کہ مجھے بے شمار شعر یاد ہیں، تاریخیں یاد ہیں، واقعات یاد ہیں، نثر کے ٹکڑے یاد ہیں، حافظہ اچھا ہے۔مثلاً کسی کا ٹیلی فون آیا کہ صاحب یہ شعر بتادیجئے۔غالب کے دیوان میں ڈھونڈنا پڑے گا آپ سے فوراً معلوم ہوجائے گا تو اس طرح کے ٹیلی فون مسلسل آتے ہیں۔ان کو یاد رکھنے کا معاملہ، مجھے اپنے والد سے ورثے میں ملا ہے۔انھیں کئی ہزار شعر یاد تھے۔

میرے ذوق مطالعہ کا میرے بچوں پہ بہت اچھا اثر ہوا ہے۔ میرے بڑے بیٹے

آصف کا جدید ادبیات میں مطالعہ مجھ سے بہت زیادہ ہے۔ وہ انگریزی میں بھی لکھتے ہیں اور ہم دونوں ادبی موضوعات پر تبادلہ خیال کرتے ہیں اور ایک دوسرے سے استفادہ کرتے ہیں۔ وہ کوئی کتاب پڑھتے ہیں تو مجھے بتاتے ہیں، میں کوئی نئی کتاب پڑھتا ہوں تو میں اُن کو بتاتا ہوں تو پھر اُس کے بعد گفتگو ہوتی ہے، مکالمہ ہوتا ہے۔ افسوس ہے کہ خفت بصارت کی وجہ سے پڑھنا برائے نام رہ گیا ہے۔ آئے روز ایک نئی کتاب مجھے دکھاتے ہیں، مگر میں پڑھ نہیں سکتا صرف افسوس کر سکتا ہوں۔

ذاتی لائبریری ہے تو سہی لیکن مرتب نہیں کیونکہ کتابیں رکھنے کے لیے جگہ نہیں ہے۔ میرے بزرگوں نے بہت کتابیں جمع کی تھیں۔ میں نے آپ کو بتایا کہ 16-15 ہزار کتابیں تھیں جو بعد میں ہندوستانی حکومت نے گھر کے سارے سامان کے ساتھ ضبط کر لی تھیں اور مجھے بڑا دکھ ہوا اور ساری زندگی رہے گا کہ وہ کتب خانہ صرف ساٹھ روپے میں نیلام ہو گیا تھا۔ بہت دن تک یہاں آ کر کتابوں کو جمع نہیں کیا، پھر جمع کرنا شروع کیا۔ یہاں جگہ نہیں ہے بہت سی کتابیں میں کتب خانوں کو دے دیتا ہوں۔ میں نے ایک دن اندازہ لگایا تو مجھے یہ خیال آیا کہ کم از کم اب تک تیس چالیس برس میں میں ہزاروں کتابیں مختلف کتب خانوں کو دے چکا ہوں۔ انگلش Fiction کا بہت بڑا Collection تھا۔ تو پھر آہستہ آہستہ جمع ہو جاتی ہیں۔ اب صورت حال یہ ہے کہ اس گھر کے ہر کمرے میں کتابیں ہی کتابیں ہیں۔ کتابیں اتنی ہو گئی ہیں کہ سارے گھر والے تنگ آ گئے ہیں اور یہ بھی سچی بات ہے کہ اُن کو جدا کرنے کو دل بھی نہیں چاہتا۔ مثلاً میں نے ابھی آپ کے سامنے تذکرہ کیا کہ سیرت النبیؐ کا جو پہلا ایڈیشن ہے وہ میرے پاس ہے، اب جی نہیں چاہتا کہ وہ ایڈیشن کسی کو دے دوں۔ بہت بڑا اطمینان ہے اور وہ اطمینان یہ ہے کہ میری کتابیں کباڑیوں کے ہاں نہیں جائیں گی کیوں کہ میری ساری کتابیں آصف سنبھال لیں گے۔ ان کا گھر بھی اسی طرح کی کتابوں سے بھرا ہوا ہے اور یہ کہ اُن سے کہا ہے کہ تم جس کتب خانے کو بہتر سمجھو اُسے دے دینا۔

سینکڑوں کتابیں ضائع ہوئیں۔ افسوس ہوتا ہے جو لے گیا اُس نے واپس نہیں کی مگر یہ کہ ایک شاگرد ہے اُسے ضرورت ہے تو کتاب تو دینا پڑے گی۔ بعض اچھی ہیں ایسی ہیں مثلاً محمد حسین آزاد کی کتابوں کا پورا سیٹ میرے پاس ہے۔ اُن میں سے اگر کوئی کتاب ضائع ہو جائے تو وہ پھر مل نہیں سکتی۔

باقی زندگی کے لیے جو تین کتابیں پسند کرنے کی بات ہے ان میں ایک ''تو فوائد الفواد'' ہو گی، دوسری کتاب ''دیوان غالب'' ہو گی اور تیسری کتاب ''بستان نظام'' ہو گی۔

بہت سی ایسی تحریریں ہیں جن سے اشتعال پیدا ہوتا ہے ایک تحریر تھوڑی ہے بے شمار

تحریریں ہیں۔لوگ دل آزاری سے باز نہیں آتے۔شائستگی کو مدنظر نہیں رکھتے، مجھے سفید رنگ پسند ہے آپ کو کوئی دوسرا رنگ پسند ہے تو بھائی اس کی ضرورت نہیں ہے کہ مجھ میں اور آپ میں تکرار ہو اور آپ میری دل آزاری کے لیے سفید رنگ کو بُرا کہیں۔ یہ آج کی دنیا میں جو دل آزار چیزیں لکھی جارہی ہیں اور ان کے پیچھے عصبتیں ہوتی ہیں وہ قابل نفرت ہوتی ہیں۔

اشتعال انگیز تحریریں نفرت پھیلانے اور خبث باطن کے اظہار کے لیے لکھی جاتی ہیں۔ دل آزاری کے لیے لکھی جاتی ہیں، فساد کرانے کے لیے لکھی جاتی ہیں۔ ہماری تعلیم تو یہ ہے کہ کسی کو برا نہ کہو، ہر بزرگ ہمارا بزرگ ہے۔اس کی عزت کرو، یہ کیا کہ دوسرے بزرگوں کی مذمت شروع کردی کوئی کارٹون بنانے لگا کوئی ناول لکھنے لگا، یہ سب نہایت تکلیف دہ باتیں ہیں اور خبث باطن کا اظہار ہیں۔ پھر ادب میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جو ایک دوسرے کے خلاف لکھتے ہیں۔تو وہ جو خلاف لکھتے ہیں تو اُن کو حق ہے کہ ضرور لکھیں کہ صاحب غالب جو تھا بڑا گھٹیا شاعر تھا۔ٹھیک ہے صاحب بالکل ٹھیک ہے اگر آپ کی رائے ہے تو اس میں آپ اپنی رائے پر قائم رہیں۔ میں اپنی رائے پر قائم رہوں گا کہ غالب اچھے شاعر تھے۔مگر آپ اگر یہ کہیں کہ فلاں شاعر یا نثر نگار تو ذلیل آدمی تھا، کمینہ تھا تو یہ تو دل آزاری کی بات ہوگی اور اس دل آزاری سے فضا اور ماحول خراب ہوگا، نفرت پھیلے گی۔اگر آپ کسی شخص کی علمی یا ادبی حیثیت کے منکر ہیں تو آپ انکار کیجئے کوئی حرج نہیں لیکن گستاخی نہ کیجئے۔

میرے مطالعے کے اوقات مقرر نہیں۔ ہر وقت اور ہر جگہ یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ میں کتاب پر نشان نہیں لگاتا جو کچھ پڑھتا ہوں اسے ذہن میں محفوظ رکھتا ہوں اور حسب ضرورت اس سے فائدہ اٹھاتا ہوں۔ یہ سب باتیں اس وقت کی ہیں جب آتش جواں تھا۔اب دنیا کے ستم یاد نہ اپنی ہی وفا یاد۔ یہ خواب وخیال ہوگیا۔ نہ کسی سے شکوہ ہے نہ کسی سے کوئی گلہ، سب اچھے ہیں۔ سارے لکھنے والے لائق تحسین ہیں۔اللہ تعالیٰ ان سب کو خوش رکھے۔

میری متاثر کن کتابیں

ڈاکٹر مبارک علی

تاریخ دان 1941 میں ٹونک راجھستان میں پیدا ہوئے۔ قیام پاکستان کے بعد حیدر آباد سندھ میں آ کر مقیم ہوئے۔ 1963 میں ایم اے تاریخ کیا اور سندھ یونی ورسٹی میں لیکچرر رہے۔ 1976 میں جرمن یونی ورسٹی سے مغل دربار کے موضوع پر مقالہ لکھا اور ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ 1989 میں لاہور منتقل ہو گئے 1994 میں گوئٹے انسٹی ٹیوٹ لاہور کے ریزیڈنٹ ڈائریکٹر مقرر ہوئے اور اب صرف تصنیف و تالیف کے لیے وقت ہیں، وہ اپنی تحریروں میں تاریخ کی اہمیت اور افادیت خصوصاً تاریخ میں معاشرتی، عوامی اور ثقافتی عوامل کی شمولیت پر زور دیتے ہیں ان کے کالم اردو، انگریزی اخبارات کی زینت بنتے ہیں۔ اب تک متعدد کتب لکھ چکے ہیں، ان کی معروف کتب المیہ تاریخ، شاہی محل، مغل دربار، آخری عہد مغلیہ کا ہندوستان، تاریخ کے بدلتے نظریات، برصغیر میں مسلم قوم کا المیہ، اچھوت لوگوں کا ادب۔ 1988 میں ڈاکٹر مبارک علی کو فیض ایوارڈ دیا گیا۔ آج کل روزنامہ جہان پاکستان میں کالم لکھ رہے ہیں اس سے پہلے وہ فرنٹیئر پوسٹ، روزنامہ آج کل میں کالم لکھتے رہے ہیں۔

علمی سفر کی ابتدا تو ہوتی ہے، اس کی انتہا کوئی نہیں۔ جب یہ سفر شروع ہوتا ہے تو جستجو اور اشتیاق کے جذبات پیدا ہوتے ہیں، تخیلات کی دنیا آباد ہوتی ہے۔ وقت اور عمر کے ساتھ جاننے، اور حاصل کرنے کے شوق میں تبدیلی آتی رہتی ہے۔ بچپن میں جو پڑھا تھا، جوانی میں اس کی اہمیت نہیں رہتی ہے، پھر جب علم کا حصول بڑھتا ہے تو اس کے ساتھ ساتھ خیالات میں بھی تبدیلی آتی ہے۔ نظریات بدلتے ہیں، اور سچائی یا حقیقت تک پہنچنے کے بارے میں برابر تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ اس لیے جب کوئی یہ سوال پوچھتا ہے کہ آپ کا پسندیدہ مصنف کون ہے؟ یا کون سی کتاب نے سب سے زیادہ آپ کو متاثر کیا؟ تو اس کا جواب نہیں دیا جا سکتا کیوں کہ وقت کے ساتھ مصنف بدلتے رہتے ہیں، ایک کتاب کے بعد دوسرے کتاب آپ کے لیے علم کے دروازے کھولتی رہتی ہے، اور یوں یہ سفر جاری رہتا ہے۔

میرا خیال یہ ہے کہ بچپن میں جو پڑھا جاتا ہے، اس میں رومان ہوتا ہے، جنوں، پریوں

کی باتیں ہوتی ہیں کہ جو ایک دوسری دنیا میں رہتے ہیں۔ لہٰذا یہ آپ کو خوشی و مسرت کے جذبات سے معمور کر دیتا ہے۔ مگر جب آپ ان کہانیوں سے نکل کر حقیقت کی دنیا میں آتے ہیں، تو پھر زندگی کی تلخیاں بھی ہیں تو مسرت کے لمحات بھی، اصل زندگی کے بارے میں علم انسان کو افسردہ کر دیتا ہے۔ جب سچائی کی تلاش کی جائے اور یہ آپ کو نہ ملے تو آپ اور زیادہ مایوس ہو جاتے ہیں اور اگر آپ اپنی سچائی کو پالیں، مگر اس پر عمل کرنے والے نہ ہوں تو پھر آپ تنہائی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ علم آپ کے سکون اور اطمینان کو چھین لیتا ہے۔ یہ آپ کے ذہن کو زیادہ پریشانیوں میں مبتلا کر دیتا ہے۔ بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ کوئی عالم سچائی کو پالیتا ہے اور اسے سکون مل جاتا ہے۔ ورنہ یہ ایک نہ ختم ہونے والا جستجو کا سلسلہ ہے۔ یہ بھول بھلیاں ہیں کہ جس میں آدمی گم ہو جاتا ہے۔

میں نے بچپن میں جن کتابوں سے اس سفر کا آغاز کیا ان میں داستان امیر حمزہ، طلسم ہوشربا، قصہ چہار درویش اور قصہ حاتم طائی وغیرہ تھے۔ ان کتابوں کو پڑھ کر تخیل ایک دوسری دنیا میں لے جاتا تھا کہ جہاں طلسمات تھے، عمرو عیار کی زنبیل تھی اور بھول بھلیاں تھیں کہ جن تک پہنچنا مشکل تھا۔ یہ کتابیں مجھے اس دنیا سے دور ایسی دنیاؤں میں لے جاتی تھیں کہ جہاں کی ہر چیز نئی تھی، حیران کرنے والی، اور حقیقت کی دنیا سے بہت دور۔ ان کتابوں سے تخیل میں وسعت آئی، یہ احساس ہوا کہ ہمارے علاوہ بھی اور دنیائیں ہیں، زندگی میں اچھے اور برے انسان ہیں۔ اس دنیا میں انسان ہر وقت امتحان کے عالم میں رہتا ہے۔ اس سے برابر سوال پوچھے جاتے ہیں اور وہ جواب کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔

اس مرحلے سے گزر کر، تاریخی اور جاسوسی ناول پڑھنے کا شوق ہوا۔ تاریخی ناولوں میں عبدالحلیم شرر اور صادق حسین صدیقی کے ناول تھے۔ اس وقت ان ناولوں کے پڑھنے کے بعد جذبہ ایمان ابھرتا تھا اور شدید خواہش ہوتی تھی کہ تلوار لے کر نکل جائیں اور کافروں کو قتل کر کے ان کے کشتوں کے پشتے لگا دیں۔ اگرچہ ان ناولوں کا ماڈل ایک ہی جیسا ہوتا تھا، مگر ہر ناول میں اپنا لطف تھا۔ ان سے زیادہ موثر اور اسلامی تاریخی ناول نسیم حجازی کے تھے کہ جس میں مسلمانوں کی فتوحات اور ان کی بہادری اور شجاعت کے بڑے دل نشیں پیرائے میں بیان کیا گیا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ میں ان کے ایک ناول سے اس قدر متاثر ہوا کہ ان کے پیرائے میں، میں نے بھی ایک افسانہ لکھ ڈالا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان تاریخی ناولوں نے مسلمان معاشرے کو ایک خاص قسم کا تاریخی شعور دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہماری تاریخ صرف فاتحین اور جنگ جوؤں کے کارناموں میں محدود ہو کر رہ گئی اور جہاد اور کافروں کا قتال تاریخ کا اہم باب بن گیا۔

اس کے بعد جاسوسی ناولوں کا نمبر آیا۔ اس وقت تیرتھ رام فیروز پوری کے ترجمہ کیے

ہوئے ناول بڑے مقبول تھے۔ انھوں نے آرتھر کونن ڈائل کے ناولوں کا ترجمہ کیا جس میں شرلاک ہومز اور ڈاکٹر واٹسن اہم کردار ہیں۔ جاسوسی ناول ذہن کو سسپنس میں مبتلا رکھتے ہیں۔ اس میں راز پر پردے پڑے ہوئے ہیں جو آہستہ آہستہ اٹھتے ہیں۔ جب تک یہ راز کھل نہ جائے، قاری کا ذہن اس کی قید میں رہتا ہے۔ اس وقت جاسوسی ناول بہت پڑھے جاتے تھے چونکہ اردو میں اس قسم کے ناول کا رواج نہیں تھا اس لیے یہ انگریزی سے ترجمہ ہوتے تھے اور محلّہ کی لائبریریوں میں آجاتے تھے۔

ان ناولوں نے پڑھنے کی عادت ڈالی۔ کتابیں لوگوں کا ذہن بناتی ہیں، اگر کوئی صرف کتابوں کو پڑھ کر آگے نہیں بڑھے تو اس کا ذہن بھی ایک جگہ ٹھہر جاتا ہے۔ جیسا کہ اکثر ہوتا ہے۔ ان کی سوچ ان کی ہی تاریخی اور جاسوسی ناولوں کی سوچ ہو جاتی ہے۔ لیکن اگر علم کا سفر جاری رہے تو سلسلہ اس سے آگے بڑھتا ہے اور سوچ میں بے قراری پیدا ہوتی ہے۔ جاسوسی ناول پڑھنے کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اس میں تجسس پیدا ہوتا ہے اور قاری یہ اندازہ لگانے کی کوشش کرتا ہے کہ آخر اصل راز کیا ہے؟ اگر اس میں مجرم کا سلسلہ ہوتا ہے تو وہ وجوہات تلاش کرتا ہے کہ جو اسے مجرم تک لے جائیں۔ اگر ناول میں جرم کے مقدمات ہوتے ہیں تو وہ وکیلوں کے دلائل سے متاثر ہوتا ہے۔ یہ ناول قاری میں تحقیق اور تلاش کا جذبہ پیدا کرتے ہیں۔

اس زمانہ میں رائیڈر ہیگر یڈ کے ناولوں کا اردو ترجمہ ہوا، ان میں ''خزانہ کی تلاش' مانٹی زیوما کی دختر' چکہ'' جو کہ زولو قبیلہ کا حکمراں تھا اس کی داستاں، اور شی (She) جس کا ترجمہ ''روح کی داستاں'' اور ''روح کی واپسی'' کے طور سے ہوا۔ بعد میں میں نے ان کے انگریزی ورژن بھی پڑھے۔ رائیڈر ہیگر یڈ کا بیٹا جنگ عظیم اول میں مارا گیا تھا، جو اس کے لیے بڑا صدمہ تھا۔ اس لیے وہ روح اور روح سے ملاقات کرنے کا یقین کرنے لگا تھا۔ شاید روح کی واپسی اسی پس منظر میں لکھا گیا ہو۔

اس کے بعد اردو کے افسانے اور ناولوں کو پڑھنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ ڈپٹی نزیر احمد کے کچھ ناول تو ہمارے نصاب میں تھے۔ اس لیے پڑھنا پڑے، ان میں زبان کی روانی شستگی تو ہے مگر یہ اصلاحی ناول ہیں، ان میں کوئی جان نہیں ہے۔ مرزا ہادی رسوا کا امراؤ جان ادا، ان کے دوسرے ناولوں کے مقابلے میں سب سے عمدہ ہے۔ منشی پریم چند کے ناول اور افسانے ہمارے معاشرے کی عکاسی کرتے ہیں۔ ان کا افسانہ کفن تو آج بھی یاد کر کے دل کو ہلا دیتا ہے۔ عظیم بیگ چغتائی، عصمت چغتائی، کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، قرۃ العین حیدر کے بعد میرا اردو ناول اور افسانوں کا سلسلہ تقریباً ختم ہوگیا۔ حال ہی میں ایک طویل عرصہ بعد میں نے شمس الرحمٰن فاروقی کا

ناول ''کئی چاند تھے سر آسماں'' پڑھا۔ اگر چہ اردو میں اب نئے لکھنے والے آ گئے ہیں، لیکن میرا رابطہ اب فکشن سے بہت گہرا نہیں رہا۔ کبھی کبھار کوئی ایک آدھ افسانہ پڑھنے کو مل جاتا ہے، کہ جس میں نئی تازگی ہوتی ہے ورنہ مجھے اردو کے لکھنے والوں میں وہ تخلیقی صلاحیت نہیں نظر آئی کہ جو دوسرے زبانوں کے لکھنے والوں میں ہے۔

جب میں نے انگریزی میں ترجمہ کیے ہوئے روسی، فرانسیسی اور جرمن زبانوں کے ناول اور افسانے پڑھے تو یہ ایک دوسری ہی دنیا تھی جو دریافت ہوئی۔ انگریزی کا پہلا ناول جو میں نے پڑھا وہ پرل ایس بک (Perl As. Buck) کا گڈ ارتھ (Good Earth) تھا۔ لیکن ناولوں کو پڑھتے ہوئے جب میں دوستوفسکی کا ناول (Crime and Punishment) یعنی ''جرم وسزا'' پڑھا تو اس نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔ اس کے بعد میں نے اس کے دوسرے ناول اور افسانے پڑھے اور اس کی تحریروں کے پس منظر میں اس کے فلسفہ کو سمجھنے کی کوشش کی۔ اس کی زندگی کی کہانی بھی اس کے ناولوں کی طرح افسردگی اور رنج وغم سے بھری ہوئی تھی۔ اس کا باپ ایک زمیندار تھا جو اپنے مزارعوں کے لیے سخت ظالم و جابر تھا۔ اس لیے ایک دن انھوں نے اس کو قتل کر دیا۔ اس وقت دوستو فسکی 17 یا 18 سال کا تھا۔ اس کے بعد یہ تعلیم کے لیے سینٹ پیٹرز برگ چلا آیا۔ یہاں طلبا کی سیاست میں شریک ہوا، جو زار روس کے خلاف تھے۔ یہ طلبا گرفتار ہوئے اور عدالت نے انھیں سزائے موت دی۔ کہتے ہیں کہ جس دن ان کو قتل کیا جانا تھا۔ عین وقت پر زار روس نے ان کی سزائے موت ختم کر کے انھیں 8 سال کے لیے سائبیریا بھیج دیا۔ اس قید میں اس کے کئی ساتھی سردی اور جیل کی سختیوں کی وجہ سے مر گئے۔ یہ زندہ تو رہا مگر اس نے زندہ رہنے کے لیے روحانی قوتوں کا سہارا لیا۔ جیل سے رہائی کے بعد اس کی زندگی پریشانیوں میں ہی گزری، جوا، شراب اور بے چینی کی زندگی۔ اس لیے اس کے ناولوں اور افسانوں میں اس کی جھلک ملتی ہے۔ اگر چہ اس کے عہد میں سائنس اور عقلیت کا زور تھا، مگر یہ انسان کے اندر جو جذبات وخیالات ہوتے ہیں، ان کو عقلیت پرستی پر ترجیح دیتا ہے۔ روح کی تشویش، احساسات اور دکھ و درد کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ جرم وسزا کا ہیرو جو اس صورت حال سے دوچار ہے، اس سے اس کی محبوبہ کہتی ہے کہ وہ اپنے جرم کو تسلیم کر لے، تب ہی اسے راحت وسکون ملے گا۔ آخر میں وہ ایسا ہی کرتا ہے۔ اپنے جرم یا جرائم کو تسلیم کرنا اور اس کے نتیجے میں سکون پانا، صرف فرد کا ہی مسئلہ نہیں ہے، یہ تو قوموں کا مسئلہ بھی ہے۔ جو جرائم کا جواز تلاش کرتی ہیں، اور اسے تسلیم کرنے سے گریز کرتی ہیں، اس وقت سامراجی قوتوں کے لیے بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے جرائم کو مان کر، اپنے گناہوں کی تلافی کریں۔ ہمارا بھی کام ہے کہ ہم نے بنگلہ دیش کے ساتھ جو کچھ کیا، اس پر اس سے معافی مانگیں۔ اس سے جرم کا احساس ہوتا

ہے اور سوچا یہ جاتا ہے کہ آئندہ ایسے جرائم کا ارتکاب نہیں کیا جائے گا۔ مگر جب جرائم کو جرائم نہیں سمجھا جائے تو پھر ایک کے بعد دوسرا جرم سرزد ہوتا رہتا ہے، اور فرد اور قومیں انسانیت سے دور ہوتی چلی جاتی ہیں۔ اس کا مشہور ناول ''Notes from underground'' مجھے پاکستان میں نہیں ملا تھا۔ یہ لندن کی ایک کتابوں کی دکان پر ملا، اور میں نے اسی دن اسے پڑھ ڈالا۔ یہ اس کے بہترین ناولوں میں سے ایک ہے۔

اس کے بعد روسی فکشن سے دل چسپی ہوئی تو گوگول، چیخوف ور ترگنیف کو پڑھا۔ ٹالسٹائی کے ناولوں نے ایک طرح سے گھیر لیا۔ مجھے یاد ہے کہ جب میں اس کا ناول وار اینڈ پیس پڑھ رہا تھا تو یہ سردیوں کے دن تھے، صحن میں چاندنی بکھری ہوئی تھی، اداس اور خاموش رات کے دو اور کبھی کبھی تین بج جاتے تھے۔ صبح اٹھنے کے خیال سے ناول رکھ کر سوجاتا تھا، جب ناول ختم کیا تو اس کا اثر دل و دماغ پر تھا۔ اس ناول میں ٹالسٹائی نے تاریخ کا فلسفہ بھی بیان کیا ہے۔ وہ تاریخ میں فرد کے کردار کا حامی نہیں کہ وہ انقلابی تبدیلی لے کر آتا ہے۔ ایک لیڈر یا راہ نما اس جانور کی طرح ہے کہ جس کے گلے میں گھنٹی بندھی ہوتی ہے اور پورا گلہ اس کے پیچھے پیچھے ہے۔ اس میں نپولین کا کردار ابھر کر آتا ہے کہ جب اسے روس کے خلاف جنگ میں ناکامی ہوتی ہے تو وہ خود تو راہ فرار اختیار کر لیتا ہے اور اس کی فوج برف باری میں بھوکی پیاسی جگہ جگہ مردے چھوڑتے ہوئے واپس ہو رہی ہے۔ اس وقت جب کہ فوج کے پاس کھانے کو نہیں تھا۔ نپولین کو خوراک اور شراب مل رہی تھی وہ خود تو حفاظت سے پیرس پہنچ گیا، مگر اس کی فوج تباہ ہو گئی۔ لیڈر اور راہ نما یہ سلوک کرتے ہیں اپنی رعایا کے ساتھ یا اپنے پیروکاروں کے ساتھ۔

گورکی قدیم اور جدید کے دور کا لکھنے والا تھا۔ اس کی کتاب ماں نے بڑی تعداد میں نوجوانوں کو انقلابی بنایا۔ اس کے ناولوں اور افسانوں کے ساتھ ساتھ اس کی آپ بیتی لاجواب ہے۔ انقلاب کے بعد لینن نے اسے پیش کش کی کہ وہ حکومت میں شامل ہو جائے، مگر اس نے انکار کیا اور ایک دانش ور کی طرح ریاست سے دور رہ کر اس پر تنقید کی۔ انقلاب کے بعد ایسا محسوس ہوا کہ روسی لکھنے والوں کی تخلیقی صلاحیت شاید دم توڑ گئی۔ شولوخوف میں وہ بات کہاں۔ بعد کے ادیبوں میں بورس پیسٹرنک، ڈاکٹر ژواگو اور سولزے نت زن کے ناولوں میں پھر بھی جان ہے۔ انقلاب سے پہلے روسی فکشن میں انقلاب سے پہلے کے معاشرے کی بہترین عکاسی کی گئی ہے، یہ روس کی سماجی اور ثقافتی تاریخ ہے۔ ان ناولز کو پڑھنے کے بعد روسی نام اور ماحول سے اس قدر رومانیت ہوئی کہ معلوم ہوتا تھا کہ ہم خود اس کا ایک حصہ ہیں۔

روسی فکشن کے بعد فرانس کے ادیبوں کی تحریریں پڑھیں، وکٹر ہیوگو کا لے مزرا ابل کا

بھی یہی حال ہے کہ پڑھنا شروع کرو تو چھوڑنے کو دل نہیں چاہتا۔ قانون کی اس جنگ میں بالآخر قانون ہار جاتا ہے۔ اس کا دوسرا ناول Hunch back of Notredame محبت کے جذبات کی تصویر ہے۔ وکٹر ہیوگو فرانس کے ایک ایسے دور میں پیدا ہوا تھا جو انقلابات اور عوامی جدوجہد کا دور تھا۔ پیرس کے عوام فوج کا مقابلہ کرنے کے عادی ہو گئے تھے۔ اس کے ناولوں میں اس کے عوام کے نظریات اور تبدیلیاں نظر آتی ہیں۔

بالزاک ان ناول نگاروں میں سے تھا جو سولہ سولہ گھنٹے متواتر لکھا کرتا تھا، اور رات کو جاگنے کی خاطر تیس کے قریب کافی کے کپ پی جاتا تھا۔ اس لیے اس کی تحریریں تو بہت ہیں مگر اس کا ناول ''بڈھا گوریو'' جس کا اردو میں ترجمہ بھی ہو چکا ہے، اس کا شاہکار ہے۔ اس ناول میں اس نے فرانس کے بورژوا طبقے کی حالت پر لکھا ہے کہ جہاں عزت و وقار کا معیار دولت ہو گئی تھی۔ چاہے اسے کسی بھی طرح سے حاصل کیا جائے۔ گوریو کی بیٹیاں اپنے باپ سے پیسہ لے کر اسے کپڑوں اور نفیس گاڑیوں کے استعمال پر خرچ کرتی ہیں تاکہ سماج میں ان کی عزت ہو۔ بورژوا طبقہ کے دیوالیہ پن پر اس کا بھرپور طنز ہے۔ گستاؤ فلوبیر کی مادام بواری میں بھی سماج میں ہونے والی تبدیلیوں کی طرف اشارہ ہے کہ جس کا شکار مادام بواری ہو جاتی ہے۔ الکزنڈر ڈیوما کے ناول دل چسپ ہیں۔ میں نے Three Musketers سے لے کر اس کی تمام سیریز پڑھیں۔

امیلا زولا Emilazola اور وان گوگ دونوں نے کان کنوں کی زندگی کا مشاہدہ کیا تھا۔ امیلا زولا نے ناول ''ناناں'' اور جرمینیل Germinale لکھے جو فرانسیسی اور یورپ کے سماجی حالات کی عکاسی کرتے ہیں جو مفلسی اور محرومیوں کی ایک داستان ہے۔ فان گوگ نے اپنی پینٹنگز میں ان کی حالت زار کو پینٹ کیا ہے۔ ان کی مشہور پینٹنگ (Patato Featers) ان میں سے ایک ہے۔ انیسویں صدی کے فرانسیسی ادیب اور آرٹسٹ مل کر سماج میں روشن خیالی کی تحریک میں شریک تھے۔ اس کے علاوہ ''اسٹنٹ ہال'' کا ناول ''Black and Red'' مذہبی راہ نماؤں اور فوج کے کردار کی عکاسی کرتا ہے۔ سارتر، کامیو کے ناول اور افسانے وجودیت کے فلسفے کا اظہار ہیں۔ جو دوسری جنگ عظیم کے بعد یورپ کے ذہنی انتشار کو بیان کرتا ہے۔

انگریزی ناولوں میں چارلس ڈکنز، برونٹے سسٹرز، آسکر وائلڈ، جیمس جوائس، ہنری لارنس اور دوسرے ناول نگاروں کو پڑھا، مگر مجھے ان سب میں ٹامس ہارڈی پسند ہے۔ گوئٹے کا فاؤسٹ پہلے انگریزی میں اور بعد میں جرمن میں پڑھا۔ جرمن ناول نگار، ناول بھی فلسفہ کی مانند لکھتے ہیں، ان میں ٹامس من، ہرمن ہیسے، ہائنرش بول، گنتر گراس کو پڑھا۔

امریکی ناول نگاروں میں ہیمنگ وے اور فاکنز کو پڑھا۔ ڈراموں میں شیکسپیئر تو کورس

میں تھا، اس لیے اسے پڑھنا پڑا، برنارڈ شا غضب کا ڈرامہ نگار ہے۔ برتولڈ بریخت کے ڈرامے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے لیے ہی لکھے گئے ہیں۔ میں نے اس کے چند افسانے اور ایک ڈرامہ ترجمہ کیا ہے۔ بریخت اس لیے اہم ہے کیوں کہ وہ فاشزم کے لیے لڑا ہے، اور اس کی تحریروں کا مقصد عام لوگوں میں شعور پیدا کرنا ہے۔ اس نے شاعری بھی کی، مضامین بھی لکھے، اور افسانے و ڈرامے بھی تحریر کیے۔ نازی حکومت کے دوران اس نے جرمنی کو چھوڑ دیا تھا۔ جنگ کے خاتمہ پر اسے اتحادیوں نے مغربی جرمنی نہیں آنے دیا، اس لیے وہ مشرقی جرمنی میں مقیم رہا۔

کچھ ناول سیاسی اتار چڑھاؤ کی عکاسی کرتے ہیں، کپلنگ کا ناول کم (Kim) اس کے امپریل ازم کے خیالات کی عکاسی ہے، یہ وائٹ مینز برڈن کی تھیوری دیتا ہے کہ جس کا مشن ہے کہ وہ غیر مہذب ایشیا و افریقہ کی اقوام کو مہذب بنائے لیکن اس کے برعکس جوزف کون راڈ کے ناول Heart of Darkness اور Lord Jim امپریل ازم کے تباہ کن اثرات کا جائزہ لیتے ہیں۔ اچے وے کا ناول Fhing fall apart جس کا اردو ترجمہ ''بکھرتی دنیا'' کے نام سے ہوا ہے، بڑے فن کارانہ انداز میں سماجی تبدیلیوں کا اشارہ کرتا ہے جو امپریل ازم کے نتیجہ میں ہوئیں۔

فکشن نہ صرف انسانی ذہن کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے بلکہ اس سے سماج کے اندر جو تبدیلیاں ہوتی ہیں ان کی بھی نشان دہی کرتا ہے۔ میں نے فکشن کو پڑھ کر تاریخ کو سمجھا، تاریخ جو محض واقعات کی اسیر ہوتی ہے، وہ فکشن کا مقابلہ نہیں کرسکتی کہ جو انسان کی گہرائیوں میں جا کر ان کا مطالعہ کرتا ہے لیکن اگر دونوں کا ملاپ ہو جائے تو انسان اور معاشرہ کو سمجھا جا سکتا ہے۔

تاریخ کا مضمون ہمارے ہاں اسکول کے نصاب سے لے کر کالج تک کے نصاب میں شامل ہے لیکن یہ تاریخ انتہائی سپاٹ اور خشک مضمون ہے، اس وجہ سے طالب علموں میں یہ مقبول نہیں، اور سب کو ایک ہی شکایت ہے کہ اس میں سنہ اور تاریخوں کو یاد کرایا جاتا ہے۔ ایک تو یہ صرف سیاست تک محدود ہے، دوسرے خاندانی حکمرانوں کے تذکرے ہیں۔ لہٰذا تاریخ میں جنگوں کے حالات، انتظامی امور کی تفصیلات، اور دربار کی سرگرمیوں کا ذکر ہے۔ امتحان میں آج تک ایک ہی قسم کے سوالات پوچھے جاتے ہیں۔ سلاطین کے حکمرانوں میں کس کو اصل بانی قرار دیا جائے۔ اکبر مغل خاندان کا اصل بانی تھا، وغیرہ۔ ظاہر ہے اس قسم کی تاریخ سے نہ تو کچھ سیکھا جا سکتا ہے اور نہ ہی اس میں کسی کو دلچسپی ہوسکتی ہے۔

جب میں نے تاریخ کے مضمون کا امتحان میں پاس ہونے کے بعد مطالعہ کیا اور تاریخ نویسی اور فلسفہ کے بارے میں پڑھا تو اس مضمون کی اصل حقیقت سامنے آئی۔ برصغیر ہندوستان کی تاریخ کے بارے میں متضاد خیالات اور نظریات اس لیے پیدا ہوئے کہ اس کے لکھنے والوں کا تعلق

خاص حالات سے تھا۔ مثلاً جب ہندوستان پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا تو انھوں نے ہندوستان کی تاریخ کو یا تو ہندوستانیوں سے لکھوایا، اور یا خود خود انگریز مورخوں نے کولونیل نقطہ نظر سے تاریخ لکھی۔ غلام حسین طباطبائی کی ''سیر المتاخرین'' انگریزوں کے ایما پر لکھی گئی، اسی طرح ٹاڈ (Tod)، ڈف (Duff)، اور کننگھم (Canningham) نے راجپوتوں، مرہٹوں اور سکھوں کی تاریخ لکھی۔ جیمس مل (James Mill) نے انگریزی ہندوستان کی تاریخ لکھی جس میں اس نے تاریخ کو مذہبی بنیادوں پر تقسیم کر دیا۔ قدیم ہندوستان کو ہندو عہد سے تعبیر کیا، عہد وسطیٰ کو مسلمانوں کا دور حکومت اور جدید ہندوستان کو برطانوی عہد کہا۔ رومیلا تھاپر نے ہندو عہد پر تنقید کرتے ہوئے وضاحت کی کہ اس پورے دور کو ہندو کہنا غلط ہے، کیوں کہ اس میں بدھ حکمرانوں کا خاصا طویل عرصہ حکومت میں رہا ہے۔ یہی صورت حال مسلمانوں کے عہد میں تھی، کہ اس میں ہندو راجاؤں کی ریاستیں تھیں۔

برطانوی مورخین نے اپنی حکومت کے جواز میں اس نظریہ کو بھی دہرایا کہ ہندوستان ہمیشہ سے غیر ملکی حکمرانوں کے ماتحت رہا ہے، اس لیے ان کی حکومت بھی اس کا ایک تسلسل ہے۔ لہٰذا وہ ہندوستانیوں کو اس کا اہل نہیں سمجھتے تھے کہ وہ حکومت کرنے کے قابل ہیں۔ ان موضوعات پر میں نے اپنی کتاب ''تاریخ شناسی'' میں تفصیل سے بحث کی ہے۔

کولونیل نقطہ نظر کے جواب میں ہندوستانی مورخوں نے قوم پرستی کے نقطہ نظر سے تاریخ لکھی۔ اس کا مرکز الہ آباد یونی ورسٹی کا شعبہ تاریخ تھا۔ اس میں انھوں نے خاص طور پر مغل عہد کا انتخاب کیا کہ جس میں ہندو اور مسلمانوں نے مشترکہ تہذیب کو پیدا کیا تھا۔ 1917 کی دہائی میں سیاست میں تبدیلی کی وجہ سے تاریخی نویسی میں فرقہ وارانہ نقطہ نظر آیا۔ جس میں ہندو مسلم اتحاد اور اشتراک کے بجائے ان دونوں کے درمیان کش مکش اور تضادات کو ابھارا گیا۔

برصغیر ہندوستان کی تقسیم کے بعد، پاکستان اور ہندوستان کی تاریخ نویسی میں تبدیلی آ گئی۔ پاکستان کے مورخین کی جانب سے دو کوششیں ہوئیں، اول تو یہ کہ موجودہ پاکستان کا ہندوستان سے تعلق نہیں، دوسرا دو قومی نظریہ کی تبلیغ کی گئی۔ اس نے پاکستان کی تاریخ نویسی کو محدود کر دیا۔ میں نے جب آئی ایچ قریشی کی کتابوں کو پڑھا تو ایسا محسوس ہوا کہ انھوں نے اپنے نظریہ کو درست ثابت کرنے کی غرض سے واقعات کو مسخ کیا ہے۔ یہی صورت حال ایس ایم اکرام اور معین الحق کے ہاں ہے۔ چونکہ انھیں حکومت کی سرپرستی تھی، یونی ورسٹیوں میں ان کا تسلط تھا، اس لیے کوئی مخالف نقطہ نظر پیدا نہیں ہو سکا۔ بعد میں احمد حسن دانی نے تو بالکل حکومت کا کاسہ لیسی کی، اور تاریخ کے مضمون کو ختم کر کے رکھ دیا۔

اس کے برعکس ہندوستان میں مورخین جلد ہی تقسیم کے دائرے سے نکل گئے اور تاریخ کو کئی نقطہ ہائے نظر سے لکھا جن میں قوم پرستی، مارکس ازم اور سبالٹرن قابل ذکر ہیں۔ ان مختلف نظریات کی وجہ سے ہندوستان میں تاریخ کا مضمون بے انتہا مقبول ہے۔ ہندوستانی مورخین نے کولونیل دور پر زبردست تنقید کی ہے، جب کہ پاکستان میں اس عہد کو بالکل نظرانداز کر دیا گیا ہے۔

اسلامی تاریخ کا مطالعہ میں نے جرمنی میں رہ کر کیا۔ جرمنوں کو نہ صرف اسلام بلکہ ہندوستان اور چین کے کلاسیکل دور سے دل چسپی ہے۔ اس لیے ان کی تقریباً ہر یونی ورسٹی میں ان کے شعبہ ہیں۔ اسلامی تاریخ اور مذہب پر جرمن اسکالرز نے بڑی ریسرچ کی ہے، عربی کے مسودات کو تصیح کے بعد شائع کیا ہے، اور کلاسیکل عہد پر تحقیق کی ہے چونکہ بنیادی ماخذوں کو پڑھنے کے لیے عربی، فارسی، عبرانی اور آرامی زبانوں کا جاننا ضروری ہے۔ وہ اسلام پر تحقیق کرنے سے پہلے ان زبانوں کو سیکھتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ عربی کے بعد اسلام پر سب سے زیادہ کتابیں جرمن زبان میں شائع ہو چکی ہیں۔ ایک جرمن اسکالر بروکل مان کا یہ کارنامہ ہے کہ اس نے دنیا بھر کی لائبریوں میں موجود عربی مخطوطات کی فہرست معہ ان کے مضامین کی تفصیل کے ساتھ شائع کی ہے۔ میرے پروفیسر ہیر برٹ بوسے عربی کے عالم تھے اور انھوں نے ''آل بویہ اور محکمہ دیوان'' پر تحقیق کی ہے۔

جب میں نے ایڈورڈ سعید کی کتاب اورینٹل ازم پڑھی تو اس سے متاثر ہوا۔ مگر اس سے انکار نہیں کہ مستشرقین کی تحقیق سیاست، مذہب اور تجارت کے مفادات کے تحت ہوئی ہو، مگر انھوں نے اپنی تحقیق سے تاریخ کے نئے موضوعات کو چنا اور اس کا دائرہ وسیع کیا۔ اس کے علاوہ ان کی تحقیق انتہائی معیاری ہے۔ جس کی وجہ سے اس علم پر ان کا تسلط ہے۔ اب ہم اپنے بارے میں سیکھنے کے لیے یورپ اور امریکہ جاتے ہیں اور اپنا چہرہ ان کے آئینے میں دیکھتے ہیں۔ جب تک ہم خود اپنا علم پیدا نہیں کریں گے ہم ذہنی طور پر مفلوج ہی رہیں گے۔

تاریخ کے مضمون میں میری دل چسپی اس وقت اور زیادہ ہوئی جب میں نے فلسفہ تاریخ پر پڑھنا شروع کیا۔ اس کی وجہ سے تاریخ میں ہونے والے واقعات اور ان کی اہمیت کا احساس ہوا اور یہ کہ ان واقعات کا سماج پر کیا اثر ہوتا ہے۔ تاریخ میں ایک اہم موضوع قوموں کا عروج و زوال ہے یہ کیوں ہوتا ہے؟ اس کے پس منظر میں کیا محرکات ہوتے ہیں؟ یہ وہ سوالات ہیں کہ جو تاریخ میں واقعات کے مطالعہ کے بعد پیدا ہوتے ہیں۔ خاص طور پر اس وقت کہ جب ہمارا معاشرہ زوال کی حالت میں ہو تو یہ سوالات اور زیادہ اہم ہو جاتے ہیں۔ زوال کے اس پس منظر میں عام لوگوں کی رائے کی بھی اہمیت ہے۔ اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ ہمارے زوال کی اصل وجہ

ہماری نا اتفاقی اور فرقہ واریت ہے۔ اگر ہم متحد ہو جائیں تو تمام مسائل کو حل کیا جاسکتا ہے، یا لوگ معاشرے کی بدحالی خود غرضی، نفسانفسی، بدعنوانی اور بے ایمانی میں دیکھتے ہیں، اور اس خواہش کا اظہار کرتے ہیں کہ اگر ان خرابیوں کو دور کر دیا جائے تو سب ٹھیک ہو جائے گا لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر یہ خرابیاں کیوں پیدا ہوتی ہیں؟ ان کی وجوہات کیا ہیں؟

یہ وہ سوالات ہیں کہ جن کا جواب تاریخ کے مفکرین نے دینے کی کوشش کی ہے۔ اس سلسلہ میں میرا پہلا اتفاق آرنلڈ ٹوائن بی کو پڑھنے کا ہوا۔ 1960 کی دہائی میں انگریزی کی کتابیں مسلسل آتی تھیں۔ پینگوئن اور دوسرے اداروں کی کتابیں باآسانی مل جاتی تھیں۔ ٹوائن بی کی A Study of History کی گیارہ جلدیں ادبیات حد جوتلک چاڑی کی دکان پر تھیں میں ہر مہینے ایک جلد خریدتا تھا، اس طرح اس کی تحریروں سے واقف ہوا۔ اس کے بعد اشپنگلر کی کتاب ''زوال مغرب'' پڑھی اور پھر اس سلسلہ میں ابن خلدون کو پڑھا۔

ابن خلدون کے مقدمہ تاریخ کے مطالعہ طالب علموں کے لیے ضروری ہے مگر یہ ہمارے نصاب کا حصہ نہیں تھا اور نہ شاید اب ہے۔ ابن خلدون ایک عرصہ تک گمنامی میں رہا اور اس کے مقدمہ کی اہمیت سے لوگ ناواقف رہے۔ یہ 19 ویں صدی کی بات ہے کہ جب عثمانی سلطنت روبہ زوال تھی تو ترکی کے دانش وروں نے ابن خلدون کو دریافت کیا تاکہ اس کے مطالعے کے بعد وہ اپنے معاشرے کے زوال کے اسباب کو سمجھ سکیں۔ ترکی کی اس دریافت کے بعد اہل یورپ اس سے واقف ہوئے اور اس کا یورپی زبانوں میں ترجمہ ہوا۔ انگریزی میں اس کا سب سے عمدہ ترجمہ روزن تھال کا ہے۔ اس نے ان تمام علما اور اہم لوگوں کی زندگی کے حالات فٹ نوٹس میں دیئے ہیں کہ جن کا ذکر مقدمہ میں آیا ہے۔

اس کے بعد میں نے دوسرے مفکرین کو پڑھا اور تاریخ، فلسفہ تاریخ میں ان پر میرے مضامین شامل ہیں۔ یورپ میں تاریخ نویسی میں اس وقت اور تبدیلی آئی، جب عوامی تاریخ کا سلسلہ شروع ہوا۔ انالز اسکول نے تاریخ کو اور زیادہ وسعت دی جب کہ انھوں نے روزمرہ کی زندگی اور انسانی جذبات کی تاریخ لکھی۔ تحریک نسواں نے تاریخ میں عورتوں کے کردار کو ابھارا۔ میں نے جب مارکس کا مطالعہ کیا تو اس نے میرے تاریخی نظریات میں مزید اضافہ کیا۔ ہیگل نے 1920 کی دہائی میں تاریخ پر جو لیکچرز دیئے تھے، انھوں نے فلسفہ تاریخ میں اور اضافہ کیا۔ اس کے بعد ہرڈر، اور نتیشے نے بھی تاریخ کے فلسفہ پر لکھا۔ میں نے ان سب کے نظریات پر جو مضامین لکھے ہیں، وہ اردو داں طبقے کے لیے شاید نئے ہوں۔ اس کے علاوہ تاریخ کے بدلتے نظریات اور دوسری کتابوں میں میں نے تاریخ اور فلسفہ تاریخ کے مختلف پہلوؤں پر لکھا ہے۔ اس کے علاوہ میری یہ

کوشش بھی رہی ہے کہ تاریخ کے موضوعات پر جو نئی کتابیں آرہی ہیں ان پر تبصرے کر کے ان کے نظریات کو ابھارا جائے۔ میں نے تاریخ اور تحقیق اور تحقیق کے نئے رجحانات میں ان مضامین کو شامل کیا ہے۔

جرمنی میں تاریخ کے مضمون کو بڑی اہمیت ملی، اس کی وجہ یہ تھی کہ 1870 سے پہلے جرمنی ایک نہ تھا اس لیے جرمنی کے دانش وروں نے تاریخ اور زبان کے ذریعے جرمن قوم پرستی کی تخلیق کی۔ ان کے لیے ریاست کا عہدہ بڑا مقدس تھا اس لیے جب لیوپولڈ رانکے نے تاریخ کی تحقیق کے نئے اصول اور ضوابط تخلیق کیے تو ان میں سے اہم سوال یہ تھا کہ مورخ کو اسی طرح سے واقعہ کی رپورٹ کرنی چاہیے جیسا کہ وہ ہوا ہے۔ دوسرے اس نے ریاست کی دستاویزات کی بنیاد پر لکھی تاریخ کو صحیح اور درست تاریخ کہا۔ لیکن آگے چل کر جرمن اور یورپ کے مورخوں نے اس کو چیلنج کیا۔ جب عوامی تاریخ کو لکھنے کا سوال آیا تو اس میں ریاست کی دستاویزات خاموش تھیں، اس لیے مورخوں نے دوسری دستاویزات پر بھروسہ کیا جن میں عدالت کی کارروائیاں، ریونیو کے کاغذات، سی آئی ڈی کی رپورٹس وغیرہ۔ اس نے تاریخ کے موضوع کو اور زیادہ وسعت دے دی۔

تاریخ کے موضوع کو سمجھنے کے لیے میرے لیے یہ بھی ضروری تھا کہ میں یورپ کے دانش ورانہ تحریکوں کا مطالعہ کروں مثلاً جب انگلستان میں ہونے والے صنعتی انقلاب کا مطالعہ کیا تو اس کے پس منظر میں ہونے والی دانش ورانہ تحریکوں کو بھی پڑھا، آدم اسمتھ، ڈیوڈ ریکارڈو، اور مالتھوس کے نظریات کہ جنھوں نے سرمایہ دارانہ نظام کو استحکام دیا۔ اس انقلاب نے معاشرہ میں اونچ اور نیچ کو پیدا کیا۔ امیر اور غریب کے درمیان فرق کو ابھارا۔ اس کے مقابلے میں فرانس کے انقلاب نے مساوات کو پیدا کیا، اس کو تقویت ملی روسو کے نظریات سے۔

یورپ میں روشن خیالی کی تحریک نے معاشرہ میں ذہنی اور سیاسی تبدیلیاں کیں۔ سولہویں صدی میں فرانس بیکن نے Inductive Logic کا نظریہ پیش کیا جن میں ایک خاص موضوع سے عمومی موضوع تک جا کر نظریہ کو سمجھا جائے۔

رینے ڈیکارٹ نے Detuctive Logic کی بات کی، جس میں عمومی سے خاص تک تحقیق کی جاتی یہ۔ اس کے بعد نیوٹن کا سائنسی انقلاب ہے، اور پھر روشن خیالی کی تحریک کہ جس میں حقیقت یا سچائی کو جاننے کا ذریعہ سائنس اور عقلیت پرستی ہوگئی، مذہب نہیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ کہ دنیا برابر ترقی کر رہی ہے اور آگے کی جانب جا رہی ہے۔ اس نے یورپ کے معاشرے کا ذہن بدلا۔ آگے چل کر سائنس اور عقلیت کو چیلنج کرتے ہوئے رومانوی نقطہ نظر نے جذبات کے کردار کو ابھارا۔ اسی تحریک نے یورپ میں مختلف نظریات کو پیدا کیا جن میں قوم پرستی،

تحریک نسواں، ثبوتیت پسندی، سوشل ازم اور مارکس ازم۔

ڈارون نے نظریہ ارتقا پیش کر کے مذہبی عقائد پر زبردست حملہ کیا لیکن ڈارون کے نظریہ سے سوشل ڈارون ازم نکلا۔ جس نے نسل پرستی اور امپریل ازم کو پیدا کیا۔ اس کے ذریعہ یہ ثابت کیا گیا کہ طاقت ور اور توانا قوموں کو زندہ رہنے اور کمزوروں پر حکومت کرنے کا حق ہے۔

یہ نظریات ہمارے ہاں بھی آئے اور تاریخ نویسی ان سے متاثر ہوئی، ہندوستان میں کوسمبی نے مارکسی نقطہ نظر سے قدیم ہندوستان کی تاریخ کی تفسیر کی، ان کے کام کو رومیلا تھاپر اور ایس آر شرما نے آگے بڑھایا۔ عرفان حبیب اور علی گڑھ اسکول نے عہد وسطیٰ کی تاریخ کو مارکسی انداز میں پیش کیا۔ سبالٹرن مورخوں نے جن میں سمت سرکار گیان پانڈے اور شاہد امین وغیرہ ہیں انھوں نے جدید تاریخ کو ترقی پسند نقطہ نظر سے پیش کیا۔

ہربنس مکھیا نے مغل تاریخ کو ایک نئے اور تازہ انداز میں ترقی پسندی کے رجحانات کے ساتھ لکھا۔ اس لیے ان نظریات نے ہندوستان کی تاریخ کو بھی نئی تازگی دی۔ تاریخ کے سمجھنے میں آثار قدیمہ کی دریافتوں اور پھر ان کی بنیاد پر ماضی کی تشکیل نے اس کو نہ صرف وسعت دی بلکہ ماضی کی اس انجان دنیا سے روشناس کرایا کہ جو صدیوں سے زمین میں مدفون نظروں سے اوجھل تھی۔ یہ انسان کا کھویا ہوا ماضی تھا جسے دریافت کیا گیا۔ اس دریافت نے حیرت انگیز انکشافات کیے کہ ماضی کے بارے میں جو ہمارے مفروضے تھے کہ وہ پس ماندہ اور ذہنی طور پر ہم سے بہت پیچھے ہیں، غلط ثابت ہوئے۔ آثار قدیمہ کی دریافتوں نے انکشافات کیے، ایسے انکشافات کہ آج کا جدید انسان ان کی دریافت سے ششدر رہ جاتا ہے۔ مثلاً مصر میں ممی کرنے کا فن، یہ ایسا علم تھا کہ جو ان کے ساتھ ہی روپوش ہو گیا۔ اب ماہرین اس کوشش میں ہیں کہ تجربات کے بعد دوبارہ سے اسے حاصل کیا جائے۔ اس لیے آثار قدیمہ کا یہ کارنامہ ہے کہ وہ انسان کی کھوئی ہوئی تاریخ یا علم کو دوبارہ سے واپس لا رہا ہے اور اس ماضی کی تشکیل کر رہا ہے کہ جو کھو دیا تھا اور جسے ہم بھول چکے تھے۔ جیسے جیسے نئے آثار دریافت ہو رہے ہیں، علم آثار قدیمہ کا دائرہ بھی بڑھتا جا رہا ہے۔ اب اس کو کئی قسموں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ مثلاً پانی کے اندر دریافت کرنے والا علم (Under Water Archaeology)، کوڑا کرکٹ سے ماضی کے بارے میں معلومات کرنے والے، باغوں کے بارے میں علم، جن کے ذریعہ قدیم عہد کے درخت، پودے اور بیجوں کے بارے میں معلومات اکٹھی کرنا، میدان جنگ کے آثاروں کو دریافت کر کے فوجیوں کے ہتھیار اور ان کے لباس وغذا کے بارے میں دریافت، ٹیکنالوجی کے ماہرین، جو ماضی کی ٹیکنالوجی اور ایجادات پر روشنی ڈالتے ہیں۔ انسانوں اور جانوروں کی ہڈیوں سے ان کی حرکت اور کاموں کے بارے میں علم

اکٹھا کرنا۔

وقت کے ساتھ یہ علم انتہائی حساس ہو گیا ہے۔ اب کھدائی کے لیے نئے اوزار اور آلات ہیں، ملنے والی چیزوں کو ماہرانہ انداز میں محفوظ کرنے کا فن ہے۔ جب مصر اور میسوپوٹامیہ کے رسم الخط پڑھے جانے لگے تو تہذیبوں کی کہانی بیان کی جانے لگی۔ اب ان کی مدد سے قدیم عہد کے معاشروں کی سیاسی، سماجی اور مذہبی زندگی کے بارے میں پوری تصویر سامنے آ گئی۔ آثار قدیمہ کے علم میں اس وقت اور تبدیلی آئی کہ جب اس پر زور دیا گیا کہ محض اوزار، ہتھیار اور استعمال شدہ اشیا کی دریافت کافی نہیں ہے، بلکہ یہ دیکھنا ہے کہ ان کو استعمال کیسے کیا جاتا تھا، اور لوگوں کی روزمرہ زندگی کیا تھی؟ ابتدا میں جو آثار دریافت ہوئے اور وہاں سے جو اشیا ملیں انھیں بادشاہوں یا امراء نے لے لیا اور ماضی کی قیمتی اشیا کا جمع کرنے کا شوق ہوا، کہ جن میں مجسمے، ہتھیار، اوزار، زیورات، اور دوسری اشیا شامل تھیں۔ بعد میں میوزیم کا قیام عمل میں آیا اور ان اشیا کی وہاں نمائش ہونے لگی۔ تاکہ عام لوگ بھی ان سے فائدہ اٹھائیں۔ موجودہ دور میں اس بات پر زور دیا جارہا ہے کہ جو اشیا جہاں سے ملتی ہیں، انھیں وہیں رہنے دیا جائے اس لیے ان مقامات پر اپنے میوزیم ہیں، جہاں دریافت ہونے والی اشیا کو رکھا جاتا ہے۔

دل چسپ بات یہ ہے کہ اکثر آثاروں کی دریافت حادثاتی طور پر ہوتی ہے۔ کبھی کنواں کھودتے وقت، کبھی کھیت میں ہل چلاتے ہوئے، اور کبھی کسی عمارت کی بنیاد کھودتے ہوئے اور کبھی سڑک کی تعمیر کے وقت۔ مثلاً اس فن کی باقاعدہ ابتدا اور پیشہ ورانہ طور پر آثار کی دریافت کو 1730 کی تاریخ دی جاسکتی ہے۔ جب نیپلز کے ایک گاؤں میں کنواں کھودتے ہوئے ایک رومی شہر کی دریافت ہوئی، یہ شہر ہر کی لے نیم تھا جب کھدائی ہوئی تو شہر کے آثار دریافت ہوئے۔ یہ شہر آتش فشاں پہاڑ کے لاوے میں آ کر تباہ ہو گیا تھا۔ اس کی کھدائی کرنے والا ایک انجینئر تھا، جس نے انتہائی احتیاط سے کھدائی کی، اور جو اشیا یہاں سے ملیں ان کی مکمل فہرست تیار کی۔

اس کے بعد، دوسرا شہر جو ہر کی لے نیم کے ساتھ دریافت ہوا وہ پومپے تھا۔ یہ بھی آتش فشاں پہاڑ کے لاوے میں دب گیا تھا۔ شہر کی دریافت نے نئی معلومات فراہم کیں، کیوں کہ لاوے کی تیز رفتاری کی وجہ سے شہر تباہ ہوا، اس لیے جو جہاں تھا وہیں اس میں مدفون ہو گیا۔ شہر کے بازار، دکانیں، گھر، گھروں میں کام کرتے ہوئے لوگ۔ ایسا محسوس ہوا کہ شہر کی زندگی تھم گئی اور وہ بے حس اور بے جان ہو کر ایک جگہ ٹھہر کر رہ گئی۔ اس شہر نے ماہر آثار قدیمہ کے فن میں بھی اضافہ کیا۔ انھوں نے برتنوں، اوزاروں، گھریلو استعمال کی اشیا، امرا اور عام لوگوں کے گھروں، اور دوسرے مختلف طبقوں کی طرف رہائش ان سب کی تشکیل کی۔ شہر کی شاہرائیں اور سڑکیں، پبلک عمارتیں جن میں

مندرخاص طور پر قابل ذکر ہیں، ان سے لوگوں کے عقائد رسم ورواج کے بارے میں اندازہ لگایا۔ ایک امیر کے گھر میں پاپائے رس کے بنڈل تھے، یہ شاید اس کی لائبریری تھی۔شہر کی دریافت اہل یورپ کے لیے ایک تہلکہ مچانے والی خبر تھی۔ دانش وروں، آرٹسٹوں، مورخوں اور سیاحوں کا تانتا بندھ گیا وہ اس شہر کو دیکھنے آئے۔ کسی دانش ور نے آثاروں کی دریافت کے بارے میں بڑا اچھا جملہ کہا کہ ''کپڑوں کی تہوں میں دبی ممی ہے کہ جس کی تہوں کو ماہرین کھول کر اس کی حقیقت تک جاتے ہیں''

اس دریافت نے آثار قدیمہ کے علم اور نئی دریافتوں کے لیے ایک ستون کو پیدا کیا چنانچہ اس سے متاثر ہو کر ایک جرمن سرمایہ دار شلی من نے بیڑا اٹھایا کہ وہ ہومر کے بیان کردہ شہر ٹرائے کو دریافت کرے گا کہ جہاں مشہور ٹروجن جنگ لڑی گئی تھی۔ یہ جگہ ترکی میں تھی، چنانچہ شلی من نے اس جگہ کی کھدائی کی اور دعویٰ کیا کہ اس نے ٹروئے کے بادشاہ پرائم کا خزانہ دریافت کرلیا ہے۔ جسے وہ خاموشی سے لے کر یونان چلا گیا۔

اس کے بعد یونان اور روم کے قدیم آثاروں کی دریافت شروع ہوئی اور ان کے کانسی ولوہے کے عہد کے شہر اور بستیاں معلوم ہوئیں، جنھوں نے ان کی تاریخ کو نئے سرے سے تشکیل کرنے میں مدد دی۔ میسوپوٹامیہ کے آثاروں کی کھدائی نے خط میخی کے رسم الخط کو دریافت کیا۔ اس کو پڑھنے کے بعد گل گامیش کی داستان سامنے آئی جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ دنیا کی سب سے قدیم داستان ہے۔ 1798 میں جب نپولین نے مصر پر حملہ کیا تو وہ اپنے ساتھ ماہرین کی ایک جماعت لے کر آیا تھا، جنھوں نے مصر شناسی کی ابتدا کی۔ روزیٹا کی دریافت نے مصر کے قدیم رسم الخط کے پڑھنے میں مدد دی جس کی وجہ سے اس کی تاریخ کو مرتب کیا گیا۔

ہندوستان میں 1920 کی دہائی میں وادی سندھ کی تہذیب کے بارے میں علم ہوا مگر اس کا رسم الخط نہ پڑھنے کی وجہ سے اس کے بارے میں بہت سی معلومات ادھوری رہیں۔ لیکن ہندوستان میں آثاروں کی کھدائی نے قدیم ماضی کی دریافت میں حصہ لیا۔ قدیم کتبوں اور سارناتھ کے آثار نے اشوک کے بارے میں معلومات دیں۔ الورا اور اجنٹا کے غاروں نے تہذیب کے ایک نئے پہلو کی جانب اشارہ کیا۔ چین میں آثاروں کی کھدائی نے پہلی مرتبہ قدیم چین کی تہذیب کو جنم دیا تھا۔ اس کے بعد سے قدیم آثاروں کی کھدائی اور دریافت کا سلسلہ جاری ہے۔ اب ہر ملک اس کے ذریعے اپنے کھوئے ہوئے ماضی کو دریافت کر رہا ہے اور تاریخ میں بیش بہا اضافے ہو رہے ہیں۔

آثاروں کی کھدائی اور ماضی کی دریافت نے لوگوں میں اس جذبہ اور شوق کو پیدا کیا

کہ وہ اس کو آج کے عہد میں تشکیل کر کے آزمائیں کہ اس وقت لوگ کس طرح سے رہتے تھے اور ان کی کیا سرگرمیاں تھیں۔ لہٰذا اس مقصد کے لیے انگلستان میں لوہے کے زمانے کا ایک گاؤں بنایا گیا، جس کی عمارتیں، مکانات اور سڑکیں وگلیاں اسی طرح کی تھیں پھر ان گھروں میں رضا کاروں کو رکھا گیا کہ جو اس عہد کے مطابق زندگی گزارنے کا تجربہ کریں گے۔ اس قسم کی ایک کوشش جرمنی میں ہوئی۔ لیکن ماضی کو دہرانے کا عمل فلموں میں بہت اچھے طریقے سے ہوا، جب قدیم عہد کے کسی موضوع پر فلم بنائی گئی تو انھوں نے کوشش کی کہ اس عہد کی مکمل طور پر عکاسی ہو اور ماضی کو ان کے ذریعے زندہ کیا جائے۔

ماضی کی ٹیکنالوجی کو زندہ کرنے کے تجربات بھی ہوئے۔ پرانے جہازوں کی شکل کے جہاز بنائے گئے تاکہ سمندری سفر کے بارے میں آگہی ہو۔ قدیم راستوں اور شاہراؤں کی دریافت ہوئی، کئی ٹیموں نے سکندر کے راستے کی دریافت کی اور اس پر چلتے ہوئے ہندوستان تک آئے۔ چند لوگوں نے ایک ہاتھی کو لے کر ہینی بال کے راستے پر کوہ ایپس کو پار کرنے کا تجربہ کیا۔ اب وقتاً فوقتاً یورپ اور امریکہ میں مختلف جنگوں کو دوبارہ سے پیش کیا جاتا ہے تاکہ لوگ اس دور کے یونی فارم، ہتھیاروں اور لڑنے کے طریقوں کو دیکھیں۔

میں نے آثار قدیم کے علم سے بہت کچھ سیکھا، کہ تاریخ ایک تسلسل کا نام ہے۔ یہ تسلسل ٹوٹتا رہا ہے، جسے آثار قدیمہ جوڑ رہے ہیں۔ مگر اس تسلسل میں برابر تبدیلی آرہی ہے۔ روایات، رسم ورواج، ان میں تسلسل بھی ہے اور تبدیلی بھی۔ دنیا ایک جگہ ٹھہری ہوئی اور جامد نہیں رہتی ہے۔ ہر عہد اپنی جگہ پر شکوہ ہوتا ہے اگر اس میں آرٹ، ادب اور علم تخلیق کا سلسلہ رہا ہو۔ جب تخلیق رکتی ہے تو معاشرہ پس ماندہ ہو جاتا ہے۔

یہ علم اس کی نشان دہی بھی کرتا ہے کہ انسان ضرورت کے تحت اپنے ماحول کو بدلتا رہتا ہے۔ وہ تہذیبیں کہ جو دریاؤں کے ساحلوں پر پیدا ہوئیں، انھیں زراعت وکاشت کاری اور آب پاشی میں مشکلات پیش نہیں آئیں، مگر وہ تہذیبیں جو دریاؤں سے دور تھیں وہاں زراعت کے لیے انسان کو سخت محنت کرنی پڑی، اور ضرورت نے نئی ٹیکنالوجی کو پیدا کیا۔ جس کی مثال یونان ہے کہ جس کی زمین سخت تھی، اس لیے انھیں ہل چلانے کے لیے جانوروں کے علاوہ ٹیکنالوجی کی ضرورت ہوئی۔ اس سے یہ اندازہ بھی ہوا کہ جب علم کھو جاتا ہے تو دوبارہ سے اسے دریافت کرنے اور سیکھنے کے لیے انسان کو کتنی محنت کرنی پڑتی ہے۔ ان آثاروں نے یہ بھی ثابت کیا کہ ماضی کا انسان مجسمہ تراشی، عمارت سازی اور مصوری میں کس قدر آگے تھا۔

آثار قدیمہ تہذیبوں کے عروج وزوال کی داستان بھی پیش کرتے ہیں اور مورخوں کے

لیے یہ سوالات چھوڑتے ہیں کہ وہ ان کی دریافتوں کو ڈھونڈیں۔اب آثار قدیمہ قوموں کی شناخت کا ذریعہ بن گئے ہیں۔خاص طور پر نئے آزاد ملکوں میں ان آثار کی مدد سے ملک اپنے پرانے ماضی کو واپس لاکر اپنی تاریخ کے تسلسل کو قائم رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔اس کا ایک پہلو یہ ہے کہ یہ آثار سیکولر سوچ اور فکر کو پیدا کر رہے ہیں، کیوں کہ مذہب ان قدیم تہذیبوں کی بنیاد نہیں تھا بلکہ ایک حصہ تھا۔اس لیے جب قدیم تہذیب سے رشتہ جوڑا جاتا ہے تو وہ مذہبی تعصّبات سے بالاتر ہوتا ہے اوراس کی بنیاد قوم پرستی ہو جاتی ہے۔

علمی سفر کی ابتدا تو ہے، مگر اس کی کوئی انتہا نہیں ہے۔یہ ایک لا متناہی سلسلہ ہے نہ ختم ہونے والا۔ کہتے ہیں کہ البیرونی کے آخری لمحات میں اس کا ایک عالم دوست اس سے ملنے آیا۔ البیرونی نے اس کے سامنے ایک مسئلہ رکھا اور کہا کہ وہ اب تک اس کو سمجھ نہیں سکا ہے، اس لیے اس کا ذہن پریشان ہے۔اس عالم دوست نے اس کی وضاحت کی جب وہ گھر سے نکلا اوا بھی گلی ہی میں تھا کہ البیرونی کے گھر سے رونے کی آوازیں آئیں۔معلوم کیا تو پتہ چلا کہ اس کی وفات ہوگئی یہ۔اس پر اس عالم نے کہا، خدا مغفرت کرے، یہ آخری وقت تک علم کی جستجو میں رہا۔

اب جب میں زندگی کے اس مقام تک پہنچنے کے بعد اپنے علمی سفر کے بارے میں سوچتا ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ یہ سفر کس قدر کٹھن اور کس قدر مشکل، پر پیچ راہوں سے گزرتا ہوا یہاں تک لایا۔حقیقت کی جستجو، بار بار ایک حقیقت سامنے آئی، اس سے انکار کیا، دوسری کی جانب جانا پڑا۔ پتہ نہیں کہ میں سچائی کو تلاش کر پایا یا نہیں۔ٹراٹسکی نے اپنی آپ بیتی میں لکھا ہے کہ انقلاب کے بعد جب وہ اپنے باپ سے ملنے گیا اور انقلاب کے بارے میں بتایا تو اس کے باپ نے کہا چلو اب تمہاری سچائی کو بھی دیکھ لیں گے۔انسان کسی نہ کسی سچائی کی تلاش میں رہتا ہے۔وہ لوگ جو کسی ایک سچائی کو پا کر مطمئن ہو جاتے ہیں اور تلاش بند کر دیتے ہیں، وہ سکون کی حالت میں ہوتے ہیں۔ورنہ جستجو کا جذبہ ذہن کو پریشان کرتا رہتا ہے۔

وہ لوگ بھی ہوتے ہیں کہ جو زندگی بھر علم کے حصول میں مصروف رہتے ہیں۔مگر وہ اس علم سے کسی کو فیض یاب نہیں کرتے اور یہ سارا علم اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔اس لیے اگر علم کو حاصل کیا جائے تو اس میں دوسروں کو شریک کرنا بھی ضروری ہے۔ورنہ علم کا مقصد ختم ہو جاتا ہے۔

اپنے اس علمی سفر میں اگر میں شعر و شاعری کا تذکرہ نہیں کروں تو زیادتی ہوگی، اور نوجوانوں کی طرح میں بھی شعر و شاعری سے دل چسپی رکھتا تھا۔اردو کے کلاسیکل شعرا چونکہ کورس کا ایک حصہ ہوا کرتے تھے اس لیے میں نے میر، سودا، ناسخ، انیس، انشاء، پنڈت دیا پرشاد وغیرہ کے منتخب کلام کو پڑھا، پھر ذوق، مومن اور غالب آئے۔نوجوانی کے اس دور میں اقبال سے بڑا متاثر تھا، ان کا شکوہ جواب

شکوہ تقریباً زبانی یاد تھا۔ان کے گھن گرج کے اشعار دل کو گرماتے تھے۔اس وقت مشاعروں کا بڑا رواج تھا، تعلیمی اداروں کے علاوہ لوگوں کے گھروں پر مشاعرے ہوتے تھے۔ان کے علاوہ ہر سال آل انڈیا یا پاکستان مشاعرہ ہوتا تھا۔

جب میں انٹر کا طالب علم تھا، یعنی 1959 میں تو سٹی کالج، جہاں میں پڑھا تھا وہاں ایک یادگار مشاعرہ کا اہتمام ہوا۔شاید یہ وہی کتاب ہے جو فرحت اللہ بیگ نے لکھی ہے، یا کوئی اور تحریر۔اس میں میر سے لے کر غالب تک تمام شعرا تھے۔میں نے اس مشاعرہ میں مصحفی کا کردار ادا کیا۔غالب کا کردار فلمی دنیا کے مشہور اداکار محمد علی نے کیا تھا۔اس مشاعرہ کی تیاری ریڈیو پاکستان کے ایک پروڈیوسر تھے جنھیں لوگ بھائی جان کہتے تھے۔انھوں نے خوب ریہرسل کرائی تھی کہ کس طرح شاعروں کے ہر شعر میں، سبحان اللہ، واہ واہ، یا مکرر کہنا چاہیے۔اس میں میک اپ کے لیے لاہور سے کسی کو بلایا گیا تھا۔اس نے ہم سب کو بدل کر رکھ دیا، منہ پر داڑھی، پگڑی اور لباس چغہ یا لبادہ۔مجھے یاد ہے کہ جب والد صاحب اس کمرے میں آئے جہاں ہم میک اپ کرا کے کھڑے تھے تو وہ مجھے نہیں پہچان سکے۔چونکہ ابھی میں نے پگڑی نہیں باندھی تھی اس لیے وہ میرے بالوں سے پہچان سکے۔

ہوا یہ کہ جب ہم اسٹیج پر پہنچے اور مشاعرہ شروع ہوا تو ہم لوگ سارے ڈائیلاگ بھول گئے، مگر ہر شعر پر سبحان اللہ، واہ واہ، مکرر کہہ کر لوگوں پر ظاہر نہیں ہونے دیا۔میں جرات کے قریب تھا، چونکہ وہ نابینا تھے اس لیے میں نے ان سے ہر شاعر کا تعارف کرانا شروع کر دیا۔حضرات شمع میر صاحب کے آگے ہے، یا اب شمع سودا کے سامنے ہے، بھائی جان کا کہنا تھا کہ پہلے تو وہ پریشان ہوئے کہ ساری محنت اکارت جا رہی ہے، مگر جب مشاعرہ اپنے جوبن پر پہنچا تو وہ بہت خوش ہوئے۔اس مشاعرہ کی شہرت ہوئی تو اس وقت کے گورنر مغربی پاکستان اختر حسین نے فرمائش کی کہ اسے ان کے لیے دوبارہ کیا جائے، لہٰذا یہ دوبارہ ہوا اور کامیاب رہا۔مجھے مصحفی کی وہ غزل تو یاد نہیں رہی کہ جو میں نے اس مشاعرے میں پڑھی تھی، مگر اس کا مقطع اب تک یاد ہے۔

مصحفی، گوشہ غزلت کو سمجھ تخت شہی
کیا کرے گا تو عبث تخت سلیماں لے کر

لیکن پھر وقت کے ساتھ شاعری سے دل چسپی کم ہوتی چلی گئی، اور مرزا غالب اور میر کے علاوہ کسی کے اشعار بھی یاد نہیں۔اب مشاعروں کا رواج بھی نہیں رہا، لیکن اچھے شعرا گر سننے کو مل جائیں گے۔شاعروں کی تعداد ہمارے ہاں اب بھی بہت ہے مگر شعر فہمی کی کمی ہوتی چلی جا رہی

ہے۔علم کے اس سفر میں، میں نے جو کچھ حاصل کیا، اس میں دوستوں کو شریک کرنے کی غرض سے ایک تو میں پڑھتا رہا، اب بھی لیکچر دینے کا سلسلہ جاری ہے۔ دوسرا میں نے کتابیں لکھیں تا کہ ان کے ذریعے اپنے ہم سفروں میں اضافہ کروں۔ اس لیے میرے اس سفر میں میں اکیلا نہیں ہوں، میرے ساتھ بہت سے ہم سفر ہیں، مجھے خوشی ہے کہ میں نے جو آگہی اور فہم حاصل کیا، اس میں دوسرے بھی برابر کے شریک ہیں۔

کچھ دیر کتابوں کی دنیا میں

آصف فرخی

معروف مترجم، ادیب آصف فرخی (پ: 1959ء) کراچی میں پیدا ہوئے۔ پاک و ہند کے ایک معروف ادبی گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ انھوں نے اپنی ابتدائی تعلیم سینٹ پیٹرز اسکول، ڈی جے سائنس کالج سے ایف ایس سی کی، ڈاؤ میڈیکل کالج کراچی سے ایم بی بی ایس کی ڈگری لی۔ بعدازاں ہارورڈ یونیورسٹی سے پبلک ہیلتھ کے بارے میں اعلیٰ ڈگری حاصل کی۔ اپنے ادبی اور علمی پس منظر کی وجہ سے ان کا ادبی ذوق بہت اعلیٰ ہے۔ انھوں نے ڈان میں ادبی موضوعات پر کئی سال کالم لکھے۔ معروف ادبی رسالہ دنیا زاد بھی ان کی ادارت میں شائع ہو رہا ہے۔ (افسانوں کی چھ کتابیں مرتب کیں، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس اور برٹش کونسل کے اشتراک سے کراچی ادبی میلہ کا آغاز کیا۔ 1995 میں انھیں وزیراعظم ایوارڈ برائے ادب سے نوازا گیا۔ 2005 میں انھیں صدارتی تمغہ امتیاز سے نوازا گیا۔ معروف کتابیں: آتش فشاں پر کھلے گلاب۔ اسم اعظم کی تلاش۔ میں شاخ سے کیوں ٹوٹا۔

میں 1959ء میں شہر کراچی میں پیدا ہوا، 1972 میں میٹرک کیا۔ ڈی جے سائنس کالج سے میں نے انٹر کیا، پھر اُس کے بعد میڈیکل کالج چلا گیا۔ اس کے بعد آغا خان یونیورسٹی میں پڑھاتا رہا۔ وہاں پڑھانے کے دوران ہی مزید تعلیم کے لیے امریکا گیا۔ ہارورڈ یونیورسٹی سے میں نے ماسٹرز کیا۔ پبلک ہیلتھ میرا فیلڈ ہے۔

اب یہ تعین کرنا تو بڑا مشکل ہے کہ کن چیزوں کی وجہ سے میرے اندر ذوق مطالعہ پیدا ہوا۔ بنیادی طور پر میں ایک ایسے گھر میں پیدا ہوا جہاں میرے چاروں طرف کتابیں موجود تھیں، زندہ ہستی کی طرح۔ میرے والد کو پڑھنے کا بہت شوق رہا ہے اور کتابیں جمع کرنے کا بھی، اس طرح میرے دادا محمد احسن کو بھی مطالعے اور کتابیں جمع کرنے کا بہت شوق تھا جن کا انتقال ہو گیا ہے۔ انھوں نے کئی کتابیں لکھی ہیں۔ میرے چچا انور احسن صدیقی خود بھی شاعر اور ادیب ہیں۔ اُس ماحول میں میں نے چاروں طرف کتابیں ہی پائیں اور مجھے کبھی سوچنا نہیں پڑا کہ کتابوں سے کیوں دل چسپی ہے، اگر کبھی شعوری طور پر سوچتا کہ کتابیں پڑھنا چاہئیں یا نہیں تو ممکن ہے میں

اس کا انتخاب نہ کرتا۔ کتابوں کو پڑھنے میں مجھے کوئی خصوصی دلچسپی کا معاملہ نہیں ہے بلکہ مجھے تو یہ فطری سی بات محسوس ہوتی ہے۔ گھریلو ماحول کے ساتھ ساتھ ایک شوق بھی پھر آہستہ آہستہ پیدا ہوا اور ہمارے گھر میں بعض لوگوں کا ذکر ایسے ہوتا ہے کہ وہ زندہ ہستی کی طرح ہیں۔ میرے والد کو محمد حسین آزاد سے ایک طرح سے عقیدت سی ہے کیونکہ انھوں نے اُن پر تحقیقی کام بھی کیا ہوا ہے۔ جب میرا بالکل بچپن تھا تو وہ آزاد پر کام کر رہے تھے تو وہ آزاد کا ذکر بالکل ایسے انداز میں کرتے کہ ابھی دروازہ کھلے گا اور محمد حسین آزاد اندر آ جائیں گے۔ اور وہ ''آب حیات'' کے کچھ ٹکڑے سنانا شروع کر دیں گے۔ جس شاعر کا کلام ہم بچپن سے سنتے آئے ہیں اور جو اپنے شعور کا ایک حصہ معلوم ہوتا ہے وہ اقبال ہے ان لوگوں کو پڑھنا' ان کو سوچنا' ان کو محسوس کرنا میرے لیے بالکل ایک فطری سی بات ہے۔

میں تو یوں کہنا چاہوں گا کہ میں نے پڑھنا بچوں کی کتابوں سے شروع کیا کیونکہ ہم بچوں کی کتابوں کو بھول جاتے ہیں۔ میں کوئی اس قسم کا بقراط آدمی نہیں تھا کہ میں نے کوئی بہت موٹی اور دبیز کتابیں پڑھنا شروع کی ہوں۔ میں تو اس عمر میں کہانیاں پڑھنا چاہتا تھا۔ میں نے بہت شوق سے اشرف صبوحی دہلوی کی بچوں کی لکھی ہوئی کہانیاں پڑھیں اور اُن کا جو انداز بیاں اور کہانی لکھنے کا فطری اسٹائل تھا اس نے مجھے اردو سے جوڑے رکھا۔ کیونکہ اسکول میں اور پھر آہستہ آہستہ مطالعے کی نہج جس سطح پر جا رہی تھی اُس میں انگریزی کی کتابیں زیادہ رغبت کا سبب بن رہی تھیں اور چونکہ بہت زیادہ ادب انگریزی میں ہے، اس سے کون کافر انکار کر سکتا ہے۔ تو بچوں کی کہانیوں نے مجھے پہلے پکڑا اور بچپن میں ہی یہ شوق اور زیادہ ہوا کیونکہ میرے والد اور دادا کو جس طرح کتابوں کا شوق تھا اس کے پیش نظر ہمارے گھر میں ''طلسم ہوشربا'' بھی موجود تھی۔ ''داستان امیر حمزہ'' کی تلخیص بھی تھی اور مجھے یاد ہے کہ جب میں آٹھویں جماعت میں بہت بیمار پڑ گیا اور اُس بیماری نے مجھے بستر پر لٹا دیا تھا۔ میں بچپن میں خاصا بیمار رہا ہوں اور بیماری میں میرے لیے کتاب پڑھنا آسان ہوتا تھا اور کتاب بھی ایسی چاہیے تھی جو جلدی ختم نہ ہو کیونکہ پھر دوسری کتاب چاہیے تھی اس لیے طلسم ہوش ربا پڑھنا شروع کی۔ طلسم ہوشربا کا جو اثر ہے وہ زندگی بھر زائل نہیں ہو سکا۔

اسکول کے زمانے میں ہی میں نے انگریزی چیزیں پڑھنا شروع کیں۔ ہمارے اسکول کی لائبریری میں بہت اچھا مواد تھا۔ انگریزی فکشن کا چسکا اسی زمانے میں لگا۔ پہلے تو بچوں کی کتابیں پڑھتے تھے۔ پھر جاسوسی کتابوں کا شوق پیدا ہوا اور ''شرلاک ہوم'' ز جو تھے وہ ہمارے لیے ہیرو کا درجہ رکھتے تھے۔ اگاتھا کرسٹی، ''ارل اسٹینلی گارڈنر'' کو پڑھا اور پھر اس کے بعد جو انگریزی فکشن ماسٹر اور انگریزی ادب کے مشاہیر ہیں، رفتہ رفتہ ان کی طرف آنا شروع کیا۔ اُس

وقت ہمارے اسکول کی لائبریری میں چونکہ کلاسک کا ذخیرہ زیادہ تھا اس لیے اُن لوگوں کی طرف میرا رجحان زیادہ رہا۔ لیکن ایک بات یہ ہوئی کہ اس زمانے کے بعد مجھے جاسوسی ادب سے کبھی کوئی رغبت نہیں رہی۔ بہت سے لوگ کہتے' ان کو پڑھنے کی رغبت دلاتے رہے لیکن اُس کے بعد مجھ سے یہ چیزیں پڑھی نہیں گئیں اور Crime رائٹر ایک سے ایک اچھے نظر سے گزرے لیکن طبیعت اُن کی طرف سے اچاٹ ہوگئی تھی۔

اتفاق ایسا ہوا کہ انگریزی میں یہ چیزیں شروع ہوگئیں، اردو میں ان چیزوں کی طرف میں نہیں آیا۔ میرا راستہ گویا طلسم ہوشربا نے روک لیا اور جب بھی وقت ملتا تھا اور اردو پڑھنے کو دل کرتا تھا، میں اس میں محو ہو جاتا۔ طلسم ہوشربا کو آپ تسلسل کے ساتھ پڑھ نہیں سکتے۔ یہ آگ کا دریا ہے آپ جہاں سے چاہیں غوطہ لگالیں اور اُس داستان کی جو کیفیت ہے وہ کیا کمال کی چیز ہے اور کتنے محروم ہیں وہ لوگ جو اس داستان کو نہیں پڑھ سکے۔

شاعری ہمارے ہاں بہت زیادہ پڑھی بھی جاتی تھی، سنی بھی جاتی تھی جس ماحول کا میں حصہ تھا، وہاں چاروں طرف شاعری تھی۔ چاروں طرف سے ہمیں جذب کرنی پڑتی تھی کیوں کہ میرے والد کو بہت زیادہ شوق تھا شعر خوانی کا اور کلاسیکل شاعروں کے مطالعہ کا اور یہ اُن کی گفتگو کا حصہ تھا' تو بہت سے لوگوں کو سنا، پڑھا اور دیکھا مجھے بہت اچھی طرح یاد ہے کہ میرے والد مجھے ایک مشاعرے میں لے گئے، اس میں جوش ملیح آبادی تھے' جوش کو میں نے پڑھتے ہوئے سنا اور نہایت عقیدت کے ساتھ اُن سے آٹوگراف لیا۔ اُن سے ایک کتاب پہ دستخط کرائے۔ فیض کو بھی سنا اور پھر ابا کے جو دوست احباب آتے تھے تو پتا چلتا تھا کہ یہ سلیم احمد ہیں، یہ ممتاز حسین ہیں، یہ عزیز حامد مدنی ہیں اور یہ انجم اعظمی ہیں، تو اس طرح ان لوگوں کو دیکھا ان کو سنا ان کی گفتگو ان کی باتیں اور شاعری کی بہت ساری باتیں اس طرح سننے کو ملیں اور پھر اُس زمانے کے شاعروں کو پڑھنا شروع کیا۔ بعض لوگ بہت اچھے لگتے تھے۔ اُس زمانے میں جب مجھ پر نوجوانی کا عالم تھا، پروین شاکر کا پہلا مجموعہ شائع ہوا تھا، میں نے بڑے شوق سے اُسے حاصل کیا کیونکہ پروین شاکر میرے والد کی شاگرد بھی تھیں۔ اُن کو میں نے دیکھا بھی تھا اور سنا بھی۔ اُن کی شاعری مجھے بہت اچھی لگی۔ اس کیفیت سے شاید اب میں دور چلا آیا ہوں اور میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ فیض صاحب کی شاعری کا جو سحر تھا وہ تو شاید آج تک نہیں ٹوٹا۔ لیکن بعض شاعر اتنے قریب محسوس نہیں ہوتے، غالب اُس وقت بھی مشکل لگتے تھے اب وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اُن کی مشکلات قدرے زیادہ ہوگئی ہیں، لیکن غالب سے جو کچھ حاصل ہوتا ہے وہ کسی اور شاعر سے حاصل ہونا ممکن نہیں۔ بہرحال کہا جاسکتا ہے کہ جس شاعر کو پڑھنے سے ہمیشہ مجھے کوئی نہ کوئی لطف ملا ہے یا اپنے شعور میں

کوئی اضافہ محسوس ہوتا ہے وہ غالب ہیں۔قدیم شاعروں میں تھوڑا اچی لگا کے میر کو پڑھا تو میر کے بارے میں دل چسپی ہوئی۔تھوڑا بہت چکھ کر تو سبھی کو دیکھا۔لیکن چونکہ میرا ادب کا کوئی بہت زیادہ باضابطہ مطالعہ نہیں ہے۔اس لیے میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ میں نے ادب کو الف سے لے کرے تک پڑھا ہے لیکن کلاسیکی شعرا سے ایک Encounter ضرور رہا ہے۔اس طرح جدید شعرا میں جو مجھے بہت زیادہ پسند رہے ہیں، ان میں ناصر کاظمی ہیں، کیا بات ہے ناصر کاظمی کی۔منیر نیازی بھی مجھے بہت پسند ہیں، احمد مشتاق بھی بہت اچھے لگتے ہیں، نہایت خوب صورت غزل لکھتے ہیں۔ ظفر اقبال کی آب رواں پڑھی اور ظفر اقبال نے شاعری میں مختلف تجربات بھی کیے۔ میں غزل بہت شوق سے پڑھتا ہوں لیکن مجھے زیادہ مناسبت نظم کی شاعری سے ہے۔

بہت سارے رائٹرز مجھے یاد ہیں جن لوگوں کو اس کم عمری میں ہی پڑھا، ان میں چارلس ڈکنز کا اثر بہت زیادہ ہوا۔ جارج ایلیٹ کی جو کتاب مجھے بہت اچھی طرح یاد ہے وہ The Mill on the Floss ہے۔ایک بہن اور ایک بھائی کا کردار ہے۔جس رائٹر نے بہت حیران کیا وہ Jeiw Osten تھے، انتہائی سادہ اور بظاہر کوئی ڈرامائی ایکشن نہیں ہے، وہاں وہ پورے معاشرے کی اقتصادی نفسیات کی ترجمانی کرتے تھے۔اُس کے کچھ عرصے کے بعد یہ ہوا کہ انٹر میں چونکہ پڑھائی پر توجہ بہت تھی۔ Pre-medical کا طالب علم تھا اور پڑھائی کا بوجھ تھا، بظاہر طالب علم کوئی اتنا بڑا نہ تھا اگرچہ میٹرک میں بھی ٹاپ کیا تھا اور انٹر میں بھی، فرسٹ ایئر میں یہ سب پڑھا۔کلاس میں بریک کے دوران جب وقت ملتا تھا تو میں مطالعہ کرتا۔اس طرح میں نے کوئی آٹھ مہینے میں War and Peace کتاب پڑھی اور پھر یہ کتاب میرے دماغ میں گھومتی رہی، پڑھنا پہلی محبت کی طرح ایک ایسا تجربہ ہے جو شاید مجھے کبھی بھول نہیں سکتا۔

اردو فکشن میں مجھے عصمت چغتائی اور قرۃ العین حیدر بہت پسند ہیں اور پھر اُس کے بعد میں نے غلام عباس کو پڑھا۔منٹو کی طرف میں تھوڑی دیر سے آیا۔شاید اس لیے منٹو کی کتابیں میں نے اس وقت کم پڑھی ہیں کہ مجھے گھر میں نظر نہیں آئی۔ ''ٹیڑھی لکیر'' میں نے پہلے پڑھی، ''آگ کا دریا'' پڑھی، آگ کا دریا بیسویں صدی میں اردو کی سب سے بڑی کتابوں میں سے ایک ہے۔دوسرے رائٹر جس کو میں نے بہت تفصیل سے پڑھا، مگر ذرا دیر سے پڑھا وہ ہیں انتظار حسین۔ مجھے یاد ہے کہ ''آخری آدمی'' مجھے 1968ء میں ملی۔ جب میں پہلی بار اپنے والد کے ساتھ لاہور گیا۔ مجھے انتظار صاحب سے ملانے کے لیے لے گئے اس کے بعد میں نے ''آخری آدمی'' پڑھی۔ میں پڑھ کر حیران ہو گیا کہ گویا افسانے ایسے بھی ہوتے ہیں اور افسانہ میں ایک زمانے سے لے کر کئی زمانے کھول دینے کا ہنر بھی ہوتا ہے، اُس سے پہلے کرشن چندر کو پڑھا تھا تو کرشن چندر کا کہانی

کا ایک واقعیت والا انداز ہے، وہ کہانیاں بہت اچھی لگی تھیں۔ انتظار صاحب نے تو کمال ہی کر دیا، پھر اُن کی تحریریں میں لگا تار پڑھتا چلا آیا۔ ایک چیز ہوتی ہے Reading اور ایک چیز ہوتی ہے Re.reading۔ تو مجھے جتنا زیادہ مزا Re- reading میں آتا ہے، اتنا شاید Reading میں بھی نہیں آتا جیسے آگ کا دریا ہے اُس کو اٹھاتا ہوں اور جو صفحہ کھل جاتا ہے کھولتا ہوں اور پڑھتا ہوں اور مجھے اُس میں بڑا مزا آتا ہے اور بڑی طمانیت محسوس ہوتی ہے۔ اس کو تسلسل کے ساتھ پڑھنے کی اب ضرورت نہیں ہے۔ لیکن اس کے ٹکڑے اس کا جو پورا Dimenion جو ہے وہ بہت اچھا لگتا ہے۔ اس طرح بعض کتابوں کی Reading کی ہے اور بعض کی Re-reading کرتا رہتا ہوں۔

اگر ہر مصنف کا ایک افسانہ پڑھنا ہو تو منٹو کے تین افسانے پڑھنے چاہئیں۔ ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' پڑھنا چاہیے، ''ہتک'' پڑھنا چاہیے اور ''بُو''۔ عباس صاحب کا ''آنندی'' پڑھنا چاہیے لیکن گڑبڑ یہ ہوگی اگر آپ نے عباس صاحب کو آنندی تک محدود کر لیا جیسے بعض لوگ کر جاتے ہیں کیوں کہ عباس صاحب محض ایک کہانی کے آدمی نہیں تھے، اُن کی بعض کہانیاں بہت اچھی ہیں اور کچھ Romantic ہیں جو آنندی میں نہیں ہے، مثلاً آپ عباس صاحب کی کہانی لیجیے ''سایہ'' جو اُن کی طویل کہانی ہے۔ اس کہانی میں سارا کمال یہ ہے کہ وہ عمل جس کی آپ کو توقع ہو، وہ ہوتے ہوئے نظر نہیں آتا۔ ساری کہانیاں Shades ہیں۔ ان کی کہانیوں میں Shades کے ذریعے اظہار کی پرتیں کھلتی ہیں، چنانچہ آپ سایہ پڑھیے اور عباس صاحب کا کمال دیکھئے۔

''ایک بڑا سا مکان ہے اور جیسے جیسے دن ڈھل رہا ہے وہ اپنا خوانچہ سر کا تا جا رہا ہے اور اُس دوران اُس مکان میں آنے اور علاقے سے گزرنے والے لوگوں کی کیفیت بتا رہے ہیں''

یہ کل کہانی ہے اس سے زیادہ کوئی ڈرامائی عمل نہیں ہے، مگر اس نے پورا نقشہ کھینچ دیا ہے۔ عباس صاحب کمال کے نثر نگار تھے۔ وہ ماڈل میں نقش نگار کا اور کہانی کار کا اُس کہانی میں جملہ لکھتے ہیں ''جس صاحب کا وہ مکان ہے وہ کثرتِ اولاد کی وجہ سے ہر اک کو شفقت سے دیکھنے کے عادی ہیں۔'' کیا ہلکا سا تبسم ہے اس جملے میں، اب اس جملے کا جو ایک ہلکا سا تبسم ہے، ایک طنز ہے اور طنز نفرت بھرا نہیں ہے، وہ اُس شخص کی تضحیک نہیں کر رہے ہیں۔ اُس شخص کی محبت کی کیفیت کو دکھا رہے ہیں اور ہم لوگ اتنے بدقسمت ہیں کہ اتنا بڑا کہانی کار ہے اور ہم اُس کو بُت بنا کر اُس کی پوجا نہیں کرتے۔

عباس صاحب سے میری تھوڑی بہت واقفیت بھی تھی اور مجھے بڑا فخر ہے کہ مجھے ان سے کچھ سیکھنے کا موقع ملا۔ اُن کی افسانہ نگاری کی عمر تقریباً 60 برس ہے اور 60 سے کم افسانے لکھے

اور ہر افسانہ برسوں سوچ کے ایک ایک جملہ ناپ تول کے لکھا۔ ایک لفظ فالتو نہیں لکھتے تھے، کہتے تھے کہ اردو والوں کی بڑی خامی ہے کہ ضرورت ہو گی ایک لفظ کی وہاں دو لکھتے ہیں جیسے اگر کسی کو عشق ہو گیا تو لکھیں گے کہ عشق و محبت ہو گئی۔ ارے بھئی یا عشق لکھو یا محبت۔ دیکھیں کہ یہ کفایت لفظی کا کیسا کمال سبق ہے ہم لوگ لفظوں کے اصراف میں مبتلا ہیں۔ مثلاً کہنے لگے: افسانے میں جب Description جو لکھتا ہوں تو کسی چیز کا ذکر نہیں کرتا جس کو افسانے میں استعمال ہوتا نہ دکھایا جائے۔ مثال کے طور پر اُن کا ایک افسانہ ہے کہ وہ مکان میں داخل ہوتے ہیں تو کردار ہے فرخ بھابھی، وہ گھر میں آتی ہیں تو وہاں تین گھڑے رکھے ہوتے ہیں۔ Descprtion ختم ہو گیا۔ اُن گھڑوں کو استعمال کرنے کے لیے اُن میں پانی بھرا جاتا ہے اور پانی سے وہ نہاتی ہے۔ اس کہانی کے لیے بڑا Symbolic لمحہ ہے تو گھڑے کا ذکر انہوں نے اس لیے کیا کہ اُس کو کہانی میں استعمال ہونا تھا۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کا پڑھنا ایک آدھ Reading میں ختم نہیں ہوتا عباس صاحب کو آپ ایک دفعہ نہیں پڑھ سکتے کیونکہ عباس صاحب بہت دھیرے دھیرے کھلنے والے فن کار ہیں۔

محمد حسن عسکری بہت بڑے نقاد ہیں، لیکن اس سے پہلے وہ ایک باکمال افسانہ نگار ہیں۔ اُن کے کل 19 افسانے ہیں۔ رفیق حسین ہیں جن کا ایک مجموعہ ہے چھ افسانوں کا۔ اُن کے کچھ اور افسانے ہیں جو کتابی شکل میں نہیں شائع نہیں ہوئے مگر صاحب کیا بانکا اور سجیلا افسانہ نگار تھا۔ چھ افسانوں کی ایک چھوٹی سے کتاب کی بدولت وہ کہاں پہنچ گیا۔ تو ہم لوگ تو ان کے مطالعے کا حق ادا نہیں کر سکے جن کو گزرے ہوئے زمانہ ہو گیا۔

ہمارا جو نصابی سلسلہ ہے، وہ ہمیں اچھے ادب سے دور کر دیتا ہے۔ کرشن چند، منٹو کا نام تو لوگ لیتے ہیں، مگر مجھے گلہ ہے کہ کرشن چندر کو لوگوں نے بھلا دیا۔ اپنے زمانے میں وہ ترقی پسند نظریات کے لوگوں کا سب سے بڑا افسانہ نگار تھا، اب کوئی اُس کا ذکر بھی نہیں کرتا۔ ایک Extreme سے ہم دوسری Extreme پر چلے جاتے ہیں اور ہمارا نصاب ہمیں ایک ادب سے دوسرے ادب کی طرف چلے جانے سے پہلے تیار نہیں کرتا۔ وہ ہمیں اچھے ادب سے متنفر کرتا ہے۔ ہمارا نصاب ہمیں کبھی نہیں بتائے گا کہ رفیق حسین کتنے بڑے افسانہ نگار ہیں۔ اسی طرح دور حاضر میں نیئر مسعود کو پڑھا۔ سید محمد اشرف بہت اچھے افسانہ نگار ہیں اور خالد جاوید بھی کمال کرتے ہیں یا جیلانی بانو نے بہت کہانیاں اچھی لکھی ہیں۔

اُردو کے مطالعہ میں غیر مسلموں کو تو ہم نے نکال ہی دیا لیکن مسلمانوں کے ساتھ بھی ہم نے کوئی اچھا سلوک نہیں کیا۔ علامہ اقبال تو مسلمان ہی تھے ہم نے اُن کے ساتھ کیا سلوک کیا۔

ہمارے نصاب میں حسرت موہانی کے ساتھ کیا سلوک ہوا۔ منٹو کے ساتھ کیا سلوک ہوا۔ منٹو کی نصاب میں کیسی درگت بنتی ہے۔

میرا مطالعہ کبھی بھی Systematic نہیں رہا۔ جو ہاتھ آیا پڑھ دیا۔ کچھ مطالعہ تو میرا اپنا Professional سطح کا بھی ہے۔ کیونکہ مضمون کے ساتھ چُڑ رہنا بھی ضروری ہے۔ حالات حاضرہ یا دنیا کے رنگ میں اس کے لیے بھی پڑھنا پڑا۔ ادب کے ساتھ میری وابستگی رہی تاریخ کے ساتھ ساتھ بھی دل چسپی رہی اور تنقید بھی زیرِ مطالعہ رہی۔ لیکن تنقید وہ پسند آتی ہے جو ادب کے لیے نئے دروازے کھولے۔ لیکن Theories کی رائے بازی سے اور عقلی کشتی سے چڑ ہے۔ مجھے وہ تنقید پسند ہے جس میں یہ بتایا جائے کہ ادب کو کیسے سمجھا جائے۔ دنیا کو ادب کے ذریعے کیسے سمجھا جائے۔

مجھے خاص دل چسپی رہی 1857ء کی جنگ آزادی کے بارے میں لوگوں نے کیا لکھا ہے، ڈھونڈ ڈھونڈ کے وہ چیزیں پڑھتا رہا۔ خاص کر مجھے اس چیز سے دل چسپی ہے کہ وہ کون سے سیاح تھے جو پاکستان کی سرزمین میں آئے؟ انھوں نے اس کا حال احوال دیکھا۔ میں کوشش کر رہا ہوں کہ اُن کی کتابیں دیکھوں کیونکہ اُن کے دیکھنے کا زاویہ بہت زیادہ دل چسپ بھی ہے اور وہ ہمارے بارے میں لکھتے بھی رہے ہیں۔ ابھی حال ہی میں میں نے کتاب پڑھی ہے ایلس ایلینا ایک برطانوی خاتون ہیں جنھوں نے دریائے سندھ کا سفر کیا ہے۔ کراچی سے لے کر تبت تک بڑی شان دار کتاب ہے۔ ہندوستان میں چھپی ہے۔ اس کتاب کے سلسلے میں ایک تقریب منعقد ہوئی تھی۔ اُس خاتون کو متعارف کرانے کی ذمہ داری مجھے سونپی گئی تھی۔

ہندوستان میں 1857ء کے حوالے سے بہت سی کتابیں چھپی ہیں۔ میں وہاں سے بہت سی کتابیں لے کر آیا تھا اور اُن کو آہستہ آہستہ پڑھ رہا ہوں۔ ایک کتاب William Dalrymple کی تحریر کردہ ہے۔ بہادر شاہ ظفر کی سوانح لکھی گئی ہے۔ اُس کو پڑھ کر بہادر شاہ ظفر کے بارے میں میرا جو تاثر تھا اور ان کے متعلق میری جو معلومات تھیں اُن میں خاص تبدیلی ہوئی ہے اور زیادہ بڑی زیادہ المناک اور ثقافتی طور پر ایک اہم شخصیت کے طور پر نظر آئے ہیں۔

جن ناولوں کا مجھ پر بہت زیادہ اثر ہوا اور خاصی نوعمری میں پڑھا وہ ''آنگن'' اور ''اُداس نسلیں'' تھے اور خاص طور پر ''نادار لوگ'' پڑھ کر مجھے بہت مزا آیا اور میں عبدا؟ حسین کا مداح ہو گیا۔ اس حد تک کہ اُن کی ہر نئی کتاب کو پڑھنا اور پھر نئے سرے سے مایوس ہونا، اتنی افسوس ناک کتاب کوئی آپ کا پسندیدہ رائٹر ہی لکھ سکتا ہے۔ قرۃ العین حیدر کی کتابیں پڑھتا ہوں۔ انتظار حسین مجھے افسانہ نگار کے طور پر زیادہ اچھے لگتے ہیں اور قراۃ لعین حیدر ناول

نگار کے طور پر۔ بانو قدسیہ کی ''راجہ گدھ'' مجھے بہت Over rated کتاب لگی۔ مصنفہ نے فارمولا طے کر کے کہانی کو اُس پرفٹ کرنے کی کوشش کی ہے۔ کہانی گرو کرتی ہے اور اُس پر کوئی فطری بہاؤ نہیں ہے۔ وہ طے شدہ فارمولے پر اُس کہانی کو پہنچاتی ہیں۔ انھوں نے بہت زور لگایا۔ وہ اُس طرح ایک گاڑی ہے جو پہلے گیئر میں اسٹارٹ کر کے اُس کو بڑی تیزی سے بھگانا چاہتی ہے اور گاڑی فرسٹ گیئر میں ہی رہتی ہے۔ اسی طرح شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کی کتاب ''کئی چاند تھے سر آسماں''۔ میرے خیال میں وہ اس عہد کی ایک بہت بڑی دستاویز ہے اور میں بہت خوش قسمت ہوں کہ میں نے وہ کتاب چھپنے سے پہلے پڑھی۔

اردو اور انگریزی کے علاوہ میں کوئی اور زبان نہیں جانتا، میں اپنے خاندان کا پہلا آدمی ہوں جس نے فارسی نہیں پڑھی۔ میں فارسی کی چیزیں ترجمے میں پڑھتا ہوں اور اس طرح عربی کی چیزیں بھی ترجمے کے ذریعے۔ نجیب محفوظ کو میں اُس وقت دریافت کرتا ہوں جب وہ انگریزی میں آجاتا ہے اور مغربی دنیا اُس کو پڑھنے لگتی ہے۔

میں یہی گلہ کر رہا ہوں کہ ہمارے جو معروف لکھنے والے ہیں، اُن میں سے ہم بہت سے بہت منٹو کی بات کر لیتے ہیں۔ تھوڑا سا ذکر عصمت چغتائی کا آجاتا ہے۔ بیدی کا نام برابر لیا جاتا ہے۔ لیکن اردو افسانہ ان کے علاوہ بھی تو ہے۔ اس عہد میں غلام عباس لکھ رہے تھے۔ اُسی عہد میں بلونت سنگھ لکھ رہا تھا اور بلونت کیسی خوب صورت کہانی بناتا ہے۔ ظاہر ہے وہ اتنا بڑا یا اتنی بڑی Dimension والا آدمی نہیں ہے جیسا بیدی ہے، ابوالفضل صدیقی ہے، ضمیر الدین احمد ہے، رفیق حسین ہے۔ آج کل لوگ جو بہت اچھا لکھ رہے ہیں، ان میں اسد محمد خاں ہیں، نگہت حسن ہیں، حسن منظر ہیں، حسن منظر کی تحریریں تو لوگوں کو بتانا پڑتی ہیں کہ صاحب یہ وہ آدمی ہے جس نے فلاں فلاں چیزیں لکھی ہیں اور ایک بات جس پر بہت افسوس ہوتا ہے کہ اردو ادب کے بارے میں لوگ بہت Generlize کرتے ہیں کہ اس میں فلاں چیزیں نہیں ہیں اور جب اُن سے پوچھو کہ آپ نے کیا پڑھا؟ کیا آپ نے حسن منظر کا ناول ''العاصفہ'' پڑھا؟ محمد الیاس کی کہر پڑھی یا مرزا اطہر بیگ کا غلام باغ پڑھا؟ اور جب لوگ کہتے ہیں کہ نہیں پڑھا تو بڑا دکھ ہوتا ہے کہ صاحب دنیا میں کسی ملک میں ایسا نہیں ہوتا ہے کہ جو لکھ رہے ہیں اُن کو کسی قسم کی ایک Recognition یا پڑھنے والے تک رسائی نہیں ملتی ہے۔

ایک تو یہ ہے کہ میں بہت سی چیزوں کو خانوں میں نہیں بانٹ پایا، مزاح میں یوسفی صاحب کی تحریریں بے حد پسند ہیں۔ میں اس چیز کو زیادتی سمجھتا ہوں کہ ان کو پطرس کے ساتھ نتھی کریں یا کنہیا لال کپور کے ساتھ، شفیق الرحمٰن کا موازنہ کریں۔ انگریزی میں کہتے ہیں کہ آپ سیب

اور ناشپاتی کا موازنہ نہیں کر سکتے۔ پطرس کی تحریر میں بہت برجستگی ہے، لیکن اُن کی پوری زندگی میں مزاح کی ایک چھوٹی سی کتاب ہے۔ انھوں نے یقیناً بہت محنت کی ہوگی لیکن انھوں نے اپنی محنت کو نمایاں نہیں ہونے دیا۔ یوسفی صاحب کا جو انداز ہے وہ عوامی نہیں ہے۔ آپ بس کنڈیکٹر سے چھابڑی والے سے یوسفی صاحب کا جملہ نہیں لگا سکتے۔ یہ اُن کو کمزوری یا برائی ثابت کرنے کے لیے نہیں کہہ رہا ہوں۔ مختلف زاویوں کے لوگ ہوتے ہیں۔ یوسفی صاحب کا مزاح کسی اور انداز کا ہے۔ پطرس کا مزاح دوسرے انداز کا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ آپ پطرس اور یوسفی دونوں کو پڑھ لیں۔ میں تو خالد اختر صاحب کو پڑھتا ہوں حالانکہ مجھے اُن کا اسلوب بالکل اچھا نہیں لگتا۔ جس طرح کی وہ انگریزی زدہ اردو بناتے ہیں ان کا وہ انداز مجھے قطعاً پسند نہیں، لیکن مجھے اُس سے لطف بھی بہت آتا ہے۔ کوشش یہ ہونی چاہیے کہ جو ادب کے مختلف اسالیب ہیں۔ اُن کا جو ایک تنوع ہے اُس تنوع کو آپ Appriciate کر سکیں۔

ہمارے ہاں گڑبڑ یہ ہوتی ہے جو ہمارے نقادوں نے اور اساتذہ نے پھیلائی ہے۔ فلاں آدمی جو ہے گویا وہ معیار ہے، آپ پطرس کو پسند کر رہے ہیں تو آپ دنیا کے ہر ادب کو ملیامیٹ کر لیں۔ آپ کو فیض پسند ہے تو آپ راشد کو نہ پڑھیے۔ آپ کو راشد پسند ہے تو آپ ساقی فاروقی کو چھوڑ دیں۔ یہ غلط ہے۔ ادب کا مطلب اپنے آپ کو محدود کرنا یا اپنے آپ کو دائروں میں بند کر دینا نہیں۔ اگر ادب آپ کو دائرہ توڑنا ہی نہیں سکھاتا تو پھر ادب کیا رہ گیا۔ مطالعہ صرف اپنے دروازے کے تعصّبات کی توثیق نہیں ہے۔ مطالعہ تو یہ ہے کہ جس چیز کو میں بہت گھٹیا سمجھ رہا تھا، میں نے اُس کو پڑھا تو مجھے معلوم ہوا کہ صاحب اُس میں تو بہت جان ہے۔ مثال کے طور پر مجھے ابوالکلام آزاد کی نثر پسند نہیں رہی ہے۔ تھوڑا سا پڑھا تو مجھے اچھی نہیں لگی۔ مجھے اُس انداز سے کچھ گھبراہٹ ہوتی ہے تو میں کہہ دوں کہ ابوالکلام آزاد کو آج سے ممنوع قرار دیا جائے یا یہ کہ کرشن چندر کے جو گھٹیا افسانے ہیں، وہ مجھے دو کوڑی کے معلوم ہوتے ہیں، لیکن ''بالکونی، غالیچہ اور دو فرلانگ لمبی سڑک'' یہ ساری بہت اچھی کہانیاں ہیں۔

سیاست سے مجھے بہت زیادہ دل چسپ چیز وہ لگتی ہے جس میں تاریخ کے حوالے سے بات کی جاتی ہے۔ ٹائن بی کی کتاب پڑھی، جس آدمی نے بہت حیران کیا آپ اُسے سیاست کے خانے میں رکھیے یا تاریخ کے حوالے سے دیکھیں وہ Decline of the west کا لکھنے والا ہے۔ وہ اس زمانے کی بہت اہم اور کلیدی کتابوں میں سے ایک ہے۔ جس آدمی سے میں بہت متاثر ہوں وہ ایڈورڈ سعید ہیں۔ اس کے ہاں تاریخ کا شعور سیاست اور ثقافت، یہ مل کر ایک نئی آگہی بنتی ہے۔ سیاسی حوالہ تو نوم چومسکی کا بھی بہت بڑا ہے، لیکن چومسکی کی میں نے چند ایک ہی

کتابیں پڑھی ہیں، وہ ذرا دقت طلب مصنف ہے۔

اخبارات میں بچپن سے ہی عادت جنگ پڑھنے کی رہی ہے، لیکن اب جنگ بڑی مشکل سے پڑھا جاتا ہے۔ کیوں کہ اب شاید ہماری عمر کے اور ہمارے جیسے آشوبِ چشم کے لوگوں کے لیے یہ امر آسان نہیں ہے کہ ایک چشمہ اتارو پھر خبر کا سرا تلاش کرو تو اُس کو میں نے خدا حافظ کہہ دیا ہے۔ اس لیے میں ڈان پڑھتا ہوں۔ عام رسالوں میں Herald پڑھتا رہا ہوں۔ ٹائم میگزین دیکھ لیتا ہوں۔ ایک عادت جو اَب راسخ ہوتی جارہی ہے وہ نیٹ کی وجہ سے کئی اخبارات دوسرے تیسرے دن مجھے پڑھنے کا موقع ملتا ہے۔ الاہرام کا جو انگریزی کا ہفتہ وار ایڈیشن ہوتا ہے، اُس کے چیدہ چیدہ کالم نگاروں کے کالم اور ثقافت کے بارے میں مضامین اور تجزیے پڑھتا ہوں۔ حالات حاضرہ کے بارے میں بڑی دل چسپی سے پڑھتا ہوں۔ The Hindu جو ہندوستان کا اخبار ہے، وہ بہت شوق سے پڑھتا ہوں۔

اردو کے کالم نگاروں میں زاہدہ حنا کے کالم، کشور ناہید کے کالم، مسعود اشعر کے کالم اور انتظار حسین کے کالم دیکھ رہا ہوں۔ بہت سارے کالم نگار تو ایسے ہیں کہ جن سے جی چاہتا ہے کہ اگر وہ ہم پہ یہ مہربانی نہ کرتے تو احسان ہوتا۔ میرے والد کے ایک دوست تھے جو امتحانوں کی کاپیاں دیکھا کرتے تھے۔ وہ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد یہ بات کہا کرتے کہ بعض کاپیاں یہاں ایسی ہوتی ہیں جس میں طالب علم کے گھر کا بھی پتا لکھا ہونا چاہے۔ اور ہر ممتحن کو ایک جیپ اور ایک تیل میں بھیگا ہوا ہنٹر (تازیانہ) بھی ملنا چاہیے کہ جیسے ہی وہ پیپر دیکھے تو ہنٹر لے کے پہنچ جائے اور گھر کی گھنٹی بجائے اور جونہی پیپر حل کرنے والا نوجوان سامنے آئے، تو بندہ اس ہنٹر سے اس کی خبر لینا شروع کرے۔ اسی طرح بعض کالم نگاروں کو میں دیکھتا ہوں تو مجھے چودھری اظہار مرحوم، اُن کی جیپ اور ہنٹر بہت یاد آتا ہے اور جی چاہتا ہے کہ میں ان کے کالم پڑھ کر ان کی اسی طرح خبر لیا کروں اور جہاں تک سفر میں پڑھنے کا تعلق ہے مجھے سفر بہت کرنا پڑتا ہے اور ایک فائل بھی ہوتی ہے جسے میں reading فائل کہتا ہوں کیوں کہ میں مختلف رسالے جو نیٹ پر دیکھتا ہوں اُن میں سے بعض چیزیں پرنٹ کر کے رکھ لیتا ہوں جو فوری طور پر تو نہیں پڑھی جاسکتی وہ سفر میں پڑھنے میں بہت مزا آتا ہے اور گھر میں پڑھتا ہوں تو لیٹ کے پڑھتا ہوں تو لیٹ کے کتابیں ہی پڑھی جاسکتیں اور جہاز میں جب بھی کوئی تحریر پڑھی تو خاص نشاط انگیزی نہیں ہوتی جیسا اگر میں پبلک ہیلتھ کی کوئی چیز پڑھوں گا تو وہ میں بیٹھ کے ہی پڑھوں گا۔

مصنفین سے ملنے کا اشتیاق پیدا ہونے سے پہلے ہی میں بہت سارے مصنفین سے مل چکا تھا۔ بہت سے لوگ ایسے تھے جن سے جی چاہتا تھا کہ اُن سے مزید ملا جائے، جیسے قرۃ العین

حیدر سے کئی بار ملا۔ لیکن اتنا نہیں مل سکا کیوں کہ قرۃ العین حیدر جیسی باکمال Conversationlist میں نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھی۔ میں پہلی بار لکھنو جا رہا تھا تو دلی میں رکا اور اُن سے ملاقات ہوئی۔ تو میں نے کہا کل لکھنو جا رہا ہوں تو کہا ارے لکھنو۔ فلاں جگہ دیکھنا وہ ایسی جگہ ہے، انھوں نے آدھے گھنٹے کے اندر شہر کی تصویر لا کھڑی کی یہ اور بات ہے کہ جب میں اُس شہر میں گیا تو مجھے وہ تصویر کہیں نظر نہ آئی اور وہ خاصا مایوس کن شہر ثابت ہوا، البتہ جو عینی آپا کی گفتگو کا سحر تھا انھوں نے اُس شہر کو زندہ کر دیا۔ بہت جی چاہتا تھا کہ اُن سے کسی طرح اور ملا جائے لیکن ظاہر ہے کہ فاصلے رکاوٹ تھے۔ حسن عسکری صاحب کے پاس میں جایا کرتا تھا۔ مجھ میں اور اُن میں عمر کا بڑا فرق تھا۔ وہ بہت مزے کی باتیں کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ میں اُن سے بے تکلف ہو کر بات نہیں کر سکتا تھا۔ بہت سی باتیں اُن سے سیکھنے اور جاننے کا موقع ملا۔ میں اُن سے پوچھتا کہ آپ نے فلاں کتاب پڑھی ہے تو کہتے کہ کتاب بعد میں پڑھوں گا پہلے نماز کا وقت ہو گیا ہے آؤ نماز پڑھتے ہیں۔

تبصرے میں یہ ہوتا ہے کہ کتاب کو پڑھنے کا جو تاثر ہے وہ محفوظ رہ جاتا ہے ورنہ یہ حال ہو گیا ہے کہ جیسے نظیر صدیقی مرحوم نے ایک بات کہی کہ صاحب اس موقع پر ایک آدمی نے کیا اچھی بات کہی اور بھلا سا نام تھا جو بھول گیا ہے اور اُس نے جس بارے میں بات کی اُس کتاب کا نام میں بھول گیا۔

ذوق مطالعہ میں بچوں کو حصہ دار بنانے کی بات ہے تو میری دونوں بیٹیوں کو ماشاء ا? پڑھنے کا بہت شوق ہے۔ بہت غیر معمولی طور پر پڑھتی ہیں اور پھر ان کا ادب کا اچھا مطالعہ ہے لیکن اردو کا اتنا مطالعہ نہیں ہے کیوں کہ اسکول میں تعلیم سے اردو پڑھنے کا جو شوق ہوتا ہے وہ نہیں ہے۔ یہ بات میں اس لیے بھی کہہ رہا ہوں جب میں اسکول میں تھا تو نصاب کے ذریعے سے مجھے اردو پڑھنے کا کبھی شوق نہیں ہوا۔ اگر اردو کو اپنے والد کے مطالعے سے یا گھر میں جو چیزیں دیکھی ہیں، اس حوالے سے جاری نہ رکھا ہوتا تو میں اردو ادب سے منسلک نہ ہوتا۔

ذاتی لائبریری سے متعلق یہ ہے کہ میرے گھر کے ہر کمرے میں کتابیں رکھی ہوئی ہیں اور میرے گھر والے اس سے بیزار بھی ہو جاتے ہیں کہ میں انہیں سمیٹوں اور میں سمیٹ نہیں پاتا۔ کتابیں حاصل کرنے کا مجھے بہت شوق رہا ہے بلکہ جنون رہا ہے، بلکہ یہ ایک بیماری ہے۔ میں تو پرانی کتابوں کا بہت رسیا ہوں اور ڈھونڈتا رہتا ہوں۔ گھومتا رہتا ہوں۔ کراچی میں، لاہور میں، اسلام آباد میں اور بعض کتابیں ایسی ہیں جن کے حاصل کرنے کی پوری داستان ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میری شادی ہونے والی تھی اور میرے والد نے کہا کہ فلاں جگہ جا کے شادی کا کارڈ

دے آؤ۔ تو میں شادی کارڈ دینے کے لیے اس طرح گیا کہ میں پیر کالونی کے بس اسٹاپ سے ہوتا ہوا جاؤں کیونکہ وہاں ایک ٹھیلہ ہوتا تھا کتابوں کا، وہاں جناب میں نے دیکھا تھا کہ اسپنگلر کی زوال مغرب رکھی ہوئی ہے۔ پرانی سی کتاب ہے، اُس کتاب کو خریدنے کے لیے میرے پاس پیسے نہیں تھے اور اُس کتاب کو میں چھوڑ بھی نہیں سکتا تھا اور میں نے گھڑی اتاری اور اُسے ٹھیلے والے کو کتاب کی قیمت کے طور پر بطورِ ضمانت دے دی اور اُسے کہا کہ کتاب تو میں لے جارہا ہوں، کل آتے ہوئے یہ لے جاؤں گا تو اُس نے کہا کہ کتنے بے وقوف آدمی ہیں، اس معمولی کتاب کے لیے اتنی مہنگی گھڑی چھوڑ گئے۔ میں نے کہا کہ آپ کتنے عجیب وغریب آدمی ہیں کہ آپ اس کتاب کو معمولی کتاب کہہ رہے ہیں۔ وہ کتاب میرے پاس آج بھی رکھی ہوئی ہے۔

باقی زندگی کے لیے کونسی کتاب رکھنا پسند کروں گا، تو میں اپنے ساتھ ڈکشنری رکھنا پسند کروں گا کیوں کہ اُس کے ذریعے الفاظ اور کیفیات ساتھ رہتی ہیں۔ ابھی میں ذکر کر رہا تھا حسن منظر کا جو اس عہد کے بڑے ادیب ہیں۔ انہوں نے کہا کہ میں تین کتابوں کے بغیر تو سفر ہی نہیں کرتا۔ ایک قرآن شریف، ایک دیوان غالب اور ایک شیکسپیئر، دیوان غالب کا ایک چھوٹا سا ایڈیشن میرے ساتھ رہتا ہے۔ قرآن شریف چونکہ مجھے بچپن میں پڑھایا گیا ہے۔ وہ مجھے بار بار Attract کرتا ہے۔ Shakespare کی وسعت نظر کے کیا کہنے ہیں، اُس کے بار بار پڑھنے کی طلب ہوتی ہے۔

میں نے قرآن شریف کو کئی بار پڑھا۔ انجیل کو انگریزی میں پڑھا۔ قرآن کو پہلی مرتبہ ڈپٹی نذیر احمد کے ترجمے سے پڑھا۔ ڈپٹی نذیر احمد سے میری خاندانی مناسبت رہی ہے اور اُن کے ترجمے کو میں نے اتنے لطف کے ساتھ پڑھا کہ میرا جب کبھی بھی قرآن شریف پڑھنے کو جی چاہتا ہے تو اُن کا ترجمہ مجھے بار بار یاد آتا ہے۔ وہ محاورے و تراکیب ذہن میں آتی ہیں۔ میں چونکہ عربی نہیں جانتا، مجھے نہیں معلوم کہ وہ کتنا درست ہے۔ اُس کی خالصتاً دینی نقطہ نظر سے کیا اہمیت ہے۔ نذیر احمد کہیں کہیں شوخی کرتے ہیں، لیکن ادبی نقطہ نظر سے تو وہ بڑا کام ہے۔

جہاں تک خاکوں اور آپ بیتیوں کا تعلق ہے، مجھے اشرف صبوحی کے خاکے بہت پسند ہیں۔ اشرف صبوحی کے خاکوں کے انتخاب تو میں نے بھی کیا ہے۔ اپنے والد کے ساتھ مل کر بزم صبوحی کے نام سے پھر ہم نے بزم شاہد کے نام سے جو شاہد احمد دہلوی کا ادبی کام، اس کو منظر عام پر لانے کی کوشش کی ہے۔ اشرف صبوحی اور شاہد احمد دہلوی جن کی میں خاک پا کے برابر ہوں۔ اُن کی زبان اور اُن کی نثر مجھے بہت اچھی لگتی ہے۔ پھر اپنے ہی خاندان کی بزرگ ناصری بیگم، اُن کی ایک شان دار کتاب ''کتاب زندگی'' جواب جا کے شائع ہوئی ہے، اُن کے انتقال کے بیس برس بعد۔ وہ

بڑی باکمال کتاب ہے۔ یہ کتاب تہذیبی زندگی کا بڑا شان دار مرقع ہے۔ نذیر احمد کے خاندان سے ان کا تعلق تھا۔ ڈپٹی نذیر احمد کے جو بیٹے تھے (بشیرالدین) وہ بڑے اہم آدمی تھے ان کو شوق تو ناول نگاری کا تھا۔ لیکن وہ مورخ بہت بڑے ہیں، دارالحکومت دہلی پر کسی بھی شخص کا اس موضوع پر سب سے زیادہ کام انھی کا ہے۔ ان کی کتاب کی چار جلدیں ہیں اور ہزار ہزار صفحوں کی ہیں۔ وہ ایسی کتاب ہے کہ ہندستان کی عدالت میں وہ Evidence کے طور پر شمار کی جاتی ہے، جو چیزیں انھوں نے لکھ دیں نقشے بنائے، ناپا، تصویریں لیں اور دلی کے جو واقعات تھے وہ اُن جلدوں میں جمع کر دیئے ہیں اور اُن کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ صاحب اگلے وقتوں میں کیا کیا لوگ تھے۔

کتاب مستعار لیتے ہوئے بہت خوشی محسوس ہوتی ہے اور دیتے ہوئے دل بہت دکھتا ہے۔ جب اپنے پسندیدہ مصنف کی کوئی ایسی تحریر دیکھتا ہوں تو بہت غصہ آتا ہے پھر کچھ ادھر رواج چل نکلا ہے کہ اردو میں ہمارے ہاں شخصی حملے بہت ہونے لگے ہیں۔ اُس طرح کی چیزیں پڑھ کر کوفت ہوتی ہے۔

ترجموں کے بارے میں آپ نے پوچھا War and Peace کہ اسے اگر اردو میں پڑھا جائے تو اس سے کچھ مزا آئے گا، تو وہ پہلے بھی انگریزی میں ترجمہ ہے اور لوگ اُس کو انجوائے کرتے ہیں۔ وہ جو روسی زبان کا مزا ہوگا وہ تو اپنا مزا ہے۔ بہت کچھ گم ہونے کے بعد بھی اس میں لطف رہ جاتا ہے۔ یہ جو بڑے بڑے کلاسک ہیں، ان کے ترجمے میں پھر بھی کچھ نہ کچھ باقی رہ جاتا ہے۔ اردو میں شاید حمید اختر صاحب نے ''جنگ اور امن'' کے نام سے ترجمہ کیا ہے۔ بڑا کمال کا ترجمہ کیا۔ جس کو کہتے ہیں لفظ اور اُس کے فقرے اور محاورے اُن کے قریب رہنے کی کوشش کی ہے۔ بہت اچھا اور شان دار ترجمہ ہے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اس طرح سے کلاسیکل کا رواج اردو میں پڑھنے سے کم سے کم ہوتا جارہا ہے۔ آپ کو یہ بتاتا چلوں Wuthring Heights کا ترجمہ میرا پسندیدہ ناول رہا ہے۔ یہ عالمی ادب کے شاہ کاروں میں سے ایک ہے۔ اپنے اردو کے قاری کو اُس کتاب سے ہم نے محروم کر دیا، ہم انگریزی کو اپناتے جارہے ہیں اور انگریزی ادب کو بُرا کہتے جارہے ہیں۔ الف لیلیٰ جو مسلمانوں کی ثقافتی تاریخ کا شاہ کار ہے جس کو ساری دنیا نے پسند کیا۔ الف لیلیٰ کا آپ اردو میں اچھا ترجمہ کوئی کہیں سے دکھا دیجیے، جو بازار میں دستیاب ہو۔ افسوس کی بات ہے کہ الف لیلیٰ کا جو ترجمہ ابوالحسن منصور صاحب نے کیا ہے، انھوں نے یہ ترجمہ بابائے اردو کے زمانے میں کیا تھا۔ وہ آج انجمن ترقی اردو نے چھاپا تو اُس میں سے پیرگراف کے پیراگراف غائب کر دیے۔ اُن کو سفید چھوڑ دیا۔ یعنی کلاسک کے معاملے میں ہم بابائے اردو کے زمانے سے پیچھے چلے گئے۔ جو کتاب مسلمانوں کے ثقافتی اور تہذیبی رویے کی

شناخت کا اتنا بڑا حصہ ہے ہم اُس کتاب کو پڑھنے کے متحمل ہی نہیں ہو سکتے۔ کلیلہ دمنہ ایک کتاب ہے۔ Doris Lessing اس کتاب کو دنیا میں انسانی ذہن کے سب سے بڑے تجربے کا نام دیا جاتا ہے۔ جو کتاب ہندوستان میں لکھی گئی پھر ایران میں ترجمہ ہوا۔ کیا انوارِ سہیلی کا کلیلہ دمنہ کا کوئی ایسا ترجمہ موجود ہے جو بازار میں ہو اور آپ اس کو پڑھ سکیں۔ جی ہاں، موجود ہے، انگریزی میں۔ میرے بچے کلیلہ دمنہ اردو میں نہیں پڑھ سکتے، وہ انگریزی میں پڑھتے ہیں۔

تو ہم نے اپنے ثقافتی ورثے سے اپنے آپ کو اتنا دور کرلیا ہے کیونکہ ہم ان سب چیزوں کو اہمیت ہی نہیں دینا چاہتے۔ پھر ہم کہتے ہیں کہ لوگوں کو کتابوں سے دلچسپی ہی نہیں رہی۔ لوگوں نے ٹی وی دیکھنا شروع کر دیا۔ کلیلہ دمنہ کتنے ہزار برس ہمارے مطالعے کا حصہ رہی ہے اور بادشاہوں کی تربیت کے لیے شہزادوں کی تربیت کے لیے نوجوانوں کی تربیت کے لیے اور اس کو بھی چھوڑیے گلستان بوستان ہر بچہ مکتب میں سبق کے طور پر پڑھا کرتا تھا۔ صرف زبان کے لطف کے لیے ہی نہیں اُس میں اخلاقی نصیحتیں ہیں۔ کیا ہم گلستان بوستاں آج طلب کر سکتے ہیں اپنے پڑھنے والوں کے لیے؟ کیا مولانا روم کا کوئی آسان ترجمہ میسر ہے؟ فردوسی کے شاہ نامہ کو ہم نے عام کرنے کی کوشش کی؟ میں نے ابھی کچھ عرصہ پہلے لندن میں دیکھا تھا کہ نظامی کا بیشتر جو کام ہے اُس کو بڑا خوبصورت illustrate کروا کے بچوں کے لیے چھاپا گیا ہے۔ نظامی گنجوی کو وہ بچے تو پڑھ سکتے ہیں اور نظامی جہاں پہ تزک کا حصہ رہا، وہاں سے وہ غائب ہو گیا۔ بہت سے لوگ اُس کا نام بھی نہیں جانتے تو ہم اپنے کلاسیکی ورثے کے ساتھ کیا کر رہے ہیں۔ انگریزی کے ترجمے تو بہت دور کی بات ہے۔ انگریزی کے ترجموں سے ہم نے زیادہ واقفیت پیدا نہیں کی۔ حالانکہ انگریزی زبان پر ہمارا انحصار بڑھتا جا رہا ہے۔ ہم زبان کو تجارت کے طور پر تو استعمال کرنا چاہتے ہیں لیکن زبان کے لیے جو تہذیب ہے اُس سے ہم کوئی واقفیت ہی نہیں رکھنا چاہیے اسے اپنانا یا پھر اس کو مسترد کرنا تو بعد کی بات ہے۔

پرانی انارکلی میں کتابوں کے فٹ پاتھ

زلیخا اویس

کہتے ہیں اچھی کتاب سے بہتر کوئی دوست نہیں، اکثر اس اچھے دوست کی تلاش بڑی مشکل ہو جاتی ہے۔ کتاب پڑھنے والے کو آجکل کے مہنگائی کے دور میں اگر سستی، نایاب و معیاری کتابیں میسر آجائیں؛ تو صاحب، سودا مہنگا نہیں!

میں کتنے دنوں سے ایک کتاب ڈھونے کی کوشش کر رہی تھی لیکن شہر کے تمام اچھے بک سٹالز چھاننے کے باوجود مجھے کہیں سے اپنی مطلوبہ کتاب نہیں مل رہی تھی' اس وجہ سے میں بہت پریشان تھی' کیونکہ مجھے اس کتاب کی اشد ضرورت تھی۔ ایک دن میں اسی پریشانی میں چلی جا رہی تھی کہ میری نظر فٹ پاتھ پر قائم ایک بک سٹال پر پڑی۔ میں یہ سوچ کر وہاں پڑی ہوئی کتابیں دیکھنے لگی کہ چلو ایک نظر یہاں بھی دیکھتی چلوں' ہوسکتا ہے کہ گوہر مقصود ہاتھ آ ہی جائے۔ اوہ' یہ ہی تو وہ کتاب ہے' جسے ڈھونڈ ڈھونڈ کر میں پاگل ہو گئی تھی۔ مجھے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ اپنی مطلوبہ کتاب مجھے فٹ پاتھ پر قائم ایک بک سٹال سے مل جائے گی۔ میں نے فوراً ہی اپنی مطلوبہ کتاب خرید لی' اس کے بعد تو میرا یہ معمول بن گیا کہ اگر کہیں آتے جاتے مجھے فٹ پاتھ پر ایسا کوئی بک سٹال نظر آجاتا تو میں کچھ دیر وہاں رکے بغیر آگے نہیں بڑھتی تھی۔

ایسے بک سٹالز پر نوجوانوں کے ساتھ ساتھ بڑی عمر کے افراد بھی دکھائی دیتے ہیں جو ان کتابوں کی تلاش میں یہاں آتے ہیں۔ ویسے تو اگر کسی نوجوان کو کوئی کتاب خریدنی ہوگی تو وہ باقاعدہ کسی بک سٹال پر جائے گا۔ لیکن فٹ پاتھ کے بک اسٹالز کے حوالے سے یہ بات دیکھنے میں آتی ہے کہ یہاں سے گزرتے ہوئے اکثر لوگ رک جاتے ہیں کہ چلتے چلتے ایک نظر ان کتابوں پر بھی ڈال لیتے ہیں۔ دراصل یہ ان کی کتابوں سے محبت کا ایک ثبوت بھی ہوتا ہے کہ وہ کتابوں کا سٹال دیکھ کر آگے نہیں بڑھ پاتے' چاہے انہیں کوئی کتاب نہ خریدنی ہو' تب بھی ایک نظر ان پر ضرور ڈالتے ہیں۔ ایسے ہی ایک بک سٹال پر کھڑے ایک طلبہ سے میری بات ہوئی تو وہ کہنے لگی کہ یہ میری روزمرہ معمولات کا حصہ ہے کہ میں اکثر ایسے سٹالز پر آتی رہتی ہوں اور اب تک یہاں سے درجنوں کتابیں خرید چکی ہوں' جن میں سے بعض کتب تو بہت نادر و نایاب ہیں' جس کا علم شاید

کتابیں فروخت کرنے والوں کو بھی نہیں ہوگا۔

یوں تو اس طرح کتابیں فروخت کرنے والے کہیں بھی کتابیں رکھ کر بیٹھ جاتے ہیں لیکن چند ایک جگہیں اس حوالے سے خاصی شہرت رکھتی ہیں۔ سڑک پر چلتے چلتے ریگل کے فٹ پاتھ پر ہمیں کتابیں رکھی دکھائی دیتی ہیں، پہلے حسن سکوائر پر بھی کتابوں کے ٹھیلے نظر آتے تھے، آج کل ممتاز منزل پر آپ کو کتابوں کے اسٹال ملیں گے، جہاں ہر وقت لوگوں کا ہجوم دکھائی دیتا ہے۔

پرانی انارکلی ویسے تو یہ سڑک، پورا ہفتہ ہی کھچا کھچ بھری نظر آتی ہے۔ شہر کے اس مصروف ترین بازار میں پورا ہفتہ گاڑیوں اور انسانوں کے رش کے باعث 'تل دھرنے' کی جگہ نہیں ہوتی، مگر 'اتوار' وہ واحد دن ہے جب یہاں کاروباری طبقہ نہیں بلکہ 'کتاب دوست انسانوں' کا رش لگا رہتا ہے۔ وہ لوگ جنہیں پرانی اور سستی کتابوں کا خریدنے کا شوق ہے، اتوار کا انتظار کرتے ہیں، اور اِدھر کا رخ کرتے ہیں۔ علی الصبح لگنے والی پرانی کتابوں' کی اس 'اتوار بازار' میں آپ کو کئی شہری کتابیں کھنگالتے نظر آئیں گے، بشمول خواتین، بچے، بوڑھے اور جوان۔

ایک اتوار میں نے کتابوں کے اس بازار کا رخ کیا، جہاں ایک نوجوان ہاتھ میں 4 سے 5 کتابیں پکڑے ہوئے کئی کتابوں کے عنوانات کو غور غور سے پڑھ رہا تھا۔ دیکھنے میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کئی کتابیں خریدنے کے بعد بھی اس کی تلاش جاری ہے۔ پوچھنے پر بتایا کہ 'میں نے کئی کتابیں خرید لی ہیں۔ مگر، ایسا لگتا ہے ہر کتاب اپنی اہمیت کی کہانی سنا رہی ہے۔ اس لئے فیصلہ کرنے میں دشواری ہو رہی ہے کہ کیا لیا جائے اور کیا نہیں'۔

کتابیں خریدنے والے ایک اور شہری نے بتایا کہ 'کتابیں تو اردو بازار میں بھی مل جاتی ہیں۔ مگر، اتوار بازار کی بات ہی کچھ اور ہے۔ یہاں پرانی کتابوں کی قیمت نصف سے بھی کم ہوتی ہے، جس وجہ سے ہم یہاں سے کتابیں خریدتے ہیں۔''

ایک کتاب فروخت کرنے والے نے بتایا کہ وہ پچھلے 30 برس سے یہاں کتابیں فروخت کر رہے ہیں۔ بقول اُن کے، یہ وہ دور تھا جب یہاں کمپیوٹر اور انگریزی کی کتابیں زیادہ فروخت ہوا کرتی تھیں۔ کتابیں فروخت کرنے والے ایک اور فرد نے بتایا کہ کچھ عرصہ پہلے یہ بازار میں روڈ پر لگتا تھا۔ مگر، اب ایک گلی میں لگاتے ہیں۔ یہ برسوں سے چلا آ رہا ہے۔ بازار بند ہوتا ہے تو ہم یہاں کتابیں بیچ لیتے ہیں۔ نہ دکان کی ضرورت نہ اسٹال کی اور نہ ہی صفائی کی، کتابوں کے اس اتوار بازار میں سستی اور پرانی کتابوں کی فروخت کیلئے، کسی دکان یا اسٹال کی ضرورت نہیں۔ بس، دکان کے آگے بنے فٹ پاتھوں پر پرانی چادر بچھا کر، اُن پر کتابیں سجا دیتے ہیں۔

جبکہ، بعض دکاندار اضافی کتابوں کو بند دکانوں کے شٹر سے لگا کر بھی سجا دیتے

ہیں۔ایک اور قابل غور بات یہ ہے کہ اگر انتظامیہ کی جانب سے صفائی نہ ہونے پر اس سڑک پر کوڑا کرکٹ بھی موجود ہو تو پھر بھی خریداروں کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ پھر بھی کتابیں ڈھونڈنے میں مگن دکھائی دیں گے۔

ہر عنوان پر کتاب دستیاب ہے۔جس میں، مشہور و معروف مصنفوں کی کتابیں رکھی جاتی ہیں۔اُن میں عصمت چغتائی کے ناول، 100 نامور خواتین، شیکسپیئر، علامہ اقبال، فیض، اکبر بگٹی، ایدھی، جواہر لال نہرو اور گاندھی کی انگریزی ترجموں کی کتابیں بھی دستیاب ہیں۔اس کے علاوہ، سائنس، فکشن، شاعری، انسائیکلوپیڈیا، عربی، بزنس، بینکنگ، ڈاکٹریٹ، کمپیوٹر ٹیکنالوجی، انگریزی زبان کی مختلف کتابیں رکھی ہیں۔اس کے علاوہ بچوں کی نظمیں، کہانیاں اور مختلف عنوانات کی کتابیں موجود ہیں، جنھیں دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ یہاں ہر پڑھنے والے کے ذوق کے مطابق کتابیں موجود ہیں۔

ایک کتاب فروش نے بتایا کہ 'یہاں سستی کتابیں فروخت کرتے ہیں، جسکی قیمت عام بازار کی قیمتوں سے نہایت کم ہوتی ہیں۔ جبکہ میرے پاس 500 روپے والی کتاب کی قیمت 100 روپے ہے۔سستی کتابوں کی وجہ سے گاہک یہاں کا ہی رخ کرتے ہیں۔

سستی کتابیں دیکھ کر ذہن میں خیال آیا کہ اتنی سستے داموں بکنے والی کتابوں کا ذریعہ کیا ہے اور یہ کہاں سے لائی جاتی ہیں؟ اس کاروبار سے منسلک ایک فرد نے بتایا کہ 'یہاں کتابیں لاکر فروخت کرنے کے مختلف ذرائع ہیں''۔

ایک ذریعہ پرانے سامان اور کباڑ کی دکانیں ہیں، جہاں ہم خود جا کر اپنے حساب سے کتابیں نکال کر یہاں فروخت کیلئے لاتے ہیں، جبکہ کچھ لوگ اپنی پڑھی ہوئی کتابیں بھی ہمیں یہاں لاکر بیچ دیتے ہیں۔ایک اور کتاب فروش کا کہنا تھا کہ یہ سستا بازار، کتاب کلچر کو فروغ دینے کا سبب ہے۔ ویسے کچھ کتابیں انٹرنیٹ پر مل جاتی ہیں مگر پڑھنے والا کتاب کا مطالعہ ہی کرتا ہے، جس کے بغیر اس کی تسلی نہیں ہوسکتی۔

دو بچوں کے ہمراہ، ایک شہری کتابیں خریدنے میں محو تھا۔اُن کا کہنا تھا کہ چھوٹے بچوں میں کتابوں کے رجحان کو فروغ دینے کے لیے، اچھا ہے کہ انھیں ڈرائنگ اور تصاویر والی کتابیں دلائی جائیں، تاکہ یہ چھوٹی عمر سے ہی پڑھنے کی جانب راغب ہوں۔ ہر اتوار کو انارکلی میں لگنے والا کتابوں کا یہ بازار بھی خوب ہے۔ یہاں اکثر ایسی کتابیں میسر آجاتی ہیں جو بازار یا لائبریری میں باآسانی دستیاب نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر عمر اور ہر ذوق کے افراد یہاں کا رخ کرتے ہیں۔دکانداروں کا کہنا ہے کہ یہاں ایسی کتابیں بھی مل جاتی ہیں جنہیں عام آدمی کی جیب خریدنے

کی اجازت نہیں دیتی جبکہ کاروبار کے ساتھ علم دوست افراد سے مل کر بھی بہت خوشی ہوتی ہے۔
کتابوں کی خریداری کیلئے یہاں آنے والوں کا کہنا ہے کہ شہر کا یہ بازار علم کے متوالوں کے لئے ایک چشمہ ہے جو کسی حد تک ان کی پیاس بجھانے کا ذریعہ ہے۔ البتہ بعض نوجوان یہ شکایت بھی کرتے ہیں کہ اب ایسے بک سٹالز اور اتوار بازار میں بھی کتابیں مہنگے داموں فروخت کی جاتی ہیں اور اگر دکان دار کو یہ پتہ چل جائے کہ ہم کوئی مخصوص کتاب خریدنا چاہتے ہیں تو وہ ایک دم سے بہت زیادہ نرخ بتا دیتا ہے کیونکہ اسے علم ہوتا ہے کہ اب خریدار اسے خریدے بغیر نہیں جا سکتا۔ دوسری طرف دکان داروں کا کہنا ہے کہ اب انہیں کتابیں مہنگے داموں ملتی ہیں' اس لیے وہ کتابیں مہنگے داموں فروخت کرنے پر مجبور ہیں۔

جدید دور میں بھی کتابوں کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا، جس کا ثبوت انارکلی میں لگنے والے اس بازار میں لوگوں کی بڑی تعداد میں آمد ہے۔

امین پور بازار فیصل آباد میں فٹ پاتھ کی کتابیں

قاسم یعقوب

کتاب گھر سے نکل کر کب فٹ پاتھ پر پہنچتی ہے اور انھیں کون اور کیوں خریدتے ہیں؟ اور کیا ہر وہ کتاب جو فٹ پاتھ پر پہنچتی ہے گھر سے نکالی گئی ہوتی ہے؟

یہ سوال ہر کتاب بینی کے شوقین کو درپیش ہوتے ہیں۔

میں ایک بُک سٹال کارنر پر کھڑا کچھ ایسی قسم کے سوالوں میں گھرا تھا جو ایک فٹ پاتھ پر سجایا گیا تھا۔ اسی فٹ پاتھ کے دائیں بائیں اور دوسری طرف اس طرح کے درجنوں سٹالز نظر آ رہے تھے۔ لوگ تھے کہ ایسے اُمڈ آئے تھے کہ جیسے مفت کی کتابیں بِک رہی ہیں۔ سستی کتابیں اور نایاب کتابوں کے وہم میں مبتلا نئے اور پرانے چہروں کی بھرمار تھی۔ اتنی سستی کتابوں پر بھی طولانی بحث معرکہ ہوتا اور بلاخر کتاب بِک جاتی۔

میں بھی اسی طرح کے ایک سٹال پر پرانے نسخوں جن کے دوبارہ ایڈیشنز شائع ہو چکے ہیں، ختم شدہ کتابوں اور ایسی کتابیں جن کے مقامی ایڈیشنز ملنا ناممکن ہوتا ہے ڈھونڈ رہا تھا، لو جی______بہت سی کتابیں ایک دم نظر آ گئیں_____

میرا سوال مزید کرید پیدا کر رہا تھا کہ یہ نایاب اور پرانی کتابیں یہاں تک کیسے پہنچ گئیں!!!

یہ اکیسویں صدی کی پہلی دہائی کے پہلے سال کی بات ہوگی۔ میرے جی سی فیصل آباد کے استادِ محترم پروفیسر سعید احمد نے کلاس میں لمبی تمہید باندھی کہ فٹ پاتھ پر نایاب کتابیں ملتی ہیں۔ آپ نوجوانوں کو بھی ضرور دیکھنی چاہیے اور اچھی کتابوں کا ذخیرہ اپنے پاس رکھنا چاہیے۔ میں نے کلاس کے بعد اس بابت تفصیل جاننا چاہی۔ سعید صاحب نے بتایا کہ صبح صبح جب سٹالز لگائے جا رہے ہوں، بوریاں کھولی جا رہی ہوں اور اُن کی ترتیب بندی کی جا رہی ہو تب وہاں پہنچنا چاہیے تا کہ جو کتاب بھی نایاب یا اہمیت کی حامل ملے فوراً اٹھا لیں ورنہ ان کتابوں کے رسیا پہنچنا شروع ہو جاتے ہیں اور پھر مجنونوں کے مجموعوں کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ مجھے یاد ہے میں پہلی دفعہ سعید صاحب سے بھی پہلے امین پور بازار پہنچ گیا تھا اور بہت سی ایسی کتابیں جن کا نام بھی نہیں سنا تھا اور

قدامت سے اندازہ لگا کر خریدنے لگا تھا۔ پھر سعید صاحب نے وہاں آ کر مجھے مزید ایسی کتابوں کا بتایا جو میرے علم میں بھی اضافہ تھا۔ یوں میں شہر کے ان فٹ پاتھوں کا مستقل گاہک بن گیا تھا۔

یہ فٹ پاتھ مارکیٹ اب بہت توانا اور ''ہوشیار'' ہو چکی ہے۔ انھیں پتا چل گیا ہے کہ کون سی کتاب کس فرد کے لیے کتنی اہم ہے۔ یہ مالکان اب اولڈ بک شاپس کا بڑے پیمانے پر کاروبار کرنے لگے ہیں۔ فیصل آباد میں امین پور بازار، کراچی میں صدر، لاہور میں پرانی انارکلی اور پنڈی کے صدر بازار میں ان فٹ پاتھوں کی قطاریں دیکھی جاسکتی ہیں۔ یہاں صرف ادب نہیں بِکتا بلکہ ''طب، فلسفہ، دست شناسی، ریاضی، طبیعات، کھانے بنانے کے طریقے، اور سائنس کی نایاب کتابیں بھی بکتی ہیں۔ مستقل گاہکوں کے ساتھ منفرد سلوک کیا جاتا ہے۔ انھیں فون کر کے گھر آنے کی دعوت بھی دی جاتی ہے۔ ان کے لیے کتابیں پہلے سے ہی نکال لی جاتی ہیں تاکہ یہ اولڈ بکس والے ان گاہکوں کی ضرورت بنے رہیں۔ فیصل آباد میں ہمارے ایک سینئر پروفیسر غوث علی ہوتے تھے، انھیں کتابیں اور صرف پرانی کتابوں کا اتنا شوق ہوتا تھا کہ دیوانہ وار بھاگے جاتے اور بھاری بھاری شاپر اٹھائے لوٹتے۔ ان کا کمرہ بس کتابوں سے بھرا ہوتا۔ ان کے سونے اور میز کی جگہ اتنی محدود ہوگئی تھی کہ ذرا سی چوٹ پہ کتابوں کا ملبہ اُن پر آ گرنے کا احتمال لگا رہتا۔ مگر وہ کتاب خریدنا نہیں بند کرتے تھے۔ یہیں امین پور بازار کے فٹ پاتھ میں ایک صاحب ارشد علی بھی آیا کرتے۔ اُن کو کتابوں کے پڑھنے سے زیادہ کتابیں اکٹھی کرنے کا شوق تھا اور وہ مختلف سکالرز کی مدد کیا کرتے۔ میں نے اکثر غوث صاحب اور سعید صاحب سے سنا کہ آج فلاں سکالر نے ارشد صاحب کی لائبریری سے خاطر خواہ مدد لی۔ ایک دن میں بھی سعید صاحب کے ساتھ ارشد صاحب کے ہاں چلا گیا جو ملت روڈ پر واقع ایک آبادی میں مقیم تھے، ارشد صاحب نے اپنی لائبریری کے دروازے کھول دیئے اور کتابوں کے حروف کسی سیلابی پانی کی طرح مجھے اپنی طغیانی میں ڈبونے لگے۔ مجھے بے حد اشتیاق پیدا ہوا کہ میرے پاس بھی ایسی لائبریری ہو جو شہر کا نایاب کتب خانہ کہلائے۔

یہ بھی عجیب بات کہ یہ کتب فٹ پاتھوں پر نیچے بے دردی سے پڑی ہوتی ہیں مگر کسی کو بُرا نہیں لگتا اور نہ ان بازاروں میں ان فٹ پاتھوں پر بیٹھ کر کتابیں خریدنا معیوب لگتا ہے۔ سنا ہے کمیٹی والوں کو مخصوص بھتا ملتا ہے جو اس ''ناکارہ کاروبار'' کو جاری رکھنے کا لائسنس جاری کرتے ہیں۔ ایک وقت ایسا بھی آ گیا کہ مجھے اپنی کتابیں اور رسالے بھی ان فٹ پاتھوں کی زینت بنتے نظر آنے لگے۔ میں حیران تھا کہ یہ یہاں تک کیسے پہنچے؟ میری کُرید اور بڑھنے لگی _____ آخر ان فٹ پاتھ سٹالوں کا ذریعہ کیا ہے؟ یہ کہاں سے کتابیں اٹھاتے ہیں اور ایسی ایسی کتابیں جن کو دیکھ کر

ہی خریدنے کی اشتہا پیدا ہونے لگے۔ ایک دن میں نے ایک کتاب ''باقیاتِ میرا جی'' مرتبہ شیما مجید'' امین پور بازار سے خریدی، اُس پر ایک سرکاری کالج کی سٹمپ لگی ہوئی تھی۔ میں نے سعید صاحب کو دکھائی تو انھوں نے بے ساختہ کہا: ''اوہ ہ____ یہ بُک سٹال والا کم بخت____ خرید لایا____'' میں نے کہا کہ کیا ماجرہ ہے تو سعید صاحب بتانے لگے:

''ایک کثیر تعداد میں کالج کی لائبریری سے کتابیں چوری ہو گئی تھیں، یہ سب ''بُک سٹالز فٹ پاتھیے'' ان کتابوں کو خرید لاتے ہیں۔ مگر سنا تھا کہ ایک شہر کی چوری کتابیں دوسرے شہر میں بکتی ہیں مگر یہ تو یہیں بک رہی ہیں اور یہ شخص تو ایسا نہیں تھا، یہ بھی خرید لایا''____________ میں سوچنے لگا کہ لائبریریوں کا مال فٹ پاتھوں پہ جاتا ہے اور پھر گھروں میں منتقل ہو جاتا ہے۔ ہم بھی عجیب ہیں لائبریری میں کتاب دیکھنا نہیں چاہتے گھر میں شاید زیادہ مفید ہو جاتی ہے۔

کچھ سال پہلے میں کراچی میں ایک ادبی کانفرنس میں گیا تو میں نے وہاں جاتے ہی مقامی لوگوں سے وہاں کے کتاب بازاروں کا پوچھا جو فٹ پاتھوں کی زینت بنتے ہیں اور میں اتوار والے دن وہاں پہنچ گیا۔ میں نے اپنی سینئر ڈاکٹر نجیبہ عارف صاحبہ سے بھی کہا کہ اگر آپ کو دلچسپی ہو تو میرے ساتھ چلیں انھوں نے کہیں اور جانا تھا جس کی وجہ سے مجھے اکیلے ہی اس دشت کی سیاہی کرنا پڑی۔ مگر جب ہم شام کو کھانے کی میز پہ اکٹھے ہوئے تو انھوں نے نہ صرف یہ پوچھا کہ آپ گئے تھے بلکہ ایک ایک خریدی گئی کتاب کی تفصیل پوچھنا شروع کر دی۔ مگر میں زیادہ بہتر خریداری نہیں کر سکا تھا۔ شاید کراچی میں یہ کلچر دم توڑ چکا ہے۔

بہت سا وقت گزر گیا تھا میں نے اب فٹ پاتھوں کے چکر لگانے بھی کم کر دیئے اور صلاح الدین درویش کے بقول کہ ''ان فٹ پاتھوں پہ اب کچھ نہیں ملتا۔ اب اپنی ہی کوئی ختم شدہ کتاب مل جائے تو اٹھا لو اور کچھ نہیں ملنے والا۔''

میں گذشتہ دنوں فیصل آباد گیا تو سعید صاحب کی ضخیم لائبریری کو دیکھنے لگا اور ساتھ ہی اس فٹ پاتھ کلچر پر نئی معلومات پہ کئی سوال کر ڈالے۔ میں نے یہی سوال اُن کے سامنے رکھ دیا کہ کیا اب ان فٹ پاتھ سٹالوں پہ ''کام کا مال'' نہیں آتا؟ انھوں نے جواب دیا کہ ''اب یہ سٹال والے چالاک ہو گئے ہیں، بہت مہنگے داموں کتاب بیچتے ہیں کئی ردی والوں نے تو الگ سے شورومز بنا لیے ہیں یا جنھوں نے پہلے ہی شورومز بنا رکھے ہیں ان کو کتابیں بیچ آتے ہیں۔ باقی سب کچرا فٹ پاتھ پہ آ جاتا ہے۔'' میں نے مایوسی کا اظہار کیا اور کچھ توقف کے بعد پوچھا:

''سر____ وہ ارشد صاحب اور غوث صاحب ٹھیک ہیں؟ کیا اب بھی وہ کتابیں ڈھونڈتے پھرتے ہیں؟'' سعید صاحب نے غوث صاحب کے نام پر مسکرا دیا اور ان کی

ایک بڑے آفیسر بننے کی خبر سنائی، البتہ ارشد صاحب کا بتایا کہ وہ تو وفات پا گئے ہیں۔ میں نے افسوس کا اظہار کرتے کہا کہ ''سر ___ ان کی اتنی شاندار لائبریری کا کیا بنا'' سعید صاحب نے کہا'' وہ تو ان کے بچوں نے آگے بیچ دی''

میں نے بے ساختہ کہا: ''کس کو''

انھوں نے کہا: ''ردی والوں کو ___ کوئی دو لاکھ روپے بنے ___ بیٹے خوش ہو گئے کہ اتنے پیسے ان بے کار کتابوں کے!''

میں سعید صاحب کی باتیں سن کے یک دم سکتے میں آ گیا اور کچھ دیر گم ہو گیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ میری کتابیں تھیں جو کسی نے مجھ سے چھین لی ہیں مگر مجھے خوشی بھی تھی کہ مجھے میرے سوال کا جواب مل گیا تھا۔

''کتاب گھر سے نکل کر کب فٹ پاتھ پر پہنچتی ہے اور انھیں کون اور کیوں خریدتے ہیں؟''

صدر کراچی کی پرانی کتابیں

اختر حسین بلوچ

اتوار کے دن کراچی، صدر کے علاقے میں واقع مارکیٹیں بند ہوتی ہیں۔ صدر کی چوڑی سڑکوں پر جن میں عام دنوں پیدل چلنا بھی محال ہوتا ہے۔ اس دن صدر کی سڑکیں موٹر گاڑیوں اور عام لوگوں کے لیے اپنا دل کھولے بیٹھی ہوتی ہیں۔ مگر وہ بھی جانتی ہیں کہ یہ کراچی کے باسیوں کے آرام کا دن ہے، اس لیے مایوسی کا شکار رہتی ہیں۔ پھر لمبی تان کے سو جاتی ہیں۔ ریگل چوک کے ساتھ ایک سڑک ایسی ہے جو مسرور و شاداں رہتی ہے۔ اتوار کا دن اس کے لیے عید، کرسمس یا ہولی سے کم نہیں ہے۔ اتوار کو یہاں آنے والوں میں مسلمان، ہندو، عیسائی سب ہی شامل ہیں۔ سڑک کے لیے ایک قابل فخر بات یہ بھی ہے کہ یہاں آنے والوں میں ہر طبقہ فکر کے لوگ شامل ہیں۔ یہاں مختلف سیاسی نظریات رکھنے والے لوگ بھی آتے ہیں۔ ان میں محقق ہیں تو شاعر بھی مذہبی اکابر بھی تو قوم پرست بھی لیکن یہ سب بغیر کسی تفریق کے اُس کی میزبانی سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اور ہر کوئی اپنی استطاعت اور ذوق کے مطابق خریداری بھی کر رہا ہوتا ہے۔ آپ بھی سوچتے ہوں گے کہ میں کیا قصہ لے بیٹھا کراچی جہاں روز دسیوں افراد زبان رنگ نسل اور مذہب کے نام پر قتل کیے جاتے ہوں، کیا کوئی ایسی مہربان سڑک کا وجود بھی ہے جو تمام تعصّبات سے بالاتر ہو کر اپنے مہمانوں کے لیے فرش دل راہ کیے بیٹھی ہو۔ جی ہاں یہ سڑک موجود ہے۔ ریگل چوک جو کبھی آمروں کے خلاف سیاسی سرگرمیوں کا مرکز ہوتا تھا یہ اُس سے متصل ہے۔ بھلا ہو ہمارے اخبار نویسوں کا جنھوں نے سیاسی پارٹیوں کو سمجھا دیا کہ ریگل چوک پر مظاہرہ کرنے سے ان کی کوریج میں کمی رہ جاتی ہے۔ اس لیے اب یہ تمام مظاہرے کراچی پریس کلب پر ہوتے ہیں۔ چلیں چھوڑیں اس پر پھر کبھی بات کریں گے۔ ہاں تو ذکر کرتے ہیں سڑک کا۔ اس سڑک پر اتوار کی صبح 8 بجے سے ہی میزبان مہمانوں کے لیے چیزیں لے کر پہنچنا شروع ہو جاتے ہیں۔ وہ یہ سامان رکشوں، سوزوکی پک اپ، موٹر سائیکلوں اور ٹھیلوں پر لے کر پہنچتے ہیں۔ کمال یہ ہے کہ ہر میزبان کے پاس اپنی ورائٹی ہوتی ہے لیکن چیز ایک ہی ہوتی ہے اور وہ ہے کتاب۔

جی ہاں، ہم ہر اتوار کو ریگل چوک سے متصل سڑک پر پرانی کتابوں کی نمائش کا ذکر کر

رہے ہیں۔ اگر آپ کو ہمارے لکھے پہ اعتبار ہو تو کبھی آ کر آزما لیں۔ اگر آپ ریگل کی جانب سے سڑک پر داخل ہوں گے، تو دو انتہائی خوبصورت سندھی بولنے والے کتب فروشوں ندیم اور اسلم سے آپ کا واسطہ پڑے گا جن کی مادری زبان اردو ہے ۔ اگر آپ دوسری جانب سے سڑک پر داخل ہوں گے تو پنجابی بولنے والے الیاس صاحب نئی چھپی ہوئی کتابیں لیے بیٹھے ہوں گے۔ اس کے فوراً بعد ایک اردو بولنے والے صاحب بچوں اور بڑوں کی کتابیں لیے آپ کے منتظر ہوں گے۔ ان کے بعد ایک پختون اردو ادب پر مبنی کتابیں فروخت کر رہے ہوں گے۔ ان کے بالکل سامنے ایک کیتھولک عیسائی نوجوان ٹھیلے پر کتابیں سجائے بیٹھا ہے۔ اس کے پاس کتابیں بہت زیادہ نہیں اور بیشتر عیسائی تبلیغی اداروں کی چھاپی ہوئی ہیں۔ اس طرح آپ آگے بڑھتے رہیں، ایک سفید داڑھی والے بروہی صاحب کتابیں سجا رہے ہوں گے۔ انھیں کتابیں سجاتے سجاتے صبح سے سہ پہر ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد وہ کتابیں دوبارہ بوروں میں ڈالنا شروع کرتے ہیں۔ کتابیں سجانے اور دوبارہ بوروں میں ڈالنے کا یہ عمل صبح سے شام تک جاری رہتا ہے۔ اُس دوران اگر کوئی ان سے کتاب کی قیمت پر بھاؤ تاؤ کرے تو اُسے کتاب کی سن اشاعت کا حوالہ دے کر یہ بتاتے ہیں کہ جب کتاب چھپی کاغذ کا ریٹ کیا تھا اور اب کیا ہے۔ اُس وقت کتابیں کمپیوٹر پر لکھنے کے بجائے کاتب لکھا کرتے تھے۔ ان کی پوری کوشش ہوتی ہے کہ خریدار کتاب نہ خریدے اور اگر خریدنے کی ہمت کر لے تو ان کی قیمت پر خریدلے۔

ان سے کچھ فاصلے پر ایک خان صاحب اپنی کتابیں سجائے بیٹھے ہوتے ہیں۔ یہ سیاسی طور پر خاصے باشعور ہیں۔ اگر ان سے آپ کو سستی کتاب لینی ہے تو ان کے دو تین سوالات کا جواب ان کی مرضی کے مطابق دینا ضروری ہے۔ پہلا سوال کراچی کے حالات کے بارے میں ہوتا ہے۔ جس میں آپ کی جانب سے جواب یہ ہونا چاہیے: 'حالات کچھ بھی ہوں پختونوں کے ساتھ بڑا ظلم ہو رہا ہے'۔ دوسرا سوال صدر زرداری کے بارے میں ہوگا اور اگر آپ نے کہہ دیا کہ اگلی باری پھر زرداری تو پھر کیا کہنے۔ اس کے بعد وہ زرداری کی ذہانت پر ایک مختصر خطاب کر کے کتاب آپ کو آپ کی اپنی پسندیدہ قیمت پر دے دیتے ہیں۔ اس دوران متعلقہ تھانے کی پولیس کی ایک گشتی وین بھی وہاں ایک آدھ چکر لگاتی ہے۔ غلط فہمی میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں یہ آپ کی حفاظت کے لیے نہیں بلکہ کتب فروشوں سے اپنا حصہ وصول کرنے آتی ہے۔ اس کتابی میلے کی تاریخ کے بارے میں مختلف لوگوں کی مختلف رائے ہے۔ کوئی اس کی عمر تیس سال بتاتا ہے تو کوئی پچیس سال لیکن اس سلسلے میں مستند تاریخ معروف ترقی پسند محقق احمد سلیم نے اپنی کتاب "فیض: یادیں، باتیں" میں کچھ یوں بیان کی ہے: "1964 میں ماہنامہ افکار نے فیض نمبر نکالنے کا اعلان کیا۔ فیض

کے بارے میں اس خصوصی اشاعت میں پاکستان بھر کے طلباء و طالبات کو دعوت دی گئی تھی کہ وہ فیض پر بہترین نثری اور منظوم تخلیقات کے مقابلے میں شرکت کریں۔ میں نے اس حوالے سے اپنی نظم 'مدیر افکار' کو بھیجی۔ اس کے بعد ان کی جانب سے مجھے ایک خط ملا کہ ججوں کے پینل نے میری نظم کو بہترین قرار دیا ہے۔ آخر وہ دن بھی آ گیا کہ جب میں نے فیض صاحب کے دست مبارک سے انعام کی شکل میں کتابوں کا پیکٹ وصول کیا۔ میں اس دن کو آج تک فراموش نہیں کر سکا۔ حال یہ تھا کے بھوک اور نقاہت کے باعث مجھ سے چلا تک نہیں جا رہا تھا اور کتابوں کا بڑا بنڈل اٹھانا مشکل ہو رہا تھا۔ تقریب سے میں سیدھا ریگل چوک کی پرانی کتابوں کی دکانوں پر گیا۔ پیکٹ کھول کر چھ کی چھ کتابیں اونے پونے بیچ دیں۔ دکاندار فیض کی دستخطوں والی کتابیں دیکھ کر پھولا نہں سما رہا تھا۔ اس نے مجھے پورے تیس روپے دیئے۔ میں پیسے جیب میں ڈالے، سیدھا کافی ہاؤس کی جانب لپکا اور کئی مہینوں بعد پیٹ بھر کر کھانا کھایا۔ یہ پر مسرت عیاشی میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ میں پیر الٰہی بخش کالونی کی ایک مسجد کے حجرے میں دس روپے ماہانہ کرائے پر رہتا تھا۔ اس واقعے کو تین چار دن گزرے ہونگے جب ماہنامہ افکار سے کوئی مجھے ڈھونڈتا ہوا وہاں پہنچا۔ صہبا لکھنوی کا پیغام تھا کہ میں انہیں فوراً ملوں۔ میں پہنچا تو وہ غصے میں بھرے بیٹھے تھے، چھوٹتے ہی بھولے، میاں یہ نظم کسی سے لکھوائی ہے یا چوری کی ہے؟ میں ساری کہانی سمجھ گیا۔ میرے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہ تھا کہ میں نے انعامی کتابیں ردی میں کیوں بیچیں۔ وہ دیر تک مجھے کوستے رہے۔ اس کے بعد مجھے حکم دیا کہ میں فیض صاحب کو ہارون کالج، لیاری جہاں وہ پرنسپل تھے، جا کر ملوں۔ دوسری صبح میں ہارون کالج جو عرف عام میں کھڈا کالج بھی کہلاتا تھا، پہنچ کر فیض صاحب کے سامنے پیش ہوا۔ میں کرسی پر بیٹھ گیا تو بولے؛ ''بھئی ہم آپ کا تفصیلی تعارف چاہتے ہیں''۔ میں نے انہیں مختصراً بتایا۔ کبھی کبھی اتنے پیسے بھی نہیں ہوتے کہ پیٹ کی آگ بجھا سکوں۔ مجبوراً آپ کی انعامی کتابیں فٹ پاتھ پر بیچنا پڑیں۔ وہ دوبارہ مسکرائے اور کہا، " بھئی اس طرح تو ہم سب کے ساتھ ہوتا ہے"۔ ان کی گفتگو کا لب لباب یہ تھا کہ میں اردو کالج چھوڑ کر ان کے کالج میں آ جاؤں، کتابیں اور داخلہ مفت ہوگا اور جلد ہی نوکری کا بندوبست ہو جائے گا۔ اٹھتے وقت انہوں نے وہ کتابیں دوبارہ مجھے تھما دیں جو فٹ پاتھ سے غالباً سحر انصاری صاحب نے خرید کر انہیں پہنچائیں تھی"۔ احمد سلیم کی اس روایت کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کتابی میلہ کم از کم 50 سالہ سال پرانا ہوگا ہے۔ صدر ٹاؤن کا صفائی کرنے والا عملہ بھی بیچنے والوں اور خریداروں دونوں کے مزاج کو سمجھتا ہے۔ ہر کتاب کے اسٹال کے ساتھ ایک کچرے کا ڈھیر ضرور نظر آتا ہے۔ یہ کتابوں اور کچرے کا ایک حسین امتزاج نظر آتا ہے۔ شاید انھیں معلوم ہے کہ کتابیں بیچنے والے کتابیں ردی کے بھاؤ پر لے کر آتے

ہیں۔دونوں جانب کچرا ہی تو ہے۔ایک اُٹھانے کے لیے دوسرا بیچنے کے لیے۔

. آخر یہاں کتابیں کہاں سے آتی ہیں؟ اس سوال کا جواب نامور محقق عقیل عباس جعفری نے کچھ یوں دیا؛"جولوگ یہاں سے نادر و نایاب کتابیں خریدتے ہیں۔بس ذرا اُن کے مرنے کی دیر ہوتی ہے۔ان کی بیویاں اور بچے یہ کتابیں دوبارہ یہاں پہنچا دیتے ہیں۔کتنا بڑا احسان کرتے ہیں یہ نئے پڑھنے والوں پر۔ورنہ یہ کتابیں گھروں پر پڑی سڑتی رہیں۔پھر دیمک انھیں چاٹ لے۔اس سے بہتر ہے کہ یہ کسی کام آ جائیں"۔عقیل عباس کہتے ہیں کہ گھر والوں کی یہ سوچ بھی ہوتی ہے کہ گھر کا ایک کمرہ تو خالی ہو۔سڑک کے میزبان ہر مہمان کے کوائف سے مکمل آ گاہ ہوتے ہیں۔جس میں عمر، پیسہ اور علاقہ بھی شامل ہوتا ہے۔اگر کوئی مہمان 10 ہفتوں تک میزبان کو مہمانی کا شرف نہ بخشے تو عمر کے حوالے سے اُس کی غیر حاضری کی وجہ کا اندازہ لگایا جاتا ہے۔اگر مہمان کی عمر 60 سے اوپر ہے تو اس کے کسی ہم خیال دوست سے اس کے بارے میں معلوم کیا جاتا ہے۔اگر آپکا کوئی دوست متواتر نظر نہ آئے تو مہمان چپکے سے بتا دیتے ہیں کہ عباس کشمیری کی نعش پڑوسیوں نے چندہ کر کے آزاد کشمیر بھجوادی ہے۔اُس دن سڑک پر کشمیر کی تاریخ اور جدو جہد آزادی کے حوالے سے بے شمار کتابیں ایک اسٹال پر موجود تھیں۔ایک دن ایک میزبان کے اسٹال پر شیعہ مذہب کے حوالے سے بے شمار کتابیں موجود تھیں۔ایک آدھ میں نے بھی خرید لی میزبان نے مجھے خاموشی سے بتایا رضوی صاحب کا انتقال ہو گیا۔اس کے بعد میں نے معلوم کرنا چھوڑ دیا۔بس کتابیں دیکھ کر اندازہ کر لیتا ہوں کہ شیعہ، بریلوی، دیو بندی، عیسائی، سُرخا، شاعر یا دانشور کون مرا ہے۔میرا سابقہ ہندوستانی صدر عبدالکلام سے مکمل تعارف بھی اسی سڑک پر ہوا۔مجھے پہلی بار معلوم ہوا کہ ان کا پورا نام ابولفخر جین العابدین عبدالکلام ہے۔میرا خیال ہے 'جین العابدین' سے مراد زین العابدین ہے ان کی سوانح عمری پر ان کے دست خط ہیں۔ یہ کتاب کان پور کے کسی کتابی میلے میں سے خریدی گئی تھی اس کے بعد ایمیسٹر ڈیم گئی اس کے بعد اس بازار میں پہنچ گئی۔ ایک اور کتاب جو مشہور ہندوستانی مصور ایم ایف حسین کی سوانح عمری ہے اور اس پر ان کے دستخط بھی ہیں وہ بھی یہیں ملی۔ایک اور کتاب جو نامور نقاد محمد علی صدیقی نے ایک دوست کو اپنے دستخط کے ساتھ پیش کی تھی اسی سڑک سے ملی . ہمارے دوستوں شاہد بھائی، عقیل عباس جعفری کے پاس ایسی بے شمار کتابیں ہیں اب تو کسی مصنف کی کتاب لینے کے بعد کتاب پر اس کے دستخط کراتے ہوئے کئی بار سوچنا پڑتا ہے کہ لوگ ہمارے بیوی بچوں کے بارے میں کیا سوچیں گے؟

ریگل چوک انارکلی اور کتاب فروش رانا اصغر

محمود الحسن

کتابوں کے بھانت بھانت کے عشاق ان کے پاس آتے ہیں، کوئی مجبوری ان کے شوق کی راہ میں مزاحم نہیں ہوتی۔ ایسوں میں سب سے منفرد اور ''بہادر'' ہمیں وہ لگے، جن کے گھر کتابوں کا ڈھیر لگ چکا ہے، مزید کی گنجایش نہیں، لیکن اُن سے رہا نہیں جاتا، اور وہ پرانی کتابوں کے اس میلے میں پہنچ جاتے ہیں۔ وہ معاشی دباؤ تو برداشت کر لیتے ہیں، لیکن ایک دباؤ جو اس سے بڑھ کر ہے، اور جس کے بارے میں ہمیں 28 برس سے کتابوں کی فروخت سے وابستہ رانا محمد اصغر نے بتایا، وہ بیگمات کا دباؤ ہے، جو اپنے شوہروں کی کتاب دوستی سے عاجز ہیں، اِس لیے یہ حضرات، بیگموں کے ڈر سے کتابیں خرید کر ان کے پاس رکھوا جاتے ہیں، اور بعد میں مناسب وقت پر آ کر خاموشی سے لے جاتے ہیں۔

رانا محمد اصغر نے 18 برس، ہر اتوار کو ریگل میں فٹ پاتھ پر کتب کو آراستہ کیا، لیکن سات آٹھ برس قبل وہ ادھر ایسی جگہ اُٹھ آئے، جس کو برصغیر کی ادبی تاریخ میں تاریخی مقام حاصل ہے، اور یہ جگہ پاک ٹی ہاؤس ہے، جو اِس زمانے میں نیا نیا بند ہوا تھا، انھوں نے ٹی ہاؤس کے سامنے کتابوں کا اسٹال لگانا شروع کر دیا۔ اس وقت انھیں ٹی ہاؤس کی اہمیت کا تو خوب احساس تھا، لیکن شاید یہ اندازہ نہیں تھا کہ اِدھر کام کرنا انھیں کس قدر راہم بنا دے گا۔ ٹی ہاؤس کی تزئین و آرائش اور اس کے دوبارہ کھلنے کی خبروں نے اس کو پھر سے لوگوں کی توجہ کا مرکز بنا دیا، ایسے میں ان کی بھی بن آئی ہے۔ وہ بتا رہے تھے کہ ابھی چند دن قبل ایک نجی ٹی وی نے ان سے بات چیت کی ہے، اور لوگ بھی ان سے بڑے اشتیاق سے پوچھتے ہیں کہ ''بھیا! پاک ٹی ہاؤس کب کھلے گا؟'' یہ سوال ہم نے بھی پوچھ لیا، تو انھوں نے فوراً سے کہہ ڈالا ''آپ صحافی لوگ ہیں، اس بارے میں مجھ سے بہتر جانتے ہوں گے۔'' ہم صحافی ہونے کے باوجود چوں کہ بہتر نہیں جانتے تھے، اس لیے فوراً سے پہلے گفت گو کا رخ دوسری طرف موڑا۔

دکان دار کے لیے اپنا جما جمایا اڈا چھوڑنا خاصا مشکل ہوتا ہے، تو ریگل سے انارکلی کی طرف سفر کا فیصلہ کیسے ہوا؟ سادہ اور کھرے لہجے میں بات کرنے والے محمد اصغر نے بتایا: ''ریگل

میں جس جگہ میں بیٹھا تھا، وہ سروس لین تھی، جس پر آمد ورفت بہت زیادہ ہوگئی تھی۔ دوسرے دکان داروں نے اتوار کے روز اپنی دکان کے سامنے اور لوگوں کو بھی کام کرنے کی اجازت دے دی، جس کی وجہ سے کام متاثر ہونے لگا اور سات برس قبل میں نے وہاں سے کوچ کرنے کا فیصلہ کرلیا۔'' یہ وہ زمانہ تھا، جب پاک ٹی ہاؤس نیا نیا بند ہوا تھا، اور اس کے سامنے جگہ خالی پڑی تھی۔ ''مجھ سے قبل بھی دو تین افراد نے یہاں کام کیا، لیکن وہ اسے جاری نہیں رکھ سکے، کیوں کہ ان کا خیال تھا کہ انار کلی سے جس کتاب بازار کا آغاز ہوتا ہے، اس میں ٹی ہاؤس تک پہنچنے کے لیے بیچ میں سڑک پڑتی ہے، اس لیے گاہک کئی بار اس طرف آنے سے گریز کرتے ہیں، اس لیے اصل بازار سڑک کے پرلی طرف کو سمجھا جاتا ہے، اس لیے اس طرف کام میں زیادہ فائدہ ہے۔'' رانا محمد اصغر اس سوچ سے متفق نہیں تھے، اس لیے انھوں نے اللہ کا نام لے کر ٹی ہاؤس اور اس سے ملحق دکان کے سامنے فٹ پاتھ پر کتابوں کو چُن دیا، اور ان کے بہ قول، پہلے دن ہی ان کے اندر سے آواز آئی کہ یہاں کام چل نکلے گا، اور ایسا ہی ہوا اور اِدھر کام ان کی توقعات کے عین مطابق چل نکلا۔

یہاں اڈا جمانے سے قبل انھوں نے اردگرد کے دکان داروں سے اجازت حاصل کرنے کے سلسلے میں رابطہ کیا، تو ان کا رویہ بہت مثبت تھا اور انھوں نے کہا کہ اتوار کو تو دکان ویسے ہی بند ہوتی ہے، اس لیے انھیں کوئی اعتراض نہیں۔ محمد اصغر اس رویے پر ان مہربانوں کے تہ دل سے ممنون ہیں۔

ہم نے ان سے پوچھا کہ اب، جب کہ ٹی ہاؤس کھلنے جا رہا ہے تو آپ کو یہاں سے اُٹھا نہیں دیا جائے گا؟ اس پر وہ کہنے لگے: ''مجھے اس سلسلے میں کوئی پریشانی نہیں۔ ٹی ہاؤس سے ملحق ٹائروں کی دکان ہے، اس کے سامنے میں کام جاری رکھوں گا۔ دوسرے ٹی ہاؤس کے داخلی دروازے کو چھوڑ کر اس کے اردگرد کتابیں لگا سکتا ہوں۔ اور یہ کام بھی ایسا ہے، جس کا ٹی ہاؤس میں آنے والوں سے ہی تعلق ہے، اس لیے یہ بات بھی میرے حق میں جاتی ہے۔ دوسرے اِدھر ادب سے متعلق لوگ آئیں گے تو وہ میری کتابوں پر بھی ضرور نظر ڈالیں گے، تو یہ ٹی ہاؤس کھلنے کا میرے کام کے حوالے سے مثبت پہلو ہے۔ جگہ تھوڑی ہونے سے ان کو بہتر انداز میں ترتیب دے کر پہلے کی طرح جاری رکھا جا سکتا ہے۔'' پرانی کتابوں سے متعلق کاروبار کے بارے میں ان کے پاس معلومات کا دریا ہے کہ جب سے ہوش سنبھالا ہے، اسی سے جڑے ہیں، اور ایسے مطمئن ہیں کہ اب اپنے فرزند ارجمند کو بھی اس سے وابستہ کرنا چاہتے ہیں۔ اتوار کو وہ بھی اکیلے نہیں ہوتے بلکہ تین لڑکے ان کے ساتھ کام کرتے ہیں، جو ان کے ساتھ رہ کر اس کام کی بہت سی باریکیاں جان چکے ہیں، وہ نہ بھی ہوں تو گاہکوں سے معاملات بڑے اچھے انداز میں طے کرلیتے ہیں۔ ہم نے ان

سے پوچھا کہ ان کے پاس کن کن ذرائع سے کتابیں آتی ہیں؟

''سب سے پہلے تو کباڑ خانہ ہے، جہاں مختلف گھروں سے کتب و رسائل ردی کی صورت میں آتے ہیں۔ ان سے ہمارا مسلسل رابطہ رہتا ہے۔ دوسرے، جب کوئی پڑھا لکھا بندہ گزر جاتا ہے، تو ان کی اولادیں سے کوئی رابطہ کرتا ہے اور یوں ہم ان سے کتابیں خریدتے ہیں۔ یہ بڑی بہترین کتابیں ہوتی ہیں، اور ان کا سودا لم سم ہی ہوتا ہے۔ ان میں یہ ہوتا ہے کہ آپ نے ساری کتابوں کو اکٹھے ہی خریدنا ہوتا ہے، لیکن وہ نکلتی آہستہ آہستہ ہیں، اس لیے رقم تھوڑا عرصہ رکی رہتی ہے۔ محلوں میں کسی زمانے میں لائبریریاں ہوتی تھیں، وہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ختم ہوتی گئیں، تو وہ سارا مال بھی ہمارے پاس آتا رہا۔ اب تو محلوں میں لائبریری کا رواج ہی ختم ہو گیا ہے۔ کنٹینرز کا مال بھی آتا ہے لیکن میں اسے زیادہ پسند نہیں کرتا، کیوں کہ اس میں کام کی چیزیں کم ہی ہوتی ہیں۔''

ان کا کہنا تھا کہ بہت سے لوگ مجبوری کی وجہ سے بھی کتابیں فروخت کر دیتے ہیں، اور بعض ایسے ہوتے ہیں، جنھیں اندازہ ہو جاتا ہے کہ ان کے جانے کے بعد اس علمی سرمائے کا کوئی پرسان حال نہیں ہوگا، تو وہ اپنی زندگی میں ہی کتابیں بیچ دیتے ہیں، ایسے لوگ ان کے خیال میں اس لیے فائدے میں رہتے ہیں کہ انھیں کتابوں کی قدر و قیمت کا ٹھیک ٹھیک اندازہ ہوتا ہے، اس لیے انھیں بہتر دام مل جاتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ پرانی کتابوں کی اہمیت ہمیشہ برقرار رہے گی، کیوں کہ یہ وہ خزانہ ہے، جو بازار میں نہیں ملتا، دوسرے سستے دام ان کی طرف کشش کا سبب ہے۔
وہ بتاتے ہیں کہ لاہور میں دس پندرہ سال سے بک اسٹریٹ کے بارے میں سن رہے ہیں، لیکن اس ضمن میں کوئی پیش رفت نہیں ہوئی۔ ان کے خیال میں فٹ پاتھ پر انگریزی کی بہ نسبت اردو کتابیں زیادہ چلتی ہیں۔ سردیوں میں اُن کے خیال میں کتابیں زیادہ بکتی ہیں، تمام دن گاہک آتے رہتے ہیں، جب کہ گرمیوں میں صبح سات سے گیارہ اور پھر پانچ بجے سے سات بجے تک کے اوقات میں گاہک آتے ہیں۔

ان کے بہ قول پاکستان بھر میں پرانی کتابوں کا لاہور جیسا اتوار بازار کہیں بھی نہیں لگتا، عام دنوں میں اورینٹل کالج سے باہر پرانی کتابوں کا سب سے اچھا ذخیرہ آراستہ کیا جاتا ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ گوالمنڈی میں جو دکانیں ہیں، وہ زیادہ تر رسالوں سے سروکار رکھتی ہیں، اور پرانی کتابوں کی فروخت ان کی اولین ترجیح نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ان کے پاس کئی قسم کے گاہک آتے ہیں۔ ان میں سے وہ جن سے تعلق استوار ہو چکا ہوتا ہے، اور دام بھی مطلب کے دیتے ہیں، تو انھیں وہ ہفتے کو اپنے گودام میں بلاتے ہیں تا کہ وہ اپنی مطلوبہ کتب تلاش کر سکیں۔ ایسے گاہکوں کوئی

لاٹ آنے پر بھی فوری مطلع کر دیا جاتا ہے۔

رانا محمد اصغر کا کہنا تھا کہ پرانی کتابوں کا بیوپار کرنے والے بعض گاہکوں، جن سے ان کا مسلسل رابطہ رہتا ہے، انھیں کتاب گھر بھی پہنچا دیتے ہیں۔ اُن کے خیال میں دکان دار گاہک کی نفسیات کا بھی علم رکھتا ہے اور اسے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کتاب خریدنے میں کس قدر دل چسپی رکھتا ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ بہت سے لوگ کسی خاص موضوع میں دل چسپی رکھتے ہیں، جس کے پیش نظر ان کے لیے الگ سے کتابوں کو چھانٹ کر رکھ لیا جاتا ہے۔

ان کا بتانا تھا کہ اگر دکان دار کو پہلے سے معلوم ہو کہ فلاں موضوع پر کتاب کسی گاہک کی کمزوری ہے تو اسے بے چارے کی مجبوری کا فائدہ اٹھانے کے بجائے مناسب دام ہی طلب کرنے چاہئیں۔ ان کے بقول کبھی کبھار کتاب چوری بھی ہو جاتی ہے۔ ان کے خیال میں ماضی کے مقابلے میں کتابیں کم فروخت ہونے کی بنیادی وجہ منہگائی ہے، اور پرانی کتابوں کی صنعت کو کچھ فرق انٹرنیٹ میڈیا کے آنے سے بھی پڑا ہے۔ وہ اس کام سے مطمئن ہیں، جس سے گذشتہ کئی برسوں سے ان کے گھر کا چولھا جل رہا ہے۔ وہ اتوار کے علاوہ باقی دنوں میں دھرم پورہ میں واقع اپنی کتابوں کی دکان بھی چلاتے ہیں جہاں پر زیادہ تر نصابی کتب فروخت ہوتی ہیں۔ بتاتے ہیں کہ بھلے وقتوں میں بڑے نامی گرامی ادیب فٹ پاتھ پر بکھرے علمی خزینوں کی تلاش میں آتے تھے، لیکن اب کوئی مشہور ادیب ادھر کا رُخ نہیں کرتا۔

ریگل چوک کراچی میں کتابوں کا اتوار بازار

کاشف حسین

انٹرنیٹ کے دور میں بھی کراچی کے شہریوں کی بڑی تعداد نے کتابوں سے اپنا تعلق برقرار رکھا ہوا ہے، کتاب بینی کو خواہ عادت کہیں، شوق یا ضرورت تینوں صورتوں میں سستی اور نایاب کتابوں کا حصول دشوار امر ہے لیکن بھلا ہو اتوار کے روز پرانی کتابیں فروخت کرنے والوں کا جو شہریوں کا کتب سے رشتہ جوڑے رکھنے میں اہم کردار ادا کررہے ہیں۔

مصروف ترین تجارتی مرکز صدر میں قائم ریگل بازار کی گلیوں میں عام دنوں میں پیدل چلنا بھی محال ہوتا ہے تاہم ریگل الیکٹرانک مارکیٹ کی ہی ایک گلی میں ہر ہفتے اتوار کے روز سال ہا سال سے پرانی کتابوں کا بازار لگایا جاتا ہے، کتابوں کے رسیا بچے بڑے، پروفیشنل ماہرین، اساتذہ اور ہر عمل کے طلبہ اس بازار کا رخ کرتے ہیں، کئی ادوار دیکھنے والا کتابوں کا یہ بازار وقت کے ساتھ ساتھ پھیلتا سکڑتا رہا تاہم ان دنوں شہر میں امن وسکون نے کافی عرصے سے ڈیرہ ڈال رکھا ہے جس کا فائدہ پرانی کتابوں کے تاجروں اور خریداروں کو پہنچ رہا ہے۔

صدر ریگل بازار میں پرانی کتابوں کا بازار صبح 8 بجے سے لگنا شروع ہوجاتا ہے، گلی میں دو طرفہ زمین وار دکانوں کے تھڑوں پر سجی کتابیں شام ڈھلے تک گاہکوں کی منتظر رہتی ہیں، اس بازار میں شعروادب، فنون لطیفہ، مذہبی کتب کے علاوہ طب، کاروبار، معاشیات، سائنس کے دیگر شعبوں سمیت کھانے پکانے کی تراکیب پر مشتمل رسالہ، ڈائجسٹ، بچوں کی کہانیاں اور درسی کتب کا بڑا ذخیرہ بکھرا نظر آتا ہے، ریگل میں پرانی کتابوں کے بازار میں لگے بندھے گاہک آیا کرتے تھے تاہم اب نجی اور سرکاری جامعات کے طلبہ کی ایک بڑی تعداد درسی اور نصابی کتب تلاش کرتی بازار میں نظر آتی ہے۔

بعض والدین بھی یہاں سے نجی اسکولوں کی نصابی کتب تلاش کرتے نظر آتے ہیں پرانی کتابوں کے بازار میں زیادہ تر کتابوں کا ڈھیر 20 سے لے کر 100 روپے تک کی فکس قیمت پر فروخت کے لیے رکھا جاتا ہے تاہم نایاب اور کلاسک کتابیں گاہک کی قوت خرید کے مطابق فروخت کی جاتی

ہیں، کتب فروش زمین پر چادر بچھا کر کتابوں کا ڈھیر لگا دیتے ہیں جس میں سے گاہک اپنے ذوق اور شوق کے مطابق کتابیں تلاش کر کے قیمت طے کرتے ہیں، کچھ کتب فروش ٹیبلوں پر کتابیں سلیقے سے سجا کر بھی فروخت کرتے ہیں، کتب فروشوں کے مطابق گاہکوں کی اکثریت زمین پر بکھری کتابوں میں زیادہ دیر سر کھپانے میں کوفت محسوس کرتی ہے، اس لیے وہ ٹیبل پر موضوع کے مطابق کتابیں سجا دیتے ہیں۔

جس میں پسند کی کتاب کو تلاش کرنا قدرے آسان ہو جاتا ہے، اتوار بازار کے کتب فروشوں کا کہنا ہے کہ جیسے جیسے نئی کتابوں کی قیمت بڑھ رہی ہے پرانی کتابوں کی طلب میں اضافہ ہو رہا ہے، مہنگائی کی وجہ سے مطالعے کے شوقین افراد پرانی کتابوں سے اپنے علم کی پیاس بجھاتے ہیں اتوار بازار میں زیادہ تر اردو اور انگریزی زبان کی کتابیں فروخت کے لیے لائی جاتی ہیں تاہم بعض اوقات گجراتی، سنسکرت، عربی، سندھی اور دیگر زبانوں کے نایاب نسخے بھی فروخت کے لیے لائے جاتے ہیں۔ بازار لسانی، مذہبی اور نظریاتی ہم آہنگی کی مثال ہے

پرانی کتابوں کا بازار لسانی، مذہبی اور نظریاتی ہم آہنگی کی ایک مثال ہے، اس بازار میں مختلف زبانیں بولنے والے کتب فروش کتابیں فروخت کرتے اور ایک دوسرے کی مدد کرتے نظر آتے ہیں، ایک دوسرے کی ضد یا نفی کرنے والے مکاتب فکر کے محققین اور اسکالرز کی تصانیف بھی ایک دوسرے کے ساتھ یا اوپر نیچے رکھی نظر آتی ہیں اسی طرح مختلف سماجی، سیاسی پس منظر کے حامل گاہک اپنے مذہب، مسلک اور عقیدے سے بالاتر ہو کر کتابوں کے شوق میں ہم آہنگی کے ساتھ کتابیں خریدنے اور تصانیف کے بارے میں تبادلہ خیال کرتے نظر آتے ہیں۔ پوش علاقوں سے تعلق رکھنے والے خریداراب فریئر ہال کو ترجیح دیتے ہیں

پرانی کتابوں کی فروخت میں بھی طبقاتی فرق نمایاں ہے، ریگل کے کتب فروشوں کے مطابق امیر طبقہ سے تعلق رکھنے والے افراد کی بڑی تعداد نے اب ریگل کے بازار کا رخ کرنا کم کر دیا ہے، ریگل کے ساتھ فیریئر ہال میں بھی اتوار کے روز پرانی کتابوں کے اسٹال لگائے جاتے ہیں، پوش علاقوں سے تعلق رکھنے والے خریداراب زیادہ تر فریئر ہال کو ترجیح دیتے ہیں، فریئر ہال میں کتابوں کی اچھی قیمت مل جاتی ہے اس کے برعکس ریگل کے بازار میں آنے والوں کی قوت خرید کم ہوتی ہے اور وہ پرانی کتابوں کی قیمت پر بھی بھاؤ کرتے ہیں، ریگل بازار میں بعض کتب فروشوں کی تیسری نسل بھی اس کام سے وابستہ ہو گئی ہے۔

پرانی کتابیں فروخت کرنے والے شہر بھر سے کتابیں جمع کرتے ہیں، بعض گھرانوں میں گھر کا سربراہ فوت ہو جانے پر ان کی جمع شدہ تمام کتابیں کباڑیوں کو فروخت کر دی جاتی ہیں جو

یہ کباڑیے سے خرید کر بازار میں لاتے ہیں، پاپوش بڑا میدان سے آنے والے ایک کباڑے اکرم کے مطابق شہر بھر میں کباڑیے کی دکانیں کتابوں کے حصول کا اہم ذریعہ ہیں گلی گلی پھرنے والے کباڑیے دن بھر کی جمع کردہ کتابیں کباڑ کی دکانوں پر فروخت کرتے ہیں۔

اکرم کے مطابق اب کباڑیے تول کے بجائے کتاب کی اہمیت کے لحاظ سے قیمت مانگنے لگے ہیں اس لیے پرانی کتابوں پر منافع کی شرح کم ہورہی ہے، اکرم کے مطابق اس کے بھائی کی کباڑیے کی دکان ہے جہاں آنے والی کتابیں بازار میں فروخت کردی جاتی ہیں، اکرم کے مطابق بعض اوقات کباڑ کی کتابوں میں ہاتھ سے لکھے گئے قلمی نسخے بھی مل جاتے ہیں جن کی قیمت ہزاروں روپے میں وصول کی جاتی ہے۔

کتب فروشوں کے مطابق عام طور پر پرانی کتابوں پر منافع 20 سے 30 روپے تک ہوتا ہے لیکن پیشہ ورانہ تعلیم سے متعلق درآمد شدہ کتابوں پر اچھی بچت ہوجاتی ہے، میڈیکل کالجوں کے طلبا بسوں میں بھر کر آتے ہیں اور اپنے مضامین سے متعلق کتابیں خرید کر لے جاتے ہیں جس روز میڈیکل کالجوں کے طلبہ بسوں میں آتے ہیں اس روز کتب فروشوں کی اچھی آمدن ہوجاتی ہے۔

پرانی کتابوں کے شوقین افراد کئی گھنٹے کتابیں تلاش کرتے ہیں، بازار میں اپنے اور اپنے بچوں کے لیے کتابیں تلاش کرنے والے ایک شہری کا کہنا تھا کہ ریگل میں پرانی کتابوں کے بازار سے اپنی پسندیدہ کتابوں کا حصول مشکل ہوتا ہے، وقت کے ساتھ ساتھ صاحب ذوق کتب فروشوں کی تعداد کم ہوگئی ہے، اس بازار میں اکثریت پرانی اشیا کے بیوپاری کباڑے کا کام کرنے والے کتابیں فروخت کررہے ہیں جو بعض اوقات غیر اہم کتاب کی ظاہری صورت کو دیکھتے ہوئے بھاری قیمت طلب کرتے ہیں اور نایاب کتابوں کے پرانے نسخوں کی قیمت کم طلب کرتے ہیں۔

گاہکوں کے مطابق نئی کتابوں کی خریداری عام اور متوسط طبقے کی پہنچ سے بھی دور ہوچکی ہے اس لیے پرانی کتابوں سے دل بہلاتے ہیں، پرانی کتابوں کے بازار میں بچوں کے ہمراہ درسی کتب تلاش کرنے والے والدین کے مطابق بین الاقوامی ناشران کی کتابوں کی قیمت بہت زیادہ ہے اس لیے اسکولوں کیلیے نئی کتابیں خریدنے کے بعد گھروں پر پڑھانے یا ٹیوشن کیلیے پرانی درسی کتب خریدتے ہیں جو نئی کتب کے مقابلے میں 70 فیصد تک کم قیمت پر مل جاتی ہیں، 20 روپے سے 100 روپے کے درمیان بچوں کی کہانیوں کی بہترین کتابیں مل جاتی ہیں، بازار میں اردو ڈائجسٹ خریدنے والے ایک عمر رسیدہ شہری کا کہنا تھا کہ محدود پنشن میں کتابوں کی خریداری ممکن نہیں اس لیے ہفتہ وار بنیاد پر اس بازار سے ایک دو ڈائجسٹ یا ناول خرید کر پڑھ لیتا ہوں۔

کتاب کیچڑ میں گر پڑی تھی

افتخار عارف

عجب گھڑی تھی
کتاب کیچڑ میں گر پڑی تھی
چمکتے لفظوں کی میلی آنکھوں میں الجھے آنسو بلا رہے تھے
مگر مجھے ہوش ہی کہاں تھا
نظر میں اک اور ہی جہاں تھا
نئے نئے منظروں کی خواہش میں اپنے منظر سے کٹ گیا ہوں
نئے نئے دائروں کی گردش میں اپنے محور سے ہٹ گیا ہوں
صلہ جزا خوف ناامیدی
امید امکان بے یقینی
ہزار خانوں میں بٹ گیا ہوں
اب اس سے پہلے کہ رات اپنی کمند ڈالے یہ چاہتا ہوں کہ لوٹ جاؤں
عجب نہیں وہ کتاب اب بھی وہیں پڑی ہو
عجب نہیں آج بھی مری راہ دیکھتی ہو
چمکتے لفظوں کی میلی آنکھوں میں الجھے آنسو
ہوا و حرص و ہوس کی سب گرد صاف کر دیں
عجب گھڑی تھی
کتاب کیچڑ میں گر پڑی تھی

میرے کمرے میں کتابوں کے سوا کچھ بھی نہیں

جون ایلیا

تم جب آؤ گی تو کھویا ہوا پاؤ گی مجھے
میری تنہائی میں خوابوں کے سوا کچھ بھی نہیں
میرے کمرے کو سجانے کی تمنا ہے تمھیں
میرے کمرے میں کتابوں کے سوا کچھ بھی
نہیں

ان کتابوں نے بڑا ظلم کیا ہے مجھ پر
ان میں اک رمز ہے جس رمز کا مارا ہوا ذہن
مژدہ عشرت انجام نہیں پا سکتا
زندگی میں کبھی آرام نہیں پا سکتا

کتاب گمراہ کر رہی ہے

شہرام سرمدی

کتاب گمراہ کر رہی ہے
پہ اک یقیں ہے کہ
اتنی گمراہیوں کے پیچھے
کوئی تو اک راہ ہوگی
جو منزلوں سے نہیں ملے گی
سفر پہ جو گامزن رکھے گی
یہ شرک کہنا
سفر کی وحدانیت کو مجروح کر رہا ہے
کہاں کی منزل

کہاں ہے منزل
یہ شرک کے ہیں سراب سارے
ہم آپ ہیں محو خواب سارے
یہ شرک افیون بن کے خوں میں گھلا ہوا ہے
ہجوم منزل میں اب سفر کی شناخت
خود ایک مسئلہ ہے

سفر خلا ہے

خلا میں جو کچھ بھی ہو نتیجہ وہی خلا ہے

یہی خلا ہے!

خلا کو منزل کے نقش پا سے کثیف کرنے کا

احمقانہ خیال چھوڑو

کتاب گمراہ کر رہی ہے!

سفر پہ نکلو

پہ منزلوں کے مہیب سایوں کی زد سے

خود کو بچائے رکھو

سفر پہ پاؤں جمائے رکھو

یہ سب وجود و عدم کے قصے

سفر میں تخلیق ہو رہے ہیں

ازل نہیں ہے ابد نہیں ہے

یہ اک سفر ہے کہ حد نہیں ہے

تو کیسے نا حد میں

منزلوں کی حدیں بنائیں

خلا خلا خلائیں

اسی وجود خلا میں انساں

وجود انسان شرک اعظم

یہ ایک نکتہ ہے اسم اعظم

کس اسم اعظم کی جستجو میں

کتاب تصنیف ہو رہی ہے

کتاب تالیف ہو رہی ہے

وجود انساں

کتاب تصنیف کر رہا ہے

کتاب تالیف کر رہا ہے
کتاب گمراہ کر رہی ہے

کتاب کا کیڑا

عزیز حامد مدنی

دق تجھ سے کتابیں ہیں بہت کرم کتابی
تو دشمن دزدیدہ ہے خاکی ہو کہ آبی
الفاظ کی کھیتی ہے فقط تیری چراگاہ
معنی کی زمیں تیرے سب سایوں نے دابی
ہونے کو تری اصل ہے صیاد مکیں گاہ
کہنے کو فقط تیری حقیقت ہے سرابی
تو نے تو ہر اک سمت لگائی ہیں سرنگیں
پارینہ ہو فرمان کتابیں ہوں نصابی
بادامی ہو کاغذ تو مزا اور ہی کچھ ہے
لقمہ ہوا تحریر کا ہر مغز شتابی
گھن ساتھ ہی گیہوں کے ہے پستہ ہوا دیکھا
برگشتہ ورق لا نہ سکا تجھ پہ خرابی
کیا خوب ہے یہ مجلس اوراق کہن بھی
ویران کتب خانوں کی دیمک تری لابی

فردوسی و خلدوں کی کتابیں ہیں ہراساں
وہ قلعۂ معنی تیرا حملہ ہے جوابی
پردہ ہے خموشی تری آہنگ فنا کی
بھونرا ہے فقط کنج گلستاں کا ربابی
تو چاٹ گیا دانش کہنہ کی فصیلیں
بنیاد عمارت کو ہے ڈھانا تری ہابی
اعداد کے قالب میں ہے تو صفر کی طاقت
صفحات کے سوراخ کا بے نام حسابی
تاریخ کے اس سیل میں انسان نے پائی
ایک آدھ کوئی موج نفس وہ بھی حبابی
بکتے سر بازار ہیں مانند زغال آج
جو تازہ نفس خواب تغیر تھے شہابی
کھا جاتی ہے اک دن اسے سب گرد زمانہ
مٹی کی وہ صحنک ہو کہ چینی کی رکابی
بدلی ہوئی دنیا میں تغیر کا عمل ہے
تو کرم کتابی نہیں اک کرم خلل ہے

میں جب بھی کتاب پڑھتا ہوں

قاسم یعقوب

کوئی کتاب نہیں پڑھتا
میرا بھائی کتابوں سے نفرت کرتا ہے
وہ کتابوں کو چوہوں کے کترنے کا مشغلہ سمجھتا ہے
میرے دوست کتابوں کو
کیڑوں کے گھروں کی تعمیر کا سامان کہتے ہیں
میری بیوی پھٹی کتابوں کو گھر سے باہر پھینک دیتی ہے
اسی لیے میں کتابوں کو ادھڑنے سے پہلے ہی جوڑ لیتا ہوں
جب شہر کے فٹ پاتھ کتابوں سے بھر جاتے ہیں
میں کتابوں کو مقدس آیات کی طرح اُٹھا کے چومتا ہوں
اوران کی گھروں اور کتب خانوں سے بے دخلی پر آنسوؤں سے ماتم کرتا ہوں

میں آج جو کتاب پڑھ رہا ہوں
اس میں لکھا ہے
''میسوپوٹیمیا کا اینکی
مصر کا نن
اور یونانیوں کا اوقیانوس
پانی کو دیوتا مانتے تھے''

ہاں، پانی ہی ہر شے کا تخلیقِ اول ہے
اور شاید لمسِ آخر بھی ________

آج کتاب پڑھتے ہوئے تمھاری آنکھیں بھیگ گئیں تو
مجھے اپنی آنکھوں کا پانی یاد آیا
جو کتاب پڑھتے ہوئے تمھیں یاد کرتا ہے
جب کوئی کتاب نہیں پڑھتا
میں تمھاری طرح کتاب پڑھ کے
آنسوؤں کا ورد کرتا ہوں
ہاں پانی ہی محبت کی تخلیق کا محرکِ اوّل ہے
اور لمسِ آخر بھی ____

’کتاب نامہ‘: اِک کنکر ٹھہرے پانی میں

ڈاکٹر شبانہ امان اللہ

جب نسلِ انسانی جمود کا شکار ہونے لگتی ہے، زوال کا نقارہ بجنے لگتا ہے، روایات شکست و ریخت سے دوچار ہونے لگتی ہیں، سرمایۂ علم وفن پر اغماض کی کائی جمنے لگتی ہے تو ایسے میں کوئی صاحبِ علم و دانش اس روش کے سامنے کوہِ گراں کی مانند کھڑا ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر ارشد محمود ناشاؔد کا شمار بھی ایسے اربابِ علم و دانش میں ہوتا ہے جو اعلیٰ ادبی روایات کے احیا کے لیے سینہ سپر ہو کر صفِ اوّل میں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ’’کتاب نامہ‘‘ کی تخلیق اِسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

اردو ادب ابتدا سے ہی نشیب و فراز کا سامنا کرتا ہوا گردشِ دوراں سے برسرِ پیکار، زماں کے سیل بے پناہ میں رواں دواں رہا ہے۔ کئی اصنافِ نظم ونثر کی تخلیق ہوئی، کئی پروان چڑھیں اور کئی وقت کے تغیر وتبدل کی بدولت زوال پذیر ہو کر اپنے وجود کو برقرار نہ رکھ پائیں اور رفتہ رفتہ معدوم ہو گئیں۔ ان ہی اصناف سخن میں سے ایک صنف مثنوی بھی ہے۔ اردو شاعری کے ابتدائی دور بالخصوص بہمنی اور عادل شاہی عہدِ حکومت میں مثنوی نے عروج کو چھو لیا تھا۔ اس کے بعد کم و بیش ہر بڑے شاعر نے اس صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی مگر ہندوستان کے بدلتے سیاسی منظر نامے نے مثنوی کو بھی زوال آشنا کر دیا۔ قیامِ پاکستان کے بعد اگر کسی شاعر نے مثنوی لکھنے کی سعی بھی کی تو وہ جدید ادبی رنگوں سے عبارت تھی۔ اس کی ہیئت تو وہی رہی مگر موضوعات اور لفظیات کے ساتھ ساتھ مجموعی فضا میں نیا پن آ گیا۔ لیکن اس ادبی رجحان کو بھی زیادہ تقویت نہیں ملی اور غزل، طویل و مختصر نظموں کی تخلیق کو اولیت رہی۔

ایک عرصے بعد ڈاکٹر ارشد محمود ناشاؔد نے ’’کتاب نامہ‘‘ کی شکل میں مثنوی تخلیق کر کے ایک جامد ادبی رجحان کو حیاتِ نو عطا کی اور ادب کے بحرِ بے کراں میں ایک کنکر پھینکا جو بلاشبہ ارتعاش کا باعث بنا۔ یہ ارتعاش اپنے منفرد موضوع سے نمو پا کر ایک طاقت ور قوت بننے کی صلاحیت رکھتا ہے جو ذہن وفکر کے کئی دریچوں کو وا کر کے خوابیدہ شعورِ انسانی کو جگانے کا باعث ہوگا۔ کیوں کی اس نفسا نفسی کے عالم میں جہاں دیگر اعلیٰ روایات کی طرح ادب بھی زوال پذیر ہے اور ہماری اخلاقی اور انسانی اقدار کی عمارت بھی خستہ حالی کا شکار ہو کر مسمار ہونے لگی ہے، طالبِ علم

کے لیے علم محض برائے حصولِ ڈگری اور ذریعہ معاش رہ گیا ہے، اس دگرگوں صورت حال میں ’’کتاب نامہ‘‘ کی تخلیق بہت اہمیت کی حامل ہے۔ مادیت پرستی میں مبتلا، سطحی سوچ کی حامل ہماری نئی نسل کتاب سے دور ہوتی جارہی ہے۔ لائبریری ایک ایسا لایعنی اور بے مقصد مقام ٹھہری جہاں گنجینۂ علم بے توجہی اور اغماض کی گرد سے اٹا پڑا ہے۔ ڈاکٹر ارشد محمود ناشادؔ نے کتاب سے دوری کے مرض کی نہ صرف تشخیص کی بل کہ ماہر طب کی مانند اس کے اسباب وعلل سے آگاہی حاصل کر کے نوکِ قلم سے جراحت کا عمل بھی کیا۔ سمارٹ فون، انٹرنیٹ اور چشم تماشا کو خیرہ کرنے والی دیگر ایجادات کے سیل بے پناہ میں بہتے انسانی شعور کو اس کی علمی میراث کی جانب متوجہ کرنے کی کاوش لائقِ تحسین ہے۔

’’کتاب نامہ‘‘ جہاں اپنے موضوع اور ہیئت کے اعتبار سے منفرد ہے وہاں اس کی طباعت بھی تعریف وتوصیف کی طالب ہے۔ سرورق پر موجود تصویر اور تاج کتاب کی فوقیت کا آئینہ دار ہے۔ اس میں نسوانی خاکہ کچھ مناسب نہیں۔ یہ تذکیر وتانیث سے مبرا ہونا چاہیے تھا مگر اس کے باوجود یہ اس قدر جاذبِ نظر ہے کہ بے اختیار دل کرتا ہے کہ اس کتاب کو پڑھا جائے۔ فلیپ پر مختلف اربابِ علم وفن کے تاثرات اس مثنوی کی اہمیت اور لکھنے والے کے حساس دل و دماغ، خلاقانہ جوہر اور فنِ شاعری پر ان کی کامل دسترس کی غمازی کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں اس کی طباعت میں رنگوں کا معتبر اور عمدہ انتخاب مع تصویری خاکے ڈاکٹر ارشد محمود ناشادؔ کے جمالیاتی ذوق کے آئینہ دار ہیں۔

’’کتاب نامہ‘‘ کے مندرجات کو ’’سلکِ دُرر‘‘ کا عنوان دینا بجائے خود ایک ندرت ہے۔ کافکا کے کتاب کے بارے میں خیالات پر مبنی ایک اقتباس شامل کیا گیا اور طلوع کے عنوان سے ڈاکٹر صاحب نے کتاب سے گریز پائی اور بے گانگی کے اسباب اور رجحان بیان کر کے مثنوی کی تخلیق کے متعلق اپنا مطمحِ نظر پیش کیا۔ وہ لکھتے ہیں:

> ’’کتاب نامہ‘‘ اسی احساس کو متشکل کرنے کی ایک ناتمام سی کوشش ہے کیا خبر
> یہ مختصر سی کتاب کہانی نئی نسلوں کے در دل پر دستک دینے میں کامران ٹھہرے۔‘‘

اظہارِ تشکر وامتنان میں ان اشخاصِ علم وفن کا ذکر کیا جنھوں نے ’’کتاب نامہ‘‘ پر رائے زنی کی اور ان کی حوصلہ افزائی کی۔ تقریبات میں ’’کلکِ صناعت‘‘ اور ’’کتاب کہانی‘‘ شامل ہے۔ ’’کلکِ صناعت‘‘ امین راحت چغتائی کی تحریر ہے جو بذات خود دورِ حاضر کے مشہور ومعروف شاعر ہیں۔ انھوں نے مختصراً مگر جامع انداز میں نہ صرف مثنوی کی روایت پر روشنی ڈالی بل کہ ’’کتاب نامہ‘‘ کی تخلیق اور موضوع کی انفرادیت پر بھی اپنے قیمتی خیالات کا اظہار کر کے قلمی خاکہ پیش کر

دیا۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''ڈاکٹر ناشادؔ نے مثنوی کا وہ موضوع چنا جو آج کل ہر صاحبِ علم و دانش کی زبان پر ہے، اس امتیاز کے ساتھ کہ یہاں شکوہ کتاب کی اپنی زبان سے ادا کیا گیا ہے اور مسئلہ قحط الرجال کا ہے۔ یہ موضوع کے اعتبار سے اردو کی پہلی مثنوی ہے۔''

''کتاب کہانی'' کے عنوان سے معروف شاعر جمیل یوسف نے کتاب نامہ کی تقریب میں ابتدائی دور سے عہدِ جدید تک کتاب کی تاریخ کا اجمالی جائزہ پیش کیا۔ تخلیق کار کا جسدِ خاکی تو دنیا سے رخصت ہو سکتا ہے مگر کتاب اس کو زندہ و جاوید بنا دیتی ہے۔ جمیل یوسف نے عہدِ جدید میں کتاب سے بے گانگی اور اغماض پر کفِ افسوس ملتے ہوئے اسے ذہنی زوال اور پستی کا عمل قرار دیا اور کتاب کے ساتھ رشتہ استوار کرنے کی اہمیت کو ازسرِ نو زندہ کرنے کی اس کاوش کو انسانی فطرت کی نباضی قرار دیا۔ وہ رقم طراز ہیں:

> ''اس تہذیبی اور معاشرتی المیے نے شاعرِ نغز گو جناب پروفیسر ڈاکٹر ارشد محمود ناشادؔ کے دل میں جو فریاد پیدا کی زبانِ شعر میں اس کا نہایت دل آویز اور موثر اظہار انھوں نے ایک مثنوی کی صورت میں کیا ہے۔ جس کا نام انھوں نے ''کتاب نامہ'' رکھا ہے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے اس موضوع پر یہ پہلی مربوط اور منظّم شعری کاوش ہے اور اس کے لیے مثنوی کی صنفِ سخن موزوں ترین تھی۔''

''کتاب نامہ'' کا اختصاص یہ ہے کہ یہ اپنے موضوع کے اعتبار سے اوّلین نوعیت کی مثنوی ہے۔ اس سے پہلے اردو شاعری کی تاریخ ایسی تخلیق سے تہی دامن نظر آتی ہے یہ اعزاز قدرت نے ڈاکٹر ارشد محمود ناشادؔ کے لیے ہی مخصوص کر رکھا تھا اور اردو شاعر کی تاریخ میں ان کا نام سنہری حروف میں لکھا جائے گا۔

''کتاب نامہ'' ایک سو اڑتالیس (۱۴۸) اشعار پر مبنی ہے۔ یہ اشعار موضوع کی گہرائی اور گیرائی کے اعتبار سے بحرِ بے کراں کی سی وسعت کے حامل ہیں۔ انچاس (۴۹) اشعار مردّف ہیں اور ننانوے (۹۹) غیر مردّف۔ گویا ڈاکٹر صاحب کی جولانیِ طبع نے غیر مردف اشعار کو زیادہ فوقیت دی۔ اشعار کے ساتھ ساتھ تصویری خاکے بھی قابلِ توجہ ہیں جو نہ صرف کتاب کی طباعت میں جاذبیت کا باعث ہیں بل کہ علم کے نور سے بھی قاری کو روشن کرتے ہیں۔ مثنوی کا آغاز اللہ کریم کی حمد و ثنا سے ہوتا ہے۔ پہلے چار اشعار میں اللہ عزوجل کی عظمت، اس کی قدرت اور کاری گری پر

روشنی ڈالی گئی ہے۔ پہلا شعر کچھ یوں ہے:

کروں پہلے توصیفِ ربِ جہاں
کیے خلق جس نے یہ کون ومکاں

دیگر اشعار میں اللہ تعالیٰ کی صناعت، اس کی بے مثل نقاشی اور یکتا ہونے کا احساس جا گزیں ہے۔ اس کے بعد حسبِ روایت ہادیِ عالم حضرت محمد مصطفیٰ صل اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نعت میں دو اشعار لکھے گئے ہیں:

پڑھوں پھر محمد پہ بے حد درود
مبارک ، معطر ، منور ، وجود

مثنوی کی روایت کے مطابق ساقی سے خطاب کر کے نفسِ مضمون کا سفر آغاز ہوتا ہے:

پلا ساقیا پھر مئے لالہ فام
کہ رنگین ہو جائے حسن ِکلام

ان اشعار کے بعد کتاب کی حکایت اس کی اپنی زبانی شروع ہوتی ہے۔ زمانے کے نشیب وفراز سے گزرتی، زماں ومکاں کے عجائبات پر نظر دوڑائی ہوئی یہ تحفۂ خداوندی اپنے وجود کو برقرار رکھتی ہوئی عہدِ حاضر تک سفر کی داستان لیے ہوئے ہے۔ تضاداتِ زمانہ اور صدیوں کے عیب و ہنر اپنے دامن میں سمیٹی ہوئی یہ ارمغانِ باری تعالیٰ تاریخِ عالم کی نگہدار اور افکارِ آدم کی نگہ بان رہی ہے۔

خالقِ دو جہاں نے اسے کلکِ صناعت کا اوّلین معجزہ بنایا۔ یہ فرمانِ داور کی ہمراز اور منشائے خالق کی آواز قرار دی گئی۔ اولادِ آدم کی ہدایت کے قرینے اس کی بدولت عطا ہوئے۔ نبوت کا سفینہ بن کر اسے رسولوں پر نازل کیا گیا۔ یہاں مختلف الہامی اور مذہبی کتابوں کا تذکرہ کیا گیا ہے اور اُن کے انسان کے ساتھ تعلق کو عمدگی سے بیان کیا ہے۔ آسمانی کتابوں کے ذکر میں زمانی ترتیب کو ملحوظِ خاطر نہیں رکھا گیا۔ تورات کا ذکر زبور سے پہلے آ گیا۔ بعد ازاں انجیل اور قرآن حکیم کا ذکر کیا گیا۔ پھر بالترتیب وید، گیتا، گرنتھ کے فیوض وبرکات پر قلم فرسائی کی گئی۔ کتاب اپنی عظمت ورفعت کا تذکرہ نہایت وضاحت سے سامنے لاتی ہے۔ اس کی تاریخ پوری انسانی زندگی پر پھیلی ہوئی ہے، وہ فخریہ کہتی ہے:

میں حسنِ حقیقت کی ایجاد ہوں
میں سارے زمانوں کی استاد ہوں

اپنے تابندہ ماضی کا ذکر کرتے ہوئے آہ بھر کر کتاب اپنی ضوفشانی اور نور افروزی کو

موضوعِ بحث بناتی ہےاورزمانے سے لے کر بستیوں تک اورقصرِ شاہی سےعوام بہ شمول امرااور غربا تک اپنی اہمیت کو جتلاتی ہے۔کتاب نویسی کے لیے جو ذرائع استعمال ہوتے ہیں ان کے ذکر کے ساتھ تصویری خاکے قابلِ دید ہیں۔کھال، چوب، چھال، ہڈیاں اور تختیاں منبعِ تخلیقِ کتب ٹھہریں۔سونے چاندی سے کتاب کی تزئین وآرائش کواس شعرمیں کچھ یوں بیان کیا گیا:

کبھی سیم سے مری صورت سجی
کبھی میں رقم آبِ زر سے ہوئی

بعدازاں خطاطی کے مختلف قرینوں کا ذکر کیا گیا۔نمایاں خطوط میں حجازی، تازی، خطِ کوفی، ثلث، ریحان، خطِ دیوان، شکستہ، نسخ ونستعلیق سے وجود میں آنے والا خطِ سلطان اوران سے کتاب کو دوام ملنے کی داستان بہت دل کش ہے۔کتاب کی تزین وآرائش میں منہمک ماہر خطاط کا ذکر بھی انتہائی تفصیلی ہے۔ان میں صادقین، چغتائی، اسلم کمال قابلِ ذکر ہیں۔اس کے علاوہ ریشم اوراطلس سے کتاب کو پوشاکِ فاخرانہ عطا کرنا، اسے جزدان ہیں مشک ولوبان میں بسا کرسجانا بھی دل چسپ امر ہے۔اس کے بعد کے اشعار میں علم وفن کے مراکز کا ذکر کیا گیا۔ ان میں بخارا، بصرہ، شیراز، قم، قرطبہ، اشبیلہ، اصفہان، دلی، بغداداور لاہور شامل ہے۔ یہاں پھرشاعر کا تخیل اصفہان کے بعد دلی کو دیکھتا ہے۔اگر دِلی اور لاہور کا ذکر پہلو بہ پہلو ہوتا تو ارضی قربت کی ترتیب درست رہتی۔

افتادِ زمانہ کے زیرِ اثر کتاب کوصفحہءِ ہستی سے مٹانے کی ناروا کوششیں جاری رہیں ۔عالم اور جاہل، کتاب دوست اور کتاب دشمن عناصر باہم برسرِ پیکار رہے مگر فتح ہمیشہ کتاب کے دوام کو ہی رہی جوعلم وہنر کا خزینہ ٹھہری۔اس نے ہرطرح کے مظالم کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اورعلم کے اس سوتے کوخشک نہ ہونے دیا۔کتب خانے جلا کر، کتاب کی تحقیر وتذلیل کوشعار بنا کر، اس کی صورت کومسخ کرنے کی فکر میں غلطاں جہلا اسے نذرِآتش کرکے، دریا برد کرکے ختم نہ کرسکے اور خودحرفِ غلط کی طرح لوحِ حیات سے مٹ گئے۔ان کے نام ونشان تک معدوم ہوئے اور کتاب کے شیدائی، قدردان مفکر، محقق، معلم، مدرس علم وادب کےامام بن کردیے سے دیا جلانے کے مصداق اپنا سفر جاری رکھے ہوئے ہیں۔ڈاکٹر ارشد محمود ناشاؔد نے کتاب کی تاریخ کوتاریخ انسانی کے ساتھ مدغم کرکے عہدِ گذشتہ کا ایک خاکہ پیش کیا اور ہمیں یہ قوت بخشی کہ ہم ماضی، حال اور مستقبل کے آئینے میں اپنا محاسبہ کرسکیں۔

کتاب کوعزت وتکریم دینے والے اربابِ فکروفن کا تذکرہ تفصیلاً کیا گیا۔سلسلہءِ گفتار ارسطو، افلاطون، ورجل اور ہومر کے ذوقِ نموکو پیش کرکے جوئے آبِ علم کا رخ مغرب سے مشرق

کی جانب موڑا۔ رومیؔ، سعدیؔ، قدسیؔ اور بیدلؔ کے حیات بخش زمزموں سے قاری کو روشناس کرواتے ہوئے سنائی،غزالی کے بصیرت افروز اقوال کا سلسلۂ سخن دراز کیا گیا۔ بعدازاں بابا فرید اور وارث کی نغمہ سنجی اور حکمت کے گنجینے کی میراث کو بیان کیا گیا۔اسی دوران میں خسرو اور گوئٹے کا ذکر ترتیب پر اثر انداز ہوتا ہے۔ کیوں کہ گوئٹے کے بعد شاعر کا تخیل ایک بار پھر کروٹ بدل کر بھٹائی کی شاعری کا تذکرہ کرنے لگتا ہے۔ یہ سلسلہ آگے بڑھ کر بلوچ حق پرستوں کی جانب پرواز کرتا ہے اور رحمان بابا،خوش حال خان خٹک کی کتاب دوستی کے اظہار پر رکتا ہے۔

شاعر کا تخیل ایک بار پھر مغرب کی جانب پر تولتا ہے اور چشمِ تخیل ملٹن ، ورڈز ورتھ ،کٹیس ، ہارڈی اور ییٹس کی کتب شناسی کا احاطہ کرتی ہے اور چشمِ زدن میں مشرق میں غالب، اقبال، ٹیگور کو منبع علم و دانش قرار دیتا ہے جن کا سینہ گنجینۂ معارف اور دامن متاعِ ہنر سے مالا مال ہے:

غرض علم و دانش کے سب آفتاب
مری روشنی سے ہوئے فیض باب
معارف سے معمور سینہ مرا
متاعِ ہنر ہے خزینہ مرا

''کتاب نامہ'' کا اہم ترین حصہ اپنے کمالات اور فیوض و برکات کی سرگزشت بیان کرنا ہے۔افسردہ دلوں کے لیے امید،ظلمتوں میں امید کی کرن، آگہی اور خبر کی نمود کی آماجگاہ،کبھی حکمت کے آداب کی تحصیل اور یقین کی ترسیل خوداعتمادی کی دولت سے مالا مال کرنے کا عمل اس کی بے پناہ خدمات پر دال ہے۔ وہم گمان کو مٹا کر صداقت کی امانت داری کا فریضہ ادا کر کے ان کا ایک ایک حرف نسل در نسل اقوام و افراد تک پہنچانا مادرانہ تربیت کی غمازی کرتا ہے۔ یہ بنی نوع آدم کے شعور کو اپنی آغوش میں لے کر شاہانِ رفتہ کی دلچسپ حکایات سناتی ہے اور ایک کردار ساز ماں کی طرح عقاید اور شریعت کے اسرار و رموز، تصوف اور طریقت کے نکتے، مشائخ کے اقوال و اعمال پہنچانے کا فرض ادا کرتی ہے۔ کتاب ہی وہ ماٰخذ ہے جو جلوت میں انسان کو معزز اور خلوت میں غمِ تنہائی سے چھٹکارا دیتا ہے۔صداقت، عدالت اور اقوامِ خفتہ کو احساسِ بصیرت سے مزین کر کے معرکہ عمل کی جانب گامزن کرنے کے لیے اس کے حروف جادو کی سی اکسیر کے حامل ہیں۔ کبھی یہ خوابوں کو تعبیر آشنا کرتی ہے تو کبھی شگفتہ مزاجی کو جلا بخشتی ہے۔کبھی یہ ذریعہ لبِ خنداں ہے تو کبھی دل میں مسرت کے پھول کھلا کر انسان کو غمِ روزگار سے نجات دلاتی ہے۔ یہ محبت اور انسانیت کی سفیر بن کر دشمنوں کے دلوں میں لباسِ عداوت کو پاک کر کے کدورت مٹاتی ہے۔

دلوں سے کدورت مٹاتی ہوں میں
بشر کو محبت سکھاتی ہوں میں

دنیا میں علم وفن کے تمام سوتے اسی مرکز سے پھوٹتے ہیں۔ طب، منطق، فلسفہ، تاریخ، جغرافیہ، ریاضی، سیاست، معیشت، طبیعات، علوم و بحر و بر سے لے کر ظرافت، حکایاتِ محبت، قصہء گوئی کے فن کو اسی کی بدولت تقویت ملتی ہے۔ اپنی اہمیت سے آگاہ کرنے کے بعد دیگر اشعار میں کتاب اپنی ناقدر شناسی اور زوال پذیری پر نوحہ کناں ہے:

پرانے قوانین بدلنے لگے
دساتیر و آئین بدلنے لگے

جہاں انسانی تحقیق و جستجو نے سائنسی انقلابات کو رواج دیا اور مشینوں کی حکومت کی راہ ہموار کی وہاں مادیت پرستی کا رجحان بھی پروان چڑھنے لگا۔ روحانیت کے سوتے خشک ہوتے چلے گئے اور رفتہ رفتہ ذہن و قلب کو منور کرنے والی، منبع علم و دانش، رہنمائے دوجہاں کتاب سے بھی رشتہ ٹوٹنے لگا۔ خلق کی اس بدگمانی کے سبب کتب خانے ویران ہونے لگے۔ نئی نسل نے مدارس اور کتب خانوں کو خیر باد کہہ کر گریز پائی کی روش اختیار کرتے ہوئے خود کو جہالت کی رنگینوں میں گم کر دیا۔ چنانچہ غفلت، سہل پرستی کا شکار نئی نسل قوتِ حرکت سے محروم ہوگئی ہے۔ غصہ، نفرت، وحشت، مفادات کے حصول کی خاطر لاحاصل تگ و دو نے قبائے خلافت کو تار تار کر کے اولادِ آدم کو بے وقار کر دیا۔ ڈاکٹر ارشد محمود ناشادؔ نے دورِ حاضر کی وحشت، احساسِ تنہائی اور شکست و ریخت کے شکار سماج کا سبب بھی کتاب سے شعوری اغماض کو قرار دیا۔ مساجد، مکاتب، مدارس سے تغافل کے باعث انسان بے مقام ہوگیا اور انسانیت گوشہء عافیت کی متلاشی ہوگئی۔ انسان یہ بھول گیا کہ کتاب کو طاقِ نسیاں پر دھر کر ذلت اور نکبت اس کا مقدر ہوگئی۔ اس دگرگوں صورت حال میں کتاب نے انسانی ضمیر پر ان الفاظ سے دستک دی:

مری دوستی ہے نصیب کمال
مری روشنی ہے علاجِ زوال

کیوں کہ جو بھی اس سائے سے محروم ہوگیا، کامیابی اس سے روٹھ گئی۔ یہ مزاجوں کو تعمیر کرنے والی، دماغوں کی تطہیر کرنے والی ہے اور جوہر سے معمور مخزن اور مہکتا ہوا گلشن اس کی ذات میں پنہاں ہے۔ تخلیقِ انسانی کے ساتھ ہی اس کی تخلیق کا آغاز ہوا اور یہ باعثِ قصرِ خلافت ٹھہری۔ آخری شعر بہت بصیرت افروز ہے:

نگاہِ خبردار! ہوشیار ہو

دلِ زندہ! آمادہ کار ہو

''کتاب نامہ'' کی طباعت کا اہم حصہ اس کی فرہنگ بھی ہے۔ اس میں تمام تشریح طلب نکات کی جامع مگر مختصر تفصیل بیان کی گئی ہے۔ یہ قارئین کے لیے بلاشبہ فہم و فراست کے کئی دریچے وا کرتی ہے۔

''کتاب نامہ'' جہاں موضوعاتی اعتبار سے اچھوتی تحریر ہے اور صدیوں کی انسانی تاریخ کا احاطہ کرتی ہے وہیں فنی محاسن سے بھی مالا مال ہے۔ ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد کو ڈاکٹر معین نظامی نے معروف ماہرِ تعلیم، ثقہ محقق اور صحیح حصوں میں نغز گو شاعر قرار دیا اور اس کا عملی نمونہ اس پر اثر مثنوی میں موضوع کی مناسبت سے فنی محاسن سے کماحقہ استفادہ کرنا ہے۔ ضائع بدائع، علمِ بیان اور تاریخی حوالوں سے مزین یہ مثنوی شاعر کے کمالاتِ فکر و ہنر پر روشنی ڈالتی ہے۔

جاذبِ نظر تراکیب، مناسب لفظیات اور مصرعوں کا در و بست اس کی اثر انگیزی میں اضافہ کرتا ہے۔ استعارہ کی مثال دیکھیے:

پلا ساقیا پھر مئے لالہ فام
کہ رنگین ہو جائے حسنِ کلام

صنائع کی چند مثالیں پیش خدمت ہیں:

صنعتِ تکرار:

سنو غور سے اب کہانی مری
کہانی مری اور زبانی مری

صنعتِ تضاد:

عجائب بھری ہے مری داستان
کہ دیکھے ہیں میں نے زمان و مکاں

مری زندگی کے نشیب و فراز
مری ہاؤ ہو، میرا ایک ایک راز

صنعتِ تکرار:

کبھی نام تھا جگ میں میرا زبور
مرے دم سے تھی زندگی نور نور

صنعتِ ترصیع:

دیا میں نے سب کو شعورِ حیات
کھلا میرے صدقے دل ِکائنات

صنعتِ تضاد

مری روشنی سے اندھیرے چھٹے
جہالت کے ظلمت کے جنگل کٹے

صنعتِ مراۃ النظیر:

مرے دم سے تھیں بستیاں تاب دار
مرے نور سے ضوفشاں تھے دیار

صنعتِ سیاق الاعداد:

مجھے سو طرح سے بنایا گیا
سنوارا گیا اور سجایا گیا

صنعتِ تکرار:

سلامی کو حاضر ہوئے خاص و عام
پیے علم کے سب نے بھر بھر کے جام

مرے دم سے جلوت ہے محترم
مرے دم سے مٹ جائے خلوت کا غم

ِصنعتِ ترصیع:

محبت کے مضمون مجھے یاد ہیں
حکایاتِ مجنون مجھے یاد ہیں

صنعتِ مراۃ النظیر:

پرانے قوانین بدلنے لگے
دساتیر و آئین بدلنے لگے

صنعتِ ترصیع:

اخوت زمانے سے رخصت ہوئی
محبت زمانے سے رخصت ہوئی

صنعتِ تکرار:

گھروں پر مسلط ہے دہشت کا راج
کیا خوف نے ریزہ ریزہ سماج

صنعتِ تضاد:

تنزل کی صورت ہوئی آشکار
ترقی کا بھولی ہیں قومیں شعار

صنعتِ ترصیع:

مزاجوں کی تعمیر کرتی ہوں میں
دماغوں کی تطہیر کرتی ہوں میں

ان اشعار کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے کم و بیش ہر معروف صنعت کا استعمال کیا۔ علاوہ ازیں حرفِ عطف کا بھی استعمال کیا گیا ان میں نمایاں درج ذیل ہیں:

کون و مکاں، ارض و سما، زمان و مکاں، عیب و ہنر، نقش و نگار، پروین و یوسف و سید

نفس، الماس وگوہر، خاص وعام، حقیر وذلیل، وہم وگمان، اقوام وافراد۔

ڈاکٹر ناشاؔد کی استعمال کردہ چند تراکیب درج ذیل ہیں:

نگہدارِ تاریخِ عالم، دلِ کائنات، قصرِ شاہی، آبِ زر، روحِ الفاظ اور شاہانِ رفتہ۔

مختصراً یہ کہ ''کتاب نامہ'' عہدِ حاضر کے زوال کو سب پر عیاں کرتی ہے۔ یہ کتاب کی ناقدری کی صورت حال کو واضح کرتے ہوئے بنی نوع انسان کو اپنی بقا کے لیے اس نسخہ کیمیا سے ایک بار پھر رجوع کرنے کی نصیحت کرتی ہے۔ یہ نئی نسل کے ضمیر کو جگانے کی سعی کرتے ہوئے اسے راہِ راست پر لانے کے لیے خود کو راہ نما پیش کرتی ہے۔ کتاب موجودہ دور کی نہ صرف ضرورت ہے بل کہ راہ نجات اور ترقی کا زینہ بھی ہے۔

(مضمون میں تمام حوالہ جات ''کتاب نامہ'' سے لیے گئے، کتاب نامہ، سرمد پبلی کیشنز اٹک، ۲۰۱۷)

کتاب نامہ

___ارشد محمود ناشاد___

کروں پہلے توصیفِ ربِّ جہاں
کیے خلق جس نے یہ کون و مکاں

دوعالم ہیں اُس کی صناعت پہ دال
وہ نقّاشِ بے مثل ہے لایزال

کیے اُس نے تخلیق ارض و سما
نہیں اُس کا ثانی کوئی دوسرا

یہ قدرت یہ کاری گری اُس کی ہے
یہ زینت یہ سب دلبری اُس کی ہے

پڑھوں پھر محمّدؐ پہ بے حد درود
مبارک ، معطّر ، منوّر ، وُجود

سجی جن کی خاطر یہ بزمِ جہاں
ہوئیں جن کے باعث یہ صناعیاں

پلا ساقیا پھر مئے لالہ فام
کہ رنگین ہو جائے حسنِ کلام

سُنانی ہے اپنی حکایت مجھے
دکھانی ہے اپنی حقیقت مجھے

میں ہوں دانش و فکر کا انتخاب
مرا نام رکھّا گیا تھا کتاب

سنو غور سے اب کہانی مری
کہانی مری اور زبانی مری

عجائب بھری ہے مری داستاں
کہ دیکھے ہیں میں نے زمان و مکاں

مری زندگی کے نشیب و فراز
مری ہاؤ ہو ، میرا ایک ایک راز

تحیّر سے رنگیں ہے میرا سفر
کھُلا مجھ پہ صدیوں کا عیب و ہنر

نگہدارِ تاریخِ عالم ہوں میں
نگہبانِ افکارِ آدم ہوں میں

مجھے سب سے اوّل خدا نے لکھا
میں کلکِ صناعت کا ہوں معجزا

میں فرمانِ داور کی ہم راز ہوں
میں منشائے خالق کی آواز ہوں

ہدایت کے مجھ کو قرینے ملے
نبوت کے مجھ کو سفینے ملے

رسولوں پہ مجھ کو اُتارا گیا
صحیفہ کہا اور پُکارا گیا

رسولوں کا سینہ بنا میرا گھر
بنایا مجھے خلق نے راہ بر

کبھی نام توریت میرا پڑا
ہوا آلِ موسیٰ میں شہرہ مرا

جو پاکیزہ خُو نیک اطوار تھے
مرے قدر داں تھے مرے یار تھے

کبھی نام تھا جگ میں میرا زبُور
مرے دم سے تھی زندگی نور نور
دیا میں نے سب کو شعورِ حیات
کھلا میرے صدقے دلِ کائنات

کبھی مجھ کو انجیل کہتی تھی خلق
مرے چار اطراف رہتی تھی خلق

کبھی مجھ کو قرآں پُکارا گیا
شفیعُ الامم پر اُتارا گیا

مری روشنی سے اندھیرے چھٹے
جہالت کے ظلمت کے جنگل کٹے

کبھی وید رکھا گیا میرا نام
زمانے نے مجھ کو دیا احترام

کبھی مجھ کو گیتا کا عنواں ملا
مجھے پیار کرتی تھی خلقِ خدا

کبھی لوگ کہتے تھے مجھ کو گرنتھ
دکھایا ہے میں نے صداقت کا پنتھ

میں حسنِ حقیقت کی ایجاد ہوں
میں سارے زمانوں کی اُستاد ہوں

کبھی تھا زمانے میں چرچا مرا
طلب گار ہر آدمی تھا مرا

مرے دم سے تھیں بستیاں تاب دار
مرے نور سے ضوفشاں تھے دیار

مرے دم سے روشن تھا سارا جہان
مرے دم سے تھی قصرِ شاہی کی شان

مرے قدر داں تھے غریب و رئیس
ہر اک صاحبِ دل تھا میرا جلیس

مری قدر کرتے تھے چھوٹے بڑے
مرے ساتھ رہتے تھے لکھے پڑے

کبھی مجھ سے تابندہ تھے سارے گھر
زمانہ مرے دم سے تھا معتبر

کبھی مجھ کو لکھا گیا کھال پر
کبھی چوب پر اور کبھی چھال پر

کبھی ہڈّیاں میرا مسطر ہوئیں
کبھی تختیاں میرا بستر ہوئیں

کبھی سیم سے میری صورت سجی
کبھی میں رقم آبِ زر سے ہوئی

بنے میرے صفحوں پہ نقش و نگار
سراپا مرا ہو گیا پُر بہار

حجازی نے کی میری صورت گری
کبھی نسخ نے میری تہذیب کی

کبھی خطِّ کوفی نے بخشا وقار
کہ دی میرے حرفوں کی صورت سنوار

ثُلُث نے دِیا مجھ کو ایسا جمال
ہوئی روحِ الفاظ جس سے نہال

سنوارا کبھی مجھ کو رِیحان نے
نکھارا کبھی خطِّ دیوان نے

شکستہ نے بخشا نیا آب و رنگ
کہ لفظوں میں بجنے لگی جل ترنگ

نچھاور ہوا مجھ پہ خطِّ بہار
مرا ہر بُنِ مُو ہوا مشک بار

ہوا مجھ پہ تعلیق یوں مہرباں
کہ عاشق ہوا مجھ پہ سارا جہاں

ہوئے نسخ و تعلیق جب ایک جان
تو ظاہر ہوئی خطِ سُلطاں کی شان

وہ سُلطانِ خط بھی ہے عاشق مرا
ملا اُس سے حرفوں کو رنگِ بقا

بہت خط کہ تھے خوب آرائشی
عطا کی اُنھوں نے مجھے دل کشی

جو کاتب تھے نامی جو خطّاط تھے
ہنر میں بہت طاق ، محتاط تھے

مہارت ہوئی اُن کی مجھ پر نثار
دیا اپنا فن میری صورت پہ وار

وہ پرویں وہ یوسف وہ سیّد نفیس
نگاریں قلم تھے ، قلم کے رئیس

وہ الماس و گوہر وہ زرّیں رقم
سمجھتے تھے حرفوں کے جو پیچ و خم

مرے عاشقوں میں تھے شامل سبھی
کتابت کے فن میں تھے کامل سبھی

مصوّر وہ نامی کہ تھا صادقین
سنوارے ہیں اُس نے مرے نقش نین

وہ چغتائی مشرق میں فن کا امام
رہا مُو قلم اُس کا میرا غلام

وہ خلّاق فن کار اسلم کمال
نئے خط سے دی میری صورت اُجال

مجھے سو طرح سے بنایا گیا
سنوارا گیا اور سجایا گیا

کبھی مجھ کو ریشم کی پوشاک دی
کبھی میرا جامہ بنا اطلسی

سجایا گیا مجھ کو جزدان میں
بسایا گیا مشک و لُوبان میں

بنائے گئے میرے گھر جا بہ جا
مجھے شان سے اُن میں رکھا گیا

سلامی کو حاضر ہوئے خاص و عام
پیے علم کے سب نے بھر بھر کے جام

محبت سے جس نے رکھا مجھ کو یاد
اُسے بخش دی دولتِ اعتماد

بخارا مرے دم سے تھا معتبر
مرے دم سے بصرہ تھا شہرِ ہنر

مرے دم سے شیراز تھا دارِ علم
مرے دم سے تھا قُم نگہدارِ علم

مرے دم سے روشن ہوا قرطبہ
مرے دم سے چمکا ہے اشبیلیہ

مرے دم سے مشہور تھا اصفہان
مرے دم سے قائم تھی دِلّی کی شان

مرے دم سے تابندہ بغداد تھا
مرے دم سے لاہور آباد تھا

پلا ساقیا! اب مئے ارغواں
کہ تلخی سے لبریز ہے داستاں

کبھی ظلم بھی مجھ پہ ڈھائے گئے
مرے گھر گرائے ، جلائے گئے

جہالت تھی جن کے سروں پر سوار
اُنھوں نے ستایا مجھے بار بار

بہت میری تحقیر و تذلیل کی
مری شکل و صورت بھی تبدیل کی

ذخیرے مرے نذرِ آتش ہوئے
کبھی تیز دریا میں ڈوبے ، بہے

غرورِ حکومت میں سرمست تھے
بہ ظاہر تھے بالا مگر پست تھے

رہا اُن کا باقی نہ نام و نشاں
مرا اب بھی ہے نام لیوا جہاں

مفکّر ، محقق مرے قدرداں
معلّم ، مدرّس مرے مدح خواں

مفسّر ، محدّث ، ادب کے امام
کیا سب نے دل سے مرا احترام

مجھے شاعروں سے محبت ملی
ادیبوں سے میری رہی دوستی

ارسطوؔ کی عزّت مرے دم سے ہے
فلاطوںؔ کی حکمت مرے دم سے ہے

ہے ورجلؔ مرے نام سے سرخرو
دیا میں نے ہومرؔ کو ذوقِ نمو

وہ رومیؔ وہ سعدیؔ مرے راز داں
وہ قدسیؔ وہ بیدلؔ مرے نغمہ خواں

سنائیؔ سے صحبت رہی ہے مری
غزالیؔ سے قربت رہی ہے مری

جسے خلق کہتی ہے بابا فریدؔ
وہ شیخِ زمانہ تھا میرا مرید

کبھی عاشقوں میں تھا خسروؔ مرا
کبھی میرؔ میرا طلب گار تھا

وہ باہوؔ وہ وارث مرے نغمہ سنج
لُٹاتے رہے مجھ پہ حکمت کے گنج

گوئٹے وہ مغرب کا روشن ضمیر
رہا ہے محبت میں میری، اسیر

بھٹائی وہ بھٹ شہ کا اخلاص کیش
مری قدر دانی میں تھا پیش پیش

مری حق پرستوں سے سنگت رہی
بلوچوں کے مستوں سے سنگت رہی

وہ رحمان بابا وہ خوش حال خان
کہ گونجا ہے نغموں سے جن کے جہان

رہے زندگی بھر وہ میرے قریب
سمجھتے تھے وہ مجھ کو دل سے حبیب

وہ ملٹن کہ تھا شاعرِ خوش کلام
رہا زندگی بھر مرے زیرِ دام

ثنا خواں مرے ورڈزورتھ اور کیٹس
مرے رتبہ داں ہارڈی اور ییٹس

کبھی مجھ کو غالبؔ کی صحبت ملی
کبھی ہم نشیں تھی میں اقبالؔ کی

وہ ٹیگور جو فخرِ بنگال تھا
مری ہم نشینی میں خوش حال تھا

غرض علم و دانش کے سب آفتاب
مری روشنی سے ہوئے فیض یاب

معارف سے معمور سینہ مرا
متاعِ ہنر ہے خزینہ مرا

دِیے ظلمتوں میں جلاتی ہوں میں
فسردہ دلوں کو لبھاتی ہوں میں

مرے دم سے ہے آگہی کی نمود
مرے دم سے ہے ہر خبر کا وُجود

سکھاتی ہوں حکمت کے آداب میں
دماغوں کو کرتی ہوں سیراب میں

دلوں سے مٹاتی ہوں وہم و گماں
یقیں بانٹتی ہوں یہاں اور وہاں

صداقت نشاں ہے مرا ہر ورق
ہے حکمت سے معمور اک اک سبق

سکھاتی ہوں اقوام و افراد کو
سکھائے کوئی جیسے اولاد کو

سُناتی ہوں شاہانِ رفتہ کا حال
جہاں میں نہیں جن کی کوئی مثال

عقاید کی دُنیا ، شریعت کی بات
تصوّف کے نکتے ، طریقت کی بات

مشائخ کے اقوال و اعمال سب
دکھاتی ہوں قوموں کے احوال سب

جو پڑھتا ہے مجھ کو دل و جان سے
کرے بات محفل میں وہ شان سے

مرے دم سے جلوت بنے محترم
مرے دم سے مٹ جائے خلوت کا غم

ہویدا ہے مجھ سے صداقت کی شان
نمایاں ہے مجھ سے عدالت کی آن

جگاتی ہوں اقوامِ خفتہ کو میں
ہِلاتی ہوں اندر کی دُنیا کو میں

مرے لفظ جادُو ہیں اکسیر ہیں
مرے حرف خوابوں کی تعبیر ہیں

شگفتہ مزاجی جگاتی ہوں میں
لبوں پر تبسّم سجاتی ہوں میں

کھلاتی ہوں دل میں مُسرّت کے پھول
جو میرا بنے ، جائے دُکھ درد بھول

دلوں سے کدورت مٹاتی ہوں میں
بشر کو محبت سکھاتی ہوں میں

سفیرِ محبت ہوں میں برملا
دِیے میں نے دل دشمنوں کے ملا

مرے دم سے پھیلے محبت کے رنگ
مرے فیض سے ختم صدیوں کی جنگ

میں کرتی ہوں سینوں کو نفرت سے پاک
لباسِ عداوت مرے دم سے چاک

سکھاتی ہوں میں زندگی کے اُصول
مرے دم سے ہے رحمتوں کا نزدل

ہوئے زندہ طب ، منطق و فلسفہ
مرے دم سے تاریخ و جغرافیہ

ریاضی کی صورت گری میں نے کی
فلاحت مرے دم سے پھولی پھلی

سیاست کے آئیں ، معیشت کی بات
مرے دم سے روشن ہوئی طبیعیات

زمیں کے خط و خال مجھ پر کھلے
سمندر کے احوال مجھ پر کھلے

کیے میں نے زندہ علوم و فنون
معارف کی رگ رگ میں ہے میرا خون

لطائف کا گنجِ گراں مجھ میں ہے
ظرافت بھرا گلستاں مجھ میں ہے

محبت کے مضموں مجھے یاد ہیں
حکایاتِ مجنوں مجھے یاد ہیں

زمانوں کے قصّے سُناتی ہوں میں
حکایاتِ خفتہ جگاتی ہوں میں

معطر مری بُو سے سارا جہاں
منوّر مرے نور سے این و آں

تغیر نشاں ہے زمانے کا رنگ
بدلنے لگا زندگانی کا ڈھنگ

پُرانے قوانیں بدلنے لگے
دساتیر و آئیں بدلنے لگے

ہوئی خلق کیوں مجھ سے یوں بد گماں
مٹانے لگی ہے وہ میرے نشاں

کتب خانے ویران ہونے لگے
مدارس بیابان ہونے لگے

گریزاں ہوئیں مجھ سے نسلیں نئی
ضرورت نہیں کیا انھیں اب مری ؟

مرے سائے سے بھاگتے ہیں سبھی
سمجھتے ہیں مجھ کو مصیبت بڑی

کوئی دل سے پڑھتا نہیں دو ورق
کوئی مجھ سے لیتا نہیں اب سبق

گلے سے لگاتا نہیں کوئی فرد
تغافل سے انساں کے ہے روح سرد

تساہل میں ، غفلت میں کھوئی ہے خلق
جہالت میں، ظلمت میں ڈوبی ہے خلق

یہ غصّہ ،یہ نفرت ، یہ وحشت ، یہ جنگ
نہ عزّت سلامت ، نہ ناموس و ننگ

قبائے خلافت ہوئی تار تار
ہے اولادِ آدم بہت بے وقار

اخوت زمانے سے رخصت ہوئی
محبت زمانے سے رخصت ہوئی

گھروں پر مسلط ہے دہشت کا راج
کیا خوف نے ریزہ ریزہ سماج

لڑائی پہ آمادہ ہر ایک فرد
شقاوت کی اُڑتی ہے ہر سمت گرد

نہیں اب کہیں گوشۂ عافیت
بھٹکتی ہے گلیوں میں انسانیت

مساجد ، مکاتب ، مدارس تمام
تغافل سے انساں کے ہیں بے مقام

تنزل کی صورت ہوئی آشکار
ترقّی کا بھولی ہیں قومیں شعار

مجھے طاقِ نسیاں پہ سب نے دھرا
یہ ذلت یہ نکبت ہے اس کی سزا

مری دوستی ہے نقیبِ کمال
مری روشنی ہے علاجِ زوال

مرے سائے سے جو بھی محروم ہے
زمانے کے منظر سے معدوم ہے

مزاجوں کی تعمیر کرتی ہوں میں
دماغوں کی تطہیر کرتی ہوں میں

جواہر سے معمور مخزن ہوں میں
مہکتا ہوا ایک گلشن ہوں میں

میں انساں کے قصّے کا عنوان ہوں
میں قصرِ خلافت کی پہچان ہوں

مرے پاس حکمت کا سامان ہے
مرے پاس صدیوں کا عرفان ہے

اُٹھو! بڑھ کے دامن مرا تھام لو
محبت سے پھر مجھ کو پڑھنے لگو

نگاہِ خبردار ! ہشیار ہو
دلِ زندہ ! آمادۂ کار ہو

مولوی شمس الدین مرحوم ومغفور

(ایک تاجر کتب: ایک عظیم کتاب دوست انسان)

مولانا غلام رسول مہر

آنچہ پر جستیم و کم دیدیم دور کار است و نیست
نیست جز انسان دریں عالم کہ بسیار است و نیست

دنیا میں آب وگل کے ان متحرک پیکروں کی قلت کبھی نہیں رہی جنہیں آدمی کہتے ہیں۔ لیکن انسان روئے زمین پر پہلے بھی بہت کم نظر آئے۔ جب انسانیت بدرجہا بہتر و معنویت کے ساتھ جلوہ افروز تھی اور ہمارے دور میں تو اچھے انسانوں کا ہاتھ آنا واقعی خدائے بزرگ و برتر کا خاص احسان سمجھنا چاہیے۔ کیوں کہ اب تو عالم انسانیت پر ایسی تاریکی چھا رہی ہے جس نے قوت بینائی کی کارفرمائی کے لیے کوئی گنجائش نہیں چھوڑی میرزا غالب نے اپنے میں کہا تھا کہ

آدمی کو بھی میسر نہیں انسان ہونا

مگر آج تو میرزا کے دور سے زیادہ مایوس کن صورت حال سامنے آ گئی ہے۔ مولوی شمس الدین مرحوم ومغفور واقعی مختلف اعتبارات سے اس دور کے ایک محبوب انسان تھے۔

آج کل مکروہ اغراض کی ہنگامہ جوشیوں اور ریا ونمائش کی فریب آرائیوں سے ہر طرف ایک حشر سا بپا ہے۔ یہ فضا مولوی صاحب مرحوم جیسے انسانوں کی تربیت و پرورش کے لیے کیوں کر سازگار سمجھی جا سکتی ہے اور کیا امید رکھی جا سکتی ہے کہ ایسے انسان پھر نظر آئیں گے؟

ابتدائی ملاقات

ہر بچہ قدرت کی طرف سے بے داغ فطرت لے کر آتا ہے ماحول کے ظروف، اقرباء کے حلقے، احباب کی صحبتیں، دوائر کاروبار کے اوضاع واطوار جیسے ہوتے ہیں۔ وہ عموماً انہیں کے سانچے میں ڈھل جاتا ہے۔ یہی چیزیں بچے کی لوح فطرت کو زرنگار یا قیرگوں بنا دیتی ہیں۔ انہیں میں اس کی سعادت یا شقاوت پروان چڑھتی ہے بعض سعید ہستیاں ایسی بھی ہوتی ہیں۔ جو شدید تاریکیوں میں رہ کر بھی اپنے قلب پر کوئی نامناسب و نامطلوب نقش جمنے نہیں دیتیں اور خدا کی رحمت کے سائے میں ان کی فطرت بالکل پاک ومزکیٰ رہتی ہے۔ ایسی ہی ایک فطرت مولوی شمس

الدین مرحوم کی تھی جو غالباً پونچھ میں پیدا ہوئے۔ کچھ معلوم نہیں کہ کہاں کہاں تعلیم وتربیت پائی۔ کہاں کہاں رہے۔ مجھے صرف اتنا معلوم ہے کہ تقسیم ملک سے کئی سال پیشتر لاہور آ گئے تھے۔ان سے میری پہلی ملاقات مسجد موراں کے ایک حجرے میں ہوئی تھی۔ان کا پتہ مجھے چودھری محمد حسین مرحوم ومغفوراور مولانا ظفراقبال سے ملا تھا۔

پرانی عربی، فارسی اور اردو کتابوں کی جستجو میں میرا شوق دیوانگی کی حد پر پہنچا ہوا تھا اور مولوی صاحب مرحوم سے ملا تو معلوم ہوا کہ وہ نادر علمی جواہر پاروں کا ایک خزانہ لیے بیٹھے ہیں۔ شناسائی نہ ہونے کے باوصف ان کے ملنے کا انداز اس درجہ لطف پرور اور محبانہ تھا کہ دل ان کے جواہر پاروں سے بھی مسحور ہوا اور ان کی دل آویز شخصیت کا جادو بھی زور تاثیر میں ہرگز کم نہ رہا۔ مجھے پرانی کتابیں فروخت کرنے والوں کے طور طریقوں کا خاصا تجربہ تھا۔جو گاہک کے شوق کو ایک ہی نگاہ میں تول کر مال کی قیمت لگاتے تھے لیکن مولوی صاحب مرحوم نے پہلے ہی معاملے میں میری والہیت کو دیکھ کر مطلوب کتابوں کی قیمتیں اتنی کم لگائیں جو میرے اپنے اندازے سے بھی کم ہی تھیں۔

حسن سلوک

پھر تو مسجد موراں کے اس حجرے کی زیارت میرا خاص مشغلہ بن گئی جس میں مولوی صاحب مرحوم مقیم تھے میں قریباً روزانہ شیخ مبارک علی کی دکان (واقع لوہاری منڈی) میں جایا کرتا تھا اور وہاں سے مسجد موراں بہت قریب تھی ہر دوسرے تیسرے دن شیخ مبارک علی کی طرف جاتے یا وہاں سے لوٹتے وقت مولوی صاحب مرحوم سے ضرور ملتا ان کی محبت کا یہ احسان میں تادم مرگ فراموش نہیں کرسکتا کہ وہ جو نادر کتاب یا رسالے لاتے مجھے ضرور دیکھاتے بلکہ بعض کتابیں یہ کہہ کر پیش کر دیتے کہ انہیں ضرور لے لیجیے پھر نہیں ملیں گی۔ وہ لاہور سے باہر جاتے تھے تو صرف اس غرض سے کہ کہیں انہیں نادر ذخیرہ وکتب کا سراغ مل جاتا اور جب کوئی ذخیرہ لاتے تو اس کے منتخب نوادر مجھے عنایت فرما دیتے کبھی اس امر کا خیال نہ کیا کہ دوسرے افراد واداروں سے انہیں زیادہ رقمیں مل جائیں گی۔ ہمیشہ یہ امر پیش نظر رہتا کہ میرا شوق پورا ہو جائے۔میرے پاس عمدہ کتابوں کا جتنی بھی اندوختہ ہے اس میں بڑا حصہ مولوی صاحب مرحوم ہی کی مہربانی، محبت اور ایک ناچیز طالب علم سے انتہائی حسن سلوک کا کرشمہ ہے۔

کتابوں کا بیش بہا ذخیرہ

ایک مرتبہ انہوں نے بھوپال اور حیدرآباد کے سفر کا قصد کیا۔ اس میں خاصا وقت صرف ہو گیا۔ واپس آئے تو فرمایا کہ بہت کتابیں لایا ہوں۔ میں نے وعدہ لے لیا کہ کتابیں سب

سے پہلے مجھے دکھا دیں گے۔ پھر اپنے ہاں لے جائیں گے۔ چنانچہ وہ سٹیشن سے بلٹیاں چھڑاتے ہی صندوق ''انقلاب'' کے دفتر میں لے آئے جو اس وقت خالصہ سٹریٹ میں تھا۔ مجھے نواب صدیق حسن خاں مرحوم کی کتابیں درکار تھیں اور وہ کہیں سے ملتی نہ تھیں مولوی صاحب مرحوم کے صندوقوں میں سے اکثر کتابیں مل گئیں۔ دوسری کتابیں بھی تھیں۔ میرے اندازے کے مطابق ان کی قیمت سینکڑوں سے متجاوز تھی لیکن مولوی صاحب مرحوم نے قیمتیں لگائیں تو میزان پانچ سو سے زیادہ نہ تھی۔

ان کا فطری وظیفہ

ان کی محبت ونوازش کے یہ درخشاں نقوش ربع صدی گزر جانے کے بعد بھی لوح قلب پر بدستور روشن وضیاافروز ہیں۔ غالباً ایسے ہی نقوش ہیں۔ جن کی وجہ سے ان کی مفارقت دوستوں کی مجلس کو تڑپا رہی ہے۔ میرا احساس یہ ہے کہ اگرچہ کتابیں فروخت کرنا بظاہر ان کا پیشہ تھا لیکن حقیقۃً قدرت نے انہیں طالبان علم کے شوق کی تسکین کا ذریعہ بنا کر بھیجا تھا لہذا انہیں زندگی کی جتنی بھی مہلت ملی اپنے اسی فطری وظیفے کی بجا آوری میں گزار دی اور دنیا سے اٹھے تو اپنے پیچھے محبوب یاروں کے ایسے چمن زار چھوڑ گئے۔ جن کی شادابی، طراوت اور رواں بخشی میں ان شاءاللہ کبھی کمی نہ آئے گی۔

حسن انسانیت

ظاہر ہے کہ مولوی شمس الدین مرحوم علم کا صحیح ذوق رکھنے کے باوجود ممتاز اہل علم میں سے نہ تھے۔ دولت وثروت یا عزوجاہ بھی انہیں کوئی واسطہ نہ تھا لیکن انسانیت کا حسن ان چیزوں پر موقوف نہیں بلکہ ان کی وجہ سے اکثر اس حسن کا دامن داغدار ہو جاتا ہے۔

دیکھیے ان کے بغیر بھی مولوی صاحب کی انسانیت کتنی نمایاں اور ممتاز رہی۔ فقیری اور دوراندیشی میں بھی ان کے اندر ایسی مقناطیسی قوت تھی کہ مختلف لوگ ان کی طرف کشاں کشاں جاتے تھے ان میں سے ایک عاجز و ہیچ میرز بھی تھا۔ افسوس کہ آخری دور میں میرا جانا اوّل گوناگوں مشاغل کی وجہ سے کم ہو گیا۔ اور زیادہ تو چند عزیز دوستوں کے ذریعے سے نامہ وپیام پر مدار رہا۔ دوم شیخ مبارک علی صاحب لوہاری دروازے سے اٹھ کر پبلشرز یونائیٹڈ کا کام سنبھال بیٹھے اور وہاں سے نکل کر مسلم مسجد تک جانے کی مہلت ہی نہیں ملتی تھی با ایں ہمہ جب کبھی شیخ نیاز احمد کے ساتھ علمی پرنٹنگ پریس پہنچ جاتا تھا۔ دو چار منٹ ہی کے لیے سہی، مولوی صاحب کی زیارت ضرور کر آتا تھا۔ ان کے اپنے حالات اچھے ہوں یا برے لیکن ان کے چہرے کی محبوب شگفتگی یا لبوں کے تبسم یا پرخلوص جوش خیر مقدم میں کبھی کمی نہ آئی اور فنجان چائے ہمیشہ گردش میں رہتا تھا۔ بارہا عرض کیا کہ

بھائی ضرورت نہیں لیکن مولوی صاحب کی محبت کبھی معذرت پر مطمئن نہ ہوئی۔ اب معلوم ہوتا ہے کہ ان کا برتاؤ تمام احباب سے ایسا ہی تھا میں تو اپنے آپ کو ان احباب میں شامل سمجھنے کی جسارت بھی نہیں کر سکتا۔

فضائل اخلاق پیکر

وہ بڑے محبوب انسان تھے۔ اپنی ہوشمندانہ زندگی کا ہر لمحہ دوسروں کی خدمت، خیر خواہی، خوشی اور خیر مقدم میں گزارتے رہے ایسے مخلص، بے غرض، وسیع القلب، فضائل اخلاق سے مزین اور ہر نوع کی ذاتی منفعت سے بے نیاز افراد کہاں نظر آتے ہیں۔ انہوں نے کبھی شہرت کی آرزو نہ کی۔ حالانکہ ان کا مشغلہ ایسا تھا جس میں وہ دولت و ثروت بھی خاص حاصل کر سکتے تھے اور شہرت میں بھی بلند درجے پر پہنچ سکتے تھے فارسی کی ایک مشہور رباعی ہے:

گیرم کہ ہزار مسجد آباد کنی
صد صومعہ و مدرسہ بنیاد کنی
گر خرم ازاں غمزدہ نیست چہ سود؟
جہدے بنما کہ خاطرے شاد کنی

مولوی شمس الدین مرحوم رباعی کے آخری مصرعے کا ایک پاکیزہ عملی مرقع تھے۔

محبوبیت کا راز

انہیں عموماً نوادر علم کا جوہری سمجھا جاتا ہے یقیناً انہوں نے کمیاب و نادر کتابوں کی فراہمی اور فروخت کا سلسلہ شروع کر رکھا تھا اور

بزم میں اہل سخن بھی ہیں تماشائی بھی

کے پیش نظر دوسری کتابیں رکھ لی تھیں مگر مجھے تو ان کی انسانیت عالیہ نوادر کتب پر ہمیشہ فائق و برتر نظر آئی وہ تاجر کم تر درجے کے تھے۔ انسان بہت اونچے درجے کے تھے۔ آج ان کے لیے قلوب احباب میں جو پر خلوص تڑپ بجا نظر آتی ہے وہ ان کی تجارت کتب نہیں۔ حسن انسانیت ہی کا کرشمہ ہے۔

ایک واقعہ

آخری دور کا ایک واقعہ یاد آ گیا۔ میری ایک کتاب ''انفاس العارفین'' گم ہوگئی۔ یہ شاہ ولی اللہ محدثؒ دہلوی کی مشہور تصنیف ہے جگہ جگہ تلاش کرائی مگر کہیں سے مل نہ سکی۔ مولوی شمس الدین مرحوم کو پیغام بھیج دیا کہ جہاں سے بھی اور جس قیمت پر ملے، میرے لیے مہیا فرما دیں۔ ایک روز میرے عزیز دوست محمد عالم مختار حق صاحب (جھگیاں، ناگرہ، لاہور) ان کے ہاں سے

آئے اور کاغذ میں لپٹی ہوئی ''انفاس العارفین'' میرے حوالے کر دی۔ اس کی پیشانی پر مولوی صاحب مرحوم نے اپنے قلم سے لکھ دیا تھا کہ یہ بطور ہدیہ حاضر ہے۔ قیمت نہیں لوں گا میں نے خود ایک مرتبہ حاضر ہو کر عرض کیا کہ جس قیمت پر بھی آپ نے خریدی ہے وہی لے لیجیے۔ فرمایا۔ شرمندہ نہ کیجیے۔ میں نے یہ اپنی طرف سے بطور یادگار دی ہے۔

غرض ایسے بیسیوں واقعات ہیں۔ کس کس کا ذکر کروں اور کیا بتاؤں کہ ان کی ہر ادا اور لطف و محبت کے ہر کرشمے میں کتنی دل آویزی تھی!

غیر معمولی شخصیت

انسان کے لیے خاکدان ارضی کا قیام بہرحال عارضی ہے۔ کوئی کتنی ہی لمبی عمر یہاں گزارے، آخر یہ گھر چھوڑ کر عالم بقا میں پہنچتا ہے۔ یہاں ہم جو کچھ بوئیں گے اسی کا پھل ہمیں اگلی دنیا میں ملے گا اور اسی کی بنا پر آئندہ زندگی کی تشکیل ہوگی۔

مولوی شمس الدین مرحوم اپنے دامن میں نیکیوں اور سعادتوں کے جو جواہر بھر کر لے گئے ان کے گراں بہا ہونے میں بفضل اللہ ان لوگوں کے لیے گنجائش کلام نہیں ان کی محبتوں سے مستفید ہوئے یا جنہیں ان سے سرسری سی بھی شناسائی تھی ان میں ایک فرومایہ علم و عمل میں بھی ہوں گیان کی زندگی کو قلوب احباب کے لیے نسیم بہار کی حیثیت حاصل تھی۔ یقین ہے کہ کریم مطلق کی رحمت بے کراں سے ان کی آئندہ زندگی بھی بہار بے خزاں میں گزر رہی ہوگی۔ انہوں نے کسی کے ساتھ نیکی، خیر خواہی اور محبت کے برتاؤ میں کمی نہ کی۔ میں یہی دعا کر سکتا ہوں کہ اللہ انہیں ہمیشہ اپنی رحمت کے سائے میں رکھے اور ان کی سیرۃ کو دوسروں کے لیی نمونہ عمل بنائے! آمین! ثم آمین!!

الفاظ کا کوئی مجموعہ اس عزیز دوست کی پر خلوص محبت کا حق ادا نہیں کر سکتا۔ مجھے اس کا پورا احساس ہے لیکن میرے لیے اس کے سوا رہ بھی کیا گیا ہے کہ ٹوٹے پھوٹے الفاظ کا جو گلدستہ پریشان تیار کر سکا اس کو لے کر مولوی شمس الدین مرحوم کی بارگاہ عظمت میں حاضر ہو جاؤں۔ مرحوم کے ساتھ ربط و تعلم کی جو مدت کم و بیش تیس سال پر پھیلی ہوئی ہے۔ اس کی یاد منانے کا یہ کوئی اچھا اور قابل ذکر سرمایہ نہ سہی تاہم اپنی بساط کے مطابق اس فرض کی بجا آوری سے محرومی پر دل راضی نہیں۔

مسٹر بکس والا یوسف

کشور ناہید

عید کے تیسرے دن، ہم دوست اکٹھے باتیں کر رہے تھے کہ ایک میسج نے ہم سب کو چونکا دیا۔ مسٹر بکس کا مالک بہت اچھا ادب دوست اور کتابوں کو اسلام آباد جیسے شہر میں پھیلانے والا ایک وہ تھا اور ایک سعید بک بنک والے سعید صاحب۔ دونوں ہی چلے گئے۔ ہم لوگ جب شام کو مسٹر بکس پر جاتے تو وہاں کئی ڈپلومیٹس، کئی افسر، کئی صحافی اور کئی سیاست دان مل جاتے گھنٹوں ہم کھڑے کھڑے باتیں کرتے سارے ہی موضوعات زیر بحث آتے، یوسف بھی ہمارے ساتھ شریک ہوتا اور ہم واپسی پہ خوش ہوتے کہ چلو یہاں ٹی ہاؤس نہیں ہے۔ البتہ مسٹر بکس پر بہت لوگوں سے ملاقات ہو جاتی ہے۔

یوسف کو حد سے زیادہ بڑھی ہوئی شوگر تھی۔ اس کے باعث آنکھوں کی بینائی بھی بہت حد تک ختم ہو گئی تھی۔ شوگر ہی کے باعث اس کے دونوں پاؤں آدھے کاٹے جا چکے تھے۔ ان تمام بیماریوں کے باوجود وہ دوسری کتابوں کی دکان میں، مجھ سے بار بار کہتا کہ ادیبوں کے لئے ایک ٹی ہاؤس بناؤں گا، اسے آپ خود کنٹرول کریں گی۔ یہی حال سعید صاحب کا تھا۔ دنیا بھر کی کتابیں منگوانے اور ڈسپلے کرنے کا شوق تھا۔

کتابوں کی دکانیں، مقتدرہ اور اکیڈمی نے بنائی ہوئی ہیں۔ ان میں زیادہ تر ان کی ہی شائع شدہ کتب مل جاتی ہیں۔ ایک چھوٹا سا ٹی ہاؤس اکیڈمی نے بھی بنایا ہوا ہے۔ وہاں مختلف ادارے جیسے حلقہ ارباب ذوق ہفتہ وار میٹنگ کرتے ہیں۔ اس طرح اکیڈمی کی طرف پندرہ دن بعد ایک ادیب سے ملاقات کا اہتمام ہوتا ہے۔ ڈاکٹر بوگھیو کی دلچسپی اکیڈمی کی کتابیں شائع کرنے میں بھی بہت ہے۔ صرف میرے جیسے بڈھوں کا مسئلہ ہے کہ اتنی دور تک گاڑی چلائی نہیں جاتی۔

بار بار رضا ربانی کہہ رہےہیں کہ طالب علموں اور دانشوروں کے بیٹھنے کےلئےکوئی جگہ ہونی چاہئے۔ وہ شاید لاہور کے ٹی ہاؤس کو بھول گئے ہیں کہ جہاں ضیاالحق کے زمانے میں ادیب کم اور ایجنسیوں کے لوگ بڑھتے گئے۔ اسلام آباد میں بھی جس موضوع پر بھی ادیبوں کی نشست ہوتی

ہے، تین چار ایجنسیوں کے لوگ ضرور آتے ہیں۔ پتہ نہیں کس نے ان کو سکھایا ہے کہ ادیب حکومت کے خلاف بات کرتے ہیں۔

ادیب اکھٹے ہوتے ہیں تو ادیب کے علاوہ ملکی معاملات پر بھی بات کرتے ہیں۔ یہ سن کر غصہ چڑھتا ہے کہ ہمارے ملک میں دہشت گرد نہیں ہیں۔ جبکہ جماعت الدعوۃ نے تو الیکشن لڑنے کے لئےسیاسی پارٹی بھی بنائی ہے۔ لشکر طیبہ اور پھر سب سے بڑھ کر تدریسی اداروں میں داعش کا زور بڑھ رہا ہے۔ اگر ان باتوں کا تجزیہ کرو تو ایجنسیوں کے لوگ حکومت کو خبر دیتے ہیں کہ یہ لوگ محبِّ وطن نہیں ہیں۔ وہ باتیں جو ٹیکسی ڈرائیور سے لے کر چھابڑی والا تک جانتا ہے، ہمارا میڈیا اور اخبارات تک اس کو جھٹلاتے رہتے ہیں۔ ایک زمانے تک چوہدری نثار کہتے رہے، پاکستان میں داعش کا کوئی رکن نہیں۔ جب لڑکوں کے علاوہ پڑھی لکھی لڑکیاں بھی شام جا کر تربیت حاصل کر کے واپس ملک میں غارت گری کرنے لگیں تو پھر ذرا زبان کھلی۔

کتاب دوستی تو ہمارے ملک کے پروفیسروں اور بڑی تنخواہوں پر کام کرنے والے نوجوانوں میں بھی نہیں۔ سیدھا جواب ملتا ہے۔ کیا کریں وقت ہی نہیں ملتا۔ کتاب سے محبت پیدا کرنے کے لئے بک فاؤنڈیشن بھی بہت کام کر رہی ہے۔ مگر جب لاہور جاتے ہوئے، بس اسٹیشن پر اتر کر چائے پیتے ہوئے، کتابوں کی جانب جاتی ہوں تو سنجیدہ فکشن یا ناول کم ہی نظر آتے ہیں۔ وظیفوں اور اسلامی تاریخ کی کتابیں زیادہ نظر آتی ہیں۔ اس طرح مسٹر بکس اور سعید بک بنک میں بھی ہدایت نامہ شوہر قسم کی کتابیں اولین صف میں دکھائی دیتی ہیں۔ یوگا اور کھانا پکانے کی ترکیبوں والی کتابیں بہت فروخت ہوتی ہیں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سنجیدہ کتابیں کیسے پڑھی جائیں اور کون پڑھائے۔ ہم جب کالج میں تھے تو ہمارے استاد، نئی کتاب پڑھنے کے بارے میں پوچھتے تھے۔ جن لوگوں نے نہیں پڑھی ہوتی تھی تو ان کو کتاب دی جاتی اور اس پر باقاعدہ بحث ہوتی۔ اس کا باقاعدہ ایک گھنٹہ مقرر ہوتا تھا۔ اب تو بچوں اور استادوں کو صرف کورس پڑھانے کی ذمہ داری سمجھی جاتی ہے۔ یوں استاد بھی خوش اور شاگرد بھی۔

گورنمنٹ کالج لاہور میں اقبال سوسائٹی، انگلش سوسائٹی کی طرح ینگ سیکرز یونین الگ ہوتی تھیں۔ کنیرڈ کالج میں بھی سالانہ ڈرامہ ہوتا تھا۔ باقاعدہ یو۔این۔او کے سیشن منعقد کئے جاتے ہیں جس میں سب ملکوں کے نمائندے بن کر ہم لوگ بحث کرتے۔ استاد ہمارے ایسے سیشن کے لئے بھی نمبر دیتے تھے۔ علاوہ ازیں سالانہ مشاعرہ، ایکٹینشن لیکچر کے لئے باقاعدہ باہر سے ماہرین بلائے جاتے تھے۔ اب تو نہ چاک گریبان والے نظر آتے ہیں اور نہ وہ مجنوں جو کوئلوں سے دیواروں پر شعر لکھتے تھے۔ اب تو فیس بک پر بے ہودہ زبان اور کم عقلی کا مظاہرہ، سیاست اور

مذہب کے حوالے سے کیا جاتا ہے۔ہمیں کسی موضوع کی وضاحت چاہیے تو گوگلز اور یوٹیوب پر تلاش کرتے ہیں۔آج کل کے نوجوان یوٹیوب پر فلمیں دیکھتے ہیں۔ بزرگ اور جوان عورتوں کو پہلے تو پوچھ لیتے تھے۔آپ کے پاس وقت ہے، میں آپ سے دوستی کرنا چاہتا ہوں۔اب تو شتر بے مہار کی طرح لڑکیاں اورلڑکے دوستی کے اس غار میں گر جاتے ہیں، جہاں سے واپسی صرف کتاب دے سکتی ہے!

مسٹر بکس کا یوسف بھائی

روف کلاسرا

زندگی میں کتنی ہی ایسی خبریں آپ تک پہنچتی ہوں گی، جنہیں سن کر آپ کا دل چاہتا ہوگا کہ کاش یہ سب جھوٹ ہو، جیسے میرے اپنے دو بھائیوں یوسف بھائی اور نعیم بھائی کے انتقال کی خبر، یا پھر ڈاکٹر ظفر الطاف اور اب مسٹر بکس کے یوسف بھائی کی خبر۔ گاؤں سے عید کے بعد واپسی کے سفر میں ملنے والے ایک موبائل ٹیکسٹ کو پڑھ کر بے اختیار دل چاہا کہ کاش یہ سب کچھ جھوٹ ہو۔ میسج ملا کہ یوسف بھائی کا انتقال ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر ظفر الطاف کے انتقال کے بعد اسلام آباد پہلے ہی خالی خالی لگتا ہے۔ اب ایک اور خوبصورت انسان کی موت نے مزید دکھی کر دیا ہے۔

ابھی اگلے روز ہی سعدیہ نذیر اور محمد شہزاد گھر آئے تو کافی دیر ان سے گپ شپ ہوتی رہی۔ اگلے دن سعدیہ نے کہا: شہزاد کا کہنا ہے کہ لگتا ہے رؤف زندگی کو انجوائے نہیں کر رہا، پیسے کمانے کی مشین بن گیا ہے۔ میں چپ رہا۔ اصرار کیا گیا تو محض یہ بولا: دراصل زندگی میں اچانک کوئی تبدیلی ہو جائے، یا کوئی بندہ آپ کی زندگی سے غائب ہو جائے تو آپ کو زندگی بور لگنے لگتی ہے۔ پہلے نعیم بھائی اچانک گئے، تو اس کے بعد ڈاکٹر ظفر الطاف، جن کے ساتھ اٹھارہ برس تک گزاری ہوئی خوبصورت دوپہروں کا اثر ابھی تک زائل نہیں ہوا۔ اب سب دوپہریں ان کے بغیر بور لگتی ہیں۔ اب تو نئے دوست بنانے کو دل نہیں کرتا۔ ہم جیسے لوگ بڑی جلدی دل لگا بیٹھتے ہیں اور پھر نسٹیلجیا تنگ کرتا ہے۔

بیس برس قبل اسلام آباد آنے سے پہلے ہی میرا تعارف مسٹر بکس سے ہو چکا تھا۔ برسوں قبل جب لاہور میں میں نے اپنے خالو میجر نواز ملک کے گھر ان کا ایک انگریزی ناول چرایا تو اس پر مسٹر بکس کی مہر لگی دیکھی تھی۔ میجر صاحب اسلام آباد آتے رہتے تھے تو اس بک سٹور سے مرضی کے ناول خرید کر لے جاتے تھے۔ میں اکثر ان کے لاہور گھر میں پڑے ناول اٹھا کر لے جاتا تھا، اور کالج ہوسٹل میں رات گئے تک پڑھتا رہتا تھا، تاہم اتنی چالاکی ضرور کرتا کہ پہلے چیک کر لیتا، انہوں نے پڑھ لیا ہے یا نہیں، یا پھر زیادہ سے زیادہ خالہ سے پوچھ لیتا تو وہ بھی یہی کہتیں لے جاؤ، نواز نے نہیں پڑھا تو بھی نیا خرید لے گا۔ لیکن مجھے علم تھا مسئلہ نیا ناول خریدنے کا نہیں۔ اگر

آپ ناول پڑھ رہے ہیں تو وہ سارا دن دفتر یا کام پر بھی آپ کے ذہن پر سوار رہتا ہے اور آپ گھر پہنچ کر اسے وہیں سے پڑھنا چاہتے ہیں' جہاں رات کو چھوڑا تھا اور اگر وہ ناول آپ کو نہ ملے تو جو کوفت ہوتی ہے اس کا میں اندازہ کر سکتا تھا' لہٰذا کبھی وہ ناول نہ اٹھایا' جو ابھی وہ پڑھ رہے ہوتے تھے۔

جب اسلام آباد پہنچا تو کچھ دن بعد یہ سوچا کہ ڈھونڈا جائے' مسٹر بکس کہاں ہے۔ سپر مارکیٹ میں دور سے ہی دکان نظر آئی تو ایسے لگا جیسے کسی پرانے دوست سے ملاقات ہو رہی ہو۔ میں فکشن زیادہ پسند کرتا ہوں۔ اس کے بعد ہسٹری، سیاست اور فلاسفی کی باری لگتی ہے۔ اگر مجھے کتابوں کی دکان سے ایک کتاب خریدنے کا موقع ملے تو میں فکشن ہی لوں گا۔

یہیں یوسف بھائی سے تعلقات کا آغاز ہوا۔ میرا خیال تھا' وہ بھی عام کتب فروشوں کی طرح صرف کتاب فروخت کر کے اپنا منافع کھرا کرنے کے شوقین ہوں گے؛ لیکن دھیرے دھیرے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ کتاب دوست انسان ہیں۔ ان کا کاروبار اپنی جگہ ہوگا' لیکن انہیں اس کام سے محبت بھی ہے۔ اچھی کتابیں ڈھونڈ کر رکھتے۔ نئی دکان بنائی تو بتایا کہ وہ چاہتے ہیں' دکان کے اوپر ایک ایسا کارنر ہو جہاں کافی ملے اور کوئی بھی بیٹھ کر کتاب پڑھ سکے۔ یقیناً یہ وہ جدید انداز تھا' جو آپ کو امریکہ اور لندن میں تو نظر آتا' لیکن پاکستان میں اس وقت یہ کلچر عام نہیں ہوا تھا۔ ایک دفعہ سعید بکس کے مالک احمد سے پوچھا: آپ کیوں کیفے ٹائپ چیز شروع نہیں کرتے' جہاں بیٹھ کر کتاب کے ساتھ ساتھ کافی بھی انجوائے کی جائے' دوستوں کے ساتھ کوئی دوپہر یہاں گزاری جائے۔ احمد بولے: شروع کیا تھا' لیکن بند کرنا پڑا کیونکہ کتابیں پڑھنے والے کم اور گپ شپ کرنے والے زیادہ آتے تھے' جنہیں تنہائی درکار ہوتی تھی۔ میں چپ ہو گیا۔

یوسف بھائی نے جب نئی دکان بنائی تو وہ کیفے نہ بنا سکے' لیکن اپنا ایک خوبصورت دفتر ضرور بنا لیا' جہاں میرے جیسے جہاں گرد کے لیے اچھی سے اچھی کافی، چائے اور ڈرائی فروٹ' ملتے۔ اچھی کتابیں میز پر پڑی ہوتیں۔ میری للچائی ہوئی نظروں کو دیکھتے تو اٹھا کر دے دیتے کہ لے جائیں۔ میں کہتا: ایسے نہیں لوں گا' ایاز کو کاؤنٹر پر کہہ دیں' کچھ رعایت کر دے گا۔ اور پھر انہوں نے ایاز کو کہہ دیا کہ انہیں ہمیشہ رعایت کیا کریں۔ میں اکیلا نہیں تھا' جس کے ساتھ وہ اس وجہ سے پیار' اور عزت کرتے تھے' پورا اسلام آباد ان کا دیوانہ تھا۔ کالم نگار دوستوں اظہار الحق، آصف محمود، پروفیسر طاہر ملک کی ان پر دل سے لکھی گئی تحریریں اس بات کی گواہ ہیں کہ کس طبیعت کے انسان تھے اور ان کے نزدیک کتاب پڑھنے والوں کی کیا اہمیت تھی۔

ایک دن میں نے کہا: مجھے امریکی صدر نکسن کی کتاب لیڈر نہیں مل رہی' جارجیا سے

اعجاز بھائی نے بھیجی تھی، لیکن وہ کوئی اٹھا کر لے گیا ہے۔ وعدہ کر لیا کہ وہ بہت جلد منگوا دیں گے۔ کچھ عرصہ گزر گیا اور یاد دلایا تو بولے: چلیں کل آپ آئیں کچھ کرتے ہیں۔ میں حیران ہو کر چلا آیا کہ اگر ابھی تک انہیں کہیں سے نہیں ملی، تو اب اچانک کہاں سے جادوگر کی طرح ٹوپی سے نکال کر پیش کر دیں گے۔ اگلے دن گیا' تو میرے ہاتھ میں کتاب تھما دی۔ میں نے قیمت پوچھی تو ہنس پڑے اور بتایا کہ یہ ان کی لائبریری میں برسوں سے موجود تھی۔ یہ انیس سو بیاسی کا پیپر بیک ایڈیشن تھا۔ انہوں نے کہا: اب یہ کتاب آپ کی ہوئی۔ ہاتھ سے لکھ کر دیا۔ میں نے کہا: آپ کی تصویر لے لوں۔ وہ مسکرا کر سنبھلے اور بولے: ہاں اب لیں۔ میں نے فون کے کیمرے سے کلک کیا۔ ابھی تک وہ تصویر میرے پاس محفوظ ہے۔ کئی دفعہ کہا: آپ کی گھر پر لائبریری دیکھنی ہے' اور وہاں سے کتابیں چرانی ہیں۔ بولتے: جو کتاب آپ کا جی چاہے' لے جایئے گا۔ کبھی فون آ جاتا کہ جناب سردیاں آ گئی ہیں، ڈرائی فروٹ آ گیا ہے' آ جائیں' اچھی سی چائے پیتے ہیں۔ پھر طویل گپ شپ ہوتی۔ ایک خوبصورت انسان کی خوبصورت کمپنی۔ ذاتی طور پر ان کی صحت اچھی نہ رہی۔ رہی سہی کسر کسی ظالم نے اس وقت پوری کر دی' جب انہیں اغوا کر کے تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ وہیں سے ان کی حالت بگڑی کہ شوگر کی دوائیں نہ ملیں اور پھر کچھ عرصے بعد ان کی ٹانگوں کو کاٹنا پڑا۔ وہیل چیئر پر آ گئے' لیکن مجال ہے کہ میں نے کبھی ان کے چہرے پر غم دیکھا ہو۔ کبھی دکھ کی پرچھائیں دیکھی ہو۔ ہر وقت ہنستے مسکراتے رہتے تھے۔ اگر کسی کو ذاتی دکھوں کو ہنس کر سہتے دیکھا تو ڈاکٹر ظفر الطاف کے بعد وہ دوسرے انسان تھے۔ اکثر یہ کہہ کر دکھی ہو جاتے کہ ان کے بچوں کو کتابوں کے اس کاروبار میں دلچسپی نہیں ہے۔ میں ہنس کر کہتا: یوسف بھائی آپ کو پتہ ہے' میرا ریٹائرمنٹ پلان کیا ہے؟ میرے بچوں نے ایک دن بیٹھ کر بنایا تھا۔ دونوں بچوں کا کہنا تھا: بابا کو ریٹائرمنٹ کے بعد کتابوں کی دکان کھولنی چاہیے۔ ان کا دل وہیں لگا رہے گا۔ میں نے یوسف بھائی سے کہا: میرے ریٹائر ہونے کا انتظار کریں۔ اکٹھے دکان چلائیں گے۔ ہنس کر بولے: لیکن میں نے تو سنا ہے صحافی کبھی ریٹائر نہیں ہوتے۔

ہمارے خوبصورت دل اور دماغ کے مالک یوسف بھائی خود ریٹائر ہو کر قبر میں جا لیٹے ہیں۔ وہ اسلام آباد کو ایک اور اچھے انسان سے محروم کر ہی گئے' لیکن جاتے جاتے میرا ریٹائرمنٹ پلان بھی اپنے ساتھ لے گئے ہیں۔

ایک کتاب دوست کی موت

قاسم یعقوب

بظاہر انسان کے دو چہرے ہوتے ہیں۔ایک خارجی اور ایک داخلی ــــــ عموماً یہ سمجھا جاتا ہے کہ داخلی چہرہ انسان کا وہ روپ ہوتا ہے جو وہ اپنے سامنے عیاں رکھتا ہے جسے وہ خود سے نہیں چھپا سکتا۔ جب کہ خارجی چہرہ اُس کا ظاہر ہے جو ہر کوئی دیکھ رہا ہے۔ جو اُس کے اعمال کا عکس ہے، جو اُس کے ماضی و حال کو سمیٹ لینے کی قدرت رکھتا ہے۔انسان کے یہ داخلی اور خارجی حصوں کی لکیریں انسان کو محدود سمجھنے کا عمل ہیں۔اصل میں انسان کے یہ روپ اُس کی ہیئت کو تقسیم کرنے تک محدود ہیں ورنہ انسان کے کئی چہرے اور کئی روپ ہیں۔انسان کے''داخل''میں دخل دیتے ہی اُس کا''داخل''کئی حصوں میں تقسیم نظر آنے لگتا ہے۔اُس کی داخلی زندگی بھی کسی ایک چہرے سے منعکس نہیں۔ظاہری چہرہ تو سراسر دھوکا ہوتا ہے۔ انسان اپنی فطرت کی بساط پر جو بازی لڑنے نکلتا ہے اُسے فطرت ہی سمجھ سکتی ہے۔ بابا بلّے کا کہنا 'میں کی جاناں بُلیا ــــ میں کون' انسان کے لامحدود تصور کو عیاں کر رہا ہے۔

عابد ایوب بھی ایک انسان تھا جو عام مشاہدے میں دو چہروں میں تقسیم نظر آتا تھا۔ایک تو اُس کا وہ چہرہ تھا جو کالج کی عمارت میں موجِ بے تاب کی طرح گھومتا نظر آتا۔ایک اُس کا دوسرا چہرہ تھا جو کالج کی ہنگام پرور زندگی کے بعد اُس کے چہرے پر ماسک کی طرح چمٹ جاتا۔مگر وہ تو ایک ہی چہرہ لیے ہمارے سامنے آیا۔ظاہری چہرہ ــــــ جو سب کو نظر آ رہا ہوتا تھا جس کے پیچھے 'داخل' کے لاتعداد چہرے چھپے ہوتے ،جن تک رسائی کسی کے بس کا کھیل نہیں۔ جو ایک گورکھ دھندا ہے۔جس کی کھوج میں نکلنے والا اپنا پتا بھی بھول جاتا ہے۔

عابد ایوب ایک سرکاری کالج میں بہت معمولی نوعیت کا ملازم تھا۔نجانے وہ خوش بخت تھا کہ بدقسمت ــــــ کہ وہ اسی کالج سے اپنی ابتدائی تعلیم بھی حاصل کر چکا تھا۔اُس کے حالات ایسے نہ تھے کہ وہ بہت اعلیٰ تعلیم حاصل کرتا۔ چناں چہ کالج میں خدمت گار کے طور پر تعینات ہو گیا۔ عموماً کسی طالب علم کے لیے اپنے ہی تعلیمی ادارے میں بہت معمولی نوکری پر کام کرنا معیوب ہوتا ہے مگر عابد نہایت خصوع خشوع کے ساتھ کالج کی خدمت کو اپنی خوش قسمتی تصور کیا کرتا۔اصل میں وہ اپنی دُھن میں جتا رہتا تھا ایسے لگتا تھا کہ اُسے بہت جلدی ہے اور وہ تمام کام جلدی جلدی کرنا

چاہتا ہے۔

عابد ایوب مختلف ذمہ داریوں کے بعد بالآخر کالج کی لائبریری میں تعینات کر دیا گیا۔ کتابوں کے ساتھ رہنا بذاتِ خود ایک زندہ عمل ہے۔ وہ اب ان معنوں میں خوش قسمت تھا کہ ایک طالب علم کے ناتے وہ اپنے ساتھ کتابوں کی زندہ صحبت رکھنے لگا تھا۔ میرا بھی کتابوں سے اتنا ہی تعلق ہے جس طرح ایک کتاب کا اپنی ساتھی کتاب سے ہوتا ہے۔ میں کالج میں آتے ہی سب سے پہلا کام یہ کرتا ہوں کہ سیدھا لائبریری میں چلا جاتا ہوں اور اخبارات کا مطالعہ کرتا ہوں اور پھر گاہے گاہے دن میں کئی دفعہ لائبریری میں آتا ہوں اور کتابوں کے پاس بیٹھ کر ورق گردانی کرتا رہتا ہوں۔ اس لیے میرا عابد ایوب سے دن میں کئی دفعہ سامنا رہتا۔ میں نہ چاہتے ہوئے بھی اُس کی موجودگی کو اپنے مطالعے کا حصہ بنائے رکھتا۔ لائبریری کے انچارج یاسر اقبال بھی عابد کو روزانہ کی بنیاد پر کوئی ذمہ داری دیتے رہتے اور وہ نہایت جذباتی انداز سے سرانجام دیتا۔ ایک دن میں اپنی کلاس سے فارغ ہو کے لائبریری آیا تو دیکھا کہ یاسر اقبال بہت سخت لہجے میں عابد سے محوِ گفتگو تھے۔ میں نے مخل ہونا مناسب نہ سمجھا اور خاموشی سے کتاب پڑھنے لگا۔ یاسر اقبال اُسے طالب علم کے ساتھ غیر مناسب رویہ اختیار کرنے پر جھڑک رہے تھے اور وہ نہایت ادب سے یہ سب برداشت کر رہا تھا۔ جب یاسر خاموش ہو کے بیٹھ گئے تو وہ آہستہ سے میرے پاس آیا اور میرے سامنے اپنا مقدمہ ایسے کھول کے رکھنے لگا جیسے کسی فیصلے سے زیادہ اپنے دکھ کا اظہار کرنا چاہ رہا ہو، اپنے دکھوں کو راستہ دے رہا ہو۔

مجھے کہنا لگا:

''میں نے ایک طالب علم کو کتاب کی جلد پھٹ جانے پر ڈانٹا تھا اور اسے کہا تھا کہ آئندہ کتاب نہیں ملے گی، سر یاسر نے تو صرف اتنا سنا کہ تم نے طالب علم کو کتاب سے کیوں منع کیا، حالاں کہ میں اُسے صرف سکھا رہا تھا کہ کتاب کو یوں پھاڑتے نہیں۔''

میں نے کہا

تم یہ بات سر یاسر کو بتا دیتے۔ وہ آگے سے کہنے لگا

''اگر میں یہ بات طالب علم کے سامنے کہہ دیتا تو میری ساری محنت ضائع ہو جاتی اور وہ طالب علم دوہرا بُرا اثر لیتا۔''

میں نے کہا

''خدا کے بندے تم نے اپنی بے عزتی کروانا مناسب سمجھا مگر بتایا نہیں۔ آفریں ہے تم نے کتاب کی حفاظت اور بچے کی تربیت کو اولیت دی۔''

وہ ان معاملوں میں ایک بہت اچھا استاد بھی تھا۔ کالج لائبریری میں بیٹھے ہوئے میں اکثر اُس کی حرکات کا مشاہدہ کرتا رہتا۔ وہ کم گو تھا اور اپنی دُھن میں رہتا تھا، فارغ وقت میں اُس کا ایک ہی کام تھا ــــــ کتاب کا مطالعہ۔ اُسے دُھن تھی کہ میں بھی کوئی بڑی شخصیت بن جاؤں۔ وہ اکثر کالج کے انتظامی معاملات پر بات کرتا اور کہتا کہ اگر میں ادارے کا سربراہ ہوتا تو ایسے کرتا، ویسے کرتا۔ وہ چوں کہ اسی کالج کا طالب علم بھی تھا لہٰذا کالج کے در و دیوار سے بہت محبت کرتا اور اساتذہ کا بہت احترام کرتا۔

عابد مختلف طرح کی ذمہ داریاں ادا کرتا ہُوا بالآخر لائبریری میں آ گیا۔ اب اُس کا کام کتابوں کی دیکھ بھال تھا۔ وہ کالج کے طلبا کو صرف کتابیں ہی ایشو نہیں کرتا بلکہ انھیں کتاب کلچر سے آشنائی بھی سکھاتا۔ میں نے اکثر اُس کو مشاہدہ کیا کہ وہ کس طرح کتابیں ایشو کرتا اور اُن کی اہمیت کے متعلق طلبا کی رہنمائی کرتا تھا۔ بعض اوقات جو کتاب طالب علم واپس کرتا اُس کی حفاظت اور اُس کے صوری حسن پر لیکچر بھی دیتا۔ لائبریری میں بہت کم اساتذہ کتابوں سے استفادہ کرتے نظر آتے ہیں۔ بلکہ اگر میں یہ کہوں کہ اساتذہ کا لائبریری سے کیا کام تو میری بات زیادہ واضح ہو جائے گی۔ عابد کی یہ عادت تھی کہ وہ میری موجودگی کا فائدہ اُٹھا کے کچھ دیر کے لیے اپنی بیماری کی مشقت سے نجات کے لیے نکل جاتا۔ مگر وہ جاتے ہوئے بھی پوری طرح تصدیق کر کے جاتا کہ ''آپ یہیں ہیں ناں! ــــــ مبادا کوئی طالب علم آئے تو اُسے میری غیر موجودگی میں مایوسی ہو۔'' کالج کے ایک پروفیسر عبدالمالک صاحب نے بھی اُسے بہت قریب سے مشاہدہ کر رکھا تھا۔ ایک دن میں نے مالک صاحب سے عابد کی لائبریری مشاہدات کے متعلق پوچھا تو وہ کہنے لگے ''عابد کی ایک بات سے میں بہت متاثر تھا، وہ طالب علموں کو نظم و ضبط کا پابند رہنے کا کہتا رہتا۔ اُس کے اندر ایک بااصول انسان تھا۔ کتاب سے اُسے بے پناہ محبت تھی۔ ایک دن مجھے کوئی کتاب نہیں مل رہی تھی تو میں نے عابد سے شیلف کی رہنمائی چاہی۔ وہ عین اُسی مقام پر مجھے لے گیا۔ مگر مجھے میرے مطابق کتاب نہ ملی۔ جب میں نے مایوسی کا اظہار کیا تو کہنے لگا۔ اگر آپ انتظار کر سکیں تو اس ٹاپک پر ایک کتاب میرے گھر میں بھی موجود ہے۔ میں آپ کو کل لا دوں گا۔ مگر افسوس اگلے دن وہ کالج ہی نہ آ سکا''۔

عابد کی کتاب دوستی کا یہ حال تھا کہ وہ فارغ وقت میں لائبریری میں بیٹھ کر پھٹی کتابوں کو مرمت کرتا رہتا۔ اُن کی جلدوں کو خوبصورت بناتا رہتا۔

عابد جب اس لائبریری میں آیا تو وہ صرف میٹرک پاس تھا۔ اُس نے اسی لائبریری میں بیٹھ کر بی ایس ایل کر لیا۔ اب وہ ایم ایس ایل کر رہا تھا۔ چند سال پہلے اُسے بائیو لیب میں بھیج

دیا گیا کہ وہ وہاں لیبارٹری کے متعلق اُمور کے فرائض انجام دے گا۔ اس لیب کے انچارج فیاض ندیم تھے۔ فیاض ندیم نے اُسے لیبارٹری اور سائنس کی خود کارانہ تعلیم کا بہت درس دیا مگر وہ اپنے آپ کو مس فٹ کہتا رہا۔ بالآخر فیاض صاحب نے اُسے لائبریری میں واپس بھجوا دیا۔

ایک دن میں حسبِ معمول مطالعہ کر رہا تھا کہ وہ میرے پاس آ کر کہنے لگا

''سر____ اگر آپ میری ہیلپ کریں تو میں کتابوں کی دنیا بدل سکتا ہوں''

میں حیران ہو کر اُس کا چہرہ دیکھنے لگا۔ میں نے پوچھا بھائی وہ کیسے _____ کہنے لگا:

''اگر مجھے کمپیوٹر مل جائے تو میرے پاس ایک سافٹ ویئر ہے۔ میرے ایک دوست نے دیا ہے۔ میں تمام کتابوں کی ڈیٹا انٹری کر دوں اور نئی کتابوں کو بھی کمپیوٹر میں اِین لسٹ کر دوں گا۔''

میں نے پرنسپل سے بات کرنے کا وعدہ کیا اور پھر بھول گیا۔ مجھے اندازہ تھا کہ وہ جس سماج کا حصہ ہے وہ تو خود مسائل کے جنگل میں راستہ ڈھونڈ رہا ہے۔ یہاں تو انور مسعود کے بقول ہر شخص برف کے باٹ لیے دھوپ میں بیٹھا ہے اور ناپ تول کا کاروبار کر رہا ہے۔ مجھے اُس کی وہ بات بھی یاد ہے جب اُس نے مجھے لائبریری کی ایک کھڑکی ٹوٹنے کی وجہ سے گرد و غبار کی ایک دبیز تہہ کتابوں پر جمی دکھائی۔ وہ مجھے گرد اپنی پوروں پر مل کے دکھا رہا تھا اور میں کچھ اور سوچ رہا تھا:

''ان کتابوں پر یہ گرد نہیں بلکہ تاریکی کا راج ہے، جسے میاں عابد_____ تم اور میں مل کے بھی نہیں شکست نہیں دے سکتے۔ یہ تو روشنی _____ (نئے جذبوں کی روشنی) سے ہار مانے گا، اُترے گا اور مٹے گا _____ ہاں تم ان بچوں کے ذریعے ہی یہ کام کروا سکتے ہو، میں کچھ نہیں کر سکتا اور نہ ہی یہ نام نہاد سماج _____''

عابد کا معمول تھا (یا شاید عادت یا ڈیوٹی، ویسے یہ بھی عجیب بات ہے کہ وہ اپنی ڈیوٹی بھی خود ہی متعین کرتا تھا) کہ وہ صبح سویرے کالج میں داخل ہوتے ہی لائبریری کھولتا اور سیدھا اخبارات لینے چلا جاتا۔ نئے اخبار مرکزی دفتر میں آتے، وہ انھیں وہاں سے وصول کرتا اور سیدھا لائبریری میں لے آتا۔ اُن اخبارات کو سٹیمپ کرتا اور پھر ہر دفتر میں اُن کو دینے چلا جاتا۔ وہاں پر پڑے گذشتہ کل کے اخبارات جمع کرتا پھر لائبریری میں لا کے اُن کی حوالہ جاتی تقسیم کرتا۔ اُس کو ہر اخبار کا تاریخی ریکارڈ زبانی یاد تھا۔ کوئی کبھی کسی پرانے اخبار کا پوچھ لیتا تو وہ دو، چار منٹ میں نکال لاتا۔ میں روزانہ صبح اُسی کے ساتھ لائبریری میں داخل ہوتا اور پھر تقریباً تمام اخبارات کا مطالعہ کر لیتا۔ وہ اس دوران اخبارات کو سٹیمپ کرتا اور اُن پر حوالہ جاتی نمبرز ڈالتا جاتا۔ میں اُس کے کام کو نہایت باریک بینی سے مشاہدہ کرتا رہتا۔ وہ اس دوران میری موجودگی سے بعض اوقات خلل محسوس

کرتا اور کئی دفعہ وہ میری ساتھ کسی سیاسی مسئلہ یا اپنے ذاتی مسئلہ کی گفتگو چھیڑ لیتا۔ مگر ہر دو صورت میں وہ اپنے کام میں مشغول ہی نظر آتا۔

ایک دن میں نے اُس سے پوچھا کہ تم گھر جا کر کیا کرتے ہو کیا تم کتاب کا مطالعہ بھی کرتے ہو یا گھر کے کام کاج میں مصروف رہتے ہو؟ وہ میری باتوں پر خاموش رہا پھر اچانک بولا

''میرا نانا مجھ سے بہت پیار کرتا ہے۔ میں اکثر کالج سے سیدھا اُن کے گھر چلا جاتا ہوں اور پھر ملکی حالات پر گفتگو کرتا ہوں''

میں نے کہا

''تم ملکی حالات پر اتنے پریشان کیوں ہو۔''

وہ کہنے لگا ''میرا ایک بیٹا بھی ہے ناں، وہ ایک سال کا ہو گیا ہے''

میں نے کہا ''یہ کیا جواب ہُوا______''

میں سمجھ تو گیا تھا بلکہ بہت کچھ سمجھ گیا تھا۔ اُس کے جواب کے بعد میں خاموش ہو گیا۔ یہ تو مجھے اُس کے چھوٹے بھائی نے جو اسی کالج میں ہی ملازم ہے، بتایا کہ ''وہ میرے ماموں کے مدرسے میں سائنس کی ٹیوشن بھی پڑھایا کرتا تھا'' اب میں سوچتا ہوں کہ وہ مجھے اپنی اس مصروفیت کا بتا کے ایک روایتی سوچ کا اظہار کر سکتا تھا مگر اُسے اپنے بیٹے کے تناظر میں نجانے کیا کیا یاد آتا تھا۔ جسے وہ سوچتا رہتا اور میرے سوال کے جواب میں اُس نے یہی بتانا مناسب سمجھا۔

وقت تیزی سے گزر رہا تھا وہ اپنی بیماری کے ہاتھوں روز بہ روز کمزور ہوتا جا رہا تھا۔ اُسے مرگی (Epilepsy) کا اذیت ناک مرض تھا۔ اُسے اکثر چکر آتے اور وہ کالج کی درو دیوار سے لپٹتا اور دوڑتا نظر آتا۔ کالج کا بے حس منظر نامہ اُسے ایک کردار کے طور پر دیکھتا اور سٹیج پر نئے کرداروں کے طلوع ہوتے ہی اُسے بھول جاتا۔ جس طرح کسی بازار کی رونق رات کے وقت مر جاتی ہے اور نئے دن کی نئی رونق کے ساتھ وقت کی مٹی سے اُگ آتی ہے۔

یاسر اقبال لائبریری انچارج کے طور پر اُس کے ساتھ نہایت نرمی برتتے۔ وہ اکثر کالج ٹائم میں اُسے ہسپتالوں کے تعفن زدہ ماحول کا حصہ بننے کی اجازت دے دیتے جہاں وہ اپنی زندگی کے وجودی کرب میں چیخنے کی آزادی حاصل کر لیتا۔ جب وہ واپس آتا تو اُس کے ہاتھ میں ایک میلے سے لفافے میں بدبودار دواؤں کے پیکٹ ہوتے، جسے اُس نے شفا کے نام پر اپنی خون پسینے کی کمائی کی ریز گاری سے خریدا ہوتا تھا۔ دوا اُس کے بدن میں اُتر رہی تھی مگر شفا اُس کے حلق سے نیچے جانے سے انکاری تھی۔ البتہ اُس کی آنکھیں کتابوں اور طالب علموں پر ہوتیں۔ مہربان اور محبت آشنائی کے گہرے جذبات کے ساتھ______ وہ طالب علموں کو چلنے کے آداب،

سلام کہنے اور شکریہ ادا کرنے کی رسموں تک سے آگاہ کرتا مگر زندگی کی شاخ پر اُگے اُس کے وجود کو کچھ چیلیں نوچ رہی تھیں جن کو فطرت کے مقابل کسی قسم کا ڈسپلن عطا کرنے سے وہ معذور تھا۔

کالج کے ایک طالب علم زوہیب کیانی نے مجھے بتایا کہ ایک دن وہ کلاس میں آکر کہنے لگا:

''نماز پڑھا کرو۔''

زوہیب نے کہا ''اگر خالی خولی نماز پڑھنی ہے تو بہتر ہے کہ نہ پڑھی جائے۔''

عابد تیقن کی دولت سے مٹھی بھر کے بولا:

''نہیں، میں تمھیں ایک طریقہ بتاتا ہوں، تم اذان کو غور سے سنا کرو، اور اذان کے الفاظ کا جواب دیا کرو، جب اذان ختم ہو جائے تم دیکھنا، تم خالی خولی نماز نہیں پڑھو گے۔ دل اور ذہن کے صفحوں پر بنی دنیا زاد تصویریں، تمھارے سجدوں کے ساتھ زمین پر سجدہ ریز ہوں گی، تم اذان کے پاک لفظوں کے ساتھ پاک ہو جاؤ گے۔''

ایک دن مجھے اپنے طالب علموں کو دکھانے کے لیے کچھ ڈکشنریز کی ضرورت پڑی تو میں نے یاسر اقبال انچارج لائبریری سے کہا کہ ''مجھے یک مشت چند ڈکشنریز ایشو کر دی جائیں۔'' وہ کہنے لگے ''ہم ایسا کرتے تو نہیں، کیوں کہ یہ ریفرینس بُکس ہیں مگر آپ کل ہر صورت واپس لے آیئے گا۔'' جب میں ڈکشنریز لے کے جا رہا تھا تو عابد نے مجھے نہایت سخت نظروں سے گھورا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ اُس کی آنکھیں کیا کہہ رہی ہیں مگر میں چپکے سے نکل آیا۔ یہ میری اُس سے آخری ملاقات تھی اور وہ اُسی شام وفات پا گیا۔ جب میں نے اُس کی وفات کی خبر سنی تو میں نم ناک اور غم زدہ تو تھا ہی ____ ساتھ ہی شرمندہ بھی تھا جیسے وہ مجھے کہہ رہا ہو:

''زندگی میں سلیقہ اور ترتیب اپنے اندر سے شروع ہوتا ہے۔ میں آپ سے ناراض ہوں میں تو آپ سے نظمِ نو کی توقع کرتا رہا''۔

میں یہ لائنز لکھتے ہوئے شدید دکھ کا شکار ہوں کہ'' کاش اُسے میں بتا سکتا کہ میں نے ایسا غلط کیوں کیا اور اس اُمید کا طالب ہوں کہ کاش وہ مجھے معاف کر دے''

عابد کی زندگی ایک چراغ کی لَو کی طرح تھی جو اپنے فتیلے کی قید سے زیادہ اُن ہواؤں کے سہارے پر تھی جس نے اُسے بجھانے کی ٹھان رکھی تھی۔ وہ ساری زندگی اپنی حیات کی ٹمٹماتی لَو کو ہاتھوں کے گنبد میں چھپاتا رہا اور ناسازگار ہواؤں سے بچاتا رہا۔

ابھی کل ہی کی بات ہے میں اُسی معمول کے مطابق لائبریری میں داخل ہُوا۔ اب اُس کی جگہ کوئی اور اخبارات کو سٹیمپ کر رہا تھا۔ کتابیں اُسی طرح اپنی جگہ پڑی تھیں۔ پرانے اخبارات

کا سٹاک اُسی ترتیب سے رکھا ہُوا تھا۔ یاسر اقبال صاحب اُس کے چھوٹے بھائی سے محوِ گفتگو تھے اور بتا رہے تھے:

یہ دیکھو؛ عابد کی کچھ چیزیں ______

یہ اُس کی کتابیں اور کچھ صفحے؛ اسی طرح پڑے ہیں ______

یہ وہ کارڈز ہیں جو وہ ایشو کیا کرتا۔ اپنی جیب سے لایا تھا تاکہ طالب علموں کو سہولت رہے۔ جاؤ لے جاؤ اگر کسی طالب علم کو ضرورت ہوئی تو اُنھیں دے دینا ______

اور ہاں یہ دیکھو ______

یہ وہ مہر ہے جس سے وہ کارڈز ایشو کرتا ____

آہ ہ ہ ہ ____ دیکھو اس پر وہی تاریخ لکھی ہے جس دن اُس کی وفات ہوئی ______

میں ابھی یہ باتیں سن ہی رہا تھا کہ ایک طالب علم لائبریری میں داخل ہُوا اور عابد کا پوچھنے لگا:

''سر ____ عابد صاحب کہاں ہیں یہ کتاب واپس کرنی ہے ____''

میں نے بے ساختہ کہا:

''وہ ٹوٹی کھڑکی سے اندر آنے والی گرد کی تہہ سے پریشان تھا۔ کتابیں گرد آلود ہو چکیں تھیں۔ ایک بڑے صاحب کو شکایت لگانے گیا ہے۔ انشااللہ دبیز گرد کی تہہ جلد صاف ہو جائے گی مگر تب تک عابد تمھاری کتاب واپس نہیں لے گا''

دنیا کی مہنگی ترین کتاب

دنیا کی مہنگی ترین کتابوں کی فہرست میں سب سے پہلا نام ہے ''کوڈیکس لیسٹر'' کا اور یہ کتاب لیونارڈو ڈاونچی کی سائنسی تحریروں پر مشتمل ہے۔ لیونارڈو کے 30 سائنسی رسالوں میں سے کوڈیکس سب سے مشہور ہے۔ پہلی بار ایک انگریز رئیس لینڈ لارڈ ٹامس کاک نے 1719ء میں یہ نادر دستاویز خریدی۔ ٹامس کاک کو ''ارل آف لیسٹر'' کا خطاب ملا تو اسی مناسبت سے کتاب کا نام بھی کوڈیکس لیسٹر پڑ گیا۔ 11 نومبر 1994ء کو معروف سوفٹ ویئر کمپنی مائیکروسوفٹ کے مالک بل گیٹس نے نیویارک میں فائن آرٹس آکشن ہاؤس ''کرسٹیز'' سے یہ کتاب تین کروڑ آٹھ لاکھ دو ہزار پانچ سو ڈالر میں خریدی اور اس طرح کوڈیکس لیسٹر دنیا کی مہنگی ترین کتاب بن گئی۔ پاکستانی روپوں میں اس کی مالیت سوا تین ارب روپے کے لگ بھگ بنتی ہے۔

دوسری مہنگی ترین کتاب ''میگنا کارٹا'' ہے جسے ''گریٹ چارٹر آف دی لبرٹیز آف انگلینڈ'' کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ یہ دراصل اینجوین چارٹر ہے جسے جون 1215ء میں لاطینی زبان میں جاری کیا گیا۔ 1219ء میں اسے مقامی فرانسیسی زبان میں ترجمہ کیا گیا اور تیرہویں صدی میں تبدیل شدہ ورژن میں اس کا دوبارہ اجرا کیا گیا۔ 1225ء میں پہلی بار اس چارٹر کا قانون پاس ہوا۔ 1297ء کا ورژن طویل لاطینی عنوان جسے انگریزی میں ''دی گریٹ چارٹر آف لبرٹیز آف انگلینڈ، اینڈ آف دی لبرٹیز آف فاریسٹ'' کہتے ہیں، کے ساتھ اب بھی انگلینڈ اور ویلز میں قانونی کتاب کی حیثیت رکھتا ہے۔ ایڈورڈ اول کی شاہی مہر کی حامل ہاتھ سے لکھی ہوئی 1297ء کی صرف ایک کاپی نجی ہاتھوں میں ہے۔ یہ کاپی پانچ سو سال تک برو ڈنل خاندان یعنی ارلز آف کارڈیگن کے پاس رہنے کے بعد 1984ء میں پیروٹ فاؤنڈیشن کے پاس فروخت ہوئی اور فاؤنڈیشن نے 18 دسمبر 2007ء کو یہ کاپی دو کروڑ تیرہ لاکھ ڈالر میں نیلام کر دی۔ اسے کارلائل گروپ کے ڈیوڈ روبن سٹائن نے خریدا۔

اسی طرح لاطینی زبان میں لکھی ہوئی ساتویں صدی عیسوی کی پاکٹ گوسپیل بک ''سینٹ کتھ برٹ گوسپیل'' اپریل 2012ء میں ایک کروڑ تینتالیس لاکھ ڈالر میں، 1640ء میں برٹش نارتھ امریکا میں پرنٹ ہونے والی پہلی کتاب ''بے سام بک'' نومبر 2013ء میں ایک کروڑ بیالیس لاکھ ڈالر میں، کئی آرٹسٹوں کی بنائی ہوئی تصاویر سے مزین فلیمش بک آف آورز ''روتھس

چائلڈ پریئر بک'' جولائی 1999ء میں ایک کروڑ چونتیس لاکھ ڈالر میں اور 1175ء کی ''گوسپلز آف ہنری دی لائین'' کی اصلی اور اکلوتی کاپی دسمبر 1983ء میں ایک کروڑ سترہ لاکھ ڈالر میں فروخت ہوئی۔

مہنگی ترین کتابوں میں آٹھویں نویں اور دسویں نمبر پر آنے والی کتاب کا نام ''دی برڈز آف امریکا'' ہے۔ نیچرلسٹ اور پینٹر جان جیمز اوڈبان کی یہ کتاب 1827ء سے 1838ء کے دوران پہلی بار لندن سے شائع ہوئی اور یہ امریکی پرندوں کی وسیع ورائٹی کی السٹریشنز پر مشتمل ہے۔ اعداد و شمار کے مطابق اس کتاب کی صرف 119 مکمل کاپیاں باقی بچی ہیں جن میں سے تین بالترتیب دسمبر 2010ء میں ایک کروڑ پندرہ لاکھ ڈالر، 2000ء میں اٹھاسی لاکھ ڈالر اور جنوری 2012ء میں اناسی لاکھ ڈالر میں فروخت ہوئیں۔ جدید کتابوں میں ''آف اے فائر آن دی مون'' نامی کتاب کی 12 کاپیاں ایک لاکھ بارہ ہزار پانچ سو ڈالر فی کاپی کے حساب سے فروخت ہوئیں۔ یہ کتاب ''لائف'' میگزین میں قسط وار شائع ہوئی اور یہ 1969ء میں چاند پر بھیجے گئے اپالو مشن کے بارے میں نورمن میلر کے منفرد نکتہ نظر پر مشتمل اہم ڈاکومینٹری سمجھی جاتی ہے۔ ہاؤسٹن میں مشن کنٹرول اور سپیس سنٹر میں وقت گزارنے اور کیپ کینیڈی فلوریڈا سے اپنی آنکھوں سے سیٹرن وی راکٹ کی اڑان دیکھنے کے بعد میلر نے اس سفر کی روئیداد لکھنی شروع کی جو کہ اگست 1969ء سے جنوری 1970ء کے دوران تین طویل قسطوں میں ''اے فائر آن دی مون''، ''سائیکالوجی آف آسٹروناٹس'' اور ''اے ڈریم آف دی فیوچرز فیس'' کے نام سے شائع ہوئی۔ یہ کتاب اس لئے مہنگی نہیں کہ اس میں چاند پر جانے کی کہانی رقم ہے بلکہ یہ اس لئے مہنگی ہے کہ اس کتاب کو پڑھنے کے علاوہ آپ اس کے ساتھ چاند کو چھو بھی سکتے ہیں۔ 2009ء میں 40 ویں سالگرہ چاند کی تسخیر کے سال کی مناسبت سے اس کتاب کی 1969ء کاپیاں شائع کی گئی ہیں۔ ان میں سے 12 کاپیوں کے ساتھ شہابیوں کے ٹکڑے فراہم کئے گئے جو چاند سے زمین پر پہنچے ہیں۔ عام کتاب کی قیمت 1000 امریکی ڈالر رکھی گئی ہے جبکہ چاند کے ٹکڑے کے ساتھ اس کی قیمت بھی آسمان پر پہنچ گئی۔ کتاب کی ہر کاپی پر مشن مون کے ہیرو بز ایلڈرن کے دستخط ہیں اور اس کے ساتھ چاند پر کھڑے ہو کر لی گئی ان کی یادگار فریم شدہ تصویر بھی ہے جس میں ان کے وائزر میں آرمسٹرانگ کا عکس نظر آ رہا ہے۔ کتاب کی کل 1969 کاپیوں میں سے 1957 کاپیاں آن لائن فروخت کے لئے دستیاب ہوئیں جبکہ حتمی 12 کاپیوں کے لئے پبلشر ایک ویٹنگ لسٹ تیار کی۔ ماہرین نے 12 کاپیوں کے ساتھ فراہم کئے جانے والے چاند کے ٹکڑوں کی پیشہ ورانہ انداز میں جانچ پڑتال بھی کی۔

کتابوں پہ نقش ونگار کی تاریخ

مغل بادشاہوں نے بابر سے شاہجہاں تک کتابوں پر فن مصوری کی بھی اسی طرح حوصلہ افزائی کی جس طرح مخطوطات کو جلدوں کی آرائش وزیبائش اور نقش ونگار سے آراستہ کرنے کے لیے کی۔

چنانچہ جب بابر نے ہندوستان کو فتح کیا تو یہاں فن مصوری اور باتصویر مخطوطات کے فن کو بھی اپنی سرپرستی عطا کی۔ بابر نے اپنے مشہور زمانہ کتاب تزکِ بابری میں کتابوں سے بے پناہ لگاو? کا ذکر کیا ہے۔ مغلیہ دور کے مصور، جن میں بہزاد اور شاہ مظفر کے نام شامل ہیں، اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ مغل فرمانروا و?ں کو علم وحکمت اور صنعت وحرفت کے ساتھ ساتھ فنون لطیفہ سے بھی بے حد شغف تھا۔

ہمایوں اپنی جلاوطنی کے دوران ایران کے شاہ طہماسپ کے دربار کے مصوروں سے بہت متاثر تھا۔ چنانچہ واپسی پر بہت سے ہنرمندوں کو اپنے ساتھ لایا تو ان میں ماہر خطاط، جلد ساز اور مخطوطات پر خوبصورت مصوری کرنے والے اہل فن بھی شامل تھے جن کی اس نے اپنے دربار میں عزت افزائی کی۔ داستان امیر حمزہ کا مصوری مخطوطہ جو بارہ جلدوں پر مشتمل تھا، اس کی ہر جلد میں سو اوراق ہیں اور ہر ورق پر ایک تصویر ہے۔ کہتے ہیں کہ داستان امیر حمزہ کو باتصویر کرنے کے لیے پچاس مصور مقرر کیے گئے تھے۔

اکبر بادشاہ نے عبداللہ کی شاگردی میں فن مصوری کا مطالعہ کیا۔ مصوری اور کتابی تصویر سازی سے اکبر کو غیر معمولی دلچسپی تھی۔ اس کے دربار سے تقریباً سو مصور وابستہ تھے جو فتح پور سیکری میں شاندار عمارات میں فن مصوری کے نادر نمونے تخلیق کرتے رہتے تھے۔ جہانگیر نے بھی مخطوطات کو مصوری اور نقش ونگار سے سجانے کی سرپرستی کی۔ وہ خود بھی فن مصوری کا بڑا دلدادہ تھا۔ اس کی طرح شاہجہاں بھی مصوری کا بڑا شائق تھا مگر مصوری اور فن کتابت کو اتنی سرپرستی حاصل نہ ہوئی جو کہ ان کے اجداد سے حاصل ہوئی تھی۔ اورنگ زیب جو خود صوم وصلوٰۃ کا بہت پابند تھا، مصوری اور فن موسیقی سے کوئی دلچسپی نہ رکھتا تھا۔

فن مصوری مخطوطات پر ہو یا الگ کینوس پر، وہ اسلامی احکامات اور اقدار کی وجہ سے ان کو پسند نہ کرتا تھا۔ کتابت اور عمدہ خطاطی کی قدر کرتا تھا۔ مخطوطات اور کتابوں کی جلدوں کی

خوبصورتی بیل بوٹوں اور دیدہ زیب جیومیٹریکل ڈیزائن سے تیار کیے ہوئے نسخوں کو بہت پسند کرتا تھا۔ خود بھی اعلیٰ پائے کا خطاط تھا اور قرآن مجید کی خطاطی کر کے قلمی نسخوں کو خانہ کعبہ اور علمی مراکز کو روانہ کرتا تھا۔

ابتدا میں جلدوں پر آرائشی نقوش دھات کے اوزار سے بنائے جاتے تھے لیکن ان میں کوئی رنگ استعمال نہیں کیا جاتا تھا۔ پندرہویں صدی عیسوی سے سونے کے اوراق سے تزئین کا کام شروع ہوا اور اٹلی میں وینس شہر کے جلد سازوں نے اس میں خاصی مہارت حاصل کی۔ ایک خیال یہ بھی ہے کہ اٹلی میں جلد سازی سپین سے آئی۔

1530ء تک اطالوی طلائی جلدیں یورپ میں سب سے اعلیٰ تھیں۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ فرانس کے جلد ساز اطالوی جلد سازوں سے متاثر تھے اور انہی کی تقلید کرتے تھے۔ سولہویں صدی عیسوی کی اعلیٰ شاہی کتب کی جلدیں جو برطانوی شہنشاہوں اور امرا کے پاس ملتی ہیں فرانس کے جلد سازوں کی بنی ہوئی ہیں۔ برطانوی جلد سازوں نے ان نمونوں سے متاثر ہو کر اس فن کو برطانیہ میں رواج دیا۔ مختلف دھات سے بنے ہوئے اوزار ایجاد کیے جو جلد کی آرائش میں استعمال ہوئے۔ جلد سازی میں لیس یعنی کپڑے کی پٹی کا استعمال شروع کیا۔ برطانوی جلد سازوں نے جلد کی آرائش کے لیے دھاتی ٹھپوں اور پٹیوں کو بہت خوبصورتی سے استعمال کیا۔ جلد کی پشت (سپائن) کو نہایت محنت کے ساتھ تیار کیا جاتا تھا۔

اٹھارہویں صدی عیسوی کے آغاز میں موزایق جلد سازی کا رواج ہوا۔ جلدوں کی آرائش میں کتاب کے کناروں کو طلائی رنگ (Gilt Edge) دینے کا رواج ہوا۔ کتابوں کی آرائش میں ایک اور تجربہ یہ کیا گیا کہ کتابوں کے صفحات کے کناروں پر خوبصورت نقوش یا مناظر چھاپے گئے۔ کتاب کے صفحات کو تھوڑا سا موڑنے یا کھولنے پر یہ نظر آتے لیکن جب کتاب کی جلد کو بند کر دیا جاتا تو یہ مناظر کناروں کے طلائی رنگ میں چھپ جاتے۔ اسی طرح جلد کی اندرونی سطحوں کو بھی خوبصورت ڈیزائن اور کاغذ سے مزین کرنے کا رواج ہوا۔ جلد کے کناروں اور کونوں کی آرائش پر خاص توجہ دی جاتی۔ یہ تمام کام ہاتھ سے انجام دیے جاتے تھے۔

خصوصی شکریہ: (آن لائن میگزین 'پہلا صفحہ')

سب سے با اثر کتابوں کی فہرست

ادبی میگزین وسافاری کی ایک فہرست کے مطابق سلمان رشدی کے ناول 'سٹینک ورسز'، ولادیمیر نبوکو کے 'لولیتا' اور گیبریل گارشیا مارکیز کی 'ہنڈریڈ ائیرز آف سولیٹیوڈ' کو گزشتہ 25 برس میں ادب کی دنیا میں شائع ہونے والی سب سے با اثر کتابیں قرار دیا گیا ہے۔ وسافاری نے دنیا کے 25 مقبول ترین ادیبوں سے اس فہرست کے لیے بہترین کتابوں کو منتخب کرنے کی دعوت دی تھی۔ ان ادیبوں میں امت چودھری، بلیک موریسن اور اندرا سنہا شامل تھیں۔

مارکیز کی 'ہنڈریڈ ائیرز آف سولیٹیوڈ' واحد ایسی کتاب تھی جسے ایک سے زیادہ ادیب ججوں نے منتخب کیا۔ کتابوں کی فہرست وسافاری کی 25 ویں سالگرہ کے موقع پر تیار کی گئی ہے۔

ہنڈریڈ ائیر آف سولیٹیوڈ کو نائجیرین ناول نگار چیکا انگووے، گھانا کے شاعر نی پارکیس اور انڈین شاعر سجاتا بھٹ نے بہترین کتابوں کے فہرست کے لیے منتخب کیا تھا۔

انگووے کے مطابق 'مارکیز نے زندگی کی سچائی دیکھنے کے نظریے کو بدل دیا ہے'۔ انکا مزید کہنا تھا میرا ایسا ایک بھی ادیب دوست نہیں ہے جو اپنی تحریز میں مارکیز سے متاثر نہیں ہے۔

ہنڈریڈ ائیرز آف سولیٹیوڈ سے پہلے ہسپانوی زبان میں 1967 میں شائع ہوا تھا۔ یہ ناول ایک ایسے خاندان کی کہانی ہے کہ جو ایک افسانوی گاؤں میں زندگی بتانے کی کوشش کر رہا ہے۔ مارکیز اپنے لکھنے کے لیے انداز ؛میجیکل ریئلزم ; کے لیے جانے جاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ سلمان رشدی انکے اس ادبی انداز سے بے حد متاثر ہوئے اس لیے انہوں نے اپنے ناول 'مڈ نائٹ چلڈرن' میں یہی انداز اپنایا۔ مارکیز کو دنیا کے سب سے اہم ترین ادیبوں میں مانا جاتا ہے جنہوں نے اپنے سبھی افسانوں اور ناولوں میں کہانی بیان کرنے کا وہ انداز زندہ رکھا ہے جس سے پڑھنے والے لطف اٹھاتے رہے ہیں۔

ولادیمیر نباکو کا ناول 'لولیتا' انگریزی میں لکھا گیا تھا جو 1955 میں پہلی بار پیرس میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد خود نباکو نے 1958 میں اسے روسی زبان میں ترجمہ کیا تھا۔ یہ کتاب اپنے تجرباتی کہانی کہنے کے سٹائل اور متنازعہ موضوع کے لیے مشہور ہے۔ کتاب کی کہانی ایک ایسے شخص

کی کہانی ہے جو اپنی عمر سے بہت کم لڑکی ڈولوریس ہیز کے عشق میں مبتلا ہے اور اسکے ساتھ جنسی رشتہ بناتا ہے۔ٹائم میگزین نے اس ناول کو 1923 سے 2005 کے درمیان شائع ہونے 100 بہترین ناولوں کی فہرست میں رکھا ہے۔

جن دیگر کتابوں کو وسافاری کی اس فہرست میں شامل کیا گیا ان میں امریکی صدر باراک اوباما کی کتاب 'ڈریمز فروم مائی فادر' کے علاوہ ٹیڈ ہیوز، وی ایس نائپول، جے ایم کٹزی کے کتابیں شامل ہیں۔

اس فہرست میں سلمان رشدی کی 'سٹینک ورسز' بھی شامل ہے۔سٹینک ورسز رشدی کا چوتھا ناول تھا جو 1988 میں شائع ہوا۔سیٹنک ورسز کے منظر عام پر آنے کے بعد کتاب کے موضوع کو لیکرز بردست تنازعہ کھڑا ہو گیا تھا۔مسلم ورلڈ نے کتاب کو 'توہین اسلام' قرار دیا اور ہندوستان پہلا ملک تھا جس نے اس کتاب پر پابندی عائد کی تھی۔ بعد میں برطانیہ، ایران، اور دنیا کے مختلف مما لک پر کتاب پر پابندی کے مطالبات ہوئے تھے۔

(خصوصی شکریہ: بی بی سی اُردو)

اسٹرانڈ بک اسٹور کی کتابیں

کیرِن ہوف اِسٹائن

نیویارک کا اسٹرانڈ بک اسٹور پانچ منزلوں پر مشتمل کتابوں، نادر و نایاب ذخیروں اور ادبی مجالس کی بنا پر کتابوں کے شائقین کے لئے ایک اہم مرکز بن گیا ہے۔

اسٹرانڈ بک اسٹور کے اندر کی حالت اچھی نہیں ہے۔ اس کی فرش گھسی ہوئی ہے۔ کتابوں کی میزیں پرانی ہیں اور کرسیاں صرف بیٹھنے کے لائق۔ لیکن یہ چیزیں اس کتب خانہ کی خوبصورتی میں اضافہ ہی کرتی ہیں۔ پوری دنیا کے جو لوگ پہلی بار اس کتاب کی دکان میں آتے ہیں انہیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے وہ پہلے بھی کبھی یہاں آئے ہوں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اس کتب خانہ کے اندرونی حصے کسی بھی ایسے شخص کیلئے جانے پہچانے ہوتے ہیں جس نے فلم ''جولی اینڈ جولیا'' دیکھی ہے یا ٹیلی ویژن شو ''سیکس اینڈ دی سٹی'' اور ''ایبسولوٹلی فیبولس'' دیکھے ہوں۔ ذرائع ابلاغ میں اس طرح دکھائے جانے کی وجہ سے ۳۸ سال پرانی یہ دکان ایک روایتی کتب خانے کا درجہ حاصل کر چکی ہے۔

یہ سادہ سی عمارت براڈوے اور ایسٹ ۱۲ اسٹریٹ کے کنارے واقع ہے جس کی پانچ منزلوں میں اسٹرانڈ بک اسٹور ہے۔ ان میں سے چار منزلیں عوام کیلئے کھلی ہوئی ہیں۔ چھتیں اونچی ہونے کی وجہ سے کتابوں کے خانے ڈھائی میٹر تک اونچے ہیں۔ وہاں ہمیشہ ایک سیڑھی دستیاب رہتی ہے جس کے ذریعہ گاہک چاہیں تو سب سے اونچی طاق پر رکھی کتابوں تک پہنچ سکتے ہیں۔ اسٹرانڈ بک اسٹور کے مالک فریڈ باس کا اندازہ ہے کہ اِسٹرانڈ بک اسٹور میں جو کتابیں ہیں، انہیں اگر زمین پر بچھا دیا جائے تو ۸۱ میل یا تقریباً ۹۲ کلومیٹر تک پھیل جائیں گی۔ اس بک اسٹور کا 'لوگو'، جو تھیلوں مگ اور ٹی شرٹ پر چھپا ہوا ہے، اس میں ایک سرخ رنگ کی بیضوی شکل بنی ہوئی ہے جس پر ''۸۱ مائلس آف بکس'' لکھا ہے۔

یہ کتب خانہ ۱۹۲۷ میں باس کے والد بن نے قائم کیا تھا۔ اس کتب خانے کا نام اشاعتی گھرانوں کے لئے مشہور لندن کی ایک سڑک کے نام پر رکھا گیا ہے۔ اب باس فیملی کی تیسری نسل یہ کتب خانہ چلا رہی ہے اور اس میں بین الاقوامی قارئین کے ذوق کی تسلی کا سامان ہے۔ پیرس میں

سینی ندی کے کنارے واقع کتاب کی دکانوں سے متاثر ہوکر اس اسٹور نے بھی سنٹرل پارک کے قریب اسی طرح کی چھوٹی چھوٹی کتاب کی دکانیں چلانے کا اہتمام کیا ہے۔

اسٹرانڈ بک اسٹور کی کتابوں کے خریدار بڑے وفا دار ہیں اور اس اسٹور کے بارے میں اپنے احساسات کو بیان کرنے کیلئے لفظ محبت کا بار بار استعمال کرتے ہیں۔ امبرٹو ایکو، فرین لیبو وز اور فرینک میکو سمیت اہم مصنفین نے کہا ہے کہ یہ ان کا پسندیدہ کتب خانہ ہے۔ اس میں تواتر کے ساتھ مصنفین کو اپنی تخلیقات پڑھنے کا موقع دیا جاتا ہے۔ ان مصنفین میں ڈیوڈ سیڈارس، جیمس ایل رائے اور جھمپا لہری بھی شامل ہیں۔ اسٹرانڈ میں چک کلوز سے کرسٹو اور جین کلاؤڈ ے جیسے آرٹسٹوں تک نے اپنے فن پاروں کی نمائش کی ہے۔ یہاں ہونے والی نظم خوانی، افسانے کی قرا?ت، خطبات اور نمائشوں میں بڑے پیمانے پر لوگ شریک ہوتے ہیں اور جو ذاتی طور پر وہاں نہیں پہنچ سکتے ان کے لئے اسٹرانڈ کی ویب سائٹ کسی بھی تقریب کے انعقاد کے دوران ساتھ ساتھ اس کی ترسیل وتشہیر کا اہتمام کرتی ہے۔ اسٹرانڈ بک اسٹور لوگوں کے لئے یہ سہولت بھی فراہم کرتا ہے کہ اگر وہ تقریب میں شریک نہ ہوسکیں تو بھی انہیں کتابوں کے دستخط شدہ نسخے پہلے سے دیئے گئے آرڈر کے تحت دستیاب ہو جاتے ہیں۔

نینسی باس وائڈن نے، جو اپنے والد کے ساتھ مل کر اسٹرانڈ بک اسٹور چلا رہی ہیں، کہا کہ ''ہم لوگ اپنے بارے میں یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارا کتب خانہ کتابوں کے شیدائیوں کا پسندیدہ کتب خانہ ہے۔ ہمارا صرف ایک ہی اسٹور ہے جسے ہمارا خاندان آزادانہ طریقے سے چلاتا ہے۔ ہم تمام کتابوں کی قیمتوں میں رعایت دیتے ہیں۔''

ایک ایسے شہر میں جہاں صنعتی گھرانوں کی ملکیت میں ان گنت کتب خانے ہیں، اسٹرانڈ بک اسٹور نہ صرف باقی ہے بلکہ ترقی بھی کرر رہا ہے۔ یہاں ایسی کتابیں اور خدمات پیش کی جاتی ہیں جو دوسرے اسٹورس میں نہیں ملتیں۔ اسٹرانڈ بک اسٹور صرف نئی کتابیں ہی نہیں فروخت کرتا بلکہ وہ کتابیں بھی یہاں مل جاتی ہیں جن کی کاپیاں ختم ہوگئی ہوں یا جن کے ایڈیشن نادر ہوں۔ اسٹرانڈ بک اسٹور اپنے گاہکوں کے لئے لائبریریاں قائم کرنے کا اہتمام بھی کرتا ہے اور پوپ اسٹار موبی جیسی مشہور شخصیتوں نے اپنے گھروں میں لائبریری کے قیام کیلئے اس کی خدمات حاصل کی ہیں۔ بائیڈن کہتے ہیں کہ ''یہ خیال ہی سچ مچ بڑا پر جوش کر دیتا ہے کہ جن کتابوں کو ہم پسند کرتے ہیں انہیں کسی اور کی طاق پر سجایا جائے۔ یہاں تقریباً ہر کوئی کالج کا ڈگری یافتہ ہے اور ادب میں اس سے بھی اوپر کی ڈگری لے رکھی ہے۔ اس لئے ہم لوگ صرف کتابیں بیچتے ہی نہیں ان سے پیار بھی کرتے ہیں۔''

وائڈن نے بتایا کہ ایک اندازے کے مطابق ہر روز ۶۰۰۰ سے ۸۰۰۰ تک افراد اس اسٹور میں آتے ہیں۔ کام کے دنوں کے ایک غیر رسمی جائزے سے پتہ چلا کہ ۲۲ فیصد گاہک بیرونی ملکوں سے آتے ہیں اور ۳۳ فیصد نیویارک علاقے کے باہر سے۔ بہت سے لوگ ایسی کتابیں مانگتے ہیں جو ان کے اپنے ملک یا اپنی ریاست میں دستیاب نہیں ہیں۔ ہم لوگ یہ کتابیں کسی بھی جگہ بھیج سکتے ہیں...... بیرون ملک بھی۔'' اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں کہ اسٹرانڈ بک اسٹور کا انٹرنیٹ کاروبار بھی خوب ترقی کر رہا ہے اور کچھ کتابوں کو چھوڑ کر اسٹرانڈ کی تقریباً تمام کتابیں آن لائن دستیاب بھی ہیں۔ آرٹ سے متعلق کتابیں خاص طور سے بہت مقبول ہیں اور اس اسٹور میں آرٹ بک کا جو حصہ ہے وہ دنیا میں سب سے بڑے آرٹ بک سیکشنوں میں گنا جاتا ہے۔ وائیڈن نے بتایا کہ ''اس کتب خانے میں پہنچ کر کتاب کی خریداری کرنے کا جو مزہ ہے وہ آپ کو انٹرنیٹ پر نہیں مل سکتا اور وہ ہے کتابوں کو چھونے کا لمسی تجربہ۔ کچھ لوگ یہاں ہر روز آتے ہیں اور ان کو کسی خلاف معمول چیز کی تلاش ہوتی ہے۔ یہ ایک طرح سے کسی خزانے کی تلاش ہے۔''

اسٹرانڈ بک اسٹور میں آنے والوں کی دلکشی کا ایک نمایاں مرکز اس اسٹور کی تیسری منزل پر واقع نادر کتابوں کا کمرہ ہے۔ اس کمرے کی دیکھ بھال کا کام ماہرین کی ایک ٹیم کرتی ہے۔ دیوار پر ایک اشاریہ لکھا ہے ''ہر کسی کیلئے قابلِ حصول کتابیں'' اس کمرے کے بیچ میں ایک ''گولڈ والٹ'' ہے جو کہ ایک بینک کی سابق تجوری ہے۔ اس کے اندر اس اسٹور کی انتہائی گرانقدر کتابیں رکھی ہوئی ہیں۔ گولڈ والٹ کی کھڑکی سے اندر جھانک کر دیکھیں تو اس کے اندر ''اولی سیس'' کی ایک کاپی رکھی ہوئی ہے جس پر جیمس جوائس اور ہنری میٹیسے کے دستخط ہیں۔ یہاں ''گان وتھ دی ونڈ'' کا پہلا ایڈیشن ہے اور مارک ٹوائن کی کتابوں کا پورا سیٹ ہے جس پر مصنف کے قلمی نام اور حقیقی نام سیموئیل کلیمنس کے دستخط ہیں۔

وائیڈن نے نارمن میلر کی دستخط شدہ ۱۵۰ ڈالر کی ایک کتاب کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ ''ڈھیر ساری پرانی کتابیں سچ مچ قوت خرید کے اندر ہیں۔ یہ بامعنی کتابیں ہیں۔ جن کتابوں پر دستخط ہیں وہ ایک طرح سے مصنفین کے ساتھ رابطے کا درجہ رکھتی ہیں۔''

اپنے اسٹاک کو برقرار رکھنے اور اسے بڑھانے کے لئے اسٹرانڈ ہزاروں کی تعداد میں استعمال شدہ کتابیں خریدتا ہے۔ کتابوں کی خریداری کا شعبہ ہفتے میں ۶ دن کھلا رہتا ہے۔ بہت سے گاہک ایسے ہیں جو یہاں سے کتابیں خریدتے ہیں اور پھر یہیں لاکر بیچ بھی دیتے ہیں۔ وائیڈن نے ہنستے ہوئے کہا کہ ''ہم لوگ اس کے بارے میں 'ری یوز، ری سائکل، ری ریڈ' ہی کہنا پسند کرتے ہیں۔''

باس اب ۲۸ سال کے ہو گئے ہیں اور کتابوں کی خریداری کے سربراہ ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ ''اس کاؤنٹر پر ہم لوگ ایک دن میں کئی ہزار کتابیں خریدتے ہیں۔ اس کے علاوہ کتابوں کے نجی ذخیرے ہیں جہاں سے بیک وقت ہمیں کبھی ۵۰، کبھی ۶۰ اور کبھی ۷۰ باکس کتابیں مل جاتی ہیں۔'' یہ کتابیں استعمال شدہ نسخوں سے لے کر عمدہ اور نادر ایڈیشن تک ہر طرح کی ہیں۔'' باس نے کہا کہ ''میں قدیم کتابوں کا کام دیکھتا ہوں۔''

جب ان سے پوچھا گیا کہ کیا انٹرنیٹ سے یا نوک اور کائنڈل جیسے ای ریڈروں سے اسٹرانڈ بک اسٹور کو کوئی خطرہ لاحق ہے تو باس نے کہا کہ ''ان سے خطرہ نہیں ہے، لیکن ان کی وجہ سے کاروبار تھوڑا سا بدل جاتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایک طرح سے اس کی وجہ سے کاروبار بڑھ سکتا ہے۔ بہت سے لوگ ایسے ہیں جو خریدنے سے پہلے کتاب کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ چونکہ ہماری قیمتیں مقابلتاً کم ہیں اس لئے یہ ان کے لئے سستی ہوں گی۔ آپ جانتے ہیں کہ جب ٹی وی آیا تھا تو ہمیں لگا تھا کہ ہم لوگ اب کتابیں فروخت نہیں کر سکیں گے۔''

اسٹرانڈ نے مستقبل کو ذہن میں رکھتے ہوئے بچوں کی کتابوں کا ایک وسیع شعبہ بنایا ہے۔ ہر جمعرات کو دن کے ساڑھے تین بجے بچوں کے لئے والدین کے ساتھ فیچر خوانی میں شرکت کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد ریڈنگ سے متعلق ایک آرٹس اینڈ کرافٹس کا پروگرام ہوتا ہے۔ ابھی حال میں ایک خاص تقریب ''فار ایور فرینڈس'' منعقد کی گئی اور اس پروجیکٹ کا نام 'ویوینگ فرینڈشپ بریسلٹس' رکھا گیا۔

باس اسی کتب خانے میں کام کرتے ہوئے بڑے ہوئے۔ یوں تو کچھ دن انہوں نے امریکی فوج کی خدمت بھی کی مگر پھر لوٹ کر یہیں آ گئے۔ انہوں نے بتایا کہ ''میں آپ کو ایک بات بتاتا ہوں کہ بہت بڑی تعداد میں نوجوان لڑکے لڑکیاں یہاں کتابوں کی خریداری میں مصروف ہیں۔ وہ لوگ دن رات اس اسٹور میں آتے رہتے ہیں۔ پرانے لوگوں کی ایک بڑی تعداد ایسی ہے جو مجھے پسند کرتی ہے۔ جو کچھ ہو رہا ہے اسے دیکھ کر طاقت ملتی ہے۔ کتاب ابھی مری نہیں۔ کتب بینی ابھی مری نہیں۔ مستقبل سے ہماری بڑی امیدیں وابستہ ہیں۔''

(کیرِن ہوف اِسٹائن، امریکہ ڈاٹ جی او وی سے وابستہ خصوصی نامہ نگار ہیں)

کتابیں جلانے والوں سے تاریخ کا انتقام

نومئی انیس سوتینتیس کو برلن میں ہزار ہا کتابیں جلائی گئیں۔ٹھیک پچھتر سال پہلے جرمنی میں نازیوں نے ہزاروں کتابوں کو جلایا تھا۔اس سلسلے میں سنیچر کو جرمنی کے مختلف شہروں میں تقریبات منعقد کی گئی ہیں۔پچھتر سال قبل اسی روز مشہور نفسیات داں سگمنڈ فرائیڈ اور کارل مارکس جیسے معروف مصنفوں کی کتابوں کو یہ کہہ کر جلا دیا گیا تھا کہ یہ یہودی سوچ سے متاثر ہیں، نا کہ جرمن کردار سے۔

بی بی سی کے نامہ نگاروں نے اس دن کے حوالے سے مختلف مراسلوں میں بتایا ہے کہ جرمنی کے دارالحکومت برلن میں پچھتر سال پہلے جس مقام پر ہزاروں کتابوں کو جلایا گیا تھا وہیں سنیچر کو سکول کے بچوں نے انہی کتابوں کے اقتباسات اور نظمیں پڑھیں۔

مئی انیس سوتینتیس میں نازیوں نے برلن اور دوسرے شہروں میں دسیوں ہزار کتابوں کو لائبریریوں اور لوگوں کے گھروں سے ضبط کر کے باہر سڑکوں پر جلا دیا تھا۔

کتابیں جلانے والے ان لوگوں کا کہنا تھا کہ 'یہ کتابیں فرسودہ ہیں، جرمن تہذیب سے مطابقت نہیں رکھتیں اور یہودی سوچ سے بہت زیادہ متاثر ہیں'۔جن مصنفوں کی کتابیں جلائی گئیں، ان میں تحلیلِ نفسی کے بانی سگمنڈ فرائیڈ، کمیونیزم کے بانی کارل مارکس، ناول نگار ٹامس مان اور امریکی مصنف ارنسٹ ہیمنگوے شامل تھے۔

برلن میں اس مقام کو جہاں کتابیں جلائی گئی تھیں ایک شیشے سے ڈھک دیا گیا ہے جسے لوگ اوپر سے دیکھ سکتے ہیں سنیچر کو بچوں اس شیشے پر پھول چڑھا کر ان مصنفوں کو خراج تحسین پیش کیا جن کی کتابیں جلائی گئی تھیں۔

بشکریہ بی بی سی

دنیا کا سب سے بڑا کتب خانہ

کانگرس کا کتب خانہ درحقیقت امریکہ کا قومی کتب خانہ ہے۔اس کے علاوہ یہ دنیا کا سب سے بڑا کتب خانہ بھی ہے جس میں 16 کروڑ سے زائد اشیا تقریباً 450 زبانوں میں موجود ہیں۔اس کتب خانے میں دنیا بھر سے اکٹھا کیا گیا ادبی اور شائع شدہ، اہم مواد موجود ہے۔اگرچہ عام عوام اس کتب خانے کا دورہ کرسکتی ہے لیکن کتب اور دیگر مواد تک رسائی صرف اعلیٰ حکومتی عہدے داران ہی حاصل کرسکتے ہیں۔

برطانوی کتب خانہ دنیا کا دوسرا بڑا کتب خانہ ہے جس میں 15 کروڑ اشیا مثلاً کتابیں، نقشے، میگیزین، شیٹ میوزک اور دیگر اشیا موجود ہیں۔اور اپنے امریکی حریف کے برعکس اس کتب خانے میں موجود تمام اشیا عوام کے مطالعے کے لیے دستیاب ہیں۔

بشکریہ بی بی سی

جنت ایک قسم کی لائبریری ہوگی!

ورجینیا وُولف نے ایک بار کہا تھا 'عوامی کتب خانوں کی چھان بین کرنے پر میں انھیں آنکھوں سے اوجھل خزانے سے بھرا ہوا پاتی ہوں۔' ساتھی مصنف 'ہورہے لوئس بورجیز' نے بھی ان سے کافی حد تک اتفاق کرتے ہوئے کہا 'میں نے ہمیشہ یہ تصور کیا ہے کہ جنت ایک قسم کی لائبریری ہوگی۔'

آج کل کے ڈیجیٹل دور میں کچھ لوگوں کے خیال میں شاید یہ کتب خانے فرسودہ ہو چکے ہوں لیکن سچ تو یہ ہے کہ ان کی دریافت کے آغاز سے ہی یہ انسانی دلچسپی کا باعث بنے ہوئے ہیں۔ ان دروازوں کے اندر داخل ہوکر ہم کھو سے جاتے ہیں اور حیرت کے مارے ایسی کتب کا مطالعہ بھی شروع کر دیتے ہیں جنھیں پڑھنا مقصود ہی نہیں ہوتا۔

یہ کتابیں نہ صرف علم فراہم کرتی ہیں بلکہ ان کا مطالعہ ہر کوئی کر سکتا ہے۔ یہ جسم اور روح کے لیے ایک پناہ گاہ ثابت ہوتی ہیں اور آرام وسکون کا باعث بنتی ہیں۔ ان کتب خانوں میں لا محدود کتابوں کے مطالعے کے علاوہ تجربے کی بنیاد پر مشورے بھی ملتے ہیں اور تو اور قسمت اچھی ہو تو مفت وائی فائی سمیت، فری ہیٹنگ بھی میسر ہوتی ہے۔

(بشکریہ: بی بی سی)

کتاب کی رفاقت

ہربرٹ این کین

ماخوذ از: ماہنامہ ''درویش''، لاہور۔ جولائی ۱۹۸۹ء

بہت سے نوجوان جب ان کی شادی ہو جائے تو محبت کرنا چھوڑ دیتے ہیں اور جب کوئی ملازمت مل جائے تو پڑھنا، سیکھنا ترک کر دیتے ہیں۔ وہ محبت اور تعلیم دونوں کو زندگی کی عارضی ضرورتیں خیال کرتے ہیں یا ایک ایسا ابتدائی تجربہ جس سے ہر نوجوان کو لازماً واسطہ پڑتا ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ اس انوکھے خیال ہی کے باعث بے گھروں کی زندگی افسردہ نظر آ رہی ہے اور بے شمار ناخوش نوجوان ایک ہی معمولی ملازمت میں دھنسے چلے جا رہے ہیں۔

روزی کماؤ! محبت اور علم حاصل کرو......

اگر ہم دنیا کی آسودگی اور خوش حالی میں سے اپنا پورا پورا حصہ لینا چاہتے ہیں تو اس کے لیے یہ ایک بہترین اصول ہے۔علم حاصل کرنے کا سب سے اعلیٰ طریقہ یہ ہے کہ ہر وقت اپنے ہاتھ میں ایک مفید کتاب رکھو اور فرصت کے اوقات میں اس کا مطالعہ کرو۔ایک فی صد شخص بھی کتابوں سے قطع تعلق کر کے زندگی کی کوئی بہت بڑی کامیابی حاصل کرنے کی امید نہ رکھے۔قریب قریب کتابیں ہی دنیا پر حکومت پر کرتی ہیں۔ وہ ایسی مؤثر رائے عامہ وجود میں لاتی ہیں جو سلطنتوں کو زیر و زبر کر دیتی ہے۔ایک ایک کتاب کئی کئی حکومتوں کا تختہ الٹ چکی ہے۔یہ کنا بھی قریب قریب درست ہے کہ تہذیب کتابوں ہی کے ذریعے سے پیدا ہوئی۔ نیوٹن نے نظریات، لکھ کر تمام مہذب ممالک کے نقطۂ خیال میں تبدیلی پیدا کر دی اور ایسا ہی ڈارون نے بھی اپنی کتاب مبداء انواع کے ذریعے سے دنیا کے خیالات میں انقلاب برپا کیا۔

ایڈم سمتھ کی کتاب دولت اقوام نے برطانیہ کو تجارت اور کاروبار کے ڈھنگ سکھائے۔

پٹ نے ۲۰ سال کی عمر میں اس کتاب کی ایک جلد خریدی تھی۔ یہی کتاب تھی جس نے اس کی زندگی کو ایک ایسے سانچے میں ڈھالا کہ وہ برطانیہ کا وزیر اعظم بن گیا۔

اس کتب نے اس پر یہ حقیقت واضح کی کہ کاروبار پابندیوں سے آزاد ہونا چاہیے۔ یہ

ایک ایسی حقیقت ہے جسے ماضی قریب کے کسی وزیر اعظم نے نہ سمجھا۔حکومت کے وسائل دولت کا نظم ونسق اور آزاد تجارت ...... یہ پٹ کی پالیسی تھی جو اس نے اس کتاب سے حاصل کی تھی۔قریباً ہر بڑے آدمی کی پشت پر ایک کتاب ہوتی ہے ہم ان کے تذکرے پڑھیں تو یہ حقیقت منکشف ہو جائے گی۔فریڈے نے اپنے لڑکپن کے زمانے میں علم کیمیا کے موضوع پر ایک کتاب خریدی تھی۔ اس کتاب نے اس کے دماغ کی تعمیر کی۔اسے اپنی دماغی قابلیتوں کے جوہر دکھانے کے قابل بنایا۔اسے برطانیہ میں سائنس کی رہنمائی کا شرف حاصل ہوا۔وہ لارڈ کلوین کا اتالیق مقرر ہوا۔

کرٹس ایک مرتبہ لندن کی سیر کو آیا۔تو اس نے ٹائمنر کے لائق ترین ایڈیٹر فائن ڈلین کا تذکرہ مول لے لیا۔امریکہ لوٹ کر اس نے اخبار پبلک ریجر خریدا اور اسے ولایات متحدہ کا ''ٹائمنر'' بنا دکھایا۔اسے یہ ترغیب فاہن ڈلین کے تذکرے ہی سے حاصل ہوئی تھی۔سیسل روڈس عمر بھر کتابوں کا مطالعہ کرتا رہا۔وہ ایک سلطنت کا بانی تھا۔

ایڈیس مدرسے کی تعلیم سے محروم تھا۔اس کی والدہ نے اس کی تعلیم وتربیت کی اور اسے مفید کتابوں کے مطالعے کی عادت ڈالی۔جب وہ کسی اختراعی مہم کا ارادہ کرتا تو اس کا دستور یہ تھا کہ پہلے اپنے موضوع پر تمام کتابوں کا مطالعہ کر لیتا، پھر اس نقطے سے اپنے کام کا آغاز کرتا جہاں کتابیں ختم ہو جاتی تھیں۔یہی وجہ ہے کہ اسے اتنی کامیابی نصیب ہوئی۔اس نے ان چیزوں کو کبھی ایجاد نہ کیا جو پہلے ہی ایجاد ہو چکی ہوتیں جیسا کہ بہت سے موجدوں کا شیوہ ہے۔دنیا میں کتابوں کا سب سے بڑا قدردان اینڈریو کارینگی تھا۔اس نے چھ کروڑ پاؤنڈ کمائے اور ان میں سے آدھی رقم لائبریریوں کے قیام کے لیے وقف کر دی۔دنیا بھر میں اس وقت ہزارہا لائبریریاں قائم ہیں۔ان میں سکندریہ کی شہرۂ آفاق لائبریری سے بھی زیادہ تعداد میں اور زیادہ عمدہ کتابیں موجود ہیں۔ان سب کی سرتاج برطانوی عجائب گھر کی لائبریری ہے، جس میں ۴۰ لاکھ کتابیں موجود ہیں۔اس عمارت میں ساری نسل انسانی کا علم جمع کر دیا گیا ہے اور وہ نیویارک کی تمام فلک بوس عمارتوں سے بھی زیادہ قیمتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ کسی بھی یونیورسٹی میں کوئی ایسی چیز نہیں سکھائی جاتی جو کتاب میں موجود نہ ہو۔کوئی بھی شخص عہد حاضر کے عالمگیر اسباب وذرائع کی موجودگی میں یونیورسٹی کی شکل دیکھے بغیر اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکتا ہے۔

اس امر کی کوئی پروا نہ کریں کہ آپ کی ملازمت کیسی ہے۔درجن بھر کتابیں آپ کی امداد کر سکتی ہیں۔آپ ایک مرتبہ پڑھنے کا طریقہ سیکھ لیں پھر جاہل رہنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

چند برس پہلے کاروباری لوگ محض ''کتابی تعلیم'' کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتے تھے۔ان

کا خیال تھا کہ انسان کو جو کچھ سیکھنا ہو۔ ذاتی تجربوں کے ذریعے سے سیکھے۔ آج سے تیس برس پیشتر یہ خیال بڑی حد تک صحیح تھا۔ اس زمانے میں کتابیں صرف ادیب اور عالم ہی لکھا کرتے تھے جنہیں تجارت اور کاروبار کا عملی طور پر کوئی تجربہ نہ تھا۔ مگر یہ نظریہ اب اس زمانے میں درست نہیں سمجھا جا سکتا۔ اب ہنری فورڈ نے بھی کتابیں لکھی ہیں۔

نہایت قیمتی کتابیں۔ جن میں اس نے وہ تمام اصول و خیالات جمع کر دیے ہیں جن کے ذریعے سے وہ دنیا کا کامیاب ترین تاجر بنا تھا۔ ذاتی تجربوں کے ذریعے سے جو کچھ بھی ہم سیکھتے ہیں وہ ہمیں بہت گراں قیمت پر حاصل ہوتا ہے۔ ہمیں مختلف تجربوں، آزمائشوں اور ناکامیوں کی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔ ذاتی تجربے، لمبے عرصے تک ہماری راہ نمائی نہیں کر سکتے۔ ہماری زندگیاں بہت مختصر ہیں اور ان قلیل اوقات میں ہمیں بہت کچھ سیکھنا ہوتا ہے۔

مثال کے طور پر کوئی شخص ذاتی تجربے کے ذریعے سے علم ہیئت، برقیات، کیمیا اور فن تعمیر کے متعلق کیا سیکھ سکتا ہے؟

کیا یہ واقعہ نہیں کہ جن لوگوں کی قوت فکر کمزور ہو۔ انہیں اوّل تو ذاتی تجربے سے کچھ فائدہ نہیں پہنچتا اور اگر پہنچتا بھی ہے تو نہایت کم۔ ایک معمار ساری عمر غلط طریقے سے اینٹیں چنتا رہے گا مگر اسے کبھی اس بات کا خیال نہ آئے گا کہ کسی بہتر طریقے سے رجوع کرے۔ صرف وہ شخص اپنے تجربے سے کماحقہ فائدہ اٹھا سکتا ہے جو مطالعے کا عادی ہو۔ مطالعہ اسے غور و فکر کرنا سکھائے گا، مقابلے، موازنے، انتخاب و قبول اور اصلاح کی ترغیب دلائے گا۔ اس وقت ہزار ہا کتابیں جو ذاتی تجربوں کی بنا پر لکھی گئی ہیں دستیاب ہو سکتی ہیں۔ وہ پروفیسروں کی لکھی ہوئی نہیں بلکہ ان لوگوں کی لکھی ہیں جو کاروباری دنیا میں کامیاب ہیں۔ یہ کتابیں نہایت مفید معلومات سے معمور ہیں۔

محض دست فروشی کے فن پر آٹھ سے اوپر کتابیں موجود ہیں اور قریباً اتنی ہی تعداد میں اشتہار بازی کے موضوع پر انجینئرنگ، حساب کتاب، کیمیا اور علم البرق کے مختلف پہلوؤں پر کئی کتابیں مل سکتی ہیں اور ان میں سے اکثر چند روپے فی کتاب کی قیمت پر خریدی جا سکتی ہیں۔

اس سوال کا جواب کہ ایک شخص سال میں کتنی کتابیں پڑھ سکتا ہے بالعموم اس کی رفتار مطالعہ پر منحصر ہے۔ میں ہفتے میں تین کتابیں پڑھ لیتا ہوں، دو مفید کتابیں اور ایک ناول۔ مگر بعض لوگ اس سے زیادہ کتابوں کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔

مناسب یہ ہے کہ آپ مانگے کی کتابوں پر گزارہ کرنے کے بجائے اپنی ذاتی لائبریری بنائیں۔ اگر آپ ہفتے میں ایک روپیہ بھی بچا سکیں تو سال بھر میں آٹھ دس کتابیں خرید لیں گے۔

دس سال کے بعد آپ ایک اپنی لائبریری کے مالک بن جائیں گے۔

جہاں تک پڑھنے کے بہترین طریقے کا تعلق ہے۔ میرا مشورہ ہے پنسل ہاتھ میں لے کر مطالعہ کریں۔ جو پیرے سب سے زیادہ دلچسپ ہوں۔ان پر نشان لگا دیں۔ پھرانہیں الگ لکھ کر سال بھران کا بار بار مطالعہ کرتے رہیں۔ہم میں سے بہت سے لوگ اخبارات پرتو بہت سا وقت ضائع کر دیتے ہیں۔مگر کتابوں کے لیے بہت کم فرصت نکالتے ہیں۔ہمیں روزانہ اخبارات جلد جلد مطالعہ کرنے کی عادت ڈالنا چاہیے۔ یقیناً سارے کا سارا اخبار پڑھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

اخبار ہر شخص کے لیے ہوتا ہے۔ ہر قسم اور ہر ڈھنگ کے آدمی کے لیے لہذا اس میں سے آپ کو انہیں چیزوں کو چننا چاہیے جن کے ساتھ آپ کو تعلق یا دلچسپی ہے۔ اکثر مضامین کے عنوانات ہی پر سرسری نظر ڈال کر گزر جانا کافی ہے۔

تمام وہ کتابیں، جن کا مقصد پروپیگنڈا کرنا ہو، کبھی ہاتھ میں نہ لینی چاہییں۔وہ کتاب جو اوّل سے آخر تک کسی نظریے وعقیدے یا کسی مسئلے کی خاص وکالت کے لیے لکھی گئی ہو ہمیں کچھ نہیں سکھا سکتی۔جتنی کوئی کتاب جوش وجذبات سے معمور ہوگی بالعموم اتنی ہی اس میں عقل وخرد کی کمی ہو گی۔سیر وسیاحت کی کتابیں ہمیشہ قیمتی معلومات کی حامل ہوتی ہیں۔وہ ہمیں غیر ممالک کے رسوم و رواج اور منڈیوں کے حالات بتا کر ہمارے دماغوں کو گنوار پن سے محفوظ رکھتی ہیں۔اگر ہم سیر وسفر کی کتابوں کے مطالعے میں زیادہ وقت صرف کریں تو ممالک غیر سے اپنی تجارت کو وسیع کر سکتے ہیں۔اچھے لکھے ہوئے تذکرے، بشرطیکہ وہ مداخانہ نوعیت کے نہ ہوں اور جو کسی پیر یا رکن خاندان کے قلم سے ہوں، پڑھنے کے قابل ہوتے ہیں۔ان کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ کس طرح ایک شخص نے کامیابی کی راہ پر قدم رکھا! کس طرح مشکلات وحالاتِ نامساعد کا مقابلہ کیا؟ اس قسم کی کتابیں عملی امداد سے بڑھ کر ہم میں ترغیب پیدا کرتی ہیں۔

جہاں تک ناولوں کا تعلق ہے ہمیں ان ناولوں کی طرف کوئی توجہ نہ دینا چاہیے جن میں فرضی لوگوں کی کہانیاں لکھی ہوں۔البتہ وہ ناول جن میں حقیقی زندگیوں اور حقیقی لوگوں کے حالات موجود ہیں ہماری توجہ کے مستحق ہیں۔اس کے علاوہ تعلیمی نصاب کی کتابیں بھی ہیں، لیکن ان کی قیمت بہت زیادہ ہوتی ہے۔نصاب کی کتاب کا ایک بہت بڑا فائدہ یہ ہے کہ آپ اسے جیب میں ڈال کر جہاں چاہیں اپنے ساتھ لے جا سکتے ہیں۔گاڑی میں بیٹھ کر یا جہاں کہیں آپ کو ایک آدھ گھنٹہ کی فرصت مل جائے اس کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔

مطالعہ میں ایک بنیادی چیز یہ ہے کہ آپ کتابوں سے پورا پورا فائدہ اٹھائیں ورنہ محض کتاب بینی کا کوئی فائدہ نہیں۔ بہت سے لوگ محض وقت گزارنے کے لیے کتابیں پڑھتے ہیں۔ یہ

عادت جہاں مفید ثابت ہوسکتی ہے۔ وہاں نقصان سے بھی خالی نہیں۔ انسان اس طرح کرم کتابی بن کر رہ جاتا ہے کہ اسے اپنے مطالعے کا فائدہ اٹھانے کا موقع ہی نہیں ملتا۔

ایک اچھی کتاب کسی حد تک آپ کے دماغ کو وسیع تو کر سکتی ہے لیکن آپ کا مقصود ہمیشہ یہ ہونا چاہیے کہ وہ آپ کے دل کو آمادہ عمل کرے۔ حل طلب سوال یہ ہے کہ آپ کیوں کر جست اور محنتی بن سکتے ہیں۔ نہ کہ سست اور جامد؟ ہر قسم کے خیالات و حقائق کو اپنے دماغ میں ٹھونسنے سے بھلا فائدہ کیا ہے جب وہ آپ کو زندگی کی مشکلات سے عہدہ برآ ہونے میں کوئی مدد نہیں دیتے؟

جب بھی آپ کسی کتاب کا مطالعہ کریں اپنے آپ سے دریافت کریں میں اس سے کیا فائدہ اٹھا سکتا ہوں؟ اپنی ملازمت میں، اپنے خیالات میں اس سے کیا کام سکتا ہوں؟ اپنی ملازمت میں، اپنے حالات میں اس سے کیا کام لے سکتا ہوں؟ یہ کتاب پڑھنے کا ایک مؤثر طریقہ ہے۔

کتاب کو یہ سمجھ کر ہاتھ میں لیں کہ وہ ایک اوزار بھی ہے اور لطف و تفریح کا سامان بھی۔ اس کے ذریعے آپ اپنا مقصد حاصل کریں اور دوسرے لوگوں کے خیالات و تجربات سے فائدہ اٹھائیں۔ یہی ایک طریقہ ہے جس کے ذریعے آپ اپنے مطالعے سے پوری پوری قیمت وصول کر سکتے ہیں۔

ادیب لوگ اس طریق عمل کو پسند نہیں کرتے۔ ان کے نزدیک کتابوں کا کام ذہنی تربیت ہے۔ یہ درست ہے۔ مگر وہ اس سے بھی بڑھ کر مفید ثابت ہوسکتی ہیں۔ وہ آپ کو اس قابل بنا سکتی ہیں کہ آپ اپنی فرم اور اس کے گاہکوں کی بہتر خدمت کر کے اپنی آمدنی بڑھا سکیں۔

پچھلے پانچ سو سال سے کتابیں چھاپی جا رہی ہیں۔ ان سے کیوں زیادہ سے زیادہ فائدہ نہ اٹھایا جائے اور کیوں اس طرح زندگی بسر کی جائے گویا تیرھویں صدی میں بھی رہے ہیں جب چھپی ہوئی کتابوں کا وجود تک نہ تھا؟

بہ ہر حال آپ کے دماغ کی زندگی ہی آپ کی حقیقی زندگی ہے۔ جس سے آپ جانتے، سوچتے اور محسوس کرتے ہیں۔ آپ کے اندر آپ کی اپنی دنیا موجود ہے۔ کوئی شخص آپ کو اپنی اس اندرونی دماغی زندگی کو نشو و نما دینے سے باز نہیں رکھ سکتا۔ کوئی قانون آپ کو پیچھے نہیں دھکیل سکتا۔ اگر آپ دیکھنے اور پڑھنے کے قابل ہیں تو دنیا جہاں کی کتابیں آپ کے لیے ہیں۔ آپ انہیں خرید کر مانگ کر پڑھ سکتے ہیں۔

کسی بھی شخص کو الگ تھلگ، مایوس اور ناخواندہ رہنے کی ضرورت نہیں۔ کوئی شخص ناکام نہیں رہ سکتا، بشرطیکہ وہ ہر وقت اپنے پاس ایک مفید کتاب رکھنے کی عادت ڈال سکے۔

نئی نسل کیا پڑھتی ہے!

انتخاب وترتیب: عافیہ شاکر

جویریہ ظفر

طالبہ: بی ایس انگریزی، نمل اسلام آباد

شکسپیئر کے مطابق زندگی ایک سٹیج ہے اور ہم سب اداکار جو اپنا کردار ایک مخصوص وقت تک نبھاتے ہیں اور پھر گزر جاتے ہیں۔ ہم کتابوں میں کرداروں کو پڑھتے ہیں ہر صفحہ پلٹنے کے ساتھ ساتھ ہمارا تجسس بڑھتا جاتا ہے اور ایک نئی دنیا کے سفر پر نکل جاتے ہیں، حرفوں اور لفظوں کی دنیا، خوابوں، خواہشوں کی دنیا۔ ہیں افسانوی اور غیر افسانوی ادب میں مجھ جیسے ٹین ایجر افسانوی ادب کو ترجیح دیتے ہیں کیوں کہ ہمیں کہانیوں میں کہی باتیں زیادہ اچھی لگتی ہیں۔ گھر بیٹھے مختلف دنیاؤں کے دروازے کھول کر ان کے اندر جھانکنے، ان کے بہاؤ، ایڈونچرز اور ٹریجڈیز دیکھ کے ہم کہیں نہ کہیں خود کو انھی راہوں کے مسافر محسوس کر رہے ہوتے ہیں۔

انگریزی یا اُردو ادب ہر کوئی اپنے ذوق کے مطابق کتابوں کا انتخاب کرتا ہے کیوں کہ ادب کی کوئی جمالیاتی حد نہیں ہوتی اور ''انگریزی ادب بُرا اور اُردو ادب اچھا'' جیسے لیبلز نہیں لگائے جا سکتے کہ ہم پاکستانی ہیں تو اُردو ادب ہر قیمت پہ اچھا اور مغربی ادب ہر حال میں بُرا۔

بات اگر اُردو ادب سے شروع کی جائے تو حال ہی میں ایسے بہت سے ناول نگار موجود ہیں جو دلچسپ اور معیاری نمونے پیش کر رہے ہیں جیسے نمرہ احمد، عمیرہ احمد، سمیرا احمید اور ہاشم ندیم وغیر موجود ہیں جو بہت معیاری اور ضخیم ناول لکھ رہے ہیں۔ میں تو انھیں اچھے ناول سمجھتی ہوں مگر نقادانِ ادب انھیں تنقیدی سطح پہ معیاری ادب نہیں کہتے۔ میں اپنی پسندیدہ کتابوں اور اچھی کتابیں لکھنے والوں کی اگر ایک فہرست بناؤں تو مندرجہ ذیل ہوں گی:

نمل:

ایسی ایسی تخلیق کار ہیں جن کے لیے اگر کہا جائے کہ وہ بین الاقوامی معیار کا لکھتی ہیں تو غلط نہ ہوگا۔ ان کے بے حد مقبول ناولوں میں سے ایک ''نمل'' بھی ہے جو شاہ زیب قتل کیس اور

کامران فیصل قتل سے متاثر ہو کر لکھا گیا ہے۔ یہ دونوں کیس ہمارے معاشرے کا المیہ بھی تصور کیے جاتے ہیں۔ ایسے میں ایک حساس ذہن کیسے خاموش رہ سکتا ہے۔ اس ناول میں کی سب سے بڑی خاصیت یہ ہے کہ اس کے کردار بہت مضبوط ہیں، ان کا عمل، مکالمے، پلاٹ سب مل کے ناول کی کہانی کو ایک شاہکار کتاب بنا دیتے ہیں۔ ہر کردار بہت متحرک ہے اور سب سے خوبصورت بات یہ کہ کوئی بھی کردار مکمل (Perfect) نہیں ہے، ہر کوئی خامیوں اور خوبیوں، خیر و شر اور سفید اور سیاہ جیسے عناصر سے مزین ہے۔ فرق بس یہی ہے کہ جو شر کو خیر پہ ترجیح دینے میں کامیاب ہو جاتے ہیں وہ کاردرز اور جو اپنے شر سے لڑ کے خیر پا لیتے ہیں وہ یوسفز بن جاتے ہیں۔

''نمل'' سورۃ النمل سے ہے جس کا مطلب ہے ''چیونٹیاں'' جو کہ ایک قطار میں ایک ساتھ رہتی ہیں۔ خواہ گھر بنانا ہو یا کھانا تلاش کرنا ہو وہ ایک ساتھ رہتی ہیں۔ نمل بھی ایسی ہی کہانی ہے جو خاندان رشتوں کی بات کرتی ہے۔ یہ کہانی ہے قانون اور انصاف کی جنگ کی جہاں کچھ لوگ (یوسفز) قانون کے راستے سے انصاف لینا چاہتے ہیں مگر اس سے پہلے ہی کچھ ایلیٹس (کاردرز) قانونِ پاکستان'' کے تحت اپنی مرضی کا فیصلہ لے لیتے ہیں۔ یہ بات شاہ زیب قتل جیسے لوگوں کی کہانی ہے جو قانون کا دروازہ کھٹکھٹاتے ہیں مگر دروازہ کھلنے سے پہلے کوئی جیت جاتا ہے۔ اس ناول میں یہ بتایا گیا ہے کہ اصل جیت تو ''کوشش'' ہوتی ہے۔ نتائج تو اللہ کے ہاتھ میں ہوتے ہیں مگر ہمارا امتحاں تو ہماری کوشش کو آزمانے آتا ہے۔

یہ کہانی حسنین یوسف کی بھی ہے بلکہ ہم جیسی کئی لڑکیوں کی بھی جو اپنے اندر کے Monster کو قبول کر لیتی ہے جو اپنے ڈپریشن سے لڑتی، اور اپنے اندر کے کیڑے کو مارتی ہوئی اپنا ہیرو خود بن جاتی ہے۔ اپنے مرض کو علاج خود کرتی ہے مگر مرض کو ٹھیک کرنا اور اس کا علاج کرنا ضروری ہوتا ہے اُس کو بھول نہیں جاتے۔

جیسا کہ نام ہی سے ظاہر ہے اس ناول میں سورۃ النمل پہ غور و فکر کیا گیا ہے۔ یہ بتایا گیا ہے کہ قرآن مجید ہر زمانے کی کتاب کیسے ہے۔ مختلف کردار اپنی زندگی کے اہم موڑ پہ کیسے قرآن مجید سے رہنمائی لیتے ہیں۔ ناول کا سب سے دلچسپ منظر قرآن مجید کی آیت ''**وَأَوْحَىٰ رَبُّكَ إِلَى النَّحْلِ أَنِ اتَّخِذِي مِنَ الْجِبَالِ بُيُوتًا وَمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا يَعْرِشُونَ** (68)'' کے تناظر سے کی گئی ہے جس میں شہد کی مکھیوں کو ہماری آج کی جنریشن سے جوڑا گیا ہے۔ مکھیاں جس طرح اپنے پیچھے سگنلز چھوڑتی ہیں اسی طرح آج کی نسل موبائلز کا ستعمال کر رہی ہے۔

''نمل'' کوئی المیہ ناول نہیں ہے جس میں رونے دھونے اور جذباتی مناظر تو تصویر یہ بند کیا گیا ہو، بلکہ اس ناول میں ناول نگار نمرہ احمد ہر طرح کے حالات، جذبات، ہنسی خوشی، ایک گھر

کے مناظر جہاں ندرت اماں کا کردار ہماری ماؤں جیسا ہی ہے، بچیوں کے کم سگھڑ ہونے اور دوسروں کی بچیوں کے بہت سگھڑ، تیز طرار اور نمازی پرہیزگار ہونے پہ لیکچر دیتی نظر آتی ہیں۔

جنت کے پتے:

نمرہ احمد کا ایک اور مقبولِ عام ناول ''جنت کے پتے'' ہے، جنت کے پتے ہر وہ چیز ہوتے ہیں جو انسان رسوا ہونے کے بعد خود کو ڈھکنے اور دوبارہ عزت حاصل کرنے کے لیے اوڑھنا چاہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ جنت کے پتے اوڑھنے والوں کو رسوا نہیں کرتا۔

یہ کہانی اذیت سہنے والوں، مشکل حالات میں راستا ڈھونڈنے والوں، مسائل سے نہ گھبرانے والوں اور صبر کرنے والوں کی کہانی ہے جس طرح غزوہ خندق کی سختیاں جھیلنے والے صحابی تھے۔ نمرہ احمد نے اس ناول میں اُن حجابی لڑکیوں کو کہانی کا مرکزی کردار بنا دیا ہے جو اپنے حجاب کے لیے Stand بنا لیتی ہیں اہلِ مکہ اور بنو قریظہ کا سامنا کرتی ہیں۔ پھر ایک دن بغیر کچھ کھوئے، کسی محاذ پہ لڑے، بغیر کسی نقصان کے اچانک سیوہ جنگ جیت جاتی ہیں۔ حجاب کی آیت سورۃ احزاب میں ہے۔ اس ناول میں حجاب اور جنگ احزاب کی مماثلت بتائی گئی ہے۔

''جنت کے پتے'' میں قرآن مجید کی بہت سی آیات کو زندگیوں سے جوڑنے کی کوشش کی گئی ہیں۔ پس منظر میں زندگی کی بہت سی پہیلیوں کو حل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ سنسنی خیزی، تجسس، تحرک، پُراسراریت اور پہیلیوں سے بھرپور اس ناول کا آدھا حصہ پاکستان اور آدھا ترکی کے پس منظر میں تخلیق کیا گیا ہے۔ اس تناظر میں اسے سفرنامہ بھی کہا جا سکتا ہے۔

دی کائٹ رنر:

بات اگر انگریزی ادب کی کی جائے تو خالد حسینی کا نام نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جن، کے بہت سے ناول افغانستان پس منظر میں لکھے گئے ہیں۔ The kite Runner ان میں سے ایک ہے۔ دو افغان دوستوں کی کہانی جو Kite Tournament کے دوران ایک ایسے موڑ پہ آ کے رُکتی ہے جو ان دونوں کے لیے ہی دل دہلا دینے والی ہوتی ہے، دونوں کی دوستی کو نیا رُخ ملتا ہے۔ ۱۹۷۰ سے پہلے کا افغانستان اور روسی افواج کے آنے کے بعد افغانستان ان سب کی زندگیوں کی طرح ایک جیسا نہیں رہتا۔

یہ کہانی ہے دوستی اور وفاداری کی، ایک اسی غلطی اور غفلت کی جو بہت بڑے پچھتاوے اور نقصان کا باعث بنتی ہے۔ اس کہانی میں مرکزی کردار عامر کا بھی ہے جو اپنے پچھتاوے کا سفر کرتے کرتے Redemption تک پہنچتا ہے۔ وہ اپنے بچپن کے دوست (حسن) کے بیٹے کو

طالبان کے ہاتھوں سے بچالاتا ہے کیوں کہ یہی وہ راستہ تھا جس سے وہ اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرسکتا تھا۔

یہ کہانی حسن کی بھی ہے جو ذات پات میں کم حیثیت ہونے کے باوجود، اپنے دوست کی غلطیوں کے باوجود اپنی موت اپنے مالک اور دوست سے وفاداری کا ثبوت پیش کرتا ہے۔ کہانی کا پلاٹ اپنے گناہوں سے نجات پانے کی لازوال داستان پر مشتمل ہے۔

الکیمسٹ:

ہر لکھاری کی ایک کتاب ایسی ضرور ہوتی ہے جو اُس کی پہچان کا باعث بنتی ہے۔ الکیمسٹ بھی پائیلہو کولہو کی ایسی ہی کتاب ہے۔ یہ کہانی ایک گڈریے Shepherd boy کی ہے جو گڈریا اس لیے بنتا ہے کیوں کہ وہ دنیا دیکھنا چاہتا ہے۔ وہ اپنے خواب میں ایک خزانہ دیکھتا ہے۔ وہ ایک جگہ جہاں خزانہ موجود ہوتا ہے کو حاصل کرنے کے لیے سفر پہ چل پڑتا ہے۔ اس سفر میں بہت سے لوگوں سے ملتا ہے، ایک الکیمسٹ سے بھی ملتا ہے جو اس کو سکھاتا ہے کہ لیڈ کو کیسے گولڈ یعنی سونا بنایا جاسکتا ہے۔ وہ یہ سیکھتا ہے کہ کائنات کی ہر چیز کی ایک زبان ہوتی ہے:

Soul of the natural world

کائنات کے بہت سے راز ہیں جو وہی کھول سکتا ہے جو یہ زبان سیکھ جاتا ہے۔ جب وہ اس جگہ پہنچتا ہے تو اس کو معلوم ہوتا ہے کہ خزانہ تو وہاں تھا جہاں اس نے سب سے پہلے خواب دیکھا تھا پھر اُس کو یہ بات سمجھ آتی ہے کہ اس سفر کا مقصد اُس کو سکھانا تھا کہ منزل اہم نہیں ہوتی مگر منزل تک پہنچنے کا راستہ اہم ہوتا ہے۔ اُس کا اصل خزانہ وہ راز تھے جو وہ سفر میں جان لیتا ہے۔

Pride and prjudice

اگر بات انگریزی ادب کی کی جائے اور اٹھارہویں صدی کی جیم آسٹن کا تذکرہ نہ ہو تو ناول کی دنیا ادھوری معلوم ہوگی۔ Pride and Prejudice ایسا ناول ہے جو آج تک سب سے پڑھا جانے والا ناول ہے، اپنی زبان اور مکالمات کی وجہ سے اسے خاص شہرت ملی۔ ناول میں Protogonist کو انگریزی ادب کی ملکہ کہا جاتا ہے کیوں کہ الزبتھ ایک ایسا کردار ہے جو اٹھاہوریں صدی کی ایک روایتی عورت کے لیے بڑا چیلنج تھا۔ یہ ناول معاشرے کے لیے ایک ایسا صدمہ ہے جہاں شادی اور رشتوں کی بنیاد پیسے پر ہوتی تھی اور یہ ناول آج تک مشرق اور مغرب میں زندہ ہے کیوں کہ وہ عناصر جن کے خلاف جین آسٹن نے آواز اٹھائی تھی آج تک موجود ہیں۔ ایک انسان کی حتمی رائے دوسروں کے لیے، اس کو اپنے prejudice میں اندھا کر دیتی ہے اور وہ حقیقت کا پردہ اٹھانے سے محروم ہوجاتا ہے۔ Irony سے بھرپور یہ ناول بہت

خوبصورت انداز میں لکھا گیا ہے۔

کتابیں انسان کے لیے بہت سے دروازے کھولتی ہیں مگر سب سے اہم بات یہ ہے کہ ان کو صرف وقت گزارنے کا ذریعہ نہیں ہونا چاہیے بلکہ ان میں Live کیا جانا چاہیے تب ہی ایک ناول کی دنیا منکشف ہوسکتی ہے۔ دوسری بات یہ کہ ناولوں پہ لیبل نہیں لگانے چاہیے کہ یہ ناول فلاں رویوں، ازم سے تعلق رکھتا ہے۔ ہر ناول کی دنیا ایک مکمل اور دوسری دنیاؤں سے مختلف ہوتی ہے۔

یحییٰ سعید

عمر 18 سال، کلاس: انٹرمیڈیٹ، ملتان

فیس بُک اور سوشل میڈیا پہ انگریزی ناول الکیمسٹ'' کی تعریف کا بہت شور سنا اور اس کے متعلق مختلف لوگوں کی آراسنیں۔ میں نے یہ ناول پچھلے ہی ہفتے بڑی فراغت میں پڑھا۔ دو دن کے مطالعے کے بعد میں اس نتیجے پہ پہنچا کہ یہ ناول کسی بھی عام ناول سے کچھ خاص زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ میں بلاشبہ چند ایک باتیں ایسی ہیں جن میں حوصلہ، ہمت اور مستقل مزاجی کا سبق ملتا ہے مثلاً اس میں ایک لائن ہے

When you really want some thing the whole universe conspires to help you.

جس نقطہ نظر سے میں نے اس کا مطالعہ کیا ہے تو مجھے اس میں حقیقت نہ ہونے کے برابر نظر آئی ہے۔ ہمیشہ ایک اچھے ناول کی خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ اپنے قاری کو اپنے کرداروں میں شامل کرے۔ اس ناول میں ایک لڑکے کو خزانے کے خواب آنا۔ راستے میں بڑھاپا کا کچھ حصہ مانگ کر خزانے کے حوالے سے بتانا اور ایک بادشاہ جو بادشاہ ہو کے بھی بھیڑ والوں سے اُس کی ساری لے کر ضرانے کا راز بتاتا ہے۔ ان باتوں کا حقیقت ے کوئی تعلق لینا دینا نہیں۔ ان کے ذریعے مصنف نے اپنے طور پر چند ایک کام کی باتیں بتاتا ہے۔

اب اگر مصنف نے یہ بات سکھائی تھی کہ مضبوط عزائم ہوں تو منزل یقینی ہے تو اس کو چاہیے تھا کہ کوئی ایسی کہانی ہوتی جس کا حقیقت سے گہرا تعلق ہوتا جو قاری پہ بھی اثر انداز ہوتی۔

ضیاء ثقلین

عمر 18، کلاس: انٹرمیڈیٹ، جہانیاں، خانیوال

میں بارھویں جماعت کا طالب علم ہوں۔میرے امتحانات ہو گئے ہیں اور میں یونیورسٹی میں داخلے کی تیاری کر رہا ہوں۔ بہت سے لوگ ناول تفریح کے لیے پڑھتے ہیں مگر میں اسے اصلاح کیلیے پڑھتا ہوں اور اسی مقصد کے لیے آج اس بندہ ناچیز نے قلم اٹھایا ہے

مصحف

مصنفہ:نمرہ احمد

کل صفحات:357

قیمت:700

تبصرہ:

نمرہ احمد پاکستان کے ناموراد یبوں میں شامل ہیں۔ان کے بہت سے شاہکار ناول ہیں جن میں پاکستان کی اصل ثقافت پڑھنے کوملتی ہے۔ان کا یہ ناول پڑھ کر دل کو بہت ہی سکون ملا کیونکہ انہوں نے نوجوان نسل کوقرآن پاک سے راہنماء حاصل کرنے کے بارے میں جو مسحور کن کہانی کا پلاٹ تیار کیا ہے وہ شاید ہی کوءاور کرسکتا ہو۔کہانی ایک لڑکی کے مرکزی کردار سے شروع ہوتی ہے جس کو آہستہ آہستہ قرآن پاک سے راہنماء کا موقع ملتا ہے۔اور بڑی خوبصورتی سے وہ قاری کواس بات کا کامل یقین دلاتی ہیں کہ:"یہ کتاب جس میں کوءشک نہیں اور مومنوں کے لیے ہدایت ہے"۔انہوں نے ایک ایسے طبقے کی طرف بھی اشارہ کیا ہے جوقرآن پاک کی تشریح اپنے مقصد کے مطابق کر کے ہی مطمئن ہو جاتا ہے جو گمراہ ہو جاتا ہے۔ بہت سے قاری غلطی کر جاتے ہیں کہ وہ اس کوایک تفریح کے نظریے سے پڑھتے ہیں جبکہ اگر ہم اس کو اصلاح کے نظریے سے پڑھیں تو یہ ہمارے اندر قرآن مجید کو سمجھ کر پڑھنے کی شدید خواہش پیدا کرنے کے لیے کافی ہے۔قرآن مجید کو درست سمجھ کر پڑھیں یہ ہی اس کتاب کا مقصد ہیاور ایک مقصد یہ بھی ہے کہ ہم اپنے بچوں کی خاص کرلڑکیوں کی اسلامی تربیت پر توجہ دیں۔آج کل تو یہ بہت ہی آسان ہو گیا ہے کیونکہ سوشل میڈیا پر بہت سے ایسے نیٹورک موجود ہیں جو گھر بیٹھےلڑکیوں کو اسلامی تعلیم کے کورس کرواتے ہیں اور با قاعدہ امتحانات کے بعد انہیں اسناد بھی دیتے ہیں۔مگر ضرورت ہمیں صرف تلاش کرنے کی ہے۔ میں اپنے عنوان سے ہٹ گیا تھا مگر یہ ضروری تھا کہ اس ناول کا مقصد بیان کیا جائے۔نمرہ احمد کے ناولوں میں اسلام کے ساتھ جڑنے کا تاثر ہمیں کہیں نہ کہیں مل ہی جاتا ہے۔امید ہے کہ آپ میرے نظریے سے متفق ہوں گے۔

مریم سمیع خان

This book is a masterpiece travelogue written by Mustansar Hussain Tarar.
This book is such an adventure where the writer takes you to Spain (undlas of moors) along with him.
The way he explains these places like Gharnada, Ashbelia, Qastaliya, Qasr e Alhambra k Surkh Meenar and the mosque of cordoba with such an attraction that reader becomes mesmerized and feels as if he were really there with him!
The way he explains the customs and cultures in spain, and the enthraling savage Bullfight is just priceless!
This book is more like wandering and finding new places, meeting new people, and making friends, basically enjoying and living in the moment!

تلاش

This book is written on tasawuf by Mumtaz Mufti. It is based on his quest in finding the true meaning of Islam.
He expresses his feelings and questions that arise in his mind that most of the Muslims can relate to!
This book provides a deep insight to the reader on the religion and the love of Allah almighty.
It provides guidance on how our religion is supposed to be and the role of the misguiding Scholars who only care for their vanity!
His thoughts are different and his way of expressing

them is different, but he focuses on being a good and down to earth person and connecting to Allah by heart!

<u>ہیری پوٹر</u>

My favorite book in the Harry Potter series
The story depicts friendship, love, bravery loyalty and also on a broad level it also explains the society, the role of media, the role of the government, and higher authorities.
Harry Potter is my favorite character and the best thing about him is that he is not depicted as the hero and the best man! But JK Rowling has made him so real..a typical mediocre teenager! He's brave and confident, loyal and witty. Also he's obsessive, stubborn, sassy and kind of arrogant!
And Sirius Black! I love this character, he's the most loyal best friend of Harry's late father.. James Potter, And Harry's godfather.. He's now the only family that Harry's got, he's the only one who understands him. He's the coolest godfather ever! And he dies at the end of the book saving Harry!
This book drives you through humor and fun, jealsosy, sass, pain, fear, anger and loss and more pain! This book kind of drags you in and you can never actually get out of it!

<u>*4.Ella Enchanted:*</u>

It's a modified Cinderella story
Ella being blessed by "the gift of obedience" by a fairy on her birth. This gift has played the role of curse for her, because she has to follow each and every order given to her no matter given by a friend or foe.
But Ella is a strong and smart girl, a little clumsy and she's got a good sense of humor. She comes up with creative, inventive ways to defy the orders. This creativity is one of the things that prince charmote falls in love with her! The story's a fairytale with giants, ogres, elves, fairies, stepmother and stepsisters! And a lot of twists and turns.

ایمن طاہر

عمر: 22 سال، سرگودھا

۱-محمد عربی (ﷺ)　　*مصنف: محمد عنایت اللہ سبحانی*

یہ کتاب میں نے دسویں جماعت میں پڑھی تھی۔ یہ کتاب رسول اکرم (ص) کے حیات طیبہ پر لکھی گئی ہے۔ جب میں نے اس کتاب کو پڑھنا شروع کیا تھا تو مجھے ایسا لگتا تھا کہ میں بھی اس خوبصورت دور میں موجود ہوں۔ اور سب کچھ میری نظروں کے سامنے ہو رہا ہے۔ حتیٰ کہ جب اس کتاب کا اختتام ہوا جہاں آپ (ص) کے وصال کو تفصیلاً بیان کیا گیا ہے تو خود بخود آنکھوں سے آنسوں جاری ہو گئے اور ایسا لگا کہ آپ (ص) حقیقتاً ہم سے جدا ہو گئے ہوں۔
میں نے اس کتاب کے الفاظ کو آسان پایا۔ اور نہ ہی یہ بہت طویل کتاب تھی۔ بلکہ اس میں بہت مختلف اہم واقعات کو جامع انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں آپ (ص) کی حیات مبارکہ کو پڑھ کر جو میں نے سبق سیکھے وہ یہ ہیں:

- اخلاق اور حسنِ اخلاق کا کامل ترین نمونہ ہے آپ (ص) کی ذات۔
- زندگی عزم و حوصلے اور صبر و استقلال سے گزاری جائے۔
- اللہ تعالیٰ کی عبدیت اور بندگی ہی ہماری اولین ترجیح ہونی چاہیے۔

غرض بہت کچھ سیکھنے کوملا جس میں سے میں نے چند ایک کا ہی ذکر کیا ہے۔
یہ ایک بہترین کتاب ہے جو پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔اللہ عمل کی توفیق عطا فرمائے۔

وہ جان حیات کون ومکاں روح کات انسانی
وہ جسکی بلندی کے آگے افلاک ہوئے پانی پانی
وہ فقر کا پیکر جسکے قدم چھوتا ہے شکوہ سلطانی
ان سے ہی مجھے نسبت ہے مگر کب انکی حقیقت پہچانی
احساس خطا کی پلکوں سے آنسو بن کر گر جاتا ہوں
کہنے کو مسلمان میں بھی ہوں لیکن کہتے شرماتا ہوں

2*-مصحف:* **مصنف:نمرہ احمد**

اس کتاب کو پڑھنے کے بعد جو میرے تاثرات تھے وہ یہ ہیں کہ:
-قران پاک وہ کتاب ہے جو بحیثیت مسلمان ہم سب کو سمجھنی چاہیے۔

اس کی عربی پڑھ کر ہم اکتفا نہیں کر سکتے کیونکہ ہماری مادری زبان اردو ہے اور جب تک اسکا اردو ترجمہ نہ پڑھیں ہم اسکی روح تک نہیں پہنچ سکتے۔ہم کیسے سمجھ سکتے ہیں کہ ہمارا اللہ ہم سے کیا کہنا چاہتا ہے اور ہمیں پھر کیا کرنا چاہیے۔آزمائش اور مصائب جو ہمارے لیے لکھ دیے گئے ہیں وہ ہمیں مل کر ہی رہیں گے۔فرق یہ ہوگا کہ اگر ہم قرآن سے دور رہیں گے تو یہ مشکلات ہمیں پاگل کر دیں گی اور اگر ہم قرآن سے قریب ہوں گے تو ان مشکلات سے نکلنے کا راستہ ملے گا۔

اگر اللہ تعالٰی نے آپکو ایمان کی دولت سے نوازا ہے اور "العلم" عطا کیا ہے تو کبھی بھی اس پر غرور اور ناز نہ کریں۔دوسروں کو کمتر مت سمجھیں بلکہ ہمیشہ اللہ سے دعا کریں کہ وہ آپکو ثابت قدم رکھے اور غرور و تکبر جیسی بیماری سے بچائے۔حسن اخلاق سے پیش آیا جائے خواہ کوئی آپکے ساتھ کتنی ہی بداخلاقی کیوں نہ کرے۔اگرچہ یہ بہت مشکل کام ہے لیکن کوشش اور دعا کی جا سکتی ہے۔

3*-سو عظیم مہمات* ***مصنف:جان کیننگ*** **ترجمہ:قیصر چوہان**

اس کتاب میں دنیا بھر میں ہونے والی مہمات میں سے سو عظیم مہمات کا ذکر ہے۔
سب سے بڑی خوشی اس کتاب کو پڑھ کر جو مجھے ہوئی تھی وہ یہ تھی کہ ان سو عظیم مہمات میں سب سے پہلی مہم "آپ (ص) کی مکہ معظّمہ سے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت" کا ذکر کیا گیا ہے۔جو میرے خیال میں بحیثیت مسلمان ہم سب کے لیے خوشی کا باعث بھی ہے اور لمحہ فکریہ بھی۔
خوشی کا باعث اس لیے کہ اللہ نے آپ (ص) کی عظمت کو نہ صرف مسلمانوں بلکہ پوری دنیا کے لوگوں کے دلوں میں پیدا کیا ہے کہ اہل مغرب بھی آپ (ص) کی فتح و کامیابی کو تسلیم کرتے ہیں۔

اور لمحہ فکریہ ہمارے لیے یہ کہ ہم ان تعلیمات سے کوسوں دور------!

خیر اس کتاب میں باقی 99 مہمات مختلف مما لک کے مختلف لوگوں کی ہیں جو کہ واقعی قابلِ قدر ہیں۔اس کتاب کو پڑھ کے جو مجھے سبق ملا وہ یہ ہے کہ حالات کیسے بھی ہوں ہمیں اپنے اوپر یقین کرنا چاہیے اور بہادری سے ان حالات کا مقابلہ کرنا چاہیے۔

اس کتاب میں بہت ہی دلچسپ اور سنسنی خیز مہمات کا زکر بھی کیا گیا ہے جو کسی بھی عام انسان کی رگوں میں خون دوڑانے کے لیے کافی ہے۔اس کتاب کے شروع میں ایک قول ہے نو مجھے بہت پسند ہے: "جرات بہادری متاعِ عزیز ہے۔اگر جرات اور بہادری رخصت ہو جائے تو سمجھ لیں کہ سب کچھ رخصت ہو گیا ہے."(سر جیمز باری)

عائشہ افق

عمر:22 سال،سرگودھا

اور باقی جن کتابوں کا زکر تھا وہ مجھے اسلیے پسند کے وہ سنسی خیز ہیں . جاسوس اور پھر جانے اب اس سین کے بعد کیا ہو تھرل . تجسس ہے اسلیے مجھے پسند ہیں...

سفر نامے میں ریلیکس ہونے کو پڑھتی ہوں .

*مستنصر حسین تارڑ کے سفر *نامے جن میں کے ٹو کہانی، . ہنزہ داستان،سفر شمال کے،شمشال بے مثال، یاک سرائے،سنو لیک، لاہور آوارگی، کالاش، نانگا پربت. ، برفیلی بلندیاں اور رتی گلی شامل ہیں.

طارق اسمٰعیل ساگر کے ہاتھوں رقم سیاچن گلیشیر پہ دفاع کی جنگ لڑتے فوجیوں کی داستان "اے راہ حق کے شہیدو" اور ہندو مظالم کے خلاف سکھوں اور مسلمانوں کی بقائی جنگ کی کہانی "چناروں کے آنسو."

" کمانڈو فور" از منیر احمد راشد سقوط ڈھاکہ کی کہانی ہے . پاکستان کو دولخت ہونے سے بچانے کے لیے ایک سابقہ فوجی کی کاوشوں پہ مبنی ناول.

گوریلا فائٹرز " مصنف شان مسلم دین اور وطن سے محبت کرنے والے 4 بہترین دماغوں کے کارناموں پہ مبنی ناول جنھوں نے اسرائیلیوں کو ناکوں چنے چبوا دیئے . چاروں خداد صلاحیتوں کے مالک تھے . ایک سونگھنے کی حس میں اپنا ثانی نہ رکھتا تھا تو دوسرے کی فوٹو گرافک میمری بہت تیز تھی تیسرا جوڈو کراٹے کا ماہر

سیف اعجاز

گوجرہ، عمر ۱۸، (طالب علم: سیکنڈ ائیر)

۱۔عجائب القرآن مع غرائب القرآن

بلاشبہ قرآن کریم اس کائنات کی سب سے بہترین تصنیف ہے اور دنیا کے تمام علوم اسی سے ماخوذ ہیں۔عجائب القرآن مع غرائب القرآن قرآن کریم میں بیان کیے گئے معجزات اور بہت سے تاریخی واقعات کی مفصل وضاحت دیتی ہیاوران معجزات کے رموز واسرار کیساتھ ساتھ ان واقعات میں پوشیدہ عبرتوں اور نصیحتوں کو بیاں کر کے اپنے قاری کو غورو فکر کرنے پر مجبور کرتی ہے۔

۲۔الفتوحات المکیہ

ہر انسان لازماں اور لامکاں کی تلاش میں ہے اور خدا کی رحمت کا عالم دیکھیں کہ وہ ھر انسان کے قلب پر ایسی کیفیات زندگی میں ایک بار ضرور وارد کرتا ہیکہ وہ راہِ حق پر چلتے ہوئے اس سے ملنے کے لیے فنا ہو جائے اب یہ منحصر ہے تو بنی نوع انسان پر۔میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ دنیائے تصوف کی سب سے بہترین کتاب ہے اور اس بات کا دعوی کرسکتا ہوں کہ یہ کتاب مٹی کو کندن بنانے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

۳

کیمیائے سعادت

ابنِ آدم روزِ ازل سے حق اور قلبی سکون کا متلاشی ہے۔امام غزالی کا یہ شاہکار اس حوالے سے بے نظیر ہے۔روحانیت اور نفسیات کے متعلق جس عمدہ انداز سے ذکر کیا گیا ہیوہ اسے فلسفہ کی دنیا کا شاہکار بناتی ہے۔عقائد وعبادات کے حوالے سے بہترین رہنمائی کرتی ہے اور حق و باطل میں فرق کرنے کے علاوہ احوالِ باطن سے مردہ اٹھاتی ہے۔یہ کتاب دنیائے تصوف کی پہلی سیڑھی ہے۔

۴

فوزِ مبین در ردِ حرکاتِ زمین

سائنسی علم دنیا کا سب سے مستند علم گردانا جاتا ہے کیونکہ یہ اعداد وشمار اور حقائق و دلائل پر مبنی ہے۔سائنس کا دعوی ہے کہ زمین حرکت کرتی ہیمگر امام احمد رضا اس کتاب میں ایک سو سے زائد دلائل کے ساتھ ساتھ قرآنی آیات کا حوالہ دیتے ہوئے زمین کے ساکن ہونے کا ثبوت دیتے ہیں اور اگر یہ درست ہے تو پھر دن اور رات کی پیدائش کس نقطہ کی بنیاد پر ہوتی ہے؟؟

۵

جب زندگی شروع ہوگی

خالقِ جہاں فطرتِ بنی نوع انساں سے بخوبی آشنا ہے۔ انسان اس فانی دنیا کو اپنا ابدی ٹھکانا سمجھتے ہوئے اس کی رنگینوں اور نظر کو خیرہ کرنے والی روشنیوں میں گم ہو جاتا ہے۔ مگر یہ ناول انسان کو اس دنیا کی حقیقت سے روشناس کرواتا ہے۔ روزِ محشر کی جس انداز سے منظر کشی کی گئی ہے اور جس احسن طریقے سے بہشت اور جہنم کا ذکر کیا گیا ہے وہ انسان کو راہِ حق پر چلانے کے لیے کافی ہے۔

محمد عثمان

کلاس: ICT، عمر: ۱۹ سال، گوجرہ پنجاب

راجہ گدھ:

یہ ناول اُردو ادب کے صفِ اول کے ناولوں میں شمار ہوتا ہے۔ میں نے توجہ سے اسے پڑھا ہے۔ اس کا موضوع حرام رزق پہ ہے۔ بانو قدسیہ یہ بتاتی ہیں کہ کس طرح حرام رزق نسلوں میں منتقل ہو کے انسانی نسلوں کو خراب کر دیتا ہے۔ اس کے علاوہ اس ناول میں عشق اور ہوس میں بھی بنیادی فرق بتانے کی کوشش کی گئی ہے۔

اے غزالِ شب:

مستنصر حسین تارڑ کا یہ ناول USSR کے انہدام کے بعد حقیقی نظریاتی بے اعتمادی اور بے یقینی پہ لکھا گیا ہے۔ اس ناول میں تارڑ ہمیں بتاتے ہیں کہ کس طرح وہ ممالک جو کمیونزم کے سربارہ بنے ہوئے تھے اس انہدام کے بعد نظریں چرانے لگے۔ ترقی پذیر اقوام کے کمیونسٹ کارکن اسی امید پہ زندگی گزارتے رہتے ہیں کہ ہم دیکھیں گے!

الکیمسٹ:

پائلو کولہو کا یہ ناول دنیا کا کامیاب ترین ناول کہا جاتا ہے۔ اس میں مصنف نے نہایت ہی عمدہ طریقے سے لکھا ہے کہ کسی بھی کام میں ''شگون'' کی اہمیت بہت زیادہ ہوتی ہے۔ خدا ''شگون'' کی زبان میں انسان سے بات کرتا ہے۔ یہ ناول پڑھنے کے بعد میں کئی دن تک اس کے سحر سے نہیں نکل سکا۔

’دوام‘: پہاڑوں کی وادی کوئٹہ سے ایک منفرد ناول

فواد رضا

اُردو ناول پہ موضوعات کی قلت کا الزام لگایا جاتا ہے۔ عموماً ناول لگے بندھے موضوعات کے گرد گھومتے ہیں۔ ناقدین کی رائے قابلِ احترام صحیح لیکن کوئٹہ سے تعلق رکھنے والی نوجوان مصنف صادقہ خان اس رائے کی نفی کرتی نظر آتی ہیں۔ پہلی بار جب انہوں نے مجھے بتایا کہ انہوں نے ماحولیاتی تبدیلیوں پر ایک ناول لکھا ہے تو میرے اندر موجود قاری کی تمام تر حسیات یک دم بیدار ہوگئیں کہ یہ ایک منفرد خیال ہے جسے شاید اردو ادب میں پہلی مرتبہ برتا جا رہا ہے۔ فوراً ہی دوسرا خیال ذہن میں ابھرا کہ اس حوالے سے مستنصر حسین تارڑ صاحب ’بہاؤ‘ کے عنوان سے ناول تحریر کر چکے ہیں، بہرکیف جب مسودہ سامنے آیا تو یہ بات صاف ہوگئی کہ یہ بہاؤ سے مختلف موضوع ہے، بہاؤ یقینی طور پر ایک خاص طبقے کے قارئین کے لیے لکھا گیا ہے لیکن دوام کی بنت اس طرح کی ہے کہ معاشرے کے ہر طبقے سے تعلق رکھنے والا شخص اسے نہ صرف پسند کرے گا بلکہ یہ با آسانی قاری کے حلق سے بھی اتر جائے گا۔ بہرحال طے یہ پایا کہ اس ناول کو اے آر وائی نیوز کی اردو ویب سائٹ پر قسط وار شائع کیا جائے اور پھر یہی کیا گیا۔

صادقہ خان اس سے قبل میری فرمائش پر سائنسی موضوعات پر مضامین تحریر کرتی رہی تھیں اور یہ سلسلہ تا حال جاری ہے، اور میرا ذاتی خیال یہ تھا کہ یہی ان کی مہارتوں کا میدان ہے تاہم جب مجھے ناول کا مسودہ موصول ہوا تو اندازہ ہوا کہ پہاڑوں میں گھرے شہر کوئٹہ میں رہنے والی یہ نوجوان نہ صرف سائنسی موضوعات پر دسترس رکھتی ہے بلکہ ادب کو بھی عمدہ پیرائے میں قلم بند کرنا اچھی طرح سے جانتی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ پاکستان کے نوجوان طبقے میں سائنسی موضوعات میں دلچسپی کے لیے ہر ممکن کوشش کرتی رہتی ہیں، وہ خود ابھی نوجوان ہیں ار فکر و خیال کی منزلیں طے کر رہی ہیں لیکن اپنے ساتھ اپنے جیسے کئی نوجوانوں کو بھی اپنی دھرتی پر ہی چلنے کا سلیقہ بھی سکھا رہی ہیں۔

دوام— کہانی ہے ایک ایسی لڑکی کی، جس کا مسکن پاکستان ہے اور وہ چاہتی ہے کہ اس کے ملک کا نام افلاک کی رفعتوں سے بلند ہو کر خلاؤں میں لکھا اور سنا جائے اور یہی خواہش اس لڑکی کو

امریکا کے خلائی تحقیقات ادارے ’ناسا‘ تک لے جاتی ہے۔ تنقید کرنے والے کہتے ہیں کہ پاکستان میں خواتین کو صرف ایک مخصوص نوعیت کے ڈرامے اور ناول پسند ہیں اور وہ ان سے باہر نکلنا نہیں چاہتیں تاہم اس ناول کو پڑھتے ہوئے مجھے اندازہ ہوا کہ یہ تنقید قطعی طور پر غلط ہے بلکہ اصل بات یہ ہے کہ یہاں خواتین کو عشق و محبت کی داستانوں سے ہٹ کر کسی تجرباتی ناول کا مرکزی کردار بنانے کی ہمت کبھی کسی مصنف نے کی ہی نہیں۔

صادقہ خان اپنے ناول دوام میں آپ کی ملاقات ’منتہا‘ نام کی ایک ایسی لڑکی سے کرا رہی ہیں جس کے پاس روایتی عشق و محبت جیسے موضوع کے لیے بالکل بھی وقت نہیں ہے بلکہ وہ اپنی زندگی میں کچھ اہم مقاصد لے کر آگے بڑھ رہی ہے اور اس کا ہر قدم کامیابی کی جانب اٹھتا ہے۔ مصنف آپ کو یہ بھی دکھائیں گی کس طرح پاکستان کی ایک لڑکی خلاو؟ں تک اپنے لیے راستے بناتی ہے۔ ناول میں ایک موڑ ایسا آتا ہے جب آپ کو لگے گا سب کچھ ختم ہو گیا لیکن ایسا ہرگز نہیں ہے، وہ موڑ تو شروعات ہے نئی انتہاؤں کی جہاں منتہا جانا چاہتی ہے، جہاں صادقہ خان جانا چاہتی ہے اور یہ بھی چاہتی ہیکہ پاکستان کی ہر لڑکی ان رفعتوں تک پہنچے۔

صادقہ خان کا ناول سائنس اور ماحولیاتی تبدیلیوں جیسے خشک موضوع پر لکھا گیا ہے لیکن صادقہ نے اس کی بنت خالصتاً پاکستانی تعلیمی اداروں کے روایتی ماحول کو مدنظر رکھتے ہوئے کی ہے اور آگے جا کر ہم پاکستانیوں اور امریکیوں کے سماجی رویوں میں موجود واضح فرق کو بھی باآسانی محسوس کر سکیں گے۔ اس ناول کی مرکزی کردار پہلے ایک چھوٹے سے شہر سے لاہور کا سفر کرتی ہے اور اس کے بعد امریکا کی راہوں پر گامزن ہوتی ہے۔ ناول کے ہر موڑ پر رویوں اور رشتوں کو بے حد اہمیت دی گئی ہے اور سائنسی موضوعات کے ساتھ معاشرتی رویوں کو کچھ اس طرح گفتگو کا موضوع بنایا گیا ہے کہ روایتی ناولوں کا قاری بھی ایک لمحے کو بوریت محسوس نہیں کرے گا۔ کیونکہ عشق ہماری مٹی میں، ہمارے خمیر میں شامل ہے اور اردو ادب کی روایات کا حصہ بھی لہٰذا دوام میں بھی ایک لافانی عشق کی داستان ہے لیکن صادقہ کے ہاں عشق و محبت کا انداز بالکل ہی منفرد ہے اور روایتی رومانوی ناولوں کے مداحوں کے لیے شاید یہ ایک پھیکا ناول ثابت ہو، تاہم معاشرے کے وہ صحت مند اذہان جو محبت کو محض جنسی اتصال سےآگے کی شے سمجھتے ہیں انکے لیے یہ ناول اپنے اندر ایک شاندار عشقیہ داستان لیے ہوئے ہے۔

اہم بات یہ ہے کہ عشق کی یہ داستاں ناول کا مرکزی خیال ہرگز نہیں ہے، یعنی مص ف قاری کو اپنے ساتھ لے کر اختتام کی جانب جب گامزن ہوتی ہیں تو یہ سفر کسی حجلہ عروسی میں اختتام پذیر نہیں ہوگا، نہ ہی صادقہ قاری کو کسی المناک رومانوی داستان کی مانند ایک المیہ اختتام پر لا کر

چھوڑیں گی بلکہ ناول کا اختتام قاری کو ایک الگ ہی جذبے سے مہمیز کرتا ہے۔ جہاں تک بات ہے زبان و بیاں کی تو صادقہ کے ہاں انتہائی سادہ زبان کے استعمال کا رواج دیکھنے میں آیا ہے، ان کی یہی صلاحیت سائنسی مضامین کے میدان میں انہیں چند ہی مہینوں میں پاکستان کے مرکزی میڈیا ہاؤسز میں جگہ دلا پائی تھی کہ وہ مشکل بات بھی آسان لب و لہجے میں کہنے کی عادی ہیں۔

صادقہ کیونکہ سائنس کی دنیا سے تعلق رکھتی ہیں تو روایتی مصنفین کی نسبت انہوں نے ناول کو فروخت کرنے کے لیے بھی جدید طریقہ ہی استعمال کیا اور اسے کسی پبلشر کے ہاتھوں میں دینے کے بجائے آن لائن فروخت کیا، آج کی دنیا میں جہاں چند گنے چنے ناموں کے سوا کوئی مصنف نہیں بکتا، حیرت انگیز طور پر صادقہ کا پہلا ایڈیشن ختم ہونے والا ہے اور چند روز قبل ہی وہ مجھ سے سوال کر رہی تھیں کہ آیا دوسرا ایڈیشن نکالا جائے یا پھر زیرِ تکمیل ناول کی اشاعت پر توجہ دی جائے۔ مجھے امید ہے کہ سائنس کی طرح ادب کے میدان میں بھی ایک تابناک مستقبل صادقہ خان کا انتظار کر رہا ہیا اور جیسے جیسے ان کا کام آگے بڑھتا جائے گا، نئی راہیں صادقہ کے حق میں وا ہوتی جائیں گی۔

مجھے امید ہے کہ یہ ناول یقیناً اردو ادب کو ایک نئی سمت عطا کرے گا اور یقیناً اس کے بعد مزید مصنفین کو نئے تجربے کرنے کی ہمت ہوگی، یاد رکھیے ادب کی دنیا میں تجربہ ہی سب کچھ ہے۔ صرف وہی مصنف عوام میں مقبول ہوتا ہے جو روایت سے ہٹ کر تجربے کی راہ اپنائے۔

”بے پناہ شادمانی کی مملکت“ ایک مطالعہ

رابعہ رحمٰن

The God of Small Things کی مصنفہ ارون دھتی رائے کا شمار عالمی شہرت یافتہ ناول نگاروں میں ہوتا ہے۔ ارون دھتی رائے 1961ء میں پیدا ہوئیں۔ ان کے پہلے ناول نے بُکر پرائز (Booker Prize) جیتا اور جس کا ترجمہ چالیس سے زیادہ زبانوں میں ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ ارندھتی رائے کی متعدد کتابیں غیر افسانوی موضوعات پر شائع ہو چکی ہیں جن میں ابدی انصاف کا الجبرا (The Algebra of Infinite Justice) ٹڈی دل کی آہٹ (Listening to grasshoppers) اورٹوٹی پھوٹی ری پبلک (Broken Republic) شامل ہیں۔ ارون دھتی رائے آج کل دہلی میں مقیم ہیں۔

ارون دھتی رائے برصغیر اور خاص طور پر ہندوستان کی سیاست اور تہذیب و معاشرت پر بے باک نظریات اور بے لاگ آرا رکھنے والی ایک نہایت بلند اور نمایاں آواز ہیں۔ اور یہ آواز ان کی شب و روز کی محنت کا صلہ ہے جو انہوں نے مختلف احتجاجی جلوس اور ہڑتالوں میں حصہ لے کر حاصل کی۔ اس ساری جدو جہد میں وہ جیل بھی گئیں قتل کی دھمکیاں بھی ملیں۔ مگر ان مظالم اور بے انصافیوں کے خلاف ان کا قلم چلتا رہا اور وہ اپنے قلم کو ان عناصر کے خلاف استعمال کرتی رہیں۔

بے پناہ شادمانی کی مملکت ان کے دوسرے ناول (The Ministry of Utmost Happiness) کا ترجمہ ہے جو ان کے پہلے ناول کے بعد 20 سال کے وقفے سے جون 2017ء میں شائع ہوا۔ ارون دھتی رائے کی ایما پر اس کا ترجمہ ارجمند آرا نے کیا۔ اور ترجمہ کو زیادہ بامعنی اور اصل بنانے کے لئے خود اپنے چند دوستوں کے ساتھ مل کر اس ترجمہ کو سنتی تھیں۔ اور زبان و بیان اور اسلوب کی باریکیوں کے ساتھ ساتھ کشمیری زبان کے الفاظ، جگہوں کے نام، ان کے صحیح تلفظ، کشمیر میں مستعمل اردو اصطلاحات پر خاص توجہ دے کر اس ترجمہ کو بہترین بنایا گیا۔ اس ناول کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جائے کہ بے پناہ شادمانی مملکت کی ہندوستان ہی میں نوے ہزار سے زیادہ کاپیاں فروخت ہوئیں۔ اور اس کا ترجمہ کل ملا کر 42 زبانوں میں ہو چکا ہے۔

اس ناول کا مرکزی موضوع کشمیر میں ہونے والے مظالم اور تشدد کے تلخ تجربات ہیں۔ مصنفہ نے تلوتما کے کردار کے ذریعہ اس دستاویزی ناول میں ہندوستان کی جس تہذیبی اور سیاسی فضا کو بیان کیا اس کا تعلق بنیادی طور پر ہندی اور اردو بولنے والی شمالی خطے سے ہے۔ اُرندھتی رائے نے نہایت بے باکانہ انداز میں ان تمام مناظر، جدوجہد اور تحریکوں کو بیان کیا ہے جس پر لکھنے سے قبل ان کا قلم یہ بھول گیا کہ وہ انڈیا کے ملک کی رہائشی ہیں۔ اور بھارتی افواج اور مجاہدین کی جھڑپوں اور مظالم کی داستان اتنی وضاحت اور تلخی کے ساتھ بیان کرنا آسان نہیں ہے۔

کشمیر کے حالات اور سیاسی جدوجہد کے ساتھ ساتھ اس ناول میں تیسری نسل ہیجڑوں (خواجہ سراؤں) کے معاملات زندگی، ان کی مشکلات اور بالخصوص دہلی میں ان کی کمیونٹی کے شب و روز کا ذکر بھی موجود ہے اور اگر اس ناول کے اہم کردار انجم (آفتاب) کے بنائے ہوئے جنت گیسٹ ہاؤس کو ہی بے پناہ شادمانی کی مملکت قرار دیا جائے تو غلط نہ ہوگا کیونکہ اس ٹھکانہ پر دنیا بھر کے دھتکارے ہوئے لوگ نہ صرف پناہ لیتے ہیں۔ بلکہ اپنی زندگی مسرت اور شادمانی سے گزارتے ہیں قبرستان میں سجا یہ جنت گیسٹ ہاؤس بہت سارے بے آسرا لوگوں اور جانوروں کی آماجگاہ ہے جو دنیا کی ریس میں تھک ہار کر زندگی سے بے آسرا ہو چکے ہیں۔ اور اس مملکت میں شادمانی کے ساتھ رہتے ہیں۔

کہانی کے اختتام پر بھارت میں تیزی سے آنے والی صنعتی تبدیلی کی خواہش کا ذکر بھی ملتا ہے۔ جس کی وجہ سے کئی سو کی تعداد میں فوجی گرین ہنٹ کا نعرہ لگا کر جنگلوں میں اور گاؤں میں بسے ہوئے لوگوں کو تشدد کا نشانہ بنا کر جدید صنعتی شہر کی بنیاد رکھنا چاہتے ہیں۔ یوں یہ کہانی اور اس کا موضوع بنیادی طور پر تو کشمیر کے حالات، آزادی کی تحریک اور بھارتی افواج کے مظالم پر مبنی ہے مگر ساتھ کئی دوسرے اہم مسائل کو بھی اجاگر کیا گیا ہے۔ اس ناول میں مختلف عنوانات کے تحت کہانی کو آگے بڑھایا گیا ہے کل 12 عنوانات ہیں۔ کہانی کی ابتداء انجم (خواجہ سرا) کی کہانی سے ہوتی ہے کہ کس طرح وہ آفتاب سے انجم بنا اور اس تیسری جنس کے لوگوں کی زندگی کس ڈگر پر چلتی ہے۔ ان کا رہن سہن اور ان کی معاشرتی حیثیت کو وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ ان کا کرب لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا:

''دنیا میں رہنے والے عام لوگ وہ کیا جانیں کہ ہیجڑے کی طرح جینے کے لئے کیا کیا گنوانا پڑتا ہے؟ انہیں اصولوں، قاعدوں اور قربانیوں کے بارے میں کیا پتا؟'' (ص 98)

اور دنیا کے رواجوں سے تنگ آ کر انجم جب قبرستان میں پناہ لیتی ہے تو وہ اس ٹھکانہ کا نام جنت گیسٹ ہاؤس رکھتی ہے۔ اور پھر یہ گیسٹ ہاؤس ان کی شادمانی کا مرکز بن جاتا ہے نمو

گورکھپوری، صدام حسین، امام ضیاء الدین اس گیسٹ ہاؤس میں انجم کے ساتھی تھے۔ اور جلد ہی اس گیسٹ ہاؤس کا نام ''جنت گیسٹ ہاؤس اور کفن دفن مرکز'' پڑ گیا کیونکہ یہاں ان لوگوں کو دفنایا جاتا جنہیں دنیا کے قبرستانوں اور اماموں نے مسترد کر دیا ہو۔

ناول کے اگلے موڑ پر تین دوستوں کی کہانی کی ابتداء ہوتی ہے جن میں تلوتما ایک معمولی نسل کے تعلق رکھنے والی ایک پراسرار عورت، ناگا ایک پرجوش یونیورسٹی طالب علم جو بعد میں ایک کامیاب صحافی بن جاتا ہے۔ جو بالخصوص کشمیر کے حالات پر لکھتا ہے اور بھارتی افواج اس کے قلم کے ذریعے اپنا سچ بیان کرواتی ہے۔ موسیٰ اس کہانی کا اہم کردار جس کو بھارتی افواج کا ظلم مجبور کر دیتا ہے کہ وہ کشمیر کے حالات کے لئے جدوجہد کرے۔ یہ تینوں کردار یونیورسٹی کے زمانے کے دوست ہیں اور کہانی کے دھارے میں تینوں آپس میں جڑے ہوئے نظر آتے ہیں انکا دوست بلپ داس گپتا بھی کہانی میں اہم کردار ہیں۔ ان کرداروں کے ذریعے ہی کشمیر کے مظالم اور وہاں پر پرتشدد واقعات اور مجاہد کمانڈو کی منصوبہ بندی کا حال معلوم ہوتا ہے۔ اور کہانی کے اختتام پر تلوتما انجم کے جنت گیسٹ ہاؤس گیسٹ ہاؤس کی مکین بن جاتی ہے اور یہ جدوجہد اور مظالم کا سلسلہ جاری ہے اور اُمید ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ کچھ نہ کچھ ضرور بدلے گا۔ اس ناول میں بہت سارے کردار موجود ہیں۔ جس میں تلوتما، موسیٰ، ناگا، انجم، ڈاکٹر آزاد بھارتیہ، صدام حسین بالخصوص اہم ہیں۔

تلوتما اس ناول کی ہیروئن یا مرکزی کردار ہے۔ کشمیر کی جدوجہد اور وہاں کے مظالم کو مصنفہ نے تلوتما کے کردار کے ذریعے بیان کیا ہے۔ اس ناول کی کہانی میں بیان کیا ہے۔ تلوتما اپنی سٹوڈنٹ لائف سے ہی منفرد اور الگ شخصیت کی مالک تھی۔ تلوتما کی ماں جو عیسائی خاندان سے تعلق رکھتی ہے اور نچلے طبقے کی کسی شخص کے ساتھ محبت کے نتیجے میں تلوتما کی پیدائش ہوئی۔ حسب معمول تلو کی ماں مریم آئپ کو کسی دور مقام پر بھیج دیا گیا اور تلو کی ولادت کے بعد اس کو عیسائی کے یتیم خانہ بھیج دیا گیا جہاں سے مریم آئپ نے خود جا کر اس کو گود لے لیا۔ یوں یہ ناجائز تعلق منہ بولی ماں کے ساتھ رہنے کے قابل ہو گیا۔

تلوتما کے کردار میں ماں کا کرب اور اس نفرت کا جذبہ بھی اس کہانی میں واضح نظر آتا ہے۔ لیکن آخر کار وہ اپنی ماں کو معاف کر دیتی ہے۔ تلوتما کا تعلق ناگا اور موسیٰ دونوں کے ساتھ ہے ناگا سے وہ تحفظ کے لئے شادی کرتی ہے۔ لیکن حقیقتاً وہ موسیٰ سے ہی محبت کرتی ہے۔ اور یہ محبت تلوتما کو کشمیر میں ہونے والے مظالم اور مجاہدین کی خفیہ تحریکوں سے آگاہی دیتی ہے۔ موسیٰ سے آخری ملاقات اور پھر ملنے کی آس کے ساتھ ہی یہ کردار اپنی ٹوٹی بکھری کہانی میں اپنے عجب پن کے ساتھ سب سے اہم ہے۔

ناگا بھی کشمیر کے حالات اور پر تشدد واقعات کے ضمن میں اہم کردار ہے۔ ناگا سٹوڈنٹ لائف سے ہی شدید جذباتی انسان تھا اور یہ جذباتیت اس کو ایک کامیاب صحافی بنا دیتی ہے۔ جو آزادی اور حق گوئی کا نعرہ لگا کر کشمیر کے حالات پر قلم اٹھاتا ہے۔ بھارتی افواج نے اس کا خاص رعایت اور مراعات دے رکھی ہیں۔ ناگا تلوتما کو کشمیر سے آزاد کرا کے لاتا ہے جب وہ موسیٰ کی وجہ سے بھارتی افواج کے ہاتھ قید ہوتی ہے۔ ناگا آخر تک تلوتما سے محبت کرتا ہے لیکن شادی کے باوجود وہ اس کو حاصل کرنے میں ناکام رہتا ہے۔

موسیٰ اس ناول کا ایک اہم کردار ہے۔ موسیٰ کو کمانڈر گلریز کے نام سے بھی کہانی میں متعارف کروایا گیا۔ بھارتی افواج موسیٰ کے خاندان اسکی بیوی اور بیٹی کو مار کر اس کو مجبور کر دیتے ہیں کہ وہ اس جد و جہد آزادی کشمیر کا حصہ بن جائے۔ موسیٰ کا کردار مختلف شکلوں میں مختلف علاقوں میں کشمیر کی آزادی کی یہ جنگ لڑتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ تلوتما سے اس کی ملاقات بھی ہوتی رہتی ہے۔ موسیٰ کے کردار کے ذریعے اُرندھتی رائے نے وہ تمام خفیہ ذرائع بھی بیان کئے کہ کس طرح کشمیری مجاہدین اپنے لئے راستے بناتے ہیں کہ بھارتی افواج ان تک رسائی حاصل نہ کر سکیں۔

انجم کے کردار سے ہی ناول کا آغاز اور اس کے کردار پر ہی ناول کا اختتام ہوتا ہے اور کردار دہلی میں موجود، ہیجڑوں کی نمائندگی کرتا ہے۔ انجم آفتاب کے نام سے ایک مسلمان گھرانہ میں پیدا ہوا لیکن جلد ہی اس کے ماں باپ کو معلوم ہو گیا کہ وہ تیسری جنس سے تعلق رکھتا ہے مصنفہ نے بہت باریکی کے ساتھ ان تمام باتوں کی تفصیلات درج کر کے انجم اور اس کی طرح کے دوسرے ہیجڑوں کے شب و روز کو بیان کیا ہے۔ انجم کا جنت گیسٹ ہاؤس اور کفن دفن مرکز بھی اسی تیسری تقسیم کی دھتکاری ہوئی مخلوق کے لئے ہی بنا اور بعد میں اس میں دنیا کے ستائے ہوئے انسانوں اور جانوروں نے پناہ لینی شروع کر دی۔

صدام حسین بھی انجم کا پرانا دوست اور جنت گیسٹ ہاؤس میں انجم کا ساتھی جو مختلف کام دھندے کر کے اپنے لئے روزی کماتا تھا اور جنت گیسٹ ہاؤس میں کفن دفن کا مرکز بنانے کا منصوبہ بھی صدام کا تھا۔ یہی کردار موسیٰ اور تلوتما کے ساتھ جد و جہد کشمیر میں بھی شامل رہا۔ اور آخر میں انجم کی منہ بولی بیٹی زینب سے شادی بھی کر لیتا ہے۔

ڈاکٹر آزاد بھارتیہ کا کردار بھارت میں موجود فری انڈین طبقے کا نمائندہ کردار ہے جو سرمایہ درانہ نظام، امریکی سرمایہ داری اور اعلیٰ طبقے کی برتری اور محنت کشوں کی ذلالت اور دکھ پر بھوک ہڑتال کر رہا ہے۔ جنتر منتر نئی دہلی آزاد بھارتیہ کا مرکز تھا جہاں وہ اپنے نظریات کا پرچار کرتا

اور وہ مائی ''نیوز اینڈ ویوز'' کے نام سے اس کو محفوظ کرتا مگر پولیس اکثر چھاپہ مار کر آزاد بھارتیہ کا تمام ڈیٹا اور کاغذات ضبط کر لیتی۔ اور اس دفعہ تو جنتر منتر سے ایک نامولود بچی کے اغوا کا معاملہ تھا اس لئے پولیس نے مقدمہ درج کر لیا۔ پولیس کے جاتے ہی ڈاکٹر آزاد بھارتیہ نئے سرے سے پھر ڈیٹا ترتیب دینے لگا۔

میجر امریک سنگھ بھارتی افواج میں اپنی بہترین صلاحیتوں کی وجہ سے مشہور تھا مگر اس کا المناک انجام کہ اس نے اپنی بیوی اور بیٹوں کو قتل کر کے خود کو بھی گولی مار لی۔ یہ بھارتی فیوجیوں کا عبرت ناک انجام ظاہر کرتا ہے۔ امریک سنگھ نے معروف کارکن جالب قادری کو مار ڈالا اور بھارتی فوج نے ہنگاموں سے بچنے کے لئے اس کو نوکری سے برطرف کیا اور اس کا انجام بالآخر موت ہی ہوا۔ اے سی پنکی اور ڈپٹی کمانڈنٹ اشفاق میئر بھارتی افواج کے روایتی اور ظالم آفیسرز کی نمائندگی کرتے ہیں۔

اس ناول میں ناگا، تلو اور موسیٰ کی یونیورسٹی کی لائف کا ایک دوست بیلپ داس گپتا جو اب ڈپٹی اسٹیشن ہیڈ انڈیا تھا اور داس گپتا تلو سے سٹوڈنٹ لائف سے ہی عشق کرتا اور آخر کار وہ ناگا کے ذریعے اس کی مدد بھی کرتا ہے اور ناگا کو بھی فوج کی حمایت اسی کردار کی وجہ سے حاصل ہے۔ اور یہ تلو کو رہنے کے لئے اپنا مکان بھی کرایہ پر دیتا ہے کیونکہ جوانی کی محبت اس کے دل میں اب بھی تلو کے لئے کم محسوس نہیں ہوتی۔ کہانی کا دھارا اس کردار کے سہارے کافی آگے بڑھتا ہے۔
اس کے علاوہ اس ناول میں تلو کی ماں، انجم کی ماں، خدیجہ موسیٰ کی مخبر کمانڈر گلریز کے نام کے پردے میں موسیٰ کا دوست گلریز، زینب، مس جبین اول، مس جبیں دوم اور ریوتی جو کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا میں کام کرتی تھی جو تیلگو ہے اہم ہیں۔

ارون دھتی رائے نے اس ناول میں جس کردار کو جس بھی طبقے کی نمائندگی کروائی وہ کمال سے کروائی۔ ان کا ہر کردار اپنے طبقے اور اپنے کردار کی تمام مشکلات کو کمال کے ساتھ بیان کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ امریک سنگھ، ریوتی، صدام حسین جیسے کردار اپنے نظریات کے پختہ مبلغ معلوم ہوتے ہیں۔ کرداروں کے حوالے سے ناول اپنا حق ادا کرتا ہے۔

ارون دھتی رائے کا یہ ناول اسلوب کے حوالے سے بھی فنی مہارت پر پورا اترتا ہے۔
ارجمند آرا نے ترجمہ بھی کمال خوبی سے کیا اور ناول پر ترجمہ ہونے کے باوجود ترجمہ کا احساس کم ہی محسوس ہوتا ہے۔ منظر کشی، جزئیات نگاری بھی اپنے عروج پر نظر آتی ہے۔ خاص طور پر کشمیر کے حالات کے حوالے سے منظر کشی اور جزئیات نگاری بہت عمدہ ہے۔
''شہادت وادی کشمیر میں لائن آف کنٹرول سے چوری چھپے داخل ہوئی تھی۔ چاندنی

میں نہائے پہاڑی دروں کے راستے سے، جن پر فوج تعینات تھی۔ شہادت ایک کے بعد ایک رات کو برف کی نیلی چوٹیوں کے گرد دھاگوں کی طرح لپٹے تنگ، پتھریلے رستوں پر چل کر آتی رہی، وسیع وعریض گلیشئروں اور کمر کمر تک اونچی برف کے میدانوں سے گزرتی ہوئی۔ (ص ۳۳۰)

مکالمہ کا رنگ بھی مصنفہ نے خوب استعمال کیا ہے۔ ان کے اسلوب میں مکالمے جاندار بامعنی نظر آتے ہیں۔ شاعری کے اقتباسات بھی اس ناول کے اسلوب میں اور خوبصورتی پیدا کرتے ہیں۔ اسلوب میں ایک منفرد رنگ جب وہ مختصر عنوانات کو معنی خیزی کے ساتھ درج کرتی ہیں اور آخر میں بڑے ہی تلخ سوالات بھی کرتی ہیں بوڑھا، آدمی اور اس کا بیٹا، خبریں، بے عیب قتل، آج کی کہانی، مخبر اول، مخبر دوئم، کنوارا، دلیر، کریئر ساز، نوبل انعام یافتہ، زمانے کے انداز بدلے گئے، کچھ نہیں۔ یوں اُرندھتی رائے کا اسلوب اس ناول میں ان کے موضوع کو بہترین انداز میں بیان کرتا ہے۔

جہاں تک پلاٹ کا تعلق ہے تو اس کا ناول کا پلاٹ دو بیانوں پر مشتمل ایک انجم (ہیجڑے) کی کہانی اور دوسری کشمیر کے پس منظر میں تلو، ناگا اور موسیٰ کی کہانی، مصنفہ دونوں کہانیوں کو ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ دیتی ہے۔ اور اختتام پر دونوں قصوں کے مرکزی کردار ایک ہی جگہ پر موجود ہیں اور کہانی کا اختتام ہو جاتا ہے۔

حقیقت میں یہ ناول 400 صفحات پر مشتمل ایک ضخیم ناول ہے مگر یہ روایت سے ہٹ کر ایک تازیانہ ہے۔ کتاب کے بیانیہ کے دو بڑے منظر نامے ہیں۔ دہلی کی پستی اور کشمیر کی مزاحمت ان دونوں پہلوؤں کے تمام دکھ درد سمیٹ لئے گئے ہیں۔ سماج کے اغماص شدہ زخموں کو بے رحمی سے کریدا گیا ہے۔ پہلی کہانی کا آغاز نماز قبرستان کی فضا سے ہوتا ہے اور دوسری کا اختتام بھی قبرستان ہے۔ قدرت کی ستم ظریفی، انسان کی مکمل معذوری، ایک بیٹے آفتاب کی نامکمل جنسیت یہ سب مل کر سماج کے المیہ کی پوری داستان بن جاتے ہیں۔ اُرندھتی رائے کی قوت مشاہدے کو داد دینی پڑے گی۔

کتاب کا دوسرا محور کشمیر ہے یہ خاصا لمبا ہے اور گہرے مطالعہ اور مشاہدے کی غمازی کرتا ہے بیس سال کے طویل عرصہ میں جو دیکھا محسوس کیا وہ جرات کے ساتھ بلا کم و کاست سامنے لے آئی ہیں۔ وہ نئے ہندوستان کے ضمیر کو جھنجھوڑ رہی ہیں۔ انہوں نے ہمیں گجرات کے قتل عام کی داستان بھی سنائی۔ بھوپال کی تباہی، سکھ نسل کشی اور گائے ذبح کرنے والوں کی غیر قانونی پھانسیوں کو تفصیل سے بیان کرتی ہیں۔ ناول میں ہم کشمیری مسلمانوں کے مسائل، کشمیری بیواؤں اور بھوک ہڑتالوں کے بارے میں جان لیتے ہیں۔ ظلم پر ظلم، ریاست کی دہشت گردی، لوگوں کے سر پھوڑنا،

آنکھیں نوچنا، نوجوانوں کو اندھا کرنا، عورتوں کی بے حرمتی یہ سب کہانی کے دھارے میں گندھے ہوئے ملتے ہیں۔

ارون دھتی رائے کا یہ ناول انڈیا کے حالات کے بیان میں آنکھیں کھول دینے والا ہے۔ پچھلے تین عشروں میں انڈیا میں بدلتے ہوئے حالات و واقعات کو کہانی کے دھرے میں خوبصورتی سے سمو دیا ہے۔ یہ کتاب ہندوستان کی تاریخ میں ایک عظیم معیار بن کر جانی جائے گی۔ ارون دھتی رائے نے ہندوستان جو کہ دنیا کی سپر پاور بننے کے خواب دیکھ رہا ہے مگر جہاں انسانیت تباہی کے دھانے پر کھڑی ہے، سالہا سال کے عمیق مطالعہ سے اس کے ضمیر کو جھنجھوڑا ہے۔ مذہبی جنون کو للکارا گیا ہے۔ اور کشمیری حالات اور بھارتی افواج کے مظالم کو بھی کمال مہارت سے بیان کیا ہے۔ یوں یہ ناول جدید دور میں ایک منفرد اور بڑا ناول ہے۔

آپ ہمارے کتابی سلسلے کا حصہ بن سکتے
ہیں مزید اس طرح کی شان دار،
مفید اور نایاب کتب کے حصول کے لئے
ہمارے وٹس ایپ گروپ کو جوائن کریں

ایڈمن پینل

عبداللہ عتیق : 03478848884
سدرہ طاہر : 03340120123
حسنین سیالوی : 03056406067

''غلاموں کی غلامی کی فکری اساس'' ایک مطالعہ

شاہد اشرف

غلاموں کی غلامی پروفیسر فتح محمد ملک کے کالموں کا مجموعہ ہے۔ سرورق پر درج شعر سے کتاب کے موضوعات کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ شعر درج ذیل ہے۔

بے وقار آزادی ہم غریب قوموں کی
سر پہ تاج رکھا ہے بیڑیاں ہیں پاؤں میں

کتاب کے پانچ ذیلی عنوانات ہیں۔ پہلے حصے کا عنوان ''الاماں از روح جعفر الاماں '' ہے۔ اس حصے میں اُنھوں نے قیام پاکستان کے نظریے سے انحراف اور میر جعفر اور میر قاسم کی معنوی اولاد جاگیردار طبقے کو موضوع بحث بنایا ہے۔ پروفیسر فتح محمد ملک پاکستانیت کے علمبردار ہیں اور موروثی جاگیردرانہ سیاست سے بے حد نالاں ہیں۔ قیام پاکستان سے قبل یونینسٹ پارٹی کے لیڈروں نے مسلم لیگ کی حمایت اس لیے کی تھی کہ نئے ملک میں اُن کی جاگیر محفوظ رہ سکتی تھی دوسری طرف کانگرس نے واضح طور پر ملک کے جاگیردار طبقے سے زمین واپس لینے کا اعلان کر دیا تھا۔ وہ لکھتے ہیں۔

> ''موروثی سیاست دانوں کو اپنے جاگیردارانہ مفادات پاکستان اور اسلام ہر دو سے بڑھ کر عزیز ہیں۔ قیام پاکستان کے صرف چھ ماہ بعد دولتانہ اور ممدوٹ نے وزارتوں سے مستعفی ہونے کا مشورہ ماننے سے انکار کر دیا ہر چند پنجاب کے دو یونینسٹ خا ندانوں سے تعلق رکھنے والے یہ نوجوان سیاست دان اقتدار کی دوڑ میں ایک دو سرے کے حریف تھے۔ مگر جاگیرداروں کے تحفظ میں اس حد تک متحد تھے کہ اپنے قا ئداعظم کی رائے کو نہ صرف ٹھکرانے پر آمادہ ہو گئے تھے۔ بلکہ اپنے زیر اثر اخبارات میں قائداعظم کے ''آمرانہ رویہ'' پر اداریئے لکھوانے میں بھی سرگرم ہو گئے تھے''۔
>
> (۱)

پروفیسر فتح محمد ملک پاکستان کے مسائل کا سبب جاگیردانہ نظام کو گردانتے ہیں۔ ملک

میں قانون کی پامالی، اقدار کی تباہی اور اخلاقیات کی زبوں حالی کی وجہ یہی جاگیردار طبقہ ہے اس لیے ملک میں عدل وانصاف اور مساوات ناپید ہے۔ اگر ہم ماضی میں نگاہ دوڑائیں تو پتا چلتا ہے کہ یونینسٹ پارٹی کے صدر سر سکندر حیات، سکندر جناح پیکٹ کے تحت مسلم لیگ میں شامل ہوئے مگر مسلم لیگ پنجاب کے صدر کی حیثیت سے اُنھوں نے جو سیاہ کارنامے انجام دیے وہ تاریخ پاکستان کا المناک باب ہے۔ عاشق حسین بٹالوی لکھتے ہیں۔

''مسلم لیگ کے گوشۂ عافیت میں پناہ لینے اور لیگ کے چراغ سے اپنا چراغ روشن کرنے کے باوجود سر سکندر حیات نے بعض اوقات کھلم کھلا اور بعض اوقات در پردہ لیگ کے خلاف جو کچھ کہا اور کیا ہے وہ ایسی تلخ اور افسوسناک داستان ہے جس کی نظیر ہندوستان کی اجتماعی زندگی میں بہت کم ملے گی۔ سر سکندر وحیات کے اکثر کارنامے ایسے ہیں جنھیں دیکھ کر انسان حیران رہ جاتا ہے کہ وہ مسلم لیگ کے ایک عظیم الشان لیڈر کے نامۂ اعمال کا مطالعہ کر رہا ہے یا لیگ کے بدترین دشمن کی کارگزاریاں دیکھ رہا ہے''۔ (۲)

آگے چل کر وہ لکھتے ہیں۔

''پنجاب کے بلند پایہ لیڈر جو آج تحریک پاکستان کے سب سے بڑے مجاہدوں میں شمار ہوتے ہیں۔ میاں ممتاز خاں دولتانہ۔ سردار شوکت حیات۔ چودھری نذید احمد خاں۔ میاں امیر الدین۔ محمود علی قصوری۔ محمد انور (ایم انور) جسٹس بدیع الزماں کیکاؤس۔ میاں مشتاق احمد گورمانی۔ علامہ علاؤ الدین صدیقی۔ سید شمیم حسین قادری۔ سید امجد علی۔ ایس ایم اکرام۔ چودھری محمد علی وغیرہ کیا یہ اصحاب از راہ کرم بتائیں گے کہ وہ تحریک پاکستان کے کس مرحلے پر اس تحریک میں شامل ہوئے تھے''؟ (۳)

دُشمن صفِ مخالف میں کھڑا ہو تو مقابلہ آساں رہتا ہے جب دُشمن اپنوں میں شامل ہو تو شکست یقینی ہوتی ہے۔ سلطان ٹیپو کو میر جعفر کی وجہ سے شکست ہوئی مگر جب انگریزوں نے میر قاسم کو موثر جانا تو میر جعفر کو فارغ کر دیا۔ غداری کرنے والوں کو میر جعفر کا انجام یاد رکھنا چاہیے۔ غلاموں کی غلامی کا یہ حصہ گزرے وقتوں کا نوحہ ہے جس میں حالات وواقعات کے ذریعے تاریخ کے اُفق سے طلوع ہونے والے سیاہ دنوں کا ماتم کیا گیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

''جاگیرداری اور قبائلی ہر دو نظام برطانوی حکمرانوں نے اپنے مفادات کے تحفظ اور فروغ کی خاطر قائم کیے تھے۔ چنانچہ برطانوی اقتداران ہی ظالمانہ نظاموں

کے پروردہ افراد کی اندھا دھند وفاداری پر قائم رہا۔ جب تحریک پاکستان کی جڑیں مسلمان عوام کے دلوں میں اتر گئیں اور مسلم لیگ ایک نا قابل تسخیر عوامی جمہوری تحریک میں ڈھل گئی تو یہ لوگ خود کو بے یارو مددگار سمجھنے لگے۔ علامہ اقبال اور قائد اعظم نے اسلام کے معاشی انصاف اور انسانی مساوات کے تصورات کے عملی نفاذ کا پروگرام جس مخلصانہ اور مؤثر انداز میں پیش کیا تھا اُس نے اس حکمران طبقے کی نیندیں اُڑادیں''۔ (۴)

قیام پاکستان کے بعد ملک کو پے در پے سانحوں کا سامنا کرنا پڑا قائداعظم کی وفات اور لیاقت علی خاں کی شہادت سے سیاسی خلا پیدا ہو گیا اور انگریزوں کی وفادار بیوروکریسی اور جاگیر داروں کو کھل کھیلنے کا موقع ملا۔ ۱۹۵۵ میں گورنر جنرل بنتے ہی سکندر مرزا (پیر جعفر کے خاندان کا چشم و چراغ) نے سیاسی عمل ختم کر کے آمریت کی راہ ہموار کرنا شروع کر دی۔ اس مقصد کے لیے جنرل ایوب کی امریکہ بھی بھیجا گیا۔ اس کے بعد امریکی پاکستان آئے اور ہم آج تک اُن سے اپنے ملک کی پالیسی کے لیے ہدایات لیتے ہیں۔ انگریز چلے اور امریکی آگئے۔ ڈاکٹر فتح محمد لکھتے ہیں۔

''آج ایک مرتبہ پھر عام پاکستانیوں کے ذہنوں کو اس سوال نے تہہ و بالا کرنا شروع کر دیا ہے کہ ہمارے سیاستدان اور ٹیکنوکریٹس اقتدار میں رہنے یا اقتدار میں آنے کی خاطر امریکہ سے امداد کی بھیک مانگنے کی بجائے' خود اپنے عوام کی جانب رجوع کیوں نہیں کرتے؟۔۔۔ ایک بھارتی روزنامہ ''دکن ریویو' نے خبر دی کہ ''نواز شریف نے گزشتہ اگست میں امریکی صدر بل کلنٹن کو اپنا ایک خصوصی پیغام بھجوایا تھا کہ انھیں اپنے ملک کی فوج اور بنیاد پرست طاقتوں جن میں جماعت اسلامی شامل ہے سے سخت خطرہ لاحق ہے۔ امریکی صدر نے پیغام کی نقول امریکی سی آئی اے، پینٹاگان، قومی دفاعی کونسل اور اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کو بھجوا کر اس بارے میں معلومات فراہم کرنے کو کہا تھا۔ بعد ازاں امریکی انتظامیہ نے نواز شریف کے بھائی شہباز شریف کو معزول وزیراعظم کے خصوصی نمائندے کی حیثیت سے امریکہ بلوایا اور اپنے ایک بیان میں غیر آئینی تبدیلی کی مخالفت کی تھی''۔ یہ بات قومی غیرت اور شخصی وقار ہر دو کے منافی ہے کہ کسی ملک کا وزیراعظم کسی دوسرے ملک کی حکومت سے اپنی فوج کو وارننگ دلوائے''۔ (۵)

کتاب کے دوسرے حصے کا عنوان ''الارض للہ'' ہے اس حصوں میں انھوں نے واضح کیا ہے کہ جاگیردار کی خدائی سے انکار کیے بغیر توحید پرست معاشرے کی تشکیل ممکن نہیں ہے

۔اقبال کے نظریات اور قائداعظم کے افکار موجودہ جاگیردارانہ نظام کی نفی کرتے ہیں۔ بابائے قوم نے ۱۹۴۳ کو مسلم لیگ کے دہلی میں منعقدہ اجلاس میں فرمایا۔

''یہاں میں جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کو خبردار کرنا چاہتا ہوں کہ وہ ایک ایسے ظالمانہ اور شر پسند نظام کی پیداوار ہیں، جس کی بنیادیں ہمارے خون سے سینچی گئی ہیں ۔عوام کا استحصال ان کی رگوں میں خون بن کر گردش کر رہا ہے، اس لئے ان کے سامنے عقل اور انصاف کی کوئی دلیل کام نہیں کرتی۔ ہمارے ہاں لاکھوں کی تعداد میں ایسے لوگ موجود ہیں، جنہیں انتہائی مشقت کے باوجود صرف ایک وقت کی روٹی میسر ہے۔کیا یہ ہے ہماری شاندار تہذیب؟ کیا پاکستان کا مطلب یہ ہے؟ کیا آپ تصور کر سکتے ہیں کہ لاکھوں مسلمان معاشی ظلم کا شکار ہو کر ایک وقت کی روٹی کو بھی ترستے رہیں؟ اگر پاکستان کا مطلب یہ ہے تو میں ایسے پاکستان سے باز آیا''۔

(۶)

جب قیام پاکستان کا عمل ناگزیر ٹھہرا اور انگریز آزادی دینے پر مجبور ہو گئے تو انہوں نے ایسا پاکستان بنانے کی منصوبہ بندی کی جس میں اختیارات اور وسائل پر انگریز نواز طبقہ قابض ہو۔اُنھوں نے اپنے وفادار خاندانوں کو تحریک پاکستان میں شمولیت کا حکم دیا۔ مسلم لیگ میں موروثی جاگیردار اس وجہ سے شامل ہوئے۔

فتح محمد ملک نے سابق صدر فاروق احمد لغاری کا حوالہ دیا ہے۔جنھوں نے صدر بنتے ہی جاگیر کی توسیع کے لیے عدالتی کارروائی کے ذریعے قبضہ حاصل کیا ۔سیدہ عابدہ حسین اور فخر امام بظاہر بڑے روشن خیال نظر آتے ہیں مگر اپنے علاقوں میں خدا تصور ہوتے ہیں اور ظلم و جبر کا نظام قائم رکھنے کے لیے ہر طرح کے وسائل بڑے کار لاتے ہیں۔نواز شریف کے عہد حکومت میں جب نواز شریف نے سیدہ عابدہ حسین کی زمین قبضے میں لینے کے لیے سرکاری سطح پر کارروائی کی تو ملک کے بہت سے جاگیرداروں نے عابدہ حسین کی حمایت میں اپنے مسلح لوگ جھنگ بھیج دیے۔ جاگیردار دوسرے جاگیرداروں کا محافظ ہے۔اس طرح جب زرعی ٹیکس کی کوشش کی گئی تو پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ کے دونوں پارٹیوں کے جاگیردار اکھٹے ہو گئے اور انھوں نے زرعی ٹیکس کی کوشش ناکام بنا دی

۔

پروفیسر فتح محمد ملک نے سیدہ عابدہ حسین اور فخر امام کے حوالے سے جاگیردارانہ طبقے کی ذہنیت، مزاج اور افکار کا جائزہ لیا ہے۔اس سلسلے میں اس نے کرسٹینا لیمب کی کتاب ''ویٹنگ فار اللہ'' کا ایک اقتباس درج کیا ہے۔

''(ہمیں) فوراً لوگوں نے اپنے گھیرے میں لے لیا۔ یہ لوگ اپنے گھٹنوں پر گر کر فخر امام کی قمیض (کذا۔ قمیص) کے دامن کو چومنے کے لئے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے میں کوشاں تھے۔ یہ منظر دیکھ کر مجھے بہت صدمہ ہوا۔ مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے ملتان سے یہاں تک دو گھنٹے کے سفر نے ہمیں تاریخ میں دو صدیوں پیچھے دھکیل دیا ہو۔ میں سوچنے لگی کہ یہ شخص جو راستے میں مغربی اصولوں کا پرچار کرتا آیا ہے اور لندن اور اسلام آباد کے ڈرائنگ روموں جدید مغربی نظریات پر گرمی گفتار کے جوہر دکھانے کا خوگر ہے، فی الحقیقت اسی جاگیرداری نظام کا ستون بھی ہے اور پروردہ بھی جس کی بظاہر وہ مذمت کرتا رہتا ہے۔ اس کی جاگیر پر کام کرنے والے ہاتھ بندھے غلام آنکھ بند کر کے اسے ووٹ ڈالتے ہیں اور اس غلامی کے عوض انہیں فقط ایک فاقوں بھری زندگی میسر آتی ہے۔ پاکستان کے دیہات میں زندگی کا یہی نقشہ ہے''۔ (۷)

پاکستان کا جاگیردار طبقہ یہ تاثر پھیلاتا ہے کہ جاگیردارانہ نظام کا خاتمہ سوشلزم کا نقطہ آغاز ثابت ہوگا اور اس بات پر وہ مذہبی طبقے کی حمایت حاصل کرتا ہے۔ غریب اور محکوم لوگوں کو مذہب کے نام پر استحصال کا شکار بنایا جاتا ہے اور یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔

کتاب کے تیسرے حصے کا موضوع ''ہے وہ سلطاں غیر کی کھیتی پہ ہو جس کی نظر'' ہے۔ اس حصے میں جمہوری حکومتوں پر آمریت کے شب خوں کا ذکر ملتا ہے۔ صدر ایوب، ضیاالحق، یحییٰ خاں اور پرویز مشرف ہماری تاریخ کے ایسے متنازعہ کردار ہیں جن کے اثرات دہائیوں بعد بھی نظر آتے ہیں مگر اس کے ساتھ ساتھ جمہوری رویوں میں ذاتی مفادات نے سیاسی زندگی کو بھی متاثر کیا ہے۔ فتح محمد ملک نواز شریف کے پابند سلاسل کے بعد بیگم کلثوم نواز کی سیاست میں آمد کو جمہوری کے بجائے شوہر کو بچانے کی سیاست قرار دیتے ہیں۔ بالکل جیسے بے نظیر بھٹو نے آصف علی زرداری کو جیل سے نکالنے کے لئے سیاسی محاذ پر پسپائی اختیار کرتے ہوئے سمجھوتہ کیا۔ بے نظیر بھٹو اور کلثوم نواز کی سیاست کا مرکز و محور ملک و قوم کی بھلائی کے بجائے اپنے شوہروں کی جیل سے نجات ہے۔

کتاب کے اس حصے میں اُنھوں نے بیگم عابدہ حسین اور فخر امام کے خیالات پر تبصرہ کیا ہے۔ اور مرد و زن کی سیاست کے بارے میں جاگیردارانہ اخلاقیات کو بھی بیان کیا ہے۔ بے نظیر بھٹو کے بنیاد پرستوں کے اقتدار میں آنے کا واویلا بھی زیر بحث آیا ہے۔ اُنھوں نے بے نظیر بھٹو اور نواز شریف کے ذاتی گھروں کی زیبائش و آسائش اور حکمران طبقے کے بیرون ملک دوروں کی مجرمانہ سرگرمیوں کا ذکر بھی کیا ہے۔ مہنگے ہوٹلوں میں قیام کے علاوہ جوئے خانوں میں ہاری ہوئی با

زیوں کی تفصیلات بھی ہیں۔ایسے کرپٹ حکمرانوں کی امریکی حکومت سے حمایت دراصل عوام کے حقوق پرڈاکا ڈالنے کے مترادف ہے۔اگرکبھی یہ عوام جمہوری انداز میں حکومت میں آجائیں تو بنیاد پرست قرار دے کرالجزائر کی طرح اُن کی حکومت ختم کردی جاتی ہے۔

اک طرف پاکستان کے مفلوک الحال عوام ہیں اور دوسری طرف حکمرانوں کے محلات جن کی یاترا سے مغلیہ عہد حکمرانی کی یاد تازہ ہوتی ہے اگر کوئی تبدیلی آئی ہے تو بقول فتح محمد ملک:

''اگر کوئی تبدیلی آئی ہے فقط اتنی کہ بڑے میاں کو انگریز گورنر ٹیلی فون پر ہدایات دیا کرتا تھا تو چھوٹے میاں امریکی سفیر سے رہنمائی کے طلب گار رہتے ہیں۔''(۸)

کتاب کے چھوٹے حصے کا موضوع ''فاقوں کی فصل'' ہے اس حصے میں پاکستان میں غریب اور پسماندہ طبقے کی زندگی کی عکاسی کی گئی ہے۔عالمی بنک کے استحصالی کردار کا ذکر بھی ہے اور آئی ایم ایف کی چیرہ دستیوں کا احوال بھی۔ہماری حکومتیں ذاتی مقصد کے تحت قرض پہ قرض لیے جاتی ہیں جو آنے والی نسلوں کو بھگتنا پڑتا ہے۔چونکہ ہمارے ہاں سیاسی استحکام نہیں ہے اس لیے حکمران ان اداروں کے غلام بن کر رہ جاتے ہیں۔نتیجتاً ملک کو اقتصادی تباہی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔نواز شریف اور بے نظیر دونوں آئی ایم ایف سے ہدایات لے کر اپنے ملک کے عوام کی زندگی اجیرن کرنے کے لیے پٹرول، بجلی اور گیس کی قیمتیں مہنگی کرتے رہے ہیں صورت حال اتنی گھمبیر ہے کہ پچھلے دنوں والدین اپنے بچوں کو بیچنے کے لیے بازار لے آئے۔جسم بیچنے کے لیے نوجوان لڑکیاں گھروں سے باہر نکل آئی ہیں۔غربت نے معاشرے کی اخلاقیات کا جنازہ نکال دیا ہے۔فتح محمد ملک نے اس حصے میں ملک کی زبوں حالی اور غربت کا واحد حل جاگیردارانہ نظام کا خاتمہ بتایا ہے۔

چائلڈ لیبر۔جسم فروشی اور بچوں سے زیادتی کے واقعات عام ہیں۔سب سے زیادہ ظلم بچوں کی خلیجی ممالک سمگلنگ ہے جس کے نتیجے میں معصوم بچوں کو سمگل کر کے اُونٹوں کی ریس میں استعمال کیا جاتا ہے اس سلسلے میں اِنسانی حقوق کی تنظیمیں اور عالمی حقوق اطفال کے ادارے خاموش کیوں ہیں؟ فتح محمد ملک سوشل جسٹس چاہتے اور وہ صرف جمہوریت، اسلام اور نظریہء پاکستان پرعمل پیرا ہونے سے حاصل ہوسکتا ہے وگرنہ ملک میں غربت کے ہاتھوں خودسوزیوں کا رجحان کسی بڑے المیے کو جنم دے سکتا ہے۔

کتاب کے آخری حصے کا عنوان ''داغم از رسوائی ایں کارواں ہے'' اس حصے میں قیام پاکستان کے دوران میں ہونے والے ظلم وستم کا احوال ملتا ہے۔درددل رکھنے والوں کے ایک سوال یہ ہے کیا اتنی قربانیوں کے بعد حاصل ہونے والی مملکت خداداد بکھر جائے گی۔جانوں کا ضیاع اور عصمتوں کی قربانی رائیگاں جائے گی۔اُنھوں نے محترمہ بلقیس محمود اور حمید نظامی کے حوالے سے دو

خوبصورت کالم لکھے ہیں۔ اُن کی فکری اساس میں پاکستانیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے اور وہ ملک کو اقبال اور قائد کا پاکستان بنانے کی جدوجہد میں عملی طور پر شریک ہیں۔ وہ پاکستان ٹوٹنے کے سانحے سے گزرے ہیں۔ وہ نسل آئندہ کے لیے ایسے پاکستان کی خواہش رکھتے ہیں جہاں نظریہ پاکستان کا عملی اظہار ہو۔ مساوات، عدل وانصاف اور جمہوریت کا چلن ہو۔ یہی احساس ہمیں قومی ناہمواریوں اور قومی تنازعات سے بچا کر قوموں کی دُنیا میں سرفراز کر سکتا ہے۔

حوالہ جات

(۱) پروفیسر فتح محمد ملک: غلاموں کی غلامی، اسلام آباد: دوست پبلی کیشنز، ۲۰۰۲، ص، ۲۱، ۲۲۔

(۲) عاشق حسین بٹالوی: ہماری قومی جدوجہد، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز 1995، ص ۲۵۳، ۲۵۴۔

(۳) ایضاً، ص ۶۴۸

(۴) پروفیسر فتح محمد ملک: غلاموں کی غلامی، اسلام آباد: دوست پبلی کیشنز، ۲۰۰۲، ص، ۳۵۔

(۵) ایضاً، ص ۴۴

(۶) قائداعظمؒ: غلاموں کی غلامی، مصنف فتح محمد ملک، اسلام آباد: دوست پبلی کیشنز، ۲۰۰۲، ص، ۴۹، ۵۰۔

(۷) کرسٹینا لیمب: غلاموں کی غلامی، مصنف فتح محمد ملک، اسلام آباد: دوست پبلی کیشنز، ۲۰۰۲، ص، ۴۹، ۵۰۔۔

(۸) فتح محمد ملک: غلاموں کی غلامی، اسلام آباد: دوست پبلی کیشنز، ۲۰۰۲، ص، ۳۵۔

''چینوا اچیبے'' پہ ایک نئی کتاب

عبدالعزیز ملک

جدید افریقی ادب میں چینوا اچیبے نمایاں نام ہے جس نے افریقی ادب کو نئی تکنیک، ہیئت اور اسلوب سے روشناس کروایا۔اچیبے کی یہ خاص بات ہے کہ اس نے جدید ادبی رویوں سے استفادہ کرتے ہوئے اپنی تہذیب اور ثقافت سے ناتا نہیں توڑا۔یہی وجہ ہے کہ اپنے پہلے ناول ''بکھرتی دنیا''(Things Fall Apart)(جس میں انگریزوں کی آمد سے قبل کی قبائلی زندگی کو موضوع بنایا گیا ہے) کی اشاعت (۱۹۵۸ء) کے ساتھ ہی اس نے ادبی دنیا میں اپنا مقام بنا لیا۔اگرچہ اس کے بعد (چندروز اور میری جان) ,"No Longer At Ease" (ناوکِ خداوندی)"Arrow Of God"اور(عوام کا نمائندہ) "A Man Of The People" بھی منظر عام پر آئے لیکن جو شہرت اور درجہ Things Fall Apart کو نصیب ہوا وہ ان کے کسی اور ناول کے حصے میں نہ آسکا۔چینوا اچیبے کا تعلق افریقا میں رہائش پذیر ''اگبو'' قبیلے سے ہے۔کہانیاں کہنا اس قبیلے کی روایت اور معاشرت کا لازمی حصہ ہے۔اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ کہانی کہنے کا فن اسے معاشرتی وراثت میں ملا ہے۔اس نے اس فن کو سامراجی مفادات کی قلعی کھولنے کے لیے استعمال کیا ہے۔بقول نجم الدین احمد ''اچیبے کی فکشن نگاری کی ابتدا افریقا کے روایتی معاشروں پر برطانوی نوآبادیات کے تباہ کن اثرات پر تنقید سے ہوئی۔''اور اس نے اچیبے کو کامیابی کی منزلیں طے کروانے میں اہم کردار ادا کیا۔اچیبے نے نہ صرف ثقافتی اور تہذیبی مسائل کو اپنی تحریروں کا حصہ بنایا بلکہ روحانی معاملات نے بھی اس کی لکھتوں میں جگہ پائی ہے۔

ایم خالد فیاض نے اس عظیم افریقی ادیب کے فکروفن کو اردو دنیا میں متعارف کروانے کی کوشش کی ہے۔اس سلسلے میں ان کی کتاب ''چینوا اچیبے، ادب، فکر اور فن کا مطالعہ'' بک ٹائم ،کراچی سے 2014 میں اشاعت پذیر ہوئی۔جس میں چینوا اچیبے کی تخلیقات، ان پر تنقیدی تحریریں ،ان کے لیکچرز اور اچیبے کے انٹرویوز کو کتاب میں شامل کیا گیا ہے۔کتاب کے آغاز میں نجم الدین احمد نے چینوا اچیبے کا بھرپور تعارف کروایا ہے جو اس سے قبل رسالہ ''تناظر'' میں بھی شائع ہو چکا ہے۔تعارف کے بعد چینوا اچیبے کے انٹرویوز کو کتاب میں جگہ دی گئی ہے۔پہلا انٹرویو'' کچھ

دنیا، کچھ آرٹ کی ، کچھ اپنی باتیں'' کے عنوان سے شامل ہے جسے Conjunctions کے مدیر''بریڈفورڈ مورو'' Bradford Morrow نے ۱۹۹۱ء میں کیا۔مبشر احمد میر نے اسے اردو کا روپ دیا ہے۔دوسرا انٹرویو''پس نو آبادیاتی ناول نگار چینوا اچیبے سے گفتگو'' کے عنوان سے شاملِ کتاب ہے۔یہ انٹرویو''فیروز جیوسیویلا'' کی مرتبہ کتاب Interviews with Writers of the Post Colonial World(1992,London) سے لیا گیا ہے جسے رابی وحید نے ترجمہ کیا ہے۔دونوں انٹرویوز ادب کے طالبِ علموں کے لیے بیش قیمت خزانہ ہیں جس میں اچیبے نے اپنے ادبی خیالات ونظریات کا اظہار خوش اسلوبی سے کیا ہے۔کتاب میں اچیبے کے معروف ناول'' بکھرتی دنیا'' کے گیارہ ابواب کا ترجمہ بھی موجود ہے جسے فاروق حسن نے اردو میں ڈھالا ہے۔اکرام اللہ نے بھی اس ناول کا اردو ترجمہ کیا تھا جسے''مشعل''لاہور نے چھاپا ہے۔ اس ترجمے کا دیباچہ انتظار حسین نے تحریر کیا، جسے ایم خالد فیاض نے کتاب میں جگہ دی ہے۔ڈاکٹر شوچی اگروال کا مضمون'' بکھرتی دنیا کا مابعد نو آبادیاتی مطالعہ''ایک پر مغز تحریر ہے جسے انوار الحق نے اردو ترجمہ کیا ہے۔ڈاکٹر شوچی اگروال اس بات کے قائل نظر آتے ہیں کہ نائیجیریا کی نو آباد کاری میں ثقافتوں کے ٹکراؤ کا اس قدر عمل دخل تھا کہ اس سے مطابقت پیدا کرنے کے لیے زبان کو بھی تبدیل کرنا پڑا۔مضمون کا مطالعہ ناول کی نئی نئی پرتیں کھولتا ہے۔

مسعود اشعر کی تحریر''عوام کا نمائندہ'' بھی شاملِ کتاب ہے۔جس میں انھوں نے اچیبے کے ناول Man Of The People کا فکری تجزیہ پیش کیا ہے۔اچیبے کے اس ناول میں ایک ایسی کہانی پیش کی گئی ہے،جس میں اقتدار کے حصول کے لیے سیاسی جوڑ توڑ اور حصولِ اقتدار کے بعد ذاتی مفادات کو موضوع بنایا گیا ہے۔اس ناول میں اچیبے نے صیغہ واحد متکلم کا استعمال کثرت سے کیا ہے اور اپنے ساتھ پیش آنے والے واقعات کو ناول کے مرکزی کردار نے ملک کی تاریخ بنا دیا ہے۔مسعود اشعر نے اس مضمون میں ان تمام پہلوؤں کا جائزہ لینے کی کوشش کی ہے۔ایم خالد فیاض کا مضمون'' عوام کا نمائندہ،کرداری کشمکش کا بہترین اظہاریہ'' بھی ایک عمدہ مضمون ہے۔اچیبے کا ناول''عوام کا نمائندہ'' آزادی کے بعد کی مابعد نو آبادیاتی صورتِ حال،جس میں سیاست دانوں کی بد عنوانی،دھوکا ،فریب اور عوام کی بے بسی شامل ہے ،کو موضوع بنایا گیا ہے۔ایم خالد فیاض نے اسے کرداری کشمکش کا ناول قرار دیا ہے۔ان کے خیال میں کشمکش کو یہاں تکنیک کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔کیوں کہ پورے ناول کی بنت دو کرداروں کے تصادم اور کشمکش سے ہوئی ہے۔ایم خالد فیاض کا مضمون پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔رضی مجتبیٰ کا مضمون ''چنیوا اشیبے کا فنِ ناول نگاری'' بھی کتاب میں شامل ہے۔اس مضمون میں انھوں نے اچیبے کے

ناولوں پر عمدہ بحث کی ہے۔ ڈاکٹر شاہین مفتی کی تحریر ''میں کہانی لکھتا رہوں گا'' چینوا اچیبے کے تازہ ناول ''سوانا کے پہاڑی چیونٹے''Ant Hills Of The Svannah' پر ایک مختصر اور جاندار تحریر ہے، جو پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔

چینوا اچیبے کی چار مختصر کہانیوں کا اردو ترجمہ بھی کتاب کا حصہ ہے۔ پہلی کہانی '' دوشیزائیں محاذ پر'' کے عنوان سے شاملِ کتاب ہے۔ اس کہانی کا نجم الدین احمد نے اردو ترجمہ کیا ہے۔ فوجیوں اور عام شہریوں پر جنگ کی تباہ کاریوں کو موضوع بناتی ہوئی یہ کہانی فوجی اور سول افسر شاہی کی دورانِ جنگ عیاشیوں کا حال بیان کرتی ہے۔ دوسری کہانی ''امنِ دروں'' کا عنوان لیے ہوئے ہے۔ اس کو سید ایاز محمود نے اردو روپ دیا ہے۔ یہ کہانی جنگ کے بعد کے اثرات کا احاطہ کرتی ہے۔ جنگ کے بعد عام شہریوں کی نہ جان محفوظ تھی نہ مال۔ جس کی بڑی وجہ لوگوں کی اپنی بزدلی تھی یہی وجہ ہے کہ جرائم پیشہ لوگ برملا جرم کرتے تھے۔ تیسری کہانی ''روحوں کی راہ گزر'' کے نام سے کتاب میں شامل ہے۔ یہ کہانی جدید سائنسی رجحانات اور توہم پرستانہ عقائد کے مابین کشمکش کو ظاہر کرتی ہے۔ جس میں توہم پرستانہ عقائد کی آخر کار جیت ہو جاتی ہے۔ ''شادی نجی معاملہ ہے'' روایت اور بدلتی روایات کے مابین تصادم کی صورتِ حال کو منعکس کرتی ہے۔

''سامراجی شعلوں میں گھرا ہوا میرا وطن'' چینوا اچیبے کے ایک لیکچر کا اردو ترجمہ ہے جسے شیراز احمد نے اردو میں ڈھالا ہے۔ ۱۹۹۸ء میں اچیبے نے ہارورڈ یونی ورسٹی میں تین لیکچرز دیے جسے بعد میں ''گھر اور جلاوطنی''(Home and Exile) کے عنوان سے کتابی شکل دے دی گئی۔ یہ اس سلسلے میں دے گئے پہلے لیکچر My Home Under Imperial Fire کا اردو ترجمہ ہے۔ ڈاکٹر ناصر عباس نیر جدید اردو تنقید کا ایک اہم نام ہے۔ انھوں نے اچیبے کے لیکچروں کے مجموعے ''گھر اور جلاوطنی''(Home and Exile) جو ۲۰۰۱ء میں نیو یارک سے شائع ہوئے تھے، پر تنقیدی تبصرہ کیا ہے۔ ''ناول نگار یا معلم؟''، ''دو جرمن ایک امریکی'' اور افریقہ کا تصور'' چینوا اچیبے کی تحاریر ہیں جسے بالترتیب مظفر علی سید، ڈاکٹر شاہین مفتی اور معظم شیخ نے اردو ترجمہ کیا ہے۔

جوزف کونریڈ کے ناول ''قلبِ ظلمات'' پر سخت تنقید کرتے ہوئے اچیبے نے کونریڈ کو ''پکا نسل پرست'' قرار دیا تھا۔ اس حوالے سے ''ہیومر سر کرٹلر'' نے ایک مضمون لکھا تھا جس میں اس نے اچیبے کے نکالے ہوئے نتیجے کا تفصیل سے تجزیہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ اجمل کمال نے ہیومر سر کرٹلر کے مضمون کو ''قلبِ ظلمات میں نسل پرستی اور عظمت'' کے عنوان سے اردو ترجمہ کیا ہے۔ جو ایم خالد فیاض نے اس کتاب میں شامل کیا ہے۔ یقیناً اچیبے سے دلچسپی رکھنے والے احباب کے لیے یہ

مضمون خاصے کی چیز ہے۔اور آخر میں ’’ناڈین گورڈیمر‘‘ کی تحریر ’’چینوا اچیبے کا تعزیت نامہ‘‘ آصف فرخی کے قلم سے اردو کا حصہ بنا ہے۔ایم خالد فیاض نے چینوا اچیبے کی ان نادر تحریروں کو ایک جگہ مجتمع کر کے چینوا اچیبے کے مداحین کے لیے گراں قدر خدمت سرانجام دی ہے۔ایم خالد فیاض اس سے قبل ’’غلام عباس: فکروفن‘‘ کے عنوان سے ایک کتاب مرتب کر کے اپنی تحقیقی وتدوینی صلاحیتوں کا اعتراف کروا چکے ہیں۔ایک بار پھر انھوں نے ایک اہم کام سرانجام دے کر اردو ادب کے قارئین کو بیش بہا تحفے سے نوازا ہے۔

انتظار حسن کو جستجو کیا ہے؟

ڈاکٹر اورنگ زیب نیازی

انتظار حسین ہماری ادبی تاریخ کے ایک فعال، بھرپور اور زرخیز تخلیقی عہد کا نام ہے۔ ''جستجو کیا ہے؟'' اِس عہد کی داستان ہے۔ غالب کے مصرع سے مستعار یہ سوالیہ عنوان گہری معنویت کا حامل ہے۔ زندگی معلوم سے نامعلوم کی طرف ایک سفرِ مسلسل کا نام ہے۔ انسان کا آج تک کا سفر اِس نامعلوم کی جُستجو میں اس کی پُر اسراریت کو دریافت کرنے سے عبارت ہے۔ انسان نے جب اپنے باطن کی طرف سفر کیا تو اس نے انکشافِ ذات کے لیے اس نے آپ بیتی کا سہارا لیا۔ اگر اپنے باطن میں جھانکنے اور اور اعترافِ ذات کا حوصلہ ہو تو ایک آپ بیتی ہر کوئی لکھ سکتا ہے کیوں کہ ایک زندگی تو ہر کوئی جیتا ہے مگر آپ بیتی لکھنا یا سچی آپ بیتی لکھنا ممکن نہیں۔ وہ بہت کچھ جس کا شاہد خود انسان یا اس کا خدا ہوتا ہے، جب انسان لکھنے بیٹھتا ہے تو صداقت اور حق گوئی کے تمام تر دعووں کے باوجود قلم ہزار بار رُکتا ہے۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی بہت کچھ پردۂ خفا میں رکھنے پر مجبور ہوتا ہے۔ دیگر کئی اصناف کی طرح آپ بیتی کا فن بھی مغرب سے آیا لیکن جو سچائی اور بے باکی مغرب میں اس کا خاصا تھی وہ مشرق میں آ کر اسے نصیب نہ ہو سکی۔ مشرق کی اخلاقیات، اقدار اور سماجی قیود نے آپ بیتی کو پابند کر دیا ہے۔ ہر چند انتظار حسین کی کتاب ''جُستجو کیا ہے؟'' آپ بیتی ہے لیکن نہیں بھی (پڑھنے والے اس کتاب کو آپ بیتی کی ذیل میں شمار کرتے ہیں مگر مصنف ایسا کوئی دعویٰ نہیں کرتا چناں چہ اس مضمون میں اس کتاب کے لیے کہیں آپ بیتی اور کہیں محض کتاب کا لفظ استعمال کیا گیا ہے)۔ انتظار حسین کے پیش رو اور معاصر ادیبوں نے جو آپ بیتیاں لکھی ہیں ان میں سے کسی نے تو اعترافِ گناہ میں لذت محسوس کی ہے؛ کسی کے ہاں ''صاف چُھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں'' والی کیفیت ہے اور کسی نے تہذیب اور اخلاقیات کو بالائے طاق رکھ کر مبالغہ آرائی کی حدوں کو چُھو لیا۔ انتظار حسین کا معاملہ مختلف ہے۔ وہ سب حسابِ جاں برسرِ عام رکھنے کے روادار نہیں ہیں۔ کہتے ہیں:

> ''اب سوچتا ہوں کہ ہمارے اندر جو اندھا کنواں ہے اس میں بھی کتنے اچھے بُرے تجربے، کتنی زہر بھری یادیں، کتنے سانپ سنپولیے دبے پڑے ہوں گے۔ اچھا ہی

ہے کہ ہماری طرف سے ان میں تاکنے جھانکنے کا کاروبار فرائیڈ اور ژونگ کے چیلوں نے سنبھال رکھا ہے۔کم از کم مجھے ایسا شوق کبھی نہیں رہا۔یہ ان کا شوق رہا ہے کہ اپنی خودنوشت لکھی جائے تو اردگرد کے علاوہ اپنے اندر بھی جھانک لیا جائے اور اگر اندھے کنویں کی تھاہ تک رسائی ہو جائے تو وہاں سے کوئی گناہ سے آلودہ یاد، کوئی نجس تجربہ برآمد کر کے ہتھیلی پر رکھ کر نمایش کی جائے کہ دیکھو یہ میں ہوں، ایک گنہگار روح''۔(ص۲۹۵)

''جس تہذیب میں آنکھ کھولی ہے، جس کی آغوش میں پلے بڑھے ہیں وہ کب اس کی اجازت دیتی ہے۔بھلے ہی پڑھ لیا ہو فرائیڈ کو، عشقِ پردہ نشیں میں مرتے ہیں پر زبان نہیں کھولتے۔تہذیب نے ہونٹوں پر تالا ڈال رکھا ہے، قلم کیسے چلے؟''(ص۲۹۶)

گویا انھوں نے اپنی آپ بیتی کی حدود مقرر کر دی ہیں اور قاری کو بھی سمجھا دیا ہے کہ بھئی کسی کی ذاتی زندگی اور نجی معاملات میں دل چسپی اور تاک جھانک شریفوں کا شیوہ نہیں ہے۔اس احتیاط کا تقاضا تھا کہ واقعات کے تسلسل اور ان واقعات کے سنین سے بھی احتراز برتا جائے۔سو احتیاط کے یہ تقاضے بھی مصنف نے پورے اہتمام سے پورے کیے ہیں۔انھوں نے آپ بیتی کی مروجہ تکنیک سے کئی سطحوں پر انحراف کیا ہے۔اس کتاب میں کئی ادبی اصناف کے دھارے آ کر مل گئے ہیں۔اس میں سفر نامہ کے عناصر بھی موجود ہیں، یہ یادداشتوں کا مجموعہ بھی ہے، اس کے اندر شخصیت نامے بھی ہیں اور کہیں کہیں رپورتاژ کا گمان بھی گزرتا ہے۔اس رنگا رنگی کا اعتراف خود مصنف کو بھی ہے:

''تو میں لکھتا چلا گیا یہ سوچے بغیر کہ کون سی فارم یا کون سی صنف ہے اور اس کے تقاضے کیا ہیں۔اب جب میں لکھ چکا ہوں تو بھی میں اسے کسی خانے میں مقید کرنے کی کوشش کو روا نہیں سمجھتا۔اس سے قاری کو شہ ملے گی اور وہ اپنے طور پر طے کرنے کی کوشش کرے گا۔ممکن ہے وہ اسے خودنوشت جان کر پڑھنے کی کوشش کرے اور پھر سوال اُٹھائے کہ یہاں خودنوشت کے تقاضے پورے ہوئے ہیں یا نہیں۔مگر ممکن ہے کوئی پڑھنے والا اس سے اختلاف کرے اور کہے کہ یہ تو بس سفر نامہ ہے۔'' (ص۲۹۴)

انسان جگہوں، چیزوں اور لوگوں کو جس حال میں چھوڑ کر جاتا ہے، انھیں ہمیشہ اسی حال میں دیکھنے کا آرزومند ہوتا ہے لیکن گردشِ ایام میں بہت سے نقوش دھندلا جاتے ہیں۔انتظار

حسین ایک ادبی سیمینار میں شرکت کے لیے ہندوستان گئے تو ان کے دل میں اپنے مرزبوم ڈِبائی (ضلع بلند شہر) کو دیکھنے کی خواہش نے زور کیا۔ وہ اپنے میزبانوں کے ہمراہ ڈبائی میں اپنے محلے پہنچے تو وہاں سب کچھ ویسا ہی تھا جیسا وہ تقسیم سے پہلے چھوڑ کر گئے تھے۔ تب ان کے تخیل نے ایک زقند بھری اور وہ برسوں پیچھے اپنے بچپن میں جا پہنچے۔ ان کو ماضی کے جھروکوں سے ماقبل تقسیم کے ہندوستان بالخصوص ڈبائی، ہاپوڑ اور میرٹھ کے سارے مناظر بہت واضح اور صاف دکھائی دیتے ہیں۔ ڈبائی کے گلی کوچے، بازار، محلے، مسجدیں، امام بارگاہیں، محرم کی مجلسیں، رام لیلا کے جلوس، انقلاب کے نعرے، ہندو مسلم معاشرت، رشتے ناتے اور خاندانی نظام ۔۔۔۔۔ کتاب کے اس حصے پر رومانیت کے سایے بہت گہرے ہیں۔ تخیل کی کارفرمائی ضرور ہے لیکن تخیل حقائق پر غالب نہیں۔ موسموں، پھلوں، باغیچوں، جانوروں، پرندوں، مجلسوں، جلوسوں اور تہواروں کی جزئیات اور منظر نگاری عروج پر ہے۔ یہاں مصنف نے اپنے خاندانی پس منظر کا سرسری تذکرہ کیا ہے۔ خودنوشت نگار عموماً اپنے خاندانی پس منظر اور حسب نسب کے بیان میں مبالغے اور تعلّی کی حدوں کو چھونے لگتے ہیں، مگر انتظار حسین اپنے خاندان کے بارے مین محض خبر دیتے ہیں:

> ''میں نے پوچھا: اچھا یہ بات ہے تو بتایئے کہ شجرۂ نسب ہمیں کس امام کی اولاد بتاتا ہے۔ بولے: ''ہم سیدنا حضرت امام حسین کی اولاد ہیں''۔ تب میں ٹھٹکا۔ ارے یہ تو خاک مدینہ و نجف میں کربلا کی خاک بھی آن ملی۔ اب میں یہ کیسے انکار کروں اور یہ میرے سنی عزیز حسینی ہونے پر مُصر ہیں تو میں کس خوشی میں پہلو بچا رہا ہوں۔ سو اے دوستو! میں نے عالی نسبی کا کوئی دعوٰی نہیں کیا مگر میرے اہل خاندان شجرہ لیے کھڑے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ کربلا کی خاک سے بہنے والے خون سے جو چھینٹے اُڑے ہیں، انھیں میں سے ایک چھینٹا ہم بھی ہیں۔'' (ص ۲۲)

مصنف کا خاندان ڈبائی سے ہاپوڑ منتقل ہوا اور ہاپور سے اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے وہ میرٹھ پہنچے۔ جہاں انھوں نے میرٹھ کالج سے بی۔اے اور ایم۔اے اردو کیا. یہاں ان کی ملاقات پروفیسر کرار حسین اور محمد حسن عسکری سے ہوتی ہے۔ پروفیسر کرار کی شاگردی اور عسکری کی محبت میں ان کا جو وقت گزرا اس کے اثرات انتظار حسین کی ادبی شخصیت پر بہت گہرے محسوس کیے جا سکتے ہیں۔۔ قیام پاکستان کے بعد لاہور میں بھی مصنف کو ان دو حضرات کی رفاقت میسر رہی۔ محمد حسن عسکری سیلانی طبیعت کے مالک تھے۔ وہ عمر بھر کسی ایک مرکز پر ٹِک کر نہ رہے۔ آغاز میں ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہوئے، پھر حلقۂ ارباب ذوق کے زیر اثر ہیئت اور مواد کی یکجائی پر زور دیا اور نفسیاتی تنقید میں بھی جوہر دکھائے، پھر پاکستانی ادب کی تحریک کا ڈول ڈالا اور آخر میں رینے

گینوں (شیخ عبدالواحد یحییٰ) کے ہاتھ پر بیعت کر کے اسلامی ادب کی طرف نکل گئے۔ اردو تنقید کی تاریخ اور ارتقاء پر نظر رکھنے والے جانتے ہیں کہ قیام پاکستان کے فوراً بعد ادب میں ریاست سے وفاداری اور الگ تہذیبی شناخت کا سوال اُٹھایا گیا۔ پاکستانی ادب کی تحریک کا محرک یہی سوال تھا۔ یہ تحریک ترقی پسند نقطۂ نظر کا ردعمل تھی۔ کچھ قوتوں نے اس سے اپنے سیاسی مقاصد بھی پورے کیے مگر اس تحریک کا محور پاکستانی ادب اور کلچر کے بارے میں عسکری کے خیالات تھے۔ اس رجحان نے اردو تنقید میں ایک نئی جہت کا اضافہ کیا۔ اس کی وجہ سے ادب میں مقامی عناصر کا ظہور ہوا اور ارضِ وطن سے محبت کا احساس بیدار ہوا۔ قیام پاکستان سے کچھ عرصہ پہلے ہی عسکری صاحب کے ذہن میں کلچر کا سوال اچانک کس طرح پیدا ہوا، اس کے گواہ انتظار حسین ہیں۔ واقعہ ملاحظہ ہو:

> ''کرار صاحب کی گفتگو میں اندیشہائے دور دراز کی کارفرمائی اب زیادہ ہی نظر آنے لگی تھی۔ آپ پوچھتے ہیں کہ ''ہندوستان میں اب مسلمانوں کی سیاست کیا رُخ اختیار کرے گی؟'' رُکے۔ پھر بولے ''کیسی سیاست، کہاں کی سیاست۔ مسلمانوں کے لیے یہ دروازہ لمبے عرصے کے لیے بند ہو چکا ہے۔'' عسکری صاحب سوچ میں پڑ گئے۔ پھر دیر بعد بولے: ''سیاست کے سوا بھی تو فعل و عمل کی صورتیں ہیں۔'' ''مثلاً؟'' کرار صاحب نے پوچھا۔ ''مثلاً کلچر۔'' بس یہاں سے ایک نئی بحث کا دروازہ کھل گیا اور بات ہند اسلامی کلچر تک پہنچی۔'' (ص ۸۴)

ہجرت کے بعد مصنف کی زندگی میں ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے: لاہور آمد، لاہور کے گلی کوچے، شامیں اور رتجگے، معاش کی تلاش، ''نظام''، ''آفاق''، ''امروز'' سے وابستگی، صحافتی زندگی کی مصروفیات، ماہنامہ ''خیال'' کا اجراء، کافی ہاؤس اور ٹی ہاؤس کی محفلیں۔۔۔۔ یہاں مصنف کی وساطت سے ہماری ملاقات ہماری ادبی تاریخ کے کئی اہم ناموں سے ہوتی ہے جن میں چراغ حسن حسرت، سلیم احمد، م حسن لطیفی، شاکر علی، مولانا صلاح الدین احمد، عبداللہ چغتائی اور کئی دوسری اہم ادبی شخصیات قابل ذکر ہیں۔ مگر شخصیہ نگاری مکمل نہیں ہے۔ کسی بھی شخصیت کے خدو خال پوری طرح ابھر کر سامنے نہیں آ سکے۔ انتظار حسین کی یادداشتوں کا ایک مجموعہ ''چراغوں کا دھواں'' کے عنوان سے ۱۹۹۹ء میں شایع ہوا تھا۔ بیشتر واقعات معمولی ردوبدل کے ساتھ وہاں سے لے کر یہاں نقل کیے گئے ہیں۔ مثلاً ''چراغوں کا دھواں'' میں صفحہ ۳۲ تا ۳۶ مصنف نے یہ واقعہ لکھا ہے کہ ''نظام'' کی ادارت کے دنوں میں انھیں سہیل عظیم آبادی کا ایک خط موصول ہوا جس میں سہیل عظیم آبادی نے ترقی پسند نقطۂ نظر سے پاکستان اور قائداعظم کے سیاسی کردار پر اظہار خیال کیا تھا۔ عسکری صاحب ان دنوں ادب میں ریاست سے ادیب کی وفاداری کا سوال اُٹھا رہے

تھے۔خط کی اشاعت پر عسکری نے شدید ردعمل کا اظہار کیا اور اپنے مضمون میں ترقی پسند ادیبوں پر جملے کسے۔جس کے جواب میں عبداللہ ملک نے انجمن ترقی پسند مصنفین کے جلسے میں اپنا مضمون پڑھا۔عبداللہ ملک کے اصرار پر مصنف (انتظار حسین) یہ مضمون بغیر کسی ردوبدل کے ''نظام'' میں شایع کرنے پر مجبور ہو گئے۔اس مضمون کی اشاعت کے بعد ''نظام'' میں بحث کا ایک نیا سلسلہ چل نکلا۔یہ واقعہ تقریباً انھی الفاظ میں مصنف نے ''جستجو کیا ہے؟'' (ص ۹۵-۹۹) میں بھی نقل کیا ہے۔یا کرشن چندر کی بہن سے ریوتی سرن شرما کا عشق اور اس کے گھر والوں سے مصنف کی ملاقات کا احوال جو ''چراغوں کا دھواں'' میں صفحہ ۵۶، ۵۷ اور ''جستجو کیا ہے؟'' کے صفحہ ۷۹-۸۰ پر موجود ہے،اسی طرح کئی اور واقعات کی تکرار بھی ان دونوں کتابوں کے صفحات پر ملتی ہے۔

طویل عرصے کے بعد مصنف کو ہندوستان یاترا کا موقع ایک بار پھر سے نصیب ہوا۔اس مرتبہ وہ ساہتیہ اکیڈمی کی دعوت پر 'پریم چند فیلو شپ' کے سلسلے میں ہندوستان پہنچے۔ہندوستان میں ان کا قیام خاصا طویل رہا۔اس دوران انھوں نے ہندوستان کے کئی اہم شہروں مثلاً لکھنو،علی گڑھ اور بندرا بن کی سیر کی؛کئی لکھنے والوں سے ملاقاتیں کیں اور کئی ادبی تقریبات میں شریک ہوئے۔اس سفر اور ان ملاقاتوں کی روداد بھی اس کتاب کا حصہ بنی ہے۔

مصنف نے کتاب کو اکتیس (۳۱) ابواب یا ذیلی عنوانات کے تحت تقسیم کیا ہے۔تاہم یہ کتاب بنیادی طور پر تین بڑے حصوں یا مصنف کی زندگی کے تین ادوار پر مشتمل ہے۔پہلا دور تقسیم سے پہلے کے دور میں مصنف کے بچپن اور نوجوانی کا ہے۔دوسرا دور ہجرت کے بعد لاہور آمد اور یہاں گزرنے والے شب وروز جب کہ تیسرا دور اکیسویں صدی میں پھر سے ہندوستان یاترا کی یادوں پر مشتمل ہے۔

ہند اسلامی تہذیب انتظار حسین کے ادبی سرمایے میں ایک مستقل رو کی صورت میں موجود ہے۔یہ داستان (آپ بیتی) اسی تہذیب کی جستجو سے عبارت ہے۔مصنف نے شعوری یا غیر شعوری طور پر آپ بیتی میں کئی خلا چھوڑے ہیں۔واقعات میں عدم تسلسل ہے جب کہ کچھ واقعات کی تکرار بھی ہے۔مثال کے طور پر عبید صدیقی کے تعارف اور پریم چند فیلوشپ کے سلسلے میں شہریار کے فون کے واقعے کو من وعن دہرایا گیا ہے۔انتظار حسین نے نوآبادیاتی عہد کے ہندوستان کو اپنی آنکھوں سے دیکھا لیکن اس کی تصویر اپنے قارئین کو نہیں دکھائی۔اپنے قیام میرٹھ کے بیان میں اس ذکر کیا بھی تو سرسری،صرف ایک پیراگراف میں۔وہ تحریک آزادی کے چشم دید گواہ تھے لیکن ان حالات کا تذکرہ بھی ان کی آپ بیتی میں نہیں ہے۔وہ ہجرت کے تجربے سے گزرے اور ہجرت کے دُکھ کو اپنی ذات پر سہا بھی۔اس دُکھ کی چاپ کتاب کے آخری صفحات میں

سنائی دیتی ہے اور کسی حد تک فضا کو ملول بھی کرتی ہے مگر ہجرت کے واقعات اور تجربات میں قاری کو پوری طرح شریک کرنا انھوں نے مناسب نہیں سمجھا۔ وہ تہذیب کے منطقوں میں سفر کرتے رہے۔ ان کی ذات کبھی تو پیش منظر پر اُبھرتی ہے اور کبھی پس منظر میں ڈوب جاتی ہے۔ کتاب کا پہلا حصہ آپ بیتی کے مروجہ تقاضے پورا کرتا ہے؛ دوسرے حصے میں شخصیت نگاری کا رنگ گہرا ہے اور تیسرے حصے میں تاریخ اور جغرافیہ غالب رہتا ہے۔ تیسرے حصے کو آپ بیتی سے زیادہ سفرنامہ کہنے میں تامل نہیں ہونا چاہیے۔ بالخصوص اس حصے کا ایک باب ''بندرابن کی کنج گلی میں'' مکمل طور پر خود کو سفرنامہ باور کراتا ہے۔ ایک پیراگراف ملاحظہ ہو:

''چلتے چلتے ہم اس بڑے مندر کے سامنے پہنچ گئے تھے جو گوبند جی کا مندر کہلاتا تھا۔ گوبند، کرشن جی کا وہ نام ہے
جو رہس لیلا سے متعلق ہے۔ اسی حساب سے یہ مندر تعمیر ہوا ہے۔ جب داخل ہوتے ہیں تو ایک لمبا چوڑا ایوان نظر آتا ہے۔ اس کے آخر میں ایک کوٹھڑی ہے جس میں کرشن جی کی مورتی سجی ہے اور ایسے زاویے سے سجی ہے کہ جب پورن ماشی کا چاند نکلتا ہے تو اس کی کرنیں اس طویل ایوان کو پار کر کے سیدھی مورتی پر پڑتی ہیں۔'' (ص ۱۶۵)

میری مذکورہ معروضات سے قطع نظر اس کتاب کی ایک خوبی ایسی ہے جس پر دو رائیں نہیں ہو سکتیں اور وہ ہے اس کا جاندار اسلوب، داستانوی فضا، براہِ راست گفتگو کا لب و لہجہ، مختصر اور بے تکلف جملے، صاف ستھری اور شستہ اردو۔ ایسا روزمرہ اور محاورہ کہ جس سے کم از کم میری نسل کے طالب علم ناآشنا ہوتے جا رہے ہیں اور فصاحت و بلاغت کا ایسا معیار جو اردو کی آپ بیتیوں میں خال خال ہی نظر آئے گا۔ اس دعوے کی دلیل میں کم و بیش یہ ساری کتاب پیش کی جا سکتی ہے تاہم یہ چند اقتباسات میرے مؤقف کی تائید کے لیے کافی ہوں گے:

> ''پھیری والوں میں کوئی چین بیل والا، کوئی صدا لگا رہا ہے: ریشم کی لچھیاں لے لو۔ پھر موسم کے میوے کی صدا لگانے والے۔ کسی کے سر پر بڑا سا شہتوت کا چھابڑا ہے۔ کوئی کمرخ بیچتا ہے۔ کوئی فالسے کی صدا لگاتا ہے اور ہاں رات آندھی چلی تھی۔ آندھی میں جانے کتنی کچی امبیاں گری تھیں کہ ٹوکرے امبیوں سے بھرے سر پر دھرے کنجڑے چلے آ رہے ہیں۔ ٹکے دھڑی لگا دی ہیں امبیاں۔ منہارن تو خیر بے تکلف اندر چلی آتی تھی۔ وہ آئی اور ہماری بہنوں کی عید ہو گئی۔ کلائیوں پر چڑھتے چڑھتے کتنی چوڑیاں چکنا چور ہو جاتی تھیں۔'' (ص ۳۴)

''لیجیے انھیں دنوں کے حوالے سے ایک اور شخصیت کی یاد آئی۔ جون کا مہینا، دوپہر کا

وقت، سورج جیسے سوا نیزے پر اُترا ہوا ہو۔ میں دفتر کی بالکنی سے باہر جھانکتا ہوں۔ ایک بزرگ سوٹ میں ملبوس، سر پر سولر ہیٹ، ہاتھ میں چھڑی سامنے مال کے فٹ پاتھ پر ٹخ ٹخ کرتے چلے جارہے ہیں۔ یہ مولانا صلاح الدین احمد ہیں۔'' (ص ۱۲۸)

''فطرت یہاں آکر کتنی حسین کتنی مہذب، کتنی ضابطہ کی پابند ہوگئی ہے۔ ہر چند کہ یہ فطرت کے خلاف بات ہے۔ سبزہ وگل پہ بہار آئی ہوئی تھی۔ پھول کیسے ڈھڈ ہار ہے تھے مگر رنگ ہی رنگ، خوشبو ندارد۔ یہاں پھول کھلتے ہیں، مہکتے نہیں اور درخت بہت سرسبز، بہت گھنے مگر بلندی کی شان سے نا آشنا۔ اے حضرت ورڈ سورتھ! کبھی آپ ہندوستان پاکستان کی طرف آئے ہوتے اور ہمارے برگد کو دیکھا ہوتا۔ الڈس ہکسلے نے تمھیں ٹھیک طعنہ دیا تھا کہ اس شاعر کا کبھی استوائی علاقہ میں گزر ہوا ہوتا تب اسے پتا چلتا کہ فطرت کیا ہوتی ہے؟ خالی حسین نہیں ہوتی، ہیبت ناک بھی ہوتی ہے۔'' (ص ۱۵۲)

یہ کتاب انتظار حسین کے ادبی فن کی تفہیم میں معاون ہے۔ اس کتاب کی مدد سے ہم انتظار حسین کی ادبی زندگی کا ارتقاء تو سمجھ سکتے ہیں لیکن ان کی شخصیت کے تمام ابعاد تک ہماری رسائی نہیں ہوتی۔ اس کا لزام ہم مصنف پر نہیں دھر سکتے کہ وہ ہماری پسند یا ناپسند کا پابند نہیں۔ یہ ہماری خواہش ہوسکتی ہے کہ ہم اپنے پسندیدہ مصنف سے کیا سننا چاہتے ہیں یا اس کے بارے میں کیا جاننا چاہتے ہیں لیکن یہ اختیار صرف اس کو حاصل ہے کہ وہ اپنی زندگی کے کن واقعات اور تجربات میں ہمیں شامل کرنا چاہتا ہے اور کن واقعات میں شامل نہیں کرنا چاہتا۔ انتظار حسین اپنی زندگی کے تمام واقعات و تجربات تسلسل اور تفصیل سے لکھتے تو یہ کتاب ایک مکمل آپ بیتی بن سکتی تھی۔ انھوں نے ایسا نہیں کیا تو یہ ان کا اختیار تھا لیکن اس سے کتاب کی ادبی حیثیت ہرگز مجروح نہیں ہوئی۔

’’ہائیڈل برگ کی ڈائری‘‘ سے ایک ورق

محمد الیاس کبیر

اصنافِ ادب میں ڈائری/ روزنامچہ سب سے زیادہ لکھی جانے والی اور سب سے کم شایع ہونے والی صنف ہے۔ یہاں دو سوال جنم لیتے ہیں: ایک، کسی بھی چیز کا سب سے زیادہ لکھا جانا اُس کی اہمیت میں کس قدر اضافے کا باعث بنتا ہے؟ دوسرا، سب سے زیادہ لکھی جانے والی تحریر سب سے کم شایع کیوں ہوتی ہے؟ اِن بنیادی دو سوالوں سے ایک اور سوال بھی جنم لیتا ہے کہ ہر ڈائری قابل اشاعت نہیں ہوتی۔ ڈائری کے شایع کرنے کے لیے کچھ قابل ذکر چیزوں کا ہونا ضروری ہے۔ اس میں یہ بھی دیکھا جائے کہ اس ڈائری کے مندرجات کا شایع کرانا کس حد تک لازمی ہے۔ محض روزمرہ معمولات کو ہی صفحۂ قرطاس پر منتقل کرنا ڈائری کا مقصدِ وحید نہیں ہوتا، بلکہ ان کے علاوہ بھی کچھ دیگر چیزوں کو بھی پیش نظر رکھا جائے۔ مثال کے طور پر ڈائری نویس جس خطے، جس علاقے میں قیام پذیر ہو اُس کے سیاسی و سماجی اور ادبی پہلو بھی نمایاں ہوں اور دن کے اہم ترین واقعات، مصروفیات اور دیگر حوالوں کو بھی اجمالی انداز میں بیان کیا جائے تاکہ اُس کی پڑھت سے اندازہ لگایا جا سکے کہ ڈائری لکھنے والے نے کسی چیز یا واقعہ کو کس انداز اور کس زاویے سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔

ڈاکٹر ناصر عباس نیرّ ایک ذہین نقاد ہی نہیں بلکہ اسی مزاج کے تخلیق کار بھی ہیں۔ انھوں نے تنقید کی طرح تخلیق کے میدان میں بھی اپنی انفرادیت کو قائم رکھا ہے۔ تخلیقی حوالے سے دیکھا جائے تو ان کی اب تک چار کتابیں شایع ہوئی ہیں (اور مستقل قریب میں حیران کن حد تک مزید کئی کتابیں آنے والی ہیں)۔ ’’چراغ آفریدم‘‘ اگرچہ اُن کی پہلی تخلیقی کتاب ہے جو صنفِ انشائیہ پر مشتمل ہے، لیکن انھوں نے انشائیوں سے قبل لکھنے کا آغاز افسانوں سے کیا تھا، جو اُس دور کے مقبول ترین جرائد میں شایع ہوئے۔ یہ وہ دور تھا جب ان رسائل کا انتظار انتہائی شدت کے ساتھ کیا جاتا تھا، اور ان رسائل میں تخلیق کی اشاعت کسی بھی تخلیق کار کے لیے مہمیز ثابت ہوتی۔ یہ کوئی بیس سال قبل کی بات ہے۔ ناصر عباس نیر نے اپنے استاد ڈاکٹر پرویز پروازی کے منع کرنے پر افسانے لکھنا چھوڑ دیا تھا۔ بعض اوقات کسی چیز کی سختی سے ممانعت اُس سے مزید رغبت اور جرأت کا

باعث بن جاتی ہے۔ کچھ ایسی ہی صورتِ حال کا سامنا ناصر عباس نیرؔ کو بھی کرنا پڑا، اور اُن کا افسانے کی طرف رجحان پختہ سے پختہ تر ہوتا چلا گیا۔ اسی دورانیے میں انھوں نے بہت سا اردو اور انگریزی فکشن پڑھ ڈالا۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے اردو تنقید کے خارزار میں قدم رکھ دیا اور اس میں بھی ایک اعتبار اور معیار قائم کیا۔ بیس سال کے طویل عرصے کے بعد وہ اپنا افسانوی مجموعہ ''خاک کی مہک'' کے نام سے منظرِ عام پر لائے تو اس میں کوئی بھی پرانا افسانہ نہیں تھا بلکہ تمام افسانے یک سر نئے لکھے گئے تھے۔ یہ افسانے اپنے موضوع، مزاج اور مذاق کے حوالے سے بالکل جداگانہ اور روایت سے ہٹ کر ثابت ہوئے۔ جن کی فضا نے اردو افسانے کے قاری کے لیے جہانِ فن کے نئے در وا کیے۔ ایک سال کے اندر اندر دوسرا افسانوی مجموعہ ''فرشتہ نہیں آیا'' آیا تو انھوں نے اپنے آپ کو دہرایا نہیں بلکہ مختلف موضوعات کو مختلف انداز سے دیکھنے کی کوشش کی۔

''ہائیڈل برگ کی ڈائری'' جو دراصل ۲۰۱۱ء میں ناصر عباس نیرؔ کی ہائیڈل برگ یونیورسٹی جرمنی میں اپنے پوسٹ ڈاکٹرل فیلوشپ کے سلسلے میں قیام کے دنوں کی یادداشتوں پر مشتمل ڈائری ہے۔ یہاں ان کے مقالے کا عنوان ''نوآبادیاتی عہد میں اردو نصابات'' تھا جسے بعد میں ''ثقافتی شناخت اور استعماری اجارہ داری: نوآبادیاتی عہد کے اردو نصابات کا مابعد نوآبادیاتی مطالعہ'' کے عنوان سے شایع کیا گیا۔ ''ہائیڈل برگ کی ڈائری'' روایتی طرز میں لکھی گئی ڈائری نہیں بلکہ مصنف نے حسبِ روایت فلسفیانہ انداز میں مختلف چیزوں کو ان کے سیاسی و سماجی اور ادبی تناظر میں دیکھا ہے۔

یہاں ایک چیز کا ذکر کرنا ضروری ہے کہ انھوں نے اگر کوئی عمارت دیکھی تو اس عمارت کا صرف حدود اربعہ بیان نہیں کیا بلکہ اس کی تعمیر کے پس منظر پر کئی سوالات بھی قائم کیے۔ یہ سوالات تاریخی نوعیت کے ہیں جس کے اندر مزید سوالات جنم لے رہے ہیں۔ (اور یہ ناصر عباس نیر کا مخصوص اسلوب ہے کہ وہ سوال در سوال کے ذریعے کسی بھی متن کی نئے نئے انداز میں تعبیر کر سکتے ہیں)۔ کچھ یہی صورتِ حال اس کتاب میں بھی نظر آتی ہے۔ سنگِ مرمر کی کوئی عمارت دیکھی تو اس پتھر کا شکوہ مختلف عمارتوں میں تلاش کیا۔ کہیں پر سفید مرمر اور کہیں پر بھورے سنگِ مرمر کا ذکر ہوا۔ اس تناظر کو ہندوستانی عمارتوں سے جوڑنے کی کوشش کی۔ مثال کے طور پر:

> ''سفید مرمر کے پتھر کا بھی اپنا شکوہ ہے، جو تاج محل میں نظر آتا ہے، مگر بھورے سنگِ مرمر میں بھی دل کش چمک تھی۔ مرمر کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ پرانا نہیں ہوتا۔ گویا وقت سے آزاد ہوتا ہے۔ اسے دیکھنے سے روشنی کا انتہائی مدھم احساس ہوتا ہے اور یہ احساس روشنی کو بڑھانے کی خواہش جگاتا ہے۔ کیا خاص رنگ کے پتھروں کا

خاص طرح سے سوچنے سے کوئی تعلق ہے؟ عمارتوں کا ہم پر کس قسم کا اثر ہوتا ہے؟
مجھے اورینٹل کالج کی سرخ رنگ کی عمارت یاد آئی۔ اس کے ساتھ جانے کیا کیا یاد
آیا۔ قدیم متون پر معصومانہ قسم کی تحقیق، ترقی کی دوڑ، سازشیں، رومانس، خودنگری
کی خو، تکبر اور جانے کیا کیا۔ کچھ نہ کچھ تو اثر ہوتا ہے عمارتوں
کا۔ Congnitive نہ سہی، Affective سہی!'' (ص ۴۶، ۴۷)

اِس کتاب میں ناصر عباس نیرّ پارسائی کا دعویٰ کرتے ہوئے کسی رندِ مشربی پر مذہبی قدغن نہیں لگاتے، بلکہ روشن فکر اور معروف معنوں میں آزاد خیالی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے اس کا ثقافتی حق تسلیم کرتے ہیں۔ انھیں جرمنی میں جو ثقافتی میلانات نظر آئے اُسے ایک روایتی مشرق پسند شخص کی نظر سے نہیں دیکھا۔ وہ اپنی ثقافت سے باہر نکلتے بھی نظر نہیں آتے اور اُن کی شخصیت میں اتنی لچک موجود ہے کہ وہ جرمن ثقافت کو قبول کرتے ہیں اور اُس پر ''حملہ آور'' نہیں ہوتے۔ اُن کا ایمان اپنی ذات میں محفوظ ہے اور جرمن دوشیزاؤں کے مختصر لباس اور بوس و کنار کو دیکھتے ہیں تو اُن کی اقدار کو کسی قسم کا کوئی خطرہ لاحق نہیں ہوتا اور وہ اسے اُن کا سماجی حق گردانتے ہیں:

''اسی طرح میں دیکھتا ہوں کہ جوں ہی دھوپ نکلتی ہے، خواتین کے جسم پر محض دو دھجیاں سج جاتی ہیں۔ ہر دوسرے قدم پر نوجوان (اور بزرگ بھی) جوڑے سرِعام بوس و کنار کرنے لگتے ہیں۔ کوئی ان کی طرف توجہ دیتا ہے نہ یہ کسی کی پروا کرتے ہیں۔ اس آزادی کو ''رشک بھری نگاہوں'' سے دیکھنے کے باوجود میں اس کی تقلید کرنے پر خود کو آمادہ نہیں پاتا، مگر میں اسے ایک لمحہ کے لیے غلط یا گم راہ کن قرار نہیں دے سکتا۔ جس بات کو کوئی سماج اجتماعی طور پر قبول کر لیتا ہے، اس پر حرف زنی کا ہمیں کوئی حق نہیں۔'' (ص ۶۷)

ایک ایشیائی مسلمان باشندے بالخصوص ایک پاکستانی نے جرمنی میں اپنی مشکلات، اپنے جذبات واحساسات کو جس طرح دیکھا اُسے کسی لگی لپٹی کے بغیر بیان کر دیا۔ ہم مسلمان (صرف پاکستانی مسلمان) مسلم اُمہ کا درد اپنے جگر میں پالتے ہیں، ہر جگہ اور ہر فورم پر اس کا برملا اظہار بھی کرتے ہیں۔ لیکن اس کا عملی اطلاق کہیں پر نظر نہیں آتا اور ہم نئے نوآبادیاتی آقا کے حکم کی تعمیل میں اُمتِ مسلمہ کو پارہ پارہ کرنے سے بھی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے۔ جو بے درد دردمندی ہمارے دل میں ہے وہ شاید دنیا کے کسی مسلمان میں موجود ہو۔ اس کا ایک اظہار ناصر عباس نیر نے الجیریائی مسلمان کی صورت میں ملاحظہ کیا:

''ایک نوجوان ملا۔ ڈاڑھی تھی۔ میں نے خود غرضی سے سوچا، اگر لسانی تعصب

ہوسکتا ہے تو مذہبی تعصب کیوں نہیں، چناں چہ میں نے اپنے تعارف سے بات شروع کی۔ پاکستان سے آیا ہوں، مسلمان ہوں۔ راستہ پوچھنا ہے۔ جواب ملا۔ عریبک آر فرنچ۔ میں نے کہا۔ برادر، اونلی انگلش۔ وہ الجیریا کا مسلمان تھا۔ لہٰذا اس کے ماضی میں عربی اور فرانسیسی تھی۔ اس کے بعد کہیں اس کے مسلمان ہونے کی پہچان تھی۔ میں نے کہا کہ اگر آپ انگریزی میں دو جملے بول دیں تو کیا فرق پڑے گا۔ کہنے لگا۔ ''آئی ڈونٹ نو انگلش''۔ میں نے عرض کیا۔ یونو اینڈ کین سپیک کنوینٹلی برادر۔ پلیز گائیڈ می۔ مگر آگے لمبی چپ۔ مسلم ہیں ہم، وطن ہے سارا جہاں ہمارا......اخوت کس کو کہتے ہیں؟...... چبھے کانٹا جو پیرس میں......تو مسلماں الجیریا کا......'' (ص ۱۲۴)

اس کتاب کا ایک اختصاص یہ بھی ہے کہ بہ یک وقت جرمنی کا سفرنامہ بھی ہے، اور اس میں جرمنی کی ماضی، حال اور مستقبل کی تاریخ بھی بیان کر دی گئی ہے۔ وہاں پر کتب خانوں کا قابل تقلید انصرام اور کتب بینی کا قابل رشک رجحان، طالب علموں میں علم و دانش کے حصول کا جنون، نت نئے سیمینارز، مذاکرے اور نئے تنقیدی مباحث، شعر و ادب کی تازہ ترین صورتِ حال، وہاں کی بےفکر زندگی، سہانی صبحیں اور خمار آلود شامیں، کلب، پب، ریستوران، عبادت گاہیں، متنوع خورونوش کی اشیا، شہری اور دیہاتی زندگی، سیاسی و سماجی صورتِ حال، کام کرنے کی ان تھک لگن اور جوش و جذبہ......غرض سب کچھ اس کتاب میں سما گیا ہے۔ نیز اس میں جرمنی کے خارجی مناظر کے ساتھ ساتھ داخلی کیفیات اور مظاہرات پر بھی کھل کر بات کی گئی ہے۔

اب ناصر عباس نیر کے قارئین اُن سے ایک بڑے ناول کا تقاضا کر رہے ہیں۔

لیاقت علی کا سچا جھوٹ

ضیغم رضا

’’جھوٹے آدمی کے اعترافات‘‘ لیاقت علی کا دوسرا مجموعہ ہے ان کا پہلا مجموعہ ۲۰۰۸ء میں ’’پلیٹ فارم‘‘ کے نام سے چھپا تھا۔ دونوں مجموعوں کے درمیان کم و بیش دس سال کا فاصلہ ہے اور ظاہر ہے اس دوران میں ہمارا معاشرہ کئی طرح کی سیاسی، سماجی اور مذہبی تبدیلیوں سے ہمکنار ہو چکا تھا۔ پرویز مشرف کا جبری دورِ حکومت ختم ہونے کے بعد دس سالہ جمہوری دورانیہ بظاہر خوش آئند ہے مگر کئی عوامل ایسے ہیں جنھوں نے بہ حیثیت قوم ہمیں شکستگی سے دوچار کیا ہے۔ اس دوران میں کئی اہم سیاسی و سماجی شخصیات اور ہزاروں عام شہری دہشت گردی کا نشانہ بنے۔ ملکی صورت حال عجیب دوراہے پہ آ ٹھہری ہے کہ ایک طرف ہم خود دہشت گردی کی لپیٹ میں ہے دوسری طرف عالمی سطح پہ ہمیں بطور دہشت گرد متعارف کرایا جاتا ہے۔ آمریت کے بادل بظاہر چھٹ چکے ہیں مگر ایک طبقہ اب بھی باقی ہے جو اپنی سماعتوں سے بوٹوں کی چاپ ٹکرانے کا دعویٰ کرتی ہے۔ میڈیائی یلغار نے سانحے کو واقعہ اور واقعے کو سانحہ بنانے کے ایسے حربے ایجاد کر لیے ہیں کہ جو بظاہر نظر آتا ہے وہ عموماً ہوتا نہیں۔ خبروں کی گرد اس قدر اڑائی جاتی ہے کہ حقیقی واقعہ کہیں گم ہو کے رہ جاتا ہے۔ پھر کمرشلزم ہے کہ جس نے رشتوں اور قدروں کو کہیں پیچھے دھکیل کر ترجیحات و مفادات کے پیمانے وضع کر دیے ہیں۔ ان تمام حالات میں اگر کوئی رویہ جنم لیتا ہے تو وہ بے اعتباری کے سوا کیا ہو سکتا ہے؟ ہر گز کہیں کہ ہے، نہیں ہے؛ کا یہ رویہ اب اجتماعی طور پر ہمارے اندر سرایت کر چکا ہے۔ ہم جو مکے مدینے سے اپنی نسبت گنواتے آئے ہیں اب اس رشتے سے بھی تادیر بندھے رہنا ہمارے لیے ممکن نہیں رہا کہ ہمارا خمیر وہاں سے نہیں ہے۔ ہماری زمین کہ جس سے ہمیں اٹھایا جانا ہے؛ ہم پہ اس قدر تنگ ہے کہ آئے دن ہماری جڑیں مزید اکھڑتی چلی جا رہی ہیں۔ اس کا واحد حل یہی ہے کہ ایک جھوٹا سچ مان لیا جائے اور اسی کے ساتھ ہی اپنی تمام تر وابستگی کو مجتمع کر کے؛ کم سے کم خود کو تو مطمئن رکھا جائے اور یہی رویہ ہمیں لیاقت علی کے ان افسانوں میں دیکھنے کو ملتا ہے۔

افسانے کا وہ عنوان جو اس مجموعے کا بھی عنوان ہے ہمارے درج بالا نتیجے سے میل کھاتا نظر آتا ہے۔ اس افسانے کے اختتام پہ کیا گیا اعتراف گویا ہمارا اجتماعی اعتراف ہے:

''وہ اب تک جو کہتا، سنتا اور لکھتا آیا۔ وہ، وہ نہیں تھا جو وہ کہنا سننا یا لکھنا چاہتا تھا۔ زندگی کے بیچ میں سرگرداں وہ آج یہ اعتراف کرتا ہے کہ جھوٹ دنیا کی سب سے بڑی سچائی ہے۔۔''

یہاں شاید یہ بیان قدرے مایوس کن یا مبالغہ آمیز لگے مگر ہماری ملکی تاریخ کو اگر مدنظر رکھا جائے تو کیا یہ بیان مبنی بر حقیقت نظر نہیں آتا؟ ہمارا وہ بچہ جس کی تربیت اعلی انسانی قدروں پہ کی جاتی ہے مذہبی حکایات جس کے لیے مثالی نمونہ ہوتی ہیں کیا زندگی بھر انہیں اصولوں پہ کاربند رہنا اس کے لیے ممکن ہوتا ہے۔ اس افسانے کا کردار بھی اس صورتحال سے دوچار ہے کہ جس کی دنیاوی کامیابی کو اس کی نیت کے ساتھ مشروط کر دیا جاتا ہے۔ موجودہ عہد میں دنیوی کامیابی کے جو پیمانے ہیں ان کے برعکس نیت کا ٹھیک ہونا بے معنی ہو کے رہ جاتا ہے اور ظاہر ہے اس کا نفسیاتی ردعمل حد درجہ مایوسی کی صورت ہی سامنے آتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اگر ہمارے پیش نظر ہمارے عہد کی ملکی صورتحال رہے تو یہ جھوٹ؛ بہت حد تک سچ لگے گا۔ ذرا ایک نظر ''پرچھائیاں''، ''گم شدہ لوگ''، ''گنبدِ بے در'' اور ''مہیب سائے'' کو دیکھیے کیا ایسی صورتحال میں بے اعتباری و بے یقینی کی فضا بامعنی نہیں؟ ''گمشدہ لوگ'' کا متکلم جو ایک کہانی کار ہے ایک ایسی کہانی لکھ بیٹھا ہے جس کی وجہ سے اس کا ادبی قد کاٹھ تو بڑھ سکتا ہے مگر اسے خود کا گمشدہ لوگوں میں شمار ہونے کا اندیشہ ہے۔ کہانی ایک ایسے مصور کی ہے جس نے ایک تصویر میں ان لوگوں کے چہرے دکھائے جو دیکھتے ہی دیکھتے کہیں لاپتہ ہو گئے۔ اس تصویر کی پاداش میں مصور کو سزائے موت ہو جاتی ہے۔ رمز و کنا سے مملو یہ کہانی ہمارے ملک کے گمشدہ لوگوں کو موضوع تو بناتی ہے مگر اس طرح کہ پسینہ افسانہ نگار کے ماتھے سے بہہ رہا ہے۔ خوف و دہشت کی اس فضا میں سچ کہنا تو موت کو دعوت دینا ہے ہی اس سچ کے ساتھ جینا بھی مسلسل کرب کا سامان ہے۔ اس کرب کو ''پرچھائیاں'' اور ''گنبدِ بے در'' میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ پھر ''بلڈی سولینز'' کی اصطلاح استعمال کرنے والے ''مہیب سائے'' بھی ہیں جو اپنے ہی پیاروں کو خونم خون کر رہے ہیں۔ ایسے میں ''مکوڑے'' ہیں کہ دن بدن بڑھتے جا رہے ہیں اور ان کا سدِ باب ہم سے ہونے میں نہیں آتا۔ مکوڑوں کے ساتھ رہنے کی عادت بھی ہماری ''شناخت'' کو مسخ کر رہی ہے سو حیلہ یہی ہے کہ اپنی عصبیت بدل لی جائے؛ ایک سچ اگر جھوٹ ثابت ہو جائے تو ایک اور سچ تشکیل دے لیا جائے اور یہی رویہ ''گھوڑے'' میں سامنے آتا ہے جو کہ قدرے متوازن بھی ہے۔

جنریشن گیپ کے اس دور میں یہ ایک ایسے باپ بیٹے کی کہانی ہے کہ مشترکہ جنون نے جنہیں ایک دوسرے کے قریب کر دیا ہے۔ مختصر سی اس کہانی میں؛ روزمرہ کی تفریح (کرکٹ) کو موضوع بنا کے وسیع منظر نامہ تشکیل دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ میڈیا جو ایسے مواقع پہ سنسنی پھیلانے

اور اپنے ہیروز کو قبل از وقت فاتح ثابت کرنے کا ہر حیلہ آزماتا ہے؛ عوام کا ردعمل جو شکست کی صورت میں کئی دنوں کی جھلاہٹ کا سبب بنتا ہے اور سب سے اہم بات اپنے بچوں کے سامنے اپنے روشن (کرکٹ کے) ماضی کی تابندگی کو موہوم ہوتے دیکھنا۔ اگر بات یہاں تک رہتی تو یہ محض ایک معمول کی بات ہوتی جسے سن کے بآسانی اڑایا جا سکتا تھا مگر معاملہ اتنا سیدھا نہیں ہے۔ یہ اختصاص لیاقت علی کو ضرور حاصل ہے کہ وہ علامت کو کہانی میں یوں تحلیل کر دیتے ہیں کہ معنویت دوہری تہری سے بھی آگے نکل جاتی ہے۔ اوپر میں نے ذکر کیا تھا کہ اس افسانے میں قدرے متوازن رویہ سامنے آتا ہے اب ذرا اس مکالمے کو دیکھیے:

''یہ تو مسلمان نہیں ہیں تو اللہ ان کا ساتھی کیسے ہوسکتا ہے؟

میں نے اس سے کہا: یار شیگی اللہ محنت کرنے والوں کا ساتھی ہے۔''

یہاں مجھے بپسی سدھوا کا یادگار کردار فریڈی یاد آرہا ہے کہ جو اپنی غرض اور کامیابی سے بڑھ کر کسی چیز کو اہمیت نہیں دیتا۔ ہمارے ہاں بھی دین و دنیا کے بیچ میں اٹک کر عموماً دونوں کو ادھورا چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس ''گھوڑے'' میں قطعیت کا رویہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ اپنے ماضی کے ہیروز کو مشعل راہ مان کر اگر دنیاوی کامیابی کا حصول ممکن نہیں تو کیوں نہ ''گھوڑے'' بدل لیے جائیں اور اپنی عصبیت ان ''گھوڑوں'' کے ساتھ مشروط کر دی جائے کہ جن کا حال روشن ماضی کی گواہی دے سکے، جو ہمیں سر اٹھا کے چلنے کے قابل بنا سکیں۔ صرف اسی افسانے کی نہیں مذکورہ بالا تمام افسانوں میں رمز و علامت کا برتاو اس سلیقے سے کیا گیا ہے کہ کہانی ذرا بھی متاثر نہیں ہوئی۔ یوں یہ مفروضہ دم توڑ جاتا ہے کہ علامت اور کہانی ایک ساتھ نہیں چل سکتے بس ان کو یکجا کرنے کا ہنر چاہیے جسے لیاقت علی نے ان افسانوں میں بہ احسن برتا ہے۔

اب اگر مجموعے کے باقی افسانوں کی بات کی جائے تو مذکورہ بالا افسانوں کے برعکس ایک تو ان میں علائم سے کنارہ کشی اختیار کی گئی ہے دوسرا یہ کہ اجتماعی صورتحال کے برعکس ذاتی و نفسی رویوں کو زیادہ موضوع بنایا گیا ہے۔ اگرچہ موضوعات یہاں بھی سماج سے چنیدہ ہیں مگر ان سب کا محور و مرکز فرد اور بالخصوص عورت ہے۔ زر، زن اور زمیں میں سے افسانہ نگار کے نزدیک زن وہ مرکز ہے کہ ذات و کائنات کی جنت جس کے گرد گھومتی نظر آتی ہے۔ مگر یہ ہمارے خطے کی بدنصیبی ہے کہ جہاں عورت خود بھلے ہی رنگینی کا سامان ہو مگر اس کی قسمت میں سنگینی لکھ دی گئی ہے۔ یہی سنگینی ہی درحقیقت لیاقت علی کا اصل موضوع ہے جسے انہوں نے اس مجموعے کے ان بیشتر افسانوں میں برتا جن میں فرد اجتماع پہ مقدم ہے۔ یہاں میں نے سنگینی کا تذکرہ کیا تو ہوسکتا ہے لیاقت علی کے ابتدائی دور کے قاری چونک پڑیں۔ یہ ہے بھی حقیقت کہ گرداب، برزخ، الٹی قمیص، ایڈیٹ اور

ایس ایم ایس جیسے افسانے سامنے آنے کے بعد ان کے قارئین یقیناً ان سے عورت اور سنگینی کے تصور کو یکجا کرنے کی توقع نہیں رکھتے۔تو قصہ یہ ہے کہ جنتِ گم گشتہ ہو، فصیلِ ذات ہو یا پھر ادھوری کہانی؛ اس کے ساتھ ساتھ بلیک ہول کو بھی شامل کر لیجیے۔ان افسانوں میں جس نسائی کردار سے بھی واسطہ پڑتا ہے یا تو پیش قدمی میں ہچکچاہٹ محسوس کرتی ہے (ادھوری کہانی) یا پھر اس کو بالجبر اپنی خواہشات دبانی پڑتی ہیں (جنتِ گم گشتہ) کہیں وہ اپنی جہنم ہو چکی زندگی کو اپنی خواہشات کے برعکس وہ جہاں بھی گیا لوٹا تو میرے پاس آیا کے بمصداق قبولنے پہ آمادہ رہتی ہے۔(فصیلِ ذات، بلیک ہول)۔

فصیلِ ذات میں دو نسائی کردار (بیگم درانی، رفعت) سامنے آتے ہیں اور دونوں ہی اپنی جگہ پہ دلچسپ نفسیات کے حامل کردار ہیں۔بیگم درانی جو ایک اخبار کی ایڈیٹر ہے متکلم اور دفتر کے باقی عملے کے لیے قدرے معماتی شخصیت ہے۔اس کے سنائے گئے قصے تو بے ربط ہیں ہی مگر اس کے اپنے خانگی معاملات بھی نارمل نہیں لگتے۔مسز درانی اپنے ملازم کے ساتھ گھر میں اکیلی رہتی ہے جب کہ اس کا خاوند اٹلی میں ہے اور چھ ماہ کی رخصت پہ گھر آتا ہے۔مسز درانی کے توسط سے ہی ہمارا سامنا رفعت سے ہوتا ہے اور یوں ایک ہی درگاہ پہ سارے راندہ درگاہ کی یکجائی کا تاثر ملتا ہے۔ماں باپ کی اکلوتی بیٹی رفعت کو؛ مسز درانی یونیورسٹی کے ایام سے جانتی ہے۔آزاد خیال اور خوبرو رفعت کو اس کے شوہر نے جائیداد پہ قابض ہو کے گھر سے نکال دیا تھا۔کئی سال تک مختلف ملازمتیں کر کے خود کو ہی اپنا محور و مرکز بنانے کے بعد جب وہ مسز درانی سے ملتی ہے تو اب اس کے احساسات کچھ یوں ہیں:

> ''میں اس زندگی سے بیزار ہو چکی ہوں۔۔۔شاید میں پھر سے بنا چادر ننگے پاوں ایک مرد کے تشدد کا شکار ہو کر بھاگ کر ہمسائے کے گھر میں پناہ لینا چاہتی ہوں۔۔بیگم درانی بہت عجیب بات ہے مگر ہے تو آپ سے کیوں چھپاؤں؛ مجھے ایک مرد چاہیے۔۔۔!''

یہ سنتے ہی بیگم درانی اس کی حوصلہ افزائی کرتی ہے کہ ماضی کو بھول کر ایک اور کشتی پہ سوار ہو کے موجوں سے کھیلے۔مگر ہوا یہی کہ آخر عورت جو ہوئی! سو واپس ناروال (یعنی اپنے سابقہ شوہر) کے پاس چلی جاتی ہے۔اس افسانے کی جو دلچسپ بات ہے وہ یہ کہ ہم یہاں عورت کی مجہولیت کو 'پدرسری' سماج کے روایتی طعنوں سے معنون نہیں کر سکتے۔یہاں عورت کی مجبوریوں کو بیان کر کے روایتی ترحم پیدا کرنے کے لیے افسانے کی فضا کو ٹریجیڈ نہیں بنایا گیا۔یہاں سارا زور ہی عورت کی نفسیات اور جبلت و فطرت کو سمجھنے کی کوشش پہ لگایا گیا ہے۔متذکرہ بالا اقتباس کو ذرا پھر

سے دیکھیے کیا رفعت کی یہ خواہش کہ مجھے ایک مرد چاہیے؛ کیا کسی مجبوری کے سبب ہے یا پھر جبلی و فطری خواہش کا تقاضا؟ یقیناً یہ موخرالذکر مفروضے کے عین مطابق ہے صرف اس افسانے میں ہی نہیں باقی افسانوں میں بھی کہ جہاں عورت کو مرکزیت دی گئی ہے اس کی نفسیات کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ''جنتِ گم گشتہ'' کی فوزیہ اگر سمجھوتے کی زندگی بسر کر رہی ہے تو صرف اس لیے کہ سمیر (اس کا خاوند) اس کے ترلے کرتا ہے یعنی خاوند کی انا کو ٹھیس پہنچانے کے لیے وہ تیار نہیں ہو پاتی۔ ادھوری کہنی میں متکلم کو اس کی محبت نہیں ملتی یہ بھی دراصل اس کی اپنی بزدلی کا سبب ہے کہ یک طرفہ محبت اور وہ بھی اس قدر خاموش! کیسے کنارے لگاتی؟ ''بلیک ہول'' کی رابعہ اگر ایک بے پروا شخص کی بجائے قدرے سلجھے ہوئے دنیادار آدمی کے ساتھ زندگی گزارتی ہے تو اس میں کیا برائی ہے؟ عورت کے حقوق پہ ضرور بات کرنی چاہیے مگر اس سے پہلے خود عورت کی نفسیات، اور جبلت اور بنیادی تقاضوں سے آشنائی بھی یقیناً بہت اہم ہے کہ جس کو سمجھنے کی لیاقت علی نے ان افسانوں میں مقدور بھر کوشش ضرور کی ہے۔

ناصر عباس نیر کی کتاب 'اردو ادب کی تشکیلِ جدید'

محمد الیاس کبیر

غلام ہندوستان کی تاریخ میں نوآبادیاتی عہد ایک 'پُرآشوب اور ہنگامہ خیز دور کا حامل رہا ہے۔نوآبادکاروں/ استعمار کاروں نے ہندوستان میں اپنے مخصوص مقاصد کے حصول کے لیے 'علم' کو طاقت کا ذریعہ بنایا۔ یہ علم بظاہر تو سچائی کے دعوے کا حامل تھا لیکن انھوں نے اس کا حقیقی مقصد اپنی سیاسی طاقت کا حصول بنایا۔انھوں نے یہاں کے لوگوں، یہاں کی زبانوں، یہاں کی تاریخ و جغرافیے ، یہاں کے ادب وثقافت کا علم حاصل کیا ،تا کہ اس سارے علم کو اپنی سیاسی طاقت میں تبدیل کیا جا سکے۔ وہ اس مقصد میں خاطر خواہ کامیاب بھی ہو گئے۔

نوآبادیاتی عہد نے سماج کے دیگر شعبہ جات کی طرح اردو ادب پر بھی گہرے اثرات مرتسم کیے۔اردو کی جدید اصناف ، جیسے افسانہ ، ناول، آزاد نظم ، تنقید ، انشائیہ ، اور آپ بیتی و تاریخ نگاری اور تحقیق کے نئے طریقے نوآبادیاتی عہد میں متعارف ہوئے۔ اردو نے نئی ہیئتوں سے لے کر نئے اسالیب اور طریق کار تک یورپ سے مستعار لیے۔ اردو ادب پر نوآبادیاتی اثرات مجموعی طور پر تین قسم کے تھے۔ کچھ تخلیق کاروں نے نوآبادکاروں اور ان کی تہذیب کا 'پُرشکوہ تصور پیش کیا۔ کچھ نے استعماریت اور یورپی تہذیب دونوں کے خلاف مزاحمت کی۔ بعض اردو ادیبوں نے درمیانی راستہ اختیار کیا۔انھوں نے مقامی اور یورپی تہذیب کے امتزاج کا تصور پیش کیا۔

استعمار کاروں کے 'مخصوص مقاصد' کو متعدد صاحبانِ علم و دانش نے تیسری دنیا پر واضح کر دیا کہ استعماریت نے مشرق کو ہمیشہ تعصب کی نگاہ سے دیکھا۔انگریزی میں اس حوالے سے بہت پہلے کام شروع ہوا۔ ایڈ ورڈ سعید، فرانز فینن ، ہومی بھابھا اور گیاتری چکرورتی سپیوک وغیرہ نے اپنی ناقدانہ بصیرت سے نوآبادکاروں کے مقاصد اور اثرات کا بالتفصیل جائزہ لیا۔ ایڈورڈ سعید نے انگریزی کے علاوہ عربی میں بھی لکھا۔ 'مابعد الاستعمار' انھی کی وضع کردہ اصطلاح ہے جو عربی ادب میں رائج ہوئی۔ جسے ہمارے ہاں 'مابعد نوآبادیات' کہا جاتا ہے۔اس حوالے سے اردو میں قدرے بعد میں کام شروع ہوا۔ ڈاکٹر ابوالکلام قاسمی، شمس الرحمٰن فاروقی، ڈاکٹر احمد سہیل وغیرہ کے ہاں ابتدائی نوعیت کے مضامین دکھائی دیتے ہیں۔ ضرورت محسوس کی جا رہی تھی کہ اردو دنیا میں بھی

نوآبادکاروں کے مقاصد کو خالص علمی انداز میں باقاعدہ متعارف کرایا جائے۔ڈاکٹر ناصر عباس نیرّ کو اس حوالے سے اختصاص حاصل ہے کہ انھوں نے جدید اردو تنقید کو مغربی سیاق میں دیکھنے کی کامیاب سعی کی۔اور نوآبادیات میں ہونے والے کثیرالجہت کام کو اردو میں دیکھنے کا خواب دیکھا جس کی اوّلین تعبیر ۲۰۱۳ء میں سامنے آئی۔اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس سے شایع ہونے والی اُن کی کتاب 'مابعد نوآبادیات: اردو کے تناظر میں' اسی سلسلے کی پہلی کڑی تھی۔جس میں انھوں نے استعمار کار اور استعمار زدوں کے درمیان ثقافتی رشتوں کو تلاش کیا تھا۔اور نوآبادیات کے اردو زبان و ادب پر ہونے والے اثرات اور مضمرات کو تجزیاتی انداز میں بیان کیا تھا۔نیز انھوں نے استعماری بیانیے کی ماہیت، اس کے اثرات اور حکمتِ عملی کو سمجھنے پر توجہ دی گئی تھی۔اس کے علاوہ انھوں نے مابعد نوآبادیاتی فکر کے نظری مباحث کو بھی علمی ڈسپلن کے تحت سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی۔نیز اُسی کتاب کا ایک حصہ اطلاقی جہات کے حوالے سے بھی تھا جس میں انھوں نے گل کرسٹ کی لسانی خدمات، محمد حسین آزاد کے لسانی تصورات اور انجمن اشاعتِ علومِ مفیدہ پنجاب کو مابعد نوآبادیاتی تناظر میں دیکھا تھا۔

ڈاکٹر ناصر عباس نیر کی کتاب 'اردو ادب کی تشکیل جدید' اس سلسلے کی دوسری کڑی ہے، جس میں انھوں نے نوآبادیاتی اور پس نوآبادیاتی عہد کے تناظر میں اردو ادب کے مطالعات پیش کیے ہیں۔اوّل الذکر کتاب میں انھوں نے انجمن پنجاب تک اپنے مطالعات پیش کیے تھے۔جبکہ ثانی الذکر کتاب میں اُس سے آگے اور بعد کے مباحث کو سمیٹا گیا ہے۔کتاب کا مقدمہ خاصے کی چیز ہے کہ اس میں اردو میں پہلی مرتبہ متبادل بیانیے کا تصور متعارف کروایا گیا ہے۔مصنف کے مطابق، متبادل بیانیہ صرف اپنی زبان میں لکھا جاسکتا ہے، اور یہ بیانیہ مزاحمتی بیانیے سے آگے کی چیز ہے!

> ''جسے ہم متبادل بیانیہ کہتے ہیں، وہ احتجاجی، مزاحمتی اور قومی بیانیوں ہی کے قبیل سے ہے، مگر کچھ باتوں میں یہ ان سے مختلف ہوتا ہے۔مثلاً یہ بات سب میں مشترک ہے کہ یہ سب بیانیے استعمار زدہ مصنفین پیش کرتے ہیں، مگر ایک بنیادی فرق بھی ہے: وہ یہ کہ احتجاجی و مزاحمتی بیانیے استعمار کار کے بیانیوں پر 'منحصر' ہوتے ہیں، جب کہ متبادل بیانیہ استعمار کار کے حاوی بیانیوں پر لازمی انحصار سے آزاد ہوا ہے۔مزاحمتی بیانیہ اس مفہوم میں 'منحصر بیانیہ' ہوتا ہے کہ اس کی ابتدا، اس کی سمت، اس کی حد استعمار کار کے بیانیوں سے طے ہوتی ہے۔'' (پیش لفظ)

اس کتاب کا ایک اہم مضمون 'برصغیر پر مسلم ثقافتی اثرات: نوآبادیاتی تناظر' ہے جس میں مصنف نے بتایا ہے کہ اگر ہندوستان کو انگریزوں نے تاراج کیا تھا تو ان سے قبل مسلم حکمران بھی

ایسا کر چکے تھے۔لیکن ان دونوں کے 'طریقہ واردات' میں کئی بنیادی فرق تھے: ایک فرق تو زمانے کا تھا۔مسلمانوں کا زمانہ جاگیرداری کا زمانہ تھا، جب کہ انگریز جب آئے تو صنعتی سرمایہ داریت کا آغاز ہو چکا تھا۔اس لیے دونوں کی اقدار، رویے، پالیسیاں، ہندوستان کے معاشی استحصال کے طور طریقے الگ الگ تھے۔ انگریزوں نے ہندوستان کو اپنا وطن نہیں بنایا، مگر سوائے چند ایک مسلمان حملہ آوروں کے (بالخصوص غزنوی، غوری، نادرشاہ، احمد شاہ ابدالی)۔اکثر ہندوستان ہی کی خاک میں پیوند ہوئے۔تاہم مغل حکمرانوں نے ہندوستان کو مغل امپائر بناتے ہوئے اس کے معاشی وسائل شاہی باغات، محلات، مقابر اور قلعوں کی تعمیر میں صرف کیا۔اعلیٰ تعلیمی ادارے قائم نہیں کیے۔دوسری طرف انگریزوں نے ہندوستان کو باقاعدہ کالونی کا درجہ دیا اور اس پر مختلف النوع اثرات مرتب کیے۔انگریزوں نے نہ صرف ہندوستان کا سرمایہ باہر منتقل کیا بلکہ انھوں نے حاکم و محکوم کے درمیان بنیادی فرق اور درجہ بندی کو سفاکانہ انداز میں برقرار رکھا۔مسلمانوں کے عہد کی سب سے اہم ثقافتی یادگار بھگتی تحریک ہے، جب کہ انگریز عہد کی یادگار لسانی، مذہبی، قومی فرقہ واریت ہے، جس کی آگ میں اس وقت بھی پورا جنوبی ایشیا جل رہا ہے۔

یورپ/مغرب نے مشرق کے حوالے سے ایک خاص نوعیت کا ذخیرۂ علم پیدا کیا تاکہ مشرق کی من چاہی تعبیر کی جا سکے۔ڈاکٹر نیرّ کے مطابق مغرب نے مشرق کے لوک ادب اور ہندی کہاوتوں اور ضرب الامثال سے خاطر خواہ استفادہ کیا اور اُس نے ہندوستان کے چند مخصوص علاقوں (بالخصوص یوپی) میں رائج کہاوتوں سے 'مشرقی ذہن' کو دریافت کیا۔یورپی تعقل نے اس لوک ادب کو اشاعت کے جدید ذرائع کی مدد سے پھیلایا اور پھر ہندوستانیوں کو اس کے مطابق ڈھلنے پر مائل کیا۔استعمار کی یہ کوشش اس بات پر منتج ہوئی کہ مشرق اپنے ہی ادب سے اخذ کردہ شناخت کو قبول نہ کرنے میں اسے کوئی معقولیت نظر نہ آئی۔اور اس طرح نوآبادکار اپنے اس مقصد میں کامیاب بھی ہو گئے۔

الطاف حسین حالی اپنی شاعری کو کذب وافترا قرار دیتے ہیں لیکن ایسا کذب جو حق نمائی کی سمت نمائی کرے۔اُن کی شاعری کے حوالے سے بالعموم یہ رائے دی جاتی ہے کہ اُن کی شاعری قومی اور مقصدی شاعری کے زمرے میں آتی ہے۔یہ خیال کسی حد تک درست بھی ہے کیوں کہ کلامِ حالی کا معتدبہ حصہ اس خیال کا عملی پیکر نظر آتا ہے لیکن شعرِ حالی میں بہت سا مواد ایسی شاعری کا بھی موجود ہے جس میں انھوں نے نوآبادکاروں کو شائستہ قوم قرار دیا۔اپنی نظم 'حبِ وطن' اور اس قبیل کی دیگر نظموں میں حالی کا 'قومی شعور' جلوہ ریز ہے۔

کبھی تورانیوں نے گھر لوٹا　　　　کبھی درانیوں نے زر لوٹا

کبھی نادر نے قتلِ عام کیا	کبھی محمود نے غلام کیا
سب سے آخر کو لے گئی بازی	ایک شائستہ قوم مغرب کی
یہ بھی تم پر خدا کا تھا انعام	کہ پڑا تم کو ایسی قوم سے کام

مغرب کو 'شائستہ قوم' اور 'خدا کا انعام' قرار دینے والے حالی کو ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں انگریزوں کی طرف سے کھیلی گئی آگ اور خون کی ہولی کیوں بھول گئی۔ ڈاکٹر نیرّ نے اس حوالے سے اپنے مضمون 'کچھ کذب وافترا ہے، کچھ کذبِ حق نما ہے: حالی کی قومی شاعری کا نوآبادیاتی سیاق' میں حالی کی قومی شاعری پر کئی سوالات قائم کیے ہیں:

> حالی کی قومی شاعری نے قومیت پرستی کے تصورات کے فروغ میں کیا کردار ادا کیا اور یہ تصورات کیا ان کے شعری تخیل کے پیداوار تھے یا کہیں سے مستعار تھے، یعنی کسی اندرونی تحریک کا نتیجہ تھے یا بیرونی دباؤ کے پیدا کردہ تھے؟ (ص ۴۶)

> کیا حالی یہ کہنا چاہ رہے ہیں کہ ان کی انگریزی گورنمنٹ کی تعریف ایک ایسا کذب ہے جس میں قوم کی راہ نمائی کی صلاحیت ہے؟ (ص ۴۷)

ڈاکٹر نیرّ کی اس کتاب کا ایک قابل ذکر حصہ اردو فکشن پر مشتمل ہے: منٹو کی کہانی کو انھوں نے 'حاشیے پر لکھا متن' کا نام دیا ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد کے ناول 'توبتہ النصوح' کا مطالعہ 'معنی واحد اور معنیِ اضافی کی کش مکش' کے عنوان سے کیا ہے۔ جس میں بتایا گیا ہے کہ نذیر احمد نے نوآبادیاتی مقاصد کے تحت یہ ناول لکھا تھا۔ ڈاکٹر نیرّ نے اردو افسانے میں جادوئی حقیقت نگاری کے مباحث اپنے اُس وقیع مضمون میں اٹھائے ہیں جس کا عنوان 'پس نوآبادیاتی اردو فکشن: جادوئی حقیقت نگاری اور ''غیر'' کے تصور کی روشنی میں' ہے۔

کتاب کے ایک اہم مضمون 'دہرے شعور کی کش مکش: سرسید کی جدیدیت اور اکبر کی ردّ استعماریت' میں بتایا ہے کہ سرسید کا رخ مستقبل کی طرف اور اکبر کی سمت ماضی کی جانب ہے۔ ہر دو حضرات اپنے اپنے نظامِ فکر میں آخر دم تک قائم رہے۔ اکبر ایک طرف تو انگریز سرکار کی نوکری کر رہے تھے تو دوسری طرف مغرب اور سرسید کے سخت ترین ناقد بھی تھے۔ جبکہ سرسید مفاہمت اور مصلحت کے پیکر دکھائی دیتے ہیں۔ اور 'پیرویٔ مغربی' کے لیے آزاد اور حالی کو مشورے بھی دیے جا رہے ہیں۔

میرا جی کے حوالے سے مصنف کا مضمون 'اُس کو اِک شخص سمجھنا تو مناسب ہی نہیں: میرا جی کی نظم کا مطالعہ' بڑی اہمیت کا حامل ہے جس میں انھوں نے بتایا ہے کہ میرا جی کو صرف ابہام اور جنسیت تک محدود کرنا میرا جی پر بہت بڑا ظلم ہے۔ اعجاز احمد نے میرا جی کو جنس زدہ کہا جبکہ انیس ناگی

نے اُسے ایک بھٹکا ہوا شاعر قرار دیا ہے۔ ڈاکٹر نیرّ کے مطابق میرا جی کی نظم کا مطالعہ زیادہ تر اُن کی شخصیت کے تناظر میں کیا گیا ہے جو کسی طور درست نہیں مانا جاسکتا۔ کیوں کہ اس طرح میرا جی کی شخصیت تو نمایاں ہو جاتی ہے لیکن اُن کی نظم کہیں دور چلی جاتی ہے۔ حالاں کہ میرا جی کی نظم کی پرتیں تہہ در تہہ ہیں۔

'میرا جی کی نظم کا مطالعہ زیادہ تر میرا جی کی شخصیت کے سیاق میں کیا گیا ہے۔ اس کے نتیجے میں نہ صرف میرا جی کی نظم اور شخصیت ایک دوسرے کے مساوی تصور کی گئی ہیں بلکہ ان کی نظم اپنے وجود اور معنویت دونوں کے سلسلے میں ان کی شخصیت پر منحصر سمجھی گئی ہے۔ واضح رہے کہ اس طرزِ مطالعہ میں میرا جی کی شخصیت ان کی نظم سے طلوع نہیں ہوتی، ان کی شخصیت، ان کی نظم کی صورت ایک اپنا ہم سر اور ہم شکل وجود میں لاتی ہے۔'' (ص ۲۳۵)

ڈاکٹر نیرّ نے شبلی نعمانی کی تنقید کا تجزیہ 'دو جذبیت' کے تناظر میں کیا ہے۔ شبلی کا سرسید اور علی گڑھ تحریک سے گہرا تعلق بھی تھا اور وہ اس سے گریزاں بھی رہے۔ وہ سرسید پر تنقید بھی کرتے تھے اور تحسین بھی۔ وہ سرسید سے مرعوب بھی تھے اور گریز پائی کا رویہ بھی اُن کی طبع میں شامل تھا۔ یہ سب ان کی تنقید میں بھی آیا ہے، وہ یورپ کی علمی روایت کی تحسین کرتے اور اس سے استفادہ بھی کرتے ہیں، لیکن ساتھ ہی مغربی علمی روایت کے ناقد بھی ہیں، اہم بات یہ ہے کہ یہ دو جذبی رویہ خود مشرقی تنقید کے سلسلے میں بھی دکھائی دیتا ہے۔ ڈاکٹر نیرّ نے شبلی کی نظری و عملی دونوں طرح کی تنقید میں اس دو جذبی رجحان کی موجودگی اور مضمرات کا جائزہ غیر معمولی ذہانت سے کیا ہے!

ایک بات ان سب کتاب کے مضامین میں مشترک محسوس ہوتی ہے کہ انھیں پڑھنے کے بعد آپ ان سب مصنفین (جنھیں اس کتاب میں زیر بحث لایا گیا ہے) کے بارے میں پہلے سے موجود آرا پر نظر ثانی پر خود کو مجبور پاتے ہیں۔ وسیع مطالعے، گہرے تجزیے اور متاثر کن اسلوب نے کتاب میں شامل ہر مقالے کو چیزے دیگر بنا دیا ہے۔

'اردو ادب کی تشکیل جدید' نو آبادیاتی اور پس نو آبادیاتی عہد کے اردو ادب کی ایک اہم ترین دستاویز ہے۔ ڈاکٹر ناصر عباس نیر مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے ایک ایسے موضوع پر قلم اٹھایا ہے جسے بعض ناقدین بھاری پتھر سمجھ کر اٹھا نہ سکے تو چوم کر چھوڑ دیا۔

انجم سلیمی کی ’’میں‘‘

قاسم یعقوب

انجم سلیمی کے شعر پہ بات کرتے ہوئے مجھے انجم کے شعروں سے زیادہ اپنے پاس جانا پڑے گا۔ اپنے پاس، اپنی اُس ’میں‘ کے پاس جو میری اندر ہوتے ہوئے بھی میرے وجود سے باہر جھانک لیتی ہے۔ جو میرے بارے میں مجھ سے زیادہ جانتی ہے۔ انجم سلیمی کا شعری وژن ہم سب کو اپنے اپنے اندر جھانکنے کا موقع دیتا ہے۔ اپنے وجود اور اپنی ’میں‘ کا فرق سمجھاتا ہے۔

میں نے انجم سلیمی کو بہت پڑھا ہے، بہت سنا ہے بلکہ اگر میں یہ کہوں کہ میں نے انجم کے شعروں میں اپنے بہترین لمحے Live کیے ہیں تو بے جا نہ ہوگا۔ انجم سلیمی کا شعری تخلیقی ساختیہ بنیادی طور پر دو حصوں پہ مشتمل ہے۔ ایک حصہ اُس ’میں‘ تک کی کھوج پہ مشتمل ہے جسے انجم نے اپنے شعور کی تخلیقیت کے ساتھ پہچان لیا تھا جب کہ دوسرا حصہ اُس ’میں‘ کی دریافت کا ہے جسے انجم نے گیان کے گہرے مراقبوں میں تلاش کرتے ہوئے بلاخر ایک دن پا لیا۔ مجھے یہ اعزاز ہے کہ میں انجم کو ان دونوں مرحلوں کی طویل مسافت میں رواں دواں دیکھتا رہا ہوں۔ یوں میرا انجم سے رشتہ بیس سال پرانا نہیں بلکہ صدیوں پہ محیط لمحۂ ازل سے لازوال لمحوں تک کی مسافت کا ہے۔ انجم سلیمی کے شعی سفر کا اگر جائزہ لیا جائے تو پہلے مرحلے میں وہ اپنی ’میں‘ کی جستجو میں مصروف نظر آتا ہے، فکری توڑ پھوڑ کرتا ہوا، اپنے اردگرد سے مایوسی، بیزاری اور بے یقینی سے مملو اور اپنے توکل میں آسمان کی طرح ایستادہ ، اپنے ہی حجابات میں چھپا ہوا ہے:

ظہورِ کشف و کرامات میں پڑا ہُوا ہوں
ابھی میں اپنے حجابات میں پڑا ہُوا ہوں
مجھے یقیں ہی نہیں آ رہا کہ یہ میں ہُوں
عجب توّہم و شبہات میں پڑا ہُوا ہوں
گزر رہی ہے مجھے روندتی ہوئی دنیا
قدیم و کہنہ روایات میں پڑا ہُوا ہوں

لوگوں نے ہاتھ کاٹ لیے دیکھ کر جسے
مرعوب اُس جمال سے میں بھی ذرا ہُوا
جنھوں نے دیکھی نہیں پانیوں کی تنہائی
انھی کے واسطے میں کشتیاں بناتا ہوں
کوئی خوشی مری صحبت میں رہنا چاہتی ہے
مری طرف سے اجازت نہیں ملی ابھی تک
اب کے دشمن سے نہیں خود سے بچانا ہے مجھے
میں نے میدان نہیں ، حوصلہ ہارا ہے میاں

مگر دوسرے مرحلے میں ایک اعتماد اور یقین کا گہرا سانس لیتا ہوا اطمینان چہرے پہ دکھائی دینے لگتا ہے۔ دوسرے مرحلے میں انجم اپنی ریاضت کی چلہ کشی کا سرمایہ بانٹنا شروع کر دیتا ہے۔

تمام شہر خفا ہے ، پتا کسی کو نہیں
میں روز کس کو مناتا ہوں رقص کرتا ہوں
میں جانتا ہوں مجھے کیسے شانت ہونا ہے
کہو تو ہو کے دکھاتا ہوں ، رقص کرتا ہوں
میں نے دیکھا کہ میں اک سادہ ورق ہوں
اور لوگ چومتے ہیں، کبھی آنکھوں سے لگاتے ہیں
مجھے
میں آج خود سے ملاقات کرنے والا ہوں
جہاں میں کوئی بھی میرے سوا نہ رہ جائے

میں نے انجم سلیمی کے پہلے دور کی شاعری کو ازبر کر رکھا تھا۔ میں نے خود انجم سے کئی بار پوچھا کہ آخر ’میں‘ ہے کیا؟ کیا میں محبت ہے؟ کیا میں عشق کا کوئی درجہ ہے؟ کیا میں اپنے آپ کا ادراک ہے؟ کیا میں سے جہان بینی کا درک تصور کیا جائے؟ کیا میں خدا شناسی ہے یا ذات شناسی کا وہ علم جسے صوفیہ نے خودی سے تعبیر کیا؟ انجم مجھے میرے کسی سوال کا جواب دینے کی بجائے اپنے شعروں میں مجھ سے مخاطب ہوتا رہا۔ بلاخر ایک دن انھی شعروں میں مجھے جواب مل گیا۔ مجھے ایسے لگا جیسے مجھے ’میں‘ کا ایقان ہاتھ لگ گیا۔ انجم سلیمی کی شعری تخلیقت میں ’میں‘ کی تلاش اور دریافت کے دونوں مرحلے ایک دم مکمل ہو گئے۔

میں خیر و شر کے توازن میں رہنا چاہتا ہوں

مجھے پتا تو چلے مجھ میں کیا زیادہ ہے!

انسان میں شر کیا ہے؟ کیا وہ شر ہے جسے سماج نے شر قرار دے رکھا ہے؟ یوں تو شر تو بدلتا رہتا ہے۔ ہر زمانے کا شر اپنا الگ معنی رکھتا ہے۔ وقت اپنا شر خود تشکیل دیتا ہے۔ یہ خیر کیا ہے؟ کیا خیر وہی کچھ ہے جسے ایک معاشرے میں خیر کہہ دیا گیا ہے؟ کیا خیر وشر کے تمام تصورات وہی ہیں جو معاشرے میں رائج ہوتے ہیں؟ ان کے علاوہ کوئی چیز خیر وشر کے احاطے میں نہیں آسکتی؟ خیر وشر کو طے کیسے کا جائے اور پھر ان میں توازن کیسے قائم ہو۔ مجھے کیا پتا میرے اندر شر زیادہ ہے یا خیر؟ میں جسے خیر سمجھ رہا ہوں کیا پتا وہ شر ہو اور جسے شر کہا جا رہا ہے وہ سراپا خیر ہو۔ عجیب سوال ہے کہ مجھے کیسں پتا چلے کہ توازن کہاں بن رہا ہے۔ پوری اخلاقیات اور مذہبیات کی فلاسفی ایک طرف کو ڈھتی ہوئی نظر آتی ہے۔ انجم سلیمی نے اپنی 'میں' کی بنیاد انھی خیر وشر کے عدم توازن کی داستان قرار دیا ہے۔ زمانہ نہیں بتا سکتا ہے کہ اُس کے اندر خیر وشر کا رتوازن کیسے وجود میں آ سکتا ہے۔ یہیں سے 'میں' احاطۂ سوال میں آ جاتی ہے۔ انجم سوال کرتا ہے کہ پھر انسان کی 'میں' کس طرح توازن میں آئے، یا اُس سے کس توازن کی امید رکھی جائے؟ 'میں' کی ساری تگ ودو ہی توازن میں رکھنے اور رہنے میں صرف ہو جاتی ہے۔

انجم سلیمی کی شاعری کا مرکزی موضوع 'میں' خود کسی مرکزہ کے بغیر ہے۔ انجم سلیمی کی 'میں' وجود کی وجودیاتی مجبوریوں سے جنم لینے والی 'میں' نہیں جسے اپنے وجود کی تخلیقیت سے ہی انکار تھا۔ جو جوہر کی نفی پہ استوار تھی۔ انجم اپنی 'میں' کو غیر The other بنانے پہ بھی قادر ہے۔ وہ میں کو خود اپنا 'غیر' بنا کے اُسے علیحدہ بھی کر لیتے ہیں۔

مجھے بھی سہنی پڑے گی مخالفت اپنی
جو کھل گئی کبھی مجھ پر منافقت اپنی
میں خود سے مل کے کبھی صاف صاف کہہ دوں گا
مجھے پسند نہیں ہے مداخلت اپنی
میں شرمسار ہُوا اپنے آپ سے ، پھر بھی
قبول کی ہی نہیں میں نے معذرت اپنی
زمانے سے تو مرا کچھ گلہ نہیں بنتا
کہ مجھ سے میرا تعلق تھا معرفت اپنی
خبر نہیں ہے مرے سانحے کی دنیا کو

سو اپنے آپ سے کرتا ہوں تعزیت اپنی

انجم کی ایک اور غزل سنیے جس میں خود کو اپنی ''میں'' کے ساتھ غیر بنایا گیا ہے۔ گویا یہاں 'غیر' اُس کا اپنا وجود ہے جسے وہ اپنے 'میں' کے مقابل لا کھڑا کرتا ہے:

خود کی نگرانی پہ مامور کیا میں نے مجھے
اپنی تنہائی میں محصور کیا میں نے مجھے
میری ٹھوکر پہ تھا میں اور مری دنیا داری
خود کو پانے کے لیے دور کیا میں نے مجھے
زندگی خرچ ہوئی اپنی صفائی دیتے
ایک دن میں نہیں منظور کِیا میں نے مجھے
پہلے اِک خواب کی تعمیر کا سوچا دِل میں
پھر اُسی خواب کا مزدور کیا ، میں نے مجھے
درد سے بھرتا رہا ذات کے خالی پن کو
تھوڑا تھوڑا یونہی بھرپور کیا ، میں نے مجھے

یاد رہے کہ صوفیہ کی ''میں'' ان کے اندر کی دریافت ہے یا یوں کہہ لیں کہ وہ اپنی میں کے ذریعے کسی دوسری ہستی کا ادراک کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ انجم سلیمی نے اپنی میں کو اپنے وجود کی تخلیقیت کی ایک معراج قرار دیا ہے جسے یہاں سازگار ماحول میسر نہیں ہو سکا۔ اُس کی 'میں' تخلیقیت کی اس اعلیٰ تشکیل کو دنیا داری میں ضائع کر دیتی ہے۔ حتیٰ کہ یہ میں جب ایک وجود پاتی ہے تو یہ وجود بھی اس 'میں' کی تخلیقیت کو نہیں سمجھ سکتا اور وہ خود اسے آلودہ کرتا رہتا ہے اور دنیا داری کے بکھیڑوں میں الجھا دیتا ہے۔ گویا ''میں'' ایک ایسا آئیڈیل تصور ہے جسے انجم نے روایتی صوفیانہ تصورات سے الگ تشکیل دیا ہے۔ یہ اپنی طرز کا بالکل نیا خیال ہے۔ اسی لیے وہ دنیا والوں سے شکوہ کرتا ہے کہ ''میں'' کا تخلیقی جمال ان کے ہاتھوں پارہ پارہ ہو جاتا ہے۔

یہیں جی بھر کے مری خاک اڑا لی جائے
خاک داں پہ میں دوبارہ نہیں آنے والا
کچھ اور بھی ہے دل میں گھٹن کے سوا ضرور
اک دن میں میرا دوسرا چکر ہے باغ میں
منہمک چاک پہ اے مجھ کو بنانے والے
آئے بیٹھے ہیں مری خاک اڑانے والے

پلٹ گئی کوئی نیکی صدا لگاتی ہوئی
دعا کمانے میں تاخیر ہوگئی مجھ سے

دنیا نے مجھ کو مالِ غنیمت سمجھ لیا
جتنا میں جس کے ہاتھ لگا لے اُڑا مجھے

انجم سلیمی نے اپنے وژن کو باہر پھیلانے کی بجائے اپنے اندر ذات کی تہوں میں اتارا ہے۔ کتنے شاعر ہیں جن کے ہاں ایسا دکھ، ایسی ریاضت، عبادت کی طرح ملتی ہے! انجم نے اپنے شعری ساختیے میں کسی ایسے شعر کو داخل ہونے سے بچایا ہے جو اُس کے تخلیقی وژن سے میل نہ کھاتا ہو۔ انجم کی ''میں'' اُردو شاعری میں موضوعاتی اور تکنیکی سطحوں پہ منفرد تجربہ ہے جسے پڑھنے اور دریافت کرنے کے لیے بھی تخلیقی ریاضت کی ضرورت ہے۔

انجم سلیمی کی ''میں'': ذات سے عرفانِ ذات کا سفر

محمد اشرف ثمر

انجم سلیمی کا شمار اُن جدید اردو شعرا میں ہوتا ہے جن کی شاعری نے بیسویں صدی کے آخری عشروں میں ادبی منظر نامے پر اپنی ابدیت کی مہریں ثبت کیں۔ لیکن صرف جدید کہہ کر فکری کرید کیے بغیر آگے نکلنا قرینِ انصاف نہیں ہے۔ انجم کی تفہیم لفظ ''میں'' سے زیادہ آسان ہے ۔یہی ان کا معدنِ شعری اور اثاثہِ زیست ہے۔ انجم نے ''میں'' کو معکوسی معنیات کی جس ابدیت سے ہمکنار کیا ہے وہ اس کا تجربہ نہیں بلکہ فکری اجتہاد کا ثمر ہے۔ لفظ ''انا'' کے مسلماتِ معنوی سے منصور حلاج اور ''خودی'' کے مسلماتِ معنوی سے جس طرح کا انحراف اقبال نے کیا اس کی بنا خالصتاً نظامِ فلسفہ پر تھی مگر انجم سلیمی نے جو ''میں'' کے عندالناس مسلماتِ معنوی سے انحراف کرتے ہوئے اسے جس فکری سطح پر آفاقی تناظر میں جا کر برتا ہے اس کی بنیاد ''تجدیدِ میں'' پر ہے۔ تجدیدِ میں در اصل اپنی ذات کی بازیافت ہے جو آگے چل کر کائنات کا ادراک بن جاتی ہے۔ انجم تنکا تنکا اپنی ذات کو جمع کرتا ہے اور ''میں'' کے روزنِ اظہار سے شاعری میں اپنی کی تکوین پاتا ہے۔ اسی امر کا انکشاف ایک اور انداز میں انجم نے یوں کیا ہے:

> ''بس ایک پردہ ہے جو مجھے ڈھانپے ہوئے ہے۔ ایک حجاب ہے جو مجھ پر پڑا ہوا ہے۔ میں اسے تھوڑا تھوڑا سرکاتا رہتا ہوں، خود پر جمی راکھ جھاڑ کر، خود میں پھیلا گہرا دھواں اڑاتا ہوں، خود کو مسمار بھی کرتا ہوں اور تعمیر بھی، ذرہ ذرہ خود کو چنتا ہوں اور خود میں بہتے ہوئے آئینوں کی گدلاہٹ کو شفاف کرنے کی کاوش میں رہتا ہوں ۔کہیں کہیں، کبھی کبھی خال وخد جمع کرتے ہوئے اپنے آپ کو دیکھنے کی کوشش کرتا ہوں، خود پر خود کو ظاہر کرتا ہوں، دریافت ہوتا ہوں۔ کبھی کبھی اپنی ذرا سی جھلک پا جاتا ہوں تو کسی شعر میں، کسی لفظ میں، کسی خیال میں اپنی اس جھلک کا کوئی عکس اتارتے ہوئے جس تخلیقی مسرت سے آشنا ہوتا ہوں وہی مسرت، وہی آگہی اداس رکھتی ہے اور سرشار بھی۔''

اپنی ''میں'' سے حجابات ہٹانے کے عمل میں جس داخلی سفر کی بات انجم نے یہاں کی

ہے نفسیات کی اصطلاح میں اسے Introversive Behaviour یا داخلی رجحان کہا جاتا ہے۔ یہ ان کی تسلسلِ فکر کا نتیجہ ہے جو ''میں'' کا عرفان بنتی ہے اور ''میں'' کے ہر صفحے پر نظر آتی ہے۔ ''میں'' من ہے اور من انا ہے، ھُوَ انہیں ہے بلکہ ھُوَ ا کے مشابہ ہے۔ انجم نے ''میں'' کے نئے معانی متعین کیے ہیں اور انھیں برتنے کے ساتھ ساتھ بسر بھی کیا ہے۔ اس سلسلے میں انجم کے یہ الفاظ غور طلب ہیں:

''میں بھی اپنے آپ سے محبت کرتا ہوں تا کہ دوسروں سے محبت کر سکوں۔ یہ ''میں'' نرگسیت نہیں، انا نہیں، محبت کا غرور نہیں، یہ تو میں کا عرفان ہے۔ ایک طرزِ احساس ہے۔ یہی طرزِ احساس میری شاعری ہے، میری محبت ہے۔''

''میں'' ذات نہیں، عرفانِ ذات ہے، حسن نہیں حسنِ نظر ہے، جمال نہیں احساسِ جمال ہے، تکبر نہیں احساسِ عجز ہے، علم نہیں معرفت ہے، نفس نہیں جوہر ہے، شخصیت نہیں تشخص ہے، یہ جذبہ بھی نہیں کیونکہ جذبہ مبدل بہ کیف ہوتا ہے، یہ احساس ہے اور احساس ہمیشہ حواس سے ہوتا ہے اور حواس اپنے موجود کا پتا دیتے ہیں اور موجود وجود پر دلالت کرتا ہے، لہٰذا وجود ''میں'' ہے اور ''میں'' احساس جو محبت کے سوا کچھ بھی نہیں۔ یہی وہ انحراف ہے جو ''میں'' کے تعیناتِ معنوی سے انجم نے شاعرانہ طور پر برتا ہے۔ ان کے ہر فن پارے میں اس کی جھلک نظر آتی ہے۔ اس انحراف کی منتہائے مقصود محبت اور احساس ہے۔ یہ وہ احساس ہے جو عرفانِ ذات میں ڈھلتا ہے تو ''انا'' بن جاتا ہے اور عرفانِ کائنات میں ڈھلتا ہے تو ''الحق'' بن جاتا ہے۔ جب یہ دونوں مجتمع ہو جائیں تو ''انا الحق'' بنتا ہے۔ انا الحق اپنا مقسوم آپ ہے۔ یہ مشیت کی وہ عدالت ہے جہاں مقدر اپنی قسمت کا فیصلہ سننے آتا ہے۔ یہی کُلِ عرفان ہے۔ من حیث الفکر انجم، منصور حلاج، ابن العربیؒ، بلھےؒ شاہ اور اقبالؒ کے قبیلے کا فرد ہے جو بیسویں اور اکیسویں صدی کے ''دشتِ میں'' کو آباد کر رہا ہے۔

مجھ پہ الہام ہوا جب مری میں کا عرفان
دار پر کھینچ کے منصور کیا میں نے مجھے
میں ہی تھا چشمِ تماشا بھی، تماشا گر بھی
کبھی موسیٰ تو کبھی طور کیا میں نے مجھے

''میں'' کا عرفان کو شاعر نے یہاں ذاتی تجربے سے آگے بڑھا کر اجتماعیت سے ہمکنار کیا ہے۔ اسے خبر ہے کہ میں کے عرفان کے بعد سنتِ منصور ادا کرنا پڑتی ہے۔ اپنے پیش رووں سے بچھڑ کر ابعادِ زمانہ کے ''دشتِ میں'' میں اسے یہ بھی گلہ ہے۔

کس زمانے میں مجھ کو بھیج دیا
مجھ سے تو رائے بھی نہ چاہی مری
یہ زمانہ مرا زمانہ نہیں
کہاں لے کر میں آ گیا خود کو

یہ گلہ بے جا نہیں ہے۔ ''میں'' کا سفر مستقبل کی طرف نہیں ہے۔ نہ یہ فردا ہے نہ یہ امروز۔ رجعت ہے نہ ماضی پرستی۔ یہ تو جستجوئے ازل ہے۔ مستقبل سے آگے ماضی کو پا لینے کی جستجو۔ یعنی آگے بڑھ کر ازل کو پالینے کی جستجو۔ ''میں'' کا سفر ابد کی طرف نہیں بلکہ ازل کی طرف ہے۔ ''میں'' کا عرفان ابد سے نہیں ازل سے ملاتا ہے۔ اس ''میں'' کا شعور جتنا گہرا ہوتا چلا جاتا ہے، شاعر لاشعوری طور پر اتنا ہی مائل بہ ازل ہوتا ہے۔ آفرینش و تخلیقِ کائنات کے سبھی نظائر ''میں'' کے تقلیبی رجحان کی چغلی کھاتے ہیں۔ یہ انحراف، تقلیب اور انعکاس کا جہان ہے۔ یہاں ابد کو ازل میں بدلنے کا رجحان اغلب ہے۔ الٰہیاتی مذاہب میں کائنات و موجوداتِ کائنات کی مادی فنا اٹل ہے۔ اگر یہ فنا اٹل ہے تو یہ ابدالآباد نہیں۔ اس کا سفر بھی ابد کی جانب نہیں بلکہ ازل کی طرف ہے۔ وہ ازل جو مکرر ہوگا اور ابد کے بطن سے عدم اور عدم کے بطن سے ازل جنم لے گا۔ عدم کالعدم ہو جائے گا اور ازل مدام ازل رہے گا۔ نتیجہ ازل ہے۔ ازل ''میں'' اور ''میں'' ہی ازل ہے۔ عندالناس ابدیت کا تصور مسلم ہے لیکن ہم نے اس سے انحراف کرتے ہوئے مقلب بہ ازل کیا ہے۔ ازلیت ہی فردا ہے۔ دل ابد کے طاق میں خوش ہے کیونکہ یہ جہانِ آب و گل کا رسیا ہے جبکہ ''میں'' اس سے آگے بڑھ کر ازل کو پالینے کی جستجو میں ہے۔ صبحِ ازل ہمارے انتظار میں ہے۔ یہ حیران کن بات ہے کہ انجم کے ہاں ''ازل'' کا یہ شعور پراگندہ نہیں منضبط ہے۔

صبحِ ازل ہے کب سے مرے انتظار میں
جی چاہتا ہے طاقِ ابد میں پڑا رہوں
مجھے پلٹنا ہے اک روز اپنے فردا میں
نکالنا ہے گزشتہ کو حال سے باہر

بس یہی وجہ ہے کہ ''میں'' کا شاعر فردا کی جانب جست بھرتے ہوئے بھی وقت کے پار اپنے گم گشتہ ٹھکانے ''ازل'' کی طرف جا نکلتا ہے۔

جست بھرتا ہوا فردا کے دہانے کی طرف
جا نکلتا ہوں کسی گزرے زمانے کی طرف
ایک بچھڑی ہوئی آواز بلاتی ہے مجھے

وقت کے پار سے گم گشتہ ٹھکانے کی طرف

ازل کا یہ شعور اتنا پختہ ہے کہ کسی اور اردو شاعر کے ہاں اس کی مثال ملنا مشکل ہے ۔یہاں اس طرح کے اشعار دیے جاتے ہیں۔

میں عدم میں کہیں پڑا ہوا تھا
کالعدم کر دیا گیا ہے مجھے
اچھا بھلا پڑا تھا میں اپنے وجود میں
دنیا کے راستے پہ مجھے رکھ دیا گیا
میں ہی تھا چشمِ تماشا بھی ،تماشا گر بھی
کبھی موسیٰ تو کبھی طور کیا میں نے مجھے
میں خود ابد کی اداسی سے مل کے خوش تھا کہ جو
مقیم مجھ میں بصد اشتیاق ہو رہی تھی

انجم سلیمی کے ہاں مسلمات سے انحراف دو صورتوں میں متشکل پذیر ہوا ہے۔اور دونوں کا تعلق ''میں'' یا ''من'' سے ہے۔اول یہ کہ ''میں'' کی معنیاتی تقلیب کرنے کے بعد اس کے متبادل کے طور پر انجم نے ایک نظامِ فکر مہیا کیا ہے جو ان کے مجموعہ کلام ''میں'' کا ماحصل ہے۔دوم یہ کہ عندالناس مذہبی اور اعتقادی مسلمات سے جو انحراف برتا گیا ہے وہ ''میں'' کے نظامِ ہائے فکر ہی کا سابقہ ولاحقہ ہیں اور جن کی حیثیت تقوینی اور ثانوی ہے۔''میں'' کے دیباچے میں انجم نے ''میں '' کے حصولِ عرفان کی تحریک بلھے شاہؒ سے حاصل کی ہے اور بلھے شاہ کے کلام ''بلھیا کی جاناں میں کون'' سے نظری استدلال کرتے ہوئے یہ تاثر بھی دیا ہے کہ ''میں'' کے عرفان کی طرف انجم نے بلھے شاہؒ کی تحریک پر قدم اٹھایا ہے۔

''ایک دن میرے ہمراہ چلتے ہوئے میرے کانوں میں بلھے نے سرگوشی کی بے خبر! کیا تجھے علم ہے؟ کیا تُو جانتا ہے کہ تُو کون ہے؟ میں چونکا!''

(انجم سلیمی: ''میں''، دست خط مطبوعات، فیصل آباد، ۲۰۱۳)

بلھے شاہ نے ''کیہ جاناں میں کون'' کی جذبی کیفیت کے بعد جو عرفان حاصل کیا وہ عشق کے ذریعے ذاتِ محبوب میں مکمل فنا ہے اور مادی ''میں'' کو خواب سے تعبیر کرتے ہوئے فنا کی زد میں رکھا ہے۔یعنی بلھے شاہؒ نے ''میں'' اور ''معائیرِ میں'' کی نفی کی ہے اور اسے بطورِ ہست اور فرد کے فنا کے گھاٹ اتارتے ہوئے اتصال بالروح سے نروان حاصل کیا ہے، لہٰذا اس طریق سے ''میں'' کی بطورِ الگ وجود کے مکمل نفی اور اس کے عرفان کا اثبات کیا ہے۔تو پھر انجم سلیمی کا ''

میں'' کے معائیر سے انحراف کیا ہوا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ انجم نے بلھے شاہؒ کے ''میں'' کے تصورِ فنا سے انحراف کرتے ہوئے انسان کی الگ وجودی حیثیت پر زور دیتے ہوئے اسے لامحدود اور لافانی قرار دیا ہے اور یہاں وہ اقبال کے سلسلہ فکر کو آگے بڑھایا ہے۔ اور جہاں ''عرفانِ میں'' کے اثباتی پہلو کو آگے بڑھایا ہے وہاں اس کا سلسلہِ فکر بلھے شاہؒ کے ''کیہ جاناں میں کون'' کی توسیع بن جاتا ہے:

''میں'' سفنا سب جگ وی سفنا

سفنا لوک بیانا

خاکی خاک سیوں رل جانا

کجھ نئیں زور دھنگانا

(سید بلّھے شاہ: ''کلیات بلھے شاہ'' مدون ''ڈاکٹر فقیر محمد فقیر'' (جلد اول) (تخلیقات، لاہور، ۲۰۰۹ء) ص ۳۰۹)

اب انجم کے یہ اشعار دیکھیے:

مہک اٹھا تھا کہیں پاس ہی فنا کا شجر

میں سانس روکے ہوئے باغ سے نکل رہا تھا

بلھے شاہؒ کو جب عشق کے پر لگے تو اس نے داخلی سفر کی لاانتہاؤں کو اسپِ عشق پر سوار ہو کر سر کیا۔ وہ فنا بقا کی منزل سے آگے نکل کر نفس الناطقہ کی مثال تھا جو اپنی ''میں'' کی معرفت کی کہانی یوں سناتا ہے:

بلھا شوہ دا ''میں' محتاج ہویا

مہاراج ملے میرا کاج ہویا

مجھے پیا کا درس معراج ہویا

لگا عشق تاں اے گُن گایا ہے

میں پایا ہے میں پایا ہے

تیں آپ سروپ وٹایا ہے

حیران کن بات یہ ہے کہ انجم سلیمی نے ''عرفانِ میں'' کے اس سفر میں اسپِ عشق کا سہارا ہی نہیں لیا جو دراصل بلھے شاہؒ کی ''میں'' کا اصل الاصول اور ''کلّ عرفان'' ہے۔ انجم نے اپنی ''میں'' کی تقلیب کے لیے منفرد راستا اختیار کیا ہے۔ ایسا راستا جو ''میں'' کے عرفان کے بعد تخلیق پر منتج ہوتا ہے۔ عشق اگر بلھے شاہؒ کے لیے ہست کے عرفان کا راز اور مجاز و حقیقت کا ماحصل ہے تو انجم

کے لیے ذہنی سہولت ہے سود وزیاں یا بدلتے ہوئے موسموں کی باس ہے، اپنے توکل میں آسمان ہے، عریانیِ راز ہے، کچے گھڑے کا سوار ہے:

ان دنوں خود سے فراغت ہی فراغت ہے مجھے
عشق بھی جیسے کوئی ذہنی سہولت ہے مجھے

عشق میں نام کمایا ہے گنوا کر خود کو
سو کا سود خسارے کا خسارا ہے میاں

یہ عشق اپنے توکل میں آسمان سا ہے
کسی ستوں کا سہارا نظر نہیں آتا

میں روشنی میں آ کے پشیماں بہت ہوا
عریاں کیا ہے عشق کی پوشاک نے مجھے

تُو آپ کچے گھڑے پر سوار ہے عشقا!
تُو خود بھی ڈوب مرے گا مجھے بچاتے ہوئے

بلھے شاہؒ کے برعکس عشق انجم کے ہاں واجبی سا جذبہ ہے جو محبت سے آگے نہیں بڑھ پاتا۔ اس کی حیثیت متصوفانہ نہیں، شاعرانہ ہے۔ یہ شاعر کی جذباتی جمالیات پر قرض ہوتا ہے جو اسے شاعری کی صورت ادا کرنا ہوتا ہے۔ لہٰذا وہ شاعر جنھیں عشق کی ہوا بھی نہیں لگتی، عشق کا واویلا زیادہ کرتے ہیں۔ انجم کے ہاں عشق محبت کے تجربہ ہے جو راحت بھی ہے اور مصیبت بھی اور یہ ایک بار نہیں، بار بار ہوسکتا ہے:

سخت مشکل میں کیا ہجر نے آسان مجھے
دوسرا عشق ہوا پہلے کے دوران مجھے

مندرجہ بالا بحث سے یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ انجم نے بلھے شاہؒ کی طرح ''میں'' کے عرفان کے لیے عشق کا سہارا لیا نہ مجذوبیت طاری کی۔ یہ تفکر ہے، اپنے ''ہونے'' کا شعور ہے جو ''میں'' کے روزن سے معرفت تک پہنچاتا ہے۔ ''میں'' کو شاعرانہ سطح پر عرفانِ خودی کے حوالے سے بہت کم شعرا نے اپنی شاعری میں نئی معنویت سے ہمکنار کیا ہے۔ منیرؔ نیازی کے ہاں بسا اوقات اس کی جھلکیاں نظر آجاتی ہیں جو کہ فکرِ انجم کا تماثل تو ہیں لیکن نعم البدل نہیں۔ منیرؔ نیازی کی نظم بعنوان ''میں'' ملاحظہ کیجیے:

میں بھی دل کے بہلانے کو کیا کیا سوانگ رچاتا ہوں

سایوں کے جھرمٹ میں بیٹھا سکھ کی سیج سجاتا ہوں
بجھتے جلتے دیپک سے سپنوں کے چاند بناتا ہوں
آپ ہی کالی آنکھیں بن کر اپنے سامنے آتا ہوں
آپ ہی دکھ کے بھیس بدل کر ان کو ڈھونڈنے جاتا ہوں

منیؔر نیازی کی ''میں''، تقلیبی یا معکوسی نقطۂ نظر کی حامل ہے نہ یہ مسلمات سے انحراف کرتی ہے بلکہ یہ تو منیؔر کی تخلیقی شخصیت کا مظہر ہے جو اس کی باطنی دنیا کا تجرباتی انعکاس ہے۔ لیکن انجم جب یہ کہتا ہے کہ

یہ تب کی بات ہے جب کُن نہیں کہا گیا تھا
کہیں کہیں پہ خدا تھا، کہیں کہیں پہ تھا میں

تو اس کی مراد وہ ''کُلِّ ادراک'' ہوتی ہے جو اپنے کُل میں جزو اور جزو میں کُل ہوتا ہے۔ مالکِ کُن ہُکل ہے اور حاصلِ کُن جزو ہے۔ بس جزو اگر کُل سے ہے تو اس میں کُل کا ادراک ہونا ضروری ہے۔ گویا یہ وہ ازل ہے جو تابع بالا بد نہیں بلکہ ماورائے تبدل ہے۔ ایسی صورت میں انجم کے ہاں ''میں'' سے مراد ''میں'' کے عرفان کی تخلیقی استنتاج کی صورت ہے۔ یہاں بلھے شاہؒ کی طرح عشق کے ذریعے محبوبِ ازل کا وصال منتہائے مقصود نہیں بلکہ انجم معروضیت سے زیادہ قریب رہتا ہے۔ وہ اگر عالمِ لاہوت میں بھی ہو تو اس کے پاؤں زمین سے جڑے رہتے ہیں۔ لہٰذا جب کبھی ''میں'' سے پردہ اٹھتا ہے تو وہ اظہارِ ذات کی واردات بن جاتی ہے۔ انجم ققنس کی طرح اپنی ''میں'' کی آگ میں جل کر راکھ ہوتا ہے اور اسی راکھ سے نمودِ مکرر حاصل کرتے ہوئے ہر مرتبہ تخلیق کے روپ میں نیا جنم پاتا ہے۔ یہی اس کی دریافت ہے، یہی اس کی مسمار اور یہی اس کی تعمیر ہے۔

''میں'' کے ہر صفحے پر اپنے ہونے کا احساس ہے۔ یہ مداحی نہیں ہے، بین حقیقت ہے۔ بسا اوقات شاعر فکر فرماتے ہوئے کبھی یہ سوچ بھی نہیں سکتا کہ اس نے فلسفۂ بشریت کی کس گتھی کو سلجھایا ہے یا ابہام پیدا کیا ہے۔ بعض اوامر اجتماعی لاشعور سے برآمد ہوتے ہیں جن کا شعور شاعر کو نہیں ہوتا لیکن یہ مربوط نظام فکر مرتب نہیں کرتے اور پراگندہ و منتشر خال خال اشعار میں نظر آتے ہیں۔

وہ انھیں موزوں کر کے ان کے معانی پر ذاتی تعینات کی گرہیں لگا دیتا ہے۔ اس کا کام یہیں پر ختم ہو جاتا ہے۔ نقاد المعانی فی بطن الشاعر تک کبھی نہیں پہنچتا۔ نتیجہ کیا نکلتا ہے؟ مابعد جدیدیت کی رو سے نتیجہ لاتعینی ہے جو عدم کلیت اور عدم مرکزیت پر زور دیتی ہے۔ یہاں انحراف نظریاتی نہیں تجرباتی اور جز وقتی رہتا ہے مگر انجم سلیمی کے مجموعۂ کلام ''میں'' میں لوح سے تمت تک

کوئی ایک غزل بھی ایسی نہیں ہے جس میں لفظ ''میں'' اور اس کے معائیر کا منحرف عن الجمہو ر برتاؤ نہ ہو۔ قریب قریب ہر شعر میں ''میں'' کے عرفان کی جھلک، یا کوشش یا اپنے ہونے کا شعور نظر آتا ہے۔ انجم ''فلسفۂ میں'' کا شاعر ہے۔ اردو شاعری میں اس نقطۂ نظر سے اس قدر منضبط نظامِ فکر کی مثال نہیں ہے جو ''میں'' اور ''انسلاکاتِ میں'' کا کامل نمونہ ہو۔ یہ انجم سلیمی کا سب سے بڑا انحراف ہے جو انھوں نے ''میں'' کے بطورِ انا و نرگسیت کے مسلم و مروج نظامِ فکر سے انحراف کرتے ہوئے ایک الگ فکر سے روشناس کرایا ہے جو ادبی تنقید میں ایک نئے باب کی بحث کی متقاضی ہے۔

(انجم سلیمی کے اشعار اور ان کے حوالے ''میں'' دست خط مطبوعات، فیصل آباد ۲۰۱۳ سے لیے گئے ہیں)

ایڈورڈ سعید کی کتاب شرق شناسی: ایک مطالعہ

تنزیلہ اسلم

ایڈورڈ سعید 1935 کو یروشلم فلسطین میں ایک امیر کاروباری شخص ویدی ابراہیم کے ہاں پیدا ہوئے۔ اُن کی والدہ ویلز کے شہزادے ایڈورڈ ہشتم سے بہت متاثر تھیں اس لیے اُن کا نام ایڈورڈ سعید رکھا گیا۔

ایڈورڈ سعید امریکی فلسطینی ماہر تعلیم، سیاسی کارکن اور ادبی نقاد، عالمی سماجی اور ثقافتی سیاست کے تناظر میں ادب کی تفہیم کی روایت سے جڑے ہوئے ہیں۔

اُنہوں نے آزاد فلسطینی ریاست کے قیام اور فلسطینی عوام کے سیاسی حقوق کے تحفظ کے لیے قلمی اور علمی طور پر فعال کوششیں کیں۔ فلسطینوں کے حقوق کے لیے بلند ہونے والی آوازوں میں ان کی آواز موثر ترین آواز ہے۔ اُنہوں نے فلسطین کے بارے میں اسرائیل اور امریکہ کی پالیسیوں کو سخت تنقید کا نشانہ بنایا۔ اُنہوں نے زیادہ تر وقت جلاوطنی میں گزارا۔

☆ خاص طور پر ''مشرق'' اُن کی تنقید و تحقیق کا بنیادی موضوع رہا۔

☆ کالونیاتی ادب کے شعبے میں جدیدیت کا بانی بھی قرار دیا جاتا ہے۔

☆ اُن کا خاص میدان یہ ہے کہ یورپ میں مشرق تہذیب کو کیسے دیکھا اور سمجھا جاتا ہے اور اس نقطہ نظر کے یورپی اور مشرقی ادب پر کیا اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ یوں اُنہوں نے کالونیاتی ادب کی اصطلاح کو ایک نیا مفہوم دیا اور اس تفہیم کے لیے راہیں آسان کر دیں۔

☆ ایڈورڈ سعید کی سب سے معروف کتاب جس نے انہیں عالمی شہرت عطا کی ''مشرقیت'' ہے۔

ایڈورڈ سعید کی کتاب 1978ء میں Orientalism شائع ہوئی۔ یہ دستاویزی نوعیت کی حامل کتاب ہے۔ مقتدرہ قومی زبان

☆ پاکستان نے ۲۰۱۲ء میں اس کا ترجمہ ''شرق شناسی'' کے نام کروایا۔ جو محمد عباس عالم نے کیا اور ''شرق شناسی'' کا پیش لفظ ڈاکٹر انور احمد نے تحریر کیا۔ اس کتاب کو مصنف نے تین ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ اور ابواب بندی سے پہلے کتاب کا تعارف کروایا ہے۔

1975ء سے 1976ء کی خوفناک خانہ جنگی کے دوران ، بیروت کا دورہ کرنے والے ایک فرانسیسی صحافی نے شہر کے تباہ شدہ مرکزی حصے کے بارے میں افسوس کرتے ہوئے لکھا:۔

''اس علاقے کا تعلق کبھی شاتو برائنڈ اورنرول کے مشرق سے تھا'' بحوالہ ''شرق شناسی'' ص ا

صحافی کی بات درست ہے ''مشرق، اصطلاحاً بڑی حدتک یورپ ہی کی ایجاد تھا۔اور قدیم ایام ہی سے رومانویت ، عجیب وغریب مخلوقات ، ذہین پر چھا جانے والی یادوں ، زمینی تناظر اورنادر تجربات سے عبارت تھا۔

☆ وہ مزید کہتا ہے کہ مشرق جغرافیائی طور پر مغرب سے ہے اور یہ وہ خطہ ہے جس میں یورپ کی سب سے بڑی اورسب سے زیادہ دولت مند قدیم ترین نوآبادیات تھیں۔

☆ مشرق کی موجودگی میں یورپ کوموقع ملا کہ اپنا ایک تصّور قائم کرے۔

شرق شناسی (Orientalism):

شرق شناسی کے عمومی معنی یہ ہیں کہ یہ ایک اندازفکر کا نام ہے، جس کی بنیاد علم موجودات اورنظریہ علم کے مطابق اس امتیاز پر ہے جو''خاص مشرق'' اور''خاص مغرب'' کے درمیان ہے۔

اس لحاظ سے لکھنے والوں کی ایک بڑی تعداد نے جس میں شعرا، ناول نگار، فلسفی، سیاسی قائدین، ماہر معاشیات اورمغرب کی توسیع پسند پالیسی کے منتظمین شامل ہیں۔

مشرق اورمغرب کے درمیان اس بنیادی امتیاز کونظریات ، رزمیہ داستانوں ، ناولوں اورمعاشرتی توضیحات اورسیاسی صورتِ حال کے تجزیے، جن کا تعلق اہل مشرق ان کے رسم ورواج ، ذہنیت اورقسمت وغیرہ سے ہے۔نقطہ آغاز کے طور پر تسلیم کرلیا گیا ہے۔

مختصر الفاظ میں شرق شناسی ،مشرق پر مغرب کی حکمرانی اوراختیار رکھنے کے لیے اختیار کردہ ایک تشکیل ہے۔

☆ شرق شناسی ایک جغرافیائی شعور، معلومات اورعلم کا جمالیاتی اور عالمانہ، معاشی، عمرانی، تاریخی اورلسانیات کے متعلق اصل تحریروں میں ایک طرح کا پھیلاؤ ہے۔فی الواقع شرق شناسی ایک جغرافیائی فرق کی تشریح وتوضیح ہے۔

☆ اس کا مقصد ایک مختلف دنیا کو سمجھنا اور بیشتر صورتوں میں اس پر تسلّط قائم کرنا اس کے بارے میں منصوبہ بندی کرنا بالآخر اسے اپنے اندر تمدّنی، معاشرتی ، سیاسی اورمعاشی طور پر سمولینا ہے۔شرق شناسی کے مطالعہ میں کچھ اس طرح کے سوالات اُٹھائے جاتے ہیں۔

☆ شرق شناسی کی روایت میں شرق شناس کے وجود کے علاوہ کس قسم کی علمی، جمالیاتی، عالمانہ اورتمدنی قوت بروئے کارلائی گئی؟

☆ لسانیات ،لغت نویسی، تاریخ،حیوانیات، سیاسی اور معاشرتی نظریات ،ناول نویسی وغیرہ کی مدد سے کس طرح شرق شناسی نے دنیا کے بارے میں بادشاہت کا تصور پیدا کیا اوراس کو مروّج کردیا؟

☆ شرق شناسی میں کیا تبدیلیاں واقع ہوئیں؟

☆ کس طرح سے کس طریقے سے مواد کی جمع آوری ہوئی اوراس کو کیسے صاف شفاف بنایا گیا؟

تحقیق کا طریقِ کار:

مصنف نے جوطریقہ کار اختیار کیا اس حوالے سے وہ کہتے ہیں کہ کام کا نقطہ آغاز پہلے سے موجود نہیں ہوتا اور نہ یہ آپ کی دسترس میں ہوتا ہے بلکہ کسی منصوبہ پر کام کی ابتدا ہی اس طرح کی جائے کہ مطلوبہ نتائج حاصل ہوں۔وہ کہتے ہیں اصل تحریروں کے مجموعہ کو ترتیب زمانی میں لاتے ہوئے غفلت نہیں کی جاسکتی تھی۔اس لیے نقطہ آغاز کے طور پر مشرق کے بارے میں برطانیہ، فرانسیسی اورامریکہ میں ہونے والی کاروائیوں کوایک اکائی کی حیثیت دی۔

ایڈورڈ سعید نے اس کام کو تین حصّوں میں تقسیم کیا۔

۱۔ مشرق پر برطانوی،فرانسیسی اورامریکی اصل کتب اورتحریروں کا مجموعہ بھاری بھرکم تھا۔

۲۔ جرمنی،اٹلی یا روس میں ہونے والا کام دوسرے نمبر پر ہے۔

۳۔ اورآخر میں پھر جرمنوں نے اس کام کومحنت اورتوجہ سے پایہ تکمیل تک پہنچایا۔

اس کے بعد وہ اعتراف کرتا ہے کہ جرمنی کے واجب الاحترام عالموں کے کام سے میں فائدہ نہیں اُٹھاسکا اوراپنی دل چسپی کا محور برطانوی اورفرانسیسی مصنفین کو بتایا۔

ایڈورڈ سعید نے اپنے اس تحقیقی کام کے بارے میں کہا کہ یہاں سے مشرق کے بارے میں تحقیق کا صحیح مذاق پیدا ہوگا۔کیونکہ شرق شناسی کے حوالے سے ریمانڈ شواب، جان فِک اورڈورتھی میٹلز کی تصانیف قاموس العلوم کا درجہ رکھتی ہیں۔

کتاب کی تصنیف کے مقاصد:

ایڈورڈ سعید کہتے ہیں کہ کتاب لکھتے ہوئے درج ذیل مقاصد سامنے رکھّے۔

1۔ ایک عام اورمجموعی کتاب مہیا کروں جو پہلے میسّر نہیں۔

2۔ دوسرا مقصد یہ ہے کہ ایسے مفروضات پرتحقیق کروں جو مشرق کے بارے میں پہلے

سے موجود ہیں۔ جن پر کبھی شک یا سوال نہیں کیا گیا۔ اس طرح ان پر بحث کو تحریک دوں کیونکہ طلبہ اور فاضلین کے کام کا بیشتر انحصار اور اعتماد انہی مفروضات پر ہے۔

3۔ یہ کتاب نام نہاد تیسری دنیا کے قارئین کے لیے بھی ہے کہ مغربی سیاست اور اس سیاست میں غیر مغربی دنیا کے کردار کو سمجھنے کی طرف ایک قدم نہیں بلکہ یہ اس قوت کو سمجھنے میں مددگار ہوگی جو مغربی تمدن کے ابلاغ اور مقالات میں کارفرما ہے۔

4۔ تاحال مغرب کی سامراجیت اور تمدن پر مبسوط اور مکمل مقالے کی ضرورت ہے۔

5۔ یہ معلوم کرنا کہ کوئی محقق دوسری ثقافتوں اور دوسری قوموں پر بغیر کسی دباؤ اور کسی قسم کی ریشہ دوانی کے کس طرح آزاد تحقیق کرسکتا ہے۔

6۔ علم اور حکومت کے درمیان پیچ در پیچ تعلق پر دوبارہ غور خوص کرنا پڑیگا۔

اس کتاب کی تصیف کا ایک ذاتی پہلو بھی بیان کیا ہے۔"امریکہ میں، میں نے تمام تعلیم حاصل کی مگر اس کے باوجود مشرقی ہونے کا شعور ابھی تک قائم ودائم ہے" ایڈورڈ سعید گرامسی کی اطالوی زبان میں تحریر کا حوالہ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

"ابتداہی سے یہ انتہائی ضروری ہے کہ انسان پر تاریخ کے اثرات کی ایک فہرست مرتب کی جائے" بحوالہ:۔قید خانہ کی یاداشتوں میں

بقول ایڈورڈ سعید تین چیزوں نے سادگی پسند عربوں اور اسلام کے بارے میں سادہ سے تصور کو بہت زیادہ سیاست آمیز اور بھاری بھرکم مسئلہ بنادیا ہے۔ بحوالہ:۔قید خانہ کی یاداشتوں میں

1) مغرب کے لوگوں میں عربوں اور اسلام کے خلاف تعصب۔

2) عربوں اور اسرائیلی صیہونیت کے درمیان موجودہ کش مکش امریکی یہودیوں کے آزاد تمدن اور وہاں کے عوام الناس پر اثر انداز ہوتی ہے۔

3) امریکہ میں کوئی ایسی صورت نہیں جس میں ثقافت کے لحاظ سے امریکی لوگ عربوں اور اسلام سے غیر جذباتی انداز میں بحث ومباحثہ کرسکیں۔

ایڈورڈ سعید کے بقول بعض اوقات ادب کو تاریخی اور سیاسی لحاظ سے غیر ضرر رساں اور معصوم خیال کیا جاتا ہے۔ مگر یہ بات درست نہیں ہے۔ معاشرے اور ادبی ثقافت کو صرف اس وقت سمجھا جاسکتا ہے۔ جب دونوں کو ملا کر کام کیا جائے اس سے ثقافتی بالاتری کے طریقہ واردات کو سمجھا جاسکتا ہے۔

ابواب بندی:

اس کتاب کے تین ابواب اوران کے بارہ چھوٹے حصے ہیں۔اس تقسیم کا مقصد یہ تھا کہ معاملات ،حالات ،واقعات ،نظریات اور خیالات کی توضیح وتشریح کوممکن حدتک آسان بنادیا جائے۔

(پہلاباب)شرق شناسی کی وسعت

1۔ مشرق کاادراک

2۔ تصوراتی جغرافیہ اوراس کی نمائندگی:مشرقیت کی تجسیم

3۔ منصوبے

4۔ بحران

اس باب میں شرق شناسی کے ان تمام پہلوؤں کے گرد ایک دائرہ کھینچا گیا ہے جوتاریخ ،تجربات اور مشاہدات پر مشتمل ہے۔

یہ جائزہ فلسفیانہ اور سیاسی نوعیت کا ہے۔اس میں برطانوی پارلیمنٹ میں ہونے والے مباحث کوزیر بحث لایا گیا ہے۔کہ'' آپ جن لوگوں کومشرقی کہتے ہیں ان پر آپ کے تفاخراور بالاتری کا جواز کیا ہے؟

جواہم نکتہ اس باب میں ہے وہ یہ ہے کہ''علم''اور''طاقت''لیکن وہ برطانیہ کی برتری اورمصر کی کمتری کاانکارنہیں کرتا۔مصنف اس میں سوالات اُٹھاتا ہے کہ مصر کی اخلاقی ترقی جوان کی حکومت کی وجہ سے ہوئی۔اس کی پیمائش کیسے کی؟

ان کے تمام استدلال کوسادہ ترین شکل میں لایا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ

☆ ''دنیا مغربی لوگ ہیں،مشرقی بھی،اول الذکر حکومت کرتے ہیں اور ثانی الذکرّ کولازماً محکوم ہونا چاہیے''

☆ مشرق کا آدمی غیر منطقی ،گراپڑا،بچوں جیسا اور مختلف ہے،جبکہ یورپ کا انسان منطقی، نیک،بالغ نظراور متوازن ہے۔

کرومراور کپلنگ کاحوالہ دیاہے۔

☆ عرب ایک ذلیل تمدن میں زندہ ہے۔

☆ عرب صرف مقابلے کی صورت میں ہی کام کرسکتے ہیں۔

☆ عرب کلچر کم تراس لیے ہے کہ اسلام قصاص کونیکی بتاتا ہے۔

شرق شناسی کی ابتداویانا چرچ کونسل منعقدہ ۱۳۱۲ء کے ایک فیصلے سے ہوئی اور عربی یونانی،عبرانی اور سریانی زبانوں کے شعبوں کاایک سلسلہ قائم کیا گیا۔

☆ شرق شناسی پر تحقیق کا مطلب یہ بھی ہے کہ طریق کار میں پیش آنے والے ان مسائل کو حل کیا جائے جن کو تاریخ سامنے لے آتی ہے۔ تحقیق سے پہلے ضروری ہے کہ درست طور پر انسانی اقدار پر نظر ڈالی جائے جو شرق شناسی اپنی وسعت اور تشکیلات سے پیدا کرتی ہے اور پھر ان کو ملیا میٹ کر دیتی ہے۔

(باب دوم) شرق شناسی تشکیلات اور تشکیلاتِ جدید

1۔ سرحدات اور مسائل کا از سر نو تعین، لادینیت کا دین
2۔ بساسی اور رینان منطقی علم الانسان اور لسانی تجربہ گاہ
3۔ زائرین اور زیارتیں
4۔ مشرق میں قیام اور علمیت

دوسرے باب میں شرق شناسی کی ترقی کے سلسلے میں اہم اور بڑے بڑے واقعات کو تاریخ وار بیان گیا ہے۔ ساتھ ہی ان طریقوں کا بھی ذکر کیا گیا ہے جو معروف شعرا، فن کاروں اور فاضلین کے مشرق پر کام کے سلسلے میں باہم مشترک ہیں۔

(باب سوم) عصر حاضر میں شرق شناسی

1۔ خوابیدہ اور بیدار
2۔ انداز کار، مہارت، فراست، شرق شناسی کی دنیاداری
3۔ جدید برطانوی فرانسیسی شرق شناسی کا بار آور ترین زمانہ
4۔ موجودہ دور

اس میں بات وہاں سے شروع کی گئی ہے جہاں اس سے پہلے ختم ہوئی تھی ۔ یعنی ۱۸۷۰ء کے لگ بھگ زمانے سے آگے ۔ یہ وہ زمانہ ہے جس میں بڑے پیمانے پر مشرق میں مغرب کی نوآبادیات میں توسیع پذیری ہوئی، جس کا نتیجہ جنگِ عظیم دوم کی صورت میں نکلا

تیسرے باب کا آخری حصہ مشرق پر برطانوی اور فرانسیسی اثر و رسوخ کا امریکہ کی طرف منتقل ہونے کا احوال ہے۔

آخر میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں شرق شناسی کے بارے میں موجودہ علمی اور تمدنی حقائق کا خاکہ پیش کیا ہے۔

گب کے بارے میں لکھتا ہے کہ اس نے اسلام کو نئے سرے سے پیش کیا۔

خلاصہ:

یہ کتاب بیسویں صدی کی انتہائی متاثر کن کتابوں میں شمار ہوتی ہے۔

پاکستان میں ناصر عباس نیّر نے ان کی کتابوں پر بہت سے مضامین لکھے ہیں۔

Orientalism کے بارے میں وہ لکھتے ہیں کہ اس کتاب میں ایڈورڈ سعید نے مشرقی دنیا خاص طور پر عرب ملکوں سے متعلق مغربی علماء کی رائے کا تجزیہ کیا ہے۔

وہ اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ ماضی میں مغربی علماء نسبتاً زیادہ تعصب پسند اور تنگ نظری کا شکار تھے۔ اور انہی پردوں کے پیچھے رہتے ہوئے انہوں نے مشرق کو دیکھا اور اس کے بارے میں رائے قائم کی۔ جبکہ یہ رائے یک طرفہ جانب دارانہ اور گم راہ کُن تھی۔ یہ ذاتی پسند ناپسند پر مبنی تھی۔

اس کتاب میں اُنہوں نے یہ بتایا کہ فرانسیسی اور برطانوی مستشرقین نے کس طرح ''مشرق'' کی بالکل غلط نمائندگی کی ہے۔

اس طرح کرتے ہوئے اُنہوں نے مغربی علم کا بھانڈا پھوڑ دیا کہ مغربی مفکرین مشرقی کلچر اور باشندوں کو سمجھنے کے اہل نہیں۔

مغربی نو آبادیاتی حاکموں نے مشرق کو جس طرح بیان کیا اس کے پیچھے سامراجی مقاصد، نہ کہ علمی تجسس کے تقاضے پوشیدہ تھے۔ اُنہوں نے مشرق کو اپنے غیر ''Other'' کی طرح پیش کیا، گویا مشرقیوں کو مکمل انسانی درجہ نہیں دیا۔

کرومر کی ''محکوم اقوام'' اور بالغور کے ''مشرقی'' کے نزدیک استدلال ایسی چیز ہے جس سے مشرق کا انسان مکمل طور پر لاتعلق ہے۔

بحوالہ شرق شناسی'' ص ۴۲

نئے لوکیل پہ ایک اہم ناول: ''نیلی بار''

مدثر علی خان

اس میں کوئی شک نہیں کہ طاہرہ اقبال نے بہت کم عرصے میں افسانہ نگاری اور ناول نگاری میں اپنا نام پیدا کیا ہے۔ناول نیلی بار سے قبل اُن کی مختلف تصانیف جن میں چار افسانوی مجموعے (سنگ بستہ، ریخت، گنجی بار، زمین رنگ)، سفر نامہ (نگیں گم گشتہ)، ناولٹ (مٹی کی سانجھ)، منٹو کا اسلوب (تحقیق وتدوین) اور پاکستانی اُردو افسانہ (تحقیق وتدوین) منظر عام پر آ چکی ہیں۔طاہرہ اقبال ایک لکھاری ہونے کے ساتھ ساتھ گورنمٹ کالج ویمن یونی ورسٹی میں بہترین معلّمہ کی خدمات بھی سرانجام دے رہی ہیں۔

نیلی بار 564 صفحات پر مشتمل ہے اس کا سرورق خالد رشید نے تیار کیا، اس کی قیمت 1050 روپے رکھی گئی اور یہ ناول دوست پبلی کیشنز کے زیرِ اہتمام شائع ہوا ہے۔اس ناول کا انتساب ''بار کے قدیم باشندوں کے نام اور دادا جی ملک عنائت اللہ اعوان کے نام'' ہے۔اس ناول کا حرف آغاز مستنصر حسین تارڑ نے لکھا ہے۔

ناول پڑھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کے طاہرہ اقبال جس مٹی سے بنائی گئی ہیں اُس چیکنی مٹی کو نیلی بار سے لے کر راوی اور چناب کے پانی میں گوندھ کر نیلی بار کی ہی کڑکتی بلکتی دُپہروں میں پکایا گیا ہے۔وہ اپنے کلچر، تہذیب، رہن سہن، رسم ورواج، موسمی حالات یہاں تک کے نیلی بار کی دھرتی پر اُگنے والی اجناس سے بھی بخوبی واقف ہیں۔

ناول کی ابتدا نیلی بار کے موسم اور رسم ورواج کے تعارف سے ہوتی ہے۔ابتدائی طور پر ملک فتح شیر کا کردار سامنے آتا ہے۔'ملک فتح شیر' ایک بڑا جاگیر دار ہے جس کے پاس چور، ڈاکو اور بدمعاش پناہ لیے رہتے ہیں۔ یہ بدمعاش صرف قافلے سے مال وزر ہی نہیں لوٹتے بلکہ قافلے کے مرد وزن کو بھی اغوا کر کے ملک فتح شیر کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ایسی ہی ایک واردات میں ایک نئی نویلی دُلہن 'ست بھرائی' اور اُس کے براتیوں کو لوٹ کر ملک فتح شیر کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ ملک فتح شیر ست بھرائی کو اپنے لیے پسند کرتا ہے لیکن اُس کا نوجوان بیٹا 'عبدالرحمان' ست بھرائی کو بھگا کر جنگل میں اپنے خفیہ ٹھکانے پر لے جاتا ہے جو بعد ازاں وٹ لینے کے لیے واپس کر دی جاتی

ہے۔ ست بھرائی کو عبدالرحمان سے عشق ہو جاتا ہے اور وہ عبدارحمان کے عشق میں پاگل ہو جاتی ہے۔ ملک فتح شیر کی بہن صفورہ جو جاگیرداری نظام کی وجہ سے ہر وقت گھر میں قید رہتی ہے اپنی جنسی خواہش کے ہاتھوں مجبور ہو کر ایک نوکرانی کی جگہ ملک فتح شیر کے پالتو ڈاکو کے پاس چلی جاتی ہے۔ جسے بعد میں حاملہ ہونے پر قتل کر دیا جاتا ہے۔

ملک فتح شیر کو عبدالرحمان کے کہنے پر ایک ڈاکو مار دیتا ہے جسے فوراً عبدالرحمان مار دیتا ہے۔ ملک فتح شیر کی دو بیٹیاں 'زارا فتح شیر' اور 'سارا' اپنی ماں کے ساتھ شہر میں مقیم ہو جاتی ہیں۔ زارا یونیورسٹی میں پڑھتی ہے جبکہ سارا اپنی ماں اور شوہر کے ساتھ اپنی ماں کے گھر رہتی ہے۔ سارا کے شوہر کو اُس کی فیکٹری کے مزدور جلا دیتے ہیں۔ زارا اپنے ہی ایک کلاس فیلو علی جواد سے Love and hate کے تعلق میں گرفتار رہتی ہے۔ زارا ایک دن پریشانی کے عالم میں علی جواد کے ساتھ اپنی پھوپھی صفورا والی غلطی دُہراتی ہے۔ اس غلطی کی سزا میں زارا کی ماں اُس کا نکاح نا چاہتے ہوئے بھی علی جواد سے کروا دیتی ہے۔ زارا علی جواد کو کچھ زمین دے کر طلاق لیتی ہے اور اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان چلی چلی جاتی ہے۔

زارا انگلینڈ سے واپس آ کر یونی ورسٹی میں لیکچرز دینا شروع کر دیتی ہے۔ اس وقت تک علی جواد انقلابی صف سے الگ ہو کر محمد علی معاویہ کے نام سے مذہبی روپ دھار چُکا ہوتا ہے۔ زارا ڈھلتی عمر میں بچے کی خواہش کے لیے ایک سجادہ نشین پیر اسرار علی شاہ سے شادی کر لیتی ہے۔ پیر اسرار علی شاہ زارا کی خواہش کی تکمیل نہیں کر پاتا۔ درگاہ پر قوالی کی محفل میں زارا محمد علی معاویہ کو دیکھ کر چونک جاتی ہے۔ دریافت کرنے پر اُسے معلوم ہوتا ہے کہ وہ درگاہ کے مدرسے میں بچوں کو تعلیم دینے کی غرض سے بلوایا گیا ہے۔ کچھ عرصہ بعد محمد علی معاویہ کی بدولت زارا کی خواہش پایہ تکمیل کو پہنچتی ہے۔ محمد علی معاویہ کا کام بچوں کو جہاد کی ترغیب دے کر افغانستان بھیجنا ہوتا ہے اسی لیے بڑا ہو کر زارا کا بیٹا بھی جہاد کے لیے گھر چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ اسی جھنجھلاہٹ میں زارا اپنا راز فاش کر بیٹھتی ہے جس کی سزا میں اُسے پیر خانے سے بے دخل کر دیا جاتا ہے۔ زارا محمد علی معاویہ سے کہہ کر اپنا بیٹا واپس کرواتی ہے اور اُسے انگلینڈ بھیج دیتی ہے جب کہ محمد علی معاویہ ایک بم دھماکے میں فوت ہو جاتا ہے۔

نیلی بار میں مرکزی پلاٹ کے ساتھ ساتھ ایک ضمنی پلاٹ چلتا ہے۔ ایک پلاٹ جس کے بارے اوپر ذکر کیا جا چکا ہے اور دوسرے پلاٹ کا ابتدائی کردار 'ذیلدار' ہے۔ یہ رتبے میں ملک فتح شیر سے کم ہے اور کسی نہ کسی طرح اپنی شناخت بجائے رکھنا چاہتا ہے۔ اس کی دو بیٹیاں ہے ایک کو یہ عبدالرحمان کو چھُپ کر دیکھنے کی وجہ سے مار ڈالتا ہے جب کہ دوسری بیٹی پاکیزہ ہے جو پانچویں

جماعت پاس کرنے کے بعد گھر سے کبھی باہر نہیں گئی۔ پاکیزہ ہر وقت گھر میں قید ہے اور کہانیاں سنتی اور بنتی رہتی ہے۔ وہ باہر کی دُنیا کو کہانیوں میں ہی دیکھتی ہے۔ وہ اپنی نوکرانیوں کی زندگی کو خود سے بہت بہتر سمجھتی ہے جو کام کاج میں مصروف رہتی ہیں جو کہیں بھی جا سکتی ہیں۔ پاکیزہ کی مرد ذات سے اس قدر دوری دیکھائی گئی ہے کہ وہ اپنے باپ کی میت کو بھی دیکھنے سے گھبراتی ہے۔ یہ وہ ضمنی پلاٹ ہے جس میں مصنفہ اپنا فلسفہ، نیلی بار کے باشندوں کی طرز معاشرت اور اُن کی نفسیات بیان کرتی ہیں۔

نیلی بار اگر موضوع کے اعتبار سے دیکھا جائے تو طاہرہ اقبال نے اس میں کئی موضوعات کو جگہ دی ہے۔ یہ شاید پہلا ناول ہے جو قیام پاکستان سے افغان امریکہ جنگ تک کے سیاسی منظر نامہ پیش کرتا ہے۔ اس ناول میں مہاجرین کو انوکھے انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ وہ نیلی بار کے باشندوں سے زیادہ سمجھدار، چُست اور چالاک ہیں۔ وہ بار کے ریتی رواجوں میں اس لیے بھی مخل ہوتے ہیں کیوں کہ وہ سابقہ تہذیب اپنے ساتھ لائے ہیں۔ وہ جاگیرداروں کے لیے اپنی آگہی کے باعث ایک خطرہ ہیں اور سادہ لوح کسانوں اور نچلے طبقے کے لوگوں کو نئی اجناس سے بھی روشناس کراتے ہیں اور اپنا حق مانگنے پر بھی اُکساتے ہیں۔ ان مہاجرین میں ایک احساسِ تفاخر پایا جاتا ہے۔ وہ لوٹے جا چکنے کے باوجود خود کو نیلی بار کے باشندوں سے معتبر، مہذب اور با شعور سمجھتے ہیں۔ طاہرہ اقبال ایک جگہ لکھتی ہیں:

''اپنی برتر ذات اور معاشرت کے زعم میں ان جنگلیوں کی آزاد منش معاشرت پر کراہت سے تھوکا اور توبہ توبہ کر کے کانوں کی لویں چھوئیں۔۔۔ ہائے نی گندا دیس گندا بھیس گندی رہتل، گندی بولی۔ ہائے نی کھارے پانی باروں کے، ننگی بچی دھوپیں جھوکوں کی، کوؤں چیلوں اور سولوں بھرے بار، چھدرے پیڑ، ہائے نی کوڑے کالے کھو، ہائے نی سونہا دیس چھٹا، سوہنا بھیس چھٹا۔۔۔'' (1)

ایک اور جگہ لکھتی ہیں:

''مہاجرنوں نے پھر احساسِ برتری میں افسوس زدہ زبانیں چچ چچ بجائیں۔'' نہ ہمارے بڈھے دیکھو کس شان سے جیتے ہیں۔ سارے رِشتے ناتے اُنھی کے حکم سے طے پاتے ہیں پوتوں پڑپوتوں پر بھی اُنھیں کا حکم چلے، نہ بہوؤں کی کیا جرات کہ گوموت نہ اُٹھائیں۔'' (2)

طاہرہ اقبال نے نیلی بار میں سیاست کے مختلف ادوار کو بھلے وہ ایوب خان کا دور ہو یا بھٹو کا، پیپلز پارٹی کا عہد ہو یا مسلم لیگ کا عمدہ طریقے سے پیش کیا ہے۔ طاہرہ اقبال تصویر کے دونوں رُخ دیکھتی ہیں اور اُن کرداروں کے مابین مکالمے کروا کر قاری پر اُس عہد کے اہم اسرار و رموز واضح کر

دیتی ہیں۔ وہ ایک جگہ لکھتی ہیں۔

''زارا بیگم! وہ پولیٹیک اسٹنٹ تھا، الیکشن جیتنے کی فضا بندی۔ ان کنگلے موالیوں نے وزارتیں چلانی ہیں کیا؟ جس طرح ملیں چلائی ہیں۔ مشینیں بھی بیچ کر کھا گئیہیں۔ اسی طرح وزارتیں بھی ہڑپ کر جائیں گے۔ خاندانی رُوساء میں ہی اتنا ظرف ہے کہ دولت واقتدار کی چکا چوند میں اپنی آنکھیں پھٹنے سے بچا سکیں۔ یہ پبلک تو ایندھن ہے وہ لکڑیاں جو اقتدار کی دیگ کے نیچے جھونکی جاتی ہیں وہ کندھے جو جیتنے والوں کو خود پر سوار کرواتے ہیں۔ وہ حلق جو نعرے لگانے کے لیے کرائے پر لیے جاتے ہیں کون ان سے کتنا کام لے سکتا ہے یہ سیاستدان کی کوالٹی ہے، پھر بھٹو نے صنعتوں کو لٹوا کر سبق سیکھ لیا ہے۔ اسی لیے تو زمینوں کی طرف دیکھا تک نہیں۔۔۔'' (3)

طاہرہ اقبال نے پاکستان میں ہونے والی پیر پرستی اور اُس کے بھیانک چہرے کو بھی موضوع بنایا ہے۔ وہ اپنے ایک کردار زارا فتح شیر کی شادی شائد سجادہ نشین اسرار علی شاہ سے اسی لیے کراتی ہیں کہ اس موضوع کے لیے ناول میں جگہ بنائیں اور مقدس درباروں اور درگاہوں کے برقعے میں چھپے مکروہ چہروں کو بے نقاب کر سکیں۔ وہ ان پیروں کو کسی نیک بزرگوں کے روپ میں نہیں بلکہ بادشاہوں کے روپ میں پیش کرتی ہیں۔ وہ کس طرح سادہ انسانوں کو جنت کی لالچ دے کر اور جہنم سے خوف زدہ کر کے بے عزتی اور بے غیرتی کے گڑھوں میں دھکیلتے ہیں۔ مریدین اس حد تک ان کے جال میں پھنسے نظر آتے ہیں کہ وہ اپنی جوان بیٹیاں ان کے سامنے نذرانے کی صورت پیش کرتے ہیں۔ طاہرہ اقبال ایسے ہی ایک مکالمے کو کچھ یوں قلم بند کرتی ہیں۔

''ہم راندہ درگاہ ہو گئے ہم دھتکارے گئے ہائے اُس جھلی نے ہمیں کہیں کا نہ چھوڑا ہم جہنمی ہوئے ہم دوزخ کا بالن ہوئے۔ معافی کا در بند ہوا۔ درگاہ معاف نہ کرے تو اللہ سائیں کیونکر معاف کر یہائے کبھی نہ کرے کبھی نہ بخشے جائیں گیہم دونوں۔۔ سائیں! ہمارے پاس بس یہ آخری چڑھاوا بچا ہے یہ بھی دھتکاری گئی تو ہم کس چوکھٹ کے پائے کو تھامیں گے۔ جیتے جی مر جائیں گے۔ قبول کرو پیرنی جی قبول کرو فقیری دعویٰ قبول کرو۔۔۔'' (4)

طاہرہ اقبال نے جہاد اور اُس کے پیچھے چھپی مذہبی منافقتوں کو بھی قاری کے سامنے کہانی کی صورت میں پیش کیا ہے وہ معصوم لوگوں کو جہاد کی ترغیب دینے اور اُس جہاد کے عوض تار تار ہونے والے ماوں کے کلیجوں کو بھی قاری کے سامنے لے آتی ہیں۔ نیلی بار میں دو ابواب؛ چھٹا باب ''اے مردِ مجاہد جاگ ذرا'' اور آٹھواں باب ''گل خان گل بانو'' جہاد کے موضوع کا احاطہ کرتے ہیں۔ ان دونوں ابواب میں مصنفہ نے جہاد کے نام پر کی جانے والی منافقت کو ناول میں بیان کیا ہے۔ ان ابواب کے علاوہ محمد علی معاویہ جو جہادی تیار کرتا ہے اور زارا فتح شیر جو ایک ماڈرن

خاتون ہے کے مکالمے نہایت عمدہ ہیں۔مثال ملاحظہ ہو۔

’’تم کیا جانو زارا بی بی! یہاں جنت کے خریدار بہت ہیں اور جان تو ایک معمولی زرِ مبادلہ ہے۔ یہ خام مال کاروبار میں لگانیوالے بخوبی آگاہ ہیں کہ کن منڈیوں میں ان کے مال کی کھپت ہے۔کہاں کہاں سے تھوک کے آرڈر مل سکتے ہیں۔بس ایک کفر کا فتویٰ کافی ہے۔اتنی لبیک سُنائی دیتی ہے کہ انتخاب مشکل ہوجاتا ہے۔‘‘(5)

ناول نیلی بار مارکسزم کے تناظر میں لکھا گیا ہے۔اس لیےاس کے آغاز سے انجام تک جاگیردارنہ نظام کی جھلک نظر آتی ہے۔ ذات پات ،طبقاتی کشمکش اورعدم مساوت کا ازلی نظام سارے ناول میں واضح نظر آتا۔زیادہ تر کردار اسی نظام کے تابع نظر آتے ہیں جس کے بارے میں طاہرہ اقبال کچھ یوں رقم طراز ہیں:۔

’’آقائیت اور رعیت،ربوبیت اور بندگی کا عجب جاگیردارانہ نظام متعارف ہوا۔ گویا یہ گولے باندے یہ چوہڑے مسلی،انسانی نسل سے الگ ہی کوئی مخلوق ہوں جن کی مائیں اُنھیں اسی غلامانہ فطرت کی پرداخت کے تسلسل کے لیے جنتی ہوں اور جن کی کوکھ صدیوں سے کسی خیانت کی مرتکب نہ ٹھہری ہو۔‘‘(6)

نیلی بار میں بیانیہ تکنیک استعمال کی گئی ہے۔ ناول کے کردار اسی مٹی سیأ بھرتے ہیں۔کرداروں کی زُبان،لباس اورنفسیات بھی اسی دھرتی کی ہے۔نیلی بار میں دومرکزی کردار ہیں ایک پاکیزہ اور دوسرا زارافتح شیر۔ پاکیزہ دیہی زندگی کی اور زارا فتح شیرشہری زندگی کی نمائندہ ہے۔عبدالرحمان اورذیلدار جاگیردارنہ نظام جبکہ علی جواد مذہبی منافقتوں کا نمائندہ کردار ہے۔باقی کرداروں کے نام طبقاتی تقسیم کے مطابق رکھے گئے ہیں۔جاگیرداروں کے نام عبدالرحمان اور ملک فتح شیر ہیں تو نوکروں اورکمی کمینوں کے کرملی،وریاما،پھتو اور رحماتر کھان رکھا گیا ہے۔پاکیزہ اور زارا دونوں بڑے گھر کی بیٹیاں جبکہ چھوٹی ذات کے کرداروں کے نام ستو، بکھاں اور ٹھرو ہیں۔ناول کے کردار زندہ جیتے جاگتے اوراپنی من مانیاں کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

ناول کی زُبان ایسا آمیزہ ہے جس میں اُردو، پنجابی اور پنجابی سے بھی زیادہ رُچناوی کے الفاظ پائے جاتے ہیں۔مختلف ناولوں میں اُردوانگریزی اوراُردو پنجابی کی آمیزش سے تجربات کئے جاچکے ہیں لیکن یہ پہلا تجربہ ہے جس میں رُچناوی کو اُردو کے ہم پلا کھڑا کیا گیا ہے۔ویسے تو سارے ناول میں رُچناوی الفاظ جابجا ملتے ہیں لیکن ناول کا پہلا باب ’’بار کے رنگ،موسم اور لوگ‘‘ اس ناول کے دروازے کی سی حیثیت رکھتا ہے۔لازمی نہیں کوئی ناول یا کوئی تحریر ہر قاری کو اپنے اندر داخل ہونے کی اجازت دے اسی طرح جو قاری اس ناول کے دروازے یعنی پہلے باب

کی مسافت کو طے کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے وہ ہی ناول سے صحیح حظ اُٹھا سکتا ہے۔اس باب میں رُچناوی زُبان کے ٹھیٹھ الفاظ استعمال کیے گئے ہیں جو بار کی اصل زُبان ہیں۔اُن ریتی رواجو ں کو موضوع بحث بنایا گیا ہے جو بار میں صدیوں سے رچے بسے ہوئے ہیں۔اس باب میں طاہرہ اقبال نے قاری کو جادوئی انداز میں نیلی بار کی سیر کراتی ہیں۔مثال کے طور پر پیرا دیکھیں۔

''اُونٹوں کی ٹلیاں اور گھنگھروں کی آوازیں سن کر راجباہوں اور کھالوں کے کناروں کپڑے کوٹتی کھار اُبال کر موٹے لمبے سیاہ جھاڑ سے بال دھوتیں اور راکھ مل مل کر نہاتی، ممصلنیں، جانگلیانیاں اُنٹ بٹھوا کر دُلہن دیکھتیں۔'' (7)

اس کے علاوہ جہاں پورا جملہ رُچناوی میں لکھا ہے طاہرہ اقبال نے قوسین میں اُردو ترجمہ بھی لکھ دیا ہے۔ناول میں استعمال ہونے والے ماہیے، ٹپے اور بین خالص رُچناوی زُبان میں ہیں۔مثال دیکھیے:

تیری گھڑولی بھرن چاچیاں تے تائیاں
تیری گھڑولی نوں لگیاں ست لڑیاں (8)

باہمنا روچناوی ناچ ہے۔جیسے سمّی بھی کہا جاتا ہے۔اس ناچ پر یہ خاص گیت گایا جاتا ہے۔باہمنے کے گیت کی مثال ملاحظہ فرمائیں:۔

توں جوتڑ چلووں نوکری میرا باہمنا
توں کریسیں نوکری میرا باہمنا
میں کڈیساں رومال میرا باہمنا
ہک ٹکا تیری نوکری میرا باہمنا
لاکھ ٹکا رومال میرا باہمنا (9)

نچلے طبقے کے اور دیہاتی کرداروں کے مکالموں میں بھی روچنائی زُبان رنگ بھر دیتی ہے۔

''لسّی کی کجی میں نمک ڈال ہاتھ سے اُسے کھورتیں اور سورج ڈھلے بھینس کا پچھلا تھن بھرا چھوڑ آتیں اور آنکھ کے اشارے سے کہتیں:
جادھاریں لے لے۔'' (10)

ایک ان پڑھ گنوار خاتون کردار کے مقالمے سے پہلے کے الفاظ دیکھیں:

''بوبو نے ناک سڑکتے ہوئے آ بھودانے بے دانت کے منہ میں گھمائے اور پھونک مار کر منہ کے اندر انھیں ٹھنڈا کیا خالی مسوڑھوں میں سے سیٹی سی بجی'' (11)

مکالموں کے علاوہ صاف اور شفاف اُردو لکھی گئی ہے۔ زُبان کا یہی آمیزہ اس ناول کا تقاضا تھا اگر اس میں سے رُچناوی الفاظ نکال دیئے جائیں تو تحریر کی ساری چاشنی بھی جاتی رہے گی۔

طاہرہ اقبال نیلی بار کی مٹی میں پلی بڑھی ہیں اور گہرے مشاہدے کی مالک ہیں۔ وہ اس جاندار انداز سے منظر نگاری کرتی ہیں کہ سارا منظر ایک ویڈیو فلم کی طرح قاری کے سامنے آجاتا ہے۔ صفورہ کا یک لخت تن سے جدا ہوتا ہوا سر، اُس کی کھُلی حیران آنکھیں، بارات لے کر گئے ہوئے جھومر ڈالتے ہوئے چوڑے مسلی، چھٹالے، کمادا اور کنک کی فصلیں صاف دیکھائی دیتی ہیں اور ان میں دُہائی دیتی ست بھرائی کی چیخیں صاف سُنائی دیتی ہیں۔ منظر نگاری کی یہ مثال دیکھیں۔

''یہ حبشی نژاد شکلوں والے کالے کلوٹے کاہل الوجود امن پسند دراوڑ اور کول نسلوں کی باقیات اس وقت بھی تین تال والا جھومر ناچ رہے تھے قطار در قطار بیسیوں جھگیوں کے سامنے پھیلے وسیع وعریض احاطے میں ڈھول کی تھاپ اور سارنگی کی گونج تیز تر تھی'' (12)

چونکہ سارے ناول پر مارکسزم کے گہرے بادل چھائے ہیں اس لیے کرداروں کے مابین طبقاتی تقسیم جا بجا نظر آتی ہے۔ طاہرہ اقبال جاگیردانہ نظام، مذہبی منافقت، صنعت کاری اور سیاست کی مکاریوں کے پردے چاک کرتی نظر آتی ہیں۔ شاید یہ واحد ناول ہو جو قیام پاکستان سے اب تک کے سارے سیاسی حالات اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔

طاہرہ اقبال کا اندازِ بیاں سہل اور سادا ہے۔ وہ ایک بیباک لکھاری ہیں۔ لاج، شرم اور شعوری بندشوں کو توڑ کر اپنی بات کہہ دیتی ہیں۔ اپنے خیالات کے اظہار میں وہ مصلحتوں کی قائل نہیں بلکہ حسب ضرورت منٹو کی طرح گالم گلوچ سے بھی نہیں چوکتیں۔ عورت کی نفسیات بیان کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

''ناگن جسے پہلی بار ڈنگتی ہیاس کے لہو کا ست اُس کے وجود کا حصہ ہو جاتا ہے۔ وہ اُس کی تلاش میں گھومتی رہتی ہے۔ بہت سوں کو ڈستی ہیلیکن پہلے ڈنگ کی لذت میں سرگرداں رہتی ہے۔ بالآخر اُسے برس بعد برس ڈھونڈ نکالتی ہے ڈسنے کے لیے۔'' (13)

اسی طرح مرد کی نفسیات بیان کرتے ہوئے کہتی ہیں:۔

''یہ مرد بھی کیسا خود رو کھیت چاہے دریائی پانی کتنا ہی سیراب کریں کسی ایک فصل کا بیج خالص نہیں رہتا۔ کتنی جڑی بوٹیاں گھاس پھونس اُگا لیتا ہے۔ ان حسین بیگمات کے جلو میں اُس نے کنیزوں کو دیکھا کوئی دمی سٹی، کوئی جٹ مدھانہ، اکروری، تاندلا، کوئی جنگلی کنیر کتنے وحشی ذائقے۔ اُن میں سے نکلتی یہ توری کی بیل جس کی پشت بھاری پتوں کے جھاڑ سے لدی تھی اور سامنے

لگے مخروطی پھل گر گر پڑتے تھے جیسے تھر کی کوئی ڈاچی''(14)

طاہرہ اقبال کا ناول نیلی بار اُن ناولوں میں سے ہے جو صدیاں گزرنے کے بعد بھی اپنے لکھاریوں کا نام زندہ رکھنے کا باعث ہوتے ہیں۔ نیلی بار طاہرہ اقبال کی وہ کاوش ہے جس کے اعتراف میں مستنصر حسین تارڑ اپنا سرنگوں کرتے نظر آتے ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ حرف آغاز میں لکھتے ہیں:۔

''اِندرو کے وہ سردار جی اگر وہ ابھی تک حیات ہیں، طاہرہ کا ناول ''نیلی بار'' پڑھ لیں تو بلونت اور بیدی تو کیا مجھے بھی فراموش کر کے طاہرہ کے چرنوں میں گِر جاتے، اُسے اپنا ایک اور گورو مان کر اُس پر ایمان لے آتے کہ ''نیلی بار'' بھی گرنتھ صاحب کی ایک جادوئی تفسیر ہے۔''(15)

حوالہ جات

1. طاہرہ اقبال، ''نیلی بار''، ''دوست پبلی کیشنز''اسلام آباد، 2017 ء،ص 18
2. ایضاً،ص 27
3. ایضاً،ص 153
4. ایضاً،ص 327
5. ایضاً،ص 257
6. ایضاً،ص 13
7. ایضاً،ص 35
8. ایضاً،ص 22
9. ایضاً،ص 27
10. ایضاً،ص 430
11. ایضاً،ص 401
12. ایضاً،ص 14
13. ایضاً،ص 255
14. ایضاً،ص 315
15. ایضاً،ص 8

ٹیری ایگلٹن کی کتاب ''تھیوری کے بعد''

حمیرا اکرم

ٹیری ایگلٹن نامور ادبی تھیورسٹ، نقاد، ماہرِ لسانیات اور ۴۰ سے زائد کتابوں کا مصنف ہے۔ٹیری ایگلٹن نے ۲۰۰۱ء میں مانچسٹر یونی ورسٹی میں کلچر تھیوری کے پروفیسر کی حیثیت سے کام کا آغاز کیا اور ۲۰۰۸ء سے لینکاسٹر یونی ورسٹی میں (Lancaster University) میں خدمات پر مامور ہے۔

لسانی تجزیہ، تنقید، تحقیق اور ادبی تھیوری پر کام کرنے کی بدولت ٹیری ایگلٹن کا شمار عصرِ حاضر کے نامور ادیبوں میں ہوتا ہے۔1938 میں شائع ہونے والی اُس کی کتاب iterary theory کی مختصر عرصے میں ہی سات لاکھ پچاس ہزار کاپیاں فروخت ہوئیں۔اِس کتاب میں ٹیری ایگلٹن نے واضح کیا کہ:

۱۔ کوئی بھی ادبی فن پارہ مکمل طور پر غیر سیاسی نہیں ہوتا۔

۲۔ ادبِ عالیہ ہمیشہ حکمران طبقے کی خدمات سرانجام دیتا ہے۔

۳۔ تاریخی اور نظریاتی لحاظ سے مشکوک ادبی تھیوریز مثلاً ساختیات، پسِ ساختیات، تحلیلِ نفسی اور ردِ تشکیل وغیرہ نے طاقت کے نظام اور تصورات کو چیلنج کرنے کی بجائے مضبوط کیا ہے۔لہٰذا وہ ثقافتی تناظر سے ادب اور ثقافت کے مطالعے پر زور دیتا ہے اور، محض کلچرل تھیوری کی خاطر تنقید پر اکساتا ہے جس کا مقصد معاشرے کی سماجی تبدیلی کے ذریعے بہترین لوگوں کی پیداوار ہے۔ثقافتی تھیوری کے حوالے سے اُس کے منظم اور جامع خیالات اُس کی جدید کتاب After theory میں سامنے آئے۔۲۰۰۳ء میں شائع ہونے والی اِس کتاب کا ترجمہ محمد داؤد راحت نے تھیوری کے بعد کے نام سے کیا ہے۔زیرِ مطالعہ یہ کتاب آٹھ ابواب پر مشتمل ہے۔آخر میں ضمیمہ دیا گیا ہے۔ابواب کی تفصیل یوں ہے:

باب اوّل: نسیان کی سیاست

باب دوم: تھیوری کا عروج وزوال

باب سوم: مابعد جدیدیت کی راہ

باب اوّل نسیان کی سیاست کے زیرِ عنوان، مصنف کے فلسفیانہ افکار ور عالمی سیاست کے پسِ منظر میں موجودہ حالات کا تجزیہ نہایت اہم ہے۔ ابتداء میں مصنف ثقافتی تھیوری کے حوالے سے کہتا ہے کہ اِس کا سنہری دور گزر گیا اور ثقافتی تھیوری پر کام کرنیوالوں کا کام اگرچہ اساسی نوعیت کا تھا لیکن نا قابلِ تقابل تھا۔ پھر جب بڑے نظریہ ساز مثلاً جولیا کرسٹووا اور رولاں باتھ اِس دنیا سے منہ موڑ کر مذہبی تصوف کی طرف راغب ہوئے تو محض جنسیت ہی اُن کے شاگردوں کی تحقیقِ علم کا محور و مرکز بن گئی۔ اور مارکسیت نے بھی حقیقی سیاسی جِد وجُہد سے ناتا توڑا اور وہ بھی فقط انقلابی فلسفے پر بحث و تمحیص کا ایک مشغلہ بن کر رہ گئی۔ یوں آج ثقافتی تھیوری محض دانشورانہ سرگرمی کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ ''تھیوری کے بعد'' کے مطالعے سے قبل ہم دیکھیں گے کہ ثقافتی تھیوری کیا ہے:

ثقافتی تھیوری یا کلچرل تھیوری تقابلی بشریات، Anthropology اور نشانیات Semiotics کی ایک شاخ ہے جو ثقافت کے انکشافی تصور Heuristic Concepts کا عملی یا سائنسی اصطلاحات میں مطالعہ کرتی ہے۔ اِس سے مراد یہ ہے کہ ثقافتی تھیوری انسانی رویوں، اور معاشرے کے ماضی و حال اور اقدار و معیارات کے مطالعے کے ساتھ ساتھ لسانی اور نشانیاتی عوامل کا بھی مطالعہ کرتی ہے، کہ کس طرح زبان اور علامتیں سماجی زندگی پر اثر انداز ہوتی ہیں اور یہ کہ ایک ثقافت کے لوگوں کا ایک مخصوص انداز میں عمل یا ردِّ عمل ایک جیسا کیوں ہوتا ہے۔ کلچرل تھیوری کی درست تفہیم اِس سے متعلق کم وبیش ۲۵۰ اصطلاحات کی تفہیم کے بغیر بہت مشکل ہے۔ ثقافتی تھیوری جس کا بنیادی مقصد ایک بہترین معاشرے کی بنیاد رکھنا تھا، مصنف کے نزدیک، اب وہ اپنے مقصد سے ہٹ گئی ہے۔ یہاں وہ طنزاً لکھتے ہیں کہ دلچسپ زمانوں میں زندہ رہنا ایک ملمع نعمت ہے۔ کیا فائدہ تکلیف دہ ایام کو یاد کرنے کا؟ دراصل مصنف عالمی سیاست کے منحوس رخ سے آشنا ہونے کے بعد نسیان کی سیاست کا شکار تیسری دنیا کے حوالے سے بات کر رہا ہے، جو حصولِ آزادی کی تحریکوں اور انقلابات سے گزری لیکن اُس کو قائم نہ رکھ سکی اور آج یہی نسیان کی سیاست مقتدر طبقے کو مزید مضبوط اور کمزور کو کوڑے کے ڈھیر سے رزق تلاش کرنے میں

معاونت کر رہی ہے۔ یہاں وہ ایک سوال کرتا ہے کہ اِس نظام کی کلید کون ہے یا کیا ہے؟ کیونکہ مفلس و نادار تو یقیناً عالمی معیشت کے پھینکے گئے کچرے کی صورت حاشیے پر موجود ہیں لیکن کم آمدنی والوں کا کیا ہے؟ یہاں وہ مڈل کلاس یا ورکنگ کلاس کا تجزیہ کرتا ہے جو نہ تو زندگی کے مرکزی دھارے میں ہیں اور نہ حاشیے پر۔ اگرچہ وہ تعداد میں کہیں زیادہ ہیں۔ چنانچہ اُس کے نزدیک اِس نظام کو چلانے، قائم رکھنے اور مضبوط کرنے میں اِسی مڈل کلاس کا کردار بہت اہم ہے۔ ٹیری ایگلٹن کے ''تھیوری کے بعد'' میں جو واضح مقاصدِ تحریر نظر آتے ہیں وہ یہ ہیں:۔

۱۔ ۱۹۶۰ء سے ۱۹۰۱ء تک کی ثقافتی تھیوری کے حاصلات، نقائص اور نقصانات کا میزانیہ مرتب کرنا

۲۔ اپنی فلسفیانہ فکر اور ثقافتی مطالعے کی روشنی میں متبادل ثقافتی نظریے کی تشکیل کرنا۔

ٹیری ایگلٹن کے نزدیک ثقافتی تھیوری کی جڑیں افلاطون تک جاتی ہیں۔ لیکن اپنی واضح شکل میں ۱۹۶۵ء سے ۱۹۸۰ء تک کے ڈیڑھ عشرے میں ابھر کر سامنے آئی۔ جنگِ عظیم دوم کے بعد کے زمانے سے لے کر یہ اُس مخصوص عرصے میں پھیلتی چلی گئی جس میں بائیں بازوں والے (سوشلسٹ، کیمونسٹ، مارکسٹ، فیمینسٹ وغیرہ) منظر سے غائب ہونے سے قبل نمایاں ہوئے تھے۔ اِسی دوران میں ہی ساختیاتی اور پسِ ساختیاتی مفکرین نے جہت ساز کام کیے اور یہی وہ عرصہ ہے جس میں صارف کمیونٹی کو فروغ حاصل ہوا۔ ٹیری ایگلٹن نے ثقافتی تھیوری کے حاصلات کی بحث میں جن باتوں کو نشان زد کیا ہے اُن میں سے چند یہ ہیں:

۱۔ ثقافتی تھیوری نے جنسیت کو مطالعے کے جائز اور سیاسی عناصر کے طور پر قائم کیا۔

۲۔ ثقافتی تھیوری نے مقبول ثقافتوں کے ساتھ حاشیائی ثقافتوں کے مطالعے کے تصور کو بھی راسخ کیا۔

۳۔ اِن حاصلات میں سب سے بڑھ کر ثقافتی مطالعات کا تیزی سے ترقی پانے والا شعبہ مابعد نوآبادیاتی مطالعات کا شعبہ ہے جس نے نہ صرف تیسری دنیا کی اقوام کی ناکامی کو واضح کیا بلکہ عالمی سیاست خصوصاً یورپی سیاست کا مکرہ چہرہ بھی سامنے لایا ہے۔

۴۔ ادبی حوالے سے ٹیری ایگلٹن بہترین تنقیدی افکار اُسے مانتا ہے جو فن پارے کی تفہیم میں معاونت کریں۔ چنانچہ ثقافتی تھیوری کے حاصلات میں سے ایک یہ ہے کہ ثقافتی تھیورسٹ فن پارے کی تفہیم و تعبیر کے لیے ایک ہی ذریعہ درست سمجھنے کی بجائے بہت سے متصورہ افکار برتنے پر اصرار کرتے ہیں۔

۵۔ ثقافتی نظریہ سازوں کے نزدیک فن پارے میں تخلیق کے لاشعور کو کھوجنے و رفن پارے کی تفہیم کے مختلف تناظر کے حوالے سے یہ افکار قاری کو بھی معاون خالق کا درجہ دیتے ہیں۔

درج بالا چند اہم حاصلات کے ساتھ ٹیری ایگلٹن کو ثقافتی تھیوری پر بڑا اعتراض یہ ہے کہ وہ نہ تو معاصر سیاست سے بھرپور انداز سے نمٹ سکی اور نہ ہی زندگی کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کر سکی، اس لیے لکھتا ہے کہ:۔

''ثقافتی تھیوری کچھ بنیادی مسائل کو آڑے ہاتھوں لیتی ہے لیکن مجموعی ثمرہ دینے میں ناکام رہتی ہے۔ یہ اخلاقیات اور مابعدالطبیعیات کے حوالے سے خلوت پسند، محبت، حیاتیات، مذہب اور انقلاب کے حوالے سے کوفت زدہ، برائی یا شر کے حوالے سے بڑی حد تک خاموش، موت کے حوالے کم سخن اور دکھی اور بنیادی روح اور جوہر کے حوالے سے خود استنادی اور سچ، معروضیت اور غیر جانبداری کے حوالے سے سطحی رہی ہے۔'' ص ۹۸

اِن نقائص کے ساتھ ساتھ مصنف کے نزدیک ثقافتی تھیوری کے نقصانات کا میزانیہ اِن عناصر سے ترتیب پاتا ہے۔ کہ:

۱۔ ثقافتی تھیوری جس تنوع، تقلیب اور حد سے تجاوز کرنے کی تبلیغ کرتی ہے، وہ رویے سرمایہ دارانہ نظام کو مزید مستحکم اور مضبوط کرتے ہیں۔

۲۔ ثقافتی تھیوری نے پیوریٹن تصور کو منہدم کیا، کیونکہ پیوریٹن طرز کا سرمایہ دارانہ نظام ہمیں اپنی ذات سے حظ اُٹھانے سے باز رکھتا تھا لیکن جدید صارفی کلچر کا سرمایہ دارانہ نظام ہمیں بے شرمی کی حد تک ہر ممکن طریقے سے اپنی ذات کی تسکین کی رغبت پیدا کرتا ہے۔ یہاں وہ نہایت تحقیر آمیز تفصیل سے سرمایہ دارانہ نظام کی خصوصیات گنواتے ہیں مثلاً: سرمایہ دارانہ نظام اِس بات کی بالکل پروا نہیں کرتا کہ یہ کس کا استحصال کر رہا ہے۔ یہ تحقیر کے معاملے میں مساوات پسند ہے۔ رنگارنگ ثقافتوں کا ملغوبہ بنانے کا مشتاق ہے تاکہ اپنی اشیاء فروخت کر سکے۔ اپنے منافع کے تلاش میں ہر مسافت طے کر سکتا ہے، ہر مصیبت جھیل سکتا ہے، بے ہودہ ترین رفیق کے ساتھ رہ سکتا ہے، کریہہ ترین ذلتوں کو برداشت کر سکتا ہے۔ اِس کے نزدیک پگڑی باندھنے والے، بھڑکیلے قرمزی ویسٹ کوٹ پہننے والے اور لنگوٹ باندھنے والے سب برابر ہیں۔ یہ حدود کو توڑنے اور مقدس گائے کو مار گرانے سے فروغ پاتا ہے۔ اِس کا قانون تمام حدود کا تمسخر اُڑاتا ہے۔ یہ اپنی خواہش کے لیے کی گئی خلاف ورزی کے حوالے سے نقادوں کو نیم مہذب ظاہر کرتا ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام کی اِسی بے رحم اور سفاک صورتِ حال کی بنا پر ٹیری ایگلٹن ثقافتی تھیوری کی تشکیلِ نو اور اجراء کو ضروری قرار دیتا ہے۔ اِس صورتِ حال کے علاوہ وہ دو مزید بڑے مسائل بھی بیان کرتا ہے۔ جن میں ایک تو مغرب کا اپنی طرزِ زندگی کے نفاذ اور دفاع کے لیے متکبرانہ رویہ اور دوسرا ڈیتھ آف ہسٹری کا خوف یا تشویش ہے۔ مختصراً یہ کہ اُس کے نزدیک آج

کے الجھے ہوئے اور نہایت اہم ثقافتی مسائل کے حل کے لیے بائبل اور مارکس کے نظریات سے رجوع کرنا نہایت سودمند ثابت ہوگا۔

ٹیری ایگلٹن مابعد جدیدیت اور ساختیاتی مفکرین کو براہِ راست طنز اور اعتراضات کا نشانہ بناتے ہوئے یہاں تک کہتا ہے کہ :۔

''مابعد جدید فکر سے ظہور پذیر ہونے والی مخلوق بے مرکز ، لذتیاتی ، اپنی دریافت خود کرنے والے اور متواتر سطح کے توافق ہی ہے۔''ص ۱۷۵

لیکن اِن اعتراضات کے ضمن میں مصنف نے کہیں بھی مدلل انداز اختیار نہیں کیا اور نہ ہی اس نے اپنی بات کی تائید کے لیے کوئی مستند حوالہ پیش کیا ہے۔شاید یہی وجہ تھی کہ بعد میں اُسے لسانی نظریات پر کیے گئے اپنے سنگین اعتراضات سے رجوع کرنا پڑا۔مستند تاریخی واقعات اور سیاسی حالات کے تناظر میں ثقافتی تھیوری کے ارتقاء کی تاریخ کا یہ جامع خاکہ، اُس کے حاصلات نقائص اور نقصانات کا میزانیہ مرتب کرنے کے بعد ٹیری ایگلٹن نے ثقافتی تھیوری کی تشکیل نو کے لیے اپنے افکار و نظریات کو جس مدلل انداز میں پیش کیا ہے اس کا احاطہ اس مختصر مضمون میں نہیں کیا جا سکتا۔لیکن اس نے ثقافتی تھیوری کی تشکیلِ نو کے لیے جس طرح مدلل افکار و نظریات پیش کیے ہیں اس میں انسان اور انسان کے متنوع زندگی کے تمام پہلو اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ زیرِ بحث آ گئے ہیں۔بہترین انسانی معاشرے کے قیام کی ضمن میں ٹیری ایگلٹن کے یہ فلسفیانہ افکار و نظریات جہاں اُس کے جامع فکر اور فلسفے کے تسلسل کو منظّم کرتے ہیں، وہیں اُس کی ہر فکر اور ہر فلسفہ اپنی جگہ ایک مکمل اکائی بھی ہے۔اِسی نقطہ نظر سے چند افکار ملاحظہ فرمائیں۔اشیائے صرف اور اشیائے خورد و نوش کی افراط و بہتات کے اس دور میں غریب کے افلاس اور فاقے کے سبب اور جواز کا مکمل ادراک رکھتے ہوئے لکھتا ہے:

''غریب کی صورتِ حال کسی حد تک اِس وجہ سے ناقابلِ برداشت ہے کہ اُس کی حالت کو بہتر کرنے والے ذرائع کی بہتات ہے اور فاقہ کشی کسی حد تک اِس لیے ہولناک ہے کہ یہ غیر ضروری ہے۔سماجی تبدیلی دنیا کی قابلِ افسوس صورتِ حال کی وجہ سے ضروری ہے لیکن مادی ترقی کی وجہ سے ممکن بھی ہے۔''ص ۱۶۶

ٹیری ایگلٹن کے نزدیک ثقافتی مفکرین نے جن مسائل کو قابلِ اعتنا نہ گردانا تھا اُن میں سے ایک اخلاقیات ہے، چنانچہ وہ اخلاقیات Morality اور اخلاقیت Moralism کا معنوی فرق واضح کرتا ہے۔وہ اخلاقیات کو لطف اندوزی اور زندگی کی فراوانی کا نام دیتا ہے۔باہمی تعاون کو معاشرے کی بقا اور ارتقاء کا مرہونِ منت سمجھتے ہوئے وہ یہ بھی واضح کرتا ہے کہ :۔

''انسانی تعاون میں بذاتِ خود کوئی اچھائی نہیں پائی جاتی۔ اُس کا انحصار اِس بات پر ہے
کہ کون کس کے ساتھ اور کس مقصد کے لیے تعاون کر رہا ہے۔ مارکس دیکھتا ہے کہ کس
طرح کچھ لوگ دوسروں کی سماجی قوتوں کو اپنے حریص مفادات کے لیے ہائی جیک کر
لیتے ہیں۔'' ص ۱۵۸

سیاق وسباق سے قطع نظر، موت کے حوالے سے اُس کی فکر صوفیانہ نظریے، مُـوتُـوْ قَبلِ اَنتَ مُوْ تُو سے کس قدر قریب لگتی ہے۔

''موت پر آمادگی اُس کی آمد پر اُسے کم ہولناک بناتی ہے۔ اگر ہم خود کو کمی کے ساتھ زندہ
رہنے اور اپنی خواہش کے بتوں اور اعضاء پرستی کے ذریعے تکمیل سے باز رہنے کے عادی
ہو جاتے ہیں تو ہم نے زندگی میں ہی موت کی مشق کر لی۔ اور اِس طرح ہم نے اُسے کم
خوفناک بنا دیا ہے۔'' ص ۱۷۰

ایک اور جگہ لکھتا ہے کہ:

''مزید یہ کہ اگر ہم موت کو ذہن میں رکھ سکیں تو ہم یقیناً اِس سے زیادہ نیکی کے ساتھ
پیش آئیں جس قدر ہم اب پیش آتے ہیں۔'' ص ۱۹۳

''وہ معاشرہ جو موت سے خوف زدہ اور گریزاں ہوتا ہے، اُس کا بیرونی لوگوں کے
ہاتھوں پامال ہونے کا امکان زیادہ ہوتا ہے۔'' ص ۱۹۴

عنوان موت بدی اور عدم وجود میں انسان کو تاریخی حیوان گردانتے ہوئے ارتقاءِ روحانی کے نقطۂ نظر سے لکھتا ہے:

''اِس لیے ہم ہمیشہ دائمی طور پر اپنے وجود سے آگے کچھ بننے کے مرحلے میں ہوتے ہیں
کیونکہ ہماری زندگی حالیہ لمحات کے ایک سلسلے کی بجائے ایک منصوبے کا نام ہے تو ہم کبھی
بھی مچھر یا دوشاخے کی طرح ایک مستحکم شناخت حاصل نہیں کر سکتے۔'' ص ۱۹۱

المختصر انتہائی گنجلک تحریر اور فلفسیانہ مباحث پر مبنی ٹیری ایگلٹن کی یہ کتاب ثقافتی نظریے کے گزشتہ عہد کے ساتھ ساتھ، ثقافتی نظریے کے عصری تقاضوں پر بھی نگاہ رکھے ہوئے ہے۔ اور ثقافتی نظریے کے اُس عہد کو بھی پیشِ نظر رکھے ہوئے ہے جو ابھی لکھا جانا ہے۔ اس حوالے سے یہ ایک بے مثل کتاب ہے جو خالصتاً ثقافتی تھیوری کا نقطہ نظر بھی پیش کرتی ہے۔ اگرچہ اِس کے چند افکار و نظریات سے، خصوصاً مابعد جدیدیت کے حوالے سے، اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن اِس کے باوجود ٹیری ایگلٹن کی ثقافتی بصیرت کا مخصوص ثقافتی مسائل پر اطلاق سودمند ثابت ہو سکتا ہے۔

کاشف رضا کا ایک منفرد ناول: چار درویش اور ایک کچھوا

نعیم الرحمان

سید کاشف رضا کی ادبی حلقوں اور دوستوں میں پہچان نثری نظم اور انگریزی ادب کا بے پناہ مطالعہ رہی ہے۔ان کی شاعری کے دو مجموعے ''محبت کا محل وقوع'' اور ''ممنوع موسموں کی کتاب'' شائع ہو کر قارئین کی بھرپور داد حاصل کر چکے ہیں۔ 1973ء میں سرگودھا میں پیدا ہونے والے سید کاشف رضا چوتھائی صدی سے کراچی میں مقیم ہیں۔ان کا بچپن پاک فضائیہ کے مختلف مراکز میں گزرا جہاں ان کے والد ملازم تھے۔ انہوں نے راولپنڈی سے بی اے کے بعد کراچی یونی ورسٹی سے انگریزی ادب اور انگریزی لسانیات میں ایم اے کیا۔ وہ بطور صحافی دو دہائیوں سے زیادہ عرصے سے الیکٹرانک میڈیا سے وابستہ ہیں۔سید کاشف رضا کا حلقہ احباب انگریزی ادب کے وسیع مطالعہ سے واقف ہیں۔لیکن انہوں نے اردو میں منفرد ناول لکھ کر حیران کر دیا۔

اولین ناول سے قبل سید کاشف رضا نے نوم چومسکی کی دو کتابوں کے تراجم ''دہشت گردی کی صحافت'' اور ''گیارہ ستمبر'' کے نام سے کیے۔تاہم یہ ان کے مزاج اور فکر سے ہم آہنگ موضوع تھے۔ وہ محمد حنیف کے مشہور ناول A case of Exploding Mangoes کا ترجمہ بھی کر رہے ہیں۔ میلان کنڈیرا کے ناول The Joke کا ترجمہ بھی مکمل کر رہے ہیں۔ دونوں تراجم کا کچھ حصہ آج میں شائع ہو چکے ہیں۔غرض بھرپور ادبی سرگرمیوں میں مصروف ہیں۔ تاہم یہ ان کے مزاج اور فکر سے ہم آہنگ موضوع تھے۔ پھر ادبی جریدے آج میں ان کی طویل سفری کہانیاں شائع ہوئیں۔اور قارئین کو سفر نامے کے ایک نئے لطف سے آشنا کیا۔

سید کاشف رضا کے پہلے ناول ''چار درویش اور ایک کچھوا'' نے ادبی جریدے آج میں شائع ہو کر دھوم مچائی۔ اسے کتابی شکل میں مکتبہ دانیال نے شائع کیا ہے۔تین سو تیس صفحات کے ناول کی قیمت پانچ سو پچیانوے روپے ہے۔ ناول کے لیے انہوں نے اردو ادب کے لیے منفرد تکنیک برتی ہے۔ جو ان کے وسیع مطالعہ کی آئینہ دار ہے۔اس اسٹائل کو بجا طور ''اردو ادب میں جادوئی حقیقت نگاری'' قرار دیا جا سکتا ہے۔

ناول کے ابتدائیہ میں مصنف انوکھا سوال اٹھاتا ہے کہ

''پتہ نہیں کب انسانوں نے طے کیا تھا کہ کہانی کو بیان کرنے کے لیے کسی نہ کسی راوی کی موجودگی ضروری ہے۔مگر ایک کہانی کو ایک راوی کیسے بیان کرسکتا ہے؟ کہانی تو ہرسمت سے دکھائی دیتی ہے،تو پھراس کے بیان کے لیے ایک عدد راوی کا ہونا کیوں ضروری ہے؟ میرے سامنے میرے کردار اپنی اپنی کہانیوں کی پوٹلیاں اٹھائے موجود ہیں۔میرے ذرا سے اشارے کے منتظر، کہ میں ان پوٹلیوں میں سے زندگی کے رنگ برنگے ٹکڑے نکال کرانہیں دیکھنا دکھانا شروع کروں۔لیکن کردار آپ کے سامنے بھی تو موجود ہیں۔تو چلیے ان کی کہانی کو ایک ایسا دستر خوان سمجھیے جس پر میں آپ کو بھی دعوت اڑانے کی پیشکش کرر رہا ہوں۔میں ان پوٹلیوں میں سے زندگی کے جو رنگ برنگے ٹکڑے نکالوں ان میں سے کچھ کو منظور کیجیے اور کچھ کو مسترد،اور منظور شدہ ٹکڑوں کو توڑ،موڑ اور جوڑ کر ہر کہانی کو خود ترتیب دینے اور اپنے طور پر دیکھنے، دکھانے کی کوشش کر دیکھیے ۔میں خود ایک سامع بھی رہا ہوں جسے یہ جاننے کی جستجو بھی رہی ہے کہ شہرزاد کے ساتھ ایک ہزار دوسری رات کو کیا ہوا۔مجھے ایک حریص راوی بھی سمجھ لیجیے جس نے بیان کے ہر ہر طریقے کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا ہو۔ایک حریص راوی کو کسی حریص سامع سے زیادہ کسی کی تلاش نہیں ہوتی۔سو میری اس حرص میں آپ بھی شریک ہو جائیں تو مل جل کر دعوت اڑانے کا سامزہ آجائے۔اب آغاز قصے کا کرتا ہوں، ذرا کان دھر کر سنو اور منصفی کرو۔''

کیا انوکھا اور قدیم داستانی انداز ہے۔ناول اس ابتدائیہ کے ساتھ ہی قاری کی پوری توجہ کو اپنی جانب مبذول کرانے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔''چار درویش اور ایک کچھوا'' کے چھ ابواب ہیں۔جن میں سے پانچ روایتی قصہ چار درویش کی مانند چار درویش جاوید اقبال،آفتاب اقبال، بالادی وبجی گاٹ اور ان کے تینوں کے والد تحصیل دار اقبال محمد خان اور پانچواں باب کچھوے ارشمیدس کے بارے میں ہے۔جس کے بارے میں سید کاشف رضا نے ایک انٹرویو میں بتایا کہ

''میں نے زیادہ تر ناول انگریزی میں پڑھے ہیں ان میں روسی، لاطینی، امریکن اور برٹش شامل ہیں۔ وہاں جنس کا بیانیہ اجنبی نہیں ہے۔اردو میں جنس کا بیان کافی ملفوف ہوتا ہے۔مجھے لگا کہ مجھے ملفوف طرز سے ہٹ کر انگریزی ناولوں کے طرز کی پیروی کرنا چاہیے۔میں نے اس مشکل کو ایسے حل کیا کہ ایک کردار کچھوا تخلیق کیا وہ

جنس کے بیان پر تنقید کرتا ہے۔ اور یہ بھی بتاتا ہے کہ اسے انگریزی میں ایسے بیان کیا جاسکتا تھا۔ وہاں میں نے انگریزی اقتباسات بھی دیے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ان انگریزی ٹکڑوں پر اب تک کسی نے بات نہیں کی، اور نہ ہی اعتراض کیا۔ بہر حال ناول کی کئی سطحیں ہوتی ہیں۔ میرے خیال میں آدمی کو سمجھنے کے لیے اس کی جنسیت کو بھی سمجھنا ضروری ہے۔ اور معاشرے کی نمائندگی بھی کرنی ہے اور یہ معاشرے کے جنسی رجحانات کی عکاسی بھی کرتی ہے۔ بلکہ میں تو سمجھتا ہوں کہ میں معاشرے کی جنسیت کے رجحانات جیسے دکھانا چاہتا تھا وہ ابھی تشنہ رہ گئے۔''

سید کاشف رضا کی کردار نگاری بے مثال ہے۔ چار بنیادی کرداروں کی مکمل اور بھرپور شخصیت اور ان کی خامیاں اور خوبیاں انہوں نے بہت عمدگی سے پیش کی ہیں۔ ناول میں سیاسی، مذہبی، معاشرتی، طبقاتی، جنسی، غرض ہر موضوع کو چند مخصوص کرداروں کے دائرے میں بڑی خوبی سے بیان کیا گیا ہے۔ خصوصاً متنازعہ موضوعات کا ذکر کاشف رضا نے بڑی خوبی اور بے باکی سے کیا ہے۔ ہمارے معاشرے میں جن پر بات کرتے ہوئے ہر کسی کے پر جلتے ہیں۔ ایک اچھے مصنف کی یہی خوبی ہوتی ہے کہ وہ جو کہنا چاہتا ہے کسی نہ کسی انداز میں کہہ گزرے۔ چھٹے باب ''ستائیس دسمبر اور اس کے بعد'' میں نال کو بہت عمدگی سے اختتام تک پہنچایا ہے۔ بہت کم ناولوں اور ڈراموں میں اس طرح ہر کردار کا واضح اور منتقی انجام پیش کیا جاتا ہے۔ جس طرح ''چار درویش اور ایک کچھوا'' میں پیش کیا گیا ہے۔ سید کاشف رضا کا وسیع مطالعہ، ہر باب کے آغاز میں ژاں بودریاغ کے جملے، مختلف ناولوں، فلمیں سین اور مصنفین کا ذکر کمال مہارت سے کہانی کو بیان کرنے یا آگے بڑھانے میں استعمال کیا گیا ہے۔ ہر کردار اپنی جگہ مکمل اور اس کے حوالے سے آنے والی تفصیلات اسکی شخصیت کے خدوخال قارئین پر واضح کر دیتی ہیں۔ جاوید، آفتاب دو مختلف ماؤں سے اقبال محمد خان کے بیٹے جبکہ بالا اس کی غلط کاریوں کا نتیجہ ہے۔ چاروں کردار، کچھوا ارشمیدس اور راوی بھی ایک کردار کی صورت پورے ناول میں موجود ہیں اور اسے قدیم داستان گوئی خصوصاً قصہ چار درویش سے منسلک کر کے اس کی دلچسپی میں اضافہ کرتا ہے۔ اس قسم کے کردار حقیقی زندگی میں ہمارے اردگرد ہی موجود ہیں۔ بس دیکھنے والی آنکھ ہونی چاہیے۔ واقعات بھی ہمارے جانے پہنچانے سے ہیں۔ بقول سیف الدین سیف ''سیف اندازِ بیان رنگ بدل دیتا ہے۔۔ ورنہ دنیا میں کوئی بات نئی بات نہیں''

سید کاشف رضا کا انگریزی ادب کا مطالعہ انہیں انگلش ناولوں میں موجود پورنوگرافی کی جانب راغب ضرور کرتا ہے۔ لیکن ان کے ہاں یہ پورنوگرافی نہ بلاضرورت ہے اور نہ ہمارے

معاشرتی اخلاقیات کے دائرے سے باہر ہوتی ہے۔ بلکہ کہانی کا ایک حصہ اور انسانی کردار اور سائیکی میں موجود بوالعجی کو آشکار کرتی ہے۔ کیونکہ بہرحال جنس بھی انسانی زندگی کا اہم حصہ ہے۔ کہانی سے لطف اندوز ہونے والے کو یہ جنسیت ناگوار نہیں گزرتی۔

ناول کا پہلا باب 'جاوید اقبال' کے بارے میں ہے، جو ٹی وی چینل میں رپورٹر ہے اور کرینہ کپور کا شیدائی ہے۔ جس کی تصاویر اس کے پورے فلیٹ میں لگی ہیں، جہاں وہ تنہا رہتا ہے۔ اس کے فلیٹ کے سامنے زرینہ اور صادق رہائش پذیر ہیں۔ جاوید اپنے فلیٹ سے زرینہ کو دیکھتا رہتا ہے۔ جو اسے کرینہ سے مشابہ اور ایک چیلنج محسوس ہوتی ہے۔ جسے حاصل کرنے کے بعد اس کی دلچسپی ختم ہو جاتی ہے۔ صادق بھائی ناول کا عجیب وغریب کردار ہے۔ جس کے خواب حقیقت میں ڈھل جاتے ہیں۔ جاوید، زرینہ کے حصول کے لیے صادق سے دوستی کرتا ہے۔ اپنے متعلق صادق کا خواب اسے حیران کر دیتا ہے۔ جاوید کو ٹی وی چینل میں ساتھی مشعال بے حد پسند ہے اور اس کے مثبت ردِعمل سے وہ بے حد خوش ہے۔ مشعال کو اینکر بننے کا موقع ملتا ہے، تو اس کے عزائم میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ لیکن وہ اپنے ظاہر کے برعکس پختہ کردار کی مالک ہے۔ زرینہ کے حصول کے لیے کاوشوں سے جاوید کا کردار اور شخصیت کے روپ اجاگر ہوتے ہیں۔ اٹھارہ اکتوبر کو بے نظیر بھٹو کی وطن واپسی پر کارساز دھماکے اور ٹی وی چینلز کی مصروفیات کہانی رنگ اجاگر کرتے ہیں اور بہت سی ان کہی بھی سمجھ میں آجاتی ہے۔ صادق بھائی کے خواب ناول میں ایک عجیب پراسرار فضا کو جنم دیتے ہیں۔ جن پر حقیقت اور گمان دونوں کا شائبہ ہوتا ہے، اور انہی کے پس منظر میں بے نظیر بھٹو کی آمد پر بم دھماکہ، پنڈی دھماکے میں بے نظیر بھٹو کی شہادت، اس کے قتل میں ملوث مذہبی عناصر اور ان کی بے نظیر سے اس حد تک ناراضی کی وجوہ، قتل کے بعد رحمٰن ملک جیسے پی پی کے لیڈروں کا کردار اور شیری رحمٰن کی اپنی گاڑی میں بے نظیر کو لے جانا قتل کے محرکات بہت کچھ واضح اور پس پردہ طور پر بیان کیے ہیں۔ جو ناول کی دلچسپی میں اضافے کا باعث ہیں۔ نفاذِ شریعت کے لیے مذہبی عناصر کیا کچھ کرتے ہیں اور کس حد تک جاسکتے ہیں۔ اس کی حقیقت کیا ہے۔ یہ ایک اغوا کار کے مطالبے اور اس کے لیے ٹی وی بیپر میں ایک عالم دین سے گفتگو میں واضح کیا گیا ہے۔ جو کسی طور پر اس بدترین اور ناقابلِ قبول سانحے کی مذمت کو تیار نہیں ہے۔ بلکہ مختلف تاویلات پیش کرتا ہے۔ اینکر سوال کرتی ہے۔ لیکن مولانا یہ شخص شریعت کی خاطر خواتین کا ریپ کر رہا ہے۔ کیا آپ اس کی مذمت نہیں کریں گے؟ تو مولانا جواب میں کہتے ہیں کہ دیکھئے میں کوئی مفتی نہیں ہوں، لیکن تاریخ میں ایسی مثالیں موجود ہیں۔ اب کون حق پر تھا اور کون نہیں تھا، یہ فیصلہ میں اور آپ یہاں بیٹھ کر تو نہیں کرسکتے نا۔ آپ لوگ بلاوجہ میڈیا پر ایسے سوالات پوچھتے ہیں؟ ایسے

معاملات میں پردہ پوشی ہی مستحسن ہے لیکن مجھے تو لگتا ہے کہ آپ امریکا کے ایجنڈے اور سیکولر ایجنڈے پر کام کر رہی ہیں۔

یہاں کاشف رضا ریپ کے بجائے کسی اور صورتحال کے ذریعے بھی پیغام دے سکتے تھے۔ ان کے طرز بیان سے اختلاف ہو سکتا ہے۔ لیکن جو وہ کہنا چاہتے تھے وہ بہت خوبی سے قارئین پر عیاں کر دیا۔ یہی ناول نگار کی خوبی ہے۔

جاوید اقبال کے حوالے سے ان کی والدہ سلطانہ بیگم کا ایک دلچسپ پیرا بھی چشم کشا ہے۔ والدہ جاوید سے دور رہتی تھیں۔ لیکن انہیں بیٹے کی لڑکیوں سے دلچسپی کا علم ضرور تھا۔ جس نے اپنے کارناموں کا آغاز اسکول سے ہی کر دیا تھا۔ ان دنوں وہ اپنے شوہر سے الگ ہو کر اپنی امی کے ہاں رہ رہی تھیں۔ علیحدگی کا سبب گھر ہی میں شوہر کو ایک عورت کے ساتھ نازیبا حالت میں دیکھنا تھا۔ اب جب بیٹے نے گل کھلایا تو انہیں غصہ کے بجائے احساس تفاخر ہوا۔ یہاں ماؤں کا بیٹوں کی غلط کاریوں کی پردہ پوشی اور بڑھاوا دینے کی عمل کو واضح کیا گیا ہے۔

ناول کا دوسرا باب دوسرے درویش آفتاب اقبال کے بارے میں ہے۔ جو اقبال محمد خان کی پہلی بیوی امتہ الکریم سے بڑا بیٹا ہے۔ امتہ الکریم کی تین بیٹیاں بھی ہیں۔ وہ احمدی عقیدے سے تعلق رکھتی اور صوم وصلواۃ کی پابند اور پردہ پر سختی سے کاربند ہیں۔ اسی وجہ سے آزاد طبیعت کے اقبال نے انہیں طلاق دیدی۔ امتہ الکریم کی خودداری نے سابقہ شوہر سے بچوں کی پروش کے لیے بھی کچھ لینا گوارا نہ کیا۔ بیالیس سالہ آفتاب یونیورسٹی میں پروفیسر اور عملاً مذہبی جھمیلوں سے دور ہے۔ اس کی ذہانت اور فکری نشو ونما کو کلاس میں دلچسپ اور فکر انگیز مکالمے میں افلاطون اور ارسطو کے تصور ممیسس کے بارے میں گفتگو کے ٹکڑے سے اجاگر کیا گیا ہے۔ آفتاب طلبا کو بتاتے ہیں کہ حقیقت کی نمائندگی یا ریپریزنٹیشن ایک بہت لیئرڈ کانسپٹ ہے۔ یعنی اس کی بہت سے تہیں اور بہت سے آسپکٹس ہیں۔ مثال کے طور پر آپ ایک واقعہ دیکھ رہے ہوں اور آپ کو اسے بیان کرنے کو کہا جائے تو سب کا بیان الگ الگ ہوگا۔ کسی کو کوئی چیز اہم لگی ہوگی اور کسی کو کوئی اور چیز۔ ریالٹی کی نمائندگی میں ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ یہ نمائندگی یا ری پریزنٹیشن کون کر رہا ہے۔

اس قسم کی فلسفیانہ بحث کو بھی دلچسپ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ جس سے نا صرف ناول کی دلچسپی میں اضافہ ہوتا ہے۔ بلکہ قاری کے علم میں بھی کشادگی آتی ہے۔ بیالیس سالہ آفتاب کی دیدہ زیب شخصیت اور ذہانت سے متاثر چھبیس سالہ شاگرد سلمیٰ ان سے محبت میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ کنوارا آفتاب بھی اس سے متاثر ہوتا ہے۔ سلمیٰ امیر والدین کی اولاد ہے۔ جو کسی صورت یہ

رشتہ کرنے کو تیار نہیں اور جب انہیں آفتاب کی والدہ کے احمدی ہونے کا علم ہوتا ہے تو انہیں انکار کا جواز مل جاتا ہے۔ سلمٰی کے والد آفتاب سے فوری مستعفی ہونے کا کہتے ہیں اور وہ چپ چاپ ایسا ہی کرتا ہے۔ لیکن سلمٰی کالج لیکچرار بننے اور خود مختار ہونے کے بعد آفتاب سے شادی کر لیتی ہے۔ تب ایک ہجوم ان کے گھر پر حملہ آور ہوتا ہے اور وہ دونوں بمشکل اپنی جان بچا کر بھاگنے میں کامیاب ہو پاتے ہیں۔ ناول کے اس حصے میں ہماری کردار کی بوالعجبیوں اور قول و فعل کے تضاد کو واضح کیا گیا ہے۔ آفتاب شاگردوں سے بات چیت میں کہتا ہے کہ

''تو دیتے نا عورتوں کو عزت! تو پیدا کرتے نا مساوات! حضور ﷺ نے تو میثاقِ مدینہ میں مسیحیوں کو برابر کا شہری قرار دیا تھا نا۔ تو غیر مسلموں کو برابر کا شہری کیوں نہیں سمجھتے مسلمان؟ غلامی کا انسٹی ٹیوشن ختم کرنے کے لیے بھی ابراہام لنکن کو آنا پڑا۔ عورتیں ہیں تو بیچاری ذلیل ہو رہی ہیں کسی غیرتمند بھائی سے اتنا نہیں ہوتا کہ والدین کے مرنے کے بعد جائیداد میں سے شریعت کے مطابق بہنوں کا حصہ ہی انہیں دیدے۔ سب بے شرمی سے اسٹامپ پیپر لے کر بہنوں کے پاس پہنچ جاتے ہیں کہ اپنا حصہ ہمارے نام کر دو، چودہ سو سال تک مسلمان اس بات پر کشت و خون کرتے رہے کہ کسی بادشاہ کے مرنے کے بعد اس کا کونسا بیٹا بادشاہ بنے گا، ارے بھئی کوئی قانون بنا دو کہ باپ کے بعد سب سے بڑا بیٹا بادشاہ بنے گا۔ ویسٹ بھی تو ہے جنہوں نے ٹرائیل اینڈ ایرر کے بعد منصفانہ انتخاب کا طریقہ سوچ لیا اور بادشاہ؟ یہ کہاں سے آگئے اسلام میں؟ اسلام میں تو سب برابر تھے، پھر ملوکیت کہاں سے آ گئی اسلام میں؟''

اس قسم کی فلسفیانہ گفتگو اور دیگر مصنفین کے اقتباسات سے سید کاشف رضا نے اپنے قاری کی ذہنی تربیت کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔ اور یہ سب کسی بیزار کن لیکچر کی شکل میں نہیں ہے۔ بلکہ نا صرف ناول کی کہانی کو آگے بڑھانے میں مددگار ہیں۔ بلکہ ناول کی دلچسپی بھی قائم رہتی ہے۔ اور متنازعہ امور کی وضاحت کے لیے مصنف نے بڑی خوبی سے مختلف حوالوں کو استعمال کیا ہے۔ جیسے آفتاب اقبال کے باب میں احمدیوں سے ملک میں سلوک کو واضح کرنے کے لیے سید کاشف رضا نے یہودی فلسفی بروچ اسپائی نوزا کے بارے میں آفتاب کی فکر کو بڑی عمدگی سے بیان کیا ہے۔

''میرے لیے یہ عجیب بات تھی کہ اسپائی نوزا کے خیالات سے اتفاق نہ کرنے کے باوجود میں آج چوتھی مرتبہ ایک ایسی صورتحال سے دوچار تھا، جو اسپائی نوزا کو بھی پیش آ چکی تھی۔ بروچ بطور انسان مجھے بہت پسند تھا لیکن مسئلہ جبر و قدر کے بارے میں اس کا نظریہ یہ تھا کہ تمام تر اختیار خدا کو ہی حاصل ہے۔ جس نے انسان کی تقدیر طے کر دی ہے۔ میرا موقف یہ تھا کہ اگر یہ نظریہ درست ہے تب بھی قابلِ عمل نہیں اور یہ نظریہ انسان سے اس کی زندگی کے غیر متوقع حالات

میں عمل کی طاقت سلب کر لیتا ہے۔ میرے لیے عجیب بات یہ تھی کہ اسپائی نوزا کے نظریات سے متفق نہ ہونے کے باوجود وہ میری زندگی میں بار بار مثال بن کر کیوں آتا ہے۔ سپائی نوزا ایک مظلوم اقلیت سے تعلق رکھتا تھا، لیکن سچائی کی تلاش میں اس نے یہ بات قبول کر لی تھی کہ یہودی ربی اسے اپنے دین سے خارج کر دیں میں بھی اپنے فرقہ کو مظلوم سمجھتا ہوں، لیکن اس کے ساتھ ہی میں اپنے فرقے کی تمام عبادات اور مجالس سے دور رہتا ہوں۔ اسپائی نوزا کے والدین کو اپنے بیٹے پر کوئی فخر نہیں تھا، اور والد کے مرنے کے بعد ان کی جائیداد اسپائی نوزا کی بہن نے ہتھیا نا چاہی تھی۔ اسپائی نوزا نے مقدمہ کیا اور جیتا، اور پھر جائیداد اسی بہن کے حوالے کر دی جس کے خلاف وہ مقدمہ لڑا تھا۔ تنہائی کے بہت برسوں میں ہر مشقت، معاشی جدوجہد نے میری ماں کو اور خود مجھے ایسا غیور بنا دیا تھا کہ ہم ابو کی جائیداد میں سے کسی حصے کے خواہاں نہیں تھے۔ اسپائی نوزا نے اپنے استاد کی بیٹی سے محبت کی تھی اور محبت کرتے وقت یہ بھول گیا تھا کہ لڑکی مسیحی ہے اور وہ خود یہودی۔ حالانکہ یہودی تو صرف اس کا باپ تھا۔ میں بھی سلمٰی سے تعلق کے دوران چاہتا تھا کہ یہ بات بھولا رہوں کہ میں ایک احمدی ماں کا بیٹا تھا۔ آج زندگی کے ایک اہم مرحلے پر مجھے اسپائی نوزا کی یاد آ رہی ہے۔ جب اسپائی نوزا پر روزگار کے تمام دروازے بند کر دیے گئے تھے۔ تو اس نے عد سے چمکانے کا کام شروع کر دیا تھا۔ آج میں اپنے یونیورسٹی کے کیریئر کو خیر باد کہہ چکا ہوں اور مجھے نئے پیشے کا انتخاب کرنا تھا۔ جو میری اولین محبت یعنی تعلیم سے بالکل الگ ہوگا۔ اسی باب میں پاکستان کی تاریخ کے اتفاقات کا مختصر ذکر سب کچھ دہراتے ہوئے مصنف بیان کرتا ہے کہ

''اگر بھٹو گیارہ جنرلیوں کو سپر سیڈ کر کے ضیاالحق کو آرمی چیف نہ بناتا، اگر بھٹو، مجیب الرحمٰن کو وزیر اعظم تسلیم کرنے پر آمادہ ہو جاتا، اگر ایوب خان نے پاکستان میں سیاسی عمل روک کر مارشل لا نہ لگا دیا ہوتا، اگر راولپنڈی کے لیاقت باغ میں لیاقت علی خان کو قتل نہ کر دیا جاتا، اگر جناح قیام پاکستان کے ایک سال بعد ہی انتقال نہ کر گئے ہوتے تو پاکستان کی تاریخ شاید مختلف ہوتی۔ اس قسم کی گفتگو اور پیرا گرافس میں سید کاشف رضا اپنے سیاسی، مذہبی اور معاشرتی خیالات کا بڑی خوبی سے کسی تنازعہ میں پڑے بغیر آشکار کرتے ہیں۔

ناول کا تیسرا باب ارشمیدس کچھوے کے بارے میں ہے۔ جسے ایک کردار کے طور پر پیش کر کے سید کاشف رضا نے کہانی آگے بڑھانے کا کام بڑی خوبصورتی سے لیا ہے۔ اس باب میں بہت سے ان کہی بے حد عمدگی سے بیان کی گئی ہیں۔ کچھوا جاوید کو کیسے ملا، اس کے بارے میں پر اسرار کہانی کچھوے کے گرد ایک غیر مرئی طلسماتی ہالا قائم کر دیتی ہے۔ راوی اور کچھوے کی بحث دلچسپ اور حقیقت کشا ہونے کے ساتھ مصنف کی ذہانت کی بھی آئینہ دار ہے۔ جس نے بہت سے

مشکل مراحل کچھوے اور راوی کے بیان کی صورت میں بڑی آسانی سے طے کر لیے۔ جس کے لیے وہ بھرپور داد کے حقدار ہیں۔ پہلے ہی ناول میں ان کا اعجاز بیان حیران کن ہے۔

ناول کا تیسرا درویش اور چوتھا باب بالا دی ویجی گاٹ ہے۔ بالا، اقبال محمد خان کا ناجائز بیٹا ایک دیہاتی عورت عالم گیر سے تعلقات کا ثمر ہے۔ وہ اپنے دوسرے بہن بھائیوں سے شکل میں مختلف، رنگ میں گورا اور اقبال محمد خان سے مشابہت پر ہمیشہ باپ اور بہن بھائیوں کی نفرت اور غلط رویے کا شکار رہا ہے۔ اس ناروا سلوک کی وجہ سے وہ نفسیاتی مریض بن جاتا ہے۔ اور گاؤں میں قتل کر کے بھاگ جاتا ہے۔ بالا گھر سے بھاگنے کے بعد مذہبی جہادی تنظیم کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ بالا کے کردار کے حوالے سے سید کاشف رضا نے جہادی تنظیموں کے طریقہ کار، کم عمر بچوں کو ورغلانے، خودکش دھماکوں کو فضیلت کا روپ دیکر آمادہ کر کے جنت میں جانے اور وہاں حوروں اور دیگر سامانِ عیش حاصل کرنے کی ترغیب کمال مہارت اور اختصار سے بیان کی ہیں۔ ناول کے مطابق بالا ہی بےنظیر بھٹو کی گاڑی سے باہر خودکش دھماکا کرتا ہے۔ لیکن بےنظیر گاڑی سے باہر سر نکالنے کی وجہ سے شہید ہوتی ہے۔

ناول کا چوتھا درویش اقبال محمد خان پہلے تین درویشوں کا باپ ہے۔ اس کے کردار کی تشکیل اور کہانی کی تعمیر میں یہ باب بھی دلچسپ ترین ہے۔ اقبال کے عورتوں سے تعلق، دو بیوی اور بچوں کی موجودگی میں دیگر خواتین سے روابط ہر بات انتہائی دلچسپ، تہلکہ خیز اور عقدہ کشا ہے۔ ناول کی بےشمار پرتیں اور پہلو ہیں۔ کئی پیرے اتنے دلچسپ ہیں کہ قاری انہیں بار بار پڑھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اور ہر پڑھت پر ایک نیا مفہوم سامنے آتا ہے۔

چھٹا اور آخری باب 'ستائیس دسمبر اور اس کے بعد' میں تمام کڑیوں کو جوڑ کر ناول کے ہر کردار کو منطقی انجام تک پہنچایا گیا ہے۔ بہت کم ناولوں میں اس طرح ہر پہلو کو اختتام پذیر کیا جاتا ہے۔ کوئی بات ادھوری نہیں چھوڑی گئی۔ یہ ناول کی بہت بڑی خوبی ہے کہ صفحہ اول سے آخر تک قاری کی دلچسپی کا تار کہیں ٹوٹنے نہیں پاتا۔ ہر کردار حقیقت سے قریب تر، ہر واقعہ زندگی کے ایک نئے ان کہے روپ کا عقدہ کشا ہے۔ اپنے پہلے ہی ناول میں اس کمال کے بیانیہ اور بےمثال مہارت پر سید کاشف رضا بھرپور مبارکباد اور داد کے مستحق ہیں۔ قارئین کو ان سے آئندہ ناول کے لیے توقعات بہت زیادہ ہوگئی ہیں۔ میری نظر میں ''چار درویش اور ایک کچھوا'' اردو ادب میں جادوئی حقیقت نگاری کی عمدہ مثال پیش کرتا ہے۔ بقول مستنصر حسین تارڑ ایک ناول تو بہت لوگ اچھا لکھ لیتے ہیں۔ کسی مصنف کا اصل امتحان اس کے دوسرے ناول سے ہوتا ہے۔ اور یہ امتحان سید کاشف رضا نے ایک بےمثال ناول لکھ کر مزید مشکل بنا لیا ہے۔

’کچھوؤں کا سپنوں بھرا جیون‘

محمد حنیف		ترجمہ: ابو عمش

ایک مشہور واہمہ ہے، اُسی طرح کے واہموں میں سے ایک جو واٹس ایپ گروپوں میں گردش کرتے رہتے ہیں، کہ مرد کا ہر ساتواں سیکنڈ جنسی سوچ میں گُزرتا ہے۔ سید کاشف رضا اپنے پہلے ناول ’’چار درویش اور ایک کچھوا‘‘ میں اس واہمے کو ٹھکانے لگا کر ایک برمحل سوال اُٹھاتے ہیں: مرد باقی چھ سیکنڈوں میں کیا سوچ رہا ہوتا ہے؟

مرد اُن باقی چھ سیکنڈوں میں بھی وہی کچھ سوچ رہا ہوتا ہے جو وہ ساتویں سیکنڈ میں سوچ رہا تھا؛ تاہم وہ ظاہر یہی کرتا ہے کہ وہ اس بارے میں نہیں سوچ رہا تھا۔

لیجیے یہ ہے کاشف رضا کا ہر دم مُستعد ٹیلی وژن رپورٹر جاوید اقبال! جاوید اقبال ابھی ابھی کراچی میں ایک انتہائی خونیں دھماکا دیکھ کر آیا ہے۔ وہ اب اپنے معمول کی سرگرمیوں میں مصروف ہے، لائیو بیپر دے رہا ہے، ہم کاروں سے باتیں کر رہا ہے، لیکن اسی دوران اُس کے پڑوسی کی اہلیہ سے متعلق خیالات اُسے پھونکے ڈال رہے ہیں۔ جاوید کا خیال یہی ہے کہ یہ خاتون بھی اُس میں دلچسپی لینے لگی ہے۔ ہمارے لیے اس پیشہ ور نوجوان کی ذہنی کیفیات میں جھانکنا ہی کفایت کر جاتا لیکن موصوف تو ایک ہم کار لڑکی پر بھی فریفتہ ہیں۔ جاوید سمجھتا ہے کہ وہ اپنی اس نوجوان، ترقّی کے سپنے سجائے، ساتھی رپورٹر کی محبت میں گرفتار ہو چکا۔ یہ لڑکی بھی اس کے خام سے اشاروں کنایوں کے جواب میں ردّعمل دے رہی ہے لیکن اس کی توجّہ اپنی پیشہ ورانہ ترقّی پر مرکوز ہے۔ جاوید کی نظر سے دیکھا جائے تو یہ لڑکی بھی اُسی طرح کی ایک خاتون ہے جس کی انگیا کی ڈوری پاکستانی مردانگی کو جنسی ضعف کے جھٹکے لگاتی ہے۔

مردوں کی مریضانہ جنسیت کی تباہ کُن تصویر کشی کرتے ہوئے کاشف نے ایک ایسا ناول تحریر کیا ہے جو اپنے دائرہءِ اظہار میں پُرشکوہ ہے اور جدید مردانگی کے سمندر میں عمیق غوّاصی کرتا ہے۔ جاوید کا کنواروں والا اپارٹمنٹ اس کے ذہن کا آئینہ ہے: یہ اپارٹمنٹ ہندی فلموں کی اداکارہ کرینہ کپور کی جیتی جاگتی قدّ آدم تصویروں سے بھرا ہوا ہے۔ اس اپارٹمنٹ میں جاوید کا دماغ ایک ایسا مسلسل رواں مونتاژ دکھائی دیتا ہے جسے بولی ووڈ کے آئٹم نمبروں سے ترتیب دیا گیا ہو۔

صنفِ نازک کو لُبھانا جاوید کی جبلّت ہے اور ضبط کرنا اُس کی عادت۔ وہ سب کچھ حاصل کرنا چاہتا ہے، لیکن وہ کسی سے محبت نہیں کر سکتا۔ ٹی وی نیوز روم اور کراچی کے اطراف وقوع پذیر ایک کرارے سے سیکوئنس میں کاشف رضا اس کردار کو اس کی تمام تر عظیم الشّان بے چارگی کے ساتھ پیش کرتے ہیں اور ہمیں جدید اُردو فکشن کے یادگار ترین کرداروں میں سے ایک کردار عطا کرتے ہیں۔

پانچ حصّوں میں منقسم اس ناول میں کاشف ہمارے سامنے شریروں کی ایک گیلری پیش کرتے ہیں۔ تاہم جو مرد اس ناول کو آباد کرتے ہیں، اُن کے دماغ ہماری سیر کے لیے کوئی خوش گوار مقامات نہیں۔ اس دوران جب جاوید اپنے پڑوسی کی اہلیہ کے ساتھ شہوانی محبت حاصل کرنے اور اپنے لیے ایک بلند پرواز کا وعدہ کرتی شادی کا اہتمام کرنے کے دُہرے مشن پر لگا ہوا ہے، آپ شاید بجا طور پر یہ سوچنے لگیں کہ مرد اس سے بہتر بھی تو ہوں گے۔ تو لیجیے اس کے بھائی آفتاب سے ملیے: ایک اچھا آدمی، فلسفے کا پروفیسر، جس نے اب تک دامن بچا کر زندگی گزاری ہے، کچھ تو اخلاقی وضع داری کے باعث اور کچھ اپنے فطری شرمیلے پن کی وجہ سے۔ لیکن اب وہ ایک باحجاب طالبہ کی جانب ملتفت ہے۔ وہ جب اس باحجاب طالبہ سے موعودہ ملاقات کرے گا تو اس کے چہرے کو پہچانے گا کیسے؟ یہ ناول کے پلاٹ کا ایک نفیس ترین موڑ ہے۔ آفتاب کا تعلّق ایک ایسے اقلیتی گروہ سے ہے جسے اقلیت بھی نہیں سمجھا جاتا اور جب لڑکی کا والد اسے احمدی کہہ کر نکال دیتا ہے تو اُس کا کیریئر ایک دھچکے کے ساتھ رُک جاتا ہے اور وہ پچھتاووں کا بوجھ اُٹھائے خود کو بھاگے بھاگے پھرتا ہوا پاتا ہے۔

اب ذرا ماضی کو آواز دے کر اقبال محمد خاں سے ملیے، ایک چھوٹا موٹا بیوروکریٹ، جس کی آثارِ قدیمہ اور ادب سے دلچسپی بس مبہم سی ہے، لیکن جو ساری زندگی زن باز رہا ہے۔ ایک شادی شدہ خاتون سے اُس کے معاشقے سے بالا نامی بیٹا پیدا ہوتا ہے، جس کے بارے میں سارا گاؤں جانتا ہے کہ وہ ناجائز ہے۔

کاشف اُن چند معاصر لکھاریوں میں سے ہیں جو جدید شہری اور دیہی زندگی کو یک ساں سہولت سے بیان کر سکتے ہیں۔ وہ اردو، پنجابی اور انگریزی کا امتزاج پیش کرتے ہیں جیسے ہم اپنی حقیقی زندگیوں میں ان زبانوں کو اپنی بول چال میں گھُلا ملا ہوا پاتے ہیں۔ یہاں ایک فلاکت زدہ گاؤں کے خاندان کی زندگی کی منظر کشی اتنی ہی تفصیل سے کی گئی ہے جتنی تفصیل سے ایک ٹی وی نیوز روم کی سرگرمیاں دکھائی گئی ہیں۔ لیکن یہ اُن کی دیہی زندگی کا معرکہ ہے جس میں وہ جدید ناولوں کی ستم ظریفانہ منظر نگاری کا شکار ہو جاتے ہیں: گاؤں کی عورت سادہ ہوتی ہے؛ اپنی سوچ میں

بھی سادہ اور اپنی احتیاجات میں بھی سادہ۔ ایک جانب جہاں ''چار درویش اور ایک کچھوا'' کے نسوانی کردار خواہشوں سے بھرے ہیں اور زندگی میں اپنی راہیں تراش رہے ہیں، یہ گاوں ہی کی عورت ہے جو اگرچہ دلیر اور مُنھ پھٹ ہے مگر جو مرد شہری مصنّفین کی فینٹسی کا شکار ہو جاتی ہے اور یہ مصنّفین قاری کو کسی گاوں میں سادہ دیہاتی قسم کا پیار محبت دکھانے لیے چلتے ہیں۔

اس ایک غلط سُر کے سوا کاشف کی نثر بالکل کامل اور قارئین میں برقی رَو دوڑا دینے والی ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ وہ اپنے پہلے ناول تک سال ہا سال کی مشقِ سُخن کے بعد پہنچے ہیں۔ کاشف شاعری کی دو کتابیں لکھ چکے ہیں جنھیں ناقدین میں پذیرائی ملی ہے، انھوں نے زندگی کے رنگوں سے معمور چند سفرنامے بھی تحریر کیے ہیں اور خورخے لوئیس بورخیس اور میلان کنڈیرا جیسے مصنّفین کو اُردو کے قالب میں بھی ڈھال چُکے ہیں۔ کاشف ایک ٹی وی جرنلسٹ ہیں، شاید آپ نے اُنھیں اسکرین پر کبھی نہ دیکھا ہو، تاہم وہ نصف شب کے اُس بلیٹن کو اپنی آواز فراہم کرتے ہیں، جس کی تراش خراش بھی ایک معروف چینل کے لیے وہ خود کرتے ہیں۔ آپ کبھی کبھار اُن کی آواز اہم خبروں میں سُن سکتے ہیں۔ کرکٹ کی کوئی اہم فتح ہو، کوئی وزیر اعظم نکالا جا رہا ہو، اس قسم کی خبریں۔ یہ اُسی نصف شب کے صحافی کی آواز ہے جسے وہ اس ناول میں لے آئے ہیں: واضح، گونج دار، تحکمانہ اور فی الفور سُنائی دینے والی آواز، جسے سُنتے ہی آپ اُٹھ کر بیٹھ جاتے ہیں۔ ناول اپنی متعدّد آوازوں اور بدلتے لہجوں کے ساتھ ایک تیز رفتار اور رواں دواں بلیٹن کی طرح لگتا ہے جس کے ڈرامائی مناظر، جو کہیں کہیں ماورائے حقیقت بھی لگتے ہیں، آپ کو اسکرین سے کسی اور طرف دیکھنے نہیں دیتے۔

مرد اور خاتون مصنّفین کے لکھے ہوئے اُردو ناولوں میں ان ناولوں کے حصّے کے بُرے مرد، ناکام مرد اور عیب دار مرد سب موجود ہیں، لیکن یہ مرد ہمیشہ اپنے مُکتی شبدوں کے ساتھ موجود ہوتے ہیں: وہ مصائب جھیلتے ہیں، قربانیاں دیتے ہیں اور عام طور پر آخر میں مُکتی حاصل کر لیتے ہیں۔ کاشف کے مرد کرداروں نے اپنے لیے جو زہریلے جالے بُن لیے ہیں، کاشف اب انھیں ان جالوں سے آسانی سے نکل جانے دینے کی کسی بھی ترغیب کی مزاحمت کرتے ہیں۔ ناول کے اختتام کے قریب، آفتاب دوبارہ اپنی کالج والی محبت سے مل جاتا ہے اور ایک گوٹھ میں گوشہء عافیت تلاش کر لیتا ہے، لیکن ہم قارئین جانتے ہیں کہ ان کے ممکنہ قاتل اُن کے تعاقب میں ہیں۔

ناول کے پہلے حصّے میں ایک شان دار علامتی مرحلہ آتا ہے جب آفتاب، اپنی محبت گنوا دینے کے بعد، سی ویو کے ساحل پر جاتا ہے، چلتے چلتے سمندر میں داخل ہوتا ہے اور روتے روتے اور اپنی محبت کو اُس کا نام لے کر پُکارتے ہوئے اپنی پتلون اُتار دیتا ہے۔ لیکن اُس نے اپنے آپ

کو جس مصیبت میں گرفتار کر رکھا ہے اس کی سنگینی ہمارے لیے یہ جان کر کم ہو جاتی ہے کہ اسے معلوم ہے کہ قریبی طعام گاہ کی پارکنگ میں کھڑی اُس کی گاڑی پر پریس کلب کا اسٹیکر چسپاں ہے اور پولیس اُسے تنگ نہیں کرے گی۔ کاشف رضا کے مرد، چاہے وہ کسی غم میں گھُل ہی کیوں نہ رہے ہوں، خوب جانتے ہیں کہ اُن کی پُشت محفوظ ہے۔

رہ گئی یہ بات کہ کچھوا اس ناول میں کیا کر رہا ہے؟ تو جناب اب اتنی گنجائش باقی نہیں رہی کہ اس کچھوے کی بھی تعریف و توصیف کی جائے، اس لیے جایئے اور اس حیرت انگیز ناول کا مطالعہ کیجیے۔

''شاہ محمد کا ٹانگہ'' کی کہانیاں

ابوبکر

پچھلے دنوں گاؤں جانا ہوا تو شاہ محمد کا ٹانگہ ساتھ لیا۔ سالم تانگے کا سفر شرفا کی عادات میں شامل رہا ہے۔ تاہم نہ شاہ محمد رہا نہ وہ شرفا رہے۔ زمانہ جتنی تیزی سے گزرنے لگا سفر اتنے ہی طویل ہوتے گئے۔ تانگے ریس سے نکل گئے۔ تو عرض یہ ہے کہ مجھے بھی بس ہی پکڑنا پڑی۔ شاہ محمد کا ٹانگہ علی اکبر ناطق کے افسانوں کی کتاب ہے۔ شرمیلے قارئین اسے شاہ محمد کا تانگہ بھی پڑھ سکتے ہیں۔ یہ مجموعہ پہلے نظر سے نہ گزرا تھا۔ ناطق صاحب کی کچھ شاعری اور قائم دین سے چند افسانے پڑھ رکھے تھے۔ ارادہ کیا کہ افسانوں کی یہ دو کتابیں قدرے تحمل سے دیکھی جائیں۔ چنانچہ ایسا ہی کیا۔ باقی رہ گیا نولکھی کوٹھی ناول، تو اس بابت منصوبہ یہ ہے کہ مرفی ذرا قدنکال لے تب پڑھوں گا۔ ان دنوں فرصتِ حقیقی کا کال پڑا ہے۔

بعض کوتاہ مغز میرے متعلق یہ عجیب چرچا کرتے ہیں کہ میں ناطق کا خدانخواستہ کوئی روایتی یا غیر روایتی مخالف ہوں۔ یہ تاثر قطعی غلط ہے اور میں اس سے بری الذمہ ہوں۔ ناطق ایک مقبول مصنف ہیں اور اس مقبولیت کے ادبی و غیر ادبی پہلوؤں کو سمجھنے کی کوشش کو مخالفت کا نام دینا مناسب نہیں۔ نیز واقف حال قارئین جانتے ہیں کہ میں اپنے موضوعات سے کہیں پیچیدہ لیکن راست تعلق کا قائل رہا ہوں۔

ناطق بطور افسانہ نگار بلیک ہول جیسی شے ہے جس کی شدت قیامت خیز (کہ قاری کو ایک بار تو نگل لے) لیکن پھیلاؤ ناپید۔ آپ ان کے افسانے پڑھیں تو ربع صدی قبل کے دہقانی پنجاب کے رنگ اپنی چمک دمک کی بہار دکھاتے نظر آئیں گے۔ چونکہ میں خود بھی 'گرائیں' ہوں سو ان رنگوں کی لطافت بہتر محسوس کرسکتا ہوں۔ مزید برآں ناطق اپنی اس کوشش میں بھی کامیاب رہا ہے کہ اس نے دیہی ثقافت کو شہری قارئین کے لیے بھی ایک تصویر کی صورت کھینچ دیا ہے جس کے اسٹروک کسی قصہ گو کی مہارت کا نشاں دیتے ہیں۔ شہری قارئین یوں بھی گیلریوں کی جمالیات کے اسیر رہتے ہیں۔ دور دراز دیہاتوں کی ایسی پراسرار پہ جاذب نظر تصویریں انہیں مسحور کر دیتی ہیں۔ ناطق کی ان داستانوی تصویروں میں وحدت بھی ہے اور تسلسل بھی۔ بعض اوقات تو یہ وحدت

متسلسل محسوس ہوتی ہے۔ ایک کے بعد ایک کہانی مابعد تقسیم کے بارڈر پاس بسے دیہاتوں کے درمیان سفر معلوم ہوتی ہے۔ ناطق باری باری ان دیہاتوں اور قصبوں میں رکتا اور قاری کو ایک قصہ سناتا جاتا ہے۔ ناسٹیلجیا ناطق کی تمام کہانیوں (دیہی کہانیاں) کا مزاج ہے۔ ماضی قریب کے پنجابی دیہات، اس کے کردار، اقدار اور ان کے درمیان گزرتے واقعات۔ کہانیوں کی زبان رواں اور سلیس ہے۔ متعدد مقامات پر مقامی الفاظ اور لوک اشعار بھی روانی سے برتے گئے ہیں اور قاری اس دیہی زبان کا زندہ لطف بھی لیتا ہے۔ زبان اور بیان کا ساتھ تمام کہانیوں میں بڑا ہموار ہے۔ بیان قصہ اور کہانی ہے اور زبان سادہ تا کہ قاری محسوس کر سکے کہ داستان گو سامنے بیٹھا یہ کہانیاں سنا رہا ہے۔ واضح رہے کہ بیان جس قدر گہرا ہو گا زبان اتنی ہی پیچدار ہوتی جائے گی اور الفاظ کا کرتب یعنی ورڈ پلے کے تخلیقی امکانات بھی بڑھ جائیں گے۔ اہم بات یہ کہ ان میں سے اکثر کہانیاں گہری نہیں ہیں۔ جیسا کہ عرض کر چکا ہوں کہ میں خود بھی ایک دیہاتی ہوں اور مجھے چوپال، دارے اور بیٹھکوں پر 'گویڑیوں' کے قصوں کا بھی تجربہ ہے پس میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ یہ وہی قصے ہیں جو اردو میں خوبصورتی سے لکھ دیئے گئے ہیں۔ اب چونکہ کچھ اچھی کہانیاں بھی خال خال نظر آتی ہیں سو ناطق کی کہانیاں ایسی ہیں کہ منفرد نظر آئیں۔ لیکن یہ کہانیاں اپنی شدت کے باوجود محدود ہیں جس کی کئی وجوہات ہیں۔

اولین وجہ تو بیشتر کہانیوں میں بین السطور شدید ناسٹیلجیا ہے جس نے کہانی کی بقیہ جہات پر زمانوں کی گرد چڑھا دی ہے۔ پھر اکثر کہانیوں میں یہ ناسٹیلجیا جامد ہے یعنی ماضی قریب کے پنجابی دیہات کی ایک بند کہانی ہے۔ لیکن یہ گاؤں اب بہت بدل گیا ہے اور اس کے موجودہ کردار خود کو نئی اور اجنبی کیفیات میں گھرا پاتے ہیں۔ ان کرداروں کو اقدار کے نئے بحرانوں کا سامنا ہے جو ان کے آباء کے وہم و گمان میں بھی نہ تھے۔ ناطق کی اکثر کہانیاں اس بدلے ہوئے گاؤں اور اس کے باسیوں پر خاموش ہیں۔ جہاں جہاں ان کا ذکر بھی ہوا ہے وہاں بدلاؤ کی کوئی توجیہہ کوئی تصویر موجود نہیں۔ نیز ایسی کہانیوں میں قاری کو ایک جھٹکے میں ہی اڑھائی تین دہائیوں سے گزار کر زمانہ حال میں کھڑا کر دیا جاتا ہے۔ پھر ناسٹیلجیا کے مزاج کے عین مطابق ان کہانیوں میں جدید فرد پر ندامت اور دکھ کا اظہار کیا جاتا ہے۔ یہ وہی جدید فرد ہے جس کا کوئی وکیل نہیں۔ قصہ گو تو اس فرد سے دانستہ طور دور رہتے ہیں۔ قصہ گوئی میں ماضی پرستی ایک تخلیقی اصول ہے لیکن اصل فن قصے کو امروز میں داخل کرنا ہے۔ ایسا کرنا بعض اوقات قصہ گو کی اپنی قربانی مانگتا ہے۔ ایک کہانی 'جیرے کی روانگی' میں یہی صورتحال ہے اور بلاشبہ وہ زبردست کہانی ہے۔ لیکن ناطق خود جیرا نہیں ہے۔ وہ ایسا قصہ گو ہے جو مسلسل کہانی سنانے کی چاہ میں اس قربانی سے گریز کرتا ہے جو

دراصل قصہ گو کو عظیم بناتی ہے۔ ناطق کی کہانیاں گزرے ہوئے پنجاب کی روایتیں ہیں اوران میں سے اکثر آج کے مسائل کو براہ راست موضوع نہیں بناتیں۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ پنجاب کی دیہی ثقافت میں پچھلی دو دہائیوں میں اس قدر شدید اور تیز تبدیلی آئی ہے کہ ابھی پہلی نسل نے صرف یادرفتہ میں آنسو بہانا یا ہنس کر وقت گزارنا سیکھا ہے۔ ناطق اسی نسل کا کہانی گو ہے جس نے ماضی کے آئینے میں ابھی اتنی گہرائی سے نہیں دیکھا کہ اسے اپنی شبیہ اجنبی محسوس ہو۔ ناطق ماضی کی مانوس صورتوں کی محفل ہے جس کے کسی فرد کو یہ معلوم نہیں کہ برخواستی کے بعد واپس جاتے ہوئے اسے تنہائی میں کن سوالوں کا سامنا کرنا ہوگا۔' قائم دین' اسی رنگ کی وہ منفرد کہانی ہے جو کسی قدر مختلف ہے یعنی اس میں ناسٹیلجیا سطحی نہیں ہے اگر چہ محدود ہے۔ دیہی احوال کی کہانیوں کی تعداد زیادہ ہے اوران کہانیوں کا ماحول تقریباً یکساں۔

جدید احوال کی کہانیاں مثلاً نسلیں، سیاہ ٹھپا، حاجی ابراہیم میں اگر چہ کیفیات بدلی ہوئی اور عہد حاضر سے ہیں لیکن مصنف انہیں صرف فریم کرنے کی حد تک قابو کرتا ہے۔ یہ رجحان دراصل ہر دو قسم کی کہانیوں میں ہے۔ بلکہ قائم دین کے دیباچے میں مصنف اقرار کرتا ہے کہ انہوں نے کسی بھی قسم کے نظریے یا فلسفے سے قطع نظر حقیقی زندگی کی چلتی پھرتی تصویر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس تصویر کے جامد یا متحرک ہونے کی بات اوپر ہو چکی ہے۔ یہاں دوسری بات یعنی' تصویر کو فریم کی حد تک' پکڑنے کی کوشش کو دیکھنا ہوگا۔ اس سے مراد یہ ہے کہ جب آپ زندگی کو صرف اس سطح تک دیکھیں جس سے کہانی کی صورت بن جائے۔ ہر مصنف مجبور ہے کہ زندگی کو جہاں نظری سطح پر دیکھے وہیں یہ کہ وہ فلسفہ حیات سے واقف ہوتا کہ انفرادی احوال سے وہ رمز پکڑ سکے جو تمام انسانوں کی ہیومن کنڈیشن سے تعلق رکھتے ہیں۔ ناطق کے ہاں یہ پہلو قریباً مفقود ہے۔ آپ ان کی کہانیاں پڑھ کر نہایت لطف لیں گے اور کسی فلم کی طرح وہ کہانی کچھ دیر آپ کے دماغ میں چلتی تصویروں کی طرح گھومتی رہے گی لیکن اس داستانوی حظ سے قطع نظر یہ کہانیاں آپ کو زندگی کے بنیادی سوالات اور انسانی کیفیات کی پیچیدہ اور متصادم صورتوں تک کم ہی لے جائیں گی۔ میں نے جب یہ تاثر ایک دوست سے بیان کیا تو انہوں نے ایک کمال کا نکتہ بتایا جس سے یہ بات کھل کر واضح ہو جاتی ہے۔ فرمانے لگے آپ ناطق کی دس کہانیوں سے شاید دس اقوال (کوٹیشنز) بھی نشان زد نہ کرسکیں۔ یہ بات نہایت اہم ہے اور زبان و بیان دونوں کے باب میں ایک خاص غربت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ ان کہانیوں کی زبان سلیس اور رواں ہے کیونکہ ان کا موضوع پلین اور متسلسل ہے۔ لیکن ان کہانیوں کی زبان پیچدار اور گہری نہیں ہے کیونکہ بیان کی معنوی پرتیں محدود رہ گئی ہیں جو صرف اسی وقت پنپ سکتی ہیں جب مصنف کا مشاہدہ گہرا ہو اور وہ ایک ہی کیفیت کو کئی

جہات اور احوال میں دیکھ رہا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ آپ عظیم کہانی کاروں کی نثر سے جا بجا ایسے اقوال کشید کر سکتے ہیں جو اپنے آپ میں ایک مکمل معنوی اکائی ہوتے ہیں۔ فلسفہ سے عاری کوئی فکشن عظیم نہیں کہلا سکتا۔

ان کہانیوں میں اس کی وجہ صرف وہی ہے کہ مصنف قصہ گو کی طرح ایک مسلسل کہانی سنا رہا ہے جس کا صرف تاثر باقی رہتا ہے۔

قصہ گوئی کی تکنیک ان کہانیوں کی بنیاد ہے۔ تقریباً تمام کہانیاں اسی رنگ میں ہیں۔ اس سے جہاں تاثر کی منتقلی آسان ہوئی ہے وہاں یہ خرابی پیدا ہوگئی کہ قصہ گو اپنے کرداروں پر غالب آتا محسوس ہوتا ہے۔ اکثر کہانیوں میں کرداروں کی وجودی تشکیل تشنہ رہ گئی ہے کیونکہ کہانی سنانے والا نا صرف جلدی میں ہے بلکہ اس کا مدعا اپنا فن دکھانا زیادہ ہے اور کرداروں کا حال کم۔ چنانچہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ایک ایک کر کے کئی کردار اینٹوں کی طرح باری باری لائے جاتے ہیں تاکہ مکمل دیوار کی تعمیر نظر آسکے۔ اس حالت میں اکثر اینٹیں تغافل کا گلہ کرتی نظر آتی ہیں۔ پھر کرداروں کی رینج نہایت محدود ہے اور ان میں ایک کمی تو پہلی نظر میں سامنے آتی ہے۔ ان کہانیوں میں عورت کا مضبوط اور متشکل کردار کہیں نظر نہیں آتا۔ بعض کہانیوں میں اگر چلمن کے پیچھے سے کوئی عورت دکھائی بھی دیتی ہے تو محض اس معرفت کہ یہ فلاں صاحب کی بیوی، بیٹی یا رکھیل ہے۔ عورت کہیں مرکزی کردار نہیں ہے اور یہ بات حیران کن ہے کیونکہ یہ کہانیاں جس پنجاب سے متعلق ہیں اس کی عورت آج کی پنجابی عورت کے مقابلے میں عملی طور کہیں فعال اور اہم تھی؛ اور دیہی علاقوں میں تو یہ بات اور بھی زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ ناطق کی کہانیاں اسی دیہی ماحول کی کہانیاں ہیں لیکن چونکہ یہ کہانیاں چوپال کی منظّم روایتیں ہیں پس اس کے موضوعات از حد مردانہ رہ گئے ہیں۔ یہاں تک کہ عورت اور مرد کی محبت دکھائی بھی گئی تو دور سے۔ البتہ کئی کہانیوں میں اس کی نسبت ہم جنس پرستی کا بہت بہتر اظہار موجود ہے۔

موضوعات کی یکسانیت، کرداروں کی رینج اور شدت میں کمی، وضاحتی اور سادہ ناسٹیلجیا جو اپنے جمود میں احوال کو متحرک اور بدلتے ہوئی شکل میں نہیں دیکھتا، ان عناصر کی وجہ یہ کہانیاں ایک حد سے آگے نہیں گزر سکتیں۔ اس پر نظری مشاہدہ کی گہرائی و گیرائی سے پہلو تہی اور فلسفہ حیات کے ترک سے ان کہانیوں میں تکنیک کی رنگا نگی اور تخیل کی شدت بھی نہیں ہے۔ احساس کے ایک خاص توارد کا شبہ ہوتا ہے۔

انیس ناگی نے انور سجاد کے افسانوی مجموعے 'چوراہا' پر تاثرات لکھتے ہوئے اس وقت کے افسانوں میں یکسانیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بجا طور پر کہا تھا کہ آج کا افسانہ غزل بن

گیا ہے۔(اب سننے میں آیا ہے کہ ناطق صاحب کی غزلوں کی کتاب بھی آ گئی ہے اور بعض تبصرے جو نظر سے گزرے ان میں یہی مرقوم ہے کہ ان غزلیات میں پنجابی دیہاتی ثقافت کے رنگ، بولیاں وغیرہ وغیرہ نمایاں ہیں۔رہے نام اللہ کا۔)۔

ناگی نے اردو افسانون کے متعلق ایک اور بات یہاں بہت اہم لکھی ہے جس کا تعلق براہ راست اس گفتگو سے ہے؛

''افسانہ نویسوں کے پاس محبت اور جنس کے قصوں کے علاوہ اور کچھ نہیں رہا۔زندگی کے بطن میں جو تغیرات جنم لے رہے ہیں۔ بین الاقوامی انسان کی شبیہ جو رنگ بدل رہی ہے، ان سے اردو کے افسانہ نگار اور نقاد دونوں بے خبر ہیں یا تشخیص کی صلاحیت نہیں رکھتے۔کیونکہ علم سے دونوں کو چڑ ہے اور آ گاہی ان کے لیے گالی ہے۔ان کے نزدیک کہانی کچے جذبات کا اظہار اور یادِ رفتگاں کو قلم بند کرنے کا حسین بہانہ ہے۔لیکن یہ حسین بہانوں کا دور نہیں بلکہ تمام انسانوں کے لیے لمحہ فکریہ ہے۔کیونکہ انسانوں کا مقدر ایک نئے چوراہے پر ہے جہاں وہ ظاہر و باطن کے الجھتے ہوئے گتھم گتھا راستوں اور مختلف نظام ہائے زندگی میں گھرا ہے''

گفتگو طویل ہوئی جاتی ہے۔ناطق کی کہانیوں کے اسی دیہی مرکزی پہلو سے موازنے کے لیے میرے ذہن میں تھا کہ اسد فاطمی کی اسی رنگ کی کہانیوں سے ایک تقابلی جائزہ بھی پیش کیا جاتا۔اسد نے یہ کہانیاں چند سال قبل لالٹین میگزین میں'ریگمال'کے نام سے ایک سلسلے کی شکل میں لکھی تھیں۔دیہی ماحول کی کہانیوں کا یہ سلسلہ شاید مکمل نہ ہوسکا تاہم چار بہترین کہانیاں ایسی ضرور آ گئیں کہ بے دھڑک موازنہ کے لیے رکھ سکوں۔تاہم خوف طوالت سے فی الوقت یہ ممکن نہیں۔

اختر رضا سلیمی کے خواب کی تعبیر

ڈاکٹر فرید حسینی

کارل ساگان نے Blaise Pascal کے حوالے سے لکھا ہے ''مجھے اپنی عظمت خلا میں تلاش نہیں کرنی چاہیے بلکہ اپنی فکر کے تانے بانے میں۔ اگر بہت سی دنیائیں میرے قبضے میں ہوں تب بھی اس میں اضافہ نہیں ہوگا۔ خلا میں تو کائنات مجھے گھیر لے گی اور ایک ایٹم کی طرح نگل جائے گی لیکن اپنی قیم سے میں پوری کائنات کا ادراک کر لیتا ہوں۔'' (۱)

۱۔ کارل ساگان، ترجمہ منصور سعید، کائنات۔ فکشن ہاؤس، لاہور۔ ۱۹۹۶ء۔ ص ۱۵

''جاگے ہیں خواب میں'' اختر رضا سلیمی کا وہ ناول ہے جس میں پوری کائنات کو انسان کے فہم و ادراک کے آئینے میں دکھایا گیا ہے۔ ناول کا عنوان غالب کے شعر سے مستعار ہے۔

ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود
ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

کائنات ہمیشہ سے فلسفیوں اور دانشوروں کے لیے معمہ رہی ہے۔ غیب کیا ہے حاضر کس کو کہتے ہیں۔ خواب اور حقیقت کا کوئی تعلق ہے آپس میں۔ شاہد اور مشہود ایک ہیں یا ان میں دوئی ہے۔ وجود اور عدم میں تفاوت کی نوعیت کیا ہے جیسے سوال انسانی فکر کے بنیادی شرکار چلے آئے ہیں۔ سلیمی صاحب نے ناول کے تقریباً اختتام پر 'برج نارائن چکبست' کا ایک اور شعر درج کر کے گویا خود اس گتھی کو سلجھا دیا ہے۔

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہور ترتیب
موت کیا ہے؟ انھی اجزا کا پریشان ہونا

کہانی میں انسان کی داخلی کیفیت کے توسل سے زندگانی کی حقیقت کو سمجھنے اور سمجھانے کی سعی کی گئی ہے۔ ناول کو آٹھ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ زمان کے ذریعے تین زمانوں کا احاطہ کیا گیا جو بظاہر تو تین نسلوں کے تذکرہ پر مشتمل ہے مگر بدھا کے دور کی بازگشت خواب کا اہم ترین حصہ ہے۔ ناول نگار نے کائنات کی مادی اشیاء کو کرداروں میں ڈھال کر انسانی کرداروں کے ہم پلہ کر دیا ہے۔ چاندنی رات میں وہ چٹانی چبوترے پر کھڑا کچھ سوچ رہا ہے:

''کاندھے پر رکھا کمبل اتار کر اسے درمیان سے دہرا کرتے ہوئے اس نے ایک نظر چٹان پر بنی آڑھی ترچھی لکیروں کو دیکھا، باوجود اس کے کہ آج سہ پہر کو وہ ان کا موازنہ اپنے ہاتھ کی لکیروں سے کر چکا تھا، اس نے اپنے بائیں ہاتھ کی لکیروں کا موازنہ چٹانی لکیروں سے ضروری سمجھا۔''

(اختر رضا سلیمی۔ جاگے ہیں خواب سے۔ رمیل ہاؤس آف پبلی کیشنز، راولپنڈی۔ ۲۰۱۷ء، طبع سوم۔ ص ۱۹)

خدا ان کو پہچاننا ہے تو اپنے آپ کو پہچانو...... خودی ہے سرِ نہاں۔ ہاتھ پر کندہ وہی نوشتہ چٹان بھی ہے۔ ہیری پور سے اسلام آباد آتے ہوئے وہ دریائے ہرو کے پل کے عین وسط میں گاڑی روک کر کوہِ پیر کا اپنی جمالیتا تو وہ پہاڑ ایک دیو قامت بحری جہاز کی طرح آہستہ آہستہ حرکت کرتا ہوا محسوس ہوتا۔ سلیمی صاحب نے یہ منظر دن میں وقوع پذیر دکھایا ہے۔ اس سے قبل اشفاق احمد نے پہاڑوں کی حرکت پذیری کا وقت رات کا اندھیرا بتا رکھا ہے:

''رات کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں کئی کئی گھنٹے پہاڑوں کی سبک خرام موومنٹس کو واچ کیا کرتا حالانکہ نظر کچھ بھی نہیں آتا تھا لیکن پتہ صاف چل جاتا تھا۔''

(اشفاق احمد۔ کھیل تماشا۔ سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور۔ ۲۰۰۱ء۔ ص ۷۸)

پہلے باب میں ایک نظم بھی موجود ہے جس میں دریا کا حوالہ ہے یہاں ''آگ کا دریا'' میں دی گئی ٹی ایس ایلیٹ کی نظم کی طرف فوراً دھیان چلا جاتا ہے مگر ایک فرق کے ساتھ...... وہ دریا تند غصیلا اور ڈبونے والا ہے اور یہ دریا پرسکون، میٹھا اور زندگی دینے والا ہے۔

میں ہرو ہوں
ہزاروں برس سے یونہی اپنی رو میں بہے جا رہا ہوں......
............قسم ہے زمانے کی
میں نے کسی بھی زمانے میں اپنے کنارے پر آباد گاؤں اجاڑے نہیں
سو مرے پانیوں میں لہو نہیں......
سیب و شہتوت و زیتون و انجیر کا ذائقہ ہے
میں گنگا نہ جمنا نہ نیل نہ فرات
ایک گم نام دریا ہرو ہوں ہرو
مقدس صحیفے مرے تذکرے سے تہی ہیں

............داستانوں میں میرا حوالہ نہیں

کہ میں نے کسی سوہنی کو ڈبو یا نہیں

تاریخ کی ستم ظریفی یہ ہے کہ وہ بادشاہوں اور مقتدرہ کا تذکرہ کرتی ہے۔ کسی ستم زدہ، مظلوم اور پسے ہوئے کا بیان اسے زیبا نہیں۔ ادب کا منصب یہی ہے کہ وہ جرنیلوں کے نہیں گمنام بے گناہ سپاہیوں کے مرثیے، نوحے لکھتے۔ دریائے پرو کا موازنہ، نیل وفرات اور گنگا وجمنا سے کرنا ایک تو احساس کمتری سے نکلنے کی نشانی ہے۔ وہ لوگ وہ علاقے وہ اشیاء جن کا تذکرہ صحیفوں اور مقدس کتب میں اور بڑے ادب پاروں میں نہیں کیا، لازم ہے کہ وہ عظمت و رفعت سے بھی نہیں ہوں۔ وہ دریا جن کے کنارے، اہل حق العطش العطش کرتے راہی ملک عدم ہوئے وہی محترم ٹھہرے۔ جو روانی کے لیے دوشیزاؤں کی بلی مانگتے رہے جو محبت کرنے والوں کو کچھ گھڑوں سمیت غرق کرتے رہے کیا انہی کا استحقاق ہے کہ ان کے تذکرے ہوتے رہیں۔ گم نام جو ہیں وہ عالی ظرف بھی ہیں۔ تاریخ نے انہیں اگر بھلایا ہے تو ہم یاد رکھیں گے یہ اس ناول کا پیغام ہے۔

زمان اپنی یونیورسٹی فیلو ماہ نور سے محبت کرتا ہے جو کسی اور سے منسوب ہو چکی مگر وہ ماہ نور کو اپنے ذہن سے مٹا نہ سکا۔ اس لیے کہ محبت مابعد الطبعیاتی چیز ہے۔ محبوب کی یاد کے ساتھ ہی وہ Big Dippor (دب اکبر) کا نظارہ کرتا ہے۔ الدبران (Aldehran) کی طرف دیکھتے ہی وہ اس کا زمین سے فاصلہ ذہن میں لاتا ہے جو پینسٹھ نوری سال ہے۔ آج زمین پر پہنچنے والی الدبران کی کرنیں ۱۹۴۰ء میں وہاں سے روانہ ہوئی ہوں گی اور یہ وہ سال ہے جب دوسری جنگ عظیم زوروں پر تھی۔ ہیروشیما اور ناگاساکی کی تباہی بھی چشم تصور میں ابھر آتی ہے۔ ناول نگار نے یہاں غیر ضروری طوالت علم نجوم وفلکیات کے بارے دی ہے۔ ٹائی ٹینک ۱۹۱۲ء میں حادثے کا شکار ہوا اور رابرٹ سن نے چودہ سال قبل اس کا سکرپٹ لکھ دیا تھا۔ یہ البتہ وہ سوال ہے جو طبیعیات اور مابعد طبیعیات کے سرے آپس میں ملا دیتا ہے۔ سائنس نے ترقی کی آئن سٹائن کے پیروکار بہت آئے مگر نفسیات کا علم آگے نہ بڑھ سکا۔ فرائیڈ اور ژونگ جاپنے جانشینوں کی راہ تک رہے ہیں۔ سائنس اور نفسیات کے بارے میں مباحث جب ناول میں آتے ہیں تو ناول نگار کی مداخلت صاف جھلکتی ہے۔ یہ مباحث کہانی کی روانی میں رکاوٹ ڈالتے ہیں۔

دوسرا باب جس کا عنوان ''خواب کا پس منظر'' ہے راجہ رنجیت سنگھ کے دور کا تذکرہ ہے جس میں امر سنگھ ہزارہ کا گورنر مقرر ہوا۔ نور خان اور عبداللہ خان مسلمانوں کے نمائندہ کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ جو سید احمد بریلوی شہید بالاکوٹ کے بے دام سپاہی ہیں۔ مبادا سید صاحب کی لاش کی بے حرمتی سکھ دستے کریں نور خان ان کا سر کاٹ کر لے گیا اور نامعلوم مقام پر دفن کر دیا۔

اس حصے میں سکھوں کی فوج اوران کے راج کو غاصب اور ظالم دکھایا گیا ہے اور یوں معلوم ہوتا ہے سکھ فوج کے مد مقابل نور خان، عبداللہ خان اور چند اور مجاہدین ہیں جنھوں نے سکھوں کی کمر توڑ کر رکھ دی ہے اور بعد میں آرام سے انگریز نے اپنا راج قائم کر لیا۔ لگتا ہے، یہاں سلیمی صاحب نے فقط نصابی تاریخ سے استفادہ کیا ہے۔ تاریخ ہند گواہ ہے کہ جن دنوں جگت سیٹھ بنگالے میں سراج الدولہ کے خلاف ریشہ دوانیوں میں مصروف تھا اور ملیچھوں کی حکومت کے خاتمے کا نعرہ عروج پر تھا۔ وہی دن ایک اور نعرہ بھی سن رہے تھے ہم اہل کتاب بھائی بھائی ہیں۔ لا دینوں (سکھوں) کے خلاف لڑنا جائز ہے۔

جیمز ایبٹ بہرحال ہزارہ میں ہر دلعزیز تھا اس کا کہنا تھا:

"اس ملک میں میری طاقت کا اندازہ فوج کی تعداد سے نہیں بلکہ لوگوں کے اس اعتماد سے لگایا جائے، جو مجھ پر بطور اپنے ایک خیر خواہ دوست کے رکھتے ہیں۔"

(جاگے ہیں خواب میں۔ص ۲۷)

یہاں ہزارہ کوفہ کی مثال دکھتا ہے جو سپاہ یزید (سکھوں) کے پنجۂ استبداد میں ہے اور پھر سینکڑوں خطوط کے جواب میں مسلم بن عقیل (میجر جیمز ایبٹ) آن پہنچتا ہے۔

ہاں شاید یہ تاریخی سچائی ہے کہ پورے برصغیر میں ایسے ہی ہوا۔ یہاں کی سرزمین کا راجہ چاہے پورس ہو، داہر ہو، رنجیت ہو، ٹیپو ہو، سراج لا دولہ ہو، واجد علی شاہ ہو، وہ نامراد ہیں، نااہل ہیں، ضعیف ہیں............نو آبادیاتی طاقت زندہ باد۔

یہ نرم خو ہیں، دانشمند ہیں، اہل ہیں اور سب سے بڑھ کر مہذب ہیں۔ ایبٹ ۱۸۴۹ء میں ہزارہ میں وارد ہوا اس کا عوام سے برتاؤ مثالی تھا۔ اسی عرصہ میں ہندوستان کے بادشاہ سے ایک معمولی انگریز افسر کا برتاؤ ملاحظہ ہو:

"جب ان (مٹکلف) کے ہاتھ میں پوری طرح سے سب اختیارات آ گئے تو انھوں نے نہایت ناعاقبت اندیشی سے بادشاہ کی عزت واحترام کے خلاف ایسی ایسی ناشائستہ و نازیبا حرکتیں کرنی شروع کیں جو عقل وانسانیت سے بالکل بعید معلوم ہوتی تھیں۔"

(محمد اکرم چغتائی (مرتب)۔۱۸۵۷ء۔ مجموعہ خواجہ حسن نظامی۔ سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور۔۲۰۰۷ء۔ص ۴۸۴)

سکھوں کو شکست فاش دینے کے بعد انگریزوں کے دست پر بیعت کرنے والوں کے

لیے شاید اس کے علاوہ کوئی آپشن بچا نہیں تھا۔ معاہدہ کوڑہ جہان آباد سے قبل ہندوستان میں گروپ بندی، مرہٹہ، مغل، پٹھان، راجپوت یا شیعہ سنی وغیرہ تھی اب اس معاہدہ کے بعد گروپ بندی کی بنیاد انگریزوں کی حمایت یا مخالفت ہوگئی۔

(محمد میاں، سید، مولانا۔ علمائے ہند کا شاندار ماضی۔ مکتبۂ رشیدیہ، کراچی۔ ۱۹۸۶ء۔ ص ۹۱)

صدیوں پرانے درختوں کے کاٹنے پر ہمیں ناول میں ایک کرب سنائی دیتا ہے۔ فطرت کے تناور نمائندہ درخت کی موت کو انسان کی موت سے کم تر ہرگز نہیں جانا:

> ''درخت گرنے کی آواز کی گونج جب بستی میں پہنچی تو میت کے اردگرد بیٹھی خواتین جو بین کر رہی تھیں، یک دم چپ ہوئیں۔ پھر لمحہ بھر کے وقفے کے بعد ایک دوسرے سے لپٹ کر زور زور سے رونے اور چلّانے لگیں۔ جیسے علی احمد کی موت کے دکھ میں انھوں نے بستی کے ایک اور بزرگ کی موت کا دکھ بھی شامل کر لیا ہو۔''

(جاگے ہیں خواب میں۔ ص ۶۰۔ ۵۹)

یہ ہندوستان میں مسلمانوں کے انحطاط کا دور ہے شاید وہ اپنی مجموعی شناخت کی فکر میں تھے۔ ہزارہ میں بیٹھا نور خان ایسے ہی حالات میں گھر چکا ہے۔ سکھوں کی شکست کے بعد وہ نئے فاتح میجر ایبٹ کے سامنے نہ چاہتے ہوئے بھی دوستی کا ہاتھ بڑھا دیتا ہے۔ یہاں عبداللہ حسین کے ناول اداس نسلیں کا ہیرو نعیم اور اس ناول کا نور خان میں مماثلت ہے۔ دونوں آنے والی نسلوں کے لیے شاید انگریزی سامراج کا ساتھ دینے پر مجبور ہیں۔ نور خان دلی طور پر اب بھی کسی اور سے وابستہ ہے:

> ''نور خان بدستور خاموش تھا تاہم ایبٹ نے محسوس کیا کہ خلیفہ سید احمد بریلوی اور بہادر شاہ ظفر کا نام سنتے ہوئے نور خان کے چہرے کے تاثرات میں واضح تبدیلی ہوئی ہے''

(جاگے ہیں خواب میں، ص ۴۷)

خواب کا پیش منظر تیسرے باب کا ٹائٹل ہے۔ ظفر علی خان ناول کے مرکزی کردار زمان کے باپ کا نکڑ دادا ہے۔ زمان اور ظفر علی کے مابین وقت کی دیوار حائل ہے۔ مگر دونوں کے افعال میں اتنی مشابہت ہے کہ ماضی اور حال یکجا دکھائی دیتے ہیں۔

> ''نہ جانے کتنی دیر آبشار کو ٹکٹکی اباندھے دیکھ رہے۔ رفتہ رفتہ انھیں محسوس ہوا جیسے پانی ساکت ہے اور زمین چل رہی ہے۔ پھر انھیں لگا جیسے یہ پتھریلا تھال

فضا میں بلند ہو رہا ہے۔ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ایک طلسمی قالین کی صورت
اڑنے لگا‘‘

(جاگے ہیں خواب میں، ص ۸۰)

ظفر علی خان کو جنون کے دورے پڑنے لگے۔ یہ وہ دور ہے جب وہ چٹانوں پر آڑھی ترچھی لکیریں کھینچتا رہتا ہے۔ اسے آبشار پر ایک پری بھی دکھائی دی۔ جنون کے خاتمے کے لیے معالج کے مشورے سے اس کی شادی صابرہ نامی غریب لڑکی سے کر دی گئی۔ جسے وہ پسند کرتا تھا۔ وہ پری دراصل صابرہ تھی۔ جو ماورا سے حقیقت کے روپ میں ڈھل گئی۔ ناول کے اس حصے میں داستان کے اور زیب داستان زیادہ ہے۔ پہاڑی زندگی کی جذئیات کو ہنر مندی سے بیان کیا گیا ہے۔

باب پنجم میں ہمارا تعارف عرفان احمد سے ہوتا ہے یہ نور آباد کے عام لوگوں کے لیے مشکوک مگر چھوٹے سردار کے سب سے کار آمد شخص ہے۔ سائنس، تاریخ، مذہب، فلسفہ، کیمیا گری، ادب اور نجوم جیسے علوم میں طاق ہے یہی وجہ ہے کہ چھوٹے سردار (زمان) اور اس کا یارانہ ہے۔ غار اس کہانی میں بار بار استعمال ہوا ہے۔ جیسے مستنصر حسین تارڑ کے ناولوں میں مرغابی ایک معمہ ہے۔ بعینہٖ اختر رضا کے ہاں غار ہے۔ عرفان اور چھوٹے سردار میں ایک اور قدر مشترک خواب دیکھنا بھی ہے۔ عجیب طرح کے خواب میں وہ غار کے چبوترے پر گرتا ہے آنکھ کھلنے پر اپنا تقابل اصحاب کہف سے کرتا ہے۔

آگے چل کر زلزلے کی تباہی کا تذکرہ ہے جس نے نور آباد کی بستی کو ملبے کا ڈھیر بنا دیا۔ ۲۰۰۵ء کے اس زلزلے میں زمان جو اکیلا گاؤں میں رہائش پذیر تھا۔ اور زلزلہ والی رات غار کی چھت پر شگاف پڑنے پر وہ اندر گر گیا اور اس کے دماغ میں چوٹیں آئیں۔ اس حصے میں زلزلے سے آنے والی تباہی کے منظر بڑی مہارت سے پیش کیے گئے ہیں۔ زلزلے کے نتیجے میں پیدا ہونے والے ذاتی المیوں کے پس منظر میں معاشرتی دکھوں کا بیان ہوا ہے۔ زمانی تسلسل عنقا ہے۔ خواب اور حقیقت دونوں گڈ مڈ ہیں۔ کہانی میں بیک وقت کئی مناظر ابھرتے ڈوبتے رہتے ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ مونتاژ ہے جس سے کئی جہات اپنا اثبات کرتی ہیں۔ مثلاً زمان بے ہوش ہے مگر اس کی یونیورسٹی میں ادھورے معاشقے سے بھی قاری واقف ہو جاتا ہے۔ ماہ نور جو اس ناول کی ہیروئن بننے کی اہل تھی مگر وہ وفقط زمان کے خیالوں میں زندہ رہی......

شعور کی رو تکنیک سے زمانوں کو جوڑ کر رکھا گیا ہے۔ مصنف کے ہمہ بین بیان اور راوی سے بھی کافی مدد لی گئی ہے۔

فلسفیانہ گتھیوں اور انسانی مسائل کے بیان میں ناول نگار قرۃ العین حیدر سے متاثر معلوم ہوتے ہیں۔ رضی عابدی نے گردش رنگ چمن کے حوالے سے لکھا ہے کہ اس کے موضوع کی نوعیت ابدی اور آفاقی ہے یہاں ایک ایسی دنیا کی کھوج ہے جہاں انسان اور فطرت میں مکمل ہم آہنگی ہو۔

(رضی عابدی۔ تین ناول نگار۔ پولیمر پبلیکیشنز، لاہور۔۱۹۹۴ء۔ص ۴۳)

جاگے ہیں خواب میں ایسی دنیا کو دریافت کر لیا گیا ہے جہاں انسان اور فطرت ہم آغوش ہیں۔ خواب در خواب جو کہ ناول کا پانچواں باب بہت دلچسپ ہے۔ یہاں ناول کے فن کا جادو سر چڑھ کر بولا ہے۔ زمان زلزلے کے جھٹکے کے دوران جب غار کے اندر گرتا ہے تو خیال کرتا ہے۔

"اس نے اپنے تمام حواس، گراؤ کے دوہرے عمل پر مرکوز کر لیے اور اپنی منزل کا انتظار کرنے لگا۔ وہ اس عمل کو ہر حس کے ذریعے محسوس کرنا چاہتا ہے۔ رفتہ رفتہ اسے احساس ہونے لگا کہ گرنے کے اس دوہرے عمل میں سے کوئی ایک اپنے اختتام کے قریب پہنچ چکا ہے۔ اور آہستہ آہستہ ختم ہو رہا ہے لیکن اس بات کی نشاندہی نہیں ہو پا رہی تھی کہ کون سا عمل؟ وجود کے باہر گرنے کا، یا اس کے اندر گرنے کا؟"

(جاگے ہیں خواب میں۔ص ۱۲۹)

یہاں خارج وار باطن کی دنیاؤں کے علیحدہ وجود کا بھی سراغ ملتا ہے۔ خارج جن عوامل سے تشکیل پاتا ہے۔ ان میں بظاہر باطن کا دخل منظر نہیں آتا یا اسے شمار نہیں کیا جاتا۔ اختر رضا نے ہمیں داخلی دنیا سے آشنائی کروا کر کے ماضی سے ہم کلامی کا موقع فراہم کر دیا ہے۔ ماضی لاشعور زندہ ہوتا ہے۔ جس کے لیے باطن میں غوطہ زن ہونا پڑتا ہے۔ گزرا ہوا وقت حال کے ساتھ منسلک کر کے کڑیاں ملائیں تو آنے والا زمانہ اپنی چھب دکھلا دیتا ہے۔

ملبا جب ہٹایا جا رہا تھا تو زمان ایک نیا جنم لے رہا تھا۔

"جونہی وہ کسی کی چھاتی سے چمٹا ہوا باہر نکلا، اس نے دیکھا کہ باہر بارش ہو رہی ہے۔ اس نے چیخنا بند کر دیا اور اس آدمی کی طرف دیکھنے لگا جو اسے چارپائی سے بندھے جھولنے سے نکال کر اپنے سینے سے چمٹائے باہر لایا تھا۔"

(جاگے ہیں خواب میں۔ص ۱۳۷)

اب وہ خیال کی ایک ہی جست میں بالاکوٹ کے مقتل میں پہنچ جاتا ہے جہاں وہ اپنے مرشد کی لاش کو بہ آسانی پہچان لیتا ہے۔ خود کو وقت میں سے گزرتا ہوا دیکھنا چاہتے ہو تو آتم تیاگ کرو۔ تاکہ تم سچ کو پالو۔ زمان کے لیے نور آباد اور ٹیکسا شلہ بھی ایک مکان ہیں اور وہ ہزاروں برس

پیچھے آنند سادھو کا ہم عصر ہے۔ بائیس دن بعد زمان کے گھر والے سمجھتے ہیں کہ اسے ہوش آ گیا ہے تو یہ کھلتا ہے کہ گھر والے ظاہر کی دنیا میں سن ۲۰۰۵ء میں موجود ہیں جبکہ زمان باطن کی صدیوں کو پھلانگ کر کہیں اور ہے:

''مجھے فوراً ان کی غلط فہمی دور کر دینی چاہیے اور انہیں بتا دینا چاہیے کہ مجھے دھر مار اجپکا جا کر مہاراجہ کو فرمان مقدس کے بارے میں بتا تا ہے۔......''

(جاگے ہیں خواب میں۔ص ۱۵۲)

جاگے ہیں خواب میں ہنوز چھٹا باب پہلے یہ ہسپتال سے گھر منتقلی کا قصہ ہے۔ عالم دیوانگی جو شاید اصل میں عالم فرزانگی ہے بھی عجب ہے۔ حسین ابن منصور حلاج کے دوست شبلی (جو کہ دیوانہ تھے) کو چند لوگ ملنے آئے تو شبلی نے ان پر پتھر پھینکے وہ وہیں سے بھاگ گئے کسی نے شبلی کو کہا یہ تو آپ کے دوست تھے آپ نے انہیں پتھر مارے۔ شبلی نے فرمایا یہ کہاں کی دوستی ہے کہ وہ میرے دو چار پتھر ہی نہ سہ سکے۔ زمان نے اسلام کے ہسپتال سے ہزارہ اپنے گاؤں منتقلی تک جو بھی منظر دیکھے اس پر وہ ششدر رتھا۔ ناول نگار نے فنی چابکدستی سے زمان کے ذہن کو صفحہ قرطاس پر منتقل کیا ہے۔ سٹریچر کو چلتے پھرتے سبتر، ایمبولینس کو (جو بغیر جانور کے چلتی ہے) جادوئی گاڑی، بڑی بڑی کشادہ شاہراہیں، بلند عمارتیں، سڑکوں پر لگے کتبے (سائن بورڈ وسنگ میل) خروشتی کی بجائے کسی اجنبی زبان میں لکھے ہوئے وغیرہ زمان نے سوچا یہ اس کا دیس نہیں ہے پھر اچانک اسے یاد آیا کہ اس کا ایک ساتھی مہاراجہ اشوک کا پیغام لے کر جب شاہ انطبوکس والی یونان کی طرف گیا تھا تو اس نے یونان کی حیرت انگیز ترقی کی بات کی تھی ضرور یہ یونان ہے۔ زمان اپنے بھائی فرمان کو بتا تا ہے کہ میں نے ساتواں فرمان مقدس چٹان پر کندہ کروایا تھا اور مہاراجہ کو میں نے رپورٹ پیش کرنی ہے۔ کہانی میں کچھ کمزوریاں بھی ہیں۔ اردو زبان میں مادری کے الفاظ استعمال کرنے کی بدعت بانو اور اشفاق صاحب نے کی۔ اس میں برائی بھی نہیں۔ بدعت حسنہ سمجھ کر ہضم کیا جا سکتا ہے۔ مگر جہاں اردو زبان کا لفظ موجود ہے وہاں دوسری زبان کا لفظ برتنا تھوڑی زیادتی ہے۔ سلیمی صاحب نے بھی مادری زبان کے کئی الفاظ ناول میں برتے ہیں۔ زمان نے جب چٹان پر کندہ آڑھی ترچھی لکیروں کی طرف اشارہ کیا تو اس کے لیے ماہر آثار قدیمہ کو بلانے کا فیصلہ ہوا۔ مگر ماہر سے قبل ہی زمان کا بھائی فرمان یہ نتیجہ اخذ کر لیتا ہے کہ ہر کوئی اجنبی زبان ہے۔ آڑھی لکیروں کو اگر ماہر آثار قدیمہ تک لکیریں ہی بتایا جاتا تو زیادہ موزوں تھا۔ آگے چل کر ڈاکٹر کلیم ماہر آثار قدیمہ اور ڈاکٹر مسیح الدین فاروقی ماہر نفسیات اپنی انٹری دیتے ہیں۔ ڈاکٹر کلیم نے اس عبارت کو مہاراجہ اشوک کا فرمان قرار دیا جو ساتویں صدی عیسویں تک رائج رہا پھر دیوناگری رسم الخط سے

بدل دیا گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنا مضمون بھی چھپوا دیا جس میں چٹان پر کندہ عبارت کا سہرا انہوں نے اکیلے اپنے سر باندھ لیا۔ یہ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے جو ادبی سرقہ کے نام سے مشہور ہے۔

ڈاکٹر فاروقی نے نفسیات کی رو سے زمان کی تشخیص یوں کی:

> ''وہ کومے میں گیا تو اس کا لاشعور جاگ گیا اور اس نے ایک طویل خواب دیکھا ہے گویا عام سی بات ہے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ اب یہی خواب اس کا ماضی ہے۔ ہمارے نقطۂ نظر سے وہ بے ہوش ہو گیا تھا اور اب بظاہر ہوش میں آ گیا ہے۔ لیکن اس کے نقطۂ نظر سے ایسا نہیں...... جو خواب میں دیکھا وہ اس کے لیے مانوس اور جانا پہچانا ہے لیکن اب جو کچھ کھلی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے وہ اس کے لیے بالکل اجنبی ہے۔''

(جاگے ہیں خواب میں۔ص ۱۸۵)

ماضی اپنے آپ کو دہراتا بھی ہے۔ اور اپنا تسلسل حال سے ٹوٹنے نہیں دیتا۔ ظفر علی خان جو زمان کے اجداد میں سے تھا اور زمان میں حیرت انگیز مماثلتیں بھی تلاش کی گئیں۔ غار کے چبوترے پر بیٹھنا، دیوانگی، خوابوں میں حسین لڑکی، زلزلہ کے دوران میں ملبے تلے دب جانا، معجزانہ طور پر بچ جانا وغیرہ۔ یہ سب ظاہر کرتا ہے کہ ماضی اور حال میں کوئی سمبھند ضرور ہے۔

ساتویں باب کے آغاز میں زمان کی یادداشت کی واپسی کا ذکر ہے اس باب کا عنوان ''خواب اور حقیقت کے درمیان'' ہے۔ اس نے گھر میں لیٹے لیٹے اندازہ لگایا کہ وہ رات کو غار پر برف اور چاندنی کے ملاپ سے جنم لینے والے طلسمی منظر کا نظارہ کرنے گیا تھا۔ یہ تلازمہ کہف کے اصحاب سے مماثل ہے۔ صدیوں سونے والے سمجھ رہے ہیں کہ وہ چند گھنٹے کی نیند پوری کر کے اٹھے ہیں۔

اب ڈاکٹر مسیح الدین کا قبل از مسیح کے اشرافیہ اسٹائل کا لباس، ٹیکسا شلہ، فرمان مقدس سب زمان کے لیے عجیب اور نامانوس ہو گئے۔ یا اس نے کوئی نیا خواب دیکھنا ہے اور ابھی تک اس سے باہر نہیں آیا۔ یہ ڈاکٹر کی رائے تھی۔ اچانک زمان کو بخار نے آ لیا اور وہ ہسپتال میں پہنچا دیا گیا۔ یہاں وہ نیم بے ہوشی کے عالم میں رہنے کے بعد کچھ یاد کرنے کی کوشش کرتا ہے تو زلزلے والی رات کا پورا واقعہ اس کے تصور میں گھوم جاتا ہے:

> ''اس پر ایک خوابیدگی سی طاری تھی۔ اس کی یادداشت لکھوں ٹکڑوں میں بٹ گئی تھی، جیسے کسی چٹان کو دھماکوں سے اڑا کر ذروں میں تحلیل کر دیا گیا ہو اور

سوائے گاڑھی دھول کے کچھ بھی سجھائی نہ دے رہا ہو۔''

(جاگے ہیں خواب میں۔ص ۱۹۸)

کچھ دیر وہ خوف اور تذبذب کی فضا میں رہا۔اسے اپنے عزیز و اقارب اور ہسپتال کا عملہ سائے دکھائی دیتے۔مگر پھر جلد خواب اور حقیقت اس کے ایک ہو گئے۔دونوں کے درمیان تمیز کرنا اس کے لیے مشکل ہو گیا۔

اسی باب کے آخری صفحات پر ہمیں اب حال اور مستقبل کے درمیان تعلق کا پتہ چلتا ہے۔چٹان پر خون میں تر ایک ہیولا تڑپ رہا ہے۔یہ خواب تھا اور تعبیر اکبر خان کی موت...... جو گھوڑے سے گر کر عین اسی چٹان پر بے حس و حرکت پڑا تھا جو زمان پہلے ہی ملاحظہ کر چکا تھا۔

جاگے ہیں خواب میں آخری باب کا عنوان ہے یہ ٹریجڈی سے بھرپور ہے۔ماضی کا مسافر اب راہی ملک عدم ہونے والا ہے۔مگر وہ کوئی پیغام دے کر جا رہا ہے:

''عدم اور وجود کے درمیان کوئی منطقی پل موجود نہ سہی۔مگر عدم بھی ایسا ہی ممکن ہے، جیسا وجود۔شاید عدم زیادہ ممکن الوجود ہے۔موجود نہ ہونا، موجود ہونے سے زیادہ قرین قیاس اور قابل فہم ہے......موت اور زندگی دونوں ایک ساتھ عدم سے وجود میں آتے ہیں۔''

(جاگے ہیں خواب میں۔ص ۲۲۳)

اپنی بیوی ماہ نور کی فوت کو بھی وہ پہلے محسوس کر لیتا ہے۔زمان کی زندگی کے آخری دنوں میں ایک کتّا بھی ناول میں در آیا ہے۔اپنی محبوبہ، اور اپنی ماں سمیت کئی اقرباء کی موت کو وقت سے پہلے جان لینا یہ سب کیا ہے؟ کیا میرا ان کو مرتے دیکھنا ان کی موت کی علت ہے؟ یا اس کے پیچھے محدود انسانی فہم ہے؟ آنے والے وقت کی آہٹ کو جانور بھی محسوس کر لیتے ہیں۔جانور انسانوں سے زیادہ حساس ہوتے ہیں۔زمان کا ڈبو (کتا) بھی ایک پیشین گوئی کرتا ہے:

''اگلے ہی لمحے اسے یاد آیا کہ پچھلے ماہ جب وہ نصف رات غار سے اتر کر ڈبو کے ساتھ گھر کی طرف جا رہا تھا تو راستے میں ڈبو یکدم رک گیا تھا۔پہلے وہ بھاگتا ہوا بائیں سمت والی چٹان کی طرف گیا اور کافی دیر بھٹکتا رہا، پھر اس نے اچانک بھونکنا بند کر دیا اور واپس اس کے پاس آ کر اس کی ٹانگوں میں گھس گیا تھا۔''

(جاگے ہیں خواب میں۔ص ۲۲۸)

ناول میں کہیں بھی غصہ، جھنجھلاہٹ اور ہیجان کا اظہار نہیں ہوا۔جذباتیت کے مظاہر

جہاں بھی آئے ان میں توازن اور آہنگ ہے۔ روشنی اور اندھیرا کی تراکیب کے ساتھ ناگاسا کی اور ہیروشیما کا ذکر بھی کئی بار آیا ہے۔ یہاں بالواسطہ وہ استعماری اور استحصالی قوتوں کو اندھیروں اور پسے ہوئے مظلوم طبقات کو روشنی سے تشبیہ دیتے ہین۔

آخری حصہ میں زمان اور اس کی ماں کی تجہیز و تکفین کا ذکر ہے یہاں قاری عجب جذبہ ترحم اور رنجیدگی سے دوچار ہو جاتا ہے۔ مگر حیرت انگیز طور پر زمان خود اس صورت حال سے خوف زدہ نہیں ہوتا۔ روح اور بدن کا تعلق ٹوٹنے پر وہ خوشی کا اظہار کرتا ہے۔ گو یہ زمان کی طبعی موت ہے مگر یہاں وہ منصور کا ہم شرب دکھائی دیتا ہے جس نے کہا تھا

ترجمہ: اسے میرے دوستو مجھے قتل کر دو کہ میری موت ہی میری زندگی ہے۔(۷)

وزیر آغا نے سدھارتھ کے بارے لکھا ہے۔ وہ اپنی ذات میں سمٹا تو اس نے اپنے شعوری نظام کو ریزہ ریزہ کر دیا۔ مکمل نراج کی اس حالت میں وہ کیفیت طلوع ہوئی جو سراسر روشنی، خیر اور صداقت تھی۔(۸)

(وزیر آغا، ڈاکٹر۔ تخلیقی عمل۔ مکتبۂ عالیہ، لاہور۔ طبع سوم۔ ۱۹۸۳ء۔ ص ۱۸۹)

زمان بھی شعور کی وادی سے نکل کر لاشعور کی تعلیم میں داخل ہوتا ہے تو صداقت اور روشنی تک رسائی ممکن بنا لیتا ہے۔ سلیمی صاحب نے ناول کی تخلیق میں بھی نراج سے مدد لی ہے۔ ناول کے مرکزی کردار کی داخلیت کو Explore کرنے میں ناول نگار کا داخلی کرب نمایاں ہے۔

کہانی میں بالاکوٹ اور ٹیکسلا سے بیک وقت قلبی لگاؤ اچھنبا معلوم ہوتا ہے کیوں کہ واقعتاً دونوں الگ الگ سکولز آف تھاٹ کے نمائندہ ہیں۔ مگر بنیادی طور پر ایک اچھوتا اور منفرد موضوع ہے۔ جس میں خواب اور حقیقت، عدم اور وجود، موت اور زندگی، جنون اور خردمندی، خلا و مکان اور ماضی حال و مستقبل زیر بحث آئے ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ نے اس ناول کے بارے میں کہا ہے کہ ہمیں اس کی آمد پر کھڑے ہو کر اس کا استقبال کرنا چاہیے۔ ہم نے کھڑے ہو کر دایاں ہاتھ دل پر رکھ کر جھک کر اس ناول کو خوش آمدید کیا ہے۔

ہم نے تو دل جلا کے سرِ عام رکھ دیا

(آصف فرخی کی کتاب ''چراغ شب افسانہ'')

ڈاکٹر فرید حسینی

آصف فرخی کی ادبی قد وقامت سے زمانہ آگاہ ہے۔ ان کی انتظار حسین کے فن پر چھپنے والی کتاب ''چراغ شب افسانہ'' ۲۰۱۶ء کے اوائل میں منظر عام پر آئی۔ قریباً پانچ سو صفحات کی اس کتاب میں انتظار حسین کی تمام فنی جہات کا احاطہ کیا گیا ہے۔ ناولوں، افسانوں، تراجم، تذکروں، سفرناموں، ڈراموں، تنقیدی مضامین، کالم نگاری (صحافت) کا نہ صرف باریک بینی اور ژرف نگاہی سے جائزہ لیا ہے بلکہ انتظار حسین سے ذاتی تعلق کی بنیاد پر ایسے گوشے بھی زیر بحث لائے ہیں جو کسی بھی اور ناقد کے لیے شاید آسان نہ ہوتا۔ جامع الکمالات ادیب کے فن کی تفہیم و تفسیر کے لیے جو وسیع مطالعہ اور تہذیبی شعور درکار ہے وہ کم وبیش تیس (۳۰) ابواب (حصوں) میں منقسم مذکورہ بالا کتاب میں جا بجا اپنا اثبات کرتا دکھائی دیتا ہے۔ آصف صاحب نے افسانہ نگاری کو انتظار حسین کی طاقتور جہت قرار دیا ہے۔ ہاں مگر دوسری اصناف کم اہم اس لیے نہیں کہ انتظار حسین کی کلی تفہیم ان کے پورے جہانِ فن سے ہی ممکن ہے۔ اولین حصہ، انتظار حسین کا زندگی نامہ سے چھتیس (۳۶) صفحات پر مشتمل ہے جس میں پیدائش سے تا دم مرگ ان کا احوال اختصار کے ساتھ یوں دیا ہے کہ مکمل سوانح کا گمان گزرتا ہے۔ کتاب کے سرنامہ پر مارسل پروست کے ناول اور انتظار حسین کے افسانہ انجن ہاری سے اقتباسات درج ہیں۔ انجن ہاری جس نفاست احتیاط اور صبر سے گندھی ہوئی گیلی مٹی سے گھر بناتی ہے۔ افسانہ کی تکنیک بھی وہی ہے۔ چراغ شب افسانہ کے مصنف نے بھی دھیرج سے ایک ایک فقرے اور ایک ایک لفظ کو سوچ بچار کے بعد صفحہ قرطاس پر منتقل کیا ہے۔ افسانہ نگاری کی پیغمبر (بقول انتظار حسین) انجن ہاری سے گویا فرخی صاحب نے بھی فیض پا لیا۔ انتظار حسین طبعاً خاموش اور خود نمائی سے دور بھاگنے والے تھے۔ ان کی تحریریں مگر زیریں سطح پر تلاطم سے بھرپور ہیں۔ ڈاکٹر فرخی کو یہ سہولت میسر رہی کہ وہ انتظار حسین صاحب سے ذاتی اور نجی تعلق رکھتے تھے جس کی بنیاد پر مشکل مقامات سے بھی وہ آسانی سے نبٹ لیے۔ بزم

فسانہ گویاں اس کتاب کا دوسرا باب ہے جس میں انتظار حسین کے معاصرین اور پیش رو فکشن نگاروں کے بارے میں میں رائے توجہ کی مستحق ہے۔منشی پریم سے لے کر زاہدہ حنا تک کی افسانے کی تاریخ پر انتظار حسین کی عدم دلچسپی درون خانہ ان کی خود پسندی پر دلالت کرتی ہے۔افسانہ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۶۷ء کے عنوان سے باندھے گئے باب میں گلی کوچے، کنکری، آخری آدمی اور ناولٹ دن اور داستان پر مؤثر انداز میں خامہ فرسائی کی گئی ہے۔صاحب کتاب نے انتظار حسین کو نہ صرف صاحب اسلوب بلکہ رجحان ساز افسانہ نگار قرار دیا ہے جو صائب رائے ہے۔افسانے ۱۹۶۷ء سے تا حال چوتھا باب ہے۔جس میں شہر افسوس، کچھوے اور خیمے سے دور پر تبصرہ ہے۔ اپنے پہلے افسانے سے مجموعہ کچھوے کی اشاعت تک بقول فرخی انتظار حسین کا فن مسلسل آگے بڑھتا رہا ہے۔مزید کی جستجو نے کئی نئے امکانات روشن کیے۔اس میں شامل افسانے پہلے سے موجود فنی اسالیب کو آگے بڑھاتے ہیں۔

اس ٹھہراؤ کو زوال نہیں بلکہ فنی پختگی کہا گیا ہے۔انتظار حسین کی شخصیت اور ان کا مافی الضمیر کہانیوں کے توسل سے ہی بیان ہوا ہے اور اکثر روایتی ناقدین ان کی یک رخی تفہیم کرتے آئے ہیں۔سجاد باقر رضوی اور شمیم حنفی کے بعد اگر حقیقی معنی میں کوئی تنقید نگار انتظار حسین کو سمجھنے میں کامیاب ہوا ہے تو وہ آصف فرخی ہیں۔کہانی میں بیانیہ، اسلوب، تکنیک اور علامتی پیرائے کے علاوہ کرداروں کے نفسیاتی تجزیہ سے بھی پرت در پرت ہٹا کر انتظار شناسی کا ثبوت دیا گیا ہے۔ افسانے: حاضر، موجود اور حال میں مجموعہ خالی پنجرہ اور شہرزاد کے نام میں شامل افسانے زیر بحث ہیں۔دوران نقد مصنف جہاں ایک طرف غیر جانبدار رہے اور کسی تعصب اور ذاتی پسند و ناپسند کو قریب نہیں پھٹکنے دیا وہیں وہ کسی بھی مقام پر جذباتیت کا شکار نہیں ہوئے۔انتظار حسین کی خامیاں اور کمزوریاں (فنی اور شخصی) بھی گرفت میں لائی گئی ہیں:

> ''ان کی نثر طلسم ہوشربا کے اسلوب کی بازیابی کی ایک کوشش ہے لیکن پوری طرح کامیاب نہیں۔داستان کی اس بازگوئی سے ایک Episode سے زیادہ اور کیا ہاتھ آیا ہے؟...... مجھے حیرت ہوتی ہے کہ اردو فکشن کا کیا حشر ہوتا اگر انتظار حسین س طرح کی کہانیاں رقم کرتے رہتے۔اس سوال کے جواب کا خطرہ مول لینا آسان نہیں۔''(۱)

انتظار حسین کی خود پسندی یا مردم بیزاری کے اشارے میں بھی موجود ہیں۔قصہ گو کی واپسی والے باب میں انتظار حسین کے مجموعہ ''نئی پرانی کہانیوں'' کو موضوع سخن بنایا گیا ہے۔گو اپنے پورے فنی کیریئر میں وہ قدیم قصہ کہانیوں سے مواد اخذ کرتے رہے ہیں مگر اب کی بار براہ راست ان قدیم کتھاؤں کو اپنے اسلوب میں Re-cast کیا ہے۔ڈاکٹر فرخی کے بقول یہ قصے

کہانیاں افسانوں میں ڈھلنے کی بجائے اپنی اصلی حالت برقرار رکھتی ہیں اور لگتا ہے کہ جیسے افسانہ نگار کی مسند پر قصہ گو آن کر بیٹھ گیا ہو۔ کہانیوں کی سماعی روایت زندہ رہتی تو یقیناً انتظار حسین قلم کار نہیں قصہ گو ہوتے۔ تخیلاتی محرک، انسپائریشن کے ذرائع اور روایت سے استفادے کو فرخی صاحب نے سرقہ، نقالی اور تکرار کہنا نامناسب خیال کیا ہے۔ اصل بات یہ دیکھنا ہے کہ کہی ہوئی بات یا لکھی گئی کہانی محض جگالی ہے یا طبع زاد اثرات کی حامل۔ ڈرتا ہوں آئینے سے نامی باب میں انتظار حسین کے افسانوں کا ان کی اپنی نظر میں جو مقام ہے اس پر خامہ فرسائی کی گئی ہے۔ انتظار حسین نے اپنے فن کے بارے میں جو درجن بھر تنقیدی مضامین تحریر کیے وہ یقیناً ان کی فنی تفہیم و تفسیر میں مددگار ہو سکتے ہیں اور ہیں۔ آصف فرخی نے انہیں ڈاٹس کی مدد سے کئی جگہوں پر تصویر مکمل کیا ہے۔ مثلاً ''انیس، نظیر'' اور ''محمد حسین آزاد'' یہ چند ہستیاں میرا راستہ روکتی ہیں، یہ کہنا ہے انتظار حسین کا۔ توجیح یوں کرتے ہیں کہ ''آب حیات''، واقعی مجھے کبھی کبھی یوں لگتا ہے کہ اردو میں پہلا ناول آزاد نے لکھا تھا اور دوسرا ناول میں لکھوں گا۔ فرخی صاحب جیسے اہل نظر ہی سے یہ توقع تھی کہ وہ شے کی حقیقت کو سمجھتے۔ اور انھوں نے سمجھا اور لکھا:

> ''آزاد کے حوالے سے یہ نقطۂ نظر دلچسپ ہے۔ اگر آزاد نے واقعی اردو کا پہلا ناول لکھا تو پھر اس کے تسلسل میں دوسرا ناول شمس الرحمٰن فاروقی نے ''کئی چاند تھے سرِ آسمان'' لکھا۔''(۲)

آزاد کا انداز ملاحظہ ہو: نرگسی آنکھیں، دراز پلکیں، جٹی بھنویں، پگھلے ہوئے سونے کا سا رنگ بیضوی چہرہ، یاقوتی لب، ساون کی گھٹاؤں کی مانند کالے لانبے بال، بوٹا قد، مائل بہ گداز دلاویز جسم، سفید کالی کنی کی سوتی باریک ساڑھی بے پرواہی سے لپیٹے، مشرقی حیا آمیز اداؤں کا قافلہ اپنے جلو میں لیے، میں نے اس حور کو دیکھا ہے۔ محمد حسین آزاد نے جو تصویر مرزا داغ دہلوی کی والدہ کی الفاظ میں کھینچی اس کی تکمیل فاروقی صاحب کا مذکورہ ناول ہے۔ ''شکل کرے آئینہ خانہ پرواز''، چراغ شب افسانہ کا آٹھواں باب ہے۔ جس میں ناقدین انتظار حسین کی انتقادیات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ دوسرے ہی جملے میں فرخی صاحب نے قرار دیا کہ انتظار حسین کے افسانوں کا شاید سب سے عمدہ مطالعہ انتظار حسین کے افسانے ہی پیش کرتے ہیں۔ حسن عسکری، مظفر علی سید، ممتاز شیریں، سہیل احمد خان، شمیم حنفی، گوپی چند نارنگ، شمس الرحمٰن فاروقی، وارث علوی، فتح محمد ملک، سراج منیر، تحسین فراقی، مسعود اشعر جیسے ثقہ نقادوں کے تجزیے تبصرے اور تنقیدی آراء کو سلیقے سے غیر جانبداری سے پیش کر دیا گیا ہے۔ ڈاکٹر فرخی صاحب کی رائے میں انتظار حسین اپنے نقادوں کے لیے بھاری پتھر کی طرح رہے ہیں۔ عمومی اردو تنقید کے حوالے سے ان کا خیال ہے کہ ہمارے

نقاد ایسے ہنر مند افسانہ نگاروں سے محرک حاصل کر سکے اور نہ وابستگی و پیوستگی کا کوئی Sustained موقع۔ اگلے حصے میں ناول کے ناقدین زیر بحث ہیں ان کے چار ناول چاند گہن، بستی، تذکرہ، آگے سمندر ہے اور ناولٹ دن اور داستان پر گفتگو ہوئی ہے۔

ناولوں پر سلیم الرحمٰن، عمر میمن، مظفر علی سید، محمد خالد اختر، سراج منیر، وزیر آغا، شمیم حنفی، ممتاز احمد خان، اسلوب انصاری، مسعود اشعر جیسے نقادوں کی رائے کی روشنی میں انتظار کے فنی ما فی الضمیر کو کھنگالا ہے۔ واقعہ در افسانہ کے باب میں انتظار حسین کی انفرادیت کو ان کی کہانیوں خصوصاً چاند گہن کے حوالے اجاگر کیا گیا ہے۔ تقسیم اور آزادی کا موضوع اس دور کے لکھنے والوں کے لیے ایک موٹف بنا۔ آصف صاحب نے تقسیم کو ادب کے لیے مرکزی اور تعین کنندہ واقعہ قرار دیا ہے جس پر تقریباً سبھی قلمکاروں نے قلم اٹھایا مگر اس پر انتظار حسین کے ہاں اس کا براہ راست واقعاتی بیان برائے نام ہے۔ یہ رویہ فقط تقسیم کے حوالے سے نہیں بلکہ ہر موضوع کو انہوں نے ایسے ہی ٹریٹ کیا ہے۔ آگے چل تہذیبی ریخت مہاجرت اور نوزائیدہ مملکت کے دیگر سماجی وسیاسی مسائل جو انتظار کے فن پاروں کے موضوعات رہے ان کا تجزیہ بھی موجود ہے۔ آصف صاحب نے انتظار حسین کو ہجرت کا افسانہ نگار (مقبول عام تصور میں اور یار لوگوں کی کم فہمی کی بنا پر جیسا سمجھا گیا) ماننے سے انکار کیا ہے۔ بن لکھی رزمیہ جیسے افسانے کو ان کی فنکاری کی دلیل مانا گیا ہے۔ ہجرت کے واقعے کو انتظار حسین ہمیشہ تجربہ قرار دیتے رہے اور اس تجربے کو وہ تخلیقی سطح پر افسانے کے روپ میں ڈھالتے رہے۔ ڈاکٹر فرخی کی رائے میں انتظار کے دل کا معاملہ ان کے غیر افسانوی تحریریں کھولتی ہیں نہ کہ افسانوی۔ صاحب کتاب نے انتظار حسین کے مسلک کے عین مطابق یہ تفسیر کی ہے کہ یہ ہجرت طبعی سے زیادہ ذہنی تھی۔ انتظار حسین کے ایک مضمون ''ہمارے عہد کا ادب'' کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''اس مضمون میں بیسویں صدی کے اردو ادب کا حال پڑھ کر مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے گویا وہ سب انتظار کے تخیل میں موجود ہے، محض ادبی تاریخ نہیں کوئی نیا طلسم ہوشربا ہے جسے اس حکیم نے کمال ذہانت سے باندھ دیا ہے۔'' (۳)

افسانہ نگار پر جو ناسٹلجیا کی تہمت لگی اس پر آصف فرخی نے رائے دی کہ نوسٹلجیا کوئی اکہرا عذر یا الزام نہیں بلکہ انتظار حسین کے جہان فن میں پیچیدہ اور تہہ دار معنویت رکھتا ہے۔ آگے چل کر چاند گہن کے عنوان سے باب ہے۔ ناول کو سمجھنے کے لیے تین بڑے کرداروں بوجی (ماں)، سبطین اور فیاض کا انتخاب کیا گیا ہے۔ اوّل الذکر کردار تو ہم پرست اور روایتی مشرقی ذہن ہے جبکہ مؤخر الذکر دونوں دانشور ہیں۔ توہم اور جدت، کے ان نمائندہ کرداروں کے ذریعے ہی ناول کو سمجھنے کی سعی کی گئی

ہے۔

انھوں نے ناول لکھنے کی طرح پڑھنے کے لیے بھی مہارت کو ضروری قرار دیا ہے۔ آصف صاحب نے روایتی تحسین وتردید کی بجائے ناولوں کے پرپیچ اور پیچیدہ Aspects کو سامنے لانے کی سعی کی ہے۔ انتظار حسین کے افسانوں اور ناولوں پر جو عمومی اعتراض اٹھایا جاتا رہا ہے، وہ ہجرت کے تجربے اور ناستلجیا سے باہر نہ نکلنے کا ہے۔ اس معاملے میں صاحب چراغ شب افسانہ نے کھل کر انتظار حسین کا دفاع کیا ہے۔ ان کا استدلال ہے کہ تجربے کے دائرے کو توڑنا اس وقت ممکن ہوتا ہے جب لکھنے والے کے لیے تمام امکانات ختم ہو چکے ہوں اور ہم ان کو پوری طرح گرفت میں لا چکے ہوں۔ جبکہ انتظار حسین نے تو کہہ رکھا ہے کہ تجربہ جھپٹ پراُگی وہ گھاس جوان کے نزدیک سبز پنکھا ہے۔ سبز پنکھیا کو بہت پکڑنے کی کوشش کی مگر وہ ہاتھ نہ آئی۔ جستجو کیا ہے۔ اجمل اعظم جو کہ بالترتیب سوانح اور دلی کی تاریخ اپنے اندر سموئے ہوئے ہیں۔ انتظار حسین کی یہ کتابیں بھی ناولوں کی طرح پڑھنی چاہییں۔ آصف فرخی کے نزدیک انتظار کو سمجھنے کے لیے یہ اصناف بھی مددگار ثابت ہوسکتی ہیں۔ ناول نگار کی تاریخی وتہذیبی بصیرت کو پورے تنقیدی شعور کے ساتھ پرکھا گیا ہے۔ انتظار حسین کی Uniqueness کو جس نقطے میں بیان کیا گیا ہے وہ بہت اہم ہے:

> ''انتظار حسین کی انفرادیت کا اہم ترین زاویہ ہی یہ ہے کہ وہ ہر سیاسی تجربے کو اس کی واقعاتی سطح سے الگ کر کے ایک وسیع تر انسانی سطح تک لے جاتے ہیں۔''(۴)

اس ناول کی کچھ کمزوریوں کی بنا پر یہ کہا گیا ہے کہ اس کے مجموعی تاثر میں ارتکاز نہیں۔ بستی کو وسط محراب کا پتھر قرار دیا گیا ہے کیوں کہ اس کتاب کا مطالعہ دراصل ان کے پورے فن کا مطالعہ بن جاتا ہے۔ بستی پر تنقید نگاروں کی نقد کو سامنے لاتے ہوئے ساتھ ساتھ ڈاکٹر صاحب نے دھیمے اور منطقی انداز میں اپنا نقطۂ نظر بھی بیان کر دیا ہے۔ گویا انتقادیات کی تنقید کا سامنظر نامہ ہے۔ انسانیت کی گرتی ہوئی ساکھ، آدمی کی کم وقعتی اور آدمی ہی کی پراسراریت کا سراغ ناول کے بیانیہ کی تہوں میں تلاش کیا گیا ہے۔ انتظار حسین کی حیثیت اور بصیرت ان کے اسلوب کے غار میں مستور ہے اور دہانہ پر علامتی پیرایہ کی مکڑی نے جالا بن رکھا ہے۔ اکہری نظر اور سطحی مغز ماری سے اس حسیت اور بصیرت کی کھوج الل ٹپ کے سوا کچھ بھی نہیں۔ ڈاکٹر آصف فرخی نے تاریخ، تہذیب اور اساطیری روایات کے آئینے میں ناول کی تفہیم کی ہے۔ اس ناول کو انھوں نے نوآبادیاتی مطالعات کی صف میں شمار کیا ہے۔ عام قارئین اور روایتی ناقدین جو خالی پلاٹ اور بیانیہ کو بنیاد بنا کر تجزیے کرتے ہیں انھیں یہ پیغام بھی دیا گیا ہے کہ انتظار حسین کے فن کو سمجھنے کے لیے ان کے کرداروں کا نفسیاتی تجزیہ بھی لازم ہے۔ پھانسی گھاٹ کا میلہ، نیا گھر انتظار حسین کے ناول ''تذکرہ'' کے جائزہ

کا عنوان ہے۔تذکرہ پر کم تنقید نگاروں نے توجہ دی۔زمین سے اکھڑ کر بے جڑ ہونا اور پھر دربدری اور نئے ملک کے گوناں گوں مسائل سب ترتیب وار تجزیہ کی زد میں آئے ہیں۔مارشل لا کے جبر اور بھٹو کی پھانسی بھی اس ناول میں مذکور ہیں۔یہ دونوں واقعات پاکستان کی سیاسی وسماجی منظر نامے کو بدلنے کا موجب بنے۔فرخی صاحب البتہ صرف ایک رخ پھانسی کی سزا کے تسلسل کو زیر بحث لائے ہیں۔آگے سمندر ہے میں کراچی کے حالات مہاجروں کے حوالے سے بیان ہوئے ہیں۔اس ناول پر بات کرنے کے لیے سمندر کا بلاوا کے نام سے باب موجود ہے۔ناول کا آغاز مجو بھائی اور جواد کے مکالموں سے ہوتا ہے،الجھے سلجھے مکالمے، بھارت یاترا میں ہسپانیہ کی تاریخ کا ذکر۔بقول مصنف یہ کہانی ایک نقطے سے دوسرے مقام کا سفر سیدھی لکیر کی طرح طے نہیں کرتی۔اس کہانی کے دونوں مرکزی کرداروں کو شرلاک ہومز، ڈاکٹر واٹسن اور فلابیر کے آخری نامکمل ناول کے دو دوستوں سے تشبیہہ دی گئی ہے جن کے باہم گفت وشنید سے زندگی کی معنویت واضح ہوتی ہے۔ انتظار حسین کی فنی تعبیر میں جا بجا تمثیلوں اور تقابلی جائزوں سے مدد لی گئی ہے۔تاریخ کے جبر کو بیان کرنے میں انتظار حسین کو ملکہ حاصل تھا۔اسی لیے مہاجرت کے شہرہ آفاق شاعر محمود درویش کی نظم ''Eleven Planets at the End of the Anulnian Scene'' اور آگے سمندر ہے میں مشابہت ڈھونڈی گئی ہے۔اس ناول کو فرخی صاحب نے قومی وثقافتی زوال کی دستاویز کہا ہے یہ تاریخ کا وہ عمل ہے وہ قرنوں صدیوں سے جاری ہے اور جڑوں کا سوال شدت سے سر اٹھاتا ہے۔آشوب سرا میں انتظار حسین کے ناولوں کی تکنیک پر بحث کی گئی ہے۔ان کا کہنا ہے کہ ناول سادہ نظر آتے ہیں۔اور وہ ایسے دریا کی مانند ہیں جو اوپر سے پرسکون ہے جس میں اترے بغیر گہرائی کا اندازہ لگانا ممکن نہیں۔ناولوں کو پڑھے بغیر نکتہ چینی اور اعتراض کو مصنف نے خطرناک عمل قرار دیا ہے۔میرے خیال میں ایک نہیں کئی مرتبہ پڑھنے کے بعد بھی انتظار حسین کے ناول اپنے بھید قاری پر نہیں کھولتے (آصف فرخی یہ اعتراف کر چکے ہیں کہ'' آگے سمندر ہے'' ان پر پہلی Reading میں نہیں کھلا) کتاب کے اندر ایک انکشاف یہ بھی کیا گیا ہے کہ ''بستی''،'' تذکرہ'' اور'' آگے سمندر ہے''۔ایک سلسلے کی کڑیاں ہیں۔تین آشوب اپنے اپنے زمانے کے ان میں بیان ہوئے ہیں خصوصاً ہماری صورتحال کے حوالے سے:

> ''پختگی کے دور کے یہ تینوں ناول فنی کامیابی اور ادبی وقعت کے لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں اس کے باوجود تینوں میں یہ نقطہ مشترک ہے کہ ان کی اساس ایک نہ ایک قومی آشوب پر ہے۔''(۵)

قوم، ملک،تہذیب،راویات،اخلاقیات،سماجیات،سیاسیات وہ کونسی ایسی چیز تھی جو تباہ و برباد نہ

ہوئی اور جس کا ذکر انتظار حسین نے اپنی تحریروں میں نہ کیا۔آ شوب کے قسط وار بیان کو آصف فرخی نے نجیب محفوظ کے ''قاہرہ سہ شاخہ'' کی طرز کی کاوش قرار دیا ہے۔مصری تہذیب میں جو اتار چڑھاؤ آئے اور فرد اور معاشرے پر جو اثرات مرتب ہوئے ان کا ہندوستانی سماج و سیاسی حالات سے ہر چند تقابل کرنا مناسب نہ ہو مگر ہیئت اور تکنیک کے تجربات میں دونوں ناول نگار ایک صفحے پر ہیں۔جو فنکار غالب اور آزاد کو اردو کے اوّلین افسانہ نگاروں کے روپ میں دیکھے اور پریم چند اور کرشن چندر کی افسانہ نگاری کا شاکی ہو اس کے تخلیقی مواد کا تنقیدی احاطہ ہرگز آسان نہیں تھا۔فرخی صاحب کی بین الاقوامی ادب پر دقیق نظر کا فیضان ہے کہ انتظار حسین کی فنی گہرائی میں غوطہ زن ہوئے۔انہوں نے ان ناولوں کو وطن عزیز کا تاریخی بیانیہ قرار دیا ہے۔

بڑا افنکار ماضی حال کے علاوہ مستقبل کا بھی صورت گر ہوتا ہے۔قوم کے لیے انتظار حسین کا کرب ان کے فن میں اپنا ثبات کرتا ہے۔ڈاکٹر آصف فرخی نے لفظ آشوب کی تفسیر بستی کے حوالے سے کرنے کی خاطر انتظار صاحب سے رجوع کیا تو انھوں نے فرمایا:

> ''میں نے دریافت کیا کہ ''بستی'' آجکل کے حالات میں لکھی جاتی تو اس کی صورت کیا ہوتی......؟ (جواب آیا)......اب جو آشوب ہے پاکستان کا تو میں سوچتا ہوں کہ یہ آشوب اس وقت پیدا ہوا ہے جبکہ میں اپنی تخلیقی عمر پوری کر رہا ہوں۔تو یہ آشوب میری گرفت میں نہیں آپائے گا اور اس حوالے سے شاید کوئی ایسی تحریر نہیں آئے گی۔کوئی ایسا ناول نہ ہوگا کیوں کہ میں ختم ہو رہا ہوں اور آشوب شروع ہو رہا ہے۔''(۶)

اگلے صفحات پر انتظار حسین کی فن ترجمہ نگاری کی بات کی گئی ہے۔جو کہ ''ترجمہ نگاری کے میدان میں'' کا ذیلی عنوان رکھتی ہے۔ترگنیف کا ناول انتظار حسین نے ۱۹۵۲ء میں ''نئی پود'' کے نام سے ترجمہ کیا۔یہ دَور اِن کی نوجوانی اور ابتدائی افسانوں کا زمانہ ہے۔گویا ابتداء ہی میں انھوں نے اپنی اردو و انگریزی زبانوں پر دسترس کا ثبوت فراہم کر دیا۔صاحب کتاب نے اس دور کی انتظار کی طبع زاد تحریروں (چاند گہن سمیت) پر بھی اس ترجمہ کے اثرات کا پتہ لگایا ہے۔ The Red Bridge of Courage امریکی ناول نگار اسٹیفن کرین کا جنگ کے خلاف لکھا جانے والا معروف ناول ہے اس کا ترجمہ انتظار حسین نے ''سرخ تمغہ'' کے نام سے کیا۔اس کے ناول کی بازگشت بھی انتظار حسین کے کئی افسانوں (آخری راؤنڈ، خندق، مورنامہ) میں سنائی دیتی ہے جو جنگوں سے نفور کا اعجاز ہے۔کرین کے سپاٹ پن کو مترجم نے بقول آصف فرخی کامیابی سے اپنے اسلوب میں ڈھال لیا ہے۔انتون چیخوف سے انتظار حسین بہت متاثر تھے۔ان کے افسانے Steppe کا ترجمہ ''گھاس کے میدانوں'' کے نام سے کیا گیا۔چیخوف کا وصف یہ ہے کہ وہ

معمولی واقعات اور عام حالات (Situation) سے بھی کہانی بن لیتا ہے یہی انتظار حسین نے بھی کیا اور کسی بڑے واقعہ کا سہارا لیے بغیر انھوں نے کامیاب افسانے لکھے۔ علامت اور حقیقت کی بیک وقت کارفرمائی کا سبق مترجم نے گرہ میں باندھ لیا یہ کہنا ہے آصف فرخی کا۔ اس ترجمے کو انھوں نے اردو کے کامیاب تراجم میں سے ایک قرار دیا ہے۔ ایمل حبیبی عرب ادیب (فلسطینی نژاد) اور صحافی ہیں۔ ۱۹۷۴ء میں (عرب اسرائیل جنگوں کے بعد) ان کا ناول اسرائیلی قبضے اور فلسطینی Diaspora کا بیان لیے ہوئے ہے۔ اس کو سعید کی پراسرار زندگی کے نام سے انتظار حسین نے ترجمہ کیا۔ اس کے اثرات کو انتظار حسین نے قبول نہیں کیا وجہ ہمیں یہ بتائی گئی ہے کہ انتظار صاحب کا اپنا اسلوب اس وقت تک پختہ ہو چکا تھا۔ راقم کے خیال میں انتظار حسین کی توجہ حاصل کرنا ہی، بجائے خود ایک اثر ہے اور غالباً وہ وجہ مہاجرت، دربدری اور نوآبادیاتی ریشہ دوانیوں کی (فلسطینیوں اور ہندوستانیوں) مشترکہ میراث ہے۔

عطیہ حسین کا ناول ''Sunlight on a Broken Column'' کے نام سے ۱۹۶۱ء میں لکھنؤ میں چھپا تھا۔ ۱۹۹۸ء میں انتظار حسین نے اس کا ترجمہ ''شکستہ ستون پر دھوپ'' کے نام سے کیا۔ قراۃ العین حیدر کی خواہش تھی کہ یہ انگریزی سے اردو میں منتقل ہونا چاہیے چنانچہ انتظار حسین نے ترجمہ کرتے ہوئے پیش لفظ میں لکھا۔ لکھنؤ جس تہذیب کا نام ہے اس کی تو اپنی ایک زبان ہے۔ یہاں شرح آرزو زبان میں غیر میں ہوئی ہے...... میں نے سوچا کہ یہ ناول انگریزی لفظوں کے پیچ کیوں بھٹک رہا ہے۔ اسے اس کی اصلی زبان کیوں نہ لوٹا دی جائے۔ آصف فرخی صاحب نے انتظار حسین کے اعترافی بیان کو حوالہ بنا کر لکھا ہے کہ اس بار ترجمہ مزے دار نہیں ہوا:

> ''اصل متن میں مصنفہ نے زبان کو بڑی مہارت کے ساتھ Transform کیا ہے اور اب وہ زبان واپس اپنی ابتدائی واصلی حالت میں لانا، اس سے زیادہ مشکل کام جو ناول کو زک پہنچائے بغیر ممکن نہیں تھا۔ اسی لیے انتظار حسین کی تمام تر محنت کے باوجود اس ترجمے میں ایک اجنبیت سی در آئی ہے جو اصل انگریزی میں محسوس نہیں ہوتی۔'' (۷)

اس کے علاوہ کئی افسانوں کے جو ترجمے انتظار حسین نے کیے ان پر بھی نظر ڈالی گئی ہے۔ اس کے علاوہ بطور صحافی انتظار حسین نے اسٹیوارٹ شریم کی کتاب ''ماؤزے تنگ'' کا ترجمہ ۱۹۶۶ء میں کیا۔ مغرب کی تہذیبی یلغار کے خلاف اور اسلامی فکری اساس و اسلامی دانشوری اور اسلامی فنون کے تناظر میں لکھی جانے والی عبدالجبار ڈیز کی کتاب کا ترجمہ ''اسلامی روایت'' کے نام سے ۱۹۹۶ء میں انتظار حسین نے کیا۔ پھر امریکی فلسفی اور ماہر تعلیم جان ڈیوی کی کتاب کا ترجمہ بھی انتظار حسین کا کارنامہ ہے۔ جو فلسفے کی نئی تشکیل کے نام سے چھپی۔ اس کتاب میں انتظار حسین کی دلچسپی کا سامان

زندگی کی وہ تبدیلیاں بتائی گئی ہیں، جو برابر جاری رہ کر بحران کی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔ یقیناً یہ مناسب اور صحیح توجیح ہے۔ انتظار حسین کی ایک جہت بطور ڈرامہ نگار بھی ہے۔ جس سے کئی لوگ لاعلم ہیں۔ ۲۰۱۶ء فروری میں اکادمی ادبیات پاکستان میں ہونے والے انتظار حسین کے تعزیتی ریفرنس کی نظامت راقم نے کی اور صدارت جناب عطاء الحق قاسمی صاحب نے فرمائی۔ ایک مقرر نے انتظار حسین کے ڈراموں کا ذکر کیا تو قاسمی صاحب نے انتظار حسین کی ڈرامہ نگاری سے لاعلمی کا اظہار کیا اور راقم نے اس لاعلمی پر حیرت کا اظہار۔ فرخی صاحب نے ''پردہ اٹھنے کے منتظر ہے نگاہ'' میں ان کی ڈرامہ نگاری کو اہم جہت قرار دیا ہے۔ سٹیج، ریڈیو اور ٹی وی کے لیے انہوں نے ڈرامے لکھے۔ اور ڈراموں کے تراجم بھی کیے۔ ان کا اپنا طبع زاد ڈرامہ ''خوابوں کے مسافر'' ہے جسے آصف صاحب نے اس دور کے افسانوں سے مشابہہ قرار دیا ہے۔

انہوں نے شعری حسیت سے بھرپور اس ڈرامے کو اردو ڈراموں کی مختصر روایت میں بہترین کاوش کہا ہے۔ اس ڈرامے کو ضیاء محی الدین جیسے منجھے ہوئے ہدایتکار و اداکار نے اپنی ڈائریکشن کے ساتھ کراچی میں سٹیج کروایا اور یہ انڈیا میں بھی پیش کیا گیا۔ اس کے فنی پیچ وخم پر جتنی جامع گفتگو فرخی صاحب نے کی ہے اس سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انتظار حسین کے پورے ناول کی ٹکر کا ڈرامہ ہے۔ نفرت کے پردے میں'' نامی ڈرامے کا بھی ذکر ہے جو پی ٹی وی سے ۱۹۶۷ء میں نشر ہوا اور بعد میں شائع بھی ہوا۔ ساتواں سوال'' ایسا کھیل ہے جس میں ڈرامہ در ڈرامہ والی تکنیک استعمال میں لائی گئی ہے۔ ان ڈراموں میں روایت اور جدت کے علاوہ بنیاد پرستی (جو بعد میں شدت پسندی میں تبدیل ہوئی) کو موضوع بنائے ہوئے ہیں۔ ڈرامہ نئی عورتیں پرانی لڑکیاں ٹی وی پر پیش ہوا۔ ٹیلی ویژن کے لیے ڈرامے اور سلسلہ وار کھیل لکھنے کے باوجود اس میڈیم سے انھیں خاص شہرت نہیں ملی۔ اس میدان میں نام نہ کمانے اور کنی کترانے کی وجہ آصف صاحب نے لکھ دی ہے کہ وہ سرکاری پراپیگنڈہ مشنری کا کل پرزہ بننے کے قطعاً روادار نہ تھے۔ انتظار نے ریڈیائی ڈرامے بھی تخلیق کیے Our Town امریکی ادیب قائٹن وائلڈر کا ڈرامہ ہے جسے انتظار صاحب نے ''ہماری بستی'' کے نام سے ترجمہ کیا۔ یہ واحد ڈرامہ ہے جو شائع ہوا مگر سٹیج نہیں ہوا۔ مراٹھی زبان کے ڈرامہ نگار وجے تیندولکر کے ڈرامے کا ترجمہ ''خاموش! یہ عدالت ہے!'' (شانتا! کورٹ چالو آ ہے) بھی انتظار حسین نے ترجمہ کیا یہ لاہور اور کراچی میں سٹیج ہوا۔

آصف صاحب کا خیال ہے کہ کاش انتظار حسین اس صنف پر توجہ دیتے تو ڈرامہ مزید کامیابیاں سمیٹتا۔ انتظار حسین کی تنقید نگاری کے بارے میں اہم اطلاع یہ دی گئی ہے کہ وہ افسانہ لکھنے سے بھی پہلے مضمون نگاری شروع کر چکے تھے۔ مصنف نے ان کے تنقیدی مضامین جو ۱۹۴۶ء

سے ۱۹۵۹ء کے درمیان لکھے گئے اور ساقی، ادب لطیف، نقوش، نیا دور اور ہمایوں میں چھپے کا جائزہ موثر انداز میں لیا ہے۔ جوش جوانی اور وفور جذبات کے تحت لکھے گئے اس دور کے مضامین کو انظار حسین نے خود مسترد کر ڈالا۔ چراغ شب افسانہ کے توسط سے قارئین ادب کو یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انتظار حسین کا پہلا تنقیدی دور تاکید و تنقیص کا جبکہ دوسرا تحسین و تعبیر کا تھا۔ اول الذکر میں نظریات اور بعد ازاں تجربات سے استفادہ کیا گیا۔ انتظار حسین کی تنقید نگاری کی بابت لکھا ہے:

''افسانے کے بارے میں ان کے مضامین پڑھ کر ہمیں نہ تو افسانہ نگاروں کی درجہ بندی میں سہولت حاصل ہوتی ہے اور نہ افسانے میں اچھا، برا چھان پھٹک کر الگ کرنے کے اصول معلوم ہوتے ہیں لیکن ان سے بھی بڑھ کر ہمیں خود افسانے کے بارے میں ایک نئی بصیرت حاصل ہوتی ہے اور اس فن میں مضمر زندگی ایک نیا انکشاف بن کر جھلک اٹھتی ہے۔'' (۸)

غیر افسانوی نثر کی تین کتب اجمل اعظم، دلی تھا جس کا نام، جستجو کیا ہے، تذکرہ لیے ہوئے ہیں جو انتظار حسین کی یادوں کا بنیادی سروکار رہا ہے۔ وہ تہذیب، وہ وضع داری، وہ روایات جو اب قصہ ہو چکیں ان کو ان تذکروں میں الفاظ کے روپ میں دیکھا جا سکتا ہے۔

اس باب میں کتب میں مذکور تذکروں کا احوال (Autobiography) ہیں جو انتظار حسین کی نجی زندگی کا احاطہ کرتی ہیں مگر اس کے باوجود وہ معاصر ادبی سماجی صورتحال پر رواں تبصرے ہیں۔ ان کتابوں کو خود انتظار حسین نے آپ بیتی کے بجائے کچھ یادیں کچھ باتیں کہا ہے۔ جو بات قابل غور ہے وہ یہ ہے کہ (بقول مصنف) انتظار حسین نے بالعموم صنفی تقاضوں سے وفاداری سے نہ صرف دامن بچایا ہے بلکہ تحریر کی اندرونی ساخت و معنویت کے حوالے سے ان کو دانستہ توڑا بھی ہے۔ یوں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کی افسانوی اور غیر افسانوی تحریروں میں حد فاصل کھینچنا مشکل امر ہے۔ نئے شہر پرانی بستیاں اور زمین اور فلک اور انتظار حسین کے دو سفر نامے بھی ان کے جہان فن کا حصہ ہیں۔ یہ مختلف سفروں کے الگ الگ حال پر مشتمل متفرق مضامین ہیں جو کتابی شکل میں جمع ہوئے ان کا حال مختصراً درج ہے۔ انتظار حسین کے مٹھی بھر خاکوں پر بھی محاکمہ ہے۔ جو انھوں نے نانی اماں، حسن عسکری، شاکر علی، ناصر کاظمی، جمیل جالبی، جمیل الدین عالی، قیوم نظر، شیخ صلاح الدین، سلیم احمد، ڈاکٹر آفتاب احمد، شاہد احمد دہلوی اور یو آر اننتھ ورتی (کنٹر زبان کے ادیب) کے لکھے۔ صحافت انتظار صاحب کا ذریعہ معاش رہی چنانچہ اس جہت کو بھی کتاب میں جگہ دی گئی ہے۔ مصنف نے ان کی صحافتی کالموں پر مشتمل کتب، ذرے، بوند بوند، ملاقاتیں، قطرے میں دریا کا تذکرہ کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ انتظار کی صحافتی تحریروں کو صحافت کے دائرے ہی میں رکھ کر پڑھا جائے نہ کہ ان کا ادبی سرمایے سے موازنہ و تقابل۔ اس حصے میں بھی باریک بینی

سے انتظار حسین کی صحافت اور کالم نگاری سے اہم نکات کی نشاندہی کی گئی ہے جو اس بات کی غماض ہے کہ وہ اس شعبے میں بھی اپنی انفرادیت قائم رکھنے میں کامیاب رہے۔ان کی کالموں اور انٹرویوز پر مشتمل کتاب ''ملاقاتیں'' سے آصف صاحب نے دو مثالیں نقل کی ہیں جو ان کی Uniqeness پر دال ہیں:

> ''تین چیزیں تین چیزوں کو کھا جاتی ہیں۔ مدرسی نقاد کو، فلم شاعر کو، ٹی وی سیریل افسانہ نگار کو مگر قتیل شفائی کہتے ہیں کہ فلم نے مجھے نہیں کھایا............ جوش صاحب کے بارے میں شاہد اثر لکھنؤی نے یہ فقرہ لکھا تھا کہ اردو میں ایک کیٹس پیدا ہوا تھا مگر اس کو بھیڑیے اٹھا کر لے گئے۔ جمیل الدین عالی کیٹس نہیں ہیں اور رائٹر گلڈ بھیڑیا نہیں ہے۔ پھر بھی حادثہ اسی قسم کا ہے۔''(۹)

یہ وقت ہے شگفتن گل ہائے ناز کا...... کتاب کا پچیسواں باب ہے۔ انتظار حسین کو عام طور پر قنوطیت پسند ناسٹلجیا کا شکار لکھاری سمجھا جاتا ہے۔ آصف صاحب نے میگوئیل اونامو (Miguelde unameno)، کی مستعار اصطلاح ''زندگی کے احساس الم'' کا اطلاق انتظار حسین پر کیا ہے۔ مگر اس کے باوجود شگفتگی اور طنز و مزاح ان کے ہاں کلی طور پر مفقود نہیں۔ ان تحریروں کو آصف صاحب نے ان کی Versatality کی دلیل قرار دیا ہے۔اس سلسلے میں ان کے تین مضامین خوجی لاہور میں، گڑ کی گزک اور تیرے بعد تیری بتیاں کا ذکر ہے۔ مصنف نے انتظار حسین کے فکاہیہ رنگ اور طنزیہ و مزاحیہ انداز کو ان کی فنکارانہ جہت کا ایک جاندار پہلو قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ ان کے اندر یہ مادہ تھا مگر بوجوہ وہ بروئے کار نہ لایا جا سکا۔ اپنے بارے میں تعزیتی مضمون (از راہ تفنن) میں لکھا:

> ''میں نے یہ غلط کہا کہ وہ ڈبائی میں رہتا تو چلمیں بناتا۔ ویسے اسے ڈبائی ہی میں رہنا چاہیے تھا۔ اس قصباتی فضا سے اس کا ذہن کبھی نکلا ہی نہیں۔ وہاں اگر رہتا تو وہاں یکّہ چلا کر کچھ دال دلیا کر لیتا............ لاہور آ کر کہانیاں لکھنا شروع کر دیں۔ کہانیاں کیا لکھتا یکّہ چلاتا تھا۔ ڈبائی کے یکّوں کی طرح اس کی کہانیوں کے بھی سارے انجر پنجر ڈھیلے ہیں............''(۱۰)

آصف فرخی نے حس مزاح کی نسبت انتظار حسین کی حس نوستلجیا کو مضبوط قرار دیا ہے۔'' تذکرہ رستخیز بے جا المعروف بہ فسانہ عبرت'' میں جو اسلوب اختیار کیا گیا ہے اگر وہ مناسب مقدار اور رفتار میں جاری رہتا تو اردو مزاحیہ ادب کو شاید آدھا مشتاق احمد یوسفی مزید میسر آ جاتا۔ بچوں کے لیے طبع زاد تحریریں اور تراجم بھی انتظار حسین کے کریڈٹ پر ہیں۔ مشہور قدیم ہندوستانی داستان

''کلیلہ دمنہ'' کو آسان اور سلیس بنا کر ان کا سب سے اہم کارنامہ گردانا گیا ہے۔ انتظار حسین نے کچھ کتب مرتب کیں ان کا احوال بھی معہ تبصرہ کتاب کا حصہ ہے۔ لطیفوں کی کتاب لطیفے اور چٹکلے بھی ان میں سے ایک ہے۔ کتاب کی اشاعت کے بعد سکھوں کے بارے میں ایک لطیفہ باعث نزاع بن گیا جسے کتاب سے حذف کر دیا گیا۔ اس پر آصف فرخی نے لطیف جملہ کسا۔ یہ اعزاز بہر حال انتظار حسین کو حاصل ہوا کہ انھوں نے لطیفے بھی جمع کیے تو باعث نزاع بن گئے۔ کچھ تو کہیے (حلقہ ارباب ذوق کے مباحث) الف لیلہ (سرشار کی کتاب) انشاء کی کہانیاں (رانی کیتکی اور سلک گوہر) سن ستاون میری نظر میں (ناصر کاظمی کے ساتھ مل کر ترتیب دی)، سوالات و خیالات (اپنے استاد پروفیسر کرار حسین کے مضامین)، پاکستانی کہانیاں (منتخب افسانے آصف فرخی کے ساتھ مل کر) سنگھاسن بتیسی (قدیم ہندوستانی کہانیاں) اور سخن او اہل سخن (مظفر علی سید کے مقالات) شامل ہیں۔ ان مرتب شدہ کتابوں کے مواد و متون کے ساتھ ساتھ انتظار حسین کی علمی و ادبی حیثیت بھی موضوع سخن رہی ہے۔ انتظار حسین کی کتابوں کی تفصیل بھی آخر میں صنف و سن وار دے دی گئی ہے۔ آصف فرخی نے پس نوشت نامی آخری باب میں چراغ شب افسانہ تالیف کرنے کی وجہ بھی بتا دی کہ خواہ مخواہ میری طرح کے کم فہم قاری ٹامک ٹوئیاں نہ مارتے پھریں۔ انتظار حسین کی تحریروں کو سمجھنے کے لیے آصف صاحب کو عصمت چغتائی، منٹو، غلام عباس، بیدی، کرشن چندر اور قراۃ العین حیدر جیسے ثقہ بند فنکاروں سے آشنائی پیدا کرنا پڑی۔ تب کہیں جا کر انتظار حسین پکڑائی دیے۔ اتنی مبسوط اور مستند تصنیف (جو ''حیات جاوید''، ''زندہ رود'' سے بڑھ کر معنویت کی حامل ہے) کے علی الرغم آصف نے انتظار حسین کے فن کو کلی طور پر گرفت میں لینے کا دعویٰ نہیں کیا:

> ''انتظار حسین کی کتابیں میرے لیے بہت سہولت کے ساتھ، کسی سم سم کا نام لیتے ہی کھل جانے والے خزانے نہیں تھے۔ ہر مرتبہ پچھلی کتابوں کو نئے سرے سے جاننے پہچاننے کے مرحلے میں داخل ہونا پڑتا۔ ان تحریروں نے مجھے بار بار اپنی رائے اور مطالعے کے نتائج بدلنے پر مجبور کیا اور میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ آخری بار رہوا ہے۔'' (۱۱)

آصف صاحب کی کسر نفسی ایک طرف مگر یہ حقیقت بھی ہے کیوں کہ انتظار حسین نے کہہ رکھا ہے کہ اگر کوئی کتاب اپنے پورے معانی جس دن کھول دے گی گویا اس کتاب کی موت واقع ہو جائے گی۔ انسانی وجود اور معاشرے کی تشخص کی گواہی فن پارہ سے لی جا سکتی ہے۔ آصف فرخی صاحب کو انتظار حسین کو سمجھنے کے لیے جس ٹول کی ضرورت تھی وہ ان کا تنقیدی شعور ہے۔ اسلوب محققانہ اور عالمانہ کی بجائے سادہ و سلیس ہے۔ رائے دیتے ہوئے کوئی حکم نہیں لگاتے بس

دھیمے سروں میں کچھ نہ کہتے ہوئے بھی بہت کچھ کہہ جاتے ہیں۔تنقید میں افسانوی رنگ جھلکتا ہے۔ جو قاری کو بوریت کا احساس نہیں ہونے دیتا۔شاید اس لیے کہ مصنف تنقید نگار کے ساتھ ساتھ افسانہ نگاری بھی ہے۔تحسین وتردید کے فوری تاثر سے پاک تعصّبات سے کوسوں دور وارعقیدت سے یکسر خالی کتاب محض انتظار حسین کی تفہیم وتفسیر کا نسخہ ہے۔انتظار حسین جیسے قدرے خشک اور قنوطیت پسند لکھاری کے لیے آصف صاحب جیسے دلکش اور رجائیت سے بھرپور نقاد کا میسر آجانا ہمارے لیے نعمت سے کم نہیں۔شمیم حنفی کی انتظار شناسی کا اگر اس کتاب سے موازنہ کیا جائے تو یہ کہنا غلط نہ ہوگا مؤخرالذکر عام فہم اور Attractive ہے۔آب حیات اگر ناول قرار پاسکتی ہے تو یہ دعویٰ کرنے میں بھی کوئی حرج نہیں کہ ''چراغ شب افسانہ'' بھی ''کراماز وف برادران'' کی طرز کا فن پارہ ہے۔انتظار حسین کی شرح کرتے ہوئے آصف صاب نے ٹھوکر کھائی یا نہیں یہ الگ سوال سہی ہاں مگر ان کے کئی افسانوں پر تنقید تشنگی کا پہلو لیے ہوئے ہے۔

مواد اور ہیئت ہر دو اعتبار سے ''چراغ شب افسانہ'' حسن امتزاج کی حامل تخلیق ہے۔ ڈاکٹر آصف فرخی نے گویا چراغ دل جلا کر یاران نکتہ داں کے لیے انتظار شناسی کا سامان مہیا کر دیا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ آصف فرخی، ڈاکٹر۔ چراغ شب افسانہ۔ ۔۲۰۱۶ء۔ص۱۱۰،۱۱۱

۲۔ ایضاً،ص۱۳۰

۳۔ ایضاً،ص۱۸۰

۴۔ ایضاً،ص۱۵۹

۵۔ ایضاً،ص۲۷۵

۶۔ ایضاً،ص۲۹۳

۷۔ ایضاً ص۳۱۱

۸۔ ایضاً،ص۳۷۵

۹۔ ایضاً،ص۴۲۶

۱۰۔ ایضاً،ص۴۳۲

۱۱۔ ایضاً،ص۴۷۰

پرویز انجم کی کتاب ''منٹو غالب کا پرستار''

انور سن رائے

منٹو صدی کے حوالے سے کتابوں کی آمد جاری ہے۔ جس سے جس طرح ممکن ہو رہا ہے سعادت حسن منٹو کے نئے پہلو اجاگر کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ پرویز انجم کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انھوں نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ منٹو پر تحقیق کرنے میں گذارا ہے۔ 'منٹو: غالب کا پرستار' اس حوالے سے ان کی پہلی کتاب ہے جو شائع ہوئی ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ان کی مزید کتابیں شائع ہونے والی ہیں جن میں 'منٹو اور سینما'، 'منٹو نامے' غالباً منٹو کے خطوط، اور 'منٹو باتیں' منٹو کے انٹرویوز پر مشتمل ہوگی۔ اس کے علاوہ وہ ایک اور کتاب پر بھی کام کر رہے ہیں جو 'اردو ادیب اور سینما' کے نام سے ہوگی۔

منٹو پر تحقیق کے علاوہ انھوں نے افسانے لکھے ہیں اور ان کا افسانوں کا پہلا مجموعہ 'مونگرے کے پھول' کے نام سے شائع ہوا ہے۔ افسانوں کا ایک اور مجموعہ 'ایک موسم' کے نام سے زیر اشاعت بتایا جاتا ہے۔ روزگار کے سلسلے میں وہ پاکستان کے علاوہ کئی ممالک میں رہے ہیں اور کہا جاتا ہے کہ اس مسافرت نے انھیں مشاہدے کے جو مواقع فراہم کیے ہیں اس کے نتیجے میں ان کے تخلیقی شعور میں گہرائی پیدا ہوئی ہے۔ کتاب کی اولین تحریر یا تعارف کے طور پر ڈاکٹر طارق ہاشمی نے لکھا ہے کہ:

> ''کتاب کا حصہ اوّل منٹو کی غالب کے حوالے سے چھ تحریروں پر مشتمل ہے اور حصہ دوم منٹو کی فلم 'مرزا غالب' کے اسکرپٹ سے مزیّن ہے جو تحریری شکل میں ایک ادبی حیثیت اختیار کر جائے گا۔ مرتب کی اس کاوش کو یقیناً تحسین کی نگاہ سے دیکھنا چاہیے۔ جواہرات منٹو، حصہ اوّل کے مضامین اور ڈرامے، غالب پر سعادت حسن منٹو کی تحریریں کچھ افسانوی اور کچھ نیم افسانوی ہیں اور تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان کی اہمیت کیا ہے، اس پر اردو تحقیق وتنقید کے میدان میں بہت کچھ لکھا جائے گا۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ پرویز انجم کی یہ کتاب اپنے اندر اہم تحقیق مواد رکھتی ہے۔ تاہم پرویز انجم نے منٹو کے غالب نوادرات کے اس زریں ذخیرے کو دریافت کر کے منٹو شناسوں کے سامنے

بعض سوالات ضرور رکھے ہیں اور یہ یقیناً ایک فرض بھی تھا جو انھوں نے بہ اسلوبِ احسن نبھایا ہے اور یہ ایک قرض بھی تھا جو پرویز انجم نے وقت، محنت اور نقد کے بہت سے دام دان کر کے چکایا ہے''

حصہ اوّل میں میں منٹو کے چھ مضمون ہیں: آگرہ میں مرزا نوشہ کی زندگی، غالب اور چودھویں، - غالب، چودھویں اور حشمت خان، غالب اور سرکاری ملازمت، قرض کی پیتے تھے۔۔۔اور مرزا غالب کی حشمت خان کے گھر دعوت۔

اس کے علاوہ اس کتاب میں خود پرویز انجم کے دو مضمون ہیں جن میں پہلا 'منٹو، غالب کا پرستار' کے عنوان سے ہے۔ اور دوسرا اس فلم کے سکرپٹ کے حوالے سے ہے جو منٹو نے غالب کی زندگی کے بارے میں لکھا۔ دونوں مضمون دلچسپ ہیں۔

ان دونوں مضامین میں پرویز انجم نے منٹو کے حوالے سے غالب کی اور غالب کے حوالے سے منٹو کی زندگی اور فن پر بات کی ہے اور بعض جگہ بہت دلچسپ تبصرے بھی کیے ہیں:

'غالب اور منٹو دروں بیں شخصیات تھیں مگر اپنے گمان سے نکل کر جب انھوں نے چشمِ تنگ کو کثرتِ نظارہ سے وا کیا تو ان کی خیال پرستی زندگی کی تخیلی ترجمان بن گئی۔ دونوں کی زندگیاں احساس محرومی سے عبارت ہیں مگر اس احساسِ محرومی میں بھی زندگی کی خواہش ان کے دل سے نہیں نکلتی اور ولولوں کے چراغ جلتے رہتے ہیں'۔

ایسے بہت تبصرے ان کے مضامین میں موجود ہیں۔ اس کے علاوہ انھیں گاڑھی اردو لکھنے سے بھی شوق ہے جو نہ تو منٹو کا شیوہ تھا نہ غالب کی پسند۔ لیکن اصل بات وہی ہے جس کی طرف ڈاکٹر طارق ہاشمی نے اشارہ کیا ہے کہ پرویز انجم نے منٹو کی سات تحریروں کو ایک جگہ کر کے ایک ایسا اہم کام کیا جو منٹو پر کام کرنے والوں کے لیے خاصا مددگار ہوگا اور وہ اس سے ضرور فائدہ اٹھائیں گے۔ کتاب انتہائی عمدہ شائع ہوئی ہے اور قیمت بھی انتہائی مناسب ہے۔ اس کتاب کی تزئین عدالحفیظ نے کی ہے اور خیال ہے کہ ٹائیٹل بھی ان کا بنایا ہوا ہے۔ اگر ان کا نہیں تو بھی بہت عمدہ، سادہ اور متوجہ کرنے والا ہے۔

ادب پڑھنے والے بہت لوگوں کے لیے یہ کتاب اس لیے اہم ہے کہ اس کے ذریعے سعادت حسن منٹو کی وہ تحریریں ایک جگہ جمع ہوئی ہیں جو پہلے ایک جگہ نہیں تھیں۔

'مکان': طاقت سے نجات کا منشور

نسیم سید

مکان صرف ایک ناول نہیں ہے۔ یہ بچھڑی ہوئی تہذیب، گرزرے ہوئے وقت کی کہانی بھی نہیں ہے، یہ حسن و عشق کی ماجرا خیز داستان بھی نہیں۔ یہ جسم یا جنس کے خلوت افروز جذبات انگیز بھیدوں بھرے اوراق بھی نہیں ہیں۔ پھر کیا ہے؟

مکان کو پڑھ کے میں نے سوچا۔ میرے اندر بہت سی آوازیں اپنی اپنی بات کہہ رہی تھیں مگر سب سے صاف اور واضح ایک آواز تھی۔

''دراصل یہ گلوب پر کھینچی ہوئی لکیروں کو مٹا کے ایک مکان جیسا بنا دینے کے بعد اس میں موجود ہونٹ سی لینے والی خاموش غلام گردشوں۔ سازشی بیٹھکوں، طاقت کی پر پیچ دستار سروں پر سجائے مکان کی ہر آہٹ پر نظر رکھنے اور اپنی مٹھی میں جکڑ لینے والیہمارے اطراف چلتے پھرتے کرداروں کی روداد ہے۔ اور اس روداد کے انہی کرداروں سے ٹکرا جانے والی صدیوں کی کم ہمت، مجبور آواز کے یا وجود کے اپنے آپ کو جوڑنے بٹورنے اٹھ کھڑے ہونے اور منوانے کی داستان ہے۔'' مکان'' دراصل ٹوٹی ہمتوں کو جوڑنے کا فکری وجدان بھی ہے اور تخلیقی منشور بھی اور وہ گر بھی جو راکھ میں دبی آگ ڈھونڈ نکالتا ہے اور اسے پھر شعلے میں تبدیل کر دیتا ہے۔ اس گرُ کو مصنف نے ''نیرا'' کا نام دیا ہے اور اس منشور کو'' مکان'' کا۔

بلراج ورما صاحب نے گو ایک بہت گہری بات کی ایک جملہ میں'' مکان'' کے حوالے سے کہ ''نیرا ایک لڑکی نہیں بلکہ ہندوستان کی وہ اقلیت ہے جو اکثریت سے برسر پیکار ہے۔'' میں اس بات کو آگے بڑھانا چاہونگی۔ میں سمجھتی ہوں کہ مکان صرف ہندوستان کیا قلیت کے اکثریت سے برسر پیکار ہونے کی داستان نہیں ہے بلکہ دنیا کے ہر اس بظاہر کمزور لیکن کسی چٹان سے زیادہ مضبوط انسان کی داستان ہے جو طاقت سے برسر پیکار ہے۔ اگر اسکو دنیا کے نقشے پر کھینچی ہوء لکیروں کو مٹا کے دیکھا جائے تو یہ ایک بہت بڑے کینوس پر بنائی ہوئی تصویر ہے۔

''مکان'' صدیوں کی بوسیدہ ہڈیوں میں اترے ہوئے گھن کا وہ ایکسرے ہے جو صرف مرض کی تشخیص نہیں کرتا بلکہ علاج بھی بتاتا ہے۔ پیغام آفاقی کی فکر سماج اور سماجی

شعور کی نباض ہے۔ وہ ماؤ زے تنگ کے اس قول کی روشنائی میں اپنا قلم ڈبو کے فکری پیکر تراشتے ہیں کہ ''ادیب و دانشور اس ہراول دستے کے سپاہی ہیں جو قلم سے لڑتے ہیں'' ان کا گہرا مشاہدہ، بے پناہ حساسیت اور آفاقی شعور ہر بے ایمانی، ہر چالاکی، ہر جبر کو آئینہ دکھاتا چلا جاتا ہے۔ مکاں کی داستان کو اگر ہم بین الاقوامی تناظر میں دیکھیں تو اسے دس ہزار سال قبل کے شمالی امریکہ کے مقامی باشندوں کی اس داستان سے بھی جڑا پائیں گے جس میں اس زمین یا اس مکان کے اصل وارثوں کی مجبوری اور جدو جہد کی تفصیلا رقم ہیں کہ کس طرح سفید النسل نے انہیں انکے گھروں سے بے دخل کر کے انکی زمیں یعنی ان کے مکان پر قبضہ کرلیا۔ یہاں میں پیغام آفاقی کے ناول کی ابتدائی سطور کوٹ کرنا چاہونگی ''یہ ایک سنگین مسئلہ تھا نیرا کا مکان خطرے میں تھا۔ اور اس کا کرایہ دار اس سے اس کا یہ مکان چھین لینا چاہتا تھا'' شمالی امریکہ کے حقیقی واثوں کا مسئلہ بھی ''سنگین'' تھا کہ باہر سے آنے والے انکی زمین انکا مکان چھین کے انہیں وہاں سے بے دخل کر رہے تھے۔ تاریخ کے اورق گواہ ہیں کہ:

INLIVEDALREADYWHOPEOPLETHEAREABORIGINAL
ABOUTCANADAANDALASKATHROUGHAMERICA
ARRIVEDEUROPEANSTHEWHENAGOYEARS10,000

ان حقیقی باشندوں کے بارے میں اس دور کے معروف تنقید نگار ڈائمنڈ جیمز نے فیصلہ دیا تھا کہ ''یہ جنگلی کچھ ہی عرصہ میں اپنی موت آپ مرجائیں گے'' لیکن وقت پر اپنی راس ڈال کے رکھنے والے ان قبائل کے ادیبوں اور شاعروں نے پیغام آفاقی کی نیرا کی طرح ہار ماننے سے انکار کر دیا اور جبر کے سامنے صبر سے ڈٹے رہے۔ اپنے ہونے کی گواہی اور جدو جہد کے طویل دورانیہ کے بعد اس کے جشن کے وقت اس دور کا ایک شاعر (یا پیغام آفاقی کی نیرا) ڈائمنڈ جیمز اور اس جیسے تما فیصلہ سنانے والے جابروں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کیٹز سے پوچھتا ہے'' کیا تم وہی سفید فام نہیں ہو جس نے ہمیں ہمارے خیموں سے بے دخل کر دیا تھا

''اسی طرح ''مکان'' اس سیاہ فام قوم کے اپنے دور غلامی سے نجات کی اذیت ناک تاریخ و تفصیل بھی ہے جنہوں نے خود کو برابر کا انسان منوانے کی جدو جہد میں برسہا برس گزار دئے لیکن ہار نہیں مانی یہ وہ تھے جن کو اس کی اجازت نہیں تھی کہ وہ کسی سفید النسل کے علاقیمیں قدم بھی رکھ سکیں ہے۔ پیغام آفاقی کے ناول کا مرکزی کردار نیرا ہو یا افریقن امریکن عورت روزا پارکس (Rosa Parks) دونوں کی اپنے سچ کو منوانے کی ضد اور اس سے جڑی بے مثال ذہنی اور جسمانی مشقت، تھکن، ٹوٹنے اور ٹوٹ ٹوٹ کے جڑنے کی داستان تقریباً ایک ہے۔ روزا کا واقعہ 1955 کا ہے وہ ایک دن اپنے کام سے گھر واپسی کے وقت بس میں سوار ہوء، بس میں آگے کی

دس سیٹوں پر سفید امریکن کے لئے مخصوص ہوتی تھیں اور افریقن امریکی پیچھے کی سیٹ پر بیٹھتے تھے۔روزا حسب دستور پیچھے کی سیٹ پر بیٹھ گئی آگے کی دس سیٹیں اسوقت تک بھر چکی تھیں تب اسی وقت ایک امریکن بس میں سوار ہوا اور پچھلی سیٹ پر چار افریقی جو روزا سمیت بیٹھے تھے انہیں بس کے ڈرائیور نے سیٹ خالی کرنے کا حکم دیا۔سب اٹھ گئے لیکن روزا نے اٹھنے سے انکار کر دیا اس جرم پر روزا کو گرفتار کرلیا گیا اور اسے سزا سنا دی گئی روزا نے ہار نہیں مانی اس نے ہائی کورٹ میں اپیل کر دی اور ''Jim Crow Laws'' جیسے سخت قانوں کو چیلنج کر دیا۔ روزا کی بے مثال جنگ اور اس کی جرائت نے ایک تحریک کی شکل اختیار کر لی اس طویل جدو جہد کی شکل میں آج امریکہ کا وہ وائٹ ہاؤس جس کے لئے یہ سوچنا بھی گناہ جیسا ہوگا کہ کوئی سیاہ فام اس میں قدم رکھے گا اوباما کے قدم چوم رہا ہے۔

مجھے مکان کو پڑھتے ہوئے روزآ بے اختیار یاد آ گئی۔کیا نیرا وہی روح، وہی اپنے سچ کا یقین وہی طاقت کے قوانین کے سامنے ڈٹ جانے کی لا پرواہ ضد نہیں؟ انسان کی اندر پوشیدہ ہمتوں اور صلاحیتوں کی لازوال داستانوں کے ہر صفحے سے ''مکان'' کے اوراق جڑے ہوئے ہیں۔۔اس دور کی روزآ اور ''مکان'' کی نیرآ ایسے کردار ہیں جو سیلاب حیات کے منجدھار سے الجھتے ہی نہیں بلکہ طوفانی موجوں پر راس ڈال کے انکا رخ موڑ دیتے ہیں۔مکآن گزشتہ سے لیکے موجودہ دور تک کے انسانی مسائل اور انسے نبرد آزمائی کا وہ منشور ہے جو انسان کو زندگی کرنے کا ڈھنگ دیتا ہے۔ پیغام آفاقی ایک ایسی مضطرب روح کا نام ہے جو وقت کی ،صدائین کرتی، بین کر تی، جگاتی آوازوں پر خود بھی لبیک کہتی ہے اور قلم کے سرفروشوں کو بھی صدا دیتی اور جھنجھوڑتی ہے۔وہ جانتے ہیں کہ اعلی تصور حیات اور سماجی نصب العین کے بغیر کوئی قوم ترقی نہیں کر سکتی۔مکآن کی دا ستان ایک تصویر کے دورخ ہیں۔اس میں تمام وہ تصویریں بھی ان جابروں کی ہیں جو کمزوروں کے نرخرے پر پاؤں دھرے اسے اپنا حق سمجھ رہی ہیں اور اس ہمت کی تصویر بھی جو انہیں دھتکارنا اور سدھارنا جانتی ہے یعنی یہ صرف ایک ناول نہیں ہے بلکہ یہ نشان دہی ہے ان سنگین مسائل کی کہ سماج کی منفی قدروں کو کن اسباب سے کن وجوہات سے تقویت ملتی ہے اور کیوں کوئی معاشرہ نفسیاتی، اخلاقی، تہذیبی اور سیاسی اعتبار سے دیوالیہ ہوتا ہے اس سنگین مسئلہ کو کن اداروں کی سرپرستی سے احکام ملا ہے۔

پیغام آفاقی نے انتہاء ذہانت اوسہولت سے اسے کسی وعض کی شکل دینے کے بجائے کبھی نیرا کی خود کلامی کی ذریعہ کبھی مختلف کرداروں کے مکالموں کے ذریعہ بڑے فلسفیانہ انداز میں نہ صرف نشاندھی کی ہے بلکہ اسے زور آور کی پیٹھ پر سواری کرنے کا نسخہ کیمیا بھی بنا دیا ہے۔ یہ آج کے بین الاقوامی اضطراب کے پس منظر میں پھیلتی اور سکڑتی سرحدوں کی دستاویز بھی ہے اور گر بھی وہ

جو دینا کی ہر اقلیت کے لئے اتنا ہی اہم ہے جتنا ہندوستان کی اقلیت کے لئے۔ یہی سبب ہے کہ میں نے اس کو گلوب پر کھینچی ہوئی لکیروں کو مٹا ایک بہت بڑے کینوس پر پھیلا دیکھا پوری دنیا کی وہ اقلیت جو اکثریت سے برسر پیکار ہے اس کی کہانی بہت قدیم بھی ہے اور موجودہ دور تک ہمارے اطراف موجود بھی۔ اس صورت حال کا پیغام آفاقی نے بغور مطالعہ کیا ہے انکی قوت مشاہدہ، تخلیقی بصیرت اور زندگی سے گہرا ربط وہی ہے جسے معروف تنقید نگار افسانہ نگار اور ناول نگار جناب حمید شاہد نے ''اچھے فنکار کے تخلیقی حواص خمسہ'' قرار دیا ہے

''حمید شاہد کہتے ہیں ''ایک حقیقی فنکار اپنے باطن میں کائنات کی سی وسعت لئے ہوتا ہے۔ وہ لفظ کی بھیڑ میں موجزن معنی کے طلسم اور بہتے دھاروں پر قدرت رکھتا ہے۔ اسے معلوم ہوتا ہے کہ لطف تاثیر، گہراء، گیرائی اور تعبیر کی تکثیر ایک جملے کی تقدیر کیسے بن سکتے ہیں۔ وہ زندگی کو دیکھتا ہے اور زندگی کے جوہر کو بھی۔ وہ کائنات پر نظر رکھتا ہے اور ابدیت کے کنگروں کو چھونے کا بھی حوصلہ مند ہوتا ہے۔ وہ اپنے اندر الفاظ، سوچوں، اندیشوں، جذبوں کو سنبھال کر رکھنے اور اپنے تخلیقی وجود کا حصہ بنا لینے کی للک اور قرینہ رکھتا ہے'' پیغام آفاقی کی تخلیق مکان — بھی اپنے لطف تاثیر، گہرائی، گیراء، فکری آفاقیت اور اظہار کی ندرت میں ان کے تخلیقی حواص خمسہ کی رعناء کی مظہر ہے۔ پیغام آفاقی نے اپنے ناول کو ''مکان'' کا نام بہت سوچ سمجھ کے دیا۔ ہر فرد کی زندگی ایک مکان جیسی ہے اور کوءنہ کوئی سنگیں مسئلہ اس مکان جیسی زندگی کو گھر کرنے تک کسی کمار (نیرا کا کرایہ دار جو نیرا کو اس کے گھر سے بے دخل کرنے کے لئے ہر حد سے گزر جاتا ہے) کا سامنا ہے۔ یہ ناول مکان جیسی زندگی کو گھر کرنے کے ہنر بتاتا ہے اس کو پڑھتے ہوئے اپنے اندر مسمار ہوتا وجود، ٹوٹتی ہمتیں، سیلن کھاتی سوچیں کسی نءجون میں بدلتی جاتی ہیں اور اپنے اندر ایک نئ کائنات کی دھمک محسوس کرتی ہیں۔

اس نئ کائنات کا وجود زندگی کرنے کے اس فلسفے کا مرہون منت ہے جو ''مکان'' کا عطا کردہ ہے۔ ''تم اس کے قدمون تلے آؤ تو یہ تمہیں کچل دے گی، تم اس کی پیٹھ پر بیٹھ جاؤ تو زندگی تم کو بلندیوں کی سیر کرائے گی'' زندگی میں ہم سے قدم قدم پر ٹکراتے تمام کے تمام کردار اس ناول میں اپنی اصل شناخت اور چہرے کے ساتھ موجود ہیں۔ ان کرداروں کی شخصیت کسی تصوراتی دنیا کی نہیں ہے بلکہ ہماری حقیقی دنیا کی ہے۔ ناول کا مرکزی کردار ایک لڑکی نیرا ہے۔ پیغام آفاقی نے اس کی کوئی ضرورت نہیں محسوس کی کہ نیرا کے حسن کی تفصیلات میں جا کے قاری کو متوجہ کرتے بلکہ انہوں نے اس پہلو سے بالکل پہلوتہی کی اور اہمیت اس لڑکی کے وجود میں موجود اس چنگاری کو دی جو مخالف ہواؤں کے جھکڑ کے سامنے دھیرے دھیرے شعلہ بن کے انکے اطراف پھیل جاتی ہے۔ ناول کے مرکزی کردار کے لئے ایک لڑکی کا انتخاب بھی یقیناً مصنف کا سوچا سمجھا فیصلہ ہے۔ عورت برسہا برس

سے ''کمزور'' کے لیبل کے تحت زندگی گزار رہی ہے۔ چتا پر زندہ جل جانے والی، قرآن سے بیاہ دی جانے والی، تاوان میں دے دی جانے والی۔ نن بنا کے گرجاؤں میں حنوط کردی جانے لاتعداد عورتیں جو ذاتی اور سماجی حقوق سے طرح طرح سے دھتکاری جاتی رہی ہیں پیغام آفاقی اس عورت کے تشخص کو پہچانتے بھی ہیں اور اسکی پہچان بہت بھرپور طریقے سے دنیا سے بھی کراتے ہیں وہ اپنی تابناک فکر کو نیرا کی سوچ میں ڈھال کے عورت کے وجود کو اپنی شناخت کا وجدان عطا کرتے ہیں۔

''اس کا کوئی سرپرست نہیں ہے، کوئی اس کی حفاظت کرنے والا، اس کے لئے سوچنے والا نہیں ہے۔

''سوچنے کے دوران اس نے محسوس کیا کہ اس کے دماغ کے ریشے از سرنو مرتب ہو رہے ہیں جیسے کوء اس سے ہولے ہولے کہہ رہا ہو۔ یہاں قدم قدم پر رہزن گھات میں بیٹھے ہیں۔ یہاں معاہدہ بنانے والے ایک ایک لفظ کے ہزاروں ہزاروں روپے لیتے ہیں، اس شہر میں تم بھروسوں کی سڑک پر چل رہی ہو'' نیرا کو جن چالاکیوں کا سامنا ہے مردانے معاشرے میں مصنف نے ان کو ننگا کرنے میں کوئی رعایت نہیں برتی بلکہ مردانہ معاشرے کی گھناؤنی سازشوں کی وکالت وہ ایک مرد (پولیس انسپکٹر نیّر) سے ہی کرواتے ہیں۔

''آپ دیکھئے تو۔۔ رفتہ رفتہ تھانے اور کورٹ بھگاتے بھگاتے اور قدم قدم پر اسمارٹ نس کے استعمال کا موقع دیتے دیتے اس کے پرس کے پیسے اور آنکھوں کی جھجک سب چھین لوں گا اور پھر وہ دن آئیں گے کہ ہماری ہر چوٹ کو وہ اپنی دونوں ٹانگوں کے بیچ روکے گی۔ اسپتہ بھی نہیں چلے گا کہ وہ وہاں جا رہی ہے اور ان لوگوں سے مدد لے رہی ہے جہاں ھم چاہتے ہیں۔ ھم ایک طرف سے اسے دبائیں گے اور دوسری طرف سے اسے پچکاریں گیا ور سہارا دینگے وہ ہماری آغوش میں ہمیں سے پوری یکسوئی اور دلجوء سے جنگ میں مشغول نظر آئے گی اور اس خوش گمانی میں مبتلا رہے گی کہ وہ بہت بہادری سے لڑ رہی ہے۔ اور پھر ھم اس کو سراہتے ہوئے اس کو مقدمہ لڑنے کے لئے سکے بھی دینگے اور دوسروں سے بھی دلوائیں گے۔ تب اسے پتہ چلے گا کہ وہ جنگ لڑتے لڑتے کہاں پہنچ چکی ہے۔ اور پھر وہ خاموشی سے ایکدن یہ محسوس کرلے گی کہ یہ جنگ اس کا پیشہ بن چکا ہے۔ اس پیشے کی دنیا میں وہ مشہور و مقبول ہو چکی ہے۔ وہ جان جائے گی کہ اب یہ جنگ اس کو اسوقت تک لڑنی ہے جب تک اس کے جسم میں کشش کی ایک کرن بھی باقی ہے'' ایک ایک جملے میں ہزار ہزار چالاکیوں کو سمیٹتے ہوئے کس طرح کوزے میں گویا دریا دکھا دیا ہے مصنف نے۔ مجھے بے اختیار کچھ یاد آ گیا۔ ٹورنٹو کے ایک شاعر نے ایک نیرا جیسی یہاں کے شاعرہ کے لئے ایک بیان دیا تھا ''فلاں (ایک بڑے شاعر) کہہ رہے تھے مجھ سے کہ سالی کو اپنی جانگ کے نیچے لے آؤ۔ دیکھو

کیسے اپنی ساری اکڑ بھول کے تمہارے اشاروں پر ناچتی ہے'' تجربات عوتوں کے ہیں ان عورتوں کے جو سوچنے بولنے اور اپنے ہونے کا حق اپنے نام محفوظ رکھتی ہیں اور کسی زور آور کے جال اور جھانسے میں نہیں آتیں۔ لیکن پیغام آفاقی وہ مصنف ہیں جو مرد ہوتے ہوئے بھی ان بیانات کو رقم کرتے ہوئے اپنے قلم کو لکنت نہیں کھانے دیتے۔ جو خود پولیس کے محکمہ میں ایک اہم عہدے پر فائز ہونے کے باوجود اس محکمے کی بدعنوانیوں پر انگلی دھر دھر کے ان کی تفصیلات دکھاتے ہیں۔ پیغام آفاقی کا تخلیقی وجدان جھوٹ کو جھوٹ، بدعنوانی کو بدعنونی خرد برد کو خرد برد کہنے کا فولادی حوصلہ رکھتا ہے انکا قلم ہر سچ کو بلا کسی تفریق کیتصویر کرتا چلا جاتا ہے۔ ہمارا سماجی نظام دو طبقات میں بٹا ہوا ہے۔ ایک طبقہ وہ ہے جو لوٹ رہا ہے اور دوسرا وہ جو لٹ رہا ہے۔ آج پوری نوع انسانی سرمایہ دارون اور محنت کشوں، آجروں اور اجیروں، مظلوموں اور ظالموں، کمزوروں اور طاقت وروں میں تقسیم ہو چکی ہے۔ طاقت وروں کیبچھائے ہوئے جال اور سجائے ہوئے یہ استحصال کے مناظر سانپ کی طرح اپنا پھن اٹھائے کھڑے ہیں ہمارے اطراف۔ زندگی کی مادّی، روحانی اور تخلیقی صلاحیتوں کے انمول خزانے پر بیٹھے یہ سانپوں کے آلہ کار اور مددگار ہر مذہب کے ''ملا'' سیاسی رہنما اور انکے دستر خوان کے نمک حلال ہیں۔ اس وقت پوری دنیا کو کن مشکلات کا سامنا ہے وہ جانتے ہیں اور یہ بھی جانتے ہیں کہ خود کو اپنا پرسہ دینے کے بجائے کچھ کرنا ہے۔ اس جان کاری کی بے چینی اور اس بے چینی کا حل ان کا ناول ''مکان'' ہے۔

پیغام آفاقی جانتے ہیں کہ ایسے میں فنون لطیفہ سے تعلق رکھنے والے ہر ادیب ہر شاعر اور ہر فنکار کو بیک وقت کئی محاذوں پر اپنی جنگ لڑنی ہے اور اپنے فن کو بلا تفریق و امتیاز سچ کا فرض ادا کرنے جرائت عطا کرنی ہے۔ حقیقی مسائل کی نشاندہی کرنی ہے۔ اس حشر انگیز اور اضطرابی دور میں کوئی تخلیق کار اپنی تخلیقی ذمہ داریوں کو کیسے پورا کرے۔ لہذا وہ ''مکان'' کی فکر کے وسیع ترافق کے پس منظر میں مسائل کی نشاندھی بھی کرتے ہیں اور مرکزی کردار نیرؔا کے ذریعہ ایک عام انسان کی ہمت کو مہمیز بھی۔ پیغام آفاقی نے ناول کے مختلف کرداروں کے مکالموں کے ذریعہ دکھایا ہے کہ کوئی ادیب کس طرح ادب کا فلسفیانہ منطقیانہ اور وہ سماجی تصور باقی رکھے جس میں ہم ارسطو کے منطق کی گونج سنتے ہیں اور جسے کے ہم ادیب ترجمان بھی ہیں اور نقیب بھی۔ مکاؔن اعلی تصور حیات اور سماجی نصب العین کا خاکہ بھی ہے اور دستور بھی یہ سماج کی منفی قدروں کو بڑی کاری ضرب لگاتا ہے اور وہ تمام کردار جو ان منفی قدروں کی پشت پناہی کرتے ہیں ایک ایک کر کے بے نقاب کرتا چلا جاتا۔ جس کی ایک بھرپور مثال الوکؔ کا کردار ہے۔ ڈاکٹر مولا بخش نے ناول کے پیش لفظ میں الوکؔ کو پیغام آفاقی کا ہمزاد قرار دیا ہے۔ اور بجا طور پر قرار دیا ہے کہ الوکؔ کی سوچ اور اس کے کر

دار میں پیغام آفاقی کی اپنی ذات اور انکے عہدے کی جھلکیاں صاف دکھائی دیتی ہیں لہذا وہ لا شعوری طور پر بھی اس کو انسانی فطرت سے ماورا کوئی تصوراتی کردار بنا کے پیش کر سکتے تھے۔لیکن انہوں نے اس کردار کے کمزور (یا فطری کہہ لیجئے) پہلو سے صرف نظر نہیں کیا اور پورا سچ لکھنے سے اپنے قلم کو نہیں روکا۔پیغام آفاقی کی تخلیقی بصیرت، کردار شناسی، مجموعی حسیت اور زندگی کو ذاتی نقطۂ نظر کیعلاوہ کائناتی نقطۂ نظر سے دیکھنے کی صلاحیت نے ''مکان'' میں انسان کو انسان سے متعارف کرایا ہے اس انسان کو جو بے پناہ صلاحیتوں کا مالک ہے وہ انسان نیرا کے روپ میں اعلان کرتا ہے

''میں حقیقت کو تسلیم کرنے نہیں حقیقت کو بدلنے نکلی ہوں''

ناول کے طویل مکالمے اور نیرا کی طویل خود کلامی ممکن ہے کچھ صاحبان نقد کے لئے قابل قبول نہ ہوں لیکن اگر ایک بار ان کی گہراء میں اتر کے ان کے ساتھ جم کے بیٹھ جائے قاری تو فکر کے نئے دریچے کھلنے لگتے ہیں۔دراصل اس ناول کو پڑھتے ہوئے اندازہ ہوتا ہے کہ پیغام آفاقی اس فکر کے قائل ہیں کہ کوء رائے رکھنے کا مطلب یہ ہیکہ اسے پوری قوت سے پیش کر دیا جائے۔انکی وہ رائے یا وہ عقیدہ کیا ہے جو وہ مکان کے صفحات میں پوری سچائی سے پیش کر رہے ہیں؟

وہ رائے یا عقیدہ یہ ہے کہ وہ انسانوں کے درمیان ظالم اور مظلوم کے علاوہ کسی تفریق کو نہیں مانتے۔ظالم کے خوف کو وہ مظلوم کی جھوٹی سی ماچس کی ڈبیا سے کیسا تیلی تیلی جلا کے راکھ کرتے ہیں دیکھئے۔نیرا ایک ماچس کی ایک ڈبیا خریدتی ہے ایک پارک میں ایک اونچی چٹان کے نیچے ایک چھوٹے سے پتھر پر بیٹھ جاتی ہے۔وہ ماچس کی ڈبیا کھولتی ہے اور ایک ایک تیلی کر کے جلاتی ہے اس خوف کے نام کہ اگر میں نے کمار سے جھگڑا کیا تو میری پڑھائی خراب ہو جائے گی آج اس خوف کو جلا کے فنا کر رہی ہوں اس خوف کے نام کہ لوگ مجھے تھانے اور کچہری جاتے دیکھ کے کیا کہیں گے۔تیسری، چوتھی پانچویں تیلی جلاتی ہے اور اپنے اندر کے خوف کے جلا جلا کے پھینکتی جاتی ہے''پولیس اسٹیشن سے لگی امیدوں کے نام'' کمار کے نام، راکیش کے نام، غنڈوں کے نام غرض وہ ہر خوف کو ماچس کی چند تیلیوں سے جلا کے راکھ کر دیتی ہے۔ ان جلتی ہوء تیلیوں میں اس نے آخری تیلی جلاتے ہوئے کہا''یہ آخری تیلی ــــــــ ان تیلیوں کے نام ـــ کہ میں رشتوں کے اس شمشان گھاٹ تک کو یاد نہیں رکھنا چاہتی''اس ناول کو پڑھتے ہوئے میں نیرا کی اسی ماچس کی تیلی سے ایک شمع روشن کرنا چاہون گی''مکان'' کے نام اور پیغام آفاقی کے تخلیق منشور اور فکری وجدان کے نام''

خاکیہ نظمیں

سلیم شہزاد

چیونٹیوں کی چال چلتے لفظوں لفظوں کے تعاقب میں رینگتا ، اپنی نظم کی حسیّت کو دھیرے دھیرے بڑھاتا حفیظ تبسّم جب نثری نظم کے میدان میں اترتا ہے تو اس کے وجود پر سچ کی خراشیں واضح طور پر دِکھائی دیتی ہیں۔ وہ ان خراشوں کو لفظوں میں بدل کر خاکیہ نظم تشکیل دیتا ہے۔ لیکن یہ نظم اس کی دل جوئی کرنے کی بجائے ان خراشوں کو نقادی نظروں سے چھیلتی رہتی ہے۔ ہم جس عہد میں نظم کی تنہائیوں کو ساتھ لے کر اپنی نیندیں اپنے سوتیلے خوابوں کی نظر کر رہے ہیں وہاں یا تو خواب دکھانا سرے سے ممکن ہی نہیں اور جہاں ایک آدھ ادھورا خواب ہم اپنی پتلیوں سے نیچے اتارتے ہیں تو لفظوں کے چابک اسے نظم بننے سے روک دیتے ہیں۔ یہ المیہ ہر اُس لکھاری کا ہے جو خوابوں کی پوٹلی کو آنکھوں کی پتلیوں سے باندھ کر، اس قحط الرجال میں صدائیں لگا کر آشاؤں کی بستی میں اُمنگوں کے شہر بسانا چاہتا ہے۔

’وہاں تان سین سے سُر ادھار لے کر
گا رہا ہے کائنات کا نیا گیت
اور پرندے وحشت میں تالیاں بجاتے
فرضی اذان دے رہے ہیں‘‘
(بانجھ موسم میں خوشبو کا گیت: علی زاہد)

گلوبلائزیشن کے اس دور میں جہاں دنیا سمٹ کر مائیکرو چپ کے وجود میں سما چکی ہے وہاں مرکنٹائل کلاس اپنے جبری پنجوں سے عام آدمی کی رگوں سے آخری بوند بھی نچوڑ کر اس نوآبادیاتی دنیا کو انتشار کے اس دہانے پر لا کھڑا کرنا چاہتی ہے جہاں انسانیت اپنے وجود سے بھی متنفّر ہو جائے۔ اس متنفّر وجود کو موجودیت کا احساس صرف اور صرف وہ شاعر یا ادیب کر سکتا ہے جس کی حسّی سطح احساس کی بلند سطح سے بھی آگے ہو۔ اگر ہم اپنے موجودہ عہد پر نظر ڈالیں تو ہمیں واضح طور پر نظر آتا ہے کہ اس استبداد کے خلاف وہی آواز سُنائی دیتی ہے جو عہد موجود میں وجود کی کرچیوں کو سمیٹنے کی سعی کر کے صدائے احتجاج بلند کرتی ہو۔ ایسی آواز انسانیت کی تذلیل پہ سرنگوں

ہونے کی بجائے سر بلند ہو کر اپنے معاشرے کے اجتماع مفاد کو ترجیحی بنیادوں پر اپنے ادب کا حصّہ بناتی نظر آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں مزاحمتی ادب کی جڑیں مضبوط سے مضبوط تر ہوتی جا رہی ہیں کہ ہم اس سرمایہ دارانہ نظام کے سامنے ہمیشہ سے سر اٹھا کے کھڑے ہیں۔

میرا خیال ہے کہ عہد جدید کے پیچیدہ معاشی، معاشرتی اور نفسیاتی مسائل نے جہاں پوری دنیا کو الجھنوں میں گرفتار کر کے سلجھنے کی کوئی راہ نہیں سجھائی تو یہ سانحہ حفیظ تبسّم کے ساتھ بھی ہوا۔

''اس نے خواب سے خالی پنجرہ
روح کے درخت پر لٹکایا
تو اداسی پھیل گئی''

(ارشد معراج: اپنی ذات کے تعاقب میں)

اس اداسی نے حفیظ تبسّم کے وجود پر نظمیں لکھنی شروع کر دیں۔ اُس کا وجود کائنات کے دُکھ جھیلتا عہد جدید کا آئینہ بن گیا جہاں عوام الناس کی دم توڑتی مزاحمت کا منظر نامہ لکھا جا رہا تھا۔ وہ نظمیں لکھتے لکھتے ایک ایسے اساطیری ماحول میں داخل ہوا جہاں شخصی خاکے اس کی اُور دیکھے اور نظمانے کے طلب گار بن جاتے۔ وہ گھبراتا نہیں۔ خاکیہ نظموں کی جانب متوجہ ہوا۔ وہ جوں جوں دیکھتا جاتا، نظمیں اس کے وجود سے پھسلتی جاتیں:

''وہ قدیم پیڑ کی سوکھی شاخوں سے ہاتھ ملاتے
سوال کرتا ہے
جہاں ٹہنیوں سے ہزاروں پتے جدا ہوئے
پیڑ مسلسل خاموش ہیں
وہ نہیں جانتے یہ انسان
کاغذ، قلم اٹھائے کس راز کی تلاش میں ہے''

پابلو نیرودا: چلّی کا آخری سلام

''ماہی گیر پانی میں قدم رکھتے ہیں
تم کتابوں کے کمرے میں
جب جال پھینکا جاتا ہے
تم لکھنے کی میز پر بیٹھ جاتے ہو
جب پہلی مچھلی جال میں پھڑ پھڑاتی ہے

تم نظم شروع کرتے ہو'‘
(افضال احمد سیّد: ایک معذرت کا تکلّف)

حفیظ تبسّم انسانیت کی پل پل گھمبیر ہوتی صورت حال کے باوجود روشنی کے وجود کا منکر نہیں ہے۔ فکر وفن کی تازگی ہر لمحہ تلاش کرتے رہنا اور فلسفہ انسانیت کی اساس کو اپنے احساس سے جوڑے رکھنا اس کے ادبی سفر کا اثاثہ ہے۔ نئی نظم کے سفر میں جب وہ دیکھتا ہے کہ نظم اپنی ہیئت اور نئے پیرائیہ اظہار کے ساتھ عہد جدید کی معنی آفرینی کو ساتھ لے کر چلنا چاہتی ہے تو وفورِ ذات کے مکمل پھیلاؤ کے ساتھ نئی لفظیات کی نئی معنویت سے
یوں ملاپ کرتا ہے کہ حیرت بھی انگشتِ بدنداں لفظوں کی چرخی پہ گھومتی نظر آتی ہے ۔

''تمہارے دن کے چہرے پر رات کے نشان ہیں
جو چمگادڑوں کو آوارہ گردی کے لائسنس جاری کرتی ہے
اور تمہارے سائے سے درخت اُگائے گئے
جو دھوپ میں بیٹھے نوحہ پڑھتے ہیں
اور تمہاری آنکھوں سے بارش کے قطرے ایجاد ہوئے
جو بن پھول پودے پر برس کر ختم ہو گئے
اور تمہاری یادداشت کے گلے میں نایاب پرندہ بولتا ہے'‘
(علی محمد فرشی: خودکشی کے مقدمے کا آخری گواہ)

''پہاڑوں پر برف باری کے دنوں میں
تیز ہوائیں خیمے کے بدن پر انگلیاں پھرتی ہیں
الاؤ کے گرد رفتہ رفتہ
زہریلی خاموشی کی وباء پھیل جاتی ہے'‘
(صغیر ملال: آخری داستان گو)

تکنیکی اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو حفیظ تبسّم کی نظم کا ایک اہم پہلو اس کا پہلو دار ہونا ہے۔ اس کی نظم پرت در پرت وا ہوتی ہے۔ وہ اکہری پرت کی نظموں پر یقین نہیں رکھتا۔ لفظوں کے چناؤ میں یوں احتیاط برتتا ہے جیسے انگارے چُن رہا ہو:

''تمہارے پاس ایک چیخ ہے
جو ذلت کے اسیر دماغ سے نکل کر

معتوب معاشرے کی کتاب میں محفوظ ہے
میں اس کتاب کا مطالعہ کر کے
شاعری کی تہہ میں اترنا چاہتا ہوں‘‘
(ملاقات کا دعوت نامہ: انورسن رائے)

’’پہاڑوں پر خون کی بارش ہوتی ہے
درخت فرار سے پہلے
الّو کی خوفزدہ پکار سنتے ہیں
جو بغیر نوحے کے موت کا اعلان کرتا ہے
کیونکہ ان دنوں
خاموش کھنڈروں کے درمیان نوحہ گری ممنوع تھی‘‘
(پہاڑوں کا نوحہ گر: فیصل ریحان)

تاہم حفیظ کی نظموں کی قرات کے دوران اکثر یہ گمان گزرتا ہے کہ قاری سے کچھ ایسے امور کا بھی متقاضی ہے جن کا وہ سزاوار نہیں۔ ’’دشمنوں کے لیے نظمیں‘‘ ڈرامائی خود کلامی کی ایسی قسم ہے جس میں Interlocator شاعر اپنے دوستوں کی خوبیوں کو احساس کی اس سطح پر لے جا کر بیان کرتا ہے جہاں قاری حیرت زدہ ہو کر سوال کرتا ہے کہ:

’’میں ان کرداروں کو حفیظ تبسّم کی نظر سے دیکھوں یا اپنی اس باریک بیں نظر سے جانچوں جس کا میں حق محفوظ رکھتا ہوں؟ اگر میں حفیظ تبسّم کی نظر سے دیکھوں تو اکثر کردار ادھورے کیوں نظر آتے ہیں! اور یہ کہ خبر کے متن کو محفوظ رکھ کے مجھے سرخیوں سے کیوں بہلایا جا رہا ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ حفیظ تبسّم اپنی شاعری کے رومان میں خود گرفتار ہے؟ وہ جس رنگ کا چشمہ لگا کر ان شخصیات کو دیکھ رہا ہے اُسی رنگ کے چشمے سے مجھے بھی دکھانا چاہتا ہے جبکہ میں نو ان میں سے بہت سی شخصیات کو جانتا تک نہیں۔ میں اس کی آنکھ سے کیسے دیکھ سکتا ہوں؟ حفیظ تبسّم تم نے شاید مجھے تماشائی سمجھا ہے، قاری نہیں! میں چاہتا ہوں تم مجھے قاری سمجھ کر میرے وجود میں یوں اُترو کہ میں تمہارے وجود کا پرتَو بن جاؤں نہیں تو میں تمہاری شاعری سے الگ ہو کر تمہیں اجنبیت کی آنکھ سے دیکھنے لگوں گا۔‘‘

’’ایسا تو گئے وقتوں میں شیکسپیئر کے دور میں ہوا کرتا تھا جب مجھ ایسے تماشائی گلوب تھیٹر کے صحن میں مبہوت کھڑے سہ پہر کی گرمی کے باوجود، محض کرداروں کے مکالموں کے سحر میں مبتلا ہو

کر خود کو اس ماحول کا حصّہ سمجھنے لگتے جہاں انہیں محسوس ہونے لگتا کہ خون جما دینے والی سرد رات کا پچھلا پہر ہے اور ہم بیتی رات کے اندھیرے میں کمبل اوڑھے کھڑے ہیں۔'' گلوبلائزیشن نے جہاں مختلف چیزوں کو اتھل پتھل کر کے نئے رنگ میں ڈھال دیا ہے وہاں ادب بھی اتھل پتھل ہو کر تنقید کے نئے زاویوں کا متقاضی ہو گیا ہے۔ اگر ادب جدّت کی کروٹیں بدل رہا ہے تو یاد رہے کہ قاری بھی نئے ماحول میں تربیت پا کر ادب فہمی کی سعی کر رہا ہے۔

نئے دور کے تخلیق کار کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے موضوعات، اسلوب، تکنیک اور کرافٹ کو اس طرح برتے کہ عہد جدید کی تہذیب کے سارے پہلو اس کے قلم میں سمٹ کر لفظوں کے آئینوں میں اپنی شناخت تلاش کر سکیں اور یہ کام وہی ہنرمند کر سکتا ہے جو اس کٹھن معیار پر پورا اُتر سکے۔

۵۸لفظوں میں ''ذہن کی دیوار پر دستخط'' کرتے کرتے ''کچھ یاد رہ جانے والے خواب'' سمیٹنے والا حفیظ تبسّم ''ڈائری کے ورق کی گردانی کے دوران'' اپنے خیال کو مقامی مٹی سے گوندھ کر اساطیری کردار سازی کرنے والا شاعر ہے جس نے موجودہ نظم کو اپنی دسترس میں لا کر اپنے اسلوب کی بنیاد رکھنے کی بھرپور کوشش کی ہے کہ وہ نظم کے چنیدہ ناموں میں آ سکے مگر میرے خیال میں ابھی نہیں! لیکن آنے والے وقت میں اگر وہ اپنے اسلوب کو واضح طور پر دریافت کرنے میں کامیاب ہو گیا تو شاید آنے والے زمانے اس کی راہ میں لفظوں کے پھول بچھائے اس کے منتظر ہوں۔

''تمہاری نظمیں خواہش اور دکھ کے درمیان
زندگی کے ایک حصّے کو بچانے کا تحریری معاہدہ ہیں
تمہاری نظمیں وقت کے عجائب گھر میں رکھی تصویریں ہیں
جو تنہائی کے بے رنگ کپڑے سے ڈھانپ دی گئی ہیں''
(عارفہ شہزاد: ایک اَن لکھی کتاب کا مسودہ)

'گرد بار': ایک مزاحمتی ناول

سبین علی

کچھ گرہیں ہاتھوں سے لگائی جاتی ہیں اور دانتوں سے کھولنا پڑتی ہیں۔ سرد جنگ کے دوران جو عالمی طاقتوں کی رسہ کشی میں ہمارے خطے کو میدان جنگ بنایا گیا اس نے ان ممالک کی سرزمینیں اور باشندے تو محفوظ رکھے مگر ہمارے بہت سے شہریوں کو منشیات، شدت پسندی کے گرد بار اور عام عوام کو دہشت گردی کی ان گہری کھائیوں میں دھکیل دیا جن سے ہم آج تک نبرد آزما ہیں۔

محمد عاطف علیم کے ناول گرد بار کا دور صدر ضیاء کے مارشل لاء میں شروع ہوتا ہے اور کوئی دس برس کے عرصے پر مشتمل سیاسی سماجی اور جاگیرداری نظام کے جبر تلے پروان چڑھتے کرداروں کو سامنے لاتا ہے۔ ناول کے فیوڈل کرداروں سے مصنف کی بیزاری کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان کرداروں کو آخر تک بے نام رکھا گیا اور انکا تذکرہ ناول میں چودھری فلانا اور ملک ڈھمکانا کے ناموں سے کیا گیا ہے۔ البتہ مرد مومن مرد حق کا نام اور نظام کھل کر زیر بحث لایا گیا ہے۔

جتنا تبرا اردو ادب میں صدر ضیاء کے مارشل لاء اور پالیسیوں پر بھیجا گیا اس کی مثال ادب کی دنیا میں خال خال ہی ملے گی اردو میں مزاحمتی ادب کا ایک بڑا ذخیرہ اس دور کی کہانیوں پر مشتمل ہے جس دور میں تحریر و تقریر پر سخت پابندیاں تھیں۔ اخبار میں سنسر کی ہوئی خبروں کی جگہ خالی چھوڑ دی جاتی تھی۔

اس ناول گرد بار کی مرکزی کردار ایک عورت ہے۔ ایک پسی ہوئی عورت شمو جو فیوڈل سسٹم کے جبر کے سائے میں پروان چڑھتی ہے اور مطلب نکل جانے پر استعمال شدہ ٹشو پیپر کی مانند پھینک دی جاتی ہے۔

دھیرے دھیرے شمو کی کہانی اس دور میں عورت پر بڑھتے سماجی اور نئی مذہبی تفہیم کے دباؤ کا شکار ایک مظلوم عورت کو سامنے لاتی ہے۔ حالات کے جبر کا شکار ہونے کے بعد یہی عورت اس نظام کے ردعمل میں تن تنہا مزاحم بھی ہو جاتی ہے۔ گاؤں میں پنچائت کا نظام جو شمو کو اجتماعی جنسی

زیادتی کا نشانہ بناتا ہے وہیں شہر کے معروف عدالتی نظام میں بھی اسکی کوئی شنوائی نہیں ہوتی۔ اس ناول کی مرکزی کردار شمو بالآخر فیوڈل سسٹم کے سینے میں خنجر تو گھونپتی ہے مگر عدالتی اور سیاسی نظام اسے کسی قسم کی مدد فراہم کرنے کی بجائے طبقہ اشرافیہ کا ہی مددگار نظر آتا ہے۔ اس کا شجرہ نسب بھی موجو موچی جیسا پست اور معاشرے میں رزیل ترین گردانا جاتا ہے تو یہی مشترکہ ذلت اور درد ناول کے ان دو انتہاؤں پر موجود کرداروں کے بیچ اپنی شناخت کے بحران کے کرب کا رشتہ بھی استوار کر دیتا ہے۔ شمو اسی کی دہائی میں جہاں مزاحم عورت کی علامت ہے وہیں اس دور میں عورتوں پر بڑھتے سماجی و مذہبی دباؤ اور اس کے مضمرات کا بھی استعارہ ہے۔ ناول میں ایک خاموش عورت زلیخا بھی نظر آتی ہے جو شمو کی مانند مزاحم نہیں ہو پاتی مگر خواہش کرتی ہے کہ وہ بھی دار پر چڑھ جاتی مگر خود پر ہوئے ظلم کا بدلہ لے پاتی۔

اس ناول میں سیاسی خانوادوں اور اعلی افسران کے قدموں تلے روندی ہوئی زرعی سماج کی کمتر گردانی گئی پرجاتیاں (انہیں انسانی حقوق کہاں حاصل ہو پائے ہیں کہ شہری یا انسان گنے جائیں) کیڑے مکوڑوں کی مانند کچلی نظر آتی ہیں جب وہ ایک گرداب سے نکلنے کی تگ و دو کرتی ہیں تو کوئی دوسرا گرداب کوئی نیا واورولا ان کا منتظر ہوتا ہے اور انہیں کے بیٹے جنگوں کا ایندھن بنتے ہیں انہیں کے ماس ادھڑتے ہیں انہیں کی روح گھائل ہوتی ہے۔

’سدھارتھ‘ کو پڑھنا، بسر کرنا خود کو

شہزاد وریا

میرے پیشِ نظر اس وقت آصف فرخی کا ترجمہ کیا ہُوا ناول ’’سدھارتھ‘‘ ہے۔ کیسا خوبصورت ترجمہ ہے۔ اس ناول کی فضا اور زبان ایک ساتھ مل کے طبع زاد تحریر کا گماں پیدا کر رہی ہے۔ سدھارتھ کا موضوع بہت مختلف ہے اتنا مختلف جتنا ہم ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہوتے ہیں۔ ہم دوسرے کو نہیں جان سکتے۔ سدھارتھ دریا کے کنارے کھڑا ہے اور پانی کو دیکھتا ہے اور محسوس کرتا ہے کہ پانی بہتا ہے اور بہتا چلا جاتا ہے اور پھر بھی ہمیشہ وہیں رہتا ہے اور ایک سا رہتا ہے لیکن ہر لمحہ نیا بھی ہوتا ہے۔ کون ہے جو دنیا میں سکون اور روحانی خود آگہی پانا نہیں چاہتا؟؟ ہر شخص سکون کا ہی تو متلاشی ہے اب وہ یہ سکون کہاں سے حاصل ہوسکتا ہے؟ خود آگاہی کہاں سے ملے؟

دور حاضر میں زیادہ تر ناول سیاسی، سماجی، معاشرتی اور معاشی مسائل کے متعلق تو موجود ہیں لیکن ایسی تحریریں کم دکھائی دیتی ہیں جن سے انسان اپنی ذات میں جھانک سکتا ہو۔ خود آگہی کی کوئی داستان کہیں کم ہی سنائی دیتی ہے لیکن جب میں ہرمن ہیسے کا ناول سدھارتھ پڑھا تو مجھے احساس ہو کہ یہ تحریر عرفان ذات کا مکمل احاطہ کرتی ہے۔

2 جولائی 1877 کو جرمنی کے ایک چھوٹے سے شہر کالو (Calw) میں پیدا ہونے والا یہ بچہ جب چھ سات برس کا ہوا تو اس کے والدین نے محسوس کرلیا کہ ان کا بچہ غیر معمولی صلاحتیوں کا مالک ہے مگر اس کے والدین مسیحیت کیلئے وقف تھے۔ اس واسطے انہوں نے اس پر بھرپور توجہ نہ دی۔ وہ مذہبی تعلیم دینے والے سکول سے بھاگ گیا۔ ہرمن ہیسے نے کتب کی خرید و فروخت کے کاروبار سے وابستگی اختیار کی‘ اخبارات فروخت کئے‘ گھڑی ساز بنا رہا مگر اسے مطالعے کا بہت شوق تھا‘ اسے جو کتاب ملتی‘ اسے پڑھ ڈالتا۔ ایک موقعہ پر اس نے خودکشی کرنے کی کوشش بھی کی۔ ۱۹۱۱ء میں ہرمن ہیسے نے سیلون، سنگاپور، سماٹرا اور انڈیا کا سفر کیا۔ ۱۹۱۲ء میں اس نے جرمنی کو خیر باد کہا۔ ۱۹۱۶ء کی بات ہیسے کے والد کی وفات ہوئی، اس کا بیٹا ایک شدید بیماری کا شکار ہوا اور اس کی بیوی پاگل ہوگئی۔ ۱۹۱۹ء میں اس نے اپنی تحریروں اور جوابی خطوط کے ذریعے جرمن

نوجوانوں کی ذہنی وروحانی جلا کے لیے کاوش کی۔۱۹۲۳ء میں ہیسے کوسوئس نیشنلٹی مل گئی۔۱۹۴۶ء میں ہرمن ہیسے کوادب کا نوبل پرائز دیا گیا۔ ہرمن ہیسے 9 اگست 1962ء کو 85 سال کی عمر میں انتقال کر گئے۔ بنیادی طور پر اپنی تین شاہکار ناولوں سدھارتھ، اسٹیفن وولف اور دی گلاس بیڈ گیم کے لیے جانے جاتے ہیں۔اب آتے ہیں سدھارتھ کی طرف۔

سدھارتھ (انگریزی: Siddhartha) ہرمن ہیسے کا ناول ہے، جو اس نے 1922ء میں لکھا۔۔سدھارتھ، ہرمن ہیسے کا نواں ناول ہے، جواس نے جرمن زبان میں لکھا۔ امریکا میں ناول پہلی بار 1951ء میں شائع ہوااور 1960ء کی دہائی میں اس کے اثرات ظاہر ہوئے۔ہیسے نے ناول کے پہلے حصے کا انتساب روماں رولاں کےاوردوسرے حصے کا اپنے قریبی رشتہ دار ولیلم گرڈٹ کے نام کیا۔لفظ سدھارتھ سنسکرت کے دوالفاظ سے مل کر بنا ہے،ایک سدھ جس کے معنی ہیں حاصل کرنا (جس کی تلاش تھی) اوردوسرا لفظ ارتھ (طبعی یا مادی حصول)،اس مرکب کا مطلب ہے وہ جس نے جان لیا ہے(وجودکو) یاوہ جس نے اپنے مقصد کو پالیا۔سدھارتھ جوایک برہمن بھی ہےاورامیرزادہ بھی وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس میں مذہبی اکتاہٹ پیدا ہو جاتی ہےاور بہت سے سوالات کا متلاشی بھی اوراس کے اندرایک نیا احساس کروٹ لیتا ہے کہ خود آگہی سیکھنے سکھانے سے نہیں آتی۔خودکی تلاش کے لیے وہ اپنا شاہانہ طرز زندگی چھوڑ کرسنیاسوں اور جوگیوں کے ساتھ رہنا شروع کر دیتا ہے جوملتا ہے کھالیتا ہے کھالیتا ہے کچھ نہیں ملتا تو صبر کر لیتا ہے۔اس کا بچپن کا دوست گووند بھی اس کے ساتھ نکل آتا ہے۔اس دوران وہ تین ہنر سیکھ لیتا ہے پہلے اس کو بھوک زیادہ لگتی ہے اب وہ آسانی سے اس کو برداشت کرسکتا ہے۔ پہلے انتظار بہت مشکل تھا اب انتظار کرسکتا ہےاوراس کے غوروفکر کی صلاحیت بہت زیادہ ہوگئی ہے پھراس سے اگلا مقام حاصل کر لیتا ہے وہ ایک جسم سے دوسرے جسم میں آسانی سے داخل ہوسکتا ہیمگر سدھارتھ کے نزدیک ان کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔

اس کولگتا ہے جواس سے سیکھا اس کواس کی تلاش نہیں کسی اورادراک کی ہے وہ ان کو چھوڑ کے جانے لگتا ہےتو اسے کہا جاتا ہے کہ وہ اگر وہاں مزید رکےتو بوڑھا سادھو اسے پانی پر چلنے کا ہنرسکھانے پرآمادہ ہے۔مگرسدھارتھ کہتا ہے کہ اسے پانی پر چلنے کی کوئی خواہش نہیں۔تین برس کے بعداس نے گوتم بدھ کے بارے میں کچھ سنااور پھروہ گووند کے ساتھ گوتم بدھ سے ملتا۔گوتم بدھ سے ملاقات کافی ایمان افروز ہوتی ہے۔گووندتو گوتم بدھ کےحلق؟ ارادت میں شامل ہوجاتا ہےلیکن سدھارتھ گوتم کی عظمت اورروحانیت کوتسلیم کرنے کے باوجوداپنی جستجو کوخودمکمل کرنا چاہتا ہے۔سو اس نے رگ وید، اتھروید اورسنیاس کی تعلیمات چھوڑ دیں اورخوداپنی شاگردی اختیار کر لی۔اس

نے خود سے سیکھنا شروع کیا کہ سدھارتھ میں کیا اسرار ہیں۔

جس دنیا سے اس کو کبھی نفرت تھی اب اس کو اسی سے محبت ہو جاتی ہے یہ دنیا میں واپس تو آتا ہے لیکن اپنے باپ کے گھر نہیں جاتا۔ جب وہ شہر کی طرف آ رہا ہوتا ہے تو راستے میں اس کو ایک واسو دیو ملاح ملتا ہے جو اس کو دریا عبور کروانے مین مدد دیتا ہے لیکن یہ اس کو بتاتا ہے کے میرے پاس تمہیں دینے کے لے کچھ نہیں ہے۔ شہر میں اس کو ایک طوائف ملتی ہے جس کا نام کملا ہوتا ہے یہ اس کے عشق میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ اسی کے توسط ایک تاجر سے شراکت داری کرتا ہے۔ تین سال اس نے جو صبر اور شعور کے ہنر سیکھے تھے ان کی بدولت وہ محبت اور کاروبار دونوں میں بہت کامیاب ہوتا ہے۔ بہت امیر آدمی بن جاتا ہے۔ پہلے پہل یہ سب کچھ اس کے نزدیک ایک کھیل سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا مگر وہ آہستہ آہستہ عزت، دولت، طاقت، محبت، امید اور توقعات کی دنیا میں جذب ہوتا چلا جاتا ہے اور اس کو یہ سب بے معانی لگنے لگ گیا پھر ایک دن کملا سے ملنے گیا تو اس کا سدھارتھ پھر اس کے اندر انگڑائی لیتا ہے اور یہ پھر جنگل کا رخ کر لیتا ہے اب اس کا جی چاہتا ہے میں خود کو فنا کر لوں۔ یہاں تک کے خود کو پانی میں دیکھ کر تھوک دیتا ہےجنگل میں اپنے بچپن کے دوست گووند سے ملاقات ہوتی ہے۔ گووندا اسے پہچان نہیں پاتا۔ جنگل سے سدھارتھ پھر اسی دریا کے کنارے پہنچتا ہے اور وہی ملاح واسودیوا سے ملتا ہے۔ اس بار بھی اسے ملاح کو دینے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ تعارف ہونے پر واسو دیو اسے اپنی جھونپڑی میں رہنے کی پیش کش کرتا ہے۔ سدھارتھ نے دریا کے ساتھ رہنے کا ارادہ کر لیا۔ اس نے دیکھا کہ پانی بہتا ہے اور بہتا چلا جاتا ہے اور پھر بھی ہمیشہ وہیں رہتا ہے اور ایک سا رہتا ہے لیکن ہر لمحہ نیا بھی ہوتا ہیواسودیوا اور اپنی ریاضت سے اس میں غور وفکر کی صلاحیت میں اضافہ ہو جاتا ہے وہ دریا سے باتیں کرنے لگتا ہے اس کو اس پانی میں بہت کچھ سنائی دیتا ہے بیل کی آواز، حاملہ عورت کی آواز، راجے کی آواز، رات کے پرندوں کی بولیاں، جنگی سورما کی آواز، آدمی کی سسکیوں کی آواز اور ہزاروں دوسری آوازیں اس کے غور کا سبب بن جاتی ہیں۔ جب کلملا کو سدھارتھ کے بارے میں پتہ چلتا ہےپیشہ چھوڑ دیتی ہے اور گوتم بدھ کی چیلی بن کر اپنا باغ اور ساری دولت گوتم بدھ کے مشن کو سونپ دیتی ہے۔

کملا جب گوتم بدھ کے وقتِ آخر کی خبر سن کر اپنے گیارہ سالہ بیٹا (جو دراصل سدھارتھ سے تھا) آخری دیدار کے لیے نکلتی ہے تو واسودیو کی ناؤ کے قریب کملا کو ایک سانپ ڈس لیتا ہے۔ واسو اور سدھارتھ اسے بچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ سدھارتھ اور کملا کے درمیان وہ زندگی کی الوداعی والی ملاقات ہوتی ہیاور سدھارتھ کو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے ساتھ جو بچہ ہے وہ اسی کا بیٹا ہے۔ پھر کملا مر جاتی ہے اور سدھارتھ کا بیٹا اس سے باغی ہوتا ہے اور وہاں سے بھاگ

ہو جاتا ہے۔سدھارتھ اس کی تلاش کرتا ہے اس کی تلاش میں جہاں کملا سے پہلی ملاقات ہوئی تھی اسی شہر میں پہنچ جاتا ہےلیکن بیٹا نہیں ملتا اور واسودیو اسے جھونپڑی میں واپس لے آتا ہے۔دریا کنارے پر ایک بار پھر سدھارتھ کی گووند سے ملاقات ہوتی ہے اور اس بار بھی گووند اسے پہچان نہیں پاتا۔سدھارتھ کے مرنے کر وقت گووند اس کے پاس ہی ہوتا ہے اس کو سدھارتھ کے چہرے پر گیان کی روشنی دیکھائی دیتی ہے

حسن معراج کی تازہ کتاب ''ریل کی سیٹی''

فرنود عالم

حسن معراج کی تازہ کتاب ''ریل کی سیٹی'' آپ کی میز پر رکھ دی جائے تو نظر پڑتے ہی پہلی نظر میں کیا یاد آئے گا؟ یقیناً انتظار حسین کا افسانہ ''کٹا ہوا ڈبہ'' یاد آئے گا۔ انتظار حسین کا تو ایک ایک تجربہ دراصل ہجرت کے مشاہدات سے نچوڑا ہوا یادوں کا جام سفال ہے۔ یہ سوچتے ہی آپ کچھ دیر کو انتظار حسین کے سحر میں گم ہو جائیں گے۔ اول دل بیٹھ سا جائے گا کہ اس ''بستی'' میں اب وہ بردبار مسکراہٹ نہیں رہی، پھر جی اس خیال سے بہل جائے گا کہ چلو ہم نے اُس ہستی کو اِس بستی میں بچشم سر دیکھا تو ہے۔ ہم اس کے عہد میں جیئے۔ کیا یہ کم ہے۔ یہ سب سوچتے ہوئے آپ حسن معراج کی کتاب کو یونہی بیچ سے کھولیں اور نگاہ ایک ایسی سطر پہ ٹک جائے جہاں آپ کو چناب کے کنارے جیلیانوالہ باغ میں سکھ فوجی دستے بھاگتے دوڑتے نظر آئیں اور خونریزی کا عالم ہو تو، تو آپ کی یادوں کا چھلاوہ ایک جست میں حسن معراج کی ریل سے اتر کر خشونت سنگھ کی اس ٹرین میں جا بیٹھے گا، جو روز ایک سرحدی گاؤں منوجرہ سے گزرتی ہے۔ منوجرہ کی آبادی سکھوں اور مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ یہاں بے خبری کا یہ عالم ہے کہ لوگ یہ تک نہیں جانتے کہ ملک تقسیم ہونے والا ہے۔ کچھ دیر کو یہاں رکنے والی ٹرین سے ہی کچھ سن گن ہو پاتی ہے کہ دور پار کے بڑے شہر کن گھما گھمیوں سے گزر رہے ہیں۔ یہ ٹرین ایک دن گزرتی ہے تو ذبح ہونے والے مسلمانوں کی لاشیں اس میں دکھائی پڑتی ہیں۔ پھر سے گزرتی ہے تو کچھ سکھ اس میں مردہ پائے جاتے ہیں۔ خبر ہو جاتی ہے کہ ملک میں کچھ اچھا نہیں ہو رہا۔ منوجرہ گاؤں میں فساد پھوٹ پڑتے ہیں۔ خشونت سنگھ ہوں، حسن معراج ہوں، چیلیانوالہ ہو، منوجرہ ہو، جنگ آزادی ہو، فسادات ہوں، ایسے میں یادوں کا چھلاوہ اگلی جست میں دور لکھنو کے قریب کاکوری اور عالم نگر سے گزرتی ہوئی ٹرین سے جا لٹکتا ہے۔ ادیبوں اور شاعروں نے ریل پر قلم اٹھایا ہے، مگر تحریک آزادی کے دو مجاہد اور شاعر و ادیب رام پرساد بسمل اور اشفاق اللہ خاں نے کاکوری سے گزرتی ہوئی ریل پہ بندوق اٹھائی تھی۔ انگریز سرکار کی لوٹی گئی اس ریل کے بغیر تحریک آزادی کا باب مکمل نہیں ہوتا۔ کیسے مکمل ہو سکتا ہے۔ اسی

''کاکوری ریل سازش کیس'' میں ہی تو رام پرساد بسمل اور اشفاق اللہ خاں کو پھانسی ہوئی تھی۔ رام پرساد بسمل نے شعر کہے، ناول لکھا، ترجمے کیے، آپ بیتی لکھی اور ریل پہ بندوق اٹھانے کی پاداش میں پھندے پہ جھول گئے۔ کچھ سانسیں اور مل جاتیں تو اسی ریل پہ وہ قلم بھی اٹھاتے۔ ہمارے شیلف میں آج خشونت سنگھ کے ناول ''ٹرین ٹو پاکستان'' کے ساتھ یہ شہکار بھی رکھا ہوتا۔ مگر تیس برس کے جوان کو وقت نے مہلت نہ دی۔ وقت تک یاد آتا ہے کہ ''ٹرین ٹو پاکستان'' جس منوجرہ گاؤں کی کہانی ہے وہاں کے مکینوں کے لیے ریل کی سیٹی کی کتنی اہمیت تھی۔ گھڑی کی سوئی سے نہیں، بلکہ ریل کی سیٹی سے یہ وقت کا اندازہ لگاتے تھے۔ منوجرہ جیسا ایک دورافتادہ وپسماندہ گاؤں ہو، دور کہیں سے ریل کی سیٹی سنائی دے جائے تو بے اختیار منیر نیازی کا شعر زبان پر آجانا چاہیے۔

صبح کاذب کی ہوا میں درد تھا کتنا منیر
ریل کی سیٹی بجی تو دل لہو سے بھر گیا

ایک وقت آئے گا کہ جب کبھی منیر نیازی کا یہ شعر سنتے ہی ذہن حسن معراج کی کتاب ''ریل کی سیٹی'' کی طرف جائے گا۔ یہ دن ضرور آئے گا۔ فی الحال تو اس کتاب hasam"\ کا بہت بڑا نقص یہ ہیکہ اس کا مصنف ابھی زندہ ہے۔ کتاب کے سرورق پر اداس سا پلیٹ فارم ہے۔ کوئی نہیں، بس ایک سناٹا ہے جو خود کلامی کر رہا ہے۔ اسٹیشن سے پرے شہر کے بیچ سے قدیم طرز تعمیر والے گنبد و مینار جھانکتے ہیں۔ گزر جانے والے قدردان قافلوں پہ نوحہ کناں۔ اس سارے منظر میں جتنی قدامت ہے، اتنا ہی دلفریب ہے۔ رومانویت تو جیسے ریل اور ریل اسٹیشن کا نصیب ٹھہر گئی ہے۔ بلوچستان کے معروف افسانہ نگار آغا گل نے اپنے ایک افسانے کا نام ''ہلی'' رکھا تھا۔ ہلی گھوڑے کو کہتے ہیں اور اس سے ان کی مراد ریل ہی ہے۔ یہ ماننا ہی پڑتا ہے کہ ترقی کے باب میں ڈبے کھینچتے اور دھواں چھوڑتے اس آہنی گھوڑے کا کردار کلیدی ہے۔ جہاز سفری ترقی کی معراج ہے۔ ترقی کا یہ سفر رکنے والا نہیں ہے۔ عنقریب ہم از راہ تفریح خلا کے چکر کاٹنے والے ہیں۔ بات اس سے بھی آگے جائے گی، مگر رومانویت کے جو پہلو ریل کے سفر میں پنہاں ہیں، وہ کسی اور سواری میں کہاں ہیں۔ انتظار حسین ہمارے دل کی بات بہت ہی سادگی سے کہتے ہیں

''ریل میں میلوں کا سفر ہے۔ ریل جنگلوں، بستیوں اور کھیتوں کے درمیان سے گزر رہی ہے۔ آپ کھڑکی کے برابر بیٹھے دیکھ رہے ہیں۔ رات کو منظر عجیب ہوتا ہے۔ سارا ڈبہ سویا ہے۔ آپ جاگ رہے ہیں۔ گاڑی رکی۔ ایک سواری خاموشی سے جھٹ پٹ اتر گئی، ایک سوار ہو رہی ہے''

رضا علی عابدی صاحب نے ریل میں مہینے بھر کا سفر کیا۔ یہ سفر "ریل کہانی" کے نام سے کتب خانوں میں محفوظ ہے۔ ریل کے سفر کی سحر انگیزی سے متعلق وہ کیا کہتے ہیں، پڑھ لیجیے

’’ریل گاڑی کی اپنی الگ دنیا ہے۔شہر کی وہ سڑک جو ریلوے اسٹیشن کی طرف مڑتی ہے، اُس پر مڑتے ہی نہ صرف ماحول کی بلکہ مڑنے والے کے شعور کی کیفیت بھی بدلنے لگتی ہے۔ وہیں سے فضا کے رنگ اور ہوا کی بو بدلنے لگتی ہے اور پھر اسٹیشن کی عمارت میں قدم رکھتے ہی اور ریل کے ڈبے میں داخل ہوتے ہی نہ صرف احساس بدلتا ہے، احساس کا مالک بھی بدل جاتا ہے۔ ریل کے ڈبے میں ہر شخص گھبرایا ہوا داخل ہوتا ہے۔ کچھ دیر بعد وہ خود اور اس کا مزاج سنبھلنا شروع ہوتا ہے۔ پھر برابر بیٹھے ہوئے مسافر سے علیک سلیک ہوتی ہے جو بعض اوقات زندگی بھر کے گہرے مراسم میں بدل جاتی ہے۔عمر بھی کی دوستیاں ہوجاتی ہیں اور خدا جانے کتنی شادیاں اور کتنے رشتے ان ہی ریل گاڑیوں میں طے ہوئے ہوں گے۔ میرا تجربہ کہتا ہے کہ انسان کو سمجھنا ہو تو اس کے ساتھ ریل گاڑی میں سفر کیجیئے۔انسانی رشتے اور محبتوں کے تعلق پروان چڑھانے ہوں تو یہ کام کسی ہوائی جہاز، بس، ٹیکسی یا رکشا میں نہیں ہوسکتا۔‘‘

چاند چاندنی، نگاہ کا خمار، زلفوں کی تیرگی، لب لعلین کی مسکراہٹ، بہار کے جھونکوں، پھولوں کی خوشبو، دریا کی لہروں، جھیل کے کناروں، بارش کی بوندوں سے جس طرح ایک ادیب کے لیے قلم بچانا ناممکن ہے، اگر ریل کے تجربے سے گزر رہا ہو تو ماننا پڑے گا کہ ریل کے رومان انگیز اثرات سے قلم کا بچ نکلنا بھی بہت مشکل ہے۔ جوش ملیح آبادی نے ریل کو اپنی نظم میں جنگل کی شہزادی کہا تھا۔اسی نظم کے ایک مصرعے ’’ایک ریل کے سفر کی تصویر کھینچتا ہوں‘‘ کو عنوان بنا کر سید ضمیر جعفری نے ایک نظم کہی تھی۔ ریل کا سفر ہو اور بات ہو نظم کی، تو پھر اسرار الحق مجاز کی نظم ’’رات اور ریل‘‘ کا ایک بند آپ کے ذوق کی نذر کرنے کی اجازت درکار ہوگی۔عرض کیا ہے

پھر چلی ہے ریل اسٹیشن سے لہراتی ہوئی
نیم شب کی خامشی میں زیرِ لب گاتی ہوئی
ڈگمگاتی، جھومتی، سیٹی بجاتی، کھیلتی
وادی و کہسار کی ٹھنڈی ہوا کھاتی ہوئی
تیز جھونکوں میں وہ چھم چھم کا سرودِ دل نشیں
آندھیوں میں مینہ برسنے کی صدا آتی ہوئی
نونہالوں کو سناتی میٹھی میٹھی لوریاں
نازنینوں کو سنہرے خواب دکھلاتی ہوئی

ریل کا سفر ادھوری حسرتوں کی ایک داستان بھی ہے۔روز اس جہانِ خراب میں کسی کی آنکھیں کسی سے چار ہوجاتی ہیں۔ابھی بات حال احوال، آپ، وہ، جی، مگر کے مرحلے میں ہی

ہوتی ہے کہ منزل آجاتی ہے۔اہل خانہ کے ساتھ بیٹھی کسی پری پیکرتک رسائی کا موقع ابھی تلاش کے مرحلے میں ہوتا ہے کہ سفرتمام ہوجاتا ہے۔وہ کون تھی کہاں سے آئی کہاں جارہی ہے،اسی شہر میں رہتی ہے کہ کسی کے ہاں کچھ پل ٹھہرنے کوآئی ہے؟اسی شہرمیں رہتی ہےتو کہاں رہتی ہے؟ابھی ایک بھی سوال کا جواب نہیں مل پا تا کہ وہ ماہ روپلوسنبھالےنظروں سےاوجھل ہوتے ہوئے پھاٹک کےاس پارکہیں گم ہوجاتی ہے۔حضرتِ جوش نے یہی تو فرمایا تھا

مڑ کر جو میں نے دیکھا امید مرچکی تھی
پٹری چمک رہی تھی، گاڑی گزر چکی تھی

اگرآپ پلک جھپکتے میں ریل کاایک سفرکرنا چاہتے ہیں تو جوش ملیح آبادی کی نظم ’’جنگل کی شہزادی‘‘ پڑھ لیجیے۔اگرآپ کے پاس فرصت ہے،اور رک رک کرٹھہر "\rail\" ٹھہرکرایک ایسا سفرکرنا چاہتے ہیں کہ آپ پٹری کے دونوں اطراف میں واقع شہروں گاؤں اور بستیوں اور وہاں کی رسوم وروایات،تہذیب وثقافت اور ہزاروں سال کی تاریخ جان پائیں تو پھرمیرے تجربے کی حدتک حسن معراج سے بہترکوئی ہمسفرنہیں ہوسکتا۔رضاعلی عابدی صاحب نے "ریل کہانی" میں کوئٹہ سےکلکتہ تک کا منظرکھینچا تھا۔حسن معراج نے پنجاب بھرکانقشہ کھینچ کےسامنے رکھ دیا ہے

حسن معراج تیزی سے گزرتی ہوئی بستیوں کا تعارف چندالفاظ میں کرواتے ہیں۔ جہاں ریل دس منٹ کورک جائے، کچھ دیراتر کر دروازے کے پاس ہی کھڑے ہوکرکہانی سناتے ہیں۔شہرکےجنکشن پہ رک جائےتو انگلی پکڑ کرشہرکی طرف لے جاتے ہیں۔ کچھ دیرکوآنکھیں بند کریں تو آپ کواٹھارہ سو اکیاسی تک اوراس سے پیچھے تک بھی لے جاتے ہیں۔راولپنڈی میں پٹریاں بچھتی ہوئی دکھاتے ہیں۔اسلام آباد کےآسیب زدہ رستوں گلیوں میں لے جاتے ہیں۔ بڑے بڑے محلات میں رہنے والے چھوٹے لوگوں کا تعارف کرواتے ہیں۔چھوٹے علاقوں کے بڑےلوگوں کی طرف چل پڑتے ہیں۔خطہ پوٹھوار لے جاتے ہیں۔ بڑے بوڑھوں سے ملواتے ہیں۔ جوکہانیاں سناتے ہیں۔ جہاں کہانی میں جھول ہوا سے حسن معراج سدھار دیتے ہیں۔ بیک وقت سیٹھ میلا رام اورصوفی رفیق اختر سے ملواتے ہیں۔دھمیل گاؤں لے جاتے ہیں۔ شہاب الدین غوری کی آرام گاہ دکھاتے ہیں۔لوگ تاریخ سناتے ہیں۔حسن معراج دھیرے سے کان میں یہ بھی بتا دیتے ہیں غوری کے چچانے غزنی شہرکوجلا کرراکھ بھی کیا تھا۔منگلا کینٹ کلوال، کالا گوجراں سے ہوتے چناب کے کنارے بٹھاتے ہیں۔ظہیرالدین بابرشیرشاہ سوری تک چلے جاتے ہیں۔ یہاں سے اٹھتے ہیں تو جہلم کا کنارہ پکڑ لیتے ہیں۔ چارسطروں میں پورے دریائے سندھ کوسمیٹ دیتے ہیں۔میاں محمد بخش کی کہانی ’’جھیل سیف الملوک‘‘ سناتے ہیں۔اگلی سانس

میں جنرل جگجیت سنگھ اروڑا کا نام لے کر چونکاتے ہیں۔اس بیچ کہیں بھوک کا احساس ہو تو مکئی کی روٹی کے ساتھ ساگ کھلاتے ہیں۔ کچھ دیر سرائے عالمگیر میں ٹھہراتے ہیں۔ یہاں بھی شریف کنجاہی کے جگ راتے سناتے ہیں۔ یہاں سے نکلیں تو کھاریاں کی چھاونی دکھاتے ہیں۔ جب پوری تاریخ سنا دیتے ہیں تو میاں جی کے ڈھابے پہ دال کھلاتے ہیں۔ ساتھ انور مسعود کی امبڑی سناتے ہیں۔سوہنی کا گجرات دکھاتے ہیں۔ گجرات کی سوہنی دکھاتے ہیں۔ جلال پور کے بیساکھی میلے میں لے جاتے ہیں۔ پھر گجرات کی دوسری طرف لے جاتے ہیں۔اچانک چناب کے دریا تک لے آتے ہیں۔آپ پوچھتے ہیں یہ کون سا دریا ہے؟ حسن معراج ایک سطر میں بات پوری کر دیتے ہیں۔ کہتے ہیں

''یہ ہمالے کی آنکھ سے ٹپکتا ہوا وہ آنسو ہے جسے مٹی بصد احتیاط سمندروں کے حوالے کر آتی ہے''

چلتے جاتے ہیں۔ وزیر آباد آتا ہے۔کوٹھی اور برج کے بیچ تاریخ سمیٹ دیتے ہیں۔ اک نکتے وچ گل مکاتے ہیں۔ یہ رہا سیالکوٹ۔ اقبال فیض کلدیپ نائر اور سر ظفر اللہ خان کا سیالکوٹ۔ راجندر سنگھ بھیدی اور وحید مراد کا سیالکوٹ۔ یہ فیصل آباد ہے۔نہیں یہ لائل پور ہے۔اگر چاہتے ہیں حسن معراج کے ساتھ سفر خواشگوار گزرے، تو حسن کے شہر کو فیصل آباد کہنے کی جسارت نہ کرنا۔ یہ بات تو حسن معراج سفر کے آغاز پہ ہی بتا دیتے ہیں۔ کنائے میں سہی، مگر وہ بتاتے ہیں کہ کراچی کی الفنسٹن اسٹریٹ کا نام زیب النسا اسٹریٹ کرنے سے وہ اسٹریٹ مسلمان نہیں ہوگئی۔ بیساکھی میلے میں بھی حسن یہی دکھڑا سناتے ہیں، کہ جو میلہ موسم سے منسوب تھا اسے مذہب سے کیوں جوڑ دیا گیا۔شاید تاریخ کے اسی جبر کو سمجھانے کے لیے حسن معراج سفر کے آغاز پہ ہی سمجھا دیتے کہ میاں!

''جب قلم کلمہ پڑھ لے پھر سب سے پہلے تاریخ کافر ہوا کرتی ہے۔ادب، مذہب اور تاریخ کی تثلیث شاید پہلے دن سے ہی سچ کے توحید کے درپے ہے''

سو یہ لائل پور ہے۔ بھگت سنگھ کا لائل پور۔ لائل پور کا بھگت سنگھ۔ بھگت سنگھ کی پھانسی تک کا سفر دو دو جملوں میں تمام ہوتا ہے۔ یہ تاریخ کوئی حسن معراج سے ہی سنے۔اس شخص نے کیا زبان پائی ہے۔ کیا ہی اسلوب پایا ہے۔ وہ بھگت سنگھ کو سولی چڑھتا ہوا بتاتے نہیں ہیں، دکھاتے ہیں۔ دیکھ کر دل بیٹھ جاتا ہے۔ خیر کی بات یہ ہے کہ ساتھ ہی وارث شاہ کی ہیر سنانے لگتے ہیں۔ نصرت فتح علی خان کا سرگم سناتے ہیں۔اس طرح جی کچھ بہل سا جاتا ہے۔سفر شروع کرتے ہیں۔ سالار سنگھ کے سالار والا تک کے قصبے حسن معراج سے نہیں چھپتے۔فوج کی نوکری تیاگ کر فلاح کا رستہ اختیار کرنے والے صوفی برکت کی کہانی سناتے ہیں تو کہتے کہتے کچھ یوں کہہ جاتے

ہیں کہ

''اب فوج میں اس کے شب و روز کیسے گزرے، یہ تو فوج میں بہت سے آزاد منش لوگ ہی بخوبی جانتے ہیں، مگر اتنا ضرور ہے کہ طاقت کے حصول اور اس کی بقا کے لیے بنائے گئے اس ادارے میں کھلے آدمی کا گزارا مشکل ہے''

یہاں آپ حسن معراج سے ایک سوال کیے بنا رہ نہیں پائیں گے کہ حضور۔! تو کیا آپ اسی لیے فوج کی نوکری چھوڑ کر اہل خانہ سمیت انگلستان سدھار گئے۔؟ حسن معراج قہقہہ لگائیں گے۔قہقہہ دیکھنا چاہتے ہیں۔؟ ''ریل کی سیٹی'' پلٹ کر دیکھ لیجیے۔قہقہے اور آنسو تو اس سفر کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ جڑاں والا سید والا شیخوپورہ یہاں تک کہ کوہ نورمل سے گزارتے ہوئے شادرہ تک لے جاتے ہیں۔اٹھارہ ستاون کی جنگ آزادی سناتے ہیں تو پوری فلم دکھا دیتے ہیں۔احمد خان کھرل کی کہانی سناتے ہیں تو تاریخ اور رامائن کا لطف بیک وقت دیتے ہیں۔دیر تک ماضی میں کھوئے رکھتے ہیں، اچانک کسی پھاٹک سے حال میں پہنچا دیتے ہیں۔ پل میں پرانا لاھور پل میں نیا لاھور۔کہیں میناروں سے بلند ہوتی اذانیں ہیں کہیں ڈھول کی تھاپ پر تھرکتے جسم۔کہیں خانقاہوں میں دم بدم ذکرِ اللہ ھو اور کہیں بالا خانوں میں سر ساگر۔کہیں عبادت خانہ تو کہیں ذکرِ مے خانہ۔کہیں فلسفہ تو کہیں تاریخ۔کبھی الٰہیات اور کبھی سیاسیات۔پل میں منطق تو پل میں ادب۔معیشت کی ٹوٹتی بندھتی سانسیں اور تہذیب کی اٹھتی بیٹھتی دھڑکنیں۔اونٹ سے جہاز تک کا سفر اور زمین سے چاند تک کی کہانی۔

یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جائے گا کہ حسن معراج مورخ ہیں کہ سیاح ہیں۔فوجی ہیں کہ صوفی ہیں۔رہنما ہیں کہ پیروکار ہیں۔مرشد ہیں کہ گرو ہیں۔جدت پسند ہیں کہ قدامت پسند ہیں۔ استاد ہیں کہ طالب علم ہیں۔مصور ہیں کہ موسیقار ہیں۔شاعر ہیں کہ مطرب ہیں۔جیسے یہ سب رنگ آپ کو مصنف حسن معراج میں نظر آتے ہیں ویسے ہی کئی رنگ آپ کو ''ریل کی سیٹی'' میں نظر آتے ہیں۔ پھر رنگ ہر رنگ میں داد طلب ہے۔کہیں کہانی کا پیرایہ ہے تو کہیں افسانے کا رنگ۔کہیں تاریخ کا ذائقہ ہے تو کہیں آپ بیتی کا عکس۔کہیں سفرنامے کا تاثر ہے تو کہیں شاعرانہ طرز۔آپ ایک سے دوسرے دوسرے سے تیسرے منظر اور اسلوب میں داخل ہوتے جائیں گے اور محو در محو ہوتے چلے جائیں گے۔

ایک سفر جس میں حسن معراج ساتھ ہوں۔تیز گام و خیبر میل کی جگہ سنگِ میل ہو۔ناصر عباس نیر بھی اس سفر کی خوشگواریوں کا اعتراف کرتے ہوں، تو بارہ سو میں یہ سفر بہت مہنگا ہے کیا۔؟

ہاورڈ فاسٹ کا ناول سپارٹیکس

تبصرہ: حنا جمشید

مترجم: شاہ محمد مری

ہاورڈ فاسٹ کا ناول سپارٹیکس سلطنتِ روم کے اُن غلاموں سے تعلق رکھتا ہے جنھوں نے تاریخِ انسانی میں سب سے پہلے اپنی غلامی کے خلاف مزاحمت کی، خون بہایا اور اپنی جانوں کے نذرانے پیش کیے۔ لیکن اٹلی کے اشرافیہ اور حکمران طبقات کے سامنے جھکنے سے انکار کیا اور اپنے حقوق کی جنگ خود دلیری سے لڑی۔ سپارٹیکس عظیم سلطنتِ روم کا وہ پیدائشی غلام تھا جسے زبردستی اغواء کر کے اٹلی لے جایا گیا اور غلامی کے ساتھ ساتھ قتل کرنے کی بھی تربیت دی گئی تھی تاکہ وہ اشرافیہ کے لیے تفریحِ طبع کا ساماں فراہم کرے۔

یسوع مسیح کی پیدائش سے کوئی ایک ہزار سال قبل اٹلی کے جنوب میں یونانی آباد تھے جبکہ مرکز میں ایک غیر آریائی آبادی ایطرسکانی سکونت پذیر تھے جنھوں نے مختلف آریائی قبائل کو زیرِ نگیں کیا ہوا تھا۔ چھٹی صدی قبل از مسیح میں جب ایطرسکان بادشاہوں کی بادشاہت ختم ہوئی تب روم، جو اٹلی کا دارالحکومت تھا، اشرافیہ کی سرزمین بن گیا، جہاں اشرافیہ کے زیرِ نگیں محکوم طبقہ، ظلم و استحصال کی چکی میں پستا رہا۔ یہ محکوم لوگ صدیوں تک اپنی غلامی سے آزادی حاصل کرنے کی جدوجہد کرتے رہے اور آخر کار کامیاب ہوئے۔

۲۴۰ قبل از مسیح میں جب سسلی کو فتح کر کے اُسے رومیوں کا مفتوحہ علاقہ قرار دیا گیا تب خزانے اور زرخیز زمینوں کے ساتھ ساتھ روم کو بے شمار غلام بھی ہاتھ آئے۔ اب حالات یہ تھے کہ روم میں غلاموں کی کثرت تھی۔ اشرافیہ کے ہر طبقے کے پاس غلاموں کی پوری فوج تھی، جن کی جان، مال، عزت، آبرو سب حاکموں کی ملکیت تھا، جنھیں ڈھنگ سے کھانا تک میسر نہ تھا۔ اُن کے پاس اپنی قوت کے اظہار کا صرف ایک ہی طریقہ تھا۔۔ بغاوت!

اٹلی کے انہی کشیدہ حالات کے تناظر میں، ۷۳ قبل از مسیح میں سپارٹیکس کی قیادت میں، وہ عظیم بغاوت ہوئی جو تاریخ میں امر ہوگئی۔ جس نے آقا اور غلام کے معنی بدل ڈالے۔ سپارٹیکس جو

ایک غلام کی اولاد ہونے کی وجہ سے اپنے بچپن میں ہی ایک سونا نکالنے کی کان میں زبردستی لایا گیا۔ کیونکہ:

''چٹان کے اندر سونے کی موڑ کھاتی ہوئی رگوں کے پیچھے پیچھے گرمی، گرد اور جسمانی مشقت کے لیے مصر یا ایتھوپیا سے کسی کسان کو ملازم رکھنا ممکن ہی نہ تھا۔ عام غلام ایک تو مہنگا پڑتا دوسرا یہ کہ وہ مر جلدی جاتا۔ چنانچہ ایسے مقام پہ قیدی بنائے گئے، سپاہی لائے جاتے جنھیں جنگ نے فولاد بنا دیا تھا، یا پھر گردنوں میں جکڑی آہنی زنجیروں کے بوجھ کے ساتھ زبردستی وہ بچے لائے جاتے جو خود غلاموں کی اولاد ہوتے۔ ظاہر ہے ایسے حالات میں صرف وہ ہی زندہ بچ سکتا تھا جو زیادہ سخت جان ہوتا۔۔'' [ص۸۶]

سونے کی کان میں غلاموں کے ساتھ ہونے والے ظلم اور زیادتی کو سپارٹیکس اپنے دل پر بارہا محسوس کیا۔ کہیں اس کے پیاروں نے اُس کی نظروں کے سامنے بھوک اور پیاس سے بلک بلک کر جان دی تو کہیں آقاؤں کے کوڑے، ان کی سیاہ جھلسی ہوئی چمڑیوں کو جگہ جگہ سے ادھیڑ ڈالتے۔ وہ اپنے دل میں بار بار ایک ہی بات دہراتا کہ غلامی دنیا کا سب سے بڑا دوزخ ہے۔

''اس وقت اچھی خاصی سردی ہے، پر غلام ننگے ہیں۔ ان کے قابلِ رحم، تشدد زدہ اور سورج کی چلچلاتی شعاعوں سے سیاہ، جنسی حصوں تک کو ڈھانپنے کے لیے کپڑے نہیں۔ وہ سامنے کی طرف اپنے بازو باندھے کانپ رہے ہیں۔ اُسے غصہ آنے لگتا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ ہر چیز برداشت کی جاسکتی ہے مگر یہ چیز بالکل نا قابلِ برداشت ہے، جب اپنا ستر ڈھانپنے کے لیے ہمیں کپڑے کا چیتھڑا تک نصیب نہیں تو ہم میں اور جانوروں میں کیا فرق رہ جاتا ہے۔۔نہیں ہم تو جانوروں سے بھی نیچ ہیں کیونکہ جب رومیوں نے اس سرزمین پر قبضہ کیا تو جانوروں کو تو چھوڑ دیا مگر ہمیں چُن چُن کر کانوں تک گھسیٹ لائے۔۔'' [ص۱۰۰]

ناول میں غلاموں کی حالتِ زار کا بیان اور وہ مناظر بہت دردناک ہیں، جہاں غلام بھوک اور ظلم سے مجبور جانوروں کی سی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ ان کی کسمپرسی کی حالت قابلِ ترس ہے۔

''غلاموں کے لیے یہ کالے پتھر کی بڑی بڑی سلوں سے بنائے گئے بیرک تھے۔ جہاں کوئی روشنی نہ تھی۔۔کئی دہائیوں کی گندگی اس فرش پر سڑ کر سخت ہو چکی تھی۔ اگر یہاں اندر کوئی مسئلہ ہو جاتا، تو خراک اور پانی روک لیا جاتا۔۔تب غلام پالتو جانوروں کی طرح پیٹ کے بل رینگتے ہوئے باہر آجاتے۔ جب اندر کسی کی موت ہو جاتی تب بھی وہی

لاش کو باہر لاتے۔ پر جب کبھی کوئی بچہ لمبی بیرک میں بہت آگے اندر مر جائے اور کسی کو اُس کا پتہ نہ چلے تو اُس کی لاش کی سڑاند بالآخر اُس کا پتہ بتا دیتی۔۔'' [ص۹۲]

اور تب جب اُسے روم کی اشرافیہ کی تفریح کے لیے بنے خصوصی خونی اکھاڑوں میں خرید کر لایا جاتا ہے، جہاں دو غلاموں کو اُس وقت تک لڑنے کے لیے چھوڑا جاتا ہے جب تک کہ اُن میں سے ایک دوسرے کا خون نہ کر ڈالے، وہ گلیڈی ایٹر تو بنتا ہے مگر اپنے ہی ہاتھ سے اپنے ساتھیوں کی جان نہیں لے پاتا۔ یہی وہ وقت تھا جب اُس نے اپنے ساتھ مزید ساتھیوں کو ملا کر پہلے اُس اکھاڑے کو برباد کیا اور پھر سلطنتِ روم سے آزادی کی ایک خونی جنگ کا اعلان کر دیا۔

''سپارٹیکس جانتا تھا کہ اگر یہ غلام بھاگ بھی جاتے تو بھی جانوروں کی طرح چَر کر زندہ رہنے پر مجبور ہو جاتے، پھر انھیں ایک ایک کر کے شکار کر لیا جاتا اور صلیب پر چڑھا دیا جاتا۔ یہ دنیا بنی ہی اس ڈھنگ سے تھی کہ غلام کے لیے کہیں بھی کوئی جائے پناہ نہ تھی۔ جب وہ سپاہیوں کو اپنی طرف دوڑتا ہوا دیکھ رہا تھا، تب اُسے اس سادہ حقیقت کا اچھی طرح علم ہو گیا تھا کہ اب چھپنے کے لیے نہ تو کوئی جگہ تھی اور نہ گھسنے کے لیے کوئی بل۔ اُس کے لیے اب دنیا کو بدلنا اشد ضروری ہو چکا تھا۔'' [ص۱۹۷]

اور پھر وہ وقت بھی آتا ہے جب غلاموں کی یہ جنگ اپنے منطقی انجام کو پہنچتی ہے اور دنیا کی ہر جنگ کی طرح طاقت ور فاتح قرار پاتا ہے اور سلطنتِ روم کے چھ ہزار غلاموں کو تسبیح کے دانوں کی مانند چوراہوں پر کھڑی صلیبوں پر میخوں سے گاڑ دیا جاتا ہے۔ ناول کا یہ وہ مقام ہے جہاں قاری اور روم کے عام شہری دونوں کے دلوں میں، ان غلاموں کے لیے ہمدردی پھوٹتی ہے۔ لیکن وہ ایک بے بسی کی کیفیت میں مبتلا نظر آتا ہے۔

''لوگ گلیڈی ایٹر کو مرتا دیکھنے کے لیے یہاں آئے تھے۔۔ وہ ایک عجیب شخص تھا جس نے خود پہ مایوسی مسلط کر رکھی تھی۔ وہ یہ دیکھنے آئے تھے کہ کیا یہ خاموشی توڑی جا سکتی ہے؟ پھر جب میخیں توڑنے کے دوران بھی یہ مایوسی نہ توڑی جا سکی تو بھی وہ منتظر کھڑے رہے کہ آخر یہ کب ٹوٹے گی۔۔۔ اور یہ ٹوٹ چکی۔ یہ درد اور تکلیف کی ایک وحشتناک چیخ تھی۔۔ یہ ایک غیر ملکی زبان تھی، کچھ نے کہا اُس نے خداؤں کو پکارا تھا۔ کچھ دوسروں نے کہا اُس نے اپنی ماں کو پکارنے کی آواز دی تھی۔۔۔ جبکہ حقیقت میں وہ بے بسی سے چیخا تھا: 'سپارٹیکس۔۔ ہم کیوں ناکام ہوئے؟'' [ص۲۹۹]

ہاورڈ فاسٹ نے کہانی کو بھرپور طریقے سے ایک ناول کی چوکھٹ میں ترتیب دیا ہے۔ کہانی کا پلاٹ صرف جنگ اور مزاحمت کے قصوں سے عبارت نہیں بلکہ یہاں وہ پاکیزہ محبت بھی

دکھائی دیتی ہے جوسپارٹیکس اور اُس کی بیوی ورینیا کے مابین پروان چڑھی۔ جوخود ایک غلام تھی۔ یہ جنگ کے ساتھ ساتھ عشق ومحبت کی ایک لازوال کہانی بھی ہے۔

''سپارٹیکس نے کہا: انسان کے پاس تھوڑی سی قوت ہوتی ہے، تھوڑی سی امید اور تھوڑی سی محبت۔ یہ خاصیتیں ایسے بیج ہیں جو تمام انسانوں میں بودیے گئے ہیں۔ مگر اگر وہ انھیں محض اپنے آپ تک رکھتا ہے تو یہ بیج جلد گل سڑ کر مر جاتے ہیں۔۔۔ اس کے برعکس اگر وہ اپنی توانائی، امید اور محبت دوسروں کو دیتا ہے تو یہ بے پناہ ذخیرہ کبھی ختم ہی نہیں ہوتا۔'' [ص ۳۱۵]

سپارٹیکس کی فکری ونظریاتی محبوب بیوی ورینیا کو جب، غلاموں کی بغاوت کچل دینے اور سپارٹیکس کو مار ڈالنے کے بعد گرفتار کیا گیا تب تک وہ سپارٹیکس کے بیٹے کو جنم دے چکی تھی۔ اُس کے حسن اور جنگ میں اُس کی بہادری اور سپارٹیکس کے شانہ بشانہ لڑنے کے قصوں سے مرعوب ہو کر سلطنتِ روم کے عظیم کمانڈر انچیف نے اسے اپنی محبوبہ بنانا چاہا اور اُس کے قدموں میں زر و جواہر کے ڈھیر لگا دیے۔ جسے اُس نے محض اِس لیے ٹھکرا دیا کہ اب سپارٹیکس کے بعد اس کی زندگی میں کسی دوسرے کی جگہ ہی نہ بچی تھی۔ اس کی اِسی وفاداری سے مرعوب ہو کر جو اُس وقت کی روم کی اشرافیہ خواتین میں مفقود تھی، گراکس نامی روم کے سب سے دولتمند آدمی نے اُسے یوں خراجِ تحسین پیش کیا کہ اُسے کمانڈر کے محل سے اغوا کروا کر روم سے کوسوں دور بھجوا دیا اور خود، خودکشی کر لی۔

کارل مارکس جیسے فلسفی نے سپارٹیکس کو اپنا ہیرو قرار دیا اور اسے ''قدیم انسانی تاریخ کا سب سے شاندار شخص اور عظیم جرنیل قرار دیا۔ جو اپنے کردار میں پاک اور قدیم پرولتاریہ کا حقیقی نمائندہ تھا۔'' ہاورڈ فاسٹ نے اپنے اس ناول میں اُس دور کو نہ صرف زندہ کر دیا ہے بلکہ سپارٹیکس کی زندگی کی کہانی کو ایسے دلچسپ اور موثر پیرائے میں بیان کیا ہے کہ قاری سلطنتِ روم کے مظالم کو اپنے تخیل کی آنکھ سے دیکھتا ہے اور اپنے دل کے نرم حصوں میں اترتا محسوس کرتا ہے۔ خاص کہ اُس وقت جب اس عظیم بغاوت کو کچل دیے جانے کے بعد، اور بے دردی سے سپارٹیکس کو گوشت کے ٹکڑوں میں منقسم کر دیے جانے کے بعد اُس کے ساتھوں غلاموں اور ان کی قیادت کرنے والے اُس جیسے طاقت ور گلیڈی ایٹرز کو زندہ صلیبوں پہ ٹھونک دیا گیا۔ جہاں ان کی ہتھیلیوں اور پیروں سے نکلنے والے خون کو لوگوں نے دردناک اور عبرت ناک نگاہوں سے دیکھا اور جن کی گدھوں سے نوچی گئی لاشوں کو انھوں نے برسوں یاد رکھا۔ اس لیے نہیں کہ آئندہ وہ ایسی بغاوت سے دور رہیں گے بلکہ اِس لیے کہ وہ اپنے ہیرو کا قصہ اپنی نسلوں کو منتقل کریں گے۔

یہی وجہ تھی کہ تاریخ کے ان بوسیدہ پنوں میں سپارٹیکس کا نام امر ہو گیا۔ جرمن کمیونسٹ پارٹی کا پہلا نام سپارٹیسٹ لیگ رکھا گیا اسی طرح ۱۹۷۰ کی دہائی میں آسٹریا میں فاشسٹ مخالف

تنظیم کا نام بھی اُسی پر رکھا گیا۔ مشہور کمیونسٹ چے گویرا بھی سپارٹیکس کا بہت مداح و معترف تھا۔

بلوچستان سے شاہ محمد مری کی مظلوم اور محکوم طبقے کی آواز ہیں۔ انھوں نے اس ناول کو آسان اور موثر پیرائے میں اردو زبان کے قالب میں ڈھالا۔ کہیں کہیں تو ترجمہ اتنا رواں اور سہل ہے کہ تخلیق کا گماں ہوتا ہے۔ اسی طرح جہاں جہاں سلطنتِ روم کی اشرافیہ کے ہاتھوں مفلس اور نادار طبقات کا استحصال نظر آتا ہے، وہاں محسوس ہوتا ہے کہ ظلم کے خلاف یہ تقاریر اور مزاحمتی بیانات سپارٹیکس کے ہی نہیں بلکہ ہاورڈ فاسٹ اور خود شاہ محمد مری کے دلوں کے بھی ترجمان ہیں۔

سپارٹیکس کی زندگی اور جدوجہد پہ لکھے گئے ہاورڈ فاسٹ کے اِس ناول کا، ۱۹۶۰ تک دنیا کی تقریباً ۸۲ زبانوں میں ترجمہ ہو چکا تھا۔ آج بھی یہ ناول اتنا ہی مقبول ہے جتنا کہ اپنے عہد میں رہا اور جس کی صرف ایک بنیادی وجہ یہی تھی کہ یہ ناول دراصل انسانی غلامی اور انسانی حقوق کے استحصال کے خلاف، سپارٹیکس کی عملی جدوجہد اور مزاحمت کی حقیقی کہانی پر مبنی تھا اور ہم جانتے ہیں کہ ایسی کہانیوں کو کبھی زوال نہیں!

گارسیں دتاسی کی 'تاریخ ادبیاتِ اردو'

تبصرہ: حنا جمشید

مترجم: لیلیان سیکستن نازرو

ترتیب، تدوین اور تقدیم: ڈاکٹر معین الدین عقیل

انیسویں صدی کے نمایاں اور مشہور فرانسیسی مستشرق، محقق اور مؤرخ گارسیں دتاسی (۱۷۹۴۔۱۸۷۸) کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ گارسیں دتاسی جنوبی ایشیاء کبھی نہ آئے لیکن انھوں نے ہمیشہ اپنے ملک میں رہ کر اردو زبان و ادب کے مطالعہ و تحقیق میں جستجو، انہماک، مستقل مزاجی، محنت اور لگن کا ثبوت دیا۔ وہ بھی ایک ایسے دور میں جب اردو زبان علمی زبانوں کی صف میں ابھی شامل نہ ہوئی تھی، نہ تو اس کی معیاری لغات اور قواعد مرتب ہوئی تھیں اور نہ ہی اس وقت تک یہ زبان علمی وسیلۂ اظہار کے قابل سمجھی جا سکی تھی۔ ایسے وقت میں گارسیں دتاسی نے اُردو زبان کا نہ صرف بہ دقّتِ نظر مطالعہ کیا بلکہ اپنی تحقیقی خدمات سے اس زبان کے لئے کئی گراں قدر خدمات بھی سرانجام دیں۔

ان کی معروف تصنیف Histoire de la Litterature Hindouie et Hindoustanie (تذکرۂ شعرا ؤ مصنّفین اُردو) کے اردو ترجمے ''تاریخ ادبیاتِ اردو'' کو مشہور محقق، مؤرخ، نقاد اور دانشور ڈاکٹر معین الدین عقیل نے پاکستان اسٹڈی سنٹر جامعہ کراچی کے تعاون سے مرتب کیا ہے۔ واضح رہے کہ یہ کتاب اولاً ۱۸۳۹ء میں، پھر اس کے بعد ۱۸۴۷ء میں (بطور جلد دوم)، اسکے بعد کئی قیمتی اضافوں کے ساتھ ۱۸۷۰ء میں اور پھر ۱۸۷۱ء میں شائع ہوئی۔ لیکن اپنی اشاعت کے ۹۰ سال گزر جانے کے بعد اور اردو ادب کا انتہائی ناگزیر ماخذ ہونے کے باوجود بھی نہ تو انگریزی میں اور نہ ہی اردو ترجمہ میں منصۂ شہود پر آسکی۔ اگرچہ ۱۹۶۰ء میں اس کا ترجمہ ایک فرانسیسی خاتون ''لیلیان سیکستین نازرو'' نے فرانسیسی سے اردو زبان میں کیا تھا۔ یہ ترجمہ پی ایچ ڈی کی ڈگری کے حصول کے لئے جامعہ کراچی میں ۱۹۶۰ء میں ڈاکٹر ابواللیث

(۱۹۱۶ء۔۱۹۹۴ء) کی نگرانی میں پیش کیا گیا۔مترجمہ خود بھی فرانسیسی تھیں۔تاہم محض کسی کتاب کا ترجمہ پی ایچ ڈی کی سند کے لئے قابلِ قبول نہیں ہوتا اس لئے مترجمہ نے ترجمے میں گارسیں دتاسی کے بیانات کی تصدیق وتوثیق کے لئے ہم عصر ماخذات سے جن کے حوالے خود مصنف نے متن میں دیئے تھے،اسناد کے طور پر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔اسی طرح مصنف نے جن جگہوں پہ معلومات تشنہ چھوڑی تھیں،لیلیان سیکستین نازرو نے ان معلومات کو بھی متعلقہ حواشی میں درج کیا ہے۔جن شعراء کے اشعار کا حوالہ مصنف نے دیا تھا یا جن اشعار کے ترجمے فرانسیسی میں دیئے گئے تھے اور اشعار نقل نہیں کیئے تھے،مترجم نے متعلقہ ماخذ سے ایسے کئی اشعار اخذ کر کے انھیں متن میں شامل کرنے کی سعی کی ہے۔جہاں کہیں ضروری محسوس ہوا وہاں نثری عبارات بھی نقل کردی ہیں۔نیز اپنے تحریر کردہ تعارف میں مترجم نے اُن ماخذات کی بھی فہرست مہیّا کردی ہے جن کو مدِ نظر رکھ کر مصنف نے یہ کتاب تصنیف کی۔یہ سب مترجم کے کئے گئے ایسے اضافے ہیں جو گارسیں دتاسی کے اصل فرانسیسی متن میں موجود نہیں۔اس طرح اس ترجمے کو معلومات کے حوالے سے اصل فرانسیسی متن سے قدرے زیادہ مفید سمجھا جاسکتا ہے۔

۹۳۹ صفحات پر مشتمل یہ ضخیم کتاب ،گارسین دتاسی کی تصویر سے مزیّن سرورق کے ساتھ ترجمہ، تحقیق اور تدوین کا خوبصورت امتزاج ہے۔''سرِ آغاز''میں ڈاکٹر سیّد جعفر احمد نے کتاب کا تعارف اور مندرجات سرسری بیان کئے ہیں۔کتاب کے پس منظر اور گارسیں دتاسی کے اصل مسوّدے سے منقلب ہو کر اس کے موجودہ سفر کی تفصیلات ڈاکٹر معین الدین عقیل نے 'معروضات' کے نام سے پیش کردی ہیں۔اس کے بعد کتاب کی تحقیق وتدوین سے متعلق معلومات سے بھرپور ایک مفصّل مقدمہ اور پھر اصل متن ہے۔جبکہ آخر میں کتب، رسائل اور شعراء و مصنّفین کے حوالے سے بھرپور معلومات ضمیمہ جات میں درج کی گئی ہیں۔

ابتداء میں لیلیان سیکستین نازرو نے جب اس ترجمے کو سند کے لئے یونیورسٹی میں پیش کیا تو ضخامت کے باعث اسے دو جلدوں میں تقسیم کردیا تھا۔لیکن بوجوہ مختلف ترامیم اور ضروری ترتیب کے اسے اب ایک ہی جلد میں پیش کیا گیا ہے۔لیکن پوری کوشش کی گئی ہے کہ متن اور اُس کے مطالب قطعی متاثر یا حذف نہ ہوں۔زیرِ نظر ترجمہ چونکہ ڈاکٹر ابواللیث کی نگرانی میں کیا گیا لہٰذا اس میں جگہ جگہ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی مرحوم کے قلم سے اضافے اور تصحیحات موجود ہیں۔اکثر مقامات پر بامحاورہ زبان، روزمرہ، تراکیب اور زبان کے فطری لب ولہجے سے بھی ابواللیث صدیقی کے قلم سے کی گئی اصلاحات صاف نظر آتی ہیں۔جن کے سبب یہ ترجمہ روایتی تراجم سے ہٹ کر قدرے دلچسپ،رواں معلومات افزاء ہے۔

مختصر یہ کہ گارسیں دتاسی کے اس گراں قدر علمی وادبی کام کو لیلیان سیکستین نازرو نے جس دقّتِ نظر اور محنت سے اردو میں منتقل کیا ہے اسی جانفشانی سے ڈاکٹر معین الدین عقیل نے اس کام کی ترتیب، تدوین اور تقدیم کی ہے۔ڈاکٹر سیّد جعفر احمد کے الفاظ میں بلاشبہ گارسیں دتاسی کی اس گراں قدر کتاب ''تاریخ ادبیاتِ اردو'' کی اشاعت کو اردو ادب کی تاریخ کا اہم واقعہ قرار دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

پرانوں کی کہانیاں

حنا جمشید

معروف ادیب اور نقاد گوپی چند نارنگ، جن کا نام اردو ادب کی دنیا میں کسی تعارف کا محتاج نہیں، کی ہندو مذہب و اساطیر پر مبنی کتاب ''پرانوں کی کہانیاں'' کا دوسرا ایڈیشن شائع کیا ہے۔ واضح رہے اس کتاب کا پہلا ایڈیشن ۲۰۰۱ میں شائع کیا گیا تھا۔کتاب کیا ہے ہندو مذہب کے قدیم اساطیری کرداروں کی ایک داستان نگری ہے۔جس میں ہندوستان کے صدیوں پرانے وہ قدیم قصے، کہانیاں اور رزمیہ نظمیں (مثلاً مہا بھارت اور رامائن) اور اساطیر شامل ہیں، جو سینہ بہ سینہ آج کے ہندوستانی تک منتقل ہوئے۔ان کہانیوں کے یوں پشت در پشت چلے آنے کی واحد وجہ ان کی وہ قدامت ہے جب رسم الخط بھی ایجاد نہ ہوا تھا۔

کتاب کے آغاز میں ہی رشید ملک اس اہم بات کو بیان کر دیتے ہیں کہ یہ ادب دراصل ہندوستان کے مذہبی ادب کی دو نمایاں شاخوں شروتی اور سمرتی میں سے سمرتی کا ایک حصہ ہے جو محض یادداشت پر مبنی مذہبی ادب ہے۔جبکہ شروتی ادب وہ الہامی یا مذہبی ادب ہے جس کے ضمن میں چاروں وید (رگ وید، سام وید، یجر وید، اتھر وید) ان سے متعلق رسومات وہدایات وغیرہ شامل ہیں جن کا سننا شودروں اور نچلی ذات کے ہندوؤں کے لیے ممنوع تھا اور چھپ کے سن لینے کی صورت میں ان کے لیے کڑی سزاوؤں کا اہتمام کیا جاتا۔تاہم سمرتی ادب چونکہ ایسی کسی بھی پابندی سے ماورا تھا سو خوب پھلا پھولا۔اس کا ثبوت یہ پرانوں کی کہانیاں جو آج ہندوستان کے مذہبی ادب کے بنیادی اور کلیدی اساطیر کی اہمیت کی حامل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کہانیوں کی مقبولیت اور ان پر کیا جانے والا اعتقاد آج بھی ہندو مذہب کی الہامی کتب سے زیادہ ہے۔

پُران کے معنی پرانے یا قدیم کے ہیں، یوں قدیم لوک مذہبی کتھائیں ان کہانیوں کا موضوع ہیں۔جن میں کئی دیوی دیوتا ہیں۔ مثلاً برہما، وشنو، شِو، پاروتی، دُرگاہ، لکشمی جیسے کردار جنھیں ہندو مت میں لافانی کردار سمجھا جاتا ہے۔ان پرانوں میں کچھ ایسے انسانی کردار ہیں جو ایک بار سامنے آتے ہیں اور اپنا کردار نبھا کر یا تو چلے جاتے ہیں یا مر جاتے ہیں لیکن درج بالا دیوی

دیوتاوؤں جیسے کردار وقت کے محور کے لافانی کردار ہیں جو کبھی بھی کہیں بھی سامنے آ سکتے ہیں اور اپنے آدرشوں اور شکتیوں کی مدد سے درست اور غلط کا فیصلہ کر کے چلتے بنتے ہیں۔

کہانیوں میں ہندی ماحول اور منظر نامے کے ساتھ ساتھ ہندی الفاظ، تراکیب اور اصلاحات کو بھی ضرورت کے تحت برتا گیا ہے۔ متن کی تفہیم کے لیے قاری کا ان سب سے ماقبل تعارف ضروری ہے۔ ان کہانیوں میں حکمت کے بھید پوشیدہ ہیں۔ کہیں کہانی سے اور کہیں دو کرداروں کے مابین ہونے والے مکالمے سے سننے سمجھنے والوں کی اخلاقی تربیت کی جاتی ہے۔ انھیں اچھائی برائی کا درس بھی سکھایا جاتا ہے اور ان کے سامنے ایک ایسا منظر پیش کر دیا جاتا ہے کہ جہاں قاری اپنے فہم و ادراک کے ذریعے درست سمت کا انتخاب خود کرے۔

مثال کے طور پر ان پرانوں کے کچھ حصے ملاحظہ کیجیے جو حکمت آموز بھی اور حکمت آمیز بھی:

''یکش: زمین سے بڑا کون ہے؟ آسمان سے اونچا کون ہے؟ ہوا سے تیز چلنے والا کون ہے؟ اور تعداد میں تنکوں سے زیادہ کیا ہے؟

یدھشٹر: ماں کا درجہ زمین سے بھی بڑا ہے اور باپ کا آسمان سے بھی اونچا، من ہوا سے بھی تیز چلنے والا ہے اور خیال تعداد میں تنکوں سے بھی زیادہ ہیں۔۔

یکش: دھرم، بڑائی، فضیلت اور سکھ کا مقام کیا ہے؟

یدھشٹر: دھرم کا مقام دیا یعنی رحم ہے، بڑائی کا دان یعنی خیرات، فضیلت کا، سچائی اور سکھ کا مقام نیک کرداری ہے۔'' [ص۹۱]

اسی طرح مذہبی پند و نصائح سے بھرپور قصے بھی ان پرانوں کا حصہ ہیں، جن میں اچھائی اور برائی کے معرکوں میں جیت ہمیشہ سچ اور مذہب کی ہوتی ہے۔ یقیناً یہ پران لوگوں کو مذہب پر کاربند رکھنے کے معاملات میں بھی کارآمد ہوتے ہونگے۔

''اب تو پرہلاد نے اپنے باپ ہرنا کشپ کی کھلم کھلا مخالفت شوع کر دی، وہ ایشور کو ہی سچا خالق ماننے کی تلقین کرتا۔۔ وہ انھیں سمجھاتا: 'انسان کو چاہئے کام (خواہشاتِ نفسانی)، کرودھ (غصہ)، موہ (علائق)، لوبھ (لالچ)، اہنکار (تکبر) کے جال سے نکلے۔ جانوروں کو تو صرف پیٹ کی فکر ہوتی ہے۔ انسان کو پیٹ کے علاوہ آتما کی بھی فکر کرنی چاہئے۔۔۔ انسانی جنم انمول رتن ہے۔۔ انسان کے آگے سر جھکانا غلط ہے۔ ایشور کے آگے سر جھکانا چاہئے جس نے انسان کو پیدا کیا وہ ایک ہے اور اُس کا کوئی ثانی نہیں۔'' [ص۱۱۱]

اسی طرح زندگی کی پیچیدگی کو سمجھنے کے لیے بھی ان پرانوں کا اپنا مخصوص فلسفہ ہائے حیات ہے جہاں کوئی چیز فانی نہیں، انسان اس کے اعمال اور روح سب ایسی چیزیں ہیں جو لافانی ہیں:

''جب راجا کے آنسو نہ رکے، تب رونارد جی نے اپنی روحانی طاقت سے بچے کے جسم میں پھر سے جان ڈال دی۔۔ بچے کی روح نے کہا: یہ کس کس جنم میں میرے باپ تھے۔ میں تو اپنے عمل کی سزا اور جزا کے لیے کبھی دیوتا ہوں تو کبھی انسان۔ کبھی چوپایہ، کبھی پرندہ، طرح طرح کے جسموں میں جانے کتنے یگوں سے بھٹک رہا ہوں۔ ماں، باپ، دوست، دشمن، بیوی، بچے سب رشتوں کے بندھن ہیں، جو جسم سے پیدا ہوتے ہیں اور جسم کی موت کے ساتھ ہی ختم ہو جاتے ہیں۔'' [ص ۶۳]

آج کی دنیا میں یہ اساطیری ادب ہندوستان کی قدیم تاریخ کے ماخذات میں ضرور شمار کیا جاتا ہے تاہم اس کی صداقت میں اب بھی کئی جگہوں پر شکوک و شبہات کا اظہار کیا جاتا ہے۔ اس کی واحد وجہ زمانے کے ساتھ ساتھ، ان پرانوں میں ہونے والا ردوبدل ہے جسے آج بھی تسلیم کیا جاتا ہے۔

قدیم دنیا کی دیوی دیوتاؤں اور راکھشسوں کے قصے کہانیاں اور اساطیر قاری کو ایک نئے جہان میں لے جاتے ہیں۔ جہاں وہ خود کو ممکنات کی ایک ایسی دلچسپ دنیا میں پاتا ہے جہاں نہ صرف دیومالائی کہانیوں کی نوکھی بنت عقل کو دنگ کیے دیتی ہے وہاں قاری کو ہندوستان کے قدیم مذہبی، تہذیبی اور ثقافتی مزاج سے آگہی بھی نصیب ہوتی ہے۔

ہنٹگٹن کی کتاب ''تہذیبوں کا تصادم اور عالمی نظام کی تشکیل نو

محمد عمران شاہد

سیموئل فلپس ہنٹگٹن (Samuel Phillips Huntington) کی کتاب " The clash of Civilization and the Remaking of World) ہے۔ اس کتاب کا ضبطِ تحریر میں آنے کے جو اسباب ہے وہ یہ ہیں کہ سب سے پہلے اُس نے 1992ء میں امریکن انٹر پرائز انسٹی ٹیوٹ کے اندر دیے جانے والے ایک لیکچر میں پیش کیا جسے بعد ازاں 1993ء میں امور خارجہ کے مجلّے "Foreign Affairs" میں "تہذیبوں کا تصادم" کے عنوان کے تحت ایک باقاعدہ مضمون کی صورت میں شائع کیا گیا اس سے قبل 1993ء میں (Francis Fukuyama) کی کتاب "تاریخ کا خاتمہ اور آخری آدمی" (The End of History and the Last Man) منظرِ عام پر آئی اور ہنٹگٹن نے اس کتاب کے ردعمل کے طور پر اپنے لیکچر میں پیش کردہ نظریے کی توسیع کرتے ہوئے 1994ء میں اسے باقاعدہ کتاب کی شکل دی اور اس کا نام "تہذیبوں کا تصادم اور عالمی نظام کی تشکیل نو" (The clash of Civilization and the Remaking of World) رکھا تاہم یہ اصطلاح "تہذیبوں کا تصادم" برنارڈ لیوس (Bernard Lewis) نے اپنے ایک مضمون بعنوان "مسلمانوں میں غیض وغضب کی وجوہات" (The Roots of Muslim Rage) میں سب سے پہلے استعمال کی، جو ماہنامہ اٹلانٹک (The monthly Atlantic) کے شمارہ بابت ستمبر 1990ء میں اشاعت پذیر ہوا۔ اس کتاب کا ترجمہ پہلے پہل محمد احسن بٹ نے 2003ء میں کیا جو مثال پبلیشنگ لاہور نے شائع کیا ہے۔ اُس کے بعد ڈاکٹر سہیل انجم نے "تہذیبوں کے تصادم" کے نام سے کیا جو آکسفرڈ یونیورسٹی پریس، ۵ بنگلور ٹاؤن شارع فیصل، کراچی سے فروری 2018ء میں شائع ہوا۔ یہ ایک ضخیم کتاب ہے۔

"تہذیبوں کا تصادم" بلاشبہ بیسویں صدی کے اختتام پر اور اکیسویں صدی کے منظر نامے پر ایک ایسی پیچیدہ دستاویز ہے کہ جس پر اقصائے عالم میں بڑے زور وشور سے مباحثہ ہوا اور غالبًا بین الاقوامی سطح پر تہذیبوں کی تفہیم کے بارے میں اس کتاب کی وجہ سے ہی ہمہ جہت مکالمہ

شروع ہوا۔ "تہذیبوں کا تصادم" ایک نظریہ ہے جسے امریکی ماہر سیاسیات، سیموئل فلپس ہنٹگٹن نے پیش کیا جس کا لُبِ لباب یہ ہے کہ "(امریکہ اور روس کے درمیان) سرد جنگ کے خاتمے کے بعد دنیا میں تنازعات اور جنگوں کا باعث مختلف نظریات نہیں ہوں گے بلکہ تنازعات کی بنیادی وجوہات لوگوں کی ثقافتی اور مذہبی شناختیں ہوں گی۔"

دور جدید کی تاریخ کے دو مراحل گزر چکے ہیں۔ دور جدید کی تاریخ کا پہلا مرحلہ وہ تھا جب اقوام عالم قومی ریاستوں کی بنیاد پر تقسیم تھیں۔ اس دور میں مغرب کی طاقت ور اقوام نے کمزور ممالک اور ان کے وسائل پر قبضہ کر کے ان پر تسلط جمالیا۔ بعد میں جنگ عظیم اول اور دوم کے نتیجے میں سامراجی ممالک کی قوت ختم ہوگئی۔ نوآبادیاتی ریاستیں ایک ایک کر کے آزاد ہو گئیں۔ یورپی ممالک کے اندر تیزی سے کم ہوتی ہوئی مقامی آبادی اور ان ممالک میں مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی تعداد نے ڈیوز بری اور بلیک برن جیسے بے شمار مسلم اکثریتی شہروں کو جنم دیا ہے جہاں مسلم ثقافت مغربی تہذیب پر غالب نظر آتی ہے۔ یورپ میں پیدا ہونے والی مسلمانوں کی نئی نسل ایشیا اور افریقہ سے آنے والے اپنے آبا کی طرح معذرت خواہانہ رویّے کی حامل نہیں بلکہ اپنی تہذیبی اقدار پر اصرار کرتے ہوئے اپنے آپ کو حق بجانب سمجھتی ہے۔ تاہم اس کے بعد اقوام عالم ایک نئی کشمکش کا شکار ہوگئیں۔ یہ کشمکش نظریاتی بنیادوں پر تھی جس میں جدید دنیا کے اہم اور طاقت ور ترین ممالک کمیونزم اور سرمایہ دارانہ نظام کی بنیاد پر، امریکہ اور سوویت یونین کے زیر سایہ، دو حصوں میں تقسیم ہوگئے۔ یوں بیسویں صدی کا نصف آخر دو عظیم سپر پاورز کی باہمی چپقلش سے عبارت رہا۔ یہ وہ دور تھا جب بظاہر غیر جانب دار کہلائے جانے والے ممالک بھی کسی نہ کسی اعتبار سے دو سپر پاورز سے متعلق تھے۔ ان ممالک کی یہ کشمکش صرف نظریاتی بنیادوں تک محدود نہ تھی، بلکہ اس عرصے میں دنیا حقیقی معنوں میں ایٹمی جنگ کے خطرے سے دوچار رہی۔ دور جدید کی تاریخ کا یہ دور سوویت یونین کے خاتمے کے ساتھ تمام ہوا۔

کمیونزم کے زوال کے نتیجے میں سوویت یونین ختم ہوا تھا، دنیا نہیں۔ چنانچہ سرد جنگ کے فاتح اہل مغرب کے ذہنوں میں یہ سوال پیدا ہونا شروع ہوا کہ اب دنیا کے معاملات کس اصول پر چلیں گے؟ اقوام عالم کی نئی صف بندی کن اساسات پر ہوگی؟ نیا عالمی نظام کن بنیادوں پر استوار ہوگا؟ ان سوالات کے نتیجے میں بہت سے جوابات سامنے آئے۔ سب سے اہم سوال مغربی تہذیب کا تھا وہ کیسی ہوگی۔ دوسری طرف دنیا بھر میں اسلامی تہذیب کے علم بردار، مسلم دانش ور اور خود مغربی ممالک میں موجود مقامی اور غیر مقامی مسلم اپنی تہذیب اور اس کی اقدار پر زور دے کر مغربی تہذیب کو چیلنج کر رہے ہیں۔ اس صورت حال نے سوچنے سمجھنے والے افراد کے ذہنوں میں

تہذیبی تصادم کے بارے میں چند بنیادی سوالات کو جنم دیا ہے۔ تہذیب کیا ہوتی ہے؟ ایک تہذیب کس طرح دوسری تہذیب سے مختلف ہوتی ہے؟ دنیا میں موجود تہذیبیں کس طرح ایک دوسرے سے معاون یا متصادم ہیں؟ کیا تہذیبی تصادم ایک وقتی صورت حال ہے؟ اس تہذیبی جنگ میں کون کس ہتھیار سے مسلح ہے؟ تہذیبوں کے تصادم کے اہم ترین کردار کون کون ہیں؟ کس تہذیب کی جیت کے امکانات ہیں؟ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس تہذیبی تصادم کا انجام کیا ہوگا؟ ۔مگر جس نقطہ نظر نے دنیا بھر کے اہل علم ودانش کی توجہ حاصل کی وہ سیموئیل پی ہننگٹن کے شہرہ آفاق مضمون ''تہذیبوں کا تصادم'' میں پیش کیا گیا۔ آیئے سب سے پہلے اس بنیادی سوال کا جائزہ لیں کہ تہذیب ہوتی کیا ہے؟

تہذیب کے ضمن میں ایک غلط فہمی یہ ہے کہ کچھ لوگ تہذیب اور تہذیب کے مظاہر میں فرق نہیں سمجھتے اور تہذیبوں کے مظاہر مثلاً رسم رواج، لباس اور رہن سہن کے معاملات کے فرق کو تہذیبی اختلاف قرار دیتے ہیں۔ یہ لوگ تہذیبی اختلاف کو شلوار یا پینٹ اور میز یا دستر خوان کے اختلاف سے پہچانتے ہیں مگر یہ ایک سطحی موازنہ ہے۔ یہ سب تہذیب کے مظاہر اور تفصیلات ہیں۔ تہذیب کی بنیاد اس کے چند اساسی نظریات ہوا کرتے ہیں۔ تہذیب اپنے تصور کائنات (World View) اور تصور خالق اور تصور انسان سے پہچانی جاتی ہے۔ یہ تصورات اور ان پر مشتمل تہذیب، ایک سکے کے دو رخ ہیں۔ عقیدہ جب فکر و عمل میں ڈھلتا ہے تو چند مظاہر سامنے آتے ہیں۔ یہی مظاہر "تہذیب'' کہلاتے ہیں۔ عقائد کی درستی یا خرابی کا اندازہ تہذیبی مظاہر سے ہوتا ہے۔ اس لئے تہذیب ایک اعتبار سے عقائد کا اظہار ہے اور عقائد تہذیب کا باطن ہیں۔ عقائد اور تہذیب میں بیج اور درخت کا تعلق ہے۔ تہذیب اپنے بنیادی عقائد اور ان کے مظاہر پر مشتمل ہوتی ہے۔

خالق کائنات، کائنات، انسان اور علم کے بارے میں مختلف نظریات و عقائد تہذیبی اختلاف کا باعث بنتے ہیں۔ اس وقت دنیا میں سیکولر مغربی تہذیب، اسلامی تہذیب، ہندو تہذیب، عیسائی تہذیب، چینی تہذیب اور بدھ تہذیب سمیت کئی بڑی بڑی تہذیبیں موجود ہیں۔ "تہذیبوں کے تصادم میں" اسی بات کا کھوج لگانے کی کوشش کی گئی ہے۔

اس کتاب کی اشاعت کو قریباً تین عشرے ہونے والے ہے اور اس دوران میں پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی بہ چکا ہے۔ خصوصاً ۱۱ ستمبر کے واقعے کے بعد دنیا کی سیاست نے ایک خاص رخ اختیار کر لیا ہے، جس میں امریکہ اپنی بے پناہ طاقت کے بل بوتے پر جو چاہتا ہے کر گزرتا ہے۔ بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ بین الاقوامی سیاست میں اس وقت جو کچھ ہو رہا ہے، اس کی

سب سے بہتر تفہیم بلاشبہ اسی خاکے کی بنیاد پر کی جاسکتی ہے جو ''تہذیبوں کا تصادم'' میں پیش کیا گیا تھا۔اس تہذیبی تصادم کے ابتدائی نشانات یورپی نو آبادیات کے قیام اور صلیبی جنگوں کی تاریخ میں موجود ہیں۔ اس سے پہلے کہ تہذیب اور اس کی بنیادوں کے متعلق ابتدائی گفتگو کا آغاز کیا جائے زیادہ بہتر معلوم ہوتا ہے کہ تہذیبی تصادم کی موجود صورت حال کا اجمالی جائزہ لے لیا جائے۔

اس وقت تہذیبی تصادم کی صورت محض یہ نہیں کہ مختلف تہذیبوں سے تعلق رکھنے والے چند ممالک باہم برسرِ پیکار ہیں بلکہ اس سے بڑھ کر معاملہ یہ ہے کہ مشرق ومغرب کے ممالک اپنی جغرافیائی حدود میں تہذیبی تصادم سے دوچار ہیں۔مسلم ممالک کے اندر مغربی واسلامی تہذیب کے علم بردار سیکولر اور اسلامی گروہوں کی شکل میں آمنے سامنے ہیں تو یورپی ممالک اپنی آبادی میں موجود ایسی مسلم برادی کے چیلنج کا سامنا کر رہے ہیں جو اپنی تہذیب وثقافت اور اقدار پر اصرار کر رہی ہے اور یورپی تہذیب، اس کی اقدار اور معاشرے میں مکمل ادغام سے عملاً انکار کر رہی ہے۔اس پر طرّہ یہ کہ نہ صرف عام یورپی باشندے بلکہ یورپی دانش وروں اور طبقہ اشرافیہ کی بھی ایک مخصوص تعداد اسلامی تہذیب کی نہ صرف ہمنوائی کر رہے ہے بلکہ اس نظریئے کو عملا قبول بھی کر رہی ہے۔یہی وجہ ہے کہ آج تک اس کتاب کے تراجم دنیا بھر میں ہو رہے ہیں اور کتاب کے قارئین کی تعداد بڑھتی چلی جارہی ہے۔ ہمارے پیش نظر کتاب کا وہ ترجمہ ہے جو حال ہی میں آکسفرڈ یونیورسٹی پریس نے شائع کیا ہے۔

یہ کتاب اپنے صفحات کے اعتبار سے تو بے حد ضخیم ہے، مگر مرکزی خیال کے اعتبار سے بہت مختصر۔یعنی سرد جنگ کے بعد کی دنیا ثقافتی بنیادوں پر تقسیم ہوگی اور یہی تقسیم مستقبل کی جنگ و امن کے سلسلے میں فیصلہ کن ہوگی۔مگر چونکہ یہ کتاب ایک خاص نقط؟ نظر کی تنقید میں لکھی گئی ہے، اس لیے اس میں اعداد وشمار، تحلیل وتجزیے، حالات وواقعات اور پس وپیش منظر وغیرہ کے بیان میں بڑی جز رسی اور تفصیل سے کام لیا گیا ہے۔ یہ کتاب جس بنیادی نقطے کے اردگرد گھومتی ہے وہ مصنف کے اپنے الفاظ میں کچھ یوں ہے:

> ''اس کتاب کا مرکزی خیال یہ ہے کہ ثقافت اور ثقافتی شناخت، جو وسیع ترین سطح پر تہذیبی شناخت ہوتی ہے، مابعد سرد جنگ دنیا میں اتحاد، انتشار اور تصادم کے تانے بانے بن رہی ہے۔'' (۲۰۔۱۲)

سیموئل فلپس ہنگٹن اپنی کتاب کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا ہے جس کی ترتیب کچھ یوں ہے

1۔حصہ اوّل۔تہذیبوں کی دنیا (world of civilizationsA)

2۔ حصہ دوئم ۔ تہذیبوں کا بدلتا توازن (The shifting balance of civilizations)

3۔ حصہ سوئم ۔ تہذیبوں کا ابھرتا ہوا نظام (The emerging order of civilizations)

4۔ حصہ چہارم ۔ تہذیبوں کے تصادم (Clashes of civilizations)

5۔ حصہ پنجم ۔ تہذیبوں کا مستقبل (The future of civilizations)۔ جس میں مصنف نے اپنے اسی بنیادی مقدمے کو دلائل و براہین سے ثابت کیا ہے اور اس کی بنیاد پر نئے عالمی نظام کے مختلف پہلوؤں کو واضح کیا ہے۔ پہلے حصے میں مصنف بتاتے ہیں کہ موجودہ عالمی سیاست کی بنیاد تہذیب ہے نہ کہ قوم یا نظریہ۔ وہ واضح کرتے ہیں کہ دنیا اگر مغرب کے اثرات قبول کر رہی ہے تو یہ لوگوں کے جدید (Modern) ہونے کی علامت ہے نہ کہ مغربی (Westernize) ہونے کی۔ یہ اثرات کسی عالمی مغربی تہذیب کو پیدا نہیں کرتے، بلکہ مختلف تہذیبوں کے جدید ہونے کی علامت ہیں۔

دوسرے حصے میں مصنف بیان کرتے ہیں کہ مغرب کی طاقت زوال پزیر ہے۔ ایشیائی تہذیبیں اپنی بڑھتی ہوئی معاشی اور فوجی طاقت جبکہ مسلمان اپنی بڑھتی ہوئی آبادی کی بنا پر مغرب کے لیے چیلنج پیدا کر دیں گے۔ تیسرے حصے میں مصنف بتاتے ہیں کہ نیا عالمی نظام تہذیبی بنیادوں پر جنم لے رہا ہے اور لوگ تہذیب و ثقافت کی بنیاد پر ہی جڑ اور کٹ رہے ہیں۔ چوتھے حصے میں مصنف براہ راست تہذیبوں کے تصادم کو موضوع بنا کر یہ بتاتے ہیں کہ مغرب کا ٹکراؤ ممکنہ طور پر چین اور مسلم دنیا سے ہوگا۔ پانچویں اور آخری باب میں مصنف اہل مغرب کو یہ بتاتے ہیں کہ وہ اپنی مغربی شناخت پر قائم رہیں۔ اسی بنیاد پر امریکہ اور یورپ متحد ہو کر غیر مغربی معاشروں کے چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہوں۔

کتاب کا موضوع چونکہ بین الاقوامی سیاست اور عالمی نظام ہے، اس لیے دوسری اقوام اور تہذیبیں یقیناً زیر بحث آئی ہیں۔ اسی بنا پر کتاب دنیا بھر میں گفتگو، بحث و مباحثے اور تنقید و تجزیے کا موضوع بنی ہے۔ مگر درحقیقت یہ کتاب اہل مغرب کو مخاطب کر کے لکھی گئی ہے اور سرد جنگ کے بعد پھیلنے والے بعض مغربی نظریات کو ہدف تنقید بنا کر اپنا استدلال پیش کرتی ہے۔ ان میں خاص طور پر وہ نقطہ نظر سب سے نمایاں ہے جو سرد جنگ کے خاتمے اور کمیونزم کے خلاف مغرب کی کامیابی کے بعد مغربی حلقوں میں بڑا مقبول ہوا تھا۔ یعنی آزاد، جمہوری اور سرمایہ دارانہ مغربی معاشرہ انسانی فکری ارتقا کی آخری حد ہے۔ جس کے بعد دنیا پر واضح ہو چکا ہے کہ یہی اقدار

مبنی برحق ہیں۔ دنیا انھیں قبول کررہی ہے۔ اسے ایسا ہی کرنا چاہیے۔ اس عمل کے نتیجے میں ایک عالمی آفاقی تہذیب وجود میں آجائے گی جس کا امام مغرب ہوگا۔ اس نقط ؟ نظر کی نمائندہ کتاب ۱۹۸۹ء میں شائع ہونے والی فرانسس فوکویاما کی کتاب ’The End of History‘ تھی۔

مصنف نے اس نقطہ نظر کو رد کرتے ہوئے اہل مغرب پر یہ بات واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ سرد جنگ کے بعد بین الاقوامی تصادم ختم نہیں ہوا، بلکہ اس کی اساسات بدل گئی ہیں۔ پہلے یہ تصادم قومی اور نظریاتی بنیادوں پر ہوتا تھا اور اب تہذیبی بنیادوں پر ہوگا۔ یہ سوچنا کہ جینز، برگر، پیپسی اور ہالی وڈ کا کلچر اختیار کرنے سے دنیا مغربی اقدار کو قبول کررہی ہے، درست نہیں۔ دورِ جدید میں اہل مغرب کو کئی اعتبارات سے دوسری تہذیبوں پر برتری حاصل رہی ہے، مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ انھوں نے دوسری تہذیبوں سے ترقی کے امکانات ختم کردیے یا عروج و زوال کے فطری قانون سے اہل مغرب کو کوئی استثنا حاصل ہوگیا ہے۔ وہ مغرب کے آفاقی تہذیب کے تصور پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ’’ہر تہذیب خود کو دنیا کے مرکز کی حیثیت سے دیکھتی ہے اور اپنی تاریخ لکھتے وقت اسے انسانی تاریخ کے مرکزی ڈرامے کا مرتبہ دیتی ہے۔ یہ بات دوسری ثقافتوں کے مقابلے میں مغرب کے بارے میں شائد زیادہ صحیح ہے۔ لیکن ایک کثیر تہذیبی دنیا میں ایسے یک تہذیبی نقطہ نظر کی اہمیت اور افادیت کم ہورہی ہے۔‘‘ (۳۶)

اس کے بعد مصنف بعض بڑے مغربی دانش وروں مثلاً اسپینگلر، ٹائن بی وغیرہ کے حوالے سے اس نقطہ نظر پر تنقید کے بعد لکھتے ہیں:

> ’’تاہم ان دانش وروں نے جن سرابوں اور تعصّبات سے ہوشیار رہنے کے لیے کہا تھا وہ زندہ ہیں اور بیسویں صدی کے آخر میں تنگ نظری پر مبنی اس متکبرانہ نقطہ نگاہ کی صورت میں بہت عام ہوگئے ہیں کہ مغرب کی یورپی تہذیب اب دنیا کی آفاقی تہذیب ہے۔‘‘ (۴۶)

کتاب کی ابتدا میں اس تصور پر تنقید کرنے کے بعد پوری کتاب میں مصنف نے وہ حالات وواقعات، اعداد و شمار اور حقائق بیان کیے ہیں جو یہ بتاتے ہیں کہ:

1 آج کی دنیا ایک کثیر تہذیبی دنیا ہے۔

2 اس دنیا میں مغربی تہذیب کی طاقت ماضی کے مقابلے میں بہت کم ہوچکی ہے۔

3 دیگر تہذیبیں نہ صرف موجود ہیں اور اپنے وجود کا اثبات کررہی ہیں، بلکہ طاقت کا توازن بتدریج ان کے حق میں بدلتا جارہا ہے۔

4 دنیا میں دوستی، دشمنی اور امن و جنگ کے سارے معاملات تہذیبی بنیاد ہی پر ہوں گے۔

5 مغرب کے لیے سب سے بڑا ممکنہ چیلنج چینی اور مسلم تہذیب کی طرف سے رونما ہوگا۔

6 اس نئی تہذیبی دنیا کا اثبات کیے بغیر مغرب دنیا پر اپنی برتری برقرار نہیں رکھ سکتا اور نئے چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ امریکہ اور یورپ کا اتحاد وجود میں آئے۔

مصنف نے جس نقطہ نظر کو اس کتاب میں پیش کیا ہے، محسوس ہوتا ہے کہ امریکی پالیسی سازوں نے اس نقطہ نظر کے بہت سے پہلوؤں کی افادیت کو تسلیم کر لیا ہے۔ خاص طور پر ۱۱ ستمبر کے واقعے کے بعد۔ چنانچہ پہلے مرحلے پر مسلم تہذیب کے کمزور چیلنج کو کچلنے کا فیصلہ کیا گیا۔ جس کے نتیجے میں افغانستان اور عراق کا حشر دیکھنے کے بعد ایران اور لیبیا اپنے نیوکلیائی پروگرام سے دست بردار ہونے کا سوچ رہے ہیں۔ تاہم جو کچھ ہوا اس کی ذمہ داری بڑی حد تک خود مسلم رہنماوں پر عائد ہوتی ہے۔ کتاب میں مختلف تہذیبوں کی طاقت کا جو حقیقت پسندانہ تجزیہ کیا گیا ہے، اس کے مطالعے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مغرب کے لیے اصل خطرہ چین کی ابھرتی ہوئی فوجی اور معاشی طاقت ہے، مگر اس کے باوجود چینی رہنما حتی الامکان مغرب کے مقابلے میں آنے سے گریز کرتے ہیں۔ جبکہ ہماری صورت حال یہ ہے کہ جذباتی لیڈرشپ کا بس نہیں چلتا کہ پورے عالم اسلام کو امریکہ سے بھڑا دیں۔ زمینی حقائق کیا ہیں؟ اللہ تعالیٰ کے کن قوانین کے تحت یہ دنیا چل رہی ہے؟ تاریخ کا سبق کیا ہے؟ عوام الناس کے حالات اور ان کی ذہنی کیفیت کیا ہے؟ ان تمام چیزیوں سے جذباتی لوگوں کو کوئی دلچسپی نہیں۔ ان کے فکر وفہم کا آخری منتہا یہ ہے کہ امریکہ (مغرب) کا زوال عنقریب ہو جائے گا۔ تاریخ سے معمولی شد بد رکھنے والا شخص بھی یہ جانتا ہے کہ ایسا ہی ہوگا۔ مگر سوال یہ ہے کہ کیا مسلمانوں کا اس کی جگہ لینے کا کوئی امکان ہے؟ بدقسمتی سے اس سوال کا جواب نفی میں ہے اور یہ وہ بات ہے جس کی طرف ان لوگوں کی کوئی توجہ نہیں۔

مسلمانوں کے لیے سب سے بہتر راستہ یہی ہے کہ فوراً سے پیش تر فوجی میدان میں خود کو مغرب کے مقابلے سے ہٹا دیں۔ اس کے بجائے وہ اس تہذیبی جنگ کی تیاری کریں جس سے مصنف نے بڑا صرف نظر کیا ہے۔ یعنی حیات و کائنات کے بارے میں دنیا بھر کا مغربی نقطہ نظر کو اختیار کر لینا۔ مصنف چونکہ اصلاً ایک سیاسی دانش ور ہیں، اس لیے انھوں نے چیزوں کو اسی عینک سے دیکھا ہے۔ وگرنہ یہ ایک حقیقت ہے کہ الحاد پر مبنی اہل مغرب کی تہذیب دنیا کے خشک و تر اور مشرق و مغرب پر حکمران ہے۔ اور اس اعتبار سے بلاشبہ یہ ایک عالمی تہذیب ہے۔ مسلمانوں کو اصل خطرہ مغرب کی فوجی یا معاشی طاقت سے نہیں، بلکہ ان کی تہذیبی یلغار سے ہے۔ اس یلغار کے

وہ پہلو جو مسلمانوں کو توحید و آخرت سے غافل اور عفت و عصمت سے بے نیاز کر رہے ہیں، تہذیبوں کے تصادم کا، مسلمانوں کی حد تک، اصل میدان ہیں۔

مصنف کے تجزیے کا ایک اور کمزور پہلو اس حقیقت کو نظر انداز کرنا ہے کہ مفادات صرف تہذیبی نہیں ہوا کرتے۔ معاشی، سیاسی اور دیگر کئی طرح کے مفادات ہیں جو دور جدید میں قوموں کی صف بندی میں نمایاں کردار ادا کریں گے اور کر رہے ہیں۔ افغانستان پر حملے کے وقت پاکستان نے جو کچھ کیا، وہ اس کی ایک نمایاں مثال ہے۔ اسی طرح اسلام کی اصل تعلیمات سے بے خبری کی بنا پر مصنف یہ نہ جان سکے کہ وہ بہت سی اقدار جو مغرب نے دنیا میں رائج کی ہیں، اسلام ہی نے پہلی دفعہ دنیا کے سامنے ان کا عملی نمونہ پیش کیا تھا۔ انسانی حقوق، جمہوریت، خواتین کے حقوق، اظہار رائے کی آزادی اور ان جیسی بہت سی دیگر اقدار ہیں، اسلام جن کا سب سے بڑا مبلغ ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ مسلمان بعد میں ان اقدار کو گنوا بیٹھے اور اب ان کے مخالف ہو گئے ہیں۔ جس روز وہ حقیقی اسلام کے علم بردار بنے، سب سے بڑھ کر ان اقدار کو دنیا کے سامنے لے کر اٹھیں گے۔

بہرحال یہ کتاب اس قابل ہے کہ ہر باشعور شخص اس کا مطالعہ کرے۔ اس سے نہ صرف اہل مغرب کے ذہن کا اندازہ ہوتا ہے، بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ حقائق کا تجزیہ کس انداز سے کرتے ہیں۔ ایک حدیث میں مومن کو ''اپنے زمانے سے باخبر'' قرار دیا گیا ہے۔ کتاب کے قاری کو اندازہ ہوگا کہ یہ صفت جو آج کے مسلمانوں میں تو شاید موجود نہیں، ہم جنھیں ''کافر'' قرار دیتے ہیں، ان میں بافراط پائی جاتی ہے۔

میں ہوں وارث ــــــ جناح کا!!

سید تحسین گیلانی

اقبالؒ نے کہا ہے:

"It is an organic whole in the past is not left behind but is moving along with and in the present and the future is given to it not as lying as before yet to be traversed;it is given only in the sense that it is present in the nature as an open possibility."

(اقبالیات مارچ 88ء۔اقبال اکادمی پاکستان)

اس کے ساتھ ہی اقبالؒ کا یہ کہنا کہ:

"۔۔انسانی انا کی ابتداء زماں میں ہی ہوئی ہے اور زمان و مکاں کے تانے بانے میں ہونے سے پہلے وہ موجود نہیں ہوتا۔۔"

مندرجہ بالا دونوں اہم اقتباسات اقبال کی فکر کے غماز ہیں وہ انسان کی انرجی کو ایک جیتا جاگتا مظہر قرار دیتے ہیں انسان کا تخلیقی عمل اور اس کی انرجی جو کائناتِ بسیط کے اندر عمل آرا ہے اسے متحرک کیے ہوئے ہے۔

مذکورہ ناول "میں جناح کا وارث ہوں" ظاہری قامت میں تو مزدور بچوں کے مسائل کا اشاریہ ہے لیکن صرف ایسا ہرگز نہیں ہے یہ ناول تخلیقی عمل سے گزرتے لمحوں میں بنی نوع انسان کے کئی اہم مسائل کا بھی تخاطب ہے۔اس ناول کا مرکزی کردار "وارث "اس ناول کا ہی نہیں بلکہ ایک پوری نسل کا وارث بن کر ابھرا ہے اس کا شدید تجسس اس کی انا ہی اس کا وہ غیر مختتم جذبہ ہے جو ایک قوی جذبے کی متشکل کرتے ہوئے آگے بڑھتا ہے۔

اس کے ہاں Passion اور تلاش وجستجو کا میلان ہی اس کی کامیابی کا وسیلہ ہے جسے اور کئی وسیلوں نے مل کر پروان چڑھایا۔۔۔۔

قرآنِ کریم میں اللہ کریم ارشاد فرماتے ہیں:

"اگر تم میں آسمانوں اور زمین کی حدود یا مداروں سے نکل جانے کی استطاعت ہے تو نکل جاؤ، تم نہیں نکل سکتے مگر علم کی قوت تسخیر (سلطان) کے ساتھ۔"

یعنی خدائے رحمان نے بھی علم و جستجو کو وسیلہ قرار دیا ہے کہ انسان جو چاہے علم کے وسیلے سے زیر کر سکتا ہے۔ تو اس ناول کا مرکزی کردار علم کو بنیاد اور ڈھال بنا کر دنیا کو فتح کرنے کا ارادا کرتا ہے جس میں وہ کامیاب رہتا ہے۔

آغاز میں اقبال کے نوٹ میں انہوں نے بھی زماں کے لاتعداد امکانات کے تصوررات کی وضاحت کی ہے۔ انسانی انا کو تخلیقی قوت کا منبع قرار دینے کا مطلب یہی ہے کہ انسان کی جبلت ہے کہ چیلنج سے اس کی انا کو ضرب لگتی ہے اور یوں انسان کی تخلیقی قوت بھی لحظہ لحظہ بڑھتی ہے اور پے در پے ظہور کی متقاضی ہوتی ہے اور ساتھ ہی تغیرات سے بھی دوچار ہوتی ہے اور کسی پابندی کو قبول نہیں کرتی۔ معروف محقق و ناقد ڈاکٹر حامدی کاشمیری نے ایک جگہ لکھا ہے کہ:

"انسان کی ازلی تلاش کا منبع داخلی شخصیت کی وہ انرجی ہے جو مادے کے ایک زندہ جز کی حیثیت سے اسے فطرت سے ودیعت ہوئی۔ انرجی مادہ اور زندگی دونوں کے بطون میں عمل آرا ہے، اور اظہاریت کی طالب ہے۔۔۔"

زیرِ بحث ناول کا مرکزی کردار بھی بھرپور انرجی سے ہم رشتہ ہے وہ باطنی طور پر اظہاریت کے لیے مضطرب رہتا ہے اور یہی اس کی کامیابی کا راز ہے۔ یہ ناول مجھے مستقبل کا پیش بیں بھی لگا جیسے سیاسی نظریات و افکار کو اس ناول میں موضوع بنایا گیا ہے وہ ہر لحاظ سے کسی زیرک حکمران کی فکر کو مہمیز کرتی ہوئی فکر ہے۔ جیسے عوامی مسائل کا حل اس ناول میں پیش کیا گیا ہے اور جس طرح سے کردار ان مسائل پر جامع و اکمل انداز میں بات کرتا ہے وہ ایک ناخدا کی حیثیت اختیار کرتا چلا گیا ہے۔ میں اس ناول کو سیاسی سائنس کا عمدہ شاہکار بھی سمجھتا ہوں۔

گو کہ انسانی شعور کوئی ماورائی الوہی یا آزاد مکاشفانہ قوت نہیں ہے، بلکہ طبعیاتی سطح پر حواس ظاہری کی ترکیب اور عمل آوری کا نتیجہ ہے جو مادی حالات سے مشروط ہے یہ بات اس ناول سے ثابت ہے۔ انسان کو عملی مظاہرہ کرتے ہوئے حالات و واقعات سے گزرتے ہوئے ہی انجام آشنا ہونا پڑتا ہے۔ عملی اقدامات ہی کسی انسان کو کامیابی کی راہ پر گامزن کر سکتے ہیں۔

ہماری نسل میں قابلیت و اہلیت کی کوئی کمی نہیں ہے لیکن اشرافیہ کو نچلے طبقے پر نظر ڈالنا ہوگی کیسے کیسے "گواچے ہیرے" اردگرد موجود ہیں بس ذرا سی تلاش سے ان کو چمکایا جا سکتا ہے ہاں انفرادی سطح پر بھی اگر ہم کوشاں رہیں تو باآسانی اس نسل سے کئی ایسے انمول رتن مل سکتے ہیں جو قوم و ملت کے لیے مفید ہو سکتے ہیں۔

ہمارے ہاں مقاصد کے حصول کے لیے اور اپنے مفادات کی خاطر تو ہم کسی سطح تک جا کر بھی سوچ سکتے ہیں لیکن بحیثیت فردِ ملت ہم میں سے کوئی بھی وطنِ عزیز کے لیے سوچنے کو تیار نہیں ہے۔اس ناول کا کینوس canvas اس قدر وسیع ہیکہ اس میں پورے ایک عہد کا تہذیبی ارتقاء منعکس ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ کسی ناول کی سب بڑی خوبی یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ کسی خاص عہد کی تاریخ اس کے تمام اہم واقعات کو بیان کرتا ہے اور یوں وہ ایک خاص عہد کی مجلسی/ سماجی / تہذیبی/ ثقافتی/ سیاسی اقدار کی نقاب کشائی بھی کرتا چلا جاتا ہے۔اس ناول کے کردار، پلاٹ اور مناظر جیتی جاگتی زندگی کے عکاس ہیں اور درجنوں کردار مختلف قسم کے واقعات سے گرزتے ہوئے مرکزی کردار سے آ کر متصادم ہوتے چلے جاتے ہیں۔اس کے علاوہ جو اہم خوبی ہے وہ یہ ہے کہ یہ ناول اُس وسیع پس منظر کو بھی اجاگر کرتا ہے جس کی روشنی کرداروں کی ہیئت کو نمایاں کرتی ہے۔ میں موضوع کو اس مضمون میں کھولنا نہیں چاہتا لیکن مخصوص اشاروں سے قارئین کو متجسس کر کے ان کی فکر کو مہمیز کرتے ہوئے انہیں بھی اس ناول کی reading پر اکسا ضرور رہا ہوں کہ وہ اگر ناول میں کردار سازی۔ پلاٹ اور منظر بندی کا عمدہ مظاہرہ دیکھنا چاہیں تو اس ناول سے ضرور رجوع کریں۔

ناول کی باب میں مَیں یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ ناول ایک حد تک منتشر صنفِ ادب ہے جس میں بہت احتیاط لازم ہے۔ڈاکٹر وزیر آغا صاحب لکھتے ہیں کہ:

"افسانے کی تراش ہیئت اور تار و پود میں کفایت اور انضباط کا احساس ہوتا لیکن ناول کسی دیو پیکر درخت کی مانند ہوتا ہے جس میں چھوٹی چھوٹی جڑیں مل کر ایک بڑی جڑ کی تشکیل کرتی ہیں اور پھر اسی قبیل کی بڑی جڑیں مل کر ایک اور بڑی جڑ کو وجود میں لاتی ہیں۔۔۔"

ناول کا مرکزی کردار افسانے کے کئی چھوٹے چھوٹے کرداروں پر بھاری ہوتا ہے۔۔۔۔ جیسے کہ عصمت کے افسانوں کے بیشمار کردار ہیں لیکن ان کے ناول ٹیڑھی لکیر کا کردار 'شمّن' کا مقام ان سب سے الگ ہے۔

ایسے ہی "میں جناح کا وارث ہوں" کا مرکزی کردار وارث ایک ایسا زندہ کردار ہے جو کئی افسانوی کرداروں پر بھاری ہے۔اس ناول پر مزید بات ہوگی اور تادیر یہ ناول موضوع بحث رہے گا اگر اسے اچھے اور سنجیدہ قارئین میسر آئے۔محمود ظفر اقبال ہاشمی صاحب کا یہ ناول پڑھتے ہوئے اس سوال نے بار بار مجھ میں سوال اٹھایا کہ کیا واقعی۔۔۔۔۔

میں وارث ہوں۔۔۔۔ جناح کا؟؟؟

ناول: 'اندھیرے میں جگنو'

سیدہ آیت گیلانی

ایک منجھے ہوئے ناول نگار ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ایک شاعر اور مصور بھی ہیں۔۔نہ صرف اپنے قلم کی قوت سے واقف ہیں بلکہ حرمتِ قلم سے بھی مکمل طور پر آشنا ہیں۔۔۔ظفر اقبال ھاشمی کے تعارف کے لئے اتنا کہنا ہی کافی ہے کہ وہ حقیقتِ حرف کے اتنے بڑے نبض شناس ہیں کہ نہ صرف یہ جانتے ہیں کہ وقت کس قسم کی تحریر کا طلبگار رہے بلکہ یہ بھی عرفان رکھتے کہاں کب اور کیسے فکر کے پنچھیوں کو لفظوں کے لبادے اوڑھ کر اڑان بھرنی ہے۔انہوں نے اسلوب۔۔پلاٹ اور بیانیے۔۔کے ساتھ ساتھ اردو ادب کی رگوں میں اُس دھیمی مسکان کا رقص بھی اتارا ہے جو ان کی ذات کا لازمی عنصر ہے۔ان کے انداز اور مزاج کی انفرادیت کا یہی راز ہے کہ ان کی تخلیق میں لفظ ہی نہیں منظر بھی کلام کرتے ہیں۔فطرت کی گنگناہٹ جن کے حُسن ودلکشی میں چار چاند لگا دیتی ہے۔

"اندھیرے میں جگنو " فطرت کے حسنِ لازوال، قلم کی قدرت کے کمال اور فکر کے جمال سے مزین ایسا ہی شاہکار ناول ہے جسے ادب کی تاریخ کثیر الجہت اوصاف اور فکری زاویوں کے باعث ہمیشہ یاد رکھے گی۔۔۔اس ناول کا آغاز انتظار سے ہوتا ہے۔۔۔پہلا منظر ہی قُدرتِ قلم کا شاہکار ہے۔جس انتظار سے ناول کا آغاز ہے تخلیق کار نے اسی انتظار کو کثیر الجہت زاویوں سے ایسے مجسم کیا ہے کہ کردار کی کیفیت اور احساس کا فسوں یعنی انتظار کا رنگ وادی پہ اداس بادل کی طرح چھایا نظر آتا ہے۔یہ اداسی ڈال ڈال پر قطرہ قطرہ گرتی ہے اور پھر سارے منظر میں ایسے ضم ہو جاتی ہے جیسے کالی گھٹائیں نیلے آسماں کو اپنے دراز آنچل میں سمیٹ لیں۔انتظار کے اس رنگ سے آگے "وادی تخت الملوک" کا تعارف ہے۔۔امیج سے بالا ہے اسے تعارف کہوں یا تصویر۔۔بیان میں اس قدر جامعیت ہے کہ یوں گماں ہوتا ہے جیسے فطرت کی پری پَر پھیلائے آسمان سے اتر کر قرطاس پر آن براجمان ہوئی ہو۔۔بشر کی تخلیق پر یہ گماں ہے تو قدرت کی صناعی کیا ہو گی۔سبحان اللہ

(جسے یہ بات مبالغہ لگے اُس کے لیے لازم ہے کہ اس منظر کا روح کی آنکھ سے مطالعہ

کرے اور نگاہ کو باطن میں اتار کر چشمِ بینا سے منظر دیکھے۔حرفوں کی رگ کریدنے کا مزہ ہی الگ ہے۔۔۔)

جہاں تک اس کی کہانی کا تعلق ہے یہ ایک ایسا ناول جسے ہر انسانیت نواز دل کی آواز کہنا بیجا نہ ہوگا۔۔بقول خالد شریف: "یہ ناول نہیں ایک حیرت کدہ ہے"

اس حیرت کدے کی حیرت کا راز یہی ہے کہ یہقاری پر اس کی فکر کے مطابق کُھلتا ہیمگر پیغامِ محبت، امید اور ایمان کی روشنی سب کے دامن میں یکساں انڈیل جاتا ہے۔۔کیونکہ یہ فقط حیرت کدہ ہی نہیں فسوں کدہ بھی ہے۔ جذبات و احساسات کا فسوں کدہ۔۔وہ جذبات و احساسات جو مصنف کے تخیل کے فلک پر دھنک کی صورت چھب دکھاتے ہیں اور قاری کی طبیعت کے نشیب وفراز میں میٹھے چشموں کی طرح روانی سے بہتے چلے جاتے ہیں۔۔

اس ناول کا ہر ورق پڑھنے والے پر اک نیا سحر طاری کرتا ہے۔اس کی کہانیوں میں اترتے موسموں کی شدتوں کو وہ کرداروں کی طرح من وعن محسوس کرتا ہے جو اس میں سانس لیتے، چلتے پھرتے اپنے ماضی وحال کے آئینے سے ان وارداتوں کا عکس دکھاتے ہیں جو کبھی خارجی اور کبھی داخلی دنیا کی بھول بھلیوں میں وقوع پذیر ہو کر وقت کے دامن پر اپنے انمٹ نقش چھوڑ جاتی ہیں۔وہ بے اختیار ان کے ساتھ جاڑے کی بدن چیرتی ہواؤں میں کانپتا اور خزاں کے بے رنگی دیکھ کر اداس ہوتا ہے۔وہ کرداروں کے ساتھ روتا اور ہنستا ہے۔۔نظر اوراق پر چھپے کالے لفظوں پر جمی رہتی ہے اور روح روشن مفہوم کی وادی میں متحرک رہتی ہے۔۔۔طبیعات و مابعد طبیعات کا لطیف سنگم فکر میں ایک تازہ لہر پیدا کرنے کا باعث بن کر اول تا آخر کبھی خاموشیوں میں کلام کرتا ہے اور کبھی فطرت کے نظاروں میں سانس لیتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔۔کہی سے زیادہ ان کہی جاندار انداز میں جلوہ افروز ہوتی ہے کون کتنا بلند ہے، کس کا کیا مرتبہ ہے، کون سے ظرف میں جامِ بقا ہے یہ قلم خوب جانتا ہے۔۔۔۔بہت خوب پہچانتا ہے۔۔۔

تا حدِ نظر خواہشوں کی تتلیاں
تا حدِ فکر جستجوئے تازہ کی خُو
ہر گام پہ صدائے تازہ کی مہک
ہر موڑ پہ نئی منزل کی خوش بُو
ہر دریچے میں اِک آہٹِ تازہ
ہر جھروکے میں نئے رنگ روبرُو

دھند کے اُس پار انتظار میں سلگتے
چلمن کے دامن سے لپٹے
کچھ اشاروں کا فسوں
برف پہنے راہ گزر کے اِس طرف
زندگی کی چاہ لیے چند راستے
اور ان راستوں پر لبِ جُو
جذبات کی آنچ سے پگھلتے
پربتوں اور قربتوں کے حسیں سلسلے
جن کے دامن میں سانس لیتی
کہانی کی صدائے نو میں
خدائی کے سب رنگ ہیں!!!
وہ خدا ہے؟
یا
میں اور تُو
ہاں! میں اور تُو
جیسے
"اندھیرے میں جگنو"

یہ زندہ ناول ہے جس کے الفاظ جامد وساکت نہیں ہر دم تازہ وحرکت پذیر ہیں۔ یہ زندہ کہانی ہے۔آغوشِ حیات میں سانس لیتی حقیقت کی زندہ کہانی جو کبھی نہیں مرتی کوہ ودمن میں صورتیں بدل بدل کر پروان چڑھتی رہتی ہے۔۔۔مرے بھی تو کیسے؟

اس نے آبِ حیات پی رکھا ہے۔

دراصل آبِ حیات کہانی کے مضبوط کردار ہوتے ہیں جو

اسے حیاتِ جاوداں بخشتے ہیں۔۔۔یہ ناول اپنے دامن میں بھی حقیقت کی زمین پر کھڑے وقت کے موسموں سے نبرد آزما مضبوط کرداروں کی داستان سمیٹے ہوئے ہے۔آہ وفغاں و نالہ وفریاد کو خاموشی اور صبر سے درد والم کی خزاؤں کے شکم میں اتار کر شکوہ وشکایت کو کُنجِ قلب کے کسی ویران گوشے میں دفنا کر عزمِ نو، عالی ہمت اور چشمِ بینا کے سہارے حوصلے سے سفر کرتے مسافروں

کی جستجو کا بیان ہے جو کبھی ماضی کے دھندلکوں سے خورشید تازہ کی کرن بن کر دل و جاں کو حرارت بخشتے ہیں تو کبھی آنکھ کی منڈیر پر تماشا دیکھتی پلکوں کی دہلیز پر امید کے چراغ روشن کرتے ہیں۔احترامِ انسانیت جن کی لو ہے اور محبت جن کا روغن۔۔۔ایسے چراغ جو جلیں تو بزمِ دہر سے تاریکیاں منہ چھپا کر بھاگ جاتی ہیں۔۔۔۔

"اندھیرے میں جگنو" کے کرداروں کا بنظرِ غائر مطالعہ کریں تو یہ اسمِ بامسمیٰ محسوس ہوتے ہیں جیسے دس سالہ شہیر زمان خان المعروف "جگنو" کا چمکتا دمکتا کردار۔نام بھی جگنو اور کام بھی جگنو۔۔۔

جگنو۔۔فقط ایک کردار ہی نہیں ایک معصوم آواز بھی ہے جو ہر باضمیر دل کی دھڑکن بن کر ہر جگہ اس کے نظریات و خیالات کا پرچار کرتی ہے۔جگنو درحقیقت زندگی کی آواز ہے جو روشن فکر سرفہد کے باطن سے پھوٹتے نظریات کی صورت ہمیں آغاز سے اختتام تک سُنائی دیتی ہے۔کِس کے درِ دل پر اِس آواز نے کتنی دستک دی یہ اُس کے معیارِ سماعت اور فراوانیء بخت کی بات ہے۔اِس کا بہروں سے کوئی علاقہ نہیں۔یہ کردار ایسا ہی ہے جیسے سید وستوں کے درمیان کسی کے لیے کوئی وجہ؟ دوستی ہو۔ اس ناول میں یہ ظاہری طور پر عمر میں سب سے چھوٹا ہے مگر کئی مقامات پر بڑے بڑوں سے بڑا نظر آیا۔اور جب یہ مکمل قد کے ساتھ صفحۂ قرطاس پر نکھر کر سامنے آتا ہے تو یہ ایک سورج کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔۔یعنی "سرفواد"۔جو مصائب کی بدلیوں میں چھپتا تو ہے مگر وہ اس کی آب و تاب کو گہنا نہیں پاتیں۔۔

کالے بادلو!!
تم میں کہاں دم؟
کہ تم کرنوں سے روشنی نچوڑ دو
اوٹ میں چھپنے سے مسکن نہیں بدلتے
مہر و ماہ صورت نہیں بدلتے
برستی ہے تو گھٹا کالی
سورج تو جہاں بھی ہو
سدا سورج ہی رہتا ہے۔

ایثار اور خلوص کا نایاب پیکر جی ایم یعنی غلام محمد ہے۔۔۔مجھے اس کردار کے بارے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ اگر تخلیق کار اس کی تخلیق میں بے نیازی برت جاتے یا جس منصب پر جس طرح اس کے وجود کی مورت کو تراشا گیا اس میں رتی بھر بھی کمی آجاتی تو تحریر توازن کھو

بیٹھتی۔ہمیں پورے ناول میں اس جانثار کی بیلوث شفقت اور وفاداری نیکی کیجذ بے سے آشنا کرواتے ہوئے ایسے غالب نظر آتی ہے جیسے باغ کے گوشے گوشے پر ذمہ دار باغباں کا وجود۔
اس کے جاندار مکالمے فلسفیانہ آہنگ کے ساتھ لطف دوبالا کرنے کا مکمل سامان مہیا کرتے ہیں۔جی ایم کی گفتگو اس بات پر دلیل ہے کی علم ڈگریوں کا محتاج نہیں ہوتا اصل تجربہ زندگی کی دَین ہے جس کے ہر موڑ پر چابک پکڑے سبق وہ استاد سکھاتا ہے جسے لوگ " وقت " کہتے ہیں۔۔۔جی ایم کی زبانی کیا خوبصورت جملہ ہے۔۔۔

"ارے بھاڑ میں جائیں یہ سب فلاسفر۔۔۔زندگی کے خوبصورت رنگ برنگے پَر توڑ ڈالے ان سب مرُدودوں نے مل کر"۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔(واااہ واا۔۔۔۔مزہ آ گیا)

یقیناً یہ جملہ وہی انسان کہہ سکتا ہے جسے تجربات کی بھٹی میں کندن بن کر یہ علم ہوا ہو کہ

" آگہی بڑی سخت سزا ہے۔"

اک اور بہت سبق آموز جملہ

" گھر بڑا ہو یا چھوٹا اسے حتی الامکاں خوبصورت ضرور ہونا چاہیئے۔"

اور یہ

"بٹیا! یہ ٹھہرا ہوا پانی ہے۔۔اس میں کنکر پھینکنے سے اب کوئی دائرہ نہیں بنتا"

اور ایسے بہت سے خوبصورت جملے اس ناول کی خوبصورتی اور زبان کی چاشنی کو بڑھاتے ہیں۔

(میرے لیے یا سی وجہ سیانتخاب کڑا رہا کہ کون سا جملہ لکھوں اور کون سا نہیں۔یقین مانیے اگر میں ڈائیلاگز لکھنے بیٹھوں تو صرف منظر نکان ہوں گیباقی سارا ناول ہی لکھنے لائق ہے۔۔ ?خدا کرے زورِ قلم اور زیادہ)

اِن کے علاوہ۔۔۔۔صبر و وفا کا مسکراتا چہرہ رابیل اور امید کی نئی اور نکھرتی صبح سحر افروز۔۔۔اپنی سوچ سے صبحِ نو کے اُجالے بکھرتی سُندر سویرے جیسی سحر افروز۔۔جس کا کہنا ہے کہ "میں آدھی روشنی کو محرومی نہیں سمجھتی اور نہ ہی اسے اپنا قید خانہ بناتی ہوں۔۔۔آدھی روشنی سے خود بھی خوش رہتی ہوں اور دوسروں کو بھی خوش رکھنے کی کوشش کرتی ہوں۔۔۔"

(کیا خوب کہا افروز بی بی۔۔۔۔۔!!!!! ہم میں سے اکثریت کو آدھی روشنی ہی حاصل ہے۔المیہ یہ ہے کہ قناعت کا سبق فراموش ہو چکنے کے باعث ہم ... پوری کے چکر میں آدھی بھی گنوا بیٹھتے ہیں اور الزام اندھیروں پہ دھرتے ہیں۔)

ادب کیسے راہبری کرتا ہے کیسے سوچ کے دریچوں میں اپنا عکس چھوڑ جاتا ہے سحر افروز

کے اس مکالمے سے اس کی وضاحت بخوبی ہوتی ہے۔

اس ناول کا ہر کردار اپنی جگہ انگوٹھی میں نگینے کی طرح فٹ نظر آتا ہے۔ محمد صفدر ہاشمی صاحب کی معتبر شخصیت، حفصہ بہروز، اسد، نیر جہاں بیگم، دادا جان، درشہوار اور دادی جان یہ سب خلوص اور محبت کے رنگ ہیں جو مختلف چہرے اوڑھ کر اس دھرتی پر موجود ہیں۔ یہ سب ایسے کردار ہیں جن کے دم سے انسانیت باقی ہے۔ انسان کا انسانیت پر یقین باقی ہے۔ مقصدِ حیات، مقصدِ کائنات باقی ہے۔۔ ایسے لوگوں کو دیکھ کر یا ان کے بارے میں جان کر ہم سمجھتے ہیں کہ شاید قصوں، کہانیوں، افسانوں، ناولوں یا فلموں اور ڈراموں میں ہی ایسے کردار ملتے ہیں مگر ایسا نہیں یہ اِسی دھرتی کے باسی ہیں ہمارے قرب و جوار مین اُسی بھیڑ کا ایک حصہ بن کر جس میں ہم بھی آنکھیں بند کیے چلے جاتے ہیں۔ ہمیں یہ اس نہیں ملتے کہ ہم نے اس فریبی دنیا مین اعتماد کے ساتھ قدم جمانے کے بجائے انہونی سے ڈرنا زیادہ سیکھ لیا ہے۔ بے اعتباری کی جس فضا میں ہم سب سانس لے رہے ہیں وہاں وفا قصہٗ پارینہ لگتی ہے یہی وجہ ہے کہ انسان، انسان سے دور ہو گیا ہے۔ سگنلز کیچ کرنے اور ربط بڑھانے کی ضرورت ہے جیسے ہی دل، دل کو پہچانے گا ایسے کردار ہمارے روبرو ہوں گے۔۔ محبت مسکرا کر ہاتھ تھامے ہمیں اس ہجومِ سنگ صفت سے نکال لے جائے گی۔۔۔ آزمائش شرط ہے۔

کرداروں کی اس ست رنگی میں اِن وفا کے دیوتاؤں میں ایک چہرہ اس بیوفا کا بھی نظر آتا ہے جو اسی دنیا کی تصویر کا دوسرا رخ ہے شہرینا۔۔ محبت تو محبت ہے کسی کو محبت سے ہو یا مطلب سے یہ الگ قصہ کہ دنیا اسی کا نام ہے۔۔۔ سچ ہے یہ دنیا بہت عجیب ہے۔ جون ایلیاء کا شعر یاد آ گیا:

ہم نے جانا تو ہم نے یہ جانا
جو نہیں ہے وہ خوبصورت ہے

ناکامی کامیابی کا پہلا زینہ ہے اور پہلا زینہ بارش کے پہلے قطرے کی طرح اہم ہوا کرتا ہے۔ کیونکہ پہلا تقلید کی موت اور روشِ تازہ کی حیاتِ نو کی زندہ دلیل ہوتا ہے اسی لیے پہلا قدم اور پہلا قطرہ بننے میں ہی عظمت کی صد ہزار داستانیں پنہاں ہوتی ہیں۔ ایک طرف بظاہر ہجرت ولا مکانی اور دوسری طرف فنا۔۔ اس کشمکشِ مسلسل سے جو آزاد ہوا وہی پہلا قطرہ وہی پہلا قدم ہوا۔۔ ہمت، حوصلہ، امید، اپنی ذات پر یقین اور پچھلی ناکامیوں کو بھلا کر نئے سرے سے کامیابی کی جستجو اس آزادی کی بنا ہے جو ثابت قدمی سے آرزومند کو آرزو کے دامن سے لپٹ کر منزل تک پہنچنے کی ترغیب دیتی ہے۔۔۔ بقا سے فنا، فنا میں بقا، موجود سے عدم اور پھر عدم سے

موجود اک دائرہ ہے اور مجھے یہ کہانی اس دائرے کے ہر نقطے کو چھوتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ کہیں موجود معدوم ہو کر عدم بنتا ہے اور کہیں رجعت کی راہوں سے گزر کر حال کی آنکھوں میں انکھیں ڈال ہمکلام ہوتا نظر آتا ہے۔ یہی کلام ماضی کی نقاب کشائی بھی کرتا ہے اور مستقبل کی جھلک بھی دکھاتا ہے۔۔

اور کیا کہوں۔۔۔ کیا لکھوں اس کے سوا کہ فطرت کے رنگوں سے زندگی کے انوکھے سنگم کا نظارہ اندر کی آنکھ سے کرنا ہو تو۔۔۔۔ اندھیرے میں جگنو۔۔۔ کو پڑھنا واجب ہے۔۔۔۔

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یا رَبّ

ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

عبادت سے جنت ملتی ہے اور خدمت سے خدا۔ ادب کی خدمت عبادت بھی ہے اور قُربِ خدا کا زینہ بھی۔ دعا ہے کہ بلندیوں کی بلندی آپ کا مقام ہو۔ خُدا کرے رزقِ عرفان میں دن بدن اضافہ ہو۔

ناول: ''مشک پوری کی ملکہ''

حفیظ تبسم

اردو ناول میں قدیم داستانوں کے پراسرار طلسماتی، سامراجی ماحول سے جدید ناول کی واقعاتی اور عوامی فضا تک ارتقائی عمل کا سلسلہ ملتا ہے۔گو اردو ناول کا ظہور قدیم دور کے اختتام اور ایک نئی تہذیب کے آغاز کی علامت ہے۔ناول نگاری داستان گوئی سے اس لئے بھی مختلف ہے کہ داستان میں غیر مرئی اور مافوق الفطرت واقعات کو بیان کیا جاتا ہے اور ناول میں ہماری روزمرہ کی زندگی سے کردار اٹھا کر ایک ایسی تخیلی زندگی کی عکاسی کی جاتی ہے کی عملی زندگی کی آئینہ دار بن جاتی ہے۔داستانوں میں زندگی کی جھلک نایاب ہوتی ہے جبکہ ناول شروع ہی زندگی کی عکاسی سے ہوتا ہے۔گو ناول ہی وہ صنف ہے جس سے ہم کسی بھی معاشرے کی ترقی کے مدارج، تہذیب و تمدن کے آثار اور معاشرے میں رہنے بسنے والے ہر طبقے کے رہن سہن بارے جانکاری لے سکتے ہیں۔

اکسیویں صدی کو ناول صدی کا نام دیا جا چکا ہے۔اس بات میں کسی شک و شبہ کی گنجائش بھی نہیں ہے۔کئی ادبی جرائد نے ناول کی ترویج کے سلسلے میں ''ناول نمبر'' کا اجراء کیا اور ناول کی تحقیق و تنقید میں گراں قدر کامیابی حاصل کی۔اس کے علاوہ اس صدی کی پہلی دہائی میں ہی کئی منفرد تجربات کے حامل ناول بھی سامنے آئے ہیں جن میں محمد عاطف علیم کا ناول ''مشک پوری کی ملکہ'' بھی قابلِ ذکر ہے۔

''مشک پوری کی ملکہ''۔۔۔۔نام سنتے ہی ذہن میں کئی طرح کی ملکاؤں کے نام آتے ہیں۔ملکہ برطانیہ، ملکہ نور جہاں، ملکہ حُسن وغیرہ۔مگر مشک پوری کی ملکہ ایک مادہ لیپرڈ یعنی گلدار ہے اور وہ بھی ایک آدم خور گلدار جو ایوبیہ نیشنل پارک کے گرد و نواح میں تاحدِ نگاہ پھیلے جنگلات میں رہتی ہے اور انسانوں کا شکار کرتی ہے۔ناول کی کہانی اسی کے گرد گھومتی ہے۔ناول کا آغاز وفاقی دارلحکومت سے کچھ دور گلیات کے علاقے میں موجود پہاڑی سلسلے کی منظر کشی سے ہوتا ہے۔یہیں مشک پوری نام کا ایک پہاڑ بھی ہے جو بے پناہ قدرتی حسن کا حامل ہونے کے باعث سیاحوں کیلئے خاص کشش کا حامل ہے۔اسی پہاڑ کا نواحی علاقہ ''مشک پوری کی ملکہ'' کی آماجگاہ ہے۔منظریوں

ہے کہ موسم سرما اپنی برفانی شال سمیٹ کر رخصت ہو چکا ہے مشک پوری کی ملکہ اپنے دونو عمر گل گوتھنوں کو ساتھ لئے شکار پر نکلتی ہے۔ یہاں مادہ گلدار کی حیوانی مامتا اپنے البیلے پن اور احساس ذمہ داری کے ساتھ ہمارے سامنے آتی ہے۔اس کا معمول ہے کہ وہ ہر روز اپنے دونوں بچوں کو ہمراہ لے کر اپنی غار سے نکل کر جنگل کا رخ کرتی ہے۔انسانوں کی جنگل میں بے جا مداخلت اور درختوں کی بے دریغ کٹائی کے باعث جنگل تیزی سے حیوانی وجود سے خالی ہوتے جا رہے ہیں۔لیپرڈ کے گذارے کیلئے بھی اب جنگل میں بہت زیادہ شکار نہیں رہ گیا۔ان ماں بچوں کی شکار یاترا کی صورت میں ہمیں حیوانی جبلت کا دلچسپ بیان ملتا ہے۔اس دوران ان کا سامنا ان لالچی اور سفاک انسانوں سے ہوتا ہے جو جنگلوں میں جانوروں کے بچوں کو اغوا کر کے انہیں مہنگے داموں بیچنے کا دھندہ کرتے ہیں۔وہ مادہ لیپرڈ کی آنکھوں کے سامنے اس کے دونوں بچوں پر جال پھینک کر بے بس کر دیتے ہیں۔وہ مامتا کے جوش میں پاگل ہو کر دھاڑتی ہے اور ان پر حملہ آور ہو کر انہیں مار بھگانا چاہتی ہے لیکن ان کی آگ اگلتی بندوقیں اس کا راستہ روک لیتی ہیں۔وہ زخمی ہو کر بھاگنے پر مجبور ہو جاتی ہے اور یوں ہمیشہ کیلئے اپنے گل گوتھنوں سے محروم ہو جاتی ہے۔لالچی اور سفاک ''جنگل مافیا'' کے نمائندہ یہ کردار انسانوں اور حیوانوں کے درمیان بقائے باہمی کے مقدس معاہدے کو توڑنے کے مرتکب ہوتے ہیں جو فطرت کے توازن کو قائم رکھنے کیلئے ناگزیر ہے۔ردعمل میں جنگل کی اس ملکہ کے دل میں انسانوں کے خلاف نفرت اور انتقام کے جذبات بیدار ہوتے ہیں ۔نفرت اور انتقام کے یہی جذبات اس کے آدم خور ہونے اور گلیات کے جنگلات میں صدیوں پرانے بقائے باہمی کے رشتے کو خون آلود کرنے پر منتج ہوتے ہیں۔

اس ناول میں عاطف علیم نے پہاڑی علاقوں کی تہذیبی ، معاشرتی ، سیاسی اور سماجی پہلوؤں کو فنکاری سے پیش کیا ہے اور ساتھ ساتھ ملک کے میدانی اور دنیا کے بدلتے حالات کو مدِ نظر رکھا ہے۔سیاسی حالات، انقلابات، معاشی اور صنعتی ترقی کا تذکرہ ایک مرکزی کردار نور محمد کی زبانی بیان کیا ہے، جس نے معاشی ترقی کا خواب دیکھتے ہر گھاٹ کا پانی پیا ہے، مگر حالات میں کچھ تبدیلی واقع نہ ہو سکی۔کہانی میں ایک اور مرکزی کردار جمشید کمال ثانی جو شکاری ہے اور اس آدم خور ملکہ کو مارنے پر مامور کیا گیا ہے جب گلیات کے دلفریب حسن کو دیکھتا ہے تو مبہوت ہو کر رہ جاتا ہے:

> ''ثانی نے گہرا سانس لے کر جنگل کی نم باس کو پھیپھڑوں میں بھرا اور ایک عالم بے خودی میں کہنے لگا۔''مائی گاڈ! میں اس جادونگری کے عشق میں مبتلا ہونے لگا ہوں۔ بہت عشق کئے ہیں میں نے زندگی میں، لیکن اس نئے عشق میں مستی کا رنگ کچھ زیادہ ہی ہے۔''

نور محمد جوان پہاڑوں کا باشندہ ہے اور یہاں کے حسن میں چھپی محرومیوں اور افلاس کا عادی ہے جب اسے ایک میدانی باشندے کی پہاڑوں سے مخصوص سطحی اور غیر شخصی محبت کو دیکھتا ہے تو تلخی سے کہتا ہے:

''صاب! آپ چار دن یہاں رہ کر دیکھو، اس حالت میں جس حالت میں ہم یہاں رہتے ہیں۔ پھر میں دیکھوں آپ کے اس عشق کو۔ جب آپ کو دو دو سو کی مزدوری کے لئے کبھی مری اور کبھی نتھیا گلی میں لوگوں کی منتیں کرنا پڑیں گی جب آپ کو جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لانا پڑیں گی، جب آپ کی بیوی کو میلوں دور جنگل میں جا کر پانی تلاش کرنا پڑے گا، جب آپ کے بچوں کے لئے مری، ایبٹ آباد سے پہلے کوئی سکول نہ ہوگا، جب آپ کے گھر میں بچوں اور بوڑھوں کے لئے کوئی ڈاکٹر میسر ہوگا نہ دارو، جب آپ کی بیوی پیدائش کے عمل سے گزر رہی ہوگی اور اس مشکل میں اسلام آباد سے پہلے کوئی ہسپتال نہ ہوگا، جب کوئی بجلی ہوگی نہ گیس، نہ ٹیلی وژن ہوگا نہ انٹرنیٹ اور جب برفانی موسم شروع ہونے پر آپ کو مہینوں ایک کمرے میں قید رہنا پڑے گا تو میں دیکھوں آپ کے اس عشق کی حقیقت کو۔۔

عاطف علیم نے پہاڑی علاقے کے باسیوں کی زندگی کو پیش کرنے میں ایک خاص طرز کو اپنایا ہے اور واحد غائب متکلم بن کر اس احوال کو پیش کیا ہے جو اس نے پہاڑی زندگی کے مشاہدے اور مطالعے سے باریک بینی سے اخذ کیا۔ ایک ہی خطے میں بسنے والے لوگوں کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو قارئین کے سامنے کھول کر پیش کر دیا ہے۔ اتنی زیادہ حقیقی اور واضع تصویر اردو ناول میں ناپید تو نہیں البتہ بہت کم پیش ہوئی ہے۔ اگر تھوڑا غور سے اردو ناولوں پر نظر دوڑائی جائے تو کچھ ہی ناول ایسے نکلیں گے جو پہاڑی زندگی پر لکھے گئے اور پہاڑی علاقے کے باسیوں کی حقیقی زندگی کی تصویریں عیاں ہوئی ہوں۔ عام طور پر تو پہاڑی علاقے کا نام سنتے ہی ذہن میں فرحت بخش احساس جاگ اٹھتا ہے۔ لہلہاتے پیڑ، چشموں کا تازہ پانی، پرندوں کی رس بھری آوازیں اور سیاحوں کی شوخ مستیاں مگر یہ احساس انہیں لوگوں کے ذہن میں ابھرتا ہے جو دلفریب مناظر کو دیکھنے کیلئے مہمانوں کی طرح آتے ہیں اور موج مستی کے کچھ دن گذار کر لوٹ جاتے ہیں۔ دوسری جانب نامساعد میں گھرے وہ لوگ ہیں جن کیلئے پہاڑوں کی دلفریب بلندیاں ایک نہ ختم ہونے والی قید اور زندگی کی کٹھنائیوں کا پیغام ہیں۔ چنانچہ ''مشک پوری کی ملکہ'' میں پہاڑی زندگی کے جن حقائق سے پردہ اٹھایا ہے ان میں بھولے بھالے لوگوں کے کم تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے سرمایہ داروں کی اخلاق سوز حرکتوں کا بھی ذکر ہے۔

ناول میں ہماری ملاقات حاجی نثار عباسی نامی ایک منفی کردار سے ہوتی ہے۔ یہ کردار ان منفی قوتوں کا نمائندہ ہے جو جائز ناجائز کے لحاظ سے آزاد ہو کر نا صرف اپنے علاقے کے وسائل پر قابض ہوتے ہیں بلکہ اپنے استحصالی کردار کو دوام بخشنے کیلئے ان کے دماغوں پر بھی قبضہ جما لیتے ہیں۔اس مقصد کیلئے وہ خوف اور توہم پرستی کو اپنا ہتھیار بناتے ہیں اور اس کے ساتھ لوگوں کے مذہبی جذبات کو بھی اپنی منفعت کیلئے استعمال کرنے سے دریغ نہیں کرتے۔حاجی نثار عباسی کے کئی جائز اور ناجائز دھندے ہیں۔دیگر دھندوں کے علاوہ وہ جنگل مافیا کا ڈان بھی ہے۔جنگل میں درختوں کی بے دریغ اور غیر قانونی کٹائی ہو یا جنگلی جانوروں کو پکڑ کر انہیں دساور بھیجنے کا دھندہ ہو۔ان کا کھرا حاجی کے گھر تک ہی جاتا ہے۔یہ حاجی ہی ہے جس کے کارندے جنگل میں مادہ گلدار کے بچوں کو اغوا کرنے اور خود اسے گھائل کرنے اور نتیجے کے طور پر پورے علاقے پر آدم خور کی دہشت مسلط کرنے کا باعث بنتے ہیں۔جب زخم خوردہ ''مشک پوری کی ملکہ'' آدم خوری پر اتر آتی ہے تو موقع پرست حاجی اس کی وحشت کو بھی اپنی دولت اور بالادستی میں اضافے کیلئے استعمال کرتا ہے۔وہ اپنے کارندوں اور ایک جعلی پیر کے ذریعے آدم خور کو ایک چھلاوہ اور خدا کی طرف سے لوگوں کے گناہوں کی سزا کے طور پر مشہور کر دیتا ہے۔مقصد یہ کہ ایک طرف تو ڈرے سہمے لوگ اپنی نجات کیلئے حاجی اور اس جعلی پیر بادشاہ کی طرف دیکھیں اور دوسری طرف یہ کہ خوف کی فضا میں وہاں سے سیاح بھاگ جائیں اور کاروبار مندے پڑ جائیں جنہیں وہ اونے پونے میں خرید کر اپنے اثاثوں میں شامل کر لے۔یوں ہے کہ جب آدم خور درندہ پہلے پہل دو جوان لڑکیوں اور ایک نوجوان گڈریئے کو اپنا شکار بناتی ہے تو حاجی کے کارندے منظّم انداز میں اس خبر کو یوں پھیلاتے ہیں کہ لوگ دہشت زدہ ہو کر اپنے گھروں میں بند ہو جائیں۔کا پہلا شکار دو جوان لڑکیاں اور ایک گڈریا بنتا ہے تو یہ خبر جنگل میں آگ کی طرح ہر سو پھیل کر خوف کی فضا قائم کر دیتی ہے۔حاجی کے کارندے پورے علاقے میں ایک خبر کا پرچار کر رہے ہوتے ہیں۔یہ بات عام کر دی جاتی ہے کہ ہلاک شدگان کسی جنگلی درندے کا نہیں بلکہ بدروح کا شکار بنے ہیں۔ان سادہ لوح لوگوں کو باور کرایا جاتا ہے کہ چونکہ بدروح کو صرف روحانی علم کے ذریعے ہی بھگایا جا سکتا ہے لہٰذا لوگوں کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ وہ نجات کیلئے حضرت پیر بادشاہ سے رجوع کریں۔ایک اقتباس دیکھیے

> ''ایک بینر پر لکھا ہے کہ لوگ اس بدروح سے نجات کے لئے زیادہ سے زیادہ صدقہ خیرات کریں اور نجات کے لئے حضرت پیر بادشاہ سے رجوع کریں''

حضرت پیر بادشاہ بھی حاجی کا کارندہ ہی ہے اور لوگوں کو مذہبی طور پر بے وقوف بنانے

میں معاون کار بھی۔ یہی نہیں بلکہ خونخوار گلدار کے خاتمے کے لئے آئے شکاری ثانی کو کئی طریقوں سے ڈرایا دھمکایا جاتا ہے تاکہ وہ اپنے مقصد کو حاصل کئے بغیر واپس لوٹ جائے۔

''آخری وارننگ واپسی یا موت فیصلہ آج رات تک''

ناول کے اسی حصے میں عاطف علیم نے شکاری زندگی کے بارے میں ایسی بہت سی باتیں لکھی ہیں۔ جن کے بغیر شاید تجسّس اور جستجو کے عناصر کم ہو جاتے۔ جب جنگل میں شکار کی بات چھڑتی ہے تو مصنف ہمیں شکار کے بارے میں اس باریک بینی سے بتاتا ہے کہ کئی جگہوں پر ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے متحدہ ہندوستان میں آدم خور شیروں کا شکار فطرت پرست برطانوی شکاری جم کاربٹ نے نہیں بلکہ خود عاطف علیم نے کھیلا ہو یا وہ سفر میں اس کا رفیق کار رہا ہو۔ شکاری مہمات کی منظر نگاری کو اس فنی چابکدستی سے سامنے لایا گیا ہے کہ درختوں پر چھلانگیں لگاتے بندر، پھدکتی گلہریاں، شور مچاتے پرندے زندہ ہو کر ہماری آنکھوں کے سامنے سے گذر جاتے ہیں۔

ناول میں ''مشک پوری کی ملکہ'' کے روپ میں اس ماں کی ذہنی اور نفسیاتی کیفیت کو کمال مہارت سے بیان کیا گیا ہے جس کے سامنے اس کے بچے اغواء کر لیئے یا مار دیئے جائیں۔ اس ماں کا غیض زمین و آسمان کو ایک کر دیتا ہے۔ ناول کے اس مقام پر پہنچ کر قاری تو خیر جذبات میں بہنے لگتا ہے لیکن مصنف کی گرفت ذرا بھی ڈھیلی نہیں پڑتی۔ یہ منظر اس ناول کے بیانئے کی جان ہے:

''وہ آسمان کی جانب منہ اٹھا کر ایک کرب ناک سی آواز نکالتی کچھ ایسے جیسے سرد تاریک راتوں میں بلی رویا کرتی ہے اور پھر اپنے بچے کی لاش پر منہ پھیرنے لگتی۔ وہ دنیا مافیا سے بے خبر تھی اور اس کے منہ سے ایک کربناک لحن میں '' غرررر۔۔۔۔غررر۔۔۔ غوں ں ں'' جیسی آواز ایک تسلسل سے نکل رہی تھی۔ بہت آسان تھا کہ وہ رائفل سیدھی کرتا اور ٹھائیں ٹھائیں معاملہ خلاص کر دیتا۔ اس نے رائفل سیدھی کی بھی، نشانہ بھی باندھا، مگر گولی چلانے والے ہاتھ میں سیسہ اتر آیا تھا۔ آدم خور کو مارنے کا آسان ترین موقع ایک ماں نے مشکل بنا دیا تھا۔''

انیسویں اور بیسویں صدی کا درمیانی عرصہ آدم خور شیروں کی وحشت ناک داستانوں اور ان کے خلاف شکاریوں کی جرات مندانہ سرگرمیوں سے بھرا پڑا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب جنگلوں میں خونخوار جانوروں کا راج تھا۔ ذرائع آمدورفت مفقود تھے۔ جنگلات کے آس پاس آبادیاں بہت کم تھیں۔ آدم خور درندے آسانی سے آبادیوں کا رخ کر لیتے تھے۔ مگر یہ بہت بعد کی بات ہے تیزی سے بدلتے جغرافیائی اور سائنسی حالات کی وجہ سے خونخوار درندوں کا طریقہ شکار تو تقریباً

وہی ہے مگر شکاریوں نے شکار کے نت نئے طریقے ایجاد کر لئے ہیں تاہم عاطف علیم نے اس حوالے سے انسانی جبلت کو ایک طاقت ور ہتھیار کے طور پر استعمال کیا۔ مصنف نے ''مشک پوری کی ملکہ'' کے آخری صفحات میں ہمیں ماقبل تاریخ یا شکار کے دور کے انسان کی یاد دلا دی۔ تب انسان اپنے سے کہیں طاقتور درندوں اور سفاک تر فطرت کے مقابل اپنی بقا کی جنگ لڑنے میں مصروف تھا۔ اس کے پاس جو ابتدائی نوعیت کے ہتھیار تھے وہ اس قدر ہلاکت خیز نہیں تھے کہ اس کی حفاظت اور اسے شکار کی فراہمی کیلئے کافی ہوتے۔ تب وہ اپنی قدیم جبلت میں موجود حیوانی وحشت کو کام میں لاتا؛ حیوان کے مقابل حیوان اور درندے کے مقابل درندہ۔ یہاں بھی ایسی ہی صورتحال جنم لیتی ہے جب کہانی کے انجام کے قریب شکاری اور نور محمد زخم خوردہ مامتا کے ہاتھوں مجبور درندے کا تعاقب کرتے اس کی غار کے قریب پہنچ جاتے ہیں۔ وہ دیکھتے ہیں کہ وہاں زخم خوردہ ملکہ اپنے بچے کی لاش کو سامنے رکھے اس سنگین مذاق پر کربناک احتجاج کر رہی ہے جو تہذیب یافتہ انسانوں نے اس کے ساتھ کیا تھا۔ اس موقع پر دو مظلوم اور زخم کھائے ہوئے کردار آدم خور اور نور محمد ایک دوسرے کے مقابل آنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ معاملہ بقا کا ہے۔ ایک کی موت دوسرے کیلئے حیات کا پیغام ہے۔ وہیں شکاری جمشید کمال ثانی بھی موجود ہے جو اس منظر کا لازمی لیکن قدرے غیر متعلق جزو ہے۔ آدم خور اس کی رائفل کی رینج میں ہے۔ ایک گولی چلے اور معاملہ خلاص لیکن نور محمد کیلئے بات اتنی سادہ نہیں۔ آدم خور کی طرف اس کا بہت زیادہ حساب نکلتا ہے۔ اس نے نور محمد کی بچپن کی محبت گلابے کو بے رحمی سے ہلاک کیا تھا۔ آدم خور کی آسان موت نور محمد کے زخموں کا مداوا نہیں ہو سکتی تھی۔ یوں وہ ثانی کو منظر سے باہر نکال کر آدم خور کو اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے۔ ایک خنجر کے سوا اس کے پاس اگر کوئی ہتھیار ہے تو وہ اس کی قدیم وحشیانہ جبلت ہے۔ یوں نور محمد ہمارا ہاتھ تھام کر ہمیں شکار کے اس دور میں لے جاتا ہے جہاں بے شمار نور محمد وحشت اور درندگی کے مقابل اپنی بقا کی جنگ لڑا کرتے تھے۔ کچھ اقتباسات دیکھئے۔

''اچانک نور محمد کے منہ سے ایک چنگھاڑ نکلی اور اس نے خنجر کو تولتے ہوئے آدم خور کی طرف دوڑ لگا دی۔ اسی آن آدم خور کی غضبناک دہاڑ گونجی اور پورے ماحول پر چھا گئی ۔۔۔ آدم خور نے اسے پنجہ مارنا چاہا لیکن نور محمد نے جسم و جان کا پورا زور صرف کرتے ہوئے اس کی دونوں اگلی ٹانگوں کو جھٹکے کے ساتھ زمین پر لگا دیا۔ آدم خور کی وحشت نے اگلے ہی لمحے نور محمد کو صاف پچھاڑ دیا۔ اس نے تھوڑی زور آزمائی کے بعد اپنے جسم کو ایک جھٹکا دیا اور نور محمد کو دور پھینک دیا۔ اگلے لمحے سورج اس کے خنجر پر چمکا اور اس نے خنجر بردار ہاتھ کو نیچے آنے سے پہلے فضا میں تھام لیا۔ فیصلہ کن وار کرنے سے پہلے وہ

پھیپھڑوں کی پوری قوت سے چلایا۔''بول مال زادی بول! تو نے میری گلابے کو کیوں مارا؟ ۔۔۔بول! کیوں مارا؟۔۔۔بول ۔۔بول۔''نور محمد کا ہوا میں اٹھا ہوا ہاتھ تیزی سے نیچے آیا اور اس نے اس کے دل کے قریب خنجر اتار دیا۔تکلیف کی شدت سے آدم خور پھر دہاڑی۔اس کی دہاڑ میں اس قدر قوت تھی کہ نور محمد ایک جھٹکے سے پیچھے جا پڑا لیکن اس بار اس نے خنجر پر اپنی گرفت مضبوط رکھی۔وہ خنجر بلند کئے پھر سے جھپٹا اور اس نے اسی جگہ ایک اور وار کر دیا۔''

فکری لحاظ سے دیکھا جائے تو بظاہر ناول بنیادی طور پر شکاری زندگی پر مبنی لگتا ہے مگر اس میں انسانی اور حیوانی زندگی کو جس قدر عمیق گہرائیوں میں دیکھا گیا ہے وہ ایک خاصے کی چیز ہے۔اس کے ساتھ ساتھ اس میں تہذیبی اور معاشرتی زندگی کے رنگ بھی نمایاں ہیں۔ جہاں ایک طرف فطرت کا دل موہ لینے والا بیانیہ موجود ہے وہاں دوسری طرف اس خطہ ارضی میں آباد انسانوں کی سماجی اور معاشی کٹھنائیوں کو بھی کھول کر بیان کیا گیا ہے۔ جہاں تک ناول کے اسلوب کا تعلق ہے انتہائی سادہ اور سلیس اندازِ بیاں نے پورے ناول کی عبارت کو دلکش اور دلچسپ بنا دیا ہے۔مشکل الفاظ بالکل نہیں تو بہت کم سامنے آئے اور بار بار لغت کی عینک نہیں لگانی پڑی۔(یہ بات سب کے لئے نہیں تو کم از کم میرے لئے ضرور ہے جسے لغت دیکھنے کی کچھ زیادہ ہی عادت ہے)

فنی اور تکنیکی حیثیت سے بھی یہ ناول ایک کامیاب تجربہ ہے۔تہذیبی اور معاشرتی پہلو ہونے کے باوجود اس میں روایتی قصہ گوئی یا کہانی برائے کہانی کو کوئی خاص اہمیت حاصل نہیں، ناول کا پلاٹ پھیلا ہوا ہے۔کسی بھی حصے میں پلاٹ پر گرفت ڈھیلی دکھائی نہیں دی۔ بلکہ شکاری زندگی کے قدیم اور جدید تر رجحانات کی مدد سے مزید سے مزید پھیلاؤ دکھائی دیا۔ناول میں پیش کئے گئے تمام کردار حقیقی زندگی کے کردار ہیں۔چنانچہ ان کے ارتقاء میں حقیقت کا عنصر شامل ہے۔ناول پہاڑی علاقے کی زندگی کے حقائق سے پردہ اٹھانے کے لئے تحریر کیا گیا اور عاطف علیم کامیاب رہے ہیں۔اب ہمارے نقاد حضرات اسے کس صورت یا زاویے سے رد کرتے ہیں یا قبول۔یہ سوال باقی ہے اور ہمارے لئے لمحہ فکریہ اور تجسس کا باعث بھی۔

محمد عاصم بٹ کا ناول ''ناتمام''

محمد سلیم الرحمٰن

محمد عاصم بٹ سے میرا پہلا رابطہ سہیل احمد خان کی وساطت سے ہوا تھا۔ میں سہیل سے کہتا رہتا تھا کہ اگر کوئی نوجوان اور ہونہار افسانہ نگار یا شاعر نظر آئے تو ضرور خبر دو تا کہ اسے ''سویرا'' میں شائع کیا جائے۔ ایک روز سہیل نے کہا کہ ایک نوجوان نے ایک دو اچھے افسانے لکھے ہیں۔ اس طرح محمد عاصم بٹ سے تعارف ہوا۔ خوشی اس بات کی ہے کہ سہیل نے اس کے جوہر کو پہچانا۔ اس سے بھی زیادہ خوش کن امر یہ ہے کہ عاصم نے، بطور ادیب، قدم آگے ہی بڑھایا۔ ایک مقام پر پہنچ کر ٹھیر نہیں گیا۔

''ناتمام'' اس کا نیا ناول ہے۔ موضوع جانا پہچانا ہے۔ ایک ایسے معاشرے میں، جہاں مردوں کو غیر معمولی اور بے جا بالا دستی حاصل ہے، بے سہارا عورتوں کی روداد دردانگیز ہی ہو سکتی ہے۔ ناول کی مرکزی کردار صائمہ ہے۔ وہ ابھی چھوٹی تھی کہ باپ ایک حادثے میں ہلاک ہو گیا۔ ماں نے کسی نہ کسی طرح صائمہ کی بڑی بہن کو بیاہ دیا۔ لیکن ڈیڑھ دو سال بعد اسے طلاق ہوگئی اور وہ گھر لوٹ آئی۔ ماں صدمے اٹھا اٹھا کر، بیمار رہ کر، نیم اپاہج اور جنونی سی ہو چکی تھی۔ گھر میں، جہاں کوئی مرد نہ تھا، ہر وقت تناؤ کی ایک کیفیت رہتی تھی۔ بڑی بہن نے ایک سکول میں نوکری کر لی۔ ماں کی وفات کے بعد صائمہ تعلیم ادھوری چھوڑ کر ایک بیوٹی پارلر میں ملازم ہوگئی۔ محلے کے ایک لڑکے سے ناجائز تعلقات قائم ہوئے جو راز نہ رہ سکے۔ لڑکا اسے چھوڑ کر چلتا بنا۔ صائمہ حاملہ ہو چکی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ابارشن کرانا پڑا۔ بڑی بہن سے نباہ ممکن نہ رہا۔ نرسنگ کا کورس کر کے پہلے ایک میٹرنٹی کلینک میں نرس بنی پھر ایک ہسپتال میں کام کرتی رہی۔ ہسپتال کے ڈاکٹر سے، جو شادی شدہ تھا، تعلقات ہو گئے۔ ڈاکٹر کی بیوی ایک امیر کبیر خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ شوہر اس سے دب کر رہتا تھا۔ ڈاکٹر سے معاشقے کا انجام بھی اچھا نہ ہوا۔ آخر صائمہ بالکل تنہا رہ گئی اور اسے اپنی زندگی بے معنی نظر آنے لگی۔ اسے واہموں نے گھیر لیا۔

ناول کے کرداروں میں وہی پراگندگی ہے جس میں پاکستان میں ہزاروں خاندان مبتلا ہیں۔ یوں تو مردوں کا عورتوں کی کم زور حیثیت سے فائدہ اٹھاتے رہنا روزمرہ کا ماجرا ہے۔ زیادہ دکھ اس کہانی میں یہ ہے کہ خود عورتیں بھی ایک دوسری کی زندگی اجیرن کرنے سے باز نہیں آتیں بلکہ بعض اوقات اپنی مفروضہ آزادانہ زندگی کی خاطر ازدواجی تعلقات کا ملیا میٹ کرنے سے بھی بالکل نہیں ہچکچاتیں۔ ناول کیا ہے مسلسل استحصال کا قصہ ہے جس میں خوشی کے لمحات اگر ہیں تو بہت تھوڑے اور روٹھے روٹھے سے جیسے خوشی کی رمق بھی گوارا نہ ہو۔ ناول کا اختتام ہنرمندی سے کیا گیا ہے۔ مردزدہ معاشرے میں عورتوں کی جو تذلیل کی جاتی ہے اسے مہاتما بدھ کی بیوی کی بیچارگی اور رام چندر کے ہاتھوں سیتا کی درگت کے ذریعے سہارا دیا گیا ہے۔ اسطورے کی مدد سے ناول کا موضوع بہت پرانا بھی ہو جاتا ہے اور نیا بھی رہتا ہے۔

نثر میں ناہمواری ہے۔ کہیں اچھی ہے تو کہیں معمولی۔ بعض جگہ بے پروائی بھی نظر آتی ہے۔ مثلاً ایک ہی صفحے پر صائمہ کی بڑی بہن کو گوری چٹی بتایا ہے اور بعد میں لکھا ہے کہ اس کا رنگ گندمی تھا۔ ہسپتال میں ڈاکٹر کسی مریض کو دیکھ کر ہدایت دیتا ہے: ''کیتھڈرل فریش کر دیجیے۔'' پتا نہیں، یہاں کیتھڈرل سے کیا مراد ہے۔ صائمہ کا ڈاکٹر کی بیوی سے مکالمہ بھی بے تکا سا ہے۔ صائمہ چالاک نہ سہی، بہت بھولی بھی نہ تھی۔ یہ معلوم ہونے کے بعد کہ فون ڈاکٹر کی بیوی نے اٹھایا ہے وہ بات چیت کو منقطع کر سکتی تھی۔ خود کو زیرِعلاج مریضہ ثابت کرنا بھی اچھی چال ثابت ہوتا۔

نثر میں جذباتیت قدرے زیادہ ہے۔ اگر اس کم زوری پر قابو پا لیا جاتا تو بہتر ہوتا۔ ناول میں برتے گئے بہت سے الفاظ نامانوس معلوم ہوں گے۔ لیکن اس سے اردو کی ثروت میں اضافہ ہی ہوا ہے۔ مستقبل میں اردو کو یہی روپ پھبے گا۔ جس طرح کی نثر محمد عاصم بٹ نے لکھی ہے بالآخر وہی مستند ٹھہرے گی یا کم از کم ایک نئے لہجے کا آغاز ثابت ہو گی۔

آپ ہمارے کتابی سلسلے کا حصہ بن سکتے
ہیں مزید اس طرح کی شان دار،
مفید اور نایاب کتب کے حصول کے لئے
ہمارے وٹس ایپ گروپ کو جوائن کریں

ایڈمن پینل

عبداللہ عتیق : 03478848884
سدرہ طاہر : 03340120123
حسنین سیالوی : 03056406067

میرواہ کی مضطرب رات کا اِسرار

شہناز رحمٰن

رفاقت حیات کا ناول ’’میرواہ کی راتیں‘‘ ایک ایسے کردار کی زندگی سے وابستہ واقعہ پر مبنی ہے جس کی جذباتی کیفیات پیچیدہ صورت اختیار کرگئی ہیں۔ اس کی جبلی خواہشات اتنی شدید ہو چکی ہیں کہ ان کی آسودگی کے لیے وہ سماجی تقاضوں سے بیگانہ ہو گیا ہے۔ واقعہ بیان کرتے ہوئے اس کردار کے پیچ در پیچ داخلی اضطراب کو جس تسلسل سے بیان کیا گیا ہے وہ عمومیت اور حقیقت سے ماوراء ہو کر افسانوی روپ دھار لیتا ہے۔ چونکہ اسی کردار کے شب و روز کے غیر معمولی عوامل اور نت نئے تجربوں سے افسانوی فضا کی تشکیل ہوتی ہے اسی لیے ایسے راوی کا انتخاب کیا گیا ہے جو تمام تر حالات اور محرکات پر نظر رکھ سکے۔

ناول کی ابتدا مرکزی کردار نذیر کی مرتعش زندگی کی اس رات سے ہوتی ہے جو گذشتہ راتوں سے مختلف ہے۔ اسے اپنی پسندیدہ کہانی ’’مومل رانا‘‘ بے کیف محسوس ہوتی ہے۔ رسالہ کے صفحات پر لفظوں کے بجائے مبہم خاکے ابھرتے نظر آتے ہیں۔ بالآخر سونے کی کوشش میں ناکام ہو کر وہ چھت کی کڑیاں شمار کرنے لگتا ہے اور ان اعداد کو مختلف انداز سے بدل کر پیچیدہ بنا دیتا ہے اور پھر اسے مومل اور رانا کے واقعہ سے وابستہ کر کے معنی برآمد کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس اذیت ناک رات کے بعد اپنی زندگی میں آنے والے خوبصورت لمحات کی توقع لیے وہ پوری رات مختلف خیالوں اور وسوسوں میں گزار دیتا ہے۔ اس ناول کے راوی نے ’منزل مقصود‘ تک پہنچنے والی رات سے پہلے کی بے چینی سے قصہ شروع کر کے قاری کو اس طرح متجسس کر دیا کہ وہ اس مضطرب صورت حال کے انجام سے روبرو ہونے کے لیے بلا توقف پورا ناول پڑھنے پر مجبور ہو جائے۔ اس نے نہایت ہی اختصار سے ایک ناآسودہ نوجوان کی نفسیاتی کیفیت کا سہارا لے کر واقعات کا ایسا تانا بانا تیار کیا ہے جس میں سماجی، علاقائی اور ایک مخصوص معاشرے کی آرزوئیں، تمنائیں اور سماجی حد بند یاں اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ سامنے آجاتی ہیں۔ نذیر کے احساسات اور خیالات قاری کے لیے تحیر زا ہیں لیکن ان کے پس پشت کارفرما گہرے رموز اگر تلاش کر لیے جائیں تو کسی حد تک اس کردار کو سمجھنے کے ساتھ متن کی معنویت میں بھی اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ اس کے بعض نامانوس

احساسات کی وجوہ تو خود متن میں موجود ہیں ،مثلاً اس مضطرب رات کے بعد اس کی چچی جب جگانے آتی ہے تو وہ اسے پہلے سے زیادہ حسین نظر آنے لگتی ہے۔اگلے ہی ثانیہ اپنی اس کیفیت کی وجہ بھی دریافت کر لیتا ہے کہ ''شاید اپنے ہاتھ کی انگلیوں کے نرم لمس کی وجہ سے وہ ایک دم پہلے سے زیادہ حسین ہوگئی تھی''۔رفتہ رفتہ چچی اس کی توجہ کا مرکز بن جاتی ہے۔اس کے جسم کی کشش نذیر کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔چچی کے پرخلوص رویے اور اچھے برتاؤ میں اسے مامتا کے بجائے لذت محسوس ہونے لگتی ہے گرچہ وہ خوف زدہ بھی ہوتا ہے کہ کہیں چچی اس کے ارادے بھانپ نہ لے لیکن کچھ ہی روز میں چچی خود مائل بہ کرم ہو جاتی ہے۔نذیر اپنے والدین کی آٹھ اولادوں میں سے چوتھے نمبر پر ہے، جو ہر وقت اپنی شرارتوں کی وجہ سے کبھی باپ تو کبھی بڑے بھائیوں سے پٹتا رہتا ہے۔لیکن اس کے باوجود وہ اپنی حرکتوں سے باز نہیں آتا ،حسین لڑکیوں کی تاک میں رہنا ،ان کا پیچھا کرتے ہوئے گھر تک چلے جانا ،باپ کے پیسے چرا لینا اس کا محبوب مشغلہ ہوتا ہے یہاں تک کہ وہ ایک طوائف کی زلفوں کا اسیر ہو جاتا ہے اور باپ کو دھوکہ دے کر ایک بڑی رقم لے کر فرار ہو جاتا ہے۔اس واقعہ کے بعد اسے چچا کے پاس ٹھری میرواہ بھیج دیا جاتا ہے۔

میرواہ پہنچنے کے بعد اس کی فطری جبلتیں آسودگی کے لیے مزید سرگرم ہو جاتی ہیں لہٰذا حصول لذت کے لیے چچی بطور نعمت اسے مل جاتی ہے گرچہ اسے اس بات کا احساس ہے کہ اس کا یہ عمل تہذیبی اور اخلاقی ضابطوں کے منافی ہے لیکن اس کے باوجود وہ موقع بہ موقع چچی کو شہوانی نظروں سے دیکھنے سے خود کو باز نہیں رکھ پاتا۔چچی کی طرف سے کوئی واضح اشارہ نہ ملنے کی وجہ سے اس کی آرزوئیں اپنی تشنگی دور کرنے کے لیے ایک الگ راہ نکال لیتی ہیں۔وہ چچا غفور کی دوکان پر آنے والی ہر عورت کی نگاہوں میں اپنے لیے التفات تلاش کرتا ہے۔کبھی کبھی تو خاطر خواہ نتائج بھی سامنے آجاتے ہیں۔اس کے علاوہ نذیر کی ایک اور غیر معمولی عادت ہے کہ وہ سفر کرتے ہوئے خوبصورت نسوانی چہرے کی تلاش میں رہتا تا کہ ان آنکھوں میں اپنے چہرے کو ٹٹولتے ہوئے بیزار کن سفر کو یادگار بنا سکے۔گرچہ یہ سلسلہ ایک اسٹیشن سے شروع ہو کر دوسرے پہ ختم ہو جاتا مگر ہر سفر ایک خوبصورت یاد کے طور پر اس کے ذہن میں مرتسم ہو جاتا تھا۔اسی عادت کی پیروی کرتے ہوئے نذیر کو ایک ایسی عورت مل جاتی ہے جس کی آنکھوں میں اسے اپنا عکس نظر آجاتا ہے۔یہ وہی عورت ''شمیم'' ہے جو اس کے لیے متاع جاں بن جاتی ہے۔شروع میں جس مضطرب رات کا ذکر کیا گیا ہے اس کے بعد شمیم سے ملاقات کی رات آنے والی ہے جس پر اس ناول کی عمارت کھڑی کی گئی ہے۔

بچپن سے لے کر جوانی تک سیمابی و اضطراری کیفیت رکھنے والے کردار نذیر کے

عادات وعوامل پر غور کیا جائے تو وہ فرائڈ کے نظریہ تحلیل نفسی اور شخصیت کی نشو ونما میں اس کے طے کردہ مدارج میں فٹ نہ بیٹھنے والے کردار کا استعارہ معلوم ہوتا ہے، جسے مصنف نے خواہشات کے اظہار کی بے ساختگی کی مثال بنا کر پیش کیا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ ہر کردار کی نفسیات مختلف ہوتی ہیں لیکن جب کسی کردار کو موضوع بنا کر کوئی فن پارہ تخلیق کیا جاتا ہے تو اس میں انوکھا اور غیر معمولی پن کا ہونا ضروری ہے جو فن کار کی تخلیقی حسیت کو مہمیز کر سکے۔ اردو کے افسانوی ادب میں بے شمار کرداری افسانے اور ناول لکھے گئے اور ان تمام کرداروں میں سب سے مضبوط پہلوان کا نفسیاتی داؤ پیچ ہے جو انھیں متن کے دیگر افراد سے ممتاز بناتا ہے مگر اس ناول کے مرکزی کردار نذیر میں جو خصوصیات موجود ہیں ان کی تفہیم فرائڈ کے نظریہ کا سہارا لیے بغیر ممکن نہیں۔ کیوں کہ دوسرے افسانوی متون میں کردار کے اعمال وحرکات کے اسباب وعلل عموماً متن میں ہی تلاش کر لیے گئے ہیں۔ لیکن نذیر کو سمجھنے کے لیے ناول کا بین السطور ناکافی ثابت ہوتا ہے۔ شمیم سے ملاقات کے لیے پکوڑا فروش نورل جوگی سے دوستی کرنا اور اس دوستی کو اعتبار بخشنے کے لیے نورل جوگی کے ساتھ بھانگ اور چرس سے نشہ کرنا اور شمیم کو ملتفت کرنے کے لیے زیور خریدنا وغیرہ منزل مقصود تک پہنچنے کے لاشعوری محرکات تو قرار دیئے جاسکتے ہیں مگر شمیم سے وصال کے دوسرے روز ہی چچی خیر النساء سے مباشرت کرنے کی تحریک بغیر کسی نفسیاتی جنون کے ممکن نہیں۔ فرائڈ کے مطابق ایسے ہمت افزا اقدام اڈ ld کی قوت کے زیر تحت انجام پاتے ہیں۔ فرائڈ کا خیال ہے کہ اڈ وہ خودکار قوت ہے جو ہر شخص میں پیدائشی طور پر موجود ہوتی ہے۔ یہ قوت منھ زور اور بے لگام ہوتی ہے ہمیشہ جبلتوں کی تسکین کے سامان تلاش کرتی رہتی ہے۔ اگر تسکین کے طریقے ضابطہ اخلاقیات کے خلاف ہوں تو حصول لذت کے نت نئے راستے ایجاد کرتی ہے جو سماج کے لیے قابل قبول ہوں۔ یہ طریقے علامتی بھی ہوتے ہیں اور بالواسطہ بھی۔ انسان کے بہت سے سفلی جذبات اور منفی رجحانات بھی اس کے دائرے میں آتے ہیں جو عموماً شکلیں بدل کر آسودہ کیے جاتے ہیں۔ لیکن بعض شدید صورتوں میں براہ راست اور بغیر اخلاقی اصولوں کی پاسداری کے بھی آسودہ کیے جاتے ہیں جس کی بدترین مثال زنا بالجبر اور مباشرت محرم وغیرہ ہوتے ہیں۔ فرائڈ کے اس نظریہ کی روشنی میں نذیر کے کردار کا تجزیہ کیا جائے تو بڑی حد تک متن سے برآمد ہونے والے سوالوں کا حل سامنے آجاتا ہے۔ اس کے علاوہ نذیر کا سوٹ بوٹ والے مرد کے سامنے خود کو کمتر محسوس کرنا، چچا غفور کو رقیب سمجھ کر جان لینے کا خیال پیدا ہونا، شمیم سے ہم بستری کے دوران ایک غیر متوقع صورت حال کی وجہ سے مباشرت نہ کر پانے کو اپنی مردانگی کی کمزوری سمجھنا سامنے کے نفسیاتی عقدے ہیں جو اسے بحیثیت افسانوی کردار ایک تشخص عطا کرتے ہیں۔

ناول کے واقعات واضح اور محاکاتی ہوتے ہوئے بھی اس کردار کی جذباتی لہروں کی وجہ سے اتنے اشاراتی اور انسلاکاتی ہو گئے ہیں کہ یہ ناول پیچ وخم اور تہہ داری کا ایک مرقع معلوم ہوتا ہے۔ واقعات میں ایسا فطری بہاؤ ہے کہ قاری یہ محسوس کرنے سے قاصر رہتا ہے کہ ماضی وحال کب مدغم ہو گئے لیکن اس روانی میں ایک مخصوص طرح کا ٹھہراؤ ہے جو قصے کو وحدت پذیر صورت میں ڈھالتا ہے۔ چچی کے خطوط جسم سے متلذذ ہونے کے زمانے سے لے کر شمیم کے لیے دیوانگی اور چچی کے جسم کو اپنی ناآسودگیوں کی تکمیل کا ذریعہ بنانے تک کے پورے عرصے میں قاری بھی مصنف کے ساتھ کرداروں کے ہر عمل ورد عمل میں ذہنی وفکری طور پر شامل ہو جاتا ہے۔ ناول کی نامانوس فضا کا خاکہ گرچہ قاری کے ذہن میں واضح طور پر نہیں ابھر پاتا لیکن اگر قوت متخیلہ پر ہلکی سی ضرب لگائی جائے تو وہ سندھ کے مخصوص علاقے میں رہنے والے نچلے طبقے کی بیچارگیوں، خواہشوں اور بوالعجبیوں کا بیان نہ ہو کر ایشیائی ممالک کے مختلف خطوں کے واقعات معلوم ہونے لگتے ہیں۔ ناول کا جغرافیائی تناظر سندھ کا علاقہ ہے۔ مصنف نے متن میں حقیقت کا رنگ پیدا کرنے کے لیے سندھی علاقوں کے حقیقی نام، علاقائی الفاظ اور مقامی لب و لہجے، بود و باش، طرز فکر، عقاید ، باہمی یگانگت ، ایثار اور سچے جذبات کی آمیزش کر دی ہے جس کی وجہ سے متن اور قاری کے درمیان کی حد فاصل ختم ہوگئی ہے اور پھر راوی نے ان کرداروں کی خارجی زندگی اور داخلی کیفیات کے سارے پوشیدہ راز قاری کے سامنے جس اجمالی اور اشاراتی انداز میں بے نقاب کر دیئے ہیں وہ اس کی گہری بصیرت کے غماز ہیں۔ متن اور قاری کے درمیان کسی طرح کی کوئی اجنبیت باقی نہ رہنے کی صورت میں قاری ناول کے ہر منظر، ہر کردار کی گفتگو اور ناول کی تخیلاتی جہتوں سے حسب طبیعت محظوظ ہوتا ہے، اور یہ عنصر اس ناول میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ راوی نے واقعات کے بیان میں یہ احتیاط روا رکھی ہے کہ کسی معاملے میں اس کی طرف سے شدت پیدا نہ ہو بلکہ صورت حال کی مناسبت سے خود قاری معاملے کے نشیب وفراز کو سمجھ سکے۔ ناول کے بیشتر وقوعوں میں یہ خوبی بھی مضمر ہے کہ ہر عمل کا فطری ردعمل سامنے آتا ہے۔ بعض مقامات پر بیان کنندہ نے ایک ماہر نبض شناس کی طرح متوقع صورت حال کو نہایت ہی مناسب طریقہ سے تبدیل کر دیا ہے۔ ایک شادی شدہ عورت کا شوہر کو دھوکہ دے کر اپنے عاشق سے ملنا اپنے آپ میں بڑا اجرأت مندانہ قدم ہے۔ مزید یہ کہ قبرستان جیسی پراسرار جگہ جہاں پر چمگادڑوں کی آوازوں پر بدروحوں کا گمان ہوتا ہو اور ایسا غیر رومانی ماحول جس میں کشمکش اور خوف کی زیریں لہریں حواس پر غالب ہوں وہاں دو محبت کرنے والوں کی ملاقات کا منظر پیش کر کے اس میں لذتیت پیدا کرنا ایک چابکدست فن کار کا ہی کمال ہوسکتا ہے کہ۔ ان کی ملاقات کا وہ سحر انگیز منظر ملاحظہ ہو:

’’نذیر نے اس کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا’’ہمارا آج کا یہ ملاپ ہمارے پیار کی یادگار رہے گا۔ میں اسے زندگی بھر بھول نہیں سکوں گا۔ آج حضرت سچل سرمست بھی ہمارے پیار کے گواہوں میں شامل ہو گئے۔‘‘ اس کا ہاتھ اس کے بازو کے گداز سے پھسل کر اس کے جسم کے نہاں حصوں کو ٹٹولنے لگا۔ وہ اس کے اور نزدیک آ گیا۔’’دیکھو تم گاؤں کی عورت ہو اور تمھیں ڈرنا نہیں چاہیے۔‘‘

وہ مزاحمت کرنا چاہتی تھی مگر نذیر کے شریر ہاتھوں نے اس کے حواس معطل کر دیے تھے۔ اس کے بدن کے رگ و ریشے میں ایک بے چینی اور بے اطمینانی سی پھیلتی جا رہی تھی۔ وہ لذت کے ست رنگے پرندے کو اپنے بدن کی تمام پہنائیوں اور تمام دسعتوں میں مائل بہ پرواز دیکھنا چاہتی تھی۔ اس خواہش میں اپنی ملاقات کا محل وقوع تک فراموش کر بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھیں خود بخود بند ہو رہی تھیں۔ اپنے بوجھل پپوٹے بمشکل پوری طرح کھول کر اس نے نذیر کی طرف دیکھا اور پہلی بار اپنے بازو پھیلا کر اسے اپنے بدن سے لپٹا لیا۔ نذیر کے تشنہ لبوں کا بوسہ لینے کے بعد اس نے بمشکل اسے اپنے آپ سے علیحدہ کر دیا۔ الگ ہونے کے بعد نذیر نے گرد و پیش پر نظر دوڑائی تو اسے پہلی بار اس محل وقوع کی حرمت کا خیال آیا۔ شب کا نجانے کون سا پہر تھا اور وہ انسانی لاشوں کے مدفن میں اس وقت کیا کر رہا تھا۔‘‘

(میرواہ کی راتیں، رفاقت حیات، سانجھ پبلی کیشنز، پاکستان، ۲۰۱۶، ص:۸۱)

اس اقتباس سے واضح ہوتا ہے کہ تمام تر قوتوں کے سامنے اس کردار کی جبلت زیادہ فعال اور قوی تر ہے۔ جنسی لذت کوشی سے مغلوب اور معاشرتی و بشریاتی پاس و لحاظ سے ماوراء ہو کر لمحہ وصال سے لطف اندوز ہوتے ہوئے اچانک اس جگہ کی حرمت کا خیال آنے اور پھر خاموش ہو جانے سے اس کردار کی نفسیاتی کیفیت پوری شدت کے ساتھ آئینہ ہو جاتی ہے۔ یہاں پر مصنف نے لاشعور کے نہاں خانوں میں اتر کر صدیوں سے چلے آ رہے اخلاقی و تہذیبی ضابطوں کے پابند معاشرے میں سانس لینے والے ایک شخص کے نہایت ہی لطیف نفسیاتی نکتہ کو گرفت میں لیا ہے۔

اس ناول کے اختصار اور تاثر کی وحدت و یکسانیت کی وجہ سے یہ کشمکش پیدا ہوتی ہے کہ صنفی اعتبار سے اسے کس زمرے میں رکھا جائے لیکن اس کے ہیئتی اجزا اس بات کی توثیق کرتے ہیں کہ مصنف نے ناول کی ہیئت میں ایک نیا تجربہ کیا ہے جس میں حتی الامکان تفصیل سے گریز کیا گیا ہے۔ جو چند مہینے کے زمانی عرصہ پر محیط ہے اور مختصر پلاٹ کے اس بیانیہ میں صرف آٹھ کردار

ہیں۔بظاہر جن کی اپنی کوئی خواہش ،نجی ضرورت اور کوئی شناخت نہیں لیکن انھیں کے عوامل سے ناول کی جزئیات میں اضافہ ہوتا ہے اور واقعات کا فطری ارتقاء بھی ہوتا ہے۔وہ ہمہ وقت نذیر کے حوالے سے ہی گفت وشنید کرتے نظر آتے ہیں لیکن رمز واشارے میں ان کی زندگی کے احوال بھی عیاں ہو جاتے ہیں۔چچی خیر النساء اور شمیم دونوں یکساں المیہ کی شکار ہیں۔چچی اور غفور چچا کے عمروں میں بڑا تفاوت ہے اور شمیم کا شوہر کسی دوسری عورت میں دلچسپی لیتا ہے۔اس لیے وہ وہ دونوں جنسی نا آسودگی کے سبب اپنے شوہروں سے بیزار ہو کر نذیر کی جنسی خواہشات کی تسکین میں کوئی تردد نہیں کرتیں۔زمانہ بلوغ کی جذباتی تشنگی کے نتیجہ میں نذیر کو کنواری لڑکیوں سے وحشت ہوتی ہے بمقابلہ کنواریوں کے وہ شادی شدہ کو ترجیح دیتا ہے۔نورل جوگی چند پیسوں کے عوض دلالی کرنے پر راضی ہے اور حیدری محض دوستی کے لحاظ میں اس کا ساتھ دے رہا ہے جبکہ چچا غفور کی حیثیت ایک غیر ضروری شے کی سی ہے۔اس کے علاوہ اس ناول میں سماجی وتہذیبی مظاہر بھی برائے نام ہیں۔مزاروں اور درگاہوں پر نشہ میں دھت مست ملنگوں کی پیشگوئی اور الہامی باتوں کا بیان دوسرے ناولوں کی طرح اس میں بھی بغیر کسی امتیاز کے بیان کیا گیا ہے جس میں اس معاشرے کے مذہبی رجحان کے سوا اور کوئی گہرا رمز نہیں ہے۔لیکن ان جزئیات کا نذیر کی زندگی سے بڑا گہرا تعلق ہے جس کی وجہ سے ناول درجہ بدرجہ نقطہ عروج کی طرف بڑھتا ہے۔اس کے علاوہ جو عنصر ناول کو کامیابی کی دہلیز تک پہنچانے میں معاون ثابت ہوا وہ ہے انداز بیان ،جس کا اندازہ کم وبیش ناول کے اختصار سے تو ہو ہی جاتا ہے مزید یہ کہ ایک مخصوص علاقے کی زندگی کا نقشہ پیش کرنے کے باوجود مصنف نے کہیں ایسے مکالمے استعمال نہیں کیے جو دوران قرات گراں گزریں یا متن کی تفہیم میں مانع ہوں۔راوی بہ چشم خود نذیر کے جنسی ارتعاشات کا عینی شاہد ہے یہاں تک کہ وہ مناظر بھی جو خلوت نشینی کے متقاضی ہیں راوی نے انھیں بھی اپنے تخیل اور لسانی موزونیت سے اس طرح بیان کیا ہے کہ وہ چشم دید واقعہ کی طرح حقیقی محسوس ہوتا ہے۔حقیقت کا التباس پیدا کرنے کے لیے کرداروں کے پیشے اور منصب کے لحاظ سے اور علاقائی لفظیات میں مکالموں کے بجائے لہجے کی برجستگی اور انداز گفتگو سے فطری پن پیدا کرنے کی کوشش کی ہے جو بڑی حد تک کامیاب بھی ہے ۔علاقائی الفاظ کا استعمال صرف اس حد تک ہے جو قاری کے لیے دلچسپی اور کشش کا موجب بن سکے۔

ناول کے مطالعہ کے بعد قاری کا ذہن بے ساختہ یہ سوال کر سکتا ہے کہ ’’کیا نذیر اور دوسرے کرداروں کی زندگی میں جنسی لذت کی حصولیابی کے علاوہ کوئی اور قابل ذکر پہلو نہیں جو ناول میں بیان کیا جاتا؟ یہی وہ نکتہ ہے جو اس کردار کی تشکیل ،واقعہ کی نوعیت اور ناول کے محدود کینوس کو

وسیع تر کر کے اس دنیا کے وجود میں آنے کے محرکات پر توجہ مرکوز کر دیتا ہے۔ ایسے میں ناول کا وضاحتی بیانیہ یکا یک ابہام وعلامات کے ایک لامتناہی سلسلہ میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ تشنہ خواہشات کے یہ واقعات صرف نذیر، چچی خیر النساء اور شمیم کا واقعہ نہ ہو کر بے شمار انسانوں کی زندگی کا المیہ بن جاتے ہیں اور یہ ناول اس مہذب معاشرے پر ایک شدید طنز ثابت ہوتا ہے جو سماجی معیار اور اخلاقی اقدار کے دباؤ میں انسانی زندگی کے بنیادی تقاضوں کو نظر انداز کر کے مریضانہ حد تک امر و نہی اور اصلاح پر توجہ دیتا ہے۔ کیوں کہ تخلیق کائنات کے بعد تمام مذاہب اور معاشرے نے جبلی خواہشات کی تکمیل کے لیے مختلف سطح کے حدود متعین کیے مگر مہذب ماحول کی خواہش نے انسانوں کو شدت پسندی کی طرف مائل کر دیا جس کے بطن سے بغاوت نے جنم لیا اور نتیجہ کے طور پر شدت عمل اور جذبہ سے بھر پور نذیر جیسے کرداروں کے ذریعہ فرسودہ اخلاقی معیارات کے خلاف انحراف کے رویے سامنے آئے۔

یہ ناول انسانی سماج کی ان گتھیوں کو عیاں کرتا ہے جو خود انسان کی الجھائی ہوئی ہیں۔ مصنف نے فطرت انسانی کے ادراک کے ذریعہ ان جبلتوں کی کارکردگی کو پیش کیا ہے جس کے سبب ایک کردار عام انسانوں سے ماوراء ہو کر افسانوی جہات کا حامل ہو جاتا ہے۔ اس کردار میں نفسیاتی دباؤ اس طرح عمل آراء ہیں کہ جنسی خواہشات کی تکمیل اس کی زندگی کا مقصد معلوم ہونے لگتا ہے۔ جذباتی نا آسودگی کی گھٹن نے اس طرح مضطرب کر دیا ہے اس کی زندگی بے سمت راہوں پر گامزن ہوگئی ہے، جنسی خواہشات اس کے آزانہ نمو کے راستے میں حائل ہیں اور وہ اپنی کسی بھی صلاحیت کو بروئے کار لانے سے قاصر ہے۔

دوستوں کے درمیان پڑی ہوئی نظمیں

شاہد فیروز

ارشد معراج سے میرا جتنا بھی تعارف ہے خالصتاً ادبی اور محبتوں بھرا ہے اور ان کو جس قدر جان پایا ہوں اس کے مطابق یہ ایک آزاد منش لیکن یار باش انسان ہے طبیعت میں اضطراب اور اضطرار ہے سیمابی پن نہیں لیکن تحرک ہے ہر پل کچھ نیا کرنے نیا کہنے اور نیا سوچنے کا صاحبِ ذوق اور پیشے سے انصاف کرنے والے معلم ہیں اس لئے ان کے طلبا جب ان سے استفادہ کرتے ہیں تو اپنے دامنِ فکر میں بیش بہا خزانے لئے جاتے ہیں ۔

دوستوں کو وقت لازمی دیتے ہیں اور اپنی گفتگو کے حصار میں لئے رکھتے ہیں طبیعت کی اضطراری انہیں کبھی تو فیس بک دوستوں کی ادنیٰ سے ادنیٰ پوسٹ پہ بھی رائے دینے پہ مجبور کرتی ہے اور کبھی مہینوں لائک پہ بھی نہیں اکساتی پوچھو کہ ارشد صاحب کدھر غائب ہیں جواب ملتا ہے بس دل نہیں چاہ رہا فیس بک پہ آنے کو۔ ارشد معراج کے متعلق یہ مختصر سا تعارف اس لئے تمہید کے طور پہ لکھا کہ کچھ آپ صاحب کتاب کے متعلق بھی جان سکیں گو کہ بہت سے دانشور ناقدین کا خیال ہے کہ تخلیق کو پڑھتے ہوئے تخلیق کار سے متعلق جانکاری ہونا کوئی ضروری امر نہیں بلکہ بہت سوں کا تو یہ کہنا ہے تخلیق پڑھتے ہوئے تخلیق کار کو باقاعدہ منہا کر دینا چاہیے اور اس کے ساختیاتی ہیئتی و اسلوبی پہلوؤں کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کے فکری نظام تک جانا چاہئے اور تخلیق میں موجود پیغامات کو ہی دریافت کرنا چاہئے۔ اور ممکن ہو تو پسِ ساختیات اور ردِ تشکیل سے فن پارے کو گزارنا چاہیے۔

یہ بات بہت حد تک درست ہے اور بہت حد تک میں بھی اس کا قائل ہوں لیکن تخلیق کار کو مکمل طور پر نظر انداز کر کے آپ بھلے تخلیق سے بہت کچھ نکالنے میں کامیاب ہو جائیں لیکن وہ نفسیات وہ مخصوص حالات جو تخلیق کار کے مشاہدے یا تجربے میں رہے اور جن کے سبب اس کا فکری نظام بنا اس کو جان لینے کے بعد آپ تخلیق کی اساس تک پہنچ جاتے ہیں اور بہت سی کلیدیں

آپ کے ہاتھ آجاتی ہیں اور تخلیق آپ پہ منکشف بھی ہوجاتی ہے اور اس وقت کے معروض یعنی سیاسی سماجی اور معاشی معاملات سے بھی آشنائی ہوتی ہے جو ایک تخلیق کا محرک بنے سو اس حساب سے اگر آپ تخلیق کار کو جان لیں تو یہ کوئی عیب نہیں بلکہ قاری کے ہاتھ میں ایک اضافی کلید آجاتی ہے جو اسے مطالعہ کے دوران فائدہ پہنچاتی ہے

اگر دیکھا جائے تو کسی بھی تخلیق کو دو بنیادی حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے اور اسی کی روشنی میں فن اور فنکار کے ادبی قد کاٹھ کا جائزہ لیا جاسکتا ہے۔

۱۔ تخلیق کار کا علمی اظہار

۲۔ تخلیق کار کا فنی اظہار

علمی اظہار میں تخلیق کار اپنے مشاہدے تجربے کتابی و نصابی علم نفسیاتی تجزیے کی قوت اور تخیلات میں پلنے والے احساسات کو بروئے کار لاتا ہے۔ اس کے پاس یہ مواد جتنی مقدار میں ہو گا اس کا اظہار اتنا ہی وسیع معنوں میں ہوگا اور یہی کلیہ ایک قاری پہ بھی لاگو ہوتا ہے کہ وہ جتنی زیادہ جانکاری رکھتا ہوگا تخلیق کو اتنا ہی گہرائی سے جان پائے گا جبکہ فنی اظہار میں بہت کچھ سیکھنے سے اٹھاتا ہے اور جو اپنے وجود میں ردوبدل کا متقاضی نہیں ہوتا اور یہاں صرف لفظی اسلوبی اور ہیئتی سطح کی ہی تجربات کئے جاسکتے ہیں۔ ارشد معراج کو پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ خدائے فکر و عمل نے اسے ان دونوں خوبیوں سے خوب نوازہ ہے اور اسی بنا پہ میں یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ دوستوں کے درمیاں نظموں کا ایسا مجموعہ ہے جسے بلا ردوکد موجودگی عصری ادبی منظرنامے میں ایک اہم اضافہ قرار دیا جاسکتا ہے۔

اس میں موجود نظمیں جہاں لسانی اور ساختیاتی سطح پہ اہم ہیں وہیں اس معاشرے کا تہذیبی معاشی سیاسی اور نفسیاتی مسائل کے گہرے ادراک کے سبب علمی سطح پہ بھی نہایت اہمیت کی حامل ہیں کتاب میں موجود نظمیں ایک فرد کی تنہائی سے لے کر لایعنیت بے مقصدیت اور رائیگانی کے کرب کا اظہار ہیں۔ اور ان موضوعات کو بیان کرنے کے لئے کہیں کہیں absurd way of expression کو اپنایا ہے۔

ارشد معراج کی کسی بھی نظم کو پڑھ کر اسے دوبارہ پڑھنے کو دل چاہتا ہے ایک نئی سوچ اور نئے امکانات کو ذہن میں رکھتے ہوئے لیکن یہ عمل دریدا کے double reading یا ردِ تشکیل کے زمرے میں ہرگز نہیں آئے گا گو کہ نظموں میں dissemination کی فضا موجود ہے اور آپ معنی اور ردِ معنی کے تحت بھی ان نظموں میں سے بہت سے مثبت نتائج برآمد کرسکتی ہیں۔ کتاب میں موجود نظموں میں بظاہر مخاطب دوست ہیں لیکن درپردہ مکالمہ اس معاشرے کے ہر فرد سے ہے

مجموعی طور پر بھی اور انفرادی طور پر بھی نظمیں فکری سطح پہ تو بلند پرواز ہیں ہی لسانی سطح پہ بھی نہایت دلفریب ہیں اور پنجابی الفاظ کو اتنے رچاؤ سے برتا گیا ہے کہ اظہار کا حسن دو چند ہو گیا ہے۔ جیسے

مری آنکھیں بھی پتھر ہیں
اُڈیکیں کب ختم ہوں گی

یا پھر

باوا کوثر!
میں چندرا بس اتنا جانوں
جب کوئی آفت آنے کو ہو
ڈنگت پکھنو سارے ہجرت کر جاتے ہیں

انسانی ذہن تصورات و تخیلات کی آماجگاہ ہے جہاں ایک وقت میں کئی خیالات بنتے بگڑتے ہیں خیال کی تو بار بار بہکتی ہے اور اگر یوں کہا جائے کہ مکمل ذہنی ارتکاز بھی آپ کو کسی ایک نکتے پر سوچے جانے میں مسلسل معاون نہیں ہو سکتا تو یہ دعویٰ بے جا نہ ہوگا۔

ہجرت خون کی ندیاں ہے

اس نظم میں اسی تکنیک کو برتا گیا ہے کسی بھی تخلیق کار کی تخلیقات سے حقیقی معنوی گوہر اس وقت تک دریافت نہیں کیا جا سکتا جب تک آپ تخلیق میں اور تخلیق آپ میں سما نہ جائے ارشد معراج کی بظاہر صاف اور سادہ نظر آنے والی نظمیں بھی اپنے وجود میں جہانِ معنی آباد کئے ہوئے ہیں اور یہی وہ خاصیت ہے جو آپ کو ایک سے زیادہ مرتبہ نظم پڑھنے پہ مجبور کرتی ہے

کیا مجھے زندگی سے محبت نہیں ہے؟ اس نظم میں سرخ اور سبز کو لے کر شاعر نے دو فکری رویوں کو ان کہے انداز میں اس خوبصورتی سے کہا ہے کہ ایک ایسے شخص کے ذہنی خد و خال پوری طرح نمایاں ہو جاتے ہیں جو مذہب اور لادینیت میں الجھا ہوا ہے اور پھر سبز یعنی مذہب کی جانب مائل ہو جاتے ہے اس نظم کو پڑھتے ہوئے مجھے اپنا ایک دیرینہ شعر بھی یاد آیا:

میں عجب رنگ کہاں جا بیٹھوں
سرخ بیٹھے ہیں ہرے بیٹھے ہیں

اور پھر اس نظم کے اختتامیہ میں جب شاعران رنگوں کے تناظر میں اپنی ذات کا تجزیہ کرتا ہے اور ان کا اطلاق خود پہ کرتا ہے تو وہاں سبز رنگ بالکل نئے معنی کے ساتھ آپ پہ آشکار ہوتا ہے آخری دو سطریں دیکھیں:

ریگ زاروں کی جھلسی ہوئی ساعتوں میں چلا جا رہا ہوں

مجھے تو کہیں سبز ٹکڑا دکھائی دیا ہی نہیں ہے

کتاب میں بے شمار شاہکار نظمیں موجود ہیں جو الگ الگ مضمون کا تقاضا کرتی ہیں لیکن میں اختصار کا دامن تھام کر ایک دو اور نظموں کے اشارے دوں گا تا کہ آپ کو پتا چل سکے کہ ارشد معراج جتنے کم لفظوں میں قاری کو اس منظر تک لے جاتا ہے جہاں اس کی مرضی و خواہش ہوتی ہے اور کس مہارت اور خوبصورتی سے منظر سے کڑی کراہت اور نفسیاتی رویوں کو عیاں کرتا ہے۔

ہزارہ قبیلے کا نوحہ کی چند سطریں

درد درماں نہیں

درد بڑھتا رہے

ہاتھ داڑھی پہ ہو

اور خصیے کھجاتے ہوئے

قہقہے مار کر ہنس پڑیں

خون بہتا رہے

ان سطور کو پڑھتے ہی پورا نقشہ آپ کی آنکھوں کے سامنے گھوم جائے گا اور بے حسی اور بے بسی جاں گزیں ہو جائے گی اور وہ کرب جس سے تخلیق کار گزرا ہے اس کا بوجھ آپ اپنے ذہن پہ محسوس کرنے لگیں گے۔ اسی طرح ایک نظم 'ریلوے اسٹیشن پھلروان' ہے جو وسائل کی کمیابی اور عدم دستیابی کا نوحہ ہے جس میں متکلم واحد آگ کی تلاش میں ہے وہ آگ جو ہوا پانی کی طرح زندگی کا اہم جزو ہے۔ ''دوستوں کے درمیان'' پڑھ کر یہ احساس بڑی شدت سے ہوا کہ کاش ہمارا شمار بھی ان دوستوں میں ہوتا اور ایک خوبصورت نظم ہمارے لیے بھی ہوتی۔۔۔۔